شیکسپیر کی شہرۂ آفاق تمثیل

شہر وینس کا ایک مراکشی

اوتھیلو

مترجمہ

مولانا عنایت اللہ دہلوی بی اے

سابق ناظم دار الترجمہ حیدرآباد دکن

افرادِ تمثیل

وینس کا ڈیوک۔

برابنیتیو۔ رُکنِ مجلس۔

دیگر اراکینِ مجلس۔

گریتیانو۔ برابنیتیو کا بھائی۔

لوڈوویکو۔ برابنیتیو کا رشتہ دار۔

اوتھیلو۔ ایک شریف مُور، حکومت وینس کا ملازم۔

کاسیو۔ اوتھیلو کا نائب۔

ایاگو۔ اوتھیلو کا سابق نائب۔

روڈریگو۔ وینس کا ایک شریف۔

مونٹینو۔ اوتھیلو سے پہلے قبرس کا حاکم۔

مسخرا۔ اوتھیلو کا ملازم۔

دسدیمونا۔ برابنیتیو کی بیٹی اور اوتھیلو کی بیوی۔

ایملیا۔ ایاگو کی بیوی۔

بیانکا۔ کاسیو کی داشتہ۔

ملّاح۔ قاصد۔ نقیب۔ افسر۔

شرفا۔ سازندے۔

خدمتگار۔

منظر۔ وینس۔ بندرگاہِ قبرس۔

اوتھیلو

جزو اوّل

پہلا منظر

وینس کی ایک گلی

روڈریگو اور ایاگو آتے ہیں

روڈریگو:۔ خبردار جواب مجھ سے بات کی۔ ایاگو! تم تو وہ ہو جو روپے پیسے کے ایسے ہی مالک تھے گویا کہ وہ تمھارا ہی مال تھا۔ مگر تم بڑے بے مروت نکلے۔ مجھے تم سے سخت شکایت ہے کہ تمھیں معلوم ہوا اور پھر بھی تم نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔

ایاگو:۔ واللہ آپ سنتے کس کی ہیں۔ اگر میرے وہم وگمان میں بھی آیا ہوتا کہ کیا سے کیا ہو جائیگا اور آپ سے نہ کہتا تو البتہ آپکو مجھ سے شکایت ہونی بجا تھی۔

روڈریگو:۔ ہاں ایک دفعہ تم یہ بھی تو کہتے تھے کہ تمھیں اس سے نفرت ہے۔

ایاگو:۔ اگر مجھے اس سے نفرت نہ ہو تو پھر خدا مجھے سب کی نظروں میں قابلِ نفرین ٹھیرائے۔ سنیئے! شہر کے تین بڑے آدمی خود میری سفارش کرنے اس کے پاس گئے کہ وہ مجھے اپنا نائب مقرر کرلے۔ ایمان سے عرض کرتا ہوں کہ مجھے خود اپنی قدر وقیمت خوب معلوم ہے۔ اور میں اس جگہ سے کم کے لائق ہرگز نہ تھا لیکن وہ اپنے غرور میں مست اپنے ہی مطلب کا یار کب کسی کی سنتا تھا۔ تقریر شروع کی اور اس میں فنونِ حرب کی بڑی بڑی جنگی اصطلاحیں اور لغت جھاڑ کر اصل مطلب کو ٹالنے لگا۔ اور آخر میں کہتا کیا ہے کہ ہمیں جس شخص کا انتخاب کرنا تھا اسے منتخب کرلیا۔ اور اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ جسے منتخب کیا ہے وہ ہے کون، وہ ایک فلارنس کا باشندہ ہے، میکائیل کاسیو اس کا نام ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ پڑھا لکھا بہت ہے، جورو بھی بڑی حسین کرنیوالا ہے جو کوئی دن جاتا ہے کہ اس پر بُری طرح آفتیں توڑے گی۔ پھر یہ منتخب شدہ صاحب وہ ہیں جنھوں نے کبھی کوئی فوج لڑائی کے میدان میں نہیں اتاری۔ لڑائی کے کرتبوں اور گُروں سے اتنے بھی واقف نہیں جتنی کہ گھر کی کوئی لڑکی ہو۔ البتہ کتابی باتوں میں بڑے چرب زبان ہیں۔ بڑے بڑے جُبہ پوش ماہران سیاست کی طرح بکواس کرکے سیاسی چالیں اور ترکیبیں بتانے میں استاد ہیں۔ اس پر بھی جناب والا خالی جگہ پر میرا انتخاب نہ ہوا۔ اور میں جسے وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ روڈس اور قبرص میں اور اور بہت سے مقامات کے معرکوں میں نصرانیوں اور غیر نصرانیوں دونوں کے ملکوں میں اپنی جاں بازی اور نبرد آزمائی کا کیسا کیسا ثبوت دے چکا ہوں۔ اس کاسیو کے بیچ میں آجانے سے جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ اس کے حائل ہو جانے سے میری ترقی کی بادبانوں میں ہوا نہ بھر سکی۔ اور اب یہ بہی کھاتے کا آدمی کوئی دن جاتا ہے کہ نائب سپہ سالار کے عہدے پر فائز ہو جائیگا۔ اور خدا بھلا کرے آپ کا میں نشان بردار کا نشان بردار ہی رہا۔ یعنی جس خدمت پر تھا اس سے آگے نہ کھسکا۔

روڈریگو:۔ کاش مجھے اس کے پھانسی دینے کی خدمت ملی ہوتی۔

ایاگو:۔ علاج کچھ نہیں۔ ملازمت پر سب سے بڑی لعنت یہ اتری ہوئی ہے کہ ترقی کا دارو مدار سفارش یا پسند پر رہ گیا ہے۔ وہ پُرانے طریقے اب کہاں کہ مدتِ ملازمت کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ اور ہر نیچے کے آدمی کو اوپر ترقی پانے کا موقع رہتا تھا۔ اس حالت میں جناب خود ہی خیال فرمائیں کہ مجھے اس مراکشی سے اُنس یا تعلق کہاں تک ہو سکتا ہے۔

روڈریگو:۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو کبھی اس کی ماتحتی قبول نہ کرتا۔

ایاگو:۔ یہ بالکل درست ہے، مگر میں بھی اپنے مطلب کا یار بن کر اس کی ماتحتی کر رہا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم سب افسر نہیں ہو سکتے اور نہ سب افسر ایسے ہوتے ہیں جن کی ماتحتی خیر خواہی کے ساتھ کی

جاتی ہو۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض ماتحت اپنے افسر کے سامنے بات بات پر گھٹنے زمین پر ٹیکتے ہیں۔ یہ بدمعاش وہ ہوتے ہیں جو چاپلوسی کرکے اپنی عمر اس طرح برباد کرتے ہیں جیسے کہ ان کے آقا کا گدھا ہو کہ محض دانے گھاس پر ان کی خدمت کرتا ہے۔ اور جب گدھا بڈھا ہوا تو آقا اسے گھر سے نکال باہر کرتا ہے۔ ایسے احمق نوکروں کو تو کوڑے لگانے چاہئیں مگر بعض ماتحت اور ملازم ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی شکل صورت تو ایسی بنا لیتے ہیں کہ گویا خدمت گذاری اور فرماں برداری میں دل و جان سے مصروف ہیں مگر باطن میں وہ اپنی ہی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ آقاؤں کے سامنے صرف ظاہری فرماں برداری کرتے ہیں اور جہاں جیبیں خوب بھر گئیں تو پھر چین کرتے ہیں۔ اور اب سوائے اپنی خدمت کے انھیں دوسرا کام نہیں ہوتا۔ پس یہ ناچیز بھی اپنے تئیں ایسے ہی ملازموں میں سمجھتا ہے۔ اور یہ امر ایسا ہی یقینی ہے جیسا کہ آپ اپنے کو روڈریگو یقین کرتے ہیں۔ اگر میں اس مراکشی کی جگہ ہوتا تو پھر میں اس کی اطاعت میں ایاگو نہ رہتا۔ خدا شاہد ہے کہ آقا کی خدمت یا وفاداری کا خیال میرے دل میں مطلق نہیں ہے۔ جو کچھ خدمت یا اطاعت گذاری کرتا ہوں وہ اپنے ہی مطلب و غرض سے کرتا ہوں کیونکہ جب ظاہری کاموں میں بھی دل کی اصلی اور قدرتی کیفیت ظاہر ہونے لگے تو پھر سمجھئے کہ یہ تو سینہ سے دل نکال کر ہتھیلی پر رکھنا ہوا کہ کوّے آئیں اور نوچ نوچ کر اسے کھا جائیں۔ میں وہ نہیں ہوں کہ جیسا کہ آپ مجھے دیکھتے ہیں۔

روڈریگو:۔ اگر ان سب باتوں میں ایسا ہی کامیاب ہوتا رہا تو پھر یہ موٹے ہونٹوں والا بڑا ہی خوش نصیب رہے گا۔

ایاگو:۔ اس کے باپ کو خبر دینی چاہئے اور اسے ہوشیار کرنا چاہئے کہ وہ اس مراکشی سے بازپرس کرے اور جو خوشی اس وقت اسے نصیب ہوئی ہے اس میں زہر ملایا جائے۔ شہر کے گلی کوچوں میں اسے بدنام کرو۔ لڑکی کے عزیزوں کو بھڑکاؤ۔ اور خواہ یہ مراکشی کیسی ہی خوشگوار آب و ہوا میں رہتا ہو وبا کی مکھیاں بن کر اسے ستاؤ۔ اور پریشان کرو۔ گو اس وقت اس کی خوشی حقیقت میں خوشی ہے لیکن اسے ستانے اور سراسیمہ کرنے کیلئے ایسا سامان پیدا کرو کہ اس کی یہ کُل خوشی کرکری ہو جائے۔

روڈریگو:۔ لیجئے یہی تو اس لڑکی کے باپ کا مکان ہے۔ میں اسے آواز لگاتا ہوں۔

ایاگو:۔ ہاں ضرور اور آواز بھی ایسی بھیانک ہو جیسے کسی آباد شہر میں آگ لگنے کے وقت لوگوں کی زبان سے نکلتی ہے۔

روڈریگو:۔ (چیختا ہے) برابنیتیو۔ برابنیتیو سنتے بھی ہو۔

ایاگو:۔ برابنیتیو۔ برابنیتیو جاگو۔ گھر میں چور گھسے ہیں۔ چور چور چور۔ گھر سے خبردار رہو۔ اپنی بیٹی اور روپیوں کی تھیلیوں سے ہوشیار ہو جاؤ۔ ارے چور۔ چور۔

(برابنیتیو بالاخانہ کی کھڑکی پر نمودار ہوتا ہے)

برابنیتیو:۔ یہ کیسی چیخ پکار ہے۔ بات کیا ہے۔ کچھ کہو بھی

روڈریگو:۔ صاحب آپ کے بال بچے سب گھر میں ہیں؟

ایاگو:۔ آپ کے گھر میں دروازے سب مقفل اور بند ہیں؟

برابنیتیو:۔ آخر یہ سوال کیوں کرتے ہو؟

ایاگو:۔ واللہ جناب لوٹ لئے گئے ہیں۔ اگر غیرت اور شرم ہو تو کپڑے درستی سے پہن کر نیچے آئیے۔ آپ کا دل شق ہو چکا ہے۔ آدھی جان آپ کی نکل چکی ہے اسی لئے کہتا ہوں کہ اٹھئے اور بیدار ہو جئے۔

برابنیتیو:۔ کیوں خیر تو ہے۔ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے۔

روڈریگو:۔ نہایت معزز برابنیتیو آپ میری آواز کو پہچانتے ہوں گے۔

برابنیتیو:۔ نہیں میں نہیں پہچانتا۔ تم کون ہو؟

روڈریگو:۔ میرا نام روڈریگو ہے

برابنیتیو:۔ تو پھر آپ کا آنا اور بھی نامبارک ہوا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میرے دروازے پر آپ کا کچھ کام نہیں۔ میں آپ سے صاف صاف کہہ چکا ہوں کہ میری بیٹی آپ کے لئے نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے اور شراب چڑھا کر پاگل بنے ہو۔ اور اسی جلن میں بہادر بن کر میری نیند میں خلل ڈالنے آئے ہو۔

روڈریگو:۔ واہ جناب واہ!

برابنیتیو:۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا منصب اور مرتبہ ایسا ہے کہ تمھاری ان حرکتوں کی سزا میں تمھاری زندگی تلخ کر سکتا ہوں۔

روڈریگو:۔ حضور ذرا صبر و تحمل سے کام لیں۔

برابنیتیو:۔ تم کہتے ہو کہ میں لٹ گیا۔ یہ وینس کا شہر ہے اور میرا گھر کسی ویران مقام کا کھلیان نہیں ہے۔

روڈریگو:۔ معزز اور بہادر برابنیتیو میں تو حضور کے پاس بالکل

نیک نیتی اور ایمانداری سے حاضر ہوا ہوں۔

ایاگو: والله آپ تو ان بزرگوں میں ہیں کہ اگر شیطان کہے کہ خدا کی بندگی کرو تو آپ ہرگز نہ کریں۔

برابنتیو: اور تم شیطان ہو۔

ایاگو: اور حضور مجلس سیاست کے رکن ہیں۔

برابنتیو: اس گستاخی کا تمھیں جواب دینا ہوگا۔ روڈریگو میں تمھیں خوب جانتا ہوں۔

روڈریگو: جناب والا میں تو ہر بات کا جواب دینے کو تیار ہوں۔ اور نہایت عاجزی سے گذارش کرتا ہوں کہ اگر آپ نے اپنی مرضی اور خوشی سے اجازت دی (اور معلوم ہوتا ہو کہ کسی قدر آپ کی اجازت ضرور تھی) کہ آپ کی بیٹی رات کے ایسے غیر معمولی وقت میں اور ایک غیر معتبر شخص کی نگرانی میں اور وہ بھی ایک ذلیل کشتی چلانے والا ہو جسے مزدوری دی گئی ہے اس نفس پرست مراکشی کے گھر لیجائے تاکہ وہ اس سے بغل گیر ہو۔ اگر آپ کے علم و اجازت سے ایسا ہوا تو بے شک ہم تقصیر وار ہوئے۔ اور اگر آپ کو علم نہیں ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ کسی طرح بھی آپ کی خفگی درست ہوسکتی ہے۔ آپ ہرگز یقین نہ کریں کہ ہم بالکل ہی ناشائستہ ہیں کہ آپ جیسے بزرگ کے ساتھ کوئی گستاخی کر سکتے ہیں۔ آپ کی صاحبزادی اگر آپ نے ان کو اجازت نہیں دی تو پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے سرکشی کی ہے۔ انھوں نے اپنے فرائض منصب اپنے حسن اپنے عقل و ہوش اور اپنی تقدیر کو ایک آوارہ گرد ہرجائی کے ساتھ جو کبھی یہاں ہو کبھی وہاں ہو وابستہ کردیا۔ آپ فوراً تحقیق کرکے اپنا اطمینان کریں۔ اگر وہ اپنے کمرے یا آپ کے گھر میں ہے تو پھر آپ مجھے سپرد عدالت اس بنا پر کرسکتے ہیں کہ کیوں میں نے آپ کو بلا وجہ پریشان کیا۔

برابنتیو: نوکرو! فوراً چقماق سے روشنی کرو۔ اور مجھے ایک شمع دو۔ گھر میں جتنے لوگ رہتے ہیں سب کو یہاں بلاؤ۔ میں نے ابھی ایک خواب دیکھا تھا جس کا مضمون اس واقعہ سے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اپنے اس خواب کا یقین کچھ ایسا دل میں بیٹھا ہے کہ میں سخت پریشان ہوں۔ روشنی لاؤ۔ جلد روشنی لاؤ۔

(چلا جاتا ہے)

ایاگو: خدا حافظ۔ لیجئے میں بھی یہاں سے چلتا ہوں۔ اگر یہاں ٹھیرا تو پھر میرے منصب کے شایاں نہ ہوگا کہ میں اس مراکشی کے خلاف گواہی دینے کیلئے حاضر کیا جاؤں۔ ریاست کا حال مجھ پر خوب روشن ہے۔ بہرکیف جو کچھ ہوا ہے ممکن ہے کہ اس سے مراکشی کی قدرے بدنامی ہو۔ مگر یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ریاست اسے برطرف کردے۔ کیونکہ ایک شدید ضرورت کی بنا پر اسی جہاز پر سوار ہوکر قبرص پہنچنا ہے۔ لڑائی شروع ہوگئی اور ریاست کے پاس اس مراکشی کے برابر لائق کوئی دوسرا سپہ سالار موجود نہیں ہے کہ اس مشکل وقت میں ریاست کے کام آسکے۔ اس وجہ سے اور بھی اس مراکشی سے مجھے جلن پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ نفرت ایسی ہے کہ دوزخ کا درد و عذاب بھی اس تکلیف کی برابری نہیں کرسکتا لیکن حالت موجودہ میں مراکشی کے ساتھ کوئی علامت خلوص کی بھی ظاہر کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ محض دکھاوے کی بات ہوگی۔ جو آدمی اسے اس وقت تلاش کرنے نکلیں گے وہ ساگی تری کی سرائے میں اسے ڈھونڈھنے ضرور آئیں گے۔ اور میں بھی وہیں موجود ہوں گا۔ اچھا رخصت۔

(چلا جاتا ہے)

(نیچے برابنتیو اور اس کے نوکر مشعلیں لئے آتے ہیں)

برابنتیو: یہ بات بالکل سچ ہے کہ میری بیٹی گھر سے نکل گئی۔ اور میری جتنی زندگی باقی تھی وہ تلخ کرگئی۔ اچھا روڈریگو بتاؤ تم نے میری بیٹی کو کہاں دیکھا تھا۔ اری بدنصیب بیٹی! کیا تم نے اس مراکشی کے ساتھ دیکھا تھا جو عمر میں اس کے باپ کے برابر ہے۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ وہاں میری بیٹی بھی تھی۔ ہائے اس نے مجھے ایسا دھوکا دیا ہے کہ جس کا خیال تک کبھی دل میں نہ آسکتا تھا۔ اس سے تم نے کچھ بات کی تھی۔ مشعلیں اور لاؤ۔ میرے سب عزیزوں کو بیدار کرو۔ کیا تمھارا خیال ہے کہ دونوں نے شادی کرلی؟

روڈریگو: میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

برابنتیو: خدایا وہ گھر سے کیونکر نکل گئی۔ افسوس جب اپنا ہی گوشت پوست اور اپنے ہی خون میں اتنی سرکشی ہو تو پھر کیا علاج ہوسکتا ہے۔ ارے باپو تمھاری بیٹیاں جو کچھ ظاہر میں کریں اس سے یہ نہ سمجھو کہ باطن میں بھی ان کا یہی حال ہے۔ کیا کوئی منتر کوئی جادو ایسا نہیں ہے جو جوانی اور کنوارپنے کو گمراہ کرے۔ روڈریگو کیا تم نے کسی کتاب میں ایسا جادو اور منتر نہیں پڑھا؟

روڈریگو: جی ہاں پڑھا ہے۔

برابنتیو: میرے بھائی کو بلاؤ۔ کسی طرح اسے تلاش کرو۔ کوئی

اِدھر جاؤ کوئی اُدھر جاؤ اُسے ڈھونڈھ کر کسی طرح لاؤ۔ تمھیں کچھ معلوم ہے کہ یہ دونوں کہاں مل سکتے ہیں؟

روڈریگو:۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان دونوں کو گرفتار کرا سکتا ہوں مگر چند سپاہی ہونے چاہئیں جو میرے ساتھ چلیں۔

برابینتیو:۔ اچھا تو آگے چلو۔ ہر گھر پر میں آواز لگاتا چلوں گا۔ اور یہاں بہت سے گھر ایسے ہیں جہاں میرا حکم مانا جاتا ہے۔ کچھ ہتھیار ساتھ لو اور خاص خاص پاسبانوں کو بھی ساتھ چلنے کو کہو۔ روڈریگو! میں تمھاری اس تکلیف کا بدل کر دوں گا۔

(چلے جاتے ہیں)

دُوسرا منظر

شہر کی ایک اور گلی

(اوتھیلو، ایاگو اور چند نوکر مشعلیں لئے آتے ہیں)

ایاگو:۔ گو لڑائی میں میں نے آدمیوں کو قتل کیا ہے۔ لیکن وہ چیز جسے ایمان یا ضمیر کہتے ہیں دیدہ و دانستہ کسی کا خون کرنا گوارا نہیں کرتا۔ طبیعت میں اس وقت وہ ظلم پسندی اور جفاکاری نہیں پاتا جس سے کبھی کبھی اپنا کام نکالا کرتا ہوں۔ کئی بار خیال آیا کہ اُس موذی کی پسلیوں میں چھُری بھونک دوں۔

اوتھیلو:۔ نہیں۔ جو حالت اس وقت ہے وہی بہتر ہے۔

ایاگو:۔ حضور اس نے اتنی ہتک کی ہے اور حضور کی نسبت ایسے ایسے سخت اور اشتعال انگیز جملے زبان سے نکالے ہیں کہ یہ محض خدا کا خوف تھا جتنا بھی میرے دل میں ہو جس کی وجہ سے نہایت مشکل سے میں نے اپنی طبیعت کو روکا لیکن حضور یہ تو فرمائیے کہ حضور کی شادی باضابطہ طریقے سے ہو گئی یا کچھ کسر رہ گئی۔ اس طرف سے جناب کو قطعی اطمینان ہے یا نہیں۔ برابینتیو کا لوگ بہت خیال اور لحاظ کرتے ہیں۔ اور مجلس سیاست میں بھی اس کی رائے حضور کی رائے سے دوچند وقعت رکھتی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ برابینتیو آپ کی اس شادی کو منسوخ کرا دے تو پھر قانونی طور پر وہ آزاد ہو گا کہ جیسی جی چاہے قیدیں اور تکلیفیں آپ کو پہنچائے۔

اوتھیلو:۔ جب عداوت ہی ٹھہری تو اس کا جو جی چاہے سو کرے۔ میں نے جو خدمتیں ریاست کی کی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اس کی شکایتیں کو نہ چلنے دیں گی۔ ابھی تک میرا حال کسی پر ظاہر نہیں ہے۔ جب میں سمجھوں گا کہ خودستائی موجب عزت ہوتی ہے تو میں بھی لوگوں پر ظاہر کروں گا کہ میں ان اسلاف کی اولاد سے ہوں جو کسی زمانہ میں بادشاہی کرتے تھے۔ اور جب لوگوں پر میری عالی نسبی کا حال کھلے گا تو پھر جو جلیل القدر منصب اس وقت میں رکھتا ہوں اس کا مستحق ہونا سب پر ثابت ہو جائیگا۔ ایاگو تمھیں یہ بات معلوم رہنی چاہیے کہ یہ محض ڈسڈیمونہ کا عشق تھا کہ شادی کر کے میں نے اپنی آزاد حالت پر جس میں نہ ڈر رکھتا تھا نہ گھر طرح طرح کی قیدیں لگا دیں۔ اگر یہ عشق نہ ہوتا تو سمندر کی تہ میں جو زر و جواہر بکھرے پڑے ہیں اگر کوئی مجھے پیش کرتا تب بھی میں اپنی آزادی میں خلل نہ ڈالتا۔ مگر دیکھو تو یہ روشنی کیسی ہے۔

ایاگو:۔ یہ تو اس کا باپ اور اس کے عزیز ہیں جو اُسے ڈھونڈھنے نکلے ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ اندر چلے جائیں۔

اوتھیلو:۔ میں کسی سے چھپنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میری لیاقت۔ میرا منصب یہاں تک کہ میری روح رواں جیسا کچھ کہ میں ہوں مجھے ظاہر کریں گی۔ کیا یہ وہی لوگ ہیں؟

ایاگو:۔ واللہ معلوم تو وہی ہوتے ہیں۔ مگر یہ تو کاسیو اور ریاست کے خاص خاص افسر مشعلیں لئے آ رہے ہیں۔

اوتھیلو:۔ یہ تو میرا نائب اور ڈیوک کے ملازم ہیں۔ دوستو سب کو سلام۔ کیا خبر ہے؟

کاسیو:۔ ڈیوک نے حضور کو سلام کہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ اسی وقت ان سے ملاقات کریں دیر مطلق نہ ہو۔

ایاگو:۔ ممکن ہے کہ قبرص سے کوئی خبر آئی ہو۔ بہر کیف کوئی نہ کوئی کام سخت عجلت کا درپیش ہے۔ جنگی جہازوں سے بھی قاصد بار بار ایک کے پیچھے ایک آتے رہے ہیں۔ اور بہت سے قنصل بھی مجلس میں شرکت کیلئے ڈیوک کے ہاں وارد ہیں۔ آپ کو بھی ڈیوک نے فوراً طلب کیا تھا جب آپ اپنے مکان پر نہ ملے تو مجلس نے تین قاصد خاص طور پر آپ کی تلاش میں بھیجے۔

اوتھیلو:۔ اچھا ہوا کہ میں تمھیں مل گیا۔ ذرا توقف کرو۔ اپنے گھر میں کچھ کہہ کر ابھی آتا ہوں۔ اور پھر تمھارے ساتھ چلوں گا۔

(اوتھیلو چلا جاتا ہے)

کاسیو:۔ کہو ایاگو تمھارا سردار یہاں کیا کرتا رہا؟

ایاگو:۔ واللہ آج تو اس نے ایک بڑا بھاری جہاز مال و دولت سے بھرا گرفتار کیا ہے۔ اگر کوئی قانونی شوشہ نہ نکلا تو پھر چین ہی چین ہیں۔

کاسیو:۔ میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔

ایاگو:۔ اوتھیلو نے شادی کر لی۔

کاسیو:۔ کس سے؟

(اوتھیلو پھر آتا ہے)

ایاگو:۔ لیجئے وہ ہمارے سپہ سالار تشریف لے آئے۔ کیا حضور چلنے کو تیار ہیں؟

اوتھیلو:۔ ہاں میں تمھارے ہمراہ چلتا ہوں۔

کاسیو:۔ لیجئے کچھ اور لوگ بھی آپ کی تلاش میں آ رہے ہیں۔

ایاگو:۔ یہ تو برابنیتیو ہے۔ حضور ذرا ہشیار رہیں۔ یہ لوگ اچھی نیت سے نہیں آئے ہیں۔

(برابنیتیو، روڈریگو اور چند افسر ہتھیار باندھے مشعلیں ہاتھ میں لئے آتے ہیں)

اوتھیلو:۔ تم کون ہو۔ جہاں ہو وہیں ٹھیرو۔

روڈریگو:۔ برابنیتیو دیکھئے حضور یہی وہ مراکشی ہے۔

برابنیتیو:۔ لوگو اسے فوراً گرفتار کرو۔ یہی میرا چور ہے۔

(دونوں طرف سے تلواریں تُنت جاتی ہیں)

ایاگو:۔ روڈریگو اس وقت کی لڑائی میں میرا تمھارا مقابلہ رہے گا۔

اوتھیلو:۔ اپنی تلواریں نیام میں کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ شبنم سے ان کی چمک کم ہو جائے۔ برابنیتیو! آپ تو دوسروں کو اپنی عمر اور بزرگی سے کسی بات پر آمادہ کرتے۔ ہتھیار دکھانے آپ کیلئے مناسب نہ تھے۔

برابنیتیو:۔ ارے بدمعاش چور تو نے میری بیٹی کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ اس جہنمی نے میری بیٹی پر جادو کر دیا ہے۔ جتنے عاقل اور ذی ہوش ہیں ان سب کو میں تیرے خلاف گواہی میں طلب کراؤں گا۔ اور وہ سب یہی کہیں گے کہ تو نے میری بیٹی کو جادو کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ تو اپنے کنوارے پنے میں ایسی نازک ایسی خوش اور زندہ دل شادی سے نفرت رکھنے والی بیٹی تھی کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے مالدار اور وضعدار ں کو بھی قبول نہ کرتی تھی۔ پس کیونکر ممکن تھا کہ وہ باپ کے گھر کو نکل کر دُنیا بھر میں بدنام ہوتی اور تجھ جیسے خبیث اور سیہ رُو کے پاس جا کر پناہ لیتی جہاں سوائے خوف کے کسی طرح کی مسرت اُسے نصیب نہ ہوتی۔ دُنیا میرا انصاف کرے۔ کیا اس شخص نے میری بیٹی پر جادو نہیں کیا۔ کیا کوئی ذی ہوش ایسا ہے جو نہ سمجھتا ہو کہ تو نے اس پر جادو چلایا ہے اور اس کی نوخیز اور نازک جوانی کو ایسے سحر سے غارت کیا ہے جو انسان کے ہوش اور عقل کو گم کر دیتا ہے۔ میں عدالت میں دعویٰ کروں گا کہ جہاں تک انسان کی عقل کو دخل ہے سوائے اس کے دوسری بات نہیں۔ اس پر جادو چلا کر یا کچھ اسے کھلا کر تو نے اُسے اپنا کر لیا۔ پس میں تجھے گرفتار کرتا ہوں اور تجھ پر الزام رکھتا ہوں کہ تو ساری دنیا کو دھوکہ دینے والا آدمی ہے۔ اور تو ایسے اعمال کر کے دوسروں کو گمراہ کرتا ہے جو ممنوع اور جرم سمجھے جاتے ہیں۔ سپاہیو اسے فوراً گرفتار کر لو۔ اور اگر اس نے مقابلہ کیا تو خود نقصان اٹھائیگا۔

اوتھیلو:۔ اپنے ہاتھ مجھ سے دور رکھو۔ اس میں چاہے میرے دوست ہوں چاہے کوئی اور۔ اگر لڑنے کو ہمارا جی چاہے گا تو اس میں کسی کے کہنے یا اشارے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اچھا بتاؤ تم ان الزاموں کا جواب دینے مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو۔

برابنیتیو:۔ قیدخانہ لیجانا چاہتے ہیں۔ اور وہاں اس وقت تک رہنا پڑے گا جب تک کہ مجلس کا دوسرا اجلاس نہ ہو۔ اور اس میں تو اپنی صفائی کیلئے طلب کیا جائے۔

اوتھیلو:۔ اگر میں اس کا کہا کرتا ہوں تو پھر ڈیوک کے حکم کی تعمیل کیونکر کر سکتا ہوں جس کے قاصد میری طلبی کیلئے اس وقت میرے ساتھ ہیں۔ اور کسی سرکاری ضرورت سے وہ مجھے ڈیوک کے پاس لے چلنے کو تیار ہیں۔

پہلا افسر:۔ جی ہاں یہ بالکل درست ہے۔ ڈیوک اس وقت اجلاس پر تشریف رکھتے ہیں اور آپ کو طلب کیا ہے۔

برابنیتیو:۔ رات کا وقت ہے مجلس کا اجلاس ہوتا کیسے ممکن ہے۔ سپاہیو اسے گرفتار کر کے لے چلو۔ میرا معاملہ بھی خفیف نہیں ہے۔ خود ڈیوک اور مجلس کے ارکان جو سب میرے ساتھی ہیں میرے معاملے کو ایسا ہی سمجھیں گے کہ گویا ان کے ساتھ سخت ظلم اور بے انصافی ہوئی ہے۔ کیونکہ اگر ایسے شدید جرائم کا تدارک نہ کیا گیا تو پھر اس ریاست کا انتظام غلاموں اور کافروں کے ہاتھ میں آ جائیگا۔

(سب چلے جاتے ہیں)

تیسرا منظر

مجلس سیاست کے اجلاس کا کمرہ
ڈیوک اور مجلس کے رُکن ایک میز کے گرد بیٹھے ہیں
سرکاری ملازم حاضر ہیں

ڈیوک :- ان خبروں میں اتنا اختلاف ہے کہ کسی ایک خبر کا یقین کرنا مشکل ہے۔

پہلا رکن مجلس :- واقعی اختلاف بہت ہے جو خط میرے پاس آیا ہے اس میں جنگی جہازوں کی تعداد ایک سو سات لکھی ہے۔

ڈیوک :- میرے پاس جو خط آیا ہے اس میں تعداد ایک سو چالیس ہے۔

دوسرا رکن :- اور میرے خط میں بھی تعداد دو سو بیان ہوئی ہے۔ گو جہازوں کی تعداد میں اختلاف ہے مگر یہ ضابطے کی کیفیت ہے جو حالات منکشف کرنے کیلئے بھیجی جاتی ہے۔ ایسی کیفیتوں میں اختلاف ہو جانا بالکل ممکن ہے۔ مگر جس قدر کاغذات آئے ہیں ان سے اتنا ضرور ثابت ہے کہ ترکی بیڑا قبرس کی سمت روانہ ہو گیا ہے۔

ڈیوک :- مجھے آپ کی رائے سے قطعی اتفاق ہے۔ بیانات میں فرق کا ہونا ہمیں دشمن سے محفوظ نہیں کرتا۔ تعداد میں اختلاف ہے اس میں ذرا شبہ نہیں لیکن یہی اختلاف ہمارے لئے اور وجہ خوف ہو جاتا ہے۔

(ایک ملاح کی آواز اندر سے آتی ہے "کوئی ہے کوئی ہے")

پہلا سرہنگ :- معلوم ہوتا ہے کہ جہازی بیڑے کی کوئی خبر آئی ہے۔

(ایک ملاح آتا ہے)

ڈیوک :- کیسے آئے؟

ملاح :- سینیو انجلینو نے خبر دی ہے کہ ترکی بیڑے کا رُخ بجائے قبرس کے اب روڈس کی طرف ہو گیا ہے۔

ڈیوک :- اب فرمائیے ترکی بیڑے نے جو اپنا قصد بدل دیا ہے اس سے کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔

پہلا رکن :- یہ ممکن نہیں۔ عقل اس پر گواہی نہیں دیتی جس وقت ہم سوچتے ہیں کہ ترکوں کے مقاصد کیلئے بجائے روڈس کے قبرس زیادہ کارآمد اور مفید ہے اور اس بات پر بھی غور کرتے ہیں کہ ترکوں کو قبرس سے زیادہ بحث ہے اور ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ قبرس پر دشمن کی مدافعت کا اتنا سامان موجود نہیں ہے جتنا کہ روڈس پر۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ترک اتنے نادان نہیں ہیں کہ جو امر مقدم ہے جس پر عمل کرنے میں زیادہ آسانی اور فائدہ ہے اسے چھوڑ کر ایسے کام میں ہاتھ ڈالیں گے کہ جسمیں سوائے نقصان اور خطروں کے دوسری بات نہیں۔

پہلا سرکاری افسر :- لیجئے اور خبر آئی۔

(ایک قاصد اندر آتا ہے)

قاصد :- معلی و مقتدر ڈیوک! گذارش ہے کہ ترکوں نے اپنا بیڑا روڈس میں پہنچا دیا ہے۔ اور وہیں ایک دوسرا بیڑا جو بعد کو روانہ ہوا تھا اس پہلے بیڑے میں آملا ہے۔

پہلا رکن :- میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ قاصد بھلا تمھارے خیال میں اس دوسرے بیڑے میں کتنے جنگی جہاز ہونگے؟

قاصد :- غالباً تیس ہوں گے۔ اور اب ترک اس مجموعی بیڑے کو لیکر علانیہ قبرس کی طرف حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ قبرس کے حاکم سینی اور مونٹانو نے جو آپ کا نہایت معتبر اور بہادر خادم ہے حضور کو سلام دیگر عرض کیا ہے کہ اس نے جو کچھ اطلاع دی ہے اس کا یقین کیا جائے۔

ڈیوک :- تو پھر یہ امر یقینی ہے کہ قبرس پر فوج کشی کی گئی ہے افسوس مرقس لوکی کاس اس وقت شہر میں نہیں ہے۔

پہلا رکن :- آجکل تو وہ فلارنس میں رہتا ہے۔

ڈیوک :- ہماری طرف سے تحریر کیا جائے کہ فوراً نہایت عجلت سے واپس آئے۔

پہلا رکن :- لیجئے برابنتیو اور بہادر مراکشی بھی آ رہے ہیں۔

(برابنتیو۔ اوتھیلو۔ ایاگو۔ روڈریگو اور سرہنگ آتے ہیں)

ڈیوک :- بہادر اوتھیلو ہم تمھیں فوراً اپنے دشمنوں یعنی ترکوں کے مقابلہ پر مقرر کرتے ہیں۔ (برابنتیو سے مخاطب ہو کر کہتا ہے) اہا برابنتیو میں نے آپ کو تو دیکھا ہی نہ تھا۔ شریف سینیور آپ تشریف لائیں۔ آج شب کو ہمیں آپ کے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے۔

برابنتیو: ۔ اور اسی طرح مجھے آپ کے صلاح و مشورے اور امداد کی ضرورت ہے ۔ معاف فرمائیے گا اس وقت جس چیز نے مجھ سوتے کو بستر سے اٹھایا ہے اس کو نہ میرے منصب سے کوئی تعلق ہے نہ اس مسئلے سے جو اس وقت آپ کے سامنے پیش ہے ۔ اس وقت مجھے محض اس ظلم کا خیال ہے جو مجھ پر ہوا ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ریاست کا کوئی خیال اس وقت میرے دل میں نہیں ہے ۔ کیونکہ جو رنج و الم مجھے اس وقت پہونچا ہے وہ ناقابل برداشت ہے اور باقی جس قدر رنج و آلام ہیں وہ سب اس میں غرق ہو جاتے ہیں ۔ اور وہ غم جیسا تھا ویسا ہی رہتا ہے ۔

ڈیوک: ۔ کیوں کیا بات ہے ؟

برابنتیو: ۔ میری بیٹی ۔ ہائے میری بیٹی !

ڈیوک اور اراکین: ۔ کیوں خیر ہے ۔ کیا گذر گئی ؟

برابنتیو: ۔ ہاں مجھ سے تو اسے مرا ہی سمجھئے ۔ میری سخت بے عزتی اور توہین ہوئی ہے ۔ میرے گھر سے کوئی میری بیٹی کو چرائے گیا ۔ جادو چلا کر اور کچھ اسے کھلا پلا کر خراب کیا ہے ۔ وہ نہ اندھی تھی نہ لنگڑی تھی ۔ نہ اس کے ہوش و حواس میں کوئی فرق تھا ۔ اور نہ اس کی کسی بات میں کوئی نقص آیا تھا ۔ بغیر جادو چلائے ممکن نہ تھا کہ کوئی اس کی فطرت کو گمراہ کر سکتا سوائے جادو کے دوسری بات ممکن نہیں ۔

ڈیوک: ۔ کوئی آدمی بھی ہو جس نے ایسی نامعقول اور ناشائستہ حرکت کی ہے کہ آپ کی بیٹی کو اس کی فطرت سے گمراہ اور آپ کو اس سے جدا کر دیا ہے ۔ ایسے جرم کی سزا کیلئے یہ قانون کی خونی کتاب موجود ہے ۔ اس کی عبارت کو تلخ سے تلخ معانی میں آپ پڑھکر خود مجرم کو سزا دیں ۔ اس میں مجرم خواہ میرا فرزند ہی کیوں نہ ہو ۔

برابنتیو: ۔ میں ڈیوک کا نہایت عجز و انکسار سے منت گذار ہوا ۔ وہ مجرم یہاں موجود ہے ۔ وہ یہی مراکشی ہے جسے کسی ریاست کے کام کے لئے آپ نے طلب فرمایا ہے ۔

ڈیوک اور پہلا رکن: ۔ یہ سن کر ہمیں نہایت افسوس ہوا ۔

ڈیوک: ۔ (اوتھیلو سے مخاطب ہو کر کہتا ہے) اوتھیلو آپ کو اس الزام کے بارے میں کیا کہنا ہے ؟

برابنتیو: ۔ بجز اس کے کہے گا کیا کہ الزام درست ہے ۔

اوتھیلو: ۔ معزز و باوقار متین و واجب التعظیم اراکین مجلس میرے شریف و مہربان آقاؤ ! یہ بات کہ میں اس بڈھے کی بیٹی کو اپنے پاس لے آیا بالکل درست اور صحیح ہے ۔ میں نے اس سے اپنا عقد کر لیا ہے ۔ اور یہ بات ایسی ہے جس سے سب سے بڑا الزام جو مجھ پر عائد کیا گیا ہے اس کی صفائی ہو جاتی ہے ۔ مجھے تقریر کرنی نہیں آتی ۔ زمانہ امن و سلامتی میں جو نرم اور دل گداز تقریریں کی جاتی ہیں میں ان سے قطعی نابلد ہوں ۔ کیونکہ میرے بازو سات برس کی عمر سے لیکر اب نو ماہ کا زمانہ ہوتا ہے اس وقت تک میدان جنگ میں کام کرتے رہے ہیں ۔ ان کا بہترین کام جو کچھ تھا وہ ایسے میدانوں میں تھا جہاں خیمہ و خرگاہ میں لشکر پڑاؤ ڈالے رہتے تھے ۔ دنیا کے حالات کا مجھے بہت کم علم ہے ۔ بجز جنگ و جدل کے میں کسی مضمون پر تقریر نہیں کر سکتا ۔ اس لئے جو کچھ میں کہوں گا اس سے میری بریت یا صفائی اس معاملے میں نہ ہو سکے گی ۔ لیکن پھر بھی اگر اجازت ہوئی تو میں اپنے عشق کی پوری داستان نہایت سیدھے سادے طریقے میں آپ کے سامنے بیان کروں گا جس سے ظاہر ہو گا کہ میں نے کون کونسی برائیاں اور کیسے کیسے جادو اور کیسا زبردست سحر کیا تھا جس کا الزام اب مجھ پر رکھا جاتا ہے کہ ان کے ذریعے سے میں نے اس شخص کی بیٹی کو دھوکہ دیا ۔

برابنتیو: ۔ میری معصوم بن بیاہی بیٹی دو مردوں کے سامنے بیباک نہ تھی ۔ طبیعت کی نہایت شرمیلی اور خاموش تھی ، اور اس کی فطرت ایسی نیک تھی کہ اس کا چہرہ آپ سے آپ شرم سے سرخ ہو جاتا تھا ۔ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا گو وہ کم سن تھی کہ اپنے ملک دوطن اور دین و ایمان کا لحاظ نہ کرتی ۔ اور ایک ایسے شخص سے عشق پیدا کر لیتی جو اس کیلئے خوف و بیم کی ایک چیز تھا ۔ ایسی نیک فطرت کی نسبت یہ خیال کرنا کہ اسے عشق پیدا ہوا ایک خام و ناقص خلاف عقل فیصلہ ہو گا ۔ پس لازم ہے کہ ان جہنمی وجوہ کو تحقیق کیا جائے جو اس حرکت کا موجب ہوئے ۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ کوئی جڑی بوٹی پلا کر یا کسی ایسی چیز سے جس کا اثر جادو کا سا تھا میری بیٹی کو متاثر کیا ۔

ڈیوک: ۔ تاوقتیکہ کوئی مضبوط دلیل نہ پیش کی جائے یہ کمزور خیالات اور ناقص شکوک اس کے خلاف جرم کا ثبوت نہیں ہو سکتے ۔

پہلا رکن: ۔ اوتھیلو جواب دو ۔ کیا تم نے کنایۃً یا جبراً اس

نوجوان لڑکی کے دل میں عشق پیدا کیا یا یہ عشق تمہاری درخواست
پر یا ان شیریں و دلکش باتوں کا نتیجہ ہوا جو عاشق و معشوق میں ہوا
کرتی ہیں۔

اوتھیلو:۔ میری التجا یہ ہے کہ اس لڑکی کو بیٹھی میں طلب کیا جائے
اگر وہ اپنے بیان میں میری نسبت کوئی بری بات کہے تو پھر جو
اعتبار مجھ پر آپ کو ہے اور جو بڑا منصب آپ نے مجھے دے
رکھا ہے اس سے محروم ہی نہ کیا جاؤں بلکہ میرے اس گناہ پر مجھو
سزائے موت دی جائے۔

ڈیوک:۔ ڈسڈیمونہ کو فوراً حاضر کیا جائے۔

اوتھیلو:۔ (ایاگو سے کہتا ہے) میرے نشان بردار تم جاؤ
اسے یہاں لے آؤ۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ میرا مکان کہاں ہے۔

(نوکر اور ایاگو چلے جاتے ہیں)

(اوتھیلو ارکان مجلس سے مخاطب ہوتا ہے)

اور جب تک وہ حاضر ہو میں آپ کے سامنے اسی طرح
جیسے کہ اپنے خدا کے سامنے کچھ کہوں اپنے نسل و خون کی برائیاں
آپ کی سماعت میں نہایت حیرت کے ساتھ لاؤں گا اور بیان کروں گا
کہ اس حسین لڑکی کے عشق نے میرے دل میں اور میرے عشق
نے اس کے دل میں کیونکر جگہ کی۔ کہ آخر کار وہ میری ہو گئی۔

ڈیوک:۔ اوتھیلو! اچھا بیان کرو۔

اوتھیلو:۔ اس لڑکی کا باپ میرے حال پر عنایت کرنے لگا
اور مجھے اپنے گھر بلا کر میری زندگی کے حالات مجھ سے دریافت کرتا
اور اکثر پوچھتا رہتا کہ تم نے اپنی عمر میں کیسی کیسی لڑائیاں، محاصرے اور
معرکے پیش آتے رہے۔ میں نے اپنے کل حالات لڑکپن سے
لیکر اس وقت تک کہ مجھ سے یہ سوال کیا گیا اس کو سنانا شروع
کئے۔ جس قدر صعوبتوں اور مصیبتوں کے اتفاقات خشکی اور تری
میں پیش آئے تھے اور جو جو مصائب و آفات اٹھانے پڑے
تھے کہیں بال بال جان بچی تھی، کہیں دشمن شہر کی دیواروں میں
سرنگ لگا کر داخل ہوا اور وہاں دست بدست لڑائی میں میں
گرفتار ہوا۔ پھر غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا۔ پھر اس غلامی سے کس
طرح آزاد ہوا۔ سیر و سیاحت میں بڑے بڑے غاروں،
لق و دق صحراؤں سنگلاخ کانوں، چٹانوں اور بلند پہاڑوں سو جنکی
چوٹیاں آسمان تک پہونچی تھیں گذر ہوا۔ اور ان سب حالتوں
میں میرا طور طریقہ کیا رہا۔ اس لئے مجھے کہنے پڑے کہ کسطرح
آدم خواروں میں جو ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں۔ اور ایسے
آدمیوں میں جن کے سر شانوں پر لگے ہوتے ہیں میں پہنچا۔
جب میں یہ حالات بیان کرتا ہوتا تو ڈسڈیمونہ میری صورت
دیکھتی رہتی۔ اور جو کچھ میں کہتا اسے غور سے سنتی۔ لیکن قصے
کے بیچ میں خانہ داری کی ضرورتوں سے چلی بھی جاتی۔ اور اپنا
کام جلد ختم کر کے پھر میرے پاس بیٹھ کر جو کچھ میں کہتا ہوتا اسکو
بہت غور اور توجہ سے سنتی۔ جب اس کے شوق کی یہ کیفیت
ہوئی تو ایک موقع پر مجھسے کہا کہ میں اپنی زندگی کی پوری داستان
اسے سناؤں۔ کیونکہ اب تک بیچ میں بار بار اٹھ جانے سے
اس کے کچھ حصے وہ نہیں سن سکی۔ جب اس نے بہت ہی اشتیاق
ظاہر کیا تو میں اپنا قصہ دوہرانے پر راضی ہو گیا۔ اور اب
جب میں اپنی جوانی کے زمانہ کی کوئی مصیبت یا تکلیف بیان
کرتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ جب میں اپنا قصہ
ختم کر چکا تو میری اس تکلیف کی شکر گذاری میں اس نے بہت سی
سرد آہیں بھریں۔ اور قسمیں کھا کر کہنے لگی کہ آپ کی زندگی
نہایت عجیب اور حیرتناک ہے۔ اور سخت حیرت کے ساتھ
اس پر رنج و افسوس بھی ہوتا ہے۔ کبھی کہتی کہ کاش میں اس
قصے کو سنتی ہی نہیں۔ افسوس ہے کہ خدا نے مجھے مرد اور مرد
بھی ایسا جیسے کہ آپ ہیں نہ بنایا۔ اگر کوئی میرا دوست ایسا ہوتا
جس کو مجھ سے الفت ہوتی تو پھر میں اس دوست کو سکھاتی کہ
وہ میری زندگی کی کہانی کس طرح بیان کرے۔ جب اتنا
اشارہ میں نے اس کی طرف سے پایا تو میں بھی اظہار محبت کرنے
لگا۔ اسے مجھ سے محبت ان خطروں اور مصیبتوں کی وجہ سے
ہوئی جو مجھے جھیلنی پڑی تھیں۔ اور مجھے اس سے محبت اس
وجہ سے ہوئی کہ اسے میری مصیبتوں اور تکلیفوں پر رحم
آیا تھا۔ بس یہی سحر یا جادو جو کچھ اسے کہئے تھا۔ جس کا الزام
مجھ پر رکھا جاتا ہے۔ لیجئے وہ خاتون خود تشریف لا رہی ہیں۔
یہ میرے بیان کی تصدیق کریگی۔

(ڈسڈیمونہ، ایاگو اور چند ملازم آتے ہیں)

ڈیوک:۔ یہ قصہ تو ایسا ہے کہ اگر میری بیٹی بھی سنتی تو اس
کا دل بھی پسیج جاتا۔ اچھے برابنشیو آپ اپنی بدقسمتی کو جیسی کچھ بھی
ہے گوارا کیجئے۔ جب تلوار ٹوٹ جاتی ہے تو لڑنے والے خالی
ہاتھوں سے لڑنا پسند نہیں کرتے ——

بلکہ اسی ٹوٹی تلوار سے لڑنا پسند کرتے ہیں۔

برابنیتیو:۔ مہربانی کرکے اس لڑکی کا بیان بھی سن لیا جائے۔ اگر وہ اقرار کریگی کہ اس عاشقی کے قصے میں نصف کی شریک وہ بھی ہے تو پھر وہ بلائیں جو میں اس مرد پر توڑنی چاہتا تھا وہ میرے ہی سر پر ٹوٹیں۔ بھولی اور شریف بیگم اس طرف آئیے۔ آپکی کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ اس معزز مجمع میں آپکی اطاعت و فرمانبرداری کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے۔

وسدیمونہ:۔ میرے شریف باپ اس وقت دو شخص ہیں جن کی اطاعت اور فرماں برداری کا مجھے اظہار کرنا ہے۔ ایک آپ ہیں جو میرے باپ ہیں جنھوں نے مجھے زندگی بخشی، میری تعلیم اور تربیت کی۔ میری زندگی اور تعلیم دونوں مجبور کرتے ہیں کہ آپ کا ادب اور لحاظ کروں۔ آپ میری طرف سے اطاعت اور فرمانبرداری کے مستحق ہیں۔ اور میں ابھی تک آپ کی بیٹی ہوں۔ لیکن میرا شوہر بھی ہے۔ اور جس قدر میری ماں نے اپنے باپ پر آپ کو مرجح سمجھ کر آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی تھی اسی طرح میں اس مراکشی کی جو میرا شوہر اور آقا ہی اطاعت اور فرماں برداری کو اپنا فرض سمجھتی ہوں۔

برابنیتیو:۔ لڑکی بس اب تیرا خدا حافظ ہے۔ ڈیوک میں اس معاملہ سے درگذرا۔ ریاست کا کام شروع کیا جائے۔ میں اب کسی کا باپ نہ بنوں گا۔ کسی دوسرے ہی کے بچے کو متبنٰی کروں گا۔ مراکشی ادھر آؤ۔ میں اپنی بیٹی اب تمھیں خوشی سے دیتا ہوں۔ اگر تم اسے پہلے سے حاصل نہ کر لیتے تو میری یہی خوشی ہوتی کہ میں اسے تم سے علیحدہ رکھوں اور اے میری موتی سی آبدار بیٹی! میری روح اس وقت خوش ہے کہ تیرے سوا اور کوئی میرا بچہ نہیں ہے کہ تیرے اس طرح نکل جانے سے میں اس پر سختی سے قید لگاتا۔ اراکین مجلس میرا معاملہ ختم ہوا۔

ڈیوک:۔ برابنیتیو اس وقت آپ غصے میں یہ باتیں کہہ رہے ہیں لیکن مجھے آپ کے دل کے اندر کا حال معلوم ہے اور مجھے ایک قول نقل کرنے دیجئے جو ان دونوں عاشقوں کے حق میں آپ کو پھر مہربان کر دیگا۔ وہ قول یہ ہے کہ جب کوئی بات ناقابل علاج ہو جاتی ہے تو پھر اس کا رنج کرنا فضول ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں کبھی کی بہترین امیدوں کا انجام بدترین ظاہر ہوتا ہے۔ اور کسی ایسی مصیبت کا غم کرنا جو پیش آچکی ہو ایسا مسلک ہے جو آئندہ کسی نئی تکلیف کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ جب باوجود ہماری کوشش کے تقدیر کوئی چیز ہم سے چھین لیتی ہے تو پھر صبر ہی تقدیر کو منہ چڑاتا ہے۔ جب کوئی آدمی لٹنے کے بعد ہنستا ہے تو لٹیرے کی خوشی میں کچھ کمی ضرور ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ آدمی خود اپنا رہزن بنتا ہے جو بیکار اپنا وقت رنج والم میں ضائع کرے۔

برابنیتیو:۔ تو پھر ترکوں کو بھی چاہئے کہ وہ ہمیں قبرص سے بیدخل کر دیں۔ کیونکہ جب تک ہم ہنستے رہیں گے بیدخلی کوئی نقصان نہ ہوگا۔ آپ کے ان اخلاقی مواعظ کی قدر وہی کر سکتا ہے جسے سوائے اُن مسرتوں کے جو ان باتوں کے سننے سے پیدا ہو سکتی ہیں اور کوئی کام نہ ہو۔ لیکن ایسا آدمی جو ان نصیحتوں اور اپنے رنج والم دونوں کو برداشت کرتا ہے۔ جب اس سے کہا جائے کہ جبرًا اپنے رنج کو صبر سے مٹائے تو پھر یہ نصیحتیں کسی کو شکر کی طرح شیریں اور کسی کو زقوم کی طرح تلخ جیسا کچھ بھی موقع ہو محسوس ہوتی ہیں کیونکہ ان کا مفہوم مشتبہ ہی۔ اصل یہ ہے کہ باتیں، باتیں ہی ہوا کرتی ہیں۔ میں نے نہیں سنا کہ ایک مجروح دل محض کان میں بات ڈالنے سے اچھا ہو گیا ہو۔ اب ان باتوں کو دور کیجئے اور میری گذارش ہی کہ مجلس سرکاری کام کی طرف متوجہ ہو۔

ڈیوک:۔ ترک بڑے زبردست ساز و سامان اور بڑی تیاری سے قبرص کا قصد رکھتے ہیں۔ قبرص میں جو طاقت دشمن کی مدافعت کی ہے اُس سے اتھیلو آپ بہترین طریقے پر واقف ہیں گو اس جزیرے کا موجودہ حاکم بڑا لائق آدمی ہے لیکن عملی خدمتوں کیلئے عوام کی رائے بادشاہ ہوا کرتی ہے اور وہ رائے یہ ہے کہ آپ قبرص کے حاکم بنائے جائیں اور اس مشکل و خطرناک مہم میں مصروف ہو کر اپنی اس خوشی کو کم کریں۔ جو اس شادی سے آپ کو ہوئی ہے۔

اوتھیلو:۔ معزز اراکین مجلس عادت وہ بری بلا ہے جو ایک سپاہی کے سخت اور سنگین بستر کو بھی پروں کی نرم سیج بنا دیتی ہے۔ میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں کہ سختیاں جھیلنے میں مجھے قدرتی لطف ایسا حاصل ہوتا ہے کہ ترکوں سے جو لڑائی ہونے والی ہے اس کا میں ذمہ دار ہونا چاہتا ہوں اور اراکین مجلس

معلّی کے سامنے سر اطاعت خم کر کے عرض کرتا ہوں کہ میری بیوی کے یہاں رہنے کے لئے مکان، وظیفے اور ملازمین کا حسب حیثیت معقول انتظام کر دیا جائے۔

ڈیوک: ۔ نہایت مناسب ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے والد کا مکان سکونت کیلئے اچھا ہوگا۔

برابینیو: ۔ میں یہ بات پسند نہیں کرتا۔

اوتھیلو: ۔ اور نہ مجھے یہ امر گوارا ہو سکتا ہے۔

ڈسڈیمونہ: ۔ اور نہ میں یہ گوارا کر سکتی ہوں کہ وہاں رہکر ہر وقت اپنی صورت سے باپ کے دل میں غصہ پیدا کرتی رہوں اے ڈیوک عالی قدر جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے اسے آپ اپنے گوشِ انصاف پسند اور رعایا پروری سے سنیں۔ میں دُنیا سے ناواقف ہوں۔ حضور اپنے قول و اقرار سے میری آزادی کا ذمہ لیں تاکہ اپنی ناتجربہ کاری کی حالت میں مجھے آپ سے امداد ملتی رہے۔

ڈیوک: ۔ ڈسڈیمونہ تم کیا چاہتی ہو؟

ڈسڈیمونہ: ۔ میں نے اس مراکشی سے عشق اس لئے کیا تھا کہ اس کے ساتھ رہوں گی۔ میرا یہ فعل ایسی سینہ زوری اور ستم کا تھا کہ میں نے اپنی دولت اور اپنی تقدیر کیلئے ایک غیر مستقل حالت پیدا کرلی۔ یہ چیزیں وہ ہیں جو تمام دنیا میں ڈھنڈورہ پیٹتی رہیں گی کہ مراکشی کے ساتھ میری محبت اور الفت مجھے مستحق کرتی ہے کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔ میرے شوہر نے میرا دل ایسا قابو میں کر لیا ہے اور میں نے اپنی روح اور تقدیر کو اس کے شجاعانہ کارناموں اور اس کی شہرت اور ناموری پر ایسا قربان کیا ہے کہ اے بزرگان مجلس اگر مجھے یہاں تنہا چھوڑا گیا تو جس حالت میں میرا شوہر لڑائی پر ہوگا اور میں ایک پروانہ کی مثل حالت امن و عافیت میں بیقرار و مضطر رہوں گی۔ تو جس بات کے لئے میں نے اس سے عشق کیا تھا وہ حاصل نہیں ہوتی۔ اور وہ خدمتیں جو ایک عورت اپنے شوہر کی ادا کرنے کا حق رکھتی ہے وہ مجھ سے چھن جائیں گی۔ اور جس زمانہ میں کہ میرا شوہر یہاں نہ ہوگا وہ زمانہ میرے لئے نہایت تلخ گذرے گا۔ اس کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے۔

اوتھیلو: ۔ اے معزز اراکین مجلس اب آپ اپنی اپنی رائے اس بارے میں ارشاد کریں۔ خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اپنے عیش و آرام اور جوانی کے لذائذ نفس کیلئے جو اب مجھ میں مردہ ہیں ایسی کوئی درخواست آپ سے نہیں کرتا بلکہ اس کی تائید محض اس لئے کرتا ہوں کہ میرے ساتھ رہنے میں میری بیوی کی روح خوش اور تازہ رہے گی۔ اور خدا نہ کرے کہ آپ میں سے کوئی صاحب خیال کریں کہ ایک سخت و دشوار کام کو انجام دینے پر جو بھروسہ اور اعتبار آپ صاحبوں نے مجھ پر رکھا ہے اس میں اس وجہ سے ناکام رہوں گا کہ میری بیوی میرے ساتھ ہوگی۔ نہیں ہرگز نہیں اگر پروں والے خدائے عشق کی پُر لطف مسرّتوں کا انجام یہ ہونیوالا ہے کہ میری عقل و منصبی خدمتوں میں خامی پیدا کرے اور عیش و آرام میری فوجی خدمتوں میں فرق لائے تو پھر میرے سر کا یہ خود لشکر کی عورتوں کیلئے ایک پتیلی کی طرح کام میں لایا جائے اور تمام کمینے اور سفلے میرے دشمن بن کر میری شہرت و ناموری کو داغدار کریں۔

ڈیوک: ۔ یہ ہم تمھاری مرضی اور خوشی پر چھوڑتے ہیں چاہے بیوی کو ساتھ لیجاؤ چاہے یہیں رہنے دو۔ بہرکیف معاملہ سخت عجلت کا ہے۔ اور جلد ہی اس کا تصفیہ ہونا چاہیئے۔

پہلا رُکن: ۔ آج ہی شب کو آپ کو روانہ ہو جانا چاہیئے۔

اوتھیلو: ۔ نہایت خوشی سے جانے کو تیار ہوں۔

ڈیوک: ۔ کل نو بجے صبح ہم یہاں پھر اجلاس کریں گے۔ اوتھیلو تم روانہ ہو جاؤ اور اپنے کسی ماتحت کو یہاں چھوڑ جاؤ تاکہ ہمارا باتنا اللہ حکم وہ تم تک پہنچا دے اور تمھارے درجے اور تمھارے بارے میں دیگر انعام اعزاز سے بھی تمھیں مطلع کر دے جس کے ہماری رائے میں تم مستحق ہو۔

اوتھیلو: ۔ نہایت مناسب ہے۔ میرا یہ نشان بردار جو نہایت ایمان دار اور معتبر شخص ہے اس کی نگرانی میں اپنی بیوی کو چھوڑتا ہوں۔ اور جو حکم احکام جس قدر میرے جانے کے بعد مجھے بھیجنے چاہئیں وہ بھی اسی کی معرفت مجھ تک پہونچ سکتے ہیں۔

ڈیوک: ۔ اچھا یوں ہی سہی۔ اب رخصت۔ سب کو سلام۔

(ڈیوک برابینیو سے کہتا ہے)

نہایت شریف برانیتیو! اگر نیکی اور راستی میں تمام مسرت بخش اوصاف موجود ہیں تو آپ کا یہ داماد نہایت راستباز اور نیک بخت ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ اس کی جلد کا رنگ سیاہ ہے یا سفید۔

پہلا رکن:۔ بہادر مراکشی تمھیں خدا کے سپرد کیا۔ دیکھو وسدیمونہ سے اچھا برتاؤ رکھنا۔

برانیتیو:۔ مراکشی اس لڑکی کی خبر رکھنا۔ اگر منہ پر آنکھیں رکھتے ہو تو یہ نہ بھولنا کہ وہ اپنے باپ کو دھوکا دے چکی ہے۔ ممکن ہے کہ تمھیں بھی دھوکا دے۔

(ڈیوک اور ارکان مجلس و دیگر افسران سب چلے جاتے ہیں)

اوتھیلو:۔ اس کی ایمان داری اور دیانتداری پر میں اپنی جان کی ضمانت دیتا ہوں۔ ایاگو تم ایمان رکھتے ہو۔ میں اپنی وسدیمونہ کو تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ اور میرے جانے کے بعد تم آرام و آسائش کے ساتھ وقت پر میرے پاس اسے پہونچا دینا۔ وسدیمونہ ادھر آؤ۔ اب ایک گھنٹہ اور ہے کہ عشق و محبت اور کاروبار کی باتیں ہو جائیں۔ اور جو ہدایتیں مجھے کرنی ہیں وہ بھی تم سن لو۔ وقت جتنا بھی ہے اس کی پابندی ضروری ہے۔

(اوتھیلو اور وسدیمونہ چلے جاتے ہیں)

روڈریگو:۔ ایاگو!

ایاگو:۔ اے شریف دل کیا کہتے ہو؟

روڈریگو:۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں ایسے موقع پر کیا کرنا ہے؟

ایاگو:۔ جائیے اور بستر پر پڑ کے سو رہیے۔

روڈریگو:۔ میرا تو ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے۔

ایاگو:۔ اگر تم ڈوب مرے تو پھر مجھ سے کسی بات کی توقع نہ رکھنا ڈوب مرنے کو کیوں جی چاہنے لگا۔ شریف ہو مگر نرے احمق بھی ہو۔

روڈریگو:۔ تکلیف اور اذیت سے جینا واقعی حماقت ہے۔ جب موت ہماری طبیب بنے تو پھر سوائے مر جانے کے علاج کیا ہے۔ اور پھر سوائے موت کے ہم کس چیز کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

ایاگو:۔ یا بے ایمانی تیرا ہی آسرا۔ میں آٹھ اوپر بیس برس سے اس دنیا کو دیکھ رہا ہوں۔ چونکہ نفع و نقصان میں تمیز کر سکتا ہوں اس لئے اس بات کے کہنے سے پہلے کہ میں ایک مشتبہ سی عورت کے عشق میں ڈوب مروں۔ آدمی سے بندر بن جانا پسند کرونگا۔

روڈریگو:۔ بس آپ ہی بتائیں کہ کیا کروں۔ اس کا میں اقرار کرتا ہوں کہ میرے اس عشق نے مجھے بہت ہی ذلیل و خوار کیا ہے۔ مگر اس حالت کو بدلنا میری قدرت میں نہیں ہے۔

ایاگو:۔ قدرت میں نہیں! واہ کیا مہمل بات کہی ہے۔ وہ چیز تو ہم ہی میں موجود ہے جو ہمیں کبھی کچھ دکھائی دیتی ہے کبھی کچھ۔ ہمارے یہ جسم تو ہمارے باغ ہیں۔ اور ہمارے ارادے اور قصد ہی ان باغوں کے باغبان ہیں۔ باغبان چاہے بچھو کا ساگ بوئے اور چاہے تیز پات، کیاریوں سے تنکے اور گھاس نکالے۔ نباتات چاہے ایک قسم کی بوئے چاہے مختلف قسم کے پودے لگائے، چاہے اپنی غفلت سے باغ کو ویران کرے، چاہے اپنی محنت و مشقت سے اُسے پروان چڑھائے۔ غرض یہ تمام اختیارات ہمارے قصد و ارادے کو حاصل ہیں۔ اگر ہماری زندگی میں عقل اور حواس میں اعتدال رکھا گیا ہے تو پھر یہ ہماری طبیعتوں کا کمینہ پن ہوتا ہے جو ہم میں وہ جوش و غضب پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے سخت تباہ کن ہوتے ہیں۔ لیکن فطرت نے ہمیں عقل دی ہے کہ ہم اس سے اپنے ناجائز جوش و جذبات کی حدت کو ٹھنڈا کریں۔ اور اپنے قوائے نفسانی کی جس کی ایک شاخ عشق بھی ہے روک تھام کریں۔ یہ عشق بھی ایک سینہ زور گھوڑے کی طرح ہے جس کے منہ میں دہانہ ہے نہ قرنی۔ غرض انسان کی اشتہاؤں میں عشق بھی ایک آزار ہے۔

روڈریگو:۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

ایاگو:۔ عشق تو محض خون کی ایک مستی ہے جسے ارادہ نے ظاہر کر دیا۔ لعنت بھی بھیجو، آدمی کی جون میں آؤ۔ ڈوب مرنے کی بھی خوب کہی۔ پانی میں تو بلیوں اور کتوں کے اندھے پلوں کو ڈبویا کرتے ہیں۔ میں نے تو تمھاری دوستی کا دم بھرا ہے۔ اور اپنے کو تمھارے ساتھ سخت آہنی بندشوں میں جکڑ لیا ہے۔ میں کبھی تمھارے کام کا آدمی اتنا نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ اس حالت میں ہوں مگر تمھاری جیب میں روپیے کا ہونا ضروری ہے۔ پھر ہمارے ساتھ لڑائی پر چلو۔ کہیں سے ایک لمبی سی ڈاڑھی مانگ لاؤ۔ اسے منہ پر لگا لو۔ کچھ سنتے بھی ہو کیا کہہ رہا ہوں۔ روپیہ جیب میں ہونا نہایت ضروری ہے۔ وسدیمونہ کو اس مراکشی سے ہمیشہ وہ عشق نہیں رہے گا جو اس وقت ہے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ جیب میں روپیہ موجود رہنا چاہیے۔ اور نہ اس مراکشی کا عشق وسدیمونہ کے

ساتھ مدت تک رہے گا۔ جس طرح اس عشق کی ابتدا شور و شغب میں ہوئی ہے اسی طرح اس کا زوال بھی ہوگا۔ تم دیکھو گے کہ ایک دن ایسا ہی آئیگا۔ لیکن روپیہ تمھاری جیب میں ہونا نہایت ضروری ہے۔ مراکشیوں کی طبیعت میں بہت جلد انقلاب پیدا ہوا کرتا ہے۔ جو غذا اس وقت شہد کی طرح مرغوب و لذیذ معلوم ہو رہی ہے کوئی دن جاتا ہے کہ وہ زقوم سے بھی زیادہ تلخ معلوم ہونے لگے گی۔ وہ ضرور کوئی جوان ڈھونڈے گی۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ روپیہ پاس رکھو، پھر اسے اپنی غلطی محسوس ہوگی اور تبدیلی ضروری ہو جائیگی۔ پس نہایت ضروری ہے کہ روپیہ اپنے پاس رکھو۔ اگر مرنے ہی کو جی چاہتا ہے تو پھر درستی سے مرو۔ ڈوب مرنا کیسا۔ جس قدر ممکن ہو روپیہ مہیا کرو۔ اگر ایک غلط کار وحشی اور وینس کی رہنے والی ایک لڑکی باہمی وعدہ کرلیں تو پھر یہ بات میری عقل اور تمام کارکنانِ جہنم کیلئے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ ایک نہ ایک دن تم اس کے مزے لوٹو۔ مگر روپیہ پاس رہے۔ اس ڈوب مرنے کے ارادے پر لعنت بھیجو۔ یہ بالکل بے موقع بات ہوگی۔ اپنے لطف اور مزے کیلئے پھانسی دے لینا زیادہ بہتر ہوگا بجائے اس کے کہ بغیر مزے لوٹے ڈوب مرو۔

روڈریگو:۔ اگر آپ اپنے ارادے میں پکے رہے تو پھر میری امیدوں کا دار و مدار آپ ہی پر ہے۔

ایاگو:۔ میری طرف سے اطمینان رکھو۔ مگر روپیہ کہیں سے مہیا کر رکھو۔ میں تم سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس مراکشی سے عداوت ہے۔ اور اس کی وجہ دل سے پیدا ہوئی ہے اور یہی حال تمھارا ہے۔ پس انتقام کیلئے ہم دونوں کو شریک رہنا چاہیئے۔ اگر تم نے اس مراکشی کی بیوی سے آشنائی کرلی تو پھر تم میری مسرت کیلئے ایک بڑے محب اور بڑا پُر لطف تماشا بن جاؤ گے۔ زمانہ کے بطن سے واقعات مخفی ہیں۔ اور وہ ابھی تک ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ پس چلو لڑائی پر چلیں۔ مگر روپیہ ضرور مہیا رہے۔ اچھا اب رخصت۔ کل پھر اسی مضمون پر گفتگو ہوگی۔

روڈریگو:۔ کل صبح ملاقات کہاں کروں۔

ایاگو:۔ جہاں میں ٹھیرا ہوں۔

روڈریگو:۔ میں ٹھیک وقت پر تم سے ملوں گا۔

ایاگو:۔ اچھا اب جاؤ خدا کو سونپا۔ تم سے روڈریگو کچھ اور بھی کہنا ہے۔

روڈریگو:۔ اور کیا کہتے ہو۔

ایاگو:۔ ڈوب مرنے کی بات چھوڑو۔ سمجھے تم؟

روڈریگو:۔ ہاں میرا بھی اب ارادہ بدل گیا ہے۔ اب تو میں جاکر اپنی زمین فروخت کرتا ہوں۔ (چلا جاتا ہے)

ایاگو:۔ دیکھا آپ نے، اس طرح روپیہ وصول کرنے کیلئے میں دوسروں کو اُلّو بنایا کرتا ہوں۔ کیونکہ جو علم اور تجربہ میں نے مشکل سے حاصل کیا ہے اسے ایک احمق کو دینے میں وقت کا ضائع کرنا اور اس علم اور تجربہ کی قیمت گھٹانا ہوگا۔ مجھے اس مراکشی سے عداوت ہے گو وہ میری نسبت اچھی رائے رکھتا ہے اس وجہ سے میرا مطلب اور بھی آسانی اور خوبی سے نکلے گا۔ کاسیو پہلا شخص ہے جو میری اس تختۂ مشق بننا چاہیے اس کی جگہ حاصل کرنیکے بعد میں اپنی دوگونہ بدمعاشیوں کیلئے اپنی طبیعت کو آمادہ کرونگا۔ پھر بھلا یہ کیونکر؟ ذرا غور کرلینا چاہیئے۔ کچھ دنوں بعد میں اوتھیلو کے کان بھرونگا کہ کاسیو دسدیمونہ کے ساتھ بہت بے تکلف ہوتا جاتا ہے۔ کاسیو ایسی صورت شکل اور اخلاق کا آدمی ہے کہ کسی شوہر کی بیوی بھی ہو وہ اسے آسانی سے گمراہ کرسکتا ہے اور شوہر کو اس کی طرف سے جلد بدگمانی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس کی صورت شکل اچھی ہے اور طبیعت بھی ایسی ہے کہ وہ کسی عورت کو آسانی سے بدراہ کرسکتا ہے۔ مراکشی طبیعت کا صاف آدمی ہے۔ جو دوسروں کی نسبت خیال کرتا ہے کہ وہ حقیقت میں دیانتدار ہیں گو وہ انکی دیانتداری محض ظاہر میں ہوتی ہے اور یہ مراکشی ایسا سیدھا ہے کہ جیسے گدھے کی رسی پکڑ کر جہاں لیجانے کو جی چاہے وہاں اسے آسانی سے لیجایا جاسکتا ہے۔ مجھے جو کچھ سوچنا تھا وہ سوچ لیا ہے۔ اب دوزخ اور اندھیری رات اس عجیب بھوت کو دنیا کی روشنی میں لیوا آئے۔ (چلا جاتا ہے)

جزو ثانی

پہلا منظر

(جزیرہ قبرص کا بندرگاہ اور وہاں ایک کھلی جگہ۔ مونٹانو حاکم قبرص اور دو شریف آتے ہیں)

مونٹانو:۔ کہو کیا راس کے اس گوشہ سے سمندر پر کوئی بادبان آتا دکھائی دیتا ہے؟

پہلا شریف:۔ جی نہیں کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ موج اتنی اونچی اٹھ

رہی ہو کہ سمندر اور آسمان کے نیچے کسی بادبان کا پتہ نہیں۔
مونٹونو:۔ خشکی پر ہوا کا طوفان ایسا سخت ہے کہ شہر پناہ کے کنگورے تک ہلتے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ہوا کا یہی زور سمندر پر بھی ہوا تو کون سا جہاز ہے جو ان پہاڑ جیسی موجوں کے ٹوٹنے سے اپنے چوب بلوط کے مضبوط پہلو سلامت رکھ سکے گا۔ دیکھئے اب کیا خبر سننے میں آتی ہے۔
دوسرا شریف:۔ خبر یہی آئیگی کہ ترکی بیڑا طوفان سے پراگندہ ہوا۔ کیونکہ وہاں نظر آیا تھا جہاں موجوں پر کف اٹھ رہے تھے۔ اور جہاں ہوائے تند کے قہر و عتاب سے موجیں بادلوں سے سر ٹکرا کر پاش پاش ہوتی تھیں۔ اور شیر کی ایال کی طرح بکھر بکھر کر جلتے برج دب (خرس) پر پانی ڈالتی ہیں۔ اور اسی برج کے دو چمکتے تاروں کی روشنیوں کو جو قطب تارے کے دونوں طرف پاسبانی کرتے ہیں گل کر دیتی ہیں، میں نے کبھی پہلے سمندر کی سطح پر ایسا شدید تلاطم نہ دیکھا تھا۔
مونٹونو:۔ ترکی بیڑے کے جہاز اگر کہیں پناہ کی جگہ یا بند خلیج میں نہیں پہونچے ہیں تو وہ کبھی کے غرق ہو گئے ہوں گے۔ ایسے شدید طوفان میں ان کا سلامت رہنا غیر ممکن ہے۔

(ایک تیسرا شریف آتا ہے)

تیسرا شریف:۔ لوگو خبر آئی ہے کہ لڑائی ختم ہوئی۔ اس حق نی طوفان نے ترکی بیڑے کو ایسا ناکارہ کر دیا کہ ترکوں کو اپنا قصد بدلنا پڑا۔ وینس کا ایک جہاز جب قریب سے گذرا تو اس نے دیکھا کہ ترکی بیڑے کا بڑا حصہ تباہ حالت میں تھا۔
مونٹونو:۔ کیا یہ خبر واقعی صحیح ہے۔
تیسرا شریف:۔ دیرونسر نامی جہاز ابھی بندرگاہ میں وارد ہوا ہے اور میکائیل کلاسیو یعنی اوتھیلو مراکشی کا بہادر نائب ابھی جہاز سے اترا ہے۔ اوتھیلو خود ابھی تک سمندر پر ہے۔ اور قبرس پر حکومت کے پورے اختیارات لیکر آرہا ہے۔
مونٹونو:۔ اوتھیلو کے آنے کی خبر سُن کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ واقعی وہ بڑا لائق حاکم ہے۔
تیسرا شریف:۔ کاسیو کو ترکوں کی تباہی پر خوش معلوم ہوتا ہے مگر اس کی نظروں سے فکر و تردد ٹپکتا ہے اور دعائیں مانگ رہا ہے کہ اوتھیلو سمندر پر خیریت سے ہو۔ اور کہتا ہے کہ ہم دونوں کے جہاز سمندر پر ساتھ ساتھ تھے مگر اس سخت طوفان نے ہم دونوں کو جدا کر دیا۔
مونٹونو:۔ آؤ ہم سب بھی خدا سے دعا کریں کہ اوتھیلو سمندر پر صحیح و سلامت رہے۔ میں نے اس کی ماتحتی کی ہے۔ وہ ایک بڑے جنگ آزما کی طرح کار فرمائی کرتا ہے۔ آؤ سمندر کے کنارے چل کھڑے ہوں۔ تاکہ جو جہاز آیا ہے اسے بھی دیکھیں۔ اور اس بہادر اوتھیلو کے انتظار میں اپنی نظر اس طرح جمائیں کہ سمندر اور نیلگوں طبقۂ ہوا دونوں مل جل کر ایک غبار سا معلوم دینے لگیں۔
تیسرا شریف:۔ بہتر ہے چلئے۔ کیونکہ ہر لحظہ کسی نہ کسی جہاز کے آنیکی توقع ہے۔

(کاسیو آتا ہے)

کاسیو:۔ اے جنگ آور جزیرہ قبرس کے بہادرو میں آپ کا شکر گذار ہوا۔ کہ آپ نے ہمارے مراکشی سپہ سالار کا آنا اپنے لئے مبارک سمجھا۔ اے خدا عناصر کی ان بے اعتدالیوں میں تو اسے اپنی امان میں رکھ۔ کیونکہ جس وقت میں اس سے علیحدہ ہوا ہوں تو طوفان بہت ہی تیزی پر تھا۔
مونٹونو:۔ اوتھیلو کا جہاز تو مضبوط ہے نا؟
کاسیو:۔ جہاز نہایت مضبوط لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اور اس کا ناخدا نہایت ہوشیار اور تجربہ کا آدمی ہے۔ میری امید منقطع نہیں ہوئی ہے۔ ہر حال میں خدا سے اچھی امید رکھتا ہوں۔

(شور ہوتا ہے "ایک بادبان ایک بادبان")

ایک چوتھا شریف آتا ہے

چوتھا شریف:۔ شہر آدمیوں سے خالی ہو گیا ہے۔ سب باہر کی پہاڑیوں پر جہاں سے سمندر خوب نظر آتا ہے کھڑے پکارتے ہیں "دیکھو ایک بادبان ادھر آتے ہوئے دیکھا ہے"
کاسیو:۔ اُمید کہتی ہے کہ ہو نہ ہو یہ جہاز ہمارے آقا اوتھیلو کا ہے۔

(توپوں کے چھٹنے کی آواز آتی ہے)

دوسرا شریف:۔ قلعے سے سلامی اتاری جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاز کسی دوست کا ہے۔
کاسیو:۔ اب خدا چاہے تو جلد معلوم ہوگا کہ جہاز سے کون اترا ہے۔
دوسرا شریف:۔ بہتر ہے۔ میں جا کر خبر لاتا ہوں۔

چلا جاتا ہے

مونٹونو:۔ شریف کاسیو یہ تو فرمائیے کہ کیا آپ کے ان سپہ سالار کی شادی ہو چکی ہے؟

کاسیو:۔ نہایت خوش قسمتی سے شادی ہوچکی ہے۔ اور شادی بھی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی ہے جو حسن ورعنائی کا خوش ترین نمونہ ہے۔ شاعروں کا قلم اس کی تعریف میں عاجز ہے۔ اور اس کے اوصاف اتنے اعلیٰ اور ارفع ہیں کہ جس قدر حسین مخلوق دنیا میں پیدا ہوئی ہے اس کے مداح بھی اس کے حسن وجمال کی مداحی میں حیران رہ جاتے ہیں۔

(دوسرا شریف آتا ہے)

فرمائیے جہاز سے کون اترا۔

دوسرا شریف:۔ ایک صاحب ایاگو نامی اترے ہیں۔ اور یہ اوتھیلو کے نشان دار ہیں۔

کاسیو:۔ شکر ہے ان کا سفر خیر وسلامتی سے ختم ہوا۔ طوفان اور طوفانی سمندروں اور تیز وتند پُرشور ہواؤں، سیاہ چٹانوں اور ریت کے ٹیلوں یا جتنے خطرے پانی کے اندر چھپے رہتے ہیں ان سب نے خدا کے حکم سے اپنی مضرتوں کو ترک کیا اور اس معصوم جہاز کی راہ میں وہ مزاحم نہ ہوئے۔ اور اپنے مہلک نتیجوں سے اجتناب کر کے انھوں نے اس نیک بخت اور عفت مآب وسدیمونہ کو بہ سلامتی جان کنارے اتار دیا۔

مونٹانو:۔ وسدیمونہ کون ہیں؟

کاسیو:۔ یہ وہی نیک اور حسین خاتون ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا۔ ہمارے سپہ سالار نے اپنے نشان دار ایاگو کی نگرانی میں انھیں روانہ کیا تھا۔ ایاگو کا جہاز ہمارے اندازہ سے ایک ہفتہ پہلے قبرس پہنچا ہے۔ اے خدا تو اوتھیلو کو بھی اپنے حفظ وامان میں رکھ۔ اور اپنے فضل وکرم سے اس کے بادبانوں پر ایسا دم کر کہ وہ منزل مقصود کی طرف بڑھے۔ اور اپنے بلند سفینے سے اس خلیج کو عزت بخشے۔ اور یہ عاشق صادق دل دھڑکتے حال میں اپنی وسدیمونہ کو گلے لگائے۔ اور ہماری اس وقت کی بجھی ہوئی طبیعتوں کو اجاگر کر کے ان میں پھر جوش اور حدت پیدا کرے اور سب شادکام ہوں۔

(وسدیمونہ، امیلیا، ایاگو، روڈریگو اور ملازمین آتے ہیں)

دیکھئے جہاز کی دولت زمین پر اتر پڑی۔ قبرس کے لوگو، تعظیم دو جھک کر آداب بجالاؤ۔ اس خاتون نیک وحسین کا قدم رنجہ فرمانا ہمارے لئے باعث عزت ہے۔ خدا کی برکتیں ہمیشہ اس پر سایہ کئے رہیں۔

وسدیمونہ:۔ کاسیو! میں تمھاری شکر گذار ہوں۔ یہ تو کہو میرے آقا کی کیا خبر ہے؟

کاسیو:۔ وہ ابھی تک تشریف نہیں لائے ہیں۔ اور بجز اس کے کہ وہ خیریت سے ہیں اور عنقریب وارد ہونیوالے ہیں اور ان کا کچھ حال مجھے نہیں معلوم۔

وسدیمونہ:۔ یہ تو کہئے کہ آپ کا ان کا ساتھ کیسے چھوٹا۔

(آوازیں آتی ہیں "بادبان بادبان")

کاسیو:۔ سمندر کی سخت موجوں اور ہوا کے زور نے ہمیں جدا کر دیا۔ مگر سنئے تو یہ شور وغل کیسا ہے۔ ضرور کوئی جہاز بندرگاہ میں آیا ہے۔ (توپوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ قبرس کی سلامی کے جواب میں جہاز سے توپیں سر ہو رہی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاز کسی دوست کا ہے۔ (ایک شریف سے کہتا ہے) ذرا جا کر خبر تو لائیے۔ (شریف چلا جاتا ہے) ایاگو آپ کا آنا مبارک ہوا۔ اور اے خاتون آپ کا کرم فرمانا بھی ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضور کا شرف حضوری ہمیں حاصل ہوا (ایاگو کی بیوی امیلیا کی طرف کاسیو جھک کر ایاگو سے کہتا ہے) ایاگو میری تعلیم وتربیت کا تقاضہ ہے کہ میں ایک خاتون کی تعظیم وتکریم اس طرح کروں (یہ کہہ کر امیلیا کے لبوں کا بوسہ لیتا ہے)

ایاگو:۔ غنیمت سمجھئے کہ بجائے لبوں کے انھوں نے اپنی زبان پیش نہ کی جس کا تختہ مشق میں رہتا ہوں۔ اگر کہیں آپ پر زبان چلنے لگتی تو پھر آپ کی ساری حقیقت کھل جاتی۔

وسدیمونہ:۔ وہ بیچاری تو کچھ بولتی ہی نہیں۔

ایاگو:۔ نہیں واللہ ان کی زبان تو قینچی سے بھی تیز چلتی ہے بالخصوص اس وقت جبکہ مجھے نیند آنے لگے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ حضور کے سامنے انھوں نے اپنی زبان دل میں چھپا کر رکھ لی ہے۔ اور اسوقت وہی زبان دل میں جس قدر خیالات آرہے ہیں ان پہ لعنت ملامت کرنے میں مصروف ہے۔

امیلیا:۔ تمھیں تو یہ کہنا زیبا نہیں۔

ایاگو:۔ ہاں ہاں کچھ بولو تو۔ تم تو وہ ہو کہ جب گھر سے باہر آتی ہو تو گیا کوئی نقاش اپنی تصویر میں رنگ بھر لگا جیسا کہ تم اپنے چہرے کو رنگتی ہو۔ گھر کے اندر تو تمھاری آواز ایسی کو نجتی ہے جیسے گھنٹیاں بجیں۔ اور اگر باورچیخانے میں ہوئیں تو بلیوں کی طرح لڑتی سنائی دیتی ہو۔ جب دوسروں کو آزار پہنچانے پر تلتی ہو تو فرشتوں کی طرح

نیک اور پارسا بن جاتی ہو۔ مگر جب تمھیں کوئی تکلیف پہنچائے تو شیطان سے کم نہیں رہتیں۔ گھر کے کام کاج میں دن بھر کھیل کود میں گذرتا ہے رات کو بستر پر البتہ چڑیل بن جاتی ہو۔

وسدیمونہ:۔ ارے عورتوں کے بُرا کہنے والے ذرا تو جی میں شرما۔

ایاگو:۔ نہیں واللہ جو کچھ کہتا ہوں سچ کہتا ہوں۔ اگر سچ نہ ہو تو کافر۔ جب صبح بیدار ہوتی ہیں تو کھیلنے کودنے کیلئے۔ مگر جب سونے لگتی ہیں تو کام کی سوجھتی ہے۔

امیلیا:۔ آپ کو میری تعریف میں شاعری کرنی تو ہے نہیں۔

ایاگو:۔ درست ہے۔ مطلق نہیں۔

وسدیمونہ:۔ ایاگو اگر تمھیں میری تعریف لکھنی پڑے تو خدا جانے کیا لکھو۔

ایاگو:۔ حضور یہ کام مجھ سے نہ لیں۔ کیونکہ اگر میرے شعر میں اعتراض اور عیب چینی نہ ہو تو پھر وہ کچھ نہیں۔

وسدیمونہ:۔ نہیں کچھ کہنے کی کوشش تو کرو۔ کیا کوئی بندرگاہ کی طرف گیا ہے؟

ایاگو:۔ ہاں حضور گیا ہے۔

وسدیمونہ:۔ اس وقت میرا جی اُداس ہے۔ اس اُداسی کو دور کرنے کیلئے باتوں سے ذرا جی بہلا رہی ہوں۔ ہاں ایاگو تم میری تعریف میں کیا شعر لکھو گے؟

ایاگو:۔ میں بھی اسی فکر میں ہوں مگر میرے شاعرانہ خیالات میرے دماغ سے اس طرح چھٹتے ہیں جیسے لاسے سے چپکا ہوا کپڑا چھڑایا جائے۔ اور اس کے ساتھ دماغ کے ٹکڑے بھی لگے رہیں میرا کمال شاعری اس وقت دردِ زہ میں ہے۔ اور جو کچھ اس سے پیدا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی عورت گورے رنگ کے ساتھ عقل بھی رکھتی ہے تو گورا رنگ استعمال کیلئے ہوتا اور عقل اس کا استعمال بتانے کیلئے ہوتی ہے۔

وسدیمونہ:۔ تعریف تو معقول کی۔ لیکن اگر کالی ہوئی اور ہوشیار بھی تو؟

ایاگو:۔ اگر وہ کالی ہے اور اسکے ساتھ ہوشیار بھی ہے تو پھر اسے کوئی گورا عاشق مل جائیگا جو اس کی کلونس کو پسند کریگا۔

وسدیمونہ:۔ واہ وا تم تو بد سے بدتر ہو چلے۔

امیلیا:۔ اگر گورے رنگ کے ساتھ بیوقوف بھی ہوئی؟

ایاگو:۔ گوری کبھی بیوقوف نہیں ہوا کرتی۔ کیونکہ اس کا گوراپن اسے ایک بچے کی ماں بنا سکتا ہے۔

وسدیمونہ:۔ یہ باتیں تو ایسی حماقت کی ہیں جن پر شراب خانوں میں شرابی بیٹھے سُن سُن کر ہنسا کرتے ہیں۔ اب یہ کہو کہ جو غریب بدصورت بھی ہو اور بیوقوف بھی اس کی تعریف تم کس طرح کروگے۔

ایاگو:۔ کوئی بدصورت اور بیوقوف ایسی نہیں ہے جو خوبصورت اور عقلمند کی طرح بُری حرکتیں نہ کرتی ہو۔

وسدیمونہ:۔ ارے خدا اس حماقت اور لاعلمی کی کوئی حد بھی ہے۔ بُروں کی تعریف بھلوں سے زیادہ کرتے ہو۔ لیکن اگر واقعی کوئی عورت لائق ہو تو اس کی تعریف میں تم کیا کہو گے۔ یعنی ایسی عورت جو اپنی خوبیوں اور نیکیوں کی وجہ سے حسد اور کینے کی بُری زبان کو بھی اپنے اوصافِ حمیدہ پر گواہ کرے۔

ایاگو:۔ وہ عورت جو حُسن رکھتی ہے مگر مغرور نہیں، زبان رکھتی ہے کہ جب چاہے اس سے کام لے مگر قینچی چلاتی نہیں، جس کے پاس دولت کی کمی نہیں مگر بنتی سنورتی نہیں۔ خواہشیں رکھتی ہے مگر جب تک موقع نہ ملے انھیں پورا کرنے سے پرہیز کرتی ہے۔ جو باوجود غصّہ رکھنے کے اور انتقام کا موقع حاصل ہونے کے بھی انتقام نہیں لیتی۔ اور غصے کو دل سے دور رکھتی ہے۔ جس میں اتنی عقل ہوتی ہے کہ مچھلی کے سر کی جگہ اس کی دم کو قبول نہ کرے تو پھر ایسی عورت وہ مخلوق ہے جسے خالق نے کبھی مخلوق کیا تھا۔

وسدیمونہ:۔ واہ بات پوری نہ کی۔ یہ نہ کہا کہ ایسی عورت پھر کیا کریگی۔

ایاگو:۔ یہی کریگی کہ چند احمقوں کی پرورش میں مصروف ہوگی اور گھر کا حساب کوڑی کوڑی کا رکھے گی۔

وسدیمونہ:۔ واہ کیا نامعقول نتیجہ نکالا ہے۔ امیلیا گو یہ تمھارے شوہر ہیں مگر تم ان سے کبھی کوئی بات نہ سیکھنا۔ صلاح مشورہ دینے میں یہ بڑے ہی مُنہ پھٹ اور بگڑے ہوئے اخلاق کے آدمی ہیں۔

کاسیو:۔ حضور ایاگو جو کچھ کہتا ہے بات پتے کی ہوتی ہے۔ اگر اسے اجڈ سپاہی سمجھ کر اس کی باتیں سُننے گا تو لطف آئیگا۔ لیکن کسی پڑھے لکھے شائستہ آدمی کی طرح اسے بات کرنی نہیں آتی۔

ایاگو:۔ (علیحدہ کہتا ہے) اچھا کاسیو یہ ہمت۔ وسدیمونہ کا ہاتھ تو پکڑا ہی تھا اب اس سے کانا پھوسی بھی کرنے لگے۔ یہ جال بہت چھوٹا ہے۔ مگر تجھ جیسی زبردست مکھی کو اس میں نہ پھانستا ہو تو بات نہیں

ہاں ہاں اس کی صورت دیکھکر خوب مسکراؤ ۔ تبسم جاری رہے ۔ دیکھنا میں بھی تمھاری ان اداؤں کو کیسا زنجیروں میں کستا ہوں ۔ جو ادائیں اس وقت دکھا رہے ہو سب ٹھیک ہیں ۔ اگر یہی باتیں تمھیں تمھاری نیابت سے محروم نہ کردیں تو پھر میرا نام ایاگو نہیں ۔ اچھا اب ان کی طرف گھور گھور کر اپنی انگلیاں بھی چومنے لگے ۔ واہ کیا خوب حرکتیں ہیں ۔ ان ہی حرکتوں سے آپ اپنے آقا کی بیوی کے عاشق بننا چاہتے ہیں اچھا ۔ ہاں ہاں ۔ اب ان کی طرف دیکھ کر اپنے ہاتھ بھی چومنے لگے ۔ واہ کیا خوب ادب اور تعظیم ہے ۔ واقعی ادب و تعظیم اسی کا نام ہے ۔ اچھا پھر اس کی طرف دیکھکر اپنا ہاتھ ہونٹوں تک لانا شروع کیا ۔ دیکھ لینا یہی ہاتھ کی انگلیاں گندگی کی وہ چیزیں ہو جائیں گی کہ کوئی انھیں منہ تک نہ لائے گا ۔ اس وقت جتنی حرکتیں کر رہے ہو سب درست ہیں ۔

(قرنا کی آواز آتی ہے)

اچھا مراکشی آن پہونچا ۔ اس کے قرنا کی آواز میں پہچانتا ہوں ۔

کاسیو :۔ ہاں واقعی آقا تشریف لا رہے ہیں ۔

وسدیمونہ :۔ آؤ استقبال کیلئے آگے چلیں ۔

کاسیو :۔ لیجیے وہ سامنے ہی تشریف لے آئے ۔

(اوتھیلو اور ملازم آتے ہیں)

اوتھیلو :۔ اے میری حسین لڑنے والی تم خیریت سے پہنچ گئیں ۔

وسدیمونہ :۔ پیارے اوتھیلو ۔

اوتھیلو :۔ یہ دیکھکر بے انتہا مسرت ہوئی کہ تم مجھ سے پہلے یہاں آگئیں ۔ وسدیمونہ ، میری روحانی مسرت ! کاش ہر طوفان و تلاطم کے بعد ایسا ہی سکون اور امن نصیب ہوا کرے ۔ پھر ہوائیں چاہے ایسے زور شور سے چلیں کہ موت بھی ان کے شور سے سوتے سوتے چونک پڑے اور زندگی کا یہ جہاز موجوں کے پہاڑوں پر اتنا اونچا چڑھے کہ اس کی بلندی کوہ اولمپس کے برابر ہو ۔ پھر زندگی کا یہ جہاز اس بلندی سے اتنا نشیب میں اترے جتنا کہ عرش سے طبقۂ جہنم نشیب میں ہے ۔ اے کاش اس وقت موت آجاتی تو بیحد موجب شادمانی ہوتی ۔ کیونکہ اس وقت میری روح کو وہ خوشی اور اطمینان نصیب ہے کہ ایسی خوشی اور ایسا اطمینان شاید ہی تقدیر آئندہ دکھلائے ۔

وسدیمونہ :۔ خدا نہ کرے موت کا کیا ذکر کرنے لگے ۔ خدا سے یہی امید ہے کہ جوں جوں ہماری عمر دراز ہوگی ہماری محبت اور ہمارا عیش و آرام ترقی کرتا جائیگا ۔

اوتھیلو :۔ خدا ایسا ہی کرے ۔ اے مہربان خداؤ جو اطمینان قلب اس وقت مجھے نصیب ہے اسے میں کافی طور پر بیان نہیں کرسکتا ۔ (دل پر ہاتھ رکھکر کہتا ہے) بس اب یہ کچھ آگے نہیں کہنے دیتا ۔ اور اب سوائے ان بوسوں کے (وسدیمونہ کا بوسہ لیتا ہے) اور کوئی چیز ہمارے عشق و محبت میں پیش دستی نہ کرے ۔

ایاگو :۔ (علیحدہ کہتا ہے) اس وقت تو اس ساز خوش آہنگ کے تار خوب کھچے اور سریلے ہیں ۔ لیکن جب میں کھونٹیوں کو مروڑ دونگا تو پھر ان سے وہی بے سُری آوازیں پیدا ہونگی جیسے کہ میں بے سُرا ہوں ۔

اوتھیلو :۔ آؤ وسدیمونہ قصر کو چلیں ۔ دوستو ۔ تمھیں ایک خوشخبری سناتا ہوں اب لڑائی نہ ہوگی ۔ ترک سب ڈوب کر غارت ہو چکے ہیں ۔ میرے پرانے دوست حاکم قبرس مزاج بخیر ۔ وسدیمونا مجھے اپنے ان پرانے دوستوں کی صحبت میں ہمیشہ مسرت حاصل ہوتی ہے تمھاری بھی یہ لوگ بڑی قدر کریں گے ۔ اے میری آرام جان ! وسدیمونہ میں اس وقت خلاف عادت بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا ہوں ۔ اور اپنے عیش و اطمینان کی کیفیت بڑے ذوق و شوق سے زبان پر لا رہا ہوں ۔ ہاں ایاگو ذرا تکلیف کرکے خلیج تک جاؤ اور میرا سامان وہاں سے اتروا لاؤ ۔ اور جہاز کے ناخدا کو بھی قلعہ میں اپنے ساتھ لیتے آنا ۔ یہ بڑا ہی اچھا آدمی ہے اور ایسی خوبیوں کا آدمی ہے کہ خواہ مخواہ اس کی عزت کرنیکو دل چاہتا ہے ۔ آؤ وسدیمونا ساتھ چلو ۔ ایک مرتبہ اور قبرس میں پہنچنے کی تمھیں مبارکباد دیتا ہوں ۔

(وسدیمونا ، اوتھیلو اور ملازمین چلے جاتے ہیں)

ایاگو :۔ روڈریگو تم مجھ سے بندرگاہ میں ابھی ملنا ۔ تم تو بڑی ہمت کے آدمی ہو ۔ ذرا ادھر آؤ ۔ بڑوں کا قول ہے کہ جب کسی کمینے کو عشق ہوتا ہے تو اس کی فطرت میں وہ بات آجاتی ہے جو پہلے اس میں نہ تھی ۔ میری ایک بات سنو ۔ یہ کاسیو نائب آج رات کو وہاں پہرا دیگا ۔ جہاں سپاہ محافظ کے جوان رہتے ہیں ۔ اچھا ۔ پہلی بات جو تم سے کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ وسدیمونہ کو کاسیو سے عشق ہو گیا ہے ۔

روڈریگو :۔ یہ کیونکر ؟ یہ بات قطعی ناممکن ہے ۔

ایاگو :۔ اپنے لبوں پر اس طرح انگلی رکھو اور دل کو یقین دلاؤ کہ شروع میں اوتھیلو کی زبان سے جھوٹے اناپ شناپ قصے

سُن کر زور شور سے عشق پیدا ہوا تھا۔ اب بھی اوتھیلو وہی جھوٹے سچے قصے سناکر اسے اپنی طرف مائل رکھنا چاہتا ہے۔ تو کیا اب بھی وہی نامعقول داستانیں سُن کر وہ اس پر عاشق رہے گی۔ ہرگز یقین نہ رکھنا۔ نظر کو خوش رکھنے کیلئے کچھ نہ کچھ تو ضرور چاہیئے تو پھر اس سیاہ رو خبیث کے دیکھنے میں اُسے کیا لطف آئیگا۔ جب کھیل کود ختم ہو جاتا ہے تو خون ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ پھر خواہش جوش پیدا کرکے نئی اشتہا پیدا کرتی ہے۔ صورت کا اچھا ہونا، عمروں میں زیادہ فرق کا ہونا، غرض وہ تمام خوبیاں جو مراکشی میں ہیں ان سب سے وِسدیمونا کی نازک طبیعت بے لطف ہونے لگے گی۔ بے لطف ہی نہیں بلکہ اس منحوس مراکشی کی صحبت میں اسے اُبکائیاں آنے لگیں گی۔ اور پھر اکی فطرت اس حال میں اس سے کہے گی کہ کسی اور کو تلاش کر۔ اچھا یہاں تک تو تم میری بات مانتے ہو تو پھر سمجھ لو کہ کاسیو سے بہتر آدمی اس کی نگاہ میں دُسرا کون ہو سکتا ہے۔ وہ پکا شیطان اور بڑا لفاظ ہے۔ جس کے دل میں ایمان اتنا بھی نہیں ہے کہ اسکی خواہشیں پوری ہونے سے اُسے روکے۔ اور روک کر اسے اپنا ظاہر شریفوں کا سا نہ بنانے دے۔ یہ کاسیو بڑا ہی ہوشیار اور چوکنا بدمعاش ہے جیسا موقع دیکھے گا ویسا ہی بن جائیگا۔ اور اگر کوئی موقع نہ بھی ملا تو وہ بہتر سے بہتر موقع اپنے مطلب کیلئے خود پیدا کرے گا۔ علاوہ اس کے اس خبیث کاسیو کی صورت بھی اچھی ہے، جوان ہے۔ اور وہ تمام باتیں اس میں موجود ہیں جو کبھی تلاش ایک کچی عقل والی کو اپنے ارمان پورے کرنے کیلئے رہا کرتی ہے۔ یہ پکا شیطان ہے۔ اور اب ایک عورت اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔

رو ڈریگو:۔ میں وِسدیمونا کی نسبت ہرگز ایسا خیال نہیں کر سکتا۔ وہ بہت نیک اور پارسا عورت ہے۔

ایاگو:۔ نیک اور پارسا ہونیکی بھی خوب کہی۔ اجی بالکل معمولی عورت ہے جو شراب سب پیتے ہیں وہی وہ بھی پیتی ہے۔ اور جو باتیں اوروں کی طبیعت میں پیدا ہوتی ہیں وہی اس میں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا تھا کہ جب کاسیو نے اس کا ہاتھ پکڑا تو کس پیار اور اخلاص سے اس کے ہاتھ سے کھیلنے لگی تھی۔ کیا تم نے اتنا بھی نہیں دیکھا۔

رو ڈریگو:۔ ہاں دیکھا تو تھا۔ لیکن وہ تو محض اخلاق اور آداب کی ایک بات تھی۔

ایاگو:۔ اخلاق اور آداب کچھ نہ تھا محض بدمعاشی اور اوباشی تھی اور ناپاک خیالات کی پوشیدہ تمہید یا مخفی دیباچہ تھا۔ دونوں کے لب اتنے قریب آ گئے تھے کہ ایک کا سانس دوسرے کو محسوس ہونے لگا تھا۔ حد درجہ کے پلید خیالات دونوں کے دلوں میں تھے۔ رو ڈریگو جب آپس میں اس طرح کی بے تکلفی و لیل راہ بنے تو صریحاً یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ اس کے بعد کسی سخت گناہ کا بھی ارتکاب ہونیوالا ہو۔ بس تم احمق نہ بنو۔ جو کچھ میں کہوں وہی کرو۔ میں تمہیں وینس سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ آج رات کو جو جو میں کہوں تم دیکھتے رہنا۔ کاسیو سے تم واقف نہیں ہو۔ میں تم سے دُور نہیں رہوں گا۔ تم کوئی بات ایسی کرنا کہ کاسیو کو تم پر غصہ آ جائے یا تو غصے کی آواز میں باتیں کرنے لگنا یا کوئی بات ایسی کہنا جس سے کاسیو کی کارگزاری یا کارفرمائی پر حرف آتا ہو۔ یا اس سے بھی بڑھکر کوئی بات جو وقت پر سوجھے کرنا۔ کاسیو کو غصہ جلد آ جاتا ہے۔ اسے غصہ دلانا اور پھر میں اسی سیدھی سادی بات سے قبرس میں غدر ڈلوا دوں گا اور کاسیو کا غصہ اس وقت تک ٹھنڈا نہ ہوگا جب تک اس قلعہ میں اپنی ملازمت سے برطرف ہونیکا حکم نہ سُن لیگا۔ پھر تمہیں اپنی منزل مقصود پر پہونچنے کیلئے پاس کا راستہ مل جائیگا۔ اور اس کیلئے میں اور ترکیبیں بھی نکالوں گا۔ اور جو رکاوٹیں اس راہ میں حائل ہونگی ان کو اس طرح دور کر دوں گا کہ تمہارا ہی فائدہ نکلے۔ بغیر ان باتوں کے اس کام میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

رو ڈریگو:۔ اگر موقع مناسب ملا تو جیسا آپ نے فرمایا ہے وہی کروں گا۔

ایاگو:۔ قلعے میں ضرور ملنا۔ میں اوتھیلو کا سامان ساحل سے لاکر اسے دیتا ہوں۔ اچھا رو ڈریگو خدا حافظ۔

(چلا جاتا ہے)

مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ کاسیو کو وِسدیمونہ سے عشق ہو گیا ہے۔ اور وِسدیمونہ بھی کاسیو کو چاہنے لگی ہے۔ غالباً واقعہ یہی ہے اور ایسا یقین کرنا بالکل درست ہے گو مراکشی کو میں اپنی ذاتی عداوت کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا لیکن یہ جو کچھ بھی ہو اس کی فطرت وِسدیمونہ کے عشق و محبت سے لبریز ہے۔ اوتھیلو کی محبت شریفانہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وِسدیمونہ کا وہ نہایت وفادار شوہر ثابت ہوگا۔ یوں تو مجھے بھی وِسدیمونا سے

محبّت ہے جس میں کوئی ناپاک خیال شامل نہیں ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ ایسے گناہ سے کہیں بڑھکر گناہ میں کرچکا ہوں مگر میری ان حرکتوں میں کوئی خیال انتقام کشی کا نہیں ہے۔ گو اس نفس پرست اوتھیلو نے میری بیوی کی نظروں میں میری جگہ لے رکھی ہے اور یہ خیال ایک سمِ قاتل کی طرح میرے کلیجے کو چبائے ڈالتا ہے اور اس وقت تک مجھے صبر نہ آئیگا جب تک کہ اس کا اور میرا حساب برابر نہ ہوے گا۔ یعنی جورو کے بدلے جورو کا مضمون نہ ہوجائیگا اس وقت تک میں آرام سے نہ بیٹھوں گا۔ اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر میں اس مراکشی کی طبیعت میں وہ رشک و حسد پیدا کروں گا جسے عقل و دانائی بھی دُور نہ کرسکے گی۔ اب مجھے دو باتیں کرنی ہیں۔ اول تو یہ کہ وینس کے اس ذلیل کتے کے گلے میں جو وسدیمونہ کے شکار میں بہت تیزی دکھا رہا ہے ایک بوجھ ایسا باندھ دوں کہ وہ تیز نہ دوڑ سکے۔ دوسرے اسے اس بات پر آمادہ کردوں کہ وہ کاسیو سے کسی طرح لڑ پڑے۔ اور مراکشی کی نگاہوں میں کاسیو ایک نہایت مکروہ جرم کا تقصیروار ٹھیرے۔ کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کاسیو بھی میری بیوی سے ملوث ہوچکا ہے اور یہ سب کام میں اس طرح انجام دوں گا کہ مراکشی میرا شکرگذار رہے گا۔ میرا احسان مان کر مجھے انعام کا مستحق سمجھے گا۔ پھر میں اسے اچھی طرح گدھا بنا کر اس کے اطمینان اور سکونِ قلب میں خلل ڈالونگا بلکہ اسے پورا پاگل بنا دوں گا۔ بدمعاشی اور بدطینتی کا چہرہ اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک یہ چیزیں اپنا عمل نہ شروع کریں۔

دوسرا منظر

قبرس کی ایک گلی!

ایک منادآتا ہے اور منادی کرتا ہے۔ بہت سے آدمی اس کے پیچھے ہیں!

منّاد:۔ ہمارے سپہ سالار کے پاس اچھی خبر آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی بیڑا غارت ہوا۔ اور اس خوشی میں حکم دیا گیا ہے کہ قبرس کے سب رہنے والے خوشی منائیں۔ کوئی ناچے، کوئی اونچے مقامات پر آگ روشن کرے۔ جسے جو کھیل تماشے مرغوب ہوں ان سے لطف اندوز ہو۔ کیونکہ علاوہ اس خوش خبری کے یہ جشن سپہ سالار کی شادی کی وجہ سے بھی منایا جاتا ہے۔ پانچ بجے سے گیارہ بجے تک جس طرح چاہیں ضیافت کے جلسے کریں۔ خدا ہمارے اس جزیرے اور ہمارے سپہ سالار کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

تیسرا منظر

قصر میں ایک بڑا کمرہ

اوتھیلو، وسدیمونہ، کاسیو اور ملازم آتے ہیں

اوتھیلو:۔ کاسیو! آج شب کو تم سپاہ محافظ کی نگرانی پر رہنا۔ موقع خوشی کا ہے۔ لوگوں میں کسی قسم کی بدتمیزی یا ہنگامہ نہ ہونے پائے۔

کاسیو:۔ حضور نے ایاگو کو بھی تو یہی ہدایت کی ہے۔ لیکن باوجود اس کے میں خود حاضر رہکر تعمیل ارشاد کروں گا۔ اور خیال رکھوں گا کہ اس جشن تہنیت میں کوئی بے اعتدالی نہ ہو۔

اوتھیلو:۔ ایاگو بڑے بھروسے کا آدمی ہے۔ اچھا کاسیو! شب بخیر۔ کل صبح ہوتے ہی تم مجھ سے ملنا۔ مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ (وسدیمونہ سے کہتا ہے)

آؤ پیاری ساتھ چلیں۔ اچھا سب کو سلام۔

(اوتھیلو، وسدیمونہ اور ملازمین چلے جاتے ہیں)

(ایاگو آتا ہے)

کاسیو:۔ ایاگو آؤ جشن میں لوگوں کی نگرانی کیلئے چلنا ہے۔

ایاگو:۔ ابھی سے جانیکی ضرورت نہیں۔ ابھی تو دس بھی نہیں بجے ہیں۔ ہمارے سالار نے وسدیمونہ کی محبّت کی وجہ سے ہمیں جلد رخصت کردیا۔

کاسیو:۔ وسدیمونہ تو نہایت ہی حسین اور لائق خاتون ہیں۔

ایاگو:۔ اور میں کہتا ہوں کہ طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی بہت ہے۔

کاسیو:۔ تر و تازگی اور نزاکت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

ایاگو:۔ نظر میں وہ شوخی اور فتنہ زائی ہے کہ دیکھتے ہی دنیا بھر کی لذتوں کی طرف طبیعت مائل ہوجاتی ہے۔

کاسیو:۔ نظر دل فریب ہے مگر شرم و حیا کے ساتھ۔

ایاگو:۔ جب بات کرتی ہے تو عشق و محبّت کے بیدار کرنیکا جرس بن جاتی ہے۔

کاسیو:۔ تمام خوبیوں میں کامل ہے۔

ایاگو:۔ آؤ کاسیو ہمارے ہاں ایک پورا پیمانہ شراب کا بھرا رکھا ہے اور قبرس کے چند جوان بھی موجود ہیں جو سیاہ فام اوتھیلو کا

جامِ صحت پینے کو تیار ہیں۔

کاسیو:۔ ایاگو مجھے تو شراب سے معاف رکھو۔ بے کشی میں میرا دماغ بڑے پینے والوں کی سی طاقت نہیں رکھتا۔ میں تو سوچا کرتا ہوں کہ جشن اور تہنیت کے موقعوں پر شراب کو چھوڑ کر کوئی اور ذریعہ خوش رہنے کا پیدا ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔

ایاگو:۔ یہ قبرسی جوان تو اپنے ہی دوست ہیں اور شراب کا ایک پیالا تو میں تمھارے حصے کا ضرور پیوں گا۔

کاسیو:۔ آج ہی شب کو ایک پیالا شراب کا بہت سا پانی ملا کر پی چکا ہوں۔ اور دیکھئے (سر پکڑ کر کہتا ہے) اس نے میرا کیا درجہ کیا ہے۔ اسے میری بدنصیبی سمجھئے کہ میں شراب زیادہ نہیں پی سکتا اور اب آپ زیادہ پینے پر مجھے مجبور نہ کریں۔

ایاگو:۔ واہ واہ آج تو خوشی کی رات ہے اور قبرسی جوان بھی پینے کیلئے ہمارے مہمان ہیں۔

کاسیو:۔ وہ کہاں ہیں؟

ایاگو:۔ دروازے کے پاس ہیں۔ آپ انھیں آواز دے لیں۔

کاسیو:۔ آواز تو میں انھیں دے لوں گا مگر شراب پینی میں اس وقت نہیں چاہتا۔

ایاگو:۔ (علیحدہ کہتا ہے) کاش ایک جام اسے اور پلا دیتا تو پھر جو شراب وہ پہلے سے پی چکا ہے وہ اور یہ جام دونوں مل کر اسے لڑنے جھگڑنے پر ایسا ہی آمادہ کر دیں گے جیسے کہ میری جوان جورو کا کتا بات بات پر لڑنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ اچھا اب وہ عاشقِ زار اُتو رو ڈریگو کہاں ہے۔ اسے تو عشق نے بالکل ہی بدل دیا ہے۔ اور آج تو ڈسڈیمونہ کا نام لے لے کر خوب چڑھا رہا ہے تلچھٹ تک نہیں چھوڑتا۔ قبرس کے تین جوانوں کو جو بڑے شریف اور چھیلے آدمی ہیں اور عزت رکھنے کی وجہ سے ذرا کھچے کھچے رہتے ہیں وہ سب اس لڑاکا جزیرے کے بڑے آدمی ہیں۔ آج میں نے خوب پیالے بھر بھر کر انھیں شراب پلائی ہے تاکہ ان کا غصہ اور تیز ہو جائے۔ اور پھر یہ قبرسی جوان بھی آج نگرانی میں شریک ہیں۔ اچھا اب شرابیوں کے اس غول میں میں چاہتا ہوں کہ ہمارا کاسیو کسی سے ایسا لڑ پڑے کہ سارا جزیرہ اس سے ناراض ہو جائے۔ لو وہ سب آ رہے ہیں اور جس نتیجے کی مجھے توقع تھی وہی نتیجہ پیدا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اگر سب چیزیں اسی طرح موافق پیش آتی رہیں تو پھر میں اپنے منصوبے میں پورے طور پر کامیاب ہو جاؤں گا۔

(کاسیو اور کاسیو کے ہمراہ مانٹونو اور چند شریف

کچھ نوکر شراب لئے آتے ہیں)

کاسیو:۔ واللہ ان سب نے مجھے پہلے ہی سے بہت سی شراب پلا رکھی ہے۔

مونٹونو:۔ واہ بالکل ذرا سی پی ہے۔ پورا ایک جام بھی نہیں پیا ہے۔

ایاگو:۔ تھوڑی سی ادھر بھی دینا۔ (گاتا ہے)

شیشے سے شیشہ چھنکے خوب چھنکے

شیشے سے شیشہ چھنکانے دو

حقیقت میں سپاہی صرف آدمی ہوا کرتا ہے

عمر تھوڑی ہوتی ہے تو پھر کیوں نہ شراب پیو

نوکر دو، کچھ شراب ادھر بھی دو۔

کاسیو:۔ واللہ ایاگو گیت تو تمھارا بہت ہی پُرلطف ہے۔

ایاگو:۔ یہ گیت تو میں نے انگلستان میں سیکھا تھا۔ وہاں کے پینے والے تو حقیقت میں بڑے پینے والے ہیں۔ اور پینے میں آپ کے ڈین، آپ کے المانی اور آپ کے بڑ بیو ولندیزی بھی انگلستان والوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ پیو پیو۔ خوب پیو۔ انگلستان کے شرابی کو کوئی کیا پہونچے گا۔

کاسیو:۔ کیا تمھارے انگلستان والے شراب پینے میں بہت بڑھے ہوئے ہیں؟

ایاگو:۔ ڈین کے مقابلے میں انگریز آسانی سے مے نوشی کر سکتا ہے مگر اس میں ڈین جتنی پیئے گا معلوم نہ ہوگا کہ اس نے کچھ پی ہے المانی کے ساتھ بھی انگریز کو شراب پینے میں کچھ قباحت نہیں ہوتی اور ڈچ مین اگر ساتھ بیٹھ کر پیئے تو پہلی ہی بوتل ختم ہونے پر قے کرنے لگتا ہے۔

کاسیو:۔ یہ جامِ شراب اپنے سالار کی صحت کا پیتا ہوں۔

مونٹونو:۔ کاسیو میں بھی اس میں شریک ہوں۔

ایاگو:۔ ارے واہ رے پیارے انگلستان (گاتا ہے)

بادشاہ اسٹیفن بڑا اچھا آدمی تھا

اس کی پتلون کی قیمت ایک اشرفی تھی۔

مگر درزی نے چھ پنس قیمت زیادہ لے لی۔

بادشاہ نے درزی کو بلا کر ڈانٹا [illegible] ناہیں

اور تم گھٹیا آدمی ہو۔ مگر یہی غرور ملک [illegible]

کرتا ہے۔ بس وہ پرانا کوٹ اٹھا۔ گلے میں ڈال
چلتا بنا۔ نوکر و شراب دو۔

کاسیو:۔ یہ گیت تو پہلے گیت سے بھی اچھا ہے۔

ایاگو:۔ کیا پھر سناؤں ؟

کاسیو:۔ میں تو سالار فوج کے جام صحت پینے کے وقت ایسے گیت گانے اس کی شان کے خلاف سمجھتا ہوں۔ خیر خدا سب کو اوپر ہے بہت سی روحیں ایسی ہیں جن کی نجات ہوگی اور بہت سی ایسی ہیں جن کی نجات نہ ہوگی۔

ایاگو:۔ کاسیو آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل بجا و درست ہے۔

کاسیو:۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ میری طرف سے اس میں اوتھیلو کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اور نہ کسی اور بڑے آدمی سے میرا مطلب ہے۔ مگر مجھے اپنی نجات کا تو پورا یقین ہے

ایاگو:۔ مجھے بھی یہی امید ہے۔

کاسیو:۔ مگر اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ آپکی نجات سے میری نجات پہلے ہوگی۔ مگر اب ان باتوں کو چھوڑیئے۔ نگرانی کا جو حکم ملا ہے اب اس کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ شریفو ہمارے یہ قصور معاف کرنا۔ اس وقت شراب زیادہ پی لی ہے۔ یہ میرا شانہ ادایاگو ہے۔ یہ میرا سیدھا ہاتھ ہے اور یہ الٹا۔ نشہ مجھے بالکل نہیں ہے۔ میں سیدھا کھڑا ہو سکتا ہوں اور بات بھی ٹھیک کر سکتا ہوں۔

سب کہتے ہیں:۔ ہاں ہاں سیدھے کھڑے بھی ہو سکتے ہو اور بات بھی ٹھیک کر سکتے ہو۔

کاسیو:۔ اچھا تو پھر کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں شراب پئے ہوں۔ (چلا جاتا ہے)

مونٹونو:۔ صاحبو بڑے چبوترے پر پہنچ کر نگرانی شروع کر لی جائے۔

ایاگو:۔ مونٹونو آپ نے کاسیو کو دیکھا۔ حقیقت میں یہ ایسا سپاہی ہے کہ سیزر کے لشکر میں اسے جگہ مل سکتی تھی۔ عیب اگر ہے تو شراب خواری ہے۔ مگر اس عیب کے سوا خوبیاں بھی بہت سی موجود ہیں۔ اور عیب اور خوبیاں ایسی ہی برابر رہتی ہیں جیسے کہ [illegible] لیل و نہار برابر ہوتے ہیں۔ اگر برائیاں بڑے ورجے [illegible] بھلائیاں ان سے کم درجے کی نہیں۔

اس کی یہ حالت قابل افسوس ہے اور اوتھیلو اس پر اتنا بھروسہ کرتا ہے کہ ڈر ہی معلوم ہوتا رہتا ہے کہ کہیں کسی دن نشے کی حالت میں اس کل جزیرے کو وہ زیروزبر نہ کردے۔

مونٹونو:۔ کیا نشے میں اس کی یہ حالت بھی ہو جاتی ہے۔

ایاگو:۔ اگر معدے میں شراب نہ ہو یا شراب اس کا پنگورہ ہلا کر اسے لوریاں نہ دے تو پھر چوبیس گھنٹے اسے جاگتے گذر جائیں گے۔

مونٹونو:۔ بہتر ہو کہ اس حال سے اوتھیلو کو آگاہ کر دیا جائے ممکن ہے کہ کاسیو کے اس حال کی اسے خبر نہ ہو۔ کیونکہ اوتھیلو کی طبیعت نہایت نیک اور شریف ہے۔ کاسیو کی خوبیوں کو وہ بہت پسند کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے عیوب سے وہ واقف نہ ہو۔ کیا یہ بات جو کہہ رہا ہوں صحیح نہیں ہے۔

(روڈریگو آتا ہے)

ایاگو:۔ (روڈریگو سے علیحدہ کہتا ہے) کیوں روڈریگو کیسے ہو۔ نگرانی کرنے کاسیو کے پیچھے پیچھے تم بھی جاؤ۔

(روڈریگو چلا جاتا ہے)

مونٹونو:۔ یہ تو نہایت قابل افسوس بات ہے کہ اوتھیلو ایک ایسے نائب کو ملازمت میں رکھے جسے شراب خواری کی عادت ہو۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس بات کو اسے جتا دیں۔

ایاگو:۔ اگر آپ مجھے یہ کل جزیرہ بھی تفویض فرمائیں تو بھی مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ میں ایسی کوئی بات اپنے سپہ سالار کے سامنے کہوں۔ میری اتنی ہمت نہیں کیونکہ مجھے کاسیو سے بھی بہت محبت ہے۔ مگر ذرا سنئے تو یہ شور کیسا ہے (آوازیں آتی ہیں "ارے بچاؤ کوئی بچاؤ")

(کاسیو آتا ہے۔ آگے آگے روڈریگو ہے اور اس کے پیچھے خود ہے)

کاسیو:۔ ارے بدمعاش۔ ارے شیطان!

مونٹونو:۔ کہو کیا بات ہے ؟

کاسیو:۔ یہ بدمعاش ہمیں ہمارا کام سکھانا چاہتا ہے۔ میں تو اسے اتنا دھنوں گا کہ پھونس میں لپٹی ہوئی بوتل معلوم ہونے لگے گا۔

روڈریگو:۔ تم کیا دھنو گے۔

کاسیو:۔ بدمعاش۔ زبان چلاتا ہے (کاسیو روڈریگو کو مارتا ہے)

مونٹونو:۔ جانے بھی دیجئے۔ نائب صاحب جانے دیجئے۔ (کاسیو کو روکتا ہے) میں کہتا ہوں کہ اپنا ہاتھ روک لیجئے۔ مہربانی کیجئے۔

کاسیو:۔ مجھے روکئے نہیں ورنہ میں آپ کا سر توڑ دوں گا۔

مونٹونو:۔ جانے دو جانے دو۔ کاسیو اس وقت تم پیئے ہوئے ہو۔

کاسیو:۔ میں اور شراب پیئے ہوں۔

(دونوں لڑتے ہیں)

ایاگو:۔ (روڈریگو سے علیحدہ کہتا ہے) سُنتا ہے۔ فوراً جا اور شہر میں ہر جگہ پکارتا پھر کہ غدر ہو گیا ہے۔ (روڈریگو چلا جاتا ہے) نہیں کاسیو نہیں تم تو اچھے آدمی تھے جانے دو۔ لوگو سر مونٹونو کو بچاؤ۔ شریفو مدد کرو۔ انھیں چھڑاؤ۔ واہ کیا خوب نگرانی کی ہے (شہر کا بڑا گھنٹہ بجتا ہے) یہ گھنٹہ کس نے بجایا سوائے شیطان کے دوسرا کون ہو سکتا ہے۔ اب شہر میں ضرور غدر پڑ جائیگا۔ کاسیو جانے دو۔ ورنہ عمر بھر شرمندہ رہنا پڑیگا۔

(اوتھیلو اور ملازم آتے ہیں)

اوتھیلو:۔ یہ کیا معاملہ ہے؟

مونٹونو:۔ واللہ دیکھتے ہو۔ لہو بہ رہا ہے۔ میں تو ایسا زخمی ہوا ہوں کہ جان بچنی مشکل ہے۔ (بیہوش ہو جاتا ہے)

اوتھیلو:۔ اب اگر کسی نے ہاتھ اٹھایا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو لے

ایاگو:۔ کاسیو خبردار جو اَب لڑے۔ مونٹونو۔ شریفو۔ بس کرو۔ سنتے ہو۔ افسوس تم اپنے منصب اور موقع کو بالکل بھول گئے۔ خبردار تمھارا سالار حکم دے رہا ہے۔ شرم۔ شرم۔ بس لڑنا بند کرو۔

اوتھیلو:۔ بتاؤ۔ بات کیا ہوئی؟ یہ ہنگامہ کیسے شروع ہوا؟ کیا تم سب رہزن اور قزّاق بن گئے۔ اور خود وہ حرکتیں کرنے لگے جو لٹیرے اور اٹھائی گیرے کیا کرتے ہیں۔ تم تو عیسائی ہو دل میں شرمندہ نہیں ہوتے۔ اس وحشیانہ نزاع کی ابتدا کس سے ہوئی۔ اگر اب کسی نے غصّہ دکھایا اور لڑا تو سمجھ لو اسے اپنی جان عزیز نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی کسی نے جنبش کی تو فوراً قتل کر دیا جائیگا۔ یہ گھنٹہ جو بج رہا ہے اسے فوراً بند کیا جائے۔ اسی سُن سُن کر لوگ سہمے جاتے ہیں۔ شریفو! بات کیا ہوئی ہے کچھ بتاؤ تو۔ ایاگو تمھاری صورت سے رنج اور افسوس ظاہر ہے۔ تمھیں کچھ کہو کہ یہ جھگڑا شروع کس نے کیا۔ اگر تمھیں کچھ بھی میرا لحاظ ہے تو فوراً بیان کرو۔

ایاگو:۔ حضور میں کچھ نہیں جانتا۔ سب میں اخلاص اور پیار تھا اور پیار بھی ایسا جیسا دولہا دلھن میں ہو کہ یکایک قسمت نے کچھ ایسی گردش کھائی کہ لوگوں کی عقل سلب ہو گئی۔ تلواریں نکل پڑیں۔ ایک نے دوسرے کے سینے پر تلوار چلانی چاہی۔ اور سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ یہ میں نہیں عرض کر سکتا کہ اس معاملہ میں بات کس سے شروع ہوئی تھی۔ کاش میرے یہ قدم مجھے کسی بڑی لڑائی میں پہنچاتے۔ بجائے اس کے کہ اس دنگے اور فساد میں لاتے

اوتھیلو:۔ کاسیو تم اپنے تئیں کیوں بھول گئے۔

کاسیو:۔ حضور سے التجا ہے کہ میرا قصور معاف کیا جائے۔ میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

اوتھیلو:۔ لائق مونٹونو تم تو بہت ہی عافیت پسند آدمی تھے جوان ہوا اور جوانی میں تمھاری خاموشی اور بُردباری تو تمام دنیا میں مشہور تھی۔ عاقلوں اور ہوشمندوں میں تمھارا نام بڑا تھا۔ بات کیا ہوئی کہ تم نے اپنی نیک نامی پر اس طرح داغ لگایا۔ لوگوں میں تمھاری نسبت بڑی اچھی رائے تھی۔ پھر تم نے اس رائے کو کیوں ایسا بگاڑا کہ لوگ تمھیں رات کو شراب پی کر جھگڑا اٹھانے والوں میں شمار کرنے لگے۔ اس کا جواب دو۔

مونٹونو:۔ اے لائق سپہ سالار میں ایسا زخمی ہوا ہوں کہ حالت خطرناک ہے۔ آپ کا یہ ماتحت ایاگو پورے طور پر آپ کو تمام واقعات سے آگاہ کر سکتا ہے۔ مجھ سے تو اب بات بھی نہیں کی جاتی۔ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ آج شب کو مجھ سے کوئی ناواجب بات ہوئی ہے۔ اگر حفاظت خود اختیاری بعض وقت کوئی گناہ ہو سکتی ہے تو اس میں شک نہیں کہ جب لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا تو میں نے اپنے تئیں بچانا چاہا۔

اوتھیلو:۔ بخدا اب میرا خون میری ان قوتوں سے جو مجھے نیکی کی ہدایت کرتی ہیں منحرف ہو کر اور میرا قہر و عتاب میری عقل اور سمجھ پر غالب آ کر میرا ہادی اور رہنما بننا چاہتا ہے۔ اور میرا غضب اس بات کی تحریک کرتا ہے کہ میں اپنا ہاتھ اٹھاؤں۔ اگر میرا ہاتھ اٹھا تو تم میں سے بڑے بڑے جواں مرد بھی اس طرح بیٹھ جائیں گے جیسے کسی بُلبلے کو پھونک ماردی۔ بتاؤ کہ [illegible] شروع ہوا؟ اس کا بانی کون تھا۔ کس نے سب سے پہلے اشتعال دیا۔ جو شخص ان باتوں کا مرتکب ثابت ہوگا اگر وہ میرا جڑواں [illegible] وہ اور میں دُنیا میں ساتھ پیدا ہوئے ہوں [illegible]

اور مددگار نہیں رہوں گا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ ایک ایسا شہر جس پر لڑائی کی گھٹا ابھی تک چھائی ہو اور شہر والوں کے دلوں سے ابھی تک خوف دور نہ ہوا ہو وہاں اس قسم کا دنگا فساد مارپیٹ اور وہ بھی رات کے وقت اور ایسے مقام پر جہاں سپاہ محافظ کا کام حفاظت اور نگرانی ہو۔ اور پھر وہاں ایسی شرارت اور فساد کے ہنگامے برپا کئے جائیں۔ ایاگو بتاؤ کہ فساد کس سے شروع ہوا۔

مونٹونو:۔ ایاگو اگر تم نے کاسیو سے تعلق کی وجہ سے یا اس خیال سے کہ وہ اور تم ایک ہی محکمے میں ملازم ہیں سچ سے کوئی بات گھٹا بڑھا کر کہی تو پھر تم سچے اور سیدھے سپاہی نہ ٹھہرو گے۔

ایاگو:۔ مونٹونو آپ نے یہ بات ایسی کہی ہے جو میرے دل میں چبھ گئی۔ اگر کوئی میرے تالو سے میری زبان کھینچ لے تو میں اس سے بہتر سمجھوں گا کہ کاسیو کے متعلق کوئی بری بات کہوں۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ سچی بات مجھے کہنی ہے اور مجھے یقین ہے کہ سچی بات کہنے سے میں اپنے دوست کاسیو کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گا۔ حضور سنیں واقعہ یہ ہے کہ میں اور سر مونٹونو کھڑے باتیں کرتے تھے کہ ایک آدمی چیختا چلاتا "ارے بچاؤ بچاؤ۔ مدد کرو مدد کرو" کہتا دوڑتا ہوا آیا۔ کاسیو تلوار کھینچ کر اس کی طرف چلا کہ اس پر وار کرے یہ صاحب بیچ میں آ گئے کہ بیچ بچاؤ کریں اور کاسیو کو تلوار چلانے سے روکیں۔ میں نے بھی اس چیختے چلاتے آدمی کا پیچھا کیا اس خیال سے کہ کہیں اس غل غپاڑے سے شہر والے ڈر نہ جائیں۔ جیسا کہ حقیقت میں پیش آیا۔ مگر وہ آدمی تیز دوڑنے والا تھا دور نکل گیا اور میں اسے پکڑ نہ سکا۔ جب میں پلٹا تو میں نے تلواروں کی جھنکار سنی۔ اور یہ سنا کہ کاسیو غصے میں سخت سست الفاظ زبان پر لا رہا ہے یہ الفاظ ایسے سخت تھے کہ آج رات سے پہلے میں نے کبھی اس کی زبان پر آتے نہ سنے تھے۔ جب میں پھر واپس آیا ہوں اور اس میں کچھ دیر نہ لگی تو میں نے دیکھا کہ دونوں گتھے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی تلوار کی نوک اس کے سینے میں بھونکنا چاہتا تھا اور وہ انکے یہی حال تھا جس وقت آپ تشریف لائے ہیں۔ اور یہ دونوں علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اس سے زیادہ میں اس واقعہ کا کچھ حال نہیں کہہ سکتا۔ لیکن انسان پھر انسان ہے اور اچھے سے اچھے آدمی بھی بعض وقت بھول جاتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ گو کاسیو نے کسی قدر [illegible] کے ساتھ بدزبانی کی۔ لیکن یہ بدزبانی ایسی تھی جیسا غصے [illegible] ایک آدمی اس شخص کے ساتھ کرتا ہے جس کی واقعی بھلائی چاہتا ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جو آدمی دوڑتا ہوا آ رہا تھا اس نے کاسیو کی توہین میں کوئی سخت بات ضرور کہی تھی جس پر کاسیو کو صبر نہ رہا۔

اوتھیلو:۔ ایاگو میں جانتا ہوں کہ تمہاری دیانتداری اور کاسیو کا لحاظ تم میں اتنا ہے جس سے تم نے اس معاملہ کو ہلکا کر کے بیان کیا ہے جس میں کاسیو کا قصور کم معلوم ہوتا ہے۔ کاسیو گو تم سے مجھے بہت محبت ہے۔ لیکن آج سے تم میری ماتحتی سے خارج ہوئے۔

(وسدیمونا مع ملازموں کے آتی ہے)

دیکھو تمہارے شور و غل سے وسدیمونہ بھی جاگ اٹھی۔ اور یہاں چلی آئی۔ اگر وہ اس وقت نہ آ جاتی تو کاسیو میں تمہاری سزا کو دوسروں کیلئے ایک مثال بناتا۔

وسدیمونہ:۔ بات کیا ہے؟

اوتھیلو:۔ جو کچھ جھگڑا تھا وہ سب طے ہو گیا۔ پیاری وسدیمونہ آؤ چلو سو رہیں۔ مونٹونو آپ کے زخموں کیلئے میں خود جراح ہونگا (مونٹونو کو لوگ سہارا دیکر لے جاتے ہیں۔) ایاگو شہر سے خبردار رہو۔ اور جو لوگ اس فساد کو دیکھکر غل شور مچائیں تو انھیں خاموش کر دینا۔ وسدیمونا چلو یہ تو سپاہی کی تقدیر ہی میں ہے کہ اسکی گہری نیند میں ایسے فساد اور دنگے خلل ڈالا کریں۔

(سب چلے جاتے ہیں۔ ایاگو اور کاسیو رہ جاتے ہیں)

ایاگو:۔ کیوں کاسیو کیا تمھارے چوٹ لگی ہے؟

کاسیو:۔ ہاں ایسی چوٹ لگی ہے کہ کسی علاج سے بھی وہ اچھی نہ ہوگی۔

ایاگو:۔ نہیں خدا نہ کرے ایسا کیوں ہو۔

کاسیو:۔ عزت، آبرو، نام سب کو بٹہ لگ گیا۔ اب نہ عزت رہی نہ آبرو۔ ہائے اس ہستی کا وہ حصہ غارت ہو گیا جو غیر فانی تھا۔ اور وہ حصہ رہ گیا جو حیوانوں میں بھی ہوا کرتا ہے۔ ایاگو عزت غارت ہو گئی۔ عزت اب نہ رہی۔

ایاگو:۔ میں تو سیدھا سادا آدمی ہوں۔ میں سمجھا کہ تمھیں کوئی سخت چوٹ آئی ہے۔ کیونکہ چوٹ یا زخم میں جتنی تکلیف ہوتی ہے وہ عزت یا نام کے غارت ہونے میں نہیں ہوتی۔ عزت اور نام تو مفت کا ایک بوجھ ہے جو آدمی پر باندھ دیا جاتا ہے۔ بلا استحقاق

ملتا ہے اور بلا وجہ غائب ہو جاتا ہے۔ عزت اور نام تو کہیں گیا نہیں یہ بات دوسری ہے کہ تم اسے نقصان سمجھ رہے ہو۔ اوتھیلو کو پھر مہربان کر لینے کی بہت سی ترکیبیں ہیں۔ یہ تو وقت کی بات تھی کہ اوتھیلو کو غصہ آگیا۔ یہ سزا جو تمھیں دی گئی ہے کسی عداوت یا رنجش کی وجہ سے نہیں دی گئی۔ بلکہ مصلحت یہی سمجھی گئی تاکہ قبرس کے شرفا اور عزت رکھنے والے لوگوں کا غصہ فرو ہو جائے۔ یہ سزا بھی اسی طرح دی گئی ہے جیسے کوئی شیر کے ڈرانے کیلئے اپنے کتے کو مارے۔ اگر اس کے سامنے عاجزی کرو گے تو وہ تم پر پھر مہربان ہو جائے گا۔

کاسیو:۔ مہربان ہونیکو تو اس سے کیا کہوں گا۔ اگر کچھ کہوں گا تو یہی کہوں گا کہ آپ مجھ سے اور نفرت کرنے لگیں۔ کیونکہ میں نے ایسے اچھے اور نیک آقا اور افسر کو شراب پی کر بُری طرح دھوکے میں رکھا۔ اور میں نے اپنے تئیں بہت بے احتیاط ملازم ثابت کیا۔ شراب پی کر عقل سے بے بہرہ ہوا۔ طوطوں کی طرح غل مچایا۔ لڑا اور فساد برپا کر ایا۔ شراب پی کر ایسا بدمست ہوا کہ اپنے سایہ سے بھی لڑنے لگا۔ اے شراب کی ناپدید قوت اگر تیرا کوئی نام نہیں ہے تو پھر ہم تجھے شیطان کے سوا اور کیا کہیں گے۔

ایاگو:۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ جس کے پیچھے تم تلوار لیکر لپکے تھے وہ تھا کون۔ اس نے تمھیں کیا کہا تھا؟

کاسیو:۔ مجھے مطلق علم نہیں کہ وہ کون تھا اور اس نے مجھے کیا کہا تھا۔

ایاگو:۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمھیں کچھ معلوم ہی نہ ہو۔

کاسیو:۔ ایاگو مجھے باتیں تو بہت سی یاد ہیں۔ مگر ٹھیک ٹھیک ایک بات بھی یاد نہیں۔ لڑائی یاد ہے لیکن یہ یاد نہیں کہ کیوں اور کس بات پر ہوئی تھی۔ اے خدا کیسی حیرت کی بات ہے کہ انسان اپنے منہ میں ایسا چور بٹھائے جو اس کے دماغ ہی کو چرا لیجائے۔ اور وہ چیز جسے خوش ذائقہ سمجھکر ہم اس کی تعریف کریں وہ ایسی ہو جو ہمیں آدمی سے جانور بنا دے۔

ایاگو:۔ مگر تم تو اس وقت اپنے حواس میں ہو۔ حواس اتنی جلد کیونکر درست ہو گئے؟

کاسیو:۔ ایک عیب نے دوسرے عیب کی شکل اختیار کرتی ہے پہلے نشہ تھا اب ندامت ہے اور وہ اس شدت سے ہے کہ خود اپنے سے نفرت ہو گئی۔

ایاگو:۔ جاؤ بھی تم تو بڑے اخلاق اور نیکیوں پر بحث کرنیوالے نکلے۔ وقت موقع اور حالت کے لحاظ سے جو ملک کی اس وقت ہے میں بھی یہی چاہتا تھا کہ جو کچھ ہوا وہ نہ ہوتا۔ لیکن جو بات گذر چکی وہ گذر چکی۔ اب جو کچھ ہو چکا اس سے اپنی بھلائی کیلئے کوئی بات پیدا کرنی چاہیئے۔

کاسیو:۔ کیا میں اب اس سے اپنی جگہ مانگوں۔ وہ یہی جواب دیگا کہ تم شرابی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو ایک زبان کی جگہ اگر سو زبانیں بھی دہن میں ہوں گی تو وہ سب بند ہو جائیں گی اور ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلے گا۔ پہلے حواس میں تھا پھر رفتہ رفتہ بدحواس بنا۔ یہاں تک کہ بالکل ہی جانور ہو گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ ہر جام مے جو زیادہ پیا جائے وہ ناپاک ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ شیطان کے سوا دوسری چیز نہیں۔

ایاگو:۔ سنئے تو۔ اچھی شراب تو بڑی دوست اور رفیق ہوتی ہے اگر مناسب طریقے سے پی جائے۔ شراب کو برا نہ کہو۔ کاسیو۔ اس وقت مجھے تم سے بہت محبت معلوم ہوتی ہے۔

کاسیو:۔ ہاں میری اس وقت کی حالت تو یہ بات بخوبی ثابت کر رہی ہے۔ ہائے میں شراب پی کر کیسا بدمست ہو گیا۔

ایاگو:۔ اس میں تم ہو یا کوئی اور شراب پی کر تو سب ہی کے ہوش و حواس کا گم ہونا ممکن ہے۔ اچھا سنو اب تمھیں کیا کرنا ہے۔ آجکل ہمارے سپہ سالار اوتھیلو کی بیوی حقیقت میں سپہ سالار ہے۔ اور یہ میں اس لئے اور بھی کہتا ہوں کہ آجکل اوتھیلو ڈسڈیمونہ کے حسن و جمال کو پرکھنے میں ایسا محو ہے کہ اگر اپنے واسطے تم ڈسڈیمونہ سے بار بار کہو گے تو تم کو تمھاری جگہ پھر مل جائیگی۔ اگر اوتھیلو کی بیوی سے اپنے معاملے میں سفارش اور مدد چاہو گے تو ممکن ہے کہ کامیابی ہو جائے۔ وہ تو اس قدر بے تکلف، مہربان اور اچھے مزاج کی خاتون ہے کہ اگر کوئی اس سے کچھ مانگے اور اس کو زیادہ وہ نہ دے تو اس بات کو وہ اپنی طبیعت کا ایک عیب سمجھتی ہے۔ تم میں اور تمھارے آقا میں جو بگاڑ اس وقت پڑا ہے اسے اگر کوئی درست کر سکتا ہے تو وہ یہی خاتون ہے۔ اور کہو تو میں اپنی ساری دولت شرط میں لگانیکو تیار ہوں کہ اگر اس وقت کی یہ خلش رفع ہو جائیگی تو آقا تم پر پہلے سے بھی زیادہ مہربان ہو جائیگا۔

کاسیو:۔ ایاگو آپ کہتے تو ٹھیک ہیں۔

ایاگو:۔ تمھارے خیال اور دوستی کی وجہ سے یہ خیال میرے

دل میں نہایت ایمانداری سے پیدا ہوا ہے۔

کاسیو:۔ میری بھی یہی رائے ہے اور کل صبح ہوتے ہی میں وسدیمونہ سے نہایت عاجزی سے عرض کروں گا کہ وہ میرا اتنا کام کر دیں۔ اگر ملازمت میں اس وقت کوئی نقص پڑ گیا تو پھر ہمیشہ کو بدقسمت رہنا پڑیگا۔

ایاگو:۔ کاسیو بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا نائب کاسیو شب بخیر اب میں نگرانی کو جاتا ہوں۔

کاسیو:۔ ایماندار ایاگو اچھا سلام۔

(چلا جاتا ہے)

ایاگو:۔ وہ کون ہے جو مجھے بدمعاش اور بے ایمان کہتا ہے جو مشورہ میں نے اس وقت کاسیو کو دیا ہے وہ بالکل ایمان اور راستی کا ہے۔ جس قدر اس مشورے پر غور کیا جائیگا اتنا ہی وہ درست اور صحیح نکلے گا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مراکشی کو کاسیو پر پھر مہربان کرنیکی اگر کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کیونکہ وسدیمونہ طبیعت کی ایسی نیک اور ملنسار ہے کہ کسی اچھے کام کی طرف اسے راغب کرنا بالکل آسان ہے۔ وہ تو نیکی اور دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے ہی کو دنیا میں پیدا ہوئی ہے۔ اس کی مثال تو عناصر فطرت کی سی ہے جو انسان کی بھلائی کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اچھا تو سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کاسیو اس مراکشی کو اپنے اوپر مہربان کر لے۔ اس مراکشی کا حال یہ ہے کہ اگر وسدیمونا اس سے کہے کہ وہ اپنے دین و مذہب کو یا جس قدر مذہب کی پابندیاں اس پر ہیں ان سب کو ترک کر دے تو وہ ان سے دستکش ہونے پر راضی ہو جائیگا۔ وسدیمونا کے ایک اشارے میں وہ طاقت ہے کہ کسی دیوتا کو فطرت پر بھی وہ قابو اور اختیار نہیں ہے۔ اچھا جب میں کاسیو کو اس کے فائدہ کیلئے ایسی اچھی ترکیب بتا رہا ہوں تو پھر کوئی کیونکر مجھے بدکار یا بدمعاش کہہ سکتا ہے۔ ارے جہنم کے خداؤ جب شیاطین کسی سیہ کاری کی طرف مائل ہوتے ہیں تو پھر وہ آسمانی نیکیاں دکھا کر اپنی سیاہ کاری شروع کرتے ہیں۔ اور یہی کیفیت اس وقت میری ہے۔ جس وقت یہ سیدھا اور ایماندار احمق کاسیو وسدیمونہ سے عاجزی کے ساتھ اپنی سفارش کیلئے کہے گا بس وہی موقع ہوگا کہ میں اوتھیلو کے کان میں یہ بات ڈالوں گا کہ وسدیمونہ یہ سفارش اپنے لذتِ نفس کیلئے کرتی ہے تو پھر وسدیمونہ جتنی سفارش اوتھیلو سے زیادہ کریگی اتنی ہی اوتھیلو کے دل میں اپنی بیوی کی طرف سے بدگمانی زیادہ ہوتی جائیگی۔ اور اس طرح میں ایک نیکی کو سخت گناہ بنا دوں گا۔ اور وسدیمونہ کی نیکیوں سے وہ وہ جال اور پھندے تیار کروں گا کہ جس میں بالآخر سب مبتلائے عذاب ہو جائیں۔

(روڈریگو پھر آتا ہے)

ایاگو:۔ کہو روڈریگو کیا حال ہے؟

روڈریگو:۔ حال کیا ہے۔ کتوں کے غول میں شکار کیلئے شریک ہوں۔ مگر اُن کتوں میں نہیں ہوں جو شکار کھیلتے ہیں بلکہ محض بھونکنے کیلئے غول میں شریک کیا گیا ہوں۔ روپیہ جتنا ساتھ لایا تھا سب صرف ہو چکا ہے۔ اور آج رات کو لوگوں نے مجھے خوب پیٹا بھی ہے۔ اور نتیجہ میرے ان تمام زخموں کا یہ ہوگا کہ کچھ نہ ہوگا۔ اور جب روپیہ پاس نہ رہے گا تو اس پر لطیفہ یہ اور ہوگا کہ خالی ہاتھ وینس جانا پڑیگا۔

ایاگو:۔ مفلس تو حقیقت میں وہ ہوتے ہیں جنھیں کسی بات میں صبر نہ ہو۔ وہ کونسا زخم ہے جو رفتہ رفتہ نہ بھرا ہو۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ہم جو کچھ سمجھ رکھتے ہیں اس سے کام لیتے ہیں کوئی جادو یا سحر تو ہمارے پاس ہے نہیں۔ اور سمجھ سے کام کرنے کیلئے ہمیشہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ سب درست ہوا ہے۔ کاسیو جس نے تمھیں بازی ہرا دی تھی اپنی ملازمت سے برطرف ہو گیا۔ گو اس میں تھوڑا سا نقصان تمھیں پہونچا۔ درختوں میں پھل خود ہی دھوپ کھا کر پکتے ہیں۔ مگر پھر بھی جو پھول پہلے پھل بنا وہ پہلے پکتا ہے۔ تھوڑے دن اور صبر کر لو۔ ارے یہ تو صبح ہو چلی۔ جتنا کام زیادہ ہو وقت خوب کٹ جاتا ہے۔ روڈریگو تم جہاں ٹھیری ہو وہیں جاؤ ہو وقت جاؤ اور سمجھتے رہو کہ جو کچھ ہونیوالا ہے اس سے تمھیں اطلاع ملتی رہے گی کچھ سمجھے بھی۔ بس اب جاؤ۔

(روڈریگو چلا جاتا ہے)

اس وقت مجھے دو باتیں کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ میری بیوی وسدیمونہ سے کاسیو کی سفارش کیلئے کہے اس کیلئے اپنی بیوی کو آمادہ کرنا ہے۔ اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ پہلے میں اس مراکشی کو کہیں علیحدہ لے جاؤں۔ اور پھر عین اس موقع پر جبکہ کاسیو وسدیمونہ سے اپنی سفارش کیلئے گفتگو کرتا ہوگا مراکشی

کو وہاں موجود کر دوں۔ بس یہی وہ ترکیب ہے جو سرد مہری اور نا خیر پیدا کر کے اس سفارش کو نا کام رکھے گی۔

جزو ثالث

پہلا منظر

قصر کے سامنے

کاسیو مع چند باجے والوں کے آتا ہے

کاسیو:۔ صاحبو یہاں کھڑے ہو کر اپنے ساز بجاؤ۔ میں آپ کو خوب انعام دوں گا۔ مگر جو چیز بجاؤ وہ مختصر ہو اور آقا کو سامنے صبح کے سلام کا کام دے۔

(ایک مسخرہ آتا ہے)

مسخرہ:۔ ساز ندو یہ کیسی آواز ناک ہی ناک میں نکالتے ہو۔

پہلا باجے والا:۔ کیا فرمایا؟

مسخرہ:۔ کیا مُنہ سے بجانیکا کوئی آلہ تمھارے پاس نہیں ہے؟

پہلا باجے والا:۔ جی ہاں موجود ہے۔

مسخرہ:۔ بس قصے کی دُم تو ساری یہی ہے۔ استاد و لیجئے یہ روپیہ آپ کی نذر ہے۔ ہمارے آقائے نامدار آپ کے باجوں کو سُن کر اس قدر محظوظ ہوئے ہیں کہ فرماتے ہیں مہربانی کرو۔ زیادہ غل نہ مچاؤ۔

پہلا باجے والا:۔ بہت اچھا، ہم غل غور کچھ نہ مچائیں گے۔

مسخرہ:۔ اگر آپ کے پاس کوئی ایسا ساز ہو جس کی آواز مطلق نہ نکلتی ہو تو اُسے بلا تکلف بجائیے کیونکہ ہماری سپہ سالار کی نسبت لوگوں کا خیال ہے کہ موسیقی سے ان کی طبیعت کو مطلق لگاؤ نہیں۔

پہلا باجے والا:۔ جناب ہمارے پاس کوئی باجہ یا ساز ایسا نہیں جس سے آواز نہ نکلتی ہو۔

مسخرہ:۔ تو پھر آپ اپنے یہ گل آلے اور اوزار تھیلوں میں بند کیجئے۔ میں بھی چلا اور آپ بھی رفو چکر ہو جیئے۔ بہتری اسی میں ہے۔

(باجے والے چلے جاتے ہیں)

کاسیو:۔ عزیز دوست آپ سُنتے ہیں۔

مسخرہ:۔ آپ کو سُنتا ہوں آپ کے عزیز دوست کو نہیں سُنتا۔

کاسیو:۔ یہ ضلع جگت تو چھوڑیئے۔ لیجئے یہ اشرفی آپکی نذر ہے اگر وہ شریف زادی جو سپہ سالار کی بیگم کی خدمت میں رہتی ہے اٹھی ہو تو میری طرف سے اتنا عرض کر دیجئے کہ ایک شخص کاسیو کچھ آپ سے کہنا چاہتا ہے۔ کیا آپ مہربانی فرما کر اتنی تکلیف گوارا کریں گے!

مسخرہ:۔ اٹھی تو ہیں، اگر وہ ادھر آئیں تو آپ کا پیغام ضرور پہنچا دوں گا۔

کاسیو:۔ ہاں دوست ایسا ہی کرنا۔

(مسخرہ چلا جاتا ہے)

(ایاگو آتا ہے)

خوب وقت پر آئے ایاگو۔

ایاگو:۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج رات آپ کو نیند نہیں آئی۔

کاسیو:۔ دن تو اسی وقت نکل آیا تھا جبکہ میں آپ سے رخصت ہوا تھا۔ ایاگو میں نے اتنی جرأت کی ہے کہ آپ کی بیوی کو یہاں بلایا ہے۔ ان سے مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ کسی طرح اس نیک اور شریف مزاج وسدیمونہ سے میری ملاقات کرا دیں۔

ایاگو:۔ میں اسے آپ کے پاس ابھی بھیجتا ہوں اور ایسی ترکیب کرتا ہوں کہ اوتھیلو یہاں سے کچھ دیر کو ٹل جائے۔ تاکہ وسدیمونہ سے جو کچھ تمھیں کہنا سننا ہے وہ اچھی طرح کہہ سُن لو۔

کاسیو:۔ اس مہربانی کا شکریہ قبول فرمائیں۔

(ایاگو چلا جاتا ہے)

میں نے تو ایسے حسن اخلاق کا آدمی اپنے ہم وطنوں میں یعنی فلارنس کے رہنے والوں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

(امیلیا آتی ہے)

امیلیا: - نائب صاحب کو آداب۔ مجھے بھی سخت صدمہ ہے کہ آقا آپ سے ناخوش ہو گئے ہیں۔ آپ گھرائیں نہیں سپہ سالار اور ان کی بیگم آپس میں اسی بات کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اور بیگم صاحبہ آپ کی سفارش بہت زور سے کرتی تھیں۔ آقا فرماتے تھے کہ جسے آپ نے زخمی کیا ہے وہ قبرس کے رئیسوں میں بڑے اثر اور رسوخ کا نہایت دانا اور عقلمند آدمی ہے۔ اس حالت میں کاسیو آپ کے برطرف کرنے کے سوا انھیں کچھ چارہ ہی نہ تھا۔ آقا اس بات کے مُقر ہیں کہ انھیں آپ سے بہت محبت اور تعلق ہے۔ اور وہ سوائے آپ کے کسی دوسرے کی درخواست اس جگہ پر تقرر کیلئے منظور نہ کریں گے۔ اور موقع پاتے ہی وہ آپ کو آپ کی جگہ پر بحال کر دیں گے۔

کاسیو: - لیکن میں چاہتا ہوں اور اگر آپ بھی اس بات کو پسند کریں اور امکان میں بھی ہو تو مجھے اتنا موقع دیا جائے کہ میں بیگم صاحبہ سے اپنی بابت کچھ عرض کروں۔

امیلیا: - اچھا تو اندر آجائیے۔ میں آپ کو ایسی جگہ لئے چلتی ہوں جہاں آپ بیگم صاحبہ سے اچھی طرح دل کھول کر بات کر سکتے ہیں۔

کاسیو: - میں آپ کا بیحد ممنون ہوں۔

دوسرا منظر

قصر کا ایک کمرہ

اوتھیلو، ایاگو اور چند شریف آتے ہیں

اوتھیلو: - ایاگو یہ خطوط لیجا و اور جہاز کے ناخدا کو دینا کہ وہ مجلس سیاست میں میرا اسلام پہنچا کر یہ خطوط پیش کر دے۔ اس کے بعد میں جہاں تعمیر کا کام ہو رہا ہے وہاں جا کر کام کا معائنہ کرونگا۔ ایاگو وہیں تم مجھ سے ملنا۔

ایاگو: - فدوی وہیں حاضر ہوگا۔

اوتھیلو: - فصیلوں پر جہاں کام ہو رہا ہے اسے دیکھنا ہے۔ کیا اس وقت ہم وہاں جا کر کام کا معائنہ کر سکتے ہیں۔

تیسرا منظر

قصر کا باغ

(وسدیمونہ، کاسیو اور امیلیا وہاں آتے ہیں)

وسدیمونہ: - اچھا کاسیو آپ اطمینان رکھیں اور یقین کریں کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں آپ کے لئے کرونگی۔

امیلیا: - حضور بیگم صاحبہ میرے شوہر کو بھی ان کی یہ حالت دیکھکر سخت صدمہ ہوتا ہے۔ اور یہ صدمہ ایسا ہوتا ہے کہ گویا خود انکی برطرفی عمل میں آئی ہے۔

وسدیمونہ: - تمھارے شوہر ایاگو تو بڑے ایماندار اور سچے آدمی ہیں۔ کاسیو تم ذرا فکر نہ کرو۔ میں تمھیں اور اپنے شوہر کو پھر ویسا ہی دوست کر دونگی جیسے کہ تم پہلے تھے۔

کاسیو: - میری فیاض اور مہربان بیگم مائیکل کاسیو کا جو درجہ بھی چاہے ہو مگر وہ حضور کا ہر حال میں مطیع اور تابعدار ملازم رہے گا۔

وسدیمونہ: - ہاں میں یہ بات خوب جانتی ہوں اور آپ کی ممنون ہوں۔ آپ کو حقیقت میں میرے شوہر سے بہت تعلق ہے۔ دونوں میں ایک زمانہ سے ملاقات اور محبت چلی آتی ہے اور آپ سمجھ لیں کہ جو مغائرت اس وقت آپ میں اور ان میں پیدا ہوگئی ہے وہ زیادہ دنوں تک نہ رہے گی۔ اور اس مغائرت کو بھی محض مصلحت وقت سمجھئے۔

کاسیو: - یہ تو بجا ہے۔ لیکن میری مہربان خاتون ممکن ہے کہ وہ مصلحتِ وقت یا تو اتنی مدت تک جاری رہے یا خفیف اسباب ایسے پیدا ہوں جس سے اس مصلحت کا جاری رکھنا ضروری سمجھا جائے یا ایسے واقعات پیش آئیں کہ اس مصلحت کو صحیح اور درست سمجھا جائے۔ اور میں اپنے منصب سے اتنی مدت تک علیحدہ رہوں کہ کوئی دوسرا شخص میری جگہ پر مقرر ہو جائے۔ اور سپہ سالار مجھے اور میرے تعلق، اور میری دیرینہ ملازمت کو بالکل بھول جائیں۔

وسدیمونہ: - اتنے شکوک کیوں دل میں لاتے ہو۔ دیکھئے یہ امیلیا یہاں موجود ہے اس کی موجودگی میں میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کو آپکی جگہ ضرور دلاؤنگی۔ کیونکہ میں جب کسی سے سلوک اور بھلائی کا وعدہ کرتی ہوں تو پھر اس وعدہ کو حرف بحرف ایفا کرتی ہوں۔ میں تو اس کی نیند حرام کر دوں گی اور تمھاری سفارش اتنی بار کرونگی کہ سنتے سنتے اسے صبر نہ رہے جب وہ بستر پر ہوگا تو معلوم ہوگا کہ استاد سبق پڑھا رہا ہے۔

اور اگر کھانے کی میز پر ہوگا تو معلوم ہوگا کہ پادری سامنے ہے اور اس کے آگے اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہے۔ غرض جو کام بھی وہ کرتا ہوگا میں تمھاری سفارش میں برابر گفتگو کرتی رہوں گی۔ کاسیو تم خوش ہو جاؤ میں تمھاری وکیل بنی۔ تمھارے معاملہ کو یونہی چھوڑ دینے کی جگہ اپنا مر جانا بہتر سمجھوں گی۔

امیلیا:۔ لیجئے وہ آقا تشریف لا رہے ہیں۔

کاسیو:۔ بیگم! اب میں حضور سے رخصت ہوتا ہوں۔

وسدیمونہ:۔ نہیں ابھی ٹھہرو۔ سنتے جاؤ کہ تمھارے سامنے بھی میں تمھاری سفارش اس سے کس طرح کرتی ہوں۔

کاسیو:۔ اس وقت حضور مجھے اجازت دیں۔ میں ایسی حالت میں آقا کے سامنے سخت بے چین اور بدحواس رہوں گا۔ اور خود اپنے معاملہ میں ایک حرف بھی نہ کہہ سکوں گا۔

وسدیمونہ:۔ اگر جانا ہی مناسب سمجھتے ہو تو جاؤ۔

(کاسیو چلا جاتا ہے)

(اوتھیلو اور ایاگو آتے ہیں)

ایاگو:۔ دیکھئے میں اس بات کو پسند نہیں کرتا۔

اوتھیلو:۔ یہ کیا کہا؟

ایاگو:۔ حضور کچھ نہیں۔ اگر .... خدا جانے میں کیا کہتا تھا۔

اوتھیلو:۔ یہ تو کاسیو تھا نا، جو میری بیوی کے پاس سے ابھی گیا ہے؟

ایاگو:۔ حضور بے شک کاسیو ہی تھا یقینی وہی ہے۔ خیال تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ کاسیو تھا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو دیکھتے ہی وہ کیوں ایک خطاکار کی طرح یہاں سے بھاگ گیا۔

اوتھیلو:۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ کاسیو ہی تھا۔

وسدیمونہ:۔ آقا میرے آپ کا مزاج کیسا ہے؟ میں تو اس وقت ایک سائل کا سوال سن رہی تھی۔ آپ کے ناراض ہو جانے سے یہ شخص جاں بلب ہو گیا ہے۔

اوتھیلو:۔ تمھاری مراد کس شخص سے ہے؟

وسدیمونہ:۔ مراد آپ کے نائب کاسیو سے ہے۔ میرے اچھے آقا اگر مجھے ذرا بھی اختیار آپ کی طبیعت پر ہے تو یہی کہونگی کہ اس پر سے آپ اپنا غصہ دور کریں۔ وہ آپ کا بیحد ادب اور لحاظ کرتا ہے۔ اگر اس سے کوئی غلطی بھی ہوئی ہے تو وہ لاعلمی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ہرگز کوئی بدنیتی یا شرارت اس میں نہ تھی۔ اس کی خطا معاف کر کے اسے بحال کر دیجئے۔

اوتھیلو:۔ کیا وہ ہی ابھی یہاں سے گیا ہے؟

وسدیمونہ:۔ وہ حقیقت میں نہایت نادم اور پشیمان ہے۔ اور اپنا غم میرے پاس چھوڑ گیا ہے کہ میں بھی اسے برداشت کروں۔ اچھے میرے پیارے شوہر آپ ضرور اسے بحال کر دیں۔

اوتھیلو:۔ پیاری وسدیمونہ اس وقت نہیں۔ پھر کسی وقت کہنا۔

وسدیمونہ:۔ تو کیا جلدی آپ اس کے معاملے پر غور کریں گے؟

اوتھیلو:۔ ہاں پیاری میں جلد اس کی طرف متوجہ ہوں گا۔

وسدیمونہ:۔ کیا آج شب کو یا کھانیکے وقت پھر یاد دلاؤں؟

اوتھیلو:۔ نہیں۔ آج شب کو نہیں۔

وسدیمونہ:۔ تو کیا کل کھانیکے وقت کہوں؟

اوتھیلو:۔ کل تو میں تمھارے ساتھ کھانا نہیں کھا سکوں گا۔ فوجی سرداروں کی ضیافت کے جلسے میں شریک ہونا ہے۔

وسدیمونہ:۔ تو پھر کیا کل رات کھانیکے وقت یا منگل کو کسی وقت دن میں یا رات میں یا بدھ کو صبح کے وقت یاد دلاؤں؟ میرے اچھے شوہر بتا دیجئے کب یاد دلاؤں۔ تین دن سے زیادہ آگے نہ بتلائیے گا۔ حقیقت میں وہ سخت نادم اور خجل ہے۔ نشے کی حالت میں تو اپنے وقت پر سب کا یہی حال ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی بڑا قصور نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ جنگ کا تھا۔ اور ایسے زمانہ میں بڑے بڑے افسروں کو بھی اگر ان سے قصور ہو جائے تو مثال قائم کرنے کیلئے سخت سزا دی جاتی ہے۔ قصور تو اتنا بھی نہ تھا کہ اسے زبانی فہمائش کی جاتی۔ اوتھیلو بتائیے کہ اب کاسیو کب حاضر ہو۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ آپ کوئی چیز مجھ سے مانگیں تو پھر آپ کو یہ دیکھنا پڑے کہ میں انکار کرتی ہوں۔ میں اتنی عاجزی سے کہہ رہی ہوں اور آپ متوجہ نہ ہوں اور مجھے حالت تذبذب میں رکھیں۔ کاسیو تو وہ ہے کہ جب آپ مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے تو وہ ہمیشہ ساتھ ہوتا تھا۔ اگر کبھی میں کوئی بات آپ کے خلاف کہتی تھی وہ ہمیشہ آپ کی حمایت کرتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ اس کی بحالی کیلئے مجھے بار بار کہنا پڑتا ہے۔ آپ میرا اعتبار کریں۔ میں اس کیلئے بہت کچھ......

اوتھیلو:۔ مہربانی کر کے اب اس کا ذکر نہ کرو۔ وہ جب چاہے

اپنی جگہ پر آجائے۔ مجھے تمھاری کسی بات سے انکار نہیں۔

ڈسڈیمونہ:۔ یہ تو آپ کا کوئی بڑا احسان نہ ہوا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کہ میں کہوں کہ آپ اپنے دستانے پہن لیں۔ یا یہ کہوں کہ آپ مقوی غذا کھائیں۔ تاکہ آپ توانا و تندرست رہیں۔ یا کوئی اور ایسی ہی درخواست کروں جو آپ کے فائدے کی ہو۔ یہ درخواست میری ایسی تھی جس میں میں آپ کی طبیعت سے فریاد کرتی تھی کہ اسے منظور کرلیں۔ لیکن اس کے منظور کرنے میں آپ کو ابھی تک تذبذب ہے اور آپ اسے ایک مشکل بات سمجھ کر خیال کرتے ہیں کہ اس کے منظور کرنے میں کسی بات کا خطرہ یا اندیشہ ہے۔

اوتھیلو:۔ پیاری ڈسڈیمونہ میں تمھاری کسی درخواست کو نامنظور نہیں کرسکتا۔ لیکن اس وقت یہی چاہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کو مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے۔

ڈسڈیمونہ:۔ میں بھلا کب آپ کے فرمانے کو ٹال سکتی ہوں۔ اچھا پیارے شوہر خدا حافظ۔

اوتھیلو:۔ خدا کو سونپا پیاری ڈسڈیمونہ میں خود تمھارے پاس ابھی آتا ہوں۔

ڈسڈیمونہ:۔ امیلیا آؤ چلیں۔ بہتر ہے آپ کے خیالات جو راہ آپ کو بتائیں اس پر آپ چلیں۔ حالات جو کچھ بھی پیش آئیں میں آپ کی ہمیشہ تابعدار اور فرماں بردار رہونگی۔

(ڈسڈیمونا اور امیلیا چلے جاتے ہیں)

اوتھیلو:۔ ارے ظالم خواہ میری روح پر کیسا ہی عذاب ہو مگر میں تیرے عشق کا ہمیشہ دیوانہ رہوں گا اور جب تیرا عشق نہ رہا تو پھر میرے لئے یہ کل کائنات ایسے ہی ویرانہ ہوگی جیسے کہ دنیا کا آفرینش سے پہلے حال تھا۔

ایاگو:۔ میرے شریف آقا!

اوتھیلو:۔ ایاگو کہو کیا کہتے ہو۔

ایاگو:۔ آقائے من! جس زمانہ میں آپ خاتون ڈسڈیمونہ سے اظہار عشق کرتے تھے تو کیا کاسیو کو آپ کے اس عشق کا علم تھا؟

اوتھیلو:۔ ہاں شروع سے اخیر تک اُسے سب حال معلوم تھا۔ یہ بات تم کیوں پوچھتے ہو؟

ایاگو:۔ یوں ہی ایک خیال آیا تو پوچھنے لگا۔ کسی کو کوئی نقصان پہنچانا مقصود نہیں۔

اوتھیلو:۔ ایاگو بتاؤ نا وہ کیا خیال آیا تھا؟

ایاگو:۔ میں سمجھا تھا کہ کاسیو خاتون ڈسڈیمونہ سے واقف نہ تھا۔

اوتھیلو:۔ واقف کیوں نہ ہوتا وہ اکثر ہم دونوں کے درمیان بات چیت کا ذریعہ رہتا تھا۔

ایاگو:۔ واقعی بجا ہے۔

اوتھیلو:۔ یہ تم نے 'واقعی' اور 'بجا' کس لہجے میں کہا۔ کیا تمھیں کوئی بات کاسیو کی ایمانداری کے خلاف دریافت ہوئی ہے؟

ایاگو:۔ نہیں حضور۔ اس کی ایمانداری میں کس کو شبہ گذر سکتا ہے۔

اوتھیلو:۔ ہاں اس میں ذرا شبہ نہیں کہ وہ سچا اور ایماندار آدمی ہے۔

ایاگو:۔ حضور مجھے اس کا علم نہیں۔

اوتھیلو:۔ آخر تمھارا اس کی نسبت کیا خیال ہے؟

ایاگو:۔ کیا خیال ہے؟

اوتھیلو:۔ ایں کیا خیال ہے؟ یہ تو جو جملہ میں کہتا ہوں اسی کو تم دوہرا دیتے ہو۔ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے دل میں کوئی بھوت ایسا کالا اور ہیبت ناک گھس بیٹھا ہے جس کی صورت تم دوسروں کو دکھانی نہیں چاہتے۔ تمھارا مطلب کچھ ضرور ہے گو وہ تم کہتے نہیں ابھی ابھی جس وقت کاسیو میری بیوی کے پاس سے ہٹا ہے تم نے کہا تھا کہ یہ بات مجھے پسند نہیں۔ وہ کیا بات تھی جو تمھیں پسند نہ تھی؟ اور جب میں نے تم سے کہا کہ جس زمانہ میں میں ڈسڈیمونہ سے عشق کرتا تھا تو اس کل زمانہ میں وہ میرا مشیر اور صلاح کار رہا تھا۔ تو تم کہنے لگے بجا ہے۔ اور یہ کہتے ہی تمھارے تیوری پر بل پڑ گیا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ تمھارے دل میں کوئی بڑی ہی خوفناک بات ہے جو تم نے چھپا رکھی ہے۔ اگر تمھیں مجھ سے تعلق ہے تو ضرور اپنے دل کی پوشیدہ بات مجھ پر ظاہر کروگے۔

ایاگو:۔ حضور کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ حضور سے مجھے دلی تعلق ہے۔

اوتھیلو:۔ ہاں سمجھتا تو ایسا ہی ہوں کہ مجھے بھی تم سے انس ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ یہی ہے کہ تم کو بھی مجھ سے تعلق ہے۔ اور یہ تعلق بھی نیک نیتی اور ایمانداری کے ساتھ ہے۔ اور جو بات تم مجھ سے کہتے ہو اس کو پہلے خوب سمجھ بوجھ لیتے ہو۔

اس لئے جب تم رک رک کر بات کرنے لگتے ہو تو تم مجھے اور بھی ڈرا دیتے ہو۔ کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص بات کرنے میں رکتا ہے اور کوئی بات شروع کرکے بار بار بند ہو جاتا ہے تو سننے والے کے دل میں اس حالت کا سبب دریافت کرنیکا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور بات کرنیکا یہ طریقہ زیادہ تر بدطینت اور بے ایمان آدمیوں کا ہوتا ہے اور میں ایسے آدمیوں سے ڈرتا ہوں۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ میں تمھیں ایک وفادار اور سچّا آدمی سمجھ رہا ہوں تقریر میں یہ خفیہ کشمکش و پیچ اور بار بار کچھ کہتے ہوئے رُک رُک جانا وہ چیزیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل کو اپنے خیالات پر پورا قابو نہیں۔ کہ انھیں زبان پر لاسکے۔

ایاگو:۔ انسان کا باطن بھی وہی ہونا چاہیئے جو اس کا ظاہر ہو۔ جس میں یہ بات نہ ہو میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی اسے انسان سمجھے گا۔

اوتھیلو:۔ یقینی انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنا ظاہر اور باطن ایک رکھے۔

ایاگو:۔ تو کاسیو کا ظاہر تو اچھا ہے۔ اس لئے باطن میں بھی غالباً وہ ایماندار ہوگا۔

اوتھیلو:۔ مہربانی کرکے اپنے دلی خیالات سے مجھے آگاہ کرو۔ جو کچھ دل میں ہو وہی کہو۔ اس میں چاہے اپنے بُرے سے بُرے خیالات کو بد سے بدتر الفاظ میں ادا کرنا پڑے۔

ایاگو:۔ مہربان آقا مجھے معاف فرمائیے گا۔ حضور کے ہر حکم کی بجاآوری میرا فرض منصبی ہے۔ لیکن میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جیسے کوئی بُرا آدمی بُرے خیالات خوش ہو کر ظاہر کرتا ہے میں بھی ایسا ہی کروں۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ میرے خیالات بُرے اور غلط ہیں اور باور کر لیا جائے کہ اچھی اور نیک طبیعتوں میں بھی بُرے خیالات گذر سکتے ہیں تو پھر فرمائیے کہ وہ کونسا پاک اور صاف دل ہے جس میں معمولی خیالات کے ساتھ کوئی ناپاک خیال نہ آتا ہو۔ اور جب طبیعت کسی فیصلے پر آمادہ ہو تو معمولی خیالات کے ساتھ ناپاک باتیں بھی دل میں نہ آجاتی ہوں۔

اوتھیلو:۔ تم اپنے دوست کی نسبت بدگمانی اور بدظنی پیدا کراتے ہو۔ سمجھتے ہو کہ اس کے ساتھ بدسلوکی کر رہے ہو مگر یہ بات تم اس پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

ایاگو:۔ حضور! میری گذارش ہے کہ گو بعض وقت میں اتفاق سے اپنے کسی خیال میں غلطی پر ہوں۔ اور میں اس بات کو مانتا ہوں کہ عیب چینی پر مائل رہنا میری طبیعت کا سب سے بڑا سقم ہے اور میرا رشک و حسد اکثر دوسروں میں وہ عیوب دیکھنے لگتا ہے جو فی الواقع کوئی وجود نہیں رکھتے۔ لیکن حضور تو دانا اور ہوشمند ہیں۔ مجھ جیسے کج خیال شخص کی باتوں کا کچھ خیال نہ فرمایا کریں۔ اور نہ میری پریشان خیالی یا غلط مشاہدوں سے اپنے حق میں کوئی آزار پیدا کریں۔ اپنے خیالات سے حضور کو آگاہ کرنا ایسی بات ہے جو نہ تو حضور کی تسلی اور تشفی کا موجب ہو سکتی ہے اور نہ اپنی انسانیت، دیانت اور عقل پر گواہی دیتی ہے۔

اوتھیلو:۔ تو پھر تمھارا مطلب کیا ہوا؟

ایاگو:۔ حضور مرد ہو یا عورت، نیک کرداری اس کی زندگی کا سب سے بڑا جوہر ہوتا ہے۔ جو شخص میری جیب کاٹتا ہے وہ روپیہ چراتا ہے۔ روپیہ بھی ایک چیز ہے مگر حقیقت میں کوئی چیز نہیں۔ ایک وقت میں میرا تھا اب دوسرے کا ہو گیا۔ اور یہی چیز ہزاروں کے ہاتھ میں رہ چکی ہے۔ اور ہزاروں کے پاس رہیگی۔ لیکن جو شخص مجھ سے میری نیکنامی چھینتا ہے وہ مجھے ایک ایسی دولت سے محروم کرتا ہے جو اس کے حق میں دولت نہیں ہو سکتی۔ ایسا شخص واقعی مجھے مفلس کر دیتا ہے۔

اوتھیلو:۔ واللہ کچھ بھی ہو، تمھارے خیالات جو دل میں چھپے ہیں میں ضرور معلوم کرونگا۔

ایاگو:۔ حضور نہیں معلوم کر سکتے۔ اگر میرا دل حضور کی ہتھیلی پر بھی رکھا ہو تب بھی حضور کو ان کا علم نہیں ہو سکتا اور جب تک میرے خیالات میرے قبضے میں ہیں اس وقت تک انہیں معلوم کرنا دوسرے کیلئے ممکن نہیں۔

اوتھیلو:۔ آہ افسوس ہے۔

ایاگو:۔ مفلس اور قانع حقیقت میں دولت مند ہوتے ہیں اور یہی دولت ان کے لئے کافی ہوتی ہے۔

اوتھیلو:۔ ہائے افسوس!

ایاگو:۔ حضور رشک و حسد کی بلاؤں سے ہوشیار رہیں رشک تو وہ سبز چشم درندہ ہوتا ہے جو شکار کو کھانے سے پہلے اس سے کھیلتا ہے۔ اور وہ مرد جسے علم ہے کہ اس کی بیوی حرام کار ہے خوش رہتا ہے۔ گو بیوی سے اسے محبت نہیں رہتی۔ اس شخص

کے اوقات سخت تکلیف اور اذیت میں گذرتے ہیں جس کے دل
میں بیوی کی محبت کے ساتھ اس کی وفاداری کے متعلق شک و
شبہ بھی ہو۔ گو بیوی سے اسے محبت بہت ہوتی ہے۔

اوتھیلو:۔ ارے مصیبت!

ایاگو:۔ جو شخص افلاس کے ساتھ قناعت بھی رکھتا ہے، وہ
کافی دولت مند ہے۔ لیکن اگر اس کے پاس دولت بیکراں بھی
ہو اور اس کو ہر وقت مفلس رہنے کا خوف لگا رہے تو وہ ایسا
ہی مفلس ہے جیسا کہ جاڑے کا موسم پھولوں سے۔ رشک
بُری بلا ہے۔ خدا میری قوم کے ہر متنفس کو اس بلا سے محفوظ
رکھے۔

اوتھیلو:۔ یہ خیال تمہارے دل میں کیونکر آیا۔ کیا تم سمجھتے ہو
کہ میری زندگی رشک و حسد کی زندگی ہے۔ کیا ہر چاند کے گھٹنے
بڑھنے کے ساتھ نئے نئے شکوک و شبہے میرے دل میں آتے
ہیں۔ نہیں جب کسی بات کا ایک مرتبہ دل میں شبہ ہو گیا تو پھر
ادھر یا اُدھر کوئی فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ میں تو انسان کی جگہ
جانور ہونا پسند کروں گا۔ اگر میں اپنی طبیعت کو ایسے بے بنیاد اور
مبالغہ آمیز نتیجوں کی طرف جیسے کہ تمہاری باتوں سے نکلتے ہیں رجوع
کروں۔ اگر کوئی مجھ سے کہے کہ میری بیوی حسین ہے، خوب کھاتی
پیتی پہنتی اوڑھتی ہے دوسروں میں مل کر بیٹھنا پسند کرتی ہے
صاف گو ہے۔ گاتی بجاتی بھی خوب ہے اور ناچتی بھی اچھا ہے
لیکن اگر وہ پاک دامن ہے تو یہ سب باتیں اور خوبیاں ہو جاتی
ہیں۔ اور ان خوبیوں کی وجہ سے مجھے شبہ نہیں ہوتا کہ میری
بیوی مجھ سے سرتابی کریگی۔ کیونکہ جب اس نے مجھے اپنا
شوہر بنانا پسند کیا تھا تو وہ آنکھیں رکھتی تھی۔ لیکن یہ شبہ ایسا
ہے کہ تا وقتیکہ میں اپنی آنکھ سے کوئی بات نہ دیکھ لوں اس
وقت تک میرا دل صاف رہے گا۔ اس میں بال آنا ممکن
نہیں۔ لیکن جب شبہ ثابت ہو گیا تو پھر سوائے اس کے چارہ
نہیں کہ عشق اور رشک دونوں کو ایک دم فنا کر دوں۔

ایاگو:۔ میں یہ سنکر خوش ہوا کیونکہ اب میں پورے ادب اور
تعظیم سے جو میرا فرض ہے حضور کی خدمت زیادہ آزادی اور
صفائی سے کر سکوں گا۔ اور جب کہ میرا فرض منصبی ہے حضور
مجھ سے سنئیں۔ میں ابھی تک کسی ثبوت کی نسبت کوئی بات
عرض نہیں کر سکتا۔ صرف اتنا کہتا ہوں کہ حضور اپنی اہلیہ کا خیال
رکھیں بالخصوص اس وقت جبکہ کاسیو کے ساتھ ہو۔ اور اپنے
تیور ایسے رکھئے جس سے رشک ظاہر نہ ہو۔ میں اپنے ملک والوں کے
اطوار اور مزاج سے بخوبی واقف ہوں۔ وینس میں ایسی ایسی
عورتیں ہیں جو اپنی حرکتیں آسمان کو تو دکھا دیں لیکن اپنے شوہروں
کو نظر نہ آنے دیں۔ جو بات کرتی ہے اسے بغیر کئے نہ چھوڑیں مگر
کسی کو خبر نہ ہونے دیں۔

اوتھیلو:۔ کیا تم اپنے وطن کی عورتوں کی نسبت ایسی بات
کہتے ہو۔

ایاگو:۔ آپ سے شادی کرنے میں اس نے اپنے باپ کو دھوکا
دیا۔ اور جس حالت میں کہ وہ آپ کی نظروں کو دیکھکر خوف سے
لرزنے لگتی تھی وہی وقت تھا کہ آپ کے ساتھ اس کا عشق سب سے
زیادہ زور پر تھا۔

اوتھیلو:۔ ہاں اسے عشق تو ایسا ہی تھا۔

ایاگو:۔ بس اسی سے سمجھ لیں جبکہ کم سنی میں وہ اس غضب
کی تھی کہ باپ کے دیدوں میں خاک ڈالی اور باپ اسی خیال
میں رہا کہ لڑکی پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ لیکن یہ باتیں میں ایسی
کہہ رہا ہوں کہ خود مجرم ٹھیرتا ہوں۔ آقا میں حضور سے معافی
مانگتا ہوں۔ اور میرا قصور جس کی معافی چاہتا ہوں صرف اتنا
ہے کہ مجھے حضور سے محبت بہت ہے۔

اوتھیلو:۔ میں تمہاری اس توجہ اور محبت کا شکر گذار ہوں۔

ایاگو:۔ میں دیکھتا ہوں کہ میری باتوں سے حضور کی طبیعت
کسی قدر افسردہ ہو گئی ہے۔

اوتھیلو:۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔

ایاگو:۔ نہیں واللہ مجھے خوف ہے کہ حضور میری باتوں سے
مکدر ہو چلے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ حضور اپنا خیال دُور کر دینگے۔
جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ حضور کی محبت کی وجہ سے عرض
کیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ حضور پر میری باتوں کا برا اثر ہے
مگر میری گذارش یہی ہے کہ اس وقت جو کچھ عرض کر رہا ہوں
اس سے کوئی برا نتیجہ نہ نکالیں اور اس کو شبہ کی حد سے آگے
نہ بڑھنے دیں۔

اوتھیلو:۔ ہاں میں اسے اسی حد تک سمجھ رہا ہوں۔

ایاگو:۔ اگر حضور نے اسے شبہ کی حد سے زیادہ سمجھا تو
میری باتوں سے وہ قبیح نتائج پیدا ہو سکتے ہیں جو ہر گز میرا

مقصود نہیں۔ کاسیو میرا بڑا لائق دوست ہے۔ حضور میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی طبیعت پر زیادہ اثر ہے۔

اوتھیلو:۔ نہیں کچھ زیادہ اثر نہیں۔ میں ڈسڈیمونہ کو ہر حال میں پاک دامن سمجھتا ہوں۔

ایاگو:۔ خدا کرے وہ مدت تک پاک دامن رہے اور حضور کی عمر دراز ہو کہ اُسے ایسا ہی دیکھیں۔

اوتھیلو:۔ مگر اس پر بھی فطرت کسی غلطی میں پڑنا چاہتی ہے۔

ایاگو:۔ حضور بات یہی ہے۔ اگر یہ ناچیز بیباک ہو کر حضور سے کچھ عرض کرے تو کہہ سکتا ہے کہ شادیوں کے بہت سے پیغام اپنے ہی ملک اور رنگ اور ہم درجہ لوگوں کے آئے۔ اور یہ ملک رنگ اور درجہ کا ایک ہونا ایسا تعلق ہے جو فطرت کی تمام چیزوں میں موجود ہے۔ مگر اس نے کسی کو قبول نہ کیا۔ واللہ اس ہٹ اور ضد سے بہت سے نامناسب غیر موزوں اور غیر فطری خیالات محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے معاف فرمائیے گا میرے لئے نامناسب ہوگا کہ میں صاف طور پر اس کی نسبت کوئی خیال ظاہر کروں۔ لیکن مجھے اس کی طبیعت سے یہ خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہیں وہ اس بات کو قرین انصاف نہ سمجھنے لگے۔ کہ اپنے کسی اہل وطن کی صورت و شکل سے آپ کی صورت و شکل کا مقابلہ کرے اور پھر پشیمان ہو۔

اوتھیلو:۔ اچھا اب رخصت۔ خدا حافظ۔ اگر کوئی بات تمھیں معلوم ہو تو مجھے آگاہ کرتے رہنا۔ تم اپنی بیوی سے کہدو کہ اس پر نظر رکھے۔ ایاگو تم اس وقت میرے پاس سے جاؤ۔

ایاگو:۔ (رخصت ہوتے وقت کہتا ہے) آقا میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

اوتھیلو:۔ افسوس میں نے شادی کیوں کی تھی۔ یہ شخص جو ایماندار ہے جتنی بات کہتا ہے اس سے کہیں زیادہ کا علم وہ رکھتا ہے۔

ایاگو:۔ (پھر واپس آتا ہے) آقائے من! میری حضور سے درخواست ہے کہ اس باب میں حضور اب زیادہ غور و خوض نہ کریں۔ جو کچھ ہونیوالا ہوا اسے وقت پر چھوڑ دیں۔ گو مناسب یہی ہے کہ کاسیو اپنی جگہ پر بحال کردیا جائے۔ کیونکہ اس میں ذرا شک نہیں کہ وہ بڑی لیاقت سے اپنی جگہ پر کام کرتا تھا لیکن اس پر بھی اگر آپ کچھ دنوں اس کے بحال کرنے میں توقف کریں گے تو پھر آپ خود اسے اور جو ذرائع وہ کام میں لاتا ہے انھیں معلوم کرلیں گے۔ اگر حضور کی بیگم صاحبہ اس کی سفارش پر زیادہ زور دیں تو اس بات سے بھی بہت کچھ ظاہر ہو جائیگا۔ حضور خیال فرمادیں کہ میں خود بھی طرح طرح کے خوف اور اندیشے میں مبتلا رہوں گا کیونکہ خوف اور اندیشے کی وجہ میرے لئے کافی ہے۔ لیکن حضور اس زمانہ میں اپنی بیگم صاحبہ کو بالکل معصوم اور بیگناہ تصور کریں۔ اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں محض حضور کی محبت کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔

اوتھیلو:۔ میری طرف سے تم مطمئن رہو۔ مجھے اپنی طبیعت پر پورا قابو ہے۔

ایاگو:۔ میں پھر رخصت چاہتا ہوں۔

اوتھیلو:۔ یہ شخص نہایت سچا اور ایماندار ہے۔ اور بڑی ذہانت اور دانائی سے انسان کے ایمان اور دل کی برائیوں سے واقف ہے۔ ڈسڈیمونہ کاش تو شاہین ہوتی جس کی وحشت کھوکر اُسے رام کرنا ممکن ہوتا۔ پھر چاہے تو مضبوط تسموں سے میرے ہاتھ پر بندھی ہوتی تب بھی ان بندشوں کو توڑ کر میں تجھے آزاد کردیتا کہ اپنی بہتری کی تلاش میں جس طرف چاہے پرواز کرے۔ ممکن ہے کہ میری اس سیاہ رنگت نے میری گفتگو میں وہ شیرینی اور نرمی پیدا نہ کی ہو جو حسینوں میں اٹھنے بیٹھنے والوں کی گفتگو میں ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ اب وادیِ حیات میں عمر کا آفتاب بہت ڈھل چکا ہے۔ ہائے تو نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ اب تجھ سے مفارقت ہوگئی۔ میرے نام کو داغ لگایا۔ اب بجز اس کے چارہ ہی کیا ہے کہ میں اپنے زخمی دل کو تجھ سے نفرت کرکے تسلی دیا کروں۔ شادی!!! تجھ پر لعنت ہے۔ ان مہوشوں کے حسن و نزاکت کو ہم اپنا سمجھتے ہیں مگر ان کی خواہشوں پر ہمیں قابو نہیں ہوتا۔ کاش میں کسی زندانِ تاریک کی ظلمت اور رطوبت میں زندگی بسر کرتا ہوتا۔ مگر جس چیز سے محبت تھی اس کا گوشۂ دل جو اب دوسروں کے آرام کیلئے ہے میرا مسکن نہ ہوتا۔ مردوں کے ساتھ ان کی بیویوں کی بیوفائی ایسی چیز ہے جس سے کیا اعلیٰ اور کیا ادنیٰ کسی طبقے کو بھی مفر نہیں۔ مردوں کیلئے یہ مصیبت موت کی طرح ناگزیر ہے۔ اور ان کیلئے یہی بیوفائی ان کے سروں پر زندگی بھر کانٹوں کا تاج بنی رہتی ہے۔ دیکھو ڈسڈیمونہ آرہی ہے۔

(ڈسڈیمونہ اور ایمیلیا اندر آتی ہیں)

اوتھیلو :۔ ہائے یہ صورت اور بیوفائی کرے۔ اس میں تو آسمان خود اپنا مضحکہ کرتا ہے۔ میں ہرگز یقین نہ کروں گا کہ وہ بیوفا ہے۔
وسدیمونہ :۔ کہو پیارے اوتھیلو آپ کی ضیافت اور فرحت کے جن دوستوں کو آپ نے اس میں مدعو کیا تھا وہ سب آپ کے انتظار میں ہیں۔
اوتھیلو :۔ ہاں قصور میرا ہے۔
وسدیمونہ :۔ کیوں آواز اتنی نحیف کیوں ہے ؟ کیا کچھ جی اچھا نہیں ؟
اوتھیلو :۔ ہاں پیشانی میں ادھر کو درد ہو رہا ہے۔
وسدیمونہ :۔ نگرانیاں اور معائنہ کرتے کرتے یہ درد ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں جاتا رہے گا۔ سر کو کسی کپڑے سے مضبوط باندھئے گھڑی بھر میں درد جاتا رہے گا۔
اوتھیلو :۔ تمھارا رومال چھوٹا ہے۔

(رومال اتار دیتا ہے اور وہ زمین پر گر جاتا ہے)

جانے دو۔ میں تمھارے ساتھ اندر چلتا ہوں۔
وسدیمونہ :۔ یہ دیکھ کر کہ آپ کا مزاج اچھا نہیں مجھے بڑا فکر ہو گیا۔

(اوتھیلو اور وسدیمونہ چلے جاتے ہیں)

امیلیا :۔ واہ واہ یہ رومال تو خوب ملا۔ بڑا جی خوش ہوا یہی سب سے پہلا تحفہ تھا جو مراکشی نے وسدیمونہ کو دیا تھا۔ میرے اس بدراہ شوہر نے سینکڑوں دفعہ مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں اس رومال کو کسی طرح چرالوں۔ لیکن وسدیمونہ کو اپنے شوہر کے دیئے ہوئے اس تحفہ کا بے حد خیال رہتا تھا اور وہ اس کی نہایت درجہ قدر کرتی تھی۔ کیونکہ شوہر نے دیتے وقت کہدیا تھا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھے۔ اس لئے وہ کبھی اس رومال کو جدا نہ کرتی تھی۔ ہمیشہ چوم چوم کر اسے کلیجہ سے لگاتی تھی اور اس سے باتیں بھی کیا کرتی تھی۔ جو کام اس رومال پر بنا ہے اس کی میں ایک نقل لوں گی۔ اور پھر رومال ایاگو کو دوں گی۔ نہیں معلوم وہ اس کا کیا کرے گا۔ اس کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ مجھے تو صرف اسے خوش کرنا منظور ہے۔

(ایاگو پھر اندر آتا ہے)

ایاگو :۔ کیوں اکیلی بیٹھی کیا کرتی ہو ؟
امیلیا :۔ بس آئے مجھے ستانے۔ تمھارے لئے ایک چیز ہاتھ لگی ہے۔
ایاگو :۔ میرے لئے اور کوئی چیز ! یہ تو معمولی بات ہے۔
امیلیا :۔ معمولی کیا بات ہے ؟
ایاگو :۔ کہ کسی کو بیوقوف جورو ملے۔
امیلیا :۔ واہ بس یہی انعام دیا۔ اچھا بتاؤ اس رومال کیلئے کیا دوگے ؟
ایاگو :۔ کونسے رومال کیلئے ؟
امیلیا :۔ کونسا رومال ؟ گویا بھول ہی گئے۔ وہی رومال جو مراکشی نے وسدیمونہ کو دیا تھا۔ جس کیلئے تم بار بار کہہ چکے تھے کہ اسے میں کسی طرح چرالوں۔
ایاگو :۔ تو کیا وسدیمونہ کے پاس سے چرالیا ؟
امیلیا :۔ نہیں۔ انجانی میں ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ میں وہاں موجود تھی میں نے چپکے سے اسے اٹھالیا چرایا نہیں۔ دیکھو یہی وہ رومال ہے نا ؟
ایاگو :۔ تم بڑی اچھی بیوی ہو رومال مجھے دو۔
امیلیا :۔ پہلے بتاؤ اس کے عوض میں مجھے دوگے کیا ؟ تم تو اس کے چرانے کیلئے بار بار تاکید کر چکے تھے۔
ایاگو :۔ (امیلیا کے ہاتھ سے رومال اُچک لیتا ہے) تمھیں اس سے کیا کہ میں کیا کروں گا۔
امیلیا :۔ دیکھو اگر اس سے کوئی بڑا کام لینا ہے تو لیکر پھر مجھے دیدینا۔ اگر کہیں بیگم کو معلوم ہو گیا کہ رومال اس کے پاس سے چلا گیا ہے تو وہ اس رنج میں دیوانی ہو جائیگی۔
ایاگو :۔ تمھیں پوچھنے سے کیا مطلب کہ میں اس سے کیا کام لونگا مگر کام لینا اس سے ضرور ہے۔ بس اب تم میرے پاس سے چلی جاؤ۔

(امیلیا چلی جاتی ہے)

میں کاسیو کے گھر میں یہ رومال اس طرح ڈال دونگا کہ اسے پڑا مل جائے۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جو ہوا سے بھی ہلکی ہوتی ہیں جب دل میں رشک پہلے سے موجود ہو تو پھر وہ کتاب مقدس کی آیتوں کی طرح صحیح اور برحق مانی جاتی ہیں۔ اس سے میرا کام نکل جائیگا۔ جتنا زہر مراکشی کو اب تک دے چکا ہوں اس سے اس کا رنگ بدلا نظر آتا ہے۔ خطرناک باتیں اپنی تاثیر میں زہر ہوا کرتی ہیں۔ یہ زہر پہلے کھانے میں بدمزہ نہیں معلوم

ہوتا۔ پھر جہاں خون میں اس نے اپنا تھوڑا سا بھی اثر کیا تو خون
اس طرح جلنے لگتا ہے جیسے گندھک کی کان میں آگ لگی ہو۔
یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ لو وہ اوتھیلو خود آ رہا ہے۔

(اوتھیلو اندر آتا ہے)

افیون، ایلو ایا دنیا بھر کی خواب آور چیزیں جتنی بھی ہوں
اب تجھے وہ میٹھی نیند نہیں سلا سکتیں جو کل تک تو سویا تھا۔

اوتھیلو:۔ ہا ہا۔ میرے ساتھ بیوفائی کرے۔

ایاگو:۔ اب اس کا ذکر آپ کیوں کرتے ہیں۔

اوتھیلو:۔ دور ہو بے ایمان تو نے مجھے شکنجے میں کس رکھا ہے۔
مجھے معلوم ہے کہ تھوڑی سی برائی سننے کی جگہ بہت سی برائیاں
سننی بہتر ہوتی ہیں۔

ایاگو:۔ آقا کیا بات ہے؟

اوتھیلو:۔ میں کیسے مان لوں کہ ڈسڈیمونہ مجھ سے آنکھ بچا کر
کاسیو سے ہمکنار رہوئی۔ میں نے یہ بات نہ کبھی دیکھی نہ میرے
خیال میں گذری، نہ مجھے اس سے کوئی ضرر پہنچا۔ جس رات کو
کہا جاتا ہے کہ کاسیو سے ہمکنار ہوئی اس کی دوسری رات کو وہ
اچھی طرح سوئی۔ دل ہلکا اور خوش تھا۔ کاسیو کے بوسوں کے
نشان اس کے لبوں پر نہ تھے۔ اگر کسی کا مال چوری گیا ہو اور جو
کچھ چوری گیا ہو اس کے سرقہ ہونے کی خبر مالک کو نہ ہو تو پھر بہتر یہی ہوتا
ہے کہ اس چوری کا علم اسے نہ ہونے دیا جائے۔ اور وہ یہی سمجھتا
رہے کہ کوئی چیز اس کی چوری نہیں گئی۔

ایاگو:۔ حضور کی زبان سے ایسا سن کر مجھے افسوس ہوا۔

اوتھیلو:۔ بہ تو یہ، میں تو یہ سنکر خوش ہوتا کہ لشکر کا ہر سپاہی
خواہ ادنیٰ خواہ اعلیٰ اس کے شیریں جسم سے لذت یاب ہوتا مگر شرط
یہی تھی کہ اس کا ذکر مجھ سے نہ ہوتا۔ لیکن اب اے اطمینانِ خاطر
اور سکونِ قلب تجھ سے ہمیشہ کو جدائی ہوتی ہے۔ اور اے
مسلح لشکر اور بڑی بڑی خون ریز لڑائیو جن میں شرکت کرنا،
حبِ جاہ و منزلت کی سب سے بڑی نیکی سمجھی جاتی ہے، تم سب
ہمیشہ کو رخصت چاہتا ہوں۔ اور اے لڑائی کے آراستہ و
پیراستہ توسنو تم سے بھی وداع ہوتا ہوں۔ اور اے تیز
آواز والے نفیر و قرنا، طبل و ڈھول جن کی گرج سے دل میں
جوش پیدا ہوتا تھا اور ان تمام چیزوں سے جو خون ریز لڑائیوں
میں صولت و حشمت کی وجہ ہوتی تھیں تم سب سے الوداع۔
اور اے موت افگن آتش بار توپو جن کے خوفناک حلق سے غیر فانی
خدائے جوپیٹر کی رعد و گرج کی ہیبت ناک آوازیں پیدا ہوتی ہیں
تم سے بھی رخصت۔ اوتھیلو کی سپہ گری اور اس کا کام ختم
ہوا۔

ایاگو:۔ کیا حضور ایسا ممکن ہے؟

اوتھیلو:۔ خبیث سمجھ لے جب تک تو کسی عینی شہادت سے میری
محبوبہ کو حرام کار ثابت نہ کرو گا تو پھر انسان کی روحِ غیر فانی کی قسم
کھا کر کہتا ہوں کہ پیشتر اس کے کہ میرا قہر و غضب بیدار ہو کر تجھے غارت
کرے تو بجائے انسان ہونے کے ایک کتا پیدا ہوا ہوتا۔

ایاگو:۔ لیجئے نوبت یہاں تک پہونچ گئی۔

اوتھیلو:۔ مجھے اسے حرام کاری کی حالت میں دکھا دے یا
کم سے کم اس کی اس حالت کا ثبوت پیش کر اور یہ ثبوت ایسا ہو
کہ اس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہ رہے ورنہ پھر اپنی جان
سے ہاتھ دھولے۔

ایاگو:۔ میرے شریف آقا!

اوتھیلو:۔ اگر تو اس پر بہتان بندی کرتا ہے تاکہ مجھے ایذا پہنچائے
تو پھر کبھی خدا کے سامنے تو اپنا سر زمین پر نہ رکھیو۔ پشیمانی اور
ندامت سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو کر عذاب پر عذاب اور ہول پر
ہول طاری کر، یہ کام ایسا ہو کہ آسمان بھی اس پر گریہ کرے اور روئے
زمین خوف زدہ ہو جائے کیونکہ میری ابدی ہلاکت کیلئے اس سے
بدتر کوئی دوسرا کام نہیں ہو سکتا۔

ایاگو:۔ اے خدا، اے عرش، اے آسمان میرا قصور معاف
کرو۔ کیا آپ انسان ہیں کیا آپ عقل و روح رکھتے ہیں؟ خدا
آپ کا ساتھ نہ چھوڑے۔ زیادہ کیا ہوگا میری جگہ لے لیجئے گا۔
ایاگو! ارے مصیبت زدہ احمق جو اس لئے زندہ ہے کہ اپنی ایمان
داری اور دیانت داری کو بے ایمانی ثابت کرے۔ اے بدکار دنیا
اس بات کو یاد رکھ۔ اور اے بے ایمان دنیا ہرگز نہ بھول کہ صاف
گوئی اور ایمان داری میں سلامتی نہیں۔ حضور کی اس توجہ اور
نوازش کا میں ممنون ہوں۔ اب میں کسی دوست سے محبت
نہ کروں گا۔ کیونکہ محبت میں بڑے بڑے خطرے ہیں۔

اوتھیلو:۔ نہیں ایماندار رہنا تمہارا فرض ہے۔

ایاگو:۔ نہیں مجھے ہوشیار رہنا چاہئے کیونکہ ایمانداری دراصل
حماقت ہے۔ اور اس میں وہ چیز ہاتھ سے جاتی ہے جس کیلئے

ایمانداری کی گئی تھی۔

اوتھیلو:۔ دُنیا، دنی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اپنی بیوی کو باوفا بھی سمجھتا ہوں اور بیوفا بھی۔ کبھی خیال کرتا ہوں کہ ایاگو تم سچے ہو۔ اور ساتھ ہی خیال آتا ہے کہ تم سچے نہیں ہو۔ بہرکیف مجھے کوئی ثبوت ملنا ضروری ہے۔ دسدمیونا جس کے نام میں دینی داینا کے چہرے کی سی تازگی تھی وہ اب ایسا ہی سیاہ اور تاریک نظر آتا ہے جیسا کہ میں سیاہ فام ہوں۔ چھریاں سیال انگارے، زہریا وہ ندیاں جس میں خطاکاروں کو غرق کرتے ہیں۔ ان سب کو میں برداشت کرلیتا مگر دسدمیونا کی بیوفائی اس وقت تک برداشت نہیں ہو سکے گی جب تک کہ میرا اطمینان نہ ہو جائے۔

ایاگو:۔ حضور میں دیکھتا ہوں کہ غصے اور تکلیف نے آپ پر غلبہ پالیا ہے۔ میں سخت نادم ہوں کہ میں نے کیوں آپ سے اس بات کا ذکر کیا۔ آپ اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں؟

اوتھیلو:۔ چاہنا کیسا، ضرور اطمینان کروں گا۔

ایاگو:۔ درست ہے۔ مگر حضور کا اطمینان کیسے ہو؟ اگر الزام اور صحیح واقعات حقیقت کے دروازہ تک رہنمائی کریں تو پھر آپ کا اطمینان ضرور ہو جائیگا۔ بہتر ہے اب ایسا ہی ہوگا۔

اوتھیلو:۔ مجھے ایک بیّن اور زندہ ثبوت اس کی بے وفائی کا ملنا چاہیئے۔

ایاگو:۔ گو میں اس کام کو پسند نہیں کرتا مگر چونکہ اس معاملے میں مجھے ایک بڑی حد تک دخل ہو چکا ہے۔ اور میں نے اپنی احمقانہ دیانت اور حضور کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ایسا کیا ہے پس میں اس معاملے کو آگے نہ بڑھاؤں گا۔ سنیئے کچھ عرصہ ہوتا ہے کہ کاسیو کے پاس میں پڑا سوتا تھا۔ ڈاڑھ کے درد کی تکلیف سے مجھے رات بھر نیند نہ آئی۔ بعض آدمی ایسی سیدھی طبیعتوں کے ہوتے ہیں جو نیند میں آپ سے آپ اپنے دل کی باتیں کہنے لگتے ہیں۔ کاسیو بھی اسی طبیعت کا آدمی ہے۔ نیند میں میں نے اُسے یہ کہتے سُنا کہ "اے میری پیاری دسدمیونہ تمھیں ہوشیار رہنا چاہیئے کہ اپنے عشق و محبت کا راز مخفی رکھنا ضروری ہے" پھر حضور اس نے دونوں ہاتھ پکڑ کر مجھے ہلایا اور کہنے لگا "اے پیاری حسین جان" اور پھر وہ مجھے چمٹ کر پیار کرنے لگا۔ اور میرے لبوں کو زور سے چوم کر اور آہیں بھر کر کہنے لگا "لعنت ہے اس تقدیر پر جس نے تجھے مراکشی کے حوالے کیا"

اوتھیلو:۔ ارے غضب غضب۔

ایاگو:۔ مگر یہ کاسیو کا ایک خواب تھا۔

اوتھیلو:۔ یہ درست ہے مگر اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قصد پہلے کیا تھا۔ چونکہ یہ محض خواب تھا اس لئے اصلی بات پھر بھی شک و شبہ میں رہ جاتی ہے۔

ایاگو:۔ مگر یہ واقعہ ضعیف ثبوت کو قوی کرتا ہے۔

اوتھیلو:۔ میں ایک ایک کر کے پرخچے اڑادوں گا۔

ایاگو:۔ نہیں۔ مگر عقل سے کام لیجئے۔ ممکن ہے کہ اس میں بھی کوئی بات تہ کی نہ ملے۔ ممکن ہے کہ اس پر بھی وہ باوفا ہو۔ کیا حضور نے وہ رومال اپنی بیگم کے ہاتھ میں نہیں دیکھا جس پر پھول کڑھے تھے۔

اوتھیلو:۔ ہاں کچھ یاد آتا ہے کہ ایک پھول کڑھا رومال میں نے اُسے بطور تحفے کے دیا تھا اور وہ میرا سب سے پہلا تحفہ تھا۔

ایاگو:۔ مجھے یہ کچھ نہیں معلوم۔ مگر ویسے ہی ایک رومال کا خیال آیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رومال آپکی بیگم صاحبہ کا تھا۔ آج میں نے کاسیو کو دیکھا کہ اسی رومال سے وہ اپنی ڈاڑھی پونچھ رہا تھا۔

اوتھیلو:۔ تو کیا رومال واقعی وہی تھا؟

ایاگو:۔ ممکن ہے وہی ہو یا کوئی اور ہو، مگر تھا وہ دسدمیونہ کا۔ تو یہ بات بھی جہاں اور ثبوت موجود ہیں اس کے خلاف پڑتی ہے۔

اوتھیلو:۔ کاش اس خبیث کاسیو کی ایک ہزار جانیں ہوتیں۔ صرف ایک جان لیکر میرا انتقام پورا نہ ہو سکے گا۔ اچھا اب میں دیکھتا ہوں کہ واقعہ سچ ہے۔ ایاگو ادھر دیکھو، میں اس طرح ایک پھونک مار کر اپنے تمام عشق و الفت کو آسمان کی طرف اڑائے دیتا ہوں۔ ہاں دیکھو وہ اٹھ کر آسمان تک پہنچ گیا۔ اے انتقام سیہ کار اپنے تاریک حجرے سے باہر نکل۔ اور اے عشق اپنے سر کا تاج اور دل کا تخت ظالمانہ نفرت اور عداوت کے حوالے کردے۔ اور اے حسرت بھرے سینے پر ایک اور بوجھ رکھ۔ اور یہ بوجھ زہریلے دندانِ مار کا ہے۔

ایاگو:۔ حضور ذرا صبر سے کام لیں۔

اوتھیلو:۔ خون! خون! خون!

ایاگو:۔ میں کہتا ہوں کہ ابھی صبر کیجیئے۔ ممکن ہے کہ آپکی طبیعت

کا حال جو اس وقت ہے آئندہ نہ رہے۔

اوتھیلو:۔ نہیں ایاگو نہیں۔ بحر بنطش کی سرد اور برفانی موج کی طرح جو بڑھکر گھٹنا نہیں جانتی اور تڑپتی ہوئی مارمورا اور دانیال کی سمندر ول کی طرف بڑھتی ہے اسی طرح میرے خونی خیالات مجھ میں ترقی پکڑتے جاتے ہیں۔ اور ان میں عشق کو ذلیل و خوار کرنے کیلئے اس وقت تک فرق نہ آئیگا جب تک میرا انتقام کُل دشمنوں کو غارت نہ کردیگا اور جب تک ان دشمنوں کو غارت نہ کرلوں گا میرے خونی خیالات کم نہ ہوں گے۔ اور اسے فلکِ درخشاں تیری قسم کھا کر کہتا ہوں (اتنا کہہ کر اوتھیلو تعظیم اور ادب سے جھکتا ہے) کہ اپنے قول اور وعدے کا لحاظ اور ادب کر کے اس کے الفاظ کا اپنے کو پابند کرتا ہوں۔

ایاگو:۔ حضور ابھی اٹھیں نہیں۔ (ایاگو بھی اوتھیلو کی طرح جُھک کر کہتا ہے) اے سر کے اوپر آسمان کے چمکتے تارو اور اے عناصرِ فطرت جو ہمیں ہر طرف سے حلقہ کئے ہوئے ہیں گواہ رہو کہ ایاگو جس قدر عقل قوت اور ہمت رکھتا ہے وہ کُل اس عاشقِ ناکام کی خدمت کیلئے پیش کرتا ہے۔ اٹھئے اور حکم دیجئے۔ اور حکم کی بجا آوری میرے دل کے رحم اور شرافت کی دلیل ہوگی۔ خواہ واقعات کیسے ہی خونی اور خوں ریز ثابت ہوں۔ (دونوں اٹھتے ہیں)

اوتھیلو:۔ میں تمھاری محبت کو تسلیم کرتا ہوں۔ میری یہ شکر گذاری فضول نہیں ہے۔ تم فوراً اس کی فیاضی کی آزمائش کرلوگے۔ سُن لو کہ تین دن کے اندر تمھیں معلوم ہو جائیگا کہ کاسیو زندہ نہیں ہے

ایاگو:۔ افسوس افسوس۔ میرا دوست جان سے مارا جائیگا۔ کاسیو کی موت تو اس کی مرضی سے ہوئی مگر حضور وسدیمونہ کو تو زندہ رہنے دیجئے۔

اوتھیلو:۔ جہنم میں جائے وہ بدکار، دوزخ کا کندہ بزودہ شغل آؤ ذرا میرے ساتھ چلو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس ظالم حسینہ کی موت کیلئے ایسا ذریعہ جو جلد اور آسانی سے کارگر ہو دریافت کروں۔ ایاگو آج سے تمھیں میں اپنا نائب مقرر کرتا ہوں۔

چوتھا منظر

قصر کے سامنے

وسدیمونہ، امیلیا اور ایک مسخرہ آتا ہے

وسدیمونہ:۔ کیوں صاحب تمھیں معلوم ہے نائب کاسیو کا خیمہ کہاں ہے؟

مسخرا:۔ یہ بتانا کہ اس کا خیمہ کہاں ہے جھوٹ بولنے کے برابر ہے۔

وسدیمونہ:۔ یہ کیونکر؟

مسخرا:۔ وہ سپاہی پیشہ ٹھیرا۔ اور سپاہی کی نسبت کہنا کہ وہ جھوٹا ہے اس کے معنی یہ ہونگے کہ چھُری کا زخم خود کھانا پڑے۔

وسدیمونہ:۔ تم بھی کچھ عجیب آدمی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ وہ رہتا کہاں ہے؟

مسخرا:۔ یہ بتانا کہ وہ کہاں رہتا ہے میرے لئے جھوٹ بولنا ہوگا۔

وسدیمونہ:۔ آخر تمھاری بات کا مطلب کیا ہوا؟

مسخرہ:۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے؟ اور اپنے دل سے گھڑ کر بتاتا کہ وہ وہاں رہتا ہے میرے لئے جھوٹ بولنا ہوا۔

وسدیمونہ:۔ کیا تم کسی سے دریافت کر کے اس کا مکان بتا سکتے ہو؟

مسخرا:۔ جی ہاں تمام دُنیا میں میں اس کا آتہ پتہ پوچھتا رہوں گا ہر کسی سے دریافت کرتا رہوں گا اور جو کچھ معلوم ہوگا اسے آپ سے کہتا رہوں گا۔

وسدیمونہ:۔ اچھا اسے تلاش کرو۔ جب وہ ملے تو اُسے کہنا کہ یہاں آئے۔ میں نے اپنے شوہر سے اس کی سفارش کی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ سب کام ٹھیک ہو جائیگا۔

مسخرہ:۔ یہ کام تو انسان کی طاقت میں ہے اور میں اس میں کوشش کروں گا۔ (چلا جاتا ہے)

وسدیمونہ:۔ امیلیا خدا جانے وہ رومال میں نے کہاں پھینکدیا؟

امیلیا:۔ بیگم مجھے کیا خبر؟

وسدیمونہ:۔ یقین مانو اگر اشرفیوں کی بھری تھیلی بھی گم ہو جاتی تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا۔ لیکن میرا شریف شوہر دل کا سچا ہے اور اس میں وہ کمینہ پن جو بات بات پر شک و شبہ رکھنے والوں کی طبیعت میں ہوتا ہے نہیں ہے۔

امیلیا:۔ کیوں کیا اوتھیلو میں رشک نہیں ہے؟

وسدیمونہ:۔ میرے شوہر میں اور رشک! میں تو سمجھتی ہوں کہ جس مُلک میں وہ پیدا ہوا تھا وہاں آفتاب کی حدت نے رشک و حسد کی خبیث رطوبتوں کو خشک کر دیا تھا۔

امیلیا:۔ لیجئے اوتھیلو خود تشریف لا رہے ہیں۔

(اوتھیلو آتا ہے)

وسدیمونہ:۔ آقا۔ آپ کا مزاج کیسا ہے؟

اوتھیلو:۔ بیگم اچھا ہوں (علیحدہ کہتا ہے) ہائے بناوٹ اور تصنع بھی کیسی مشکل چیزیں ہیں۔ وسدیمونہ تم کیسی ہو؟

وسدیمونہ:۔ آقا اچھی ہوں۔

اوتھیلو:۔ ذرا ہاتھ دو۔ بیگم یہ ہاتھ تو تمھارا پسیجا ہوا ہے۔

وسدیمونہ:۔ ابھی تک نہ تو بڑھاپا آیا ہے نہ کوئی صدمہ اٹھایا ہے۔

اوتھیلو:۔ نہیں۔ اس سے طبیعت کی فیاضی معلوم ہوتی ہے اور یہ کہ دریا دلی بہت ہے۔ گرم بھی ہے اور مرطوب بھی۔ یہ ہاتھ تمھارا ایسا ہے کہ کچھ دنوں کیلئے ترک دُنیا کرو۔ روزوں اور عبادت میں زندگی بسر کرو۔ نفس کُشی کرو تو بہتر ہے۔ اس ہاتھ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی جوان عورت کا ہاتھ ہے اور وہ عورت اس قسم کی ہے کہ تھوڑے سے اغوا میں بدراہ ہو سکتی ہے۔ یہ ہاتھ اچھا اور نیک ہے، اس سے دل کی صفائی معلوم ہوتی ہے۔

وسدیمونہ:۔ آپ جو چاہیں سو فرمائیں۔ مگر یہ وہ ہاتھ ہے جس نے اپنا دل آپ کو دیا تھا۔

اوتھیلو:۔ ہاں یہ فرضی ہاتھ ہے۔ پرانے زمانے میں دل ایسے ہوا کرتے تھے جو ہاتھ میں ہاتھ دیا کرتے تھے اور اب تو یہ حال ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ ہوتے ہیں دل نہیں ہوتے۔

وسدیمونہ:۔ میں اس مضمون میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اب آپ اس بات کی طرف رجوع ہوں جس بات کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔

اوتھیلو:۔ کونسا وعدہ؟

وسدیمونہ:۔ میں نے کاسیو کو بلایا ہے کہ وہ آپ سے گفتگو کرے۔

اوتھیلو:۔ میرا مزاج نادرست ہے۔ ریزش ہونے لگی ہے۔ ذرا رومال دینا۔

وسدیمونہ:۔ لیجئے رومال حاضر ہے۔

اوتھیلو:۔ نہیں یہ رومال نہیں۔ وہ رومال جو میں نے تمھیں دیا تھا۔

وسدیمونہ:۔ وہ تو میرے پاس نہیں ہے۔

اوتھیلو:۔ نہیں ہے؟

وسدیمونہ:۔ آقا وہ نہیں ہے۔

اوتھیلو:۔ یہ تمھارا قصور ہے۔ وہ رومال مصر کی ایک عورت نے میری ماں کو دیا تھا۔ وہ عورت ساحرہ تھی اور آدمیوں کے دلوں کا حال معلوم کر لیتی تھی۔ اس ساحرہ نے رومال دیتے وقت میری ماں سے کہا تھا کہ جب تک یہ رومال تیرے پاس رہے گا تو شوہر کی نظروں میں حسین و دلکش رہے گی اور میرا باپ میری ماں پر شیدا اور شیفتہ رہے گا۔ اگر کھو دیا یا کسی کو تحفے میں دیدیا تو پھر میرے باپ کو میری ماں سے نفرت اور عداوت ہو جائیگی۔ اور وہ اپنے عشق و الفت کیلئے کسی دوسرے کو تلاش کریگا۔ جب میری ماں مرنے کو ہوئی تو رومال مجھے دیا۔ اور مجھ سے کہا کہ جب تیری قسمت میں بیوی کرنا لکھا ہو تو یہ رومال اپنی بیوی کو دیجیو۔ چنانچہ وہ رومال وسدیمونہ میں نے تمھیں دیا۔ اور یہ بھی کہدیا تھا کہ اسکی بڑی حفاظت کرنا۔ اور اسکو ایسا ہی عزیز اور پیارا رکھنا جیسے کہ آنکھوں کے نور کی قدر کی جاتی ہے تو پھر وہ عذاب نازل نہ ہونگے جنکی ہمسری دوسرے عذاب نہ کر سکیں گے۔

وسدیمونہ:۔ کیا یہ سب باتیں ممکن ہیں؟

اوتھیلو:۔ ہاں بالکل سچ ہیں۔ ایک کاہنہ نے جبکہ اسکی عمر دو سو برس کی ہوئی تھی اس رومال کے تانے بانے جادو ڈال کر اسوقت بنا تھا جب کہ جادو اس کے سر پر سوار تھا۔ جن کیڑوں کا ریشم اس میں لگایا گیا ہے وہ پہلے پاک اور پوتر کیا گیا تھا اور وہ رومال ایک ایسے مصالحہ میں رنگا گیا تھا جس میں جوان عورتوں کا خون اور ان کے دل کے ٹکڑے آمیز تھے۔ اور مرنے کے بعد جنکی لاشوں کی ممی بنائی گئی تھی۔

وسدیمونہ:۔ کیا یہ سب باتیں سچ ہیں؟

اوتھیلو:۔ ہاں بالکل سچ ہیں، اس لئے اس رومال کو تلاش کرو۔

وسدیمونہ:۔ تو پھر خدا ایسا کرتا کہ میں اس رومال کو دیکھتی ہی نہیں۔

اوتھیلو:۔ ہائیں یہ کیوں؟

وسدیمونہ:۔ آپ اس طرح غصے میں کیوں بات کرتے ہیں۔

اوتھیلو:۔ کیا وہ کھویا گیا کچھ کہو تو؟ یا کہیں دُور پہنچ گیا اور اب نہیں مل سکتا؟

وسدیمونہ:۔ خدایا مجھ پر رحم کر۔

اوتھیلو:۔ کیا خدا سے دعا مانگتی ہو۔

وسدیمونہ :- وہ کھویا نہیں گیا - یا اگر کھویا بھی گیا ہو تو پھر کیا کروں ؟

اوتھیلو :- کھویا کیسے گیا ؟

وسدیمونہ :- میں کہتی ہوں کہ وہ کھویا نہیں گیا -

اوتھیلو :- تو پھر لاؤ میں اسے دیکھوں گا -

وسدیمونہ :- ہاں میں لا سکتی ہوں مگر اس وقت نہیں - یہ تو آپ کا ایک حیلہ ہے تاکہ جو سفارش میں اس وقت آپ سے کرنا چاہتی تھی وہ ٹل جائے - پھر آپ سے التجا کرتی ہوں کہ کاسیو کو بحال کر دیا جائے -

اوتھیلو :- رومال لا کر دو - میرے دل میں شبہ پیدا ہو گیا ہے -

وسدیمونہ :- رومال کو اس وقت جانے دیجئے - کاسیو کو بحال کر دیجئے - اس سے زیادہ لائق آدمی آپ کو نہیں ملیگا -

اوتھیلو :- رومال لاؤ -

وسدیمونہ :- مہربانی فرما کر اس وقت کاسیو کی بحالی کا ذکر کیجئے -

اوتھیلو :- نہیں رومال کہاں ہے ؟

وسدیمونہ :- کاسیو تو وہ شخص ہے جس نے اس کل زمانہ میں آپ ہی کی محبت اور توجہ سے ترقی کی - آپ کے ساتھ طرح طرح کے خطروں میں شریک رہا -

اوتھیلو :- رومال بتاؤ کہاں ہے ؟

وسدیمونہ :- اور واقعہ یہ ہے کہ سارا الزام آپ پر آتا ہے -

اوتھیلو :- دُور ہو -

امیلیا :- کیا اوتھیلو کے دل میں اس وقت رشک نہیں ہے ؟

وسدیمونہ :- یہ بات تو کبھی میں نے پہلے ان میں دیکھی نہ تھی - معلوم ہوتا ہے کہ اس رومال میں کوئی بھید ہے - اس کے گم ہو جانے سے تو میں بڑے عذاب میں پڑی -

امیلیا :- مرد کا حال سال دو سال کے بعد کھلتا ہے - ہم غذا ہیں اور وہ غذا کیلئے معدے ہیں - بھوک میں ہمیں کھانیکو تیار ہو جاتے ہیں - جب سیر ہو جاتے ہیں تو پھر اُگلنے لگتے ہیں - دیکھئے کاسیو اور ایاگو آ رہے ہیں -

(کاسیو اور ایاگو آتے ہیں)

وسدیمونہ :- کہو اچھے کاسیو اب کیسے ہو ؟

کاسیو :- بیگم میری پہلی گذارش کی نسبت حضور سے التجا ہے اگر بحال کر دیا جاؤں تو دوبارہ زندگی ہو جائے - اور گذارش ہے کہ آقا پھر مجھ پر مہربان کر دیئے جائیں - جن کی عزت ہمیشہ دل سے کرتا رہا ہوں - اس لئے میری بحالی میں تاخیر نہ فرمائی جائے -
اگر میرا قصور ایسا سنگین سمجھا جاتا ہے کہ اس وقت کی میری پریشانیاں اور آئندہ کیلئے ناامیدی اور مایوسی اس قصور کی تلافی نہیں کر سکتی تو پھر مجھے علم ہو جانا چاہئے کہ صبر کر کے تقدیر کے کسی اور راستے پر بھیک مانگوں -

وسدیمونہ :- افسوس - شریفوں کے شریف کاسیو اب میرا آقا وہ آقا نہ رہا - معلوم نہیں جیسا ظاہر میں بدلا ہے ویسا ہی دل میں بھی بدل گیا ہے - اے مقدس اور متبرک روحو میری مدد کرو - مجھ سے جس قدر جلد ممکن تھا میں نے نہایت گرمجوشی سے تمہاری سفارش کی - یہاں تک کہ وہ میری صاف گوئی سے ناراض بھی ہو گئے - اب کچھ دنوں اور صبر کرو جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں تمہارے لئے کرونگی اور پہلے سے بھی زیادہ تمہاری بھلائی کی امیدوار رہونگی - بس میرا اتنا کہنا آپ کیلئے کافی ہوگا -

ایاگو :- کیا آقا کچھ ناراض ہو گئے ہیں ؟

امیلیا :- وہ ابھی ابھی یہاں سے گئے ہیں - کچھ عجیب قسم کا غصہ ان کے چہرے پر ہے -

ایاگو :- کیا انھیں غصہ آ گیا - مگر میں نے تو ان کو اس وقت بھی غصہ کرتے نہ دیکھا تھا جبکہ توپ کے گولوں نے انکی سپاہ کو دھوئیں اڑا دیئے تھے - انھیں تو اس وقت بھی طیش نہ آیا تھا جبکہ ان کا بھائی ان کے پاس کھڑا توپ سے اڑ گیا تھا - وہ ناراض کس طرح ہو سکتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی ہی سخت بات ہوئی ہے کہ اُن کا مزاج برہم ہو گیا - میں ابھی جا کر اُن سے ملاقات کرتا ہوں - اگر وہ واقعی خفا ہو گئے ہیں تو کوئی ایسی ہی سخت بات پیش آئی ہوگی -

(ایاگو چلا جاتا ہے)

وسدیمونہ :- ہاں میں ابھی یہی کہنے کو تھی - وہاں جا کر دریافت کرو - ممکن ہے کوئی سرکاری معاملہ پیش آیا ہو تو معلوم کر کے بتاؤ - ممکن ہے وینس سے کوئی خبر موصول ہوئی ہو - یا نہیں ان کے خلاف کوئی سازش برپا ہوئی ہو جس نے انھیں خفا کر دیا - اور ایسی حالت میں جبکہ پیش نظر کوئی بُری بات ہو تو مرد کا مزاج چھوٹی چھوٹی باتوں پہ بھی بگڑنے لگتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کی ایک انگلی میں درد ہو تو تمام اعضا میں وہی درد و تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے -

انسان خدا تو ہوتے نہیں ۔ اور ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ شادی کے وقت جو قول و قرار انھوں نے کئے تھے اُن پر وہ ثابت قدم رہیں گے ۔ لیکن مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں اس وقت بڑی بدتمائی سے اپنے شوہر کو بُرا کہنے لگی ہوں ۔ اور اس پر نامہربانی کا الزام لگا رہی ہوں ۔ اور میں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ اس کیخلاف جھوٹی شہادت قائم کرکے اس پر غلط الزام قائم کر رہی ہوں ۔

امیلیا :۔ خدا کرے کہ اس کی ناراضی کا سبب کوئی سرکاری بات ہو جیسا کہ آپ کا بھی خیال ہے اور خدا نہ کرے کہ آپ سے کسی قسم کی بدگمانی یا شک ان کے دل میں آیا ہو ۔

وسدیمونہ :۔ ہائے ۔ یہ کیسی بُری گھڑی آگئی ۔ میں نے تو کوئی بات ان کے ناراض کرنیکی کی نہ تھی ۔

امیلیا :۔ مگر جن طبیعتوں میں رشک ایک مرتبہ پیدا ہو گیا پھر اُن کیلئے یہ جواب کافی نہیں ہوا کرتا ۔ رشک کی وجہ جس سے وہ پیدا ہوا ہو نہیں معلوم ہوا کرتی ۔ رشک اپنے پیدا ہونے کی خود وجہ ہوا کرتا ہے. زیادہ سے زیادہ وجہ یہ ہوتی ہے کہ رشک ان کو ستانے لگتا ہے۔ رشک وہ بھوت ہے جس کا پیدا کرنے والا بھی خود رشک ہوا کرتا ہے

وسدیمونہ :۔ خدا اس بھوت کو اوتھیلو سے دُور رکھے ۔

امیلیا :۔ بیگم میں بھی خدا سے یہی دُعا مانگتی ہوں ۔

وسدیمونہ :۔ اچھا میں اُسے تلاش کرتے جاتی ہوں ۔ کاسیو تم ادھر اُدھر پاس ہی رہنا ۔ اگر وہ مل گئے اور مزاج ان کا درست پایا تو تمھاری درخواست پھر پیش کرونگی ۔ اور جہاں تک ممکن ہوگا تمھارے لئے کوشش کرونگی ۔

کاسیو :۔ بیگم میں حضور کا ممنون ہوں ۔

(وسدیمونہ اور امیلیا چلے جاتے ہیں)

(بیانکا کاسیو کی آشنا آتی ہے)

بیانکا :۔ کاسیو تسلیم !

کاسیو :۔ تم کیسے گھر سے نکل پڑیں ؟ میری بہت حسین بیانکا تمھارا مزاج کیسا ہے ۔ پیاری میں تو تمھارے گھر آنیوالا ہی تھا ۔

بیانکا :۔ اور میں آپ کے مکان پر جانیوالی تھی ۔ ملاقات ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا ۔ سات دن اور سات راتیں آٹھ اور آٹھ بیس گھنٹے گذر لئے تھے ۔ اور عاشقوں میں فرقت کے گھنٹے اس مشکل سے کٹتے ہیں جیسے گھنٹے میں سوئی آٹھ بیس دفعہ گھومے حساب کرتے کرتے بھی طبیعت اُکتا جاتی ہے ۔

کاسیو :۔ بیانکا مجھے معاف کرنا ۔ یہ زمانہ مجھ پر سخت گذرا ہے ۔ لیکن اب وہ وقت آرہا ہے کہ اس غیر حاضری کی کسر نکل جائیگی ۔ پیاری بیانکا (اٹھاکر) وسدیمونہ کا رومال اسے دیتا ہے ۔ اس رومال پر جو بیل بوٹے کڑھے ہیں ویسے بیل بوٹے کسی دوسرے کپڑے پر کاڑھ دینا ۔

بیانکا :۔ پیارے کاسیو ! یہ رومال تمھارے پاس کہاں سے آیا ؟ کیا یہ کسی مہ جبین کا دیا ہوا تحفہ ہے ؟ اچھا اب تمھارے اتنے دن تک نہ آنیکا سبب معلوم ہوا ۔ کیا نوبت یہاں تک پہنچ گئی ؟ اچھا پہچان لیا ۔

کاسیو :۔ یہ تم کیسی باتیں کرنے لگیں ۔ یہ بدگمانیاں تو شیطان کے منہ پر مارو ۔ جس سے تم نے یہ باتیں سیکھی ہیں ۔ اب تمھیں بھی جلاپا ہوا ہے کہ کسی آشنا نے یہ رومال مجھے دیا ۔ اور یہ بھی کسی کے عشق و محبت کی یادگار ہے ۔ نہیں پیاری بیانکا یہ بات نہیں ہے ۔

بیانکا :۔ پھر بتاؤ یہ کس کا رومال ہے ؟

کاسیو :۔ پیاری مجھے نہیں معلوم ۔ مجھے تو اپنے کمرے میں پڑا ملا تھا ۔ اس پر جو کام بنا ہے وہ مجھے بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور میں اس کی نقل لینا چاہتا ہوں ۔ تم اسے لیجاؤ اور جیسے بیل بوٹے اس پر کڑھے ہیں ایسے ہی کاڑھ لاؤ ۔ اچھا اب تم میرے پاس سے جاؤ ۔

بیانکا :۔ کیوں جاؤں کیوں ؟

کاسیو :۔ مجھے اس وقت سپہ سالار کے سامنے حاضر ہونا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس موقع پر وہ مجھے کسی عورت کے ساتھ دیکھے ۔

بیانکا :۔ کیوں چلی کیوں جاؤں ؟

کاسیو :۔ یہ نہ سمجھو کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے ۔

بیانکا :۔ یہ تو میں جان گئی کہ اب تمھیں مجھ سے محبت نہیں رہی ۔ مجھے تھوڑی دُور راستہ بتا دو ۔ اور کہو کہ کیا آج رات کو تم سے ملوں ؟

کاسیو :۔ میں تمھیں تھوڑی دُور پہنچا سکتا ہوں ۔ کیونکہ مجھے یہاں پھر جلد حاضر ہونا ہے ۔ میں آج ہی شب کو تم سے ملوں گا ۔

بیانکا :۔ بہت بہتر ۔ ضرورت کا لحاظ کرنا ہر حال میں ضروری ہوتا ہے ۔

(چلی جاتی ہے)

جزو رابع

پہلا منظر

قصر کے سامنے

اوتھیلو اور ایاگو آتے ہیں

ایاگو :- کیا آپ کا خیال ایسا ہے ؟

اوتھیلو :- کس بات کا خیال ؟

ایاگو :- کہ تنہائی میں کوئی کسی کا بوسہ لے ۔

اوتھیلو :- یہ تو نہایت ہی بیہودہ اور نامعقول حرکت ہوگی جو ریاکاری میں شیطان کو بھی دھوکا دے ۔ اس وقت چاہے ان کی نیت بری نہ ہو لیکن پھر شیطان آکر گناہ کی ترغیب دیگا ۔ اور وہ عتاب الٰہی کے مستوجب ہونگے ۔

ایاگو :- جب تک کہ کوئی برا فعل ان سے سرزد نہ ہو تو پھر بوسہ ایک خفیف سی حرکت ہوگی لیکن میں اگر اپنی بیوی کو ایک رومال دوں . . . تو پھر

اوتھیلو :- تو ہاں پھر کیا ؟

ایاگو :- یہی کہ رومال جس کو دیا تھا اس کا ہوگیا اور اب جس غیر مرد کو چاہے وہ دیدے ۔

اوتھیلو :- مگر یہ عورت اپنے حفظ ناموس کی بھی تو رازدار ہے . تو کیا اس رومال کے ساتھ اپنی عزت بھی غارت کردے گی ۔

ایاگو :- عزت تو ایک ہوائی چیز ہے اور اکثر ان کے پاس ہوتی ہے جو برائے نام اسے رکھتے ہیں ۔ لیکن اس رومال کی نسبت پھر کیا کہا جائے ؟

اوتھیلو :- میں اسے بالکل بھلا بیٹھا تھا اور اسی میں خوش تھا مگر اس وقت تمہارے کہنے سے یاد آیا ۔ اور اس طرح ذہن میں آیا جیسے ہلاکت کا پرند کسی بیمار کے گھر پر منڈلا کر موت کی آواز لگائے ۔ کیا وہ رومال کاسیو کے پاس پہنچ گیا ؟ مگر اس سے ہوتا کیا ہے ۔

ایاگو :- اگر میں اپنی زبان سے کہتا یا دوسرے کی زبان سے سنتا کہ اس نے حضور کی بیگم کے ساتھ کوئی برا فعل کیا ہے تو پھر دنیا میں ایسے بدکار موجود ہیں جو خود اغوا کرکے یا کسی احمق بیوا کے کہنے میں آکر برے افعال کرتے ہیں ۔ اور اپنی بری حرکتوں کو دوسروں کے سامنے بیان کرنے میں مطلق پرہیز نہیں کرتے ۔ تو پھر میں آپ کے اس سوال کا کہ اس سے ہوتا کیا ہے جواب دے سکتا تھا ۔

اوتھیلو :- تو کیا کاسیو نے تم سے اس کا ذکر بھی کیا ؟

ایاگو :- جی ہاں کچھ کہا تو تھا مگر اس کا علم نہیں کہ وہ کیا حرکت تھی ؟

اوتھیلو :- حرکت کیسی ــ رومال ــ اقرار گناہ ــ رومال ــ اقبال جرم ــ جرم کا اقبال کرو پھانسی پر چڑھ جاؤ ۔ یا پھانسی پاکر جرم کا اقبال کرو ــ اس خیال سے تن بدن میں آگ لگی جاتی ہے ۔ سر سے پاؤں تک تھرایا جاتا ہوں ۔ اگر واقعی کوئی بات نہ ہوتی تو اس طرح تن بدن پر لرزہ نہ پڑتا ۔ ناک ــ کان ۔ اب اقبال جرم کرو ۔ رومال ۔

(اوتھیلو یہ باتیں کہتا کہتا بیہوش ہوجاتا ہے)

ایاگو :- شاباش میرے زہر تو اپنا کام کئے جا ۔ اب تیرا اثر شروع ہوا ہے ۔ اس طرح وہ کم عقل جو آسانی سے ہر بات کا یقین کرلیتے ہیں مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں ۔ اور اکثر پارسا اور نیک بخت عورتیں بالکل بیگناہ اور بے قصور تودۂ ملامت بنا کرتی ہیں ۔ ہائیں یہ کیا ! آقا ! آقا ! اوتھیلو آپ کچھ سنتے ہیں ۔ اوتھیلو آقا !

(کاسیو آتا ہے)

آپ کیسے ہیں کاسیو ۔ مزاج بخیر ہے ؟

کاسیو :- یہ کیا حال ہے ؟

ایاگو :- آقا کے دماغ کو گرمی چڑھ گئی ہے ۔

کاسیو :- کنپٹی کے پاس سہلایئے ۔

ایاگو :- نہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے ۔ جب تک دورہ ختم نہ ہولے کوئی علاج درست نہ ہوگا ۔ اگر کچھ بھی کیا تو اندیشہ ہے کہ منہ سے کف جاری ہو کر شدید جنون کا مقدمہ ہوجائے ۔ دیکھئے کچھ کچھ ہوش آنے لگا ۔ تھوڑی دیر میں بالکل اچھے ہوجائیں گے ۔ کاسیو جب آقا یہاں سے چلے جائیں تو تم میرے پاس آنا ۔ کچھ باتیں کرنی ہیں ۔

(کاسیو چلا جاتا ہے)

آقا حضور کا مزاج کیسا ہے؟ سر میں چوٹ تو نہیں آئی؟

اوتھیلو۔ کیا مذاق سوجھا ہے؟

ایاگو۔ حضور بھلا میری مجال گستاخی کی ہو سکتی ہے؟ کاش حضور اپنی اس تکلیف کو مردانہ ہمت سے برداشت کرتے۔

اوتھیلو۔ وہ مرد جس کی بیوی نے اُسے دھوکہ دیا ہو حقیقت میں ایک بھوت یا جانور ہو جایا کرتا ہے۔

ایاگو۔ تو پھر ایسے بھوت اور جانور تو بڑے بڑے آباد شہروں میں نہایت شائستہ طریقے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

اوتھیلو۔ تو پھر کیا اس نے اپنے جُرم کا اقبال کیا۔

ایاگو۔ حضور مردوں کی طرح گفتگو کریں۔ اور یہ معلوم کر کے دل کو صبر دے لیں کہ ہر ڈاڑھی رکھنے والا آدمی جو بیوی رکھتا ہو اس کا بھی وہی درجہ ہے جو آپ کا ہے۔ لاکھوں مرد ایسے ہیں جو ایسی شادی کے بستروں پر آرام کرتے ہیں کہ وہ حقیقت میں اُن کے نہیں ہوتے، گو وہ قسم کھانے کو تیار ہوتے ہیں کہ بستر انھیں کے ہیں، ایک شوہر کے لئے حقیقت میں یہ بات شیطان کے زہر خند اور عذاب جہنم سے بھی بدتر ہے کہ شادی کے بستر پر کوئی غیر ایک بدکار بیوی کا بوسہ لے اور پھر وہ اپنی بیوی کو پاکدامن اور نیک بخت سمجھے میں تو ہمیشہ یہی بات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور جب وہ دریافت ہو جاتی ہے تو پھر میرا برتاؤ ایسی بیوی کے ساتھ وہی ہوتا ہے جس کی وہ سزاوار ہوتی ہے۔

اوتھیلو۔ ایاگو تم بڑے ہوشیار آدمی ہو۔ لیکن جو تم کہتے ہو کیا وہ سب سچ اور یقینی ہوتا ہے۔

ایاگو۔ حضور طبیعت پر قابو رکھیں۔ صبر کی حد سے نہ گذرنے دیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ رنج اور صدمہ اس شدت سے طبیعت پر غالب ہو۔ آپ جیسے مرد کو ایسی بات پر اس طرح رنج کرنا مناسب نہیں۔ کاسیو ابھی یہاں آیا تھا۔ میں نے اُسے یہاں سے ٹال دیا۔ اور حضور کے بیہوش ہو جانے کی وجہ بھی کافی طور پر اُسے بتادی۔ میں نے اس سے کہدیا ہے کہ وہ ابھی پھر یہاں آئے۔ مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ چنانچہ اس نے واپس آنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر وہ آگیا اور آپ نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا تو اس کے چہرے کے ہر شکن اور بل سے حضور کو معلوم ہو جائیگا کہ وہ دل لگی مذاق اور دوسروں کی ہنسی اڑانے میں کس درجہ محظوظ ہوتا ہے۔ میں اس کی زبان سے خود سارا قصہ کہلوادوں گا۔ یعنی کہاں وہ بات ہوئی۔ کتنا زمانہ گذرا؟ اور پھر کب کا وعدہ ہے؟ پھر ذرا کاسیو کے تیور ملاحظہ کیجئے گا۔ واللہ صبر کیجئے ورنہ کہنا پڑیگا کہ آپ کی حالت غیظ و غضب کی ہے۔ اور ایسی حالت میں جیسے کہ ایک کمزور آدمی کے ہوش و حواس بجا نہیں رہتے وہی حال آپ کا ہوتا معلوم ہوتا ہے۔

اوتھیلو۔ ایاگو سُنتا ہے میں صبر و برداشت میں تو بہت کچھ سنبھلا رہوں گا مگر سمجھ لے کہ اس پر بھی ممکن ہے کہ خون خرابہ ہو جائے۔

ایاگو۔ اگر ایسا ہوا تو سخت غلطی ہوگی۔ موقع اور محل دیکھتے رہئے گا۔ کہیں چھپ کر اس کی باتیں سنئے گا۔

(اوتھیلو چھپنے چلا جاتا ہے)

اچھا اب میں کاسیو سے بیانکا کے متعلق کچھ باتیں دریافت کروں گا۔ بیانکا ایک بازاری عورت ہے جو مردوں کے ہاتھ اپنی عزت بیچ کر روٹی کپڑا مہیا کرتی ہے۔ اس بسوا کو کاسیو سے بڑی محبت ہوگئی ہے۔ کیونکہ فاحشہ عورتوں پر خدا کا بڑا غضب یہ ہے کہ جہاں ہزاروں کو وہ دھوکا دیتی ہیں کوئی ایسا بھی نکل آتا ہے جس کے دھوکے میں وہ خود آجاتی ہیں۔ کاسیو جب میرے پوچھنے پر اس عورت کا حال کہے گا تو بغیر ہنسنے اور قہقہے لگائے اس سے نہ رہا جائیگا۔ لو وہ کاسیو آگیا۔

(کاسیو آتا ہے)

جب کاسیو قہقہے لگائیگا تو اوتھیلو غصے سے دیوانہ ہو جائے گا۔ اور چونکہ اوتھیلو کے دل میں انتقام لینے کا خیال بندھ چکا ہے اس لئے وہ اس کے ہنسنے کے کچھ اور ہی معنی سمجھے گا۔ اور کاسیو کے انداز اور ہلکی باتوں کا مطلب اس کی سمجھ میں کچھ اور ہی آئیگا۔ اچھا نائب صاحب مہربان مزاج کیسا ہے؟

کاسیو۔ نائب صاحب کہہ کر جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو صدمہ اور زیادہ ہوتا ہے۔ اس جگہ کے ہاتھ سے نکل جانے سے تو میں اور بھی مرلیا۔

ایاگو۔ وسدیمونہ سے سفارش چاہنے میں کوتاہی نہ کیجئے گا۔ پھر یقینی بحال ہو جائیے گا (آواز ہلکی کرکے کہتا ہے) گر آپ کا بحال کرنا بیانکا کے اختیار میں ہوتا تو پھر کسی قدر جلد کامیابی ہو جاتی۔ مگر افسوس وہ غریب کیا کرسکتی ہے۔

اوتھیلو:۔ دیکھو کاسیو کس طرح ہنستا ہے؟
ایاگو:۔ عورت کو مرد کے ساتھ اتنی محبت کرتے نہ سُنا تھا۔
کاسیو:۔ افسوس میں سمجھتا ہوں کہ وہ غریب تو مجھ پر جان و دل سے فدا ہے۔
اوتھیلو:۔ اچھا انکار نہیں ہے۔ مگر کسی قدر انکار پر ہنستا بھی ہے۔
ایاگو:۔ کاسیو سنتے ہو؟
اوتھیلو:۔ ایاگو چاہتا ہے کہ کاسیو پھر اس بات کو دوہرائے۔
ایاگو شاباش شاباش۔
ایاگو:۔ اس نے مشہور کر دیا ہے کہ تم اس سے شادی کرنیوالے ہو۔ کیا حقیقت میں ایسا ارادہ ہے؟
کاسیو:۔ ہا ہا ہا (قہقہہ لگاتا ہے)
اوتھیلو:۔ ارے بدبخت کیا تو اس بات پر خوش ہو رہا ہے
کاسیو:۔ واہ جناب! میں اور ایک کسبی سے شادی کروں! اتنا تو مجھے بیوقوف اور کم عقل نہ سمجھیئے (قہقہہ لگاتا ہے)
اوتھیلو:۔ ہاں ہاں جو کامیاب ہوتے ہیں وہی ہنسا کرتے ہیں۔
ایاگو:۔ واللہ مشہور یہی ہے کہ تم اس سے شادی کرنیوالے ہو۔
کاسیو:۔ سچ بتاؤ کیا واقعی یہی افواہ اڑی ہے؟
ایاگو:۔ اگر نہ ہو تو مجھے جیسا جی چاہے بُرا سمجھنا۔
اوتھیلو:۔ اچھا ہمارا نام کسی شمار ہی میں نہ رہا۔
کاسیو:۔ یہ تو اس بندریا نے خود ہی مشہور کر دیا ہے۔ کسی نے اسے بہکا دیا ہے کہ میں اس سے شادی کرنی چاہتا ہوں۔ مجھ پر جان تو پہلے ہی سے دے رہی تھی اسے یقین آگیا۔ میں نے خود کبھی اس سے نہیں کہا۔
اوتھیلو:۔ دیکھیئے ایاگو میری طرف اشارا کرتا ہے کہ میں سنوں۔ اور اب کاسیو کوئی قصہ کہنا شروع کرتا ہے۔
کاسیو:۔ وہ تو ابھی یہیں تھی۔ جہاں جاتا ہوں پیچھے لگی رہتی ہے۔ تھوڑے دن کا ذکر ہے کہ بندرگاہ میں وینس کے چند شریفوں سے باتیں کرتا تھا کہ وہاں یہ مہ جبین بھی آوارد ہوئیں۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ اس طرح مجھ سے لپٹ گئی (کاسیو ایاگو کو لپٹ جاتا ہے)۔
اوتھیلو:۔ ہاں یہ کہکر لپٹی ہو گی میرے کاسیو۔ میرے پیارے کاسیو۔ کاسیو کے چہرے کے انداز سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

کاسیو:۔ اور اس طرح میرے سینے پر سر رکھے وہ روتی رہی۔ کبھی مجھے اِدھر گھسیٹتی تھی کبھی اُدھر۔ ہا ہا ہا (قہقہہ لگاتا ہے)
اوتھیلو:۔ اچھا اب کاسیو بتلا رہا ہے کہ کس طرح وسدمونہ کھینچ کر اسے میرے عروسی کمرے میں لیجاتی ہے۔ کاسیو یہ تیری ناک مجھے نظر آرہی ہے۔ کاش میں اسے کاٹ کر کتوں کے سامنے کھانے کو ڈال دیتا۔
کاسیو:۔ اب میں اس سے ملنا چھوڑ دوں گا۔
ایاگو:۔ ہاں واللہ ضرور۔ لیجئے خود ان کی تشریف آرہی ہے۔
کاسیو:۔ واللہ یہ عطر میں بسی دوسری بسوا ہے۔

(بیانکا آتی ہے)

بیانکا:۔ میں کیوں تیرے پیچھے لگوں۔ شیطان اور شیطان کی جورو تیرے پیچھے لگے۔ پوچھنے آئی ہوں کہ وہ رومال جو تم نے مجھے دیا تھا کس کام کے لئے دیا تھا۔ مجھ سے بڑی بیوقوفی ہوئی کہ اسے میں نے تم سے لے لیا۔ جو کام اس پر بنا ہے اس کی نقل مجھے کرنی پڑے گی۔ کام رومال پر بہت نفیس ہے مگر مجھے یہ پوچھنا ہے کہ تمھارے کمرے میں وہ کیسے پہونچ گیا؟ یہ فقرہ خوب گھڑ لیا ہے کہ کمرے میں پڑا ملا تھا۔ مگر تمھیں معلوم ہوا ہے کہ اسکو وہاں کوئی پھینک گیا تھا۔ یہ تو کوئی تحفہ معلوم ہوتا ہے جو کسی مرد نے کسی عورت کو دیا تھا تو کیا مجھ سے اس کی نقل کرانی چاہتے ہو بس نقل وقل کچھ نہ کرونگی۔
کاسیو:۔ پیاری بیانکا کیا کہتی ہو۔ یہ بھی کوئی بات تمھارے کہنے کی ہے۔
اوتھیلو:۔ واللہ یہ تو میرا رومال ہے۔
بیانکا:۔ کاسیو آج کھانے پر رات کو ضرور آنا۔ اگر مجھ سے محبت ہے تو ضرور آؤ گے۔

(بیانکا چلی جاتی ہے)

کاسیو:۔ واللہ جانا ضرور پڑے گا ورنہ گلی میں کھڑے ہو کر گالیاں دیگی۔
ایاگو:۔ کیا تم وہاں کھانا کھانے جاؤ گے؟
کاسیو:۔ ہاں ارادہ تو کر رہا ہوں۔
ایاگو:۔ ممکن ہے کہ میں بھی وہاں تم سے ملوں۔ مجھے کچھ تم سے باتیں کرنی ہیں۔

(کاسیو چلا جاتا ہے)

اوتھیلو:۔ (جہاں چھپا تھا وہاں سے باہر آ کر کہتا ہے) ایاگو میں تو اسے ضرور قتل کر ڈالوں گا۔

ایاگو:۔ حضور نے دیکھا کہ اپنی بدکاریوں کو کیسے قہقہے لگا کر بیان کرتا تھا

اوتھیلو:۔ ہاں ایاگو خوب دیکھا اور خوب سُنا۔

ایاگو:۔ اور آپ نے اپنے رومال کا حال بھی سُنا ہوگا؟

اوتھیلو:۔ کیا وہ میرے رومال کا ذکر تھا؟

ایاگو:۔ واللہ آپ کے رومال کے سوا اور کس کا رومال ہو سکتا تھا۔ اور آپ نے یہ بھی خیال کیا کہ آپ کی بیگم صاحبہ کی وہ کیسی قدر کرتا ہے اور کاسیو نے آپ کا رومال اپنی بدکار آشنا کو دیدیا ہے۔

اوتھیلو:۔ جی چاہتا ہے کہ نو برس تک کاسیو کو سسکا سسکا کر جان سے ماروں۔ واہ ہماری بیگم بھی کیسی خوش فکر کیسی حسین اور کیسی شیریں حرکات ہیں۔

ایاگو:۔ بس اب ان باتوں کو بھول جائیے۔

اوتھیلو:۔ ہاں اُسے گلنے سڑنے دو۔ وہ غارت ہو جائے۔ اور آج ہی وہ جہنم واصل ہو۔ اب وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ میرا دل تو پتھر ہو گیا ہے۔ ہاتھ مارتا ہوں ہاتھ کو چوٹ لگتی ہے۔ دل کو خبر نہیں ہوتی مگر ہائے دنیا میں اس سے حسین تر کون ہوگا۔ وہ تو اس لائق تھی کہ کسی شہنشاہ کی ملکہ بن کر اس پر کار فرمائی کرتی۔

ایاگو:۔ یہ انداز گفتگو تو حضور کا پہلے نہ تھا۔

اوتھیلو:۔ اُسے تو سولی پر چڑھا دو۔ میں نے تو اس کی نسبت صرف اتنا ہی کہا ہے جتنی کہ وہ حقیقت میں ہے۔ سینے پرونے کا ڑھنے میں استاد، موسیقی میں کامل، عقل و ذہن کی تیزی اس بلا کی کہ اگر وحشی جانور بھی اس کی باتیں سنے تو اپنی دحشت کو کھو بیٹھے۔

ایاگو:۔ مگر اس حال میں تو یہ خوبیاں اسے اور بھی بُرا بنا دیتی ہیں۔

اوتھیلو:۔ بے شک ہزار ہزار گنا مگر ہائے وہ کیسی نازک اور حسین ہے۔

ایاگو:۔ جی ہاں بڑی نازک اور حسین ہے۔

اوتھیلو:۔ اس کا نازک اور حسین ہونا تو یقینی ہے مگر ایاگو رحم آتا ہے رحم آتا ہے۔

ایاگو:۔ اگر اس کے اتنے قصوروں پر بھی حضور کو اس سے الفت ہے تو پھر اجازت کیوں نہیں دیتے کہ جو چاہے سو کیا کرے کیونکہ جب اپنے باپ ہی کے اختیار میں وہ نہ رہی تو پھر کس کے قابو کی ہو سکتی ہے۔

اوتھیلو:۔ ایاگو نہیں میں تو اس کی بوٹیاں کر کے قیمہ بناؤنگا۔ ہائے مجھے اس نے ایسا شوہر بنایا جس کی بیوی اسے دھوکے دے اور بدکار ہو۔

ایاگو:۔ واقعی یہ اس نے بڑی بُری بات کی ہے۔

اوتھیلو:۔ اور حرام کاری بھی کی تو میرے ایک ماتحت سے۔

ایاگو:۔ یہ بات اور بھی خراب ہوئی۔

اوتھیلو:۔ ایاگو کوئی زہر لادے۔ آج ہی رات کو لادے میں اب اس سے بات نہ کروں گا کہ کہیں اس کے چہرے اور جسم کا حسن میرے دل پر غالب نہ آ جائے۔ آج ہی رات کو کوئی زہر لادے۔

ایاگو:۔ زہر سے نہ ماریئے۔ جب بستر پر لیٹی ہو تو گلا گھونٹ دیجیئے۔ اور بستر بھی وہی ہو جس پر حرام کاری کی ہے۔

اوتھیلو:۔ واہ واہ ایاگو بات خوب بتائی۔ انصاف یہی چاہتا ہے۔ میں تمھاری اس بات سے بہت خوش ہوا۔ ٹھیک ہے بہت مناسب ہے۔

ایاگو:۔ اب رہا کاسیو تو اس کی سزا کفن دفن سب میری ذمے رکھیئے۔ آج آدھی رات تک اور باتیں بھی سُننے میں آئیں گی۔

اوتھیلو:۔ واہ ایاگو تیری کیا بات ہے (اندر سے ایک نقارے کی آواز آتی ہے) یہ نقارہ کیسا بجا؟

ایاگو:۔ معلوم ہوتا ہے کہ وینس سے کوئی خبر آئی ہے۔ وینس کے ڈیوک کے پاس سے لودویکو آیا ہے۔ اور ملاحظہ ہو کہ حضور کی بیگم صاحبہ ان کے ساتھ ہیں۔

لودویکو:۔ لائق سپہ سالار کو آداب بجا لاتا ہوں۔ خدا آپ کو صحیح اور سلامت رکھے۔

اوتھیلو:۔ دل سے دُعا ہے کہ خدا آپ کو بھی صحیح اور سلامت رکھے۔

لودویکو:۔ ڈیوک اور ارباب مجلس سیاسی نے آپ کو بہت بہت سلام کہا ہے۔

(ایک خط اوتھیلو کو دیتا ہے)

اوتھیلو:۔ میں مجلس کے لُطف و کرم پر ان کے اس خط کو بوسہ دیتا ہوں۔

(خط کھول کر پڑھتا ہے)

وسدیمونہ :۔ میرے اچھے بھائی لودویکو اس خط میں کیا لکھا ہے؟

ایاگو :۔ جناب والا کو دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ قبرص جناب کا خیر مقدم کرتا ہے۔

لودویکو :۔ شکریہ۔ فرمائیے نائب کاسیو کیسے ہیں؟

ایاگو :۔ زندہ ہیں۔

وسدیمونہ :۔ بھائی اُن میں اور میرے شوہر میں کچھ رنجش ہو گئی ہے۔ اب آپ آ گئے ہیں۔ دونوں میں ملاپ کرا دیجئے۔

اوتھیلو :۔ کیا تمھیں اس کا یقین ہے؟

وسدیمونہ :۔ ہاں میرے آقا!

اوتھیلو :۔ (حکم پڑھتا ہے) اس حکم کی تعمیل میں ہرگز کوتاہی نہ ہو۔

لودویکو :۔ اس نے آواز نہیں دی ہے وہ تو خط پڑھنے میں مصروف ہے۔ کیا واقعی کاسیو اور اوتھیلو میں ناچاقی ہو گئی ہے؟

وسدیمونہ :۔ جی ہاں اور وہ بھی بُری طرح ہوئی ہے۔ میں نے تو بہت کوشش کی کہ ملاپ ہو جائے کیونکہ مجھے کاسیو کا بہت خیال ہے۔

اوتھیلو :۔ پتھر اور انگارے۔

وسدیمونہ :۔ آقا۔

ایاگو :۔ یہ کیا عقل مندی ہے؟

وسدیمونہ :۔ کسی بات پر غصہ آ گیا ہے۔

لودویکو :۔ ممکن ہے خط پڑھ کر مزاج برہم ہوا ہو۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں اوتھیلو کو وینس میں واپس طلب کیا گیا ہے۔ اور قبرص کی حکومت پر ان کی جگہ کاسیو کا تقرر ہوا ہے۔

وسدیمونہ :۔ یقین جانئے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

اوتھیلو :۔ ہاں واقعی!

وسدیمونہ :۔ آقا کیا فرمایا؟

اوتھیلو :۔ کہیں تم دیوانی ہو! مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی۔

وسدیمونہ :۔ کیوں؟ اوتھیلو پیارے شوہر!

اوتھیلو :۔ (وسدیمونہ کو مارتا ہے) شیطان!

وسدیمونہ :۔ آپ کا یہ سلوک میرے ساتھ درست نہیں۔ اور نہ میں اس لائق ہوں۔

لودویکو :۔ اوتھیلو اگر اس کی خبر وینس میں پہونچی تو کوئی یقین نہ کریگا۔ میں البتہ قسم کھانیکو تیار ہوں گا کہ ہاں میں نے اپنی آنکھوں سے آپ کو اپنی بیوی پر ہاتھ چھوڑتے دیکھا ہے۔ آپ کی طرف سے یہ بیحد زیادتی ہوئی ہے۔ دیکھئے وسدیمونہ رو رہی ہے۔ آپ اسکی تسلی کیجئے۔

اوتھیلو :۔ شیطان! شیطان! واللہ اگر یہ زمین ایسی زنن مخلوق سے آباد ہوتی جو عورت کے آنسوؤں سے پیدا ہوتی ہوتی تو پھر ہر آنسو ایک نہنگ ہوتا۔ جا میرے سامنے سے دُور ہو۔

وسدیمونہ :۔ لیجئے میں دُور ہوئی جاتی ہوں۔ آپ کو زیادہ خفا کرنے کیلئے اب میں یہاں نہیں ٹھیرتی۔

اوتھیلو :۔ تو حرام کار اور بیسوا ہو گئی ہے۔

وسدیمونہ :۔ میرے آقا!

اوتھیلو :۔ کیا آپ کا بھی اس کے ساتھ کچھ ارادہ ہے؟

لودویکو :۔ کیا حضور کا مجھ سے خطاب ہے؟

اوتھیلو :۔ آپ تو یہی چاہتے تھے کہ میں اسے حرام کاری سے باز رکھوں۔ سنئے جناب ہزار کچھ کیجئے۔ کتنا ہی باز رکھئے۔ مگر وہ اپنی حرکتیں نہ چھوڑے گی۔ اور کبھی راہ راست پر نہ آئیگی۔ رونے کو اس کا دل چاہ رہا ہے وہ ضرور روئیگی اور جیسا کہ آپ کہتے ہیں وہ تابعدار بھی بنے گی۔ وہ ضرور مطیع اور فرمانبردار بھی ہو جائیگی۔ جا روتی ہوئی نکل جا۔ اچھا جناب اس خط کے متعلق عرض ہے (وسدیمونہ کی طرف منہ کر کے کہتا ہے) ارے تصنع اور بناوٹ تیرا بُرا ہو! مجھے وینس جانیکا حکم ملا ہے۔ میں اس حکم کی تعمیل کرتا ہوں اور قبرص سے روانگی کیلئے تیار ہوں۔ جا بدبخت دُور ہو (وسدیمونہ دُور چلی جاتی ہے) کاسیو میری جگہ کام کریگا۔ لودویکو آج شب کو آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ قبرص میں تشریف آوری پر خیر مقدم کہتا ہوں۔ کتے اور بندر!

لودویکو :۔ کیا یہ وہی شریف مراکشی ہے جسے وینس کے ارکانِ مجلس سمجھتے تھے کہ وہی سب کچھ ہے۔ کیا یہ وہی فطرت اور طبیعت ہے جس کی نسبت خیال تھا کہ کوئی غلط جذبہ اس میں تحریک پیدا نہیں کر سکتا۔ کیا نیکی کا یہ وہی پتلا ہے جس کی نسبت سمجھا جاتا تھا کہ کوئی واقعہ یا کوئی اتفاق نہ اس کو چھو سکتا ہے نہ چھید سکتا ہے۔

ایاگو :۔ جناب عالی وہ بہت بدل گئے ہیں۔

لودویکو :۔ کیا اس کے ہوش و حواس سلامت ہیں۔ دماغ مختل تو نہیں ہو گیا؟

ایاگو :۔ جو کچھ ہیں آپ کے سامنے ہیں [illegible] کیا عرض کر سکتا ہوں

کہ انھیں کیا ہونا چاہیئے تھا اور وہ کیا نہیں ہیں۔ میری تو خدا سے ہر وقت یہی دُعا ہے کہ وہ اچھے ہو جائیں۔

لودیوکو:۔ بیوی پر ہاتھ چھوڑنا یہ کیسی بیہودہ اور نامعقول حرکت ہے۔

ایاگو:۔ واقعی بہت بُری حرکت کی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی حرکت ان کے حق میں سخت مضر ثابت ہوگی۔

لودیوکو:۔ کیا بیوی کو مارنا اس کی عادت ہوگئی ہے؟ یا ممکن ہے کہ خط کے مضمون سے طیش آگیا ہو اور یہی باعث اس بیہودہ حرکت کا ہوا۔

ایاگو:۔ افسوس افسوس جو کچھ میں نے دیکھا اور سُنا ہے اگر اسے بیان کروں تو پھر امانت میں خیانت ہوگی۔ جناب خود ان کی حالت ملاحظہ کرتے رہیں اور جو کچھ حرکتیں ان سے ہونگی ان سے خود ان کا حال آپ پر ظاہر ہو جائیگا۔ ایسی حالت میں میرا کچھ عرض کرنا غیر ضروری ہوگا۔ آپ ان کے پیچھے پیچھے نہ جائیں اور دیکھتے رہیں کہ اب وہ کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں۔

لودیوکو:۔ افسوس ہے کہ اوتھیلو کی طبیعت کا اندازہ کرنے میں مجھے بہت دھوکا ہوا۔

(چلا جاتا ہے)

دُوسرا منظر

قصر کا ایک کمرہ

اوتھیلو اور امیلیا آتے ہیں

اوتھیلو:۔ ہاں تو تم نے کچھ نہیں دیکھا؟

امیلیا:۔ جی ہاں نہ کبھی ایسا سنا نہ کبھی ایسا شبہ گذرا۔

اوتھیلو:۔ مگر تم نے کاسیو کو اور اُسے ساتھ تو دیکھا ہے؟

امیلیا:۔ ساتھ ہونے میں تو کوئی خرابی نہ تھی۔ جو باتیں اُن میں ہوئیں ان کا ایک ایک حرف میں سُنتی آتی تھی۔

اوتھیلو:۔ کیا کبھی انھوں نے سرگوشی نہیں کی؟

امیلیا:۔ کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔

اوتھیلو:۔ کیا کبھی یہ کہہ کر تمھیں اپنے پاس سے ٹالا نہیں کہ پنکھا یا دستانہ یا نقاب لا دو؟

امیلیا:۔ جی کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔

اوتھیلو:۔ تو پھر یہ کیسی عجیب بات ہے؟

امیلیا:۔ حضور چاہے کیسی ہی سزا دیں لیکن وسدیمونہ بالکل پاک اور صاف ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو میں اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔ اگر حضور کے دل میں کوئی بُرا خیال ہے تو اُسے دل سے دُور کردیں۔ اگر کسی بے ایمان بدبخت نے کوئی بُری بات آپ کے دل میں ڈالی ہو اور جس سے آپ کو تکلیف پہنچی ہو تو اُسے نکال پھینکیں۔ اور جس نے آپکا دل اس کی طرف سے بُرا کیا ہو اس پر خدا کی طرف سے وہی غضب نازل ہو جو باغِ عدن میں سانپ پر ہوا تھا۔ اگر حضور نے وسدیمونہ کی عزت میں فرق سمجھا تو پھر کوئی مرد دُنیا میں ایسا نہ ملے گا جو اپنی بیوی سے خوش ہو۔ اور مردوں میں ان کی پاک بیویاں بھی وسدیمونہ کی پاکدامنی کے مقابلے میں مجسّم بدنامی ثابت ہونگی۔

اوتھیلو:۔ امیلیا اچھا جاؤ اور وسدیمونہ سے کہو کہ وہ یہاں آئے اور جب وہ آئے تو تم یہاں سے چلی جانا۔

(امیلیا چلی جاتی ہے)

امیلیا نے وسدیمونہ کا ذکر اچھی طرح کیا ہے مگر وہ خود حرام کار عورتوں کے غول کی ایک عورت ہے۔ پس وہ اپنے کسی ہم پیشہ کی صفائی جھوٹ بول کر نہیں کرسکتی۔ وسدیمونا زیادہ ہوشیار اور چالاک بیسوا ہے۔ وہ اپنے ناپاک ارادوں کو قفل کنجی میں رکھتی ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ خدا کے سامنے جھکتی اور عبادت کرتی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے عبادت میں مصروف دیکھا ہے۔

(وسدیمونہ اور امیلیا آتے ہیں)

وسدیمونہ:۔ آقا کیا حکم ہے؟

اوتھیلو:۔ آؤ پیاری اِدھر آؤ۔

وسدیمونہ:۔ آپ کی کیا خوشی ہے؟

اوتھیلو:۔ مجھے ذرا اپنی آنکھیں دیکھنے دو میرے چہرے کو دیکھتی رہنا۔

وسدیمونہ:۔ یہ کیسا ہولناک خیال آپ کے دل میں آیا ہے۔

اوتھیلو:۔ (امیلیا سے کہتا ہے) سُنتی ہے بیسوا! خطاکار عاشقوں کو تنہا چھوڑ کر جانا اور دروازہ بند کرکے وہاں پہرہ دینا تو تیرا معمولی کام ہے۔ جا دروازے پر کھڑی رہ۔ اگر کسی کے آنیکی آہٹ ہو تو کھنکار دینا۔ بھلا تجھے کون بتائیگا یہ تو تیرا رات دن کا کام ٹھیرا۔ مجھے کچھ رازداری کی باتیں کرنی ہیں۔ جلدی کر۔

وسدیمونہ:۔ میں آپ کے پاؤں پکڑکر پوچھتی ہوں کہ ان باتوں

سے آپکا کیا مطلب ہے ؟ آپکی باتوں سے غصہ معلوم ہوتا ہے مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ غصہ کس بات پر ہے ؟

اوتھیلو :۔ بتا تو کون ہے ؟

وسدیمونہ :۔ آپ کی بیوی، آپ کی سچی وفادار بیوی ۔

اوتھیلو :۔ اچھا قسم کھا ۔ تو تو حسن اور رعنائی میں آسمان کا فرشتہ معلوم ہوتی ہے ۔ جہنم میں کیسے جائیگی ۔ شیاطین بھی تجھ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے سہم جائیں گے اور اس سے اور بھی تو جہنم کی قابل ثابت ہو جائیگی ۔ قسم کھا کر بتا کہ تو ایماندار ہے ۔

وسدیمونہ :۔ خدا ہی خوب جانتا ہے ۔

اوتھیلو :۔ ہاں خدا خوب جانتا ہے کہ تو دوزخ کی مثل بیوفا اور ناپاک ہے ۔ اگر جھوٹی قسم کھائی تو پھر تو جہنم میں جانیکی دوچند مستحق ہو جائے گی ۔

وسدیمونہ :۔ آقا میں نے کس کے ساتھ بیوفائی کی ؟ میں جھوٹی اور بیوفا کیونکر ٹھیری ؟

اوتھیلو :۔ وسدیمونہ جا بس دور ہو ۔ دور ہو ۔

وسدیمونہ :۔ ہائے یہ کیسی بُری گھڑی آگئی ۔ آقا آپ روتے کیوں ہیں ؟ آقا کیا آپ کے ان آنسوؤں کا سبب میں ہوں ؟ اگر آپ کو میرے باپ کی نسبت شبہ ہوا کہ وہ وینس کو آپکی واپسی کا سبب ہوئے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے ۔ اگر آپ انکی دوستی سے محروم ہوئے ہیں تو میں بھی ان کی شفقت و کرم سے کبھی کی محروم ہو چکی ہوں ۔

اوتھیلو :۔ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ میری آزمائش کسی سخت مرض کو مجھ پر بھیج کر کرتا اور یہ مرض ایک بلائے آسمانی کی صورت میں میرے سر پر نازل ہو کر میرے تمام جسم پر زخم پھوڑے اور پھنسیاں پیدا کر دیتا یا مجھے افلاس اور تنگدستی میں از سر تا پا ڈبو دیتا ۔ مجھے اور میری امیدوں کو کسی محبس تاریک میں مقید کر دیتا تب بھی میں اپنے رُوح کے چشمے میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا قطرہ صبر کا تلاش کر لیتا ۔ مگر نہیں اُسے تو یہی منظور تھا کہ مجھے میرے ہی ہم چشموں میں ذلیل و خوار کرنے کیلئے انگشت نما بنائے ۔ لیکن یہ بھی میں برداشت کر لیتا اور اچھی طرح برداشت کر لیتا لیکن افسوس صد افسوس وہ گھر جس میں میں نے اپنے عشق و الفت کی دولت ذخیرہ کی تھی ۔ جہاں اگر جیتا تو وہیں جیتا جہاں اگر مرتا تو وہیں مرتا ۔ جب وہ گھر ہی اجڑ گیا اور وہ سرچشمہ جس میں میری رُوح چہکتی ہوئی بہا کرتی تھی جب وہی خشک ہو گیا اور اس کی جگہ میرے پاس گندے اور غلیظ پانی کا ایک نالہ رہ گیا ۔ جس میں کریہہ منظر جانور پیدا ہو کر بڑھتے رہیں تو پھر اسے صبر و شکیب تو بھی اپنا رنگ بدل اور اے حسین و جمیل گلفام لبوں والے فرشتے تو بھی جہنم کی مثل سیاہ اور تاریک ہو جا ۔

وسدیمونہ :۔ مجھے امید ہے کہ میرا شریف آقا مجھے ایماندار سمجھتا ہے ۔

اوتھیلو :۔ ہاں ایسا ہی پاک اور ایماندار سمجھتا ہوں جیسے گرمی کے موسم میں مذبح کی مکھیاں کہ کتنا ہی مارو اور ہٹاؤ بڑھتی ہی جائیں ۔ اے شجر حسن کی شاخ نازک تو کیسی حسین ہے اور تجھ سے کیسی شمیم جاں فزا پیدا ہے جو انسان میں ہوس پیدا کرتی ہے ۔ کاش تو دُنیا میں قدم نہ رکھتی ۔

وسدیمونہ :۔ کچھ فرمائیے تو وہ کونسا گناہ ہے جسے آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے کیا ہے ؟

اوتھیلو :۔ کاش اس کتاب حُسن کا پاکیزہ ورق اس لئے نہ ہوتا کہ بیسوا کا لفظ اس پر لکھا جاتا ۔ تو نے گناہ کیا ۔ ہائے گناہ کیا ۔ اری فاحشہ اگر میں تیری حرکتیں بیان کروں تو تیرے رخسار آگ کی بھٹیوں کی طرح روشن ہو کر شرم و حیا کو جلا کر راکھ کر دیں اور تیرے اعمال کی بدبو پر فرشتے تک ناک بند کریں ۔ اور یہ پاک صاف ہوا جو ہر چیز کو چومتی ہے زمین کی کسی کھوکلی کان میں جا چھپے تا کہ تیری آواز نہ سنے ۔ ہائے تیرے گناہ ۔ نالائق فاحشہ ۔

وسدیمونہ :۔ خدا کی قسم آپ مجھ پر جھوٹ الزام رکھتے ہیں ۔

اوتھیلو :۔ کیا تو بیسوا اور فاحشہ نہیں ہے ؟

وسدیمونہ :۔ نہیں میں بیسوا نہیں ہوں ۔ میں عیسائی ہوں جس نے اپنے جسم کو جو روح کا مسکن ہے اپنے شوہر کیلئے سلامت رکھا ہے ۔ اور کسی نجس چیز کے مس نے اُسے ناپاک نہیں کیا ۔ جو ایسی ہو وہ کیسے بیسوا یا فاحشہ ہو سکتی ہے ۔

اوتھیلو :۔ ہائیں کیا تو بیسوا نہیں ؟

وسدیمونہ :۔ نہیں ۔ میں عاقبت میں امیدوار نجات ہوں ۔

اوتھیلو :۔ کیا ایسا ممکن ہے ؟

وسدیمونہ :۔ اے خدا تو مجھے معاف کر ۔

اوتھیلو :۔ اچھا اب قصور معاف کرانے لگی ۔ میں تجھے وینس کی وہ مکار بیسوا سمجھتا ہوں جس نے اوتھیلو سے شادی کی دآوارنہ تیز

کر کے کہتا ہے) اری بیسوا۔ فاحشہ۔

(امیلیا اندر آتی ہے)

اچھا تو آئی۔ اچھا ہم اپنا کام ختم کر چکے ہیں۔ لے یہ دینا لے۔ یہ تیری خدمت کا معاوضہ ہے۔ اب تیرا کام یہ ہے کہ جو کچھ اس وقت یہاں ہوا ہے اسے پوشیدہ رکھے۔

(چلا جاتا ہے)

امیلیا:۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اوتھیلو کے دل میں کیا خیال بیٹھ گیا ہے۔ بیگم آپ کا مزاج کیسا ہے؟

وسدیمونہ:۔ خدایا رحم کر میری حالت تو غشی کی ہوتی جاتی ہے۔

امیلیا:۔ اچھی بیگم۔ میری آقا۔ آپ کی یہ کیا حالت ہے؟

وسدیمونہ:۔ کس کی حالت پوچھتی ہے؟

امیلیا:۔ حضور آقا کی کیفیت پوچھتی ہوں۔

وسدیمونہ:۔ تمھارا آقا کون ہے؟

امیلیا:۔ پیاری بیگم جو آپ کا آقا ہے وہی میرا آقا ہے۔

وسدیمونہ:۔ میرا آقا اب کوئی نہیں ہے۔ امیلیا اس وقت مجھ سے بات نہ کر۔ نہ آنکھوں میں آنسو رہے ہیں اور نہ زبان پر کوئی جواب ہے جو بغیر آنسوؤں کے دے سکوں۔ اتنی مہربانی میرے حال پر کر کہ آج رات کو میری شادی کی چادریں میرے پلنگ پر بچھا دینا۔ دیکھو بھولنا نہیں اور ذرا اپنے شوہر کو یہاں بُلالا۔

امیلیا:۔ واہ کیسی تبدیلی ہوئی ہے۔

(چلی جاتی ہے)

وسدیمونہ:۔ کیا میری یہی قدر کرنی تھی۔ واہ خوب قدر کی۔ اچھا سلوک کیا۔ میری نسبت اور ایسی بد گمانی!

(امیلیا ایاگو کو ساتھ لاتی ہے)

ایاگو:۔ بیگم! آپ کا کیا حکم ہے۔ مزاج عالی کیسا ہے؟

وسدیمونہ:۔ میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ وہ معلم جس کا کام چھوٹے بچوں کو تعلیم دینا ہوتا ہے وہ نرمی سے آسان سبق دیکر بچوں کو پڑھاتا ہے۔ یہی اس نے بھی میرے ساتھ کیا ہوتا۔ اگر میری تادیب کی ضرورت تھی تو بچوں کی طرح ہونی چاہئے تھی۔

ایاگو:۔ بیگم صاحبہ فرمائیے تو بات کیا ہوئی؟

امیلیا:۔ ایاگو افسوس آقا نے آج میری بیگم کو بہت ہی سخت باتیں کہیں۔ انھیں بیسوا اور فاحشہ تک کہا ہے اور ایسے ایسے بُرے الفاظ زبان پر لائے ہیں کہ کوئی پاکیزہ اور نیک دل برداشت نہیں کر سکتا۔

وسدیمونہ:۔ ایاگو کیا میں ایسے لفظ کے لائق تھی؟

ایاگو:۔ کس لفظ کے لائق بیگم؟

وسدیمونہ:۔ جیسا کہ ابھی امیلیا نے تمھیں بتایا ہے۔

امیلیا:۔ آقا نے میری بیگم کو بیسوا کہا۔ کوئی بھک منگا بھی شراب کے نشے میں اپنی ساتھ والی عورت کو ایسا نہ کہے گا۔

وسدیمونہ:۔ میں تو کچھ جانتی نہیں مگر میں ہرگز ایسی نہیں ہوں۔

ایاگو:۔ روئیے نہیں۔ روئیے نہیں۔ سارا افسوس اس بُرے وقت پر ہے۔

امیلیا:۔ کیا شادی کے اتنے بڑے بڑے پیغام باپ، وطن اور عزیزوں کی جُدائی اسی دن کیلئے تھی کہ کوئی اسے بیسوا کہے۔ یہ بات تو وہ ہے کہ جو سنے گا اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑینگے۔

وسدیمونہ:۔ قسمت بگڑ گئی۔ اسے میں کیا کر سکتی ہوں۔

ایاگو:۔ لعنت بھیجیے۔ آخر یہ بات اس کے دل میں آئی کیونکر؟

وسدیمونہ:۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

امیلیا:۔ چاہے مجھے کوئی پھانسی ہی کیوں نہ دیدے پر میں تو یہی کہوں گی کہ یہ کام کسی پکے بدمعاش مفسد و مکار بے ایمان شیطان کا ہے۔ جس نے کوئی بڑی جگہ حاصل کرنے کیلئے ایسی حرکت کی ہے۔ اگر یہی بات نہ ہو تو پھر مجھے سولی پر چڑھا دینا۔

ایاگو:۔ افسوس! ایسا مکار دنیا میں کون ہوگا! غیر ممکن ہے۔

وسدیمونہ:۔ اگر کوئی ہو بھی تو خدا اسے معاف کرے۔

امیلیا:۔ معاف کرے! گلے میں خدا کرے پھندا پڑے۔ اور دوزخ میں اس کی ہڈیاں جلیں۔ اس نے میری بیگم کو بیسوا کہا کیوں۔ کس کو اس کے ساتھ دیکھا تھا؟ کہاں؟ کس وقت؟ کس صورت میں؟ ایسا ہونا کیونکر ممکن ہوا۔ یہ تو کسی بڑے ہی بدمعاش پاجی نے مراکشی کو بہکا دیا ہے۔ وہ تو کوئی مشہور بدمعاش بے ایمان ہے۔ اے خدا تو کسی طرح اس خبیث بدمعاش کو سب کے سامنے لے آ۔ اور ہر ایماندار آدمی کے ہاتھ میں ایک ایک کوڑا ہو کہ کوڑے مار مار کر پہلے تو اس بے ایمان کے کپڑوں کی دھجیاں اڑائیں اور پھر ننگا کر کے اسی حال میں مشرق سے مغرب تک دوڑا دوڑا کر اسے دنیا سے باہر نکال دیں۔

ایاگو:۔ امیلیا اتنا چیختی کیوں ہو۔ آہستہ بات کرو۔

امیلیا :- ارے اس پر خدا کی پھٹکار ہو۔ وہ بھی کوئی ایسا ہی پاجی بے ایمان تھا۔ جس نے تمھاری عقل پر اتنا پردہ ڈالا کہ تم کو مراکشی کے ساتھ میری نسبت بھی شبہ ہوا۔

ایاگو :- تم تو نری احمق ہو۔

وسدیمونہ :- اچھے ایاگو میں کیا کروں کہ شوہر کی خفگی دور ہو۔ اور پھر وہ مجھ پر مہربان ہو جائے۔ تم تو اپنے ہی ہو۔ اس کے پاس جاؤ اور میری طرف سے کہو کہ اس روشن آسمان کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیوں مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ خدا کے سامنے زمین پر پیشانی رکھکر کہتی ہوں کہ میرے تو خیال میں بھی یہ بات کبھی نہیں گذری کہ شوہر سے عشق رکھتے ہوئے اس سے بیوفا بنوں۔ لیکن یہ بات میرے ذہن میں اور نہ واقعی کوئی خیال میرے دل میں کبھی ایسا گذرا۔ میری آنکھوں میری کانوں یا حواس یا کسی حس نے بجز اس کے عشق کے کبھی کسی بات میں لذت نہیں پائی۔ میرا اب تک اس کے عشق میں وہی حال ہے جو ہمیشہ سے تھا۔ میں نے کبھی کوئی بیوفائی اس کے ساتھ نہیں کی اور نہ کبھی کرونگی۔ گو اس نے اس وقت مجھے بڑی بیدردی سے اپنے سے جدا کر دیا ہے۔ مجھے چین آرام نصیب نہ ہو جو مجھے اس کے ساتھ اب تک عشق و محبت نہ ہو۔ اگر اس کی نامہربانیاں میری زندگی حرام بھی کر دیں پھر بھی میری محبت میں فرق نہ آئے گا۔ میں تو بیسوا کا لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتی۔ اور جب اس لفظ کو سنتی ہوں تو سخت نفرت معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ کام کرنا جس سے انسان اس لفظ کا مستحق ہو تو اگر دنیا بھر کی خود بینیاں اور خود آرائیاں بھی جمع ہو جائیں تب بھی میں ایسا نہ کر سکوں گی۔

ایاگو :- میری التجا ہے کہ آپ صبر کریں۔ یہ طبیعت اور وقت کی بات ہے۔ سرکاری کاموں کی وجہ سے پریشان ہو گئے ہیں اور بگڑ بیٹھے آپ پر ہیں۔

وسدیمونہ :- کاش اس کے سوا دوسری بات نہ ہو۔

ایاگو :- بات بھی ہے جو میں نے عرض کی ہے۔

(نقارہ کی آواز آتی ہے)

ضیافت کیلئے یہ نقارے بج رہے ہیں۔ وینس سے جو لوگ آئے ہیں آج ان کی دعوت ہے۔ آپ بھی شریک ہوں۔ ڈریئے نہیں سب باتیں درست ہو جائیں گی۔

(وسدیمونہ اور امیلیا چلے جاتے ہیں)

(روڈریگو آتا ہے)

کہو روڈریگو کیا حال ہے؟

روڈریگو :- میں سمجھتا ہوں ایاگو تم مجھ سے ایمان داری کا برتاؤ نہیں برتتے؟

ایاگو :- ایمان کے خلاف کونسی بات ہوئی؟

روڈریگو :- ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے تم مجھے ٹال دیتے ہو۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مجھے میری مراد تک پہونچانے کی تم جان کر کوئی اچھی توقع پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اب تک جس قدر تکلیفیں میں نے اپنی حماقت سے اٹھائی ہیں ان کا نتیجہ یہی ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ صبر شکر کرکے بیٹھ رہوں۔

ایاگو :- روڈریگو تم میری ایک بات سنو اور غور سے سنو۔

روڈریگو :- واللہ میں تمھاری بہت باتیں سن چکا ہوں تمھاری باتوں اور تمھارے کاموں میں کبھی مطابقت نہ ہوئی۔

ایاگو :- یہ تو تم مجھ پر سخت الزام رکھتے ہو۔ اور میرے ساتھ بڑی بے انصافی کرتے ہو۔

روڈریگو :- میں بے انصافی نہیں کرتا۔ جو کچھ کہتا ہوں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اتنے دن انتظار کرتے گذرے ہیں کہ اب ایک پیسہ بھی میرے پاس نہ رہا۔ جو زیور میں نے وسدیمونہ کیلئے تمھیں دیا تھا اگر اس سے آدھا بھی اس کام میں لگاتا تو پاک دامن سے پاک دامن راہبہ بھی میری طرف رغبت کرنے لگتی۔ تم نے مجھ سے کہا کہ وہ زیور وسدیمونہ نے قبول کر لیا ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد مہربانی کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوگی۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔

ایاگو :- تو پھر تم وہاں جاتے بھی تو نہیں۔

روڈریگو :- جانے کی بھی خوب کہی۔ میں کیسے جاؤں۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔ یہ تو نہایت نامعقول حرکت ہوگی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تم دھوکا دے رہے ہو۔

ایاگو :- یہ بات ہے تو اچھا پھر یوں ہی سہی۔

روڈریگو :- آپ سمجھ لیں کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ میں خود وسدیمونہ کے پاس جا کر اپنا زیور طلب کروں گا۔ میں اپنا عشق ترک کرتا ہوں۔ اور اپنی ناجائز درخواستوں پر ندامت اور شرمندگی ظاہر کروں گا اور اچھی طرح سمجھ لو کہ میں اپنی کل چیزیں تم سے ایک ایک کرکے وصول کروں گا۔

ایاگو :۔ بس کہہ چکے ؟
روڈریگو :۔ ہاں کہہ چکا۔ اور جو کچھ کہا ہے اُسے کر کے دکھادونگا۔
ایاگو :۔ اچھا کر کے دکھا دو گے اس سے معلوم ہوا کہ تم میں کچھ ہمت ہے۔ اور آج تمھاری نسبت میں وہ رائے قائم کرتا ہوں جواب تک نہ کر سکا تھا۔ روڈریگو آؤ ہاتھ ملاؤ۔ تمھیں مجھ سے جو شکایت ہو وہ بجا ہے مگر میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ میں تمھارے معاملے میں غافل نہیں رہا۔
روڈریگو :۔ بظاہر تو یہ نہیں معلوم ہوتا۔
ایاگو :۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ بظاہر ایسا نہیں ہوا۔ اور جو کچھ شبہ تمھیں ہے وہ بلاوجہ نہیں ہے۔ روڈریگو اگر تم میں ذرا بھی سمجھ ہے اور میرے خیال میں اب تمھیں پہلے سے زیادہ سمجھ آگئی ہے۔ میرا مطلب سمجھ سے ہمت ہے تو اب وہ سب معلوم ہوئی جاتی ہے۔ اگر آج سے دوسری رات کو تم نے وسدیمونہ کی مزی نہ اُڑالئے تو پھر دغابازی اور مکاری کی سزا میں تم میری جان لے لینا۔
روڈریگو :۔ اچھا پھر وہ کیا بات ہے ؟ عقل اور سمجھ سے باہر تو نہیں ہے۔
ایاگو :۔ سنئے وینس سے ایک حکم آیا ہے جس میں اوتھیلو کی جگہ کاسیو کو اس جزیرے کا حاکم مقرر کیا ہے۔
روڈریگو :۔ کیا یہ خبر صحیح ہے ؟ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اوتھیلو اور وسدیمونہ وینس واپس ہو جائیں گے۔
ایاگو :۔ نہیں اوتھیلو موریتانیہ جانیوالا ہے اور وہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جائیگا۔ اور اگر کسی وجہ سے اسے یہیں قبرس میں زیادہ قیام کرنا پڑا تو اس قیام کی وجہ سوائے اس کے دوسری نہیں ہو سکتی کہ وہ کاسیو کو دور کرنیکی کوشش کرے۔
روڈریگو :۔ دُور کرنے سے آپ کا کیا مطلب ہوا ؟
ایاگو :۔ مطلب یہی کہ کاسیو کو اس قابل نہ رکھا جائے کہ وہ اوتھیلو کی جگہ لے سکے۔ یعنی اس کا سر توڑ دیا جائے۔
روڈریگو :۔ تو کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ سر توڑنے کا کام میں کروں ؟
ایاگو :۔ ہاں اگر تم اپنے حق میں انصاف اور نفع چاہتے ہو۔ آج کاسیو اپنی آشنا کے ساتھ ضیافت میں شریک ہونیوالا ہے۔ میں اس سے ملوں گا۔ اسے ابھی تک اپنی ترقی کا حال معلوم نہیں ہے اگر تم کہیں کھڑے ہو کر اُسے ضیافت میں جاتے دیکھنے کا انتظار کرو تو پھر میں ایسی ترکیب کروں گا کہ جہاں تم کھڑے ہو اُدھر ہی سے وہ نکلے پھر تم اس سے لڑ بیٹھنا۔ وقت بارہ اور ایک کے درمیان ہوگا۔ تمھاری مدد کو میں تمھارے قریب ہی ہوں گا۔ اس طرح وہ میرے اور تمھارے درمیان زخمی ہو کر گر سکتا ہے۔ حیرت میں نہ جاؤ۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں ثابت کروں گا کہ کاسیو کی موت اس وقت اتنی ضروری ہے کہ تم مجبور ہو کہ اسے ہلاک کردو اچھا اب ضیافت کا وقت آگیا ہے۔ رات زیادہ ہوئی جاتی ہے اور بس اب یہی کام کرنا ہے۔
روڈریگو :۔ اس معاملے میں میں تم سے پھر بات چیت کرونگا۔
ایاگو :۔ ہاں اور میں تمھارا بالکل اطمینان کر دوں گا۔

(چلا جاتا ہے)

تیسرا منظر

قصر کا ایک دوسرا کمرہ

اوتھیلو، لودویکو، وسدیمونہ، امیلیا اور ملازمین آتے ہیں۔

لودویکو :۔ میری گذارش ہے کہ آپ زیادہ تکلیف نہ فرمائیں۔
اوتھیلو :۔ معاف کیجئے، اس وقت کچھ دُور چلنے سے مجھی فائدہ ہوگا۔
لودویکو :۔ خدا حافظ۔ میں آپ کا بیحد شکر گذار ہوا۔
وسدیمونہ :۔ میں آپ کو خیر مقدم کہتی ہوں۔
اوتھیلو :۔ کیا کچھ دور آپ بھی پیدل چلیں گی ؟
وسدیمونہ :۔ آقا جیسا حکم ہوگا۔
اوتھیلو :۔ نہیں آپ فوراً خواب گاہ میں جائیں میں بھی ابھی آتا ہوں۔ اپنی خادمہ امیلیا کو برطرف کر دیں۔
وسدیمونہ :۔ ابھی جاتی ہوں۔

(اوتھیلو، لودویکو ملازمین چلے جاتے ہیں)

امیلیا :۔ اوتھیلو کا حال کچھ پہلے سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔
وسدیمونہ :۔ کہا ہے کہ ابھی آتا ہوں۔ مجھے حکم دیا ہے کہ خواب گاہ میں جا کر سو رہو۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ تمھیں برخاست کر دوں۔
امیلیا :۔ مجھے برخاست کر دیں ؟

وسدیمونہ :۔ ہاں حکم تو یہی دیا ہے۔ اچھی امیلیا مجھے شب خوابی کے کپڑے دے اور خدا حافظ۔ اب ہمیں اسے ناخوش نہیں کرنا چاہیئے۔

امیلیا :۔ اے کاش آپ اس کی صورت کبھی نہ دیکھتیں۔

وسدیمونہ :۔ میں تو ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے تو اس کیساتھ عشق ہے اور ہر حال میں میں اس پر دل و جان سے نثار ہوں۔ اور اس کی بے جا خفگیاں اور ناراضگیاں بھی —— ذرا یہاں کا بند کھول دینا —— سب گوارا ہیں۔ اور اس کا لُطف و کرم معلوم ہوتی ہیں۔

امیلیا :۔ جن چادروں کو آپ نے پلنگ پر بچھانے کو کہا تھا انہیں بچھا چلی ہوں۔

وسدیمونہ :۔ مجھے تو اب سب برابر ہے۔ کیا بات ہے کہ ہم بعض وقت ایسے بیوقوف ہو جاتے ہیں۔ امیلیا اگر میں تیرے سامنے مروں تو مجھے ان ہی چادروں کا کفن دینا۔

امیلیا :۔ واہ آپ بھی کیسی باتیں کرنے لگیں ؟

وسدیمونہ :۔ میری ماں کے پاس ایک خادمہ تھی جس کا نام باربرا تھا۔ اُسے عشق ہوا اور ایسے شخص سے عشق ہوا جو دیوانہ تھا۔ اس نے اس باربرا کو چھوڑ دیا۔ اس لڑکی کو بید مجنوں کا ایک گیت یاد تھا۔ یہ پُرانے وقتوں کا ایک گیت تھا۔ اس گیت سے اس غریب لڑکی کے دل کی حالت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ اور وہ اس گیت کو گاتے گاتے مر گئی۔ آج رات کو مجھے وہی گیت یاد آرہا ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ سر کو ایک طرف ڈال کر وہی گیت گاؤں جو میں نے غریب باربرا کو مرتے وقت گاتے سنا تھا۔ امیلیا اب تم جاؤ۔ وہ آتے ہوں گے۔

امیلیا :۔ جاتی ہوں۔ آپ کو شب خوابی کے کپڑے تو نکال کر دیتی جاؤں۔

وسدیمونہ :۔ ذرا یہاں کا بند اور کھول دو۔ امیلیا یہ لودوویکو اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔

امیلیا :۔ جی ہاں بہت خوش رُو ہے۔

وسدیمونہ :۔ بات اچھی طرح کرتا ہے۔

امیلیا :۔ جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ وینس کی ایک بیگم صاحبہ کا تو یہ حال ہوا تھا کہ وہ اس کے لب زیریں کے بوسے کے لئے وینس سے فلسطین تک چلی گئی تھی۔

وسدیمونہ :۔ (گاتی ہے)

وہ غریب ایک سرو کے درخت کے نیچے بیٹھی
آہیں بھرتی تھی۔ بید مجنوں والا گیت گاتی تھی
ہاتھ سینے پر اور سر گھٹنے پر جھکا ہوا گاتی تھی۔
"بید مجنوں بید مجنوں" چشمے کا تازہ پانی اس
کے قریب بہتا ہوتا تھا۔ اور پانی کے بہنے کی
آواز اس کی آہوں میں شامل تھی۔ گاؤ،
"بید مجنوں بید مجنوں" آنسو اس کی آنکھوں
سے جاری تھے اور جس چیز پر وہ گرتے تھے
اُسے نرم کر دیتے تھے ——————

کپڑے یہیں رکھ دو۔ (گاتی ہے)

"بید مجنوں، بید مجنوں"

امیلیا! خدا کے واسطے جلد چلی جا۔ اب وہ آتے ہی ہوں گے۔

(گاتی ہے)

بید مجنوں کی ہری ہری پتیوں کا ہار میرے گلے
میں ہو، کوئی اس پر الزام نہ رکھے۔ اس کی
خفگی بھی مجھے پیاری ہے۔

نہیں گیت میں تو یہ بات آگے نہیں آتی۔ سنو، دروازہ کوئی کھٹکھٹاتا ہے۔

امیلیا :۔ کوئی نہیں ہے ہوا سے کھٹ کھٹ ہوتی ہے۔

وسدیمونہ :۔ (گاتی ہے)

میں اپنے عاشق کو جھوٹا عاشق کہنے لگی لیکن
اس نے یہ سن کر کیا کہا "گائے جاؤ بید مجنوں
بید مجنوں۔ اگر میں زیادہ عورتوں سے عشق
کروں گا تو پھر تم زیادہ مردوں کے ساتھ
ہم بستر ہو گی"

اچھا بس اب چلی جاؤ۔ سلام۔ میری آنکھیں کھجا رہی ہیں۔ لیکن کیا اس سے یہ خبر نہیں نکلتی کہ اور رونا پڑیگا۔

امیلیا :۔ اس سے تو کوئی خبر اِدھر کی نہ اُدھر کی نکلتی ہے۔

وسدیمونہ :۔ لوگوں کو ایسے ہی کہتے سُنا ہے۔ ارے یہ مرد یہ مرد۔ امیلیا تو اپنے ایمان سے کہہ سکتی ہے کہ دُنیا میں ایسی عورتیں بھی ہیں جو اپنے مردوں سے بیوفائی اور وہ بھی بہت بُرے طریقہ سے کر کے انھیں صدمہ پہنچا سکتی ہیں ؟

۴ ۲ ۳ ۵

امیلیا :۔ بعض عورتیں ضرور ایسی ہوتی ہیں۔ اس میں ذرا شک نہیں۔

وسدیمونہ :۔ امیلیا کیا تجھے ساری دُنیا ملے تو تُو ایسا کریگی؟

امیلیا :۔ کیوں؟ کیا آپ ایسا نہ کریں گی؟

وسدیمونہ :۔ نہیں اس اونچے اور روشن آسمان کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ہرگز نہیں۔

امیلیا :۔ ہاں میں بھی اس روشن آسمان کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ دن کی روشنی میں تو ایسا نہ کروں گی۔ مگر رات میں اندھیرے کی نہیں کہتی۔

وسدیمونہ :۔ امیلیا اگر کوئی ساری دُنیا تجھے دے تو تُو ایسا کرے گی؟

امیلیا :۔ دُنیا تو بڑی چیز ہے اور اس چھوٹے سے چھوٹے قصور کے تاوان میں وہ بڑی گراں ہے۔

وسدیمونہ :۔ سچ تو یہ ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ تو کبھی ایسا نہ کرے گی۔

امیلیا :۔ نہیں سچ تو یہ ہے کہ میں ایسا ہی کرونگی۔ اور کرنیکے بعد سب کچھ اَن ہوا کر دوں گی مگر قسم ہے کہ میں یہ کام کسی انگوٹھی کیلئے یا زمین اور جائداد کیلئے یا اچھے اچھے کپڑوں، کُرتیوں اور ٹوپیوں کیلئے اور چھوٹے چھوٹے تحفوں کیلئے نہ کروں گی۔ لیکن اگر پوری دُنیا ملے تو وہ عورت کونسی ہوگی جو اپنے شوہر کو دُنیا کا بادشاہ نہ بنانا چاہے گی۔ اور پھر تھوڑی دیر کیلئے ایسی بات نہ کر سکے گی۔ میں تو ایسے گناہ کو اعراف میں جا کر پاک کر لوں گی۔

وسدیمونہ :۔ لعنت ہو مجھ پر جو میں ساری دُنیا کے بدلے میں بھی ایسا کروں۔

امیلیا :۔ دُنیا میں ہر گناہ تو گناہ نہیں مانا جاتا۔ اور جب دُنیا میں آپ جیتی ہیں تو گناہ پھر اسی دُنیا میں ہوا۔ مگر اس گناہ کو آپ کارِ ثواب بنا سکتی ہیں۔

وسدیمونہ :۔ میں نہیں سمجھتی کہ کوئی عورت بھی دُنیا میں ایسی ہوگی کہ اپنے شوہر کے ساتھ اس طریقے سے بیوفائی کرے۔

امیلیا :۔ بیسیوں ایسی ہونگی۔ اور ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی ہونگی جو عزت اور اختیار کیلئے وہ کچھ کرنے کو تیار رہیں کہ اُن کی اولاد سے پوری دُنیا آباد ہو جائے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی عورتوں کا گنہ گار ہو جانا اکثر ان کے شوہروں کی غلطی اور غفلت سے پیش آتا ہے۔ اگر عورتوں کی یہ لغزشیں کہ وہ اپنے فریضوں سے غفلت کرتی ہیں، ہوتی بھی ہیں تو اس کی وجہ بھی ہوتی ہے کہ شوہر اپنا مال و متاع غیر عورتوں کی نذر کر ڈالتے ہیں۔ یا پھر رشک اور حسد پیدا ہو کر اپنی بیویوں پر طرح طرح کی قیدیں لگاتے ہیں۔ اور اگر وہ ہمیں مارتے پیٹتے ہیں، یا روپیہ دینے میں کمی کرتے ہیں تو پھر ہم غصہ بھی رکھتے ہیں اور شوہروں سے انتقام لینے کو جی چاہتا ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ ہم میں بعض خوبیاں اور نیکیاں بھی ہیں مگر ان کے ساتھ طیش اور انتقام بھی ہے۔ شوہروں کو معلوم رہنا چاہیئے کہ ان کی بیویوں میں بھی وہی قوت احساس ہے جو خود اُن میں ہے۔ اور دیکھنے کو آنکھیں اور سونگھنے کو ناک وہ بھی رکھتی ہیں کڑوی اور میٹھے میں تمیز کرنی انھیں بھی ایسی ہی آتی ہے جیسے کہ ان کے شوہروں کو آتی ہے۔ جب وہ ہم کو چھوڑ کر دوسروں کے ہو جاتے ہیں تو معلوم نہیں وہ اس بات کو کیا سمجھتے ہیں۔ کیا وہ اسے ایک کھیل گردانتے ہیں۔ ہاں میں تو ایسا ہی سمجھتی ہوں۔ اور یہ لہو و لعب جذبات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ میرا خیال ہے کہ ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے جو اسے غلطی میں ڈالتی ہے۔ تو کیا پھر ہم میں نفس کے جذبات نہیں ہیں۔ اور کیا ہمارا شوخی شرارت اور کھیل کو جی نہیں چاہتا۔ کھیل شوخی شرارت اور کمزوری ہم میں بھی وہی موجود ہے جو مردوں میں ہے۔ پس مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھیں۔ ورنہ انھیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جو بُرائیاں ہم ان کے ساتھ کرتے ہیں وہ ان ہی کی بُرائیوں سے ہم سیکھتے ہیں۔

وسدیمونہ :۔ اچھا امیلیا سلام۔ شب بخیر ہو۔ خدا کرے کہ میں بُری باتیں بُرے کاموں سے نہ سیکھوں بلکہ بُری باتوں سے بھی اپنی زندگی کے کاموں کی اصلاح کروں۔

(سب چلے جاتے ہیں)

—

جُزوِ خامس

پہلا منظر

(فرس - ایک گلی)

ایاگو اور روڈریگو آتے ہیں

ایاگو:۔ ہاں بس مکان کے اس باہر کو نکلے ہوئے گوشے کے پاس کھڑے رہو۔ وہ ادھر جلد آنیوالا ہے۔ تلوار سونت لو اور جب وہ قریب آئے تو ایک ہاتھ ایسا دینا کہ کام ہی تمام ہو جائے۔ جلدی کرو جلدی۔ کسی بات سے ڈرو نہیں۔ میں تمھارے پاس ہی رہوں گا۔ دل میں یہی بات جمائے رکھو کہ آج قسمت بنی یا بگڑی ارادہ مضبوط رکھو۔

روڈریگو:۔ تم پاس ہی رہنا۔ ممکن ہے کہ میرا وار خالی جائے۔

ایاگو:۔ میں تو تمھارے بالکل قریب ہوں۔ ہمت سے کام لو اور یہاں کھڑے ہو جاؤ۔ (چلا جاتا ہے)

روڈریگو:۔ اس کام پر میری کچھ ہمت بہت نہیں جمتی مگر ایاگو نے جو کچھ کہا ہے اس سے اطمینان ہوتا ہے۔ اگر کاسیو کو مار ڈالا تو بات اتنی ہی ہوتی کہ دُنیا سے ایک آدمی کوچ کر گیا۔ تلوار تو نکل بس اب کاسیو کے دن پورے ہوئے۔

ایاگو:۔ میں نے اس احمق روڈریگو کو بہت کچھ جوش دلا کر ہمت کے ساتھ اس میں تھوڑی سی عقل بھی پیدا کی ہے اور اُسے غصہ بھی آگیا ہے۔ اب چاہے کاسیو کو وہ قتل کرے یا کاسیو اس کا کام تمام کرے ہر صورت میں میرا ہی فائدہ ہے۔ اگر روڈریگو زندہ رہا تو وہ کل روپیہ اور زیور جو ڈسڈیمونا کے دینے کیلئے میں نے اس سے ٹھگا ہے مجھے واپس دینا پڑیگا۔ لیکن اگر کاسیو مرنے سے بچ گیا تو اس کی روزانہ زندگی کے مقابلہ میں میری زندگی بہت ہی کریہہ منظر اور بدنما معلوم ہوتی رہے گی۔ ممکن ہے کہ خود مراکشی وہ چال جو میں نے کاسیو کے مارنے کیلئے چلی ہے اس پر ظاہر کردے اس وجہ سے اور بھی میری حالت خطرے میں رہے گی۔ بہرکیف کاسیو کو جان سے مارنا ضروری ہوگا۔ اچھا سنو کاسیو کے قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(کاسیو آتا ہے)

روڈریگو:۔ میں اس کی چال خوب پہچانتا ہوں۔ بدمعاش کدھر جاتا ہے۔ جان سے ہاتھ دھولے (روڈریگو کاسیو پر تلوار چلاتا ہے)

کاسیو:۔ یہ وار تو جان کا دشمن ہی نکلتا مگر نیچے زرہ پہنے تھا۔ تلوار کاٹ نہ کرسکی۔ اب دیکھوں تو میرے وار سے کہاں تک بچتا ہے (تلوار چلاتا ہے۔ روڈریگو زخمی ہو جاتا ہے)

روڈریگو:۔ ارے مار ڈالا۔

(ایاگو پیچھے سے آکر کاسیو کی ٹانگ کو زخمی کر کے فرار ہوتا ہے)

کاسیو:۔ ارے ہیں تو ہمیشہ کو لنگڑا ہو گیا۔ مار ڈالا۔ مار ڈالا۔ کوئی مدد کرو۔ (کاسیو گر پڑتا ہے)

(اوتھیلو آتا ہے)

اوتھیلو:۔ یہ آواز تو کاسیو کی سی تھی۔ ایاگو اپنے قول کا بڑا سچا نکلا۔

روڈریگو:۔ تو پھر بدمعاش ہم ہی ٹھیرے۔

اوتھیلو:۔ ہاں بات یہی ہے۔

کاسیو:۔ لوگو مدد کرو۔ روشنی لاؤ۔ کسی جراح کو بلاؤ۔

اوتھیلو:۔ اچھا یہ تو واقعی کاسیو ہے۔ ارے واہ رے بہادر ایاگو تو بڑا قول کا سچا اور وعدے کا پکا ہے۔ اور اپنے دوست کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی ہے اس کا تجھے بڑا خیال ہے۔ تو تو مجھے سبق دیتا ہے۔ اور اے بدذات عورت دیکھ لے تیرا آشنا مرا پڑا ہے۔ اور تیری ناپاک موت بھی قریب ہے۔ تیرے حسن اور تیری حسین آنکھوں کا طلسم اب لوٹ گیا۔ وہ آنکھیں تیرے داغ ہیں اور تیرے بستر پر جو حرام کاری کے دھبے ہیں انھیں تجھ زانیہ کے خون سے رنگا جائیگا۔

(چلا جاتا ہے)

(لودویکو اور گراتیانو آتے ہیں)

کاسیو:۔ ارے کیا کوئی چوکیدار نہیں ہے۔ کوئی راہ گیر بھی ادھر سے نہیں نکلتا۔ خون ہوگیا مار ڈالا۔

گراتیانو:۔ یہ آواز تو بڑے درد اور تکلیف کی معلوم ہوتی ہے۔

کاسیو:۔ خدا کیلئے کوئی مدد کرو۔

لودویکو:۔ سنتے۔

روڈریگو :- ہائے روڈریگو بدنصیب!

لودیویکو :- دو تین زخمیوں کی سی آوازیں ہیں۔ غضب کی رات ہے۔ ممکن ہے کوئی دھوکا یا فریب ہو۔ جب تک زیادہ آدمی نہ آجائیں آگے نہ جانا چاہئے۔

روڈریگو :- اگر کوئی مدد کو نہ آیا تو میرا تو خون بہتے بہتے دم ہی نکل جائیگا۔

لودیویکو :- آپ سُنتے ہیں!

(ایاگو روشنی لیکر آتا ہے)

گراتیانو :- کوئی آدمی صرف قمیص پہنے روشنی لئے ہتھیار لگائے ادھر آرہا ہے۔

ایاگو :- کون ہے؟ اور کس کی آواز ہے؟ جو "مار ڈالا مار ڈالا" کا شور مچاتی ہے؟

لودیویکو :- ہمیں نہیں معلوم۔

ایاگو :- کیا آپ نے چیخنے کی آواز نہیں سنی؟

کاسیو :- اِدھر آیئے۔ ادھر آیئے خدا کیلئے میری مدد کیجئے۔

گراتیانو :- یہ تو اوتھیلو کا نشان بردار ایاگو معلوم ہوتا ہے۔

لودیویکو :- ہاں وہی ہے بڑا بہادر آدمی ہے۔

ایاگو :- کیا بات ہے۔ کیوں اس قدر تکلیف سے چیختے ہو؟

کاسیو :- ایاگو! میرا تو بُرا حال ہے۔ بدمعاشوں نے تو میرا کام ہی تمام کر دیا۔

ایاگو :- ارے نائب صاحب آپ ہیں! وہ بدمعاش کون تھے جنھوں نے یہ حرکت کی۔

کاسیو :- ان بدمعاشوں میں سے ایک یہیں کہیں چھپا ہے۔ وہ بھاگ نہیں سکتا۔

ایاگو :- ارے دغاباز و بدمعاشو! ئیں کیا آپ وہاں ہیں؟ ادھر آیئے اور مدد کیجئے۔

(یہ آخری جملہ لودیویکو اور گراتیانو سے کہتا ہے)

روڈریگو :- ارے کوئی میری تو خبر لے۔

کاسیو :- ان قاتلوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

ایاگو :- ارے بے ایمان قاتل شیطان۔ (یہ کہہ کر ایاگو روڈریگو کے تلوار مارتا ہے)

روڈریگو :- ارے بے ایمان ایاگو۔ ارے بے رحم کتے۔

ایاگو :- ارے بے ایمان تو اندھیرے میں آدمیوں کو قتل کرتا پھرتا ہے۔ ارے خونی بدمعاشو چور دو تم کدھر گئے۔ شہر میں تو عجیب سناٹا پڑا ہے۔ لوگو دوڑو خون ہو گیا۔ خون ہو گیا۔ آپ لوگ کون ہیں؟ اس سے غرض نہیں کہ نیت آپ کی اچھی ہے یا بُری۔ بتایئے آپ ہیں کون؟

لودیویکو :- جب معلوم ہو گا کہ ہم کون ہیں تو آپ ہماری عزت کریں گے۔

ایاگو :- ہیں! کیا سینیور لودیویکو آپ ہیں!

لودیویکو :- جی ہاں میں ہوں۔

ایاگو :- رحم کیجئے! یہاں کاسیو بدمعاشوں کے ہاتھ سے زخمی ہوا پڑا ہے۔

گراتیانو :- کاسیو!

ایاگو :- بھائی کاسیو! تمھارا کیا حال ہے؟

کاسیو :- کسی نے میری ٹانگ کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

ایاگو :- واللہ سچ ہے خدا سب کو اپنی امان میں رکھے۔ شریفو روشنی لاؤ۔ میں اپنی قمیص پھاڑ کر کاسیو کے زخم پر پٹی باندھتا ہوں۔

(بیانکا آتی ہے)

بیانکا :- کیا بات ہے۔ کون چیخ رہا ہے؟

ایاگو :- کون چلایا تھا؟

بیانکا :- ارے میرے پیارے کاسیو۔ پیارے کاسیو۔ ہائے کاسیو، کاسیو۔

ایاگو :- یہ تو وہی مشہور کسبی ہے نا، کاسیو آپ کچھ بتا سکتے ہیں کس نے آپ کو زخمی کیا؟

کاسیو :- میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ کس نے زخمی کیا ہے۔

گراتیانو :- کاسیو آپ کو زخمی دیکھکر مجھے سخت افسوس ہوتا ہے۔ میں تو اس وقت آپ ہی کی تلاش میں نکلا تھا۔ ارے کوئی پاؤں کی پٹیاں اتار کر دو کہ زخم پر باندھی جائیں۔ کوئی کرسی لاؤ کہ آسانی سے کاسیو کو یہاں سے اٹھا کر لے چلیں۔

بیانکا :- ہائے کاسیو کو تو غش آگیا ہے۔ ارے میرے کاسیو، کاسیو!

ایاگو :- شریفو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ عورت بھی اس قتل میں شریک تھی۔ کاسیو تھوڑی دیر صبر کرو۔ اچھے کاسیو چلو چلو۔ مجھے کوئی روشنی دو۔ ارے کوئی اس صورت کو بھی پہچانتا ہے۔ ہائے افسوس یہ تو میرا دوست روڈریگو ہے۔ جو میرا ہم وطن معلوم ہوتا ہے

روڈریگو تمھیں ہونا۔ واللہ روڈریگو ہے۔
گراتیانو:۔ کیا وینس کا باشندہ روڈریگو ؟
ایاگو:۔ جی ہاں وہی۔ کیا آپ اس سے واقف ہیں ؟
گراتیانو:۔ ہاں خوب جانتا ہوں۔
ایاگو:۔ سینیور گراتیانو میں آپ سے معافی مانگتا ہوں اس خون خرابہ میں ادب اور تعظیم کا بھی خیال نہ رہا اور میں آپ کو پہچان نہ سکا۔
گراتیانو:۔ میں آپ سے مل کر خوش ہوا۔
ایاگو:۔ کاسیو تمھارا کیا خیال ہے ؟ لو کرسی آگئی۔
گراتیانو:۔ روڈریگو۔
ایاگو:۔ جی ہاں وہی ہے وہی ہے۔ (کرسی لائی جاتی ہے) یہ اچھا ہوا کرسی آگئی۔ کوئی آدمی احتیاط سے اسے یہاں سے لیجائے میں ابھی جاکر سپہ سالار کے جراح کو لاتا ہوں۔ (بیانکا سے کہتا ہے) مہربان آپ نے کیوں تکلیف کی جو صاحب یہاں زخمی پڑے ہیں وہ میرے دوست کاسیو ہیں۔ کیا آپ میں اس میں کوئی رنجش تھی ؟
کاسیو:۔ نہیں کچھ نہیں۔ نہ میں اس آدمی سے واقف ہوں۔
ایاگو:۔ (بیانکا سے مخاطب ہوتا ہے)۔ واہ کیوں تم کیوں زرد پڑ گئیں۔ ارے انھیں کوئی ہوا میں لے جاؤ۔ (کاسیو اور روڈریگو کو کرسی پر بٹھا کر باہر لے جاتے ہیں) شریفو آپ قیام کریں۔ بیانکا تم زرد پڑ گئی ہو۔ ذرا آنکھوں کا پھٹا پن تو دیکھئے۔ نہیں اگر اسی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو گی تو پھر کچھ اور باتیں بھی سننے میں آئیں گی۔ ذرا اسے غور سے دیکھتے رہیئے۔ واللہ غور سے دیکھیں شریفو کیا آپ کو نہیں معلوم کہ گو زبانیں بند ہو جائیں مگر گناہ بغیر ظاہر ہوئے نہیں رہتا۔

(امیلیا آتی ہے)

امیلیا:۔ افسوس کیا بات ہے شوہر بتاؤ تو۔ کیا بات ہے ؟
ایاگو:۔ روڈریگو نے یہاں اندھیرے میں کاسیو پر حملہ کیا۔ روڈریگو کے ساتھ چند اور آدمی بھی تھے جو بھاگ گئے۔ کاسیو مرنے کے قریب ہے اور روڈریگو مر چکا ہے۔
امیلیا:۔ افسوس افسوس شریف کاسیو!
ایاگو:۔ دیکھئے حرام کاریوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ امیلیا ذرا جاکے معلوم تو کرو کہ آج رات کاسیو نے کھانا کہاں کھایا تھا ؟ (بیانکا سے کہتا ہے) تم اتنا کانپنے کیوں لگیں ؟
بیانکا:۔ اس نے آج رات کو میرے ہاں کھانا کھایا تھا۔ میں کوئی اس بات پر تھوڑا ہی کانپتی ہوں۔
ایاگو:۔ اچھا تمھارے گھر کھانا کھایا تھا۔ میں اس جرم کا الزام تم پر رکھتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔
امیلیا:۔ اری بازاری عورت تجھ پر افسوس آتا ہے۔
بیانکا:۔ میں بازاری عورت کیوں ہوتی۔ میری زندگی تو ایسی ہی پاک صاف ہے جیسا تم نام رکھنے والی کی ہے۔
امیلیا:۔ ارے میری زندگی کے برابر تیری زندگی کیا ہوگی۔ ارے دل میں ذرا تو شرما۔
ایاگو:۔ مہربانو آؤ چل کر کاسیو کا حال دیکھیں کہ اس کی مرہم پٹی ہو گئی ہے یا نہیں۔ بیانکا تم بھی آؤ۔ تمھیں تو کوئی اور ہی قصہ بیان کرنا ہوگا۔ امیلیا تم ذرا قصر تک جاؤ۔ اور آقا اور انکی بیگم سے کہو کہ یہاں کیسے کیسے قتل کے واقعے پیش آئے۔ مہربانی کرو اور جاکر اطلاع کردو۔ (علیحدہ کہتا ہے)
آج کی رات وہ ہے کہ یا تو قسمت بن گئی یا بالکل ہی بگڑ کر تباہ ہوئی۔

(چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر

قصر میں ایک خوابگاہ

(ڈسڈیمونہ بستر پر سو رہی ہے ایک شمع روشن ہے
اوتھیلو اندر آتا ہے)

اوتھیلو:۔ اصلی سبب اصلی وجہ جس کی بنا پر جو کچھ میں اس وقت کرنے والا ہوں، کروں گا یہی ہے۔ اے میری روح کیا میں ان پاک نورانی ستاروں کے سامنے اس چیز کا نام لوں جس کی وجہ سے جو کچھ اس وقت کرنیوالا ہوں وہ کرونگا مگر میں اس کا خون نہ بہاؤں گا۔ اور نہ اس کی جلد پر خون کا داغ لگنے دوں گا۔ جو برف سے زیادہ سفید اور سنگ مرمر سے زیادہ چکنی ہے۔ اے شمع میں تجھے بجھا کر افسوس نہ کروں گا۔ لیکن پھر بھی تجھے جان دینی ہوگی۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو تو اور مردوں کو دغا دیگی۔ پہلے شمع کو بجھاؤں پھر اسے حسن فطرت کے اعلیٰ ترین نمونے تجھے بھی گل کروں۔ اے شمع اگر میں تجھے بجھاتا ہوں تو پھر میں تجھے روشن کرلوں گا۔ اور تیرے بجھانے کا مجھے کچھ افسوس نہ ہوگا۔ لیکن اے حسن کی شمع فروزاں جب میں تیری

روشنی گُل کروں گا تو مجھے علم نہیں کہ وہ شرر حیات کہاں ہے جس سے میں پھر بجھے روشن کر لوں۔ درخت سے پھول توڑ لیا تو پھر اس میں کوئی جان نہیں ڈال سکتا۔ اس کا مرجھانا ضروری ہے۔ میں تو اس گُل کو درخت ہی پر سونگھوں گا۔ (وسدیمونہ کا بوسہ لیتا ہے) اے نفس جان پرور انصاف تو بھی تھا کہ اپنی تلوار کے دو ٹکڑے کر دیتا۔ ایک اور ایک۔ اور جب تو مر جائے تو جو صورت تیری اس وقت ہے اسی کے ساتھ میرے دل میں رہیو۔ اس وقت میں تیری جان لیتا ہوں۔ لیکن اس کے بعد ہمیشہ تجھی سے عشق رکھوں گا۔ ایک بوسہ اور دے اور یہ بوسہ آخری ہے۔ اس سے پہلے کوئی حسین چیز اتنی مہلک نہ تھی۔ میں روؤں گا اور خوب روؤں گا۔ اور یہ آنسو جو اس وقت گر رہے ہیں اور میرا یہ غم بھی خدا کے غم کی مثل ہو گا۔ جو اپنے پیاروں کو سزا دینے کے وقت اسے کرنا پڑتا ہے۔

(وسدیمونہ جاگتی ہے)

وسدیمونہ:۔ یہ کون ہے؟ کیا پیارے اوتھیلو تم ہو؟

اوتھیلو:۔ ہاں وسدیمونہ میں ہوں۔

وسدیمونہ:۔ آقا آپ بستر پر آجائیں۔ یہاں آرام کریں۔

اوتھیلو:۔ وسدیمونہ کیا تم خدا کی عبادت کر چکی ہو؟

وسدیمونہ:۔ ہاں آقا کر چکی ہوں۔

اوتھیلو:۔ اگر کوئی گناہ ایسا رہ گیا ہو جس کی معافی خدائے غفّار سے نہ مانگی ہو تو پھر اس کی معافی بھی مانگ لو۔

وسدیمونہ:۔ افسوس آقا معلوم نہیں آپ کی کیا مراد ہے؟

اوتھیلو:۔ ہاں خدا سے معافی مانگ لو۔ میں تمھاری روح کو ہلاک کرنا نہیں چاہتا جس وقت تک کہ تم خدا سے اپنے گناہوں کی معافی نہ مانگ لو۔ خدا نہ کرے کہ میں تیری روح کو ہلاک کرنا چاہوں۔

وسدیمونہ:۔ یہ آپ جان سے مارنے کی باتیں کیسی کہنے لگے۔

اوتھیلو:۔ ہاں باتیں ایسی ہی ہیں۔

وسدیمونہ:۔ تو خدا مجھ پر رحم کرے۔

اوتھیلو:۔ آمین! میں بھی یہی چاہتا ہوں۔

وسدیمونہ:۔ اگر آپ ایسا کہتے ہیں تو میں سمجھتی ہوں کہ آپ میری جان نہ لیں گے۔

اوتھیلو:۔ کیوں؟

وسدیمونہ:۔ پھر بھی میں ڈرتی ہوں کیونکہ آپکی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ اور جب آپ کے دیدے اس طرح پھرنے لگتے ہیں تو یہی ہوتا ہے۔ مگر میں کیوں ڈروں۔ میں گناہ سے واقف نہیں مگر پھر بھی مجھے خوف معلوم ہو رہا ہے۔

اوتھیلو:۔ اپنے گناہوں کو یاد کرو۔

وسدیمونہ:۔ گناہ کوئی یاد کرنے کو نہیں ہے۔ صرف عشق و محبت کی باتیں ہیں جو یاد آرہی ہیں۔

اوتھیلو:۔ اور ہاں اسی لئے تم ہلاک ہوتی ہو۔

وسدیمونہ:۔ وہ موت فطرت کے خلاف ہو گی جو عشق و محبت کی وجہ سے عمل میں لائی جائے۔ افسوس۔ آپ اپنا نیچے کا ہونٹ اس طرح کیوں چباتے ہیں۔ کوئی خونی جذبہ آپ پر ایسا ہی جس نے سر سے پاؤں تک آپ پر لرزہ ڈال رکھا ہے۔ مگر یہ سب انتہائی باتیں ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں آپ کی مورد قہر و عتاب نہ ہوں گی۔

اوتھیلو:۔ خاموش رہو۔ بات نہ کرو۔

وسدیمونہ:۔ میں خاموش ہوں مگر بتایئے تو بات کیا ہے؟

اوتھیلو:۔ وہ رومال جس کی میں بہت قدر کرتا تھا اور جو تمھیں دیا تھا وہ کہاں ہے؟ وہ تم نے کاسیو کو دیدیا؟

وسدیمونہ:۔ نہیں۔ میں اپنی جان اپنی روح کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے اُسے نہیں دیا۔ اُسے بلا کر پوچھ لو۔

اوتھیلو:۔ پیاری روح احتیاط کر۔ دیکھ کہیں قسم جھوٹی نہ پڑ جائے۔ کیونکہ اس وقت تو اپنے موت کے بستر پر ہے۔

وسدیمونہ:۔ لیکن ابھی تو جان سے نہ مارو گے؟

اوتھیلو:۔ ہاں ابھی۔ اس لئے اپنے گناہ کا اقرار کر۔ کیونکہ ہر بات کو قسم کھا کر انکار کرنے سے میرے اس صدمے کو تو دور نہیں کر سکتی۔ جس کے باعث میرا دل ہر وقت آہ و فغاں کرتا رہتا ہے۔ تو اس وقت اپنی جان سے جانیوالی ہے۔

وسدیمونہ:۔ تو پھر اے خدا تو مجھ پر رحم کر۔

اوتھیلو:۔ میں اس پر بھی آمین کہتا ہوں۔

وسدیمونہ:۔ تو کیا آپ میں کچھ بھی رحم ہے۔ میں نے تمام عمر آپکا کوئی قصور نہیں کیا۔ کبھی کاسیو سے محبت نہیں کی۔ اگر اس کا خیال کیا بھی تو صرف اتنا کہ آپ کے ساتھ جو عشق ہے اس میں خلل نہ آئے۔ جہاں تک خدا کا حکم ہو سکتا تھا وہاں تک میں نے اس کا

خیال کیا۔ میری محبّت اس کے ساتھ ویسی تھی جو انسان کو انسان کے ساتھ بھائی ہونیکی وجہ سے ہوتی ہے۔ وہ محبّت نہ تھی جو بیوی کو شوہر کے ساتھ ہوتی ہے۔ میں نے آپ کا دیا ہوا تحفہ اسے نہیں دیا۔

اوتھیلو:۔ خدا کی قسم میں نے اپنا رومال اس کے ہاتھ میں دیکھا۔ اری جھوٹی قسمیں کھانے والی تونے میرے دل کو پتھر بنا دیا اور جو کچھ اس وقت ارادہ رکھتا ہوں تونے ہی اس پر مجھے مجبور کیا ہے یعنی ارادہ تیری ہلاکت کا۔ اور اس ہلاکت کو میں ایک کفارہ یا قربانی سمجھتا ہوں۔ میں نے رومال اس کے پاس دیکھا ہے۔

وسدیمونہ:۔ تو اسے کہیں پڑا ملا ہوگا۔ میں نے اسے ہرگز نہیں دیا۔ یہاں بُلا کر آپ اس سے سچی بات معلوم کرلیں۔

اوتھیلو:۔ وہ اقبال کرچکا۔

وسدیمونہ:۔ کس بات کا اقبال؟

اوتھیلو:۔ اس بات کا کہ وہ تجھ سے کام لے چکا ہے۔

وسدیمونہ:۔ کیا کوئی ناجائز کام؟

اوتھیلو:۔ ہاں۔

وسدیمونہ:۔ وہ ایسا نہیں کہہ سکتا۔

اوتھیلو:۔ اس کی زبان بھی بند کردی گئی ہے۔ ایماندار ایاگو کو اس بات کا حکم دیکر روانہ کردیا ہے کہ وہ کاسیو کو ہلاک کردے۔

وسدیمونہ:۔ ہائے میں یہی ڈرتی تھی کہ کہیں اب وہ زندہ نہ ہو۔

اوتھیلو:۔ اگر اس کے تن میں تمام عالم کی جانیں ہوتیں تب بھی میرا انتقام ان سب جانوں کو لئے بغیر نہ رہتا۔

وسدیمونہ:۔ افسوس اس کے ساتھ دغا ہوئی اور میرا بھی کام تمام ہوا۔

اوتھیلو:۔ جا بدبخت بیسوا تو میرے سامنے کاسیو کیلئے آنسو بہاتی ہے۔

وسدیمونہ:۔ آقا مجھے طلاق دیدیجئے۔ جان سے نہ ماریئے۔

اوتھیلو:۔ بس مرنے کیلئے تیار ہوجا۔

وسدیمونہ:۔ اچھا کل مجھے مار ڈالنا۔ آج مجھے زندہ رہنے دو۔

اوتھیلو:۔ جب ارادہ کرلیا تو اس میں فرق نہیں ہوسکتا۔

وسدیمونہ:۔ اچھا مجھے ایک دعا پڑھ لینے دو۔

اوتھیلو:۔ نہیں بہت دیر ہوئی۔

(وسدیمونہ کا گلا گھونٹ دیتا ہے)

امیلیا:۔ (اندر سے چیختی ہے) آقا آقا آقا۔ آپ سنتے ہیں آقا۔

اوتھیلو:۔ یہ کون پکارتا ہے۔ وسدیمونہ ابھی مری نہیں ہے۔ جان پوری نہیں نکلی۔ میں ظالم و سفاک ہوں مگر رحم بھی دل میں رکھتا ہوں۔ تجھے اس وقت کے کرب و تکلیف میں نہ رہنے دونگا۔ بس۔ بس۔

امیلیا:۔ (اندر سے کہتی ہے) آقا آقا۔ آپ سنتے ہیں۔ آقا میرے۔

اوتھیلو:۔ کون ہے؟

امیلیا:۔ اچھے آقا۔ مجھے ایک بات آپ سے کہنی ہے۔

اوتھیلو:۔ اچھا یہ امیلیا ہے۔ وسدیمونہ کا دم رفتہ رفتہ نکل رہا ہے۔ امیلیا غالباً کاسیو کے مرنیکی خبر لائی ہے۔ کچھ شور یہاں بھی سُنا گیا تھا۔ اب حرکت نہیں رہی۔ چہرے پر قبر کی طرح خاموشی طاری ہے۔ امیلیا کو اندر بلالوں۔ کیا یہ بات ٹھیک ہوگی۔ اگر وہ اندر آگئی تو پھر کیا کرنا ہوگا۔ وہ آتے ہی میری بیوی سے بات کریگی۔ میری بیوی، میری بیوی! بیوی اب کہاں رہی؟ ارے ناقابلِ برداشت غم اور اے بُری گھڑی میں تو سمجھتا ہوں کہ چاند اور سورج اب مدّت تک دونوں گہن میں رہیں گے۔ اور اس انقلاب سے یہ خوف زدہ زمین شق ہوجائے گی۔

امیلیا:۔ (اندر سے کہتی ہے) میں نہایت عاجزی سے عرض کرتی ہوں کہ ایک ضروری بات مجھے آپ سے کہنی ہے۔ اچھے میرے آقا، میرے سرکار جو کچھ مجھے کہنا ہو وہ سُن لیجئے۔

اوتھیلو:۔ اچھا چپکے چپکے میں مسہری کا پردہ گراتا ہوں۔ امیلیا تم کدھر ہو (خواب گاہ کا دروازہ کھولتا ہے)

(امیلیا داخل ہوتی ہے)

امیلیا:۔ حضور یہاں سامنے تو بڑے بڑے قتل و خون ہوئے ہیں۔

اوتھیلو:۔ اچھا پھر کیا؟

امیلیا:۔ حضور وہ ابھی ابھی کے وقوعے ہیں۔

اوتھیلو:۔ یہ تو فضا میں چاند کی غلطی ہے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ زمین کے قریب آتا جاتا ہے۔ اور اس کے اثر سے آدمی دیوانے ہوئے جاتے ہیں۔

امیلیا:۔ حضور کاسیو نے وینس کے ایک نوجوان روڈریگو کو قتل کردیا ہے۔

اوتھیلو:۔ روڈریگو قتل ہوگیا اور کاسیو بھی مارا گیا۔

امیلیا:۔ نہیں کاسیو نہیں مارا گیا۔

اوتھیلو:۔ کاسیو قتل نہیں ہوا تو پھر یہ سارا کشت و خون کا منصوبہ بگڑ گیا۔ اور وہ شیریں انتقام جو لینا تھا تلخی کے ساتھ باقی رہ گیا۔

وسدیمونہ:۔ ارے مجھے دھوکے میں بالکل دھوکے میں جان سے مارا۔

امیلیا:۔ یہ آواز کیسی ہے؟

اوتھیلو:۔ کونسی آواز؟

امیلیا:۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز میری بیگم کی ہے۔ لوگو دوڑو مدد کرو۔ بیگم پھر کچھ بولو۔ پیاری وسدیمونہ، اچھی وسدیمونہ آگے کچھ کہو تو۔

وسدیمونہ:۔ میں بیقصور مرتی ہوں۔

امیلیا:۔ کس نے یہ حرکت کی؟

وسدیمونہ:۔ کسی نے کچھ نہیں کیا جو کچھ کیا میں نے کیا۔ اچھا خدا کو سونپا۔ آقا سے میرا رخصتی سلام کہہ دینا۔

(وسدیمونہ مر جاتی ہے)

اوتھیلو:۔ اس کے مارے جانے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

امیلیا:۔ افسوس ہائے افسوس کسے خبر ہے؟

اوتھیلو:۔ تم تو سُن چکی ہو کہ اس نے خود اپنی جان دی ہے۔ میں قاتل نہیں ہوں۔

امیلیا:۔ کہا تو یہی تھا۔ مگر میں ابھی سب سے جا کر کل حال کہتی ہوں۔

اوتھیلو:۔ وسدیمونہ تو ایک دروغ گو کی طرح جلتے دوزخ میں چلی گئی۔ یہ میں تھا جس نے اُسے جان سے مارا ہے۔

امیلیا:۔ تو اور بھی وہ فرشتہ ہوئی اور آپ سیاہ رُو شیطان ہوئے۔

اوتھیلو:۔ وہ بدکار تھی کسبی ہوگئی تھی۔

امیلیا:۔ آپ بالکل جھوٹ بکتے ہیں۔ آپ جھوٹے شیطان ہیں۔

اوتھیلو:۔ وہ تو پانی کی مثل تھی کہ جدھر راستہ ملے ادھر بہہ جائے وہ بیوفا تھی۔ دغاباز تھی۔

امیلیا:۔ وہ پانی تھی یا فاحشہ تھی، مگر آپ آگ کی طرح غار تگر نکلے۔

اوتھیلو:۔ اگر میں نے صحیح اور درست وجوہ کی بنا پر اسے نہیں مارا تو پھر خدا مجھے دوزخ کے طبقۂ اسفلین میں جھونک دے۔ تیرے شوہر کو سارا حال معلوم ہے۔

امیلیا:۔ میرے شوہر کو؟

اوتھیلو:۔ ہاں تیرے شوہر کو۔

امیلیا:۔ یہ کہ وہ بیوفا اور فاحشہ تھی!

اوتھیلو:۔ ہاں کاسیو کے ساتھ اس نے حرام کاری کی۔ اگر وہ باوفا رہتی اور خدا میرے لئے کوئی نئی دُنیا بھی تیار کر کے مجھے دیتا تو پھر اس دُنیا کے مولوں بھی میں اسے کبھی نہ بیچتا۔

امیلیا:۔ کیا میرے شوہر نے کہا؟

اوتھیلو:۔ اس نے مجھ سے سب سے پہلے کہا۔ وہ سچا اور ایماندار آدمی ہے۔ اور بُرے افعال کے ساتھ جو نجاست لگی ہوتی ہے اس سے وہ نفرت کرتا ہے۔

امیلیا:۔ کیا میرے شوہر نے آپ سے ایسا کہا؟

اوتھیلو:۔ عورت کیوں اس طرح ایک ہی بات بار بار پوچھے جاتی ہے۔ کیا تجھ سے میں نے نہیں کہا کہ تیرے شوہر نے مجھ سے کہا تھا۔

امیلیا:۔ ہائے ہائے میری بیگم تیرے عاشق کو دھوکوں اور مکاریوں نے اپنا شکار بنایا۔ کیا میرے شوہر نے آپ سے کہا تھا کہ بیگم بیوفا ہے!

اوتھیلو:۔ ہاں عورت سُنا نہیں کہ اسی نے مجھ سے پہلے کہا تھا۔ کیا اتنا بھی نہیں سمجھتی۔ تیرا شوہر یعنی ایماندار ایاگو اور میری دوست نے مجھ سے کہا۔ وہ تو بڑا سچا اور ایماندار شخص ہے۔

امیلیا:۔ اگر اس نے کہا تو خدا اس کی موذی اور آزار دینے والی روح کو رتی رتی کرکے غارت کرے۔ اس بے ایمان نے آپ سے پیٹ بھر کر جھوٹ بولا میری بیگم کو تو شوہر کے ساتھ وہ عشق تھا کہ کبھی کسی کے ساتھ وہ ایسا جس گناہ نہ کرسکتی تھیں۔

اوتھیلو:۔ کیا بکتی ہے!

امیلیا:۔ آپ جو چاہے سو کریں۔ آپ کا یہ کام خدا کی نظروں میں ایسا ہی ناپسندیدہ ہے جیسے کہ آپ وسدیمونہ کے شوہر بننے کے لائق نہ تھے۔

اوتھیلو:۔ بہتر یہی ہے کہ تو خاموش رہ۔

امیلیا:۔ اب آپ میں مجھے نقصان پہونچانے کی آدھی طاقت بھی نہیں ہے۔ جو مجھے نقصان اٹھانے میں ہے۔ ارے احمق

اُلّو۔ ارے گیدی۔ کیچڑ اور مٹی سے زیادہ بےحس تو نے وہ کام کیا ہے۔ تیری اس تلوار سے میں ڈرتی نہیں۔ اگر بیس جانیں بھی میں رکھتی ہوتی اور وہ سب نکال لی جاتیں تب بھی میں کُل حالات دُنیا پر آشکارا کر دُوں گی۔ لوگو دوڑو۔ مدد کرو مدد، مراکشی نے میری بیگم کو جان سے مار ڈالا۔ خون ہوا ہے۔ قتل ہوا ہے۔

(مونٹونو، گراتیانو، ایاگو اور، اور لوگ آتے ہیں)

مونٹونو:۔ کیا بات ہے؟ سپہ سالار یہ کیا معاملہ ہے؟

امیلیا:۔ ارے ایاگو تو بھی آیا۔ شاباش ایاگو شاباش تو نے خوب کام کیا۔ اب سب تیری گردن پر یہ خون رکھیں گے۔

گراتیانو:۔ یہ معاملہ کیا ہے؟

امیلیا:۔ لوگو اگر تم میں انصاف ہو تو اس ایاگو دغاباز، بدمعاش اور بےایمان پر جرم ثابت کرو۔ اوتھیلو کہتا ہے کہ ایاگو نے اس سے کہا کہ میری بیگم نے شوہر کے ساتھ دغا کی۔ کوئی بتائے تو یہ کیسے ہوا؟ میرا دل بھرا آتا ہے۔

ایاگو:۔ جو میرا خیال تھا وہی میں نے اس سے کہا اور کوئی بات اس سے زیادہ نہیں کہی جسے خود اس نے بجا اور درست نہ سمجھا ہو۔

امیلیا:۔ کیا تم نے کبھی اس سے کہا تھا کہ وسدیمونہ بیوفا ہے؟

ایاگو:۔ ہاں میں نے کہا تھا۔

امیلیا:۔ تو تُو نے بالکل جھوٹ کہا اور جھوٹ بھی ایسا بیہودہ اور جہنم واصل کرنے والا کہ خدا کی پناہ۔ اپنی جان کی قسم تو نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ اور فتنہ انگیز دروغ تھا کہ میری بیگم نے کاسیو کے ساتھ کوئی حرکت کر کے شوہر سے بیوفائی کی۔ کیا تو نے کاسیو کے ساتھ اُسے مُتہم کیا؟

ایاگو:۔ ہاں کاسیو کے ساتھ۔ نالائق عورت جادُو رہو۔ اپنی زبان بند کر۔

امیلیا:۔ میں کبھی اپنی زبان بند نہ کروں گی۔ میرا فرض ہے کہ اصلی حال کہوں۔ میری بیگم یہاں مری پڑی ہے۔ کسی نے اُسے جان سے مارا ہے۔

سب:۔ خدایا یہ کیا بات ہے۔ ہم پر اپنا رحم کر۔

امیلیا:۔ اور تیری باتوں سے یہ خون ہوا ہے۔

اوتھیلو:۔ دوستو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھو۔ یہ واقعہ صحیح ہے۔

گراتیانو:۔ اگر سچ ہے تو سخت عبرت کا مقام ہے۔

مونٹونو:۔ ارے یہ کیسا غضب کیسا ستم ہوا؟

امیلیا:۔ دغا، فریب، بدمعاشی، خیانت۔ مجھے تو پتہ چل گیا ارے بدمعاشی۔ ارے پاجی پن! تیرا بُرا ہو۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ بس تو اس صدمے میں اپنی جان دیدوں گی۔

ایاگو:۔ امیلیا کیا پاگل ہوگئی ہے؟ سنتی ہے! میں حکم دیتا ہوں بس گھر جا کر بیٹھ۔

امیلیا:۔ اچھے شریفو مجھے اجازت دو کہ میں سارا حال کہہ سناؤں یہ میں جانتی ہوں کہ بیوی کو شوہر کا حکم ماننا لازمی ہے مگر اس وقت نہیں۔ ایاگو سُن لے اب مجھے گھر جانا شاید نصیب نہ ہو۔

اوتھیلو:۔ ہائے ہائے یہ کیا ہوا۔ (بستر پر گرتا ہے)

امیلیا:۔ اچھا ہے بستر پر گر جہاں وہ مری پڑی ہے اور خوب چیخیں مار مار کر رو۔ کیونکہ تو نے ایک حسین پیاری معصومہ کو جس نے کبھی دُنیا میں آنکھ کھولی تھی جان سے مارا ہے۔

اوتھیلو:۔ (بستر سے اٹھ کر کہتا ہے) لیکن وہ بدکار اور بیوفا تھی۔ (گراتیانو کی طرف دیکھ کر کہتا ہے) چچا آپ کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ دیکھئے یہ آپ کی بھتیجی بے جان پڑی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میرے ان ہاتھوں نے اس کی جان لی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ حرکت سب کو بےحد خوفی اور ہولناک معلوم ہوتی ہے۔

گراتیانو:۔ ہائے غریب وسدیمونہ۔ اچھا ہوا کہ تیرا باپ مر چکا ہے۔ تیری یہ شادی اس کے لئے مہلک ثابت ہوئی اور محض اسی رنج اور صدمے نے اس کے رشتہ حیات کو توڑ دیا۔ اگر آج کو وہ جیتا ہوتا تو یہ واقعہ سُن کر اس کی بہت ہی بُری حالت ہو جاتی۔ بھلائی کا فرشتہ جو انسان کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے اُسے وہ لعنت کر کے دُور کر دیتا۔ اور بُرائی کے فرشتے کی مدد سے معلوم نہیں وہ کیسے کیسے جہنمی کام کرتا۔

اوتھیلو:۔ یہ حال قابل رحم ہے۔ لیکن ایاگو کو سب حال معلوم ہے کہ اس نے کاسیو کے ساتھ گناہ کیا۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ ہزاروں مرتبہ۔ کاسیو نے خود اس کا اقبال کیا۔ اور میں نے اپنے عشق کی جو نشانی اسے دی تھی۔ اس نے اغیار کیلئے اپنے عشق تاپاک کا اسے ضامن بنایا۔ میرے عشق کی یہ نشانی وہ تھی جو سب سے پہلے میں نے وسدیمونہ کو دی تھی۔ پھر میں نے وہی چیز کاسیو کے ہاتھ میں دیکھی۔ وہ پُرانی صنعت کا ایک رومال تھا جو میرے باپ نے میری ماں کو دیا تھا۔

امیلیا :- توبہ توبہ ۔ خدایا اور اے عرش کے فرشتو توبہ ۔

ایاگو :- امیلیا ادھر آ ۔ چپ رہ ۔

امیلیا :- میں سارا بھید کھولوں گی ۔ میں کچھ نہ کہوں اور چپ رہوں ۔ نہیں میری آہ و زاری میں تو وہ زور ہوگا جیسے بادِ شمال میں زور ہوتا ہے ۔ چاہے اس میں انسان یا شیاطین بلکہ دونوں مل کر مجھے شرمندہ کریں ۔ نادم کریں ۔ میں کل باتیں کہے بغیر ہرگز نہ رہوں گی ۔

ایاگو :- ارے عقل سے کام لے اور گھر چلی جا ۔

امیلیا :- میں ہرگز نہ جاؤں گی ۔

(ایاگو اسے چھری مارنے پر آمادہ ہوتا ہے)

گراتیانو :- عزت ، شرم ایاگو ! ارے کمبخت تو عورت پر ہاتھ چلاتا ہے ۔

امیلیا :- ارے بیوقوف مراکشی جس رومال کا تو ذکر کرتا ہے وہ تو اتفاق سے مجھے پڑا ملا تھا ۔ اور میں نے اُسے اپنے شوہر ایاگو کو دیا تھا ۔ کیونکہ وہ اکثر اس معمولی اور بے حقیقت چیز کیلئے کہتا رہتا تھا ۔ کہ میں اُسے کسی طرح چرا لوں ۔

ایاگو :- کیا بکتی ہے اری شیطان بدکار !

امیلیا :- وہ رومال ڈسڈیمونہ نے کاسیو کو نہیں دیا ۔ ہرگز نہیں دیا ۔ بلکہ میں نے وہ رومال جو مجھے پڑا ملا تھا اپنے شوہر ایاگو کو دیا تھا ۔

ایاگو :- بے ایمان تو جھوٹ بولتی ہے ۔

امیلیا :- خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں بولتی ۔ لوگو میں ہرگز جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں ۔ ارے قاتل ۔ بے ایمان تجھ جیسے بدکار کو ایک نیک بخت معصوم عورت سے کیا واسطہ تھا ۔

اوتھیلو :- اے عرش جو پتھر تجھ سے زمین پر گرا کرتے تھے کیا اب ان میں کوئی باقی نہیں رہا ۔ ارے خبیث بدمعاش ۔

(اوتھیلو ایاگو پر دوڑ پڑتا ہے ۔ ایاگو پیچھے سے امیلیا کو خنجر مار کر چلا جاتا ہے)

گراتیانو :- یہ عورت گر پڑی ہے ۔ ایاگو نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ۔

امیلیا :- ہاں ہاں مجھے اپنی بیگم کے پاس لٹا دو ۔

گراتیانو :- وہ تو چلا گیا اور اپنی بیوی کو جان سے مار گیا ۔

مونٹونو :- ایاگو تو مشہور بدمعاش ہے ۔ یہ تلوار آپ اپنے پاس رکھیں اسے میں نے مراکشی سے لیا ہے ۔ سپاہیو آؤ باہر کے دروازہ پر پہرہ دو کسی کو باہر نکلنے نہ دیا جائے ۔ اگر کوئی نکلنا بھی چاہے تو فوراً اس کی گردن اڑا دو ۔ میں اس بدمعاش ایاگو کو گرفتار کرنے جا رہا ہوں ۔ کیونکہ وہ بڑا ہی خبیث اور چالاک آدمی ہے ۔

(مونٹونو اور گراتیانو چلے جاتے ہیں)

اوتھیلو :- اب میری بہادری کیا باقی رہ گئی جب ایک کمزور آدمی بھی مجھ سے تلوار لے لے ۔ جب زندگی کی معمولی عزت بھی مجھ سے رخصت ہوئی تو پھر فوج اور میدانِ جنگ کی عزت کا باقی رہنا بیکار ہے ۔ دونوں عزتوں کو خیرباد کہو ۔

امیلیا :- پیاری ڈسڈیمونہ تو نے جو مرنے سے پہلے گیت گایا تھا اس سے کیا خبر نکلتی تھی ۔ پیاری کچھ سنتی بھی ہے میں تو اب وہی گیت گاتے گاتے مرتی ہوں ۔ (امیلیا گاتی ہے)

مراکشی سن لے وہ پاک تھی اور پاکدامن تھی اور
تجھ سے اُسے عشق تھا ۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ
سچ ہے ۔ خدا مجھ پر رحم کرے اور سچ کہتی ہوئی
میں جان دوں ۔ میں مرتی ہوں ۔ میں مرتی ہوں ۔

(امیلیا مر جاتی ہے)

اوتھیلو :- میرے پاس ایک دوسری تلوار اسی کمرے میں ہے جو اُندلسی فولاد کی ہے ۔ دیکھو وہ یہاں موجود ہے ۔ گراتیانو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں ۔

گراتیانو :- (اندر سے کہتا ہے) اگر تم نے ایسا کیا تو سخت سزا بھگتنی پڑے گی ۔ تمہارے پاس کوئی ہتیار نہ رہنا چاہئے ۔ ورنہ تم سخت نقصان اٹھاؤ گے ۔

اوتھیلو :- آپ خود دیکھ لیں اور پھر مجھ سے کہیں میں تو بالکل نہتا ہوں ۔ مگر اس حال میں بھی حملہ کرنے کو تیار ہوں ۔

گراتیانو :- یہ کیا بات ہوئی ؟

اوتھیلو :- دیکھئے میرے پاس ایک ہتیار ہے جو اس سے بہتر طریقے پر کبھی کسی سپاہی کی کمر میں نہ بندھا تھا ۔ میں وہ دن دیکھ چکا ہوں کہ اس بازو اور اس تلوار سے میں بڑی بڑی مزاحمتوں اور خطروں کو چیرتا ہوا نکل گیا ہوں جو تمہاری مزاحمتوں سے بیس گنا سخت تھیں ۔ مگر اس وقت یہ شیخیاں فضول ہیں ۔ تقدیر پر کسی کا بس نہیں ۔ مجھ سے ڈرو نہیں کہ میں اس وقت ہتیار لگائے

ہوں ۔ نہیں میرے سفر کی منزل قریب آگئی ہے ۔ اور وہ نشان نظر آنے لگا ہے جہاں تک میری کشتیٔ عمر کا بادبان جاتا نظر آسکتا ہے۔ تم ڈر کر بھاگتے ہو ۔ تمھارا خوف فضول ہے ۔ اوتھیلو کے حملے کے سامنے انسان ایک پرِ کاہ کی مثل ہے ۔ مگر اب وہ روپوش ہو تاکہ اوتھیلو تو کہاں جائیگا ۔ اور اسے بدقسمت عورت جو برف کی مثل سفید پڑی ہے ۔ جب ہم دونوں عالم بالا میں ملیں گے تو پھر تیری نگاہ میری روح کو عرش سے جہنم میں پھینکے گی ۔ اور شیاطین اسے لپک لیں گے ۔ ہائے پیاری تو کیسی اپنی عفت اور عصمت کے مثل سرد پڑی ہے ۔ ارے جہنم کے شیطانو آؤ اور مجھ ملعون کو کوڑے لگاؤ ۔ اور اس پاک صورت کو مجھے نہ دیکھنے دو ۔ مجھے پھونک مار کر ہوا میں اُڑا دو ۔ ابلتی گندھک میں ڈال کر جلا دو ۔ اور آتشِ عمیق کی گہری خلیجوں میں مجھے غوطے دو ۔ ہائے ڈسڈیمونہ ہائے ڈسڈیمونہ تو مر گئی ۔

(لوڈویکو، مونٹانو، کاسیو کو کرسی پر بٹھلائے لاتے ہیں۔ بہت سے افسر ایاگو کو پا بہ زنجیر کئے حاضر ہوتے ہیں)

لوڈویکو: ۔ وہ بے احتیاط، بے پروا ظالم و سفاک کہاں ہے؟

اوتھیلو: ۔ وہ جو کبھی اوتھیلو تھا یہاں موجود ہے ۔

لوڈویکو: ۔ اور وہ سانپ کا بچہ کہاں ہے ۔ اس حرامی کو سامنے لاؤ ۔

اوتھیلو: ۔ میں تو اس کے پیروں کی طرف دیکھتا ہوں ۔ کہ کہیں پاؤں کی جگہ شیطان کی طرح پنجے تو نہیں ہیں ۔ مگر یہ تو قصّے کہانیوں کی بات ہے ۔ اگر تو واقعی شیطان ہے تو میں تیری جان نہیں لے سکتا ۔ (اوتھیلو ایاگو کو زخمی کرتا ہے)

لوڈویکو: ۔ اوتھیلو سے اس کی تلوار لے لو ۔

ایاگو: ۔ زخم سے خون جاری ہے مگر مرا نہیں ہوں ۔

اوتھیلو: ۔ مجھے دونوں باتوں میں سے کسی کا بھی افسوس نہیں ۔ میں تو تیرا زندہ رہنا چاہتا ہوں ۔ کیونکہ میرے نزدیک اب مرنا ایک خوشی کی بات ہے ۔

لوڈویکو: ۔ اوتھیلو تم پر افسوس آتا ہے ۔ کسی زمانہ میں تم کیسے اچھے آدمی تھے ۔ تم اس جہنمی خبیث کی باتوں میں آگئے ۔ اب تمھیں بتاؤ کہ تمھیں کیا کہا جائے؟

اوتھیلو: ۔ جو جی میں آئے سو کہو ۔ اگر چاہو تو مجھے ایک معزز قاتل کے نام سے یاد کرو ۔ کیونکہ جو کچھ مجھ سے ہوا ہے وہ نفرت کی وجہ سے نہیں بلکہ عزت کے خیال سے ہوا ۔

لوڈویکو: ۔ اس عورت امیلیا نے ایاگو کے جو جرائم بیان کئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اوتھیلو تم نے اور ایاگو نے مل کر کاسیو کے قتل کا ارادہ کیا تھا ۔

اوتھیلو: ۔ ہاں ایسا ہوا تھا ۔

کاسیو: ۔ پیارے سالار میں نے کبھی آپ کو ناراض نہیں کیا ۔

اوتھیلو: ۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے اور میں تم سے معافی چاہتا ہوں ۔ تم اس شیطان سے دریافت کرو کہ اس نے کیوں میرے جسم اور میری روح دونوں کو مبتلائے عذاب کیا ۔

ایاگو: ۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو ۔ جو کچھ تمھیں معلوم ہے معلوم ہے اور اب سے ہرگز میں کوئی لفظ منہ سے نہ نکالوں گا ۔

لوڈویکو: ۔ کیوں کیا منہ سے معافی مانگنے کیلئے بھی کچھ نہ کہو گے ۔ لیکن جب شکنجے میں کھینچے جاؤ گے تو زبان آپ سے آپ کھل جائے گی ۔

اوتھیلو: ۔ ہاں اس کیلئے یہی درست ہوگا ۔

لوڈویکو: ۔ جو کچھ ہوا ہے وہ آپ کی سمجھ میں اور آجائیگا ۔ یہ خط مقتول روڈریگو کی جیب سے برآمد ہوا ہے ۔ اور یہ دوسرا خط بھی اسی کی جیب سے نکلا ہے ۔ ان میں سے ایک خط میں لکھا ہے کہ روڈریگو کاسیو کو قتل کرے اور یہ کام اس کے سپرد کیا جاتا ہے ۔

اوتھیلو: ۔ ارے حرامی خبیث !

کاسیو: ۔ یہ ایاگو تو بڑا ہی کافر و ظالم نکلا ۔

لوڈویکو: ۔ اور لیجئے یہ پرچہ اور ہے جو مقتول روڈریگو کی جیب سے نکلا ہے ۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرچہ روڈریگو اس شیطان ایاگو کو پاس بھیجنے والا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پرچہ پہنچنے سے پہلے ایاگو نے روڈریگو کا کام تمام کر دیا ۔

اوتھیلو: ۔ ارے بے ایمان سفاک ایاگو ۔ کاسیو یہ بتاؤ کہ میری بیوی کا رومال تمھارے پاس کیسے پہنچا ۔

کاسیو: ۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں پڑا دیکھا تھا اور خود ایاگو نے بھی اقبال کیا ہے کہ میرے کمرے میں کسی خاص مقصد کیلئے اس نے رومال ڈلوا دیا تھا ۔

اوتھیلو: ۔ ہائے میں کیسا بیوقوف احمق اور نالائق تھا ۔

کاسیو: ۔ روڈریگو کے پرچے میں جو اس نے ایاگو کو لکھا تھا اس

میں ایاگو کو اس بات پر سخت اور سست کہا ہے کہ اس نے مجھ پر اس وقت حملہ کرنیکی ترغیب دی جبکہ میں پہرہ دے رہا تھا۔ اور جیسا سمجھتے تھے کہ رودریگو مرگیا تو وہ فعتہً ہوشیار ہو کر کہنے لگا کہ ایاگو نے فی الواقع کاسیو کو اس وقت زخمی کیا تھا جبکہ کاسیو کے قتل کیلئے رودریگو کو ہدایت کی تھی۔

لودویکو:۔ اوتھیلو آپ اس کمرے سے نکل کر ہمارے ساتھ چلیں آپ کے تمام اختیارات سلب کر لئے گئے ہیں۔ اور کاسیو اب قبرص میں حکومت کریگا۔ اور کاسیو اگر کوئی درد و عذاب ایسا ہے جو اس شیطان ایاگو کو سخت سے سخت اذیت پہنچائے مگر مرنے نہ دے تو پھر ایسا درد و عذاب آپ اسے پہنچائیں۔ اوتھیلو تم اس وقت تک حراست میں رہو گے جب تک تمہارے جرم کی پوری کیفیت وینس کی ریاست کو دریافت نہ ہو جائے۔ سپاہیو! اوتھیلو کو لے چلو۔

اوتھیلو:۔ ذرا ٹھہریئے میں نے ریاست کی کچھ خدمت کی ہے وینس کی مجلس میری خدمات سے واقف ہے۔ مگر اس وقت اس کا کچھ ذکر نہیں۔ صرف اتنی درخواست ہے کہ آپ اپنی کیفیت میں جو کہ در اصل میں ہوں وہ لکھیں۔ واقعات کے بیان میں کمی نہ ہو۔ اور نہ عداوت اور نفرت سے کام لیا جاوے۔ اور میرا ذکر اس طرح کیجئے گا کہ میں وہ تھا جس نے سچا عشق کیا تھا مگر عقل نہ تھی۔ اور جیسے کسی ملک کا ایک وحشی باشندہ ایک گوہر نایاب پاتا جس کی قیمت اس وحشی کی پوری قوم سے بھی زیادہ ہوتی ہے مگر قدر نہ پہچاننے کی وجہ سے وہ اس گوہر آبدار کو ضائع کر دیتا ہے۔ اور یہ شرمندہ آنکھیں گو رونے سے واقف نہ تھیں مگر پھر بھی وہ اس طرح اشکبار ہوئیں جیسے عربستان کے درختوں سے لعاب بہتا ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ لکھنا کہ حلب میں ایک معند اور نابکار شخص تھا جس نے وینس کے ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ اور وینس کی ریاست کو گالیاں دی تھیں میں نے اس کتے کا گلا پکڑ کر اس طرح اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا

(اوتھیلو خنجر نکال کر سینے میں بھونک لیتا ہے)

لودویکو:۔ ارے خونی انجام!

گراتیانو:۔ ہماری سب بحث اور خیالات فضول ہو گئے۔

اوتھیلو:۔ (زخمی پر، ہنستا ہے) وسدیمونہ تجھے جان سے مارنے سے پہلے میں نے تیرا بوسہ لیا تھا اور اسی بوسے کو یاد کر کے میں اب اپنی جان دیتا ہوں۔ (اوتھیلو وسدیمونہ کے بستر پر گر کر مر جاتا ہے)۔

کاسیو:۔ مجھے بھی ڈر تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ آپ کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے

لودویکو:۔ اب رہا یہ موذی، بے حیا اور بے شرم کتا جو انسان کے اضطراب بھوک یا سمندر سے بھی زیادہ موذی اور سفاک ہے۔ اب ذرا اس بستر کو دیکھ کہ اس پر کتنی لاشیں پڑی ہیں۔ یہ سب تیرا کام ہے۔ ان کے دیکھنے سے بصارت زہر کھاتی ہے۔ اچھا اب اس بستر پر پردہ ڈال دیا جائے۔ گراتیانو آپ اوتھیلو اور وسدیمونہ کے گھر کا انتظام کریں۔ مرا کشی کے مال و دولت پر قبضہ کریں۔ کیونکہ وسدیمونہ اور اوتھیلو کے وارث آپ ہی ہیں۔ اور کاسیو آپ، جو اس وقت جزیرے کے حاکم ہیں آپ کے سپرد اس جہنمی بدمعاش ایاگو کی سزا کی جاتی ہے۔ کب؟ کہاں؟ اور کس طرح تکلیف اور اذیت اس کو دی جائے آپ خود تجویز کر کے اس پر عمل کریں۔ میں خود فوراً جہاز پر سوار ہو کر وینس جاتا ہوں تاکہ وہاں ریاست کے سامنے سخت رنج اور صدمے کے ساتھ یہ کل واقعات بیان کروں۔

(چلا جاتا ہے)

عنایت اللہ دہلوی

---

*"گلبانگِ حیات" کا ایک ورق۔

شکوۂ شیطان

(۱)

جبریلؑ

زمیں کی سمت سے الٰہی! دھواں سا کیوں آج اُٹھ رہا ہے؟
وہاں قیامت نہ آگئی ہو کہ شور ایسا مچا ہوا ہے!
جہنمی تیر یعنی شعلے بڑھے چلے آرہے ہیں کیسے؟
یہ سائیں سائیں ہے اُن کی یا کوئی بے بسی میں کراہتا ہے؟
کبھی نہ دیکھا تھا میری آنکھوں نے اِس بلا کا مہیب منظر
فرشتے گھبرا گئے ہیں یارب! تو ہی بتا کیا یہ ماجرا ہے؟
ملائکہ دم بخود ہیں دہشت دلوں پہ کچھ ایسی چھا رہی ہے
مگر ہے اک تیری ذات ہی "لامکاں" میں جو مسکرا رہی ہے

(۲)

باری تعالیٰ

شہابِ ثاقب کی ایک چشمک نے کھیل جس کا بگاڑ ڈالا
یہی وہ پاگل ہے روزِ اوّل پڑا تھا جبریل! جس سے پالا
یہی وہ گمراہِ اوّلیں ہے کبھی فرشتوں کا تھا جو رہبر
یہی وہ ناری ہے جس کا باطن کدورتوں نے کیا ہے کالا
یہی وہ گستاخ کینہ ور ہے "بدی کا موجد" ہے نام جس کا
یہی ہے جس نے کہا تھا "جنّت کو مَیں لگا کر رہوں گا تالا!"
شہابِ ثاقب کی رو سے باہر ٹھہر گیا ہے بڑھا نہیں ہے
ابھی بتائے گا خود ہی ہم کو کہ کیوں یہ افسردہ و غمیں ہے

(۳)

شیطان

قدیم قیوم و حیّ و احکم مرے گناہوں کا کیا ٹھکانہ
وہ تیرا آدم ہے جو کہ ستم کر کے تراش لیتا ہے جو بہانہ
گناہ ہی جس کی زندگی ہو اور آپ ہو وہ "گناہ گر" بھی
پڑی ہی کیا ہے اسے کہ تستا پھرے وہ توبہ کا تانا بانا؟
کیا ہو جب کوئی جرم دانستہ میری غیرت یہی کہے گی
کہ عذرِ تقصیر و وردِ توبہ ہے ایک فعلِ منافقانہ

نہ توبہ کرنے کو آگیا ہوں نہ میرا مقصد ہے عذر خواہی
مجھے ہے اک التماس کرنا عطا اجازت ہو یا الٰہی!

(۴)

شیطان اجازت مل چکنے کے بعد

جو اپنے ذمہ لیا تھا میں نے وہ کام انجام پا چکا ہے
ترا "خلیفہ" تجھے ہی پروردگار! دل سے بھلا چکا ہے
مرا تو کیا ذکر؟ خود تری ذات پاک ہی کا ہوا ہے منکر
جسے تو کہتا ہے اپنا بندہ وہ ہاتھ سے تیرے جا چکا ہے
شجر وہ جس پر تھا ناز تجھکو کہ عرش سا ہونگی اُس کی شاخیں
"انانیت کا ھبیب کرم" اُس کے ریشہ ریشہ کو کھا چکا ہے
یہ تیرے خاکی۔ الٰہی توبہ! غضب کے بیباک ہو گئے ہیں!
جو میرا فن تھا یہ اُس میں مجھ سے بھی آجکل تاک ہو گئے ہیں!

(۵)

شیطان کہے جاتا ہے

حیا کو بے ہودگی سمجھنا! فریب کاری پہ ناز کرنا!
غریب و بیکس پہ ظلم ڈھانا! امیر سے ساز باز کرنا!
یہ ننگِ انسانیت درندے رہے نہیں درگذر کے قابل
تجھے ترے قہر کی قسم ہے نہ اُن کی رسّی دراز کرنا!
نہ جانتے ہوں جو یہ بھی یارب! حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟
کہوں گا میں تو یہی کہ ایسوں سے چاہیئے احتراز کرنا
قریب ہی ہو اگر قیامت تو خیر کچھ دن گذار لوں گا
قیاس میرا اگر غلط ہو تو خاکیوں میں نہ اب رہوں گا

(۶)

باری تعالیٰ

جہاں ہو جذبات میں "دنانت" وہاں "تعلی" ضرور ہوگی
اور اِن پہ ہو انحصار جس کا وہ "زندگی" "پرفتور" ہوگی
"تضاد" دنیا کا ہے کرشمہ کبھی اندھیرا کبھی اُجالا
شہید ظلمت ہے آج اگر۔ کل ہی پرستارِ نور ہوگی
برس کے اُڑ جائیں گی گھٹائیں۔ ظہور مہرِ منیر ہوگا
"کلیم" کوئی نہ کوئی آئے گا خاک یہ پھر سے طور ہوگی
ابھی قیامت کہاں عزازیل! جا وہیں! ہے جہاں سے آیا
بگڑنے والا ہے کوئی دم میں یہ کھیل تیرا بنا بنایا

امین حزیں سیالکوٹی

بے باپ کا بیٹا

اماّمی نے مُڑکر دیکھا، پالنے میں اُس کا پُھلروا سا لال ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یک بیک اُس کا تنفس تیز ہو گیا اور اُس کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی۔ باہر مینہہ رِم جھم رِم جھم برس رہا تھا، رات جوانی کی طرح مست اور اُس کی زندگی کی طرح کالی تھی۔ اُس کے خیالات میں طوفان بپا ہو گیا۔ اگلے پچھلے واقعات پھر اُسے اپنے سے بیگانہ بنانے لگے۔ اُس نے دیوانہ وار بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگی، لیکن وہ بالکل خوفزدہ نہیں ہوا، بلکہ مسکرا دیا، گویا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ اُس نے پھر اُسے پالنے میں لٹا دیا اور اُس پر جھک گئی جیسے آج وہ اپنی ساری داستان اس معصوم شریکِ راز کو سُنا دیگی۔ بہت دیر تک وہ دل ہی دل میں کچھ کہتی رہی اور بچہ بدستور کلیلیں کرتا رہا۔ آخر اس کے خیالات خود بخود رُک گئے۔ مامتا جذباتِ تنفر و حقارت پر غالب آگئی اور اُس نے بے چارگی سے کہا: "میرا مُنّا! ہائے کوئی آکر دیکھے! اس کے مکھڑے پر کس قدر بھولپن اور پاکیزگی ہے! کون کہہ سکتا ہے کہ اسے عالمِ وجود میں لانے والا اس کا باپ نہیں؟" پھر اُسکے مُستقبل کا خیال آتے ہی وہ لرز گئی۔ بیشک اس چہرے پر پھٹکار نہیں ہوگی لیکن لوگ تو اسے ناجائز اولاد ہی سمجھیں گے اور ان کا رویہ اُن بے گناہ کے ساتھ کسقدر رُوح فرسا ہوگا؟

اماّمی آبادی سے ذرا دُور غریبوں کے محلے میں رہتی ہے۔ چند سال پہلے ہی غنچہ دہن، زہرہ جبیں بہت سے نوجوانوں کے دلوں پر حکومت کرتی تھی۔ اس کا نازک بدن جوانی کے بوجھ سے لچکدار تھا اور مئے شباب اُس کے ساغرِ حُسن سے چھلکی پڑتی تھی۔ نہ جانے اسکے ہر گام پر کتنے سجدے تڑپتے تھے، کتنوں نے اپنا متاعِ عقل و ہوش اُس کی ایک ادائے مستانہ پر قربان کر دیا تھا اور اس کی ساقہائے سیمیں کی دید کیلئے نہ جانے کتنوں کی آنکھیں مچلتی تھیں۔ لیکن اُس نے اپنا دامن سب سے بچانے کی کوشش کی۔ آخرکار ایک شکیل اور وجیہہ نوجوان نے اُس کے دل پر قبضہ کر لیا اور دونوں کے تعلقات حد سے گذرتے گئے۔ جوانی کی بغاوت رنگ لا کر رہی اور اُس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی دھڑکن میں ایک ننھی سی گونج اور پیدا ہو گئی ہے۔ پھر وہ نوجوان روپوش ہو گیا۔ کوئی نہیں جانتا وہ کون تھا۔ خود اماّمی بھی اُسے بھول گئی ہے یا شاید اُسے یاد آ ہی نہیں سکتا۔ اُسے صدمہ جو اس قدر پہونچا ہے! توقعات کو اس ظالم نے کتنی بیدردی سے پاش پاش کر دیا۔ وہ، کہ جو اس کے ایک اشارے پر اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار تھی، آج بالکل تباہ حال ہے۔ اس نے اس کا ساتھ عین منجھدار میں چھوڑ دیا۔ اُس نے اُسے کیسے کیسے سُہانے خواب دکھائے تھے، کیسی کیسی خوش آئند اُمیدیں دلائی تھیں۔ وہ محبت کی بیقراریاں، وہ نباہ کے وعدے، وہ شبِ تنہائی کے قول و قرار، سب اب کسی بھولی ہوئی داستان کے اوراقِ پارینہ ہیں۔ پھر اس کا دماغی توازن کیسے برقرار رہتا؟ لوگ کہتے ہیں وہ ایک مخبوط الحواس عورت ہے، جس کی نظریں ہمیشہ سامنے اور ٹھری ہوئی رہتی ہیں۔ اس سے کسی کو ہمدردی نہیں۔ سب اس کو دھتکارتے ہیں۔ عورتیں تک اُس کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں: "آوارہ کہیں کی! یہ حرام کا بچہ اس کے شرمناک افعال کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔" لیکن وہ کسی کی پروا نہیں کرتی۔ لٹھے کا تنگ پجامہ، سفید کُرتا اور موٹا جھوٹا دوپٹہ اوڑھتی ہے۔ اُس کے نزدیک دُنیا مر گئی ہے سوائے دو ہستیوں کے، ایک اُس کا جگر گوشہ جس پر وہ جان چھڑکتی ہے، دوسرا ایک مرد جس سے وہ ہر وقت نفرت کرتی ہے۔ وہ بالعموم خاموش رہتی ہے۔ صرف جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے بچے سے باتیں کرنے لگتی ہے اور کئے جاتی ہے۔ وہ کچھ نہیں سمجھتا، پھر بھی وہ اُسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اب اس کا حُسن خاک میں مل چکا ہے۔ سُورج مکھی کی طرح کھلا ہوا چہرہ گلِ خزاں رسیدہ بن چکا ہے جس کی پتیاں کُملا کر جھڑا جاتی ہیں۔ جوانی رخصت ہو رہی ہے اور دل قبرستان کی طرح اُجاڑ ہو گیا ہے۔ وہ صرف ضرورت کے وقت باہر نکلتی ہے مگر بلا وجہ کسی سے بات نہیں کرتی۔ پھر بھی بازاری لونڈے اور اوباش نوجوان اُسے بجّو دیوانی کہکر چھیڑتے ہیں۔

--- ۲ ---

بارہ سال اور بیت گئے۔ وہ بُوٹا سا قدِ رعنا مائل بہ خمیدگی ہے۔ بُڑھاپا عُمر سے پہلے سر تا پا چھا گیا ہے۔ چہرے پر بے شمار جھرّیاں پڑی ہوئی ہیں جو ہر وقت غور و فکر، ہر لحہ سوچ بچار، اور ہر گھڑی کے رنج و قلق کا اعلان کر رہی ہیں۔ وہ پہلے گم سُم رہتی تھی، اب کبھی ہنسنے اور کبھی رونے

بھی لگی ہے۔ اُس کا بچہ ہوشیار ہوگیا ہے، نہایت ذہین، رحم دل، شریف۔ (۔! کیوں نہیں؟) اور اتنا ہی حساس۔ لیکن اَمّامی اس سے اپنے دل کی بات کبھی نہیں کہتی۔ خود دم گھوٹ رہی ہے، پر مُنہ سے بھاپ نہیں نکالتی۔ نہ جانے انجام کیا ہو، مگر وہ یہ راز کب تک چھپا سکے گی؟ مارنے کے ہاتھ پکڑ لو، کہتے کی زبان پر تو کسی کا بس نہیں؟۔

"ماں!" اسفان بسورتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اُس کے بال مٹی میں اَٹے ہوئے ہیں اور پھٹا ہوا کُرتہ بتا رہا ہے کہ کسی سے دھینگا مشتی ہوئی ہے۔

امی نے اُسے اپنے سینے سے چمٹالیا اور پیار سے بولی "کیا ہوا؟"

اسفان کی آواز رندھی ہوگئی "دیکھو ۔۔۔ نو دی کنجڑا مجھے روز تنگ کرتا ہے۔ ابھی میں اسکول سے چُپ چاپ آرہا تھا کہ اُس نے تالی بجاتے ہوئے کہا "حرامی ہے بے!!" یہ بڑی موٹی گالی ہے اماں! مجھے غصہ آگیا۔ مگر میں نے اُس سے رسان میں کہا تم مجھے نہ چھیڑا کرو۔ لیکن وہ اَبے تبے پر اتر آیا اور گالی گلوج کرنے لگا۔ اس پر میں نے جھپٹ میں سے ڈنڈا اُٹھا کر اُسے زور سے مارا۔ بس پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا......"

"نہیں بیٹا! لڑا نہیں کرتے" اَمّامی نے ہولے سے کہا۔

"واہ یہ سب تمہارا ہی قصور ہے" اسفان کو فوراً طیش آگیا۔ "سب لوگ تمہیں بُری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ آخر وہ دوسری عورتوں کی طرح تمہاری عزت کیوں نہیں کرتے؟"

اَمّامی خاموش ہوگئی۔ اسفان نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور وہ سامنے دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں متوحش تھیں اور چہرے پر ایک رنگ آ اور ایک جا رہا تھا۔ اُس نے اُس کی گردن میں ہاتھ حائل کر دیئے "معاف کر دو اَماں! مجھ سے غلطی ہوئی۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ تم بھی دوسری ماؤں کی طرح رہا کرو تاکہ وہ تمہاری بھی عزت کیا کریں ۔۔۔"

اَمّامی اب بھی نہیں بولی۔ اُس کی نظریں سامنے اور ٹھہری ہوئی تھیں۔ اسفان ڈر گیا۔ اَمّامی کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی اور اُسنے سرگوشی کے لہجے میں کہا "اسفان! اب تم ماشاءاللہ سمجھدار ہوگئے ہو۔ مجھے تم سے سب کچھ کہدینا چاہیئے ۔۔۔ ورنہ ایک روز کوئی اور تم سے کہدیگا"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے الفاظ نہیں ملتے آخر ہمت کرکے اُسنے کہنا شروع کیا "تمہارا باپ مرا نہیں۔ وہ زندہ ہے اور یہیں رہتا ہے"

"میرا باپ! زندہ ہے!!" اسفان حیرت زدہ رہ گیا "وہ کون ہے اماں؟"

اَمّامی سامنے دیکھتی رہی۔ وہ اس وقت کوئی دوسری ہستی معلوم ہوتی تھی۔ اسفان کے سوال کا خیال کیئے بغیر اُس نے پھر کہا "میں اُن دنوں محلہ سوزن گراں میں لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اور میرا گھر مدرسہ کے پاس تھا۔ ماں کے انتقال کے بعد میں اکیلی رہ گئی۔ اس وقت میرے پاس کبھی کبھار دو لڑکے آیا کرتے تھے۔ ایک میرا عم زاد بھائی اور دوسرا پڑوسن کا لڑکا، جو ہمیشہ چوری چھپے آیا کرتا تھا۔ میرا عم زاد بھائی اب یہاں ایک مشہور وکیل ہے۔ میں اُس سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ اور اُس نے بھی مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ میرے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار ہے۔ رفتہ رفتہ اس محبت نے مجھے دُنیا، مذہب اور قانون سب سے انجان کر دیا اور میں بالکل اُس کی ہوگئی۔ آخر ایک دن مجھے تمہارا علم ہوا اور میں ڈر گئی۔ چنانچہ میں نے اُس پر زور ڈالا اور پھر خوشامد کی کہ شادی جلد از جلد ہو جانی چاہیئے لیکن اب اُس کے تیور ہی بدل گئے۔ محبت کے فسانوں کی جگہ خشک باتوں نے لے لی اور ایکا ایکی اُس نے آنا جانا بھی بند کر دیا۔ کچھ دنوں بعد مجھے خبر ملی کہ اسکی شادی ہو رہی ہے۔ مجھ پر بجلی گر پڑی مگر میں عورت ذات کر کیا سکتی تھی۔ خود غرض مرد، اپنی بوالہوسی کی شکار، معصوم عورت کو اسی طرح ادھر میں چھوڑ دیتا ہے۔ میں نے بہتیرے ہاتھ پیر مارے، رب العزت کے آگے گھنٹوں رو رو کر دعائیں مانگیں اور اپنی سی کرنی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس نے ایک دوسری لڑکی سے شادی کرلی اور میں اپنی حسرتوں کا خون ہوتے ہوئے دیکھتی رہی.... تم جانتے ہو جس بچے کے ماں باپ کی شادی نہ ہوئی ہو اُسے کیا کہتے ہیں؟"

غم و غصہ سے اسفان کا چہرہ لال ہوگیا۔ اُس نے چلا کر کہا "اماں وہ کون ہے؟ مجھے اس کا نام بتا دو"

"ابھی نہیں" ۔۔۔ اَمّامی پر موت کی سی زردی کھنڈ گئی اور وہ کہتی رہی ۔۔۔ "میری نوکری چھٹ گئی۔ بھلا ایسی عورت اُستانی کیسے رہ سکتی ہے جو بن بیاہی ہو کر ماں بننے والی ہو؟ لیکن مجھے اس کی بھی پروا نہیں ہوئی۔ میرے سر میں اس وقت صرف دو سودے سمائے ہوئے تھے۔ ایک تمہاری محبت اور ایک تمہارے باپ سے نفرت۔ میں نے سوچ لیا کہ اُسے جیتے جی روحانی عذاب میں مبتلا رکھوں گی۔ میرا وجود اسکے لئے اپنا ضمیر مجسمہ ہوگا جو اُسے ہر دم اور ہر جگہ بے چین اور نادم رکھیگا"

اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اسفان خوفزدہ ہوگیا کہ کہیں اُس کا دل نہ اُلٹ جائے۔ اُس نے پھر کہا "میں وہ مکان چھوڑ کر اس دوسرے گھر میں آگئی۔ مہینے کے شروع میں ڈاکیہ ایک لفافہ لایا۔ اُس میں دس روپے کے دو نوٹ تھے، گویا تمہارا باپ خدا کے حضور

اپنا گناہ دھونا چاہتا تھا اور آج تک وہ اسی کوشش میں ہے۔"

"میرا باپ کون ہے اماں؟" اُس نے چیخ کر کہا۔ "ابھی مجھے بتاؤ میں اُسے جان سے مار ڈالونگا۔"

اسفان کو جوش میں دیکھکر آمامی نے اُس کا سر سہلایا اور چمکارتے ہوئے ہولے ہولے کہنے لگی۔ "بیٹا! موت سے زیادہ اور بھی تو سنگین سزائیں ہیں اور وہ انہیں بھگت رہا ہے۔ اُس کا گھر سُونا پڑا ہے، وہ اولاد سے محروم ہے۔ تم ہی اُس کے لڑکے ہو مگر اُسے تم پر اب کوئی اختیار نہیں۔ سنو! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اُس سے کس طرح انتقام لیا جا سکتا ہے۔ اُسے جان سے مار دینے کا خیال تو بالکل دل سے نکالدو ورنہ اُسے اپنے دُکھوں سے نجات مل جائے گی اور پھر خود تمہیں بھی لوگ نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے بجائے کوشش کرو کہ تم نہایت شریف اور اچھے آدمی بنو۔ اپنے میں وہ تمام خوبیاں پیدا کرو جن سے تمہارا باپ محروم ہے۔ اپنے تئیں اتنا بلند کرو کہ باوجود مجھ کو نوتی کے دُنیا تمہیں تمہارے باپ سے بہتر سمجھے ـــــ یہ باتیں دیمک کی طرح اُسے کھوکھلا اور اُس کی زندگی اجیرن کر دینگی۔"

"لیکن ماں! تم مجھے اُس کا نام بتا دو، پھر جو تم نے کہا ہے وہی کرونگا۔" اسفان نے آمامی کے سینے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے بچے!" آمامی اپنے آپے میں آگئی اور اُسکی آنکھوں سے توحش دُور ہوگیا۔ "تم بہت اچھے ہو۔ تم نے ہمیشہ میرا کہنا مانا اور مجھے یقین ہے کہ تم اب بھی تمام عمر میری مرضی پر چلو گے ـــــ بس اب مجھ سے کچھ نہ پوچھنا۔ چلو کھانا کھائیں۔"

(۳)

وہ سوچنے لگا اور سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہونچا کہ طالوت ہی وہ شخص ہے جس نے اُس کی ماں کے ساتھ دغا کی۔ شہر کا مشہور وکیل اور لاولد! وہ کس قدر دولتمند ہے! اور اس کے مقابلے میں یہ دونوں کیسی بےبسی کی زندگی گذار رہے ہیں؟ اس کے جسم میں تنفر و حقارت کی ایک لہر دوڑ گئی مگر اُس نے ضبط کیا۔ ماں سے جو وعدہ کر چکا ہے اُسے وہ نہیں توڑ سکتا۔ آمامی نے اُسے انتقام لینے کی ایک اور راہ دکھادی ہے۔ وہی بہتر ہوگی اور اسی پر اسے عمل کرنا چاہیئے۔ اسفان نہایت ذہین و طباع ہے اور اب تو اُسے کچھ کر کے دکھانا ہے۔ اس کی تمام تر توجہات تعلیم پر مرکوز ہو گئی ہیں۔ گلی کے لڈے اُسے چھیڑتے ہیں، بازار والے اُس کی ماں کو دیوانہ کہتے ہیں مگر وہ بُرا نہیں مانتا، اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ جب ہی تو وہ آج امتحان میں اوّل آیا۔ اُسے دو انعام ملے ہیں۔ ایک اسکول کی طرف سے بڑا سا تحفہ۔ ایک طالوت وکیل کی طرف سے پچاس روپے کی تھیلی۔ وہ خوش خوش گھر آ رہا ہے مگر اُس کے دل میں مسرت و استعجاب کے ملے جُلے جذبات ہیں۔ طالوت نے اُسے یہ انعام کیوں دیا ہے؟ بیشک وہ شہر کا بڑا رئیس اور تعلیمی اداروں کا سرپرست ہے، مگر اس سے پہلے تو اُس نے کسی کو اتنا بڑا انعام نہیں دیا؟

آج انعام ملے دوسرا روز ہے۔ اسفان اسکول سے رخصت ہوا ہے۔ ہیڈ ماسٹر نے اُس کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھکر کل کا سارا واقعہ سُنا دیا کہ اس کی ماں شام کو بازاروں میں پھرتی رہی۔ راہگیروں کو ٹہراتی اور اُن سے کہتی کہ میرے بیٹے نے انعام حاصل کیا ہے۔ وہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ لائق ہے۔ طالوت کو ڈوب مرنا چاہیئے۔ وہ خود تو آرام سے رہتا ہے مگر اُس کا بیٹا سکھ چین سے محروم ہے۔ اُس نے کہا: "میں تمہارے فائدے کیلئے ہی کہتا ہوں جس طرح ہو سکے اپنی ماں سے علیحدہ ہو جاؤ ورنہ وہ میڈیکل کالج میں بھی تمہیں بدنام کریگی۔"

"کبھی نہیں۔" اسفان نے غصے میں کہا۔ "وہ میری ماں ہیں، میں انکو ہرگز نہیں چھوڑونگا۔"

وہ بھاگا ہوا گھر آیا۔ آمامی مسالہ پیس رہی تھی۔ اسفان چیخکر بولا: "اماں! کل تم سارے میں کہتی پھریں کہ میرا باپ میر[illegible] سے غافل ہے؟"

اس نے اُس کے غصہ کی پروا نہیں کی۔ اطمینان سے اُٹھکر اُس کے پاس آگئی اور کہا: "ہاں میں نے لوگوں کو بتا دیا ہے کہ تمہارا باپ تمہارے ساتھ مناسب سلوک نہیں کرتا۔ شہر کا سب سے زیادہ مالدار شخص ـــــ طالوت ـــــ تمہارا باپ ہے اور سب لوگوں کو اسکا یقین آگیا ہے۔"

"نہیں۔ کسی کو یقین نہیں آیا۔ وہ تمہیں پگلی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے صرف تم سے ڈر کر تمہاری بات مان لی ہے۔"

"مجھ سے ڈر کر؟" وہ مسکرائی اور اُس کی مسکراہٹ میں ہیبت جھلکنے لگی۔ "نہیں۔ مجھ سے سوائے طالوت کے کسی کو نہیں ڈرنا چاہیئے۔"

اُس کی پتلیاں ٹہر گئیں اور کسی مخفی جذبے نے اُس پر قبضہ کر لیا۔ آج اسکا نفسِ تحت الشعور بالائے شعور آ رہا تھا اور عرصہ دراز کی کوئی بھولی ہوئی صورت اُس کے سامنے تھی۔ اسفان کو یقین ہوگیا کہ اُس کی ماں دیوانی ہے جس کے ہوش و حواس ٹھیک نہیں رہے۔ وہ بڑبڑائی: "ایاز! اب مجھے کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔"

"اماں!" اسفان نے اسکی حالت سے خائف ہو کر زور سے آواز دی۔

امامی نے کوئی توجہ نہیں کی، گویا وہاں وہ ہے ہی نہیں۔ اور دروازے کے پاس جاکر کہنے لگی "میرے پاس نہ آؤ۔ تم راتوں کو میرے پاس آتے تھے۔ مجھے تم پر اعتماد تھا مگر تم نے مجھے دھوکا دیا۔ جاؤ مجھے تم سے محبت نہیں ہے"

وہ اُس سے لپٹ گیا اور جھنجوڑ کر اُسے ہوشیار کرنے لگا۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کپکپاتی ہوئی آواز میں چیخی "ایاز!"

اُس کی وحشیانہ چیخ سے اسفان لرز گیا۔ امامی اُسے گھورتی رہی اور بولی "ایاز! میں تمہاری شکل سے بیزار ہوں۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ میں طالوت سے شادی کرنے والی ہوں ـــــ وہ شریف آدمی ہے، تم بدذات ہو"

پھر اُسے دورہ اُٹھ آیا اور وہ بُری طرح چیخنے لگی۔

"اماں!... اماں! میں تمہارا بچہ ہوں ـــ اسفان" لیکن اسکی کوشش رائگاں گئی۔

"تم نہیں جاؤ گے؟" اس پر وحشت و ہیبت چھا گئی "تم نے میری زندگی تباہ کردی، اور اب پھر یہاں آئے ہو؟ آہ! تم نے اپنے بدنصیب بچے کا تو خیال کیا ہوتا۔ میں تمہیں مار ڈالونگی"

"[illegible] ایاز نہیں ہوں ماں... میں تمہارا بیٹا ہوں" وہ اُسے بتاتا رہا "کیا تم نہیں پہچانتیں؟ میں اسفان ہوں، یہاں اور کوئی نہیں ہے"

مگر وہ ایک رُوحِ درماندہ کی طرح مضطرب و بے چین اِدھر سے اُدھر بھٹکتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے "تم مجھے اب کبھی ہاتھ نہ لگا سکو گے۔ تم نے میری رُوح جہنم واصل کر دی ہے۔ کس قدر گنہگار، کتنی گمراہ!" اُس نے سِل کے پاس سے پنسیری اُٹھالی "اب تم کسی لڑکی پر بُری نظر نہ ڈال سکو گے" اور پیشتر اس سے کہ وہ دروازے سے نکل کر بھاگ جاتا، اُس کے سر پر پنسیری ٹکرائی۔ خُون کی تلّی بہ نکلی اور وہ بیہوش ہوکر فرش پر گر پڑا۔

آخر اُسے ہوش آیا، اُس کے سر میں اب بھی ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ اور چاروں طرف پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بڑی مشکل سے اُس نے پہچانا کہ اُس کے سامنے جو دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں ان میں سے ایک اُس کے پڑوسی شیخ شہناز ہیں۔ اُس نے گھبرا کر کہا "میری ماں کہاں ہیں؟ انہوں نے مجھ پر قصداً حملہ نہیں کیا"

شیخ شہناز دلاسہ دیتے ہوئے بولے "وہ اچھی طرح ہیں۔ ہلکان نہ ہو"

"لیکن وہ ہیں کہاں؟" اُس نے غمگین آواز میں پوچھا۔

"تمہاری ماں بڑے آرام سے ہیں۔ اب انہیں کوئی دُکھ نہ پہونچیگا" شیخ شہناز نے اُسکے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اسفان سمجھ گیا کہ اُس کی ماں مرچکی ہے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ شیخ نے کہنا شروع کیا "تمہاری دلدوز چیخ سُنکر ہم لوگ اندر گھس آئے اور جب تک ہم نے تم کو سنبھالا تمہاری ماں باہر نکل گئیں میں اُن کے پیچھے لپکا مگر وہ کنوئیں میں چھلانگ مار چکی تھیں۔ دن ڈھلے اُن کی نعش برآمد ہوئی اور اب وہ نہایت آرام کی نیند سو رہی ہیں۔ اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ انہیں یہاں سکون میسر نہیں تھا۔ خدا اُن کی مغفرت کرے ــــ"

اسفان نے غور سے دیکھا اور پہچان لیا کہ شیخ شہناز کے پاس سرنگوں بیٹھا ہوا شخص وہی وکیل ہے، مشہور، لاولد، طالوت! اس کے پچھلے زخم ہرے ہوگئے، وہ چیخ کر بولا "یہی میری ماں کی موت کا سبب ہے اسے میری نظروں سے دُور کر دو" طالوت کا چہرہ سفید پڑگیا اور وہ فوراً ایک طرف ہٹ گئے۔ اسفان پر پھر غشی طاری ہوگئی۔

دوسرے روز شہناز نے اسے ایک بہت بڑے راز سے آگاہ کیا۔

"بیٹا" وہ پیار سے بولا "تم ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ تم چار روز تک ہزیان میں بہت سی باتیں کہتے رہے اور میں ایک ایک بات پر غور کرتا رہا اس واقعہ کے دوسرے روز جب ہم تمہاری ماں کو کفنا کر دفنانے لیجانے لگے تو میں نے وکیل صاحب کو بلوایا۔ اُنہوں نے بھی مجھے بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ غور سے سنو۔ تم یہ غلط سمجھ رہے ہو کہ وکیل صاحب تمہارے باپ ہیں۔ اُنہوں نے اپنے معبود کی قسم کھا کر مجھے بتایا کہ تمہاری ماں اُن سے محبت کرتی تھیں مگر اُنہیں تمہاری ماں سے کبھی اس قسم کی محبت نہیں ہوئی۔ ایک روز مرحوم نے اُن سے کہا "میں ماں بننے والی ہوں۔ مجھے بدنامی سے بچاؤ" یہ اُن کے بس میں تھا اور جب اُنہوں نے انکار کیا تو تمہاری ماں کی حالت یکسر بدل گئی۔ تم اُن کے بھانجے ہو اور خود اُن کی کوئی اولاد نہیں۔ اسی لئے انہیں ہمیشہ تم سے ہمدردی و محبت رہی۔ لیکن وہ اسکا اظہار نہیں کرسکتے تھے کہ مبادا لوگ تمہاری ماں کے الزام کو سچ سمجھ لیں۔ ان کا ایک شخص پر شبہ تھا جو ہر ماہ تمہاری ماں کے پاس بیس روپے بھیجتا ہے۔ مگر اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ تم نے پرسوں شب بوہران میں اپنی ماں کی آخری دیوانگی کا قصہ سُنایا تو ایاز کا بھی ایک آدھ دفعہ نام لیا۔ ممکن ہے وہی تمہارا باپ ہو۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون اور کہاں ہے"

(بقیہ بر صفحہ ۲۱۹)

حقیقت کی کہانی

میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اگر آپ کے اِرد گرد آپ سے کم عُمر لوگ ہوں، نوجوانوں سے صحبت زیادہ رہتی ہو، تو پھر آپ کو اُسی رنگ میں رنگ جانا پڑتا ہے، اُسی رنگ میں رنگ جانے سے اس موقعے پر میری مراد یہ ہے کہ اگر آپ بالکل بلید الحس نہیں تو آپ اپنے دوستوں کی نوبہارِ عمر کا کچھ پاس کرنے پر مجبور ہونگے، ان کا دل میلا کرنا نہ چاہینگے۔

یادش بخیر! ایک وقت تھا کہ مجھے اپنے بعض نوجوان دوستوں کی خاطر داریاں کرنی پڑتی تھیں، یہ لوگ گاہے گاہے اپنی صحبتوں میں ایک رنگ بھری کو بُلا کر انہیں شگفتہ و رنگین بنانا چاہتے تھے؟ اور میں اپنے وقار اور سنجیدگی کا احساس رکھتے ہوئے بھی اُنکی خوش باشی کی آرزو کے سامنے سپر انداختہ ہو جاتا تھا۔

مقامی احباب کے علاوہ بعض ایسے بیرونی دوست بھی کبھی کبھی شریک ہوا کرتے تھے یا انہیں کے اعزاز میں صحبت برپا کی جاتی تھی، جنکی سنجیدگی میری سنجیدگی سے مل کر تا سنجیدگی پیدا کر دیا کرتی تھی، اور صحبتیں زیادہ گرم ہو جایا کرتی۔ آہ، مگر وہ لطفِ صحبت اور نشاطِ خوش باش آج خواب و خیال ہے!

ذکرِ عیش بہ از عیش ضرور ہے، لیکن اس وقت کی یاد اپنے اندر بعض نہایت دلدوز کانٹے بھی رکھتی ہے، ایک دوست ہمیشہ کیلئے بچھڑ گیا، دوسروں کی ہنستی نوجوانیاں زندگی کی گرم ہوا کے پہلے ہی جھونکوں سے مُرجھا گئیں! زندگی کے ہاتھوں ان کی آزاد اور تازہ جوانیوں کی تباہی حسرت خیز واقعہ ہے! اُف سوچتا ہوں تو دل ڈوبنے لگتا ہے کہ کل تک یہ اُٹھتی کونپلیں کیسی چونچال تھیں اور آج کس طرح زندگی اُن کو پیسنے پر تُل گئی ہے! مگر یہ اپنی جگہ خود ایک دلخراش قصّہ ہے۔ اسے چھوڑیئے۔ کہنا یہ مقصود تھا کہ وہ رنگ بھری جوان صحبتوں کی نیرنگی بن جایا کرتی تھی، گانا تو لیا دیا ہی سا جانتی تھی، البتہ علم مجلسی میں کامل اور صحبت کو زندہ اور ولولہ ناک رکھنے کے فن میں اُستاد تھی۔ اس کی اچپلاہٹ اور چُلبلا پنا، بس یہ سمجھ لیجئے کہ پارے کو ڈھال دیا گیا تھا۔ اُس کی ظریف گفتگو اور رنگ رنگ فقرے، ہوا کے وہ جھونکے تھے جو صبح کے وقت پھولوں کو کھلا دیا کرتے ہیں۔ اربابِ مجلس بھی گانے کے شوقین یا اُس کے سمجھنے والے نہ تھے۔ دو ایک چیزیں سُن لیں، کچھ کھایا پیا، کچھ چھنیں رہیں، پھر ایک آدھ غزل کی فرمائش ہو گئی۔ بس یہ پروگرام رہا کرتا تھا۔ لیکن اُس کی اس آمادہ خوش باشی کے اندر مجھے ہمیشہ اس کی الم خوردگی جھلکتی نظر آتی تھی۔

میں شاید کہہ تو چکا ہوں کہ ان صحبتوں میں مَیں زیادہ محتاط بنا رہا کرتا تھا؟ لیکن اس کے باوجود مَیں اُس سے استفسار کرنے کے لئے بیتاب تھا، اس لئے نہیں کہ مَیں خواہ مخواہ اس کا راز جاننا چاہتا تھا، بلکہ یہ میری مستقل جستجو تھی کہ عورت کے احساسات عورت کی زبان سے سُنوں، چنانچہ مجھے فکر تھی کہ اُس سے دریافت کروں تو کیونکر۔

اب آپ اس اتفاق کو حُسنِ اتفاق کہہ لیجئے کہ میرے نوجوان دوست اگرچہ میرے بغیر کبھی ایسی صحبت برپا نہ کرتے تھے، لیکن غیر شعوری طور پر مری اس ارادی سنجیدگی سے عاری بھی تھے، اور چاہتے تھے کہ میری اِس سنجیدگی کو پُرزے پُرزے کر دیں۔ ظاہر ہے کہ میری اس ثقاہت کے سبب ان کو اپنے کھل کھیلنے کے تقاضوں کو دبانا پڑتا تھا۔ اب آپ ہی اندازہ فرمایئے کہ ان نیچر مستقبل نوجوانوں کی موجودگی [illegible] کوئی استفسار کیسے کر سکتا تھا؟

بہرحال، یہ میرا ایک خیال ہے، کہ ایسے موقعوں پر میرا تھوڑی دیر کے لئے ٹل جانا ان دوستوں کی خواہش کے عین مطابق ہوتا تھا لیکن وہ میری عدم موجودگی بھی پسند نہ کرتے تھے۔ وہ تو اُس "بزرگی" کو ہٹانا چاہتے! چنانچہ انہوں نے ایک شرارت سوچی اور یہ اُن کی نوعمری کا تقاضا تھا، انہوں نے اُس رنگ بھری کو بھی اپنی سازشں میں شریک کر لیا، اور ان سب نے میری "بزرگی" کو ذلیل کرنے کے لئے مجھے اُس کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا۔ مگر ان کی اس شرارت نے میرے لئے استفسار کا موقعہ فراہم کر دیا۔

میں حسبِ معمول خموش تھا، مگر یہ خموشی میرے اُوپر بھاری تھی۔ وہ حسبِ عادت نچلی نہ بیٹھ سکتی تھی، مگر یہ خموشی اس کے لئے قیامت تھی۔

وہ:- الٰہی! آپ کوئی بات بھی نہ کریں گے؟ میرا دم گھٹا جا رہا ہے — معلوم نہیں یہ سب کیا ہو گئے؟

میں:- جی ہاں، معاف فرمایئے گا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اتنی غمگین کیوں ہیں؟

وہ:- میں تو غمگین نہیں! یہ آپنے کیسے سمجھا؟

میں:۔ آپ اگر غمگین نہیں تو میں جسے غم کہتا ہوں، آپ اُسے کچھ اور کہتی ہوں گی! اور سمجھا کیسے کا جواب یہ ہے کہ میں دلوں کا حال پڑھ لیتا ہوں!

وہ:۔ تو آپ نے غلط پڑھا! میں اتنا ہنستی کھیلتی ہوں کہ لوگ اُسے بدتمیزی کہنے لگتے ہیں! کوئی غمگین انسان ہنس کیسے سکتا ہے؟

میں:۔ مگر تمہاری ہنسی کے اندر آنسو لرزتے دکھائی دیتے ہیں!

یہ سُنکر اس کی صورت بدل گئی، آنکھوں میں آنسو جھلک آئے، مگر وہ فوراً پی بھی گئی۔

وہ:۔ آج سے میں آپ کی ولایت کی قائل ہوگئی۔ میں واقعی رنج والم کا مجسمہ ہوں، میرا ہنسنا کھیلنا ایک انتقام ہے۔ لیکن آپ کے استفسار کا جواب زبانی نہیں بلکہ لکھ کر دے سکوں گی۔

مجھے اپنے سوال کی حماقت کا احساس ہوا کہ مُفت میں اُسے دُکھ پہونچایا! میں نے اس سے معذرت کی اور یہ بھی کہ اپنی بپتی میری وجہ سے قلمبند نہ کرے؟ کیونکہ اس سے اُسے دُکھ ہوگا۔

اس کے کئی مہینے کے بعد مجھے اس کا بھیجا ہوا ایک مسودہ ملا جو مختلف قلم اور مختلف سیاہی سے لکھا ہوا تھا! نتیجہ نکالا کہ اُس کی داستانِ الم شاید اتنی زیادہ تکلیف دہ تھی کہ وہ اُسے ایک نشست میں لکھ بھی نہ سکی۔

بہرحال ایک مدت تک بار بار اُس کہانی کو پڑھتے رہنے کے بعد آج آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میں نے اس مسودے میں صرف ضمیر بدل دی ہے! کیونکہ اصل مسودے میں مخاطب میں تھا، میں نے اسکا مخاطب آپ کو بنا دیا ہے کہ آپ اسے پڑھیں، اور محسوس کریں!

یہ میری کہانی ہے، بہت سادہ اور سپاٹ کہانی، دُکھیا زندگی کی کہانی! مگر کسی کو کسی کی بپتا سے کیا؟ اگر کسی کو اپنا وقت کاٹنے کیلئے، اپنی دلچسپی کیلئے، ایک کہانی سننا ہے، تو وہ میری بپتا سے مزا کیوں اُٹھائے؟ مجھے کسی کے مزے سے واسطہ کیا؟ مگر خیر! اپنی بپتی کہکر میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلوں گی، آپ اس میں رنگ بھر سکتے ہیں تو مزا اٹھالیجئے ۔۔۔ میں اس سے نہ چڑھوں بھی کیوں؟

کہانی کی ابتدا ہمیشہ ابتدا سے ہوتی ہے، میری کہانی کی ابتدا مجھ سے ہے۔ میں خود اس کی ابتدا تو ہوں، مگر اس کی انتہا میں نہیں۔ وہ ختم ہوتی کسی دوسری ذات پر۔ اور آپ اگر سمجھیں تو ۔۔۔ اسی کو ایک زندگی کی تباہی کہا جاتا ہے!

میرے ماں باپ نے میری شادی اس وقت کی جب میرا گیارھواں برس پورا ہوا ہی تھا۔ شادی! شادی کے معنی خوشی کے ہی ہیں نا؟ عزیز رشتہ دار خوش ہوں، ماں باپ خوش ہوں، دُلہن دولہا خوش ہوں، جبھی تو وہ شادی کہلائے گی؟ پر میری شادی تو کوئی خوش نہ ہوا! عزیز رشتہ دار خاک خوش ہوتے جب دعوتیں تھیں نہ مہمانیاں! ماں باپ کی خوشی کہاں جب وہ بوجھ اتار پھینکنا چاہتے ہوں؟ مجھے ان کی غریبی کا خیال ہو؟ وہ مفلس تھے تو مجھے پیدا کیوں کیا؟ جب کما کر ان کو کھلا بھی نہ سکے تو کوئی بچے پیدا کرکے اناج کیوں مہنگا کرے؟ خدا کی مرضی؟ معاذاللہ! یہ بہتان! قدرت کے قانون توڑیں آپ، بھگتیں اللہ میاں! میری خوشی کا سوال ہی نہ تھا، مجھے کچھ ہوش ہی کہاں تھا؟ رہ گیا دولہا تو پچاس برس کے بوڑھے کو خوشی کا حق کب پہونچتا ہے؟ خوشی کا حق صرف جوانی کو ہے! بڑھاپا تو جوانی کی چند غیر محسوس گھڑیوں کا ایک طویل اعلانِ حسرت ہے اور بس!

شادی کے وقت تو میں کچھ بھی نہ سمجھی، مجھے نہ خوشی کا نہ رنج کا، بس ایک تبدیلی کا علم تھا جیسے بکری کے بچے کو ایک کھونٹے سے کھولا جاکر دوسرے سے باندھے جانے کا علم ہوتا ہوگا۔ لیکن جب میں بدا ہوکر سسرال نہیں "شوہرال" پہونچی، خیر سے ساس سسرے تھے ہی نہیں اور میں نے اپنے شوہر بزرگوار کو دیکھا تو مجھ پر ایک ہول ساطاری ہوگیا۔ آج میں سوچتی ہوں تو خیال گزرتا ہے کہ اس وقت میں اپنے ہول کو سمجھ ہی نہ سکی تھی، سمجھتی تو جب کہ اسکی کوئی وجہ سمجھ سکتی!

قصہ کوتاہ، میرا ہول دل نفرت سے بدل گیا اور پانچ برس میں وہ نفرت ایک پہاڑ بن گئی۔ میں اُس کو طلاق نہ دے سکتی تھی کہ عورت تھی، بے بس تھی! کچھ سمجھے آپ؟ بے بس تھی! ہائے رے عورت کی بے بسی! اساسی حقوقِ انسانی کا غوغا اتنا، مساواتِ انسانی کا غلغلہ ایسا، اور آدھی انسانیت گرہستی کے سامان میں سے ایک چیز ۔۔۔ چیز! یہ انسان ہے کہ خدا کی لعنتِ مشکّل! وہ طلاق اس لئے نہ دیتا تھا کہ مجھ سے میرے مانوس نہ ہونے کا بدلا لے! ان پانچ برس کی کہانی لات جوتی کی کہانی ہے، سُنکر کیا کرے گا! اور میرے شوہر کی صورت کا بیان؟ وہ اگر شہزادہ گلفام بھی ہوتا تب بھی شاید میں اُس سے نفرت ہی کرتی، اس کی رفاقت میری تلاش کا نتیجہ نہ تھی۔ میری آرزو کا ماحصل نہ تھی، اور کسی عورت کو مانوس کرلینے کا اُس میں ڈھنگ نہ تھا!

میری عمر سترہ سال کی تھی جب میں نے اُس سے اپنی بیزاری کا علانیہ اظہار شروع کیا، ورنہ اس وقت تک میں خود ہی کہتی اور خود ہی سنتی رہتی تھی۔ اس پانچ برس میں میں نے بہت کچھ دیکھ سیکھ لیا تھا، سیکھنا تو میرا اُسی دن سے شروع ہو گیا تھا جس دن میں شوہر کے گھر میں آئی! میں

جب خیال کرتی ہوں تو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ میکے میں، رخصت کی گھڑی تک میں، میری ہستی، میرا دل، بالکل ایک سادہ ورق تھی، لیکن دوسری ہی صبح کو اُس پر، آپ سے آپ، عجیب عجیب نقش اُبھرنا شروع ہو گئے تھے، غالباً شادی نام ہی تجربات کا ہے ـــــ کم از کم عورت کے لئے! ایک مختصر رات میں میرے بچپنے کا بھولاپن، عمر کا الھڑپن، رخصت ہو گیا، اور سسرال کی پہلی صبح کو میں رکھ رکھاؤ کو سمجھنے لگی تھی۔ بھاری بھرکم بننے کی کوشش کر رہی تھی! اور کی خبر نہیں، مَیں تو اپنی کہہ رہی ہوں، خیر۔

میں سمجھتی ہوں کہ میری اور میرے شوہر صاحب کی منافرت اصل میں غرور کا نتیجہ تھی؛ مجھے اپنی نوعمری کا ٹھسا تھا اور اُس کو روٹی کھلانے والے مرد کی حیثیت کا گھمنڈ!

میری پڑوسن سہیلی کا ایک بھائی تھا، مَیں اُس کی محبت میں مُبتلا ہو گئی۔ اس موقعے پر لفظ مبتلا خاص لفظ ہے، مَیں اپنی خواہش کے بغیر اُس سے محبت کرنے لگی۔ بلا ارادہ مجھے اُس کی چاہت ہو گئی، اور اِس محبت و چاہت نے مجھے بلاؤں کا شکار بنا دیا، انتہا یہ ہے کہ آج مَیں ایک بیسوا ہوں، بازاری ہوں!

مجھے احساس ہے کہ یہ آخری الفاظ مجھے مونہہ سے نہ نکالنا تھے، اور انہیں پڑھ سنکر بہت سے "مردوں" کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھے گی! اور جذبۂ ناموس جوش میں آجائے گا، بلکہ کہانی کی ابتدا سُن کر جن کے دلوں میں میری طرف سے شاید ہمدردی پیدا ہو گئی ہو، وہ بھی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ لیکن جس وقت میں اپنی کہانی لکھ رہی ہوں بسنت کا موسم ہے، ہَوا پھاگ اُڑاتے پھر رہی ہی، اور مَیں ابھی جوان ہوں! یہ سبب تھا کہ ایک سچی بات قلم سے از خود ٹپک پڑی۔ اب اس کو کاٹ دینا کھلی بے ایمانی اور بڑی بُزدلی ہی! اور یہ مجھے کسی نعمت کے بدلے میں بھی گوارا نہ ہوگا! مجھے دو مردوں کی بالکل پروا نہیں، میں تو اپنے ساتھ سچی رہنا چاہتی ہوں۔

ابتک آپنے جو سُنا اور مجھے جیسا سمجھا، اس کو دیکھئے اور فطرت کی اس ستم ظریفی کو دیکھئے کہ مجھے محبت ہوئی ایک چلتے پھرتے پتھر اور دھات سے! اور اس پر طرہ یہ کہ جب مجھ پر یہ بات روشن ہو گئی کہ میں ایک پتھر کی مورتی سے چاہت کر رہی ہوں تب بھی میری محبت میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس وقت مَیں سوچتی ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ عورت شاید پتھر کی چٹان سے بھی محبت کر سکتی ہے! اور اگر دیکھئے تو مرد کی ذات زندگی کی چٹان سے تراشا ہوا بت ہی تو ہے!

لیجئے مَیں آج انسانی زندگی کا ایک راز عریاں کئے دیتی ہوں، انسان، مرد اور عورت دونوں، ایک سازش کر چکا ہے، اور وہ سازش ہے ایک راز کو چھپائے رکھنے کی! اور وہ راز یہ ہے کہ ہر دل میں محبت کئے جانے کی سخت آرزو چھپی رہتی ہے! میرا یہ انکشاف ہے تو جاں گداز لیکن ایک سچی حقیقت ہے! مَیں اُس نوجوان کو چاہتی تھی اور خواہش تھی کہ وہ بھی مجھ سے اُسی طرح چاہت کرے! مگر وہ مجھ سے محبت کر نہ سکتا تھا اس کو سمجھئے ـــــ وہ مجھ سے محبت نہ کر سکتا تھا! اب بتائیے کہ ایسے کی محبت میں کوئی کیوں مُبتلا ہو جاتا ہے جو جواب میں محبت نہ کر سکتا ہو!

میرے اِس محبوب بُت نے مجھے بتایا کہ وہ میری محبت کا اہل اور مستحق نہیں، اس لئے کہ ـــ یہ کہتے ہوئے وہ کتنا ہچکچایا تھا! ـــ اُس کے اندر محبت کرنا تھا ہی نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد اُس نے مجھ سے کہا: "میرا خیال ہی کہ مَیں تمہیں پسند کرتا ہوں!"

آپ نے سُنا؟ ذرا اس "خیال کرنے" اور اس "پسند کرنے" پر غور فرمایئے! اِن دو لفظوں کے اندر چھپے ہوئے غرور اور گھمنڈ کو دیکھئے!

جس وقت اُس نے یہ کہا مَیں اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی، اور وہ جھینپ گیا، آنکھیں نیچی کر لیں۔ غالباً وہ سچ اور صاف بات کہدینا چاہتا تھا، مگر عورت سے سچ بولنے کے معنی یہ ہیں کہ مرد شرما جائے!

پھر اُس نے دفعتہً اعتراف کیا کہ ایک طرح پر وہ مجھے چاہتا ہی ہوگا۔ مگر اُس کا طریقہ تو میرا طریقہ نہ تھا۔

لیکن میں ہی بیوقوف تھی کہ اس کی یہ بات مان لی کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کر سکتا، میں نہایت بیوقوف تھی! بہرحال میں اپنی محبت سے اس طرح چمٹی رہی جیسے ایک بیل درخت سے چمٹی رہتی ہے! اور یہ ایک واقعی نرالی بات ہے کہ عورت جب اپنے محبوب کی طرف سے متیقن نہیں ہوتی تو خود اُس کو ناقابل حصول بنا دیتی ہی!

میں جانتی ہوں میرے شوہر "بزرگوار" اگر مجھے طلاق دیدیتے تو میں اس پتھر کی مورت نوجوان کو اس آسن پر براجمان نہ کرتی ـــــ شاید اس کی طرف مُڑکر دیکھتی بھی نہیں! مگر وہاں تو بس اس کا بدلہ لیا جا رہا تھا کہ مَیں اُن کو چاہتی کیوں نہیں؟ کاش یہ انتقام نہ لیا جاتا! اُس وقت ہم سب کی زندگیاں مختلف اور شاید خوبصورت بھی ہوتیں! لیکن جب زندگی کی گفتگو ہے تو جو ہوا، اپنے نشیب و فراز کے لحاظ سے اُسے بھی خوبصورت زندگی ہی کہا جائے گا ـــــ زندگی بہرحال خوبصورت ہے!

عورت کا عزم؟ معاذ اللہ! اس کو اپنا بنا نہ سکنا میرے اس تہیئے کا سبب بن گیا کہ مَیں خود کو، جسمانی اور ذہنی، غرض ہر پہلو سے ایسی

بنالوں کہ وہ مجھے ترک نہ کر سکے، بھلا نہ سکے! وہ اگر مجھے اُس طرح نہیں چاہتا جیسے ایک مرد ایک عورت کو چاہتا ہے تو اس طرح چاہے گا جیسے ایک درخت ایک بیل کو چاہتا ہے! اُف، مگر محبت کی نارسائیاں اور نراسیاں! میرا بال بال اور ریشہ ریشہ، اپنے مقصد کی سچائی کے سوا کچھ نہ تھا! لیکن شاید مقصد کی سچائی ایک ہستی کو جوان —— نوجوان رکھنا چاہتی ہے! اُف، میرا اس وقت کا حوصلہ!

لیکن میری سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اتنا وقت نہ تھا جو میں اپنے تئیں اس کے لئے ناقابل ترک بناتی، میں مفلس ماں باپ کی لڑکی اور معمولی حیثیت کے شوہر کی بیوی، اور وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا! وہ وکالت پاس کرنے علیگڈھ جا رہا تھا اور امتحان دینے تک کسی چھٹی پر بھی گھر آنا نہ چاہتا تھا۔ سال بھر کی جدائی! اور پندرہ دن کے اندر وہ چلا جائے گا! میں کیا کرتی؟ بس اتنا کر سکتی تھی کہ اُسے یہ محسوس کرادوں کہ وہ علیگڈھ جائے یا کہیں اور، مجھ سے الگ ہو کر زندگی کو سہار نہ سکیگا!

دُنیا کے خوابوں میں اس سے زیادہ سُہانا اور دلکش خواب کوئی نہیں، جب کوئی یہ سمجھنے لگے کہ اُس کے لئے کوئی دوسرا اپنی آئندہ زندگی کی اُمیدوں کو تباہی کے سپرد کر کے کہتا ہوا آئے گا کہ "میں حاضر ہوں"! میری خواہش اُس وقت یہی تھی، میں یہی میٹھا اور سہانا خواب دیکھ رہی تھی کہ وہ نوجوان اپنی خاندانی عزت اور آئندہ زندگی کے جگمگاتے ہوئے منصوبے لاکر میرے قدموں میں ڈال دیگا، اور پھر میں سوچونگی کہ اُن میں سے اُسے کوئی چیز واپس دوں یا نہیں! لیکن وہ ایسا کرنے ہی کیوں لگا تھا، میں شکست کھا گئی، حالانکہ مجھے اپنی جیت اتنی آسان معلوم ہو رہی تھی!

روانگی سے تین دن پہلے ہم دونوں ملے۔ اس سے میری مُلاقات دشوار نہ تھی۔ مکان سے مکان ملا ہوا تھا۔ اور مجھے بی ہمسائی سے ملنے کے لئے اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ ڈیوڑھی سے لگا ہوا اُس کا کمرہ تھا۔ میں جو پہونچی تو اُس نے میرے دونوں ہات تھام لئے اور تھامے رہا۔ ایسے موقعے آجاتے ہیں جب ایک شخص کی مرضی کے خلاف اُس کے نازک احساسات غالب آجاتے ہیں، مگر وہ لمحہ قلیل ہوتا ہے! اور یہ ایسا ہی ایک لمحہ تھا جو اِس وقت اُس نوجوان پر بھی گزر گیا، اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے خط لکھا کریگا، اُس نے مجھے پیاری دُلاری بھی کہا۔ اس کے جواب میں میں کیا کہہ سکتی تھی؟ میں نے کچھ نہ کہا، میری حالت ایسی ہوگئی تھی کہ گویا ہم دونوں کے درمیان کوئی بات واقع ہی نہیں ہوئی —— ہم بیگانہ تھے! ساتھ ہنسے کھیلے ہی نہیں! گویا اُس نے مجھ سے یہ کہا ہی نہ تھا کہ میں اپنی انگلیوں سے اُس کے بالوں کے ساتھ کھیلتی رہوں! گویا میں نے اُس سے یہ کہا ہی نہ تھا کہ اُس کے بال ایسے ہیں جیسے باغ میں ستھرے، مہکتے نرگس کے پھولوں کا ایک تختہ! مرد کی قوم بھی کتنی بے ہنگم ہے! وہ میرے پاس سے جاکر مجھے خط لکھے گا! مگر جدا ہوتے وقت وہ میرا بوسہ لینا تک بھول گیا...... مگر بوسوں کی حقیقت ہی کیا؟

اس موقعے پر ایک فسانہ نویس کی چالاکیِ قلم کا کام تھا، مگر میں تو ایک کہانی سُنا رہی ہوں۔ آپ کو فسانے کا لُطف لینا ہے تو اپنے ذہن پر جہاں تہاں اُس صناعی اور حُسن کاری کو داخل کر لیجئے۔ بہرحال، واقعی صورت یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہ ہونے کے باوجود، جو ہار کر اس کا غم کرتے اور اُسے تہوار کے برابر بنا لیتے ہیں، اس کے جانے کے چند روز بعد تک میری حالت ایسی بُری رہی کہ دُشمن کی نہ ہو! گویا میں تھی ہی نہیں۔ اس چند دن کے خلا کو آپ یا تو اپنے تخیل سے پُر کر لیجئے یا میری کہانی یعنی زندگی سے نکال دیجئے۔ کیونکہ میں اُن کو بیان نہیں کر سکتی۔ اُسکے جانے کے بعد سے اس وقت تک کا وقفہ جب میں نے زندگی کو پھر زندگی سمجھنا شروع کیا، اس وقفے کو میری زندگی سے خارج کر کے آپکے سامنے ایک ناقص زندگی ضرور رہ جائیگی۔ اور یقیناً یہ خلا ہی وہ موقع ہے جسکے اندر آپ رومانیت کا رنگ اور محبت کا گداز دیکھتے، جس کے بغیر کوئی افسانہ افسانہ نہیں کہلاتا۔ مگر آپ کے ذوق کی نوازش کرنے والی رومانیت اور گھلاوٹ کے کھُلے معنی ایک دل کا خُون ہونا ہے! اور آپ کو اس کے سوا لذت نہیں آئے گی۔ جہاں تک اس کہانی کا تعلق ہے گویا میری جاں گسل حالتیں آپ کے لئے لذتیں فراہم کرتیں! ایک کی مُصیبت دوسرے کی لذت —— اے ولئے زندگی!

غرض میں اُسے، اپنی پتھر کی مورتی کو، بھولی نہیں، آج تک نہیں بُھلا سکی ہوں، عورت کے صفحۂ احساس پر سے اوّلین محبت کا نقش بالکل کبھی نہیں مٹتا! میری اُس محبوب پتھر کی مورتی نے جس کا استھان میرے جذبات کے سمندر میں ایک جزیرہ تھا، بالآخر اپنے آپ کو سماجی رسم رواج کی سیاہ اور کھردری چٹان سے ٹکرایا اور ریزہ ریزہ ہو گیا!۔ سماج کے رسم و رواج کو میں نے نہ کبھی سمجھا اور نہ اب سمجھتی ہوں۔ میں بس ایک قانون کو مانتی ہوں، ایک بے رحم قسم کے قانون کو —— یعنی ردعمل کے قانون کو!

اس کے خط آئے، ٹھنڈے برف ایسے، اور مہینوں کا غوطہ لگا کر!

محض سطحی دنیادارانہ قسم کی باتیں، گو میری تعریف سے لبریز تحریریں! میں نے بس ایک خط لکھا جس میں خود اپنی تصریح کی، اس کی تشریح کی، اف، میرا وہ خط! میں نے اُس کے اندر کلیجہ نکال کے رکھدیا تھا! کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھی تھی! مگر اس خط کے اندر آرزو میں تڑپتے خون کی گرمی نہ دیکھی اس خط نے بھی اس کے خون میں کوئی حرارت پیدا نہ کی؟ اور پھر؟ پھر مجھ میں نہ ہمت تھی نہ توانائی کہ اور خط لکھتی! اس کے بعد بس میرے پاس اُس محبوب مورتی کی نرم و نازک یاد رہ گئی تھی۔

زندگی کے اُن اُوجڑ دنوں کو گزار کر مجھے زندگی سے پھر دلچسپی شروع ہوئی تو میں نے اپنے کنٹک شوہر سے جان چھڑانے کی سوچی۔ میرے سامنے دو راہیں تھیں، ایک تو مذہب بدل لینا، دوسری بازار کی جنس بن جانا! میں نے دونوں باتوں کو سوچا۔

اگر میں آریا بنتی ہوں تو شوہر بزرگوار ہی کا نہیں، آٹھ کروڑ مسلمانوں کا، جی نہیں، خود اسلام کا ناموس بن جاؤں گی! کتنی عظیم ترقی ہے! ایک قدم درمیان، اِدھر بے بسی اور کس مپرسی ہے اور اُدھر عالم اسلام کا محور بن جانا! اس سے بڑا مرتبہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور خاص کر ایک ایسی عورت کے لئے جو شوہر کا ناموس، آٹھ کروڑ مسلمانوں کا ناموس، پوری مسلم قوم کا ناموس، ایک مسلمان نوجوان کی مورتی پر بھینٹ چڑھا چکی ہو! ان ناموس کے پجاریوں سے کوئی پوچھے کہ جس کو تم نے ناموس کی دیوی بنالیا ہے وہ تو اُس ناموس کو ہر روز پامال و ذلیل کیا کرتی ہے! ناموس کے ان پرستاروں کو کوئی بتائے کہ تم نے ــــ سماج نے ــــ ایک معصوم لڑکی پر ظلم کیا، آج وہ اس قابل ہو کر تمہیں، سماج کو سزا دے رہی ہے! مگر یہ عقل کے اندھے کیوں سمجھنے لگے کہ عورت ایک عورت ہے! اور ہمیشہ ایک عورت ہے!

دوسری طرف کچھ مہاشے ہونگے، ان مہاشوں کیلئے یہ چیز سہاگ بن جائے گی۔ ہزارہا روپیہ چندہ ہوگا، خوب خوب بھوجن ہونگے، اور کروڑوں دیویوں میں ایک دیوی کا اضافہ کرنے کے لئے زمین آسمان پلٹ دئے جائیں گے! پاک دیویوں میں ناپاک چیز شامل کرنے کے لئے زمین آسمان پلٹے جائیں گے!

پھر یہ بھی ہوگا کہ صفیں آراستہ ہوں، شہادت کے جام چلیں، ایک شتری عرش پر جا بیٹھے، دوسرا فسادی پھٹکار کا مارا کھسیانا ہو کر بیٹھ جائے!

اِن صورتوں پر نظر کر کے مجھے یہ چیز گوارا نہ ہوئی کہ میں کسی حیوان بشکل انسان کی عرش نشینی کا ذریعہ بنوں یا اُس کی غلامی کی لعنت پر مزید ذلت کا انبار لگاؤں! اس کے علاوہ خود میری استری آتما، اندر کی عورت اس ڈھنڈورے سے گھبراتی تھی۔

اب آپ ہی سوچئے کہ میرے پاس بیسوا بن جانے کے سوا کیا صورت باقی رہ گئی تھی؟ اور میں نے اگر ایسا کیا تو کیا بُرائی کی؟ ایک بُرائی کو چھوڑ کر دوسری اختیار کرلی ــــ اس سے زیادہ کیا ہوا؟ آپ چھپی ڈھکی بُرائی کو کیوں اچھا سمجھتے ہیں؟ آپ کھلے بندوں بُرائی کے اسباب کیوں پیدا کرتے ہیں؟

اور سوچئے، میں چلن دار بھی ہوتی تو میرا شوہر مجھے روٹی کپڑا دیتا اور اپنی مرضی کے مطابق مجھے استعمال کرتا۔ میرا جی چاہے نہ چاہے وہ ایک بیل کی طرح میری نسائیت کے کھیت کو چرتا۔ اس کے معنی کیا ہوتے؟ کیا اس کا مطلب ایک معزز پیشہ اور کسب نہیں؟

یاد رکھئے، میں نے عورت کی اس دکھی حالت اور ذلیل حالت پر بہت سوچا، وہ جینے پر مجبور ہے اور اس لئے کھانے کی محتاج! کھانے کے تمام دروازے اُس پر بند کر دئے گئے ہیں، بس ایک کھڑکی کھلی ہے، وہ یہی معزز کسب کرنے کی کھڑکی ہے، اس کی کوئی مرضی اور کوئی ارادہ ہی نہیں، وہ کھانے کے لئے اپنے آپ کو مرد کے حوالے کر دینے کے بعد ہی زندہ رہ سکتی ہے! یہ قیمت ادا کئے بغیر اگر وہ روٹی کھانا اور زندہ رہنا چاہے تو ایسا نہیں کرسکتی! ظلم! بارالہا اس ظلم کی داد دے!

اب مجھے کہانی ختم کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ میں اپنی روحی اذیت، اپنے اس آتما دکھ سے کہ مرد نے عورت کی آزادی چھین لی ہے، آپ کی ذوق نوازی کیوں کروں؟ خاتمہ یوں ہوتا ہے کہ میں اپنے بزرگوار کو چھوڑ کر ایک اڈے میں جا پہونچی۔ نائکہ سے میں نے کہا کہ میں ایک عورت ہوں اور تم بھی ایک عورت ہو، میرا ساتھ دو، میری مدد کرو۔ اُس نے اپنی یا میری کسی غرض سے مجھے پناہ دی۔ شوہر بزرگوار کو مقدمہ چلانے کی ہمت نہ ہوئی۔

اب ناموس کا لفظ اُن کی اور قوم کی کتابوں سے خارج تھا! وہ تو صرف آریوں کے مقابلے میں بامعنی لفظ ہے، ورنہ ہزاروں مسلمان عورتیں کسب کرتی رہیں ناموس پر حرف نہیں آتا! خود مسلمان ان کی رکھشا کرنے پہنچ جاتے اور اخوت اسلامی کی لاج رکھتے ہیں!

اِس آخری ٹکڑے میں آپ کو بھی مزا نہ آئے گا۔ خیر ایک آنے جانے والے سے مجھے پھر محبت ہوگئی، مگر وہ اس قسم کی محبت نہ تھی جیسی مجھے اپنی اُس پتھر کی مورتی سے تھی؛ میری یہ محبت اُس پہلی محبت کا ردعمل تھی۔ میرا یہ نیا محبوب میرے اِس ردعمل کا چاکر تھا اور بس! میں نے اس کا نام "ردعمل" رکھدیا تھا۔ اس لئے کہ میری خالی زندگی میں اُن عروج لذت کی گھڑیوں کا یاد آنا سخت اذیت دیتا تھا، میں کھڑی بھی نہ رہ سکتی تھی ہر شے

بے حقیقت بن گئی تھی! اور اس حالت سے میں تنگ اور عاری تھی۔ پوری زندگی کو ایک طویل آہ بنا دینا کوئی عقلمندی تھی؟ میں نے اس کا علاج تجویز کیا۔ اس لئے میں نے اُس شخص کو منتخب کیا جو پتھر کی مُورتی نہ تھا، جو اتنا حسین بھی نہ تھا!

آپ اس حقیقت کو ساری کہانی سُنکر بھی نہ پہچانیں گے کہ اگرچہ میں بیسوا ہوں مگر میرا نفس داغدار نہیں! میں نے اپنی خوشی سے اپنے آپکو اُس پتھر کی مُورتی کے سوا کسی کو نہیں دیا! وہی میرا اصلی شوہر تھا! میں ہر وقت خوف میں مُبتلا رہتی ہوں ۔۔۔ یہ حالت نہ معلوم میری ندامت شرمساری ہے یا مری بدحالی و غمگینی! بہرحال جو کچھ ہے اُس کے بانی اور ذمہ دار آپ ہیں، خُدا آپ کو آنکھیں دے!۔

ل۔ احمد

آہ رفیعی (اعظمی) اجمیری

اے دوست تیرے دم سے تھا کچھ زندگی کا لُطف
اب کیا ادبیات میں میرے لئے رہا

آہ! کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ کس طرح زبان پر لاؤں کہ رفیعی کا انتقال ہوگیا۔ ڈیڑھ سال کی شدید بیماری نہایت کرب کے ساتھ گذار کر افسوس میرا دُنیا میں واحد دوست رفیعی ۵ جون ۳۹ء کو رحلت کرگیا۔ عارضہ ایسا ناقابل فہم تھا کہ نہ تو کسی بڑے سے بڑے حکیم اور نہ کسی قابل سے قابل ڈاکٹر کی سمجھ میں آیا۔ جتنی دوائیں دیں، جس قدر انجکشن لگائے، اور جتنے وظیفے پڑھے گئے سب کا اثر و نتیجہ اُلٹا برآمد ہوا۔ دوا گئی تو بے اثری کا یہ عالم تھا کہ ادھر حلق سے اُتری اُدھر طبیعت خراب سے خراب تر ہوئی۔ مرحوم کو دراصل شدید ترین اعصابی شکایت تھی اور وہی انکی ہلاکت کا باعث ہوئی۔

مرحوم کے طرزِ نگارش اور بقول مولٰنا نیاز انکی "ادبی قارونیت" کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ صنفِ ادبیات پر مرحوم جو احسان اپنی اس مختصر سی عمر (ان کی عمر ۳۰-۳۱ سال کی ہوگی) میں کر گئے ہیں وہ توفیق ادباء عالم کو اپنی طویل عمر میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس شعبۂ ادب پر قلم اُٹھایا اُس کے ستارے بنکر چمکے۔ جس زبان میں کچھ لکھا وہ اپنی مثال آپ ہوکر رہ گیا۔ فارسی کے دریا تھے اور انگریزی میں جب لکھنا شروع کیا تو ایک مضمون کے بعد ہی سے شہرت کا دروازہ کھُل گیا۔ مذاق اتنا لطیف اور ذوق اس قدر بلند تھا کہ یہ چیز میں نے کسی لطیف سے لطیف مزاج انسان میں نہیں پائی۔ تحریر و تقریر دونوں کے بادشاہ تھے۔ اس قدر خوش بیان تھے کہ گفتگو کرتے وقت مُنہ سے پھول جھڑتے تھے۔ بالعموم مجالس اور ملاقاتوں سے گھبراتے تھے، لیکن جب پھنس جاتے تھے تو مجمع میں صرف ایک یہی جادو بیاں بولتا نظر آتا تھا۔ باقی سب مسحور ہوکر بیٹھ جاتے تھے۔ میری مرحوم سے ۲۶ء میں صرف ادبی سلسلہ میں مُلاقات ہوئی اور ان کی مردم بیزاری کی وجہ سے تعلقات زیادہ نہ چل سکے۔ لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد ہم دونوں ادبی جامہ اُتار کر ایک دوسرے کے گلے ملے ہیں تو مرحوم کے تادمِ واپسیں ہمارے تعلقات، محبت و خلوص کی تمام اہم حدود کو عبور کر چکے تھے۔ ہاں یہ میں فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ موت سے چند روز قبل انکے جن دوستوں اور شناساؤں نے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اُن میں سے میں نہیں تھا۔

وائے! مرحوم نے ابھی زندگی کا کچھ لُطف بھی حاصل نہیں کیا تھا ابھی اُنکی شادی بھی نہیں ہوئی تھی کہ عروسِ مرگ سے ہمکنار ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اُنکے دونوں بزرگ بھائیوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

مرحوم ایک اعلیٰ خاندان کے فرد تھے۔ والدین کا سایہ بچپن ہی سے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اب دو بڑے بھائی ہیں خُدا اُن کو عمر خضر عطا فرمائے۔

ہر ادیب اچھا شاعر کم ہوتا ہے اور ہر شاعر کامیاب ادیب ذرا مشکل سے ہوتا ہے لیکن مرحوم کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ جس قدر اچھے ادیب تھے اتنے ہی نغز گو شاعر بھی تھے۔ جس طرح اُن کے ادب میں ایک خاص ندرت تھی اسی طرح کلام میں بھی ایک اپنا اچھوتا رنگ تھا۔ کہاں تک خُوبیاں بیان کروں۔ ع۔

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کیلئے

غم نصیب

قیسی رامپوری

کہانی

ایک روز رات کے وقت ڈاکٹر اور میں ریڈیو سن رہے تھے۔ ڈاکٹر کہیں سے ایک تصویر اُٹھا لایا تھا۔ اس تصویر میں ایک عورت چائے کی میز کے پاس بیٹھی تھی، اور بائیں جانب لیلا ڈیسائی ایک ہاتھ کمر پر اور دوسرا اپنی خوبصورت ٹھوڑی کے نیچے رکھے کھڑی تھی اور ایک بڑھیا ان دونوں کے درمیان کھڑی کچھ تعجب سے لیلا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ "دشمن" کی فلم کا ایک سین تھا۔ لیلا کی متبسم نگاہیں اس کی طبیعت کے چلبلے پن اور شوخی کی داستان کہہ رہی تھیں۔ اب آپ اسے تصویر کی دلکشی کہہ لیجئے یا اس حسینۂ طناز کی دلربائی سمجھ لیجئے۔ اس وقت میرے تخیل کی دُنیا آباد تھی۔

ریڈیو پر امرا ضیا ؎

مری شام کو صبح خنداں بنا دو
ہنسو اور ستاروں کی دُنیا بنا دو

گا رہی تھی۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟" ڈاکٹر بولا۔

"کیا؟" میں نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سوتے ہو یا جاگتے ہو؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جو کچھ بھی تم سمجھ لو!" میں نے مُسکرا کر کہا۔

"گانا کیسا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"فضا اچھی پیدا کر رکھی ہے" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو سازندوں کا کمال ہے" ڈاکٹر نے کہا "میں گانے کے متعلق پوچھ رہا ہوں"

"شاعر نے اچھی جذباتی چیز لکھی ہے" میں نے جواب دیا۔

"میں گانے والی کے متعلق پوچھ رہا ہوں" ڈاکٹر بولا۔

"بندۂ خدا!" میں نے کہا "گانے والی کو تو میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن تم یہ بتلاؤ کہ ماحول کا اثر مرد پر زیادہ ہوتا ہے یا عورت پر؟"

"عورت پر!" ڈاکٹر نے کہا۔

"محض غلط ہے" میں نے کہا "تم صرف نبض دیکھنی جانتے ہو لیکن عورت کی فطرت کو نہیں سمجھ سکتے"

"معلوم ہوتا ہے" ڈاکٹر نے ہنسکر کہا "لیلا ڈیسائی کی تصویر دیکھکر تمہیں کوئی افسانہ سوجھ رہا ہے"

"نہیں!" میں نے جواب دیا "افسانے کی تحریک تو امرا ضیا کے گیت سے ہو رہی ہے اور لیلا ڈیسائی کی تصویر افسانے کی فضا پیدا کر رہی ہے"

"بھئی!" ڈاکٹر بولا "میں تو خاک نہیں سمجھا"

"سنو!" میں نے کہا "میرے نقطۂ خیال سے اس وقت امرا ضیا یا شاعر کی مخاطب لیلا ہے۔ تم تصویر کی طرف تو ذرا دیکھو۔ کیا بانکپن ہے، کیا شانِ دلربائی ہے۔ ایک صاحبِ نظر کے لئے ایک دُنیائے رنگ و بُو کا نقشہ پیش کر رہی ہے"

"تو گویا تم صاحبِ نظر بھی ہو؟" ڈاکٹر نے ہنس کر کہا "سبحان اللہ! یہ مُنہ اور مسور کی دال!"

"ڈاکٹر!" میں نے کہا "میرے خیال میں مرد کی نسبت عورت کو اپنے جذبات پر زیادہ قابو ہوتا ہے۔ کیونکہ پاکدامنی اور حیا اس کی سرشت میں ہے"

"گویا!" ڈاکٹر مُسکرا کر بولا "یہ افسانے کی بیک گراونڈ ہے"

میں نے کہا "جہاں تک میں نے غور کیا ہے عورت قعرِ مذلت میں گرنے سے پیشتر اس سے بچنے کے لئے بقدرِ ہمت کوشش ضرور کرتی ہے۔ اور اگر اُسے کوئی سہارا دینے والا مل جائے تو بچ بھی جاتی ہے"

"ایک بیسوا کی لڑکی بیسوا ہی بنے گی" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"لیکن یہ عورت کی سرشت کے خلاف ہے" میں نے کہا "اور پھر آئینِ قدرت بھی تو یہ ہرگز نہیں، کہ بُروں کی اولاد بھی بُری ہی ہوا کرے"

"خربوزے کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا "یہ جو پیشہ ور عورتیں کبھی پاکیزگی کی زندگی اختیار کر لیتی ہیں، اس کی وجہ؟"

"اوّل لاچاری!" ڈاکٹر کہنے لگا "اور جو لاچاری نہیں تو پھر محض چاؤ یا شوق"

"گویا!" میں نے ہنسکر کہا "تم نے ہر چیز کا تاریک پہلو لینے کی قسم

کمار کہی ہے۔"

"اپنا اپنا خیال ہے" ڈاکٹر بولا۔ "میں نے تو اپنا خیال ظاہر کر دیا ہے اب تم اس دُنیائے رنگ و بو کی کیفیت بیان کرو جو لیلا کے بانکپن یا اس کی شانِ دلربائی کی تخلیق ہے۔ ذرا میں آج دیکھوں تو سہی کہ تمہارا تخیل کیسے کیسے دلکشا مناظر دکھلاتا ہے۔"

"سُنو!" میں نے کہا۔ "شہر کے ایک غیر آباد حصے میں ایک مکان تھا اس۔۔۔۔"

"لیکن پہلے شہر کا نام تو بتلاؤ" ڈاکٹر نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"جہنم!" میں نے جواب دیا۔

"تو گویا چشم دید واقعہ ہے" ڈاکٹر نے ہنس کر پوچھا۔

"جی ہاں!" میں نے کہا۔ "آپ کے وطن کی ہی تو کہہ رہا ہوں۔ کچھ اور بھی پوچھ لو!"

"تو خیر!" ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ "غیر آباد حصے میں ایک مکان تھا۔ پھر؟"

"یہ جس قدر باہر سے خستہ معلوم ہوتا تھا اتنا ہی اندر سے آراستہ تھا۔ اس مکان میں ایک عورت شانتا اور اُس کی بیٹی اُرملا رہتی تھیں۔ ماں اگر چندرے آفتاب تھی تو بیٹی چندرے ماہتاب! شام کے وقت جب دونوں ماں بیٹی موٹر میں سوار ہو کر سیر کو نکلتیں تو دیکھنے والے دیکھ دیکھ کر جھوم جھوم جاتے۔ شہر میں اُن کے متعلق مختلف افواہیں تھیں۔ کسی کا خیال تھا کہ شانتا کوئی امیر کبیر بیوہ ہے۔ کوئی سمجھتا کہ وہ کسی ملک کی رانی ہے اور خانگی اختلافات کے باعث شوہر سے علیحدہ رہتی ہے۔ اور ایک گروہ وہ بھی تھا جو صرف پردہ اُٹھنے کا منتظر تھا۔ الغرض جتنی مُنہ اتنی باتیں۔ شانتا چونکہ سوسائٹی کی عورت تھی اس لئے گاہے گاہے اس کے یہاں بھی مہمان مدعو ہوتے۔ لیکن یہ لوگ شہر کے رنگین مزاج امیر زادے ہی اکثر ہوتے۔ ارملا بھی اس قسم کے جلسوں میں شامل ہوتی۔ لیکن اس شمع کی طرح جس کے فروزاں ہوتے ہی پروانے ذوقِ طپش سے بیتاب ہو کر نثار ہونے کو تو آموجود ہوتے ہیں لیکن اُسے دسترس سے دُور پا کر اپنی ہی آہوں کی آتش سامانی سے اپنے لئے ایک کائناتِ حُسن و عشق پیدا کر لیتے ہیں۔

ایک روز شانتا کے یہاں ساز و آہنگ کا سامان تھا۔ رات کا وقت تھا اور مکان بجلی کی روشنی اور ساز و سامان کی فراوانی سے جنتِ نمرود کا نقشہ پیدا کر رہا تھا جس میں شانتا اور ارملا قاصدِ بہار کی طرح نویدِ عیش و طرب دے رہی تھیں۔ شانتا کی تزئین و آرائش ہر نگاہ کا مرکز بنی ہوئی تھی، اور ارملا کی سادگی اُس کی معصومیت کی شاہد تھی۔ ریشم کی سپید ساڑھی بدن کی لطافتوں کی پردہ دار تھی۔ کانوں میں جواہر نگار آویزے تھے جن کی چمک دلوں پر بجلیاں گراتی تھی اور ہیرے کا کیل جو خوبصورت ناک کی زینت تھی ستارہ سلمہ کی طرح درخشاں تھی۔

اُس کی عمر اور اُس کا اُٹھان ایک طوفان تھا جس کے سامنے انسان کا فہم و ادراک بھی عاجز تھا۔ آج جس طرح شانتا کا حُسن و جمال ہر تمنائی کا دل گرما رہا تھا، اسی طرح ارملا کی سنجیدگی اور سادگی اُس کے پجاریوں کے لئے ایک عقدہ تھا جس کی گرہ کشائی کے لئے ہر شخص کا ناخنِ تدبیر بے کار تھا۔

مہمانوں میں ایک نوجوان سیٹھ جمنا داس اور اُس کا دوست رام پرشاد بھی تھے۔ دونوں متاعِ حُسن کے کیڑے تھے۔ وہ ہر حُسن کی دیوی کے شوالے میں پُجاری بن کر داخل ہوتے۔ لیکن دل بھینٹ چڑھانے کی بجائے مورتی ہی لے اُڑتے۔ اس وقت دونوں اس ہشت پہلو حوض کے کنارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے جو مکان کے صحن میں تھا۔ حوض میں مختلف رنگ کے بجلی کے لیمپ روشن تھے اور پانی قوس قزح کا لُطف پیدا کر رہا تھا۔

"رام پرشاد!" جمنا داس نے پوچھا۔ "بھلا بتلاؤ تو دونوں میں سے سچ سچ کس کی زیادہ ہے۔ ماں زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے یا بیٹی؟"

"یہ تو وہ جانے!" رام پرشاد نے ہنس کر کہا۔ "جو حُسن پرست ہو"

"ٹھیک ہے!" جمنا داس نے ہنسکر جواب دیا۔ "تم حُسن پرست تو نہیں لیکن حُسن کے ڈاکو ضرور ہو۔"

"جمنا داس!" رام پرشاد بولا۔ "یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی۔"

"میرا اپنا بھی یہی خیال ہے" جمنا داس نے جواب دیا۔ "یہ سودا کچھ مہنگا پڑتا ہی نظر آتا ہے۔"

"ذرا سونے کی جھلک دکھادو" رام پرشاد بولا۔ "پری خود ہی شیشے میں اُتر آئے گی"

"ابھی جھلک دکھانی ہے کیا؟" رام پرشاد نے کہا۔ "میں تو سب جتن کر چکا۔ لیکن دیوی تو مہربان ہوتی نظر نہیں آتی۔"

"مرے یار!" رام پرشاد نے کہا۔ "پہلے پجاری کو تو خوش کرو، دیوی تو پجاری کے اشارے پر ناچتی ہے۔"

"وہاں بھی کہہ سُن چکا" جمنا داس نے جواب دیا۔

"پھر؟" رام پرشاد نے پوچھا۔ "کیا جواب ملا"

"ابھی کمسن ہے" جمنا داس نے جواب دیا۔

"ارے! کم بن!" رام پرشاد بولا "یہ اچھی رہی۔ کبھی ارملا سے بھی کچھ کہا سنا؟"

"کیا کہنا ہے" جمنا داس نے کہا "وہاں تو وہی بات ہے کہ سیانے ہونگے تو بات بھی ہوگی"

"محض پھسڈی ہو تم" رام پرشاد بولا "ہاں خود کر داؤ"

"زبردستی کیا؟" جمنا داس نے پوچھا۔

"زبردستی کیوں؟" رام پرشاد نے کہا "محبت کا جال بچھاؤ اور کوئی میٹھی لوری سناؤ۔ اور جو یہ نہیں تو پھر دانہ پھینکو مرغ خود ہی گرفتار ہو جائے گا"

"یہ تمہارے گنگ اشارے میں تو بھی سمجھ نہیں سکتا" جمنا داس نے جواب دیا۔

"اجی سیٹھ صاحب!" رام پرشاد بولا "کسی بہانے گھر بلا لو۔ اور..."

لیکن پیشتر اس کے کہ رام پرشاد بات پوری کرے ارملا حسن اور شباب کی دیوی کی طرح برق پاشیاں کرتی حوض پر آئی اور کنارے پر بیٹھ کر ہاتھ سے پانی ہلانے لگی۔ پانی کے ہلنے سے حوض میں ایک تموج سا پیدا ہو گیا معلوم ہوتا تھا کہ رنگ برنگ کی پریاں پانی میں رقص کر رہی ہیں۔

رام پرشاد اور جمنا داس مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

ارملا بولی "آپ مہمانوں سے الگ کیوں آ بیٹھے؟"

"چاند کی بہار دیکھنے" جمنا داس نے جواب دیا۔

"چاند تو کہیں ہے نہیں" ارملا نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے تو کہیں نظر نہیں آتا"

"تم چاند نہیں تو کیا ہو؟" جمنا داس نے ہنسکر کہا۔

"آپ باہر کیوں آ گئیں؟" رام پرشاد نے پوچھا۔

"اندر بہت شور و غل تھا" ارملا نے جواب دیا۔

"آپ گانے کو شور و غل کہتی ہیں" رام پرشاد نے کہا "گاتی تو آپ بھی خوب ہیں"

"تم گانا سنو گے؟" جمنا داس نے پوچھا۔

"ارملا دیوی اگر سنا دیں تو سن لوں گا" رام پرشاد نے جواب دیا۔

"سناؤ گی ارملا؟" جمنا داس نے پوچھا۔

"آواز تو یہاں بھی آ رہی ہے" ارملا نے جواب دیا "آپ نے کانوں میں روئی تو نہیں دے رکھی"

"ہم نے تو روئی نہیں دے رکھی" جمنا داس نے کہا "آپ ہی کچھ بیزار معلوم ہوتی ہیں"

"مجھے اس غل غپاڑے سے نفرت ہے" ارملا نے جواب دیا۔

"زندگی بھی تو اسی کا نام ہے ارملا!" جمنا داس نے ہنسکر کہا۔ "کھانا پینا اور ہنسنا"

"تو پھر مجھے اس زندگی سے بھی نفرت ہے" ارملا نے جواب دیا۔

"ارے!" جمنا داس نے اس "ارے" کو لمبا کر کے کہا "مسیحا اور زندگی سے نفرت"

"میں مسیحا کیسے؟" ارملا نے پوچھا۔

"تمہاری ایک ہاں سے مردے جی اٹھتے ہیں" جمنا داس نے ہنس کر کہا۔

اس وقت رام پرشاد جو جانے لگا تو ارملا بولی "آپ کہاں چلے؟"

"ذرا گانا سنوں گا" یہ کہکر رام پرشاد چلا گیا۔

"آپ بھی جائیے!" ارملا نے جمنا داس سے کہا "آپ گانا نہیں سنیں گے؟"

جمنا داس نے یہ سنکر سینے پر ہاتھ مارا اور کہا ؎

"چھوڑ کر جاؤں ترا دامن بت کافر کدھر!"

"یہ کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے آپ؟" ارملا بولی۔

"تو کیا کچھ غلط کہا میں نے!" جمنا داس نے پوچھا۔

"میں آپ سے کئی بار کہہ چکی" ارملا نے ذرا تیور بدل کر کہا "کہ مجھے یہ باتیں پسند نہیں"

"اچھا صاحب!" جمنا داس نے جیب سے ایک خوبصورت لاکٹ نکالتے ہوئے کہا "یہ تو پسند ہے نا! لیجئے! گلے میں ڈال لیجئے"

"کیوں!" ارملا نے پوچھا۔

"مجھے خوش کرنے کیلئے!" جمنا داس نے جواب دیا۔

"میں کسی سے ناراض تو نہیں" ارملا نے کہا "یہ آپ کیوں لے آئے"

"بیشک!" جمنا داس بولا "آپ ناراض تو نہیں۔ لیکن مجھے آپ سے محبت تو ہے"

"اور اس محبت کا نتیجہ؟" ارملا نے پوچھا۔

"آرزوؤں اور تمناؤں کی کامرانی!" جمنا داس نے جواب دیا۔

"تو گویا آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں"

"رام کا نام لو ارملا!" جمنا داس نے ہنسکر کہا "میں اتنا خود غرض نہیں ہوں"

"پھر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟" ارملا نے پوچھا۔

جمنا داس نے اس کے سرخ گالوں کو انگلی سے چھو کر کہا "ان

پھولوں کا رس!"

"کیا اسی کا نام شرافت ہے" ارملا پاس سے اُٹھتے ہوئے بولی "جائیے، آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے"

یہ کہکر وہ چلی گئی۔

ارملا صحن سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آکر بیٹھی ہی تھی کہ رام پرشاد آگیا اور دروازے میں کھڑے ہوکر پوچھا "ارملا دیوی! میں اندر آسکتا ہوں"

"آئیے!" ارملا نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"خیر تو ہے!" رام پرشاد نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "آپ تو کچھ ناراض سی معلوم ہوتی ہیں۔ کہیں جمنا داس سے تو ناراض نہیں ہوگئیں"

"آپ جمنا داس سے کہہ دیجئے، وہ یہاں نہ آیا کرے" ارملا نے کہا۔

"میں تو آپ سے پہلے ہی کہنے والا تھا" رام پرشاد بولا۔

"کیا؟" ارملا نے پوچھا "کیا کہنے والے تھے؟"

اور رام پرشاد نے ہنسکر کہا "یہی کہ ہٹو! تم نہیں مُنہ لگانے کے قابل!" پھر ہنستے ہوئے "ارملا دیوی! ہر چمکنے والی چیز کو سونا نہیں سمجھ لینا چاہیئے"

"مجھے اسکی دولت کی پروا نہیں" ارملا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے!" رام پرشاد بولا "لیکن دولت کے بغیر زندگی کا مزا بھی تو نہیں!"

"خواہ شرافت اور عزت پر نام کیوں نہ آئے؟" ارملا نے پوچھا۔

"شرافت اور عزت!" رام پرشاد نے مسکرا کر کہا "ہے تو بڑے کام کی چیز۔ لیکن بعض اوقات ضرورت یا مصلحت ان دونوں سے دستبردار ہونے پر مجبور بھی کر دیتی ہے"

"عزت نہیں تو کچھ بھی نہیں" ارملا نے جواب دیا

"سچ ہے!" رام پرشاد بولا "خیر! چھوڑیئے اس بحث کو۔ یہ فرمائیے! مجھ پر تو عتاب نہیں؟"

"نہیں!" ارملا نے مسکرا کر کہا۔

رام پرشاد نے جیب سے ایک خوبصورت انگشتری نکالی اور ارملا کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا "تو پھر یہ قبول کیجئے"

"لیکن اسکی ضرورت؟" ارملا نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں یہ سمجھونگا کہ واقعی آپ مجھ سے ناراض نہیں"

یہ کہتے ہوئے رام پرشاد نے انگشتری ارملا کی انگلی میں ڈالدی۔

"پسند ہے آپ کو؟"

"بات تو نیت کی ہے" ارملا نے رام پرشاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چیز اچھی ہوئی تو کیا بُری ہوئی تو کیا؟"

"نیت کا پتہ تو بھگوان کو ہے" رام پرشاد نے جواب دیا۔

"لیکن انسان بھی آخر کچھ سمجھ یا عقل رکھتا ہے" ارملا نے مسکرا کر کہا۔

"گویا!" رام پرشاد بولا "آپ مجھے بھی جمنا داس ہی سمجھ رہی ہیں"

"آپ اُس کے دوست تو ہیں" ارملا نے ہنسکر کہا۔

دونوں میں کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر دونوں جہاں اور مہمان بیٹھے تھے وہیں جا بیٹھے۔

جب سب لوگ جا چکے تو شانتا نے بیٹی سے کہا "تم نے سیٹھ جمنا داس کا لاکٹ کیوں واپس کر دیا؟"

"میری مرضی!" ارملا نے ذرا تنک کر کہا۔

"آخر کچھ وجہ بھی؟" ماں نے پوچھا۔

"کچھ وجہ نہیں" ارملا نے جواب دیا۔

ماں تعجب سے بیٹی کی طرف دیکھنے لگی۔

"مجھے جمنا داس کا یہاں آنا پسند نہیں" ارملا نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پسند نہیں؟" شانتا بولی "کیا کہہ رہی ہو ارملا؟"

"شریف آدمیوں کی کچھ کمی ہے کیا؟" ارملا بولی۔

"شریف آدمی!" شانتا بولی "جمنا داس بھی تو شریف ہے"

"ہوگا!" ارملا نے کہا "لیکن مجھے اس سے ملنا جلنا پسند نہیں۔ ہم ان لوگوں سے میل ملاقات رکھے بغیر بھی تو رہ سکتے ہیں"

"تم سے جمنا داس نے کیا کہا تھا آج؟" ماں نے پوچھا۔

اُس نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا" ارملا نے جواب دیا "میں نے ہی اُس سے کہا تھا"

"کیا کہا تھا تم نے؟" شانتا نے پوچھا۔

"وہ کہتے تھے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں نے کہا کہ مجھ سے شادی کرلو" ارملا نے جواب دیا۔

"تم نے سیٹھ سے شادی کرنے کو کہا تھا؟" شانتا نے تعجب سے کہا "سچ؟"

"کوئی بُری بات تو نہیں کہی!" ارملا بولی۔

"ارملا!" شانتا بولی: "ہر ایک عورت شادی کرنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔"

اب بیٹی ماں کی طرف تعجب سے دیکھنے لگی اور ماں بولی: "عورت مرد کو خوش کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ہم عورتیں تو کھلونا ہیں۔ مردوں کا حق ہے کہ جس طرح چاہیں ہم سے جی بہلائیں۔"

"پھر عورتیں شادی کیوں کرتی ہیں؟" ارملا نے پوچھا۔

"یہ تو محض ایک رسم ہے۔" شانتا بولی: "اور پھر اس کی کچھ قید بھی تو نہیں عورت کی مرضی ہے شادی کرے یا نہ کرے۔"

"ہر ایک عورت کی؟" ارملا نے پوچھا۔

"جہاں رسم و رواج کی جکڑ بندی ہے وہاں تو عورت کو شادی کرنی ہی پڑتی ہے۔" شانتا نے جواب دیا۔ "لیکن جو عورتیں سماج کے قوانین سے آزاد ہو کر رہتی ہیں جو اپنے عمل کی خود ذمہ دار ہیں انہیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔"

"اور ہمیں؟" ارملا نے پوچھا۔

"ہمیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔" شانتا نے جواب دیا۔ "ہمیں کیا پڑی کہ ہم اس چند روزہ زندگی کو رسم و رواج کا پابند کریں۔ ہم اپنے عمل کی خود ذمہ دار ہیں۔"

"لیکن دنیا کیا سمجھے گی؟" ارملا نے پوچھا۔

"جو اس وقت سمجھ رہی ہو۔" شانتا نے جواب دیا۔

"کھلونا؟" ارملا نے پوچھا۔

"ہاں!" شانتا بولی: "کھلونا!"

"تو گویا" ارملا نے کہا: "یہاں آنے جانے والے ہمیں ایک کھلونا سمجھ کر ہم سے کھیلنے آتے ہیں۔"

"وہ کیوں آنے لگے۔" شانتا نے کہا: "ہم تو خود انہیں بلواتے ہیں۔"

"ماں!" ارملا بولی: "یہ جو ہمارے پڑوس میں ایک بڑھیا اور اس کا بیٹا روشن لعل رہتے ہیں تم نے انہیں تو کبھی اپنے یہاں آنے کو نہیں کہا۔ حالانکہ پڑوسی کا حق تو دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔"

"ارملا!" شانتا بولی: "یہ جو تم بازار خرید و فروخت کیلئے جاتی ہو کبھی کسی دوکاندار نے کوئی چیز تمہیں مفت بھی دیدی؟"

"مفت کون دیتا ہے ماں۔" ارملا نے جواب دیا۔

"تو بس کھلونوں سے بھی وہی کھیل سکتا ہے جس کے پاس کھلونے خریدنے کو دام ہوں۔"

"تو یہاں صرف دولتمند لوگ ہی آسکتے ہیں؟" ارملا نے پوچھا۔

"ہم غریبوں سے ملیں تو گذران کیسے ہو۔" شانتا نے جواب دیا۔

"لیکن آخر شرافت بھی تو کوئی چیز ہے۔" ارملا بولی: "یہ ہمارے پڑوسی گو دولتمند تو معلوم نہیں ہوتے لیکن شریف تو ہیں۔"

"شرافت کو کوئی چاٹا کرے گا۔" شانتا نے کہا: "پیٹ تو کھانے کو مانگتا ہے۔ اور پھر عزت بھی لوگ اسی کی کرتے ہیں جس کے پلے چار پیسے بھی ہوں۔"

"میرے خیال میں تو دنیا میں اصلی عزت شرافت سے ہے۔" ارملا بولی: "اگر ایک امیر آدمی کا چلن شریفانہ نہیں تو پھر اس کی عزت بھی نہیں۔"

"یہ محض کتابی باتیں ہیں۔" شانتا نے جواب دیا: "ہر ایک شخص اپنی حالت اور واقعات کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ بس جاؤ! اب سو رہو۔ سیٹھ کو ناراض نہیں کرنا چاہیئے۔ بہت کام کا آدمی ہے۔"

ارملا پر اس وقت ایک ناخوشگوار حقیقت آشکار ہو رہی تھی۔ ایک پردہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ رہا تھا۔ اس کی حالت اس طرح کی طرح تھی جس کی کشتی بے قابو ہو کر سمندر میں چھپی ہوئی چٹانوں کی طرف جا رہی ہو جہاں بربادی اور تباہی اپنی ہولناکیوں کے ساتھ اسے تباہ کر دینے کے لئے تیار کھڑی ہو۔ کبھی خود بخود اس کے منہ سے "ماں" نکل جاتا۔ جانے کیا بات تھی کہ آج ارملا کو اس مقدس نام سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔

ماہ چہار دہم کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کھڑکی کی سلاخوں میں سے اس کے خوبصورت اور پر تکلف بستر پر پڑ رہی تھی اور ایک ہلکی سی کرن اس کے خوبصورت بالوں سے کھیل رہی تھی۔ رات کافی جا چکی تھی۔ ہر چیز پر ایک سکوت مسلط تھا۔ کون و مکان بھی خاموش اور فضا بھی خاموش۔ اس خاموشی میں ارملا کو اپنی عزت اور ناموس ایک عورت کی ہوسناکیوں کے مندر پر بھینٹ چڑھتے معلوم ہو رہے تھے۔ ارملا ان پر آلام خیالات سے نجات پانے کے لئے کوشش تو کرتی لیکن ایک آئندہ لے دور کی خوفناک جھلک آنکھ کو نیند سے آشنا نہ ہونے دیتی۔

پڑوس والے مکان کی وہ کھڑکی جو ارملا کی خوابگاہ کے سامنے تھی کھلی۔ روشن سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے سامنے کھڑا تھا۔ ارملا نے بجلی کا بٹن جو پلنگ کے برابر تھا دبا کر روشنی بند کر دی۔ اور اپنی خوبصورت کلائی پر سر رکھ کر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر روشن سلاخوں کا کھڑا رہا پھر سامنے سے ہٹ گیا۔ کچھ دیر بعد سامنے والے کمرے سے ہارمونیم کے ساتھ گانے کی آواز آنے لگی ؎

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا کہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

گانے والا یہی ایک شعر بار بار گا رہا تھا اور سُننے والی بستر پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ جس طرح ایک دایہ ننھے بچے کو کوئی میٹھی لوری سُنا سُنا کر سُلا دیتی ہے اسی طرح اس پُر کیف آواز اور اس دل سوز شعر نے آرملا کو بھی نیند کی خوشگوار وادی میں پہونچا دیا۔

بہت روز گذر چکے تھے۔ بیٹی کو دیکھ دیکھکر شانتا دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ لیکن آرملا ماں کی روز افزوں محبت دیکھ دیکھکر کچھ پریشان سی کچھ اُداس سی کچھ سہمی سہمی سی رہتی۔ وہ سیٹھ جمنا داس کی نگاہوں کو بھی خوب سمجھتی تھی اور رام پرشاد کی چکنی چپڑی باتیں بھی اُس کے آہو ئے دل کو رام نہ کر سکتی تھیں۔ رہا روشن! تو اس سے کچھ اتنا میل جول نہ تھا۔ کبھی کوچے سے گذرتے گذرتے اُس سے ایک آدھ بات کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

ایک روز شام کے سُہانے وقت آرملا سرکاری باغ میں سیر کیلئے جانکلی۔ بینڈ سٹینڈ کے پاس خاصی رونق تھی۔ پائپرز پائپ بجا رہے تھے۔ بینڈ ماسٹر کے چلنے کا انداز بہت پُر لطف تھا۔ ہارسنگھار کے ایک پیڑ کے نیچے آرملا کھڑی تھی۔ اُس کی سپید ساری جس کے کناروں پر سپید گوٹ لگی تھی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ آس پاس سے گذرنے والے جس نگاہ سے اسکی طرف دیکھتے تھے آرملا ان نگاہوں کو خوب سمجھتی تھی۔ جب بینڈ بجنا بند ہو گیا تو وہ سڑک کی طرف چلی۔ دس پانچ قدم گئی تھی کہ سیٹھ جمنا داس مل گیا۔ آرملا اُسے دیکھتے ہی واپس لوٹی اور ایک جگہ جہاں ایک کالی کلوٹی ماما ایک خوبصورت بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی جا بیٹھی۔ بچے کے سُنہری گھنگریالے بال، نیلی نیلی آنکھیں اور چہرے کی معصومیت دیکھ دیکھکر معلوم ہوتا کہ کوئی جنت کی پاکیزہ رُوح باغِ عالم کی سیر کرنے کو اُتر آئی ہے۔ جمنا داس بھی وہیں آپہونچا اور ہیٹ اُٹھاکر آرملا کو سلام کیا۔

"شانتا دیوی نہیں آئیں؟"

"جی نہیں۔"

"آپ اکیلی ہی آگئیں" جمنا داس نے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"یہاں کیوں بیٹھ رہیں!" جمنا داس نے کہا۔ "آیئے نا ذرا پہاڑی کا چکر لگائیں۔"

"میں تو اب واپس جاؤنگی" آرملا نے جوابدیا۔

"کیا پیدل ہی؟" جمنا داس نے پوچھا۔

"جی ہاں!"

پاس سے وہی ماما ہنسکر بولی "کچھ آپ سے ناراض معلوم ہوتی ہیں" پھر آرملا سے "اب صاحب منا رہے ہیں تو آپ بھی من جائیے!"

اتنا کہکر ماما بچے کو لے کر بینڈ سٹینڈ کی طرف چلی گئی۔ جمنا داس ہنسکر بولا "تو لیجئے! اب تو من جائیے!"

"یہ تو آپ اُس سے کہیں جو ناراض ہو" آرملا نے جواب دیا۔

"شکریہ!" جمنا داس نے نیازمندانہ انداز سے کہا "یہ فکر تو دُور ہوا"

"فکر!" آرملا بولی "کیسا فکر؟"

"آپ کی ناراضگی کا!" جمنا داس نے جواب دیا۔

"اور اب؟" آرملا نے پوچھا۔

"اب کیا؟" جمنا داس بولا۔ ع "اب میں ہوں اور تو ہے"

"یہی باتیں تو مجھے ناپسند ہیں" آرملا نے جواب دیا۔

"کچھ جھوٹ تو نہیں کہا میں نے" جمنا داس نے کہا۔

"جھوٹ اور سچ کا پتہ تو انسان کے عمل سے چلتا ہے" آرملا نے جواب دیا۔

"وہ تو آپ بہت دنوں سے دیکھ رہی ہیں" جمنا داس نے جواب دیا "ہاں! مجھے یہ آج تک معلوم نہیں ہوا کہ آخر مجھ پر عتاب کیوں ہے"

"سیٹھ صاحب!" آرملا نے جمنا داس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "مجھے بھی یہ آج تک معلوم نہیں ہوا کہ آخر آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں"

"موسمِ بہار کا شگفتہ پھول!" جمنا داس نے مُسکرا کر کہا۔

"کچھ اور بھی؟" آرملا نے پوچھا۔

"ساقیِ بہار!"

"کچھ اور بھی؟"

"محبوبۂ جاں نواز!"

"کچھ اور بھی؟"

"جی ہاں!" جمنا داس نے کہا "جانِ تمنا"

"آپ کو یہ الفاظ کہتے شرم تو نہیں آتی؟" آرملا نے پوچھا "میں کوئی ویشیا تو نہیں"

"جس طرح آپ کی بارگاہِ حُسن میں تحائف پیش کرتے مجھے کبھی ندامت نہیں ہوئی، اسی طرح آپ کو جانِ تمنا کہتے ہوئے کبھی حجاب دامنگیر نہیں ہوتا۔ آرملا! ویشیا کی لڑکی کو ویشیا نہ سمجھوں تو کیا سمجھوں"

"ویشیا کی لڑکی!" آرملا غصے اور خوف سے کانپتی ہوئی بولی۔

"جی ہاں!" جمنا داس نے ہنسکر کہا "لیکن آپ....."

لیکن ارملا اس سے زیادہ سُننے کی تاب نہ لا سکی۔ اور وہاں سے اُٹھکر گھر کی جانب چلدی۔

جس وقت وہ مکان پر پہونچی اُس کا چہرہ تمتایا ہوا تھا۔ آنکھیں سُرخ تھیں۔ حوض کے پاس رام پرشاد ایک کرسی پر بیٹھا کوئی اخبار دیکھ رہا تھا۔ ارملا کو آتے دیکھکر وہ تعظیم کے لئے اُٹھا۔ ارملا حوض کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

"خیر تو ہے؟" رام پرشاد نے پوچھا۔

"بس چلتے چلتے تھک گئی" ارملا نے جواب دیا۔

"شانتا دیوی کہاں ہیں" رام پرشاد نے پوچھا "مجھ سے شام کے بعد ملنے کا وعدہ تھا"

"میرے ساتھ تو نہیں تھیں" ارملا بولی "شاید ابھی آجائیں"

"آپ کہاں سے آرہی ہیں؟" رام پرشاد نے پوچھا۔

"گھومنے گئی تھی"

"یہ آج آپ پریشان سی کیوں ہیں؟" رام پرشاد نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

"مَیں یہ سوچ رہی ہوں" ارملا نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا "کہ قدرت نے عورت کو پیدا کیوں کیا ہے"

"مَیں بتلاؤں؟" رام پرشاد نے ہنسکر کہا "بھگوان کے بعد اگر کوئی چیز پوجنے کے قابل ہوسکتی ہے تو وہ عورت ہے"

"ہر ایک عورت؟" ارملا نے پوچھا "ایک ویشیا بھی کیا؟"

"بیشک!" رام پرشاد نے پھر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن سماج تو اُسے ذلیل سمجھتی ہے" ارملا نے جواب دیا۔

"ذلیل سمجھنے والوں کی جبینِ نیاز دوسروں سے کچھ زیادہ ہی اس کے حُسن کے شوالے پر جھکتی ہے" رام پرشاد نے ہنس کر کہا۔

"لیکن اگر کوئی ویشیا یہ ذلیل پیشہ چھوڑدے تو" ارملا نے پوچھا۔

"پھر کیا؟" رام پرشاد بولا "ویشیا ویشیا ہی کہلائے گی"

"سچ ہے!" ارملا بولی "لیکن اگر وہ توبہ کرلے تو کیا پھر بھی سماج اُسے معاف نہ کریگی"

"سماج کے قوانین ہی ایسے ہیں" رام پرشاد نے جواب دیا۔

"گویا!" ارملا بولی "سماج عورت کو ہمیشہ ذلیل ہی رکھنا چاہتی ہے"

"نہیں!" رام پرشاد بولا "عورت خواہ کسی طبقے سے ہو، وقار سے رہنا یا ذلیل ہوکر رہنا تو خود اس پر موقوف ہے۔ خوددار انسان ہر ایک سے عزت کروا سکتا ہے"

"ویشیا اور خودداری!" ارملا نے کہا "یہ خوب کہی آپ نے۔ اچھا یہ بتلائیے کہ اگر کوئی ویشیا کی لڑکی عزت سے رہنا چاہے تو کیا سماج اُس کی کچھ مدد کرے گی"

"ارملا!" رام پرشاد بولا "جھوٹے نگینوں کی آبیاری ہمیشہ نگاہ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ ملمع کا رنگ پائیدار نہیں ہوتا۔ روپ دھار لینے سے اصلیت چھپائی نہیں جاسکتی۔ ویشیا کی لڑکی ویشیا ہی کہلائیگی"

یہ خوفناک الفاظ سُنکر غریب ارملا کے دل پر ایک چرکا لگا۔ تاہم اُس نے دل کی تسلی کے لئے پھر کہا "اصلیت کو چھپانے کی ضرورت بھی تو نہیں۔ بات تو عمل سے ہے۔ اگر وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کردے کہ وہ ایک پاکباز عورت ہے تو پھر سماج کو کیا حق ہے کہ اُسے حقارت سے دیکھے۔ بھولا بھٹکا اگر راہ پر آنا چاہے تو اُس کی دستگیری نہ کرنا تو مہا پاپ ہے۔ کتنا ظلم ہے کہ جس پھول کو آپ گلے کا ہار بناتے ہیں، پھر اُسی کو پاؤں سے مسلنے لگتے ہیں"

"ارملا!" رام پرشاد نے ہنس کر کہا "تم تعلیم پاکر تو پوری فلسفی بن گئیں۔ تم سے بحث کون کرے۔ چلو چھوڑو اس قصّے کو ذرا پیانو پر آج کچھ سُنا تو دو"

"اس وقت تو معاف ہی کیجئے!" ارملا اُٹھتے ہوئے بولی "میرے سر میں درد ہے اب میں ذرا جاکر آرام کرونگی"

لیکن دردِ سر کا تو محض ایک بہانہ ہی تھا۔ درد تو دل میں اُٹھ رہا تھا۔ 'ویشیا کی بیٹی ویشیا ہی کہلائے گی' اور 'ویشیا کی بیٹی کو ویشیا نہ سمجھوں تو کیا سمجھوں' یہ الفاظ نہ تھے بلکہ انگارے تھے جو اُس کی متاعِ ہستی کو جلا رہے تھے۔ ارملا کبھی اپنی تعلیم کو کوستی اور کبھی قسمت کو! کاش! وہ علم سے بے بہرہ ہوتی تو اپنی موجودہ حالت کی سوختہ سامانی پر قانع رہتی۔ اور ایک اندھے کی طرح جس راہ پر اُسے کوئی لگا دیتا چلنا شروع کردیتی۔ اسے سیٹھ اور رام پرشاد سے کچھ شکوہ نہ تھا۔ سماج کے قوانین اُس کے لئے بدلے نہ جاسکتے تھے۔ سماج بُرے کو بُرا ہی کہے گی۔ لیکن نہیں! سماج کو یہ حق ہرگز نہیں کہ وہ کسی بدکردار کو نیکی کا راستہ اختیار کرلینے پر بھی بُرا ہی سمجھے۔ لیکن سیٹھ اور رام پرشاد کی بات کا اعتبار ہی کیا۔ دُکھ درد میں انسان کو، یا خدا نظر آتا ہے یا ماں۔ لیکن خدا تو شاید اُسے بھول چکا تھا اور ماں بیٹی کی کشتِ حسن میں دل ہی دل میں پھولی جارہی تھی۔ ارملا ماں کی طرف سے تو بالکل مایوس تھی۔ اس بیقراری اور بے تابی کے عالم میں وہ پلنگ سے اُترکر فرش پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ جوڑکر بولی "بھگوان! اگر تُونے میری

دستگیری نہ کی تو میں تباہ ہو جاؤں گی۔ تیری داسی تیری پناہ مانگتی ہے۔ تو مجھے نرگ کا لقمہ بننے سے بچا لے"۔

اتنا کہکر اُس نے دونوں ہاتھوں سے مُنہ ڈھانپ لیا اور اپنی بیکسی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ اپنی قسمت پر رو رہی تھی اور ساتھ والے گھر سے پھر وہی دلنواز آواز آرہی تھی ؎

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنّا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

اُرملا دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ لیکن آج سامنے والی کھڑکی بند تھی اور آواز کہیں دور سے آتی معلوم ہوتی تھی۔

اُرملا کھڑکی سے ہٹ کر پلنگ پر آبیٹھی اور سوچنے لگی کہ روشن کی کیا آرزو ہوسکتی ہے۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ سو روپے تنخواہ پاتا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ پکی پکائی کھانے کو ملتی ہے۔ ماں جان چھڑکتی ہے۔ اور پھر نہ تو کبھی اُس نے مجھ سے ہنس کر بات ہی کی ہے۔ نہ کبھی میری طرف دیکھکر مسکراتا ہے۔ نہ کبھی کھڑکی میں سے تاک جھانک نہ کوٹھے پر سے اشارے۔ نہ نامہ نہ سلام۔ بھگوان ہی جانے پھر اسے اور آرزو کیا ہے۔ بھلا اس سے پوچھوں تو سہی! یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر پھر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ لیکن کھڑکی اب بھی بند تھی اور گانے والے کی آواز بگ درابن کر سننے والی کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"بی بی!" ماما نے دروازے میں کھڑے ہوکر پوچھا "کھانا لاؤں؟"

"ماں کھا چکیں؟" اُرملا نے پوچھا۔

"وہ تو ابھی آئیں بھی نہیں" ماما نے جواب دیا۔

"ابھی تک نہیں آئیں" اُرملا نے اپنی ننھی سی بیضوی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا "یہاں تو دس بھی بج چکے"۔

"تب ہی تو کہتی ہوں" ماما بولی "آپ کھانا کھالیں"۔

"مجھے بھوک نہیں" اُرملا نے جواب دیا۔

"تو میں اب کب تک بیٹھی انتظار کروں؟" ماما بولی "پڑوس والے تو سو بھی گئے سب"۔

"تم بھی سو رہو" اُرملا نے جواب دیا۔

ماما بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

رات کسی کے بختِ سیاہ کی طرح تاریک تھی۔ ننھے ننھے ستارے سکانِ زمین کی بے مانگی پر مُسکرا رہے تھے۔ ابر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا سوادِ آسمان پر محوِ خرام تھا۔ جدھر سے سیر کرتا ہوا گزرتا وہیں ایک شبنمی سی تان دیتا۔ اور کہکشاں جبینِ فلک پر اس طرح ضیا پاش تھی جیسے کسی حسینہ کے ماتھے پر افشاں۔ کائنات محوِ خواب تھی۔ لیکن اُرملا کباب سیخ کی طرح پلنگ پر پہلو بدل رہی تھی اور یہ کمرہ جہاں اُس کے شوق اور آرام کے سبھی سامان موجود تھے اُسے اس قفس کی طرح معلوم ہو رہا تھا جہاں صیّاد نے کسی گلدم کو مقیّد کر رکھا ہو۔ جس طرح آسمان کی فضا تاریک تھی اُسی طرح کمرے میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ریڈیم کلاک کی سوئیاں اور حروف تھے جو اس اندھیرے میں ایک آخری اُمید کی طرح چمک رہے تھے۔ دو بج چکے تھے۔ اُرملا کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ کھڑی ہوئی۔ اُس کی ماں کے سونے کے کمرے میں ابھی تک روشنی تھی۔ وہ دبے پاؤں نیچے آئی اور پیچھے سے ماں کے کمرے کے پاس کھڑی ہوکر شیشوں میں سے جھانکنے لگی۔ لیکن ایک نظر ڈالنے کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی چیخ اُس کے منہ سے نکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر وہیں بیٹھ گئی۔ اُس کی ماں گناہ کی آغوش میں تھی۔

اس واقعہ کو کئی روز ہو چکے تھے۔ ایک روز ماں بیٹی صحن میں بیٹھی تھیں کہ روشن کی ماں تھال میں کچھ مٹھائی لیکر آئی۔

"ماتا!" شانتا بولی "کیا لائی ہو؟"

"میرے روشن کے سو سے سوا سو ہو گئے ہیں" پڑوسن نے مُسکرا کر کہا "اُرملا کیلئے تھوڑی سی مٹھائی لائی ہوں"۔

"بڑی کرپا کی آپ نے؟" اُرملا نے مسکرا کر کہا۔

"کرپا کیسی!" پڑوسن بولی "پڑوسیوں کا حق بھی تو ہوتا ہے"۔

"روشن بابو کا بیاہ کب کروگی ماتا؟" شانتا نے پوچھا۔

"میں تو آج کر دوں" روشن کی ماں نے جواب دیا "لیکن بیاہ والا بھی مانے!"

"مانتا کیوں نہیں؟" شانتا نے پوچھا۔

"بیٹی!" پڑوسن ہنسکر بولی "یہ لڑکے بالے مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ خیر! بھگوان کبھی میری بھی آس پوری کریں گے"۔

جب پڑوسن چلی گئی تو اُرملا بولی "کتنے اچھے لوگ ہیں۔ ہم نے تو کبھی انہیں اپنے یہاں بلوایا نہیں اور یہ آج ہمارے لئے مٹھائی لے آئی"۔

"ہاں!" شانتا نے اس ہاں کو ذرا لانبا کرکے کہا "بظاہر تو اچھے

ہی معلوم ہوتے ہیں، پر اِن سے ذرا الگ ہی رہنا چاہیئے۔"

"وہ کیوں؟" آرملا نے تعجب سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اِن لوگوں کے مُنہ میں تو گز بھر کی زبان ہوتی ہے،" شانتا بولی۔ "رائی کا پہاڑ بناتے ہیں۔"

"انسان جو کچھ دیکھتا ہے وہی کہتا ہے۔" آرملا نے جواب دیا۔ "تاہم رَوشن نے تو کبھی مجھ سے کچھ آج تک کہا نہیں۔ وہ تو بات کرتے بھی شرماتا ہے!"

"تم سے رَوشن ملا کرتا ہے؟" شانتا نے پوچھا۔

"ہاں!" آرملا نے اس ہاں کو ذرا لانبا کرکے کہا۔ "کبھی محلّے سے گذرتے آمنا سامنا ہو ہی جاتا ہے۔ بہت شریف آدمی ہے۔"

"ان شریفوں سے بھگوان ہی بچائے۔" شانتا نے مسکراکر کہا۔

"مَیں تو چاہتی ہوں۔" آرملا بولی۔ "کہ ہم ایسے لوگوں سے میل ملاپ پیدا کریں جو دُکھ سُکھ میں کبھی کام بھی آئیں۔"

"یہ دُکھ سُکھ میں تو کیا کام آئیں گے۔" شانتا نے جواب دیا۔ "ہاں! بدنام ضرور کرینگے۔"

"بدنام تو انسان اپنے عمل سے ہوتا ہے۔" آرملا نے جواب دیا۔

"سچ ہے۔" ماں نے ذرا طنزاً مُسکراکر کہا۔ "تم جتنا نیک نام بننے کی کوشش کروگی۔ دُنیا تم سے اتنی ہی بدظن ہوگی۔"

"اگر ہمارے عمل، ہمارا چلن، ہمارا برتاؤ شریفانہ ہوگا تو کون ہے ہمیں بدنام کرنے والا۔" آرملا نے جواب دیا۔

"آرملا!" ماں نے بیٹی کی طرف دیکھکر کہا۔ "میں جس دُنیا کیلئے تمہیں تیار کررہی ہوں تمہارے اگر یہی خیالات رہے تو یاد رکھو پیٹ بھرنے کیلئے بھی دوسروں کی محتاج رہوگی۔"

"اگر عزت سے روکھی سوکھی بھی مل جائے تو اِن لذیذ کھانوں سے بہتر ہے۔ جن کے باعث انسان ایک دُنیا میں ذلیل متصوّر ہونے لگے۔"

"خیر!" ماں بولی۔ "یہ بیہودہ باتیں تو اب چھوڑو۔ آج رات سیٹھ جیناداس کی یہاں دعوت ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمیں روپے کی کتنی ضرورت ہے۔ اگر تم ذرا عقل سے کام لوگی تو اُمید ہے ہزار بارہ سو اس سے مل جائیں گے۔"

"تو مَیں کیا کروں؟" آرملا نے پوچھا۔

"ایک تو ذرا گہنا پاتا پہن لو، دوسرے وہی ساری جو کل اس نے تمہارے لئے بھیجی تھی باندھ لو۔" شانتا نے جواب دیا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" آرملا نے پوچھا۔

"سیٹھ خوش ہوجائیگا۔" ماں نے ہنسکر کہا۔

"لیکن تم نے تو مجھ سے سینما چلنے کا وعدہ کیا تھا۔" آرملا نے کہا۔ "چلوگی نا۔ پہلا شو نہ سہی دوسرا شو ہی سہی!"

"آج تو نہ جاسکیں گے۔" شانتا نے کہا۔ "آج رات تو سیٹھ ہمارا مہمان ہوگا۔"

رات آرملا بالکل اِندر کے اکھاڑے کی پری بنی ہوئی تھی۔ ایک تو قدرتی حُسن پھر اُس پر غازے کی بہار۔ ہاتھوں میں حنا، ماتھے پہ سیندور کا قشقہ، کانوں میں جواہر نگار آویزے، جو بجلی کی روشنی میں دیکھنے والوں پر برق پاشیاں کررہے تھے۔ پھر جھومر جو چڑھتے چاند کی طرح پیشانی پر چمک رہا تھا۔ گلے میں موتیوں کا ہار، جو سینے کے اُبھار کو جھوم جھوم کر چوم رہا تھا۔ مرمریں کلائیوں میں سونے کی خوشنما چوڑیاں جن کی ہلکی ہلکی چمک دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اور سلمہ ستارہ کے کام والی نیلی ساڑھی بزمِ عشاق میں بجلیاں چمکارہی تھی۔ بادۂ ناب کا دَور چل رہا تھا۔ اور آرملا اپنے دلکش رقص سے مہمانوں کی دلنوازی کررہی تھی۔

شانتا اس قمار باز کی طرح جس نے آخری بانسہ پر عمر بھر کی کمائی لگا رکھی ہو، دیکھ رہی تھی۔

آرملا جب تھک کر بیٹھ گئی تو شانتا اپنے مہمانوں کو پیانو پر گانا سُنانے لگی اور آرملا ماں کی آنکھ بچاکر چپکے سے اُٹھکر اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ کچھ دیر آئینہ کے سامنے کھڑی ہوکر اپنی شکل وصورت دیکھتی رہی۔ پھر اُس کھڑکی کے پاس جو رَوشن کے مکان کی جانب تھی جاکھڑی ہوئی۔ لیکن کھڑکی بند تھی۔ جانے اُسکے دل میں کیا آئی جو اُس کی آنکھوں سے خودبخود آنسو گرنے لگے۔ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگئی۔ شانتا کے گانے کے ساتھ مہمانوں کے شور وغُل کی آواز آرہی تھی۔ اس طرح معلوم ہوتی تھی جیسے جہنم سے بدکردار ارواح نکل نکل کر چیخ رہی ہوں۔

"اس زندگی سے موت بہتر ہے۔" اُس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "ویشیا کی بیٹی ویشیا ہی کہلائے گی، ویشیا! ویشیا! کون میں؟ ہرگز نہیں۔ ویشیا کی بیٹی کو ویشیا نہ سمجھوں تو پھر کیا سمجھوں؟ لیکن جب بیٹی ہی نہ ہوگی تو ویشیا کہلائے گی کیسے؟"

آرملا مُنہ سے یہ الفاظ کہتی جاتی تھی اور کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرتی جاتی تھی۔ پھر اُس نے اسپرٹ کی بوتل نکالی اور کمرے کے سامان پر چھڑک کر آگ لگادی اور لحاف اوڑھ کر پلنگ پر لیٹ گئی۔

اچانک محلے سے آگ آگ کا شور بلند ہوا۔ اور لوگ شانتا کے مکان کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹانے لگے۔ آخر عیش کے بندوں کو بھی ہوش آیا۔ اور سب مہمان کمرے سے نکل کر صحن کی طرف بھاگے۔ اُوپر کی منزل سے شعلے نکل رہے تھے۔

"ہائے!" شانتا خوفزدہ آواز سے بولی:" ارملا کہاں ہے؟" پھر سر پیٹ کر۔" ہائے میری بیٹی! بھگوان کے لئے اسے بچاؤ"

یہ کہکر زور زور سے" ارملا! ارملا!" کہکر آوازیں دینے لگی۔ اتنے میں آگ بجھانے کا انجن بھی آپہونچا۔

سیٹھ جمنا داس اپنے دوست رام داس سے بولا:" چلو بھاگو یہاں سے! اگر کسی نے دیکھ لیا تو فضیحتا ہوگا"

دونوں چپکے سے نکل گئے۔ آگ زینے تک پہونچ چکی تھی۔ انجن والے نالیاں بچھا رہے تھے اور شانتا" ہائے میری بیٹی! ہائے میری ارملا" کہہ کہہ کر چیخ رہی تھی۔

اس وقت روشن ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگتا ہوا آیا اور دیوانوں کی طرح جلتے ہوئے زینے پر چڑھ گیا۔ خوش قسمتی سے آگ ابھی پلنگ تک نہیں پہونچی تھی۔ ارملا پلنگ پر بیہوش پڑی تھی۔ اس نے اُسے کندھے پر اُٹھایا اور جلتے ہوئے دروازے میں سے کُود کر برآمدے میں آیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ اُس کے کپڑوں میں آگ لگی ہے۔ لیکن اُس نے نہایت اطمینان کے ساتھ آگ بجھانے والوں کے اس آہنی تاروں کے جال میں جو وہ برآمدے کے نیچے پھیلائے کھڑے تھے، ارملا کو اُوپر سے پھینک دیا۔ جب تک ارملا کو لوگوں نے جال سے نکالا وہ برآمدے میں کھڑا رہا۔ پھر وہ خود بھی نیچے کُود پڑا۔ لیکن اسوقت تک وہ بُری طرح جل چکا تھا۔ لوگ اُسے اُٹھا کر ہسپتال لے گئے۔

روشن کئی روز موت اور حیات کی کشمکش میں رہا۔ ارملا اسکی پٹی سے لگی اس کی تیمارداری بھی کرتی اور بھگوان سے اس کی زندگی بھی مانگتی۔ زندگی بخشنے والے بھگوان نے روشن کو صحت اور زندگی بخشی اور روشن نے ارملا کو سہارا دیکر قعرِ مذلت سے بچالیا۔ اور سوسائٹی؟

کون کرسکتا ہے اُس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

ایم۔ اسلم

آخری سودا

جب مَیں صبح پتھر کی سڑک پر ٹہل رہا تھا تو میں نے پُکار کر کہا:" آؤ مجھے کرائے پر لے لو!" بادشاہ اپنی رتھ پر سوار تلوار ہاتھ میں لئے آیا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا:" مَیں تجھے اپنی طاقت کے بدلے میں لونگا" لیکن اُس کی طاقت عدم کے برابر تھی۔ چنانچہ وہ اپنی رتھ پر چلا گیا۔

دوپہر کی چلچلاتی دُھوپ میں مکان کھڑے تھے۔ اور اُنکی کھڑکیاں بند تھیں! مَیں پیچدار گلی میں پھر رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی روپے کی ایک تھیلی اُٹھائے برآمد ہوا۔ اُس نے پہلے تامل کیا اور پھر کہا:" مَیں تجھے اپنے روپے کے بدلے میں لے لونگا" اُس نے اپنا ایک سکہ تول کر دکھایا۔ مگر مَیں مُنہ پھیر کر چل دیا۔

شام کا وقت تھا۔ باغ کی باڑ تمام پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ ایک خوبصورت دوشیزہ آئی اور اُس نے کہا:" میں تجھے ایک مُسکراہٹ کے عوض میں لونگی" اُس کا تبسم زرد پڑ گیا اور آنسو ہوکر بہہ گیا۔ پھر وہ رات کی تاریکی میں واپس چلی گئی۔

سُورج ریت پر چمک رہا تھا اور سمندر کی موجیں شوخی و خود رائی سے اُچھل رہی تھیں۔ بچہ بیٹھا ہوا گھونگوں سے کھیل رہا تھا! اُس نے اپنا سر اُٹھایا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے پہچانتا ہے، اُس نے کہا۔" مَیں تو تمہیں مُفت لونگا"

اس سودے نے جو بچے کے کھیل میں طے ہوگیا، اُس دن سے مجھے آزاد انسان بنادیا!

(ٹیگور)

ہمشیرہ مشرف حسین

سچّی کہانی

جہانگیر نگر گرلز ہائی اسکول کی جُبلی منائی جانے والی تھی ہماری یونیورسٹی کے سب پروفیسروں کے نام دعوت نامے آئے تھے۔ بعض وجوہ سے میں اس جلسہ میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اسکول کی پرنسپل مس بوس نے دعوتی کارڈ کے علاوہ ایک پرائیویٹ خط بھی مجھے لکھا اور جلسہ میں شریک ہونیکی بہت تاکید کی۔ چند سال قبل کشمیر کی سیاحت کے دوران میں وہ میری ہم سفر رہ چکی تھیں۔ میں بیمار ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے میری تیمارداری کی تھی۔ اُن کی مہربانیاں مجھے یاد تھیں۔ ناچار اپنی خواہش کے خلاف میں جلسہ میں شریک ہوا۔

مس بوس ابھی تازہ ولایت تھیں۔ اسکول کا چارج لئے تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا۔ شہرت اور ہردلعزیزی حاصل کرنے کے لئے وہ جلسہ کو بہت زیادہ شاندار اور کامیاب بنانا چاہتی تھیں۔ شہر کی کوئی ممتاز ہستی ایسی نہ تھی جسے مدعو نہ کیا گیا ہو۔ معزز حضرات و خواتین کا اتنا عظیم الشان اجتماع اسکول کی ۲۵ سالہ زندگی میں پہلا موقع تھا۔ یوں تو مس بوس کی خوش ذوقی اور سلیقہ مندی ہر چیز سے ظاہر تھی مگر خصوصیت کے ساتھ اسٹیج بہت ہی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔

تفریحات (Entertainments) کا پروگرام شروع ہوا۔ گھنٹی بجی۔ پردہ اُٹھا اور ایک خوبرو دوشیزہ زرّین حاشیہ کی سُرخ ساڑی پہنے شعلۂ جوالہ بنی ہوئی سامنے آئی۔ اسکول کی سیاہ فام میٹرن مس وہائٹ (Miss White) نے حاضرین سے تعارف کرایا "مس پارُل سین!" پارُل نے کرسی پر بیٹھکر بنگلہ زبان میں ایک گیت گانا شروع کیا۔ آن واحد میں فضا نغموں سے گونج رہی تھی۔ پارُل کی آواز بہت ہی پیاری تھی جس وقت وہ تان لیتی، معلوم ہوتا کہ بجلی کوندگئی۔ ہال بڑا تھا۔ حاضرین کی تعداد کثیر تھی، مگر ایسا کامل سکوت طاری تھا اور لوگ اس طرح بے حس و حرکت بیٹھے تھے کہ گویا کرسیوں پر بے رُوح سنگین مُجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ ہر شخص ہمہ تن گوش تھا۔ حُسن، جوانی اور تندرستی کا اجتماع یوں ہی کیا کم قیامت ہوتا ہے کہ اس میں سحرِ نغمہ بھی شامل ہو جائے۔ کون تھا جسکا سرِ نیاز اُس وقت عالمِ خیال میں پارُل کے قدموں پر جُھکا ہوا نہ تھا۔ کوئی اعتراف نہ کریگا مگر مجھے معلوم ہے کہ اُسوقت بہت سے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔

میرے برابر والی کرسی پر مدھوپور کا نوجوان رئیس اجیت کمار سین بیٹھا ہوا تھا اور اُس کے برابر اُس کا سکریٹری رنجو بابو۔ اجیت کے باپ کو مرے ابھی ۲ ہی مہینے ہوئے تھے۔ شہر میں جابجا اُس کی آوارگیوں کے چرچے تھے۔ آزادی، جوانی، دولت، اور بُری صحبت بڑی تیزی کے ساتھ اُسے تباہی کیطرف کھینچے لئے جارہی تھیں۔ خاندانی وقار اور بزرگوں کی عزت کے طفیل اُسے ایسے پبلک جلسوں اور دعوتوں میں شریک کر لیا جاتا تھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اُس کی بداطواریوں کے باعث لوگ اُس سے دُور ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ مدھوپور ایک چھوٹی جگہ ہے۔ وہاں رنگ رلیوں کے سامان کہاں۔ اس لئے اجیت نے کئی مہینے سے جہانگیر نگر میں ڈیرے ڈالدئے تھے۔

پارُل کے حُسن و شباب اور جادو بھری آواز نے قہر کیا۔ اجیت کے جذباتِ شہوانی بُری طرح مشتعل ہو گئے۔ وہ رہ رہ کر سسکیاں لیتا اور اپنا ہونٹ کاٹتا تھا۔ اُس کی اس حالت نے بے اختیار مجھے اُس کی طرف متوجہ کر دیا۔ اُف تو بہ! کس بُری طرح

وہ پارل کو گھور رہا تھا جس طرح ایک گرسنہ درندہ اپنے شکار پر جھپٹنے کی تیاری کر رہا ہو۔ اُس کا اگر بس ہوتا تو وہ اُسی وقت پارل کو اسٹیج پر سے اُٹھا لیجاتا اور...... آخر اُس نے رُجّو بابو کی طرف جھک کر آہستہ سے کچھ کہا۔ رُجّو نے مڑکر اُس کی طرف دیکھا۔ ایک شیطانی مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ پھر اُس نے بھی آہستہ اجیت سے کچھ کہا۔ دو ایک لفظ میں نے بھی سُنے مگر مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ خدا جانے کیوں یکایک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ضرور یہ بدمعاش کوئی مجرمانہ منصوبہ گانٹھ رہے ہیں۔ پارل نے گیت ختم کیا۔ پردہ گرا۔ تالیوں کے شور سے کتنی ہی دیر تک ہال گونجتا رہا۔ اجیت اور رُجّو اسی وقت جلسہ سے اُٹھکر چلے گئے۔ پارل کا وہ گیت ایسا مقبول ہوا کہ گھر گھر گایا جانے لگا۔ کبھی کبھی میں نے سڑک پر لڑکوں کو بھی وہ گیت گاتے سُنا۔

اس واقعہ کو کئی مہینے گذر گئے۔ گرمیوں کی تعطیل میں شہر کے اسکول، کالج، اور ہماری یونیورسٹی سب تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ بعض مجبوریوں سے میں اس مرتبہ وطن نہ جا سکا۔ چھٹیاں یہیں گذاریں۔ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی کئی دن باقی تھے۔ ہندو بورڈنگ ہاؤس کے ایک ٹیوٹر مسٹر دت نے مجھے چائے پر بلایا۔ سرِ شام لوٹتے ہوتے جس وقت میں بورڈنگ ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں سے گذر رہا تھا میں نے لڑکوں کا ایک غیر معمولی اجتماع دیکھا۔ قریب پہونچکر میں نے ایک لڑکے سے جسے میں اچھی طرح جانتا تھا پوچھا "کیا قصہ ہے پال؟"

"ایک نہایت شرمناک، نہایت اندوہناک واقعہ جناب"

اُس نے نہایت غم و غصہ کے لہجہ میں جواب دیا اور اپنے ایک ساتھی سے بنگلہ زبان کا ایک اخبار لیکر پڑھنا شروع کیا۔ سب لڑکے خاموش کھڑے سُن رہے تھے:۔

"ایک دوشیزہ کی بے ناموسی۔ اتوار کی رات کو پچھلے پہر کئی مسلح نقاب پوش مسٹر تارک ناتھ سین، پلیڈر مدھو پور کے مکان میں داخل ہو گئے اور اُن کی جوان لڑکی کو جو گرمیوں کی تعطیل میں اسکول سے گھر آئی ہوئی تھی اسکے خوابگاہ میں سے اٹھا لے گئے۔ مسٹر سین کا ملازم اِن لوگوں سے ملا ہوا تھا اُس نے یا تو مکان کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا یا وقت مقررہ پر کھولدیا۔ لڑکی اپنے کمرے میں بیخبر سوئی ہوئی تھی ایسی خاموشی سے اِن لوگوں نے اپنا کام انجام دیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ علی الصباح جب مسٹر سین کی آنکھ کھلی تو مکان کا دروازہ کھلا پایا۔ گھبرا کر اُٹھے۔ دیکھا تو لڑکی غائب۔ نوکر کو آواز دی۔ تو اُس کا بھی پتہ نہیں۔ خادمہ سے پوچھا۔ اُس نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ اُسی وقت تھانے میں رپٹ لکھائی۔ پولیس نے خادمہ کو حراست میں لے لیا۔ ڈرانے دھمکانے سے آخر اُس نے اقرار کر لیا کہ "رات تین بجے کئی آدمی چھرے لئے ہوئے گھر میں گھس آئے۔ میں جاگ رہی تھی۔ ایک آدمی نے چھرا میرے سینے پر رکھدیا اور کہا کہ آواز نکالی تو مار ڈالوں گا۔ میں سہم گئی۔ وہ لوگ لڑکی کو اٹھالے گئے اور چلتے وقت مجھ سے کہہ گئے کہ اگر کسی کو کچھ حال بتایا تو کل رات کو تیرا خاتمہ کر دیں گے۔ جوتن (ملازم) بھی اُن لوگوں کے ساتھ چلا گیا"۔ پولیس نے لڑکی کی تلاش شروع کی۔ آبادی سے دُور ایک کسان نے لڑکی کو ایک کھیت میں بیہوش پڑا پایا۔ اُس نے تھانے میں اطلاع کی اور پولیس کی مدد سے لڑکی نیم مُردہ حالت میں اپنے گھر پہونچائی گئی۔ بدنصیب معصوم لڑکی کسی گہری سازش کا شکار ہوئی ہے جس میں کسی بڑے دولتمند کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔"

پال کی آنکھیں اور چہرہ بتا رہے تھے کہ وہ اس واقعہ سے حددرجہ متاثر ہوا ہے۔ اُس نے نہایت حقارت و نفرت کے لہجہ

میں کہا :-

"پروفیسر صاحب! یہ ہیں ہمارے دولتمندوں کے کرتوت!"

میں نے کہا۔"افسوس! اس منحوس واقعہ سے بیچاری کی ساری زندگی تباہ ہوگئی۔ اب کون اُس سے شادی کرنا گوارا کرے گا؟"

"مگر اُس کا قصور؟" پال نے مجھ سے سوال کیا۔

"قصور ہو یا نہ ہو مگر واقعہ بہرحال واقعہ ہی۔ کیوں کوئی ایک آلودہ دامن لڑکی کو اپنا رفیقِ زندگی بنا سکے؟" میں نے جواب دیا۔

"تو آپ کا یہ مطلب ہے کہ مجرموں کے گناہ کی سزا ایک معصوم کو ملنی چاہیئے؟" پال نے کسیقدر جھلاّ کر کہا۔

"اب جو بھی سمجھو۔"

"مگر یہ تو سراسر ظلم ہے۔"

"پال! جذبات کی دُنیا میں منطق کی دلیلیں کام نہیں دیتیں۔ سبب کچھ بھی ہو مگر جو لڑکی گوہرِ عصمت کھو چکی وہ سوسائٹی میں کسی اعزاز و احترام کی مستحق نہیں۔"

پال میرے الفاظ سے کچھ اور بھی برافروختہ ہوگیا۔ وہ غصّہ کے مارے دانت پیس رہا تھا۔ اس نے کہا :-

"معاف فرمایئے پروفیسر صاحب! آپ نے عصمت کے معنی غلط سمجھے ہیں عصمت نام ہے گناہ سے باز رہنے کا۔ اور انسان کا کوئی فعل گناہ نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی خواہش، اختیار اور ارادہ کو اس میں دخل نہ ہو۔ عصمت کوئی گہنا نہیں ہے کہ چور چُرا لے جائے یا کوئی زبردستی چھین لے عصمت نام ہے نیکی کا۔ دل کی پاکی کا۔ کیا انسان کی اخلاقی صفات بھی کوئی کسی سے بجبر چھین سکتا ہے؟ پھر گوہرِ عصمت چھن جانے کے کیا معنی؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ آج بھی ویسی ہی معصوم ویسی ہی باعصمت ہے جیسی اس منحوس حادثہ سے پہلے تھی۔"

"تم جو کچھ بھی سمجھو۔ لیکن ہماری سوسائٹی کا قانون تو ایسا سمجھنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"لعنت بھیجئے سوسائٹی کے ایسی قانون پر جو ایک معصوم کو گنہگار اور بیقصور کو مجرم گردانتا ہے۔"

"پال! سوسائٹی کے قانون پر لعنت بھیجنے سے تم سوسائٹی کے اخلاق و جذبات کو نہیں بدل سکتے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ کسی معزز اور شریف گھرانے کا کوئی باغیرت لڑکا اس بدبخت لڑکی سے شادی کرنے پر آمادہ ہوجائیگا۔؟"

"معزز اور شریف گھرانے کا حال تو مجھے معلوم نہیں نہ میں روایتی غیرتمندی سے واقف ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس کے باپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں۔" سب لڑکے حیران ہوکر پال کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا :-

"پال! ابھی تم جوان ہو۔ جذبات کے جوش میں ایسا کہہ رہے ہو۔ شاید کل تک تمہاری رائے بدل جائے۔"

"نہیں جناب! خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں اتنا "باغیرت" نہیں ہوں کہ معزز سوسائٹی کے جابرانہ آئین کی حمایت میں آنکھ بند کرکے اپنے ضمیر اور یقین دونوں کا خون کردوں۔" پال نے نہایت پُرجوش لہجہ میں جواب دیا۔

پال فلسفہ کا طالب علم تھا۔ اس کے ایم اے کے آخری امتحان میں صرف ایک مہینہ باقی تھا۔ اس واقعہ کے دو تین دن بعد میں نے سُنا کہ وہ بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر چلا گیا۔ پال ایک معزز خاندان کا لڑکا تھا۔ اس کے والد مسٹر این۔ سی۔ پال جو حال ہی میں منصفی کے عہدہ سے ریٹائر ہوتے تھے، اچھی خاصی شہرت کے مالک تھے۔ پال سیدھا مادھوپور پہونچا اور مسٹر سین سے درخواست کی کہ میں آپکی لڑکی سے شادی کرنی چاہتا ہوں۔ پال کے والد کچھ

دونوں مدھوپور میں بھی منصف رہ چکے تھے اور مسٹر سین کو بحیثیت
وکیل، بارہا ان کی عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تھا۔
جب انہیں معلوم ہوا کہ پال منصف صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے
تو انہیں بے انتہا مسرت ہوئی۔

پال کی شکل وصورت، تندرستی، تعلیم، خاندانی وجاہت
کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس کی درخواست کے لئے ایک زبردست
سفارش نہ سمجھی جائے۔ مگر مسٹر سین نے تین دن تک کوئی جواب
نہ دیا اور کسی نہ کسی حیلہ سے ٹالتے رہے۔ آخر چوتھے دن صبح
کو انہوں نے پال کو تنہا اپنے کمرے میں بلایا اور کہا:۔

"پال! میرے جواب کا انتظار کرتے کرتے تم تنگ آ گئے
ہوگے۔ مجھے اس کا نہایت افسوس ہے۔ مگر میں اُس دن سے
آج تک برابر اسی امر پر غور کرتا رہا ہوں کہ تمہاری بات کا
کیا جواب دوں۔ یقین مانو کہ تم جیسا لائق، شریف اور
سعادتمند داماد اگر مجھے مل جائے تو میں اسے اپنی انتہائی
خوش قسمتی سمجھوں اور میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی
بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ تم میرے ہو جاؤ۔ مگر افسوس
کہ بعض وجوہ سے میں تمہاری خواہش کو پورا نہیں کر سکتا۔"

پال حیران ہو کر مسٹر سین کا منہ تکنے لگا۔ اُسے یقین
تھا کہ مسٹر سین بڑی خوشی سے اس کی درخواست کو منظور
کر لیں گے۔ اس انکار کے معنی اُس کی سمجھ میں نہ آئے۔ اُسے
سخت مایوسی ہوئی۔ آخر اُس نے نہایت غمناک لہجہ میں کہا:۔

"میرا آپ پر کوئی زور نہیں۔ آپ مختار ہیں۔ لیکن کم سے کم
مجھے اتنا تو معلوم ہو جائے کہ آخر مجھ میں ایسی کونسی برائی
ہے جس کی بنا پر آپ ...."

"پال! میرے مفہوم کو غلط نہ سمجھو" مسٹر سین نے پال
کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا "تمہارے اندر ہرگز کوئی برائی نہیں۔
بلکہ خدا نے تمہیں اُن سب خوبیوں کا مالک بنایا ہے جو ایک انسان
کے لئے باعث افتخار ہو سکتی ہیں۔ کھوٹ جو کچھ ہے وہ ہمیں میں ہے۔
ہم ہی اس قابل نہیں کہ تمہیں اپنا بنا سکیں۔"

"میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آتی۔ مہربانی فرما کر صاف صاف
بتا دیجئے" پال نے منت سے کہا۔ مسٹر سین خاموش ہو گئے اور
کئی منٹ تک بالکل خاموش رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ
کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ آخر انہوں نے
نہایت اندوہناک لہجہ میں کہنا شروع کیا:۔

"پال! بدقسمتی سے ہم کچھ ایسے حادثات کا شکار ہو گئے
ہیں جنہوں نے ہمیشہ کے لئے ہمیں دنیا کی نظر میں ذلیل کر دیا۔
اگر وہ واقعات تمہیں معلوم ہوتے تو تم کبھی ہرگز یہاں تک آنے
کی زحمت گوارا نہ کرتے۔ مگر میں تم جیسے شریف اور نیک بخت
انسان کو دھوکا نہیں دے سکتا......"

"اب میں آپ کا مطلب سمجھ گیا" پال نے مسٹر سین کی بات
کاٹتے ہوئے کہا "آپ کو کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ مجھے سب
کچھ معلوم ہے اور سب کچھ جاننے کے باوجود میں یہ درخواست
لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو
اسی منحوس حادثہ نے جس کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں
مجھے اس پر آمادہ کیا ہے کہ آپ کی عزت اور ذلت میں ہمیشہ
کے لئے شریک ہو جاؤں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ غریب لڑکی ہر قسم
کی آلودگی سے پاک اور بالکل معصوم ہے۔"

پال کے الفاظ نے مسٹر سین پر ایک معجزانہ اثر کیا۔ ان کا
افسردہ چہرہ یکایک شگفتہ ہو گیا۔ آنکھوں کی چمک سے دل
کی خوشی کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ وہ مسرور بھی تھے اور حیران
بھی۔ آخر انھوں نے نہایت محبت بھرے لہجہ میں پال سے کہا:۔

"پال! مائی ڈیر۔ مجھے خبر نہ تھی کہ خدا نے تمہارے سینے میں
ایک فرشتہ کا دل رکھ دیا ہے۔ مگر ایک بات پر شاید تم نے غور نہیں
کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے والد کبھی اس رشتہ کو گوارا نہ

کریں گے۔"

"اس کا آپ فکر نہ کیجئے۔ میں انہیں راضی کر لونگا۔"

پال اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں مر چکی تھی۔ باپ کو اُس سے بے انتہا محبت تھی۔ مگر منصف صاحب ایک پُرانی وضع کے بزرگ تھے۔ اُنہیں اپنی خاندانی شرافت پر بڑا ناز تھا۔ پال نے جب تمام واقعات اُنہیں سُنائے اور مسٹر سین کی لڑکی سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے اُن پر بجلی گر پڑی۔ وہ بالکل مبہوت ہو کر رہ گئے۔ آخر کچھ دیر کے بعد سنبھلے اور نہایت اندوہناک لہجہ میں بولے:۔

"بیٹا! ہمارے بڑھاپے پر رحم کرو۔ بزرگوں کی عزت پر کلنک کا ٹیکا نہ لگاؤ۔ خدانخواستہ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم دُنیا میں کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔"

پال نے اپنی پوری قوتِ استدلال صرف کر دی مگر وہ کسی طرح اُس کی اِس رائے سے متفق نہ ہوتے کہ اس شادی میں کوئی ذلت نہیں۔ پال کا خیال تھا کہ یہ ذلت کا احساس محض ان کا واہمہ تھا اور ان کا خیال تھا کہ پال کی یہ بے معنی گفتگو اس کی فلسفہ دانی کا نتیجہ تھی۔ پال نے جب زیادہ اصرار کیا تو انہیں غصہ آ گیا اور اُنھوں نے پال کو محروم الارث کر دینے کی دھمکی دی۔ پال نے کہا "مجھے آپ کی دولت نہیں چاہیئے۔ صرف آپ کی محبت کا محتاج ہوں۔"

" میری محبت اگر تمہیں عزیز ہوتی تو میری عزت کو خاک میں لانے کا سامان نہ کرتے۔ یاد رکھو نریندر (پال) بوڑھے باپ کا دل دُکھا کر کبھی سرسبز نہ ہو گے۔"

باپ کی مخالفت کے باوجود پال نے مسٹر سین کی لڑکی سے شادی کر لی۔ منصف صاحب اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے۔ اُنھوں نے پال کو اپنی فرزندی سے خارج اور محروم الارث کر دیا۔

شادی کے بعد پال کو اپنی بیوی سے غیر معمولی محبت ہو گئی۔ وہ اپنے انتخاب پر نازاں تھا۔ بیوی بھی اُسے ایک بُت کی طرح پوجتی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے کی صحبت نے ساری دُنیا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ مگر بیدرد فطرت اس معصومانہ مسرت کو برداشت نہ کر سکی۔ پال کی شادی کو ابھی تین مہینے گذرے تھے کہ مسٹر سین پر فالج گرا اور وہ صرف تین دن بیمار رہ کر دُنیا کے خرخشوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئے۔

مسٹر سین کوئی دولتمند آدمی نہ تھے۔ وکالت بھی معمولی تھی۔ بہر حال کام چلا جاتا تھا۔ مگر اُن کی موت نے افلاس کی بھیانک تصویر پال کے سامنے لا کر کھڑی کر دی۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔ باپ سے کسی ہمدردی کی توقع نہ تھی۔ تعلیم بھی ناقص رہ گئی۔ ایم۔اے کے امتحان میں شریک نہ ہو سکا۔ ملازمت ملنا دشوار۔ آمدنی مفقود۔ مصارف مستقل۔ مسٹر سین کا کچھ اندوختہ ابھی موجود تھا جس سے کچھ کام چل رہا تھا۔ اسی اثنا میں لوکل بورڈ کے الکشن کا زمانہ آ گیا۔

اجیت کمار سین مدھو پور کا نوجوان آوارہ منش رئیس، جس کا ابتدا میں ذکر آ چکا ہے اب تک لوکل بورڈ کا چیرمین تھا اور آیندہ کے لئے اُمیدوار۔ مگر اُس کی بد اطواریوں کے باعث سارا مدھو پور اُس سے بیزار تھا۔ پال کا تو اگر بس ہوتا تو اُسے زندہ دفن کر دیتا۔ اُسے دیکھکر پال کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا اُسے اب تحقیق طور پر معلوم ہو چکا تھا کہ پارُل کی ناموسی کا باعث وہی تھا۔ چند ہی روز میں پال مدھو پور کی نوجوان پارٹی میں بہت ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ اجیت کے خلاف اس کی منظم کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوکل بورڈ کا چیرمین نہ ہو سکا۔ اجیت کے لئے یہ انتہائی ذلت تھی کہ خود اپنے علاقہ میں اس طرح شکست کھا جائے۔ وہ پال کے خون

کا پیاسا ہو گیا۔

لوکل بورڈ الیکشن کے دو ہفتے بعد پال کے یہاں چوری ہوئی۔ چور فقط روپیہ کے لالچ میں نہیں آئے تھے کیونکہ وہ گھر کے اور ساز و سامان کے علاوہ کھانے پینے کے برتن تک اٹھا لے گئے۔ پولیس نے حسب معمول بہت دوڑ دھوپ کی مگر چوری کا سراغ لگانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ پال کو یقین تھا کہ یہ حادثہ بھی اجیت کی دشمنی کا نتیجہ تھا۔ مگر ثبوت کہاں ؟ اب دنیا اس پر تنگ تھی۔ رہنے کے مکان کے سوا نقد و جنس میں سے اب کچھ بھی اس کے پاس باقی نہ تھا۔ چند روز قرض دام سے کام چلایا۔ پھر مکان گروی رکھ، بیوی کو ساتھ لے جہانگیر نگر چلا آیا۔ یہاں اسے کمشنر کے دفتر میں ایک چھوٹی سی نوکری مل گئی۔ ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ تنگی ترشی سے گذر ہونے لگی۔ بیوی کی رفاقت، محبت اور خدمت نے اس کے سب غم غلط کر دئے تھے۔ سب تکلیفیں بھلا دی تھیں۔ دونوں کے لئے ایک دوسرے کی صحبت دو جہان کی دولت تھی۔ وہ اپنی غریبی میں خوش اور موجودہ حالات پر قانع تھے۔

پال اور اس کی بیوی کبھی کبھی میرے یہاں آیا کرتے تھے۔ درحقیقت پارل بہت ہی نیک طینت لڑکی تھی۔ شوہر پر اس طرح جان چھڑکنے والی بیویاں دنیا میں زیادہ نہیں ہوتیں وہ میرا بے حد احترام کرتی تھی۔ پال کو اگر کوئی آرزو تھی تو صرف یہ کہ اجیت کو کسی طرح نیچا دکھائے مگر ایک غریب کلرک اور ایک دولتمند زمیندار کا کیا مقابلہ۔ آگ آگ ہوتے ہوئے بھی دریا کو نہیں جلا سکتی۔ اِدھر پال کو تباہ کرنے کے لئے اجیت کی ریشہ دوانیاں برابر جاری تھیں۔

ایک سال اس طرح گذر گیا۔ ایک دن پارل نے مجھے بلا بھیجا۔ میں گیا۔ پال گھر پر موجود نہ تھا۔ پارل نے رو رو کر مجھ سے کہا "پروفیسر صاحب۔ خدا کے لئے آپ انہیں سمجھائیے۔ خدا جانے اس دو تین مہینے میں انہیں کیا ہو گیا ہے۔ ان کی وہ طبیعت ہی نہیں رہی۔ رات کو بارہ بجے گھر آتے ہیں۔ رات مجھے اُن کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ خدا جانے کس کی صحبت نے اُن کا یہ حال بنا یا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہاں جاتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ پوچھتی ہوں تو بگڑتے ہیں۔ دو دو دن بات نہیں کرتے۔ دفتر سے آئے۔ چائے پی اور چلے گئے۔ میں آدھی آدھی رات تک بیٹھی ان کا انتظار کیا کرتی ہوں۔"

پارل کی یہ حالت دیکھکر اور پال کے واقعات سُنکر مجھے بے انتہا صدمہ ہوا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پال جیسا جوانِ صالح اس قسم کے افعال کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ بہر حال دوسرے دن میں نے تنہائی میں پال کو بہت سمجھایا۔ وہ میرا بہت احترام کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ آیندہ کبھی اس قسم کی کوئی بات آپ میرے متعلق نہ سُنیں گے۔ مگر افسوس کہ یہ صرف وعدہ ہی وعدہ تھا۔

اُسی زمانہ میں میں ولایت چلا گیا تقریباً دو سال وہاں قیام رہا۔ ہندوستان واپس آنے سے کوئی چار ماہ قبل لندن میں ایک بنگالی نوجوان مسٹر بھٹا چارجی سے میری ملاقات ہوئی اور چند ہی روز میں خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ وہ اجیت کمار کو اچھی طرح جانتا تھا بلکہ ایک زمانہ تک اُس کا راز دار دوست رہ چکا تھا۔ جوش انتقام نے اجیت کمار کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اُس نے پارل اور پال کو تباہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ اُسے ایک مناسب آلۂ کار کی ضرورت تھی جس کی مدد سے وہ اپنے شیطانی ارادوں کی تکمیل کر سکے۔ اُس کی نظر انتخاب بھٹا چارجی پر پڑی۔ بھٹا چارجی کی اندھی جوانی اور ہوسناک فطرت ہر طرف نفس کی لذتوں کو ڈھونڈھتی تھیں۔ اجیت کمار

نے اُسے سب کچھ دیا اور اُس کی انسانیت، اُس کی شرافت اُس کا ضمیر، سب کچھ اُس سے لے لیا۔ بھٹا چارجی کو معلوم نہ تھا کہ پارُل اور پال سے میرے تعلقات اتنے گہرے تھے۔ میں نے خود بھی اس حقیقت کو اُس سے چھپایا۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنی شرمناک سیاہکاریوں کی داستان مجھے سُنا دی۔

بھٹا چارجی پال کے دفتر میں ملازم تھا۔ اجیت کمار کے ایما سے اُس نے پال سے دوستی کی۔ پھر اُسے گھر بلا یا اپنی خوبصورت اور جوان "بیوی" رینوکا سے اُسے ملایا۔ رینوکا دراصل اس کی بیوی نہ تھی۔ اجیت کمار کی ایک داشتہ تھی۔ بہت خوبصورت۔ بلا کی طرّار دل موہ لینے کے ہزاروں گر اُسے یاد تھے۔ پال نے اوّل اوّل بہت ہمت سے کام لیا۔ حسن کی بجلیاں کوندتی تھیں اور تڑپ تڑپ کر اُس پر گرتی تھیں مگر اس کی آنکھ تک نہ جھپکتی تھی۔ رینوکا اپنے حُسن و شباب اور نسوانیت کے تمام حربے استعمال کر رہی تھی مگر پال کی شرافت کسی طرح مغلوب نہ ہوتی تھی۔ لیکن پال انسان تھا۔ فرشتہ نہ تھا۔ یوسف کی طرح معصوم فطرت لیکر پیدا نہیں ہوا تھا۔ رینوکا کی فتنہ کاریوں نے زلیخا کی عیاریوں کو مات کر دیا۔ پھر بھی پال سنبھلا رہا۔ حُسن کا جادو اُس پر نہ چلا۔ لیکن رینوکا کے مسلسل آنسو آخر اُسے بہا لیگئے۔ اُس کے قدم ڈگمگا گئے۔ اُس نے لاکھ سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ وہ گرا اور بُری طرح گرا۔ آہستہ آہستہ رینوکا نے اُسے شراب پر لگالیا اور اتنی پلائی، اتنی پلائی کہ وہ دُنیا و مافیہا سے بیخبر ہو گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ پارُل کو بھی بھول گیا۔

اب شراب اُس کی زندگی تھی یا رینوکا کے آغوش کی گرمی۔ لیکن رینوکا کا کام ہو چکا تھا۔ اُس نے ہاتھ کھینچ لیا اور پال کو مفت کی شراب ملنی بند ہو گئی۔ آمدنی ناکافی خرچ زیادہ۔ قرض کے سوا چارہ نہ تھا۔ بھٹا چارجی کی معرفت بلا ضمانت روپیہ ملنے لگا۔ یہ روپیہ اجیت کمار کا تھا۔ چند مہینے اس طرح گذرے۔

اس کے بعد قرض کی بدولت پال جیل میں تھا اور پارُل بے یار و مددگار، بیکس و تنہا۔ نانِ شبینہ کو محتاج۔ اور اس کے بعد؟ اس کے بعد وہی جو دولت کی زبردستی افلاس کی بےبسی اور مرد کی ہوسناکی نے عورت کو بارہا بنایا ہے یعنی ایک بے ناموس عصمت فروش۔ یہ تمام واقعات سُنکر مجھے جسقدر صدمہ ہوا بس میرا ہی دل جانتا ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا۔

ولایت سے واپسی پر جسدن میں کلکتہ پہونچا وہاں ایک بنگالی فلم "بیتیا" (طوائف) کی بڑی دھوم تھی۔ بعض دوستوں کے اصرار سے میں بھی دیکھنے گیا۔ اس تصویر میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ہوسناک امیروں کی بدولت کس طرح بھولی بھالی شریف زادیاں طوائفیں بن جاتی ہیں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ خود پارُل نے ہیروئن کا پارٹ کیا ہے اور قصہ خود اُس کے اپنے واقعات زندگی تھے۔ میں بہت ہی افسردہ خاطر تماشاگاہ سے نکلا۔ میری آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں مگر مجھے یقین ہے کہ پارُل اور پال کے واقعات زندگی کے سوا اور کچھ بھی اُس وقت مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ سڑک کے کنارے ہم ٹھہر گئے۔ ٹرام کا انتظار تھا کہ یکایک برابر والے موڑ پر ایک چیخ کی آواز سُنائی دی۔ کوئی شخص ایک موٹر سے ٹکرا گیا۔ لوگ دوڑ پڑے۔ میں بھی لپکا۔ وہ آدمی بُری طرح موٹر سے کچل گیا تھا۔ اس کے بدن سے خون کی ندی بہ رہی تھی۔ موٹر کا مالک موٹر سے اُترا۔ اُس کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی۔ اُس نے جھک کر زخمی کو دیکھا بے اختیار ایک چیخ اُس کے مُنہ سے نکلی، اور وہ لڑکھڑا کر زخمی پر گر پڑی۔ زخمی نے سر اُٹھایا۔

غور سے اُسے دیکھا اور ایک بڑی درد ناک کراہ کے ساتھ کہا۔ "پارل!" میرے ہوش اُڑ گئے۔ آگے بڑھکر میں نے اُسے دیکھا۔ یہ پارل تھا۔ چند منٹ کے بعد اُس نے دم توڑ دیا۔

پریم پجاری

سوچ

صحن چمن میں گھوم رہا ہوں — پتی پتی چوم رہا ہوں
کیا سوچوں یہ سوچ رہا ہوں — کیا دیکھوں اور کیونکر دیکھوں
کوئل کوکے شور مچائے، — ڈھب سُننے کا کون بتائے
کلی کلی کہتے ہیں حسیں ہے — دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے
دُھوپ سے دھوئے ہوئے نظارے — عرش پہ سورج فرش پہ تارے
دُور پہاڑوں کی دیواریں — سوئی ہوئی دیووں کی قطاریں
برف کی چادر اوڑھ رکھی ہے — دھوپ بھی جس پر کانپ رہی ہے
گونج رہے ہیں ندی نالے — جھوم رہے ہیں جنگل کالے
یہ میدان یہ وسعت اس کی — یہ آہو یہ وحشت اس کی
یہ کُٹیا کھیتوں کے کنارے — یہ بیلیں شیشم کے سہارے
بیری اک ڈھیری پہ کھڑی ہے — جڑ سوکھی اور شاخ ہری ہے
چڑیا ڈھونڈھ رہی ہے دانہ — بیلوں پیچھے ہے کاشانہ
بھونرا کلی کلی منڈلائے — رس چوسے گائے اُڑ جائے
رقصاں ہے جھاڑی پہ شبنم — جھونکا آیا شاخ ہوئی خم
لاش اُسکی مٹی پہ پڑی ہے — شاخ اُدھر حیران کھڑی ہے
وہ آتے ہیں چند شکاری — فائر کرتے باری باری
بھاگ اُٹھی ہرنوں کی ٹولی — زخمی ہرنی پیچھے ہولی،
سب کو اپنی جان ہے پیاری — ہانپ گئی ہرنی بیچاری
اک بدلی آئی لہراتی — کھیتوں پر بوندیں برساتی
دھرتی سب سیراب ہوئی ہے — میری کھیتی خُشک پڑی ہے
بُلبُل اک ڈالی پر بولی — پھول سے کھیلی آنکھ مچولی
جب تتلی اس پھول پہ ناچی — بُلبُل کیوں پر جوڑ کے چلدی
اک چرواہی گاتی آئی — اوڑھنی وہ سبزے پہ بچھائی
خوب مزے سے سو جائیگی — پل میں گم سُم ہو جائے گی
اِک چرواہا روتا آیا — اِک دلدوز ترانہ گایا
بھیڑیں آنکھیں جھپکاتی ہیں — چرتے چرتے رُک جاتی ہیں
خاک چلے ادراک کا چارا — اِن سے کیا مطلب ہے تمہارا
ان پردوں میں کون چھُپا ہے — اور یہ سب جلوہ کس کا ہے
سُنتا ہوں چُپ ہو جاتا ہوں — دیکھتا ہوں اور کھو جاتا ہوں
سوچتے سوچتے تھک جاتا ہوں — کیا کیا سوچوں کب تک سوچوں

سوچ کا ہی مطلب سمجھا دے
یا یہ پردوں کو آگ لگا دے

احمد ندیم قاسمی

لال مُہر

(زیرِ تصنیف ناول کا ایک دلچسپ حصہ)

حمیدہ

...... مجھے غور سے اور بہت غور سے دیکھکر بولے "معاف کیجیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں" اور جب میں نے مسکراتے ہوئے گلاس آگے بڑھایا تو گلاس کو لیتے ہوئے بولے "کہیں دیکھا ہے ...."

"خوب!" میں نے کہا "حضرت اتنی جلدی بھول گئے ..... وہ جھیل کے کنارے جب آپ کی والدہ ساتھ تھیں اور ہم اور آپ یہی شغل کر رہے ....."

"اوہو! .... بس بس پہچان گیا۔ لاحول ولاقوۃ"

میں نے کہا "وہ کچھ بھی سہی آپکی والدہ معظمہ ....."

کہنے لگے "آپ نے تو اس روز خوب مدد کی"

میں نے کہا "وہ آپ کا قصہ ادھورا رہ گیا۔ مجھے تو آپ وہ سنا دیجیے ....."

ایک گھونٹ پیتے ہوئے بولے "تو وہ قصہ کہاں پر چھوڑا تھا؟"

میں نے مختصراً قصہ[1] بتایا اور اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے پھر اُن سے تقاضہ کیا کہ آگے بتائیں کہ وہ کون لڑکی تھی۔ میرے اصرار پر اُنہوں نے اپنا قصہ جاری کیا۔ کہنے لگے:۔

.... جی ہاں .... میں حیرت میں رہ گیا کہ یہ لڑکی یہاں کہاں سے آئی۔ دراصل اِس لڑکی کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ بھی عجیب وغریب طرح۔ اور اس کے لئے میں اپنی زندگی کا ایک دلچسپ ترین واقعہ سناتا ہوں:۔

انٹرنس پاس کرنے کے بعد ہی خیال آیا کہ ولایت جائیں۔ وظیفہ کی کوشش کیلئے تعطیلات میں ایک ریاست میں پہونچے اور وہاں ایک دوست کے ماموں کے یہاں ٹھیرے۔ بالکل انجان مقام اور سب سے زیادہ ٹیڑھا پر وگرام اس قیام کا یہ تھا کہ ڈیڑھ میل سے زائد فاصلہ طے کر کے صبح تڑکے ہی لاری کے اسٹیشن پر اس تحقیق کے لئے جانا پڑتا تھا کہ بذریعہ لاری کوئی خط تو نہیں آیا آپ کہیں گے یہ تو کوئی دشواری نہیں، ایک نوعمر طالبعلم کیلئے صبح اتنی ورزش ضروری ہے لیکن مؤدبانہ عرض ہے کہ مصیبت دراصل یہ ہوتی تھی کہ لاری کے آتے ہی نامہ بر خط کو لاری کے اسٹیشن ماسٹر صاحب کے حوالے کر دیتا تھا جو میرے خاص کرم فرما تھے اور جن کی عنایات بے پایاں کے سبب یہ ڈاکخانہ قائم ہوا تھا۔ یہ حضرت جلد از جلد لاری کا کام ختم کر کے ڈیوٹی سے فوراً الگ ہو کر دنیا کا ایک اور ہی مزہ لوٹتے تھے یعنی پائخانہ چلے جاتے تھے اور بلا مبالغہ وہاں اتنی دیر قیام فرما ہو کر حقہ نوش کرتے کہ آپکو بھی شبہ ہو کہ شاید آج ہی حوائج ضروریہ سے متعلق کل تمنائیں پوری کر رہے ہیں! ایک روز کا ذکر ہے کہ حقہ کی آواز

---

[1] ساقی مورخہ دسمبر ۳۵ء سے سابقہ باب کی متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے تاکہ وہ حضرات بھی قصہ کا پورا لطف اٹھا سکیں جنہوں نے وہ قسط نہیں پڑھی ہے:۔

صبح کے چار بجے ہونگے جب میری آنکھ کھلی۔ سوتے وقت بجلی گل کر دی تھی۔ آنکھ اس طرح کھلی کہ گرمی کی وجہ سے سخت پیاس معلوم دی۔ میں آہستہ سے اُٹھا اور بستر سے نکل کر بجلی روشن کی تاکہ صراحی دیکھ سکوں کہ کدھر ہے۔

بجلی جلنا تھی کہ میں ششدر رہ گیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ آپ یقین کریں کہ وہ بشرخ وسفید آتش کا پرکالہ غائب! وہاں تو کوئی نوعمر لڑکی محوِ خواب تھی۔

پانی پینا چھوڑ چھاڑ میں قریب آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حد درجہ معصوم اور مظلوم سا چہرہ۔ چہرے سے بھولا پن اور بچپن ٹپک رہا تھا۔ اچھا گورا رنگ اور نہایت ہی تیکھے نقشہ۔

ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ کلبلا کر جاگ اُٹھی اور روشنی کے سبب اُس نے آنکھیں مچکائیں اور مجھے دیکھا ہے کہ ایک دم سے وہ اُچھل پڑی۔ ایک دبی چیخ اُس کے منہ سے نکلی اور انتہائی بدحواسی کے ساتھ اُٹھکر بھاگی۔ اور دروازہ کھول کر اندر غائب! میں حیرت زدہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے اور آہستہ سے دروازے کی طرف بڑھا ......"

بند ہوگئی۔ میں دیر میں آیا۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دیر سے حقہ کی آواز بند ہے لیکن جب اتنی دیر لگی کہ میں سمجھا کہ لوگ مجھے احمق بنا رہے ہیں اور کہیں چلے گئے، تو مجھے تحقیقات کی ضرورت پیش آئی۔ خاکسار کو بسلسلۂ رفع تشویش اندر جھانکنا پڑا۔ مؤدبانہ عرض ہے کہ جھانکا تو نیک نیتی سے تھا لیکن آنجناب اس تفتیش کے لئے غالباً قطعی تیار نہ تھے! ہاتھ بھر اچھل پڑے، حقہ گر گیا، چلم پھوٹ گئی اور اسی حادثہ کا سب سے بدتر اور تاریک پہلو یہ رہا کہ "باقی پھر" یعنی اس روز کا بقیہ لطف سوخت! مجبوراً میری جان پر صبر کر کے بقایا ڈال دی۔

وہاں سے جب نکلتے تو ایک آدمی پنڈلیوں پر مالش کرتا اسکے بعد مجھے خط ملتا۔ ظاہر ہے کہ عین وقت پر پہونچنا میرے لئے کس قدر محال ہوگا اور پھر یہ کہ اس ڈاک کی ڈلیوری کا مدار بد قسمتی سے ان حضرت کی افیون اور مرغنیات پر رہ گیا اگر شب کی غذا کم مرغن ہوئی تو اِس خاکسار کی آفت آگئی، بیٹھے بیٹھے سڑ گیا جب جا کر خط پایا۔ مجھے اس ڈاکخانہ کے انتظام نے قریب قریب اس مقام سے بیزار کر دیا تھا کہ ایک اور ہی معاملہ پیش آیا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ اسی ڈاک سے خط آیا اس خط میں بسلسلۂ سفارش ایک اور صاحب کے نام خط تھا اور میرے لئے ہدایت کہ یہ خط دیکر اُن سے مل لوں۔

کوئی دس بجے ہونگے جو میں سفارشی خط لیکر نسبتاً ایک بڑی بستی کے پاس پہونچا۔ مجھے باریابی تو نہیں ہوئی مگر نوکر نے ایک خط ایک اور حضرت کے نام دیا اس ہدایت کے ساتھ کہ میں یہ خط اُن کو دیکر ان سے ملوں۔ اب یہ ڈاکخانہ در ڈاکخانہ کا عمل درآمد میرے لئے باعثِ کوفت تھا اور بہت ممکن ہے کہ میں اس قصّے کو یہیں چھوڑ بھاگتا اگر میرے ساتھ ایک اور نوکر نہ بھیجا جاتا۔ اس [illegible] کے ساتھ کہ جاؤ آپ کو مجسٹریٹ صاحب کا گھر بتا دو۔

اِس ناہنجار نوکر نے ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے اجازت چاہی اور چلدیا۔ میں مکان کے دروازے پر پہونچا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مکان کو بوسیدہ کہوں یا کہنہ یا دونوں۔ بہرصورت میں نے زنجیر ہلائی۔ بمشکل تمام ایک لڑکا آیا۔ معلوم ہوا مجسٹریٹ صاحب موجود ہیں۔ میں نے خط دیدیا اور جواب کا منتظر کھڑا رہا، اس لئے کہ دروازے پر سوائے چوکھٹ کے اور کوئی مقام نشست کا نہیں تھا۔

لیکن مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بہت جلد ایک عجائب گھر میں رکھنے والی شے یعنی مجسٹریٹ صاحب تشریف لائے۔ عجیب و غریب حلیہ،

روئی کا پاجامہ، روئی کا شلوکہ، کرتا غالباً پائجامہ کے اندر۔ سر پر ایک عجیب و غریب پگڑی اور خضاب کا ڈھاٹا کسا ہوا۔ ایک عجیب انداز سپاہیانہ جس میں خمیدگی اور کہنگی نے عجیب رنگ پیدا کر دیا تھا اور بائیں ہاتھ میں تلوار اس انداز سے کہ اگر تلوار نیام میں نہ ہوتی اور وہ ہنستے نہ ہوتے اور ملاقتو ہوتے تو شاید میں بھاگ کھڑا ہوتا۔

میں نے مؤدبانہ سلام کیا۔ ہنس وہ پہلے ہی سے رہے تھے، بڑی محبت اور شرافت سے بڑھکر بجائے زبانی جواب دینے کے مجھے گلے لگا لیا وہ بھی اس سپاہیانہ شان سے کہ میرا جسم اُن سے ہاتھ بھر دور ہی رہا اور خضاب کے ڈھاٹے کو کرید کر ہاتھ کے اشارے سے اندر چلنے کو کہا۔ اور زبان سے صرف اتنا ہی کہا "آہ" (آئیے) جو تیسری دفعہ میں سمجھ سکا جب انہوں نے اسکے ساتھ یہ بھی کہا کہ "تشریف لائیے"۔

اندر سے عورتوں کے بولنے کی آواز آرہی تھی، لہٰذا میں قدرتاً ذرا جھجکا لیکن اُنہوں نے مُسکرا کر "آہ! آہ!!" کا سلسلہ باندھ دیا۔ اور کہا کہ "عزیزم آتے کیوں نہیں"! اور یہ کہکر میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا۔ ہم دونوں چلے۔ یہ تو زنانے مکان کا اندرونی حصہ تھا۔ مکان اندر سے بھی نہایت خستہ اور بوسیدہ تھا بلکہ بائیں طرف بادشاہی اینٹوں کا ایک ٹیلہ تھا جو دیوار کی بلندی تک چلا گیا تھا۔ داخل ہوتے ہی داہنی طرف باورچی خانہ تھا۔ سامنے کشادہ صحن اور ایک صاف ستھرا کمرہ۔ مکان میں عورتیں نظر نہیں پڑیں اور میں یہ سمجھا کہ پردے میں ہونگی۔ داخل ہوتے ہی مجسٹریٹ صاحب نے آواز دی "ارے بھئی چائے لاؤ"۔ مجسٹریٹ صاحب نے مجھے لیجا کر کمرے میں بٹھایا جس میں سفید فرش تھا۔ کمرے کے تین دروازے تھے جن میں سے ایک غالباً ہوا روکنے کیلئے بند تھا اور ہم اس طرح بیٹھے تھے کہ بقیہ گھر میں اگر عورتیں گھومیں پھریں تو بے پردگی نہ ہو۔ ہم بیٹھے ہی تھے کہ ایک طوفان زدہ شریف صورت بوڑھی خاتون اندر تشریف لائیں اور میرے حواس جاتے رہے جب مجسٹریٹ صاحب نے کہا کہ "یہ تمہاری چچی ہیں"! اس عالمِ بدحواسی میں سلام کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ لیکن جب اُنہوں نے دُعا دی تو مجھے سلام کرنا پڑا۔ اور فوراً میرے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے جب اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "نتا بھیا تو اچھے ہیں"! میری خوش قسمتی کہ فوراً ہی اُن پر رقت طاری ہوگئی اور اُنہوں نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوتے ایک سرد آہ بھر کر کہا "خاک پڑے پردیس پر اپنے پیارے ایسے چھُٹے کہ صورتوں کو ترس گئے۔ عمر جنم میں تو اس بچے کو آج دیکھا ہے"!

مجسٹریٹ صاحب اس موقع پر ڈھاٹے کو کرید کر ایک عجیب انداز سے ہنسکر بولے "خیر اب تو دیکھ لیا"! پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میاں

ان سے تمہارا دُہرا رشتہ ہے۔ ایک تو تمہاری یہ چچی ہیں اور دوسرے رشتہ سے تمہاری یہ پھوپی بھی ہوتی ہیں اس لئے کہ......" (رشتہ کی تفصیل بھول گیا۔)

میں عرض نہیں کر سکتا کہ اس وقت میرا کیا حال تھا، ورنہ میں اُٹھ کر قطعی بھاگ گیا ہوتا اگر کہیں اس قدر وسیع صحن نہ ہوتا اور کچھ عورتیں وہاں اور نہ آگئی ہوتیں اور جوتا پہنے ہوتا۔ مجسٹریٹ صاحب نے چائے کا سخت تقاضہ کیا اور یہ خاتون بولیں کہ آتی ہے اور آواز دی کہ "حمیدہ جلدی لاؤ!" یہ کہکر وہ چلی گئیں، اور پھر جو مجسٹریٹ صاحب نے مجھ سے باتیں کیں تو میرا یہ حال ہو گیا کہ میرا دل انجن کی طرح دھڑک رہا ہے۔ وہ اپنے کسی دُور کے عزیز کے دھوکے ہیں مجھ سے مل رہے تھے۔ میرے والد کا نام انہوں نے نبی اللہ بتایا جو قطعی غلط خود مجھے رفیع اللہ سمجھ رہے تھے درحالیکہ میں قطعی کوئی اور!!

گھبراہٹ کے سبب میرا سر چکرا رہا تھا اور میں نہیں سمجھتا کہ کیا اُنہوں نے پوچھا اور کیا میں نے بتایا۔ اور قبل اس کے کہ طلسم ٹوٹے از خود یا میں قصداً توڑوں، حمیدہ چائے لیکر آئی۔ ایک انتہا سے زیادہ خوبصورت اور نوجوان لڑکی۔ مجسٹریٹ صاحب ہنسکر بولے "یہ بھی کل ہی آئی ہے" ان سے بھی تمہارا دہرا رشتہ ہے۔ ماں کی طرف سے تو یہ تمہاری بہن ہوتی ہیں اور ایک رشتہ سے ہوتی ہیں...... ن......ن...... خالہ کی نواسی!"..

(قہقہہ کی کوشش)

ذرا غور فرمایئے گا کہ میری دماغی حالت کیا ہوگی۔ نواسی چھوڑ وہ میری پرنانی ہوتیں پر میں اس مصیبت میں نہ ہوتا، اے کاش۔

زدوکوب کا تخیل اوّلاً کس قدر پاکیزہ پھر اس خوبصورتی سے پٹنا! کس قدر تاریک مستقبل تھا اور مستقبل بھی کہاں زمانہ حال کا بھی باپ! جی حضرت ابھی! بہت جلد!!۔

(۲)

مگر غور کیجئے، یہ تو حالت اور ان حمیدہ کے حُسن کی تابانی!...

مجھے اُنہوں نے شرما کر سلام کیا میں نے بھی مکھی مار کر سر جھکا دیا۔ چشم زدن میں اُنہوں نے ایک دسترخوان تیزی سے بچھا کر اس پر چائے مع ناشتہ چُن دی۔

صحت اور تندرستی کا یہ عالم کہ جھکی جو بھی تو چہرہ اس قدر لال کہ معلوم ہو خون اب ٹپکا اب ٹپکا اور اُٹھی تو چہرے پر سفید اور سرخ رنگ کی آنکھ مچولی کا نقشہ پیش ہو گیا۔ اس مصیبت کے عالم میں بھی میں اس حسن و جمال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

دسترخوان کے لوازمات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ گویا پیشتر سے تیاری تھی لیکن اس دسترخوان کی سب سے زیادہ قابل غور اُس کی خطرناک پوزیشن تھی جس نے راہِ فرار اس طرح مسدود کر دی تھی کہ یا تو ایک ڈیکس کو پھاندو یا پھر دسترخوان پر سے بھاگو۔

"میں تو صرف ایک پیالی..." کہکر مجسٹریٹ صاحب نے مجھے دعوت دی۔ اب میری حالت عجیب تھی۔ معاملات اُلجھتے چلے جا رہے تھے۔ کیا کرتا متوجہ ہوا۔

کہتے ہیں کہ کسی گھر میں چور گھس گئے، جب راہ فرار کی مسدودی کا یقین ہو گیا تو اُن کی گھبراہٹ جاتی رہی اور اُنہوں نے کھانے کی الماریوں کا جائزہ لیا اس اطمینان سے کھانا شروع کیا کہ آگ جلا کر انڈے تک تلے اور چٹنی پیسی۔ اور اب میں یہ سوچنے لگا کہ مرد اور کوئی نہیں ہے۔ یہ خود زدوکوب چاہے محض اس دسترخوان کے عوض منظور۔ حمیدہ کی نوازشیں وہ کھاتے ہیں۔

مجسٹریٹ صاحب ایک پیالی گرما گرم پی کر ذرا سے دانت نکال کر "ایں......" کر کے چلے "ابھی حاضر ہوا ذرا چوکی پر ہو آؤں...... جا ہی رہا تھا...... اب تو آپ اطمینان سے بیٹھئے" مجسٹریٹ صاحب کی ادا ملاحظہ ہو بیت الخلا جا رہے ہیں مگر تلوار ساتھ لئے گئے۔ ہنس کر بولے "یہ عمر آئی کبھی ہاتھ سے تلوار نہیں چھوٹی"

وہ چلے گئے تو میں نے سوچا کہ اب موقع ہے اور نکل جاؤں۔ اس طرح کہ آواز دیکر عورتوں کو ہٹا دوں کہ ایک لمحہ کے لئے باہر جانا ہے لیکن یہ خیال دل میں آیا ہی تھا کہ حمیدہ داخل ہوئی۔ میں اُس کے ملکوتی حُسن کو پھر دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ پیازی رنگ کا دوپٹہ کس قدر چہرے کو خوبصورت بنائے ہوئے تھا۔ اُنہوں نے ایک چٹنی سی پیالی میں رکھی لاکر کھڑے جھک کر۔

عمر میں پہلی مرتبہ مجھ پر کسی عورت کے حُسن نے غالباً اثر کیا۔ میں اُن کے کان کے آویزے غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے [illegible] "یہ کیا ہے؟" (اسی چٹنی کی طرف اشارہ کر کے)

مُسکرا کر بولیں "پہچانیئے"

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، میں نے اُٹھا کر پیالی دیکھی۔ بولیں "چکھئے...... چکھئے"

میں نے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ چہرے پر تبسم کی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ میں مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ اُنہوں نے جھٹ سے ایک چمچہ اُٹھا کر پیالی میرے ہاتھ سے لی۔ اُنگلی اُن کی میرے ہاتھ میں لگی ہے کہ چنگاری!۔

انہوں نے ایک چمچی میں اس چٹنی کو لیکر مجھے دیا۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میں عشق و محبت کے کوچے سے قطعی نابلد تھا لیکن ایک عالم بے اختیاری میں اس چمچی کو لیکر میں نے چوم لیا!! اور اُن کے چہرے کی طرف پھر جو نظر کی تو اُن کے پُرنور چہرے پر ایک بجلی سی چمکی اور ایک تڑپ کے ساتھ وہ غائب!

اس موقع پر ہوا کی ایک رمق کے ساتھ ایک خط ڈیکس پر سے گرا۔ یہ تو وہ خط تھا جو میں لایا تھا۔ میں نے اُٹھا کر دیکھا اور پھر گھبرا گیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ "عزیزی رفیع اللہ" یہ ہیں "حسب وعدہ وقت پر حاضر ہوئے ہیں۔ (یعنی چائے پینے) خاص بات یہ تھی کہ "آپ ان کا عندیہ حمیدہ کے بارے میں لیلیں بقیہ پھر میں طے کر لونگا......"

اس خط سے پریشانی یوں بڑھی کہ یہ دھڑکا لگا کہ اصل رفیع اللہ نہ آتے ہوں۔ دراصل اب تک نہ آئے تھے، تعجب تھا مگر وہ جو انگریزی مثل ہے (میں)

آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ وہ آگئے!! دروازے پر دستک میں نے سُنی اور کسی کو یہ کہتے سُنا کہ کوئی آیا ہے خط لیکر۔ خدا کی پناہ۔ حیران کہ کیا کروں مجبوراً آہستہ سے آواز دی "ذرا سُنیئے گا!" اور لپک کر اپنا جوتا پہننے لگا۔

"بیٹھئے، بیٹھئے" میری آواز کے جواب میں حمیدہ کو شاید آنا پڑا۔ مُنہ ذرا موڑے ــ میں بھی جان پر کھیل گیا۔ میں نے کہا "آپ ہنستی کیوں ہیں" اس دلچسپ ریمارک کا جو طوفان خیز نتیجہ ممکن تھا اُس سے میں بمشکل لُطف اندوز ہو سکا تھا کہ اصلی رفیع اللہ کے ساتھ مجسٹریٹ صاحب مع تلوار ہاتھ میں گرج کر حمیدہ کو جھڑکتے ہیں "ہٹ وہاں سے" اور عورتوں کو آواز "....ہٹو...."

میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کچھ اور کرنا چاہیئے تھا جو میں نے کیا وہ بتاتا ہوں۔ میں جان پر کھیل کر بھاگا اور اصل رفیع اللہ اور مجسٹریٹ صاحب نے میرا راستہ روکا۔

"بدمعاش... پکڑو" مجسٹریٹ صاحب نے کہا "لینا..." اور تلوار سونت کر ایسے کھڑے ہوئے کہ اگر جھپٹ کر نکلتا ہوں تو وار ہوتا ہے داہنی طرف اینٹوں کا ڈھیر تھا سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اس پر چڑھ کر دیوار پھاند جاؤں یہی کیا۔ پر اینٹوں پر چڑھتا ہوں دو قدم تو اینٹوں سمیت کھسکتا ہوں ایک قدم، اور پھر شور و غل سے حواس غائب تھے ہی کہ مجسٹریٹ صاحب کی شمشیر زنی شروع ہو گئی۔ ایک تلوار ایسی پڑی کہ میرے جوتے کے اندر پیر میں چوٹ محسوس ہوئی۔

قصہ کو اس طرح مختصر کرتا ہوں کہ میں چڑھ گیا اور دیوار کود اہوں کہ اُدھر سے شور مچاتے لوگ تعاقب میں۔ ذرا بڑھا تھا کہ ایک سیٹھ جی ادھر سے آتے تھے، لوگوں کے شور پر مجھے گرفتار کرنے لگے۔ خاصی چپقلش ہوئی، جس میں اُن کی پگڑی لُٹ گئی۔ اور بمشکل جو میں نکل کر بھاگا تو سامنے کی گلی میں گھس کر جو میدان آیا ہے تو بھاگا ہی چلا گیا۔ اور اتنا بھاگا کہ تھک کر چُور ہو گیا۔ اپنے مشن سے یونہی دل برداشتہ تھا جلسے قیام پر آ کر منٹوں میں اجازت حاصل کر اسٹیشن پہونچا اور وہاں سے آدھ گھنٹہ کے اندر اندر وطن روانہ ہو گیا۔ یہ سوچتا ہوا کہ ولایت جانے کی کوشش کی بال بال بچے ورنہ مجسٹریٹ صاحب نے تو عدم کا راستہ دکھا ہی دیا تھا۔ پھر ایک عرصے بعد میں نے اُس کو جس طرح دیکھا وہ بھی قصہ دلچسپ ہے، اور اس وقت کہ شغلِ شراب ہو رہا ہے خُوب لُطف دیگا۔

میں نے کہا "بخدا ضرور لُطف دیگا، سُنائیے سُنائیے"

(۳)

اُنہوں نے کہا "یہ جب کا ذکر ہے کہ میں سکنڈ ایر میں پڑھتا تھا، دو اور دوستوں کے ساتھ ریل میں سفر کر رہا تھا۔ ہم تینوں جس بنچ پر بیٹھے تھے اُس کی پُشت پر اسی ڈبہ کا بڑا حصہ تھا بیچ میں جنگلہ سلاخوں کا تھا۔ ہم باتوں میں مشغول تھے کہ ایک دم سے تازہ مٹھائی کی خوشبو سے دماغ مہک گیا۔ مُڑ کر جو دیکھتے ہیں تو ایک بڑے سے ٹوکرے پر کاغذ کسے ہوئے، اور دو ایک مقام اسی قدر "خطرناک"، قسم کے لڈو بالوشاہی اور اسی قسم کے معطر معنبر حضرات جھانک رہے تھے کہ رال ٹپک پڑی۔ دو تین رئیس مہاجن بیٹھے تھے اور اُنہیں کے ساتھ ایک مسلمان ہو بہو چڑی کے بادشاہ۔ ڈاڑھی چڑھی ہوئی اور اس انتظام سے کہ دو طرفہ بالوں کو گھما کر سائیکل کے ہینڈل کی شکل کی دو نلکیاں قائم کی گئی تھیں۔ سائیکل کے ہینڈل پر سیاہ سیلولائڈ کا چکنا چکنا چمکتا ہوا خول جو چڑھایا جاتا ہے بالکل اسی شکل کے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی روغن میں گوند ملا کر اندر سے ان کو لکڑی ڈال کر کھوکھلا بنایا ہے اور بنانے میں وہ صفائی دکھائی تھی کہ سر دست مٹھائی چھوڑ کر کم از کم میں اس عجیب و غریب ڈاڑھی اور اس کے سائیکل کے ہینڈلوں کو دیکھنے لگا۔ خضاب سے کالی ڈاڑھی تھی، چہرہ چُرخ سا گمر بدن کسا ہوا سینہ اُبھرا ہوا۔ ایک انداز سے ترچھا صافہ باندھے انگرکھا پہنے ڈٹے ہوئے تھے۔

بہت جلد ہم لوگوں نے چُپکے چُپکے ٹوکرے میں سے مٹھائی نکال نکال کر کھانا شروع کی۔ ایک دو اسٹیشن یہ حرکت جاری رہی اور ہمیں کیا خبر معلوم کہ مالکان مٹھائی اور خود چڑی کے بادشاہ اس تاک میں ہیں کہ خود پکڑیں۔ چڑی کے بادشاہ ایک اسٹیشن پر اُتر کر جگہ بدل کر پکڑنے پر تعینات ہو چکے تھے۔ میری تقدیر کہ میں ہی پکڑا گیا۔ ایکدم سے بازو کی طرف سے جھپٹ کر چڑی کے بادشاہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اب ہونے لگی رستا کشی

اور رہٹر۔ مگر میرا ہاتھ پورا کا پورا بغل تک اندر جا چکا تھا اور مزید کشمکش کو ان چڑمی کے بادشاہ (خانصاحب) نے اس طرح روک دیا کہ ہاتھ کو ایسے ٹیڑھا کیا کہ اگر ذرا زور کروں تو ٹوٹ جائے۔ منہ میرا جنگلے سے ایسا بھڑا کہ ہٹانا دشوار۔ خفت، پریشانی، شرمندگی، تکلیف اور اگلے اسٹیشن پر پولیس کے حوالے کئے جانے کا خوشگوار خیال۔ اب بہتیرا لوگ خانصاحب سے سفارش کرتے ہیں کہ چھوڑ دیجئے۔ لڑکے ہیں۔ طالب علم ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہ نہ مانے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں کس کر کلائی سے باندھ لیا اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھ گئے۔ زمین پر ایک کچلی ہوئی مٹھائی کی ڈلی بطور شہادت پڑی تھی جو میرے ہاتھ سے چھوٹ پڑی تھی۔

میں نے نرمی سے صرف یہ درخواست کی کہ ہاتھ ذرا ڈھیلا کیا جائے تاکہ میں سیدھی طرح بیٹھ سکوں مگر وہ بھی نامنظور کر دی گئی۔ اب خانصاحب نے نئی روشنی والوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا ہے تو نہ پوچھئے۔

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ کبھی ناؤ گاڑی اور کبھی گاڑی ناؤ پر۔ اگلے اسٹیشن پر پولیس والا نہ آیا، گاڑی چلدی۔ دوسرے اسٹیشن پولیس والا آیا مگر ہنسکر چلدیا۔ تیسرے پر ناؤ گاڑی پر آگئی۔

باتوں باتوں میں ذرا ہاتھ جو ڈھیلا ہوا ہے اور مارا جو میں نے ایکدم سے جھٹکا تو خانصاحب کا ہاتھ ہماری طرف جنگلے کے اندر اور پھر جو میں نے اور دونوں دوستوں نے اُن کے ہاتھ کو پکڑ کر اور پیر جنگلے کی تختے سے اڑا کر جو جھٹکے دئے ہیں تو سلاخوں سے اُن کا سر پھوٹ پھوٹ گیا۔ اُدھر کئی آدمی لگ گئے مگر ہم نے بھی ہاتھ ٹیڑھا کر لیا کہ اگر ذرا زور لگائیں تو ٹوٹ جائے اور اتنا زور دے دیکر کھینچا کہ خانصاحب کا سر جنگلے سے لگا کا لگا رہ گیا۔ اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا، شیونگ کے سامان ہیں سے قینچی نکال کر ایک دم سے خانصاحب کی ڈاڑھی کا بائیں طرف والا ہینڈل صاف تراش لیا اور پھر ہاتھ چھوڑ دیا۔

اب یہاں خانصاحب کا قصہ شروع کر دیا جائے تو نامناسب ہے لہذا اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ خود قیاس کر لیجئے گا۔ اگلے دو اسٹیشن اس طرح گذارے کہ گاڑی رکتے ہی دوسری طرف کودے اور گاڑیوں میں آنکھ مچولی کھیلتے پھرے اور تیسرے اسٹیشن پر مجھ کو سفر توڑ کر رہ جانا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کرتا تو شاید کیا قطعی معاملہ بہت طول کھینچتا۔

اب اتفاق تو دیکھئے کہ میں تیسرے اسٹیشن پر رہ گیا تو ٹھٹھی میں [illegible]

آئے تو دُھول جھونکوں۔ گاڑیاں کھٹا کھٹ سامنے سے نکل رہی ہیں ایکدم سے سامنے زنانے درجے کی کھڑکی میں گویا چاند طلوع! حمیدہ انتہائی بھولے پن سے کھڑکی میں سر رکھے قریب ہی سے گذری۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے اچھل پڑی اور ادھر میں چونک پڑا۔ ایک دم سے اُس نے کچھ چلا کر کہا۔ میں نے نہ سنا۔ وہ ذرا زور سے تو صرف اتنا سنائی دیا... "میرا خط"۔۔۔"

گاڑی نکل گئی اور وہ خوبصورت چہرہ اڑا چلا گیا!! اور میں کھڑا سوچتا رہ گیا کہ کیسا خط۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اُس نے مجھے کوئی خط لکھا ہو! اور اگر بھیجا تھا تو کہاں گیا۔

(۲)

ان خانصاحب کی ڈاڑھی کا ہینڈل تراشے ایک سال سے کچھ کم ہی گذرا ہوگا کہ ایک انتہا سے زیادہ عجیب وغریب معاملہ پیش آیا۔ مگر خطرناک۔ یو۔ پی کے ایک صاحب کونسل کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے۔ انکے الیکشن کے کام کے تحت بندیلکھنڈ کا دورہ اس خادم کے سپرد ہوا۔ ہر مقام کے متعلق ووٹروں اور دوست احباب کے نام خطوط تھے۔ کہیں ڈاک بنگلے میں قیام تھا تو کہیں کسی ووٹر کے ہاں۔ اسی سلسلہ میں فرض کر لیجئے جھانسی میں قیام اور کام کے لئے ایک ووٹر صاحب کو خط دیا گیا۔ عالی جناب معلی الالقاب جناب کرم شیر خانصاحب ٹھیکیدار جھانسی۔

مجسم ڈاکخانہ اور ڈاکیہ بنکر ہر جگہ کے خط لیکر رخصت ہو رہا تھا کہ ایک اور صاحب آگئے۔ انہوں نے جو جھانسی کا نام سنا، کرم نیت خاں کے یہاں قیام کا نام تو بڑے زور سے بگڑے اور کہنے لگے کہ "کہاں ٹھیرو گے تم 'میلے' کے یہاں؟"

میں نے کہا "آپ کوئی جگہ بتا دیں"

انہوں نے ایک خط اپنے سابق موکل رئیس اعظم اور ملک التجار کو دیا جس کا مضمون ایسا تھا کہ موٹر چڑھنے کو، پراٹھے کباب کھانے کو اور محل قیام کو ملے۔

جھانسی پہنچ کر سیدھا میں ان رئیس اعظم کے ہاں پہونچا۔ عالیشان کوٹھی تھی۔ معلوم ہوا اندر ہیں۔ اطلاعاً خط بھجوایا۔ تھوڑی دیر بعد ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

بڑا کارخانہ تھا ایک نوکر یا ملازم لڑکا اندر آتا ہے ایک جاتا ہے بڑی دیر ہو گئی تب ملازم لڑکا ہاتھ آیا۔ پوچھا خط دے دیا معلوم ہوا خط پڑھکر انہوں نے رکھ لیا اور کچھ نہ بولے۔ پھر جو بھیجا دریافت کرنے کو کہ کیا کہا ہے تو ملازم نے آکر کہا کہ انہوں نے کہا "کہہ دو کہ کچھ نہیں کہا ہے"

میں خفیف ہو کر تانگے کی طرف چلا کچھ سوچا، ایک رقعہ پر لکھا کہ بندہ کل حاضر ہوا تھا۔ کرم شیر خانصاحب کے یہاں مقیم ہے۔ آموں کا ٹوکرا مرسلہ جناب ــــ لیکر در دولت پر حاضر ہوا۔ کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ کسی سے منگا لیجئے گا ورنہ سڑ جائیں گے۔

اب کرم شیر خاں صاحب کے یہاں پہونچا تو معلوم ہوا کھانا کھا رہے ہیں۔ مگر ان کے پاس تار آچکا تھا لہذا میرے قیام کا انتظام تھا میلے اور معمولی ٹھیکیدار تھے۔ میں ایک اُجڑے سے کمرے میں ٹھہرا۔ ایک گنوار صورت ملازم نے بستر وغیرہ کر دیا اور میں چبوتری پر بیٹھ کر منہ دھو رہا تھا کہ پیچھے سے ٹھیکیدار صاحب آگئے۔ "سلام علیکم ....."

مڑ کر جو وعلیکم السلام کرتا ہوں تو دیوتا کوچ کر گئے۔ چبوتری اتنی اونچی کہ کُود کر فرار ناممکن۔ ابھی کتنا عرصہ گذرا تھا کہ میں نے ان حضرت کی ڈاڑھی کا ہنڈل تراشا! جی ہاں یہ وہی خانصاحب تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے۔ مگر میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔

باوجود اتنا عرصہ گزرنے کے تراشیدہ ہینڈل کی جگہ نیا ہینڈل بہت چھوٹا اور ردی تھا۔ ایسا کہ چہرے کا چہرا "ہاف رائٹ" ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے غور اور نفرت سے دیکھا مگر حملہ نہیں کیا تھوڑی دیر کی باتوں کے بعد انہوں نے "آپ کو کہیں دیکھا ہے ....." کرکے انہوں نے جب مجھے پکڑنا چاہا ہے تو میں صفا مکر گیا۔ وہ یہی کہے گئے کہ ریل میں آپکا ساتھ ہوا اور ..... اور میں اسی طرح انکار کئے گیا۔ بالکل انجان بن گیا۔ مانے تو کیا، چُپ ہو گئے۔ مگر دن بھر وہی رٹ لگاتے ہی رہے ــــ

رفتہ رفتہ واقعہ بتا دیا۔ میری ڈاڑھی کی "گھونگی" اُس نے کترلی۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہینڈل کا اصلی اور صحیح نام "گھونگی" ہے۔ میں نے بیحد "اُس" نالائق کو بُرا بھلا کہا۔

تیسرے دن کا ذکر ہے کہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ خانصاحب سامنے مونڈھے پر میں تکیہ لگائے بچھونے پر نیم دراز۔ کپڑے پہنے جانے کو تیار بیٹھا تھا۔ سامنے ہی زنانخانہ کا دروازہ تھا جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔

یہ پردہ اُٹھا اور ایک نورانی چہرہ چمکا۔ حمیدہ!

اوہو! میں فوراً سمجھ گیا جس روز خانصاحب کی ڈاڑھی کا ہنڈل تراشا یہ بھی گاڑی میں تھیں۔

خود سوچئے کہ خانصاحب سے باتیں کرنا کتنا دشوار ہو گیا اس لئے کہ باربار وہ جھانکتیں۔ خانصاحب ایک گھاگ۔ توجہ میں پڑا جو فرق تو ایکدم سے مڑ کر دیکھا تو پکڑ لیا جھانکتے۔

خدا کی پناہ، مارے غصّے کے چہرہ مسخ ہو گیا۔ مجھ سے کچھ نہ بولے چُپکے سے مونڈھے پر سے اُٹھکر اندر گئے اور اندر جاکر انہوں نے حمیدہ کو مارنا شروع کیا۔ کوئی آواز نہ آئی لیکن مارنا نہ چھپا۔ میری غلطی کہیئے پلنگ کے سرہانے دیوار میں بلندی پر ایک روشندان تھا۔ مونڈھا پلنگ پر رکھکر اس پر چڑھکر اندر جو جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خانصاحب ایک لکڑی سے حمیدہ کو مار رہے ہیں۔ وہ فوراً گھر کے دوسرے حصہ کی طرف بھاگی اور اُسکے پیچھے خانصاحب دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں اس کا منتظر کہ خانصاحب اس طرف سے نکلیں تو اُتروں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مکان کا دوسرا دروازہ بھی ہے میں بدستور روشندان میں سر اڑائے تھا کہ ... ایک لٹھ! "بدمعاش تو نے میری ڈاڑھی کتری"۔

غور فرمائیں کہ پلنگ اور اسکے اوپر مونڈھا اور میں کھڑا ڈگمگا ویسے ہی رہا تھا کہ یہ لٹھ بازی۔ ایکدم سے دھپ سے پھاند پڑا۔ پھاند کیا یوں کہیے کہ زقند بھر کر اُڑا جو ہوں تو دور جاکر گرا اور بجلی کی طرح دروازے سے نکلکر چبوتری پر سے کوند گیا! اس کے بعد پھر حمیدہ کو جس طرح دیکھا آپ کو معلوم ہی ہے ......"

عظیم بیگ چغتائی

پلٹا

ایک فلاکت زدہ میاں بیوی کا بوڑھا جوڑا پناہ کے لئے دربدر مارا پھر رہا تھا لیکن خدا کی وسیع زمین میں اس کو کہیں ایک شب بسر کرنے کو بھی جگہ نہیں ملتی تھی۔

کیا یہ عالیشان محل اور بلند ایوان صرف اس لئے ہیں کہ ان کو قہقہوں سے ہی ہر دم آباد رکھا جاتے؟ کیا یہ اس لئے نہیں ہیں کہ کوئی ٹوٹا دل ان کے اندر آکر الم کی ایک ٹھنڈی سانس بھی بھر سکے؟ چونے اور پتھر کے ان باترتیب تودوں میں چنگ و رباب کی حکومت ہے اور انکے گلی اور کوچے خانماں بربادوں کی آوارہ گردی کے لئے چھوڑ دئے گئے ہیں۔ تہذیب کی تباہ سامانی کا اصرار ہے کہ مہذب بننا چاہتے ہو تو اپنے ہی تہذیب آشنا حلقہ میں گردش کرو۔ تم سے پست تر جو مخلوق ہے وہ صرف اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس تاریک پس منظر سے تم اپنی ارفع پوزیشن کی رفعت کا احساس کرسکو۔ لیکن کیا ان بلندیوں تک نحوست کے بھوت کبھی نہیں پہونچتے ہیں؟ کیا ان مرتفع مکانوں میں غم کے خونخوار دانت نہیں چبھتے؟ کیا ان فلک بوس محلوں سے کبھی نالہ و بکا کی صدائیں بلند نہیں ہوتیں؟ ہوتی ہیں۔ ع۔

چند نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

"مجھے اپنا تو خیال نہیں ہے۔ سوچ یہ ہے کہ تم بہت تھک گئی ہو۔ اب تم کو کہاں لئے لئے پھروں؟" بوڑھے نے اپنی بڑھیا سے کہا۔

"اور میں یہ سوچتی ہوں کہ تم کو میرے سبب سے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

"زیادہ فکر اس کی ہے کہ بادل تلا کھڑا ہے۔ اگر مینہ برس پڑا تو تمہارا کیا حال ہوگا؟"

"جو تمہارا سو میرا۔" بڑھیا نے اپنے بڈھے کی تسکین کرتے ہوئے کہا۔

"اس شہر میں تو کوئی پوچھے گا نہیں۔ کوئی آس پاس گاؤں ہو تو اس میں کیوں نہ چلے چلیں۔" بڈھے نے کہا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" دونوں کپکپاتے ہوئے اور بارش سے خوف کھاتے ہوئے شہر کے باہر آگئے۔

"لاؤ یہ اپنی گٹھڑی بھی مجھ کو دیدو۔ بوجھ لگ رہا ہوگا۔" بوڑھے نے کہا۔

"جوانوں کی سی باتیں نہ کرو۔ کیا کیا لادو گے اپنے اوپر۔ اچھا تو گدڑی مجھے دیدو۔ لاؤ۔"

"گدڑی میں ایسا کونسا بوجھ ہے۔ ایک تو تم تھکی ہوئی ہو پھر گٹھڑی سر پر رکھ لی ہے۔ لاؤ نہ میں دونوں چیزوں کو لا دلوں۔"

"اچھا تو اپنی گدڑی تو میرے حوالے کردو۔ تھکے ہوئے تم بھی ہو کیا کیا اپنے اوپر لادو گے۔"

بڑھیا نے اپنے بڈھے کے ہاتھ سے گدڑی لے لی اور دونوں افتاں و خیزاں ایک گاؤں کی طرف چلدئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ابر اور گہرا ہو گیا۔ بجلی چمکنے لگی اور ہوا میں تیزی پیدا ہو گئی۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ بڑھیا نے اپنے بڈھے کا سہارا لے رکھا تھا، اور اس وقت اس بے گھر جوڑے کو دیکھکر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جب تک ایک دوسرے کی معیت میں ہے ان کو کوئی فکر لاحق ہوسکتی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کی زندگی کا سہارا تھے۔ بے التفات زندگی نے ان کو اس حالت تک پہونچا دیا تھا لیکن ان کی سہل کوشی نے حیات کی صعوبتوں کو بہت بڑی حد تک فرو کر دیا تھا۔ مصیبت تو احساس مصیبت سے صورت گیر ہوتی ہے۔

"نصیبن میرے ہاتھ پر پانی کی بوند پڑی ہے۔ اگر مینہ آگیا تو تیرا کیا حال ہوگا۔"

"کسی پیڑ کے نیچے کھڑے ہو جائیں گے۔"

"یہ گھنٹہ دو گھنٹے کی برسات تھوڑی ہے۔ رات بھر کی مصیبت ہوگی۔ یہ تو رت ہی ایسی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے ایک دفعہ اس راستے میں میں نے ایک پرانا مندر دیکھا تھا خدا کرے وہ اب بھی برقرار ہو۔ برسات کی رات بسر کرنے کیلئے بری جگہ نہیں ہے۔"

"لو مینہ تو آگیا اور تمہارا مندر ابھی نہیں آیا۔ ذرا جلدی جلدی پاؤں اٹھاؤ۔" بڑھیا نے اپنے افسردہ ہاتھوں سے بڈھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

موٹی موٹی بوندیں پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ گہرے ابر کی وجہ سے شام کا منظر شب دیجور میں تبدیل ہو گیا۔ دونوں راستہ چھوڑکر کھیتوں میں گرتے پڑتے مندر کی تلاش میں چلے جا رہے تھے۔ زمین تر اور غضب

پر تنگ تھی۔ اب آسمان بھی ستم ڈھانے لگا۔

گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے چکّر کے بعد خدا خدا کر کے مندر کے قریب پہنچے۔ رات کے نو بج چکے تھے دونوں بھیگ گئے تھے اور سردی سے اُن کے نحیف جسم کپکپا رہے تھے۔ یہ مندر کیا تھا ایک دو منزلہ شکستہ عمارت تھی۔ جس کا بالائی حصّہ کچھ گر چکا تھا اور بقیہ حصّہ ایک شدید بارش کا منتظر تھا۔ نیچے کے حصّہ میں سخت تاریکی تھی۔ مگر جو لوگ حیات کی تاریکیوں سے نہیں ڈرتے اُن کے لئے ایسی تاریکی کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔

"تجھے ٹھنڈ لگ رہی ہوگی نصیبن۔ باہر جا کر دیکھتا ہوں خدا کرے سوکھی لکڑیاں درختوں کے نیچے مل جائیں تو کام چل جائے" یہ کہکر بُڈھا لکڑیاں چننے باہر چلا گیا اور بُڑھیا اندھیرے میں موسلا دھار مینہ سے بچی ہوئی بیٹھی رہی۔ دفعتہً اس کو اپنی کوٹھری کی چھت پر پہلے تو ہلکا سا دھماکا سنائی دیا پھر ایسی آواز آئی گویا کوئی اُوپر ٹہل رہا ہو۔ اوّل تو وہ ڈری مگر پھر اس کو خیال آیا کہ ممکن ہے اُوپر کے حصّہ میں بھی انکی طرح کوئی بارش سے پناہ گزین ہو۔

جب بُڈھا باہر سے لکڑیاں لیکر آیا تو اُس نے اپنے شوہر سے چُپ رہنے کا اشارہ کیا اور اُس آواز کی جانب اسکو بھی متوجہ کیا۔ بُڈھے نے پہلے تو آگ جلائی جس سے یہ مختصر سی کوٹھری روشن ہو گئی۔ اس کے بعد بُڑھیا سے بولا "تو ذرا میری گڑگڑی میں تمبا کو جما میں اُوپر جا کر دیکھتا ہوں۔"

"مگر دھیرے دھیرے سیڑھیوں پر چڑھنا ایسا نہ ہو کہ اُوپر کوئی دشمن ہو اور تم کو دیکھ لے۔"

بُڈھے نے اپنے بوسیدہ جوتے اُتار ڈالے اور دبے پیر زینے پر گیا۔ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد اُس نے دیکھا کہ اوپر ایک اور شکستہ کوٹھری ہے جس کی ایک دیوار گر چکی تھی اور دوسری میں بھی جا بجا شگاف ہو رہے تھے۔ اتنے میں زور سے بجلی چمکی تو بُڈھے نے دیکھا کہ ایک مرد اور ایک عورت ایکدوسرے کے قریب کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ اُسنے کان لگا کر ان کی باتیں سُننی شروع کیں۔ عورت سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی: "شنکر تم نے اتنا لکھا پڑھا یونہی ضائع کیا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اگر میں تم سے شادی کر لوں تو تم پھر بھی مجھ سے پریم کرتے رہو گے۔ میرا تو خیال ہے کہ کچھ دن بعد ہی ہم ایک دوسرے سے سیر ہو کر بیٹھ رہینگے۔"

"مگر کملا تم نے اس پر بھی غور کیا کہ ہم ایک دوسرے سے کسقدر محبت کرتے ہیں۔ وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ شادی کس طرح ہماری محبت کا خاتمہ کر دیگی۔"

"میری ہم جماعت شیلا کا تجربہ ہے کہ اُس نے پچاسوں نوجوانوں سے محبت کی لیکن اُس کے دل میں یہ آرزو کبھی قائم نہیں ہوئی کہ سماج کے بنائے قانون یعنی بیاہ کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ کر ایک کی ہی ہو رہے۔ ہم کیوں نہ جب تک نبھ سکے محبت کی زندگی گزارتے رہیں اور جب سیر ہو جائیں تو علیحدہ ہو جائیں۔"

"لیکن ہماری اولاد کا کیا حشر ہوگا؟"

"اولاد ہونے ہی کیوں دی جائے۔"

"مگر اس کا ہونا لازمی ہے۔"

"تم بالکل قدامت پرست ہو۔ شادی کیا ہے؟ جنسی خواہشات کی تکمیل کی ایک قانونی شکل ہے۔ یہ ایسا قانون ہے جس کا پابند کوئی سمجھدار انسان اپنے کو نہیں بنا سکتا ہے۔"

"آخر تم بیاہ سے کیوں ڈرتی ہو؟"

"تم سے پچاس بار کہہ تو دیا کہ شادی ہماری محبت کا آخری باب ہوگی۔ جب ہمارے اس جوانی کے خون کا ہیجان کچھ کم ہو جائے گا تو ہم دونوں محبت کے باب میں سرد ہو کر رہ جائیں گے۔"

"لیکن کملا کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ شادی یا محبت صرف جنسی لذّت کے لئے ہے۔ کیا مرد و عورت کے باہمی اتصال کے اور کچھ معنی نہیں ہو سکتے۔ کیا ان کے ملاپ کا کوئی اور مقصد نہیں ہے؟"

"اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ جوانی ہوتی ہی اس لئے کہ اس کو بغیر اندیشہ فردا دونوں ہاتھوں سے لٹایا جائے اسکے بعد انحطاط شروع ہوتے ہی زندگی کا خاتمہ کر لیا جائے۔"

"تمہارے خیالات بہت باغیانہ ہیں۔"

"اور تم بہت قدامت پرست ہو۔" اتنے میں مینہ اور تیز ہو گیا۔ کوٹھڑی کے ٹوٹے ہوئے حصّوں میں بوچھار تیزی سے اندر آ رہی تھی، جس سے دونوں بھیگ رہے تھے۔

"شنکر نیچے چلو یہ مینہ تھمتا نظر آتا نہیں ہے۔ یہاں تو ہم بالکل تر ہو جائیں گے۔"

بُڈھا یہ سُنکر چُپکے سے اُلٹے پیر نیچے اُتر آیا اور آ کر اطمینان سے اپنی گڑگڑی پینے لگا۔

"کون ہے اُوپر؟"

"دو پاگل نوجوان مرد و عورت ہیں۔ خدا جانے کیا بک رہے ہیں۔ لڑکی کہہ رہی ہے کہ میں بیاہ نہیں کروں گی، کنواری رہ کر بیاہی کی سی زندگی گزاروں گی اور جوان کہہ رہا ہے کہ گرہست میں آ جا۔ اور

جانے کیا کیا بک رہے ہیں وہ لوگ۔ ابھی شاید وہ نیچے ہی آنے والے ہیں وہاں وہ بھیگ رہے ہیں۔"

اتنے میں زینے پر چاپ ہوئی اور پہلے عورت اور بعد کو مرد نیچے آیا۔ اُنہوں نے جو روشنی دیکھی اور اس مدھم اُجالے میں اس بوڑھے جوڑے پر نظر ڈالی تو اُن کو بہت تعجب ہوا۔ دونوں اُنکے قریب آئے اور نوجوان نے بڈھے سے دریافت کیا "تم بھی شاید ہماری طرح یہاں پناہ لینے کے لئے پڑے ہوئے ہو۔ یہ بڑھیا کون ہے۔ کیا تمہاری بیوی ہے؟"

"اور کیا میں تمہاری طرح اِس بڑھیا کو بھگا کر لایا ہوں" بڈھے نے جواب دیا۔

"بھگا کر؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم بھاگے ہوئے ہیں؟" لڑکی نے اپنی مترنم آواز میں پوچھا۔

"کیونکہ نہ تمہارے ساتھ کچھ اسباب ہے نہ کپڑے۔ ہمارے پاس اپنی گدڑی اور گٹھری وغیرہ تو ہے" بڑھیا نے کہا۔

"بکتی ہے تو" لڑکی نے تیکھے پن سے جواب دیا۔

"لاؤ بیٹی ذرا تمہارا ہاتھ تو دیکھوں"

میرا ان خرافات پر اعتقاد نہیں ہے"

"ہاں جب تم شادی بیاہ کو بیکار سمجھتی ہو تو دوسری گیان کی باتوں کی کیوں پرواکرنے لگیں" بڑھیا نے کہا۔

"تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں شادی بیاہ کو بیکار چیز سمجھتی ہوں" لڑکی نے دریافت کیا۔

"یہ تو تیری صورت پر لکھا ہوا ہے"

"بڑی آئی میری صورت پڑھنے والی۔ شنکر میں بھیگنا پسند کرونگی لیکن ان لوگوں کے پاس بیٹھنا پسند نہیں کرسکتی"

"بیٹھ جاؤ بیٹی۔ ہم اتنے بُرے لوگ نہیں ہیں۔ ہاں ہمارے اندر کمی ہے تو اس کی ہے کہ ہم تمہاری طرح سچی باتوں کو جھٹلانا نہیں جانتے۔ میری نصیبن بہت کم جھوٹ بولتی ہے اور میں بھی" بڈھے نے کہا۔

"بڑے میاں یہ بڑھیا کب سے تمہارے پاس ہے؟" لڑکی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ شنکر بھی ایک کونے میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کب سے پاس ہے؟ دیوانی بچی کیا تیرے خیال میں یہ میری کوئی ــــ کوئی آشنا ہے"

"آشنا پر خدا کی مار" بڑھیا نے درمیان میں بول کر کہا۔ "ارے ہم بھی کبھی تم دونوں پاگلوں کی طرح جوان تھے۔ لیکن ہم نے ایک دوسرے پر خواہ مخواہ عاشق ہوکر بیاہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ ہمارے ماں باپ نے ہماری شادی رچائی تھی کہ یہ کام اُن کو کرنا تھا تاکہ میں جوان ہوکر آوارہ نہ ہوجاؤں جیسی کہ آج کل کی لڑکیاں ہورہی ہیں۔ ہمارا بیاہ اس لئے کیا گیا تھا کہ ہم میاں بیوی جیون میں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بنے رہیں۔ آج ہماری عمریں ڈھلے مدت گذر گئی لیکن نہ تو میں نے اپنے میاں کے پاس سے بھاگنے کی کبھی کوشش کی اور نہ اُسنے میرے سوا کسی کو چاہا" بڑھیا نے کہا۔

"ہاؤں ہاؤں ہاؤں" بڈھے نے ایک لمبی جمائی لی۔

"سوجاؤ تا منہ کیوں پھاڑ رہے ہو بُری طرح۔ گدڑی ڈالدوں تمہارے پیروں پر؟" بڑھیا نے اپنے بڈھے کو نیند کی حالت میں دیکھکر کہا۔

"تو بھی سوجا یہ پانی تو جانے کب تھمے گا" بڈھے نے نصیبن سے کہا۔

غرض تھوڑی دیر میں دونوں سوگئے۔

"کیسے عجیب وغریب لوگ ہیں یہ کملا" شنکر نے طویل خاموشی کے بعد کہا۔

"بیحد عجیب" کملا نے ازخود رفتگی کے عالم میں جواب دیا۔ وہ اس بوڑھے جوڑے کی اس زندگی سے بیحد متاثر ہورہی تھی۔ بہت دیر تک کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی۔ آخر شنکر سے بولی "شنکر، اس مُصیبت کے مارے مگر مسرور جوڑے کو کس قدر ایک دوسرے کا پاس ہے"

"حالانکہ ان کی شادی کو نصف صدی کے قریب گذر چکی ہوگی لیکن یہ اب بھی میاں بیوی بنے ہوئے ہیں" شنکر نے اس کو متاثر دیکھکر کہنا شروع کیا۔

"میں یہی سوچ رہی ہوں۔ یہ کیوں نہیں ایک دوسرے سے بیزار ہوتے ہیں۔ ان میں تو شادی سے پہلے باہم محبت بھی نہ تھی"

"کملا! انسان جس قدر خواہ مخواہ فلسفی بنتا ہے اسی قدر وہ اپنی زندگی اجیرن کرلیتا ہے۔ ان لوگوں نے کبھی زندگی کے اُن غیر ضروری مسائل پر غور ہی نہیں کیا جو آج کل تہذیب جدید کے جزو اعظم بنے ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے زندگی کو وہی سمجھا جو وہ ہے، وہ نہیں سمجھا جو وہ بنادی جاتی ہے"

"چھوڑو اس قصہ کو۔ یہ بتاؤ کیا تم بھی مجھے اسی طرح چاہتے رہوگے جس طرح یہ لوگ بڈھے ہوکر بھی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ بولو، بولو شنکر اگر میں سماج کے اس بندھن کو جس کو تم شادی کہتے ہو توڑدوں

کرلوں تو کیا تم ہمیشہ میرے ہی ہوکے رہوگے اور مجھ ہی سے محبت کرتے رہوگے ؟ "

"نوجوان کملا۔ انسان کی عمر محض محبت کے لئے ہی وقف نہیں ہے۔ یہ دیوانگی کا دور تو بہت ہی کم عمر ہے۔ دنیا میں ہم کو اور بھی کام کرنے پڑتے ہیں۔ اور دیگر فرائض کی بھی تکمیل کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً ہمدردی باہم، پاس فرض، غمگساری وغیرہ وغیرہ۔ اس بوڑھے جوڑے میں جو تم اب محبت کے دھندلے نقوش دیکھ رہی ہو وہ دراصل باہمی غمخواری اور رفاقت کے جذبات ہیں اور یہی جذبات حقیقی ہوتے ہیں۔ میں اور تم جب بڈھے ہوجائیں گے تو ہم کو بھی دوسرے باغی قسم کے نوجوان ایک دوسرے کا رفیق بنا دیکھکر اسی طرح رشک کیا کرینگے "

"تو پھر مکان پر چلو ہم باقاعدہ اپنے والدین کی رضامندی سے جائز طور پر شادی کی کوشش کرینگے۔ ابھی تو ہم کو گھر سے نکلے ہوئے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی ہے۔ مکان پر بہانہ کردینگے کہ سینما گئے تھے"

"مگر بارش تو ابتک ہورہی ہے" شنکر نے کہا۔

"پروا نہیں۔ اس آج کی مبارک شب کی یادگار کو قائم رکھنے کے لئے ہم کو بھیگنا چاہیئے۔ میں چاہتی ہوں شنکر اس بوڑھے جوڑے کو بھی معلوم ہوجائے کہ ہم بھی اُن جیسی زندگی اختیار کرنے والے ہیں"

"اس کے لئے پھر وقت نکالیں گے" یہ کہکر شنکر کملا کو بارش میں اپنے مکان کی طرف لیکر روانہ ہوگیا۔

قیسی رامپوری

مجھے بھی یاد کرلینا

نگاہِ خستہ و غمناک سے منہ پھیرنے والی
تصور میں نئے میری زندگی کو گھیرنے والی
تری رعنائی جب تنہائیوں میں آئینہ ڈھونڈے
مجھے بھی یاد کرلینا

شبِ ماہِ منور میں اگر دل مسکرا اُٹھے
تبسم سے اگر جھیلوں کا پانی جگمگا اُٹھے
جوانی جب فضائے دلبری میں کروٹیں بدلے
مجھے بھی یاد کرلینا

جب آدھی رات کو خوابوں کی دنیا ہو نظر آرا
ضیا بر دوش جب رہ جائے بس اک صبح کا تارا
چنبیلی جب سرہانے کھل کے تجھکو مست کر ڈالے
مجھے بھی یاد کرلینا

نیا جوڑا پہن کر جب عروسِ صبح منہ کھولے
کلی جب جاگ جائے قطرۂ شبنم سے منہ دھولے
نسیمِ صبح جب گیسوئے عنبر بار سے کھیلے
مجھے بھی یاد کرلینا

تری تعریف میں نغمات جب مدہوش ہوجائیں
شعاعیں نور کی جب تیرے نظارے میں کھو جائیں
ترے نازک لبوں سے جب تبسم کی لہر اُٹھے
مجھے بھی یاد کرلینا

خرامِ ناز سے تیرے اگر دل لڑکھڑا جائیں
دلِ مضطر شکستِ ساز کا نغمہ سنا جائیں
وفورِ حسن میں جب تجھکو خود پر ناز ہوجائے
مجھے بھی یاد کرلینا

بھری برسات میں جب بوندیاں اک گیت بنجائیں
فضائیں جب دیارِ قلب پر جذبات برسائیں
اندھیری رات ہو، بجلی ہو، مستی ہو، گھٹا جھومے
مجھے بھی یاد کرلینا

ترے جذبات جب تیرے سکوں پر بار ہوجائیں
تری آنکھیں شرابِ غم سے جب سرشار ہوجائیں
تری تنہائی جب تجھ سے بھی رازِ بیکسی کہدے
مجھے بھی یاد کرلینا

ترے قدموں پہ جب سر پھر کسی وحشی کا جھک جائے
اگر پھر سامنے تیرے کوئی رو رو کے بل کھائے
مرے انداز میں جب کوئی تجھکو پوجنا چاہے
مجھے بھی یاد کرلینا

نلش صدیقی

ایک ایکٹ کا ڈراما۔

پہلا منظر

کلکتہ۔ چترنجن اوینیو میں ایک عمارت کی تیسری منزل پر ایک کمرہ۔ ریڈیو پر دلی کا پروگرام ابھی ختم ہوا ہے یا کیا گیا ہے۔ ایک قوال نے حضرت [illegible] دلی کی مشہور غزل گائی ہے۔ اس کا ایک شعر کلیم گنگناتا اور آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہے۔

دریا رود از چشمم، لب تر نہ شود ہرگز
ایں طرفہ تماشا بیں تشنہ است بہ آب اندر

سلوک، طریقت، حقیقت، معرفت، فراق و وصل، فنا بقا یا بقائی الفنا کے مفہوم نہ میں جانتا ہوں نہ جاننے کی ضرورت اور فرصت۔ میں تو اس شعر کے معنی یہ سمجھتا ہوں کہ میرے دماغ میں فن زرگری کے سارے رموز اور نکات بھرے ہیں، میری اٹیچی میں تجارت اور معاشیات کی اوّل درجے کی شاندار سندیں پڑی ہیں۔ پھر بھی معاش کا دروازہ مجھ پر مسدود ہے۔ فضا تاریک ہے، راستہ دکھائی نہیں دیتا کدھر جاؤں۔ دولت کہاں پاؤں، دولت؟ کمرے کا کرایہ کہاں سے ادا کروں؟ سمندر میں کشتی پر پیاسا ہوں۔ پانی میں ہوں اور پی نہیں سکتا۔ زراعت، تجارت، صنعت حرفت کی بنا، پیدائش، نشوونما، عروج و کمال اور تمام جزئیات سے باخبر ہوں، ہر کاروبار کے مقام، مخرج، مرکز، منڈی، لاگت، نفع نقصان، اعداد و شمار کا حافظ ہوں اور کر کچھ نہیں سکتا۔ ہر اقدام کچھ نہ کچھ سرمایہ چاہتا ہے اور کچھ نہیں تو سیاحت کے اخراجات۔ دس بجے مالک مکان کا کارپرداز آخری بار بل لئے آئیگا اور میرا بوریا بستر سڑک پر ڈال کر کمرہ مقفل کر دیگا۔ قانونی حجت تو اب بھی نکل سکتی ہے مگر اس کمبخت کے گورکھا پیادوں کے سامنے قانون کیا چیز ہے۔ اور قرضدار کی حیثیت سے باقی کے لئے الجھنا اور ہنگامہ برپا کرنا ذلیل سی بات ہے۔

دس بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں۔ بڈھا آیا ہی چاہتا ہے۔ کمرے میں قفل لگا کر باہر نکل جاؤں۔ نہیں، یہ بزدلی ہے۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ اچھا چپا۔

ریڈیو کو چلتا کر کے کمرہ کھلا چھوڑ باہر نکل جاتا ہے۔ محبوب جان کا گانا گونج رہا ہے۔

منصور زینے پر ریڈیو کا گانا سنتا ہوا چڑھتا اور بکتا جاتا ہے۔

یار کلیم یہ ٹھیک ہے ؎

در وقت تنگدستی در عیش کوش و مستی
کایں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

(اُو پر پہونچکر باہر ہی سے) دولت کے نسخوں میں یہ نسخہ تم نے معاشیات کے نصاب میں نہ سیکھا ہوگا۔ بارے اب سیکھ گئے۔ ہیں؟ کلیم کلیم کلیم۔ کدھر گئے یار؟۔

چاروں طرف دیکھتا ہے پہلو کا کمرہ مقفل ہے۔ ڈیسک کے دراز سے سگریٹ نکال کر پینے لگتا ہے۔ خبروں کے پروگرام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ سوئی پھرا پھرا کر مختلف مقامات سے مختلف خبریں سنتا ہے کلیم داخل ہوتا ہے۔

منصور:۔ کلیم بھی واہ، کمرہ کھلا چھوڑا اور ریڈیو چلا کر غائب ہو جانا نئی وحشت ہے۔ کہاں تھے؟۔

کلیم:۔ یار جاتا کہاں۔ مالک مکان کا کارپرداز دس بجے آنے والا اور میرا فیصلہ کرنے والا تھا۔ میں نے نکالے جانے یا قفل لگا کر غائب ہو جانے سے زیادہ باعزت طریقہ اختیار کیا۔ تمہارے سامنے تو آیا ہوگا۔ کیا ہوا؟۔

منصور:۔ میں نے کسی کو یہاں تو نہیں پایا۔ مگر اب خیال آتا ہے کہ ایک بڈھا بنگالی دو گورکھا پیادوں کے ساتھ مجھے نکڑ پر ملا تھا وہ شاید یہاں سے لوٹ کر جا رہے تھے۔ خیر کچھ دیر کیلئے یہ بلا تو ٹل گئی۔ اب کیا ارادہ ہے؟۔

کلیم:۔ بے زر ارادہ کیا کر سکتا ہے؟ "بھکاری اختیار و انتخاب نہیں کیا کرتے" ارادے تو جب بتاؤں کہ کچھ روپے جیب میں آجائیں ؎

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ و صہبا مرے آگے

تمہیں کچھ کہو۔

منصور:۔ کہتے کو تو میں سب کچھ کہتا اور سینکڑوں عملی تدبیریں بتاتا ہوں مگر تم فیشن میں سب ٹال دیتے ہو۔

کلیم:۔ تم مجھے چوری اور بے ایمانی کے طریقے بتاتے ہو۔ معاشیات میں ایم اے کر کے کبھی اگر میں نے کسب معاش کے ذلیل طریقے اختیار کئے تو تعلیم میں

میری مغز پاشی بارہ برس دلّی میں رہ کر بھاڑ جھونکنا ہوا۔

منصور۔ مجھے یہی تو رونا ہے۔ معاشیات کے سب سبق تم نے پڑھ لئے مگر اصل بھید نہ سیکھا۔ مجھے تم کسی کامیاب کاروبار یا کارخانہ کا پتہ نہیں دے سکتے جس کو ناجائز ہتھکنڈوں یا بے ایمانیوں کے بغیر فروغ ہوا ہو۔ ادنیٰ اب طاخانہ سے لیکر اعلیٰ صحافت تک بازاروں میں مہینوں پھرنے کے بعد اگر تم نے یہ بھی نہ دیکھا تو کچھ نہ سیکھا۔

کلیم۔ یہ سچ ہے" پر طبیعت ادھر نہیں آتی"

منصور۔ نہیں آتی تو اپنی معاشیات کے علم کو لپیٹ کر طاقِ نسیاں میں رکھ دو۔

کلیم۔ پھر کیا کروں؟ چھوٹے ابا کے اصرار کے باوجود میں نے پروفیسری سے انکار کر دیا۔ پانسو روپے دیکر انہوں نے مجھے یہاں کی تجارت گاہوں کا تجربہ اور واقفیت حاصل کرنے کو بھیجا تھا۔ ختم ہوگیا۔ تین سو پھر بھیجے۔ وہ بھی ختم ہوگیا اور کسی کام کا اور چھور نہ ملا۔ کمروں کا تین ماہ کا کرایہ سر پر سوار ہے اور ہوٹل کا بل۔ اس آٹھ سو کے آگے ایک پیسہ دینے سے انکار کر چکے ہیں۔ اور مانگوں بھی تو کس سے؟ وہ ممالک اسلامیہ سے ہوتے ہوئے جاوا اور مالدیپ سنگلدیپ میں اسلامی آثارِ صنادید کی تفتیش میں مصروف ہیں اور اسی سنک پر اپنی کمائی لٹا رہے ہیں۔

منصور۔ خوب یاد دلایا۔ ان کے وارث تو تمہیں ہو۔

کلیم۔ ہوں تو وارث میں ہی۔ مگر اُن کی دولت تو اُن کے مرنے کے بعد ملیگی۔ وہ ابھی صحیح تندرست ہیں۔ ممکن ہے دس بیس برس اور زندہ رہیں اور اللہ اُن کا سایہ میرے سر پر قائم رکھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس غیر محدود مدت میں میں کیا کروں؟

منصور۔ ان کی زندگی کا بیمہ تو کثیر رقم پر ہوا ہوگا اور اس کے وارث بھی تم ہی ہوگے؟۔

کلیم۔ ہاں پچاس ہزار پر، اور وارث میں ہی ہوں۔

منصور۔ اس کی میعاد کیا ہے اور قسط ادائی (پریمیم) کس قدر؟

کلیم۔ میعاد کو پانچ سال باقی ہیں اور قسط پانچسو سہ ماہی۔

منصور۔ اتنی بڑی قسط بیمہ کمپنی کی نذر ہوا کرے۔ تم وارث اور آج نانِ شبینہ کے محتاج! خدا کی مار ان بیمہ کمپنیوں پر۔ کس عیاری سے کروڑوں روپے بناتی ہیں۔ کیا ان گرہ کٹوں کی گرہ کاٹنا بھی تم جرم سمجھتے ہو؟۔

کلیم۔ ان کا منافع تو واقعی غیر معتدل ہے۔ ہے تو یہ جوا کھلانے کا کاروبار اور ان کو دھوکا دینا معاشی نقطۂ نظر سے کوئی بڑا جرم نہیں۔ تو تم کیا صورت سوچتے ہو؟۔

منصور۔ بڑے میاں کو مار ڈالو۔

کلیم۔ پھر زبان سے یہ کلمہ نہ نکالنا۔ وہ میرے چچا ہی نہیں باپ ہیں جو مجھے یتیم چھوڑ گئے اور میری پرورش اور تعلیم و تربیت اُن کے ذمہ رہی۔ بادلِ ناخواستہ دُنیا کی شرم سے نہیں۔ لاولد ہیں اور مجھے اپنی صلبی اولاد سمجھتے ہیں اور میں نے بھی باپ اُنہیں کو دیکھا اور سمجھا۔ مجھے یوں کوں مرجانا منظور ہے مگر یہ منظور نہیں کہ میرے ہاتھ سے ان کا بال بیکا ہو۔ منصور، یہ تم کیا کلمہ نکال بیٹھے؟ میں تمہیں اتنا نہ سمجھتا تھا۔

منصور۔ کلیم دس برس کی دوستی پر بھی تم نے میری نسبت اتنی ذلیل رائے قائم کی؟ تمہیں معافی مانگنا پڑے گی اور میں معاف کر دونگا کیونکہ میرے الفاظ میں غلط فہمی کی گنجائش کافی تھی ـــ مردِ آدمی میری مُراد خُدا نخواستہ یہ نہ تھی کہ تم واقعی چچا کو مار ڈالو۔ بلکہ کمپنی کے لئے مار ڈالو۔ اُسے یقین دلا دو کہ وہ مر گئے۔ سابق جج اور متوفی جج میں فرق ہی کیا ہے؟ جو آثارِ صنادید کی تلاش میں کھنڈروں اور ٹیلوں پر مارا پھرے وہ خود عہدِ ماضی کا فرد ہے۔ اس زمانہ سے اُسے کام کیا؟ اس زمان اور مکان میں تو ایسی معتبر مقدس ہستی مرحوم و مغفور ہی ہے۔ ابھی شاید وہ ہندوستان تو عرصہ تک واپس نہ آئینگے؟

کلیم۔ غالباً نہیں۔ ابھی انہیں مصر اور تیونیشیا مراکش، طرابلس سے اگر داخلہ کی اجازت ہوتی، ہوتے ہوئے مدینہ طیبہ اور آخر میں مکہ معظمہ جانا ہے۔ نجد و یمن کی سیاحت کا خیال بھی ہے۔ اکیلی ذات ہے، یہ بھی ممکن ہے مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں مستقل اقامت اختیار کرلیں۔ مگر یہ کمپنی کیلئے اُن کو مارنے کی بکواس میں نہیں سُن سکتا۔

منصور۔ پھر تو کام بہت آسان ہے کبھی پکڑے بھی نہ جاؤ گے۔ پنشن تو یکمشت وصول کر ہی لے گئے ہونگے؟۔

کلیم۔ ہاں۔ مگر وفات کے ثبوت میں ڈاکٹر کی چشم دید شہادت ضروری ہے وہ کہاں سے آئیگی؟"

منصور۔ سب مہیا ہو جائیگی۔

دونوں سوچنے لگتے ہیں پھر سرگوشیاں ہوتی ہیں۔

دوسرا منظر

تیسری صبح۔ وہی منظر۔ ڈاکٹر بنرجی داخل ہوتے ہیں۔
اور کلیم اور منصور کے ساتھ پہلو کے کمرے میں جاتے
ہیں۔ ایک ضعیف و ناتواں بوڑھا پلنگ پر پڑا کھانس اور
کراہ رہا ہے۔ ڈاکٹر بنرجی اُسے اچھی طرح جانچتے ہیں۔

ڈاکٹر بنرجی۔ مسٹر کلیم آج میں خوشی سے یہ اعلان کرنے کے قابل ہوں کہ آپکے

بچا کی حالت اُمید افزا ہے۔ تپ ۱۰۲ ۹۹ ہے۔ نبض کی رفتار معتدل ہے۔ پھیپھڑے بہت کچھ صاف ہو چکے ہیں۔ اگر ۲۴ گھنٹے اور اسی حالت پر قائم رہے اور غشی کا دورہ نہ ہوا تو ان کی نئی زندگی یقینی ہے۔ پینے اور مالش کی وہی دوا جاری رہیگی۔ طاقت کے لئے ایک نئی دوا لکھے دیتا ہوں۔ اور یہ انجکشن کی دوا لکھ دی ہے اسے کل تیار رکھئے گا۔ خدا حافظ۔ (چلا جاتا ہے)

کلیم:- فیس تو اُدھار رہی۔ دواؤں کے دام کہاں سے آتے ہیں؟

منصور:- تم دواؤں کے دام کو جھک رہے ہو، مجھے یہ فکر ہے کہ یہ کمبخت اچھا ہوا جاتا ہے اور بنا بنایا کھیل بگاڑے دیتا ہے۔ دیدو کمبخت کو زہر۔

کلیم:- یہاں تو چوہے مارنے کے زہر کے بھی دام نہیں۔ ناحق یہ بلا جانے تم کہاں سے اٹھا لائے۔ اب تو یہ ڈھول گلے پڑا ہے تو بجانا ہی ہے۔ میں اسے مار نہیں سکتا۔ بدی کی نیت سے ہی کوئی نیکی ہو جائے تو زہے قسمت!

منصور:- ارے میاں، تم نہیں جانتے کہ یہ کیا بلا ہے۔ یہ پرانا مجرم دس بار کا سزا یافتہ ہے۔ ڈکیتی، چوری، قماربازی کی سزائیں بھگتتے بھگتتے اب جو بوڑھا لاچار ہو گیا تو کالی گھاٹ میں بھیک اور چڑھاوے اور لنگروں کے پس خوردہ پر بسر کرتا تھا۔ یہ بیمار بیہوش سڑک کے کنارے پڑا تھا میں رکشا میں اُٹھا لایا۔ اس کے ہوش و حواس بجا ہوئے اور طاقت عود کر آئی تو نہ جانے کیا کیا مصیبتیں کھڑی کر دے۔ اگر مارتے نہیں تو کم سے کم جلد سے جلد اس سے پیچھا چھڑاؤ۔

کلیم:- جو کچھ بھی ہو اس حال میں اُسے دھکیل کر سڑک پر ڈال دینا تو گوارا نہیں کر سکتا۔

اندر سے آواز آتی ہے۔ آگے آگے کلیم پیچھے پیچھے منصور پہلو کے کمرے میں جاتے ہیں اور مریض کے بستر پر جھکتے ہیں۔

بوڑھا:- میں کہاں ہوں حجور؟ یہ جیل ہے یا ہسپتال؟ اللہ سب کا بھلا کرے۔

کلیم:- بابا نہ یہ جیل ہے نہ ہسپتال۔ تم سڑک پر بیہوش پڑے مر رہے تھے، ہم تمہیں اپنے گھر اُٹھا لائے۔ اب تم اچھے ہو۔ ڈاکٹر کہتا ہے تم خطرے سے بچ گئے۔

بوڑھا:- اللہ سب کا بھلا کرے۔ ایک بیڑی دینا بابا۔

کلیم:- ڈاکٹر نے تم کو بیڑی پینے کو منع کیا ہے۔ تم کو نمونیا ہے۔

بوڑھا:- کیا کہا بابا ننموہیاں؟ پٹنہ میں۔ جہاں بڑے مولوی صاحب تھے میں وہاں رہا ہوں۔ نہیں میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے سُنا بھی نہیں ہے۔ بیڑی دینا بابا۔

منصور:- یہ ہمیں پولیس افسر سمجھتا ہے اور اس مقام ننموہاں یا ننموہیاں میں اس نے ضرور کبھی چوری کی ہے یا ڈاکہ ڈالا ہے۔ جبھی بے خیالی میں کھکر بکر رہا ہے۔ تیزی سے اس کے حواس لوٹ رہے ہیں۔

گھنٹی بجتی ہے۔ کلیم اور منصور صدر کمرے میں لوٹ آتے ہیں بوائے ملاقاتی کارڈ لاتا ہے۔

کلیم:- مسٹر اے ٹی دت نمائندہ ربر پاپوش کمپنی لمٹیڈ کلکتہ بمبئی دہلی! سلام بولو۔

ایک جنٹلمین لاغر اندام، سیاہ فام، چھوٹی آنکھوں اور بڑے دانتوں والا ہینڈ بیگ لئے داخل ہوتا ہے۔ صاحب سلامت ہوتی ہے۔

کلیم:- میں نے اس کارخانہ کا نام آج پہلی بار سنا۔

دت:- ابھی یہ کھلا نہیں، زیر تجویز ہے۔ پانچ لاکھ کے مجوزہ سرمایہ میں سے تین لاکھ کے حصے گرم کیک کی طرح فروخت ہو چکے۔ چار چار آنے کو پورے قد کے ربر کے جوتے مہیا کرنے کی اسکیم اس قدر مقبول عام ہو رہی ہے کہ ہم اب سرمایہ سے مطمئن ہیں۔ اگلے مہینے کام شروع ہو جائے گا۔ جاپان کا ایک ماہر آ گیا ہے۔ دوسرا امریکہ سے آنے والا ہی ہے۔ راجہ صاحب ہری پاڑا نے دس ایکڑ زمین عطا کی ہے اور پچاس ہزار کے حصے خریدے ہیں۔ میں اسی عمارت کے قطعہ ۲۱ میں رہتا ہوں۔ آپکے نشان کی تختی سے آپ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ جنٹلمین سمجھ کر اور پڑوسی کی حیثیت سے مناسب سمجھا کہ آپ کو اس سُنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کی دعوت دوں۔

منصور:- ڈائرکٹروں کے نام کیا ہیں؟

دت چھپا ہوا کاغذ نکال کر پیش کرتا ہے۔ منصور لیکر ایک نظر ڈالتا ہے۔

راجہ صاحب بلوپورہ بال بال قرض سے بندھے ہیں۔ جائداد گورنمنٹ کے زیر انتظام آنے والی ہے۔ ڈائرکٹروں کی فہرست میں ان کا شمول اور ان کے نام کے آگے چالیس ہزار کے حصوں کی خریداری! آگے چلئے۔ راجہ صاحب ست نگر کرشن کمار سین پچھلے سال قضا کر چکے۔ بابو صاحب آپ نے کسی پرانی فہرست سے یہ کاغذ تیار کیا ہے۔ عیب کرنے کا ہنر بھی نہ آیا۔ جائیے یہ جال کہیں اور پھیلائیے۔ آپنے غلط شکار چنا ہے۔

دت کڑوا منہ بنائے کچھ بڑبڑاتا نکل جاتا ہے۔

زینوں سے نیچے پہونچکر دت اشارے سے بوائے کو بلاتا ہے اور ایک چونی دے کر:-

میرا کام ہو گیا۔ لو یہ تمہارا بکسس (بخشش) ہے۔ اچھا بولو تمہارا صاحب کے روم میں روج روج ڈاکٹر کس واسطے آتا ہے۔ کون بیمار ہے؟ ہم تو کوئی

بیمار نہیں دیکھا۔

بوا :۔ وہ دوسرا کمرا میں ہے۔ میرے صاحب کا دوست منصور بابو ہفتہ روج ہوا اس کو کہیں سے رکشا پر اُٹھا لایا ہے۔ پھکیر دیکھو پڑتا ہے۔ سسرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ دوا لاؤ، پھل لاؤ، دودھ لاؤ۔ رات کو جاگ جاگ کر اسکو ٹھنساؤ۔ ہم تو سو جاتا، مگر صاحب کھد جاگتا ہے ہم کیا کرے۔ سسرے کے پاؤں تک دابتا ہے، پنکھا کرتا رہتا ہے۔

تیسرا منظر

بھوانی پور کی سڑک۔ دت ٹرام کا منتظر کھڑا ہے۔ پیچھے دو فقیر باتیں کر رہے ہیں۔ دت کان لگاتا ہے۔

پہلا فقیر :۔ بڈھا کلو آج ایک ہفتہ سے غائب ہے۔ خبر نہیں کس جہنم میں جا پڑا۔

دوسرا فقیر :۔ مر گیا ہوگا سالا۔

پہلا :۔ پھر اُس کی لاش کیا ہوگئی؟ نہ کسی کو اُٹھاتے دیکھا نہ چیل کوّوں کو کھاتے، ضرور کوئی اُسے اُڑا لے گیا۔

دوسرا :۔ نہ وہ کوئی جوان عورت تھا نہ سونے کی تھالی۔ اس کی سوکھی ہڈیوں کو تو گدھ اور چیل کوّے بھی نہ پوچھیں۔

پہلا :۔ لے تو کیا جانے۔ تیرے باپ کو پتہ نہیں کہ وہ کیسی سونے کی چڑیا تھا۔ تو اندھا بنتے بنتے سچ مچ اندھا ہو گیا۔

دوسرا :۔ تو کہاں کا لنگڑا ہے۔ ایک ٹانگ موڑے بیساکھی پر پھرنے سے لنگڑا بن گیا۔

پہلا :۔ اچھا بھیا نہ تو اندھا نہ میں لنگڑا۔ بلکہ ہم دوسروں کو اندھا بناتے ہیں۔ اس میں لڑائی کیا ہے؟ تو نے پوری بات سُنی نہیں اور گرم ہو گیا۔ کاتا اور لے دوڑی۔

دوسرا :۔ نا بھیا۔ بگڑنا کیسا۔ سچ مچ کے مجبور نہ سہی فقیر تو ہیں۔ فقیر بگڑیں گے کیا؟

پہلا :۔ اچھا تو سُن۔ کلو ویسے تو ایک ایک پیسہ کے لئے ایک ایک میل راہگیروں کا پیچھا کئے چلا جاتا ہے اور بہوں کے پھینکے ہوئے جھوٹے کھانوں پر بسر کرتا ہے لیکن اس کے پاس ایک ہانڈی اشرفی ہے ایک ہانڈی۔ جو اُس نے کہیں گاڑ دی ہے۔ کہاں گاڑی ہے خبر نہیں۔ ایسے شخص کو کوئی اُڑا لے جائے تو [illegible] کی کیا بات ہے؟ پتہ لگانا چاہتے۔ اتنا دھن غیروں کے ہتھے چڑھ جائے اور ہم آنکھوں کے ساتھی آنکھوں پر پٹی اور پاؤں میں لتا باندھے بارش دھوپ ٹھنڈ میں زندگی کاٹیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم پتہ لگا چھوڑیں گے۔

دت :۔ (آپ ہی آپ) اچھا مسٹر کلیم کے ٹھاٹھ کا بھید یہی معلوم ہوتا ہے۔ جیسا ذلیل کر کے ان دونوں نے مجھے نکالا ہے میں مزا چکھاتا ہوں۔ پولیس کو تفتیش میں لگاتا ہوں۔ بچو جی کو کڈنیپنگ اور چوری میں چالان نہ کروایا تو اسو توش دت نہیں چار۔

ٹرام سامنے آتی ہے دت سوار ہو جاتا ہے

چوتھا منظر

شام۔ ایڈن گارڈن۔ مسز اور مس لیسی ایک بنچ پر۔

مسز لیسی :۔ مسٹر کلیم کیا ہو گئے روزی؟ ایک ہفتہ سے اُن کا پتہ نہیں۔ آج تمہاری سالگرہ کے دن بھی نہ آئے۔ ان کا پتہ تو معلوم ہوگا۔

مس لیسی :۔ جی ہاں۔ اُنہوں نے مجھے ایک اچھی سی سونے کی رسٹ واچ آج کے دن نذر کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

مسز لیسی :۔ آج کل کے جوانوں کے وعدوں کا اعتبار ہی کیا۔

مس لیسی :۔ مگر اماں مسٹر کلیم ان نوجوانوں میں نہیں۔ کتنے تحفے وہ مجھے دے چکے۔ ایک گھڑی کے لئے وہ مُنہ چھپانے والے نہیں۔ ضرور کوئی بات ہے۔ دریافت کرنا چاہیئے۔

مسز لیسی :۔ خط بھیجا جائے۔

مس لیسی :۔ نہیں وقت زیادہ صرف ہوگا۔ اور کیا معلوم کس کے ہاتھ پڑ جائے۔ میں خود جاؤں گی۔

مسز لیسی :۔ تم تنہا! نہیں پیاری یہ غدار شہر ہے۔ اس کے پیٹ میں کیا کیا بلائیں بھری ہیں اور کس وقت نکل پڑتی ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا۔ نا میں تمہیں اکیلی جانے کی صلاح نہ دونگی۔

مس لیسی :۔ آپ بھی اماں کیا باتیں کرتی ہیں۔ اچھا ساتھ چلئے آپ نیچے ہی ٹھہرئیگا میں جا کر کمرے میں دیکھوں گی۔ موقع کے موافق آپ کو بُلا لونگی یا ہم لوٹ آئینگے۔ خدا کرے بیچارے خیریت سے ہوں۔

پانچواں منظر

کلیم کا کمرہ

منصور :۔ کلیم تم بالکل جذباتی ہستی ہو، غیر عملی۔ میں کہتا تھا یہ بڈھا فقیر تمہارے کام کا نہیں رہا تو اسے جلد سے جلد دُور دفان کر دو۔ تم نے ترس کھا کر اُسے رہنے دیا۔ اب بے محنت مشقت لطیف اور مقوی غذائیں کھا کھا کر مرنے کے عوض شاید بیماری کے پہلے سے بھی زیادہ تندرست اور مضبوط ہو گیا۔ اور جانے کا نام نہیں لیتا۔ کل افیون کی فرمائش بھی تھی۔ اب تو وہ ہسپتال جانے پر بھی راضی نہیں۔ پندرہ روپے نقد لے کر گھر سے کہیں اُٹھ جانے پر آمادہ

ہے مگر ہسپتال نہ جائے گا۔ آخر یہ رشوت کیوں طلب کرتا ہے۔ یا تو اُسے ہماری
نیت کا کچھ اندازہ مل گیا ہے۔ یا ہمیں بڑا سیٹھ سمجھتا ہے۔
کلیم:۔ ہم تو پندرہ روپے دیکر بھی اسے دفع کر دیں مگر اب پیسے کہاں ہیں۔
میری جیب تو خالی تھی ہی اس کمبخت کی تیمارداری نے تمہاری جیب بھی خالی
کر دی۔ (گانے لگتا ہے)

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ بنے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
اس نزاکت کا بُرا ہو! وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو اُنہیں ہاتھ لگائے نہ بنے
بکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

منصور:۔ اب تم پہونچ گئے روز الیبی کے پاس۔ سخت احمق نامعقول ہو۔
تمہیں اس وقت گانے کی سوجھی ہے اور سر پہ آفت کھڑی ہے۔
کلیم:۔ آفت تو آتی ہی جاتی رہیگی۔ مگر اس فقیر نے ایک ہفتہ سے روزی
کے دیدار سے محروم کر رکھا ہے۔ اسے خوب یاد آیا کل اس کی سالگرہ کا دن
تھا۔ جانے دل میں کیا کیا خیال کرتی ہو گی۔ منصور تم جو کہو دل کی گہرائیوں
میں مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ کسی کے کام آگیا۔ ایک مرتا فقیر ہمارے
ہاتھ سے بچ گیا۔ کم سے کم اتنا اطمینان تو ہو گیا کہ چھوٹے ابا کبھی میرا جیب
خرچ بالکل بند کر دیں تو میں اسی طرح فوٹ پاتھ پر جا پڑوں گا۔ اور میری
طرح کسی گدھے کے جی میں آ ہی جائے گا کہ مجھے اسی طرح گھر اٹھا لیجائے
منصور:۔ تمہیں شاعری اور دل لگی سوجھ رہی ہے۔ یہاں سر سے آئی
ہوئی بلا ٹالنے کا سوال ہے۔ تمہارے یہ چچا جان تمہیں کو چچا بنائے دیتے
ہیں۔

ڈاکٹر بنرجی داخل ہوتے ہیں۔

یہ دوسری مصیبت ہیں۔ آداب عرض ہے۔ آیئے ڈاکٹر صاحب۔
ڈاکٹر:۔ تسلیم۔ کہیئے علیم الدین صاحب تو بالکل اچھے ہیں؟
کلیم:۔ جی ہاں آپ کی عنایت سے بالکل اچھے ہیں۔
ڈاکٹر:۔ میں ایک مریض کے ہاں جا رہا ہوں۔ میں نے کہا ذرا آپ کے چچا کو
دیکھتا جاؤں۔

پہلو کے کمرے سے چلا جاتا ہے

تار کا پیادہ داخل ہوتا ہے۔ تار دیتا ہے۔ کلیم پڑھتا ہے۔

کلیم:۔ لو بھئی مرے پہ سو دُرّے۔ (پڑھتا ہے) "بالکل اچھا ہوں۔ مزید سیاحت
ملتوی۔ منگل کی شام کو کلکتہ پہونچونگا۔" یہ تار چچا نے بمبئی پہونچکر دیا ہے۔
بہت تنگ وقت میں۔ اب کیا ہو؟ وہ مرگِ ناگہاں کی طرح پہونچا ہی چاہتے
ہیں اور یہ چچا اب تک سر پر سوار ہے، اور ساتھ ہی یہ بیہودہ ڈاکٹر۔
منصور:۔ کم سے کم ڈاکٹر کو تو رخصت کر دیا جاتے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی
موٹر رکا۔ وہ ہارن بجا۔

مُنہ کھولے ایک دوسرے کو دیکھتا ہے۔ بوا داخل ہوتا ہے

بوا:۔ ایک مہمان آئے ہیں۔
کلیم:۔ سلام دو۔

ایک موٹے تازے بُزرگ شیروانی، ترکی ٹوپی، اوسط
ڈاڑھی، نپے تُلے قدموں سے داخل ہوتے ہیں۔ پیچھے
پیچھے اُن کا مُلازم اور بوا سامان لئے آتا ہے۔

کلیم:۔ آداب عرض کرتا ہوں ابا۔
علیم الدین:۔ علیکم السلام۔ جیتے رہو بیٹا منصور؟ اچھے ہو بیٹے؟۔

دونوں سے گلے ملتے ہیں

کلیم:۔ آپ کا تار ابھی اسی دم ملا ہے۔ بمبئی درکنار ہمیں اسٹیشن تک بھی قدمبوسی
کو حاضر ہونے کا موقع نہ دیا۔ اور یکایک مراجعت کا باعث کیا ہوا خیر تو ہے؟
علیم الدین:۔ سب خیر ہے۔ باطمینان باتیں ہونگی۔ غلام حقہ تیار کرو۔

کپڑے اتارنے لگتے ہیں۔
پہلو کے کمرے سے ڈاکٹر نکل آتا ہے

ڈاکٹر:۔ کلیم صاحب علیم الدین صاحب بالکل صحیح ہیں۔
علیم الدین:۔ (حیرت سے مُڑ کر) تسلیم۔ بالکل اچھا ہوں۔ یہ کون صاحب ہیں
کلیم، آپ کی تعریف کرو۔
کلیم:۔ جی یہ ڈاکٹر اتول چندر بنرجی ہیں۔ آپ میرے چچا مولوی علیم الدین سشن
جج وظیفہ خوار ہیں۔ ابھی بیرونی ممالک کی سیاحت سے واپس تشریف لائے ہیں۔
ڈاکٹر:۔ اور یہ مریض بزرگ بڑے چچا ہیں۔ مگر نام ایک ہی ہیں یا میری سمجھ کی
غلطی ہے۔
علیم الدین:۔ یہ مریض چچا کون ہیں؟
منصور:۔ جی عرض کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی توجہ کا بہت بہت شکریہ۔
اب کسی دوا کی ضرورت تو نہیں؟۔
ڈاکٹر:۔ نہیں۔ صرف وہ مقوی دوا جاری رکھی جائے۔ اور ابھی دو روز اور
بے سہارے بیٹھنے نہ پائیں۔ اس مرض میں قلب بہت کمزور ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر رخصت ہوتا ہے۔

اندر سے آواز آتی ہے "ایک بیڑی ملے گی بابا؟" کلیم اندر
چلا جاتا ہے۔

منصور:۔ حضور واقعہ یہ ہے کہ ایک فقیر فوٹ پاتھ پہ بیہوش پڑا تھا۔ کلیم ترس

کھا کر اسے اوپر اٹھوا لائے۔ اس کا نام بھی اتفاق سے علیم الدین ہے۔ ایک ہفتہ کے علاج اور تیمارداری کے بعد اب یہ خطرے سے محفوظ ہے۔ پھر بھی پورے ہوش درست نہیں۔ کبھی کبھی بے جوڑ باتیں بول جاتا ہے۔

علیم الدین۔ شاباش بیٹا کلیم کدھر گئے؟ (کلیم اندر سے آجاتا ہے) مجھے فخر ہے کہ تمہاری تعلیم کا بہترین پھل میں نے آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔

بیرا کارڈ لاتا ہے اور علیم الدین کو دیتا ہے۔ وہ عینک لگا کر پڑھتا ہے۔

مس روز الیسی؟ یہ کون ہے۔ سلام دو۔

مس روز الیسی داخل ہوتی ہے۔ بڑے میاں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوتی ہے۔ کلیم، منصور بدحواس ہونے لگتے ہیں۔

مس الیسی۔ میں نے شاید غلطی کی۔ معاف فرمایئے۔ میں ڈوالف ہوں۔ ۲۲۹ میں بلائی گئی ہوں۔

کلیم۔ جی ہاں یہ ۲۲۷ ہے۔ داہنی طرف ۲۲۸ ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔

علیم الدین۔ کلیم بیٹا مس صاحبہ کو نیچے تک پہونچا آؤ۔

مس الیسی۔ شکریہ۔

دونوں تبسم کے ساتھ باہر چلے جاتے ہیں۔

علیم الدین بیمار کو دیکھنے پہلو کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

منصور۔ (آپ ہی آپ) سب بلائیں بیک وقت ہمارے سر پر پڑنے کو تیار تھیں اور اسی ایک گھڑی کی منتظر تھیں۔ (کلیم واپس آتا ہے) کیوں یار ابتک تو ساری بلائیں خیر سے گذر گئیں۔ مگر مجھے شگون اچھے نظر نہیں آتے۔

کلیم۔ روزی کی تعریف نہ کروگے کیا خوب پارٹ کیا ہے۔

علیم الدین واپس آتا ہے۔

پولیس انسپکٹر، دو کانسٹبل، اور لے ٹی دت نمائندہ ربر پاپوش کمپنی داخل ہوتے ہیں۔

علیم الدین۔ آپ لوگوں نے کیوں کرم فرمایا ہے؟

انسپکٹر۔ اس کمرے میں مسٹر کلیم الدین ایم۔ اے، بی کام رہتے ہیں۔

دت۔ میں شناخت کرتا ہوں کہ (کلیم کو بتاکر) یہی ملزم ہے۔

علیم الدین۔ پہلے آپ مجھے واقعہ بتایئے۔ میں سرکاری وظیفہ خوار سشن جج علیم الدین ہوں ابھی بیرونی ممالک سے واپس آرہا ہوں اور یہ نوجوان میرا لڑکا ہے۔ بھتیجا۔ شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

انسپکٹر۔ (ہاتھ ملاکر) آداب عرض ہے۔ میں آپ کے نام سے واقف ہوں۔ معاف فرمایئے فرض سے مجبور ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جنٹلمین (دت کو بتاکر) کی اطلاع پر میں کالی گھاٹ سے ایک بوڑھے فقیر کی چوری کی تحقیقات میں آیا ہوں۔

علیم الدین۔ چوری؟ فقیر کی چوری؟ کیا معنی؟ جواہرات سے لیکر پن کی چوری سُنی ہے۔ یہ فقیر کی چوری کیسی۔

انسپکٹر۔ جی ہاں مجازاً چوری۔ کسی آدمی کو بجبر اُٹھالے جانا۔

فقیر دیوار کے سہارے لڑکھڑاتا کمرے میں پہونچ جاتا ہے

فقیر۔ کیا کہا داروغہ جی چوری؟ آپ کے سر کی بڑی چیز کی، پاک پروردگار کی قسم مدت ہوئی میں چوری کا پیشہ چھوڑ چکا ہوں، بھیک پر بسر کرتا ہوں۔ میں بے ہوش ادھ مرا سڑک پر پڑا تھا، ان سیٹھوں کا اللہ بھلا کرے، خبر نہیں مجھے کیسے اُٹھا لائے ڈاکٹر سے علاج کرایا، صاف کپڑے اور بستر دئے اور ایسی غذا جو کبھی میرے باپ نے نہیں کھائی۔ اللہ سب کا بھلا کرے۔ داروغہ جی خدا گواہ ہے پانچ برس سے میں نے ایک سوئی نہیں چرائی، صرف بھیک کا گنہگار ہوں۔

انسپکٹر۔ ارے کلو تو ہے؟ لچا اٹھائی گیرا بدمعاش۔ ان بھلے آدمیوں کے ہاں بڑا چین اڑا رہا ہے؟ اور خود ایک ہانڈی اشرفی کا مالک ہے؟

کلیم جھپٹ کر دت کو کونے میں دبوچتا ہے۔ منصور بیچ بچاؤ کرتا ہے۔ علیم الدین اور انسپکٹر دت کو ان کے ہاتھوں سے چھڑاکر کرسی پر بٹھاتے ہیں۔ ہاتھا پائی میں دت کی مونچھیں نیچے گر جاتی ہیں۔

انسپکٹر۔ یہ کیا! اہا یہ تو نرنجن داس ہے جو بجلی کمپنی ڈھاکہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے گاہکوں سے دس ہزار روپے وصول کرکے روپوش ہے۔ لاؤ تو اپنا ہینڈ بیگ۔

کاغذات دیکھے جاتے ہیں۔ راجہ صاحب ہری پاڑا کے دس ایکڑ قطعہ زمین پر کسی کارخانہ کا قیام مشتبہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈائرکٹروں کی فہرست میں اکثر نام نقلی ٹھہرتے ہیں۔ دت بھاگنا چاہتا ہے۔ منصور اُسے پکڑ لیتا ہے۔

انسپکٹر۔ سپاہیو، بابو صاحب کو گرفتار کرلو۔

سپاہی گرفتار کر لیتے ہیں

یہ ایک دلچسپ مقدمہ ہوگا۔ کلیم صاحب اس تکلیف دہ مداخلت کو معاف فرمایئے گا۔ میں اپنے فرض سے مجبور تھا۔ نرنجن داس میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے خود مجھے ایک بڑی فکر سے نجات دلائی۔

علیم الدین۔ چاہ کن را چاہ درپیش۔

انسپکٹر سپاہی اور دت رخصت ہوتے ہیں۔

محمد مسلم

ایک ایکٹ کا ڈرامہ ۔

سانپ

افراد

رفیعہ ۔ ہلکی پھلکی تیتری کی مانند۔ بھوری جاندار آنکھیں اور بات کے ساتھ جنبش کرنے والی بھویں۔ موٹے ابھرے ہوتے ہونٹ اور چھوٹی سی ناک۔ گمر رنگ نہایت شفاف۔ چہرے پر بوقت ضرورت غصہ اور معصومیت دونوں اپنا اپنا رنگ دکھا سکتے ہیں۔ لوگ اُسے حسین کہتے ہیں۔

سیّد ۔ رفیعہ کا بھائی۔ گورا رنگ، درمیانہ قد، سریع الحس اور زود رنج۔ لیکن جلد ہی من جاتا ہے۔ مگر چہرے اور آنکھوں کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے کہ پتہ نہیں چلتا ابھی غصہ ہے یا من چکا ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ رفیعہ سے چھوٹا ہے یا بڑا۔ یقیناً دونوں توام تو نہیں۔

خالدہ ۔ گدرا بدن، اگر احتیاط نہ کرے تو گول مٹول ہو جاتے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں جنہیں وہ جان کر نیم باز رکھتی ہے۔ گندمی رنگ پاؤڈر کی مدد سے ذرا کھلتا ہوا سنہرہ۔ پھولے ہوئے گال جن سے معصومیت ٹپکتی ہے۔ اور غصہ تو گویا آتا ہی نہیں۔ تراشے ہوئے بال گچھوں کی صورت میں شانوں پر پڑے رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ اور بادامی ناخون۔ چلتے میں بار بار معصومانہ غرور سے دونوں شانوں کو دیکھتی ہے۔

غفّار ۔ نہایت حسین اور نازک اس کے باوجود دراز قد، شاعرانہ چال اور مصوروں کے سے صاف اور ستھرے ہاتھ۔ ہندوستان میں اتنے دلکش چہرے بہت کم نظر آتے ہیں۔ یہ رفیعہ کی خوش قسمتی ہے کہ غفار سے اس کی منگنی سی ہو گئی تھی۔ اور اب شادی میں کچھ زیادہ دیر نہ تھی۔ اس کے علاوہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا۔ دادی جان کے اصول کے مطابق اپنے گھر اور کالج کے علاوہ آج تک قسم لے لو کہیں نہیں گیا۔ ہاں سسرال آجاتا ہے۔ یہاں اسے شرم اس قدر آتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رفیعہ سے بے تکلف بھی نہیں۔

نوکر ۔ ایسا جیسے عام نوکر ہوا کرتے ہیں۔ فرمانبردار، محنتی، ڈانٹ برداشت کرنے والا۔

وقت ۔ صبح آٹھ بجے۔ گرمی کے دن۔

لباس ۔ بہترین فیشن کے۔

اسٹیج ۔ صرف ایک کمرہ جس میں سیّد رہتا ہے۔ اور ایک امیرانہ ٹھاٹ کا ڈرائنگ روم۔

(سیّد کا کمرہ۔ کمرے میں داہیں اور باہیں ایک ایک دروازہ اور پشت پر ایک دروازہ اور کھڑکی۔ جس میں سے باغ کے پیڑ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ایک پلنگ اور چند کرسیاں، اور میزوں پر کتابیں رکھی ہیں۔ ایک آرام کرسی پر سیّد آئنے کو جھکا ہوا شیو کر رہا ہے۔ شیو کا سامان ایک بہت ہی چھوٹی میز پر رکھا ہوا ہے۔ جس پر سے کوئی چیز اُٹھانے میں بڑی مہارت کی ضرورت ہے، ورنہ دو تین چیزیں اور کھچی چلی آتی ہیں۔ سیّد کے چہرے پر کسی تازہ غم کے آثار ہیں۔ جسے معلوم ہوتا ہے وہ بہت چھپا رہا ہے۔ ذرا میلا سا سارات کا لباس پہنے ہے اور بے انتہا سنجیدہ، بھویں چڑھائے بیٹھا ہے۔)

رفیعہ ۔ (ایک بادامی رنگ کے کوٹ کے بازو پر ایک سیاہ پٹی ٹانکتی ہوئی آہستہ آہستہ آتی ہے۔) لو سیّد۔ (دانت سے تاگہ توڑتے ہوتے) لاؤ اُس دودھیا کوٹ کو بھی ٹھیک کر دوں۔

سیّد ۔ (شیو روک کر بھنا کر کھڑا ہو جاتا ہے) ہیں؟ ٹھیک کر دوں! کیا ٹھیک کرو گی؟ (عاجز آکر) بھئی۔۔۔ آخر یہ میرے ہر کوٹ کے پیچھے کیوں

پڑ گئی ہو۔ (کوٹ چھین کر) چھوڑو ادھر۔ آخر یہ کیوں؟

رفیعہ:۔ (سنجیدگی سے ڈورے میں گرہ لگاتے ہوئے) ہوں۔ تو تمہارا ارادہ ہے کہ اباجان کے انتقال کے بعد ذرا بھی اظہارِ غم نہ کرو۔ آخر دنیا کیا کہے گی کہ ایک ذرا سا کالا ٹکڑا لگانا بھی دشوار ہے۔ لاؤ ادھر دھیا کوٹ کہاں ہے۔

سید:۔ کیا کہے گی دُنیا؟ بکنے دو۔ مجھے یہ دکھاوٹ پسند نہیں۔

رفیعہ:۔ تم تو... بس۔ دیوانے ہو۔ آخر اس میں کیا بُرائی ہے۔

سید:۔ ہونے دو مجھے دیوانہ۔ کیا دُنیا میں ہمیں ڈگی پیٹنی ہے کہ ہمارے باپ کا انتقال ہو گیا جس کا ہمیں بہت ہی صدمہ ہے۔ یقین نہ آئے تو لو دیکھ لو یہ کالی پٹی۔

رفیعہ:۔ یہ تو میرا مطلب نہیں۔ (کرسی پر بیٹھ کر ناخون سے تاگہ سونت رہی ہے)

سید:۔ پھر آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ یہ جو تم نے سیاہ کپڑے پہنے ہیں۔ خوب جانتا ہوں کیوں پہنے ہیں۔

رفیعہ:۔ کیوں پہنے ہیں ذرا بتانا تو سہی؟

سید:۔ اس لئے کہ ذرا گوری نظر آؤ۔

رفیعہ:۔ پاگل۔ کیا میں ویسے نہیں پہن سکتی تھی۔

سید:۔ (کچھ نہ سُن کر تولیہ سے منہ رگڑتے ہوئے) اور دوسرے اس لئے کہ کالج کے لڑکے سوچیں بڑی... فرمانبردار بیٹی ہے۔ دیکھو نا کیسے ماتمی لباس پہن رہی ہے بیچاری۔

رفیعہ:۔ (نفرت سے) اوہو... قطعی نہیں۔

سید:۔ پھر شاید اس لئے کہ لوگوں پر ظاہر کر دو کہ تمہارا مذاق اِس معاملے میں شیلہ، خالدہ وغیرہ سے بلند ہے۔ وہ کبھی اتنے میچنگ ماتمی لباس نہیں پہن سکتیں جتنے تم پہن سکتی ہو۔

رفیعہ:۔ جھوٹ، بالکل غلط۔ شیلہ اور خالدہ دونوں کے باپ زندہ ہیں۔

سید:۔ (لاپروائی سے) تو مائیں مری ہونگی۔

نوکر:۔ (دروازہ میں آکر دو ایک بار کھنکارتا ہے اور کوٹ کا کالر کھینچتا ہے) اہم۔ سرکار... غفار میاں آئے ہیں۔

سید:۔ (غصہ سے کرسی دھکیلتا ہے) اونہہ! لاحول ولاقوۃ۔

رفیعہ:۔ کیوں یہ آخر اِترانے کیوں لگے۔

سید:۔ (ویسے ہی چڑ کر) یہ کہاں کی رسم ہے کہ ایک تو انسان ویسے ہی پریشان ہو اور اوپر سے لوگ آکر جان کھائیں۔

(ڈریسنگ گاؤن پہن لیتا ہے)

رفیعہ:۔ مگر سید، غفار ہیں۔

سید:۔ (گھٹی ہوئی آواز میں) غفار نہیں اُس کا باپ بھی ہو تو میں کیا کروں؟ مجھے اِن پرسہ دینے والوں سے چڑ ہے۔ بار بار، بار بار گویا چھیڑنے چلے آرہے ہیں۔

رفیعہ:۔ (طنز سے) صبح سے نہ جانے کون کون تمہارے دوست چلے آرہے ہیں تو کچھ نہیں اب غفار کے آنے سے جل گئے۔

سید:۔ (جھلا کر) تم اور مجھے جلا رہی ہو۔ جو بھی آرہے ہیں بیوقوف ہیں۔ مانا کہ غفار تمہارا منگیتر ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ ہر وقت سر پر ہی سوار رہے۔

رفیعہ:۔ (چڑ کر) واہ! شرم نہیں آتی۔ سب کے سامنے میرا منگیتر کہہ دیا کرتے ہو۔

سید:۔ اوہو۔ تو گویا آپ شرماتی ہیں نا اپنے منگیتر سے۔

رفیعہ:۔ یوں تو نہ کہو۔ کافی شرماتی ہوں۔

سید:۔ (منہ سکیڑ کر) بڑی شرماتی ہو۔ میں کہتا ہوں جب تمہیں اُس سے شادی ہی نہیں کرنی تو پھر اُس سے چالیں کیوں چلا کرتی ہو۔

رفیعہ:۔ لے ہے سید باولے نہ بنو۔ (آہٹ سُن کر) شش۔ چپ!

(آہستہ سے پردہ ہلتا ہے اور غفار اندر آتا ہے۔ حسین اور بھولے چہرے کو غم اور گھبراہٹ نے اور بھی معصوم بنا دیا ہے۔ تھوڑی دیر تک بے تکی خاموشی چھائی رہتی ہے۔ تینوں بے چین ہیں۔ سید کو غصہ بھی۔)

غفار:۔ (سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے ہمت کر کے) اُف! کس قدر اداسی چھائی ہوئی ہے۔

سید:۔ (گھٹتے ہوئے لہجہ میں) معاف کرنا... غفار یہی۔ بالکل یہی جملہ تم صبح دُہرا چکے ہو۔

غفار:۔ (سٹپٹا کر رحم طلب نگاہوں سے رفیعہ کو دیکھتا ہے جو سید کو تنبیہاً گھورتی ہے۔ ہمت کر کے) رفیعہ آپ کا ارادہ تعلیم جاری رکھنے کا ہے؟

سید:۔ (رفیعہ کے بولنے سے پہلے ہی) کیوں؟ بھلا ایسی کیا خوشی کی بات ہوئی ہے جو یہ پڑھنا چھوڑ بیٹھیں گی۔ خوب!

غفار:۔ (گھبرا کر) یہ میرا مطلب نہیں.... میرا مطلب ہے کہ اماں جان تنہا ہو جائیں گی۔

سید:۔ ہونہہ! جیسے یہ اُن کے پہلو سے ہی تو لگی بیٹھی رہتی ہیں۔

غفار:۔ انہیں ایک غمخوار اور ہمدرد کی تو ضرورت ہوگی۔

سید:۔ (جل کر) کس قدر بیوقوف ہو تم! بھلا یہ بیگم صاحبہ اماں جان کی کیا دلجوئی کریں گی۔ ابھی اُن کے شوہر کا انتقال ہوا ہے اور یہ قطعی نعم البدل نہیں ہو سکتیں۔

رفیعہ۔ (تنبیہاً) سید!!

غفار۔ (مُردہ آواز میں) بھئی سید نہ میں تمہاری طرح چالاک ہوں نہ چرب زبان۔

سید۔ تو پھر آپ کو ایسی پُرسہ دینے کی آفت کیا پڑی ہے۔

رفیعہ۔ (ذرا ڈانٹتے ہوئے) سید! تم تو انسان کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔

سید۔ (لڑائی کے لہجہ میں) تم کون۔ تم کون غفار کی حمایت لینے والی۔ اُسکے منہ میں کیا زبان نہیں ہے۔

رفیعہ۔ زبان تو ہے پر تمہاری طرح منہ میں تلوار نہیں ہے۔ میں کیوں نہ لوں حمایت۔

غفار۔ (ذرا سنبھل کر) اگر رفیعہ میری حمایت بھی لیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ یہ اُن کی مہربانی ہے۔

سید۔ (جلکر) حمایت... تم... تمہیں اس سے بہت مہربانیوں کی اُمید ہے؟

رفیعہ۔ (جلدی سے) سید دیکھو تم نے پھر میرا دل دُکھانے کی باتیں کیں۔ ابا جان کے انتقال کے بعد سے تم بہت ہی وہ ہو گئے ہو۔

سید۔ اُونہہ! یہ سب مکاری ہے۔

رفیعہ۔ (روآنسی ہوکر) ہر وقت میرے پیچھے ہی پڑے رہتے ہو۔

سید۔ (جلکر) تمہارے؟.... تمہارے! ارے کیوں... بس... یہ سب ہمدردی وصول کرنے کے لئے ہے.... (اُسے واقعی رونے پر تیار دیکھکر) اچھا بھئی غفار شروع کرو تم اپنی تقریر... ہاں کیا کہہ رہے تھے... کہ بڑی... وہ۔ اُداسی چھا رہی ہے... ہاں۔ اور؟

(غفار کھسیانی ہنسی ہنستا ہے)

(تھوڑی دیر پھر وہی بے تکی خاموشی)

غفار۔ (ہمت کرکے) رفیعہ تمہیں اتنا رنج نہ کرنا چاہیئے۔

سید۔ (جلدی سے) اِتنا۔ کتنا؟

(رفیعہ رومال سے آنسو نہیں آنکھیں پونچھتی ہے۔)

غفار۔ (سید کی موجودگی کو بھولنے کی کوشش کرکے) رونا نہیں چاہیئے رفیعہ مرحوم کو دُکھ ہوگا۔

(سید جلکر زور سے ہنستا ہے اور بڑے آئینے کے پاس جاکر تولیہ سے منہ پونچھتا ہے اور اپنی شکل اور بال دیکھتا ہے)

غفار۔ (مستعدی سے) رفیعہ تمہاری صحت پر اثر پڑنے کا ڈر ہے۔

(سید بے تاب ہوکر جلدی سے غسل خانے میں چلا جاتا ہے۔ غفار کو بہت ناگوار گذرتا ہے۔)

غفار۔ (جو تنہائی کو بہترین موقع سمجھتا ہے) رفیعہ... تمہیں رنجیدہ دیکھکر جانتی ہو میرا کیا حال ہوتا ہے؟

رفیعہ۔ (بڑی معصوم آواز میں) اب رنج کرنا نہ کرنا تو اپنے بس کی بات نہیں ہے۔

غفار۔ (سرگوشی میں) رفیعہ! (گویا اس کے نام میں کوئی مزہ ہے ایسے منہ میں زبان پھیرتا ہے) رفیعہ صبر کرنا چاہیئے۔ صبر نہ کرے تو تم جیسا انسان کیا سے کیا ہو جائے۔

سید۔ (واپس آکر آخری جملہ سُنکر) ہوں! پھر وہی نخرے۔ (رفیعہ کو اعتراض کی نظر سے دیکھتا ہے۔)

غفار۔ (پہلی دفعہ غصہ ہونے کی کوشش کرکے) سید!

(سید ناک سُکیڑ کر سُوں سُوں کرتا ہے اور چھوٹی سی میز پر سے سنبھال کر کچھ چیزیں اُٹھا کر بڑی میز پر رکھ آتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ تینوں پر جھنجھلاہٹ اور بے تکاپن چھا جاتا ہے۔ سید انگلیوں سے کوئی بے سُری گت گھٹنوں پر بجا رہا ہے۔ رفیعہ بار بار رومال کا کونا بدل رہی ہے۔ غفار اپنی انگشتری والی شاعرانہ اُنگلی کے ناخون کو گھبرا گھبرا کر دانتوں سے ٹٹول رہا ہے۔)

غفار۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر) اچھا تو اب اجازت ہے۔

سید۔ (چونک کر تیزی سے) بڑی خوشی سے!

غفار۔ (ٹکا توڑ جواب سے مُردہ دل ہوکر) میں... میں!

(چلا جاتا ہے)

سید۔ (غفار کے جانے کے بعد) ہونہہ! مکار۔

رفیعہ۔ (بل کھاکر) دیکھو سید تمہاری حرکتیں.....

سین ۲۔

(ڈرائنگ روم میں رفیعہ بیٹھی شیشے کے مرتبان میں مچھلیوں کو توس کے ٹکڑے ڈال رہی ہے۔ سید بہت سے خط اور پیکٹ لئے آتا ہے۔ ایک ایک کو بار بار دیکھتا ہے اور اُلٹ پلٹ کرتا ہے۔)

سید۔ ہم.... الہ آباد سے جواب ہی نہیں آیا۔

رفیعہ۔ (مڑکر) آہا ڈاک آگئی۔ کوئی میرا خط؟

سید۔ (صوفے پر خطوں کو ڈالتے ہوئے) سب تمہارے ہی ہیں۔ میرا تو ایک آیا ہے... یہ مکھن والے کا بل۔

(رفیعہ جلدی سے خط اُٹھاتی ہے اور کھول کر بڑی تیزی

سے پڑھنا شروع کر دیتی ہے۔ بار بار ہنستی ہے۔)

سید۔ کس کا خط ہے؟

(رفیعہ سنتی ہی نہیں پڑھنے میں مشغول ہے)

سید۔ (زور سے) مَیں کہتا ہوں کس کا خط ہے؟

رفیعہ۔ (سر ہلا کر ٹالتے ہوئے) ایک کا ہے۔

سید۔ آخر وہ ایک ہے کون؟

(رفیعہ دوسرا خط پڑھکر اور بھی زور سے ہنستی ہے)

سید۔ (بے تاب ہوکر) مَیں کہتا ہوں آخر تمہارے پاس اس قدر خط کیوں آتے ہیں۔

رفیعہ۔ یہ ڈاکیئے سے پوچھو وہی لاتا ہے۔ (مشغول ہے)

سید۔ نہ جانے کیسے کیسے خط۔ اور ایسے بیہودہ بیہودہ۔ مَیں کہتا ہوں، بے حیائی کی بھی کوئی حد ہے۔

رفیعہ۔ تم، تمہیں کون منع کرتا ہے تم بھی خط منگوالو اِس سے بھی بیہودہ خط——!

سید۔ مگر مَیں یہ باتیں پسند نہیں کرتا۔

رفیعہ۔ (چُمکار کر) تم بڑے اچھے بیٹے ہو!

سید۔ (غصہ سے) مَیں واقعی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ مجھ سے کئی لوگوں نے کہا۔۔۔ کہ۔۔۔۔

رفیعہ۔ (بالکل بے تعلقی سے) ہوں۔۔۔ کیا کہا؟

سید۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ مگر مَیں تو ذلیل ہوتا ہوں۔ اچھا تم اِسے عبدالرحمٰن کو کیوں خط لکھتی ہو۔

رفیعہ۔ (سادگی سے) چند ضروری باتیں پوچھنی تھیں اس لئے۔

سید۔ مَیں جانتا ہوں وہ ضروری باتیں کیا ہیں۔

رفیعہ۔ جب جانتے ہی ہو تو پھر کیوں میرا دماغ چاٹ رہے ہو۔

سید۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے۔ اور وہ عبدالرحمٰن تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

رفیعہ۔ اوہو۔ تب تو بڑی اچھی بات ہے۔

سید۔ کیسے بنتی ہو جیسے تمہیں معلوم ہی نہیں۔

رفیعہ۔ اے بیوقوف۔ معلوم ہوتا تو مَیں اُس کے چھ خطوں کا جواب کیوں گول کر جاتی۔ آج۔۔۔۔ یہ دیکھو لکھا ہے یہ "ساتواں خط ہے" دیکھو نا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو یقیناً۔۔۔۔

سید۔ تم اُس سے شادی کرو گی۔

رفیعہ۔ دیکھو زور زور سے نہ کہو، غفار سُن لے گا تو بس——

سید۔ بکو مت۔ میں تم سے پوچھنا بھول گیا۔۔۔ تم۔۔۔ اس۔۔۔ سے شادی کروگی؟ (ایک ایک لفظ صاف کہتا ہے۔)

رفیعہ۔ اب اس کا جواب ابھی کیسے دے سکتی ہوں۔

سید۔ کیوں ابھی سے کیا۔ رفیعہ۔۔۔ مگر یاد رکھو اگر تم نے اس بڈھے گھاگ سے شادی کی۔۔۔ تو بس۔

رفیعہ۔ تو بس۔۔۔ کیا؟ تو تم غصہ میں آکر جمن بی سے بیاہ کر لیتا۔ بس۔ مزہ تو رہیگا سید۔ اباجان کے بعد گھر کس قدر۔۔۔۔

سید۔ چپ رہو۔ تو اب تم اُسے خط نہ لکھنا۔

رفیعہ۔ کیوں؟ واہ!

سید۔ نہیں۔ آخر فائدہ۔ تم اس سے شادی تو کر نہیں رہی ہو۔

رفیعہ۔ کیا معلوم۔۔۔ قسمت کی کسی کو کیا خبر؟ فرض کرو غفار مجھ سے شادی نہ کرے اور جیسے کہ تم کہتے ہو ظفر میرے اُوپر تھوکے بھی نہیں تو پھر، یہ۔۔۔ ٹھیک رہیگا۔۔۔ روپیہ بہت ہے۔ سید پھر دونوں۔۔۔۔

سید۔ (غصہ سے جھنا کر) کمبخت چُپ رہ۔ اور پھر کہتی ہے تجھے کچھ نہ کہوں۔

رفیعہ۔ آخر کیوں؟ مَیں کرتی کیا ہوں۔

سید۔ اور پھر پوچھتی ہو "کیا کرتی ہوں"، یہ تم اتنا کیوں اتراتی ہو؟

رفیعہ۔ کون؟ مَیں اتراتی ہوں؟

سید۔ ہاں اور خصوصاً غفار کو دیکھکر۔

رفیعہ۔ ذرا۔۔۔ (جلکر) اچھا جاؤ اتراتے ہیں پھر تمہارا کیا، تم کیوں جلے مرتے ہو۔

سید۔ مجھے غفار پر ترس آتا ہے۔

رفیعہ۔ اوہو۔ بڑا ترس آتا ہے۔ جیسے اُسے کوئی کھائے ہی تو جا رہا ہے۔

سید۔ کھائے ہی جا رہا ہے۔ اور نہیں تو پھر کیا۔

رفیعہ۔ (خط اُٹھاتے ہوئے) تم تو پاگل ہو۔۔۔ یاد ہے وہ بادلا کتا جس نے تمہارے کاٹا تھا تو کسولی گئے تھے۔ جو نہ کرو کم ہے۔

سید۔ ارے مجھ سے چلتی ہو۔ آخر کو تمہارا بڑا بھائی ہوں۔

رفیعہ۔ تو تم ہی بتا دو میں نے غفار کے ساتھ کیا ستم ظلم کئے۔

سید۔ تم اُسے پھانسنے کی کوشش کرتی ہو۔

رفیعہ۔ (متحیر ہوکر) سید! کوئی بھائی بھی اپنی بہن کو ایسی بیہودہ بات کہتا ہوگا۔ پتہ ہے یہ گالی ہے۔

سید۔ (ہاتھ گھما کر) سچی بات میں گالی بھی ہو تو کیا کیا جائے۔

رفیعہ۔ اچھا کھاؤ قسم کہ مَیں غفار کو۔۔۔ توبہ توبہ، پھانستی ہوں۔

سید۔ (اطمینان سے) پھانستی ہی نہیں بلکہ پھانس چکیں۔ اور اب ظفر پر دانت تیز کر رہی ہو۔

رفیعہ ۔ دیکھو سیّد تم بڑی بیہودگی پر اتر آئے ہو۔ میں برداشت نہیں کر سکتی وا یہ بھی کوئی بات ہے۔

سیّد ۔ تو پھر تم کیوں ایسی حرکتیں کرتی ہو۔ آخر اس میمنہ کا خون چوسنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ ہاں ظفر اور چیز ہے۔

رفیعہ ۔ (جلدی سے) اور چیز ... اور چیز سے تمہارا کیا مطلب ہے۔

سیّد ۔ (ایک اخبار موڑتے ہوئے) میرا مطلب ہے ظفر تم سے بھی زیادہ مکّار ہے وہ اُلٹا تمہیں مزہ چکھا دیگا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے نا۔

رفیعہ ۔ (بگڑ کر) دیکھو تم گھما پھرا کر کسی نہ کسی بہانے سے مجھے مکّار کہہ ہی جاتے ہو۔ تمہاری خالدہ بڑی معصوم ہے نا۔

سیّد ۔ خالدہ ؟ لفظ معصوم کے ساتھ تمہیں خالدہ کیسے یاد آسکتی ہے۔ ارے وہ ؟ .... وہ تو تمہاری بھی اُستاد ہے اُسی نے تو تم کو بگاڑا ہے۔

رفیعہ ۔ (دھمکا کر) اچھا۔ کہونگی خالدہ سے۔

سیّد ۔ (بدمزاجی سے) لاحول ولاقوۃ ! ایک دفعہ نہیں لاکھ دفعہ کہدینا۔

رفیعہ ۔ پھر دیکھنا وہ تمہاری کیا گت بناتی ہے۔ صورت بھی نہ دیکھے گی۔

سیّد ۔ ارے وہ مبارک دن آئے بھی کبھی جب وہ میری صورت دیکھنے اور اپنی دکھانے سے باز آئے۔

رفیعہ ۔ (حیرت سے) کیا سچ کہہ رہے ہو تم ؟

سیّد ۔ اور نہیں تو کیا جھک مار رہا ہوں۔

رفیعہ ۔ تمہیں دوڑ دوڑ کر وہاں جاتے ہوئے اُسکی تو جوتی بھی پروا نہیں کرتی۔

سیّد ۔ جوتی پروا نہ کرتی ہوتی تو بھلے ہی دن تھے۔ جوتی میں خالدہ سے تو زیادہ انسانیت ہے۔ مگر وہ تو ... وہ تو یوں (پنجہ گھما کر) مجھے یوں شکنجہ میں کسے ہوئے ہے۔

رفیعہ ۔ کون منع کرتا ہے نکل آؤ نا شکنجہ میں سے۔

سیّد ۔ (جھلا کر) ارے وہ نکلنے بھی دے جب نا۔ وہ ایک پہونچی ہوئی ہے نکلنے کب دے گی۔ جوں ہی نکلنے کی کوشش کرتا ہوں اڑنگا لگا دیتی ہے۔

رفیعہ ۔ بودے ہو تم یوں کہو۔

سیّد ۔ اور کیا بودا نہ ہوتا تو وہ یوں مجھ پر چھا سکتی تھی۔

(داہیں دروازے کا پردہ ہلتا ہے خالدہ ایک سیاہ ساری اور سنہری چھوٹی سی صدری پہنے داخل ہوتی ہے)

خالدہ ۔ (دونوں ہاتھ پھیلا کر ایک طرف سر ڈالکر) رفّی !

رفیعہ ۔ (دوڑ کر اُس سے لپٹتے ہوئے) خلّو !!

سیّد ۔ (جانے کے لئے کھڑے ہو کر نقل میں) اِترانا !!!

خالدہ ۔ (چونک کر) ارے رفّی ! ابھی کون چوں سے بولا تھا ؟ (کان پر ہاتھ رکھکر) کہیں ... بھئی مجھے چوہوں

سیّد ۔ (دانت بھینچ کر) بلیاں ہی چوہے ڈرے گا۔

خالدہ ۔ (مڑ کر مسرت سے) سیّد ڈیر !

(سیّد جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹھوڑی سینے پر ٹیکائے کھڑے گھورتے رہتے ہیں۔)

خالدہ ۔ (جیسے نڈھال ہو کر کرسی پر گر جاتی ہے) رفّی ! میں سیّد سے بہت خفا ہوں۔

سیّد ۔ (ویسے ہی تنے ہوئے) شکریہ !

خالدہ ۔ (تعجب سے) شکریہ ؟ رفّی ! سیّد سے پوچھو آج میرے غصہ پر شکریہ کیسا۔

سیّد ۔ (نقل میں) رفّی ! خالدہ سے کہدو مجھے اُس کے غصّے کی رتی بھر پروا نہیں۔

خالدہ ۔ رفّی اِن سے کہو اِترائیں نہیں !

سیّد ۔ رفّی اِن سے کہدو دبتے نہیں تم سے !

خالدہ ۔ (سنجیدگی سے) رفّی اِن سے کہدو خدا کے لئے اپنی جیبوں میں سے ہاتھ نکال لیں، بالکل ربڑ کا گڈا لگ رہے ہیں۔

سیّد ۔ (جلدی سے جیبوں سے ہاتھ نکال لیتا ہے مگر فوراً ہی شرمندہ ہو جاتا ہے۔ رفیعہ اور خالدہ ایک دوسرے پر گر کر لوٹ جاتی ہیں اور بے بات ہنستی ہیں۔) اور تم ... تم جیسے موم کی پُتلیاں، منوں پاؤڈر تھوپ لیا اور بن گئیں حسین۔

خالدہ ۔ (چہرے کے پاؤڈر کو احتیاط سے تھپتھپاتے ہوئے) رفّی میں پاؤڈر لگاتی ہوں ؟

رفیعہ ۔ (جھوٹ بول کر) نہیں تو۔

خالدہ ۔ (ڈانٹ کر) پھر ... پھر سیّد نے کیسے کہا ؟۔

رفیعہ ۔ (خوشامد سے) غلطی ہوئی بیچارے کی۔

سیّد ۔ بالکل نہیں۔ تم دونوں پوڈر لگاتی ہو اور بھویں بھی اُکھیڑتی ہو۔

رفیعہ ۔ آہا ... (مذاق اُڑاتے ہوئے) اُکھیڑتی !!

خالدہ ۔ ہاں "اُکھیڑتی"۔ بھویں نہ ہوئیں خیمے ہو گئے جو اُکھیڑے جائیں۔

سیّد ۔ (کھسیا کر) اور کیا ....

خالدہ ۔ رفّی یہ سراسر بہتان ہے، نہ ہم پوڈر لگائیں نہ بھویں اُکھیڑیں۔ ہم قطعی اتنے ہی حسین ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ اور سیّد کو خدا کے لئے سمجھاؤ کہ ہماری بھویں پیدائشی کمان جیسی کھنچی ہوئی ہیں۔

سیّد۔ (ہاتھ جھٹک کر) ہوں گی۔ ضرور ہونگی۔ کمان نہیں توپ کے گوے ہوں گی۔ بس؟۔

خالدہ۔ تو گویا آپ کو شک بھی ہو سکتا ہے۔ رفی، سیّد کتنے بد مذاق ہیں؟ دُنیا اپنے محبوب کی شان میں قصیدے کہتی ہے اور یہ منحوس خواہ مخواہ پاؤڈر، لپسٹک کا ذکر کرتے ہیں۔ تمہیں کیا ہم کچھ لگائیں دکھائی تو خوبصورت دیتے ہیں۔

سیّد۔ تم لوگ بے شرم ہو۔

(لاپرواہی سے کھڑکی میں سے جھانکنے لگتا ہے۔ خالدہ اور رفیعہ چپکے چپکے باتیں کر کے اسکیم بناتی ہیں)۔

رفیعہ۔ (زور سے) اچھا تو میں ذرا دوپہر کے کھانے کے لئے باورچی کو بتا آؤں۔ (رُعب سے) سیّد، خالدہ کا دل نہ گھبرانے پائے۔

سیّد۔ (گویا سُنا ہی نہیں)

(خالدہ دبے پیر سیّد کے پیچھے جاتی ہے۔ وہ کچھ نوٹس نہیں لیتا اور برابر باہر غور سے جھانک رہا ہے۔ خالدہ کچھ چڑکر ہاتھ تول کر گال پہ ایک تھپڑ مارتی ہے۔)

خالدہ۔ (بھولپن سے ہاتھ کو دیکھتی ہے گویا کچھ ڈھونڈ رہی ہے) کہاں گیا؟ یہ موٹا سا مچھر تھا۔ اُڑ گیا؟

سیّد۔ (بھنّا کر مُڑتا ہے اور گال پر ہاتھ رکھکر) لاحول ولاقوۃ۔

خالدہ۔ سچ کہتی ہوں مچھر تھا۔ یہ بڑا سا۔ اُڑ گیا۔

سیّد۔ معاف کیجئے۔ آئندہ سے آپ میرے منہ پر مچھر کا شکار نہ کیجئے۔ کاٹنے دیجئے مچھروں کو۔

خالدہ۔ (معصوم آنکھیں بنا کر لچکتی ہوئی آواز میں) واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا دل کیسے مانے گا۔ مچھر کو کاٹتے دیکھوں گی تو ضرور اُسے مارونگی۔ تمہاری تکلیف .....

سیّد۔ میری تکلیف؟ (رکھائی سے) معاف رکھو اپنی ہمدردی سے!۔

(دُور کرسی پر بے توجہی سے بیٹھ جاتا ہے)

خالدہ۔ واہ یہ کیسے؟ (آکر اُس کی کرسی کے ہتّے پہ بیٹھ جاتی ہے) یہ کہیں ہو بھی سکتا ہے۔ میں تمہاری تکلیف کا خیال نہ کروں تو پھر کون کرے سیّد؟ پھر کون تمہاری خبر گیری کرے۔ تمہارے اُوپر مکھیاں بھنکنے لگیں تو کیا میں نہ اُڑاؤں؟۔

سیّد۔ (کچھ جلا ہوا) ہوں! بکواس۔ کوئی تمہاری سُنے۔

خالدہ۔ تم پر تو ہر وقت بھوت سوار رہتا ہے۔

سیّد۔ (ترشی سے) ہوں! جانتی ہو یہ بھوت آتا کہاں سے ہے؟

خالدہ۔ ہا... آں... ارے ٹھہرو۔ (بالوں پر ایسے چٹکی لیتی ہے گویا کوئی کیڑا پکڑ رہی ہے) لے یہ جوں! توبہ ہے سیّد (بال پکڑ کر ہلاتی ہے) سر منڈواؤ۔ یہ پٹیاں پارنے کا کیا شوق ہے۔ کانوں پر تو جوئیں رینگ رہی ہیں ... ہی ... ق ... (گھن کھاتی ہے)

سیّد۔ (تڑپ کر دوسری کرسی پر زور سے جا بیٹھتا ہے) کیا مطلب ہے تمہارا خالدہ! اِس ذرا سی دیر میں تم نے مذاق ہی مذاق میں ایک تھپڑ جڑ دیا۔ چٹکی بھر لی اور بال نوچ ڈالے۔ کہاں ہے جوں ذرا میں بھی تو دیکھوں۔

خالدہ۔ لو تو کیا میں تمہاری جوئیں سینت سینت کر رکھتی ہوں، پھینک بھی دی میں نے۔

سیّد۔ (تاڑ کر) ہاں۔ ضرور پھینک دی!

خالدہ۔ لے یہ ذرا سی جوں کا کیا جھگڑا کھڑا کر لیا اور نہیں تو کیا میں نے کھالی۔ دیوانے۔ (رُوٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

سیّد۔ میں پوچھتا ہوں تمہیں مزہ کیا آتا ہے۔

خالدہ۔ کا ہے میں؟۔

سیّد۔ لوگوں کو دُکھ پہونچانے میں۔

خالدہ۔ (خوشی سے کھِلکر) دُکھ پہونچانے میں! تمہیں بھی دُکھ پہونچتا ہے۔ (محبت سے) سیّد! میں سمجھتی تھی تم بالکل مٹّی کے تودے ہو جسے نہ کوئی دُکھ پہونچا سکتا ہے نہ سکھ، جو نہ روتا ہے نہ ہنستا ہے۔ (دُعا کیلئے ہاتھ اُٹھاکر) یا اللہ تیرا شکر کہ سیّد میں بھی جان ہے۔

سیّد۔ (غصّہ سے پہلو بدلکر) تم بڑی مکّار ہو۔

خالدہ۔ (ایکدم سنجیدہ ہوکر) تمہاری زبان بڑی گندی ہو گئی ہے سیّد۔

سیّد۔ جو بات ہوگی وہ ضرور کہونگا۔

خالدہ۔ کیا بات؟ آخر میں نے تمہارے ساتھ کیا مکّاری کی؟ جو ہر وقت کہتے رہتے ہو۔

سیّد۔ یہ مکّاری نہیں تو پھر کیا ہے کہ خود ..... خود تو میرے سر پر چڑھکر آتی ہو اور اپنی سہیلیوں سے کہتی پھرتی ہو سیّد میری جوتیاں چاٹتے ہیں۔ ہنہ۔

خالدہ۔ بالکل غلط۔ نامی اگر تمہیں میری جوتیاں چاٹتے دیکھ لے تو جاپ ڈالے۔ ناممکن میں ایسی بیہودہ اور غلط بات کہہ ہی نہیں سکتی۔

سیّد۔ (تیزی سے) تم نے نہیں کہا کہ میں تمہارے پیچھے پیچھے لگا پھرتا ہوں۔

خالدہ۔ (اطمینان سے سر ہلاکر) ہاں یہ تو میں نے کہا تو اِس میں کیا عیب ہے۔ لڑکوں کے لئے تو یہ بات باعث فخر ہے کہ وہ خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے دوڑیں۔ دیکھ لو سبھی یہ ... کرتے ہیں۔

سیّد۔ ہوگا باعث فخر اوروں کے لئے مگر میرے لئے تو ذلت ہے۔ میں یہ

بیہودگیاں نہیں پسند کرتا۔

خالدہ:۔ (دہو بیٹے وہ ہونا۔ خوب جانتے ہیں تمہیں۔ شیلہ کے ساتھ ...

سید:۔ لاحول ولاقوۃ۔ وہ میری کلاس میٹ تھی کبھی کبھی بات کرلیتا تھا تو سنا ہو آپنے اُس سے بھی اُلٹی سیدھی باتیں کہیں۔

خالدہ:۔ میں نے کیا اُلٹی باتیں کہیں؟ میں نے یہی کہا کہ تم بڑے چلتے ہوئے ہو۔

سید:۔ جھوٹی یہ نہیں کہا تم نے۔

خالدہ:۔ جھوٹے ہوگے تم۔ پھر کیا کہا میں نے .... اچھا وہ منگنی والی بات؟....

سید:۔ ہاں!

خالدہ:۔ تو کیا ہوا؟

سید:۔ تم نے کہا کہ میری تمہارے ساتھ منگنی ہوگئی۔

خالدہ:۔ ہاں کہا تو۔ پھر!۔

سید:۔ تمہارا مطلب کیا تھا یہ کہنے سے۔ جبکہ ... جبکہ ... تم ...

خالدہ:۔ اے سید سچ مچ دیوانے ہو۔ اے یوں ہی کہدیا تھا تاکہ وہ تم سے فلرٹ نہ کرے۔

سید:۔ تم کون ہوتی ہو۔ تمہیں اس سے کیا؟ کوئی کچھ کرے۔

خالدہ:۔ تو اب میں نے یہ بھی تو مشہور کر دیا کہ منگنی ٹوٹ گئی۔ بس بدلہ نکل گیا۔

سید:۔ ارے خالدہ انتہا کرتی ہو۔ تم نے منگنی ٹوٹنے کے قصہ میں بھی مجھ ہی ذلیل کیا۔

خالدہ:۔ اور کیا پاگل! خود اپنے آپکو کچھ کہہ دیتی۔

سید:۔ مگر اب میں جو شیلہ سے ملتا ہوں تو یوں جلتی ہو۔

خالدہ:۔ کچھ بھی ہو سید تم کیسے نالائق یا بدہیئت کیوں نہ ہو مگر کوئی لڑکی یہ کبھی پسند نہیں کرتی کہ اُسے پسند کرنے والا کسی دوسری لڑکی کو پسند کرنے لگے۔ سمجھے۔

سید:۔ خواہ وہ خود اُسے رتی بھر نہ دہارتی ہو۔

خالدہ:۔ ناچاہے رتی بھر نہ دہارتی ہو۔

سید:۔ بے شرم!

خالدہ:۔ کیوں!

سید:۔ اور یہ تم مجھے اس وقت دق کرنے نہیں آئیں؟ کیوں؟

خالدہ:۔ خاک۔ میں تو پُرسہ دینے آئی تھی۔

سید:۔ ہاں اور یہ جب سے تم میری جان کو پُرسہ ہی تو دے رہی ہو یا بیٹھی بیٹھی۔ مجھے دَل رہی ہو۔

خالدہ:۔ اُونہہ اب تمہیں کون سمجھائے۔

سید:۔ سمجھاؤ تو جب کہ میں خود نہ سمجھتا ہوں۔ یہ تم نے رفیعہ کو یہاں سے کیوں ٹرخا دیا۔ اسی لئے نا کہ مجھے گھیر کر میرا خون چوسو۔

خالدہ:۔ اگر تم ایسی باتیں کروگے تو میں ابھی چلی جاؤنگی۔

سید:۔ (مُردہ آواز میں) کاش تم اپنی دھمکیوں کو کبھی سچ بھی کر دکھاتیں۔

خالدہ:۔ تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں۔

سید:۔ یقیناً۔ (پھر جلدی سے) نہیں۔ نہیں۔ اگر تمہیں شبہ بھی ہو جائیگا کہ میں چاہتا ہوں تم چلی جاؤ تو تم سارے وقت میرے سر پر سوار رہوگی۔ تمہیں میری ہر بات سے ضد ہو جاتی ہے۔

خالدہ:۔ (ہنستے ہوئے اُس کی طرف بڑھکر) تم بہت عقلمند ہوگئے ہو سید!

سید:۔ (ترشی سے) حالانکہ تمہیں پختہ یقین ہے کہ مجھے بیوقوف سمجھتی ہو۔ (اُسے اپنی طرف بڑھتا دیکھکر) یہ میری طرف پھر عنایت ہو رہی ہے؟ اگر تم جانا ہی چاہتی ہو تو وہ رہا دروازہ۔

خالدہ:۔ (مصنوعی حیرت سے) ارے تم تو واقعی ہوشیار ہوتے جا رہے ہو!

سید:۔ ہا۔ ہاں۔ مگر تم بڑے آرام سے اُس کرسی پر بیٹھ سکتی ہو۔

(دُور کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔)

خالدہ:۔ (پیار سے) آؤ سید ملاپ کرلیں۔

سید:۔ معاف ہی رکھو۔ کیا پھر کوئی مچھر وچھر نظر آیا؟

خالدہ:۔ (نرمی سے) نا سید۔ ایسے کچھ نہیں۔ جو کچھ بھی کردوں تو جو سزا چاہو دینا۔ (آکر اُس کی کرسی کے ہتے پر پھر بیٹھ جاتی ہے) لو اسی بات پر تم میرا ہاتھ چُوم سکتے ہو۔

سید:۔ (تیوریاں بگاڑے منہ پھلائے) ہُنہہ۔

(رفیعہ پردے کی آڑ میں سے جھانکتی ہے اور خالدہ کو آنکھ سے اشارہ کرتی ہے۔)

خالدہ:۔ (اپنا ہاتھ اُس کے ہونٹوں سے لگاکر) لو! (چیکارتی ہے)

(رفیعہ اندر آتی ہے اور سید کو اعتراض کی نظروں سے دیکھتی ہے۔)

رفیعہ:۔ (کُڑھتی ہوئی آواز میں) آجکل کے لڑکے اس قدر بدمعاش ہوگئے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ شریف لڑکیوں کا تو گھر میں آنا دشوار ہے۔

(سید جلکر خالدہ کو ہتے پر سے دھکیلنا چاہتا ہے جو پہلے ہی ہٹ چکی ہے اور کھڑکی میں سے باہر جھانکتی ہے۔)

رفیعہ۔ (ڈانٹ کر جس سے سید کو نفرت ہے) کیا بات تھی؟ سید!

خالدہ۔ (معصوم آواز میں) کچھ نہیں ــ ان کے کان پر جوں رینگ رہی تھی یہ موٹی بھینس کی بھینس۔ میں نے پکڑ کر پھینک پھانک دی اب کہتے ہیں...

(سید کو اُٹھتا دیکھکر جلدی سے کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگتی ہے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔)

(سید بھناکر اُٹھتا ہے اور باغ کی طرف جو دروازہ ہے اُس میں سے چلا جاتا ہے۔ خالدہ اور رفیعہ زور زور سے ہنستی ہیں۔)

سین ۳۔

(سید اور رفیعہ ایک ہی صوفے پر بیٹھے ہیں۔ دونوں ذرا بہتر اور مہذب نظر آرہے ہیں۔ رفیعہ البم میں تصویریں لگا رہی ہے اور سید ٹانگ پر ٹانگ رکھے اخبار دیکھ رہا ہے۔)

رفیعہ۔ چھٹیوں نے تو سید تھکا دیا۔ جی ہی نہیں لگتا۔

سید۔ ہوں۔ بوٹنگ کو چلتی ہو؟

رفیعہ۔ ہاں۔ خلو کو بھی بلالیں گے۔

سید۔ نا بھئی خلو ٹلو کا جھول ہے۔

رفیعہ۔ اوہو خلو بغیر چاہے کچھ مزہ نہ آئے خود کو بھی۔

سید۔ کسے مجھے۔ توبہ کرو۔ سارے وقت تو مجھ سے اُلجھتی رہتی ہے تمہیں کہدو انصاف سے اُس دن اُس نے میرا جینا دوبھر کر دیا تھا کہ نہیں۔

رفیعہ۔ اچھا اب میں اُسے منع کر دونگی۔ آج میں نے خالدہ، ظفر اور غفار کو کھانے پر بلایا ہے۔ خلو تو چار بجے یہیں ہے گی۔

نوکر۔ (دروازے ہی میں سے جھک کر) ظفر میاں آئے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔

سید۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ دروازے میں سے کوّے کی طرح کھڑے گردن جھکا جھکا کر چلا رہے ہیں۔

نوکر۔ (اندر آکر ذرا کھسیانی آواز میں) ظفر میاں آئے ہیں۔

سید۔ کتنی دفعہ کہا کہ ایسے دُور سے نہ چلایا کرو گویا... کہ... یہ کوئی طریقہ نہیں۔

نوکر۔ (اور بھی مُردہ آواز میں) ظفر۔ میاں۔ آئے ہیں۔

سید۔ (جل کر) بس بکے چلے جانا.... ٹرٹر۔ ٹرٹر۔ کہدو آتے ہیں۔

رفیعہ۔ (البم سمیٹ کر) نہیں ظفر کو یہاں بلالو نا۔ جاؤ یہیں بھیجدو۔

سید۔ نہیں، ٹھہرو۔

(نوکر آدھا جاکر لوٹ آتا ہے)

رفیعہ۔ (نوکر کو ڈانٹ کر) جاؤ میں کہتی ہوں کہدو سید کام کر رہے ہیں۔

سید۔ ٹھہر بدتمیز! (نوکر پھر مُنہ بناتا لوٹتا ہے) یہی مجھے کام ہے۔ ہم دونوں جارہے ہیں موٹر خریدنے ظفر کے لئے۔

رفیعہ۔ (کھڑے ہوکر نوکر کو ڈانٹتی ہے) جاتے ہو کہ نہیں۔ کہدو نہیں آتے سید۔

(نوکر بھاگتا ہے تو اندر داخل ہوتے ہوئے ظفر سے ٹکرا جاتا ہے۔ بے طرح ڈر کر بھاگتا ہے۔)

ظفر۔ ارے بھئی آتے کیوں نہیں تھے۔ چلوگے۔ (سگریٹ سلگاتا ہے)

سید۔ ہا۔ ہاں۔ چلو۔

رفیعہ۔ ٹھیرو تو۔ ظفر، اماں جان نے کہا ہے کہ تم مجھے فلاسفی پڑھانے آیا کرو۔ روز۔

ظفر۔ (ناک سکیڑ کر) فلاسفی! میرے باپ نے بھی فلاسفی نہیں پڑھی تو تمہیں کیا خاک پڑھاؤنگا۔

رفیعہ۔ تو خیر اکنامکس پڑھا دینا۔

ظفر۔ کیا بک رہی ہو۔ یہ بنیوں والے مضمون میں کیا جانوں میں سائنس اسٹوڈنٹ ہوں۔

رفیعہ۔ بکو مت۔ اماں جان نے کہا ہے شرم نہیں آتی انکا کہنا ٹالتے۔

سید۔ (ہاتھ ہلا کر) نہیں ظفر اماں جان نے قطعی نہیں کہا دل سے گڑھ رہی ہے۔

ظفر۔ مگر بھئی مجھے آئے بھی جب تو پڑھاؤں، یا ویسے ہی۔

رفیعہ۔ اچھا پوئٹری (Poetry) پڑھا دیا کرو۔ (ہنسکر) اب بکر کہاں جاؤگے۔

سید۔ کچھ نہیں جی جھوٹ بول رہی ہے۔ اِسے ضرورت بھی نہیں۔

رفیعہ۔ میں نے کیا جھوٹ بولا۔

سید۔ یہی کہ اماں جان نے کہا کہ کوئی نہ کوئی اُلٹا سیدھا مضمون ضرور ہی ظفر سے پڑھو۔ (ظفر سے) جب اِس کا دل کسی کام کے کرنے کو چاہتا ہے تو میرے یا اماں جان کے سر تھوپ دیتی ہے۔ اور کچھ ایسا پھندا ڈالتی ہے کہ بس ہی نہیں چلتا۔

رفیعہ۔ (تیزی سے) اور جو میں نے بچھوا دیا تو؟

سید۔ کس سے بچھوا دوگی؟

رفیعہ:- خلو سے۔ دوسرے ظفر تمہارا ہی فائدہ ہے۔
ظفر:- فائدہ؟ میرا کیا فائدہ ہے نہ پڑھو گی نہ کچھ جان ضیق میں رکھو گی۔ سینکڑوں دفعہ لڑائی ہوگی۔ خواہ مخواہ۔ بھلا کیا فائدہ۔
رفیعہ:- تمہارا یہ فائدہ ہے کہ تمہیں بہانہ ڈھونڈ کر مجھ سے ملنے نہ آنا پڑیگا۔ مزے سے ایک بہانہ موجود رہے گا۔ اور غفار کو بھی اعتراض نہ ہوگا۔ کیوں ــــ؟
سیّد:- (تڑپ کر) او ..... ہ ..... بس ... ظفر میں نے کتنا کہا تجھ سے کہ اس بلا سے بچا رہیو..... مگر تو بھی نرا چغد ہی نکلا .... اب دیکھ تجھے کیسی جوتیاں کھلواتی ہے۔
ظفر:- اجی کھلوائیں جوتیاں! میں جیسے اس کی چالوں میں آ ہی تو جاؤنگا۔
رفیعہ:- لو ظفر اب تمہیں بھی رو ٹیاں لگیں اور سیّد کی طرح اترانا شروع کر دیا۔ انکی صحبت نے تو تمہیں کوڑی کام کا نہیں رکھا۔
سیّد:- میری صحبت۔ میری صحبت کیا بُری ہے۔ تم اپنی کہو تمہیں خالدہ کی صحبت نے جنگلی بنا دیا ہے۔ بالکل۔
خالدہ:- (منہ پھلائے آتی ہے اور بالکل سیّد کے قریب بیٹھ جاتی ہے۔) ہر وقت میرا ذکر۔ ہر وقت میرا ذکر۔ تمہارے خیالوں کی دنیا میں میں ہی چھائی ہوئی ہوں۔
سیّد:- (منہ بنا کر) ضرور!
رفیعہ:- لو اب پُچھوائے دیتی ہوں۔ کیوں خلو .....
ظفر:- (بات کاٹ کر) کیوں ... ٹھہرو۔ خلو کیا تمہارے سامنے اماں جان نے کہا کہ رفیعہ کو میں پڑھاؤں۔
خالدہ:- (سنجیدگی سے) کتنی مرتبہ کہا کہ ظفر میرا نام اس قدر پیار سے نہ لیا کرو سیّد کو رشک ہوتا ہے۔ کیوں سیّد؟۔
سیّد:- (بُرا مانکر) لاحول ولا قوۃ۔
رفیعہ:- تو کل سے ظفر مجھے پڑھانے آیا کرینگے۔
ظفر:- نہیں۔ قطعی نہیں ... میں ...
رفیعہ:- خیر۔ تو پھر میں محمود صاحب کو لکھونگی وہ پڑھا دیا کریں گے۔
سیّد:- جی نہیں۔ محمود سے نہیں۔ ہمارے یہاں انکی آمد و رفت نہیں۔
رفیعہ:- آمد و رفت نہیں تو اب ہو جائیگی۔
سیّد:- جی نہیں۔ نہیں ہوگی۔
رفیعہ:- (چڑ کر) یہ بھی تمہاری دھونس ہے۔ ظفر پڑھائیں نہیں۔ محمود صاحب کی آمد و رفت نہیں۔ کیوں انکے پڑھانے پر کیا اعتراض ہے آپکو؟ پوئٹری ان سے اچھی کون پڑھا سکتا ہے۔

ظفر:- اجی ــــ وہ ہے زمانے بھر کا ــــ لوفر!
سیّد:- نہیں جی یہ بات نہیں ہے۔ (طعن سے مسکرا کر) ان سے بڑھکر کون لوفر ہوگا۔
رفیعہ:- (چونک کر) کون ہم؟۔
سیّد:- جی۔ آپ خالدہ وغیرہ وغیرہ۔
خالدہ:- ہوش میں سیّد، تمہاری وغیرہ وغیرہ ہونگی لوفر ہم کیوں ہوتے۔
سیّد:- جی نہیں آپ تو سب سے بڑھکر، خدا ہی بچائے۔
خالدہ:- (حیرت اور رنج سے) سن رہی ہو رفیعہ؟
رفیعہ:- سن رہی ہوں ــ روز ہی سنتی ہوں۔ سیّد تو خیر پاگل ہیں ہی۔ مجھے تو بس ظفر پر حیرت ہو رہی ہے کہ اماں جان کی بات نہیں سنتے۔
ظفر:- میں کہتا ہوں اماں جان بچاری کو خبر بھی نہیں۔ تم دل سے بنا رہی ہو۔
رفیعہ:- (آہٹ سنکر) شش! لو اماں جان خود آ رہی ہیں۔

(ظفر سگریٹ پھینک کر ٹھیک سے بیٹھ جاتا ہے۔ خالدہ جلدی سے سیّد کے پاس سے اٹھکر دور بیٹھ جاتی ہے۔ پردہ کھلتا ہے اور سیاہ شیروانی اور تنگ پاجامہ پہنے غفار داخل ہوتے ہیں۔)

رفیعہ:- (حیرت سے) ارے؟۔

(سب زور کا قہقہہ لگاتے ہیں۔ خالدہ واپس سیّد کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔ ظفر نیا سگریٹ سلگا لیتا ہے۔ سیّد ترشروئی سے گھٹنا ہلا رہا ہے۔)

غفار:- (اس خاموش ایکٹنگ سے اکتا کر) کیا بات ہے بھئی؟۔

(سب پھر زور سے ہنستے ہیں۔)

سیّد:- چغد!
غفار:- (مجرمانہ انداز سے) کون؟
ظفر:- اونہہ ... ہم ... سب۔ (بات ٹال کر) تم اپنی کہو۔
غفار:- (سب کی طرف سے بے توجہ ہوکر) رفیعہ طبیعت تو اچھی ہے۔
رفیعہ:- (نیم باز آنکھوں سے سیّد کو دیکھکر کہ لو اب کیا جواب دوں) ہاں مگر میری طبیعت تھی کب خراب؟
غفار:- میرا مطلب ہے مزاج تو اچھا ہے۔
رفیعہ:- میں بدمزاج کبھی تھی ہی نہیں۔
غفار:- (تھک کر) یہ تو میں نے نہیں کہا کہ تم بدمزاج ہو۔
رفیعہ:- پھر؟
غفار:- (پشیمان ہوکر) میں نے تو ویسے ہی پوچھا تھا۔

رفیعہ:۔ (دبی زبان سے) رسمًا۔
غفار:۔ ہاں رسمًا ہی سمجھ لو اب۔
سید:۔ اسے اس کانٹوں کی جھاڑی سے کیوں اُلجھ رہے ہو؟
(تھوڑی دیر بے تکی خاموشی رہتی ہے۔)
رفیعہ:۔ (ایک دم سے) لے ہے زعفران دینا تو بھول ہی گئی۔ مَیں آج شاہی ٹکڑے پکا رہی ہوں۔
سید:۔ چل جھوٹی۔ کبھی باورچی خانے میں جھانکتی بھی تو نہیں۔
رفیعہ:۔ تم کون سید؟ (چلی جاتی ہے)
خالدہ:۔ (باغ کی طرف دروازے سے جاتے ہوئے) سید ذرا یہاں آؤ۔ تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔
سید:۔ (منہ پھلائے) کیا بات؟ پھر کوئی مچھر وچھر...
خالدہ:۔ نہیں۔ نہیں۔ تم آؤ تو سہی۔
(سید اُٹھکر جاتا ہے۔ خالدہ اُس کے بازو میں ہاتھ ڈالکر اُسے کھینچتی ہوئی چلی جاتی ہے۔)
ظفر:۔ (جیسے خواب میں) اُفوہ! یہ لڑکیاں!!
غفار:۔ کیوں؟ کون لڑکیاں؟
ظفر:۔ سب لڑکیاں۔ ایک ایک... سب ناگنیں ہیں۔
غفار:۔ (غیر شاعرانہ گفتگو سے متنفر ہوکر) مَیں تو نہیں سوچتا۔ یہ کیوں؟
ظفر:۔ (بہت سا دھواں ہوا میں پھیلاکر) ہوں۔ تم بیچارے سوچتے ہی کیا ہو۔
غفار:۔ (بُرا مانکر) کیوں مجھ میں بچاسے پن کی ایسی کیا بات ہے۔
ظفر:۔ یہ... یہ کہ تم... تم... جانے بھی دو اب۔
غفار:۔ آخر کچھ کہو بھی۔
ظفر:۔ کہوں کیا۔ (کچھ جلکر) تم بچے ہو۔ بچے۔ اور رفیعہ ناگن ہے۔
غفار:۔ (بگڑکر) قطعی نہیں۔ کم ازکم رفیعہ کے بارے میں تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ وہ اس قدر.....
ظفر:۔ (طعن سے جملہ پورا کرکے) بھولی ہے! کیوں؟
غفار:۔ یقینًا۔
ظفر:۔ (زور زور سے ہنستا ہے اور مصنوعی کھانسی کھانستا ہے) بھولی!!! ضرور۔
غفار:۔ (ذرا سختی سے) تم یہ بھی جانتے ہو یہ تم کس کے سامنے کہہ رہے ہو۔
ظفر:۔ (جلکر بھویں سکیڑکر اُسے دیکھتے ہوئے) شاید آپکے سامنے۔
غفار:۔ اور شاید تم یہ بھی جانتے ہو کہ ـــــــ
ظفر:۔ کہ جناب کو رفیعہ سے محبت ہے، اور اُسے چاہتے ہیں۔
غفار:۔ یقینًا۔ ایک فرشتہ خصلت لڑکی کے لئے میں...

ظفر:۔ رفیعہ ـــ فرشتہ خصلت۔
غفار:۔ بیشک کیوں نہیں... آخر...
ظفر:۔ (بات کاٹ کر اپنی تیز زبان میں) تم شاید اُن بیوقوفوں میں سے ہو جو آنکھ میچ کر ہر لڑکی کو حسین، معصوم اور نیک قرار دیدیتے ہیں۔ (ایکدم ذرا اُٹھکر) غفار تمہارا ارادہ۔ میرا مطلب ہے رفیعہ سے شادی کرنے کا ہے۔
غفار:۔ یہ بات عرصہ ہوا طے ہو چکی۔
ظفر:۔ تو تم... تم ٹھکانے لگ چکے۔
(واپس کرسی پر لیٹ جاتا ہے)
غفار:۔ (کچھ نہ سمجھ کر) یعنی؟
ظفر:۔ (تھوڑی دیر غفار کو گھور کر) اونہہ تم نہیں سمجھتے۔ تم کچھ نہیں سمجھتے۔ تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔
غفار:۔ نہ جانے کیا بک رہے ہو۔
ظفر:۔ (کچھ نہ سنکر) تم نہیں جانتے ان لڑکیوں کو۔ یہ سب... سب بلیاں ہیں بلیاں۔ تم نے دیکھا ہے ایک چوہے کو بلی کیسی کیسی جھنجوڑیاں دیتی ہے۔ کبھی اس ران کو دبا دیا کبھی اس پنجے پر کچلی مار دی کبھی کمر میں گدگدا دیا ـــ اور کبھی ـــ پورا ہڑپ کر گئیں۔
غفار:۔ (متحیر بیٹھا ہے) صنف نازک کے بارے میں تمہارے بڑے لچر خیالات ہیں۔
ظفر:۔ (جلدی جلدی) صنف نازک۔ صنف نازک۔ اوہ کس قدر بے معنی لفظ ہے ـــ فش ـــ نہ جانے کن بیوقوفوں نے انہیں صنف نازک کا خطاب دیا ہے۔
غفار:۔ (ظفر کی بیوقوفی پر مُسکراکر) تو تمہارے خیال میں عورتیں صنف نازک کہلانے کی مستحق نہیں۔
ظفر:۔ مستحق! مستحق ہونے کی خوب رہی۔ اجی یہ دُنیا کے سارے آرام اور چین اُٹھانے کی مستحق ہیں۔ کولھو کے بیل کی طرح جت کر ہم کام کریں۔ سر پھٹوائیں ہم۔ دُنیا بھر کی آفتیں اُٹھائیں ہم۔ اور یہ صنف نازک بن کر ہمارے اُوپر بھوت کی طرح سوار ہو جائیں۔ اور پھر صنفِ نازک اپنی سی کرنے پر اُتر آئیں تو وہ گت بنائیں کہ جینا دُشوار کر دیں۔
غفار:۔ میرے خیالات شکر ہے کہ تم سے مختلف ہیں۔ اور رہیں گے۔
ظفر:۔ اور پھر ان ہی خیالات کے برتے پر تم رفیعہ سے شادی کرنے کا دعوٰی رکھتے ہو۔ (ایکدم سے) کبھی تم نے براہِ راست بھی رفیعہ کی رائے معلوم کی ـــ میرا مطلب ہے شادی کے بارے میں۔
غفار:۔ ہاں مجھ سے ایک دفعہ یہ غلطی ہو گئی تھی۔

ظفر۔ (غصہ سے چونک کر) غلطی؟ کیا آدمی ہو تم ....

غفار۔ ہاں ہاں غلطی (رنجیدہ ہو کر) اُس کے والد کے انتقال کے فوراً ہی بعد۔

ظفر۔ پھر اُس نے کیا کہا۔

غفار۔ کچھ نہیں مت یاد دلاؤ ظفر وہ میری بیوقوفی تھی۔ وہ رونے لگی۔

ظفر۔ (حیرت سے) رونے لگی۔

غفار۔ ہاں۔ میری بیوقوفی۔ ایسے موقع پر دل دُکھانا۔

ظفر۔ ہوں — ضرور روئی ہوگی۔ تمہاری بدحواسیوں پر وہ بارہا رو چکی ہے۔ مگر دل دُکھانے کو تم سے کس نے کہا تھا؟

غفار۔ دل ہی دُکھا ہوا تھا — ایسے زبردست صدمہ کے بعد —

ظفر۔ (ہاتھ جھٹک کر) تو پھر تو تم قیامت تک کسی لڑکی کو نہیں سمجھ سکتے! اچھا (کچھ سوچ کر رُک رُک کر) فرض کرو رفیعہ ... کو — رفیعہ مر جائے تو تم ...

غفار۔ ظفر کم از کم میرے سامنے تو ایسی باتیں نہ کرو۔

ظفر۔ (دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبا کر) افوہ۔ کیسے کہوں تم سے۔

غفار! (مُردہ آواز میں) ہم سب بیوقوف ہیں۔ ہم سب چوہے ہیں جن سے یہ خونخوار بلیاں کھیل رہی ہیں۔ میں۔ تم۔ سید سب چوہے ہیں — بزدل چوہے —

غفار۔ (کچھ نہ سمجھ کر) میں نے تو یہ نہیں سوچا۔

ظفر۔ (بے چین ہو کر) چپ رہو۔ غفار تم مجھے پاگل کر دوگے۔ اوہ۔

غفار۔ (نہایت سکون سے) میں ذرا اماں جان کے پاس جا رہا ہوں تم بھی چلتے ہو۔

ظفر۔ (پریشان ہو کر) تم جاؤ میں ذرا دیر میں آؤنگا۔

(غفار جاتا ہے جسے ظفر رحم کی نگاہوں سے تکتا ہے۔ تھوڑی دیر سوچتا ہے پھر اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتا ہے۔ دو تین کرسیوں میزوں سے بے خیالی میں ٹھوکر لگتی ہے۔ کارنس کے پاس جا کر تصویریں دیکھنے لگتا ہے۔ رفیعہ کی تصویر کو بڑے غور سے دیکھتا ہے)

ظفر۔ (بڑبڑاتے ہوئے) ہوں! غفار رفیعہ کی تصویر دیکھتا ہے مگر رفیعہ کو نہیں۔

(دیر تک غور سے کبھی پاس سے کبھی دور سے تصویر کو اُٹھا کر دیکھتا ہے۔ آہستہ آہستہ اُس کا سر تصویر کی طرف جھکتا ہے۔ رفیعہ دبے پاؤں داخل ہو کر اس کی پشت سے پنجوں کے بل کھڑی ہو کر دیکھتی ہے۔ ظفر تصویر پر اپنے ہونٹ لگا دیتا ہے۔)

رفیعہ۔ (اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تحکمانہ لہجہ میں) دیکھا پکڑے گئے نا۔ کہو اب!

(ظفر ایکدم مُڑ کر اُسے غصہ ہو کر گھورتا ہے! اور جلدی سے تصویر پیٹھ کے پیچھے کر لیتا ہے۔)

رفیعہ۔ اب تو تمہیں مجھے پڑھانے کے لئے آنے میں کوئی اعتراض نہیں۔

(ظفر ایک جھٹکے سے تصویر میز پر رکھ کر آتشدان کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔)

رفیعہ۔ (اُس کی ٹھوڑی چھو کر) بیچارا ظفر بہانے کیا کرتا تھا۔ آج —

ظفر۔ (اُس کا ہاتھ جھٹک کر) اونہہ۔ تم واقعی سانپ ہو۔

رفیعہ۔ اور تم چھچھوندر جسے نہ میں نگلتی ہوں نہ اُگلتی ہوں۔ مگر میں کہتی ہوں چھچھوندر کی دیدہ دلیری تو دیکھو سانپ کے مُنہ سے لگ رہی تھی۔

ظفر۔ (مسکرا کر) بھگت تو رہی ہے چھچھوندر اپنے اعمال کی سزا۔

(سید کچھ بھناتا ہوا آ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے خالدہ کندھوں کو ہلکی جنبش دیتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔)

رفیعہ۔ آہا ایک اور چھچھوندر۔

ظفر۔ (خالدہ کو دیکھ کر) اور ایک اور سانپ بھی۔

خالدہ۔ ظفر تمہیں کس نے بتایا کہ سید نے مجھے سانپ کہا؟

رفیعہ۔ کسی نے بھی نہیں۔ انہیں تو وحی آتی ہے۔ بیچارے کو ابھی ابھی شہادت کا رتبہ ملا ہے۔

خالدہ۔ (پژمردہ ہو کر) میں سمجھتی تھی کہ سید ہی اس قدر شاعرانہ بات کہہ سکتا ہے۔ پر اب معلوم ہوا کہ ظفر بھی — خیر سید تم کبھی تو کوئی نئی بات نکالا کرو جس پر مجھے فخر کرنے کا موقع ملے۔

(سید مُنہ بناتا رہتا ہے)

(رفیعہ، خالدہ کے پاس جا کر اُس کے کان میں کچھ کہنا چاہتی ہے۔)

ظفر۔ (بناوٹ کر کے) یہ کانا پھوسی یہاں نہیں ہوگی۔ (رفیعہ کو کھینچ کر) تم لوگ چپکے چپکے بات نہیں کر سکتیں۔

رفیعہ۔ خلو پھر بتاؤں گی۔ اچھا۔

خالدہ۔ اور میں (سید سے آہستہ سے) بتاؤں سید تمہاری شاعری؟

سید۔ (اپنی جگہ جھوم کر) بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری شاعری۔

خالدہ۔ رنی — (سید کو دیکھتی ہے) میں نے انہیں ایک بات کہتے کہتے

بُلایا، تو یہ خود ایک بہت ہی ضروری بات کہنے لگے ـــــ بولے (پیار سے) کہدوں سیّد؟

سیّد۔ (پہلی دفعہ مُسکرا کر) بے حیا ہو تم دونوں!

خالدہ۔ پھر اُتر آئے اپنی اوقات پر؟ پھر تم نے مجھ سے شادی کی درخواست کیوں کی تھی۔

ظفر۔ اچھا!!

رفیعہ۔ (خوشی سے اُچھل کر) اور خلو یہ ظفر اتنی دیر یہاں کیا کرتے رہے۔ دیکھو نا آندھی کی وجہ سے ساری تصویروں پر گرد جم گئی تھی۔ انہوں نے سا ـــــ ب چاٹ کر صاف کر دی۔ (اپنی تصویر اُٹھا کر) یہ دیکھو کس قدر چمک گئی۔ ظفر تم چاہو تو اسے گھر بھی لے جا سکتے ہو۔ اطمینان سے اپنے صاف کر لینا۔

(ظفر کھسیانہ مُسکراتا ہے۔)

رفیعہ۔ نہیں بیتے۔ بس یہی تو مجھے جہالت کی باتیں کھلتی ہیں۔ اچھا کسی دن چُھپا کر لے جانا۔ یہ رکھی ہے۔

(ظفر اُٹھکر تصویر لیکر جیب میں ڈال لیتا ہے۔)

سیّد۔ رفیعہ تو تم نے طے کر لیا کہ ظفر سے شادی کرو گی؟

رفیعہ۔ ہاں فی الحال تو میں ظفر ہی سے کر رہی ہوں۔

ظفر۔ (چونکا کر) یہ فی الحال سے تمہارا کیا مطلب؟ (سیّد سے) یار میں نے ایسی لڑکیاں ہی کہیں نہیں دیکھیں۔ سُنا کرتے ہیں بڑی سیدھی سادی ہوتی ہیں۔

خالدہ۔ او ہو جیسے تم نے دیکھی بھی بہت سی لڑکیاں ہیں۔ لے دے کر ہم دونوں ذرا ڈھنگ کے تمہیں دکھائی دئے تو تم ہم پر ہی پیش ہو گئے۔ اور سیدھی سادی لڑکیوں کو آج کل کون پوچھتا ہے۔ پڑی گھروں میں روٹی پکایا کرتی ہیں۔

رفیعہ۔ اور کیا۔ سچ بتاؤ تمہیں وہ "گدّے" پسند ہیں؟

ظفر۔ (مسکرا کر سیّد کو دیکھتے ہوئے) تم سے تو غنیمت ہی ہونگی۔

خالدہ۔ (ایکدم سے) لو گر یہ تو بتاؤ جب رفیعہ ظفر سے شادی کریگی تو غفار کیا کریگا۔

رفیعہ۔ (جلدی سے) وہ خودکشی کرے گا یا ہمیشہ میرے نام پر کنوارا بیٹھا رہے گا۔

ظفر۔ کس قدر اِتراتی ہو تم۔

خالدہ۔ یعنی یہ تو عجیب گڑبڑ ہے۔ میرے خیال میں اسے کل معاملات سے آگاہ کر دیا جائے۔ میں اسے سمجھا دونگی۔ ابھی بُلاتی ہوں۔ (اُٹھتی ہے۔)

ظفر۔ (گھبرا کر) بھئی میں جا رہا ہوں۔

خالدہ۔ نہیں تمہیں یہیں رہنا چاہیئے ورنہ پھر پورا معاملہ طے نہ ہوگا۔

سیّد۔ ہٹو جی سب واہیات ہے۔ چلو جی ظفر یہ دونوں فساد پر تُلی ہوئی ہیں۔

رفیعہ۔ اگر تم دونوں چلے جاؤ گے تو بھئی میں صاف مُکر جاؤنگی۔

سیّد۔ (ایکدم مُڑ کر) یعنی؟

رفیعہ۔ یعنی یہ کہ تم پھر مجھ سے نہ کہنا کہ غفار کو دھوکا دیا۔

سیّد۔ اور تم دھوکا دو گی۔

رفیعہ۔ اور کیا۔ ورنہ تم مت جاؤ۔

سیّد۔ خیر اس میں بھی یقیناً تمہاری کوئی چال ہو (بیٹھ جاتا ہے) بیٹھو بھئی ظفر۔

خالدہ۔ تو میں غفار کو بُلانے جاتی ہوں۔ (چلی جاتی ہے)

سیّد۔ ظفر تم نے فیصلہ کر ہی لیا کہ رفیعہ سے شادی کرو گے۔

ظفر۔ میں شادی کر رہا ہوں یا رفیعہ مجھ سے شادی کر رہی ہے۔ چہ خوش!

سیّد۔ اماں وہ ایک ہی بات ہوئی۔

ظفر۔ ایک ہی بات کیسے ہوئی۔ چھچھوندر سانپ کو نگلتی ہے یا سانپ چھچھوندر کو؟ اب تو یہ سانپ ہی جانے کہ وہ چھچھوندر کو نگلے گا یا یوں ہی چباتا رہے گا۔

رفیعہ۔ بالکل غلط۔ سانپ چباتا کب ہے۔ اُس کے دانت ہی نہیں ہوتے۔

ظفر۔ تم دانتوں والا سانپ ہو۔ اجگر۔ (ہاتھ سے جسامت بتاتا ہے)

رفیعہ۔ دیکھو سیّد اب یہ ظفر ہی بات نکال رہے ہیں۔

(خالدہ اور غفار آتے ہیں۔)

خالدہ۔ لو ایک اور چھچھوندر۔

رفیعہ۔ (جلدی سے) دیکھو غفار، ظفر مجھے سانپ کہہ رہے ہیں۔

غفار۔ (بیوقوفی سے) یہ کیوں؟

ظفر۔ یہ یوں کہ یہ سانپ ہے ہی جو۔

(لڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔)

غفار۔ (بیٹھکر) یہ ظفر تمہاری غلطی ہے۔

ظفر۔ (جلکر) اور تمہاری بیوقوفی! رفیعہ جس شخص سے شادی کرے گی اُس بدنصیب کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ ہم لوگ ابھی یہی سوچ رہے تھے۔

رفیعہ۔ (بناوٹی رنج سے) اوہ! مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اس قدر خوفناک ہوں۔ اللہ۔

غفار۔ بالکل غلط میں تمہیں خوفناک بالکل نہیں سمجھتا۔

(ایکدم موضوع کے چھڑ جانے سے گھبرایا ہوا ہے۔)

رفیعہ۔ نہیں میں تمہاری زندگی برباد نہیں کرونگی۔

غفّار۔ (جوش سے، برباد نہیں۔ رفیعہ تم میری زندگی آباد کرو گی۔

رفیعہ۔ نہیں۔ میں تمہیں نگل جاؤں گی سانپ ہی جو ٹھہری۔

غفّار۔ (شدت جوش سے کانپ کر) کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم مجھے نگل بھی جاؤ تو بھی میرے لئے عین راحت ہوگی۔

خالدہ۔ مگر اب تو رفیعہ نے فیصلہ کر لیا۔

غفّار۔ (چونک کر) کیا فیصلہ کر لیا؟

خالدہ۔ یہی کہ وہ تمہیں نہیں نگلے گی۔

رفیعہ۔ ہاں اب تو میں ظفر کو نگلوں گی۔ یہ ہے تو پھر یہی سہی۔

(ظفر پریشان ہو کر مسکراتا ہے)

غفّار۔ (سمجھ کر) تو .... تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے ٹھکرا رہی ہو۔

رفیعہ۔ اونہہ، اب تم نے بھی غلیظ شاعری شروع کر دی۔

غفّار۔ (پریشانی سے انگلیاں چٹخا کر) اور ظفر تم مجھے دھوکا دیتے رہے۔

ظفر۔ غفار بچہ نہ بنو۔ یہ فتنہ تمہارے بس کا نہیں تھا۔ شکر کرو کہ میرے ہی اوپر بیتی اور تم بچ گئے۔ تم دیکھنا وہ میری گت بنائے گی کہ تو بہ ہی بھلی۔

غفّار۔ کاش میری ہی وہ گت بن جاتی۔

خالدہ۔ مگر غفار سوچو تو ــــ

غفّار۔ ایک عرصے سے۔ ایک عرصہ دراز سے یہ بات بزرگوں نے طے کر دی تھی۔

خالدہ۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ آبائی حق تو تمہارا ہے پر یہاں تو رفیعہ کا معاملہ آن پڑا ہے۔ وہ ایک ضدی ہے۔

غفّار۔ (اندوہگیں ہو کر) میں ــــ جا رہا ہوں۔ (نہایت اداسی سے) رفیعہ خدا کرے تم خوش رہو۔

(کھڑا ہو جاتا ہے)

ظفر۔ مجھے کوئی دعا نہیں دیتا۔ (بڑبڑا کر) جیسے رفیعہ کو بڑی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ لوگ مجھے دعا نہیں دیتے۔

رفیعہ۔ (غفار کے پاس جا کر پیار سے) غفار تم غصے تو نہیں ہو۔

غفّار۔ (غصہ سے) نہیں!

رفیعہ۔ اور رنجیدہ؟۔

غفّار۔ (رقت سے) نہ رنجیدہ۔

رفیعہ۔ (ایکدم اس کا حسین چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیکر بڑی محبت سے دیکھتی ہے) تم بڑے پیارے ہو غفار۔ تم نہیں جانتے۔ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔

سید۔ (تنبیہاً) پھر پھیلایا جال؟

رفیعہ۔ (ویسے ہی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے) تم کون ہوتے ہو سید بیچ میں بولنے والے؟ (غفار سے) میں تمہیں بچپن سے پسند کرتی ہوں۔ بہت ہی پسند کرتی ہوں۔

(ظفر متحیر آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا ہے)

غفّار۔ (امید بھری آواز میں) رفیعہ۔

رفیعہ۔ (بڑی رونق آواز میں) ہاں!

غفّار۔ (اس کے بازوؤں پر ہاتھ پھیر کر) تم نے ابھی کہا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔

رفیعہ۔ ہاں۔ اور ہمیشہ اسی طرح محبت کرتی رہونگی۔ (اس کا منہ قریب کر کے) تمہیں یاد ہے غفار۔ بچپن میں میں کسقدر تمہاری شرارتیں پسند کرتی تھی۔

سید۔ جھوٹی۔ غفار نے کبھی شرارت کی ہی نہیں۔

غفّار۔ (سید کی پروا نہ کر کے جوش سے) تو پھر ــ تو پھر ــ رفیعہ!

رفیعہ۔ ہاں پھر۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ــــ کہ ظفر سے شادی کرنے کے بعد میں فوراً تمہیں گود لے لونگی ــــ کیوں ظفر! (اس کا چہرہ جھکا کر پیار کرنا چاہتی ہے)

(ظفر ایک دبی ہوئی اطمینان کی سانس لیتا ہے اور آرام سے کرسی پر لیٹ جاتا ہے۔

غفّار۔ (جسم میں ایک دھکا سا محسوس کرتا ہے اور خاموش دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے) سانپ!!!!

(بغیر دوسری نگاہ ڈالے ایکدم پہلے دروازے سے نکل جاتا ہے۔)

رفیعہ۔ (حیرت سے مسکراتے ہوئے اپنے خالی ہاتھ دیکھتی ہے) ارے!

(ظفر، سید اور کچھ کچھ خالدہ بھی حیرت سے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں۔)

ظفر۔ (گھٹی ہوئی مردہ آواز میں) "سانپ"!!!

ــــــ (پردہ) ــــــ

عصمت چغتائی

پھول

آہ اے ننھی سی ہستی تجھ میں ہے کیا کیا نہاں
کس کو تیرے حسنِ دل افروز میں ہوگا گماں

تو سراپا حسن ہے، اور حسن خوشبو ریز ہے
یعنی تیرا ہر نفس خود بادِ عنبر بیز ہے

تیری رنگینی میں ہیں کچھ طرفہ تر رنگینیاں
تیری جلوہ ریزیوں میں طرفہ حیرت خیزیاں

تو سراپا دل ہے جس میں دردِ لطف آمیز ہے
اہلِ دل کو تیری بیتابی محبت خیز ہے

تیرے اندازِ جنوں کا طور بھی کچھ اور ہے
تیری بزمِ مے کا لطفِ دور ہی کچھ اور ہے

نالۂ بلبل سے سینہ تک ترا صد چاک ہے
خوفِ رسوائی نہیں وہ عاشقِ بیباک ہے

خوف خارِ گل سے کیا لذت چشِ سوزش ہی تو
لطفِ زخمِ دل سے صرفِ جوششِ کاوش ہی تو

تیرے سینے میں دفینہ دولتِ الفت کا ہے
پاسبان مارِ سیہ بھی داغِ دل فرقت کا ہے

اپنا اندازِ تبسم کچھ دلِ بلبل سے پوچھ
لطفِ جاں بخشِ تکلم کچھ دلِ بلبل سے پوچھ

باغِ عالم میں تری فطرت سراپا چشم ہے
دیکھنے کو منظرِ قدرت، سراپا چشم ہے

نغمۂ توحید سننے کو ہمہ تن گوش ہے
گو کہ دنیا سے غلافِ برگ میں روپوش ہے

جوشِ فرطِ شوق سے پردے کو اپنے چاک کر
ہاں نکل آیا ہے باہر گھر سے کس کو تاک کر

اے کہ تو ہے باعثِ خوشنودیِ طبعِ جہاں
اے کہ تو ہے جلوہ ریز و رونقِ کون و مکاں

اے کہ تو بزمِ جہاں میں ہے چراغِ ضوفشاں
اے کہ تیری ذات سے ہے رونقِ باغِ جہاں

ہے وجودِ حسن کا احساس تیری ذات سے
تیرا سینہ ہے مرقع گو ہرِ جذبات سے

عاشقوں کے واسطے بھی تو سبق آموز ہے
باہمہ صد چاکی دل یوں جو لطف اندوز ہے

ہے تجھی سے لبِ دو بالا حسنِ لیلائے بہار
تجھ پہ سو سو ناز سے قربان ہو جائے بہار

تو نہ ہو گلشن میں تو بس منہ کی پھر کھائے بہار
دہرِ حسن افروز میں پھر منہ نہ دکھلائے بہار

تیری ہستی پاک ہے، اور پاک ہی تیرا وجود
شاخِ گل پر تو رہا کرتا ہے سرمستِ سجود

گوش واحد شنوا ہے اور چشم واحد بیں ہی تو
ہجرِ منظورِ نظر میں گو کہ شبنم گیں ہے تو

کس کی الفت، کس کی فرقت، کس کا تجھکو درد ہے
تیرا خالق ہے مگر وہ جس کا تجھکو درد ہے

دہر میں اک تیرے دم سے لطفِ سوز و ساز ہے
دیدۂ بینا کو لے گل! تو جنوں انداز ہے

تو نہ ہو تو باغِ عالم میں یہ عالم پھر کہاں
گریۂ بلبل کہاں، ہیجانِ شبنم پھر کہاں

پھر کہاں یہ حسن پاشی، پھر کہاں یہ دلبری
پھر کہاں یہ سحر کاری پھر کہاں افسوں گری

حسن کا چرچا نہ ہو اور حسن کی باتیں نہ ہوں
وصل کی گھڑیاں نہ ہوں اور ہجر کی راتیں نہ ہوں

بلبل و گل میں محبت کی کبھی یہ گھاتیں نہ ہوں
اور پھر دنیا میں کیا ہو جبکہ یہ باتیں نہ ہوں

تو خوشی کے وقت ہے گلدستۂ فرحت فزا
بزم میں ہوتا ہے تیرا جلوہ نکہت فزا

مندروں میں، مسجدوں میں، مقبروں میں بھی ہے تو
تجھکو ہندو مندروں میں لیکے جاتے ہیں سدا
تو ہی تو ہے زلف بوسِ نوعروسانِ بہار
تو اگر عشرت کا ساتھی ہے تو عسرت کا بھی ہے
ہاں! وطن میں تجھ سے جب رہتی ہیں یہ سرگرمیاں
چھوٹنے لگتی ہے دنیا، چھوٹنے لگتے ہیں یار
سب دھرا رہتا ہے دنیا میں بجز رختِ سفر
پھر وہ ہندو ہو کہ عیسائی ہو یا ہو پارسی
تجکو لے آتا ہے بارنج و محن عزت کے ساتھ

محفلوں میں، گلشنوں میں اور گھروں میں بھی ہے تو
تیری رنگینی سے خوش ہوتے ہیں اُنکے دیوتا
ہے تری رنگیں مزاجی سے عجب شانِ بہار
وصل کا حامی اگر ہے، سوزِ فرقت کا بھی ہے
روزِ غربت میں بھی جب گھِر آتی ہیں مایوسیاں
غم بٹا سکتا نہیں کوئی کسی کا غمگسار
روتے ہیں احباب آپس میں یہ عالم دیکھکر
گبر ہو، کافر ہو، مسلم ہو کہ لامذہب کوئی
اور کر دیتا ہے بس زیبِ کفن عزت کے ساتھ

بزمِ عالم کے ہر اک کونے میں ہے جلوہ ترا
تیرے رنگوں سے ہے دنیا میں بہارِ جانفزا
تیری رگ رگ میں ہے پنہاں جانِ حسنِ رنگ و بو
ہیں ترے اوراقِ رنگیں داستانِ آرزو
تیری عزت ہر جگہ ہر وقت ہوتی ہے سدا
گُل سے تو گلقند بنتا ہے مریضوں کیلئے

باغِ عالم کے ہر اک گوشے میں ہے نقشہ ترا
تیری ہستی ہے خود اک درسِ فنا رازِ بقا
میں ہوں رہنِ شوقِ فرحت تو ہے جانِ آرزو
اے جہانِ آرزو! اے جان جانِ آرزو
خواہ دردِ جاں گسل ہو، خواہ عیشِ جانفزا
اور اُبل کر عطر بنتا ہے رئیسوں کیلئے

اے سراپا حسن! تو ہے باعثِ تزئینِ حسن
تجکو مسلم لیکے جاتے ہیں مزاروں کی طرف
تو ذریعہ ہے عجب تجدیدِ الفت کیلئے
لالہ زاروں میں، چمن زاروں میں، بازاروں میں ہے
زلف میں، بالوں میں ہے، ہاتھوں میں ہے، ہاروں میں ہے
اہلِ دنیا پر نہیں محدود کچھ افسوں ترا
باغِ رضواں کی ہے رونق تجھ سے اے رنگیں ادا
تیری الفت سے اگر گنہ تو میں گنہگاروں میں ہوں
تیری ہستی کس قدر مقبولِ خاص و عام ہے
قابلِ تقلید دنیا میں ترا انجام ہے
کاش ہوتا میں کسی کی ساعدِ رنگیں کا پھول
کس لئے مرہونِ رنج و غم ہے میری زندگی
ہر جگہ عزت مری ہوتی جہاں میں ہر جگہ

اے ہمہ تن رنگ و خوبی! تجھ سے ہے تکمیلِ حسن
پیشکش کے طور پر غفلت شعاروں کی طرف
تو طریقہ ہے عجب اظہارِ عزت کے لئے
دشت میں، وادی میں ہے، غاروں میں ہے، غاروں میں ہے
الغرض سارا جہاں تیرے گرفتاروں میں ہے
ہے ازل سے والیِ فردوس بھی مجنوں ترا
حسن میں تو شعلہ ہے، خوشبو میں ہے مشکِ تتار
تو مسیحا ہے تو میں بھی تیرے بیماروں میں ہوں
شاہ ہو، یا ہو گدا، ہر شخص تیرا رام ہے
تو رہینِ عیش ہے، بیگانۂ آلام ہے
اور پاجاتا کسی کے حسن سے حسنِ قبول
کاش میں بھی پھول ہوتا اور نہ ہوتا آدمی
عیش سے کٹتی مری کون و مکاں میں ہر جگہ

کاش پابندِ قیودِ رنج و غم ہوتا نہ میں
یوں لہو کرتا نہ دل کو جان یوں کھوتا نہ میں

فرحت کانپوری

گونگا

یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی بنائی ہوئی پختہ سڑک تھی جو قصبے سے شہر کو جاتی تھی۔

مئی کا مہینہ تھا اور دوپہر کا وقت۔ سورج آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ نیلے بلند آسمان سے لیکر جھلسی ہوئی خشک زمین کے ذروں تک ہر چیز آگ میں تپتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ فطرت اپنی ہیبتناک عریانی کے ساتھ دھوپ پر نہا رہی تھی۔ اور زمین پر بسنے والے جاندار جو اس عریانی کی تاب نہ لاسکتے تھے خانوں، اندھیری کوٹھڑیوں اور تاریک گوشوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ ہر طرف خاموشی کا دور دورہ تھا۔ زندگی اور حرکت کے آثار صرف اسقدر رہ گئے تھے کہ کبھی کبھی کوئی پرندہ کسی شاخ پر بول اٹھتا تھا یا ہوا کے جھونکے پتوں میں سے گزرتے تھے تو ایک خفیف سرسراہٹ پیدا ہوتی تھی۔ یا کوئی سوکھی ہوئی ٹہنی چیخ کر ٹوٹتی تھی تو ایک ہلکا سا نغمہ فضا میں گونج کر رہ جاتا تھا۔

سڑک کے کنارے درختوں کی مسلسل قطار تھی۔ مگر بیشتر درخت اجڑے ہوئے اور ویران تھے۔ سرسبزی اور شادابی کا نام نہ تھا۔ پتے اول تو تھے ہی نہیں، اور اگر تھے تو مرجھائے ہوئے اور خشک۔

پتے خشک ہو گئے تھے، مگر ان جانوروں کی آنتیں تو خشک نہیں ہوئی تھیں جو پتوں کو چر کر ہی زندہ رہتے ہیں۔ چنانچہ اسی نوع کے ایک جانور کا مالک اس سنسان جلتی ہوئی دوپہر میں ایک پیپل کے درخت کے نیچے کھڑا تھا اور ان پتوں کو بکھری ہوئی دولت کی طرح سمیٹ رہا تھا جو اس کا نوعمر بیٹا درخت کی بلندی سے ایک لمبی اور پتلی چھڑی کے ذریعے توڑ توڑ کر پھینک رہا تھا۔

وہ پیدائشی گونگا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے پچاس پچپن سال منہ سے بات کئے بغیر گزار دئے تھے۔ اس کے بدن کی جلد، اس کے سر کے الجھے ہوئے وحشیانہ بال، اور اس کے جسم سے لٹکتے ہوئے چیتھڑے تینوں چیزیں یکساں طور پر سیاہ تھیں۔ وہ بالکل ایک جانور معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے اور بھی گونگا تھا۔ انسانوں کو حیوانوں پر جو ایک عام تفوق حاصل ہے کہ انسان منہ سے بول سکتے ہیں اور حیوان بے زبان ہوتے ہیں، وہ اس سے بھی محروم تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی کیفیت پائی جاتی تھی جو بےزبان جانوروں کی آنکھوں میں پائی جاتی ہے۔

باپ بیٹے اپنے کام میں منہمک تھے کہ سڑک کے موڑ پر دو شخص تیزی کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دئے۔ وہ تہمد باندھے ہوئے تھے، مگر ان کی خاکی قمیصوں اور سرخ پگڑیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں پولیس کے سپاہی ہیں۔ موڑ سے نکلتے ہی ان کی نظریں تاراج ہوتے ہوئے پیپل کے درخت پر پڑیں، اور ان میں سے ایک نے وہیں سے چیخنا شروع کیا: "ابے او حرامزادے! کیا کر رہا ہے؟ سور کی اولاد!......"

یہ شخص گویا ماہر مغلظات تھا۔ اس کی گالیوں میں حیرت انگیز روانی اور بے تکلفی پائی جاتی تھی۔ درخت تک پہونچتے پہونچتے اس نے پتے توڑنے والوں اور ان کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بھتیجیوں کے متعلق اپنے تقریباً تمام زرّیں خیالات کا اظہار کر دیا۔

درخت کے نیچے پہونچکر وہ ذرا دیر کیلئے ٹھہرا، اور لڑکے کو جو ایک بہت اونچے گدّے پر کھڑا تھا نیچے اترنے کا حکم دیا۔ لڑکے نے پہلے تو پس و پیش سے کام لیا، مگر جب دیکھا کہ سپاہی ماننے والا نہیں تو بادلِ ناخواستہ آہستہ آہستہ اترنا شروع کیا۔

"جلدی اتر۔ رینگتا ہے چیونٹی کی طرح۔ بدمعاش کہیں کا" اس نے ڈانٹ کر کہا۔ لیکن شاید اسی وقت اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ لڑکا اترنے میں چاہے جتنی جلدی کرے۔ چند منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔ چنانچہ فوراً ہی دوسرا حکم صادر کیا "پہلے چھڑی نیچے پھینکدے"

لڑکے نے کوئی توجہ نہ کی۔ وہ جلدی جلدی درخت سے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ابے سنتا ہے کہ نہیں۔ چھڑی زمین پہ ڈال دے —— جلدی کر!"

لڑکے نے تیس فٹ کی بلندی سے چھڑی زمین پر پھینک دی۔ سپاہی نے چھڑی اٹھائی اور مع اپنے ساتھی کے آگے بڑھا۔ گویا چھڑی پتے توڑنے کے جرم میں ضبط کر لی گئی۔ لیکن وہ دونوں تین چار قدم ہی چلے ہوں گے کہ گونگا جو اب تک ایک سہمے ہوئے جانور کی طرح کھڑا تھا، ان کے پیچھے لپکا۔ اس نے اپنے ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا دے اور چہرے پر خود بخود ایک التجا آمیز انکسار کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ سپاہی فوراً رکا۔ چھڑی کا ایک سرا ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرا دوسرے ہاتھ میں۔ اور گھٹنے پر رکھکر بیچ میں سے اس کے دو ٹکڑے کر دئے۔ (بقیہ برصفحہ ۲۲)

پھندے

"ارے تم! ــــ تم یہاں کہاں ظہیر؟ ــــ ایے آؤ۔ بیٹھو یہاں، میرے پاس۔ میرا منہ کیا تک رہے ہو ــــ او ہو، ہو، بھئی مجھے بہت ہی خوشی ہے کہ تم سے آج اتنے برسوں کے بعد پھر ملاقات ہو گئی ــــ ہاں تمہیں میرا پتہ کیسے معلوم ہوا؟ ــــ بھئی تمہیں دیکھ کر بہت ہی خوشی ہو رہی ہے۔"

"ٹھیرو، ٹھیرو، تم تو مجھے دیکھتے ہی شور مچانے لگے۔ ذرا دو گھڑی آرام تو کر لینے دو۔ تمہیں تلاش کرتے کرتے میرا تو برا حال ہو گیا۔ نہ معلوم کہاں ان گندے غاروں میں آ کر بسے ہو۔ تلاش کرتے کرتے تھک گیا لیکن تمہارا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ ــــ اماں یہ انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے؟ کیسے رہ لیتے ہو تم اس تنگ و تاریک کوٹھری میں؟"

"چائے پیو گے، منگواؤں؟ ــــ نہیں نہیں پہلے ذرا منہ ہاتھ دھو کر ستا لو۔ پھر کچھ کھایا پیا جائیگا ــــ لو ذرا کپڑے اتار کر ادھر آ جاؤ اور منہ ہاتھ دھو ڈالو ــــ لاؤ لاؤ، مجھے دو کوٹ ــــ تم میں تو ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی ظہیر۔ ابھی تک کالج کے لونڈے ہی معلوم ہوتے ہو یار ــــ نا یہ ہاتھا پائی کی نہیں ٹھیری ہے!"

"اچھا اب جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو پوچھ ڈالو۔ میں بھی ایک ہی سانس میں جواب دینے کی کوشش کرونگا۔"

"تم ابھی تک ویسے ہی شریر ہو ــــ ٹینس وینس کا کیا حال ہے۔ اب بھی کھیلتے ہو؟ تم تو ٹینس کے رسیا تھے۔"

"اچھا اب ان حماقت کی باتوں کو چھوڑو، جذباتی جانور! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میری گاڑی چھوٹنے میں مشکل سے کوئی تین گھنٹے ہونگے اور مجھے تم سے بہت سی ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"جمنا، ارے جمنا۔ دیکھو میرے لئے اس وقت روٹی تیار نہ کرنا۔ میں باہر ہی کھا لونگا۔ میرے ایک دوست آ گئے ہیں۔ یہ میرے دوست ہیں شری یت ظہیر جی، میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں ــــ اور سنو تو ــــ دیکھو اگر دفتر سے مجھے کوئی بلانے آئے تو کہہ دینا کہ اپنے ایک دوست کو پہونچانے کے لئے اسٹیشن گئے ہیں ــــ سکھیا اگر آئے تو کہنا کل سے مل میں کام کرنے جائے۔ سیٹھ سے مل کر تمام باتیں طے ہو گئی ہیں، لو۔ یہ چابی بھی رکھ لو۔"

"ابے یہ کون؟ ــــ بتاتا کیوں نہیں ــــ بھابی یا کوئی ــــ تو آجکل یہ قصے ہیں!"

"تم میں سنجیدگی تو پیدا ہو ہی نہیں سکتی، چاہے کتنی ہی عمر ہو جائے، ویسے ہی نٹ کھٹ رہو گے ــــ مل میں کام کرتی ہے اور میری پڑوسن ہے۔ کھانے پکانے کا سارا انتظام بھی اسی کے سپرد ہے، سمجھے تم!"

"میں ایکسمس کی چھٹیوں میں کلکتہ گیا تھا۔ ایک روز میٹرو کے باہر مکرجی سے ملاقات ہو گئی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ تم رہا ہو گئے ہو، لیکن گورنمنٹ نے تمہیں بنگال میں رہنے کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے تم کانپور چلے آئے ہو اور مزدور سبھا میں کام کر رہے ہو۔ واپسی میں خیال ہوا کہ کانپور چند گھنٹے کے لئے اتر کر تم سے بھی کیوں نہ ملتا چلوں۔ چنانچہ اسباب وغیرہ اسٹیشن پر چھوڑ کر تمہاری تلاش میں نکلا۔ گھنٹوں ادھر ادھر

مارا مارا پھرا تو کہیں جا کر تمہارے مکان کا پتہ چلا۔ تم نے بھی اپنے رہنے کے لئے عجیب جگہ پسند کی ہے!"

"پسند کی ہے! —— ہاں تمہیں بہت دقت ہوئی ہوگی۔ لیکن ہم تو اسی ماحول میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، مزدوروں میں کام کرنے کے لئے بڑی حد تک خود کو بھی مزدور ہی بنانا پڑتا ہے۔ اور انہیں جیسی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے، پھر ہمارے پاس اتنا پیسہ بھی تو نہیں ہوتا کہ اس سے بہتر زندگی بسر کر سکیں —— مجھے تمہارے لکچرر ہونے کی خبر ہوگئی تھی۔ نہ معلوم کس نے کہا تھا —— چلو کچھ ناشتہ وغیرہ تو کرلو۔"

"تم تکلیف نہ کرو۔ اسٹیشن پہونچ کر دیکھا جائیگا۔"

"اس کا مجھے اچھی طرح احساس ہے۔ ملک کی سیاسی حالت کا تقاضا ہے کہ کام پوری جدوجہد سے کیا جائے۔ اور سیاست کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے جو واقعی انقلابی ذہنیتوں کے مالک ہیں۔ اس لئے کہ میرا تو ایمان ہے کہ ان اصلاح پسندوں کے ہاتھوں ہماری حالت بہتر نہیں ہوسکتی۔ ہمیں زندگی میں قدم قدم پر انقلاب کی ضرورت ہے لیکن یہ لوگ پرانی چیزوں سے اس بری طرح چمٹے ہوئے ہیں کہ ان کو چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے اور پھر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں، انقلاب کے نقیب! —— تمہاری تندرستی بہت خراب ہوگئی ہے۔ کچھ دن آرام کیوں نہیں کرتے، میرے پاس آکر رہو، پھر کچھ پرانی یادیں تازہ کیجائیں اور مستقبل کے متعلق سوچا جائے۔ نگار بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ بھئی، بیوی کے معاملے میں میں بہت خوش نصیب ہوں، وہ بالکل میری ہم خیال ہے۔"

"آؤنگا، اگر کبھی موقع ملا، دراصل ہم لوگوں کو فرصت نہیں ملتی۔ کام بہت ہے اور کرنے والے تھوڑے۔"

"لو، اصل بات تو پوچھنا بھول ہی گیا۔ میں بھی عجیب ہی آدمی ہوں۔ سوچا تھا کہ تم سے معلوم کرونگا۔ نظر بندی کے زمانے میں کس کس قسم کے تجربات ہوئے، کس طرح زندگی کے دن کاٹے اور آخر تم گرفتار کس طرح ہوئے۔ تم لوگوں کی زندگیاں تو سینکڑوں پُر اسرار واقعات کا مجموعہ ہیں جو فسانوں سے کہیں دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔"

"ہم لوگوں کی زندگیاں! نظر فریب بلبلے ہیں جو سطح آب پر نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اچھی طرح ابھریں کچھ قوتیں ان کے وجود کو فنا کر دیتی ہیں۔ یہ شاعری نہیں بلکہ تلخ حقیقت ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے بلبلے پھر سطح آب پر نمودار ہوتے ہیں۔ تم نے کبھی ان کا رقص دیکھا ہے؟ کس طرح یہ نڈر بھنور کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ گھوم گھوم کر، موجوں کے کاندھوں پر اور پھر کس دلیری سے بھنور کو احاطہ کر لیتے ہیں۔ میرے دوست، کچھ اسی قسم کی ہم لوگوں کی بھی زندگی ہے۔ ہم مٹتے اسی لئے ہیں کہ پھر ابھریں، دگنے عزم کے ساتھ! ——"

"لیکن تم کھا تو کچھ بھی نہیں رہے۔ دونوں سلسلے جاری رکھو —— اب ٹھیک ہے۔ ہاں تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم اتنے سال تک نظر بند کس جرم کی سزا میں رکھے گئے۔"

"جرم اور جرم کی سزا! کیا خوب!! —— اب سے چند ماہ قبل اگر تم مجھ سے یہ سوال کرتے کہ میں گرفتار کس طرح ہوگیا تو شاید میں کوئی جواب بھی نہ دے سکتا۔ اسلئے کہ ہم لوگوں کی گرفتاریاں بھی ایک معمہ بن کر رہ گئی تھیں۔"

"اماں کیا سچ! تمہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ تم گرفتار کس طرح ہوئے؟"

"پورے واقعات سنو گے تو تمہیں خود ہی معلوم ہوجائیگا۔

——— بی۔ اے کے بعد تم تو علیگڈھ چلے گئے۔ تم جانتے ہو کہ میری زندگی کا وہ کسقدر جذباتی دور تھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اُس غم کو بھی جاؤں لیکن پورنیما کا خیال ایک منٹ کو بھی میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ اور یہ ممکن بھی کس طرح تھا جس لڑکی کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے چار بہترین سال گذارے ہوں۔ جو میری بہترین رفیق ہو، اُس کی جُدائی کس طرح برداشت کی جاسکتی ہے اور جُدائی بھی کیسی، وہ عمر بھر کے لئے دوسرے کی آغوش میں سونپ دی گئی۔ محض اس وجہ سے کہ میں مفلس تھا۔ تم تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ ایک سال میں نے کس عالم میں بسر کیا۔ غم غلط کرنے کی بیسیوں ہی تو کوششیں کیں، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ میری زندگی کا سہارا اُس کے چند فوٹو اور وہ خطوط تھے جو وہ مجھے وقتاً فوقتاً لکھتی رہتی تھی۔ مجھے زندگی ایک ایسا سیلاب معلوم ہوتی تھی جس کا کنارہ دُور دُور تک دکھائی نہ دے چنانچہ میں نے یہ طے کیا کہ بی۔ اے کے بعد بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں اور سیاسی کاموں میں اپنے آپ کو گم کر دوں۔ میں بڑے انہماک سے کام کر رہا تھا۔ لیکن پورنیما مجھے کچھ اس قسم کا درد دے گئی تھی کہ میں اگر کسی اور کو اسی قسم کی تکلیف میں دیکھتا تو چیخ اُٹھتا۔ مجھے اُس کے ساتھ دلی ہمدردی ہو جاتی، اور میں اُس کی دلجوئی کے لئے ہر قسم قربانی کرنیکے لئے تیار ہو جاتا ——— ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں سینما دیکھنے گیا ہوا تھا کہانی ایک دردناک ٹریجیڈی تھی اور باوجود کوشش کے میں اپنی آہوں کو ضبط نہ کر سکا، چنانچہ کئی بار میرے مُنہ سے دبی دبی آہیں نکل گئیں۔ سینما ختم ہونے پر ایک نوجوان جو میرے پہلو میں بیٹھا تھا، میری صورت دیکھنے لگا۔ اسکے بعد اُس نے مُسکراتے ہوئے مجھ سے نہایت ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"آپکا دل بہت کمزور معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپکی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ آپ اس قسم کے غمگین مناظر برداشت نہیں کر سکتے۔" اُس وقت میری کچھ عجیب حالت تھی، میں لے اپنے کُرتے کے دامن کو مڑوڑتے ہوتے کہا "جی نہیں، آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی۔ میری زندگی میں تو اس قسم کی کوئی ٹریجیڈی ہوئی نہیں۔" اور جلدی سے اُسکو سلام کرکے بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

اُس روز بہت رات گئے تک مجھے نیند نہ آئی۔ پورنیما پھر میرے حواس پر چھا گئی۔ بار بار مجھے اُس کا خیال آتا تھا۔ کئی بار مجھے اُس نوجوان کا بھی خیال آیا جس سے آج سینما میں ملاقات ہوئی تھی اور میں یہ خیال کرکرکے کہ وہ میرے اس برتاؤ پر میرے متعلق نہ معلوم کیا رائے قائم کرے سخت خفیف ہو رہا تھا۔

اس کے کچھ دنوں کے بعد کالج گرمیوں کی چھٹیوں کے سلسلے میں بند ہو گیا اور میں اپنے ہیڈ آفس کی طرف سے جماعت بندی کے لئے دیہاتوں میں بھیج دیا گیا۔ چھٹیاں ختم ہونے پر میں پھر بورڈنگ ہاؤس میں آکر رہنے لگا اور اپنی تعلیم شروع کر دی، سیاسی کاموں کی وجہ سے مجھے اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ میں دوسرے لڑکوں کی طرح گپ شپ میں اپنا وقت برباد کروں، چنانچہ پورے بورڈنگ ہاؤس میں میرے چار پانچ ہی ملاقاتی تھے۔ ایک دن میں اپنا کمرہ بند کرکے کہیں باہر جانے والا تھا کہ مجھے برابر والے کمرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک طالب علم نے آواز دی۔ اُس وقت تو میں اُسکو پہچان بھی نہ سکا۔ لیکن اُس نے مجھے بتایا کہ میں اُس سے ایک بار سینما میں مل چکا ہوں، یہ وہی نوجوان تھا جس نے ایک بار مجھ سے ہمدردی کی تھی اور میں اُس کی ہمدردی کا جواب نہایت بھونڈے طریقہ سے دے کر بھاگ آیا تھا۔

میں نے اس سے اُس بُرانے واقعہ کے متعلق معذرت چاہی۔ دیر تک وہ مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا، دورانِ گفتگو میں اُس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھے گا اگر میں وقتاً فوقتاً اُس سے ملتا رہوں۔

میری اُس کی ملاقاتیں اکثر ہوتی رہتیں، کبھی کالج میں، کبھی کالج بورڈنگ ہاؤس میں۔ اب وہ کبھی کبھی میرے کمرے پر بھی آتا۔ کئی بار مجھے سینما بھی لے گیا۔ دو ایک بار اُس نے مجھے اپنے کمرے پر چائے پر بھی بُلایا۔ اُس کا کمرہ نہایت سلیقہ سے سجا ہوا تھا اور اُس کی طرزِ رہائش بتاتی تھی کہ اس کا تعلق کسی کھاتے پیتے خاندان سے ہے۔ لیکن ہماری یہ ملاقاتیں دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔ میری اور اس کی زندگی میں کوئی مناسبت نہ تھی، وہ ایک خوش باش فیشن پرست نوجوان تھا مغربی انداز کا دلدادہ اور انگریزوں کی نقل میں مُنہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزی بولنے کا شوقین اور پھر میری عدیم الفرصتی۔ چنانچہ جلد ہی میں اُس کی طرف سے بے خبر ہو گیا۔ کبھی کبھار یونہی سڑک پر اُس سے دو چار منٹ کو ملاقات ہو جاتی اور اِدھر اُدھر کی یونہی کچھ باتیں ہوتیں اور بس۔

اس کے بعد اُس کی زندگی میں ایک عجیب تغیر ہوا۔ کل کا خوش باش، ہنس مکھ، فیشن پرست نوجوان اب ہر وقت مغموم سا رہنے لگا۔ نہ اُسے اپنے لباس کی پرواہ تھی اور نہ کھانے پینے کی۔ اُس کے بال جو نہ جانے دن میں کتنی بار سنوارے جانے کے عادی تھے۔ کنگھے کی صورت کو ترس گئے تھے۔ اور عجیب طرح اُلجھے رہتے تھے، یہ تبدیلی اس قدر غیر معمولی تھی کہ مجھے بھی اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکی۔ میں اُس کے کمرے میں ملنے کے لئے گیا، اب وہ کمرہ وہ کمرہ ہی نہ تھا تصویروں پر دھول جمی ہوئی تھی۔ کتابیں گرد آلود ہو رہی تھیں ٹینس کے وہ بلّے جو کھیل ختم ہونے کے بعد نہایت احتیاط سے پریس میں رکھ دئے جاتے تھے کرسیوں اور میزوں کے نیچے پڑے ہوئے تھے، پلنگ کی چادر معلوم ہوتا تھا مدتوں سے نہیں بدلی گئی۔ غرضیکہ عجب انتشار تھا! عجیب بے سرو سامانی تھی!!

مجھے اس تبدیلی پر سخت حیرت تھی، میں نے اس کی دلجوئی کی لیکن بے سود۔ وہ روز بروز غم میں دبتا گیا، ایک عجیب قسم کی اُداسی نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا، میں نے کئی بار اس تبدیلی، اس غم کی وجہ پوچھی لیکن وہ ٹال مٹال گیا۔ کئی بار سینما کی دعوت دی لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ اور میری حیرت روز بروز بڑھتی گئی۔ میں اُس کی اس حالت کو دیکھتا تو مجھے بڑا دُکھ ہوتا۔ بہت دنوں کی کوشش کے بعد آخر کار مجھے کامیابی ہوئی۔ ایک دن اُس نے بکس میں سے نکال کر میرے سامنے خطوں کا ایک بنڈل ڈال دیا۔ یہ ایک لڑکی کے محبت نامے تھے جس سے یہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسی دوران میں لڑکی کے والد کو کوئی بہتر کھاتا کماتا بر مل گیا جس کے ساتھ اُس کی شادی کر دی گئی۔ میری اُس کی زندگی ایکا ایکی کتنی قریب ہو گئی تھی! میری اُس کی ناکامیوں میں کتنی مناسبت تھی!!

چنانچہ اب وہ جلد ہی کالج بھر میں میرا عزیز ترین دوست ہو گیا۔ اب میں اپنا خالی وقت زیادہ تر اُس کے ساتھ ہی گذارتا۔ اُس کا غم غلط کرنے کے لئے دنیا زمانے کی باتیں کرتا اور یہ باتیں نظریۂ محبت، شباب اور اُس کے خواب، موجودہ تعلیم، سیاست، اقتصادیات۔ برٹش سامراج اور ہندوستان کی غربت اور اسی قماش کے دیگر موضوعات کو احاطہ کئے ہوتیں۔

رفتہ رفتہ مجھے یقین ہو چلا کہ وہ بہترین دماغی قوتوں کا مالک ہے اور اگر کوشش کی جائے تو وہ بہترین سیاسی کام کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ وہ نہ صرف میرا ہم خیال ہو گیا بلکہ جلد ہی ہماری جماعت میں اُس نے نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔

ٍس کا عزم واستقلال، اور سوجھ بوجھ ہماری رہنمائی کرتی۔ اب
دہ بہترین دماغی قوتوں کا مالک "دہشت پسند" سمجھا جاتا تھا۔
ور مجھے اس بات پر ناز تھا کہ میں نے اُس جیسے رُکن کا اپنی پارٹی
یں اضافہ کیا ہے۔

دُرگا پوجا کی چھٹیاں تھیں اور ہم لوگ کہیں باہر جانے
ا ارادہ کر رہے تھے کہ ہمیں ہیڈ آفس سے اطلاع ملی کہ ہم
ورًا رتنام پور روانہ ہوجائیں۔ جہاں تقسیم انعامات کے
سلسلے میں ایک جلسہ ہونے والا ہے۔ تقسیم انعامات کی رسم
ہاں کے جوائنٹ مجسٹریٹ کے ہاتھوں ادا ہوگی جس نے
ہماری جماعت کو سخت نقصان پہونچایا تھا اور سیاسی کام
رنے والوں کی راہ میں بڑی رُکاوٹیں پیدا کردی تھیں۔
س کی جان پر اس سے پیشتر بھی کئی بار ناکام حملے ہوچکے
تھے۔ چنانچہ ہم لوگ اُسے اپنی گولیوں کا نشانہ بنانے کے
ئے رتنام پور روانہ ہوگئے۔ چوتھے روز کھیل ختم ہونے کے
عد جلسہ منعقد ہوا۔ اور ہم لوگ بھی تماشبینوں میں شامل
ہوگئے۔ معینہ وقت سے ایک منٹ پہلے ہم لوگوں نے اپنی
یبوں میں ریوالور نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالے لیکن اس سے
یشتر کہ ہم لوگوں کے ہاتھ جیبوں سے باہر نکلیں، اُن میں
تھکڑیاں پڑ چکیں تھیں۔

تم سمجھ سکتے ہو کہ ہماری حیرت کا کیا عالم ہوگا۔ تمام
اررروائی بہترین رفیقوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ جو ایک مدت
سے یہی کام کر رہے تھے۔ پھر کس طرح یہ راز افشا ہوگیا؟ یہ
یک معمہ تھا۔ ناقابلِ حل!

اس کے بعد ہم لوگ بغیر کسی قسم کی قانونی کارروائی
ے نظربند کردئے گئے۔ گرفتاری کے بعد میرا ساتھی نظربند
رنے کے لئے کسی اور کیمپ بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد یقین کرو،
یک ایک کرکے ہماری پارٹی کے جتنے سربرآوردہ لیڈر تھے
اُسی دن گرفتار کرلئے گئے۔ ہماری عقل وفہم سے یہ تمام
باتیں بالاتر تھیں۔

اِس کے بعد چھ سال تک نظربندی کی زندگی بسر کی۔ اب
جو ملکی سیاست میں غیر معمولی تبدیلی ہوئی تو عوام نے حکومت
کو ہم لوگوں کو رہا کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن ہمارے ساتھیوں
میں سے اکثر کو اپنے صوبے میں رہنے کی اجازت نہیں ملی۔
رہا ہونیکے بعد میں اپنے چچا زاد بھائی سے ملنے کے لئے پٹنہ
گیا۔ تیسرے پہر کے قریب میں اُن کے مکان پہونچا، وہ
وہیں یونیورسٹی میں ریڈر ہیں۔ مدتوں بعد مجھے دیکھ کر
اُنہیں بڑی حیرت اور مسرت ہوئی۔ وہ میرے حالات سے
بالکل بے خبر تھے۔

نہا دھونے کے بعد وہ مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں
لائے اور مجھے وہیں بٹھا کر خود گھر میں چائے لینے کے لئے
چلے گئے۔ میں اکیلا بیٹھا کمرہ کی چیزوں کا جائزہ لیتا رہا۔
سامنے کونے میں ایک چھوٹی سی میز پر ایک فوٹو پر میری نظریں
جم کر رہ گئیں۔ مجھے کچھ شبہ ہوا۔ چنانچہ میں نے اُٹھکر
قریب سے اُس فوٹو کو دیکھا۔ یہ تو میرے عزیز ترین دوست
کا فوٹو ہے، آج مجھے اُس کا فوٹو ہی دیکھکر بڑی مسرت
ہوئی۔ جونہی بھائی صاحب ناشتہ لیکر آئے، میں نے اُن سے
پے در پے سوالات کئے۔

"آپ، ان صاحب کو جانتے ہیں؟"

"کیوں نہیں، یہ میرے پرانے کلاس فیلو اور دوست ہیں۔"

"کیا کہا آپ نے، آپ کے کلاس فیلو؟"

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے!"

"آجکل یہ ہیں کہاں؟"

"کلکتہ میں!"

"آپ کو غالباً کچھ غلط فہمی ہوئی۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ابھی پچھلے ہی سال جب میں کلکتہ گیا تھا تو ان سے ملا تھا۔ اس کے علاوہ میری ان کی خط و کتابت ہوتی رہتی ہے۔"

"میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے ——— بھائی صاحب ان کو تو میرے ساتھ ہی چھ سال قبل رنتام پور کانسپریسی کیس میں قید ہوئی تھی۔"

"کانسپریسی کیس میں قید ہوئی تھی اور ان کو! چھ سال قبل!! ——— پہلے تم ناشتہ کر لو، پھر اطمینان سے باتیں کرنا ——— گذشتہ نو سال سے تو یہ ملازمت میں ہیں اور آج کل کلکتہ میں سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر ہیں۔ وہ کوئی اور صاحب ہوں گے۔ تمہیں شدید غلط فہمی ہوئی۔"

میرے ہاتھوں سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔"

* * * * * * * *

شاہد لطیف

نقوشِ پریشاں

مرے اشکوں کو بھی تابندگی دے — جنونِ عشق کو پائندگی دے
مجھے غم نے ابد کی زندگی دی — مرے غم کو ابد کی زندگی دے

(۲)

مجھے کیوں دشمنی سی ہے دعا سے — تعلق کیوں ہے تسلیم و رضا سے
خدا جب رازِ عسرت جانتا ہے — کہو تو کیا کہوں آخر خدا سے

(۳)

رہینِ حسرت و آلام ہوں میں — محبت میں بڑا ناکام ہوں میں
مری رسوائیوں کا پوچھنا کیا — زمانے میں بہت بدنام ہوں میں

(۴)

کہو تو درد کا قصہ سناؤں — میں روؤں اور جہاں بھر کو ہنساؤں
جسے سنکر مقدر مسکرا دے — کوئی ناکامیوں کا گیت گاؤں

(۵)

دعاؤں میں اثر کو ڈھونڈتا ہوں — ابھی تک راہبر کو ڈھونڈتا ہوں
مری نظروں کو میری جستجو ہے — میں خود اپنی نظر کو ڈھونڈتا ہوں

(۶)

دیئے دھوکے تمناؤں نے کیا کیا — مری بے رہ روی کا پوچھنا کیا
مجھے دیکھو سراپا مدعا ہوں — نہیں سوچو ہے میرا مدعا کیا

مجیب لاہوری

بھوت[1]

افسر ڈراما

عابد
شکیلہ
بھوت

(شکیلہ کے چچا جبار کے بنگلہ کا ایک کمرہ۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی میز اور کرسیاں پڑی ہیں۔ دوسری طرف صوفہ رکھا ہے۔ ایک کھڑکی اور دو دروازے ہیں۔ پردہ اُٹھتا ہے تو عابد میز پر کچھ لکھتا ہوا نظر آتا ہے)

عابد۔ (قلم رکھ کر کاغذ اُٹھاتا ہے اور پڑھتا ہے) "پیاری شکیلہ! گُستاخی معاف۔ مجھے تم سے محبت ہے، تمہیں یاد ہوگا، ہماری ملاقات چار سال قبل ہوئی تھی۔ چار سال سے میں محبت کی آگ میں جل رہا ہوں۔ مگر اظہارِ محبت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن اب موقعہ اچھا ہے۔ تمہارے چچا ضروری کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں، کل واپس آنے کی توقع ہے۔ کیا تم میرا ہدیۂ دل قبول کرو گی؟"

(دروازہ نہیں کھلتا۔ مگر بھوت داخل ہوتا ہے۔ وضع قطع سے شکیلہ کے چچا کا بھوت معلوم ہوتا ہے عابد اُسکو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہے پھر خط جلدی سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے)

عابد۔ (خوف زدہ ہوکر) آپ ..... آپ ..... (کھڑا ہو جاتا ہے)

بھوت:۔ آداب عرض ہے۔ پریشان ہونیکی کوئی بات نہیں۔

عابد:۔ جی ہاں ..... جی ہاں ... نہیں نہیں ..... یعنی کہ آپ جلد واپس آ گئے۔

بھوت:۔ (ہنستا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے دور بادل گرج رہے ہیں) ہا ہا ہا! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

عابد:۔ غلط فہمی؟ میں آپکا مطلب نہیں سمجھا۔

بھوت:۔ میں پھر کہتا ہوں۔ آپکو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں جبار نہیں ہوں۔

عابد:۔ آپ جبار نہیں ہیں! خوب! یا تو آپ مذاق کر رہے ہیں یا مجھے اپنی آنکھوں کا علاج کرانا پڑے گا (آنکھیں مل کر دیکھتا ہے)

بھوت:۔ میں نے عرض کیا میں جبار نہیں ہوں۔ میں جبار کا بھوت ہوں۔

عابد:۔ (چیخ کے ساتھ پیچھے ہٹتے ہوئے) آپ جبار کے بھوت ہیں! شکیلہ کے چچا کے بھوت ہیں!

---

[1] میں نے انگریزی میں ایک افسانہ پڑھا تھا اُسکے اصل پلاٹ کو میں ڈرامہ کے سانچے میں ڈھالکر پیش کر رہا ہوں شاید کسی قابل ہو۔

بھوت:۔ جی ہاں۔ جناب!

عابد:۔ ہائے! تو کیا اُن کا انتقال ہوگیا؟ آج ہی صبح کو تو وہ شہر سے باہر گئے تھے۔ کیا اُن کو کسی نے قتل کر دیا؟ کیا موٹر کا حادثہ پیش آیا؟ کیا اُن کے قلب کی حرکت بند ہوگئی؟ کیا وہ۔

بھوت:۔ (بات کاٹ کر) جی نہیں۔ آپ غلط سمجھے وہ زندہ ہیں۔

عابد:۔ (چونک کر) وہ زندہ ہیں! کیا بکتے ہو! تم ابھی ابھی کہہ رہے تھے ہیں اُن کا بھوت ہوں۔

بھوت:۔ ہاں دونوں باتیں صحیح ہیں وہ زندہ ہیں۔ اور میں اُن کا بھوت ہوں۔

عابد:۔ یا تو تم پاگل ہو یا پھر میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

بھوت:۔ جی نہیں۔ یہ قصہ عجیب و غریب ہے۔ جی ہاں عجیب و غریب مجھے یقین ہے آپ کو اس کی نظیر نہیں ملے گی۔ کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟

عابد:۔ جی؟ ہاں ہاں۔ کیوں نہیں؟ اِدھر آیئے (بھوت آہستہ آہستہ آگے بڑھکر صوفہ کے پاس جاتا ہے اور اس میں سما جاتا ہے، اور ٹانگیں پھیلا دیتا ہے۔ عابد فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

بھوت:۔ کیا جبار صاحب آج رات واپس آجائیں گے؟

عابد:۔ نہیں وہ کل آئیں گے۔

بھوت:۔ کیا آپکو یقین ہے؟

عابد:۔ وہ کہہ گئے ہیں کہ کل شام تک آؤں گا۔

بھوت:۔ (اطمینان کا سانس لیکر) مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی۔ ڈھائی سال کے عرصہ میں یہ پہلی مرتبہ ہی کہ وہ رات میں گھر سے باہر ہیں۔ آپ نہیں سمجھ سکتے اس سے مجھے کتنا اطمینان حاصل ہوا۔

عابد:۔ ڈھائی سال! (حیران ہوکر اُس کو گھورتا ہے) میں نہیں سمجھا۔

بھوت:۔ جی ہاں۔ ڈھائی سال۔ ڈھائی سال سے میں اس گھر میں مقیم ہوں۔

عابد:۔ یعنی ڈھائی سال سے آپ اُن کے بھوت بنے ہوئے ہیں؟

بھوت:۔ ہاں۔ ڈھائی سال سے مجھے یہ عزت حاصل ہے۔ میری کہانی سُنیئے۔ (آہ بھرکر) ڈھائی سال قبل جبار صاحب اس مکان میں سخت بیمار ہوگئے تھے۔ بہت سخت۔ ڈاکٹر تک مایوس ہوگئے تھے۔ ایک بار تو اُن کو مُردہ باور کر لیا گیا۔ یہ خبر ہمارے ہیڈ کوارٹرز کو پہنچی۔ فوراً میرا تقرر کر دیا گیا۔ حکم ملا۔ جلد از جلد جا کر جائزہ حاصل کرلو، اور کام شروع کردو۔ میں اپنے فرائض انجام دینے کے لئے یہاں آیا لیکن میری حیرت اور دہشت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیا دیکھتا ہوں۔ جبار صاحب نہ صرف مرے نہیں بلکہ صحت یاب ہونے چلے گئے ——— خُدا اُس ڈاکٹر کو غارت کرے!

عابد:۔ جناب! ڈاکٹر کو بددعا نہ دیجئے۔

بھوت:۔ خیر یہ آپ کا نقطۂ نظر ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے۔ اس ڈاکٹر کی کامیابی سے میری پوزیشن کتنی خراب اور نازک ہوگئی۔ میں اپنے ہیڈ کوارٹرز کو واپس نہیں جا سکتا تھا، اور مجھے اس شخص کا بھوت بننے کا کوئی حق نہیں تھا جو مرا نہیں تھا خدا دشمن کو بھی ایسی مصیبت میں نہ ڈالے۔

عابد:۔ واقعی آپکی یہ پوزیشن نا قابل رشک ہے۔

بھوت:۔ جی ہاں۔ میرے دوستوں نے مشورہ دیا۔ اس جگہ کو سنبھالے رہو جبار صاحب بوڑھے آدمی ہیں۔ ممکن ہے ان کا وقت جلد آجائے۔ تب میں جائز طور پر اپنے فرائض ادا کرسکتا ہوں لیکن جناب! جبار صاحب کی صحت بہت اچھی ہے بلکہ مجھے تو وہ جوان بنتے نظر آرہے ہیں۔ شاید اعادۂ شباب کا عمل فرما رہے ہیں (ٹھنڈی سانس لے کر) خدا معلوم یہ تکلیف دہ صورت حال کب تک باقی رہتی ہے خدا معلوم کونسے گناہ کی

سزا مجھے مل رہی ہے؟

عابد:- صبر کیجئے صبر۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

بھوت:- صاحب! یہ سب دل کے بہلانے کی باتیں ہیں۔ میں اس زندگی سے بیزار ہوں۔ اُمیدواری کا یہ زمانہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ مجھے اِسی مکان میں رہنا ہے اور وہ کبھی باہر نہیں جاتے۔ ہمیشہ خدشہ لگا رہتا ہے کہیں مڈبھیڑ نہ ہوجائے۔ اسی لئے میں اُن سے بچنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ آپ ہی کہیئے نا آزادی کے بغیر زندگی کس کام کی؟

عابد:- یہ صحیح ہے۔ لیکن آپ اُن سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں؟ وہ آپ کو ضرر نہیں پہنچا سکتے۔

بھوت:- ضرر تو نہیں پہنچا سکتے لیکن اُن کی موجودگی۔ اس سے مجھے صدمۂ عظیم پہنچتا ہے۔ میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میرا ضمیر مجھے لعنت ملامت کرنے لگتا ہے۔ ذرا تصور تو کیجئے جناب! آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کے احساسات کیا ہوتے؟

عابد:- (کانپ کر) جی نہیں نہیں نہیں! میں انکار کرتا ہوں۔ ایسا تصور کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہے!

بھوت:- خیر جانے دیجئے۔ ڈرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔

عابد:- کیا؟

بھوت:- جبار صاحب کے سوائے کسی اور کا بھوت بنتا تو مجھے اتنی روحانی اذیت نہ ہوتی۔ جبار صاحب بڑے سخت گیر آدمی ہیں۔ مغلوب الغضب ہیں۔ اُن کی سخت کلامی مشہور ہے۔ اگر انہیں معلوم ہوجائے ـــــــ اس خیال سے کانپ جاتا ہوں (کانپتا ہے) آپ سمجھ سکتے ہیں۔ آپ ان کی فطرت سے واقف ہیں۔

عابد:- ہاں ہاں۔ میں سب کچھ محسوس کرتا ہوں۔ بہرحال مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔

بھوت:- شکریہ۔ مجھے آپ کی صحبت میں بیٹھنے سے تسلی حاصل ہوئی۔ ڈھارس بندھی۔ اسی اُمید میں وقت ملاقات قبل از قبل مقرر کئے بغیر آپ سے ملنے چلا آیا۔ جبار صاحب شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا۔ چلو رات کا انتظار کئے بغیر مل آئیں۔ تفکرات سے تھوڑی دیر کے لئے تو نجات ملے گی۔ میں جانتا تھا۔ آپ یہاں چند دن کے مہمان ہیں۔ اس لئے جلد از جلد آپ سے دوستی کرنے کی فکر تھی اسی ارادے سے میں راتوں کو آپ کے کمرہ میں آیا۔ مگر ہر بار آپ مجھے سوتے ہوئے ملے۔

عابد:- اچھا؟ مجھے جگا کیوں نہ دیا؟

بھوت:- کچھ اس لئے کہ آپ سے تعارف نہ تھا۔ اور کچھ اس ڈر کے مارے کہ کہیں جبار صاحب آپ کی آواز نہ سُن لیں۔ ایسی صورت میں وہ ضرور آپ سے پوچھنے آتے کہ آپ تنہائی میں دیواروں سے کیوں باتیں کر رہے تھے۔

عابد:- کیوں؟ وہ آپکی آواز بھی تو سُن لیتے۔؟

بھوت:- جی نہیں اس کا امکان نہیں۔ ممکن ہے کسی شخص کو میں کبھی نظر آجاؤں۔ لیکن کوئی شخص میری آواز نہیں سن سکتا۔ جب تک میں اُسے مخاطب نہ کروں۔

عابد:- اچھا یہ فائدہ کی بات تو ہے۔ لیکن آپ مجھ سے گفتگو کیوں کرنا چاہتے ہیں۔

بھوت:- ظاہر ہے وقتاً فوقتاً کسی سے گفتگو کرنے کو جی بے اختیار چاہتا ہے۔ خصوصاً آپ جیسے آدمی سے۔ آپ آج کل پریشان ہیں اور جس شخص کو سکون نصیب نہیں ہوتا وہ ہماری جنس سے عموماً ڈرا نہیں کرتا۔ ہوتا یہی بات ہے؟

عابد:- خیر آپ اپنا مدعا بیان کیجئے۔

بھوت:- جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں۔ جبار صاحب سخت جان نکلے۔ ان کے جلد انتقال فرماجانے کا امکان کم ہے۔ میری حالت ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی ہے۔ یہی حال رہا تو اندیشہ ہے کہیں پاگل نہ ہوجاؤں۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ اپنا تبادلہ کرالوں۔

عابد:- تبادلہ! تبادلہ! یہ ہماری دنیا کی نوکری تھوڑی ہے کہ تبادلہ-

بھوت:- قطع کلام ہوتا ہے۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ اب کہ میں نے بھوت کا پیشہ اختیار کر لیا ہے میرے لئے ضروری ہے کہ کسی نہ کسی کا بھوت بنوں اور میں اس شخص کا بھوت بننا چاہتا ہوں جو واقعی مر چکا ہو۔

عابد: اوہ! یہ بات ہے؟ یہ تو کچھ مشکل نہیں۔ لوگ مرتے ہی رہتے ہیں۔ مواقع نکلتے ہی رہتے ہیں۔

بھوت:- جی نہیں نہیں! آپ ہماری دُنیا کے حالات سے واقف نہیں ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ آج کل جائدادوں کے لئے کتنا رش ہوتا ہے۔ ایک آدمی مرتا ہے تو سینکڑوں اُمیدواروں کی درخواستیں آجاتی ہیں۔

عابد:- اوہ! مجھے معلوم نہ تھا۔ آپ کے ہاں بھی بے روزگاری کی لعنت موجود ہے۔

بھوت:- جی ہاں۔ موت کی شرح میں اضافہ کے باوجود ہمارے بے کاروں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اور پھر سفارش کا بازار بھی خوب گرم رہتا ہے۔ ہم نے یہ طریقے سب آپ کی دُنیا سے سیکھے ہیں۔

عابد:- اچھا تو ایسا کیوں نہیں کیا جاتا، کہ ایک باقاعدہ سسٹم مقرر کیا جائے۔ سینیر کالحاظ پہلے اور جو نمبر کا بعد جس کے حقوق مرجح ہوں اس کو جگہ پہلے دی جائے یا پھر امتحان مقابلہ رکھا جائے۔

بھوت:- یہ چیز ہمارے ہاں نہیں چل سکتی۔ ہوتا یہ ہے کہ ——— فرض کیجئے۔ بھوت کی کوئی اچھی جگہ خالی ہوئی۔ درخواستیں دھڑا دھڑ آنے لگتی ہیں۔ اس کے برعکس بعض ایسی جائدادیں بھی نکل آتی ہیں کہ کوئی بھی اُن کو پُر کرنا نہیں پسند کرتا۔

عابد:- واقعی تب تو بڑی مشکل ہوتی ہوگی۔

بھوت:- مُشکل؟ کیا پوچھتے ہیں آپ؟ میری حالت کو دیکھئے۔ میری عقل یقیناً اُس وقت چرنے گئی تھی۔ میں نے جبار صاحب کے معاملہ میں بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ اُن کی جگہ ایسی تھی کہ کوئی اس کو لینے پر راضی نہ ہوا۔ مجھے شوق تھا۔ میں نے جھٹ قبول کر لیا۔ اور اب پچھتا رہا ہوں۔ سچ ہے جلدی کا کام شیطان کا۔ ہاں تو عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ آپ میری مدد فرمائیں۔

عابد:- (گھبرا کر) میں؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟

بھوت:- ممکن ہے آپ کو کسی ایسے کیس کا علم ہو۔ جہاں بھوت کی جگہ خالی ہونے کی توقع نہ ہو مگر پھر بھی اچانک وہ خالی ہو جائے۔ اگر آپ۔۔۔۔ آپ قلیل مدت کی نوٹس دیں تو میں کوشش کر کے اپنے تبادلہ کا انتظام کر سکتا ہوں۔

عابد:- (کھڑا ہو کر) ہائیں! کیا مطلب؟ کیا تم چاہتے ہو میں خودکشی کر لوں یا تمہارے فائدے کے لئے کسی کو قتل کر ڈالوں؟

بھوت:- جی نہیں نہیں نہیں! میرا مطلب یہ نہیں ہے (کھڑا ہو جاتا ہے) میرا مطلب یہ ہے، آپ کے رشتہ داروں یا دوستوں میں کوئی صاحب ہوں۔ بہت بوڑھے یا بیمار۔ ایسے کہ ——— یعنی کہ آپ سمجھ گئے نا؟ اگر آپ معلومات بہم پہنچائیں اور مجھ بدنصیب کی مدد کریں تو مجھے بہت فائدہ پہنچے گا۔ میں ان کی خبر رکھوں گا۔ اور وقت پر اس مخمصے سے نجات پا جاؤں گا۔ اس احسان کے بدلے میں آپ کی مدد ضرور کروں گا۔

عابد:- میری مدد؟ وہ کس طرح؟

بھوت:- میں جانتا ہوں۔ آپ شکیلہ سے محبت کرتے ہیں۔

عابد:- آپکی معلومات وسیع ہیں۔

بھوت:- ہاں میں آنکھیں رکھتا ہوں۔ سب کچھ دیکھتا اور سمجھتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں آپنے ابھی تک اپنے دل کی بات

شکیلہ سے نہیں کہی ہے۔

عابد:- میں موقع کا منتظر ہوں۔

بھوت:- میرا دل نہیں مانتا۔ آپ کو بہت سے مواقع ملے۔ مگر آپ نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کوئی اور وجہ ضرور ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھئے اور رازداں بنائیے۔

عابد:- آپ سے کیا چھپانا؟ بات یہ ہے، میں بھی آپ کی طرح شکیلہ کے چچا سے ڈرتا ہوں۔ بڑے خوفناک چچا ہیں۔

بھوت:- یہی بات میرے ذہن میں آئی تھی۔

عابد:- ہاں۔ مانا وہ والد کے گہرے دوست ہیں۔ مجھے چاہتے ہیں۔ پھر بھی ــــ پھر بھی ــــ وہ تُند خو آدمی ہیں۔ اسی بات سے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔

بھوت:- مگر وہ کیا کر سکتے ہیں؟ جب شکیلہ آپ کی بیوی بننے پر راضی ہو تو میری سمجھ میں نہیں آتا ــــ

عابد:- (بات کاٹ کر) مگر یہی تو معلوم نہیں ہے۔ یقین کے ساتھ کون کہہ سکتا ہے، شکیلہ میری بیوی بننے پر راضی ہو سکتی ہے؟ اس کے حقیقی جذبات کا علم مجھے نہیں ہے۔ میں نے اپنا دردِ دل اس کے ــــ

بھوت:- تب تو آپ بڑی کمزوری دکھاتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے۔ یہ زمانہ ترقی کا ہے۔ بزدلی سے کام نہیں چلتا، خصوصاً ایسے معاملہ میں دیکھئے آج کل لڑکیاں تک دلیر ہو گئی ہیں اور آپ کا یہ حال ہے۔ آپکو تو ایک صدی پہلے پیدا ہونا چاہیئے تھا۔

عابد:- آپ کا خیال درست ہے لیکن کیا کروں؟ پستی کا احساس ہر وقت میری زبان بند کر دیتا ہے۔ دیکھئے یہ خط ابھی ابھی لکھ رہا تھا۔ شکیلہ سے زبانی درخواست کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ارادہ ہے یہ خط بھیج دوں آپکی کیا رائے ہے؟

بھوت:- معاف کیجئے۔ میں اس تجویز کا مخالف ہوں شکیلہ پہ اس کا اثر کچھ اچھا نہ ہوگا۔ خیال کرے گی۔ ایک ہی گھر میں ہیں بالمشافہ یہ بات کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چٹھی بھیجی ہے ــــ نہیں جناب! یہ بالکل مناسب نہیں ہے۔ عورت بہادر مرد کو پسند کرتی ہے۔

عابد:- (پریشان ہو کر) کیا مشکل ہے! بولنے کی ہمت نہیں چٹھی لکھنا مناسب نہیں۔ کروں تو کیا کروں؟ ــــ اور پھر فرض کیجئے میں نے اظہارِ محبت کر دیا۔ اگر وہ انکار کر دے تو ــــ؟ میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ مجبوراً مجھے خودکشی کر لینی پڑے گی۔

بھوت:- (مسکرا کر) تب تو میرے لئے ایک اچھی جگہ خالی ہو جائے گی۔ میرے تبادلہ میں آسانی ــــ

عابد:- (غصّہ سے) کیا بکواس ہے! ہماری تو جان پر بنی ہے، اور تم کو مذاق سوجھا ہے۔ تم کیا جانو ــــ؟

بھوت:- معاف کرنا۔ دل آزاری میرا مقصد نہ تھا ــــ مگر عابد صاحب! کامیابی چاہتے ہیں تو آپ کو جوانمردی دکھانی پڑے گی۔

عابد:- اور ہاں! ایک اور بات بھی ہے۔

بھوت:- کیا؟

عابد:- آپ نے مسٹر اجمل کو دیکھا ہے؟ وہ وکیل صاحب جو یہاں اکثر آیا کرتے ہیں۔

بھوت:- نہیں کیوں؟ کیا وہ بھی ــــ؟

عابد:- ہاں! میں تو ان کو اپنا رقیب سمجھتا ہوں دوسرے تیسرے آتے ہیں۔ شکیلہ سے بہت بے تکلف ہیں۔ ہنسی مذاق بہت ہوتا رہتا ہے، ممکن ہے شکیلہ ان کی طرف مائل ہو۔ ایسی صورت میں میں درخواست کروں اور شکیلہ نامنظور کرے۔ ــــ یا اللہ!

بھوت:- آپ خواہ مخواہ بعید امکانات پر توجہ کرتے ہیں، ممکن ہے

اجل شکیلہ کا محض دوست ہو۔

عابد:- آپ کیا جانیں؟ آپ نے محبت کبھی کا ہیکو کی ہوگی؟ اس آگ میں جلتے تو معلوم ہوتا۔ عشق است وہزار بدگمانی۔

بھوت:- میں پھر کہتا ہوں۔ آپ جرأت سے کام لیں شکیلہ آپ کی درخواست منظور کرلے اور جبار صاحب اس پر صاد نہ کریں۔ اس کا امکان بہت ہی کم ہے۔ بہرحال آپ اللہ کا نام لے کر۔۔۔ (کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہی) اچھا اب اجازت دیجئے۔ آپ سے ملکر بڑی مسرت ہوئی معلوم ہوتا ہے شکیلہ آئی ہے موقع بہت اچھا ہے۔ ہاتھ سے جانے نہ دیجئے۔

عابد:- اچھی بات ہی آپ اب جایئے۔ جایئے۔

بھوت:- دیکھئے آپ میری مدد کیجئے۔ میں آپ کی مدد کرونگا۔ میں پھر آؤں گا۔ خدا حافظ۔ (غائب ہوجاتا ہی۔ عابد میز پر سے خط اٹھاکر جیب میں رکھ لیتا ہی۔ پھر بڑھکر دروازہ کھولتا ہی۔ شکیلہ داخل ہوتی ہے)

شکیلہ:- کس سے باتیں کر رہے تھے آپ؟

عابد:- (چونک کر) میں؟ باتیں؟ میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں نہیں تو۔ میں فقط یہ کتاب پڑھ رہا تھا۔ (میز کے پاس جاکر کتاب اٹھاتا ہی) بہترین کتاب ہی۔ پڑھنے کے بعد میں تم کو دوں گا۔ تم اسے بہت پسند کروگی۔ زبان ہونٹوں پر پھیرتا ہی)

شکیلہ:- (صوفہ پر بیٹھ کر) آپ بلند آواز سے پڑھتے ہیں کیا؟

عابد:- میں؟ ہاں ہاں! بلند آواز سے پڑھتا ہوں۔ بچپن سے یہی عادت ہے۔ (شکیلہ کے سامنے کرسی پر بیٹھتا ہے) جب تک بلند آواز سے نہ پڑھوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا (وقفہ) شکیلہ! (شکیلہ سر اٹھاکر اس کی طرف دیکھتی ہی) ایک بات کہوں؟

شکیلہ:- ضرور۔

عابد:- (گلا صاف کرتا ہی) میں۔۔۔ میں۔۔۔۔ شکیلہ! چچا ڈھائی سال پہلے سخت بیمار ہوگئے تھے نا۔

شکیلہ:- (حیرت سے) وہ واقعہ اس وقت کیوں یاد آیا آپ کو؟ اوہ! وہ منحوس گھڑی! چھوڑیئے اس ذکر کو۔ اسکا خیال کرکے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ چچا کی حیات تھی بچ گئے۔ ورنہ سب نا امید ہوچکے تھے ۔۔۔ خیر دوسری باتیں کیجئے۔

عابد:- ہاں ہاں! دوسری باتیں۔ (پھر رک جاتا ہی۔ وقفہ) شکیلہ!

شکیلہ:- اوں؟

عابد:- میں نے کہا۔ میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ تم۔۔۔ تم ۔۔۔ تم نے کبھی بھوت دیکھا ہی؟

شکیلہ:- (چونک کر) بھوت؟ خدا نہ کرے! خدا نہ کرے! میں بہت ڈرتی ہوں۔

عابد:- ہاں ہاں! ۔۔۔ مگر نہیں! ڈرنے کی کیا بات ہی؟ بھوت ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ بھوت ہم کو ۔۔۔

شکیلہ:- مگر یہ بھوت کا ذکر آپ کیا نکال بیٹھے؟ کیا آپ نے کوئی بھوت دیکھا ہے؟

عابد:- (گھبراکر) میں نے؟ بھوت؟ نہیں نہیں نہیں ۔۔۔ یعنی کہ میں ۔۔۔ اس گھر میں بھوت تھوڑی آسکتا ہے! یہ چچا کا گھر ہے۔ اُس کا دم فنا نہ ہوجائے تو میرا ذمہ۔

شکیلہ:- (مسکراکر) آپ لوگوں نے چچا جان کو ایک ہوّا بنا رکھا ہے۔ خواہ مخواہ ان سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہ بہت مہربان، بہت رحم دل آدمی ہیں۔ آپ نہیں جانتے وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ میری خوشی ان کی خوشی ہے۔ (رکتی ہے) کیا سوچ رہے ہیں آپ؟

عابد:- میں؟ میں سوچ رہا تھا چچا کی نسبت۔ تمہاری نسبت اپنی نسبت (خاموشی کا وقفہ) شکیلہ! (زبان ہونٹوں پر پھیرتا ہی)

شکیلہ:- اوں؟

(عابد کچھ کہنے والا ہے کہ بھوت نمودار ہوتا ہی)

عابد اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ شکیلہ کی
پُشت بھوت کی طرف ہے)

بھوت:۔ گھبرائیے نہیں۔ میں اُن کو نظر نہ آؤں گا۔ اور وہ میری آواز
سُن نہ سکیں گی، تاوقتیکہ میں اُن کو مخاطب نہ کروں ـــــ مگر
میں دیکھ رہا ہوں، آپ ابھی تک حرفِ مدعا زبان پر نہیں لائے۔
دیر کس بات کی ہے؟ آپ کو بہترین موقع ملا ہے۔ میں سمجھتا ہوں
شکیلہ اچھی موڈ میں ہے، وہ ہمدردی سے آپ کی درخواست
سُنے گی۔ اور کیا عجب کہ ہاں کہہ دے۔ بہرحال وقت نہ گنوائیے۔
جبار صاحب نہیں ہیں۔ خدا معلوم کب واپس آجائیں۔ وہ گھر
میں ہوتے تو کم از کم میں تو اُن کی بھتیجی سے پیار کی باتیں کرنے
کی جرأت نہ کرتا۔ اس لئے آپ ـــــ

عابد:۔ (بول اُٹھتا ہے) میں اُن کا خیال دل میں لانا نہیں
چاہتا!

شکیلہ:۔ (چونک کر) آں؟ کن کا خیال؟

عابد:۔ (پریشان ہوکر) کن کا خیال؟ کن کا خیال؟ اجی
اُنہیں کا خیال۔ یعنی کہ ـــــ اُنہیں کا خیال۔ میرا مطلب
ہے ـــــ اجمل کا خیال، مسٹر اجمل وکیل کا خیال (جیب سے
رومال نکالکر پسینہ پونچھتا ہے)

شکیلہ:۔ عابد صاحب! آپ کو ایسی ـــــ ایسی بات نہ کہنی
چاہیئے۔ اجمل صاحب شریف آدمی ہیں۔ خوش اخلاق ہیں۔ میرے
دوست ہیں وہ آیندہ انتخاب میں اسمبلی کے رکن بننے کی توقع
رکھتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں وہ منتخب ہوجائیں گے۔ وہ اسمبلی
کی رُکنیت کیلئے موزوں بھی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بات کس
طور پر کرنی چاہیئے اور کب کرنی چاہیئے۔

عابد:۔ معاف کرنا شکیلہ! وہ جملہ بے خیالی میں مُنہ سے نکل گیا۔
میں جانتا ہوں وہ میری خطا تھی۔

بھوت:۔ آپ پریشان کیوں ہوئے جارہے ہیں؟ دیکھیے ذرا
مرد بنیئے ورنہ گڑبڑ ہوجائے گی (عابد شکیلہ کی آنکھ بچا کر ہاتھ
ہلاتا ہے گویا بھوت کو دفع ہونے کو کہہ رہا ہے) آپ مجھے
چلے جانے کو کہتے ہیں؟ مگر میں یہاں ٹھہر کر آپ کی مدد کرنا
چاہتا ہوں۔ آپ کو سہارے کی ضرورت ہے ورنہ آپ معاملہ
بگاڑ دیں گے۔ آپ ـــــ

عابد:۔ (پکار اُٹھتا ہے) یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں! مجھے
تم سے کچھ کہنا نہیں ہے۔

شکیلہ:۔ (اُچک کر کھڑی ہوجاتی ہے۔ غضبناک ہوکر) ٹھہرنے
کی ضرورت نہیں! گویا کہ میں ـــــ مجھ سے کچھ کہنا نہیں
ہے! کیا خوب! بھلا تم مجھ سے کیا کہہ سکتے ہو! ٹھہرنے کی ضرورت
نہیں۔ ہونہہ! ـــــ میں ـــــ میں

عابد:۔ (کھڑے ہوکر رونی آواز سے) شکیلہ! شکیلہ! سُنو
سنو! شکیلہ! پوری بات سُنو! میرا مطلب ـــــ شکیلہ!
شکیلہ! (شکیلہ چلی جاتی ہے۔ دروازہ زور سے بند ہوتا ہے)
چلی گئی؟ چلی گئی! (بھوت کی طرف پلٹ کر) ارے او ناہنجار
یہ کیا کردیا تونے؟ میں لُٹ گیا! میں لُٹ گیا! نامعقول!
تونے میری زندگی برباد کردی! ہائے! میں کہیں کا نہ رہا۔
بڑا آیا مدد کرنے والا! بھوت کا بچہ (صوفہ پر گر پڑتا ہے)
یہ تم لوگوں کو عادت بد کیا پڑ گئی؟ خواہ مخواہ انسانوں کے
کام میں دخل دینے پھرتے ہو۔ تم ـــــ تم ـــــ ہائے اللہ!

بھوت:۔ دیکھیے جناب! آپ خواہ مخواہ مجھے گالیاں دے
رہے ہیں۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا؟ میں نے تو محض آپ کی
مدد کرنے کی کوشش کی لیکن آپ ہی نے بیوقوفی سے سارا
بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ـــــ مگر خیر اب جانے دیجیے۔ غصہ
تھوک ڈالیے۔ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایسی مشکلات
تو عاشق کو پیش آتی رہتی ہیں۔ ان پر قابو پانا عاشق کا کام
ہے۔ خیر اُٹھیے۔ جرأت رندانہ دکھائیے۔ پھر کیا ہے؟ بیڑا پار سمجھیے۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ! (غائب ہو جاتا ہے)

عابد:- جہنم میں جا! (اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے) یا اللہ! اب میں کیا کروں؟ (دروازہ کھولکر اندر کے کمرے میں جاتا ہے)

(تھوڑی دیر اسٹیج خالی رہتا ہے۔ پھر شکیلہ اندر آتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتی ہے)

شکیلہ:- (اپنے آپ سے) کہاں چلے گئے؟ (جانے لگتی ہے کہ عابد کمرے میں آتا ہے)

عابد:- شکیلہ! شکیلہ!

شکیلہ:- (پلٹ کر) کیا ہے؟

عابد:- شکیلہ! مجھے سمجھانے نہ دوگی؟ میں نے ــــ میں نے ــــ (کھانستا ہے)

شکیلہ:- آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

عابد:- مجھے معاف کردو شکیلہ! میں نے وہ جملے تم سے نہیں کہے تھے۔

شکیلہ:- مجھ سے نہیں کہے تھے! تو پھر کس سے کہے تھے؟ کمرہ میں تو اُس وقت ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔

عابد:- نہیں نہیں شکیلہ! ــــ یعنی ہاں! یہ صحیح ہے مگر شکیلہ! میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ میں ــــ میں ــــ شکیلہ! اب میں تم سے کیا کہوں کہ میں کتنا پریشان ہوں یہی وجہ ہے، میں بعض وقت اپنے آپے میں نہیں رہتا۔ دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہوں۔ چیخ اُٹھتا ہوں۔ شکیلہ میری حالت ناگفتہ بہ ہے۔ تم ــــ تم مجھے ــــ مجھے معاف کردو شکیلہ!

شکیلہ:- (صوفہ پر بیٹھ کر) کچھ بھی ہو۔ آپ اس وقت بڑے اکھڑے پن سے پیش آئے۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا۔

عابد:- (اُس کے سامنے بیٹھ کر) مجھے معاف کردو شکیلہ! مجھے معاف کردو۔ کیا تم سمجھتی ہو، تمہارا دل دُکھانا میرے لئے ممکن ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! وہ ایک اضطراری فعل تھا شکیلہ! میں اپنی بیوقوفی پر نادم ہوں ــــ (بلا وجہ کھنکھارتا ہے) شکیلہ!

شکیلہ:- اوں؟

عابد:- ایک بات کہوں؟ (شکیلہ ہمت افزائی کے انداز سے سر ہلاتی ہے۔ عابد کرسی سامنے کرکے اُس کے قریب ہو جاتا ہے۔ عین اُس وقت اُسکو بھوت نظر آتا ہے! عابد مایوس ہو کر منہ لٹکا لیتا ہے۔ بھوت جوش کے عالم میں نظر آتا ہے۔ ہاتھ زور زور سے ہلا رہا ہے)

بھوت:- (ہانپتے ہوئے) وہ آرہے ہیں جبار صاحب آرہے ہیں، جلدی کیجئے! جلدی کیجئے! پانچ دس منٹ میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔ خدا کے واسطے قصہ جلد ختم کیجئے۔ یہاں سے دو میل کے فاصلے پر میں نے انھیں موٹر میں دیکھا۔ خلاف توقع وہ جلد آرہے ہیں! ــــ مگر میں یہ کہنے نہیں آیا۔ مجھے ایک خوشخبری سُنانی ہے۔ دوست میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔ جی ہاں تبادلہ ہو گیا ہے! ایک گھنٹے قبل دوسرے شہر کے ایک نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ کسی کو اس کی اُمید نہ تھی۔ میرے دوستوں نے خبر پاتے ہی فوراً درخواست دیدی وہ منظور ہو گئی میرا تبادلہ ہو گیا! مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ دوست! زندگی میں مجھے اتنی خوشی کبھی نہ ہوئی تھی۔ جبار صاحب سے پیچھا چھوٹا۔ انکے نازل ہونے سے قبل مجھے چلا جانا چاہیئے۔ میں اب جائزہ لینے جا رہا ہوں، میں اب اصلی بھوت بنوں گا اچھا دوست! اب چلدئے۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔ جلدی کرو۔ خدا حافظ خدا حافظ! (غائب ہو جاتا ہے۔ باہر موٹر کی آواز آتی ہے)

عابد:- (کھڑے ہو کر بازو پھیلاتا ہے اور چیختا ہے) شکیلہ! شکیلہ! کاش تم میری ہوتیں

شکیلہ:- (بھیگی ہوئی آنکھیں اوپر اُٹھا کر) میں تمہاری ہی ہوں عابد!

(پردہ)

ماکارہ

حضت وہ تو نکل گئے

میرا اور مسعود کا یہ خیال تھا کہ امتحان کے بعد ہم دونوں دو تین دن اور ٹھیریں گے اور اچھی طرح سے لکھنؤ کی سیر کریں گے۔ لیکن امتحان ختم ہونے سے پہلے ہی پیسے ختم ہو گئے۔ جس دن آخری پرچہ کر کے ہم ہوٹل میں واپس آئے تو واپسی کے ٹکٹوں کے علاوہ تین چار روپے اور باقی تھے۔ ناچار یہ قرار پایا کہ سامان دُرست کر کے سب تیار کر لیا جائے اور ایک تیز سواری پر بیٹھ کر یہاں کا امام باڑہ۔ گھنٹہ گھر اور چوک کو ایک نگاہ دیکھ ہی آنا چاہیے۔ پھر آٹھ بجے رات کی گاڑی سے کوچ بول دیا جائے۔ جلدی جلدی سامان دُرست کر کے ہم دونوں اپنا بادہ ہوٹل سے نیچے اُترے۔ پارک کے نکڑ پر یکوں اور ٹانگوں کا ہجوم تھا۔ اُدھر چلے۔ مسعود مُصر تھے کہ گھنٹوں کے حساب سے تانگہ ٹھیرا لو۔ میں نے اُن کو مطلع کیا کہ وہ بے دال کے بودم ہیں۔ اسمیں زیادہ خرچ ہو جائیگا۔ اس لئے فی الحال یکہ پر ہی اکتفا کرنا چاہیئے۔ اب یکوں میں تلاش شروع ہوئی۔ مسعود صاحب نے ایک یکّہ کی طرف اشارہ کیا۔ اُس میں مضبوط اور تندرست جانور جُتا ہوا تھا۔ میں نے اُن سے انگریزی میں کہا کہ تم میں شعر لطیف کی کمی ہے ورنہ تیز یکہ نہ ڈھونڈتے۔ اول تو یہ کرایہ زیادہ مانگے گا دوسرے آندھی پانی کی طرح گئے۔ اور آندھی پانی کی طرح آئے اس طرح کہیں سیر ہوتی ہے۔ آخر ایک یکّہ مطلب کا مجھے نظر ہی آ گیا۔ مٹیالا چھوٹا سا ٹٹو۔ موٹی سی گردن نیچے کئے تین ٹانگوں پر حالتِ مراقبے میں تھا۔ چھوٹے سے یکّے میں۔ ٹھیٹ لکھنوی یکّے والے۔ بیٹھے اکسپر چار انگل کی دوپلی ٹوپی، چوڑی دار پاجامہ، انگرکھا پہنے، پیر سکیڑے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے غیں بیٹھے تھے۔ میں نے مسعود کیطرف غرور کے طور سے ہنستے ہوئے کہا۔ "دیکھو وہ ہے یکّہ جس پر ہم چلیں گے۔"

مسعود بولے۔ "مالک اور گھوڑا دونوں افیونی۔" مجھے بہت بُرا معلوم ہوا لیکن پھر بھی میں نے تمکنت سے اُنکو سمجھا دیا۔ "میاں ابھی صاحبزادے ہو، ناسمجھ ہو۔ افیمچی نہیں ہے۔ یادِ رفتگاں میں غرق ہیں۔ اُجڑے ہوئے دربار اودھ کی نشانیاں ہیں تم ان کی قدر و منزلت کیا جانو۔" یہ کہہ کر میں یکّے کی طرف بڑھا۔ اب سوچا کہ آواز دوں۔ جگاؤں تو کن لفظوں سے کہ تہذیب سے خالی نہ ہوں۔ محاورے کے خلاف نہ ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ ڈرتے ڈرتے سوتی ہوئی متبرک ٹھوڑی پر اُنگلی چھوائی تو یکّے والے صاحب اس زور سے اُچھل پڑے کہ میں بھی اُچھل پڑا۔ یکّہ بھی ہل گیا۔ ٹٹو کو بھی کچھ ہوش آ گیا۔ دُم کی چوری کو ایک دفعہ دائیں اور ایک دفعہ بائیں طرف ہلا کر پھر غوطہ میں پڑ گیا۔ یکّے والے صاحب نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر لاحول اس پیاری قرنت سے ادا کی کہ اُس میں چار عدد نون غنّے شامل کر دیئے۔ میں نے داد دی "سُبحان اللہ آپ تو اچھے خاصے قاری ہیں مگر اس وقت کی قرت بے موقع ہے میں تو انسان ہوں۔"

بڑے میاں بہت بگڑے "واہ حضت واہ یہ بھیں کوئی انسانیت ہیں کہ اچھیں خاصیں بیٹھے بٹھائیں مردآدمی کو چوکاں دیاں اور پھر اب فرماتے ہیں کہ لاحول نہ پڑھیں۔ اجی واں دیکھئے تو ہیں ہم تو دوروپیونکا آسراں لگائے

بیٹھے ہیں، آپ بڑے آئیں آ کے چوکاں دیاں" میں نے کہا۔ "ارے بھائی اسی واسطے تو چونکا دیا کہ کچھ مزدوری ہی کروگے کہ سوتے ہی رہو گے۔ اچھا بتاؤ کتنے گھنٹہ ہوگا"۔ بڑے میاں نے سنبھل کر فرمایا۔ "میاں گھنٹے کاں حساب تو فیشن والے تانگوں سے کیجئے۔ آپ کو چلناں کہاں ہے یہ تو فرمائیں"۔ میں نے بتایا کہ ہم لوگ پردیسی ہیں شہر کی سیر کرنا چاہتے ہیں، چوک سے ہوتے ہوئے حسینا باد اور آصف الدولہ کا امام باڑہ دیکھتے ہوئے واپس آجائینگے۔ معلوم ہوا کہ چار کوس کا چکّر ہے لیکن پردیسی ہونیکی وجہ سے ایک ہی روپیہ لے لیا جائیگا۔ میں خوش ہوگیا لیکن مسعود کا مُنہ کلکتہ سلیپر کی طرح کھنچا ہی رہا۔ خیر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے یکے والے صاحب کا نام پوچھا معلوم ہوا کہ "ننّن صاحب" میں نے کہا تو پھر اب چلئے۔ جواب ملا "جیں تو چلتاں ہوں، آپ لوگ تنیار ہیں"۔ میں نے کہا۔ بسم اللہ۔ ننّن صاحب نے بینترا بدلکر فٹ بھر کی لکڑی میں بالش بھر کا بندھا ہوا تاگا گھوڑی کے کولھوں پر چٹ سے لگایا "ٹنخ ٹنخ چل ل چل ل"۔ کا حُکم گھوڑی کو دیا۔ اُس نے چھ دفعہ سر کو اوپر نیچے کیا۔ جیسے کوئی بڑھیا اوکھلی میں موسل چلاتی ہو اور بس۔ میں نے کہا جانور تو چلتا ہی نہیں۔ فرمایا "چلتیں ہی چلتیں چلیگا مُنہ کا نوانلا تو نہیں ہے"۔

جب آخر گھوڑی چل ہی پڑی تو میں نے پھر ننّن صاحب سے گفتگو شروع کی سب ہی طرح اُنہیں چھیڑا مگر اللہ کے بندے نے ہاں اور نہیں کے دو جوابوں میں ٹال ٹال دیا۔ کچھ باتیں نہ کیں خاموش ہی رہے۔ چلتے چلتے ایک اُجڑے سے بازار میں جارہے تھے کہ ننّن صاحب بولے۔

(اب ننّن صاحب کی گفتگو بغیر نون غنوں کے لکھی جائیگی تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ ہاں شائقین اگر چاہیں تو خود متواتر غنّے نون ملاتے جائیں)

ننّن صاحب:۔ میاں صاحبزادے اب دیکھئے میں تو آپکو لئے ہی چلتا ہوں مزدوری تو میری ہو ہی جائیگی اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو مجھے چار آنے دیدیں۔

مسعود:۔ واہ جی واہ ابھی سے۔ اور بڈھن کروگے کیا۔

ننّن صاحب:۔ حضور ذری کے ذری آپ یہیں توقف کریں بندہ دو چھینٹے لگا کر ابھی آتا ہے۔ طبیعت سُست ہو رہی ہے۔ چونچالی آجائے گی۔ پھر دیکھئے حضور کو کیسی سیر کراتا ہوں۔

مسعود تو نہیں نہیں کرتے ہی رہے مگر مجھے ترس آیا پیسے میری ہی جیب میں تھے نکالکر دیدیئے۔ بڑے میاں بولے۔ "واللہ شرافت اسے کہتے ہیں۔ اے میاں سلامت رہیئے"۔ یہ کہیئے کو ایک گلی کے پاس چھوڑ چلدیئے۔ آدھ گھنٹہ ہم دونوں نے انتظار کیا اس کے بعد آپ آئے۔ اور اب جو آئے تو نہایت شگفتہ۔ خوب باتیں کرنا شروع کردیں۔

ننّن صاحب:۔ میاں کیا پوچھتیں ہیں لکھنؤں کو۔ اب کیا۔ اُجڑ گیا۔ نہ وہ زمانہ ہے نہ وہ باتیں ہیں، اسی قیصر باغ میں کیا کیا جشن ہوتے تھے۔ کیسے مہوشوں کے مجمعے رہتے تھے کیا کیا محفلیں ہوتی تھیں۔ اب کیا ہے۔ ان آنکھوں سے وہ زمانہ بھی دیکھا۔ اور میاں یہ بھی دیکھ رہے ہیں۔

مسعود:۔ بڑے میاں آپ بھی نوابوں میں سے ہیں؟

ننّن صاحب:۔ اجی سرکار کوئی نوابوں ہی پر تھوڑے موقوف ہے۔ ہم نے سب کچھ دیکھ ڈالا۔ ہمارے نوابوں سے بڑھکر وقت ہوگئے اور گذر گئے۔ جدھر سے ہم نکل جاتے تھے لوگوں کی نظریں اُٹھتی تھیں۔ اب کیا رہا ہے۔ سانسوں کا شمار

ہے۔ زندگی کے دن پورے کرنے ہیں۔ سب چل دیئے ہم رہ گئے۔ نواب مسعود قدر اور پھلکی قدر ہمارے لنگوٹیا یار تھے۔ آج چھ سات برس کا عرصہ ہوا وہ بھی چل دیئے۔

مسعود:۔ ارے واہ رے بڈھے ہیں تو زندہ بیٹھا ہوں مجھے مارے ڈالتا ہے۔

میں:۔ چپ رہو جی بدتمیزی مت کرو۔ جی ننّن صاحب تو آپ کا وقت بگڑ گیا؟ پہلے آپ رئیس ہوں گے؟

ننّن صاحب:۔ اے صاحب رئیس کیا چیز ہیں، دولت ہماری غلام تھی غلام۔ ہم روپے پیسے کی فکر نہ کرتے تھے؟ جوانی کی اُمنگیں تھیں اسوقت کا خیال نہ تھا۔ خدا طرح طرح سے دیتا تھا اور ہم لٹاتے تھے۔ ایک ہی جلسے میں رت بھر میں ننّو اشرفیاں اللہ رکھی پر سے نچھاور کر دیں۔ عیشی باغ میں ساون کا میلا۔ ہائے ہائے نہ پوچھئے۔ ہم دولھا بنے پھرتے تھے۔ لوگ اس کے متمنی ہوتے تھے کہ ہم اُن سے بات کریں۔ ؎

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

پھر اللہ نے دیا اور پھر مٹا دیا۔ اور پھر دیا اور پھر مٹا دیا۔ اے صاحب ایک دفعہ آخری موقعہ پھر ہاتھ آیا مگر پھر نصیبوں کی خرابی سے کچھ نہ رہا لیکن میاں اب کی دفعہ میرا قصور نہ تھا حاشا وکلا میرا قصور اس میں نہیں تھا۔ جو کچھ کیا اغنّن صاحب نے کیا۔ مٹا دیا۔ اغنّن صاحب نے۔ اب وہ بھی روتے ہیں اور ہم بھی ہاتھ ملتے ہیں۔ میاں صاحبزادے مقدّر کی خرابی اسے کہتے ہیں۔ ذری سی چوک میں آدمی مارا جاتا ہے۔ کیا جو کچھ تو اغنن صاحب نے ہی کیا (ماتھے پر ہاتھ مار کر) افسوس کاش مجھے معلوم ہوتا، میں کیا جانتا تھا، مگر صاحب چوک مجھ سے بھی ہو گئی۔

مسعود:۔ ارے بھائی کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا ہوا تھا۔

ننّن صاحب:۔ جی بتاتا ہوں..... لیکن..... وہ..... میاں ایک چوّنی اور دید یجئے میری آدھی مزدوری تو دیکھئے اللہ آپ کا بھلا کرے ہو ہی گئی ہے اور تکلیف نہ ہو تو ذری دیر بیٹھے رہیئے میں ابھی ابھی آیا۔

یہ کہہ چوّنی اور لے بڑے میاں پھر یکے سے اُتر کر ایک گلی میں چلے گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد پھر تشریف لائے۔ گھوڑی کو بمشکل تمام جب رفتن مصدر کے تیسر میں ڈال دیا تو پھر ہم دونوں نے اصرار کیا کہ ہاں صاحب وہ اغنّن صاحب نے کیا ستم ڈھایا تھا ہم کو بھی تو معلوم ہو۔

ننّن صاحب:۔ اے حضرت نہ پوچھئے ستم ہی ڈھا دیا کہیں کا بھی نہ رکھا ورنہ آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ صاحب قصہ یہ ہے کہ خدا مغفرت کرے اُستاد فدّن صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، اور میں بھی انہیں اسی نظر سے دیکھتا تھا۔ خدا غریق رحمت کرے بڑے خوبیوں کے آدمی تھے۔ مگر ذرا سنکی تھے جس بات کی دُھن ہوگئی تو ہوگئی۔ ایک دفعہ جو مچھلی کے شکار کی دُھن لگی تو اب طرح طرح کی ڈوریں بندھ گئیں۔ بیسیوں چارے اور جلّاب ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تیار کرائے۔ اُنگل اُنگل بھر کی مچھلیوں سے لے کر دو دو گز کی مچھلیاں پکڑ ڈالیں۔ کیمیا کا شوق ہوا تو سینکڑوں طرح کی جڑی بوٹیاں ڈھونڈ لائے۔ غرضیکہ یہی رہتا تھا۔ کبھی رمالی ہے۔ کبھی جادو۔ کبھی عملیات ہیں انہیں باتوں کی وجہ سے ہم لوگ انہیں اُستاد کہتے تھے یکہ و تنہا رہتے تھے۔ یہیں آپ کے حُسین آباد میں دو کوٹھریاں ایک دالان تھا اس میں پڑے رہتے تھے۔ عجیب صفتوں کے آدمی تھے۔ سرکار ایک دن دوپہر کو برسات کا زمانہ تھا میں ٹہلتا ہوا اُن کے پاس چلا گیا خاموش بیٹھے تھے۔

ہیں بھی جاکر پاس بیٹھ گیا۔ میں نے کہا کہئے فدّن صاحب آج کل کیا سنک ہے، ذرا تُنک مزاج بھی تھے بگڑ کر بولے۔ سنک ہو سنک تم سنک ہی سمجھتے ہو؟ سُنو تم نے کبھی کشفِ نفس کا عمل بھی سُنا ہے۔ کبھی عمل تقلیدِ خیال بھی سُنا ہے۔ عمل پرواز بھی سُنا ہے؟ میں نے کہا نہیں حضرت میں نے تو ان میں سے کسی کا نام بھی نہیں سُنا۔ بولے پھر کیا بک رہے ہو۔ میں نے کہا قبلہ کچھ تو بتایئے کہ یہ کیا ہوتے ہیں۔ ایک قلمی نسخہ پاس رکھا تھا اُس پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ یہ جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ دو لفظوں میں تم کو بتا دوں۔ میاں دن چاہئیں دن ہفتوں لگ جائیں گے۔ میں نے کہا اچھا یہ بتایئے کہ ان عملیات سے کیا کیا فائدے پہنچتے ہیں۔ بولے فائدے۔ بڑے عجیب عجیب ہیں۔ مثلاً ایک فائدہ یہی ہے کہ انسان اس عمل سے اُڑ سکتا ہے تمام خیالات فاسق کو علیحدہ کر کے دل اور دماغ کو رجوع کرنے سے اول تو انسان کا رفتہ رفتہ وزن کم ہوتا ہے اور پھر جس میں جیسی مقدرت اور قدرت ہو کافی مشق کے بعد اُڑنے بھی لگتا ہے، وزن تو میں اپنا زائل کر لیتا ہوں۔ ہاں اُڑنے میں ابھی دیر ہے۔ صبح کو ایک اُنگل کے قریب زمین سے اونچا بھی ہو اٹھا۔ میاں آپ یقین کیجئے کہ مجھے ہنسی آگئی۔ اُستاد فدّن صاحب کو میرا ہنسنا بہت ناگوار ہوا کہنے لگے اچھا دیکھو، یہ کہہ میرے سامنے بالکل سیدھے ساکت کھڑے ہو گئے۔ کوئی دس منٹ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تو خود بخود زمین سے اُونچے ہونے لگے میں نے جلدی سے چھت کو دیکھا مگر وہاں رسی نہ کچھ۔ کوئی ایک بالشت اُٹھ گئے ہوں گے کہ دھم سے پھر نیچے آگئے۔ مجھے سخت حیرت۔ بڑا پریشان۔ میں نے کہا۔ اُستاد یہ نہیں۔ ایکی پھر اُٹھو تو جانیں۔ اُستاد تاؤ میں پھر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ کوئی دس منٹ کے بعد میاں یقین جانئے اُن کے پیر تو زمین سے اُونچے ہونے لگے۔ قریب ڈیڑھ بالشت کے اُونچے ہو کر کوئی ایک سکنڈ وہیں رُکے رہے اور پھر دھم سے آئے۔ لیجئے میاں چوک تو آگیا گول دروازہ یہی ہے۔ اس کے اندر چوک ہے۔ آپ لوگ جا کر سیر کر آئیں۔ اور میاں اللہ سلامت رکھے ایک چونی اور دیجئے تو میں بھی دو چھینٹے لگا لوں۔

ننّن صاحب چھینٹے لگانے چلد یئے اور ہم دونوں اُس گندے تنگ بازار میں پچاس ساٹھ قدم جا کر واپس آگئے اور پھر یکے میں بیٹھ گئے آدھے گھنٹے بعد جو بدھن آئے تو مسعود نے کہا بس اب واپس۔ آپ ہم کو امینا باد ہی پہنچا دیں۔ سیر تو ہو چکی چھ بج رہے ہیں آٹھ بجے کی گاڑی سے ہم کو جانا ہے چنانچہ یکہ پھر واپس ہو لیا اور ننّن صاحب نے داستان شروع کر دی۔

ننّن صاحب :- جی حضور تو میں کیا کہہ رہا تھا بھول گیا؟

میں :- ایک بالشت زمین سے اُونچے ہو کر دھم سے پھر زمین پر آ گئے۔

ننّن صاحب :- جی۔ جی۔ حضور دیکھیں بندے کو کسقدر حیرت اور پریشانی ہوئی ہو گی۔ واللہ میں تو سکتے کی سی حالت میں رہ گیا۔ آنکھیں ملیں۔ لاحول پڑھی۔ اپنے ہاتھ میں چٹکی لے کر دیکھی کہ کہیں سو تو نہیں رہا ہوں۔ دماغ پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے کہا اُستاد ذرا تسلی کرو میں اپنے ہوش حواس درست کر لوں ذرا نکالی نکالو چراغ جلاؤ۔ اُستاد فدّن صاحب اُٹھے سامان درست کیا دو ایک دم لگا کر میں نے اُن سے بھی اصرار کیا کہ بھائی صاحب آپ بھی دم لگا لیں۔ خدا مغفرت کرے اُستاد بڑے خوبیو۔ نیکے آدمی تھے، دوستوں یاروں کی خاطر سامانِ دلچسپی رکھتے تھے خود زیادہ شوق نہ تھا دوستوں کے

اصرار پر اُن کی دل شکنی بھی نہ کرتے تھے شریک ہو جاتے تھے،
جب زمانہ بھی اور تھا ہر چیز سستی تھی۔ خدا کی مار اس زمانے
پر۔ سرکار دو ہی چھینٹے لیتے ہیں اور چونی کھٹیا سی نکل
جاتی ہے۔ بندہ پرور ایک وہ وقت تھے ڈبل کے چار چسکے
اور چائے کی پیالی کھاتے ہیں۔ اے قبلہ یہیں گول دروازے
میں ننھی بلاّقن کی دُکان پر ملتے تھے۔

مسعود:۔ (جھلا کر) جہنم میں گئی ننھی بلاّقن۔ تمہارے
اُستاد کا کیا حشر ہوا؟

نبّن صاحب:۔ لے ہاں میاں دیکھئے بات میں بات کہاں
سے کہاں چلی گئی۔ تو قبلہ جب نشے پانی سے چونچال ہوئے
تو ہم نے پھر کہا اچھا اُستاد اب سہی۔ اُستاد کو بھی مزا
آنے لگا تھا۔ بولے۔ میں تو بھائی بڑی تیزی سے ترقی کر رہا
ہوں مشق پر موقوف ہے۔ دماغ کا کام ہے جسقدر دھیان
ادھر ہوا اتنا ہی اچھا نتیجہ نکلتا ہے۔ سب دماغی طاقت
کا کام ہے۔ انسان کے ارادہ پر منحصر ہے۔ لو دیکھو ابکی
دو فٹ تک اُٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اُستاد فدّن
صاحب پھر جو سیدھے تانت سے کھڑے ہوئے تو ابکی
تو ایک ہی منٹ کے بعد اُٹھنے لگے۔ اور اُٹھتے اُٹھتے
چھت میں جا لگے۔ سر دھنّی میں چھو گیا۔ سرکار اُس زمانے
کے مکانوں کی چھتیں بھی یوں ہی سی اونچی ہوتی تھیں۔
ایک منٹ تک فدّن صاحب کا سر دھنیوں کے جالوں
میں گھسا رہا اس کے بعد ایک دفعہ دھم سے گر ہی تو
پڑے۔ ابکی سنبھل نہ سکے کہنیوں کے بل گرے میں نے
لپک کر اُٹھایا۔ سر کا جالا جھڑایا۔ کہا بھائی دم لیلو اطمینان
سے کام کرو واللہ یہ تو بڑی بات ہاتھ آگئی ہے۔ دیکھو
خدا کو کیا منظور ہے۔ میں یہ ہی کہہ رہا تھا کہ کوٹھری
کا دروازہ چوں سے بولا دیکھتا کیا ہوں کہ اغن صاحب

سر ڈالے ہیں۔ بولے "اُستاد کیا ہو رہا ہے۔ میں آ دُوں" اتنا
کہا اور ہنستے ہوئے آگئے۔ اب کیا کر سکتا تھا۔ دراصل مجھ سے
ہی غلطی ہوگئی مجھے پہلے ہی سے کنڈی لگا لینی چاہیئے تھی
میں نے اغن صاحب سے کہا۔ اچھا اب کنڈی لگائے آؤ۔
حضرت کو جو سب حال معلوم ہوا بولے "تو بھائی باندھو
سوپ اُستاد کے شانوں پر ہم بھی دیکھیں کیسے اُڑتے ہیں"
میں نے کہا۔ پھر وہی سفلوں کی سی باتیں شروع کیں واللہ
اچھا نہ ہوگا۔ یہ موقعہ دلگی کا ہے۔ صبر سے بیٹھو اُستاد
دم لے لیں" اغن صاحب بولے "دم تو یاروں میں بھی
لگا دُونگا۔ تم لوگ تو رچے ہوئے ہو۔ کوٹھری مہک رہی
ہے" خیر میاں دو دو چھینٹے لیلئے۔ ہائے واللہ اُستاد
کا بھی کیا دم تھا۔ پھر اصرار کرنے سے شریک ہوگئے۔ تو
میاں اُستاد پھر کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا۔ ٹھیرو تسلی
کر لو۔ جلدی سے ان کے پیروں کے نیچے اُن کا لحاف
توشک لا کر بچھا دیا اور کہا لیجئے اُستاد اب غم نہیں
چاہے سر کے بل بھی غوطہ کیوں نہ مار دیجئے۔ اُستاد کو بھی
اطمینان ہوگیا۔ پھر چھت میں سر لگا کر تین چار منٹ
معلّق رہے۔ اور آگرے۔ میں نے کہا۔ اُستاد۔ اُستاد کی
تو جب ہے کہ آہستہ آہستہ نیچے آئیے۔ یہ بھی کیا کہ ڈھیلا
کی طرح بھد سے نیچے آگرے۔ اے جب دماغی قوت اور
ارادے ہی پر موقوف ہے تو لگاؤ کدّ و کاوش۔ اُستاد نے
کہا اچھا پھر کھڑے ہوگئے ابکی گرے تو نہیں۔ مگر ایسے بھی
نیچے نہیں ہوئے جیسے کسی کی شرمائی ہوئی نظریں۔ کٹی
کنکیا کی طرح اتاتے پتاتے نیچے آگئے۔ میں نے کہا خیر بسم اللہ
بُری نہیں ہے۔ پھر کوشش کرو۔ یہ مرحلہ بھی طے ہو جائیگا
حضور تین چار دفعہ کے بعد اب تو بالکل سہولت سے
اُترنے لگے۔ اغن صاحب اور ہم دونوں دم دلاسہ دیتے

رہے۔ لیکن صاحب اغن کی وہی نادانی کی باتیں۔ اب سرہیں
اُستاد کے میں نے کہا "نہیں اب زیادہ پریشان نہ کرو۔
تھک گئے ہونگے آرام کرنے دو۔ چلو اب چلیں" میاں
میں اُن کو اپنے ہی ساتھ گھسیٹ لایا۔ راستے میں لگے
اغن صاحب زمین آسمان ملانے کبھی کہیں "اُستاد کو کلکتہ
لے چلیں گے" کبھی کہیں "ٹکٹ لگائیں گے بڑے لاٹ
کو تماشہ دکھائیں گے" میں نے کہا "میاں رسانیت
سے کام لو رسانیت سے۔ روپیہ کمانے کے تو اب لاکھوں
طریقے ہیں۔ روپیہ تو اب بہا بہا پھریگا۔ لیکن پہلے اُستاد
کی مشق پوری ہو جانے دو۔ ابھی تو کھڑے ہی اُٹھتے
ہیں۔ لیٹ کر اُٹھنا آجانا چاہیئے اور سہولت سے اُترنا
چاہیئے۔ بلکہ اور بھی اچھا یہ ہو۔ کہ پینگ لیتے ہوئے
نیچے آئیں اور پھر اُٹھتے چلے جائیں۔ ایک ہاتھ پھیلا
ہوا اور دوسرا سینے پر یہ معلوم ہو کہ خود تو سو رہے
ہیں اور کوئی پینگ دے رہا ہے۔ لیکن دیکھو یار
اغن یہ سب خاک میں مل جائیگا۔ جو ابھی کسی کو بھی
اس کی رتی بھر بھی خبر ہو گئی۔ ابھی تو یہ سب راز ہی
رہنا چاہیئے اور بھائی آمدنی میں بھی اُستاد کا حصّہ
اوّل رکھنا ہوگا۔ دیکھو تم جلدی نہ کرو۔ سہولت سے
کام لو! میں اُستاد کو راضی کر لوں گا۔ روپے میں چھ آنے
اُن کے اور پانچ پانچ آنے ہم دونوں کے" اغن صاحب
کی عقل میں بات ذرا دیر میں آتی ہے۔ مگر میاں میرے
سمجھانے سے وہ سمجھ گئے۔ دوسرے دن اُستاد کو میں نے
سب اونچ نیچ سمجھائی۔ ہائے کیا معقول آدمی تھے میاں
میری سب باتوں پر راضی ہو گئے۔ اب ہم دونوں نے
پھر انہیں مشق کرانی شروع کرادی۔ اسے حضرت
شام تک اُستاد لیٹ کر بھی اُٹھنے لگے۔ اور نہایت سہولت
سے۔ جیسے وہ لیٹے لیٹے آہستہ آہستہ زمین سے چھت تک
جاتے تھے۔ ویسے ہی آہستہ آہستہ پھر نیچے آجاتے تھے۔
شام تک چھت میں جالوں کا نام نہ رہا۔ جب اندھیرا ہو گیا تو
میں نے کہا لو دن بھر ہو گیا ہے آؤ ٹہل آئیں بھائی تمہاری
صحت بھی تو مقدم ہے۔ میوہ والی گلی تک ہو آئیں۔ میاں
یہ سُسرا ابھی ایک خاص اڈّا تھا۔ ہا ہا! سب مٹ گیا۔ ہاں
میاں ہم تینوں چلے۔ مگر میں نے دیکھا کہ اُستاد کی چال
میں کچھ فرق ہے۔ کچھ ایسے چل رہے تھے جیسے...... اجی
یہ بچوں کے کھیلنے کے ...... ربڑ کے پھکنے ہوتے ہیں نا۔
اُن میں ہوا بھر کر اگر لڑکایا جائے تو وہ اُچھلتا اُچھلتا
لڑکتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے اُستاد چل رہے تھے۔
میں نے کہا واہ اُستاد کیا بات ہے اب جو صورت دیکھتا
ہوں تو پریشان، میں نے کہا کچھ بتاؤ تو۔ بولے "معلوم
کیا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں روئی کا گالا
ہو گیا ہوں۔ میں نے اُن کا ہاتھ ٹٹولا۔ اماں جاؤ بھی
نہ کہیں۔ اُستاد بولے۔ یہ مطلب نہیں ہے۔ مجھے پکڑ کر
اُٹھاؤ تو۔ اغن نے دونوں ہاتھ اُن کی کمر پر رکھ جو ذری
یونہی سا زور لگایا تو کندھوں سے اونچا اُٹھا لیا۔ میں
یہ کیا میں تو دیکھوں۔ حضرت اُن کا تو وزن ہی غائب
تھا۔ اُستاد بولے۔ میں سمجھتا ہوں اگر اُچکوں تو حسینا باد
کا امام باڑہ اُچک جاؤں۔ میں نے کہا۔ خدا کا واسطہ یہ
نہ کرنا اول تو گناہِ عظیم اور پھر تمام راز افشا ہو جائیگا۔
میں جادوگر کیسے بنوں گا۔ خیر میاں چوک قریب آگیا
تھا آتے جاتے لوگوں کی نگاہیں پڑتیں اس لئے ایک
طرف سے میں دوسری طرف سے اغن صاحب اُن کے
ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اُن کو دبائے ہوئے لے کر چلے۔
وہاں پہونچکر دو ایک چھینٹے اُستاد کو بھی لگوا دیئے۔

اور اُسی طرح اُن کو واپس لائے۔ اب میں نے ہزار اغن کو منع کیا مگر نہ مانے۔ اُستاد کو پھر کچھ دیر مشق کرائی۔ اب اُستاد لیٹتے ہی اونچے ہوں چھت کے ایک کونے سے پینگ لیتے ہوئے زمین تک آئیں اور ویسے ہی اُٹھتے ہوتے دوسرے کونے میں چلے جائیں۔ خیر میاں اُستاد کو لٹا کر ہم لوگ چلے آئے صبح کو مجھے جانے میں دیر ہو گئی۔ چھمی کی ماں کے ہاتھ میں دُنبل نکلا ہوا تھا اُس میں نشتر لگوانے اُنہیں شاہ مینا کے ہسپتال لے گیا۔ جب یہاں سے فارغ ہو کر اُستاد کے مکان پر پہونچا تو اغن صاحب دروازے پر کھڑے تھے مُنہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے کہا خیر تو ہے۔ کہا غضب ہو گیا۔ میں نے کہا۔ اماں کچھ تو کہو۔ بولے۔ کچھ نہ پوچھو۔ اے بھائی بتاؤ تو سہی اماں اُستاد کیسے ہیں؟ میاں یقین مانیئے کہ اغن کے آنسو نکل پڑے، بولے خود اندر چل کر دیکھ لو۔ میرا دل دھک سے ہو گیا اندر گیا۔ اُستاد اچھے خاصے چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ ہاں صورت متفکر تھی اور اُن کی گود میں سل رکھی تھی۔ میاں میں اغن کی طرح تو ہوں نہیں۔ میں جا کر اطمینان سے اُن کے پاس مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اور پوچھا کہیئے اُستاد کیا حال ہے۔ اُستاد کچھ دیر تو بولے نہیں، پھر کہا بات یہ ہے کہ ارادے کی قوت ضرورت سے زیادہ صرف کر دی۔ میرا وزن گھٹتے گھٹتے بالکل ہی غائب ہو کر اب نفی کی طرف رجوع ہے۔ رات بھر پلنگ پر بیٹھ نہیں لگی، وہ تو کہو لحاف میرا بھاری ہے ساری رات اُسی سے چپکا رہا۔ صبح رفع حاجت کے واسطے اُٹھا تو چھت میں جا لگا۔ جب یہ آئے اور اِنھوں نے پیر پکڑ کر کھینچے تو نیچے آیا۔ بیچارے نے پیشاب پیخانہ کرا یا مُنہ دُھلایا۔ اب اس سل سے دبا بیٹھا ہوں۔ حضور یہ سب سُن کر فکر تو مجھے بھی ہو گئی مگر میں اپنے کو تھامے رہا کچھ غور اور فکر کے بعد میں نے اغن کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیوں میاں ہونہ صاحبزادے تم اُستاد کو ہولا ہولا کر مار ہی ڈالتے۔ اللہ نے خیر کر لی جو میں جلدی آ گیا۔ میں نے اُستاد کو دلاسا دیا آپ پریشان نہ ہوں حضور میں اُن کے جوتے لے کر چوک گیا ایک موچی کو دو آنی تھمائی اور موٹے موٹے سیسے کے سول چڑھوا کر لے آیا۔ جوتے اُستاد کو دیئے۔ کہا لو پہنو۔ چلو پھرو۔ پریشانی کی کیا بات ہے --- ہاں اب اُلٹی مشق کرنا پڑیگی۔ اُستاد جوتے پہن کر خوش تو ہو گئے لیکن ان کے دل پر جیسے وحشت سی چھا گئی۔ دماغ کا کام تھا۔ ارادے کی قوت لگانا تھی۔ وہاں اُن کی طبیعت اُچاٹ۔ کمر میں رسی بندھی ہے۔ چھت میں چمٹے ہیں۔ ہم دونوں اُن کو نیچے سے ڈھارس دے رہے ہیں۔ ہاں بھائی فدن صاحب لگاؤ اپنے ارادے کا زور اور اُترو نیچے۔ وہ ایک دو اِنچ نیچے آتے ہیں اور پھر چھت میں جا چپکتے ہیں۔ آخر میں نے اغن کو اشارہ کیا کہ تم چُپ رہو اُستاد کو ڈوری پکڑ کر نیچے گھسیٹا۔ کہا بیٹھو جوتے پہن لو۔ دو ایک چھینٹے لے لو۔ گھبراتے کیوں ہو۔ کونسا غضب ہو گیا اماں پہلے اوپر کو زور لگانے تھے اب نیچے کو لگانا ہے۔ بات تو وہی ہے۔ قوتِ ارادہ ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اُستاد نے کہا مجھے نیند آ رہی ہے سوؤنگا۔ میں نے کہا کیا حرج ہے۔ اُن کے پلنگ کے نیچے بستر کو سُتلیوں سے تان دیا اور اُستاد کو لٹا دیا۔ اُستاد اُس کے نیچے چپک گئے۔ اب میں نے پھر اغن صاحب کو سمجھایا کہ دیکھو بھائی اُستاد پریشان ہیں اُن کا دل بہلاؤ۔ تفریح کراؤ۔ جلدی نہ کرو اب اُلٹی مشق کروانا ہے اُنکا دل و دماغ حاضر ہونے دو۔ سہ پہر کو اُستاد کو جگایا مُنہ ہاتھ دُھلائے۔ چار چھ چھینٹے ہم دونوں نے لگائے اُستاد کو بھی دو تین چھینٹے لگوا دئے۔ پھر اُن کو لے کر گول دروازے ہوتے ہوتے میوے والی سرائے گئے۔ پُرانے دوست احباب کا مجمع تھا، بات چیت میں دل بہلا اُستاد گو عادی نہ تھے یہاں

افیون نہایت اعلیٰ قسم کی ہوتی تھی۔ خوب گولیاں اُڑائیں۔ سرابور ہوگئے۔ ان کا غم غلط ہوتا دیکھکر مجھے بھی خوشی ہوئی اب ہم تینوں پھر چلے اندھیرا ہوگیا تھا دوسری تاریخ کا چاند تھا۔ (ہلکی ہلکی چاندنی تھی) یہ ٹھیری کہ گومتی کے کنارے سیر کیجاتے اُستاد کو گھر پہنچادیا جائے۔ گومتی کے کنارے کنارے جارہے تھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی اُستاد کی طبیعت تو سنکی ہی تھی سنک آگئی کہ میں تو سوؤنگا۔ نشے کے ایسے زیادہ عادی بھی نہ تھے۔ اُن کا کہنا بھی بیجا نہ تھا مگر وہاں ہم اِنکو کہاں سُلاتے۔ ہزار سمجھایا گیا مگر نہ مانے۔ وہاں شاہی کے پُرانے گرے پڑے خالی مکان تھے اُستاد ایک کو دیکھ کر بولے میں تو یہیں سوؤنگا۔ نہ مانے۔ خیر میں نے جیب سے رسی نکالی اُستاد کی کمر میں باندھی جوتے اُتارے ان کو ڈیڑھ دو گز اونچا کرکے رسّی اغن صاحب کو دی کہ پیر کے نیچے دبالیں ہم دونوں اُکڑوں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں اُستاد سو گئے میں نے اغن سے کہا دیکھو اُستاد کی ضد ہے۔ خیر یونہی سہی لیکن بس پندرہ منٹ سے زیادہ نہ سونے دیں گے۔ میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ کس طرح کا شامیانہ ہونا چاہیئے۔ کرسیاں بنچیں کیسی ہوں۔ ٹکٹ درجہ اول دس روپے کا ہو کہ ۔ یا دہ کا۔ اور ادھر اغن صاحب خود پینک میں آکر مجھ پر لڑک پڑے میں بھی چونک پڑا۔ بولے اسے سے رسی چھوٹ گئی۔ میں نے کہا واللہ تم بھی عجیب انسان ہو۔ فدّن صاحب اگر جاگ پڑے اور برسوں کی پُرانی چھت اور جالوں میں اپنے کو چمٹا ہوا پایا تو بہت بگڑینگے۔ یہ کیا کیا۔ میاں امین آباد آگیا۔

ہم دونوں چونک پڑے واقعی امین آباد آگیا تھا۔ ہوٹل سامنے تھا مسعود نے گھڑی جو دیکھی بوکھلا گئے۔ "یار پونے آٹھ ہوگئے"۔ بڑے میاں یہاں سے اسٹیشن کا راستہ کتنی دیر کا ہے"۔ "اُرے حضور دس منٹ کا راستہ ہے بات کرتے میں تو اسٹیشن آتا ہے"۔ مسعود۔ "اچھا تو ہم کو اسٹیشن تک اور چھوڑ دو وہ سامنے ہوٹل میں سامان ہے ہم ابھی رکھے لیتے ہیں"۔ "اے حضور مجھے کب انکار ہے میں خدمت کیواسطے حاضر ہوں۔ پر میاں بُرا نہ مانیئے گا۔ یہاں تک کی مزدوری میں وہ چوّنی اور باقی ہے۔ وہ بھی دیدیجئے۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے آپ اسباب رکھیں اور میں ابھی آیا"۔ مسعود صاحب بولے "جے دو کھائی"۔ دو سوٹ کیس دو بستر رکھنے کے بعد چھ چھ انچ جگہ ہم دونوں کو بھی مل گئی۔ اُسی پر بیٹھ کر آدھ گھنٹے انتظار کیا۔ اب پھر چلدیئے۔ تھوڑی دیر صبر کے بعد مسعود نے کہا۔ "ہاں بڑے میاں صاحب پھر کیا ہوا"۔ بڑے میاں پھر خاموشی کے ساتھ بولے "پھر کیا ہوتا"

مسعود:۔ "آخر"

بُڈھا:۔ بس اب اپنے نصیبوں کو روتے ہیں۔

مسعود:۔ ارے ظالم تو ہوا کیا۔

بُڈھا:۔ (بڑی لمبی سانس لے کر) ہونا کیا اُس کوٹھری میں چھت ہی نہ تھی اندھیرے میں لٹکی ہوئی رسّی ٹٹولی نہ ملی تو دیاسلائی جلائی اُستاد فدّن صاحب کہاں۔ "اے حضت وہ تو نکل گئے"۔

گیارہ بجے رات کو تیسرے درجہ کے مسافر خانہ میں سوٹ کیسوں پر بستر رکھے دونوں اپنے اپنے اڈّوں پر چڑھے ہوئے صبح کے انتظار میں بڑی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے مسعود سے کہا۔ "یار اب تو صبح اسی طرح کرنی ہی پھر سوچ کس بات کا ہے"۔ مسعود پہلے تو خاموش رہے پھر میری طرف غور سے دیکھکر بولے۔ "کیوں جی اُستاد فدّن صاحب اب بھی چلے جارہے ہونگے۔ نمعلوم کہاں تک چلے گئے ہونگے نمعلوم کب تک چلے جائیں گے"۔

سید رفیق حسین

دل اور ایک لفظ

پے در پے شکستوں کے بعد بھی قسمت آزمائی کرنا بہاری کی طبع ثانی ہو چکی تھی۔ میری موجودگی میں۔ میری آنکھوں کے سامنے۔ صفدر، موہن، واحد اور بلونت ذرا سا موقع ملنے پر محض ایک لفظ کہہ کر اُسے خاموش کر دیتے۔ اور جب بہاری کا رنگ زرد پڑ جاتا اور اُس کی آنکھیں زمین پر جم کر رہ جاتیں تو وہ ایک زبردست قہقہہ لگاتے۔ میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے کیونکہ اُنہیں معلوم تھا کہ صرف مجھے ہی اُس بچارے سے کچھ ہمدردی ہے بہاری سر جھکائے ہوئے ہم سب کو چھوڑ جاتا اور گھنٹوں کہیں دکھائی نہ دیتا۔ مگر اگلے روز ہی میں اُسے پھر اُنہیں کی معیت میں پاتا۔ جتنی بار اُس نے اُن سے گھل مل جانے کی کوشش کی، جتنی بار اُس نے یہ خیال کیا کہ شاید وہ اس کا مذاق اُڑانا ترک کر دیں اتنی بار ہی اُسے تلخ تجربہ ہوا اور اُس کا قیاس غلط نکلا۔ مگر باوجود اس کے اُس نے اُن سے ملنا جُلنا نہ چھوڑا۔

بہاری ہر قسم کا مذاق، عملی یا غیر عملی، برداشت کر سکتا تھا۔ اُس کا عطر میں بھیگا ہوا ریشمیں رومال اُڑا لو بلکہ اُس کو واپس بھی نہ کرو۔ اُس کی کتابیں پروفیسر صاحب کی میز میں چھپا دو۔ اُس کا ہیٹ ہاتھ کی صرف ایک جنبش سے سوئے فلک روانہ کر دو۔ اُسے ہوسٹل کے کمرے میں مسلسل چھ گھنٹے تک بند رکھو، حتےٰ کہ کھانے کا وقت گذر جائے۔ اُسے پرنسپل صاحب کے خاص کمرے میں یہ یقین دلا کر بھیجدو کہ اُسے پرنسپل صاحب نے نہایت ضروری کام کے لئے یاد فرمایا ہے۔ اُسے گُڈ بگر، نپولین دی گریٹ۔ اُلو کی دُم، خواہ کچھ ہی کہہ لو۔ اُس کے ماتھے پر کبھی بل نہ پڑتا۔ وہ کبھی شکایت نہ کرتا۔ بلکہ سب محسوس کرتے کہ اُسے اِن تمام حرکتوں سے ایک قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مگر جہاں کسی نے اُسے "فٹ بال" کہہ دیا تو اُس پر گھڑوں پانی پڑ جاتا۔ یہ اُس کی ذاتی توہین تھی۔ اِسے وہ کسی صورت سے برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اُسکا چند منٹ پہلے کا دمکتا ہوا کدو والا گول چہرہ پھیکا پڑ جاتا۔ اُس کی سیپ کے بٹنوں جیسی چھوٹی چھوٹی خوبصورت آنکھیں، اُس کے چہرے میں ہی غائب ہو جاتیں۔ وہ ایک لحظہ نہ رُکتا اور کسی رُخ تنہا اور بے کس چل پڑتا۔ اکثر وہ میرے کمرے کی طرف ہی رُخ کرتا۔

بہاری آہستہ سے دستک دیکر میرے کمرے میں داخل ہوتا۔ مجھ سے آنکھیں ملائے بغیر ہی میرے سامنے کسی کرسی پر بیٹھ جاتا اور سر جُھکا کر ایک ہاتھ کی اُنگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی اُنگلیوں میں سے گذارنا شروع کر دیتا۔ اُس وقت وہ بے بسی اور بے زبانی کا مجسمہ بنا ہوتا۔ اور اگرچہ میں فوراً اندازہ لگا لیتا کہ اُس کی یہ حالت کس وجہ سے ہوئی ہوگی میں اپنی جگہ سے اٹھکر اُس کے پاس آتا اور اُس کی پُشت پر تھپکی دیکر کہتا:-

"کہو بہاری! آج اسقدر غمگین کیوں ہو؟"

بہاری اپنا چہرہ اوپر اُٹھاتا اور نہایت مجروح نگاہوں سے ایک لمحہ میرے چہرے کا جائزہ لیکر سر جُھکا لیتا اور کہتا:-

"آج واحد نے مجھے پھر وہی کہا۔ آخر اِس میں میرا کیا قصور ہے؟"

افیون نہایت اعلیٰ قسم کی ہوتی تھی۔ خوب گوبیاں اڑائیں۔ نشہ ابور ہوگئے۔ ان کا غم غلط ہوتا دیکھکر مجھے بھی خوشی ہوئی اب ہم تینوں پھر چلے اندھیرا ہوگیا تھا دوسری تاریخ کا چاند تھا۔ (ہلکی ہلکی چاندنی تھی) یہ ٹھیری کہ گومتی کے کنارے سیر کیجاتے استاد کو گھر پہنچا دیا جائے۔ گومتی کے کنارے کنارے جارہے تھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی استاد کی طبیعت تو سنکی ہی تھی سنک آگئی کہ میں تو سوؤنگا۔ نشے کے ایسے زیادہ عادی بھی نہ تھے۔ اُن کا کہنا بھی بیجا نہ تھا مگر وہاں ہم انکو کہاں سُلاتے۔ ہزار سمجھایا گیا مگر نہ مانے۔ وہاں شاہی کے پُرانے گرے پڑے خالی مکان تھے استاد ایک کو دیکھ کر بولے میں تو یہیں سوؤنگا۔ نہ مانے۔ خیر میں نے جیب سے رسی نکالی استاد کی کمر میں باندھی جوتے اُتارے ان کو ڈیڑھ دو گز اونچا کرکے رسّی اغن صاحب کو دی کہ ہیبر کے نیچے دبائیں ہم دونوں اُکڑوں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں استاد سوگئے میں نے اغن سے کہا دیکھو استاد کی ضد ہے۔ خیر یونہی سہی لیکن بس پندرہ منٹ سے زیادہ نہ سونے دیں گے۔ میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ کس طرح کا شامیانہ ہونا چاہیئے۔ کرسیاں۔ بنچیں کیسی ہوں۔ ٹکٹ درجہ اول دس روپے کا ہوگا۔ یا دہ کا۔ اور ادھر اغن صاحب خود پینک میں آکر مجھ پر لڑھک پڑے میں بھی چونک پڑا۔ بولے اسے ہے رسی چھوٹ گئی۔ میں نے کہا واللہ تم بھی عجیب انسان ہو۔ فدّن صاحب اگر جاگ پڑے اور برسوں کی پُرانی چھت اور جالوں میں اپنے کو چمٹا ہوا پایا تو بہت بگڑینگے۔ یہ کیا کیا۔ میاں امین آباد آگیا۔

ہم دونوں چونک پڑے واقعی امین آباد آگیا تھا۔ ہوٹل سامنے تھا مسعود نے گھڑی جو دیکھی بوکھلا گئے۔ "بارہ پونے آٹھ ہوگئے" بڑے میاں یہاں سے اسٹیشن کا راستہ کتنی دیر کا ہے؟" "اُسے حضور دس منٹ کا راستہ ہے بات کرتے میں تو اسٹیشن آتا ہے۔" مسعود۔ "اچھا تو ہم کو اسٹیشن تک اور چھوڑ دو وہ سامنے ہوٹل میں سامان ہے ہم ابھی رکھے لیتے ہیں"۔ "اے حضور مجھے کب انکار ہے میں خدمت کیواسطے حاضر ہوں۔ پر میاں بُرا نہ مانیئے گا۔ یہاں تک کی مزدوری میں وہ چونی اور باقی ہے۔ وہ بھی دیدیجئے۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے آپ اسباب رکھیں اور میں ابھی آیا" مسعود صاحب بولے "جے دو دکھائی" دو سوٹ کیس دو بستر رکھنے کے بعد چھ چھ انچ جگہ ہم دونوں کو بھی مل گئی۔ اُسی پر بیٹھ کر آدھ گھنٹے انتظار کیا۔ اب پھر چل دیئے۔ تھوڑی دیر صبر کے بعد مسعود نے کہا "ہاں بڑے میاں صاحب پھر کیا ہوا" بڑے میاں پھر خاموشی کے ساتھ بولے "پھر کیا ہوتا"

مسعود: "آخر"

بُڈھا:۔ بس اب اپنے نصیبوں کو روتے ہیں۔

مسعود:۔ ارے ظالم تو ہوا کیا۔

بُڈھا۔ (بڑی لمبی سانس لے کر) ہونا کیا اُس کوٹھری میں چھت ہی نہ تھی اندھیرے میں لٹکی ہوئی رسّی ٹٹولی نہ ملی تو دیا سلائی جلائی استاد فدّن صاحب کہاں۔ "ارے حضرت وہ تو نکل گئے"۔

گیارہ بجے رات کو تیسرے درجہ کے مسافر خانہ میں سوٹ کیسوں پر بستر رکھے دونوں اپنے اپنے اڈوں پر چڑھے ہوئے صبح کے انتظار میں بڑی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے مسعود سے کہا "یار اب تو صبح اسی طرح کرنی ہی پھر سوچ کس بات کا ہے" مسعود پہلے تو خاموش رہے پھر میری طرف غور سے دیکھکر بولے۔ "کیوں جی استاد فدّن صاحب بھی چلے جارہے ہونگے۔ نمعلوم کہاں تک چلے گئے ہونگے نمعلوم کب تک چلے جائیں گے"۔

سید رفیق حسین

دل اور ایک لفظ

پے در پے شکستوں کے بعد بھی قسمت آزمائی کرنا بہاری کی طبع ثانی ہو چکی تھی۔ میری موجودگی میں۔ میری آنکھوں کے سامنے۔ صفدر، موہن، واحد اور بلونت ذرا سا موقع ملنے پر محض ایک لفظ کہہ کر اُسے خاموش کر دیتے۔ اور جب بہاری کا رنگ زرد پڑ جاتا اور اُس کی آنکھیں زمین پر جم کر رہ جاتیں تو وہ ایک زبردست قہقہہ لگاتے۔ میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے کیونکہ اُنہیں معلوم تھا کہ صرف مجھے ہی اُس بچارے سے کچھ ہمدردی ہے۔ بہاری سر جھکائے ہوئے ہم سب کو چھوڑ جاتا اور گھنٹوں کہیں دکھائی نہ دیتا۔ مگر اگلے روز ہی میں اُسے پھر اُنہیں کی معیت میں پاتا۔ جتنی بار اُس نے اُن سے گھل مل جانے کی کوشش کی، جتنی بار اُس نے یہ خیال کیا کہ شاید وہ اس کا مذاق اُڑانا ترک کر دیں اتنی بار ہی اُسے تلخ تجربہ ہوا اور اُس کا قیاس غلط نکلا۔ مگر باوجود اس کے اُس نے اُن سے ملنا جلنا نہ چھوڑا۔

بہاری ہر قسم کا مذاق، عملی یا غیر عملی، برداشت کر سکتا تھا۔ اُس کا عطر میں بھیگا ہوا ریشمیں رومال اُڑا لو بلکہ اُس کو واپس بھی نہ کرو۔ اُس کی کتابیں پروفیسر صاحب کی میز میں چھپا دو۔ اُس کا ہیٹ ہاتھ کی صرف ایک جنبش سے سوئے فلک روانہ کر دو۔ اُسے ہوسٹل کے کمرے میں مسلسل چھ گھنٹے تک بند رکھو، حتےٰ کہ کھانے کا وقت گذر جائے۔ اُسے پرنسپل صاحب کے خاص کمرے میں یہ یقین دلا کر بھیج دو کہ اُسے پرنسپل صاحب نے نہایت ضروری کام کے لئے یاد فرمایا ہے۔ اُسے گڈ بگز نپولین دی گریٹ۔ اُلو کی دُم، خواہ کچھ ہی کہہ لو۔ اُس کے ماتھے پر کبھی بل نہ پڑتا۔ وہ کبھی شکایت نہ کرتا۔ بلکہ سب محسوس کرتے کہ اُسے اِن تمام حرکتوں سے ایک قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مگر جہاں کسی نے اُسے "فٹ بال" کہہ دیا تو اُس پر گھڑوں پانی پڑ جاتا۔ یہ اُس کی ذاتی توہین تھی۔ اِسے وہ کسی صورت سے برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اُسکا چند منٹ پہلے کا دمکتا ہوا کدو ایسا گول چہرہ پھیکا پڑ جاتا۔ اُس کی سیپ کے بٹنوں جیسی چھوٹی چھوٹی خوبصورت آنکھیں، اُس کے چہرے میں ہی غائب ہو جاتیں۔ وہ ایک لحظہ نہ رُکتا اور کسی رُخ تنہا اور بے کس چل پڑتا۔ اکثر وہ میرے کمرے کی طرف ہی رُخ کرتا۔

بہاری آہستہ سے دستک دیکر میرے کمرے میں داخل ہوتا۔ مجھ سے آنکھیں ملائے بغیر ہی میرے سامنے کسی کرسی پر بیٹھ جاتا اور سر جھکا کر ایک ہاتھ کی اُنگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی اُنگلیوں میں سے گذارنا شروع کر دیتا۔ اُس وقت وہ بے بسی اور بے زبانی کا مجسمہ بنا ہوتا۔ اور اگرچہ میں فوراً اندازہ لگا لیتا کہ اُس کی یہ حالت کس وجہ سے ہوئی ہوگی میں اپنی جگہ سے اُٹھکر اُس کے پاس آتا اور اُس کی پُشت پر تھپکی دیکر کہتا:-

"کہو بہاری! آج اسقدر غمگین کیوں ہو؟"

بہاری اپنا چہرہ اوپر اُٹھاتا اور نہایت مجروح نگاہوں سے ایک لمحہ میرے چہرے کا جائزہ لیکر سر جھکا لیتا اور کہتا:-

"آج واحد نے مجھے پھر وہی کہا۔ آخر اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

بالکل ٹھیک۔ اگر قدرت نے بہاری کو ضرورت سے زیادہ گوشت عطا کیا اور وہ بھی ایک پانچ فٹ کے قد پر۔ اگر اُسی قدرت نے اُسکا چہرہ تربوز نما بنایا اور اُس کے سر کو ڈیڑھ برس کے شیر خوار بچے کے برابر رکھکر اُس کو صرف گنتی کے چند بالوں سے مزیّن کیا۔ اور اگر پھر اُسی قدرت نے اُسکو غزالی آنکھوں کی بجائے بٹنی آنکھیں عطا کیں تو اس میں اس بیچارے کا کیا قصور تھا؟ صرف وہ یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ فطرت انسانی بعض اوقات نادر تشبیہوں کو تلاش کرکے اور اُن کو کسی ہم جنس پر تھوپ کر ہی حظ اُٹھاتی ہے۔

جب وہ ان مجروح آنکھوں سے میری طرف دیکھتا اور دھیمی آواز میں اپنے ستانے والوں کی شکایت کرتا تو میرے دل میں اُس کیلئے جذبۂ ہمدردی عود کر آتا۔ آخر دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اُس ٹولی میں سے صرف میں نے ہی اُس کے ساتھ کبھی کسی قسم کا مذاق نہیں کیا بلکہ جہاں تک مجھ سے ہوسکا دوسروں کو ایسا کرنے سے باز رکھنے کی بھی کوشش کی۔ اگر مجھ سے بھی اُسے ہمدردی کی توقع نہ ہوتی تو وہ میرے پاس کیوں آتا۔ اس صورت میں میرے لئے اس نتیجہ پر پہنچنا کوئی مبالغہ نہ تھا کہ وہ میرے پاس اس طرح آتا ہے جیسے ایک خوردسال بچہ چوٹ کھا کر اپنے گھر کی طرف بھاگتا ہے جہاں سے حفاظت اور آرام کی کامل اُمید ہوتی ہے۔

میں اُسکو دلاسا دیتا تو وہ کہتا۔ "اگر تم نہ ہو شاکر تو نہ جانے میں کیا کروں"۔

ایک دو ایسے ہی موقعوں پر وہ مجھ سے کہہ چکا تھا۔ "تمہاری نظروں میں بھی تو میں ایک موٹا اور بے ڈھب سا انسان ہوں گا۔ مگر تم نے تو آج تک مجھے ـــ فٹ بال نہیں کہا۔"

اُس کا فقرہ کتنا دردناک تھا۔ اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا۔ مگر میں بمشکل ہی اپنی ہنسی کو روک سکا اور وہ بھی اُس کی خوبیوں کو جبرًا یاد کرکے۔ مگر میں اُس کے سوال کا کیا جواب دیتا؟ خاموش ہو رہا۔

"آخر میں بھی تو انسان ہوں"۔ اُس نے اُسی رقت آمیز آواز میں کہنا شروع کیا۔ "میرے بھی ایک دل ہے، میں بھی جذبات رکھتا ہوں۔ کیا ہوا اگر میں نے اُن لوگوں جیسی صورت نہیں پائی۔ تو پھر کیوں مجھے ہر بار نشانہ تضحیک بنایا جاتا ہے۔ کیا مجھے فٹ بال کہنا قدرت کی توہین کرنیکے برابر نہیں؟"

"بے شک، بے شک"۔ میں نے اُس وقت اُس کو تسلی دینے کے لئے کہا۔

ایک اور موقع پر جب وہ حسب معمول دل شکستہ ہو کر میرے پاس آیا تو چلتے وقت کہنے لگا:۔

"شاکر! کیا تم کوئی ایسی ترکیب نہیں بتا سکتے جس سے یہ لوگ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ میں نے تو ہزار مرتبہ اُن جیسا ہی بن کر رہنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے ساتھ ساتھ گھوما۔ اُن کے محبوب ترین مشاغل ہنسی مذاق اور دُکھ سُکھ میں حصہ لیا۔ مگر باوجود ان باتوں کے وہ موقع بے موقع نشتر لگا ہی دیتے ہیں۔ کیا میں کسی طرح اُن کی ہمدردی کا حقدار نہیں بن سکتا؟"

"صرف ایک ہی ترکیب ہے"۔ میں نے کہا۔ "اور وہ یہ کہ تم اُن سے دُور رہو"۔

"مگر میرے دُور رہنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ لفظ تو اُن کے دل میں ہی رہے گا اور جب کبھی میں اُن کے قریب گیا، وہ اسے بے ساختہ استعمال کریں گے"۔

اُسی دن کے بعد بہاری نے اپنی عقل سے کام لینا شروع کیا، میں نے دیکھا کہ وہ صفدر۔ بلونت۔ واحد اور موہن کو

قریباً ہر روز ریفریشمنٹ روم میں لیجا کر اُن کی ہر طرح خاطر کرتا۔ اگر کبھی کوئی میچ وغیرہ ہوتا تو اُن کے ٹکٹ بھی وہ اپنی جیب سے خریدتا اور انہیں زبردستی ساتھ لیجاتا۔ اگر اُن میں سے کوئی محض دورانِ گفتگو میں کسی پکچر کی تعریف کر دیتا تو وہ اُن سب کو اُسی سینما میں چلنے کی دعوت دیتا۔ اور اُنہیں فرسٹ کلاس میں لابٹھاتا۔ یہی نہیں بلکہ ایک دو موقعوں پر اُس نے اپنی چند اچھی اچھی کتابیں بھی تحفہ کے طور پر اُنہیں پیش کر دیں۔

جن دنوں وہ ان ترکیبوں سے اُنہیں موہ لینے کی کوششیں کر رہا تھا وہ ایک روز میرے پاس خوش خوش بھاگا آیا۔ میں نے جو اُسکو معمول کے خلاف اسقدر بشاش پایا تو کہا:۔

"کیا قصہ ہے؟ کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا۔ یا کوئی مہوش مِل گئی؟"

"خزانہ وزانہ تو کچھ نہیں۔" اُس نے مسکرا کر کہا۔ "البتہ ایک مہ وش یہاں آئی ہوئی ہے۔ واحد وغیرہ کو تو میں ساتھ چلنے کی دعوت دے چکا ہوں۔ اب تمہارے پاس بھی یہی پیغام لے کر آیا ہوں۔ چلوگے نا آج شام کو؟"

"مگر جناب نے ابھی تک یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ کون صاحبہ ہیں۔ کہاں نازل ہوئی ہیں اور کیوں ہمارے لئے اُن کو دیکھنا اتنا ضروری سمجھا گیا؟"

"فلمی دنیا کی مشہور و معروف سِتارہ کاننا یہاں آئیں اور آپ بے خبر رہیں! خدا کے لئے کبھی اپنے کمرے سے باہر نکل کر یہ بھی دیکھ لینے کی کوشش کیا کرو کہ دُنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ خیر یہ بتاؤ کہ چلوگے یا نہیں؟"

"منظور ہے۔ مگر آنجناب اتنے روز حاضر نہیں ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل اُن لوگوں سے خوب بنتی ہے۔ کیوں؟"

بہاری مسکرا کر چلنے لگا اور چلتے چلتے کہہ گیا۔

"شام کو ٹھیک چھ بجے "امپریل" کے گیٹ پر ملنا۔"

مجھے معلوم نہ تھا کہ بہاری کے اس بے ڈھب ڈھانچے کے اندر ایک شاعر کی رُوح ہے اور ایک تڑپ اُٹھنے والا دل بھی موجود۔ اس حقیقت کا انکشاف اگلے روز ہوا جب ہم سب ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں رات کے شو اور کاننا کے گانے پر بحث کر رہے تھے۔

"میں تو وجد میں آگیا تھا۔" بلونت نے آنکھیں بھینچکر تصویرِ تصور بن کر کہا۔

"آواز ایسی تھی کہ جی چاہتا تھا تمام رات گائے چلی جائے۔" واحد نے کہا۔ "اور وہ گداز جسم؟ خدا کی قسم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھ لگانے سے مرجھا جائیگا۔" صفدر نے بلند آواز میں کہا۔

"اگر ایک دو مرتبہ اور دیکھ لیا تو سمجھیئے کہ ہم دیوانے ہو جائیں گے۔" موہن نے جوش سے کہا۔

پیشتر اس کے کہ میری باری آتی میں نے ایکدم کہا:۔

"اور بہاری! تم تو بتاؤ۔ تمہارے دل پر کیا گذری؟"

"ہاں۔ ہاں۔" سب نے یکزبان ہو کر کہا۔ "ضرور۔"

بہاری چند لمحے خاموش کھڑا رہا اور اپنے بوٹ کی نوک سے زمین پر لکیریں کھینچتا رہا۔

"کیوں بھئی۔" صفدر نے چھیڑا۔ "اب مُنہ میں زبان ہی نہیں رہی۔"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔" بہاری نے آہستہ سے کہا۔ "اُس کا گانا سُننے کے بعد کب کسی کے مُنہ میں زبان رہ سکتی ہے۔ اور اُس کی صورت دیکھ لینے کے بعد کون مسخرہ ہوش میں رہتا ہے؟ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں تھیٹر ہال میں نہیں بیٹھا ہوں بلکہ کسی طلسمی باغ میں۔ جہاں سدا بہار رہتی ہے

اور گل و بلبل ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔ اور محبت کرتے ہوئے ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ جب اس کی آواز بند ہوگئی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مجھے عرش کی بلندیوں سے زمین پر پھینک دیا ہے۔"

"عشق! عشق!" موہن نے ناچ کر کہا۔ "ان کو عشق ہوگیا ہے۔ ورنہ یہ رنگین فقرے کہاں سے آجاتے؟"

"یہ منہ اور مسور کی دال!" بلونت نے بہاری کیطرف دیکھکر قہقہہ لگایا۔

"مگر بھئی یہ تو بتاؤ۔" واحد نے نہایت متانت سے کہا۔ "کیا فٹ بال کے بھی دل ہوتا ہے۔"

واحد کی بات کا بجلی کی طرح اثر ہوا۔ سب سے پہلے میں نے اور پھر ان سب نے بہاری کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بہاری کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرات چمک رہے تھے۔ اس کے لب کھلے ہوئے تھے اور وہ جلدی جلدی سانس لے رہا تھا۔ یکایک وہ مڑا اور گیٹ کی طرف بھاگا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ گیٹ سے باہر نکل گیا۔ میں نے خشمناک نگاہوں سے ان سب کی طرف دیکھا اور ایک لفظ کہے بغیر ان کو چھوڑ کر چلا آیا۔

ایک ہفتہ تک بہاری کی شکل دکھائی نہ دی۔ میری پریشانی بڑھتی چلی جارہی تھی۔ طرح طرح کے وہم میرے دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ جس بات نے مجھے زیادہ متفکر کیا وہ یہ تھی کہ بہاری نے کوئی عرضی بھی کالج میں نہ بھیجی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس کے گھر پہنچ کر سب حال معلوم کروں گا۔ مگر اس سے اگلے روز ہی کالج کھلنے سے دو گھنٹہ پیشتر بہاری مجھے خود آملا۔ اس کی صورت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی مہلک مرض سے صحت یاب ہو کر آیا ہے۔ میں نے پوچھا۔

"اتنے روز کہاں غائب رہے۔ مجھے تو بہت پریشانی تھی۔ اور یہ تمہیں ہوا کیا۔ ایسے دکھائی دیتا ہے کہ قبر سے نکل کر آرہے ہو۔" ساتھ ہی میں نے ہنسنے کی کوشش کی کہ شاید اس طرح بہاری بھی ہنس پڑے۔ مگر وہ ایک بے حس مجسمہ بنا بیٹھا رہا۔

"چائے پیو گے؟" میں نے پھر کہا۔

"نہیں۔ شکریہ۔ میں تمہیں ایک تکلیف دینے کیلئے آیا ہوں!"

"تکلیف؟ آخر یہ کیا قصہ ہے؟ بھئی صاف صاف کہو۔"

"ذرا ان سب کو یہاں بلا لاؤ۔"

میں حیران ہو کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔

"یعنی صفدر۔ موہن ——" میں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ بہاری نے میری بات کاٹ کر کہا:۔

"ہاں۔ ہاں۔ انھیں ہی۔"

"مگر آخر یہ کس لئے؟ کچھ سمجھاؤ تو سہی!"

"سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائیگا۔"

میں مجبوراً ہار گیا اور چند منٹوں کے بعد ان سب کو ہوسٹل کے کمروں سے نکال کر اپنے ہمراہ لے آیا۔ واحد نے داخل ہوتے ہی کہا۔

"مجھ سے اس روز غلطی ہوئی۔ بہاری! میں معافی چاہتا ہوں۔"

"ہاں بھئی بہاری۔" موہن نے کہا۔ "معاف کردو۔ انسان سے غلطیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ شاکر تم ہی کہو۔ تمہاری بات تو بہاری کبھی نہ رد کرے گا۔"

بہاری نے جو اس وقت تک سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا چہرہ اٹھایا۔

"معمولی بات ہے۔ واحد! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ شاید مجھ میں ہی کوئی ایسی کمی ہے۔ مگر ان سب باتوں کو ہٹاؤ۔ میں صرف تم سے ملنے آیا تھا۔ تم لوگوں کو الوداع کہنے کے لئے۔ میں کالج چھوڑ رہا ہوں۔"

"کیوں کیا ہوا؟" سب نے ایکدم متعجب ہو کر پوچھا۔

"یونہی۔" بہاری نے جواب دیا۔ "اب طبیعت اکتا گئی ہے۔ پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ کم از کم بی۔ اے۔ تو کر لو۔" بلونت نے کہا۔

"ہاں بھئی۔" صفدر نے کہا۔ "آج کل بی۔ اے ہونا تو اشد ضروری ہے۔"

میں خاموشی سے اس گفتگو کو سُن رہا تھا اور بہاری سے کچھ نہ کہنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ کیوں کالج چھوڑنے کا ارادہ کر کے آیا ہے۔ وہ اپنے ان دوستوں کے سلوک سے عاجز آ گیا تھا۔ اُس نے اِن کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے کتنے جتن کئے تھے اور وہ محض ایک معمولی سی بات حاصل کرنے کے لئے۔ یعنی یہی کہ وہ اس لفظ کو جس سے اُسکا دل دُکھتا تھا کسی طرح بھلا دیں۔ مگر اُس روز کے واقعہ کے بعد اُس کو یقین ہو گیا تھا کہ اُن سے یہ توقع رکھنا عبث ہے۔ اور اسی لئے وہ اس ماحول کو ہی چھوڑ دینا چاہتا تھا جہاں اُس کے دل کو اتنا مجروح کیا گیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اُن سے مل کر رخصت ہونا چاہتا تھا۔ کتنا فراخدل انسان تھا!

بہاری نے صفدر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا ہوا تھا۔ سب سے آخر میں مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"خدا حافظ۔ بہاری!" میں نے کہا۔ "اُمید ہے کہ پھر کبھی ملاقات ہو گی۔"

بہاری کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوا میں اُسے دیکھتا رہا۔ جب میں نے سر موڑا تو اُن سب کی آنکھیں فرش پر لگی ہوئی تھیں۔ کیا یہ ندامت تھی؟ کیا اُنہیں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ کسی انسان کے جذبات کے ساتھ کھیلنا کیا معنی رکھتا ہے؟

میں نہیں جانتا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

انور اعجاز قیصر؁

فاؤسٹ

مترجمہ شاہد احمد۔ بی۔ اے (آنرز) دہلوی

خُدائی خوار

مرزا گوہر پوتڑوں کے امیر تھے۔ بچپن سونے چاندی کے پنگوروں میں گزرا۔ لڑکپن میں دولت سے کھیلے۔ جوان ہوئے تو باپ دادا کا اثاثہ بے دریغ اُڑایا۔ پتنگ بازی۔ مرغ بازی۔ بیٹر بازی غرضیکہ کوئی بازی ایسی نہ تھی جس کا انہیں شوق نہ ہو۔ آنکھیں بند تھیں اور دل کھلا ہوا۔ کئی پشتوں کا بنا ہوا گھر تھا بگڑتا معلوم نہ ہوا۔ اپنی کمائی ہوتی۔ اپنے خون پسینے کا پیدا کیا ہوا ہوتا تو خرچ کرتے ہوئے کچھ خیال بھی آتا۔ دوسرے کما کر چھوڑ گئے تھے۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ آخر کہاں تک۔ پوتڑوں کی امیری ٹھوکروں میں دم توڑنے لگی۔ زیور گئے۔ شال دوشالے بکے۔ گھوڑا پالکی نالکی سب پر پانی پھر گیا۔ مکان جو محلسرا کہلاتا تھا بنیوں کی نذر ہو گیا تو ہوش آیا۔ آنکھیں کھلیں لیکن

"اب کیا ہوتا تھا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

نہ کوئی لیاقت تھی نہ کچھ سلیقہ۔ نہ جسم محنت و مشقت کا عادی تھا نہ مزاج میں صلاحیت۔ نوکری ملتی تو کس برتے پر۔ اور اگر مل بھی جاتی تو پرائی تابعداری کون کرتا۔

شرافت کا جھوٹا غرور۔ پدرم سلطان بود کا ذلیل کرنے والا خیال۔ تباہ شدہ امارت کا ملال پستی کی طرف لے جانے والی سیڑھیاں ہیں۔ سرور کے بعد خمار کی حالت میں اگر انسان اپنی ہستی کو سمجھ لے اور پرانی کہانیاں بھول جائے۔ تو پھر تعمیر شروع ہو جاتی ہے لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ دولت و ثروت تلذذ و تعیش کا اُترا ہوا نشہ ساری اولوالعزمیوں کو برباد کر دیتا ہے اور اُنکی جگہ سستی۔ کاہلی۔ نامردی اور کم ہمتی پیدا ہو جاتی ہے۔ عالمِ اسباب میں بسر کرنے کی قابلیت نہیں رہتی۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح موت سے پہلے مرنا چاہتا ہے۔ اخلاقی گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیمیا کی تلاش میں خاک چھانتا ہے یا دنیا طلبی میں قدرت کی پوشیدہ طاقتوں کو مطیع کرنے میں زندگی برباد کرتا ہے تاکہ حاکم وقت مسخر ہو جائے۔ چھپے ہوئے خزانے زمین اُگل دے۔ کوئی موکل روزانہ ایک اچھی رقم دے جایا کرے اور بدنصیب یہ نہیں جانتا کہ تسخیر۔ دولت کے خزانے اور دستِ غیب۔ صرف محنت۔ بلند خیالی اور کسب کمال میں مخفی ہے۔ ایسے ناکارہ اور قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والے تو خسرۃ الدنیا والاخرۃ ہوتے ہیں۔

چنانچہ مرزا گوہر نے بھی متروک الدنیا بننے کے لئے یہ تمام درجے طے کرلئے تھے اور اب اُن کے اوقات مزاروں پر فاتحہ پڑھنے۔ درگاہوں میں چلّہ کشی کرنے اور عاملوں۔ فقیروں۔ درویشوں کی تلاش میں گزرتے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ اگر میرا کوئی وظیفہ یا موکل پوری شرطوں کے ساتھ پورا ہو گیا تو ہفت اقلیم کا بادشاہ بن جاؤں گا۔ یہ نہ ہو گا تو کوئی کیمیا کا نسخہ یا باون تولہ پاؤ رتی والا مل جائے گا۔ یہ بھی نہ ہو گا تو کم از کم دستِ غیب تو کہیں گیا ہی نہیں۔

خدا سے اُس کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف خواہش اور اُس کے انتظامات کو درہم و برہم کرنے کی کوشش۔ ایک سنگین جرم۔ ایک ناقابلِ معافی گناہ ہے۔ اگر اُس کا رحم و کرم آڑے نہ آجائے تو ایسے غدار بے پناہ

سزا کے مستحق ہیں۔ مرزا گوہر بھی دُنیا کھو کر اب دین کھونے کی فکر میں تھے۔ خدا کو یاد کرتے تھے محض دُنیا کے لئے۔ نفس کُشی ہو رہی تھی مگر صرف حصولِ عیش کی غرض سے۔ اگر اس میں اپنی عسرت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ قمار خانۂ دُنیا میں ہمت ہار چکا تھا تو کاش وہ خدا کو محض خدا کے لئے یاد کرتا جس کا سب کچھ ہے۔ اور جس کی یاد دونوں جہان کی دولت کا مالک بنا سکتی ہے۔

مرزا گوہر نے سخت سے سخت ریاضتیں کیں۔ دریا میں کھڑے ہو کر وظیفے پڑھے۔ پہاڑوں کے غاروں میں چلے کشیاں کیں۔ مہینوں انسان کی صورت نہیں دیکھی۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ آدمی سے آدمی کا خاکہ بن کر رہ گئے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر قبرستان کی مسجد میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے ترس کھا کر مرزا گوہر کو ایک وظیفہ بتایا کہ یہ دعوت دردائیل کے متعلق ہے۔

مرزا گوہر:۔ تو مجھے اجازت دیں اسے شروع کر دوں۔

بزرگ:۔ بسم اللہ۔ نوچندی جمعرات سے شروع کر دو۔ دردائیل سے انشاء اللہ تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔

مرزا گوہر:۔ اور میرے تمام مطالب پورے ہو جائیں گے۔

بزرگ:۔ تمہارے مطالب کا پورا ہونا خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔

مرزا گوہر:۔ یہ موکل خدا کی مرضی کو نہیں بدل سکتے؟

بزرگ:۔ توبہ توبہ! موکلوں کی کیا طاقت ہے کہ اُس کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی اُٹھا سکیں۔ بلکہ ہم درویش تو اسی کی پوشیدہ قوتوں کو موکل کہتے ہیں۔

مرزا گوہر:۔ پھر آپ مجھ سے یہ محنت کس لئے کرانا چاہتے ہیں۔

بزرگ:۔ صرف اس لئے کہ تم برگشتہ ایمان ہوتے جا رہے ہو۔ تم نے اسماءِ الٰہی کی برکات نہیں دیکھی ہیں۔ تمہاری غلط اعتقادیوں نے تمہیں کفر کے دروازہ پر لا ڈالا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں راندۂ درگاہ نہ ہو جاؤ۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم خدا کے صرف ایک نام کی دعوت کا کرشمہ تو دیکھ لو۔

مرزا گوہر:۔ بجا ارشاد ہوا۔ مگر اس کے ذریعہ سے میری کوئی آرزو بھی پوری ہو سکے گی؟

بزرگ:۔ وہی علیم ہے۔ اُسی کو اس کا علم ہے۔

مرزا گوہر:۔ لیکن دردائیل سے ملاقات کا مقصد؟

بزرگ:۔ تمہارے مضطرب دل کی تسکین۔

یہ کہہ کر وہ بزرگ خاموش ہو گئے۔ مرزا گوہر نے ہرچند ان سے کچھ اور بات کرنی چاہی مگر اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوسرے ہی دن وہ غائب ہو گئے۔

نوچندی جمعرات آگئی۔ مرزا گوہر نے سامانِ دعوت مہیا کر کے وظیفہ شروع کر دیا۔ ایک ہفتہ گزرا۔ دوسرا ہفتہ گزرا۔ تیسرا ہفتہ آیا اور ایسی کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی جس سے اس دعوت کی کامیابی کا خیال ہوتا۔ چھ گھنٹے کی محنت سخت پرہیز۔ دن بھر کا روزہ۔ جو کے صرف دو تولہ ستو۔ خاموشی اور تنہائی۔ مرزا گھبرا گئے۔ جی چاہا کہ چلّہ توڑ دیں۔ لیکن صاحبِ عمل بزرگ نے کچھ ایسے تیوروں سے یہ عمل بتایا تھا کہ توڑنے کی ہمت نہ ہوئی یہ بات بھی سُنی ہوئی تھی کہ بعض اعمال توڑ دئے جاتے ہیں تو اُن کے اُلٹنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا عمل جاری رہا۔ اُنتالیسواں دن تھا اور چار گھنٹے پڑھتے ہوئے گزرے تھے کہ یکایک ساری مسجد ہلنے لگی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ زلزلہ آگیا۔ حجرے کے کواڑ ٹوٹے جاتے تھے۔ مہیب مہیب آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ ایسا شور تھا جیسے آسمان سے پتھر کی ہزاروں سلیں برس رہی ہیں یا صدہا ریل گاڑیاں ہیں جو زمین کی چھاتی روند رہی ہیں

یہ ہولناک منظر لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہا تھا اور مرزا بیچارہ سہما سمٹا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور تسبیح چل رہی تھی کہ یکایک حجرے کے دروازہ کو ایک سخت دھکا لگا۔ دونوں کواڑ پاش پاش ہوگئے۔ مرزا کی جان خوف کے مارے نکلنے کے قریب ہی تھی کہ آہٹ سی معلوم ہوئی۔ اب وہ غل شور جاتا رہا تھا۔ سناٹا تھا اور خاموشی۔ مرزا نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک قوی ہیکل خوبصورت جوان نہایت بارعب ہتھیار لگائے اندر داخل ہوا۔ حصار کے گرد تین چکر لگائے اور تلوار سونت کر کھڑا ہوگیا۔ مرزا نے وظیفہ کی لے کو ذرا تیز کیا۔ چند منٹ تک ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ کہنے کے بعد اس آنے والے نے تیوری پر بل ڈال کر ذرا کرخت لہجہ میں کہا۔

"قضا و قدر سے مذاق کرنے والے ضعیف انسان۔ بول کیا چاہتا ہے؟ کیوں ہمیں پریشان کیا؟ ہمارے تسخیر کرنے سے تجھے کس فائدہ کی اُمید ہے؟"

مرزا کی جان میں جان آئی۔ وہ سمجھے کہ عمل کامیاب ہوا اور یہ دردائیل موکل ہے۔ اب میری ساری تمنائیں پوری ہوجائیں گی۔ یہ دردائیل میرے سب کام بنا دے گا۔ مسکرا کر بولے :-

مرزا گوہر:- آپ کا نام دردائیل ہے؟

موکل:- جی ہاں۔

مرزا گوہر:- اللہ اللہ! کیسی کیسی زبان گھسی ہے۔ کہاں کہاں ماتھا رگڑا ہے۔ جب آپکی زیارت نصیب ہوئی ہے۔

موکل:- اِن فضول باتوں کو چھوڑ دو۔ مطلب کہو۔

مرزا:- جلد بازی نہ کیجئے۔ ابھی تو آپ تسخیر ہوئے ہیں۔

موکل:- تسخیر، تسخیر کیسی؟ یہ تو صرف اُس پاک اسم کی برکت تھی جو ہم آگئے۔ ورنہ دُنیا کے بندوں سے ہمیں کیا واسطہ۔ یہ فقرہ موکل نے ایسا کڑک کے کہا کہ مرزا پر ہیبت طاری ہوگئی اور کسی قدر لجاجت سے بولے۔

مرزا:- اچھا تو یہ فرمایئے کہ آپ اپنے عامل کی کیا کیا خدمت کرسکتے ہیں؟

موکل:- ہم کسی عامل کی خدمت کیلئے نہیں پیدا کئے گئے ہیں۔

مرزا:- تو پھر عملیات سے آپ کا تعلق کس قسم کا ہے۔

موکل:- صرف معنوی۔ ہر اسم میں ایک طاقت پوشیدہ ہے جس کو موکل کہتے ہیں۔ چنانچہ جس اسم کی تم نے دعوت دی ہے اُس کی مخفی قوت میں ہوں اور جس کا نام تم نے دردائیل مقرر کر لیا ہے۔

مرزا:- بہت خوب۔ لیکن کیا آپ اپنے اسم کے عامل کی اطاعت نہیں کریں گے؟

موکل:- عملیات سے ہمارا تعلق اور عاملوں کی اطاعت جیسی لوگ سمجھتے ہیں۔ وہ صرف دُنیا طلب مکّار اور ڈھکوسلے باز عاملوں کا جال ہے۔ جیسا مشہور ہے ایسے نہ ہم کبھی کسی کے فرماں بردار تھے نہ اب ہوسکتے ہیں۔ اور جتنا بھی تعلق تھا وہ بھی ترک کر دیا ہے۔ یہ بھی اُس بزرگ کی جس نے تم کو یہ اسم بتایا ہے روحانی طاقت کا کرشمہ تھا جو ہم آگئے۔

مرزا:- تو اب آپ کا کیا کام ہے؟

موکل:- امورات قضا و قدر کی انجام دہی اور بس۔ تم کہو تمہارا کیا مطلب ہے؟

مرزا:- میرا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو کوئی خزانہ مل جائے۔ جدھر نظر ڈالوں دولت ہی دولت دکھائی دے۔

موکل:- یہی وہ نامعقول مطالبات ہیں جن کے سبب ہمیں عملیات کی اطاعت سے گریز کرنا پڑا۔ سونے چاندی کا ڈھیر لگا دینا۔ یا کسی دفینہ کی جگہ بتا دینا ہمارے نزدیک مشکل نہیں لیکن اس قسم کے لغو کام مشیّتِ الٰہی کے خلاف ہیں۔

مرزا:- اچھا تو مجھے کہیں کا نواب بنا دو۔ تاکہ زندگی عیش و راحت

میں گزرے۔

موکل:- اور ہوس کی شکارگاہ میں تم کو چھوڑ دوں۔ کیا خوب! پہلے ہی راجہ نواب کون سے حقِ حکومت و رعایا پروری ادا کر رہے ہیں جو تم ادا کروگے۔ اور بھیڑئے غریب بکریوں کیلئے کیا کم ہیں کہ آپ کا بھی اضافہ کیا جائے۔

مرزا:- یہ بھی نہ سہی تو خیر کوئی کیمیا کا نسخہ ہی عطا ہو جائے۔ میں خود ہی سونا چاندی بنا لیا کروں گا۔

موکل:- اس کے یہ معنی ہیں کہ تم کو خدا کے منشاء کے خلاف بیکار اور جھوٹوں کا بادشاہ بنا دیا جائے۔ تم نمونہ بن کر مخلوق کو گمراہ کرو اور بندگانِ الٰہی تم سے دھوکا کھا کر تباہ ہوں۔

مرزا:- میں تو محض دولت کا طالب ہوں۔ اسی کی خاطر یہ ساری محنتیں اٹھائی ہیں۔ دولت سے تمام خواہشیں پوری ہو سکتی ہیں اور آپ اس معاملہ میں میری کسی مدد کیلئے تیار نہیں۔

موکل:- یہ تمہارا خیال غلط ہے کہ دولت سے خواہشیں پوری ہو سکتی ہیں۔ دولت تمنا برآری کا ایک ناقص ذریعہ ہے۔ اور وہ بھی یقینی نہیں۔ اے ناقص العقل انسان تو اس چیز کو کیوں طلب کرتا ہے جو فانی ہے۔ جسکا زوال تو نے اپنی آنکھوں سے اپنے گھر میں دیکھا ہے جس سے نہ آج تک کبھی کسی کو قلبی راحت میسر آئی ہے نہ روحانی لذت۔ بدنصیب یہ شیطانی وسوسہ ہے دل سے نکال ڈال اور اُس کا طالب بن جس کے قبضۂ قدرت میں ایک یہ کیا ساری دُنیائے آرزو اور کل کائنات مسرت ہے۔

مرزا:- وہ کیا قارون کا خزانہ یا محمد شاہ رنگیلے کی بادشاہت ہے؟

موکل:- لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ارے وہ خدا کی محبت اور رسول کی اطاعت ہے۔

مرزا:- مگر میں تو دولت کا آرزومند ہوں۔ مجھے تو دولت مند بننے کی ضرورت ہے۔

موکل:- کمبخت! اسمارالٰہی کی توہین کرتا ہے۔ خیر اگر تجھ کو دولتِ دُنیا ہی سے رغبت ہے تو دُنیا کے قانون کے مطابق چل۔ کوئی ایسا کام اختیار کر جس سے مالدار ہونے کا راستہ کھل جائے۔

مرزا:- حضرت اسی جھنجٹ سے بچنے کیلئے تو میں نے عملیات کے پاپڑ بیلے ہیں۔ اِن ریاضتوں کا یہ پھل تو نہیں ملنا چاہیئے۔ کام کرنے کی ہمت ہوتی تو آپکی دعوت میں جان کیوں کھپاتا۔

موکل:- مگر ایسے پست ہمتوں۔ دُنیا کے ذلیل کتوں اور خدائی کے چوروں کی اعانت کیلئے قانون فطرت میں کوئی دفعہ موجود نہیں ہے۔ یہاں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے کچھ نہیں ملتا۔ اس جہان میں تدبیر سے تقدیر بنتی ہے۔

مرزا:- آپ تقدیر بدل تو سکتے ہیں مگر مجھ سے آپ کو ضد ہوگئی ہے۔ خیر وہ کام ہی بتایئے جس سے دولت ہاتھ آئے البتہ زیادہ محنت کی مجھ سے اُمید نہ رکھیئے گا۔

موکل:- آج کل طبابت۔ پیری مُریدی۔ قومی پیشوائی اور فرقہ پرست وعظ گوئی یہ چار پیشے ایسے ہیں کہ جتنی چاہو دولت سمیٹ لو۔ ان میں سے جس فن کو اختیار کروگے میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔

مرزا:- آپ اچھے قضا و قدر کے فرشتے ہیں۔ دولت آپ نہ دے سکے۔ نواب بنانے سے آپ نے انکار کر دیا۔ اکسیر بتانا آپ نہیں چاہتے۔ کام بتائے تو وہ کہ پہلے ساخت پھر یافت۔ یہاں اتنا صبر کہاں؟ اور کیا ان پیشوں میں فریب اور دغا نہیں ہے؟

موکل:- تمہاری کم ہمتی اور حرامخوری نے جب مال مفت ہی کو اپنی تقدیر سمجھ لیا ہے۔ تو تمہیں ایسے ہی مکر سے دولت حاصل ہو سکتی ہے۔

مرزا:- لیکن ان کاموں کیلئے بھی تو ہنرمندی درکار ہے میں تو اپنے میں نہ طبیب بننے کی قابلیت پاتا ہوں نہ پیری مُریدی کی۔

قوم کا رہنما اور مذہب کا پیشوا ہونا تو بڑی چیز ہے۔

موکل:۔ اگر ان آسان اور بغیر ہلدی پھٹکری لگائے رنگ چوکھا لانے والے پیشوں پر تم ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو خسرۃ الدنیا والآخرۃ ہو کر ٹھوکریں کھاتے رہو اور مر جاؤ۔ خلقت انسان کو رسوا کرنے والے بندے آخرت سے غافل ہوتے ہوئے متروک الدنیا تو نہ بن۔ یہ مانا کہ طبیب بننے کیلئے کچھ نہ کچھ لیاقت کی ضرورت ہے اور تھوڑا بہت روپیہ بھی چاہیئے۔ وعظ گوئی اور ریفارمری بھی ذرا مشکل ہے۔ دوڑتے ہوئے دماغ اور چلتی ہوئی زبان کے بغیر یہ دکانیں نہیں چلتیں۔ علاوہ ازیں موجودہ سیاسی دور میں جہاں مالا مال ہونے کا قوی امکان ہے۔ پولس کی سختیاں۔ جیل کی صعوبتیں اٹھانے کی جرأت ہونی لازمی ہے۔ تم جیسے نکھٹے شخص کے واسطے تو بہترین کام پیری مریدی ہے جس میں نہ کسی ساز و سامان کی قید ہے نہ کسی قابلیت کا خرچ۔ بہت سی مسجدیں۔ خانقاہیں۔ پرانے مقبرے ویران پڑے ہیں۔ جہاں جی چاہو جا بیٹھو۔ جتنی زیادہ بے ڈھنگی وضع اور جس قدر نرالی گفتگو اختیار کرو گے اسی قدر زیادہ لوگ گرویدہ ہوں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری شہرت کے لئے کوشش کرونگا اور تھوڑے دن میں تمہیں "پیر دستگیر" درویش مراد بیٹھ۔ سالک۔ مجذوب۔ قلندر۔ غوث۔ قطب جو کچھ تم چاہو گے بنا دونگا۔ سینکڑوں ضعیف الاعتقاد مرد و عورت ہندو و مسلمان تمہارے ہاتھ پاؤں چومیں گے۔ اور تم مزے کرنا۔ فقیر بادشاہ کہلاؤ گے۔ اس ایک ٹکے میں دولت نوابی کیمیا وغیرہ کی ساری خواہشیں پوری ہو جائینگی فرمایئے کیا ارادہ ہے؟

مرزا:۔ یہ کام تو ٹھیک ہو مگر میرے بس کا نہیں۔ جگہ کی قید۔ ہر شخص سے نئے طرز کی گفتگو۔ ہر درد کا علاج۔ ہر خواہش کی دوا، نہیں جناب مجھ سے نہیں ہوسکے گا۔ آپ تو اللہ کے واسطے دستِ غیب کا انتظام کر دیں۔ زیادہ نہیں تو دو تین روپے روزانہ ہی سہی۔ صبح ہوئی اور سرہانے سے اٹھا لئے۔

موکل:۔ ظالم! پیر فقیر یا درویش صاحب کرامت مشہور ہو جائیگا تو آنکھوں میں سرسوں پھول جائیگی۔ دستِ غیب کیا چیز ہے دنیا کے سارے چھپے ہوئے خزانے نظر آنے لگیں گے۔ جب معتقد سہاگنیں اور نوجوان دلہنیں مہندی لگے ہوئے ہاتھوں سے پاؤں دبا دبا کر مرادیں مانگیں گی اور آنسوؤں کی زبان سے اپنے اخلاص کا اظہار کریں گی تو حوروں سے آنکھ ملانے کو جی نہیں چاہے گا۔ کسی حسن فروش کی دکان پر جب ورق لپٹا ہوا پان پیش ہوگا اور روح افزا شربت کا ٹھنڈا گلاس سامنے آئے گا تو حضرت سلامت من شراب طہور کے جام زہر ہو جائیں گے۔ کہو کیا کہتے ہو؟

مرزا:۔ آپ بڑے ضدی ہیں۔ اچھا مجھے منظور ہے۔ عملیات کے شوق اور درویشوں کی صحبتوں کے سبب میرے لئے یہ زندگی بالکل نئی بھی نہیں ہے۔

موکل نے حقارت آمیز نگاہ سے مرزا کی طرف دیکھا اور نہایت غضب ناک آواز سے یہ کہتا ہوا کہ "اے مقہور ہستی جا اپنا کام شروع کر۔ جیسی گندی کھیتی کی تو نے خواہش کی ہے ویسے ہی کڑ کھاتے پھل تجھے ملیں گے۔ خدا کی حقیقت سے تو نے گریز کی ہے۔ اس لئے وہ بھی ہمیشہ کیلئے تجھ سے روپوش رہے گی" غائب ہوگیا۔ مرزا نے دو برس کے عرصہ میں کئی روپ بدلے پیر بنے۔ عامل ہوئے خوب شہرت پائی، پورے عیش اڑائے۔ چار دن کی چاندنی کے بعد جو اندھیرا شروع ہوا تو سارے کمالات خاک میں مل گئے۔ وحشت ہوگئی اور مدت سے مادرزاد ننگے بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ سمجھتا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ہر کے دوارے کے دھکے کھائے ہوئے کتے ہیں گھر کے نہ گھاٹ کے

اشرف صبوحی دہلوی!

نواب ٹمبکٹو

ایکٹ پہلا

(عاقل خاں وزیر اپنے محل کے دیوان خانے میں بیٹھا ہوا ہے جس کے پیچھے زنانخانہ ہے، پردے پڑے ہوتے ہیں۔ سامنے جمشید جی سوداگر ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔)

وزیر:۔ میں نے سنا ہے کہ تم بمبئی جا رہے ہو؟ کیا یہ سچ ہے؟

جمشید جی:۔ ہاں جور، ہوں بمبئی جاؤں چھوں۔

وزیر:۔ جمشید جی! میرا ایک کام ہے۔ آج اسی لئے میں نے تمہیں بلایا ہے۔

جمشید جی:۔ بولو وجور۔ اپن اکھا کام ووں چھوڑنی تمارو کام کروں چھوں۔

وزیر:۔ دیکھو مجھے ایک شلوکہ چاہیئے ہے جو بمبئی میں بہت اچھا ملے گا۔ تم اٹلی کی مخمل لینا اُس پہ اورنگ آباد کے جامہ دار کی گوٹ لگوانا اور سورت کے کاریگروں سے زری کا کام بنوانا اور بمبئی کے کاریگروں سے سلوانا۔ بس جمشید جی وہ شلوکہ ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کی مثال کسی نواب اور سلطان کے گھر میں نہ مل سکے۔ جب ایسا شلوکہ تیار ہو جائے تو وہیں پر احمد آباد کے کسی سنار سے سونے کے چوبیس بٹن تیار کرانا لیکن وہ بٹن کتنے بڑے ہوں اُسے کان کھول کر سن لو۔ ہر ایک بٹن مُرغی کے انڈے سے چھوٹا ہونا چاہیئے اور کبوتر کے انڈے سے بڑا۔ یہ تمام بٹن گلے کے چاروں طرف ٹانک دئے جائیں گے تو پہننے والے کو چار چاند لگ جائیں گے۔ اس کو جس قدر جلد ہو سکے بنوالو۔ بس میں کہہ چکا لو یہ پچاس اشرفیاں رکھو، باقی پھر دیکھا جائیگا۔ (وہ پچاس اشرفیوں کی تھیلی نکال کر سامنے رکھی ہوئی میز پر رکھ دیتا ہے) دیکھو اس میں سر مو فرق نہ ہونا چاہیئے ورنہ یاد رکھو کہ تمہارا گوشت کوؤں کو کھلاؤں گا، کوؤں کو۔۔۔ تم کب واپس آؤ گے، بولو۔

جمشید جی:۔ ہوں ایک اادس ما آؤں چھوں۔ پن شلوکہ نی سائز کیٹلی چھے کیٹلا لمبو، کیٹلا چوڑو، کیٹلی کمر، کیٹلی گلو، ان کیٹلا سینوں۔ درجی نو سوں بتاؤں چھوں کیم سائز نوں بگیر کام نتھی چالے جور۔

وزیر:۔ اونہہ سائز کی ضرورت نہیں۔ ہے۔ مجھے بس شلوکہ چاہیئے۔ چاہے بڑا ہو یا چھوٹا لیکن اگر خوبصورت بنا ہوا ہو تو بدن پر آپ ہی آپ ٹھیک آ جائیگا۔

جمشید:۔ جور، ہوں آعرج کروں چھوں۔ اپن کپڑو کھرید لے۔ بٹنوں نی تیاری کرے۔ گوٹ نی آرڈر دے دے۔ انے جری نوں کام کھتم کرالے۔ پچھلے بدھو مال تمارے آنکھوں نی سامنے لائی درجی نو حکم کری کہ سائز نو مانک کاٹ کوٹ ٹھیک بنائی ڈالی۔

وزیر:۔ سوداگر کا بچہ! ٹرٹر باتیں بنائے جاتا ہے اور ہماری کچھ سنتا ہی نہیں جیسے تمام دُنیا کی باتیں تو ہی جانتا اور سمجھتا ہے۔ ارے کیا سائز بغیر کوئی کپڑا سل ہی نہیں سکتا۔ پھر درزی کا کمال ہی کیا ہوا (چپکے سے) ارے کیسا سوداگر ہے کہ بات کو سمجھتا ہی نہیں۔ بھائی یہ بڑے راز کی بات ہے۔ میں تجھے کیسے بتا دوں کہ یہ شلوکہ کس کے لئے بن رہا ہے اور وہ عورت کتنی لمبی چوڑی اور کتنی موٹی ہے۔

جمشید جی:۔ کھتا تھئی گئی۔ اپن کو ماف کرو جور۔

وزیر:۔ نہیں معافی کی کیا بات ہے لیکن تمہیں اتنا تو سوچنا چاہیئے کہ اگر ٹمبکٹو میں یہ خبر پھیل گئی کہ میں یہ شلوکہ کس لئے بنوا رہا ہوں تو بس آفت آ جائے گی۔ میرے سر اور ڈاڑھی کے بال ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر ہوا میں اُڑتے نظر آئیں گے، سمجھا۔

جمشید جی:۔ منے کھبر نتھی جور۔

وزیر:۔ سچ کہتا ہے کہ تجھے نہیں معلوم!

جمشید جی:۔ کھری کھری بات چھے۔ منے سوں کھبر۔

وزیر:۔ اچھا تو میں تجھے بتائے دیتا ہوں۔ لیکن خبردار کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ سوداگر کی زبان اور سپاہی کے ہاتھ چلا ہی کرتے ہیں لیکن اگر میں نے سن پایا کہ تُو نے بازار میں بیٹھ کر شیخی بگھاری کہ وزیر صاحب نے مخمل کا شلوکہ بمبئی سے منگوایا ہے تو جان لینا کہ تیری زبان گدی سے نکلوا لونگا۔

جمشید:۔ (تھرتھرا کر) ہوں کسم کھاؤں چھوں۔

وزیر:۔ دیکھو، رجب، شعبان، رمضان۔ عید کے تین مہینے باقی ہیں ابکی میرا ارادہ ہے کہ عید کے موقع پر "لالہ خاتون" کی خدمت میں یہ شلوکہ پیش کر دوں اگر میں اُس کی تیاری یہاں کراؤں گا تو عقیلہ بیگم بھی ضد کریں گی کہ مجھے بھی ایسا ہی بنوا دو۔۔۔ بھئی دو جورو والے کی زندگی بڑی کٹھن ہوتی ہے اگر نہیں بنواؤں گا تو وہ تو تو میں میں ہوگی کہ گھر میں بیٹھنا دشوار ہو جائیگا۔

جمشید:۔ پن جور۔۔۔ آ شلوکہ لالہ بیگم نی انگ ماں جوئیے تو عکیلہ بیگم حشر نتھی مچاتے؟۔

وزیر:۔ یا اللہ۔ کتنا جھکی آدمی ہے بھئی۔ ارے تجھے اس سے کیا مطلب۔

اگر عقیلہ بیگم حشر مچائیگی تو میں کہدوں گا کہ یہ شلوکہ میری بہن احمد نگر کے نواب کی بیوی نے بھیجا ہے بس چلو چھٹی ہوئی۔ اب تو سمجھ گئے۔ بولو مجھ سے وعدہ کرو کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کروگے۔

جمشید۔ **حضور، ہوں مو تو سوداگر چھوں۔ ہوں جبان دوں چھوں کہ آ بات کسی ناتھی بولوں۔**

وزیر۔ **خدا تمہارا بھلا کرے۔ جاؤ دور ہو میرے سامنے سے۔**

(جمشید جی سلام کرکے رخصت ہوتا ہے اس کے جاتے ہی زنانخانہ کا پردہ ہٹتا ہے اور یکبارگی عقیلہ خانم کمرے میں داخل ہوتی ہے۔)

عقیلہ خانم۔ ہوں۔ مخمل کا شلوکہ، زری کا کام اور سونے کے بٹن، اپنی چہیتی کے لئے۔ اب میں سمجھی۔ عید کے موقع پر احمد نگر کا تحفہ آرہا ہے اور میں ایسی ننھی ہوں کہ سب باتوں کا یقین کرلوں گی۔ وہی بہن ہیں نا تمہاری جو گھی کو بوتل میں بند کرکے روٹی کے نوالے اُس پر رگڑ رگڑ کھاتی ہیں۔ اور اب وہ اتنی سخی ہوگئیں کہ تمہاری بیوی کے لئے سینکڑوں روپے کی لاگت کا شلوکہ بھیج رہی ہیں۔ اسے میں اُڑتی چڑیا کی پہچاننے والی یوں دھوکا کھا جاؤنگی۔

وزیر۔ اے بیگم کیوں مجھے دھمکا رہی ہو کچھ دیوانی ہوگئی ہو، کیسا شلوکہ، کیسا تحفہ، آخر یہ بات کیا ہے؟۔

عقیلہ خانم۔ اب مکاری بھی سیکھ گئے ہو۔ زبان پلٹتے شرم نہیں آتی میں نے اپنے کانوں سے سب باتیں سنی ہیں جو کچھ تم جمشید جی سے کہہ رہے تھے۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ آج اس پارسی سوداگر کو تم کیوں بلا رہے ہو۔ اسی لئے میں پردے کے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ خدا مبارک کرے یہ عید کا تحفہ۔ لالہ خانم اس کو پہن کر جائیں اور سارے محل کو دکھاتی پھریں لیکن تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ وہ تمہاری بنو کیا گل کھلا رہی ہیں۔ وہ روشن اختر نواب صاحب کا بھتیجہ۔

وزیر۔ چپ بڈھی کھوسٹ! تجھے شرم نہیں آتی کسی پر بہتان لگاتے ہوئے۔ میری عزت کو خاک میں ملا رہی ہے اور یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بات کر رہی ہے۔

عقیلہ خانم۔ میں تمہاری عزت کو خاک میں ملا رہی ہوں! تمہاری عزت ہے بھی۔ اے میرے پلو پر فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔ یہ تمہاری چہیتی بیگم صاحب ہی ہیں جو روشن اختر سے پینگ بڑھا رہی ہیں میری ماما نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

وزیر۔ مجھے نہ تمہارا اعتبار نہ تمہاری ماما کا۔

عقیلہ خانم۔ نہ ساری دنیا کا۔ معلوم ہوتا ہے تم اندھے ہوگئے ہو، یہ بھی نہ جانتے ہو کہ اس بات کا گھر گھر چرچا ہو رہا ہے۔

وزیر۔ اے ہے کیا بک رہی ہے۔ لالہ خانم نے اُس کو دیکھا تک تو ہے نہیں اور پینگ یوں ہی بڑھ گئے۔

عقیلہ خانم۔ خود تم نے دکھایا تم نے۔

وزیر۔ (چلاکر) میں نے!

عقیلہ خانم۔ ہاں ہاں تم نے! کیا میں نے دکھایا تھا۔ کیا بھول گئے پار سال کی بات۔ جب عید کے روز ہمارے محل کے پچھواڑے جشن منایا گیا تھا اور شہسواری کے کرتب ہوئے تھے اُس روز تم نے ہم سب کو اجازت دی تھی کہ محل کی منڈیر پر بیٹھکر تماشہ دیکھیں۔ اس روز روشن اختر نے گھوڑے پر بیٹھ کر وہ وہ بہادری دکھائی ہے کہ ساری خلقت دنگ رہ گئی تھی۔ بس اسی روز سے لالہ خانم کے دل پر اس کا سکہ بیٹھ گیا اور اس کے بعد اس نے اُسے محل میں بلا بھیجا۔ میں تو کہتی ہی تھی کہ تم بڈھے کھوسٹ ہوکر ایک جوان لڑکی سے شادی مت کرو اور اُسی کا یہ بھگتوان بھگتنا پڑا۔ ابھی کیا ہے اپنی بنو کے رنگ دیکھنا۔

وزیر۔ اچھا دور ہو جاؤ میرے سامنے سے جو کچھ تمہیں بکنا تھا بک چکیں۔ اب میرا دماغ مت کھاؤ۔ جاؤ مجھے اور کام بھی ہیں۔

عقیلہ۔ دور ہو میری بلا، دور ہو تمہاری چہیتی لالہ خانم۔ اس کا کالا منہ ہو نیلے ہاتھ پیر۔ (جاتی ہے)

وزیر۔ (اکیلے بیٹھ کر دل ہی دل میں) بڑھیا۔ بے کی زبان سے خدا بچائے قینچی کی طرح چلتی ہے تو کسی کو نہیں چھوڑتی۔ تمام دنیا کی بوڑھی عورتیں ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ وہ یہ چاہتی ہیں کہ اس دنیا میں جوان عورتوں کے لئے کوئی جگہ ہی نہ رہے۔ اور اگر کچھ جوان عورتیں رہ بھی جائیں تو اُن کے دل ان کے چہروں کی طرح بوڑھے ہو جائیں بھلا یہ بھی کوئی بات تھی۔ لالہ خانم ابھی لڑکی ہی تو ہے ذرا روشن اختر کی بہادری کی تعریف کردی ہوگی۔ آخر اس میں کیا برائی ہوگئی بس یہ لے اڑیں اور بات کا بتنگڑ بنا ڈالا۔ اگر اس کے دل پر روشن اختر کی بہادری کا سکہ بھی بیٹھ گیا ہے تو اس کو دور کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں باتوں باتوں میں کہہ دونگا کہ بھئی اس روز اس کا جن لوگوں سے مقابلہ ہوا تھا وہ سب کمزور اور بودے تھے اگر وہ اتنی سی بات پر گھمنڈ کریگا تو مجھ جیسے شورما کو غصہ آجائے گا اور ذرا سی دیر میں وہ دانت کھٹے کردونگا کہ کھائی پی سب بھول جائیں گے۔ اچھی بات ہے، میں ابھی لالہ خانم کی حویلی میں جاتا ہوں۔ (اٹھتا ہے)

عقیلہ۔ (دوبارہ آتے ہوئے) حضور والا۔ ذرا اس کنیز کو حکم دیتے جائیے کہ جناب آج خاصہ میں کیا تناول فرمائیں گے۔

وزیر۔ کیا تناول فرمائیں گے۔ یہ کیا زہر مار کرینگے۔ بخشو بی بلی خالہ چوہا لنڈورا

ہی بھلا۔ آج تمہاری باتوں ہی سے پیٹ بھر گیا۔

(وہ کمرے سے باہر جانا چاہتا ہے کہ اُس کا پاؤں سامنے پڑی ہوئی چھلنی پر پڑتا ہے۔ یکایک وہ اُچھل کر اُس کے گھٹنے پر آکر لگتی ہے جس سے سخت چوٹ آتی ہے وہ بلبلا کر گھٹنا سہلانے لگتا ہے اور غصہ سے بیتاب ہو کر عقیلہ کی طرف مخاطب ہو کر چلاتا ہے)

ہائے مار ڈالا۔ ارے کمبختو یہ چھلنی یہاں کیوں پڑی ہوئی ہے میرے دیوان خانہ میں اس کا کیا کام ہے؟

عقیلہ خانم۔ میری جانے جوتی کہ یہ چھلنی یہاں کیا کر رہی ہے۔ گالیاں اور الزام دینے کیلئے میں مل گئی ہوں اور مخمل کا شلوکہ پہننے کے لئے دوسرے ہیں۔ دُنیا سے انصاف اُٹھ گیا ہے۔

وزیر۔ ابے بھوندو کے بچے!

(بھوندو فراش باہر سے۔ جی حضور! کہتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے اور وزیر کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ عقیلہ بیگم زنان خانہ میں چلی جاتی ہے۔)

(غصہ میں) کیوں بے نمک حرام! میرے دیوانخانے میں چھلنی کا کیا کام۔

بھوندو۔ حجور۔ ہم آج جھاڑو بہاڑو دیوت رہویں تو کا دیکھت کہ دگڑو سہیں چھلنیا ہاتھ میں لئے تہارے کمرا میں ٹھاڑا ہے۔ یہ او ہو کی شرارت ہے ہمار ناہیں۔

وزیر۔ بلاؤ بدمعاش کو۔

(بھوندو جاتا ہے۔)

یا میرے اللہ، میرے دیوانخانہ میں سامیں تنگ آجاتے ہیں گویا میں اصطبل میں رہتا ہوں گھر میں نہیں۔ اس گھر میں سوائے اذیت اور پریشانی کے کچھ بھی نہیں۔

عقیلہ۔ ہاں کیوں نہیں۔ آرام تو اس گھر میں ملے گا جہاں لالہ خانم کا چاند سا مکھڑا ہوگا یہاں کانٹے ہیں۔ وہاں پھول ہیں پھر جاتے کیوں نہیں وہاں کیا میں نے روکا ہے۔

(بھوندو اپنے ساتھ سائیس کو لئے داخل ہوتا ہے۔)

وزیر۔ (غصہ سے بیتاب ہو کر) او دگڑو کے بچے، بتا تو تیرا یہاں کیا کام تھا کیا تو نے اسے بھی اصطبل ہی سمجھا ہے۔ بتا مردود! تو یہاں کیوں آیا تھا؟

دگڑو۔ ہم بھوندو بھیا سے آپوچھن آئے رہن کہ سرکار آج گھوڑوا پہ بیٹھب کہ ناہیں۔ بس یہے بات پوچھب اور جھٹ دینا ہم باہر نکی گئے۔

وزیر۔ تو پھر اپنی چھلنی کیوں ڈال گیا یہاں۔

دگڑو۔ ہم گھوڑوا کا دانہ پھٹک رہیں۔

وزیر۔ ابے گھوڑے کے بچے، دانہ پھٹکنے کیلئے یہی جگہ رہ گئی تھی۔

دگڑو۔ ناہیں سرکار ہمرے ہاتھ میں رہب تو بھولے سے چھوڑ گئب۔

وزیر۔ تو اُٹھانے کیوں نہیں آیا۔

دگڑو۔ دھیان ناہیں رہا کہ چھلنی کہاں بھولب، ہم اوہر وار ڈھونڈھت راہیں اور ہم نے چنوا کی ہتاری کو دو چار مکوا بھی مارب کہ بتا چھلنی کہاں ہے۔

وزیر۔ ہوں۔ اب آپ کا حافظہ اتنا کُند ہو گیا ہے کہ ذرا سی بات یاد نہیں رہتی۔ گیہوں کی روٹیاں لگ گئی ہیں مردود۔ رہ تو جا کمبخت — بھوندو! امین اللہ کو بلاؤ — ہاں ایک کوڑا ایک رسی اور دو چار چوکیداروں کو بھی لیتے آنا۔

(بھوندو جاتا ہے)

دگڑو۔ (کانپتے ہوئے اور روتے ہوئے) سرکار ہمری کسور ماف کرو۔ تمہری ہتاری کے صدکے اب کی بیر چھوڑ دیو، سرکار، تمہرے پاؤں پڑیں۔

وزیر۔ (غصے سے بیتاب ہو کر) چُپ مردود!

دگڑو۔ سرکار! ابکی بیر ہم تمہرے دوارے کدم رکھب تو ہمرا مانس چیل کوؤں کو کھلاؤ۔

وزیر۔ خاموش رہتا ہے یا دیتا ہوں لات۔

(امین اللہ داروغہ محل مع بھوندو اور چوکیداروں کے داخل ہوتا ہے۔)

(چوکیداروں سے) داروغہ کو پکڑ کر تھم سے باندھ دو۔ رسّی سے اچھی طرح جکڑ دو نمک حرام کو۔

(چوکیدار حکم کی تعمیل کرتے ہیں داروغہ کو پکڑ کر تھم سے باندھ دیتے ہیں۔ اگر تھم نہ ہو تو ہاتھ پاؤں رسّی سے جکڑ دیے جائیں لیکن اس طرح کہ وہ پیٹ لیٹا رہے؛ کوڑا لیکر اُدھیڑ دو کمبخت کو۔

(داروغہ پر کوڑے برسنے لگتے ہیں۔)

داروغہ۔ ارے سرکار میں مرا۔ خداوندا رحم کیجئے۔ حضور دہائی ہے آخر اس غلام کی کیا خطا ہے جو اس بے دردی سے کھال کھینچی جا رہی ہے۔

وزیر۔ میرے دیوانخانے میں چھلنی کیوں آئی؟

داروغہ۔ کیسی چھلنی حضور!

وزیر۔ جب خوب مرمت ہو جائیگی تو معلوم ہو جائے گا کہ چھلنی کیسی ہوتی ہے۔

(کوڑے پڑ رہے ہیں۔)

داروغہ:۔ آہ! میں حضور پر سے صدقے ہو کر مرجاؤں۔ آہ! میرا چمڑا سرکار کی جوتیوں کے کام آئے۔ حضور رحم کیجئے۔ پہلے یہ تو بتا دیجئے کہ میں نے کونسا جرم کیا ہو۔ یہ سزا مجھے کیوں دی جارہی ہے؟ للہ اتنا بتا دیجئے پھر مجھے مار بھی ڈالئے تو بھی میں اُف نہ کروں گا۔

وزیر:۔ ٹھہر جاؤ۔ امین اللہ! کیا یہ تمہارا فرض نہیں ہے کہ ڈیوڑھی کے نوکروں کی نگرانی کرو۔ اور دیکھو کہ وہ کام ٹھیک کرتے ہیں یا نہیں؟

داروغہ:۔ جی حضور اس غلام کا یہی فرض ہے۔

وزیر:۔ ہاں تو تمہارا جرم یہ ہے کہ تم نے اپنا فرض پوری طرح ادا نہیں کیا کیونکہ نوکروں کو اب تک یہ نہیں معلوم کہ انہیں کیا کام کرنا ہے اور کہاں کرنا ہے۔ کیا یہی تمہاری نگرانی ہے کہ سائیس اپنے اصطبل کو چھوڑ کر میرے دیوانخانہ میں بیٹھکر دانہ پھٹکیں اور چھلنی یہیں رکھکر چلے جائیں اور میں اس پر قدم رکھوں اور وہ اُچھل کر میرے گھٹنے کو زخمی کردے۔ اے مردود! مجھے ساری مملکت کا انتظام کرنا ہے اور تجھ سے ایک گھر کا انتظام نہیں ہوسکتا۔۔!

داروغہ:۔ یہ تو خدا کی دین ہے۔ میں آپ کی سی عقل و تمیز کہاں سے لاؤں۔

وزیر:۔ یہ بات ہے۔ (چوکیداروں سے) مارو کمبخت کو۔ لے یہ بھی خدا کی دین ہے۔

داروغہ:۔ ائے ائے رحم کرو۔ کیا میری جان لوگے۔ میں کہہ تو رہا ہوں کہ اب کبھی ایسا نہ ہوگا۔

وزیر:۔ اچھی بات ہے۔ جاؤ ہم نے معاف کیا۔ امین اللہ! دیکھو اگر کبھی میرے دیوان خانے میں چھلنی آئی تو تمہارا حشر بہت بُرا ہوگا۔ یاد رکھو۔

داروغہ:۔ مجال کیا کہ اب کچھ بھی آپکی مرضی کے خلاف ہو۔

وزیر:۔ جاؤ۔

وگڑو:۔ ایشور کی دیا۔

(اپنی چھلنی لے کر بھاگتا ہے دوسرے لوگ اس کے پیچھے روانہ ہوتے ہیں۔)

دوسرا ایکٹ

(لالہ خانم کی حویلی میں۔)

روشن اختر:۔ (دریا خاتون کے سامنے کھڑے ہوئے) آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا میں مرگیا ہوں جو تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف کسی دوسرے سے بیاہا جارہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عاقل خاں کو نواب سے رشتہ جوڑ کر کیا فائدہ ہوگا۔

دریا خانم:۔ کیوں نہیں؟ عزت! دولت اور حکومت میں اضافہ ہوگا۔

روشن اختر:۔ اب اُس کے گھر میں کس بات کی کمی ہے کیا وہ نواب کی ناک کا بال نہیں بنا ہُوا ہے؟

دریا خانم:۔ دولت کی ہوس مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑتی اور بے زبان لڑکیاں دولت اور حکومت کو بڑھانے کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ لچھمی کی دیوی ہماری بھینٹ لیکر خوش ہوتی ہے۔

روشن اختر:۔ اس نشہ نے اُس کو اندھا کر دیا ہے لیکن اُسے معلوم نہیں کہ نواب دوسروں کے معاملہ میں موم ہے۔ اور اپنے رشتہ داروں کے معاملہ میں پتھر۔ تم نے مجھے قسم دیکر بے دست و پا بنا دیا ہے۔ ورنہ میں اس رستے کی دیوار کو ٹھوکر مار کر گرا چکا ہوتا۔ خیر کل ہی دیکھ لونگا۔

دریا خانم:۔ ہے ہے خُدا کے لئے اتنی جلدی نہ کرو۔ تم جس طرح اب تک خاموش رہے ہو اُسی طرح اب بھی رہو۔ ورنہ دشمنوں پر نہ معلوم کیا مصیبت آجائیگی سب کچھ معلوم ہے پھر بھی اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتے ہو۔ نواب خود تمہارا دشمن ہے وہ چھری کو پاتا ہے تو تم کو نہیں پاتا ہے اور تم کو پاتا ہے تو چھری کو نہیں۔ اب جو پہل تمہاری طرف سے ہوگی تو وہ کیا کچھ ظلم نہ کریگا اور عاقل خاں زہر بھڑکانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے گا۔

روشن اختر:۔ کیا نواب نے اب بھی کوئی کسر اُٹھا رکھی ہے۔ میرے مرحوم ابا جان کو زہر دے چکا ہے اور میرا تاج و تخت دبائے بیٹھا ہے۔ اب میرے پاس رکھا ہی کیا ہے جو لے گا۔۔۔ لیکن اس اکیلی جان کا خدا مالک ہے انسان کچھ نہیں کر سکتا۔

دریا خانم:۔ تم اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہو۔ وہ تو کہیے کہ ساری خلقت تم پر اپنی جان نثار کرتی ہے اس لئے وہ تم پر ہاتھ نہیں ڈالتا ورنہ۔۔۔۔۔۔۔

روشن اختر:۔ اس کی کیا مجال ہے کہ وہ میری طرف ٹیڑھی نگاہ بھی کر سکے۔ اُسی وقت سارے ٹمبکٹو میں غدر ہو جائے گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ عاقل خاں مجھ سے کیوں جلتا ہے۔

دریا خانم:۔ تم شیر علی کو نوکر جو رکھے ہوئے ہو اور شیر علی ٹمبکٹو کی گدی کا قدیمی نمکخوار ہے۔ کیونکہ اس کا باپ خدا بخشے بڑے نواب صاحب کا وزیر تھا۔ اور اگر تم نواب ہوگئے تو تم شیر علی کو وزیر بناؤ گے یا عاقل خاں کو؟ اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ شیر علی جلاوطن کرا دیا جائے۔

روشن اختر:۔ شیر علی جلاوطن کرا دیا جائے۔ ائے وہ منہ دھو رکھے، اگر کسی نے اس کی طرف ذرا سا اشارہ بھی کیا تو کلیجہ چیر ڈالونگا۔ میرا مددگار خدا ہے۔

اس نکھرام کو اس کا مزہ نہ چکھایا تو بات ہی کیا ہوئی۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ ابھی سر اٹھانے کا وقت نہیں آیا۔ ہاں یہ تو بتاؤ لالہ باجی کہاں ہیں مجھے اُن سے کچھ پوچھنا ہے۔

دریا خانم:۔ اماں جان کی حویلی میں ہونگی۔

روشن اختر:۔ ذرا ان کو بھیج تو دو۔

دریا خانم:۔ چلو ہم تم دونوں چلتے ہیں کیونکہ اماں جان آج حمام کر رہی ہونگی

(دونوں جاتے ہیں۔)

سین

(لالہ خانم کی حویلی)

عقیلہ بیگم:۔ (داخل ہوتے ہوئے) اب میری ماما کو بھی ستانے لگی۔ یا اللہ مجھے اس گھر میں اتنا تنگ کیا جاتا ہے کہ اب میرے پاس نوکر بھی نہ رہے۔

(وہ دیکھتی ہے کہ لالہ خانم کا کمرہ خالی ہے اس لئے وہ چاروں طرف جھانکتی ہے۔) مردار کہیں گئی ہوئی ہے۔ نہیں تو اس وقت دو دو باتیں کرتی۔ (روشن اختر کی آواز باہر سے آتی ہے۔) لے ہے یہ کیا ہوا۔ یہ موا کون گھسا آتا ہے۔ ارے میں کیا کروں۔ (گھبرا کر) نگوڑی میں یہاں کیوں آگئی۔ اوئی ہوئی ہوئی وہ تو سر پر آگیا میں کہاں جا کر چھپوں۔

(وہ گھبرائی گھبرائی چاروں طرف پھرتی ہے اور آخرکار پردے کے پیچھے جا کر چھپ جاتی ہے۔ روشن اختر اور لالہ خانم داخل ہوتے ہیں۔)

روشن اختر:۔ واللہ کیا مصیبت کا سامنا ہے۔ ذرا قدم ہی رکھا تھا کہ آپ کی والدہ حمام سے اچانک نمودار ہوگئیں۔ خدا نے خیر کرلی ورنہ آج سامنا ہو ہی گیا ہوتا۔ بات کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ یہاں تو امن ملے گا۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ میری بدقسمتی یہاں بھی رنگ لائے اور وزیر صاحب داخل ہو جائیں۔

لالہ خانم:۔ بھیا اطمینان رکھو۔ وہ آج یہاں کا رُخ بھی نہ کرینگے۔

روشن اختر:۔ کیوں؟

لالہ خانم:۔ کیونکہ آج عقیلہ بیگم کی باری ہے اور وہ اسکی زبان درازی سے اتنا ڈرتے ہیں کہ بلی کے سامنے چوہا۔

روشن اختر:۔ اگر یہی سبب ہے تو معاف کیجئے میں جاتا ہوں کیونکہ آپکے شوہر کو اپنا ارادہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کیا معلوم وہ کس وقت نازل ہو جائیں۔

لالہ خانم:۔ میں نے دریا بیگم کو غلام گردش میں بٹھا دیا ہے جس وقت وہ آئینگے ہمیں فوراً اطلاع ہو جائیگی۔ لیکن تم اتنا ڈرتے کیوں ہو؟

روشن اختر:۔ میں ڈرنے کیوں لگا۔ ہاں اس وقت مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ کی فضول بدنامی ہو اور مفت میں یہ خبر نواب کے کانوں تک پہونچے۔ مجھے ابھی بہت کچھ تیاریاں کرنی ہیں۔

لالہ خانم:۔ اچھی بات ہے۔

(دریا خاتون گھبرائی ہوئی آتی ہے)

دریا خانم:۔ ہے ہے غضب ہوگیا۔ وزیر دولہ بھائی آگئے۔

(لالہ دروازہ پر جا کر جھانکتی ہے)

لالہ خانم:۔ لے میرے مولیٰ مدد! وہ تو سیدھے ادھر ہی آرہے ہیں۔ ہے ہے اب کیا کروں۔ روشن اختر تمہیں کہاں چھپاؤں۔

روشن اختر:۔ بڑی مشکل ہے۔ کیا کروں۔ معلوم ہوتا ہے وزیر کو کسی نے خبر دی ہے۔ اس وقت مل جائے تو اس کا تکہ بوٹی کر ڈالوں۔

لالہ خانم:۔ بھائی یہ موقع غصہ کا نہیں ہے۔ چلو چلو۔ اس پردے کے پیچھے۔ چلو جلدی۔ پھر میں اُن کو کسی بہانے سے ٹالتی ہوں۔

(روشن اختر گھبرا کر پردے کے پیچھے چلا جاتا ہے)

(وزیر داخل ہوتا ہے)

وزیر:۔ (لنگڑاتا ہوا آتا ہے۔ اس کے پیچھے وحید خاں خزانچی بھی ہے) لالہ خاتون کیا کر رہی ہو۔ نصیبِ دشمناں مزاج کیسا ہے؟

لالہ خانم:۔ خدا کا شکر ہے اچھی ہوں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے مگر اس وقت کیسے تشریف لے آئے۔ ارے یہ لنگڑاتے کیوں ہیں۔ آپ کو میری جان کی قسم بتائیے کیا بات ہوئی۔

وزیر:۔ ارے کچھ نہ پوچھو۔ آج میرے اوپر صبح ہی صبح وہ مصیبت پڑی ہے کہ عمر بھر یاد رہے گی۔ دن اس طرح کٹ رہے ہیں کہ خدا یاد آتا ہے ـــــ وحید ہم چائے پئیں گے۔

(وحید آداب بجا لا کر چائے لینے جاتا ہے)

لالہ خانم:۔ تو تشریف رکھیے۔ کھڑے کھڑے تھک جائیں گے۔ اب بتائیے کیا ہوا جو اس قدر مایوس نظر آرہے ہیں۔ لیکن نہ کہئے آپ کو تکلیف ہوگی اور وقت بھی زیادہ لگے گا۔

وزیر:۔ نہیں، اتنا لمبا قصہ نہیں ہے۔ سُن ہی لو۔ واقعہ یوں ہوا کہ میں آج نواب صاحب کے دربار میں بیٹھا ہوا تھا۔ بہت سے اور اُمرا بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں روشن اختر کی بہادری کا قصہ بھی نکل آیا۔ وہ سب کہنے لگے کہ ساری سلطنت میں اس وقت اس کے جوڑ کا کوئی بہادر مشکل سے نکلے گا۔ یہ سنکر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے کہا کہ جناب۔ روشن اختر ابھی بچہ ہے۔ اُس کے دودھ کے دانت بھی ابھی نہیں ٹوٹے ہیں۔ اس روز عید کے جشن کے موقع پر اُس نے جن بہادروں کو پچھاڑا وہ سب کے سب سیپ لگے ہوئے مجلے تھے۔ ان میں کوئی بھی دل گردہ کا آدمی نہ تھا۔ میرا یہ بیان سُنکر سب

دنگ رہ گئے اور کہنے لگے " اس کا ثبوت کیا ہے؟" میں نے خم ٹھونک کر کہا کہ میں پچاس سال کا بڈھا ہوں لیکن اب بھی اتنا دم رکھتا ہوں کہ اس کو اکھاڑے میں چاروں شانے چت نہ کروں تو میرا ذمہ۔ نواب صاحب یہ سُنکر اچھل پڑے اور کہنے لگے کہ بھئی اسی وقت اس بات کا فیصلہ ہو جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات، مجھے خم ٹھونک کر کھڑا ہی ہونا پڑا جب روشن اختر نے یہ دیکھا کہ اب یہ بلا سر ہی پر منڈلا رہی ہے تو وہ بھی اکھاڑے میں آن کودا۔ میں کہنے کو تو یہ بات کہہ گیا تھا لیکن اندر سے دل دھک دھک کر رہا تھا کہ خدایا تو ہی آبرو رکھنا۔ لیکن واہ رے اس کی شان۔ اس وقت میں اکھاڑے میں ایک مست ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا اور روشن اختر میرے مقابلے میں گتے کا پونڈا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اللہ کر کے جو زور لگایا ہے تو میاں چت پڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں اور بتیسی بند ہو گئی تھی۔ آدھ گھنٹے کے بعد آنکھیں کھولی ہیں تب لوگوں کو یقین ہوا کہ جان سلامت ہے ورنہ آج اُن کا خاتمہ ہی ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں نے ایک تنکے کو اُٹھا کر پھینک دیا ہے۔ لیکن بعد کو ذرا کمر میں درد محسوس ہونے لگا اسی وجہ سے چلنے پھرنے میں تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ ارے بھئی اتنے بڑے جوان کو اُٹھا پھینکنا کوئی کھیل نہیں ہے۔

لالہ خاتون۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) اوہو تو یہ کہئے کہ آج آپ رستم بن گئے تھے۔ ہے ہے اگر خدانخواستہ وہ لڑکا مر جاتا تو اُس کی میا کے کلیجے سے کیسی ہوا اُٹھتی۔

وزیر۔ ہاں جی بڑی خیر ہو گئی۔ لیکن لڑائی میں تو ایک نہ ایک دن یہ ہوتا ہی ہے اس میں میرا کیا قصور تھا۔

لالہ خانم۔ اچھا یہ تو بتایئے کہ وہ لڑکا یونہی زمین پر پڑا رہا اور آپ اپنی فتح کے نقارے بجاتے ہوئے یہاں تشریف لے آئے؟

وزیر۔ نہیں، خدام اس کو پالکی میں ڈال کر اس کی والدہ کے محل میں پہونچا آئے ہیں۔

(یہ سُنکر روشن اختر سے ضبط نہ ہو سکا اور بے اختیار اُس کے منہ سے قہقہہ کی آواز نکل جاتی ہے' وزیر غصہ سے بل کھاتا ہوا اُٹھتا ہے اور پردے کے پاس جاتا ہے' پردہ کو ہٹانے کے بعد اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب وہ عقیلہ بیگم اور روشن اختر کو ایک ہی جگہ کھڑا ہوا پاتا ہے۔ لالہ خاتون یہ دیکھکر کہ عقیلہ بیگم بھی وہیں موجود ہے، گھبرا جاتی ہے۔)

بارِ الٰہ میں اپنی آنکھوں سے یہ کیا دیکھ رہا ہوں (روشن اختر کو ڈانٹ کر) ارے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں ہوش نہیں کہ یہ میرا محل ہے۔ بولو تم کس ارادے سے آئے ہو؟

(روشن اختر کوئی جواب نہیں دیتا، سر نیچا کئے ہوئے وہ پردے سے باہر آتا ہے اور باہر جانے کے لئے دروازے تک پہونچتا ہے کہ وزیر اُس کا شانہ پکڑ لیتا ہے۔)

تم آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے۔ تمہیں بتانا ہوگا کہ تم یہاں کیوں آئے؟

روشن اختر۔ (اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے) مجھے جانے دیجئے۔

وزیر۔ (پکڑتے ہوئے) ہرگز نہیں۔

(روشن اختر ایک جھٹکا دیتا ہے پھر اُس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اُس کو زمین سے اُٹھا کر پھر زمین پر ہی دے پٹکتا ہے اور خود کمرے سے نکل جاتا ہے۔ وزیر کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور عقیلہ بیگم پر برسنے لگتا ہے۔)

مُردار! یہ تو نے کیوں قیامت جوتی ہے۔

عقیلہ بیگم۔ میں نے کیا قیامت جوتی ہے؟ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے اب بھی تمہاری آنکھوں پر سے پردے نہ اُٹھیں تو میں کیا کروں کیا نظر نہیں آتا کہ ان باتوں کا کیا مطلب ہے۔

وزیر۔ چُپ رہ گستاخ! اپنا عیب دوسروں کے سر تھوپتی ہے۔ بڑھاپے میں تیرے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ دیکھ تو تجھے کیسی سزا دیتا ہوں۔

عقیلہ بیگم۔ ہے ہے مجھے مجبور اور بیکس سمجھ کر دبا لیا ہے وہی مثل ہوئی کہ گدھے سے بس نہ چلے اور گدھیا کے کان امیٹھیں۔ میں نے کیا کیا ہے جس کی سزا مجھے ملے گی۔

وزیر۔ ارے اس سے زیادہ تو اور کیا کرے گی۔ آنکھوں میں دھول ڈال رہی ہے!

عقیلہ بیگم۔ اے میں آنکھوں میں دھول ڈال رہی ہوں یا تمہاری لالہ خاتون! ذرا اس سے پوچھو تو ایک غیر مردوا اس کے کمرے میں کیوں آیا؟

وزیر۔ بے شرمی کی انتہا ہو گئی پہلے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی کہ تو ایک غیر مرد کے ساتھ پردہ کے پیچھے کیوں کھڑی ہوئی تھی۔

عقیلہ بیگم۔ بہت بہتر۔ میں اپنی ہی صفائی پیش کرتی ہوں۔ آج تمہاری چہیتی بیگم نے میری ماما کو خواہ مخواہ بُرا بھلا کہا جب میں نے یہ سُنا تو میں سیدھی انکے کمرے کی طرف آئی کہ اُن سے پوچھوں کہ اُن کے مُنہ میں کے دانت ہیں! اور یہ اس کو صلواتیں سنانے والی ہوتی کون ہیں۔ کیا وہ ان کا نمک کھاتی ہے یا میرا۔ کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔ خیر جب میں یہاں آئی تو میں نے کمرہ خالی پایا میں جانے کو مڑی ہی تھی کہ میں نے ان کو ایک اجنبی مردوے کے ساتھ باتیں

کرتے ہوئے اُس طرف آتے دیکھا۔ مجھے پردہ اپنی جان سے زیادہ پیارا ہے کیا کرتی گھبرا کر اس پردے کے پیچھے چھپ گئی۔ میں تو تم سے خود ہی جا کر رتی رتی حال کہنے والی تھی کہ تم خود ہی آ گئے مگر وہ نگوڑا بھی تمہیں دیکھ کر اسی پردے کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

وزیر:۔ اگر یہ واقعہ سچ ہے تو تم نے فوراً ہی پردے سے باہر نکل کر مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی؟

عقیلہ بیگم:۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا بس چلتا تو میں یوں ہی خاموش کھڑی رہتی۔ ارے اس موئے نے میرے گلے پر چھری رکھدی تھی کہ اگر ادھر میرے منہ سے آواز نکلتی اور اُدھر وہ میرا کام تمام کر دیتا

وزیر:۔ لالہ خاتون! سچ سچ بتاؤ یہ مردود تمہارے پاس آیا تھا؟

لالہ خانم:۔ یہ تمہاری بڑھیا بیوی بڈھی طوطی کی طرح زبان دراز ہو گئی ہے جو جی میں آتا ہے بک دیتی ہے۔ میں کیا جانوں وہ ناٹھا کون تھا اور کس کے پاس آیا تھا؟

وزیر:۔ ارے کیوں جھوٹ بولتی ہو؟ کیا تم نے روشن اختر کو کبھی نہیں دیکھا؟ مجھے معلوم ہے کہ تم اس کو اچھی طرح جانتی ہو۔

لالہ خانم:۔ روشن اختر! وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے؟ کیا یہ وہی روشن اختر تھا جسے تم نے ابھی ابھی نواب صاحب کے سامنے چاروں شانے چت کیا تھا اور خدام اُسے پالکی میں ڈالکر اس کی ماں کے گھر لے گئے تھے؟

وزیر:۔ تم بھی فضول باتیں کرنا سیکھ گئی ہو۔ میں جو پوچھتا ہوں وہ بتاؤ کہ روشن اختر تمہارے پاس آیا تھا یا نہیں؟

لالہ خانم:۔ نہیں! نہیں!! نہیں!!! اگر وہ مجھ سے ملنے آتا تو اس وقت پردے کے پیچھے عقیلہ بیگم کے بجائے میں کھڑی ہوئی ہوتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ عقیلہ خانم کو معلوم تھا کہ آج میں حمام جا رہی ہوں اور میرا کمرہ خالی رہے گا اس لئے وہ اس کو اپنے ساتھ یہاں لیتی آئیں اس کے سوا ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے محل میں آپ بھی آنے والے ہیں اس لئے اپنے کمرے میں بیٹھنا اُنکے لئے خطرناک بھی تھا لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ حمام میں پانی پورا گرم نہیں ہوا تھا اس لئے میں اُلٹے پاؤں واپس آ گئی اب ان کے لئے یہی علاج تھا کہ فوراً ہی پردے کے پیچھے چھپ جائیں اور جب نگاہ بچے تو فوراً نکل کر چلے جائیں سچی سچی بات تو یہ ہے میں کسی کا راز کھولنا نہیں چاہتی تھی لیکن آپ نے مجبور کیا ہے تو کہنا ہی پڑا۔

عقیلہ بیگم:۔ (دہائی دیکر) ہے ہے دہائی ہے۔ اے ستارہ تجھ پر آسمان پھٹ پڑے تجھ پر بجلی گرے۔ آہ میرے مولی میں کیسے اپنی بیگناہی ثابت کروں اور اس جھوٹی سے کس طرح پیش لے جاؤں۔ بس میں اپنی جان ہی دیدونگی۔

لالہ خانم:۔ جان دیدوگی تو کسی کا کیا کروگی۔ اس دھمکی سے ہم لوگ ڈرنے والے نہیں ہیں۔ تمہارے شوہر کو اللہ نے آنکھیں دی ہیں وہ خود جانتے ہیں کہ تم کیسی ہو اور میں کیسی ہوں۔

عقیلہ بیگم:۔ ہے ہے انصاف دُنیا سے اُٹھ گیا۔ اے اللہ! میں کیا کروں! یا اللہ مجھے موت آ جائے تاکہ میں اس بدنامی سے بچوں۔ جب میرا شوہر ہی مجھے اس طرح رسوا کر رہا ہے تو میں کسی دوسرے کو کیا الزام دوں۔ ہوتا کوئی دوسرا مرد تو اس تہمت رکھنے والی کا منہ طمانچوں سے لال کر دیتا۔

لالہ خانم:۔ میرا منہ کیوں لال کرتا۔ اسے غیرت ہوگی تو تیری بوٹیاں چیل کووں کو کھلا دیگے۔ تو نے ایسا کام کیا ہے کہ سر اُٹھانے کی جگہ نہ چھوڑی۔

وزیر:۔ (عقیلہ سے) حق تو یہ ہے کہ تجھے زندہ دفن کر دیا جائے۔ خیر اس کا فیصلہ بعد کو کیا جائے گا۔ لیکن سب سے پہلے میں نواب صاحب کے محل پر جا کر فریاد کرتا ہوں کہ وہ اپنے بھتیجے صاحب کے رنگ ملاحظہ کریں۔ رہ گیا تمہارا معاملہ تو تم جھوٹ بولنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

عقیلہ بیگم:۔ خیر چلو، میں جھوٹی سہی۔ تم دونوں سچ کے پتلے ہو۔ تمہاری حقیقت اُسی وقت ظاہر ہو گئی جب آپ اپنی بہادری کا قصہ سنا رہے تھے ــــ واہ رے رستم۔

وزیر:۔ خبردار جو اب بولی۔ دُور ہو یہاں سے۔

(عقیلہ جاتی ہے وہ اس کے جانے تک انتظار کرتا ہے اس کے بعد لالہ خاتون کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔)

وزیر:۔ لالہ! اب سچ سچ بتادو۔

لالہ خانم:۔ تمہاری سہتی ہی کھاؤں اگر جھوٹ بولتی ہوں۔ میں اس پاک پروردگار کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

(اُسی وقت وحید خاں چار کی کشتی اُٹھائے ہوئے لاتا ہے اور چار کی پیالی تیار کر کے وزیر کی پشت پر سے کہتا ہے)

وحید:۔ حضور والا! چار حاضر ہے۔

وزیر:۔ (مڑتا ہے اس کی وجہ سے وحید کے ہاتھ سے چار کی پیالی گر پڑتی ہے) گدھے! نکل جا یہاں سے۔ میرا سر چکر کھا رہا ہے اور ایسے موقع پر میں چار پیونگا؟ میں نواب کے حضور میں جا رہا ہوں کہ اس معاملہ کا فیصلہ ہو جائے۔ ادھر یا اُدھر۔ (وحید اپنے کپڑے پونچھ رہا ہے) دیکھو جلدی جاؤ اور میرا کالا لبادہ اور سُرخ گھوڑا ــــ اوہ سُرخ لبادہ ــــ خیر جو مناسب سمجھو لیتے آؤ۔ ہوا کی طرح جاؤ اور آؤ۔ سُنا۔

وحید:۔ جی ہاں حضور۔ ابھی تعمیل حکم کرتا ہوں۔

(وحید جاتا ہے اُسکے جانیکے بعد وزیر بھی لنگڑاتا ہوا جاتا ہے)

لالہ خانم:- مولیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، کہ تو نے آبرو رکھ لی۔ (دریا خاتون داخل ہوتی ہے۔) دریا! غضب ہو گیا تمہارے دولہا بھائی نے روشن اختر کو عقیلہ بیگم کے ساتھ پردے کے پیچھے کھڑا دیکھ لیا۔

دریا:- اے ہٹئے، بھلا ان کو عقیلہ بیگم سے کیا واسطہ۔

لالہ خانم:- مجھے نہیں معلوم کہ عقیلہ بیگم کس وقت میرے کمرے میں پردے کے پیچھے جاکر چھپ گئی۔ خیر آج اُسی کی وجہ سے میری آبرو رہ گئی۔ جو دوسروں کے لئے کانٹے بوتا ہے وہی اُن میں اُلجھتا بھی ہے جو لوگ تمام دُنیا کو خراب اور خود کو اچھا خیال کرتے ہیں خُدا اُن کو یوں ہی ذلیل کرتا ہے۔ لیکن اب روشن اختر کی خیر مناؤ، نواب اسکی جان کا یوں ہی لاگو ہو رہا ہے اب یہ سُنکر تو وہ آگ بگولہ ہی ہو جائیگا۔ کہیں کچھ کر نہ بیٹھے۔

دریا:- باجی! مجھے کوئی ڈر نہیں ہے نواب اُن کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اللہ میں سب قدرت ہے۔ وہی مظلوموں اور بیکسوں کا مددگار ہے۔ (بہن کے گلے میں بانہیں ڈال کر) جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ چلئے اماں جان طلب کرتی ہیں وہاں جاکر ہم وحید خاں کو نواب کے محل کی طرف دوڑا دینگے۔ وہ ہمیں سب باتوں سے اطلاع دے گا کہ ان دونوں میں کیا کیا مشورے ہوتے۔

(دونوں جاتی ہیں)

تیسرا ایکٹ

ٹمبکٹو کے نواب کا دربار۔ دریا کے کنارے محل میں۔

مرزا شہرت ہاتھ میں عصا لئے ہوتے۔ سیدی جعفر اور مرزا برکت ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے ہیں۔ نواب صاحب کرسی عدالت پر رونق افروز ہیں۔

نواب:- آج مطلع صاف معلوم ہوتا ہے۔

مرزا برکت:- عالیجاہ! برکھا کے ڈیرے جا رہے ہیں۔

نواب:- تو پھر آج چاندنی کا جشن منائیں۔

مرزا برکت:- دریا کے کنارے۔

نواب:- بجرے میں۔

مرزا برکت:- رقص و سرود کے ساتھ۔

نواب:- ماہتاب اور دریا کی چھیڑ چھاڑ سے لطف اُٹھائیں۔

مرزا برکت:- بسروچشم۔ (جاتا ہے)

نواب:- عرض بیگی! فریادیوں کو حاضر کرو۔

مرزا شہرت:- حضور کا نیر اقبال درخشندہ رہے —— سیدی جعفر! فریادیوں کو باری باری سے حاضر کرو۔

(سیدی جعفر دو آدمیوں کو حاضر کرتا ہے اور آداب بجالاکر خود سامنے دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے —)

فریادی:- حضور کے جان و مال سلامت رہیں۔ کمترین ایک فریاد لایا ہے۔

نواب:- عرض کرو۔

فریادی:- خداوند! آج صبح کو یہ فدوی اپنے گھوڑے کو دریا کنارے پانی پلانے کے لئے لے گیا۔ شومئ قسمت سے اس عاجز کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام چھوٹ گئی اور جانور طرارے بھرتا ہوا فدوی کی آنکھوں کے سامنے سے نکلا چلا گیا۔ یہ مجبور سوائے ہاتھ ملنے کے اور کیا کر سکتا تھا۔ ناگاہ سامنے سے یہ شخص (دوسرے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوتے) نظر آیا۔ بارے اس لاچار نے خیال کیا کہ انسان کا کام مصیبت میں ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے، اس لئے تکلف کو بالائے طاق رکھکر اس کمترین نے "نعرہ مدد" بلند کیا۔ اور اس مرد خدا سے چلا کر کہا کہ — بھائی! تجھے واسطہ خدا، ذرا اس گھوڑے کے رُخ کو پھیر دے —— بموجب اس فریاد کے یہ شخص زمین پر جھکا، ایک پتھر اُٹھایا اور جانور کی طرف کھینچ مارا۔ آہ! پتھر کا لگنا تھا کہ بدنصیب گھوڑا یکبارگی رُک گیا کیونکہ اُس کی داہنی آنکھ پتھر کی ضرب کاری سے زخمی ہو چکی تھی۔ اب یہ جانور ایک آنکھ کا ہو گیا ہے اس لئے اُسکے مالک کے لئے منحوس بھی ہے اور بیکار بھی —— یہ کمترین فریاد کرتا ہے کہ از روئے انصاف اس گھوڑے کی قیمت دلوائی جائے۔ تاکہ حضور کا نام نوشیروانِ عادل کے نام سے سبقت لے جائے۔

نواب:- (دوسرے شخص کی طرف دیکھکر) تم کو اس بارے میں کچھ کہنا ہے۔

مدعا الیہ:- حضور جو کچھ اس شخص نے بیان کیا سب سچ ہے۔ لیکن یہ کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ میں نے جان بوجھ کر اسکے گھوڑے کو کانا کر دیا۔ میں تو اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

نواب:- بکومت۔ نیت کا علم سوائے خدا کے کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ قانون ظاہری باتوں کا فیصلہ کر سکتا ہے اندرونی باتوں کا نہیں۔ جہاں تک کہ واقعات کا تعلق ہے تم مجرم ثابت ہوتے ہو کیونکہ تمہارا جھکنا، پتھر اُٹھانا اور اس کو گھوڑے کی طرف رُخ کرکے پھینکنا ظاہر کرتا ہے کہ تم جانور کو ضرب شدید پہونچانا چاہتے تھے۔ وگرنہ پتھر میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ خود بخود اُٹھکر گھوڑے کی آنکھ کو زخمی کر دے —— کیا تمہارے پاس بھی گھوڑا ہے؟

مدعا الیہ:- ہے خداوند!

نواب۔ (فریادی سے) تم جاؤ اور اس کے گھوڑے کی داہنی آنکھ پھوڑ دو۔ یہی انصاف کا تقاضہ ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت دیا جائے۔ کوتوال! اپنے دو پیادوں کو اس شخص کے مکان پر تعینات کر دو تاکہ انکے سامنے ہی اس کے گھوڑے کی آنکھ پھوڑ دی جائے۔

(کوتوال از روئے تعظیم جھکتا ہے۔ دو پیادوں کو فریادی کے ساتھ جانے کا حکم دیکر واپس آتا ہے۔)

مرزا بیگ۔ سیدی جعفر! دوسرے فریادیوں کو حاضر کرو۔

(سیدی جعفر دو آدمیوں کو حاضر کرتا ہے)

فریادی۔ حجور کا ترکی ہو۔ اَچھا ایک پھریاد آ ہے۔

نواب۔ کہو!

فریادی۔ حجور اَچھا بھائی دُکھی ہَوا تو ہم آدمی لوگ سے پوچھا کہ تمہے دیس میں دوا دارو کون کرتا آ ہے۔ اُن لوگ نے ہمارے کو یہ حکیم (دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کا پتہ بتلائے۔ ہم ان کے پاس جاکو بولا کہ تم ہمارے گھر چلنے سکتا ہے۔ یہ بولا کہ ہم تین روپئے پھیس لیتا ہے۔ ہم جھٹ سے کھیسہ تپاس کو تین روپیہ نکالا اور اس کے ہاتھ اُپّر رکھدیا۔ یہ اچھے بھائی کو تپاس تپوس بولا کہ ہم اس کا پھسد کھولیگا۔ ہم بولا تمہارا جو مرجی۔ یہ کھیسہ میں سے چھرا نکالا اور ہمارے بھائی کے پیٹ پہ رکھکر کھوب ٹونچے مارا۔ ہم دیکھا کہ جیسے کھول کا پھوارہ چھوٹ گیا پن اِدھر کھون نکلتا تھا اور اُدھر ہمارے بھائی کا جان نکلتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہمارا بھائی مرگیا۔ ہمارے کو وہ گصہ چڑھا کہ وہی چھری سے اس حکیم کا جان لے لے پن ہم ٹھنڈا پڑا اور اس سے ارج کیا کہ "دیکھ بھائی! تو نے اُس کا جان لیا تو کھیر! پن ہمارے تین روپئے گپ چپ دیدے" پن یہ ہمارے سے مارا ماری کرنے کو لگا۔ اب آپ اس کا کچھ بھی مانڈوال کرو۔

نواب۔ (حکیم کی طرف متوجہ ہو کر) کیوں حکیم صاحب! کیا معاملہ ہے؟

حکیم۔ خداوند جل شانہ ہم سب پر اپنا رحم و کرم بحال رکھے (ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر) اور ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں لے —— ہم بندگانِ عاصی کی دلی دُعا ہے کہ یہ دُنیا امراض مہلکہ سے پاک صاف رہے تاکہ اس کے بندے تندرست رہیں۔

نواب۔ مختصر ارشاد فرمایئے۔ کیا آپنے اس شخص کے بھائی کی فصد کھولی؟

حکیم۔ جی ہاں حضور نواب صاحب! اسی احقر نے اس کے بھائی کی فصد کھولی ہے۔ اسی مریض پر کیا منحصر ہے۔ یہ احقر ہر مریض کا علاج فصد ہی کے ذریعے کیا کرتا ہے۔ اور دُنیا اس احقر کے کمال کا لوہا مانتی ہے۔ چھوٹا مُنہ بڑی بات ہوگی لیکن یہ احقر دعویٰ کر سکتا ہے کہ فصد کھولنے کے طریقے جیسے اس احقر نے ایجاد کئے ہیں ویسے روم، شام، فلسطین، فرنگستان، آمرستان جرمنستان ——،

نواب۔ خیر اپنی اس تان کو رہنے دیجئے۔ لیکن آپ کا کمال تو اسی سے ظاہر ہے کہ وہ مریض مرگیا۔

حکیم۔ حضور نواب صاحب قبلہ! حکیم کا کام علاج کرنا ہے اور خداوند جل شانہٗ کا کام شفا کلی مرحمت فرمانا۔ لیکن اتنا مجھے عرض کرنے کی اجازت مرحمت کیجئے کہ اگر یہ احقر مریض کی فصد نہ کھول دیتا تو مریض کی حالت اس سے بھی بدتر ہو جاتی۔ وہ تو کہئیے کہ خدا نے خیر کرلی اور یہ معاملہ صرف موت ہی پر ٹل گیا۔ کیا میں حضور کی سرکار سے انصاف طلب کر سکتا ہوں کہ اس احقر کو مریض کے وارثوں سے کچھ اور رقم دلوادی جائے تاکہ جتنی محنت احقر نے اس کام میں کی ہے اس کا صلہ مل جائے۔

نواب۔ (قہقہہ مار کر) حکیم صاحب! کیا آپ کے قانون میں موت سے زیادہ مہلک مرض بھی موجود ہے۔

حکیم۔ سرکار عالی۔ موت سے زیادہ مہلک مرض روپے کا خرچ ہے۔ یہ احقر دعوےٰ کرتا ہے کہ اگر احقر اس مریض کی فصد نہ کھولتا تو وہ کم از کم ایک سال اور زندہ رہتا اور اس کی دوا دارو کا خرچ اتنا ہوتا کہ اسکے بھائی کی کمر ٹوٹ جاتی۔ آہ دُنیا سے انصاف اُٹھ گیا ہے۔ احقر نے اس مریض کو ہلاک کر کے اسکے بھائی پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ......!

نواب۔ بار الٰہ (چاروں طرف دیکھکر) دُنیا کے جتنے پیچیدہ مقدمے ہوتے ہیں وہ سب تیری ہی عدالت میں آتے ہیں۔ عقل کام نہیں کرتی کہ اس کا فیصلہ کس طرح کیا جائے تاکہ قانون اور انصاف کا خون نہ ہو اور دونوں فریقین اس عدالت سے راضی خوشی جائیں۔

ایک درباری۔ حضور پر قربان ہو جاؤں —— سرکار! حکماء کا طبقہ خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اُن کی زندگی کا لمحہ لمحہ خلقِ خدا کی خدمت میں گذرتا ہے۔ اور پھر خاص طور سے یہ حکیم صاحب تو اپنے وقت کے بقراط و جالینوس ہیں۔ یہ غلام ان کے کمال کا معترف ہے۔ اس لئے مدعی کو حکم دیا جائے کہ وہ ان کی خدمت میں ایک بنارسی پگڑی اور جامہ وار کا لبادہ پیش کرے۔

نواب۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ اور اب تو جب تم سفارش کر رہے ہو تو میرے اُوپر فرض ہو گیا ہے کہ حکیم صاحب کے ساتھ انصاف کروں (مدعی سے) دیکھو جی! سنتے ہو —— ابھی جاکر حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں ایک بنارسی پگڑی اور جامہ وار کا لبادہ پیش کرو تاکہ وہ تم سے راضی رہیں خبردار! جو تم نے کسی حکیم کو ناراض کیا۔ مرزا برکت! ایک پیادے کو بلاکر

حکم دو کہ وہ اس آدمی کے ساتھ جاکر حکیم صاحب کے لئے پگڑی اور لبادہ وصول کرلے۔

(مرزا برکت حاضر ہوتا ہے۔ لیکن اسی موقع پر وزیر ہانپتا کانپتا دربار داخل ہوتا ہے اور نواب صاحب کے سامنے پہونچکر اپنا قلمدان جیب میں سے نکالکر سامنے فرش پر رکھ دیتا ہے۔)

وزیر:۔ حضور کے دوست سرسبز اور دشمن پامال ہوں اور خداوند کا نیرِ اقبال درخشندہ رہے۔ یہ قلمدانِ وزارت آپکے سپرد کرتا ہوں اور وزارت کی خدمات سے سبکدوشی چاہتا ہوں۔ مجھے میری خدمتوں کا صلہ مل چکا اب حضور جس کو جی چاہے وزیر بنادیں۔ میری قسمت کا پانسہ پلٹ چکا ہے اور اب میں اس آباد شہر سے جلاوطن ہوکر در در کی ٹھوکریں کھانا منظور کروں گا۔

نواب:۔ وزیر! کیوں کیوں! خیر تو ہے۔ آخر یہ ہوا کیا۔

وزیر:۔ حضور کا اقبال ہے کہ تمام سلطنت میں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ کسی غریب کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ لے لیکن خود آپ کے بھتیجے ہیں کہ کچھ نہ پوچھئے۔ وہ لوگوں کے دل دکھانے کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکی نظروں میں بادشاہ اور اس کے قانون کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ اب انتہا ہوگئی کہ انہوں نے مجھ تک کو نہ چھوڑا اور دن دہاڑے میرے محل میں داخل ہوکر میری بیگم کی عزت کے درپے ہوئے۔ آہ!

نواب:۔ ارے تم کیا کہہ رہے ہو وزیر، کیا روشن اختر نے ایسی جرأت کی؟

وزیر:۔ جی ہاں حضور۔ اگر میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں تو آبلہ نت میری رگوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلے۔ یہ سب کچھ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں ان کو آپ کے حضور میں لانا چاہتا تھا۔ مگر وہ مجھے دھکا دیکر بھاگ گئے۔

نواب:۔ مرزا شہرت! ابھی جاکر روشن اختر کو بلا لاؤ۔ دیکھو اس واقعہ کا کوئی ذکر نہ کرنا۔ (مرزا شہرت تعظیم بجالاتا ہے) وزیر! تم اطمینان رکھو میں اس کو ایسی سزا دونگا کہ جس سے تمام دنیا کو عبرت حاصل ہوگی۔

وزیر:۔ ملک آباد و دولت زیادہ۔ حضور نے اس وقت شاہانِ سلف کی آبرو رکھ لی۔ وہ حق اور انصاف کے معاملے میں اپنی اولاد تک کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ اسلامی تاریخ ان واقعات سے خالی نہیں ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنے ایک بڑے درباری کو محض اس قصور پر قتل کر دیا تھا کہ وہ ایک غریب آدمی کی بیوی کو بری نیت سے دیکھتا تھا۔ سلطان شیر شاہ سوری نے اپنے لڑکے کو سخت سزا دی تھی کیونکہ اُس نے ایک بیاہی لڑکی سے عشق جتایا تھا۔ خدا اُن کی پاک روحوں پر رحمت نازل کرے۔ وہ مرچکے ہیں لیکن اُن کے انصاف کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔

نواب:۔ وزیر! تم خود دیکھ لوگے کہ تمہارا نواب بھی سلطان محمود اور شیر شاہ سوری سے انصاف کے معاملے میں پیچھے نہیں رہیگا۔ اور خاص طور سے اس معاملہ میں۔ معاذاللہ۔

(مرزا شہرت اور نواب زادہ روشن اختر داخل ہوتے ہیں۔ تعظیم بجالاتے ہیں۔ نواب صاحب روشن اختر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔)

نواب:۔ کیا تمہیں اس بات کی ہدایت نہیں مل چکی ہے کہ تم میرے حضور میں تلوار کے ساتھ نہ آیا کرو؟

روشن اختر:۔ لیکن میرے پاس تو تلوار نہیں ہے۔

نواب:۔ خیر میں سمجھا کہ تمہارے پاس تلوار تھی۔ ہاں یہ تو فرمایئے کہ آپ وزیر صاحب کے محل میں کیوں تشریف لے گئے تھے۔ (روشن اختر سر جھکا لیتا ہے) ہوں! اب تو تجھے سارے زمانہ میں بدنام کریگا کہ نواب کے بھتیجے صاحب بلند اقبال کے یہ کرتوت ہیں۔ لیکن مجھے تم جیسے بھتیجوں کے ہونے سے نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ ہونے سے کوئی نقصان۔ (تالی بجاکر) کوئی ہے! شال لاؤ۔ (چار زنگی سپاہی ایک لمبی کشمیری شال لیکر آگے بڑھتے ہیں اور حکم کا انتظار کرتے ہیں۔) اس بدکردار کے گلے میں پھندا ڈال کر گرادو۔

(جوں ہی زنگی سپاہی شال لیکر آگے بڑھتے ہیں تاکہ بدقسمت نواب زادے کا گلا گھونٹ دیں۔ اسی وقت تمام دربار میں ہلچل مچ جاتی ہے اور گریہ وزاری کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔)

سب:۔ حضور خداوند — رحم! رحم! خدا کے واسطے اس کی جوانی پر ترس کھایئے۔

نواب:۔ قسم ہے اپنے جدامجد کی۔ میں کبھی معاف نہ کروں گا! — چلو شال اٹھاؤ۔

(زنگی سپاہی ذرا اور آگے بڑھتے ہیں۔ گریہ وزاری کی صدائیں اور بلند ہوتی ہیں اور تمام حاضرین خود کو فرش پر گراکر ہاتھ جوڑ جوڑ کر منت کرنے لگتے ہیں۔)

سب:۔ رحم! رحم! خداوند اپنا حکم واپس لیں! وہ اپنی ماں کا ایک ہی ہے حضور للہ معاف کر دیجئے۔ (روتے ہیں)

نواب:۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے تب بھی میں اپنا

حکم کو واپس نہیں لونگا۔ (درباریوں کی ہمدردی پر وہ غصہ سے بل کھانے لگتا ہے فراشوں کو ڈانٹ کر) نابکارو! بہرے ہو گئے ہو۔ میرے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کرتے۔

(ہاتھوں میں شال لپیٹ کر وہ آگے بڑھتے ہیں روشن اختر فوراً ہی اپنے ہاتھ پشت پر لے جاکر اپنی کمر سے پستول نکال لیتا ہے اور اس کا رخ آگے بڑھتے ہوئے سپاہیوں کی طرف کر دیتا ہے، وہ فوراً پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ روشن اختر ان آدمیوں کو جو اسے پکڑنے کے لئے بڑھتے ہیں دھکہ دیکر صاف نکل جاتا ہے۔)

نواب۔ خبردار! لینا۔ پکڑنا! گھیر کے مار لو کمبخت کو۔ (تمام لوگ ادھر ادھر دوڑنا شروع کرتے ہیں لیکن روشن اختر کا پیچھا کوئی نہیں کرتا۔) سب نمک حرام ہیں۔ آخر اسے پکڑا کیوں نہیں؟ (سب خاموش رہتے ہیں) مرزا شہرت! (مرزا شہرت آگے بڑھکر سامنے آتا ہے۔) جلدی کرو۔ اپنے ساتھ پچاس سوار لیکر روشن اختر کا تعاقب کرو اور دنیا میں جہاں ملے وہاں سے گرفتار کر کے لاؤ۔ میں جب تک اسے اپنے سامنے قتل نہ کرا لونگا اس وقت تک مجھ پر دانہ پانی سب حرام ہے!

مرزا شہرت۔ بسر و چشم! (باہر جاتا ہے)

نواب۔ (دربار کے امراء سے) دربار برخاست کیا جاتا ہے۔

(سب چلے جاتے ہیں۔)

مرزا برکت! (مرزا برکت سامنے آتا ہے) بجرہ تیار ہے؟

مرزا برکت۔ تیار ہے خداوند!

نواب۔ (اٹھتے ہوئے) تم جاؤ اور مجھ پر بھروسہ رکھو۔ مجرم کو سزا دینے میں نہ تو تاخیر کی جائے گی اور نہ غفلت ——— یہ لو! یہ دریا خانم کے لئے انگوٹھی ہے۔ آج ہی تیار ہو کر آئی ہے۔ اب جاکر تقریب نکاح کی تیاریاں کرو کیونکہ مابدولت اسی ہفتہ میں اس کی تکمیل کرنی چاہتے ہیں۔

وزیر۔ بسر و چشم!

(وہ آداب بجا لاکر باہر جاتا ہے۔ نواب اور مرزا برکت کشتی میں سوار ہو کر دریا کی سیر کیلئے روانہ ہوتے ہیں)

چوتھا ایکٹ

(لالہ خاتون کی حویلی۔ لالہ خاتون اور دریا خاتون آپس میں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ دونوں بہت متفکر معلوم ہوتی ہیں —)

دریا خاتون۔ اللہ جانے کیا گزری ہوگی؟ مسعود بھی پلٹ کر نہیں آیا۔ جو کچھ خیر خبر ملتی۔ باجی! دل میں پنکھے سے لگے ہوئے ہیں۔ اے اللہ!

لالہ خاتون۔ کیوں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ سب اچھا ہی ہوگا ——— ایں روشن اختر کی بات تو تم خود مجھ سے کہہ چکی ہو کہ نواب اُن کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتا۔

دریا خاتون۔ جانتی ہوں باجی۔ مگر اس دل کو کیا کروں۔

لالہ خاتون۔ سمجھاؤ۔

دریا خاتون۔ باجی! خدا نہ کرے کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ میں جیتے جی اُن سے جدا کر دی جاؤں ——— میں تو بے موت مر جاؤنگی۔

(مسعود داخل ہوتا ہے)

لالہ۔ مسعود! کیا خبر لائے؟ جلدی بتاؤ۔ سب خیریت ہے نا؟

مسعود۔ جی ہاں خیریت ہے بیگم صاحب! وزیر صاحب نے نواب صاحب کے سامنے خوب فریاد کی۔ چھوٹے نواب بلوائے گئے۔ نواب صاحب نے اُن کو دیکھتے ہی سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان کو شال اڑھاؤ۔ چھوٹے نواب نے یہ رنگ دیکھکر پستول نکال لیا۔ وہ بھاگڑ مچی ہے کہ یاد رہے گی۔ اور چھوٹے نواب صاحب یہ جا وہ جا۔ آنکھ جھپکتے میں غائب ہی تو ہو گئے ——— اب نواب صاحب نے پچاس سواروں کا دستہ اُن کے تعاقب میں بھیجا ہے۔ سارے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے اور تمام مکانوں کی تلاشی ہو رہی ہے۔

(دریا خاتون یہ سنتے ہی سسکیاں لینے لگتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور روشن اختر اندر داخل ہوتا ہے)

لالہ خاتون۔ ہے ہے یہ کیا غضب ہے۔ نیکی اترے تمہارے اوپر۔ یہ کیسا جگرا ہے۔ جان کا خوف بھی نہیں ہے کہ یوں کھلے خزانے دندناتے پھر رہے ہو۔

روشن اختر۔ (مسکرا کر) آخر ہوا کیا ہے جو میں منہ چھپا کر بیٹھوں۔

لالہ خاتون۔ آخر کیا باقی رہ گیا ہے۔ سب کچھ تو ہو چکا۔ سوار تمہارے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں کہ تمہیں خدا نہ کرے گرفتار کر کے نواب کے سامنے لے جائیں اور تم ہو کہ سر ہتیلی پر لئے گھوم رہے ہو ——— مسعود! خدا کیلئے ذرا باہر جاکر کھڑے ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی آ جائے۔

(مسعود باہر جاتا ہے۔)

روشن اختر۔ میں تو اُن پر سے اپنا سر نچھاور کر چکا ہوں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آج میں موت کے ڈر سے اُن کی زیارت سے باز رہتا۔ مجھے

ایک کام اور بھی تو ہے۔ میں یہ کہنے آیا تھا کہ آج رات کو میں انہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ کیونکہ اب میں اپنی منگیتر کو یہاں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ میں تو اب یہاں بار بار آنے سے رہا۔ پھر خدا معلوم میرے پیچھے کیا ہو اور کیا نہ ہو۔

لالہ خاتون۔ ہاں بھئی ٹھیک ہے! تم ان کو لے ہی جاؤ۔ مگر یوں دن دہاڑے چلا آنا تمہاری نادانی تھی۔ تم عقیلہ بیگم کو نہیں جانتے کہ وہ کیسی بلا ہے بے درماں ہے۔ نہ معلوم اُس نے ہمارے اوپر کتنے جاسوس بٹھا دئے ہونگے۔ اس کے کانوں میں اگر ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ تمہیں فوراً گرفتار کرا دیگی اور مجھے بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے گی۔ اچھا اب تم خیر سے سدھارو۔ رات کے بارہ بجے پھاٹک پر گھوڑا ایکہ آ جانا۔ میں دریا خاتون کو تمہارے پاس پہونچا جاؤں گی۔

روشن اختر۔ کیوں دریا خاتون! تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟

دریا خاتون۔ جی نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔

مسعود۔ (دروازے کے باہر سے) ارے غضب ہو گیا! وزیر ادھر ہی آ رہے ہیں۔

دریا خاتون / لالہ خاتون۔ ہے ہے کیا کروں۔ اے میرے مولا عزت اور جان آپ ہی کے ہاتھ ہے — روشن اختر! اس پردے کے پیچھے چھپ جاؤ۔ خدا کے لئے جلدی کرو۔ پھر ہم کوئی ترکیب سوچیں گے کہ انہیں کس طرح یہاں سے ٹالیں۔

روشن اختر۔ (اطمینان سے) میں اور پردے کے پیچھے جا کر چھپوں! — آنے دیجئے اُن کو — میرا کیا کرینگے۔

دریا خاتون / لالہ خاتون۔ (قدموں پر گرتے ہوئے) خدا کے لئے اپنی جوانی پر رحم کرو۔ تمہیں قسم ہے اپنے جدکی کہ اس پردے کے پیچھے چلے جاؤ آخر اس میں کیا ہو جائے گا؟

روشن اختر۔ ہرگز نہیں۔

مسعود۔ (دروازے میں اپنا سر ڈال کر) ارے وزیر صاحب آن پہونچے۔

دریا خاتون / لالہ خاتون۔ ہائے کیا کروں۔ خدا کے لئے اب بھی کہا مان لو۔ ارے ہماری جانوں پر رحم کھاؤ۔ تم تو اپنی جان بچا بھی لوگے۔ مگر ہم کیا کریں گے۔ ہائے اب وزیر نہیں چھوڑے گا — ہم تو بے موت مریں گے۔

روشن اختر۔ خیر آپ کی خاطر سے یہ بھی کرنے کو تیار ہوں۔

(روشن اختر پردے کے پیچھے جاتا ہے اور وزیر اندر آتا ہے)

وزیر۔ خدا کا شکر ہے کہ تم دونوں آج ایک ہی جگہ موجود ہو — مجھے تم سے بڑی ضروری باتیں کرنی ہیں۔ لالہ خاتون تمہیں مبارک ہو کہ تمہاری بہن نواب سے منسوب ہو چکی ہیں۔ اب تمہیں چاہیئے کہ اپنے مرتبے کو دیکھتے ہوئے اپنی عزت کا پاس کرو اور کوئی ایسی بات نہ ہونے دو جس سے ہمارے نام پر داغ آئے۔ اب میں نہ سنوں کہ کوئی تمہارے پاس میری بغیر اجازت کے آتا ہے۔

لالہ خاتون۔ (اطمینان سے) مہربانی فرما کر ذرا مجھے تو بتایئے کہ وہ کون ہے جو میرے پاس آپکی بغیر اجازت کے آتا ہے؟

وزیر۔ مثلاً روشن اختر! جسے میں نے تمہارے کمرے میں دیکھا تھا۔

لالہ خاتون۔ ہاں جو آپکی بیگم عقیلہ بیگم سے ملنے آیا تھا اور آپ کو دیکھکر پردے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

وزیر۔ ہاں ہاں، میں کب کہتا ہوں کہ وہ تمہارے پاس آیا تھا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ واقعہ عقیلہ بیگم کی وجہ سے ہوا۔ لیکن میں نے جو کچھ بھی تم سے کہا ہے اُس کا مطلب صرف اتنا جتا دینا تھا کہ کہیں نواب کا دل دریا خاتون کی طرف سے ہٹ نہ جائے۔ آج انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں سب تیار یاں کر لوں تاکہ آئندہ ہفتے تک شادی ہو جائے — اور یہ لو نواب صاحب کی طرف سے تحفہ — انگوٹھی کا — دریا خاتون اِدھر آؤ۔ شرماؤ نہیں۔ اسے اپنی اُنگلی میں پہن لو۔

(وہ دریا خاتون کے ہاتھ پر انگوٹھی پہنا دیتا ہے)

دریا خاتون۔ لیکن جس لڑکی کی بہن بدنام ہو چکی ہے اب وہی نواب صاحب کی بیگم بنے گی۔ توبہ کیجئے! آپ نواب صاحب کی بڑی ہتک کر رہے ہیں۔ یہ لیجئے انگوٹھی۔ اسے سینت کر رکھئے اپنے پاس اور جب نواب صاحب کے قابل لڑکی مل جائے تو اس کی اُنگلی میں پہنا دیجئے گا۔

(وہ انگوٹھی لیکر وزیر کے سامنے زمین پر ڈال دیتی ہے اور خود کمرے سے باہر چلی جاتی ہے)

وزیر۔ (پکارتے ہوئے) ارے کچھ دیوانی ہو گئی ہے لڑکی! آخر میں نے تمہاری بہن پر کونسا الزام رکھا ہے؟ میں نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ ایک مشورے کے طور پر تھا اور معاملہ کی اُونچ نیچ دکھانا مردوں ہی کا کام ہے۔

لالہ خاتون۔ لیکن یہ اُونچ نیچ آپ میرے بجائے عقیلہ بیگم کو دکھاتے تو اچھا ہوتا؟

وزیر۔ ہاں کیوں نہیں۔ کل ہی لو۔ ایسی ڈانٹ بتائی ہو کہ وہ بھی عمر بھر یاد ہی تو رکھے گی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اب تو مان لو۔

لالہ خاتون۔ آخر کل کیوں؟ آج ہی کیوں نہیں؟

وزیر۔ اب اس کا کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ جانے دو۔ تھوک ڈالو غصہ۔

ہم نے مانا کہ روشن اختر کا اس سے تعلق تھا۔ لیکن اس کئے کی اُسے کافی سزا مل چکی ہے۔ اگر وہ گرفتار کر لیا گیا تو فوراً قتل کر دیا جائے گا۔ اور اگر وہ بھاگ گیا تو عمر بھر جلاوطن رہیگا اور در در کی ٹھوکریں کھا کھا کر آپ ہی مر جائیگا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ معاملہ خود بخود ختم ہو گیا اب اس میں سر کھپانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب جو ہمیں کام کرنا ہے وہ دریا خاتون کی شادی کی تیاری ہے۔ مَیں کہے دیتا ہوں کہ ایسا موقع اگر ہاتھ سے نکل گیا تو عمر بھر ہاتھ ملتی رہو گی۔

لالہ خاتون:۔ تو جاؤ بیگم اماں سے بات چیت کرو۔ مَیں کیا جانوں۔

وزیر:۔ اچھا تو جاؤ، بیگم اماں کو بُلا لاؤ۔ ہم سب مل کر اس معاملہ کو طے کر لیں گے۔

(اسی موقع پر دروازہ کھلتا ہے اور ریحانہ خاتون
اپنی لڑکی دریا خاتون کے ساتھ اندر داخل ہوتی ہیں۔
وزیر کھڑے ہو کر آداب بجا لاتے ہیں۔)

وزیر:۔ اچھا ہوا حضور بیگم صاحبہ! آپ خود ہی تشریف لے آئیں۔ مَیں آپکی خدمت میں انہیں بھیج ہی رہا تھا۔ تشریف رکھیئے۔

ریحانہ خاتون:۔ (بلائیں لیکر) قربان جاؤں بیٹا! جیو سلامت رہو۔ مگر یہ وقت بیٹھکر باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔ خدا خدا کر کے آج محل میں تمہاری صورت دکھائی دی ہے۔ نہ معلوم اب یہ موقع کب ملے۔

وزیر:۔ کیوں؟ فرمایئے!

ریحانہ خاتون:۔ سلامت رہو بیٹا۔ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن اگر میرے دل سے پوچھو تو میری زندگی کا سہارا بس اب اسی پر موقوف ہے، کہ لالہ خاتون کی خیر سے گود بھرے اور تمہارے باپ دادا کا نام چلے۔ اللہ جانتا ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے میری زبان پر یہی دُعا ہے۔ کل میں پیارے شاہ ولی کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی اور اُن سے منت کی کہ وہی میری طرف سے دُعا مانگیں۔ ولیوں کی زبان میں اثر ہوتا ہے۔ شاید خدا انہیں کی سُن لے۔ قربان جاؤں کیسے ولی کامل ہیں۔ فوراً انہوں نے مجھے تعویذ لکھکر دیا اور کہنے لگے کہ "جا! بیگم تیری مُراد پوری ہوگی۔ مگر ایک شرط ہے کہ وزیر صاحب کے سر کے وزن سے تین گنے گیہوں لیکر محتاجوں میں تقسیم کر تبھی اُس کا اثر ہوگا ورنہ نہیں"۔ اب مجھے تمہارے سر کا وزن کرنا ہے نہیں تو یہ نیک ساعت گزر جائیگی اور مَیں یونہی ہاتھ ملتی رہ جاؤنگی۔

وزیر:۔ مگر آپ میرے سر کا وزن کس طرح کر سکتی ہیں جب تک کہ یہ میرے شانوں پر رکھا ہوا ہے۔

ریحانہ:۔ میں تم پر سے قربان بیٹا! یہ تم میرے ہی اُوپر چھوڑ دو۔ مَیں سب کر لوں گی۔ یہ تو چٹکی بجاتے میں ہو جائے گا۔ ابھی۔ جس بزرگ نے تعویذ دیا ہے اُسی نے اس کا راستہ بھی بتا دیا ہے۔ تمہارے سر پر میں ہانڈیاں چڑھا چڑھا کر دیکھوں گی اور جو ہانڈی تمہارے سر پر ٹھیک بیٹھے گی بس اس بھر کے گیہوں کا وزن تمہارے سر جتنا وزنی ہوگا۔۔۔۔ بیٹا دریا خاتون! لانا تو ایک ہانڈی۔

(دریا خاتون جاتی ہے اور مستورات کے ہاتھ سے ایک ہانڈی
لیکر آتی ہے۔ ریحانہ خاتون ایک ہاتھ سے وزیر صاحب
کی پگڑی اتارتی ہے۔)

وزیر:۔ ارے آپ نے میری پگڑی اتار لی۔ مجھے آپ سب کے سامنے اس طرح ذلیل نہیں کر سکتیں۔ دیکھیئے! دیکھیئے!! واللہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔

ریحانہ خاتون:۔ خدا کے لئے بیٹا مان لو۔ ہے ہے مَیں کیا کروں یہ نیک ساعت یونہی چلی جا رہی ہے۔

وزیر:۔ آپنے تو مجھے ایک تماشہ بنانے کا ارادہ کیا ہے۔ خیر شاہ صاحب کا حکم ہے اس لئے مانے لیتا ہوں۔ خدا کرے لالہ خاتون کی دلی مُراد پوری ہو۔ آمین!

ریحانہ خاتون:۔ مَیں تم پر سے واری جاؤں۔ بیٹا! شاباش۔ دریا خاتون! لانا تو ہانڈی۔ ہاں۔ اب آہستہ سے سر پر پہنا دو۔

(دریا خاتون سر پر اُلٹی ہانڈی رکھتی ہے۔ وہ ہانڈی
وزیر کے بھوؤں تک آکر رُک جاتی ہے مگر نیچے نہیں
اُترتی۔ دریا خاتون اُس کے پیندے کو ٹھونک کر نیچے
سرکانا چاہتی ہے۔)

وزیر:۔ اُف! خدا کے لئے ۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔ میری ناک ٹوٹی جاتی ہے۔ اُونہہ۔۔۔۔

(وہ ہانڈی اُتار دیتا ہے۔)

ریحانہ خاتون:۔ (جلدی سے) بیٹی! ذرا اس سے بڑی ہانڈی لاؤ۔

(دریا خاتون ہانڈی لینے بھاگتی ہے۔)

وزیر:۔ حضور بیگم، اب رہنے دیجئے۔ پھر کسی وقت جتنی ہانڈیاں جی چاہے میرے سر پر رکھدیجئے گا۔ مجھے اس وقت آپ سے بڑا ضروری مشورہ کرنا ہے۔

ریحانہ خاتون:۔ نہیں بیٹا! ہرگز نہیں۔ وہ ضروری مشورے تو پھر بھی ہوتے رہیں گے۔ لیکن نیک ساعتیں بار بار نہیں آیا کرتیں۔ بیٹا میری اس ضعیفی پر رحم کھاؤ۔ ابھی ایک ہی منٹ کی تو بات ہے۔ پھر جا ہے تو جی بھر کر باتیں کرنا۔

الٰہی لالہ کی کوک آباد ہو جائے کسی طرح۔ (روتی آواز بنا کر) میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ آج مری کل دوسرا دن۔ چاہتی ہوں کہ یہ خوشی اپنی آنکھوں سے دیکھتی جاؤں! (دریا خاتون کی طرف آنسو بھری ہوئی آنکھوں سے دیکھکر۔) ہے ہے توبہ ہے! دریا خاتون! کب سے بیچارے ننگے سر کھڑے ہوئے ہیں تم ہانڈی لئے ہوئے یوں ہی کھڑی ہوئی ہو۔ اگر یہی ہانڈی پہلے سے لے آئی ہوتیں تو کیا ہو جاتا۔

(دریا خاتون ہانڈی الٹ کر رکھتی ہے جو وزیر کے سر کو ڈھانپتی ہوئی اُس کے کندھوں تک آتی ہے۔ ریحانہ خاتون، لالہ خاتون کو اشارہ کرتی ہے۔ لالہ خاتون پردہ سرکاتی ہے اور روشن اختر شہزادے کا ہاتھ پکڑکر باہر دروازے تک چھوڑ آتی ہے۔ کیونکہ اُس کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں اس لئے قدموں کی آواز نہیں ہوتی۔ فوراً ہی دریا خاتون ہانڈی اٹھا لیتی ہے۔)

وزیر:۔ اب تو آپ کی خوشی ہوگئی! خیر اب تشریف رکھئے اور جو کچھ میں عرض کروں اُسے غور سے سنیئے۔

ریحانہ خاتون:۔ بسر و چشم۔ کہو۔

(جوں ہی وہ بیٹھنا چاہتی ہے کہ باہر سے غل شور کی آوازیں آنا شروع ہوتی ہیں۔ اور یکبارگی روشن اختر ہاتھ میں پستول لئے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔ وزیر اُس کو دیکھتے ہی کانپنے لگتا ہے۔)

روشن اختر:۔ کیوں! والدِ مرحوم کے احسانوں کا یہی بدلہ ہے کہ اُنکی اولاد کے درپئے آزار ہو جاؤ۔ میرے پیچھے ہمیشہ آستین میں چھری لئے پھرتے ہو۔ لیکن (ڈانٹ کر) جانتے ہو! جب تک میں تمہیں مار نہ ڈالونگا اُس وقت تک مجھے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

(پستول کا رُخ وزیر کی طرف کرتا ہے۔)

لالہ خاتون:۔ (اُس کے قدموں پہ گرتے ہوئے) رحم! آقا زادے رحم! (روکر) ہائے میں کس کے سہارے زندہ رہونگی۔ للہ اسکو ہٹایئے۔

(روشن اختر پستول ہٹا لیتا ہے۔ مرزا شہرت سپاہیوں کے ساتھ دروازے پر نمودار ہوتا ہے اور وہیں کھڑا ہو جاتا ہے۔)

روشن اختر:۔ مرزا شہرت! کیوں کیا چاہتے ہو؟

مرزا شہرت:۔ ہم نے حضور اور مرحوم نواب صاحب کا نمک کھایا ہے، مگر حکم حاکم اور مرگِ مفاجات۔ آپ خود جانتے ہیں کہ ہم کس لئے حاضر ہوئے ہیں۔

روشن اختر:۔ جانتا ہوں۔ مگر تم مجھے زندہ گرفتار کر کے نہیں لیجا سکتے۔ لو، میرا یہ سر حاضر ہے۔ دیکھتے کیا ہو۔ اسے کاٹ کر نواب صاحب کے سامنے پیش کر دو۔

مرزا شہرت:۔ ہماری کیا مجال ہے کہ جو بے ادبی کریں۔ آپ ہمارے ساتھ یونہیں چلے چلیں۔ آپ کو دیکھکر نواب صاحب کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائیگا۔ ویسے وہ وعدہ بھی کر چکے ہیں کہ اگر آپ خود چلے آئیں گے تو وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہونچائیں گے۔

روشن اختر:۔ اُن کے قول اور فعل پر اعتبار ہی کسے ہے۔ کونسا وعدہ انہوں نے پورا کیا ہے؟ میں کہہ چکا، تم میں ہمت ہے تو آئے بڑھو اور بسم اللہ کر کے میرا سر تن سے جدا کر لو۔ آؤ۔

(اُسی وقت باہر پھر غلغلہ ہوتا ہے۔ سلیم بیگ سپہ سالار اور بلند اختر، روشن اختر کا سوتیلا بھائی اندر داخل ہوتے ہیں۔)

سلیم بیگ:۔ مرزا شہرت! ہٹ جاؤ۔ آقا آپ کی عمر دراز ہو۔ آپ کے چچا حضور نواب صاحب دریا میں کشتی پر سیر کر رہے تھے کہ یکایک بادِ مخالف چلی اور کشتی دریا میں غرق ہوگئی۔ اب آپ اس گدی کے جائز وارث ہیں۔ کیونکہ یہ گدی دراصل آپکے والد مرحوم ہی کی ہے۔ حق بحقدار رسد۔ آپکی سلطنت کے تمام امراء دربار عام میں حضور کی قدمبوسی کے لئے بیچینی سے منتظر ہیں۔

روشن اختر:۔ بلند اختر! کیا یہ واقعہ ہے؟

بلند اختر:۔ میرے جان و مال آپ پر سے صدقے ہوں، اب آپ ہی ہمارے ولی نعمت ہیں۔ تشریف لے چلئے۔

وزیر } (وزیر اور مرزا شہرت فرش پر دراز ہو کر معافی چاہتے ہیں)
مرزا شہرت } رحم! آقا رحم!!۔

روشن اختر:۔ مرزا شہرت! کھڑے ہو جاؤ۔

(مرزا شہرت اُٹھکر ایک طرف کو سرنگوں کھڑا ہو جاتا ہے)

روشن اختر:۔ وزیر! تم نے دیکھ لیا کہ انسان کی زندگی پانی کے بلبلے جیسی ہے اور اُس کے ارادے پانی پر لکیروں جیسے۔ انہیں مٹتے دیر نہیں لگتی۔ یہ تمہاری بھول تھی کہ تم اور میرے چچا نشہ دولت و حکومت میں مخمور ہو کر اُس قادر مطلق کو بالکل بھول گئے تھے ـــــ ذرا سوچو تو میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ تم نے مجھے میرے باپ کی گدی سے محروم کیا اور غاصب چچا سے سازش کر کے میرا نام و نشان بھی دنیا سے مٹا دینے پر آمادہ ہوگئے۔ بدبخت انسان! خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اُس کی لاٹھی میں آواز

ہوتی۔ شکر ہے اس کا کہ ظالم کا سر مظلوم کے قدموں پر جھکا ہوا ہے۔ ابھی
لمحہ قبل میری جان تمہارے ہاتھوں میں تھی اور اس وقت تمہاری جان میرے
ں میں ہے۔ تم اپنی تلوار میان سے نکال رہے تھے اور دیکھو میری
ذت کہ میرے پستول کی نال تمہارے سینے سے ہٹی ہوئی تھی۔ جاؤ میں نے
ں وزارت سے برطرف کیا۔ کیونکہ سلطنت کے معاملات تم جیسے انصاف
، رشوت خوار، محسن کُش اور ظالم کے ہاتھ میں دینے کے یہ معنی ہیں کہ
ت کا خون میں اپنی گردن پر لوں ـــــ میں تمہاری جان بخشی کرتا ہوں
تمہارے مال و املاک تمہیں واپس کرتا ہوں۔ میں کہہ چکا! اب میں
حکم دیتا ہوں کہ دریا خاتون کے ساتھ میری شادی کے تمام انتظامات
ہفتہ کے اندر پورے ہو جائیں۔ خدا حافظ مادرِ محترمہ (ریحانہ خاتون)

خدا حافظ ہمشیرہ محترمہ (لالہ خاتون)۔

ریحانہ خاتون
لالہ خاتون } آقا! خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ ہنسی خوشی سلطنت کرو، پھلو اور پھولو۔ فی امان اللہ!

(روشن آختہ جاتا ہے۔ اُس کے پیچھے تمام لوگ دست بستہ جاتے ہیں۔ صرف وزیر اور خواتین باقی رہجاتی ہیں۔ وزیر چاروں طرف بھونچکا ہو کر دیکھتا ہے اور اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا کر فرش پر بیٹھ جاتا ہے۔)

سوار :۔ (باہر سے آواز آتی ہے) نواب روشن اختر بہادر زندہ باد!

(پردہ)

ـــــــــــ **سید ابوطاہر داؤد**

افسانوی حقیقت

دورِ جمشیدی بہ صورت مثالی دَور تھا
عیش و عشرت میں بھی ایراں محوِ فکر و غور تھا

تھی جو ایراں کی ذہانت ہمکنار اقبال سے
کہہ رہا تھا فرد فرد اس کا زبانِ حال سے

ہر گھڑی کیسا تفکر؟ محفل آرائی بھی ہو
کاہشِ جاں ہی فقط کیوں ہو! دل افزائی بھی ہو

رزم میں جوہر دکھاتے تھے وہ سرکش عزم کے
رُوح پرور ولولے تھے جن کی دلکش بزم کے

چھاؤں میں تاروں کی رہتے تھے رہینِ نا و نوش
مہر کو دیکھا تو دکھلانے لگے جوش و خروش

بڑھ رہا تھا آئے دن ایراں کا توسیعی حشم
کر رہا تھا دوسرے ملکوں کو اپنی اپنی حد میں ضم

اس کے فرزندوں سے تھی اسکی ثقافت آشکار
تھے قمر آثار شب کو دن کو خورشید اشتہار

تھے سفیر اس کے جہاں میں چار سو پھیلے ہوئے
آشکارا راز ان ہی سے سفارت کے ہوئے

حقِ سفارت کا ادا کرتے تھے ایرانی امیر
جلوہ گر تھا ہند میں بھی ایک روشن دل سفیر

نام اس جانباز ایرانی کا تھا فیروز بخت
شاہ بھی اس کو سمجھتا تھا معینِ تاج و تخت

رہتے رہتے ہند میں اس کو جو مدت ہو گئی
ایک ہندی شاہزادے سے محبت ہو گئی

جب سے اخلاص کا اس پر نشہ چھانے لگا
شاہزادے کو وہ اپنی راہ پر لانے لگا

کر دیا فیروز نے قائم جو تعلیمی نظام
"جنگ مصنوعی" سے خوش ہونے لگا یہ شادکام

جوش میں تلوار پر تلوار چمکانے لگا
بن کے بجلی زد سے بجلی کی نکل جانے لگا

کچھ دنوں میں بن گیا یہ مردِ میدانِ نبرد
شہسواری، نیزہ بازی، تیر اندازی میں فرد

لیکن اس کے تھے معلم جتنے ہندی فلسفی
راز ہی میں کر رہے تھے مائلِ سرِ خفی

مورتی پوجن کا سمجھا بھید سن سن کر بھجن
رفتہ رفتہ بھول بیٹھا خود پرستی کا چلن

دیکھ کر حال اس کا بول اٹھا سفیرِ نامور
اس کے بس میں آ نہیں سکتا جہانِ خیر و شر

فلسفہ ایران کی عظمت کا سمجھاؤں کسے
"گیان دھیان" اس کا ابھرنے ہی نہیں دیتا اسے

ابلقِ لیل و نہار اس کے لیے بیکار ہے
یہ شرابِ بےخودی سے رات دن سرشار ہے

علی منظور

محبت کی کھڑکی

ختم ہوتی ہے جہاں پر سانپ سی ٹیڑھی سڑک ہے وہاں میرا مکاں اونچا سا ہمدوشِ فلک
یہ مکاں کیا ہے مرا کعبہ ہے، میرا طور ہے اس کی کھڑکی مرکزِ برقِ جمال و نور ہے

مجھکو پہلے اس مکاں سے کوئی دلچسپی نہ تھی خوشنما کھڑکی میں اس کی کوئی رنگینی نہ تھی
عام رہرو کی طرح اس سے گذر جاتا تھا میں اس کی صد رنگی سے اکثر خوف ہی کھاتا تھا میں
واپسی پر ایک دن کھڑکی یکایک وا ہوئی دفعتاً میری نظر اٹھی تو اس پر جا پڑی
آنکھ میری دیکھتے ہی یوں جھپک کر رہ گئی شاخ جیسے تند جھونکوں سے لچک کر رہ گئی
دل پہ بجلی گر پڑی رنگین اک شعلہ لئے جیسے اشک آنکھوں سے ٹپکے خون کا قطرہ لئے
کیا کھلی کھڑکی، کھلا دلکش دریچہ خلد کا پھر گیا آنکھوں میں عطر آگیں بغیچہ خلد کا
کھینچدی تصویر کوئی حاصلِ حسن و شباب یا اٹھی کھڑکی سے آتشناک قرصِ آفتاب
موٹی موٹی انکھڑیوں میں بجلیاں آسودہ تھیں تیز پلکیں بادہ ریز اور کیفیت آلودہ تھیں
چاند سا قشقہ فروزاں تھا جبینِ صاف پر اک کنول سا بہہ رہا تھا موجۂ شفاف پر
شانۂ مستانہ پر کچھ بال تھے بکھرے ہوئے وہ جوانی تھی کہ خدّ و خال تھے نکھرے ہوئے
سینۂ دوشیزہ کا نازک گداز اس میں ابھار تنگ پیراہن میں گم ہونے پہ بھی تھا آشکار
شیشۂ دل آنکھ اٹھاتے ہی شکستہ ہو گیا دل کچھ اس انداز سے دھڑکا کہ تڑکا ہو گیا
میں بصد مشکل لرز کر لڑکھڑانے سے بچا کچھ زمیں پر سے اٹھانے کے بہانے سے بچا
قہقہے نے فتح کے، نغموں سے عالم بھر دیا ہنس پڑا میں بھی کہ اس کو خوش تو میں نے کر دیا
اس ذرا سے حادثے نے دل کو بسمل کر دیا حشر سے پہلے قیامت کے مقابل کر دیا
حیرتِ جلوہ سے نظروں پر سیاہی چھا گئی میری دنیائے سکوں میں اک تباہی آ گئی

دیر سے سمجھا مرے پہلو میں دردِ عشق تھا
دیر سے جانا یہ لرزہ آہِ سردِ عشق تھا

بن گئی رنگین کھڑکی قیمتی جنسِ حیات
ڈھونڈنے پر بھی نظر آئی نہ پھر راہِ نجات

دن میں سو بار اُن کی کھڑکی سے گذرنے لگ گیا
صبر و ضبطِ دل کا شیرازہ بکھرنے لگ گیا

اُس کی جانب دیکھتا بھی مَیں تو گھبرایا ہوا
اہلِ دُنیا کی نگاہِ تیز سے بچتا ہوا

بارہا ہوتی نظر اُن کی نظر سے ہمکنار
دل کو آجاتا تھا نظروں کے تصادم سے قرار

آشنا کوئی وہاں موجود ہوتا تھا اگر
قابلِ نظّارہ ہوتی تھی مری نیچی نظر

بن گئی دلچسپ، آنکھوں کی ملاقاتِ عجیب
آخر آخر ہو گیا مانوس مجھ سے وہ حبیب

اُس کو کیفِ عشق سے سرشار میں نے کر دیا
فتنۂ خوابیدہ کو بیدار میں نے کر دیا

آنکھوں آنکھوں میں بتا دی اسکو دل کی اہمیت
خامشی میں کہہ دیا مَیں ہوں تمہاری سلطنت

بن گئیں اک داستانِ شوق یہ خاموشیاں
رفتہ رفتہ وہ سمجھنے لگ گیا سرگوشیاں

اُس کو چشمِ مست سے پھر بات کرنا آگیا
اپنے ہر غمزے میں رنگِ تازہ بھرنا آگیا

حُسنِ محجوب ایک دن بیباک اتنا ہو گیا
رازِ پوشیدہ مُلاقاتوں کا افشا ہو گیا

کچھ دنوں سے دل بھڑک اُٹھا ہے گلخن کی طرح
بند ہے کھڑکی درِ زنداں کے روزن کی طرح

اُن کے گھر والے سمجھتے ہیں کہ وہ محفوظ ہیں
بند کر دینے سے کھڑکی کے بہت محظوظ ہیں

لیکن اُن کو کیا خبر ہے عشق کے اعجاز کی
جذبِ دل کی اور تخیّل کرشمہ ساز کی

اب بھی ہوں میں بارگاہِ دلربا میں باریاب
جلوہ گر ہوں اسکی نظروں میں بصد حُسن و شباب

یہ پیام آیا ہے اُن کا وہ بہت بیمار ہیں
دل سے آزردہ ہیں کچھ، کچھ زیست سے بیزار ہیں

اُن کے گھر والوں کو سمجھانا بہت دُشوار ہے
یہ مداوا تم نے جو سوچا ہے، اب بیکار ہے

مخمور جالندھری

دروغِ مصلحت آمیز

کمال ایک نئے طرز کے آراستہ ڈرائنگ روم میں
بہت بیتابی سے ٹہل رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ یہ کسی کے انتظار میں ہے۔ بار بار اپنی گھڑی بھی دیکھتا
جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی ٹھہر کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا بھی
دیتا ہے۔ گھنٹہ نو بجاتا ہے۔

کمال:- اوہو نو بج گئے۔ سنیما شروع ہونے میں بس صرف آدھ گھنٹہ رہ گیا، اور ابھی تک زہرہ تیار ہو کر نہیں آئی۔ (پھر ٹہلنے لگتا ہے) یہ زہرہ کا دستی پنکھا ہے۔ کس قدر پیارا ہے۔ (چومتا ہے) .... یہ زہرہ کا بٹوا ہے۔ آہا اس میں سے کس قدر خوشبو آرہی ہے۔ (چومتا ہے) زہرہ کا خاوند رحیم بھی گھر پر نہیں۔ چلو اچھا ہوا۔

زہرہ:- کمال! تمہارے دیوان پن کی بھی کوئی حد ہے۔

کمال:- (چونک کر) ہیں تم آگئیں۔ میں تو مایوس ہو چکا تھا۔ زہرہ اس وقت کاسنی ساڑھی میں تم کس قدر حسین معلوم ہوتی ہو۔ اف میرے خرمنِ ہوش و حواس کو تم نے اپنے صاعقۂ حسن سے جلا کر خاک کر دیا۔

زہرہ:- بس کمال تمہاری انہی اوٹ پٹانگ باتوں سے میں جلتی ہوں۔ ہر وقت تمہارے سر پر لغت چھانٹنے کا بھوت سوار رہتا ہے۔

کمال:- افسوس زہرہ تمہاری بارگاہِ حسن میں میرے اِن ناچیز جذبات کی قدر نہیں۔ میری شاعری تمہارے بے مثال حسن کو غیر فانی شہرت دیدیگی۔

زہرہ:- بس بس معاف کیجئے۔ میں اس غیر فانی شہرت سے باز آئی۔ کسی وقت تو عقل کی بات کیا کرو۔

کمال:- ہائے افسوس۔ اب عقل و خرد کو برباد کرنے کے بعد کہتی ہو عقل سے کام لوں ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

زہرہ:- اگر تمہاری ان باتوں کو رحیم نے سن لیا تو کیا کہیں گے۔

کمال:- بس زہرہ میں اس زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ آج میں دو ٹوک بات کر کے فیصلہ کرنا چاہتا ہوں اور اس کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے سامنے دو چیزیں ہیں۔ ایک طرف رحیم تمہارا خاوند ہے جو یقیناً تم سے محبت نہیں کرتا۔ اس کی نظروں میں تمہارے حسن اور خوبصورتی کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ تم کو فقط زہرہ کی حیثیت سے جانتا ہے، اور دوسری طرف میں تمہارا پرستار کمال ہوں۔ جس کے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت تمہارا تبسم اور دونوں جہان کی دولت تمہاری ایک نظرِ التفات ہے۔ جو تمہارے حسن کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز کو ہیچ سمجھتا ہے۔ جو تم سے محبت نہیں کرتا بلکہ تمہیں پوجتا ہے، پوجتا۔ اب تمہیں انصاف کرو کہ تم ان دونوں میں سے کس کو انتخاب کرو گی۔

زہرہ:- تمہارا مطلب؟

کمال:- بس میرا مطلب صاف ہے، میں اس رازداری اور پوشیدہ محبت سے تنگ آگیا ہوں۔ آج رات تم فیصلہ کرو۔ تمہیں فیصلہ کرنا پڑیگا۔

زہرہ:- کمال۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ سٹری تو نہیں ہو گئے۔

کمال:- ہاں ہاں میں سٹری سہی۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آج میری قسمت کا فیصلہ اپنے لبِ لعلیں سے مجھے سنا دو۔ زہرہ اس فیصلہ کو سننے کے لئے میری روح تڑپ رہی ہے۔

زہرہ:- بھلا یہ فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔

کمال:- بس میں نہیں جانتا۔ تم صرف ایک مرتبہ اپنے اِن خوبصورت لبوں سے ہاں کہدو۔ پھر ہم دونوں اس دنیا سے دور بہت دور افتادہ مقام پر جا کر رہیں گے۔ جہاں ہمیں کوئی نہ دیکھ سکے گا۔ جہاں ہمیں کوئی ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے گا۔

زہرہ:- لیکن رحیم۔

کمال:- میں رحیم سے صاف صاف کہدونگا۔ ہم تم ابھی رحیم کے پاس چلتے ہیں۔ میں رحیم سے بنت کہونگا کہ زہرہ کو مجھ سے محبت ہے۔ میں زہرہ کی پرستش کرتا ہوں۔ رحیم اب تم اس معاملے میں دخل نہ دو۔ اور سیدھی طرح زہرہ سے دستبردار ہو جاؤ۔

زہرہ:- ہائے میرے اللہ تم کیسی دیوانوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ یہ سنکر رحیم کیا کہے گا۔

کمال:- رحیم ایک شریف انسان ہے۔ وہ جنٹلمین ہے۔ وہ انسانی جذبات کی قدر جانتا ہے۔ جب اُسے معلوم ہو گا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور تم بھی مجھے چاہتی ہو تو مجھے یقین ہے کہ رحیم کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ بخوشی منظور کر لے گا کہ تم سے دستبردار ہو جائے۔

زہرہ:- پھر وہی جنون۔ رحیم آپ کی گدی ناپ دیں گے تو بچہ جی کے

ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔

کمال:۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ کالج کے زمانے میں مَیں بھی اکثر ورزش کرتا رہا ہوں۔ مکے بازی میں میرا کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر یہ فیصلہ طاقت آزمائی پر منحصر ہے تو مَیں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ ہاں ہاں مَیں بالکل تیار ہوں۔

زہرہ:۔ یا وحشت۔

کمال:۔ اسے تم وحشت کہو یا جنون۔ آج فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ پھر مَیں تمہارے قدموں میں بیٹھ کر اپنی نئی نظمیں سناؤں گا۔ میری شاعری اور میری زندگی کا مقصد مجھے مل جائے گا۔

زہرہ:۔ اے ہے مجھے اب یاد آیا۔ نگوڑی تمہاری وہ نظمیں اور غزلیں جو کل تم مجھے دے گئے تھے، لو انہیں واپس لے لو۔ کہیں رحیم نے دیکھ لیا تو غضب ہی آجائے گا۔

کمال:۔ افسوس زہرہ تمہیں میرے جگر کے ٹکڑوں کی قیمت کا احساس نہیں۔ یہ شعر میں نے خونِ جگر پی پی کر لکھے تھے اور تمہیں انکی قدر نہیں۔

زہرہ:۔ ہائیں وہ غزلیں میں نے اپنے اِسی بٹوے میں تو رکھی تھیں۔ کہاں گئیں۔ ہائے غضب۔ کہیں رحیم کے قبضہ میں تو نہیں آگئیں۔ اے میرے اللہ اب کیا ہوگا۔

کمال:۔ ہوگا کیا۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ رحیم کو اِس محبت کا حال بتا دوں۔ چلو اَب اُسے معلوم ہو گیا ہوگا۔

زہرہ:۔ ہائے اللہ کہیں وہ اس کمبخت زبیدہ کے ہاتھ تو نہیں لگ گئیں۔ یہ میری نند نہیں بلکہ سوکن ہے۔ بات بات پر طعنے دیتی ہے۔ اگر کہیں اُسنے دیکھ لیا تو مجھے طعنے دے دیکر ہی مار ڈالے گی۔

کمال:۔ چلو یہ اور بھی اچھا ہوا۔ تم نے سُنا نہیں کہ مُشک اور عشق کبھی نہیں چُھپ سکتے۔ چلو زہرہ، تیار ہو جاؤ۔ ہم رحیم سے درخواست کریں کہ ہمیں جانے کی اجازت دے۔ پھر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس کے بعد اے میری ملکۂ حُسن مَیں تمہارے سامنے اپنی شاعری کے پھول نثار کرونگا۔ مَیں نظمیں لکھونگا اور تم سُنو گی۔

زہرہ:۔ اے میرے اللہ۔ مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ اس شیطان زبیدہ نے یہ نظمیں میرے بٹوے سے نکال لیں۔ اب وہ ہاتھ مٹکا مٹکا کر اور انگلیاں نچا نچا کر رحیم کو تمہارے وہ شعر سُنا رہی ہوگی۔ کمال تم نے بھی غضب کیا اِن شعروں میں کھلے بندوں میرا نام لکھ دیا۔ ہر ہر مصرع میں زہرہ باندھا ہے۔

کمال:۔ (نہایت جوش سے) زہرہ میرے کمال کی داد نہ دوگی۔ ایسی مشکل زمین اور سخت قافیے میں ایسے مرصّع اشعار نکالنا میرا ہی حصّہ ہے۔ پھر دُنیا بھر کی صنعتیں اور نادر استعارے اور اچھوتی تشبیہوں کا تو ذکر ہی نہیں۔ کاش اس وقت انوری اور خاقانی زندہ ہوتے تو میرے کمال کی داد دیتے۔ غالب اور ذوق اپنے اپنے جھگڑوں کو بھول جاتے۔ میر اور سودا میرا کلام آنکھوں سے لگاتے۔

زہرہ:۔ بس جانے بھی دو یہ ہرزہ سرائی۔ کیا تمہیں زہرہ کے سوا کوئی اور ردیف بھی نہیں ملتی تھی۔ اس شہر میں بس میں ہی ایک زہرہ ہوں۔ ہائے میرے اللہ۔ رحیم ان بے ہودہ اور لغو شعروں کو پڑھکر کیا کہے گا۔ میں کوئی بہانہ بھی تو نہیں بنا سکتی۔

کمال:۔ زہرہ میرے انتخاب کی داد دینا۔ میں نے تمہارا نام اسی خوبی سے شعروں میں باندھا ہے جیسے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے۔ اگر رحیم سخن فہم ہے تو تڑپ جائے گا۔

زہرہ:۔ چولہے میں جائیں تمہارے شعر، مجھے تو اب اپنی فکر ہے دیکھو رحیم آتا ہی ہوگا۔ اُس نے کہا تھا مَیں ساڑھے نو سے پہلے آجاؤنگا۔

کمال:۔ چلو یہ اور بھی اچھا ہوا۔ مجھے اُسے ڈھونڈنے کی تکلیف اُٹھانی نہیں پڑے گی۔

زہرہ:۔ اے میرے اللہ یہ کس جانور سے پالا پڑ گیا ہے۔ دیکھو کمال تمہیں میری قسم ہے۔ تم سے رحیم اگر ان نظموں کا حال پوچھیں تو کہدینا یہ زہرہ کوئی اور ہے۔

کمال:۔ نہیں مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکے گا۔ مَیں جھوٹ کیوں بولوں۔ مَیں تو سچ سچ کہہ دوں گا کہ میرے خوابوں کی تعبیر رحیم یہی تمہاری بیوی زہرہ ہے۔

زہرہ:۔ تم میرا ہی مُردہ دیکھو۔ میرے سر کی قسم جو تم میری بات نہ مانو۔ کرو وعدہ۔ میرے اچھے کمال۔ تمہیں میری محبت ہی کی قسم ہے۔

کمال:۔ اچھا بابا جو تم کہو۔ اب تمہارے لئے مجھے جھوٹ بھی بولنا ہی پڑیگا۔

(موٹر کی آواز)

زہرہ:۔ دیکھو کمال وہ رحیم آگئے۔ دیکھوں کھڑکی میں سے اِن کے چہرے سے کیا معلوم ہوتا ہے۔ (کھڑکی میں سے جھانکتی ہے) وہ بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ میرے کمال دیکھو تمہیں میری ہی قسم ہے۔

(رحیم داخل ہوتا ہے۔)

رحیم:۔ ہائیں زہرہ ابھی تم دونوں سینما نہیں گئے۔ مَیں تو سمجھا تھا چلے گئے ہوگے۔

کمال:۔ جی نہیں۔ اب ہم نے ارادہ تبدیل کر دیا۔

زہرہ:۔ ہاں۔ مجھے شام کو ذرا چھینکیں آگئی تھیں، اس لئے مناسب نہیں

سمجھا کہ رات کی ہوا میں سینکا جاؤں۔

رحیم:۔ بہت خوب۔ کمال صاحب مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔

کمال:۔ جی ہاں میں حاضر ہوں۔ ہمہ تن گوش ہوں فرمایئے۔

رحیم:۔ جی نہیں۔ جلدی نہیں ہے۔ پھر کبھی سہی۔ زہرہ کی موجودگی میں نہیں، خیر پھر سہی۔

زہرہ:۔ نہیں پیارے رحیم، مجھے اماں کے خط کا جواب لکھنا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔

رحیم:۔ خیر تو پھر کچھ مضائقہ نہیں۔

(زہرہ جاتی ہے)

کمال:۔ جی ہاں میں آپ کے ارشادات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوں۔

رحیم:۔ (غصہ سے) ہمہ تن گوش کے بچے۔ میں تو تجھے شریف سمجھتا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ تو بے حد کمینہ ہے۔

کمال:۔ (تعجب سے) رحیم صاحب، معاف کیجئے گا، میں اس بے تکلفی کا مطلب نہیں سمجھا۔

رحیم:۔ جی ہاں آپ کیوں سمجھنے لگے۔ آپ تو بے حد خدا رسیدہ پاکباز انسان ہیں۔

کمال:۔ معاف کیجئے گا میں ان اشاروں اور کنایوں کی حقیقت کے ادراک سے قاصر ہوں ذرا وضاحت سے فرمایئے۔

رحیم:۔ (جیب سے غزلوں کا کاغذ نکالتے ہوئے) ابے دھوکے باز، بدمعاش، دیکھ۔ یہ دیکھ اپنی کارستانی۔ شرم تو نہیں آتی مردود کو۔ لوگوں کی بہو بیٹیوں پر غزلیں لکھتا ہے۔ شاعر کی دُم بنا پھرتا ہے۔ شاعر کی دُم۔

کمال:۔ (نہایت شوق سے) آہا۔ ہا۔ رحیم صاحب یہ میری پرانی غزلوں کا مسودہ آپ کے پاس ہے۔ واللہ۔ خوب صاحب خوب۔ دیکھئے چند سال ہوئے ایک شب مجھے نیند نہیں آتی۔ میں ذرا صحن میں ٹہلنے لگا۔ آسمان پر ستاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی مالی نے سیج پر پھول سجا دیئے ہوں۔

رحیم:۔ (تنگ آکر طنزیہ) خوب۔ پھر ارشاد۔

کمال:۔ بس انہیں ستاروں میں زہرہ ہے۔ وہ بھی شب چراغ کی طرح آسمان پر چمک رہا تھا۔ میرے جذبات اس ستارے کو دیکھ کر بھڑک اٹھے۔ اسی وقت قلم برداشتہ یہ چند غزلیں اور متفرق اشعار لکھ دیئے۔ رحیم صاحب میری برجستہ گوئی کی داد تو نہ دیجئے گا۔ اور پھر دیکھئے اس مشکل زمین میں کیا کیا قافئے نکالے ہیں۔ آپ کو ماننا ہی پڑیگا۔

رحیم:۔ مکار کہیں کا۔ بدمعاش نے آج تک زہرہ ستارے کی شکل تک نہیں دیکھی اب جھوٹے عذر اور نامعقول تاویلیں پیش کرتا ہے۔ ابے بدمعاش اس میں ستارے کا کہاں ذکر ہے۔ بھلا زہرہ کی زلفیں، اس کے خوبصورت لب۔ نازک رخسار بھی کسی نے دیکھے ہیں۔ یہ شعر تو نے میری بیوی کے متعلق لکھے ہیں۔

کمال:۔ معاف کیجئے گا رحیم صاحب، میں آپ سے اس قدر بے تکلف نہیں ہوں۔ اور نہ آپ کی بیوی کے متعلق میرے دل میں ایسے جذبات ہیں کہ میں انہیں اپنی غزل کا موضوع بناؤں۔ بھلا اُن کے نازک لب کہاں کہ جو کسی شاعر کے جذبات کو اکسا سکیں۔ ان کی زلفیں دیکھ کر کس احمق کو شعر کہنے کا خیال آتا ہے۔ معاذاللہ، معاذاللہ۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک ــــ

رحیم:۔ اچھا تو گویا آپ کے نزدیک میری بیوی دنیا کی بدترین عورت ہے۔ جس کے رخسار جاذب نظر نہیں۔ جس کی زلفیں گویا گھوڑے کی دُم کے بال ہیں۔ اور اُس کے لب حبشی لبوں کا نمونہ۔ کیوں یہی مطلب ہے نا آپ کا؟۔

کمال:۔ (نہایت شوق سے) جی ہاں۔ جی ہاں آپ خوب سمجھے۔ میرا یہی بالکل یہی مطلب ہے۔

کمال:۔ ابے بدمعاش تیری یہ مجال کہ میری بیوی کے متعلق یہ لفظ کہے، چہ داند بوزنہ لذاتِ ادرک۔ ابے بندر۔ تجھے کیا معلوم کہ زہرہ دُنیا کی حسین ترین عورت ہے۔ اُس کے خمِ ابرو کے اشارے پر دونوں جہان قربان ہو سکتے ہیں۔ ہمارے شہر کے بڑے بڑے رئیس صرف اس آرزو میں مرے جاتے ہیں کہ کسی چائے کی پارٹی میں زہرہ کے قریب بیٹھنے کا انہیں شرف حاصل ہو۔ اور زہرہ اپنے نازک ہاتھوں سے انہیں چائے کی ایک پیالی بنا کر پیش کرے۔ یا کم از کم اُن کے سوالات کا جواب صرف سر ہلا کر دیدے۔ بڑے بڑے مصوروں کی صرف اتنی آرزو ہے کہ زہرہ ان کے سامنے ماڈل بن کر چند منٹ کے لئے ہی بیٹھ جائے۔ بڑی بڑی سینما کمپنیوں کے ڈائرکٹر اس کی خدمات حاصل کرنے کیلئے بیتاب ہیں اور تو کہتا ہے کہ اسے دیکھ کر تیرے جذباتِ شاعری میں ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ (کمال کے سر پر چانٹا مارتا ہے) دیکھا۔ بول اب بول۔ بتا۔

کمال:۔ اچھا اب آپ اس پر اتر آئے۔ تو بسم اللہ۔ میں بھی تیار ہوں۔ یہ لیجئے۔ (مارتا ہے)

رحیم:۔ ہائے میری ناک۔

(یہ شور سنکر زہرہ اندر داخل ہوتی ہے)

زہرہ:۔ ہائیں ہائیں یہ کیا۔ کمال چھوڑو رحیم کو۔ دیکھنا پیارے رحیم، کمال

سے مت لڑنا۔ یہ اپنے زمانے میں مُکّے بازی کے اوّل نمبر کے استاد تھے۔

رحیم:۔ تو میں بھی کُشتی لڑنے کئی سال تک اُستاد سبزو خان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ہوں۔ یہ دیکھ بدمعاش۔

کمال:۔ یہ لیجئے جناب۔

زہرہ:۔ ہائیں۔ دیکھو۔ دیکھو چھوڑ دو۔ رحیم چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔

رحیم:۔ میں اِس بدمعاش کو ہرگز نہیں چھوڑونگا۔ اس نے تمہاری بے عزتی کی ہے۔ کمینہ انسان۔ کہتا ہے کہ تمہارے حُسن کو دیکھکر اسکے جذبات میں ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ شاعر کی دُم بنا پھرتا ہے

زہرہ:۔ بس بس رحیم۔ کمال تم ہی باز آجاؤ۔ رحیم تم وعدہ کرو کہ اب کمال سے نہیں لڑوگے۔

رحیم:۔ نہیں ہرگز نہیں چھوڑونگا۔ آج میں اس شاعر کی دُم کو کچّا کھا کر چھوڑونگا۔ ہاں ایک شرط ہے۔ اگر یہ اپنے الفاظ واپس لے لے۔ وہ گستاخ لفظ جو اُسنے تمہاری شان میں کہے ہیں۔ تو میں معاف کر دونگا۔

زہرہ:۔ کمال۔ چلو کمال ایک جنٹلمین کی طرح تم اپنے الفاظ واپس لے لو۔

کمال:۔ اچھا میں اپنا ایک ایک لفظ واپس لیتا ہوں بغیر کسی شرط کے۔ میں غیر مشروط معافی چاہتا ہوں۔

زہرہ:۔ شاباش کمال۔ اچھا اب رحیم سے کمال تم ہاتھ بھی ملالو۔ بس اب دونوں کی دوستی ہوگئی۔

کمال:۔ نہیں ہرگز نہیں۔ میں ان سے ہاتھ کبھی نہیں ملاؤنگا۔ آج تمہاری زہرہ صرف تمہاری وجہ سے مجھے دو دفعہ جھوٹ بولنا پڑا۔ تمہارا خاوند رحیم اوّل درجے کا بیوقوف اور گاؤدی ہے۔ اب میں سب واقعہ سچ سچ کہتا ہوں۔

زہرہ:۔ ہائے میرے اللہ۔ خدا کیلئے ذرا میری . . . . .

رحیم:۔ ہاں ہاں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ (طعنے میں) کہو کہو۔ ابھی بچّہ جی کو معلوم ہوتا ہے۔ ذرا سبق نہیں ملا۔ ہاں ہاں بولو۔

کمال:۔ میں کہہ رہا ہوں کہ تم اوّل درجے کے بیوقوف اور گاؤدی ہو۔ اور اگر تم تیار ہو تو میں اور بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

رحیم:۔ (کوٹ اُتار کر) یہ لو میں نے کوٹ اُتار دیا۔ اور میں اب تیار ہوں۔ بولو کیا کہنے والے تھے۔

کمال:۔ سُنو، یہ غزلیں میں نے ہی لکھی ہیں۔ اور زہرہ ستارے کے متعلق نہیں لکھیں۔ بلکہ تمہاری بیوی زہرہ کے متعلق لکھی ہیں۔ کیونکہ مجھے زہرہ سے محبت ہے۔ میں زہرہ کو دُنیا کی حسین ترین عورت سمجھتا ہوں۔ یہ میری شاعری کے خواب کی تعبیر ہے۔ اسکے خمِ ابرو پر میں اپنا تن من دھن سب نثار کرنے کو تیار رہوں۔ سنتے ہو رحیم مجھے اِس سے محبت ہے۔ اور تم جیسا گاؤدی اِس حسینہ کے شوہر بننے کا بلکہ اسکے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہے۔

رحیم:۔ (خوش ہوکر) کیا یہ سچ مچ تمہارے دلی جذبات ہیں۔ کمال سچ کہو۔ کیا تم یہ سچ سچ بول رہے ہو۔

کمال:۔ ہاں میں یہ سچ کہہ رہا ہوں۔ ابھی اور باقی ہے وہ بھی سُن لو۔ تمہارے آنے سے پہلے میں نے زہرہ سے صاف صاف کہدیا تھا کہ اب میں اپنی محبت چھپا نہیں سکتا۔ میں تم سے سب کہدونگا۔ پھر میں زہرہ کو لیکر کہیں اور۔ بہت دُور چلا جاؤنگا۔ لیکن افسوس کہ زہرہ نے میری التجا کو ٹھکرا دیا۔ نہ معلوم اسے تم میں کیا مل نظر آتے ہیں۔

رحیم:۔ میرے پیارے دوست کمال۔ مجھے اپنی اس غلط فہمی پر بیحد افسوس ہے۔ بھلا تم نے مجھے یہ پہلے کیوں نہ بتایا۔ اچھا زہرہ اب کمال سے درخواست کرو کہ یہ مجھ سے ہاتھ ملالیں۔

زہرہ:۔ کمال اچھا میرے کہنے سے انہیں معاف کردو۔ یہ میرے خاوند ہیں۔ میری وجہ ہی سے انہیں معاف کردو۔ چلو ان سے ہاتھ بھی ملالو۔

رحیم:۔ کمال تمہیں ماننا پڑے گا کہ کسی شاعر کے خواب کی تعبیر زہرہ سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ دُنیا کا کوئی شخص زہرہ کے حُسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

زہرہ:۔ چلو رحیم چھوڑو بھی اس قصّے میں۔

رحیم:۔ نہیں کمال صاحب۔ مجھے اپنی غلط فہمی پر بے حد افسوس ہے۔ اب میں آپ سے صرف ایک درخواست کرنی چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ اسے قبول فرمائیں گے۔

کمال:۔ (نہایت کھلے ہوئے انداز میں) فرمائیے۔

رحیم:۔ آپ مجھے اجازت عنایت فرمائیے کہ میں آپ کی ان نظموں کو جو آپنے زہرہ کی تعریف میں لکھی ہیں، ایک نہایت حسین وجمیل مجموعے کی صورت میں شائع کردوں۔ تاکہ آپکے یہ اشعار لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں ہمیشہ محفوظ رہیں۔ اور زہرہ کے حُسن کو اِن سے چار چاند لگ جائیں۔

کمال:۔ مجھے اس اجازت کے دینے میں کوئی تامّل نہیں۔ آپ ضرور شائع کردیں۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔

رحیم:۔ بس ایک تکلیف اور دینی چاہتا ہوں۔ وہ جو فارسی کا مقولہ ہے کہ تصنیف را مصنّف نیکو کند بیاں۔ آپ ہی اس مجموعے کا نام بھی تجویز کردیجئے۔ دیکھئے کچھ اس قسم کا نام مناسب رہیگا "بربطِ زہرہ" یا کوئی اور ـــــ

کمال:۔ میرے نزدیک اس کا نام "دروغِ مصلحت آمیز" زیادہ مناسب ہوگا۔

(ماخوذ) آغا محمد اشرف

مچھّر خاں

انسان کی طرح حشرات الارض بھی احساسات کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں، آپ کو یقین آئے یا نہ آئے میرا تو یہ ایمان ہے۔ میرے ایک دوست ہیں، نام اس لئے نہیں بتاتا کہ وہ ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ وہ پچھلے جنم میں مچھّر تھے، اب انسان ہیں۔ کل کیا ہونگے، مجھے پتہ نہیں۔ اُن کے ایک دوست مچھّر خاں کے حالاتِ زندگی معلوم ہوئے۔ شاید اُن حالات کو سُن کر آپ کو بھی یقین آجائے کہ کیڑے مکوڑے بھی ذی حس جاندار ہیں۔ یہ حالات اپنے دوست کے الفاظ میں ہی قلبند کرتا ہوں۔

پچھلے جنم کی بات ہے۔ ایک تھے مچھر، نام تھا میاں مچھّر خاں۔ وہ چلے شکار کو۔ اپنا نشتر بھالا زیب تن کیا اور سُورج چھپنے سے پہلے ہی نکل گئے۔ گھر سے باہر نکلے ہی ہونگے کہ ایک مہمان آدھمکے۔ قسمت سے میاں مچھّر خاں کی تھیں چار بیویاں۔ دو تھیں جاہل اور دو پڑھی لکھی۔ پہلی دو پردہ نشیں اور باقی کی دو بے پردہ۔ مہمان نے جو گھر پر آواز دی تو پہلی بولی "سونے کا پلنگ، چاندی کے ڈنڈے، ریشم کا بستر، پیچ رنگ تکیہ کہیں آرام کرتے ہونگے جی"۔ دوسری تھیں ذرا موسیقی کی دلدادہ فرماتی ہیں "نہیں جی نہیں، کہیں بین بجاتے ہونگے"۔ تیسری تھیں سیدھی سادی، اور اُن سے میاں مچھر رہتے بھی تھے ناراض۔ جل کے بولیں "مٹی کے گڈھے، گھاس پھوس کا تکیہ، کیچڑ کا گدا، کہیں چھپتے پھرتے ہونگے جی"۔ چوتھی تھیں قسمت سے دس جماعتیں پاس، وہ بھلا پرانے زمانہ کے کھوسٹ مچھّر کو کہاں خاطر میں لاتی تھیں۔ پہلے تو سُنا کیں پھر بول ہی پڑیں "مُوا یہ صورت۔ چٹ کا ٹا پٹ مارا کہیں جان نکل گئی ہوگی جی"۔ مہمان بیچارہ کھل کھلا کر ہنس پڑا بس اس کا ہنسنا غضب ہوگیا۔ چاروں کی چاروں پر جھاڑ کر جرمن اور اٹلی کی طرح وہ پیچھے پڑیں کہ بیچارے مہمان کو جان بچا کر بھاگنا ہی پڑا۔

لو صاحب مہمان کو ضروری کام تھا۔ وہ میرے پاس آیا۔ یہ قصّہ سُنایا اور کہنے لگا کہ "بھائی میرے ساتھ چلو، اکیلے جاتے تو ڈر لگتا ہے"۔

کوئی رات کے گیارہ بجے میاں مچھّر خاں کے مکان پر جا دستک دی۔ تھے بہت ملنسار، فوراً ہی باہر آگئے۔ لیکن کچھ تھکے ہوئے اور پریشان تھے۔ ہم نے کہا "خیر تو ہے"۔ بولے کہ "کچھ مت پوچھو۔ آج تو بس خیر ہی ہوئی ورنہ جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ایک تو اِن میونسپلٹیوں کا ستیاناس ہو۔ جگہ جگہ مٹی کا تیل، کولتار، چونہ پھیلا رکھا ہے۔ نہ سیرگاہ میں آرام اور نہ شکارگاہ میں لطف۔ شہریوں کی تو مت ماری گئی ہے۔ شہر کے سب سے بیکار اور خود غرض لوگوں کو چودھری بنا، پنچایت بنالی ہے میونسپلٹی نام رکھدیا۔ اُن پنچوں کو سوائے اپنے فائدے اور دوسروں کے نقصان کے اور کوئی کام ہی نہیں۔ بھلا ہم نے کون سے اُن کے بچّوں کا خون چوسا ہے جو بَیر کی ٹھانی۔ اِدھر آفت یہ کہ شکار بھی چوکنا ہوگیا ہے۔ آج ایک موٹا سا بنیا تاکا۔ اُس کی توند پر وار کیا۔ خون کا چوسنا تھا کہ میرے تمام جسم میں سنّاٹا چھا گیا، بیہوشی طاری ہوگئی، گرتا پڑتا جان بچا کر بھاگا۔ سیدھا گیا کو یراج مچھرملو کے پاس۔ انہوں نے پہلے قے کرائی، آنتوں کو دھویا، تب کہیں جان میں جان آئی۔ معلوم ہوا کہ یہ کونین کا زہر تھا۔ بس لالہ جی کی دھوکے بازی پہ جو مجھے آیا غصّہ، سیدھا ایک وہی چلتی پھرتی بولتی تصویروں کے گھر پہونچ گیا اور ستھراؤ کر دیا۔ بیس بچے، سولہ عورتیں اور تیس مرد شکار کئے۔ وہ تو میرا نشتر ہی کھنڈا ہوگیا ورنہ چھٹی کا دودھ یاد کرا دیتا"۔

میرے دوست باتیں کرتے کرتے آبدیدہ ہوگئے۔ پچھلے دن یاد آگئے۔ کہنے لگے "اب میں انسان ہوں لیکن جب مچھر تھا اچھا تھا۔ اب نہ وہ بے غرض محفلیں ہیں، نہ دُنیا کی تگ و دَو سے آزادی اور نہ کوئی مچھّر خاں جیسا عقلمند آدمی ملتا ہے۔ تم ہنس لو مگر انسان سے ہم بہتر تھے۔ مچھّر خاں پر کونین کی مار پڑے اگر کبھی بھی انہوں نے غریب اور امیر میں فرق کیا ہو۔ لو اب انسان کو دیکھ لو صرف امتیاز، چھوت، اچھوت کا غلام ہے۔ اور بھائی ہمیشہ انہوں نے ہمسایہ کا خیال رکھا۔ پورے گیارہ گھر چھوڑ کر شکار کرتے تھے۔ مجال ہے جو پڑوسی کو تکلیف ہو۔ اور تمہارے انسان پڑوسی کا ہی گلا کاٹنے کو تیار رہتے ہیں۔ ایک دن مچھّر خاں بولے "بھئی مجھے ڈاکٹر بیچارے پر بڑا رحم آتا ہے۔ میرا دُشمن سہی لیکن جو اُس کے پاس آتا ہے یہی کہتا آتا ہے، ڈاکٹر صاحب مرگیا۔ وہ بیچارا یہ سمجھ کر چپ ہو جاتا ہے کہ کوّوں کے کوسوں ڈھور تھوڑی مرجائیگا۔ مگر دیکھ لو انسان کو، تہذیب کا پُجاری بنا ہے اور طریقۂ گفتگو بھی نہیں آتا"۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک دفعہ مچھّر خاں کو بہت ہی چھیڑا کہ یہ کیا سُوجھی جو چار چار بیویاں کرلیں۔ پہلے تو ملہار سارنگ بجاتے رہے، پھر تیور چڑھا کر بولے "انسان، انسان، یہ بڑا ہی چالاک، خود غرض اور دھوکے باز ہے۔ ایک انسان نے مجھ سے یہ بدلہ لیا۔ یا وہ مچھر بڑا ہی بیوقوف

تھا اور میری طرح پھنس گیا۔ بات تو یوں ہے کہ انسان مذہب کی آڑ میں بھی دُنیا ہی کا سودا کرتا ہے۔ لو دیکھو۔ اُس کو چار بیویاں رکھنے کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ اُس پر فرض کیا گیا۔ بلکہ اجازت دی گئی۔ لیکن اس اجازت کی دو شرائط فرض کی گئیں۔ تم بھی سُن لو۔ اوّل یہ کہ وہ انسان دولت، ثروت اور قوت اتنی رکھتا ہو کہ ایک سے زیادہ بیوی رکھ سکے۔ دوسری یہ ان پر ہرطرح دولت اور محبّت میں برابری قائم رکھ سکتا ہو۔ اگر یہ شرط پوری نہیں کرسکتا، وہ گنہگار ہے بلکہ صرف اپنے نفس کو دھوکا دے رہا ہے۔ لیکن میں نے تو بتایا کہ انسان مکروفن کا پتلہ ہے۔ اجازت کو تو حکم بنا بیٹھا اور شرائط کو اندھیرے کنوئیں میں ڈال دیا۔ مذہب کے نام پر تن پرستی کرتا ہے۔ کرے۔ لو۔ اے لو بات کہاں سے کہاں گئی۔ ہماری شادیاں ایسی ہوئیں کہ ایک تھے لالہ پاتی رام۔ اپنے دوستوں میں بیٹھے شیخی بگھار رہے تھے کہ ابھی تو ہماری تین بیویاں ہیں، تین اور کریں گے۔ تم جانو لالہ جی کی شریعت میں تو تین چار کی قید نہیں۔ سچی بات ہے۔ ہم سمجھے کہ ایک سے زیادہ بیوی ہونا بھی شیخی کی بات ہے۔ بڑا غصّہ آیا کہ ہمارے پاس ایک اور لالہ جی کے پاس تین۔ غصّے کا آنا تھا کہ لالہ جی کی ناک پر وار کیا۔ لالہ جی نے ہاتھ مارا۔ میں نے کاوا کاٹ دوسرا وار کیا۔ دوسرا ہاتھ پڑا، اسے خالی دے تیسرا ایسا وار کیا کہ جڑ تک نشتر اُتار دیا۔ بس اس دن سے اسوقت تک آرام سے نہ سویا جب تک کہ چار شادیاں پوری نہ ہوگئیں۔ لیکن یار کی حماقت۔ بھئی ہم تو جانتے ہیں کہ بس ایک حور ہی کافی ہے۔ کہیں دیکھنا ہماری بات میڈم میٹرک بیوی سے نہ کہہ دینا۔ وہ بُہری اُونچی ایڑی والی۔ باتوں باتوں میں وہ نشتر چبھوتی ہے کہ مجھے آجاتا ہے غصّہ اور بھئی پھر آجاتی ہے انسانوں کی شامت۔ اور تم جانو ظلم سے ہم بچتے ہیں بہت۔"

ایک دن جو میں میاں مچھر کے گھر گیا تو ایک حشر برپا ہو رہا تھا۔ بیویاں رو رہی تھیں، بَین ہو رہا تھا۔ سیاپا کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ پوچھا خیر تو ہے۔ معلوم ہوا کوئی ایک مہینہ ہوا میاں مچھر خاں بغرض سیاحت گئے تھے ابھی تک نہیں لوٹے۔ نہ کوئی اطلاع آئی۔ سوائے اس شدنی موت کے اور کیا چیز اُن کو روک سکتی ہے۔ ہم بھی تو مچھر ہی تھے۔ کوئی اس جنم کے انسان تھوڑی تھے۔ رونے لگے۔ لیجئے صاحب دوپہر تک بَین رہا۔ اللہ کی شان ایک دم بَین رُک گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آسمان سے ایک چھوٹے عقاب کی طرح یا یوں سمجھیے کہ جنگی ہوائی جہاز کی طرح مچھر خاں چلے آرہے ہیں۔ لو صاحب رنج خوشی سے بدل گیا۔ اس کے بعد جب ملنا جلنا ہوچکا تو پھر کیا سُناؤں۔ اُنہوں نے چین، جاپان، روس، ولایت، جرمنی، فرانس، افریقہ اور یاد نہیں کن کن ملکوں کا حال سُنایا۔ کہنے لگے "چینی کے خون کا مزہ چکھا، چوبیس گھنٹے افیم کے نشے میں پڑا رہا۔ جاپانی کا خون کھاری بہت ہے، روس کا خون بے حیا بہت ہے۔ اثر بھی نہیں ہوتا۔ جرمنی کا خون سفید زیادہ ہے۔ ولایت کا خون ادلتا بدلتا رہتا ہے، اچھا خاصہ گرگٹ ہے۔ فرانس کا خون مقوی ہے۔ ترک اور اٹلی کا چکھ نہ سکا۔ وہاں ہر ایک پستول بندوق۔ مشین گن سنبھالے بیٹھا ہے۔ قسم ربِ کونین کی، بیویوں کا خیال تھا۔ تنہا ہوتا تو سینہ سپر کئے جا لڑتا۔ افریقہ کے باشندے تو بچارے میرے تمہارے مزدور ہیں۔ لدّو گدھے۔ اُن کا خون بھی ایسا ہے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان جنّت نشان میں، میاں میرے، ہرطرح کا خون ملتا ہے۔ پنڈت، مولوی، برہمن، اچھوت، کالے، بہت کالے، اور بھی کالے، گورے، بیچ کا میل ....."

ابھی یہیں تک وہ سُنا پائے تھے کہ بے اختیار اُنکا ہاتھ اُنکے منہ پر اس زور سے پڑا کہ چھینٹیں اُڑ گئیں۔ پھر شرمندہ ہوکر بولے "بھائی معاف کرنا اور سوانح نہیں سناؤنگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مچھر خاں ابھی زندہ ہیں۔ اپنی کہانی میری زبانی بیٹھے سُن رہے تھے۔ کہیں غصّہ آگیا میرے کان پر وار کرگئے۔ کیوں نہ ہو اپنی دوستی کا حق ادا کیا۔"

ڈاکٹر ہاشمی

شبِ ماہ

مجھے یاد ہے وہ شبِ ماہ و انجم ۔۔ وہ منظر نشیلے، فضائیں شرابی
وہ مستی میں کچھ ہوشمندی کے پہلو ۔۔ وہ ہر شے پہ اک حالتِ نیم خوابی
وہ گلگشت وہ جلوہ ہائے گلستاں ۔۔ وہ اک عالمِ رنگ کی ہم رکابی
وہ ہر سو بوئے مَے پریشاں پریشاں ۔۔ وہ ہر گُل کا چہرہ گلابی، گلابی
وہ پیمانہ بر کف ہر اک شاخِ گلشن ۔۔ وہ ہر ایک جھونکا ہوا کا شرابی
وہ سبزہ چمن کا مجسّم جوانی ۔۔ وہ طاری درختوں پہ کیفِ شبابی
وہ ہر ایک جانب چراغاں کا عالم ۔۔ وہ اپنی جگہ ہر نظر ماہتابی
وہ ہر ذرّۂ خاک چشمِ تماشا ۔۔ وہ ہر جلوۂ حُسن کی بے حجابی

چراغِ سرِ محفلِ یاس تھے تم
مناظر حسیں تھے، مرے پاس تھے تم

بظاہر رہے گو کہ خاموش دونوں ۔۔ مگر دل میں جذبات طُوفاں بہ طُوفاں
وفورِ مسرّت سے رُخِ ماہ و انجم ۔۔ ہجومِ طرب سے جبینیں گلستاں
ضیا پاش اُمید سے طاقِ ابرو ۔۔ منوّر تمنّا سے محرابِ مژگاں
خموشی میں سرگوشیوں کی صدائیں ۔۔ حدیثِ محبّت نگاہوں میں غلطاں
شگفتہ، شگفتہ گلِ باغِ حسرت ۔۔ مُعطّر، مُعطّر مشامِ دل و جاں
نہاں سبزۂ خط میں فرمانِ عشرت ۔۔ محبّت کی مُہریں لبوں پر نمایاں
تبسّم، زلیخا کا خوابِ جوانی ۔۔ طُلوعِ مہِ مصر چاہِ زنخداں
گرانباریِ شوق سے گردنیں خم ۔۔ میسّر سُبکدوشیِ عہد و پیماں
ہر اک ولولہ دل کا طُغیانوں پر ۔۔ جوانی کا سینہ میں رُکتا سا طوفاں
ہم آغوش ہونے کو بازو بہ بازو ۔۔ کمر بستہ تجدیدِ اُلفت کے خواہاں
برستا ہوا ابرِ نیسانِ مستی ۔۔ صدف بحرِ عشرت کا گوہر بداماں
نشاطِ محبت سے لغزش قدم میں ۔۔ مگر شوق کے راستوں پر خراماں

مری خوش نصیبی کہ تم مہرباں تھے
خدا جانے اس وقت دونوں کہاں تھے

تابش دہلوی

ملک التجار

ایک خزاں رسیدہ مقطعہ دار صاحب کو بیکاری میں بیوپار کی سوجھی آپکے بعض تجربہ کار دوستوں نے رائے دی کہ حیدرآباد سے انڈے مرغ لے جاکر بمبئی میں فروخت کرنے چاہئیں، ایک دوست نے کہا کہ بمبئی میں سگرٹ کے کاغذ کے ڈبے بہت مہنگے بکتے ہیں اگر حیدرآباد سے بنوا کر لے جائیں تو خاصہ نفع ہو سکتا ہے، یہ مشورہ بھی پسند آیا اور پانچسو ڈبے بنوائے گئے۔ اتنی ہی مُرغیاں خریدی گئیں اور کوئی دو ہزار انڈے جمع کئے گئے، خالی ڈبے لکڑی کے کیسوں میں رکھے جا رہے تھے، ایک دوست نے کہا کہ انڈوں کو ڈبوں میں اور ڈبوں کو صندوق میں رکھنا بہتر ہوگا، اسی طرح "پیکنگ" ہوئی اور ہمارے "ملک التجار" کو دھوئیں کی گاڑی اڑاتی ہوئی بمبئی لے پہونچی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مُرغیوں میں وبا پھوٹ پڑی تھی، کچھ تو بیچ راستے ہی میں اللہ کو پیاری ہوئیں اور کچھ بمبئی پہونچتے پہونچتے پرواز کر گئیں، انڈے بھی سینکڑوں کی تعداد میں ٹکرا ٹکرا کر "پڈنگ" بن گئے اور ان ڈبوں کی جو "انڈے دان" بنے تھے گت بن گئی۔ بچے کھچے انڈے مُرغیاں اونے پونے فروخت کر دیے گئے، جو روپیہ اُن کے خریدنے میں صرف ہوا تھا بمشکل اُس کا آدھا وصول ہوا۔ اب رہے ڈبے!! اُن کی فروخت میں بڑی دشواری ہوئی، کرافورڈ مارکیٹ میں انڈے مُرغیوں کے ساتھ تو یہ بکنے سے رہے!! ایک ڈبہ بطور نمونہ لئے سارا شہر روند ڈالا مگر کوئی اللہ کا بندہ لاگت سے کم پر بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوا، آخر بیزار ہو کر انہیں فروخت کرنے کی ہمارے "ملک التجار" نے ایک بڑی رسان تدبیر نکالی۔ سارے ڈبے ایک نیلام میں رکھدئے اور یہ "پڈنگ زدہ" ڈبوں کا لاٹ مبلغ پونے دو روپے میں "ونس ٹوائس آن تھری ٹائمس" ہو کر چل بسا۔

مُرغیوں کی تجارت میں "ملک التجار" صاحب کو سو فی صدی "مرغ زریں" بننے کا یقین تھا، اِس تجارت کا سرمایہ چار روپے سینکڑہ پر قرض لیا گیا تھا، اس میں سے کچھ رقم پاس تھی اور کچھ انڈے مُرغیوں کی فروخت سے ہاتھ آئی تھی، خیال ہوا کہ گھاٹے کو پورا کرنے کی تدبیر نکالی جائے۔ ذہن رسا نے یہ رائے دی کہ بمبئی سے کچھ منہیاری سامان حیدرآباد لیجا کر ٹکے بنانا چاہیئے۔ یہ خیال آتے ہی آپ فوراً ہوٹل سے نکل دوسرا دھندا کرنے چلے۔

ایک جگہ سرِ راہ گانا ہو رہا تھا، آپ موسیقی کے بڑے دلدادہ ہیں، بس وہیں ڈٹ گئے، کچھ دیر بعد جب کام یاد آیا تو چل پڑے۔ ایک دکان پر پہونچے۔ بہت سا سامان پسند کیا اور حکم دیا کہ اچھی طرح پیک کر دیا جائے حیدرآباد لے جانا ہے۔ کوئی دو سو روپے کا سامان ہوا، جب سامان کا بل آپکے ہاتھ میں دیا گیا تو روپے نکالنے شیروانی کے نیچے کی جیب میں جو ہاتھ ڈالا تو جیب مع نوٹوں کے "یا مظہر العجائب" تھی!! دکاندار نے مشورہ دیا کہ پولیس میں رپورٹ کرنا چاہیئے۔ تھانے پر اطلاع دی گئی، نام پتہ لکھوا دیا گیا۔ بمبئی پر کرڑتے رہے کہ چوروں اور جیب کتروں کی بستی ہے، کہیں ٹھہرنا مشکل! گانا سننا حرام!! ہوٹل میں جو "باقیات الصالحات" چھوڑ آئے تھے وہ کام آئے اور سامان کی قیمت ادا کر دی گئی۔ مگر نئی یہ آپڑی کہ آپ اب بمبئی نہ چھوڑ سکتے تھے، تھانہ دار صاحب کا یہ حکم تھا کہ سراغ لگنے تک بمبئی میں رہیں اور اس سلسلہ میں صبح شام ایک ہفتے تک تھانے پر حاضری دیتے رہے۔ چور نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر "تنگ آمد بہ جنگ آمد" ایک روز تھانہ دار صاحب سے جھڑپ ہو گئی۔ اُس نے کہا "ہم سراغ لگا رہے ہیں، نقدی کا ملنا دشوار ہے آپ اپنا حیدرآباد کا پتہ لکھوا دیں اگر مال برآمد ہوگا تو ہم آپکو بُلا لیں گے"۔ چلئے صبح شام تھانہ کی حاضری سے تو نجات ملی! اسی رات آپنے حیدرآباد کیلئے رختِ سفر باندھا، جو کچھ روپیہ بچا تھا اس کی جتن کیلئے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

صبح سویرے ایک دوست سے ملاقات ہوئی جو گلبرگہ جا رہے تھے۔ ہمارے "ملک التجار" نے اپنی بمبئی کی واردات اُن کو سنائی اور کہا کہ "ساری رات چوروں کے خوف سے نیند نہیں آئی، آنکھیں ملی جا رہی ہیں، جب آپ گلبرگہ پر اتریں جگا دینا"۔ جب گلبرگہ کا اسٹیشن آیا دوست نے جگا دیا، آپ جاگ تو پڑے مگر رات بھر جاگنے کی وجہ آنکھوں میں نیند کا طوفان برپا تھا، سو گئے اور کروٹیں بدل بدل کر خوب سوئے، جب آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ "پان چٹا بیڑی سگریٹ! ڈبل روٹی بسکوٹ!! گرم چائے!!!" وغیرہ کی صدائیں کسی اسٹیشن کا پتہ دے رہی تھیں۔ ڈبے سے سر نکالا تو ایک آسمانی بورڈ پر نہایت خوبصورت حروف میں یہ خطِ مشترک "نسخ و نستعلیق" رائچور لکھا نظر آیا۔ آپ کو بڑا تعجب ہوا کہ جاتے وقت یہ اسٹیشن کہیں نظر نہ آیا تھا۔ اس کھوج میں آپ اتر پڑے اور لگے ایک ایک سے پوچھنے کہ گاڑی حیدرآباد کب پہونچے گی۔ ایک صاحب نے کہا "اجی

حضرت! یہ گاڑی تو مدراس کو جاتی ہے نا!!"

آپ نے کہا: "مگر میں تو حیدرآباد جا رہا ہوں!"

انہوں نے پوچھا: "آپ کہاں سے آتے سو جی حضرت!"

کہا: "بمبئی سے۔"

ان ہی صاحب نے سوال کیا: "آپ واڈی کے جنکشن پر گاڑی کو کیوں نہیں بدل کو ڈالے؟"

جواب دیا: "واڈی تو آیا ہی نہیں!"

اتنے میں ٹکٹ کلکٹر آدھمکا ٹکٹ دیکھ کر اس نے کہا: "ٹکٹ تو حیدرآباد کا ہے آپ حیدرآباد کیوں نہیں گئے؟ یہ گاڑی تو مدراس جا رہی ہے!"

آپ نے کہا: "میں بھی تو یہی پوچھ رہا ہوں کہ یہ گاڑی حیدرآباد جاتے جاتے مدراس کی طرف کیسے نکل پڑی؟ عجب شتر بے مہار ہے! ادھر جی چاہا چل دی!!"

اس نے کہا: "آپکو واڈی پر گاڑی بدلنا چاہیے تھا!"

آپ نے پھر وہی کہا: "واڈی تو آیا ہی نہیں!" کچھ سوچکر پوچھا۔ "اچھا یہ تو بتاؤ یہاں سے مدراس کتنی دور ہے؟"

جواب ملا: "صرف چند گھنٹے کا راستہ ہے صبح ہوتے ہوتے مدراس پہونچ جائیں گے!"

فرمایا: "جب مدراس اتنا قریب ہے تو اس کو بھی کیوں نہ دیکھ لوں!..."

ٹکٹ کا محصلہ ادا کر دیا اور علی الصباح مدراس پہونچ گئے۔

دو تین دن مدراس کی سیر کی۔ لوٹتے وقت کہاری مچھلی اور سمندری جھینگوں کے دو چار تھیلے ساتھ رکھ لئے تاکہ عزیز و احباب میں بطور تحفہ تقسیم کریں، مگر اس تحفہ کی خوشبو سے ڈبہ مہک رہا تھا اور ہر کس و ناکس کی جھڑپ ہو رہی تھی، ایک اسٹیشن پر مسافر گارڈ کو کھینچ لائے، گارڈ نے پوچھا کہ تھیلے لگیج میں کیوں نہیں رکھوائے گئے؟"

فرمایا: "جیب کے روپے تک تو چور نہیں چھوڑتے لگیج کے سامان کا کیا ٹھکانہ!!"

واقعات سنکر گارڈ بھی مسکرایا اور شاکیوں کو یہ سمجھا کر سوار کرا دیا کہ تھوڑی دیر میں گاڑی "بجواڑہ" پہونچ جائیگی جانے بھی دیجئے۔

خدا خدا کر کے آپ مال تجارت اور تحائف کے ساتھ حیدرآباد پہونچے۔ تحفے تقسیم ہوئے، مال تجارت ادھار فروخت کیا گیا جو آج تک "ادھار" ہی ہے اور ساہوکار کی "دام دو پٹ" ڈگری میں جائیداد نیلام چڑھنے کو ہے۔ ملک التجار صاحب حیران ہیں آخر ان سے کہاں غلطی ہوئی تھی جو یہ خمیازہ بھگتنا پڑا۔

ملک التجار صاحب نے بمبئی کے ایوانِ تجارت سے درخواست کی ہے کہ وہ بہت جلد اپنے ایک غیر معمولی جلسہ میں یہ گتھی سلجھائے کہ ان سے کب، کہاں اور کس طرح غلطی ہوئی اور اب انہیں کیا کرنا چاہیئے؟!

چند دن بھی چین سے نہ گزرنے پائے تھے کہ ہمارے "ملک التجار" کو اس گھاٹے کو پورا کرنے کا خیال ستانے لگا۔ آپکے چند تجربہ کار دوستوں نے مشورہ دیا کہ حیدرآباد سے جلانے کی لکڑی بمبئی لے جاکر فروخت کریں، کیونکہ بمبئی میں "ہیزم سوختنی" بہت گراں بکتی ہے، ملک التجار کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اپنے مقطعہ کی لکڑی کٹوا کر چالیس چھکڑوں پر لادی، کیونکہ ریل کے ذریعے لکڑی لے جانے میں کوئی تین چار سو روپے کا خرچ آتا تھا۔ اور ایسا مقطعہ دار جس کے گھر پر "نیلامی ٹھپی" دو بار بول چکی ہے اور آخری مرتبہ بولنے کو ہے اتنی بڑی رقم بھلا کہاں سے لائے!

اس اندیشے سے کہ کہیں چھکڑے والے راستہ میں لکڑی نہ بیچ کھائیں، بلکہ "بغواتے" "مال عرب پیش عرب" ملک التجار صاحب بھی "کھاچر" میں ساتھ ہو لئے۔ ایک سچے دوست اور قدیم نوکر "گھڑوصاب" ہمسفر تھے۔

بمبئی کے جیب کتروں سے بچنے کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ شیروانی کے عوض کوٹ پہنا جائے۔ کچھ اورنگ آبادی ہمرو عرصہ سے رکھا ہوا تھا۔ اس میں دو کوٹ بن گئے۔ اونی پاجاموں اور "چور بازاری" بوٹ سے دونوں کا لباس مکمل ہوگیا۔ دو بھرمار بندوق، لوٹے، پاندان، خاصدان، پیچوان، بگھارے بیگن، میٹھی روٹی کا توشہ دان، یہ تھا کل سامان!

سفر کی طوالت کا خیال کر کے آپنے باضابطہ پروگرام بنالیا، پچھلے پہر کوئی تین بجے چل پڑتے، دوپہر سے عصر تک آرام لیتے، پھر رات کے کوئی آٹھ نو بجے تک چلتے اور کھانا کھا کر سو رہتے۔ خیال تھا کہ دس بارہ روز میں بمبئی پہونچ جائیں گے۔ پندرھواں دن آگیا مگر بمبئی کا پتہ نہیں! خدا خدا کر کے اٹھائیسویں دن "کھنڈلا" کے اونچے اونچے یا بقول آپ کے "قد آدم" پہاڑ دکھائی دئے! پہاڑوں کو دیکھتے ہی چھکڑے "الال" ہوگئے۔ یہ "مال گاڑی" رکتے ہی آپ کی کھاچر کا "بریک دان" بھی کھڑا ہو گیا بڑی سوچ بچار کے بعد دوست کی رائے ہوئی کہ بمبئی کا علاقہ شروع ہوگیا ہے، یہیں کہیں کوئی چھوٹا موٹا شہر تلاش کر کے لکڑی ٹھکے لگانا چاہیئے، مگر ان پہاڑوں میں کوئی ایسا شہر نہیں ملا!

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں چھکڑے واپس چلنے لگے!!

چل بہ چل، چل بہ چل، کچھ دن کے بعد پونہ پہونچے، رائے ہوئی کہ ان منحوس چھکڑوں کو بس یہیں ٹھکے لگا دینا چاہیئے۔ ایک لکڑی کی ٹال نظر آئی۔ ٹال والے نے فی چھکڑا چھ روپے قیمت لگائی۔ دوست تکرار پر آمادہ تھے مگر ہمارے ملک التجار نے جو اس "دلچسپ" سفر سے تنگ آگئے تھے فوراً معاملہ کرلیا۔ چھکڑے والوں نے تب غل مچا دیا۔ اُن کو اصرار تھا کہ کم سے کم آدھا کرایہ تو یہیں ملنا چاہیئے، مگر آپ کا ارادہ کچھ کرایہ ہضم کرنے کا تھا' بڑی مشکل سے آپنے چوتھائی کرایہ دیا، اس تقریب میں کوئی ڈیڑھ سو روپے نکل گئے، اگر کل کرایہ ادا کرتے تو جتنے میں لکڑی فروخت ہوئی تھی اتنا ہی اور جیب سے دینا پڑتا۔ غرضکہ ملک التجار صاحب کو یہ تجارت بھی راس نہیں آئی۔ دو مہینے کی گردش کے بعد حال ہی میں بخیر و عافیت آپ مراجعت فرما ہوتے ہیں۔ فی الحال اور کسی قسم کی تجارت کا ارادہ نہیں ہے۔ بمبئی کے ایوان تجارت کے جواب کے سخت منتظر ہیں۔ یہ سارے واقعات اس لئے منظر عام پر لائے گئے ہیں کہ تجارت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات آپکو مشورہ دیں کہ اب آپ کس قسم کی تجارت کریں!!

"جہاں نورد"

مجھے جس سے محبت ہے

مجھے جس سے محبت ہے

چمکتی ہیں ستاروں کی طرح اُس کی حسیں آنکھیں
گماں تو ہے ستاروں کا مگر ہیں بالیقیں آنکھیں
دُھلی ہے کہکشاں کے نور سے روشن جبیں اُس کی
ریاضِ خلد کی اک شام، زلفِ عنبریں اُس کی
بنے ہیں لعل لب اُس کے کلی کی مُسکراہٹ سے
تبسم شوخ ہے جن کا گلوں کی کھلکھلاہٹ سے
نگہ کا پھول جب میری نگہ پر وہ گراتی ہے
مری بے نور آنکھوں میں محبت جگمگاتی ہے
لقائے تیغِ برق افروز ہے گر ساعدِ سیمیں
بہارِ منظرِ قوسِ قزح ہے پیکرِ رنگیں
کنول کے اجلے اُجلے پھول دستِ مرمریں اُسکے
نگہ کو جن پہ پیار آئے وہ دستِ نازنیں اُسکے
حیا کی دل فروزی پھول سی پلکوں میں رہتی ہے
تعالی اللہ! اُس کی خوش نگاہی شعر کہتی ہے
کلی کی عطر افشاں سانس سے شیریں ہے خُو اُس کی
دُعائے صبحگاہی سے مقدس آبرو اُس کی
ستاروں کی نظر سے بھی نظر وہ کب ملاتی ہے
گلستاں میں وہ چشمِ ماہ سے چُھپ چُھپ کے آتی ہے
چمن کی دلکشی اپنے جلو میں اُس نے لے لی ہے
نسیم اُس کی ہے ہمجولی بہار اُس کی سہیلی ہے
وہ تصویرِ نزاکت ہے وہ تفسیرِ لطافت ہے
اُسی سے مجھ کو اُلفت ہے اُسی کا نام نگہت ہے

مہدی علیخاں

(ریڈیائی ڈرامہ)

منکہ ایک وکیل[1]

افراد

ایک وکیل صاحب — منشی جی
اُن کی بیوی — اللہ دیا

نووارد

سین

وکیل صاحب کا گھر نما دفتر

(گھنٹہ دس بجاتا ہے)

وکیل:- (جمائی لیتے ہوئے) آخاخاخا آآ آ — دس — بج — گئے۔ ہوں اں ں اُفوہ!! (اُونگھتے ہوئے) آج تو کچھ نیند سی آ رہی ہے — منشی جی؟ کچہری جا کر کیا کرنا ہے۔ کچھ کام وام تو ہے نہیں۔

(منشی جی خواب خرگوش میں مصروف ہیں۔ اُن کے خراٹوں کی آواز گھنٹہ کی ٹِک ٹِک سے ہم آہنگ ہو کر کمرے کی فضا میں نرم و نرم موسیقی کی لہریں پیدا کر رہی ہیں۔ خاص التزام سے سُریلے خراٹے لئے جا رہے ہیں۔ جن میں دُنیا بھر کے راگوں کی چاشنی ہے۔)

وکیل:- خ خ خ خوب، تو گویا منشی جی بھی ہمارے اس وقت چُنیا بیگم کے زیرِ حراست ہیں، یعنی بالکل ہی انٹاغفیل ہو رہے ہیں — چ چ چ چ چ — بیچارے کو طریقے سے سونا بھی نہیں آتا۔ کیا کرے....

(خراٹوں کا نشیلا نغمہ ذرا بلند ہوتا ہے)

وکیل:- .... ان خراٹوں کا اُتار چڑھاؤ تو دیکھو — اُفوہ!!

(خراٹے اور بھی بلند ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ ڈراؤنے بھی ہیں)

وکیل:- .... توبہ۔ توبہ۔ یہ شخص تو اپنے زہریلے سانسوں سے کمرے کی ہوا میں ضرب شدید لگا رہا ہے۔ مجبوراً مجھے عدالتی چارہ جوئی کرنی پڑیگی۔ جس کے ہرجہ خرچہ کے ذمہ دار — اجی منشی جی — منشی جی ی ی ی —!!!

(خراٹے اور بھی بلند ہوتے ہیں)

وکیل:- (بہت چیخ کر) منشی جی صاحب —!

منشی جی:- (گھبرا کر) حاضر — حاضر —!!!

وکیل:- (قہقہہ کے ساتھ) اجی قبلہ منشی جی صاحب۔ خدا کے لئے ان کالی جان سے اپنا پیچھا چھڑائیے، ورنہ یہ بدبخت اِغوا کر کے آپ کو حبس دوام بعبور دریائے شور کا مزہ چکھا دیگی — اس کا یہی طریقہ ہوتا ہے —

منشی جی:- (ذرا ناک میں بولتے ہیں۔ ان کے لب ولہجہ میں نون غنّہ بسا ہوا ہے) واہ (ں) حضرت (ں) واہ (ں) آں پ بھی ں ناحق پرں یشان کرتے ں ہیں ں ں۔

وکیل:- اماں، تو بندے خدا کے اس طرح گھوڑے بیچ کر سونے کا بھی کوئی طریقہ ہے۔ آخر کچھ کام بھی کرنا ہے یا نہیں۔

منشی:- کاں م۔ (خوش ہو کر) اس میں کیا شک ہے۔ اس میں کیا — واللہ! کیا کوئی کام آ گیا کیا؟! سچ بتائیے۔

وکیل:- یعنی یہ خوب ہوئی۔ ارے بھئی مجھ سے پوچھتے ہو کام کو۔ کیا خوب طریقہ ہے تمہارا بھی۔ کام لانا تمہارا کام ہے یا میرا کام۔ اور اگر یہی ہے میرا کام تو تمہارا کام کونسا ہے۔

منشی:- کاں م — کاں م — کاں م۔ نہ معلوم، کام کو کیا ہو گیا ہے — ان کام کرنے والوں کے حوصلے دیکھ دیکھکر ہمارا تو کام ہی تمام ہو گیا۔

وکیل:- چلئے انجام بخیر ہوا۔ دعویٰ مع خرچہ خارج — لیکن خدارا یہ تو بتائیے کہ دُنیا کے سارے رہنے بسنے والے سب مر گئے کیا۔ آخر یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ اماں، زندہ آدمی رہتے ہیں تو رہنے کے طریقے سے رہتے ہیں — دو چار

---

[1] اِس ڈرامے کے جملہ واقعات محض فرضی اور خیالی ہیں۔ تاہم کوئی وکیل بھائی اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھکر ہیں بہ جبیں ہوں تو اپنی قسمت پر ناز کریں۔ سوءِ اتفاق سے مصنف خود بھی وکیل ہے اس لئے یہ نتیجہ لازم نہیں آتا کہ اُس نے ذاتی حالات کی عکاسی کی ہے۔ لہذا کوئی کرم فرما زبردستی ترس نہ کھائیں۔ میری وکالت کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک آپ میرے موکل نہ بنیں — واجباً عرض کیا گیا۔ "انصار ناصری"

کا لڑائی دنگا ہوتا ہے، لٹھ بازی ہوتی ہے، چاقو چلتے ہیں، سر پھوٹتے ہیں، تھوڑا بہت خون بھی طریقے سے نکلتا ہے ــــ کوئی کسی کی رقم ہضم کر جاتا ہے۔ کسی کا مال نقب زنی سے اُڑایا جاتا ہے۔ کسی کی جرو اکسی کے ساتھ بھاگتی ہے ــــ وہ جواب میں دوسرے کا خون نہیں کرتا، تو کم از کم طریقے سے سر تو پھاڑ ہی دیتا ہے ــــ ارے بھئی، یہی طریقے ہوتے ہیں شریفوں کے رہنے سہنے کے ــــ اب بھلا تم ہی بتاؤ یہ بھی کوئی طریقے میں طریقہ ہے، کہ ایک سرے سے سب کو سانپ سونگھ گیا۔

منشی:۔ اس میں کیا۔ اس میں کیا شک ہے۔ یہی تو کہہ رہا تھا۔ لیکن .....

وکیل:۔ واقعی حیرت ہوتی ہے کہ یہ سبھی سب نے بالتفاق رائے سچ بولنا کیسے شروع کر دیا۔ کیا خوب طریقہ نکالا ہے۔

منشی:۔ اس میں کیا شک ہے جناب۔ یہی تو میں سوچ رہا تھا، کہ آخر ان لوگوں پر یہ کیسی خدا کی مار ہوئی کہ جسے دیکھئے بھلا آدمی بنا پھرتا ہے۔ یعنی واللہ جدھر دیکھئے شریف ہی شریف نظر آتے ہیں ــــ کل ہی کی بات ہے میں چوک سے گذر رہا تھا۔ اچھی خاصی بنی بنائی لڑائی بند ہوگئی۔ فریقین میں باہمی راضی نامہ ہوگیا۔ ورنہ وہ زدور دار تین سو تیئیس اور پانسو چار ۳۲۴/۵۰۴ لڑاتا کہ نام ہو جاتا ہے اس میں کیا ہے جناب وارنٹ نکلوا دیتا ــــ وارنٹ!! اور وہ بھی بلاضمانت۔ اور پھر گواہان استغاثہ کو وہ پٹی پڑھاتا کہ کھٹ سے (میز پر ہاتھ مارتا ہے) چھ مہینے کی ٹھک جاتی ــــ جی، اس میں کیا شک ہے جناب۔ یہ ہی نہ ہوتا تو جناب ازالہ حیثیتِ عرفی تو کہیں گئی ہی نہ تھی ایسی چٹ پٹی شہادتیں گذرتیں کہ مزہ آجاتا۔ پر کیا کروں۔ اس میں کیا شک ہے میری پھوٹی قسمت!!

("پھوٹی" کو زور سے کہکر ماتھے پر ہاتھ مارتا ہے۔)

وکیل:۔ خیر، چلئے جانے دیجئے، کوئی مضائقہ نہیں۔

منشی:۔ کوئی مضائقہ ہی نہیں؟ اجی یہی تو رونا ہے بابو جی! آپ کی انہی باتوں نے تو آپکو یہ دن دکھا دیا کہ کمرے میں ایک بھی مکھی نہ رہی۔

وکیل:۔ مکھی؟؟ کیا مطلب!! یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔

منشی:۔ جی ہاں۔ جس پر اقدام قتل کیا جاتا۔ اس میں کیا شک ہے جناب، خالی بیٹھے بیٹھے مکھیاں ہی ماری جاتی ہیں۔ اور کیا ہو سکتا ہے۔

وکیل:۔ یہ خوب کہا۔ (ہاہاہا)

منشی:۔ اجی کیا خوب کہا ــــ بندہ پرور ــــ سچی بات تو یہ ہے کہ آپسے وکالت ہو سکتی ہے، اور نہ مجھ سے آپ کی نوکری۔ غضب خدا کا پورا ایک سال ہوگیا، اور ایک بھی طریقے کا مقدمہ نہیں آیا۔ نہ دیوانی نہ فوجداری۔ نہ اجرا نہ نمبری۔ اور سب کو ڈالو بھاڑ میں کمبخت معمولی عرضی پرزے سے بھی گئے گذرے ہوگئے ــــ قسم مالک کی ان ہی ہاتھوں سے سینکڑوں کو جیل خانے بھجوا دیا۔ اور ہزاروں بالکل سچے دعوے خارج کروا کے پھینکدئے۔ آج یہ نوبت ہے کہ بیٹھے ہیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے۔

وکیل:۔ اجی، تو قبلہ منشی جی صاحب، اس میں میرا کیا قصور۔ کام نہ آئے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ طریقہ ہی کیا ہے۔

منشی:۔ کیسے کام نہ آئے۔ (جوش میں) ہم وہ ہیں، کہ قسم مالک کی مٹی میں سے کام پیدا کر دیں۔ دو بھلے مانسوں کو لڑوا دینا کون سی بڑی بات ہے۔ آن کی آن میں سترہ مقدمے کھڑے ہوتے ہیں۔ جناب، بیچ جانئے۔ خاک چاٹ کر کہتا ہوں۔ میں وہ ہوں کہ بڑے بڑے چالباز، اچھے اچھے چار سو بیس ۴۲۰ میرے آگے کان پکڑتے ہیں ــــ ایک اشارے پر مقدمات کا ڈھیر لگا دوں۔ بابو صاحب، پر کیا کروں عادت سے مجبور ہوں۔

وکیل:۔ ارے بھئی، تو میں نے کب منع کیا۔ جو جی چاہے کرو۔ لیکن دیکھنا، طریقے سے۔ ذرا اپنے ہاتھ پاؤں بچائے رہنا۔

منشی:۔ اجی توبہ کیجئے بابو جی ــــ ان باتوں میں کیا رکھا ہے ــــ یہ آپکی تعزیرات پھاڑ پیرات آور دل کیلئے ہے ہمارے لئے نہیں۔ قسم مالک کی سات خون معاف ہیں۔ اس میں کیا شک ہے۔ جی!!

وکیل:۔ (ہنستے ہوئے) افوہ!! اتنا خونریز طریقہ!!!

منشی:۔ نہیں جناب شرط یہی ہے کہ خون کی ایک بوند بھی نہ گرنے پائے۔ چاہے گھر کے گھر تباہ ہو جائیں، بڑی بڑی آسامیوں کے دیوالے نکل جائیں ــــ شریفوں کی عزت آبرو خاک میں مل جائے، اور پھر ہم الگ کے الگ ــــ ہاتھ کی صفائی اسکو کہتے ہیں، جناب۔

وکیل:۔ کیا کہنے ہیں۔ خیر چلئے زبانی جمع خرچ بہت ہو چکی۔ اب یہ بتائیے کہ اپنی وکالت کے چھکڑے کو کس طریقے سے دھکیلا جائے۔

منشی:۔ اجی رہنے بھی دیجئے ــــ اوں ہوں!! (قدرے خاموشی) آپنے مجھ سے پوچھا کب۔ جو چاہا کرتے رہے۔ اسی لئے آج یہ حالت ہے کہ چھ مہینے کا مکان کا کرایہ چڑھا ہوا ہے، اور آدھی سے زیادہ کتابیں کباڑیے کی نظر ہو چکیں، اگر آپ ایک مرتبہ بھی میرے کہنے پر چلتے، تو اس میں کیا شک ہے۔ اس میں کیا ہے جناب آج یہ نوبت نہ آتی۔

وکیل:۔ خیر، خیر، گذشتہ راصلوٰۃ۔ یہ عذرات بوجہ زائد المیعاد ہونے کے خارج۔ اب یہ بتائیے کہ آئندہ کونسا طریقہ اختیار کیا جائے۔ میں ہر طرح آپکے مشوروں پر چلنے کو تیار ہوں۔

منشی:۔ تو لکھ دیجئے ایک عدد اقرار نامہ۔ جو میں کہوں وہ کرنا ہوگا۔ قسم مالک کی اگر چاندی نہ برسنے لگے، تو میرا ذمہ، جی۔ اس میں کیا شک ہے، جناب!!

وکیل:۔ منظور، یہ لیجئے لکھتے۔ مایانکہ فلاں ابن فلاں ساکن فلاں کے ہیں۔ جو کہ

بقیامِ ہوش و حواس اقرار خود برضا و رغبت اپنی کے کرتے ہیں کہ . . . .

منشی:۔ (جلکر) اُف، توبہ توبہ، پھر وہی مذاق! بھلا اس خیالی پلاؤ میں آپکے قانونی بگھار کی کیا ضرورت ہے۔

وکیل:۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اقرار نامہ لکھدوں ـــ اور کونسا طریقہ ہے۔ اچھا جانے دیجئے۔

منشی:۔ سُنیئے۔

وکیل:۔ فرمائیے!!

منشی:۔ اس پیشے میں سب سے پہلی چیز ـ گویا سب سے پہلی۔ موکلوں کو پھانسنا ہے ـــ سمجھے جناب!!

وکیل:۔ موکلوں کو پھانسنا!! بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ گویا وکالت نہ ہوئی چڑی ماری ہوگئی۔

منشی:۔ اجی اس سے بھی زیادہ ـــ آج کل کے موکل بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ دانے پانی کی لاگ پر نہیں آتے۔ کمبختوں کو رسّی سے باندھ کر رکھنا پڑتا ہے۔ رسّی سے اور وہ پھر بھی تڑا تڑا کر بھاگ نکلتے ہیں۔ جی، اس میں کیا شک ہے جناب ـــ!

وکیل:۔ پھر اس کا علاج کس طریقے سے کیا جائے۔

منشی:۔ پس گُر کی بات ایک ہی ہے، کہ موکلوں کو ڈرا کر، دھمکا کر، جھوٹی سچی اُونچ نیچ سمجھا کر، بہلا کر، پُھسلا کر سبز باغ دکھلائے جائیں اور پھر ایسے شیشے میں اُتارا جائے کہ وہ آپ ہی کا دم بھرنے لگیں۔ سمجھے جناب۔

وکیل:۔ خُوب۔

منشی:۔ جی اس میں کیا شک ہے۔ اور چاہے آپ ان کا ذرا سا بھی کام کرکے نہ دیں۔ اُنہیں سزائیں کروا دیں۔ ان کی قرقیاں نکلوا دیں۔ پھر بھی وہ آپ ہی کے نام کی مالا جپتے رہیں ـــ اور اپنے گھر کا سارا مال و اسباب حتیٰ کہ اپنی پیاری بیویوں کا زیور بیچ بیچ کر آپ کا محنتانہ ادا کرتے رہیں۔ بس۔ اس میں کیا شک ہے جناب، اگر آپنے اتنا کر لیا تو بیڑا پار ہے۔

وکیل:۔ بس؟؟؟

منشی:۔ جی ہاں بس۔ آپ کا کام صرف اتنا ہی ہے۔ باقی عدالت جانے اور وہ۔ وکیل کا کام صرف یہی ہے کہ وہ اپنے موکلوں کو پوری طاقت سے پکڑلے ہے اس میں کیا شک ہے جناب۔

وکیل:۔ آپنے تو کمال کر دیا منشی جی، کس صفائی کے ساتھ کوزے میں دریا کو بند کیا ہے۔ گویا وکیل کا کام موکلوں کو تابع کرنا اور محنتانہ نذرانہ وغیرہ شکریے کے ساتھ ہضم کرنا ہے، بس۔

منشی:۔ (جلدی سے)، اور منشیانہ نہ بھول گئے گا، جناب۔ دس فی صدی نقد۔

ہاں جناب۔ اس میں کیا شک ہے، اس میں کیا شک ہے۔

وکیل:۔ تو بھئی ان موکلوں کو تابع کرنے کا وہ کونسا عمل ہے۔ ذرا وہ بھی تو بتائیے۔ کیا طریقہ ہے۔ وہ کونسا ایسا منتر ہے کہ چھُو کیا اور موکل رام ہوا۔

منشی:۔ منتر و نتر کچھ نہیں ـــ بابو جی، یہ چیز ہی اور ہے۔ مگر بہت مشق کی ضرورت ہے۔

وکیل:۔ پھر بھی طریقہ تو کچھ معلوم ہو۔

منشی:۔ دیکھئے، پہلا منتر تو یہ ہے کہ جیسے ہی موکل کے قدموں کی آواز آئے آپ فوراً ایک موٹی سی کتاب کھول کر اس میں غرق ہو جائیں۔ ماتھے پر موٹے موٹے بل ڈال کر اس قدر زور اور غور سے مُطالعہ کریں کہ آپ کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہے۔

وکیل:۔ تن بدن کا بھی ہوش نہ رہے!؟؟

منشی:۔ جی ہاں تن بدن کا بھی ہوش نہ رہے۔ لیکن موکل کی موجودگی کا ضرور ہوش رہے۔ اس میں کیا شک ہے جناب، جی ہاں، ـــ ذرا کن انکھیوں سے موکل کو تاکتے رہنا چاہیئے ـــ کہیں کھسک نہ جائے۔

وکیل:۔ ٹھیک ٹھیک ٹھیک۔ یہ خوب طریقہ ہے۔ (ہا ہا ہا)

منشی:۔ دوسری بات یہ کہ کبھی موکل سے سیدھے مُنہ بات نہ کیجئے۔ ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتے رہیئے۔ کاغذات کو جھٹک پٹک کر نفرت کی نگاہ سے ذرا دیر دیکھ کر اپنی مصروفیت کا راگ تیری سپتک پر پورے جوش کے ساتھ برابر الاپتے رہیئے۔ اور پھر لمبی چوڑی فیسوں کے حوالے کے ساتھ اپنی شاندار فتوحات کا سکّہ بٹھائیے ـ جی ـ اس میں کیا شک ہے، جناب۔

وکیل:۔ اس سے فائدہ؟

منشی:۔ فائدہ یہ کہ موکل پر ایسا رعب جمتا ہے، ایسا رعب جمتا ہے کہ وہ سہم کر رہ جاتا ہے۔ اور یقین کر لیتا ہے کہ وکیل صاحب بہت ہی بڑے اور بھاری قسم کے ہیں۔ ہاں ں ں۔ اس میں کیا شک ہے جناب!

وکیل:۔ خوب طریقہ ہے، پھر؟؟

منشی:۔ تیسرا منتر یہ ہے، کہ موکل کی بات کبھی غور سے نہ سُنیئے، اس کی عاجزی اور غریبی پر کبھی ترس نہ کھائیے۔ صاف کہدیجئے کہ میں ایسے فضول مقدمات نہیں کرتا۔ شروع سے معاملات بگاڑ دیئے گئے ہیں۔ میں اب کیا کر سکتا ہوں۔ بہت محنت کرنی پڑیگی وغیرہ وغیرہ۔ سمجھے آپ؟

وکیل:۔ ہوں؟ (آہستہ) اور جو وہ مایوس ہو کر چلدے۔

منشی:۔ کیسے چلا جائے۔ ان باتوں سے تو اس میں کیا شک ہے، ایسا گرویدہ ہوگا کہ خوشامد نہ کرنے لگے تو میرا ذمہ۔ بس پھر من مانی فیس طلب کیجئے۔ جی۔ اور کیا۔

وکیل:۔ اور اگر وہ اتنا نہ دے سکے اور چلدے؟

منشی:۔ کیسے چلدے۔ وہ دے اور اُس کا باپ بھی دے۔ اور جب بالکل ہی جاتا دکھائی دیگا، تو میں جو بیٹھا ہوں۔ ایسا آڑے ہاتھوں لوں کہ بچا مُنہ کے بَل گریں۔ جی قسم مالک کی، میرے کاٹے کا علاج ہی نہیں ۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔ اس میں کیا شک ہے ۔۔۔ آدھے پونے پر فیصلہ کر کے چھوڑوں گا ۔۔۔ سمجھے جناب عالی۔

وکیل:۔ طریقہ تو خاصا ہے۔

منشی:۔ اس میں کیا شک ہے۔ ایسی ترکیب ہے کہ کمبخت پانی نہیں مانگ سکتا۔ لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھئے کہ اپنی فرضی مصروفیتوں کا دُکھڑا برابر روتے جائیے۔ ذرا آپ کا سانس رُکا، اور موکّل اکھڑا مسلسل کچھ نہ کچھ کہے جانا، بس یہی کامیابی کا راز ہے ۔۔۔ اور ہاں یہ بھی یاد رکھئے۔ کہ موکّل کو حق الیقین ہو جائے کہ . . . . . .

وکیل:۔ حق الیقین یا ڈھل مل یقین ۔۔۔ !!

منشی:۔ (جوش سے) اجی ایسا یقین جیسے پتھر پر لکیر ۔۔۔ یہ بات اُسکے ذہن میں بٹھا دیجیے، کہ معاملہ ہر چند معمولی سہی، لیکن اُس نے اگر آپ کو وکیل نہ کیا، تو بس جان کا خطرہ ہے۔ سمجھے آپ ۔۔۔ یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے، کہ آپ کو موکّل سے خدا معلوم کیوں حق ناحق کی ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ نسخہ بھی بڑا کارآمد اور مجرب ہے ۔۔۔ جی ہاں، اس میں کیا شک ہے۔

وکیل:۔ واہ، واہ منشی جی۔ کیا کیا طریقے نکالے ہیں آپنے۔ شاباش ہے آپکو بھی۔ آیندہ سے ہمارا بھی یہی طریقہ رہیگا۔ اور آج ہی سے اسی طریقے پر عمل شروع ہوگا ۔۔۔ اب مَیں اندر جا کر کھانا کھاتا ہوں۔ کوئی ایسا ویسا آئے تو سنبھال لیجئے گا۔ (کھٹ پٹ)

منشی:۔ اس میں کیا شک ہے ۔۔۔ اور ہاں سنئے تو ۔۔۔ چار دن سے مارونڈمل کا آدمی پھیرے کر رہا ہے ۔۔۔ کیا آپ نے کچھ اُدھار لیا تھا؟

وکیل:۔ (ذرا شرمندہ ہو کر) ہاں بھئی۔ منشی جی، اب آپ سے چھپانے کا کونسا طریقہ ۔۔۔ گھر کی ضرورت کے لئے کچھ روپے لئے تھے۔ واپس کہاں سے دئے جائیں۔ کوئی طریقہ ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر ۔۔۔ دیکھو ۔۔۔ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائیگا۔

منشی:۔ اس میں کیا شک ہے لیکن وہ تو کہتا تھا لالہ جی سخت ناراض ہیں ۔۔۔ اور دعویٰ کرنے کو کہتے ہیں۔

وکیل:۔ آپ نمٹ لیجئے گا۔

منشی:۔ آپنے بھلا فکر کیا۔ آنے دو بدمعاش کو۔ بائیں ہاتھ سے ایسا چکر دوں کہ رہے نام مالک کا۔ اور کیا جناب اس میں کیا شک ہے۔

وکیل:۔ (دور سے) قہقہہ واقعی۔ اس میں شک کرنے کا کونسا طریقہ ہے۔ ہاہاہا۔

(ہنستا ہوا اندر جاتا ہے، پاؤں کی چاپ، گھنٹے کی آواز بند)

وکیل:۔ اللہ دتے! اللہ دتے!! (دُور سے آواز آتی ہے، پھر قریب ہو جاتی ہے۔ پاؤں کی چاپ۔ گویا دو کمرے میں آگئے) کہاں گیا بھئی۔ اللہ دیا۔ کھانا وانا تیار ہے، یا بازار سے منگایا جائے۔ ارے اللہ دتے ۔۔۔ او اللہ دتے۔ جا بھئی دہی تو لیکر آ ۔۔۔ ارے رے رے یہ کیا۔ یعنی گھر پورا دھوبی گھاٹ بنا ہوا ہے۔ بھلا یہ کونسا طریقہ ہے۔

بیوی:۔ تشریف لے آئے آپ طریقہ طریقہ بگھارتے ہوئے۔

وکیل:۔ شے شے شے۔ مَیں کہتا ہوں کہ آخر اس ٹھنڈ میں اس طرح کپڑے دھونیکا کون طریقہ ہے ۔۔۔ چلو چلو۔ چھوڑو اس گڑبڑ کو۔ کھانا وانا کھلواؤ جلدی سے ۔۔۔

(قدرے خاموشی)

وکیل:۔ بھئی کمال ہے۔ ہر کام کا طریقہ ہوا کرتا ہے۔ یہ کپڑے وپڑے دھونیکا کیا طریقہ نکالا ہے۔ بس اب ہو چکا۔ یا اب گھر کی دیواروں پر بھی استری ہوگی۔ چلو چلو چلو۔ آؤ۔ بس۔ چھوڑو بھی۔ طریقے سے کھانا نکالو۔

بیوی:۔ (جلکر) بھاڑ میں جائے آپ کا طریقہ ۔۔۔ کپڑے نہ دھوؤں تو کیا موری کی چوہیا بنی رہوں۔ آپ کو تو خدا نے پیٹ بھر کے بے غیرتی بخشدی ہے۔ اتنا میرے لئے ور در کھتے ہیں تو بنوا دیجئے نا دس بیس جوڑے۔ کمبخت دھوبن تک کے پیسے تو جُڑتے نہیں۔ ایک یہی جوڑا تن پر رہ گیا ہے۔ آپ کی سی حالت تو مجھ سے بنائی نہیں جاتی۔ کہ جیکٹ کی حالت کے کپڑے بڑے سگھڑاپے سے پہنے پھروں۔ میں کہتی ہوں . . . . . .

وکیل:۔ افوہ۔ افوہ۔ خدایا رحم۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم بھری بیٹھی ہو۔ ورنہ طریقے سے گفتگو کرتا ۔۔۔ بیگم!! گھبراؤ نہیں۔ جلد، بہت جلد، ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔ خدا نے چاہا تو میں اپنی پیاری بیگما کو زربفت و کمخواب کے کپڑے پہناؤنگا۔ جلد ۔۔۔ بہت ہی جلد ۔۔۔ بس دو ایک دن کی بات ہے۔ ہم نے ایک نیا طریقہ نکالا ہے۔

بیوی:۔ بس رہنے دیجئے، ہر روز یہی سُنتی ہوں۔ کہ بس دو ایک دن کی بات ہے۔ دو ایک دن کی بات ہے ۔۔۔ مَیں تو عنقریب منشی جی سے تھوڑی سی افیم مانگنے والی ہوں۔

وکیل:۔ ارے ررر، خدا کیلئے ایسا غضب نہ کرنا ۔۔۔ لو چلو، بس اب من جاؤ۔ زیادہ باتیں بے طریقے ہوتی ہیں۔ کھانا کھلواؤ لپک کر۔

بیوی:۔ آپنے بھی تو گھر میں گھستے ہی ایسا شور مچانا شروع کر دیا، جیسے کوئی بڑے کماؤ تھکے ہارے گھر میں گھستے ہیں۔ اور آتے ہی تھیلیوں کے مُنہ کھول دینگے۔

کھانا تیار ہے، لیکن کیا ریل پر جانا ہے جو ایسی مارا مار ہے۔

وکیل۔ دیکھو بیگم۔ اب زیادہ طعنے ہم کسی طریقے سے نہیں سُن سکتے۔ ریل پر نہیں جانا تو کیا دُنیا کا اور کوئی کام ہی نہیں۔ تم نہیں سمجھ سکتیں ایک وکیل کو کس قدر مصروفیتیں ہوتی ہیں۔

بیوی۔ جی، بڑی بھاری مصروفیتیں ـــ واقعی دن دن بھر اُونگھتے رہنا اور پھر نہایت خوبصورت اور نفیس ہوائی قلعے بنانا بڑی بھاری مصروفیتیں ہیں ـــ کیوں نہ ہو ـــ کیوں؟؟؟

وکیل۔ ہا ہا ہا۔ کرگئیں نہ چوٹ طریقے سے۔ کیوں نہ ہو۔ آخر وکیل کی بیوی ہو۔ ارے بھئی اللہ دتے۔ تو ابھی تک یہیں کھڑا ہے لایا نہیں دہی۔

اللہ دیا۔ پیسے تو دیجئے۔

وکیل۔ ارے بھئی تجھ سے لاکھ دفعہ کہا کہ ایسے معمولی سودوں کیلئے پیسوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ جا ـــ رام کشن پان والے سے ہمارا نام لیکر ایک ماچس کا بکس لے اور اسی سے دو پیسے لیکر دہی لے آ۔

اللہ دیا۔ اجی اُسی کے پاس تو گیا تھا۔ وہ تو مارنے کو دوڑتا ہے۔ کہتا ہے پہلے کے گیارہ روپے تین آنے لا۔ جب تک پچھلا حساب صاف نہیں ہوگا۔ ہم آگے کو اُدھار کیسے دیں۔ ایسا بیوپار ہمارے ہاں نہیں ہوتا۔

وکیل۔ بڑا نامعقول بیہودہ۔ میں حرامزادے کے اُوپر دعویٰ کردونگا۔

بیوی۔ آخر یہ گیارہ روپے تین آنے ہو کس طرح گئے ـــ آپ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ اب معمولی پنواڑیوں کے بھی دس دس اور بیس بیس کے قرضے ہونے لگے۔ کیوں نہ ہو۔ وکیل صاحب ہیں۔

وکیل۔ دس دس اور بیس بیس کہاں سے ہوگئے۔ طریقے سے سُنتی بھی ہو۔

بیوی۔ کہہ تو رہا ہے اللہ دیا کہ گیارہ روپے تین آنے چاہئیں۔

وکیل۔ بکتا ہے نامعقول، گیارہ روپے تین آنے نہیں۔ طریقے سے تین روپے گیارہ آنے ہوتے ہیں۔

اللہ دیا۔ نہیں جی، بابو جی۔ مجھے ٹھیک یاد ہے گیارہ روپے تین آنے ہی چاہئیں وہ کئی دن سے تقاضہ کر رہا ہے۔

وکیل۔ چُپ رہ نامعقول ـــ بکے جاتا ہے، بکے جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے جا جلدی سے دہی لیکر آ۔

اللہ دیا۔ تو پیسے تو دیجئے، بابو جی۔

وکیل۔ پھر وہی پیسے پیسے کی رٹ لگائے جاتا ہے۔ جا باہر منشی جی بیٹھے ہونگے، میرے نام سے دو پیسے لے لے۔ مگر دیکھ طریقہ سے مانگیو (اللہ دیا کچھ گنگناتا ہوا جاتا ہے) خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں یہ لوگ ـــ دہی منگوانا نہ ہوا گویا کچہری قرقی نکلوانی ہوگئی۔

(باہر منشی جی کے بڑبڑانے کی آواز)

بیوی۔ میں کہتی ہوں آخر یہ حالت کب تک جاری رہیگی۔ گھر کا سارا سامان، میز کرسی فرش فروش کے علاوہ میرا تار تار بک گیا۔ اور آپ کی وکالت کا چھکڑا ایسا دلدل میں پھنسا ہے کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ میں پھر کہتی ہوں کہ چھوڑیئے اس وکالت پھکالت کو ـــ یہ مُصیبت آپکے بس کی نہیں۔

وکیل۔ مگر اس مُصیبت سے نجات پانے کا بھی تو کوئی طریقہ بتاؤ ـــ اگر وکالت چھوڑ دی جائے تو پھر کیا کیا جائے؟؟

(قدرے خاموشی)

بیوی۔ جوتوں کی دُکان ـــ!!!

وکیل۔ جوتوں کی دُکان ـــ توبہ توبہ۔ شے شے، بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ کیا تم نے ہم کو بالکل چمار ہی سمجھا ہے۔

بیوی۔ بالکل تو نہیں، لیکن ہاں خیر ـــ خیر جانے دیجئے۔ اور یہ تو فرمایئے۔ آج کچہری کیوں نہیں گئے۔ مُفت کی چھٹیاں خوب اُڑاتے ہیں آپ۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کو بھی جی نہیں چاہتا پھر بھلا ـــ

وکیل۔ دیکھو بیگم۔ یہ طعنوں کا طریقہ اچھا نہیں۔ کچہری کیا ہماری سُسرال ہے کہ نہیں گئے تو تم گلا کرنے بیٹھی ہو۔

(اللہ دیا گنگناتا ہوا آتا ہے۔)

اللہ دیا۔ جی، وہ منشی جی کہتے ہیں، کہ میرے پاس زہر کھانے کو بھی پیسہ نہیں۔ چار دن سے بیڑی تک کو ترس رہا ہوں۔

وکیل۔ (ہار کر) بات تیری ایسی کی تیسی۔ پھونکو دہی کو۔ کیا یہی طریقہ رہ گیا ہے۔ لاؤ جی تم کھانا لاؤ۔

بیوی۔ شرم تو نہ آتی ہوگی۔ (کنجیوں کی آواز اور پھر صندوقچہ کھولنے کی آواز) بے غیرتی عجب نعمت ہے، جس کو خدا دے ـــ لے رے اللہ دتے ـــ یہ پیسے لے، جا دوڑ کر دہی لے آ۔

(اللہ دیا گنگناتا ہوا جاتا ہے)

وکیل۔ (خفیف ہنسی ہنستے ہوئے) تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم بہت اچھی ہو، نیک بیویوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے ـــ اچھا بیگم اب صندوقچہ کھولا ہے تو لاؤ ایک سگریٹ بھی پلا دو۔

بیوی۔ جی نہیں، معاف کیجئے۔ صبح سے دو سگریٹ آپ پی چکے ہیں۔ صرف تین باقی ہیں۔ ایک کھانے کے بعد۔ ایک شام کو اور ایک رات کیلئے۔ ٹھیک ٹھیک حساب ہے اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

وکیل۔ یہ حساب کتاب کا کیا طریقہ ہے ـــ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم۔

بیوی۔ جی بڑی مہربانی بڑی عنایت ـــ آپ کا سر ابھی تک سگریٹ سے

زیادہ قیمتی ثابت نہیں ہوا۔ زیادہ شوقینی کرنی ہے تو اپنی جیب سے سگرٹ نوش فرمایا کیجئے۔ میں کہاں تک آپکو دو پیکٹ روزانہ پلاتے جاؤں۔

وکیل:۔ دو پیکٹ روزانہ پلاتی ہو؟ — ارے خدا کے غضب سے ڈرو۔ تین دن میں ایک پیکٹ بھی نہیں نصیب ہوتا — اچھا خیر — لاؤ اس وقت تو دو شام کو نہیں پیونگا۔ وعدہ کرتا ہوں۔

بیوی:۔ بہت دیکھ چکی ہوں آپکے وعدے۔ اب کھانے کے بعد پیجئے گا۔

وکیل:۔ کھانے میں تو ابھی گھنٹوں پڑے ہیں۔

بیوی:۔ نہیں نہیں کھانا تو تیار ہے — (اللہ دیا گنگناتا ہوا داخل ہوتا ہے) لو۔ وہ آگیا اللہ دیا — لا بھئی کھانا لا۔ جلدی —

وکیل:۔ آہ — مرد کے ساتھ ہو بڑی ظالم — خیر — دیکھا — جائے — گا۔

کوئی دم گر زندگانی اور ہے
ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

(برتنوں کی آواز)

اگر روزانہ سو سو سگرٹ نہ پی جایا کروں تو بات ہی کیا۔ پھر تو تم جل جل کر کوئلہ کباب بن جاؤگی — کیوں؟ (ہنستا ہے)

بیوی:۔ (ذرا فاصلے سے) میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ جلے یا بھنے — اور ابھی تو یہی دیکھنا ہے کہ آپ کی یہ دھواں داری آتی کس دن ہے — جفا کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے!!

وکیل:۔ بہت جلد دیکھ لینا۔ (ہنستا ہے) ع:۔

خدا ترا ابتِ ناداں دراز سن تو کرے!!

اللہ دیا:۔ (گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے) بابو جی، بابو جی، کوئی آیا ہے، کوئی آیا ہے — موکل —!!!

وکیل:۔ موکل — آگیا۔ آگیا۔ ہو ہو ہو۔ ہی ہی ہی۔ کیا کِ کِ کیا واقعی — آگیا۔ کون ہے، کون ہے۔

اللہ دیا:۔ موکل۔

وکیل:۔ اوہو ہو۔ موکل۔ موکل۔ آگیا آگیا۔ کیا سچ؟!

بیوی:۔ توبہ، توبہ — آخر اتنا شور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آگیا ہے تو آجائے —

وکیل:۔ ارے اللہ دتے، او اللہ دتے۔ جا، جا۔ دیکھ کر آ۔ منشی جی سے کیا باتیں ہو رہی ہیں — (فاصلے سے) جلدی آیو۔

(اللہ دیا دوڑا ہوا جاتا ہے۔ منشی جی کی التجا آمیز بڑبڑاہٹ کی آواز آتی ہے۔)

وکیل:۔ (دھیمی آواز میں) ہاں۔ ہاں ہاں۔ کوئی ہے۔ واقعی کوئی موکل ہے۔ آگیا۔ آگیا۔ ہو ہو ہو۔

بیوی:۔ (بلند آواز سے) اتنی گھبراہٹ کاہے کی ہے۔ آگیا ہے تو بیٹھا رہیگا۔ کہیں بھاگا تو نہیں جاتا۔ آپ کھانا تو کھائیے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے — ناحق دیوانے بنے جا رہے ہیں۔

وکیل:۔ (دھیمی آواز میں) شش شش۔ چپ چپ چپ۔ تم نہیں جانتیں۔ یہ موکل لوگ چھلاوے کی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب ہو جاتے ہیں — انکا یہی طریقہ ہے — کھانے کا فکر نہ کرو۔ آج ضرور اُسے پھانسا جائے گا۔ منشی جی والے طریقے آج ہی آزمائے جائیں گے۔ (اللہ دیا آتا ہے) — کیوں بے اللہ دتے۔ کیا —

اللہ دیا:۔ (گھبرائی ہوئی دھیمی آواز میں) منشی جی کہہ رہے ہیں کہ کوئی موٹی سی اسامی ہے آپ ذرا اچھے کپڑے پہن کر جلدی آئیں۔

وکیل:۔ ہاں ہاں۔ اچھے کپڑے۔ جلدی کرو۔ دیکھنا بھئی وہ میرا سلک کا کوٹ نکال دو۔ ذرا جلدی — ارے بھئی جلدی کرو — (دور سے) یہ کوٹ کیسا ہے؟؟؟ (ٹرنک کھولنے کی آواز) ارے یہ تو یہاں سے اُدھڑ گیا — وہی ٹھیک رہے گا — (قریب سے) نکالدیا —؟؟؟۔ اتنے بھی جلدی کرو — یہ کیا طریقہ ہے — (دور سے) اس پہ بھی سیاہی کے دھبے پڑے ہیں — (کپڑوں کے اُلٹ پلٹ کی آواز) — (قریب سے) نکالدیا —؟؟ — نکال بھی چکو۔

بیوی:۔ توبہ ہے۔ نکال تو رہی ہوں۔ ہاتھ پاؤں پھلائے دیتے ہیں۔ زمانے بھر کا تو کھڑاک بھرا ہے اس میں —

وکیل:۔ ایسا بھی کیا پاتال میں رکھا ہے۔ ارے جلدی کرو موکل بھاگ جائیگا۔ (دور سے) یہ شیروانی کیسی رہے گی؟ — (قریب سے) ارے اس پر تو تمام چڑیا کی بیٹیں ہی بیٹیں پڑی ہیں۔ توبہ — یہ کیا طریقہ ہے۔ یہ دیکھوں دکھانا دکھانا؟ یہ کیا ہے۔ اچھا کپڑا ہے۔ ہاں ہاں بس یہ ٹھیک رہیگا۔ نہایت نفیس — ارے یہ تو تمہارا جمپر ہے!! لاحول ولا قوۃ!! بھلا یہ کیا طریقہ ہے اپنی چیزیں بھی ٹھکانے سے نہیں رکھ سکتیں۔ میرے ٹرنک میں یہ کس طریقے سے گھس گیا۔

اللہ دیا:۔ جی، وہ منشی جی کہتے ہیں، کہ جلدی آئیے۔ مال ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے۔

وکیل:۔ ہاں ہاں۔ جلدی کرو جلدی۔ نکال بھی چکو۔ دیکھ بھئی۔ منشی جی سے کہہ کہ ذرا طریقے سے بات کریں۔ بابو جی ابھی آتے ہیں۔ بحث تیار کر رہے ہیں۔ جا لپک کر جا — ہاں ہاں۔ یہی ہے۔ لاؤ۔ جلدی۔ واسکٹ کی ضرورت نہیں۔ لاؤ اب کوئی عمدہ سی ٹائی نکالو — اُفوہ — یہ تو جگہ جگہ سے گل

گیا۔ نہایت واہیات کپڑا نکلا۔ ہماری سسرال والے بھی نہایت کائیاں ہیں۔ جوڑا بھی دینے بیٹھے تو ایسا کہ ایک دفعہ سے زیادہ پہننا نصیب نہ ہوا۔ بڑا دھوکہ ہوا ہمارے ساتھ۔ شے شے شے — !!!

بیوی:۔ (جلکر) کیا کہا ہوش کی دوا کیجئے۔ بندہ پرور دُعا دیجئے سسرال والوں کو جنہوں نے آدمی بنا دیا۔

وکیل:۔ خیر خیر خیر۔ چھوڑو اس بحث کو — جانے دو — ذرا اس کوٹ کے کالر کو تو دیکھو۔ بالکل دُہرا ہو گیا۔

بیوی:۔ اب اس وقت استری تو ہو نہیں سکتی — لائیے ذرا پانی کا ہاتھ لگا کر دُرست کر دوں۔ (قدرے خاموشی)

وکیل:۔ اور ذرا ان پتلون صاحبہ کی کریز ملاحظ ہو۔ کیا صراطِ مستقیم ہے !!! (تھپ تھپ تھپ کوٹ پر ہاتھ مارنے کی آواز) بس بس بس زیادہ نہیں — اب ٹھیک ہو گیا۔

بیوی:۔ اور وہ موکل ہنسے گا نہیں کہ ٹھیٹ جاڑوں میں وکیل صاحب یہ ٹھنڈا برف سوٹ ڈانٹے ہوئے ہیں۔

وکیل:۔ موکلوں کو اتنی تمیز نہیں ہوتی۔ ان کو تو بس یہ دکھائی دینا چاہیئے کہ سوٹ ہے۔ یہی طریقہ ہوتا ہے۔ (قدرے خاموشی) — لے یہ لیجئے ٹائی ٹھیک کرنے میں ذرا ہاتھ لگا کہ کالر صاحب کی نیت پھر ڈانواں ڈول ہو گئی۔

بیوی:۔ لائیے میں پن لگا دوں۔ مگر پن کہاں سے ملے اس وقت — جانے بھی دیجئے۔ آپ یہاں ہاتھ رکھ لیجئے گا۔ گویا سینے میں درد ہے۔

وکیل:۔ ہاں طریقہ تو اچھا ہے — اچھا لاؤ اب تو سگریٹ دیدو۔ جلدی کرو۔

(صندوقچہ کھولنے کی آواز)

— ہائے رے پتلون تیری ادائیں — !!

بیوی:۔ یہ لیجئے۔

وکیل:۔ ارے یہ ایک سگریٹ کیسا۔ پورا پیکٹ دو جی۔ آخر موکل کو بھی تو پلانا ہوگا۔ یہ کونسا طریقہ ہے۔

بیوی:۔ لو بابا — لو — پیچھا چھوڑو۔

(جلدی جلدی آتے ہیں گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز)

وکیل:۔ ایہم — !!

منشی:۔ بابو جی تشریف لے آئے۔

نووارد:۔ آداب عرض کرتا ہوں جناب۔

وکیل:۔ (بے رُخی سے) منشی جی وہ رانا دلاور سنگھ کو تار دیدیجئے کہ اگر محنتانہ کے بقایا پانچ سو وصول نہیں ہوں گے تو ہم اپیل میں بحث نہیں کریں گے۔ (بولنے کی آواز بتدریج بڑھتی ہے) اور وہ دیکھئے تو — خان بہادر صاحب ہائی کورٹ لے جانا چاہتے ہیں۔ اُن کو بھی لکھ دیجئے کہ تین ہزار سے کم نہیں لیں گے۔ مقدمہ شروع سے آخر تک غلط طریقے سے چلایا گیا۔ بہت محنت کرنی پڑے گی — یہ لوگ اتنا دق کرتے ہیں کہ توبہ — اب انہیں کس طریقے سے سمجھایا جائے کہ میری یہاں سے ایک دن کی غیر حاضری لاکھوں روپوں پر پانی پھیر دیتی ہے — صاف صاف لکھدیجئے کہ آپ نے جو ایک ہزار بذریعہ تار بھیجے ہیں، وہ امانتاً محفوظ ہیں۔ ایسے پیچیدہ معاملات کی پیروی اتنے کم محنتانہ میں کیسے کی جا سکتی ہے — ابھی گذشتہ ہفتہ لالہ گھوکل نے اپنے اپیل میں چار ہزار دئے تھے۔ مگر کام بھی تو ہم نے ایک لاکھ کا کیا تھا —

نووارد:۔ جی وہ میں اس لئے حاضر ہوا تھا —

وکیل:۔ ہاں اور دیکھیے۔ مہارانی صاحبہ رام نگر نے اپنی مثلیں منگوائی ہیں، وہ آج ہی بذریعہ رجسٹری بھیجد یجئے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھ دیجئے کہ آپکے ذمے محنتانہ کے سات سو بقایا ہیں۔ جو اُمید ہے جلد از جلد مرحمت فرمائے جائیں گے۔ بلکہ میری رائے میں تقسیم نامے کا مسودہ روک لیجئے۔ محنتانہ وصول ہونے پر بھیجد یجئے گا — اور —

نووارد:۔ میں نے کہا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس لئے —

وکیل:۔ (پورے جوش میں) اور ہاں منشی جی، خوب یاد آیا۔ کل سشن کورٹ میں لالہ رام ناتھ والے مقدمہ کی تاریخ معلوم کر کے میری ڈائری میں لکھدو۔ محنتانہ وصول ہو چکا ہے پانچ سو دئے ہیں — پرانے موکل ہیں ان کے ساتھ رعایت کرنی ہی پڑتی ہے۔ اور سُنیئے ورکرز فیڈریشن (

) والوں کو تار دیدیجئے۔ کہ میں جلسے کی صدارت کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ کونسا طریقہ نکالا ہے۔ بیکار کی علت۔ اور دیکھئے تو کیا غذات نواب حیدر حسن خاں دے گئے ہیں۔ گورنر جنرل کے نام پٹیشن لکھنی ہے۔ ان کا کام بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔ پرانے تعلقات اب تو وبالِ جان ثابت ہونے لگے۔ دو ہزار کا چک دے گئے ہیں۔ کیا کہا جاتے خیر، دراز میں چک [illegible] آج ہی بنک میں جمع کرا دیجئے گا۔

نووارد:۔ (بے چین ہو کر) اجی وکیل صاحب، میں نے کہا — ذرا میری بھی تو سنیئے۔

وکیل:۔ (قدرے لہجہ بدل کر) ٹھیریئے، ٹھیریئے۔ دیکھتے نہیں ہیں آپ کہ مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں — آخر کام ہی کر رہا ہوں۔ خالی تو بیٹھا نہیں۔ یہ کونسا طریقہ ہے۔ اگر صبر نہیں ہو سکتا تو تشریف لیجائیے۔

(منشی جی آہستہ سے کھنکارتے ہیں "اس میں کیا شک ہے اس میں کیا" کی ہلکی آواز۔)

نو وارد۔ مگر میں تو ـــــ مجھے تو ـــــ

وکیل۔ پارس داس بنام گلاب سنگھ میں فہرست گواہان اور طلبانہ داخل ہوگیا یا نہیں ـــــ اور سنیئے تو وہ راجہ دن بیر سنگھ اپنے ریاستی معاملات میں مجھ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ عجیب مذاق ہے ـــــ آنے جانے کا کرایہ اور محنتانہ دو سو روپیہ یومیہ کے حساب سے اُن سے پہلے لے لیجئے گا۔ سمجھے آپ ـــــ (نو وارد سے) ہاں صاحب فرمائیے۔ آپ کا کیا معاملہ ہے۔

نو وارد۔ (کھنکھارتے ہوتے) میں نے عرض کیا کہ ـــ

وکیل۔ ہاں بھئی منشی جی خوب یاد آیا۔ ظہور الدین بنام کرم الٰہی میں جواب دعویٰ کرنا ہے ـــ جی، جی، فرمائیے، کیا طریقہ ہے۔

نو وارد۔ میں نے کہا کہ میں دو ہفتے سے آپ کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔ کئی دفعہ کچہری بھی گیا۔ وہاں آپ کو کوئی جانتا بھی نہیں ـــ جو جانتے تھے انہوں نے کہا کہ آپ کچہری کبھی تشریف ہی نہیں لے جاتے ـــ خیر ـــ چند ضروری باتیں آپ سے دریافت کرنی تھیں۔

وکیل۔ فرمائیے ـــــ دیکھنا منشی جی۔ لالہ کاشی ناتھ کا فائل میز پر رکھ دینا۔ مقدمہ بہت سنگین ہے۔ ممکن ہے پریوی کونسل تک جانا پڑے ـــ جی ـــ

نو وارد۔ بے ادبی معاف فرمائیے گا۔ اندازاً آپ کی سالانہ آمدنی کتنی ہوگی؟

وکیل۔ یہ کیا طریقہ ہے۔ عجیب بیہودہ سوال ہے۔

نو وارد۔ جی ہاں کیا عرض کیا جائے ـــــ لیکن گستاخی معاف فرمائیے۔ گذشتہ سال کی نسبت اس سال جناب کی مصروفیات میں کوئی نمایاں تبدیلی تو نہیں ہوئی۔

وکیل۔ نہیں کوئی طریقے کا فرق نہیں ہوا۔ جو حال پہلے تھا اب بھی وہی حال ہے ـــــــ!

منشی۔ (بیساختہ) اس میں کیا شک ہے، عرصے سے ایک سی ہی حالت ہے۔

نو وارد۔ پھر بھی جناب کوئی تخمینہ قائم کر کے مجھے بتا سکیں گے۔

(قدرے خاموشی)

وکیل۔ میں کوئی حساب کتاب تو طریقے سے رکھتا نہیں لیکن یوں سمجھئے کہ اوسطاً ـــــ ریاستوں کا کام چار پانچ ہزار ماہوار کا رہتا ہے ـــــ اور ـــــ اور ـــــ دیگر مقدمات بھی کوئی ایسے سمجھئے کہ چھ سات ہزار ماہوار کے پڑتے ہونگے۔

نو وارد۔ جی، درست ہے۔ کیوں نہ ہو، کیوں نہ ہو۔

وکیل۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ سمجھئے ـــــ مگر ان بے طریقے سوالوں سے آپ کا مطلب۔

نو وارد۔ جی کچھ نہیں ـــ میرے پاس آپ کی آمدنی کا تخمینہ آیا تھا جس میں آپکی اوسط آمدنی ۲۰۰۰ روپے سال درج تھی۔

منشی۔ اُفوہ اتنا جھوٹ ـــ

نو وارد۔ جی ہاں، میں خود حیران تھا کہ آپ جیسے چوٹی کے وکیلوں کی اتنی قلیل آمدنی کیسے ہو سکتی ہے۔ اس لئے حاضر ہوا تھا۔ شکر ہے کہ میرا گمان صحیح نکلا۔ آپ کی آمدنی بیس ہزار روپے سالانہ سے کسی طرح کم نہیں۔ نہایت خوب!!!

وکیل۔ لیکن آخر آپ کو میری آمدنی سے کس طریقے سے دلچسپی ہے۔

نو وارد۔ جی مجھے تو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ البتہ سرکار دولتمدار کو انتہائی دلچسپی ہے۔

وکیل۔ سرکار دولتمدار ـــ!!!؟ یعنی یہ کیا طریقہ؟؟

نو وارد۔ یعنی انکم ٹیکس ـــــ!! ـــــ لے یہ لیجئے، اس فارم کی میں نے خانہ پری کر دی ہے آپ دستخط فرما دیجئے۔

وکیل۔ (حالتِ بیہوشی میں) ان ـــ کم ـــ ٹیکس ـــ!!

نو وارد۔ یہ قلم حاضر ہے ـــ شکریہ، میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ آداب عرض ـــــ

(قدموں کی آواز)

منشی۔ اس میں کیا شک ہے ـــ بابو جی ـــ نسخہ ذرا تیز ہوگیا ـــــ اب کیا ہوگا ـــ؟؟

وکیل۔ اب کیا ہوگا ـــ؟؟؟ نہ قہ قہ ـــــ جوتوں کی دکان!!!۔ سمجھے ـــ؟! (تیزی سے) منشی جی ـــ آپ فوراً یہاں سے نکل جائیے ـــ فوراً ـــ جلدی ـــ ورنہ آپکی کھوپڑی میں ابھی (میز پر گھونسہ مارتا ہے) نعل جڑ دئے جائیں گے۔

منشی۔ (گھبرا کر) اس میں کیا شک ہے۔ اس میں کیا ـــ

وکیل۔ اس میں کیا شک کا بچہ ـــ نکل جاؤ فوراً۔ (چیخ کر) فوراً طریقے کے ساتھ ـــ چلو، جلدی۔

منشی۔ ادا ادا ـــ آداب ـــ عرض ـــ اس میں کیا شک ـــ اس میں کیا . . . .

◆ ◆ ◆

(باجازت آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

انصار ناصری، دہلوی

(پہلی بار دہلی ریڈیو اسٹیشن سے بتاریخ ۱۵ جنوری ۳۹ء کو نشر ہوا)

وعدہ

مادھوپور گاؤں کے انتہائی گوشے میں ایک باغ کے درمیان ایک سرخ عمارت واقع ہے۔ ایک لڑکی اکثر اس عمارت کے بالاخانے کے اوپر جس میں پتھر کے خوبصورت ستون نصب ہیں کھڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ صبح سویرے مشرقی بالاخانے میں کھڑی ہوئی وہ ندی کی سمت دیکھا کرتی تھی۔ اُس وقت اُس کا خوبصورت چہرہ اس کی دو نازک اور گوری گوری ہتھیلیوں کے درمیان ٹکا ہوا ہوتا تھا۔ صبح کی سنہری روشنی میں اُس کا رنگ گلابی ہوجایا کرتا تھا۔ اگر میں اسکو محض ایک لڑکی کہوں تو اس کی تشریح مکمل نہیں ہوتی۔ اُس کی عمر کا اندازہ لگانا دشوار تھا کیونکہ اسکی بڑی بڑی سُرمگیں آنکھوں کی گہرائیوں میں سینکڑوں برس کے اندوہ والم پنہاں معلوم ہوتے تھے۔ اس کی چال ایک عمر رسیدہ شخص کی طرح بہت سُست تھی لیکن اُس کا ہلکا پھلکا جسم ایک جوان لڑکی کے مانند تھا۔ صبح دن طلوع ہونے سے پہلے، چڑیوں کے ترنم ریز چہچہوں سے قبل سُنندا کا نازک جسم اُس سُرخ عمارت کے قریب رواں ندی کے گھاٹ کی جانب جُنبش کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ وہاں سے اشنان کرکے واپس لوٹتی تو اسکے باریک کپڑے اس کے پُرشباب اور بھیگے ہوئے جسم سے چمٹے ہوئے ہوتے تھے۔ اسکے گیلے پیروں کے نشان گھاٹ کی ہر سیڑھی پر جم جاتے تھے۔ اسوقت وہ ایک پری معلوم ہوتی تھی۔ پانی کے سفید قطرے موتیوں کی طرح اُسکے جسم سے ٹپکا کرتے تھے۔ اور اس کے گیلے بال اس کے مرمریں ہاتھوں سے اس طرح لپٹ جاتے تھے جس طرح پانی کی کائی کے ریشے کنول کی شاخوں سے لپٹ جاتے ہیں۔ اُس کے ہونٹ چمکیلے سُرخ نہ تھے بلکہ ہلکے گلابی تھے۔ لیکن یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ یہ عربی حور اپنی بھری مملکت کو چھوڑکر اس اجاڑ خطۂ زمین کے ایک تنہا گوشے میں اپنے دلی حُزن وملال کو سرد آہوں کے ذریعے کس لئے ہلکا کیا کرتی تھی۔

سُنندا کے قہقہوں اور گانوں سے دن بھر محل گونجتا رہتا تھا۔ اسکے چہرے پر خوشی کے آثار بھی بیک وقت موجود رہتے تھے۔ حالانکہ وہ چہرہ آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے گُلِ لالہ کی یاد تازہ کرتا تھا۔ اُس کی سہیلیاں اکثر اُس سے پوچھتیں "کیوں بہن تمہیں یہ ہنسی کے خزانے کہاں سے ہاتھ لگے ہیں" تو جس طرح جولائی کے مہینے میں سورج کی کرنیں کبھی کبھی کالے بادلوں میں سے مُسکرا دیتی ہیں وہ بھی مُسکرا دیتی اور کہتی "بھلا میں کیوں غمگین رہوں، نہ میرا گھر ہے نہ بار۔ نہ کوئی ایسا ہی ہے جس کی موت مجھے صدمہ پہونچائے یا جسکی بیوفائی سے دل گرفتہ ہوکر رونے پر مجبور ہوجاؤں۔ میرے لئے دنیا میں سب اجنبی ہیں پس اجنبیوں کے لئے آنسو بہانے سے کیا حاصل!" وہی سانحہ جو اوروں کے لئے رُوح فرسا ہوتا تھا اس لڑکی کے لئے ہنسی کا ایک مستقل سرچشمہ بن جایا کرتا تھا۔ ایک کسی سہیلی نے اُس سے دریافت کیا "کیا تو پتھر کی بنی ہوئی ہے؟" اس پر اُس نے یہی کہا "نہیں بہن میں بھی تمہاری طرح گوشت اور خُون سے بنی ہوئی ہوں" لیکن یہ ہنسی اور یہ مُسکراہٹ اُس کی تنہائیوں میں غائب ہوجاتی تھی۔ گویہ سب کچھ قیمتی زیورات تھے جو عوام کی موجودگی میں استعمال کئے جاتے ہیں اور جن کی ایسی جگہ ضرورت نہیں ہوتی جہاں اُنہیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

ندی کے کنارے "شیو" دیوتا کا مندر تھا۔ جس طرح ہر صبح آفتاب پابندی کے ساتھ طلوع ہوتے وقت مندر کی گمٹیوں کو سنہرا رنگ دیا کرتا تھا اور جس طرح وہ ہر شام کو غروب ہوتے وقت اپنی آخری کرنوں سے مغرب کی سمت آسمان میں آگ لگا دیا کرتا تھا اُسی طرح سُنندا ہر صبح سفید اور سنہری لباس میں ملبوس، دیوتا کی مُورتی کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے کھڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ مندر کے مدھم چراغوں کی روشنی میں اس کا چہرہ اور بھی اُداس اور بے رونق معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہمہ تن ایک موم سے بنی ہوئی سفید اور خاموش تصویر ایک تصویرِ عجز نظر آتی تھی۔ لیکن رات کی پوجا کے بعد جب وہ انکسار سے دیوتا کے سامنے سربسجود ہوتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا چاندنی رات میں کوئی چنبیلی پھولوں سے لدی کھڑی ہے۔ اس وقت یقین نہیں آتا تھا کہ ایسی حسین شے کبھی دُنیا میں پیدا بھی ہوئی ہوگی۔ اسکو دیکھکر گمان ہوتا تھا کہ وہ آسمانی پھولوں کا ایک ہار ہے جسے کسی طوفانی جھکڑ نے اُس کے بہشتی حرم سے یہاں منتقل کردیا تھا۔ خوشگوار موسم ہو یا ناخوشگوار باراں ہو طوفان ہو یا تاریکی وہ کبھی مندر کی حاضری سے نہیں چوکتی تھی اور ہمیشہ مندر میں اُسی جگہ اسی لباس میں کھڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ مُسکراہٹ اور اُداسی ہر وقت اُس کے چہرے پر عیاں رہتی تھیں لیکن جب تک کسی غیر کی نظر اُس کی جانب رہتی وہ اپنی مُسکراہٹ کو معدوم نہیں ہونے دیتی تھی۔

سُنندا کی خوابگاہ میں اُس کے سرہانے ایک سنگِ مرمر کا صندوق تھا۔ جس میں چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کے علاوہ ایک بہت طول وطویل خط

بھی تھا جسے اُس نے خود ہی لکھا تھا لیکن باوجود اس کے کہ وہ خط کو چھپائے رکھتی تھی۔ یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ خط کس کے نام تھا۔ کیونکہ اس میں پتہ کسی کا بھی نہ تھا۔ البتہ عبارت سے لکھنے والی کے نام اور شخصیت کا بہت کچھ پتہ چلتا تھا اور جس کے بغیر شاید وہ ہمیشہ ایک نامعلوم ہستی ہی رہتی۔ خط میں عبارت مرقوم ذیل تھی:۔

"ہر انسان کے تصرف میں ایک نہ ایک چیز ایسی ہوتی ہے جسے وہ سب سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے اور جس سے وہ محروم ہونا نہیں چاہتا۔ میرے پاس بھی ایک ایسی چیز ہے، یعنی میرا غم۔ مَیں اپنے غم کو کسی کے ساتھ بٹانا نہیں چاہتی کیونکہ سوائے اس کے میرے پاس اور کوئی ایسی چیز نہیں جو صرف میری ہی ہو اور جسے میں اپنے کلیجے سے لگائے رکھوں جسے میں اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں میں چھپائے رکھوں۔ پس میں اسی کو چھپائے رکھتی ہوں لیکن ایک وقت آئیگا جب میں خود ہی نہیں رہونگی۔ اُس وقت میں چاہتی ہوں کہ اس غم کو تمہارے شیئر کر دوں۔ یہ صرف میری ہی ملکیت ہے، لہذا میں کسی اور کو نہیں دے سکتی۔ یہ براہِ راست خدا کے ہاتھوں سے مجھ تک پہونچا ہے جسکی کسی کو خبر بھی نہیں ہے۔ میں نے اُس کے تحفے کو محفوظ رکھا۔ میں نے اس نایاب غم کو اپنے قہقہوں کے لباس میں پوشیدہ رکھا جس طرح ہری گھاس اپنے نیچے زمین کے تاریک خزانے چھپائے رکھتی ہے۔ تم نے بھی میرے چہرے پر ہمیشہ پُراسرار مسکراہٹ دیکھی ہے۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتی کہ تم اس آنسوؤں کی کہانی پر یقین بھی کرو گے۔

انسان روشنی اور مسرت سے لبریز ماحول میں جنم لیتا ہے۔ لیکن میں نے ایسی دُنیا میں جنم لیا جس میں کوئی بھی میری آؤ بھگت کرنے والا نہ تھا۔ جس شخص نے سب سے پہلے مجھے اپنی آغوش میں لیا اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میرے لئے آغوشِ مادر کے سوا تمام دُنیا مہمل اور بے حقیقت تھی۔ جس تعلق نے مجھے اس دُنیا سے منسلک کر رکھا تھا وہ ماں ہی کی محبت تھی۔

بچے کی دُنیا ہمجنسوں اور رفیقوں سے بھری ہوتی ہے جن میں سے کچھ تو خون کے تعلق کی وجہ سے اُس کے پاس رہتے ہیں اور کچھ محض دل بہلاوے کی خاطر اسکے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ دُنیا اس شہنشاہِ طفل کی نازبرداریوں میں غلامی کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ وہ شخص واقعی بدقسمت سمجھا جاتا ہو جسکے جسم کو کوئی بچہ اپنی ننھی ننھی نازک انگلیوں سے نہیں گدگداتا ہو۔ لیکن میری پیدائش ہی سے دُنیا نے مجھے غیظ و غضب سے گھورنا شروع کر دیا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میرا کوئی عزیز بھی تھا اور کوئی پیار و محبت سے میرے نزدیک بھی آتا تھا۔ گونگی اور بے زبان قدرت ہی میری سہیلی تھی۔ میں انسانی جذبات کی دُنیا میں ایک اجنبی تھی۔ میرے بچپن کی یاد بہت دُھندلی ہے۔ اس زمانے کا کوئی ایسا واقعہ نہیں نہ کوئی ایسا مشفق و رفیق ہے جس سے یہ دُھندلی یاد وابستہ رہ کر کوئی خاص صورت اختیار کر سکتی۔ ایسی صرف ایک ہی شکل ہے جو اُس وقت کا تصور کرتے دم میرے دماغ میں آجاتی ہے۔ وہ میری ماں کی شکل ہے۔

میری زندگی کی پہلی صاف یاد— وہ یاد جس کو میں کسی قدر صفائی سے سوچ سکتی ہوں گریہ و اشک ہے۔ میں اُس وقت اپنی ماں کے گلے سے چمٹی ہوئی اُس کے شانوں پہ آنسو بہا رہی تھی۔ ماں کے گالوں پر بھی آنسو تھے۔ اُن کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ جو ایک اوس میں بھیگے ہوئے کنول کے پھول کی طرح تھا اب بھی میری آنکھوں میں پھرتا ہے۔ ایک معمر شخص میری ماں کے قریب کھڑا تھا۔ جس کے مہربان اور حلیم چہرے کو سمندر جھاگ کی طرح سفید بالوں کے گچھے گھیرے ہوئے تھے "میں اس دُکھیا کو تمہارے سپرد کرنے آئی ہوں" میری ماں کہہ رہی تھی "میں ایک بدقسمت اور منحوس ماں ہوں کہ اپنی بچی کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتی" بوڑھے نے اپنے ہاتھ میری طرف بڑھا دئے۔ میں اپنی ماں سے اور زور سے چمٹ گئی۔ اس وقت اس کے آنسو میرے بالوں پر بکھر رہے تھے۔ میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ اُس وقت میری تمام دُنیا میری ماں ہی تک محدود تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا میری تمام دُنیا آنسوؤں کے ساتھ مجھ سے جُدا ہو رہی ہے۔ بوڑھے کے ہاتھ مجھے نہیں لبھا سکے۔ میں اسے شک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس وقت میں اتنی بڑی نہ تھی کہ جو کچھ گذر رہا تھا وہ سمجھ لیتی۔ مگر میری ماں کی اشک آلود آنکھوں کے نظارے نے میرے دل کو دردناک پیشینگوئیوں سے بھر دیا۔

مجھے صاف صاف یاد نہیں کہ وہ غم اور آنسوؤں کا ڈرامہ کب ختم ہوا۔ لیکن کچھ مٹی مٹی سی یاد ہے کہ جس وقت بوڑھے کے بے رحم ہاتھوں نے مجھے میری ماں کی گود سے چھین لیا تھا، اندھیرا ہو گیا تھا اور تمام راہیں تاریک ہو چکی تھیں۔ میری ماں فوراً دروازے کی سمت بھاگ گئی۔ وہ بھاگ ہی جانا چاہتی تھی قبل اس کے کہ اُس کے ارادوں میں کوئی تزلزل واقع ہوتا۔ اُس نے دروازے پر پہونچ کر میری طرف دیکھا اور ایک ناقابلِ فہم آواز میں دُعائیں دیکر ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔ مجھے خبر نہیں وہ کون تھی۔ اُس کے رخصتی الفاظ مجھے یاد نہیں۔ مجھے صرف وہ آنسو یاد ہیں جو مجھے پیار کرتے وقت اُس کی آنکھوں سے میرے بالوں پر گرے تھے۔ اسی دولت سے میں نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ گو زمانہ تدریجاً اس میں اضافہ کرتا گیا لیکن درحقیقت میرا اصل سرمایہ میری ماں ہی کا تحفہ تھا۔

میرے پہلو میں پیدائش ہی سے ایک محبت بھرا دل تھا لیکن وہ ہستی جس سے میں فطرتاً محبت کر سکتی تھی میری زندگی کی صبح ہی میں غائب ہو چکی

تھی مثل ستارے کے جو دن نکلنے سے پہلے روپوش ہو جاتا ہے۔ مَیں سمجھ گئی کہ مَیں ازل ہی سے اپنی زندگی اشکوں میں بسر کرنے کے لئے مخصوص کر لی گئی ہوں اس لئے مسرّت اور محبّت میرے لئے نہیں ہیں۔ لیکن میں اس احساس سے بہت پریشان ہو گئی۔ مَیں اپنے پیدا کرنے والے سے باغی ہو گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے احکام کی خلاف ورزی کروں گی۔ پس جس دن سے میرے بے رحم محسن نے مجھے میری ماں سے چھین کر اپنے گھر میں رکھا تھا اُسی دن سے میں نے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں سے جلاوطن کر دیا۔ اس اجنبی مکان میں مَیں نے شروع کے چند دن قطعی خاموشی میں گذار دئے۔ میں نے اس بستر سے اٹھنے سے انکار کر دیا جس پر میں نے اس بوڑھے کی سپردگی میں اپنی ماں سے جُدا ہو کر پناہ لی تھی۔ میں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ مگر بوڑھا استقلال کے ساتھ مجھے مانوس کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلانے پلانے آتا تھا مگر میں جھنجلا کر اس کے ہاتھوں کو ہٹا دیتی اور اپنے ہونٹ بھینچ لیتی۔ میں غضبناک ہو کر اپنے ہونٹوں کو اپنے دانتوں سے دبا لیتی تھی کہ مبادا وہ میری مرضی کے خلاف خود بخود کھل جائیں۔ وہ بھی دن دن بھر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ کیونکہ وہ ایسی حالت میں کچھ کھانا پسند نہیں کرتا تھا کہ جب اس کی سپردگی میں دیا ہوا بچّہ بھوکا رہے۔ اُس نے مجھے مانوس کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ رفتہ رفتہ میرا کمرہ کھلونوں کی دکان کی سی شکل اختیار کرتا گیا۔ باغیچہ میرے لئے اپنی دولت سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے بھی وہاں آنے لگے۔ بوڑھا ان کو لالچ دیکر بلایا کرتا تھا کہ وہ میرے ساتھ آکر کھیلیں میں نے ابھی تک کسی مشفق کو نہیں دیکھا تھا لہٰذا میرا دل بھی ان بچوں کے لئے ترستا تھا۔ اب میرا محسن مجھے بہ نظرِ اطمینان دیکھنے لگا۔ اور میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ رفتہ رفتہ وہ پرانا خاموش مکان میرا گھر ہو گیا۔ میں بوڑھے کو دادا کہنے لگی اور وہ مجھے سُنندا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس سے قبل میرا کبھی کوئی اور نام بھی تھا۔

جب میں ذرا بڑی ہوئی تو دادا نے مجھے شیوجی کی پوجا سکھائی۔ مجھے اس میں بڑی مسرّت ہونے لگی۔ دادا ہی نے مجھے بتایا کہ دیوتا کے سامنے سب کچھ کہا جا سکتا ہے اور جو کچھ جی چاہے مانگا بھی جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے غم اور الم اس کی مدد سے برکتوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مَیں ان باتوں پر شوق سے یقین کرنے لگی۔ مَیں جب ہر شام دیوتا کے سامنے سربسجود ہوتی تو جو کچھ میرے دل میں آتا ان سے کہہ دیتی تھی۔ انسانوں سے کہنے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ وہ میرے نزدیک کچھ بھی نہ تھے۔ اور میں ان کو صرف مسکراہٹ ہی سے نوازا کرتی تھی۔ میرا دیوتا ہی اس سرچشمہ اشک کی حقیقت سے واقف تھا جسے میں اپنا دل کہتی تھی۔

دادا کے گھر میں میرے لئے شفقت اور نگرانی کی کوئی کمی نہ تھی لیکن باوجود اس کے یہ کبھی نہیں بھول سکی کہ اور بچوں کے اور میرے درمیان بہت بڑا تفاوت ہے۔ جب میں اس قابل نہ تھی کہ اپنا کام کاج خود ہی کر سکتی تو دادا اپنے ہی ہاتھوں سے مجھے نہلایا کرتے تھے لیکن سخت ترین سردیوں میں بھی اگر وہ کبھی پوجا سے پہلے مجھے چھو لیتے تھے تو خود کو پوتر کرنے کیلئے غسل ضرور کرتے تھے۔ میرے دل کو آزار اور رنج سے بچانے کے لئے وہ ان باتوں کو مجھ سے بہت پوشیدہ رکھتے تھے لیکن ایک ایسے شخص کو دھوکا دینا بہت مشکل ہے کہ جس کی آنکھوں سے طفلانہ معصومیت کی جھلک معدوم ہو چکی ہو۔ جب کبھی مَیں انہیں دیکھ پاتی تو وہ گھبراتے ہوئے باہر چلے جاتے کہ کہیں مَیں ان کی حرکات کی تشریح نہ طلب کر بیٹھوں۔ مَیں اپنی فضول اور بے معنی باتوں سے دادا کو اطمینان دلانے کی کوشش کرنے لگتی۔ گویا میں نے کچھ دیکھا یا سُنا ہی نہیں۔ کئی بار میں نے پڑوسیوں کو ان سے سوال کرتے سُنا کہ "یہ تمہاری کون ہے؟" میری موجودگی کے باعث دادا سے جواب نہ بن پڑتا تو مَیں بیچ میں بول اٹھتی کہ "میں ان کی منہ بولی لڑکی ہوں اور کون ہوں!" غرض اسی طرح مَیں انہیں اس پریشانی سے نجات دلا دیتی تھی۔ دادا عمر کے ڈھلنے کے ساتھ ہی ساتھ روز بروز لاغر ہوتے گئے۔ ایک روز میں نے سُنا کہ ہم سب لوگ عنقریب اُن کے شہری مکان کو جانیوالے ہیں۔ وہ مکان مادھوپور میں تھا۔ دادا اپنی آنکھیں اسی مکان میں آخری دفعہ بند کرنا چاہتے تھے جس میں انہوں نے پہلی بار انہیں کھولا تھا۔

ہم اس سُرخ اینٹوں سے بنے ہوئے مکان میں پہونچے۔ جس کے اطراف میں پھیلے ہوئے باغ میں بور سے لدے ہوئے آموں کے درخت موسمِ بہار کی آمد کا پتہ دے رہے تھے۔ یہ ایک تنہا اور خاموش عمارت تھی۔ میں نے سُنا کہ کسی زمانے میں اس مکان میں بہت سے لوگ آباد تھے اور رقص و سرود یہاں کا روزانہ کا معمول تھا۔ لیکن اس وقت طاقات کے عظیم الشان کمرے سونے پڑے تھے۔ صرف شیو دیوتا کی پوجا ابھی تک جاری تھی۔ کسی زمانے میں دادا کے پاس دولت تھی اور ان کے بہت سے بیٹے اور پوتے بھی تھے لیکن لکشمی کے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سب بھی یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ صرف ایک پوتا رہ گیا لیکن دادا انتہائی صدمے کے باعث اس لڑکے اور اپنے آبائی مکان کو خیرباد کہہ کر چلے گئے۔ وہ اب کسی قسم کے رشتے ناطے پسند نہیں کرتے تھے جو صرف منقطع ہونے کے لئے ہی وجود میں آتے ہیں۔ جب موت اُن کے قریب آئی تو وہ واپس اسی چھوڑے ہوئے مکان میں لوٹ آئے۔

اُنہوں نے کہا تھا: نہیں مَیں نے اُن سب کو رُخصت کیا ہے جنھیں اپنی زندگی میں پالا تھا۔ لہٰذا مرنے کے بعد بھی مَیں اُن سے علیحدہ رہنا نہیں چاہتا۔ میری چتا کی راکھ بھی اُنہی کی راکھ سے ملنی چاہیئے۔"

یہی جگہ تھی جہاں مَیں پہلی بار تم سے ملی۔ اس وقت تم مجھے اِس برباد شدہ تاریک ویرانے میں ایک تنہا روشنی کی کرن نظر آئے۔ اِن باتوں کو بہت برس گذر چکے ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ دن اب بھی تمہیں یاد ہونگے۔ میرے خیال میں اس وقت جبکہ یہ سیڑھیاں پانی کی صاف دھارا تک پہنچنے کے لئے بنائی گئی تھیں ندی تمہارے مکان کے بہت قریب سے بہتی ہوگی! اسکے بعد سے ندی اپنا راستہ کسی قدر تبدیل کرتی رہی اور پانی روز بروز اُترتا ہی گیا یہاں تک کہ سیڑھیاں خشک اور ننگی نظر آنے لگیں۔ اب پانی تک پہونچنے سے قبل لوگوں کو کچھ فاصلے تک سُوکھی ہوئی کیچڑ پر چلنا پڑتا ہے۔ ایک گھنا پیپل کا درخت قریب ہی کھڑا ہوا ایک لامتناہی مدّت سے اپنے نیچے گہرے نیلے پانی کی سطح پر اپنا ہی عکس دیکھتا رہا ہے۔ ندی کی تیز دھارا نے آہستہ آہستہ اس کی بے شمار جڑوں کی مٹی دھو کر اُنہیں بالکل ننگا کر دیا ہے۔ اسی درخت کے سائے میں دو بڑے بڑے پتھر رکھدے گئے ہیں اور یہی گاؤں والوں کے نہانے کے لئے گھاٹ بن گیا ہے۔ اُس روز میں اپنے کمرے سے باہر نکل کر آئی اور انہی میں سے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ صبح کے دیوتا کے پہلے تبسم سے ابھی پانی سُنہرا نہیں ہوا بلکہ وہ میری نظروں کے سامنے دُھندلا اور ساکن نظر آرہا تھا۔ چڑیوں نے تیزی سے نکلتے ہوئے سورج دیوتا کے لئے استقبالیہ چہچہے ابھی شروع نہیں کئے تھے۔ مَیں اُس وقت اپنی قسمت پر خیال آرائیاں کر رہی تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا کوئی عزیز رشتہ دار زندہ بھی ہے۔ اور وہ شخص جس کو میری قسمت نے میری پناہ کے لئے مخصوص کیا تھا اپنے آخری دن پورے کر رہا تھا۔ معاً میں نے قدموں کی چاپ سُنی، اور مُڑکر دیکھا۔ تم ندی کی طرف جارہے تھے۔ میری نظروں کو تم سورج دیوتا کی طرح حسین معلوم ہوئے۔ صبح کے دھندلکے میں ہماری نظریں پہلی بار ملیں۔ یہ وقت بہت نامبارک تھا لیکن میرے نزدیک یہی میری زندگی کا مبارک ترین لمحہ تھا۔

ایک جوان دل اپنے ہم عُمر ساتھی کے لئے بیقرار رہا کرتا ہے۔ اور چونکہ تمہیں صرف میرے اور بوڑھے دادا کے درمیان ہی انتخاب کرنا تھا لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ تم نے ایک جوان ہی کو اپنا ساتھی بنانا پسند کیا۔ اسی طرح میں نے بھی تمہیں منتخب کر لیا۔ وہ مُسکراہٹ جسے میں دُنیا دکھانے کے لئے اپنے چہرے پر نمایاں رکھتی تھی اب تمہاری ملاقات سے حقیقی مسکراہٹ میں تبدیل ہوگئی۔ جب تک یہ مُسکراہٹ قائم رہی میں نے اپنے دل میں کسی فکر اور غم کو راہ نہ دی۔ میرا ظاہر اور باطن روشن ہوگیا۔ آہ۔ وہ دن بھی کیا تھے۔

اب وہ دن مجھے محض خواب معلوم ہوتے ہیں، وہ خواب جو دن کی خوفناک تاریکی میں غائب ہوجاتے۔ لیکن اس کی یاد اب بھی باقی ہے جو کسی خواب کی پری کے بازو سے گرے ہوئے ایک سُنہری پر کی طرح حسین ہے۔ ان چند ہی دنوں میں مَیں نے اپنی تاریک زندگی کے لئے کافی سکون بخش معاوضہ مہیا کرنے کی کوشش کی۔ میری حیات کا ساز مسرت آگیں سُریلے نغموں سے گونجنے لگا۔ لیکن اپنے وفور شوق میں شاید میں نے مضراب کی چوٹ زیادہ زور سے لگادی۔ کیونکہ ایک دن وہ تار ٹوٹ گیا اسی دن سے یہ ساز خاموش ہے۔

انہی دنوں جب ہم اپنے وقت کو مسرور قہقہوں میں بسر کر رہے تھے، موت کا فرشتہ گھر میں پہونچ چکا تھا۔ دادا فریش ہوچکے تھے۔ اور یہ انکی آخری بیماری تھی۔ مَیں دن بھر تو ہنسی خوشی میں گزار دیتی۔ صبح اور شام دو مرتبہ دادا کے کمرے میں جاتی اور اُن کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ وہ میری طرف دیکھتے۔ اُن کی مہربان آنکھوں میں رحم جھلکنے لگتا اور وہ اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میرے بالوں کو سُلجھانے لگتے تھے۔ مَیں جانتی تھی کہ انکا دل اُس مبارک دیس کے خیال سے لبریز نہ تھا جس سے کہ وہ روز بروز قریب تر ہوتے جارہے تھے بلکہ اُس لڑکی کے خیالات سے جسے وہ تنہا چھوڑ رہے تھے؛ وہ لاوارث جسے اُنہوں نے اپنے یہاں پناہ دی تھی اب بے یار و مددگار رہونے والی ہے؛ یہ مہلک پریشانی اُن کے آخری وقت کو اور بھی تیزی سے لاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک بہت شریف النفس انسان تھے لیکن پھر بھی مجھے چھو لینے کے بعد اپنے آپ کو پاک کرنے کے لئے وہ غسل ضروری سمجھتے تھے۔ مجھ سے چھو جانے سے جب وہ ناپاک ہوجاتے تھے تو بھلا مَیں کسی اور سے کیا اُمید رکھ سکتی تھی۔ لیکن یہ خیالات سب بعد کی پیداوار ہیں۔ اس وقت میرے پاس ایسے تاریک خیالات کے لئے فرصت نہ تھی۔ دادا کبھی کبھی مجھے اپنے بستر کے قریب کھینچ لیتے اور کچھ کہنے کی کوشش بھی کرتے لیکن اُن سے کچھ بھی نہ کہا جاتا۔ اُن کی آنکھیں کسی ایسی بات کا اظہار کرنے لگتیں جس کے کہنے سے اُن کی زبان قاصر رہتی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ چاہتے تھے۔ ہاں مجھ سے، جسے اُنہوں نے سب کچھ دے دیا تھا لیکن وہ کیا شے تھی جسے وہ مجھ سے چاہتے تھے، یہ جاننے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ اس وقت میرے پاس ایک بوڑھے کی اشک آلود اور بے رونق آنکھوں کی زبان سمجھنے کی فرصت نہ تھی۔ تمہاری سیاہ چمکدار آنکھیں مجھے ہر صبح ایک نئی کہانی سُنایا کرتی تھیں۔ میری آنکھیں سوائے اس کے اور کچھ نہیں چاہتی تھیں اس لئے جلد جلد چند الفاظ کہہ کر مسکرا کر اور اُن کے تکیہ پر چند تھپکیاں دیکر میں اُن کے کمرے سے باہر نکل آیا کرتی تھی۔ ایک شکستہ

دل کی بے شمار آہیں میرے پیچھے دوڑتیں لیکن میں قطعی پروا نہیں کرتی تھی۔ درحقیقت مجھے اُن کا ہوش بھی نہیں ہوتا تھا۔ اب اس وقت ہی مجھے اتنی فرصت ملی ہے کہ ان باتوں کا احساس کر سکوں۔

کیا تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہم دونوں نے ملکر سفید کنول کے پھولوں کا ایک ہار بنایا تھا۔ اس وقت ہم دونوں ندی کے کنارے گھاس پر بیٹھے ہوتے تھے۔ ڈوری کا ایک سرا تم نے پکڑ رکھا تھا اور دوسرا میں نے اور ہم دونوں ہمہ تن مشغول تھے۔ ہار کے ختم کر چکنے سے پہلے ڈوری بہت لمبی ہو چکی تھی۔ درمیان میں ایک پورا کِھلا ہوا خوبصورت کنول تھا۔ دادا کنول کے بڑے مشتاق تھے اس لئے میں وہ ہار دادا کے کمرے میں لے گئی اور اُن سے کہا: "دیکھو دادا یہ کتنا اچھا ہار ہے۔ اگر میں اسے پہنوں تو دیکھو یہ میرے پیروں تک آجاتا ہے۔"

دادا میری طرف مڑے اور دیکھ کر بولے: "واقعی بیٹی تم پھولوں سے قریب قریب سب ڈھک گئی ہو اور دیوی سرسوتی نظر آ رہی ہو۔ بھلا یہ اتنے پھول تمہیں کس نے دیئے؟"

"تمہارے بیٹے شنکر نے۔" میں نے جواب دیا۔

اس پر ان کا زرد چہرہ اور بھی زرد پڑ گیا لیکن وہ مسکرا دئے اور کہنے لگے: "بچی تم اپنے دن محض ہنسی میں بسر کر رہی ہو۔ لیکن زندگی صرف ہنسی ہی کا نام نہیں ہے۔ زندگی میں آنسو بھی ہوتے ہیں لہذا دونوں ہی کے لئے تیار رہنا چاہیئے ورنہ آنسو بہت زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس وقت چاہے انہیں تمہاری زندگی میں دخل نہ ہو لیکن ...... تم کیا جانو۔"

میں ہار کو دیوار پر لٹکا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ آخر ہمارے مسرور قہقہوں نے دادا کے کمرے میں پہونچ کر اپنی کہانی سنا ہی دی تھی۔ لیکن اس ہنسی کا جواب ہنسی نہیں بلکہ محض غمناک الفاظ میں دیا گیا... لیکن کیوں؟ ... وہ تمام دن میں نے تنہائی اور خاموشی میں گذارا۔ کسی نامعلوم پیش آنے والے خطرے نے میری دنیا دھندلی کر دی۔ وہ خطرہ کس شکل میں پیش آنے والا تھا... بوڑھے دادا نے مجھے تیار رہنے کو کہا تھا لیکن وہ کیا بات تھی جس کے لئے مجھے تیار رہنا چاہیئے۔ ایک مرتبہ میں نے یہ بھی خیال کیا کہ شاید تم نے دادا سے میرے خلاف کچھ کہہ دیا ہوگا۔ لیکن میں نے فوراً ہی اس خیال کو چھوڑ دیا۔ آخر تم میری بُرائی کیوں کرتے۔ میں نے تو تمہیں کبھی رنج نہیں پہونچایا تھا۔ پھر۔ کیا ماں مر چکی تھی؟ کیا دادا اسی خبر کے سننے کے لئے مجھے تیار رہنے کو کہہ رہے تھے۔ جب میں نے آخری بار ماں کو دیکھا تھا اس وقت میں ایک ناسمجھ بچی تھی۔ میں نے اُس کے اشک آلودہ چہرے کا بھی تصوّر کیا۔ مگر میری آنکھیں خشک رہیں۔ میں ایسی ماں کے لئے کیوں روتی جو مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ گلی کوچوں کے بھکاری بھی اپنی اولاد کا خیال رکھتے ہیں لیکن میری ماں نے...... میں نے اپنے دل کو سخت کر لیا۔ تمام تاریک سایوں کو میں نے اپنے دل سے نکال دیا۔ لیکن اسی دن سے وہ خوشی کی روشنی جس نے میری کائنات کو منور کر رکھا تھا بہت تیزی سے پھیکی پڑتی گئی۔ اور میں مضمحل اور پژمردہ ہونے لگی۔ میں نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ اور اپنے تمام اوقات بیکار کاموں میں صرف کرنے لگی۔ تم میری ان حرکات پر متعجب نظر آتے تھے۔ اور کبھی کبھی ان کا سبب بھی دریافت کرنے لگتے تھے۔ جس کے جواب میں میں ہنس دیا کرتی تھی۔ لیکن اب یہ میری ہنسی پھیکی اور نقلی ہو چکی تھی۔ اسی طرح چند روز گذر گئے۔ ایک روز صبح تم دادا کے کمرے میں داخل ہوئے اور تین گھنٹے تک وہیں رہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم نے آپس میں کیا کیا باتیں کیں۔ لیکن تمہارے باہر آجانے کے بعد ہی میں اندر بلوائی گئی۔ جب میں دادا کے پاس پہونچی، تو انہوں نے آہستہ سے میری طرف کروٹ بدلی اور کہا: "میری بچی۔ میرے دن اب گنتی کے رہ گئے ہیں۔ تم سے جدا ہونے سے پہلے میں تم سے اور شنکر سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شنکر سے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ علاوہ اس کے وہ مرد ذات ہے اور اپنا فائدہ نقصان خود ہی سمجھ سکتا ہے لیکن مجھے تمہارا خیال کھائے جا رہا ہے۔ میری بچی......" انہوں نے بولنا بند کر دیا اور بغور مجھے دیکھنے لگے۔ میں اپنے مضطرب دل کو دبائے ہوئے سرنگوں بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے پھر کہنا شروع کیا: "میری بچی۔ شاید تمہیں نہیں معلوم ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میرے دل میں تمہاری محبت شنکر کی محبت سے ذرہ برابر کم نہیں۔ جس دن میں اس گھر کو خیرباد کہہ کر اسے اجڑی ہوئی حالت میں چھوڑ کر گیا تھا تو میں نے قسم کھائی تھی کہ آئندہ کبھی کسی سے محبت نہ کروں گا۔ محبت مصیبتوں اور تکلیفوں کی جڑ ہے۔ لیکن تمہاری شکل نے مجھے اپنی قسم توڑنے پر مجبور کر دیا۔ دل زیادہ عرصے تک خالی نہیں رہا کرتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اس میں آکر ایک نئی زندگی کی بنیاد ڈال دیتا ہے۔ یہ خدائی قانون ہے۔ پس تم بھی میرے خالی دل میں میری ننھی شہزادی بن کر سما گئیں۔ شنکر اس وقت اپنی ماں کے رشتہ داروں کے ساتھ رہتا تھا۔ جہاں میں نے اسے اپنی خوشی سے چھوڑ رکھا تھا۔ کیونکہ میں اب کسی رشتے کے بندھنوں میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر دنیا ان بندھنوں سے جکڑی ہوئی ہے لہذا میں بھی ان سے نہ بچ سکا۔ یہ تم بخوبی جانتی ہو کہ میں نے تمہیں کس قدر لاڈ پیار سے پالا ہے۔ میں تمہیں حتی الامکان ہر رنج و غم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ لیکن تقدیر کے سامنے ایک پیش نہیں جاتی۔ اب مجھے ہی نہیں، تمہاری زندگی میں ایک صدمہ پہونچانا ہوگا۔

مسافر کی ڈائری

بمبئی سے شنگھائی تک

۲۸ جون ــــــ ۱۳ جولائی

پاسپورٹ قید خانہ سے نکل بھاگنا کتنا کٹھن ہوتا ہے ہندوستان کیلئے دوسرے ملکوں کے سفر کا پاسپورٹ لینا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ چار سال پہلے جب میں علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو تاریخ کی انجمن کی طرف سے لڑکوں کی ایک جماعت افغانستان کے سفر کیلئے بھیجی گئی تھی۔ اس سفر کا انتظام کرنیوالوں میں میں بھی تھا۔ سب کے ساتھ میں نے بھی درخواست دی۔ دو مہینے کی بھاگ دوڑ کے بعد اور سب کو پاسپورٹ مل گئے مگر مجھے نہ [illegible] نے سوچا کہ ایسے "خطرناک" آدمی کا ایک آزاد ملک میں جانا [illegible] اپنے دوستوں کی ساتھ پشاور بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان کی سرحد تک اور سپاہیوں کی نظر بچا کر ہندوستان کے باہر دو چار قدم رکھکر واپس آگیا۔ اب دُنیا کے سفر کا جب ارادہ کیا تو سوچا کہ سرکار شاید چار سال کی بات اب بھول گئی ہو۔ بمبئی میں پاسپورٹ کی درخواست دی۔ مختلف فارم بھرنے پڑے۔ پولیس کے ایک افسر کے سامنے پیشی ہوئی۔ درجنوں سوالوں کا جواب دینا پڑا "کہاں جا رہے ہو؟ کیوں جا رہے ہو؟ تمھارے پاس کتنا روپیہ ہے؟ جائداد کتنی ہے؟ تنخواہ کیا ملتی ہے؟ شادی ہو گئی ہے؟" وغیرہ وغیرہ۔ ان سب سوالوں کے جواب دیکر اور درخواست کے ساتھ تین عدد تصویریں نتھی کر کے میں سمجھا کہ اب تو پاسپورٹ مل ہی جائیگا۔ وطن گیا وہاں عزیزوں سے رخصت ہو کر ۲۴۔ جون کو بمبئی واپس آگیا۔ درخواست دیئے ہوئے کئی ہفتے گذر چکے تھے۔ جہاز کی روانگی ۲۸ کو تھی۔ یقین تھا کہ اس سے پہلے ہی پاسپورٹ مل جائیگا مگر بمبئی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ میری درخواست اب تک پنجاب سے واپس نہیں آئی۔ پنجاب کیوں بھیجی گئی؟ اس لئے کہ میری پیدائش اس صوبہ کی ہے۔ معلوم ہوتا تھا ۲۸۔ جون کا جہاز نکل جائیگا۔ اور اگر ایسا ہوا تو شاید اس سفر کو بالکل ملتوی کرنا پڑے۔ مگر بھلا ہو بمبئی کی نئی کانگریسی وزارت کا کہ ۲۷۔ جون کو پاسپورٹ مل ہی گیا۔ چھوٹی سی نیلی جلد کی کتاب۔ اوپر سرکار کی مُہر۔ اندر وائسرائے کا اعلان کہ یہاں (خواجہ احمد عبّاس) برطانوی ہند کی رعایا ہوں۔ چھوٹی سی میری تصویر جس میں "عادی مجرم" معلوم ہوتا ہوں۔ پہچان کیلئے مخصوص علامات "سیاہ بال سیاہ آنکھیں، بائیں آنکھ کے اوپر اور ٹھوڑی پر زخم کے نشان"۔ آنکھ پر کرکٹ کی گیند لگی تھی اور ٹھوڑی پر چوٹ سفر کے شوق کا نتیجہ ہے۔ برس گذر گئے۔ جب میں پانچ چھ برس کا تھا۔ نانا صاحب نے کہا ہمارے ساتھ گاؤں چلوگے؟ خوشی کا یہ حال کہ بے تحاشا دوڑا اور ٹھوکر کھا کر پتھر کے فرش پر گرا۔ اور اب پچیس ہزار میل کے سفر سے بھی اتنی خوشی نہیں ہوئی۔

ویزا ہندوستان کی سرکار نے تو سفر کی اجازت دیدی۔ مگر دوسرے ملکوں میں داخل ہونے کیلئے ان کی سرکاروں کی اجازت چاہیئے۔ بعض ملکوں (مثلاً فرانس سوئٹزرلینڈ وغیرہ) کے ساتھ سلطنتِ برطانیہ کے ایسے معاہدے ہیں جن کی رُو سے وہاں جانے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں کے کنصل خانوں سے خاص اجازت لینی پڑتی ہے جس کو "ویزا" کہتے ہیں۔ امریکہ میں داخلے کی اجازت بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ وہاں کی سرکار یہ نہیں چاہتی کہ دوسرے ملکوں کے لوگ امریکہ میں آکر بس جائیں اور انکی دولت میں حصّہ بٹائیں۔ ایشیا والوں پر خاص پابندیاں ہیں۔ دو مہینے کو زیادہ رہنے کی اجازت تو تقریباً ناممکن ہی ہے۔ مجھے چار یا پانچ ہفتے ہی رہنا تھا۔ اس لئے زیادہ دقّت نہیں ہوئی۔ مگر یہ اقرار کرنا پڑا کہ میں وہاں روزی کمانے نہیں بلکہ سیر کرنے جا رہا ہوں۔ اور اس کے مقابلے میں ہمارے ملک میں جو امریکن یا غیر ملکی چاہے بلا روک ٹوک آسکتا ہے!

بلارڈ پیئر بمبئی کی بندرگاہ تو میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر بلارڈ پیئر ہی وہ مقام ہے جہاں سے بڑے بڑے جہاز روانہ ہوتے ہیں۔ میں درجنوں مرتبہ دوستوں کو پہنچانے یا لینے یا اخبار کے کام سے مشہور مسافروں سے ملنے بلارڈ پیئر آیا ہوں۔ جس دن جہاز آتا ہے یا روانہ ہوتا ہے عجب سماں ہوتا ہے۔ سامان سے لدی ہوئی موٹریں۔ بڑھیا کپڑے پہنے ہوئے امیروں

کے غول کے غول۔ چمکتی ہوئی ساڑھیاں۔ ہار اور پھول۔ قہقہے اور آنسو۔ شور اتنا کہ آواز سنائی نہیں دیتی۔ غیر ملکی سیّاح آنکھیں پھاڑے ہوئے ہر چیز کو تعجب سے دیکھتے ہوئے۔ انگریز افسر چھٹی پر جا رہے ہیں یا ولایت سے واپس آ رہے ہیں۔ سفید یونیفارم والے انگریز سارجنٹ۔ نیلے کپڑے والے پولیس کے سپاہی۔ سامان سے لدے ہوئے قلی۔ پریشان طالب علم ولایت جانے کے شوق میں خوش۔ مگر اتنے بڑے سفر کے خیال سے سہمے ہوئے۔ کوئی لبرل پارٹی کا لیڈر ولایت کی یاترا سے واپس آیا ہے۔ اخباروں کے رپورٹر گھیرے ہوئے ہیں۔ بیان لکھوا رہا ہے۔ بڑی توند والے سیٹھ تجارت کی خاطر سات سمندر پار جا رہے ہیں۔ آخری وقت میں بھی کاروبار کی باتیں کر رہے ہیں۔ اور ہال کے دروازوں کے باہر جہاز کھڑا ہے ایک زبردست دیو کی طرح سے۔ اور یہی جہاز ان ہزاروں آدمیوں کو لیکر یورپ یا چین یا جاپان یا امریکہ جائیگا۔ ڈراونا بھی اور دلکش بھی۔ پہلے ہی سے اس خیال سے کوفت ہے کہ اسی ماحول میں مجھے بھی روانہ ہونا ہے۔ اب تک تماشائی تھا اب تماشا بنوں گا۔

۲۸۔ جون روانگی کا دن بھی آگیا۔ رات بھر دوستوں سے گپ رہی۔ صبح کو سامان باندھا۔ ٹکٹ وغیرہ کے سلسلے میں امریکن ایکسپریس کے دفتر گیا۔ سامان کو بندرگاہ روانہ کیا۔ کرانیکل کے اڈیٹر سید عبد اللہ بریلوی کے ہاں رخصتی دعوت۔ مگر کھانا نہ کھایا گیا۔ پریشانی اور گھبراہٹ یا رات بھر جاگنے کی تکان۔ بلارڈ پیر پر حسب معمول شور و غل، چیخ و پکار۔ غیر معمولی بھیڑ۔ دوست پہنچانے آئے ہیں۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر مذاق کر رہے ہیں۔ صلاح مشورہ دے رہے ہیں: "خط ضرور لکھنا۔ اجنبیوں سے دور ہی رہنا۔ انگلستان میں بڑی سردی ہوگی۔ بس دو سوٹ کیس ہی لیکر جا رہے ہو؟ یہ ٹائپ رائٹر کیا ہوگا۔ کام کرنے جا رہے ہو یا سیر کرنے؟ اور پیرس ..... پیرس کا حال ضرور لکھنا۔ یار بڑے خوش قسمت ہو۔" اور میں دل ہی دل میں روپے آنے پائی کا حساب لگا رہا ہوں۔ چند سو روپے لیکر چلا ہوں۔ کیسے کام چلے گا۔ کہیں مشکل میں نہ پڑ جاؤں مگر ٹکٹ تو واپسی کا خرید ہی لیا ہے۔ جب پیسہ نہ رہے گا واپس آجاؤں گا۔ .... ڈاکٹری معائنہ۔ سب ٹیکوں کو سرٹیفکیٹ دکھلائے۔ ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا اور مجھ سے کہا۔ ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ دوسرے مسافروں کا معائنہ ہونے لگا۔ اور میں انتظار کر رہا ہوں۔ دوست دوسرے دروازے سے اندر پہنچ گئے اور جہاز پر چڑھنے لگے اور میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ لوگ ادھر ادھر مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے اور سب کا معائنہ کرنیکے بعد دوبارہ میری نبض دیکھی۔ پھر تھرمامیٹر نکال کر میرے منہ میں دیا۔ کیا مجھے بخار ہے؟ گھڑی ٹک ٹک کئے جا رہی ہے۔ اب جہاز روانہ ہونے میں آدھ گھنٹے سے بھی کم رہ گیا۔ اور یہ ڈاکٹر مجھے جانے ہی نہیں دیتا۔ تھرمامیٹر بھی عجب دقیانوسی ہے۔ پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر نے منہ سے تھرمامیٹر نکال کر دیکھا۔ اور سر ہلایا۔ "تمھیں بخار ہے۔" اب میں سمجھا رہا ہوں کہ رات بھر سویا نہیں ہوں اس لئے معمولی حرارت ہوگئی ہوگی مگر ڈاکٹر کہتا ہے مجھے اس جہاز سے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ عجب مصیبت ہے۔ کیا میں سچ مچ اس جہاز سے نہ جا سکوں گا؟ میرا تمام پروگرام الٹ پلٹ ہو جائیگا۔ شاید پھر بالکل ہی نہ جا سکوں۔ اور خفت کس قدر ہوگی۔ اب تو اخبار میں تصویر بھی نکل چکی ہے۔ اور یہ دوست جو پہنچانے آئے ہیں۔ اور تین تین روپے کے ٹکٹ لیکر جہاز پر گئے ہیں! یہ کیا کہیں گے! لوگ کیا کہیں گے۔ انسان کی زندگی میں یہ کس قدر زبردست سوال ہے۔ کوئی اپنی خوشی یا رنج اپنے نفع نقصان کا اتنا خیال نہیں کرتا جتنا دوسروں کی رائے کا۔ "لوگ کیا کہیں گے" کہیں گے تو کہنے دو۔ اب مجھے ڈاکٹر پر غصہ آ رہا ہے۔ اگر مجھے بخار ہے تو اس کا کیا جاتا ہے۔ اگر مروں گا تو میں ..... تھوڑی دیر میں جہاز کا ڈاکٹر آگیا۔ دوبارہ معائنہ ہوا اس نے بھی سر ہلایا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ اطالوی ہے۔ انگریزی واجبی ہی واجبی جانتا ہے۔ خیر میرے اصرار پر اس نے کہا کہ اچھا جہاز کے ہسپتال میں چلو وہاں پھر معائنہ ہوگا۔ ڈاکٹر کی ساتھ ساتھ میں بھی چلا۔ زینہ پر چڑھتا ہوا جہاز پر پہنچ گیا۔ اب ذرا اطمینان ہوا۔ اب میں نہیں واپس جاؤں گا خواہ یہ لوگ میرا سامان کیوں نہ سمندر میں پھینک دیں۔ دوبارہ معائنہ ہوا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر ٹائیفائڈ سے خائف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مجھے کہیں یہی بیماری نہ ہو۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے سمجھایا کہ اگر دو دن تک میرا بخار نہ اترا تو اسے حق ہوگا کہ کولمبو پر مجھے اتار دے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ مگر اس نے شرط لگائی کہ میں ابھی فوراً جہاز کے ہسپتال میں داخل ہو جاؤں۔ مگر میں نے کہا کہ میرے دوست تو باہر کھڑے انتظار کر رہے ہیں۔ آخر کار اس نے اجازت دیدی کہ ان سے رخصت ہو لو مگر فوراً یہاں ہسپتال میں آؤ۔ جہاز کی روانگی کی پہلی سیٹی بھی ہوگئی۔ اب لوگ جو پہنچانے آئے تھے اتر

رہے ہیں۔ میں بھی اپنے دوستوں سے رخصت ہوا۔ جلدی جلدی ان کو صورتِ حال سمجھائی۔ اور اطمینان دلایا کہ کوئی گھبرانیکی بات نہیں۔ آخر وہ سب بھی اترے اور کنارے پر کھڑے ہو گئے۔ زینہ ہٹادیا گیا۔ اور جہاز نے آہستہ آہستہ حرکت شروع کی۔ دوست پکار پکار کر کچھ کہہ رہے ہیں۔ مگر سنائی نہیں دیتا۔ دونوں طرف سے رومال ہلنے لگے۔ ایک صاحب میرے قریب کھڑے رو رہے ہیں۔ مگر مجھے ..... مجھے وطن چھوڑنے کا، دوستوں سے رخصت ہونیکا کوئی رنج نہیں۔ اتنے بڑے سفر کی کوئی ہیبت نہیں۔ شاید میں سخت دل ہوں۔ اس وقت تو بس یہ خیال ہے کہ چلو سفر تو شروع ہو گیا۔ کتنی دقتیں ہوئیں۔ پاسپورٹ ملنے میں مشکل ہوئی۔ روانگی سے چند روز پہلے بینک جس میں آدھی پونجی جمع تھی فیل ہو گیا۔ اور پھر دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا یہ بخار کی مصیبت۔ خیر اب تو جہاز چل ہی پڑا۔ اپنی خوش قسمتی پر غور کر رہا تھا کہ ڈاکٹر نے پھر آن پکڑا اور پکڑ کر ہسپتال کی طرف لے چلا۔ میں نے ساحل کی طرف آخری نظر ڈالی۔ بلارڈ پیئر اب چھوٹا سا نظر آرہا تھا اور اسکے پیچھے بمبئی ... سُندر بمبئی، خوبصورت بمبئی ... پھیلا ہوا تھا۔

ہسپتال

عمر بھر کبھی ہسپتال میں داخل ہونیکی نوبت نہیں آئی۔ کیا معلوم تھا کہ سب سے پہلے ایک جہاز کے ہسپتال میں داخل ہوں گا۔ معلوم نہیں لوگ عام طور سے ہسپتال سے کیوں گھبراتے ہیں۔ مجھے تو فقط ہنسی آئی یہ سوچ کر کہ عام خیال کے مطابق تو مجھے گھنٹوں ڈک پر کھڑے ہو کر وطن کی سرزمین کو خیرباد کہنا چاہیئے تھا۔ اور اس کے بجائے مجھے یہاں بند کر دیا گیا ہے۔ ہسپتال کا کمرہ اچھا بڑا ہے۔ آٹھ پلنگ ہیں جن میں سے پانچ خالی ہیں۔ ایک کونے میں ایک ہٹا کٹا اطالوی ملاح ہے۔ دوسری کونے میں میں ہوں اور میری برابر ایک ہندوستانی مُسافر۔ یہ ایک سندھی تاجر ہے جو جاپان کاروبار کے سلسلے میں جارہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کو بھی بخار ہے اور اس کے ساتھ بھی تقریباً وہی واقعات پیش آئے جو میرے ساتھ۔ میں نے سوچا کہ یہ بھی اچھا ہی کہ کوئی باتیں کرنیکو تو موجود ہے۔ کپڑے اتار میں تو چادر اوڑھ لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا جلد ہی سو گیا۔ جہاز بمبئی سے تین بجے روانہ ہوا تھا۔ چار گھنٹے بعد آنکھ کھلی تو کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ ہلکا ہلکا سر چکرا رہا تھا۔ سوچا یہ کیا قصہ ہے۔ کھڑے ہو کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو دیکھا سورج غروب ہو رہا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ جہاز بُری طرح سے ہل رہا ہے۔ بڑی بڑی لہروں کے تھپیڑے اس کو اُچھال رہے ہیں۔ اتنے میں ڈاکٹر آگیا۔ تھرمامیٹر لگایا تو معلوم ہوا کہ اب بالکل بخار نہیں ہے۔ نیند پوری ہوتے ہی حرارت جاتی رہی۔ میں نے کہا دیکھا میں کیا کہتا تھا مگر ڈاکٹر نے ہسپتال چھوڑنے کی اجازت نہ دی اور کہا کہ ابھی چوبیس گھنٹے تم کو اور رہنا پڑیگا۔ میں نے کہا کوئی حرج نہیں۔ اس طوفان میں چلنا پھرنا تو ناممکن ہے۔ جیسے کیبن میں لیٹے ویسے یہاں۔ پھر پڑ کر سو گیا۔ رات کو ایک دفعہ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اطالوی ملاح بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا ہے۔ مزے لے لے کر۔ ممکن ہے یہ بیماری کا بہانہ کر کے اسی لئے ہسپتال میں داخل ہوا ہو کہ کام سے چھٹی ملے گی اور کھانا بھی بہتر ملیگا۔ ہم دونوں کو کھانے کی ممانعت تھی۔ پینے کو لیموں کا شربت بنایا گیا تھا۔ اس کا ایک گلاس پی کر میں پھر سو گیا۔ رات بھر پلنگ اس طرح ہلتا رہا جیسے مسلسل زلزلہ آرہا ہو۔

کونٹے ورڈے

دوسرے دن صبح کو اٹھا تو بھوک اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی ڈاکٹر نے ناشتہ کی اجازت دیدی اور میں نے ڈٹ کر کھایا۔ آج صبح میرے ہندوستانی ساتھی کا بخار بھی اتر گیا۔ وہ بیچارہ اب تک سخت پریشان تھا کہ کہیں کولمبو پر نہ اتار دیا جائے۔ آج اسکے چہرے پر کچھ رونق آئی۔ اس سے باتیں کرنے سے معلوم ہوا کہ نہ صرف وہ بلکہ اس جہاز پر بہت سے ہندوستانی تاجر ہیں جو جاپان جارہے ہیں۔ جون اور جولائی میں یہ لوگ جاتے ہیں جاڑے کے لئے سامان لانے۔ یہ تاجر مشرقی افریقہ میں بھی کافی عرصے رہا ہے۔ وہاں کے حالات بیان کرتا رہا کہ وہاں ہندوستانیوں اور دوسرے کالے آدمیوں پر کتنا ظلم ہوتا ہے۔ ہم جس جہاز پر ہیں یہ اطالوی کمپنی کا جہاز کونٹے ورڈے Conte Verde ہے جو سوئز کے راستے سے اٹلی سے آیا ہے۔ اور اب کولمبو، سنگاپور، ہانگ کانگ ہوتا ہوا شنگھائی جارہا ہے۔ اس کا وزن تقریباً بیس ہزار ٹن ہے جو ایک اچھے اوسط درجے کے جہاز کا وزن ہوتا ہے۔ زیادہ تر مسافر ہانگ کانگ پر اتر جائیں گے۔ سندھی تاجر اور دوسرے ہندوستانی بھی سب ہانگ کانگ سے جاپان کیلئے دوسرے جہاز پر سوار ہوں گے۔ شنگھائی کوئی نہیں جانا چاہتا۔ جنگ کی وجہ سے سب ڈرے ہوئے ہیں۔

آج ڈاکٹر پھر کئی بار آیا۔ اس کی شکل بالکل مسولینی کی طرح

ہے مگر زیادہ خوفناک آدمی نہیں ہے۔ اب کیونکہ ٹائیفائڈ کا خطرہ نہیں رہا اس لئے ہم سے ہنسی خوشی بات کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے کم از کم اپنے کیبن تک تو جانے دو۔ تاکہ میں منہ ہاتھ دھوکر کپڑے بدل سکوں اور پڑھنے کیلئے کوئی کتاب لے آؤں۔ اس نے کہا اچھا جاؤ مگر پندرہ منٹ میں آجانا۔

زندہ مُردہ جہاز کو چلے ہوئے تقریباً بیس گھنٹے ہوگئے۔ مگر لطف یہ کہ میں نے اب تک اپنے کیبن کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ یہ بھی نہ معلوم تھا کہ سامان وہاں رکھدیا گیا ہے یا نہیں۔ نمبر بتا کر پوچھتا پوچھتا وہاں پہنچا۔ سامان موجود تھا۔ میرے علاوہ دو مسافر اور ہیں۔ ایک بوری تاجر جاپان جارہا ہے اور ایک لڑکا سنگاپور۔ مجھے دیکھکر یہ لوگ حیران رہ گئے۔ ان کا خیال تھا میں بمبئی ہی میں رہ گیا ہوں۔ اتنے میں کیبن سٹیورڈ (Cabin Steward) یعنی جہاز کا ملازم بھی آگیا اور مجھے دیکھکر اطالوی زبان میں حیرت اور تعجب کا اس قدر زور سے اظہار کیا گویا میں کوئی مُردہ تھا جو دفعتہً زندہ ہوگیا ہو۔ کہنے لگا تم بیچ سمندر میں کہاں سے دفعتہً ٹپک پڑے۔ میں تو سمجھا تھا تم یا تو بمبئی میں رہ گئے ہو یا سمندر میں کود پڑے ہو۔" میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں بھوت نہیں ہوں اور یہ ڈاکٹر کا قصور تھا کہ اس نے ان لوگوں کو کیوں نہیں اطلاع دی کہ مجھے ہسپتال میں روکا گیا ہے۔

خیال تھا شام کو ہسپتال سے چھٹی مل جائیگی۔ مگر ڈاکٹر نے کہا اب کل صبح ہی جانا۔ میں دیکھ آیا تھا کہ کیبن میں سخت گرمی ہے۔ اس لئے میں نے بھی مناسب سمجھا کہ ایک رات یہیں اور گزاری جائے۔ پڑھنے کیلئے کتابیں اور اخبار لے آیا ہوں اس لئے وقت کاٹنے کا بھی انتظام ہے۔ تین سال تک روزانہ دفتر میں کام کرنے کے بعد آرام کرنے اور کتاب پڑھنے کی اتنی فرصت غنیمت ہے۔

ہم سفر ۳۰۔ جون۔ آج صبح ڈاکٹر نے کیبن جانیکی اجازت دیدی۔ چھوٹا سا کمرہ ہے اس میں چار آدمیوں کے سونیکی جگہ۔ دو نیچے دو اوپر۔ سمندر میں طوفان ہونیکی وجہ سے کھڑکی بھی بند ہے۔ سخت گرمی ہے۔ نہاکر اور کپڑے بدل کر اوپر ڈک پر گیا۔ میں سستے درجے (Economic Class) میں سفر کر رہا ہوں۔ جس کو تقریباً ریل کے انٹرمیڈیٹ درجے جیسا سمجھنا چاہیئے۔ جہاز پر زیادہ مُسافر نہیں ہیں۔ کُل تعداد شاید چار پانچسو سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس میں آدھے سے زیادہ ہمارے درجے میں ہیں۔ ہمارے لئے ایک نیچی چھت کا کھانے کا کمرہ ہے۔ اور ایک عام بیٹھنے اٹھنے کا کمرہ۔ گرمی کی وجہ سے مُسافر عام طریقہ سے یہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ یا ہمارے لئے جو چھوٹا سا ڈک کا حصہ مخصوص ہے وہاں ٹہلتے ہیں یا کوئی کھیل کھیلتے ہیں۔ فرسٹ سکنڈ اور ہمارے درجے والوں کے درمیان سنگین دیواریں حائل ہیں۔ مگر کبھی کبھی سکنڈ کلاس والے ہماری طرف آ نکلتے ہیں۔ ہم ان کے درجے میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ سماج میں جتنے جماعتی اختلافات نظر آتے ہیں چھوٹے پیمانہ پر ان کا نقشہ جہاز پر نظر آتا ہے۔ یہاں بھی اوپر کے درجے والے نیچے درجے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور نیچے کے درجے والے اوپر کے درجے والوں کو رشک اور حسد اور شک سے۔ اس جماعتی تفریق میں ایک حد تک نسلی اور قومی اختلافات بھی مٹ جاتے ہیں۔ ہمارے درجے میں انگریز، جرمن، اطالوی، یہودی، ہندوستانی، چینی سب قسم کے لوگ ہیں۔ انگریز تو اپنی عادت کے مطابق ذرا الگ الگ رہتے ہیں مگر اور باقی مُسافروں میں آپس میں اچھے دوستانہ تعلقات ہیں۔ بعض جرمن یہودی وطن سے نکالے ہوئے ہیں جو غالباً چین میں قسمت آزمائی کیلئے جارہے ہیں۔ ان بیچاروں کی پریشان حالی دیکھکر ہٹلر کے ظلم کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ چند چینی طالب علم ہیں جو جرمن یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرکے وطن جارہے ہیں۔ یہ بیچارے انگریزی بہت کم جانتے ہیں اور کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اور کچھ اشاروں میں ہم لوگ ان سے بات چیت کرتے ہیں۔ ان سے مل کر باتیں کرکے چین کی نئی اسپرٹ کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ جس وقت چین اور جاپان کی موجودہ جنگ شروع ہوئی ان طالب علموں نے فوراً اپنی حکومت کو لکھا کہ ان کو واپس بلالیا جائے تاکہ اپنے وطن کی حفاظت کیلئے لڑسکیں۔ مگر چینی حکومت نے جواب دیا کہ تم اس وقت جو تعلیم حاصل کر رہے ہو یہ بھی قوم ہی کیلئے ہے اس لئے اس کو بیچ میں مت چھوڑو۔ ایک چینی طالب علم نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں مجھ سے کہا چین ...... ہندوستان ...... ہم دوست۔

ہندوستانی تاجر ہمارے درجے میں تقریباً ایک درجن ہندوستانی تاجر ہیں۔ ایک کولمبو

جا رہا ہے جہاں اس کی دکان ہے۔ ہانگ کانگ جا رہے ہیں اور باقی سب سامان خریدنے جاپان جا رہے ہیں۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ جاپان نے کس طرح ہندوستانی منڈیوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ لوگ کاروبار کے بین الاقوامی اور سیاسی پہلو کو نہیں سمجھتے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ جاپان کس طرح اپنے اقتصادی اور کاروباری ذرائع کو چین پر قبضہ کرنے کیلئے استعمال کر رہا ہے۔ وہ تو بازار کے نرخ سے واقف ہیں اور جاپانی مال اس لئے خریدتے ہیں کہ سستا ہوتا ہے۔ اس میں ان کا کوئی زیادہ قصور بھی نہیں ہے۔ اگر جاپانی مال کا بائیکاٹ کرنا ہے تو اس کیلئے ہمیں باقاعدہ تمام ملک میں پروپیگنڈہ کرنا ہوگا۔ ایک دو آدمیوں سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

ان تاجروں میں ایک نوجوان سندھی لڑکا قابل ذکر ہے اس کی عمر کوئی پچیس سال کی ہوگی مگر کاروبار کے سلسلے میں وہ تقریباً تمام دنیا گھوم چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض سندھی تاجروں کا کاروبار تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کی دکانوں کی شاخیں چین، جاپان، یورپ، امریکہ وغیرہ سب جگہ موجود ہیں۔ یہ لڑکا اس سے پہلے جبرالٹر میں کام کرتا تھا۔ اب اس کو ہانگ کانگ بھیجا جا رہا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک میں بھی (جہاں والدین اپنے لڑکوں کو دہلی سے بمبئی بھیجتے گھبراتے ہیں) غیر ملکوں کے سفر کی کاروباری اہمیت کو سمجھا جا رہا ہے۔

اٹلی؟ شام کو جہاز کولمبو پہنچ جائیگا۔ جہاز کی تصویروں کے پوسٹ کارڈ خرید کر گھر والوں اور دوستوں کو خط لکھے معلوم ہوا کہ ڈاک کے ٹکٹ بھی یہیں مل سکتے ہیں۔ جب ٹکٹ خریدے تو دیکھا کہ ان پر اٹلی کے بادشاہ وکٹر ایمانوئل کی تصویر ہے۔ یہ کیسے؟ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اگرچہ ہم جزیرۂ عرب اور ہندوستان کے ساحل کے بالکل قریب ہیں مگر یہ جہاز ہر لحاظ سے اٹلی کا ٹکڑا ہے۔ ایک تیرتا ہوا اٹلی۔ جب تک ہم اس جہاز پر ہیں اطالوی قانون کے ماتحت ہیں۔ جہاز پر جتنے خط ڈالے جائیں گے ان پر اٹلی کے ٹکٹ لگانے ہوں گے۔ جہاز والے نہیں چاہتے کہ ہم ایک منٹ کیلئے بھی یہ بھولیں کہ ہم فی الحال اٹلی کی سرزمین پر ہیں۔ جہاز کے اوپر فاشسٹ پارٹی کا مخصوص نشان (لکڑیوں کا بندھا ہوا گٹھا اور کلہاڑا) لگا ہوا ہے۔ مسولینی کی تصویریں جا بجا لگی ہیں۔ بیٹھنے کے کمرے میں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی ہے جس میں کئی موٹی موٹی کتابیں مسولینی کی زندگی اور فاشیت کے سیاسی نظام کے متعلق ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان کو کوئی پڑھتا ہی نہیں۔

کولمبو تقریباً پانچ بجے ہمارا جہاز کولمبو کی بندرگاہ کے باہر لنگر انداز ہوا۔ یہاں کنارے پر پانی کافی گہرا نہیں ہے اس لئے بھاری جہاز کو دور ہی ٹھیرنا پڑتا ہے۔ لنکا کے متعلق بہت کچھ سنتے آئے تھے۔ "جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا"۔ شاید بارش ہو رہی تھی اس لئے اچھا نہیں معلوم ہوا۔ مگر کولمبو کا پہلا منظر جو ڈک پر سے دیکھا تو کافی حوصلہ شکن تھا۔ ساحل کے کنارے کنارے میلوں تک سیمنٹ کی ٹین کی بدصورت عمارتیں پھیلی گئی ہیں۔ چار پانچ چھوٹے چھوٹے جہاز لنگر سے بندھے کھڑے ہیں۔ راون کے لنکا کو (جس کا رامائن میں اس قدر ذکر ہے) تو ایک سحر انگیز ملک ہونا چاہئے تھا۔ اور یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ولایت کی گھٹیا بندرگاہیں جن کو فلموں میں دیکھا ہے۔ مگر اس میں کولمبو کا کیا قصور ہے۔ روایات کی بنا پر ہم ہر جگہ کی ایک خیالی تصویر قائم کر لیتے ہیں جو اکثر غلط ثابت ہوتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ کولمبو کے ساحل پر خوبصورت تاڑ اور کھجور کے درختوں کے جھنڈ ہوں گے۔ مگر ان کے بجائے دیکھا کہ ٹین کے گوداموں کے آگے ایک بہت بڑا بورڈ لگا ہے جس پر انگریزی میں لکھا ہے "اچھی چائے کیلئے سیلون" (Ceylon for good Tea) موجودہ کاروباری تمدن کی اشتہار بازی اور یہ سوچ کر تو یہ اعلان اور بھی برا معلوم ہوا کہ سیلون کے چائے کے کھیتوں میں یورپین مالک سیلونی اور ہندوستانی مزدوروں پر کتنا ظلم کرتے ہیں۔

علی گڑھ کے پرانے ساتھی بدیع الزماں جن کو پہلے اطلاع دیدی تھی مجھ سے ملنے کیلئے موجود تھے۔ ان کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر ساحل پر گیا۔ اتنا بڑا شہر دیکھنے کیلئے چار گھنٹے کافی تو نہیں ہوتے مگر پھر بھی موٹر میں گھوم کر بہت کچھ دیکھا۔ بمبئی کلکتہ کے برابر تو نہیں مگر تقریباً اسی انداز کا شہر ہے۔ یعنی ایک حصہ تو مغربی وضع کا امیروں رئیسوں اور افسروں کے رہنے کیلئے۔ صاف اور چوڑی سڑکیں۔ بڑی بڑی دکانیں، اونچے اونچے عالی شان مکان، پارک اور باغ۔ دوسرا حصہ وہ جہاں شہر کی ۸۰ فیصدی آبادی رہتی ہے۔ یہاں تنگ بازار، بھیڑ، شور، افلاس اور گندگی۔

عرب جہاز رانوں کی اولاد کولمبو کی آبادی زیادہ تر سنگھالی نسل کی ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر غربت کی حالت میں رہتے ہیں۔ بڑی بڑی دکانیں

اور جائے کا کاروبار یوروپین تاجروں کے ہاتھ میں ہے۔ چھوٹی دکانیں عام طور سے مدراسیوں اور گجراتیوں کی ہیں۔ اصل باشندے مزدوری کرکے پیٹ پالتے ہیں۔ یا تھوڑی سی تعداد میں جو پڑھ لکھ گئے ہیں وہ سرکاری نوکری کرتے ہیں۔ یہاں کی آبادی میں کافی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے جو ان عرب جہازرانوں کی اولاد ہیں جو تیرھویں اور چودھویں صدی میں تجارت کیلئے ھندوستان آیا کرتے تھے۔

سیلون ایک برطانوی شاہی مقبوضہ (Crown Colony) ہے۔ انگریز افسروں کی حکومت ہے۔ ایک کونسل ہے جس کے ممبروں کا الیکشن ہوتا ہے۔ مگر اب تک پارٹی بندی نسلی اور مذہبی بنیادوں پر ہے۔ سنگھالیوں، مدراسی ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ پارٹیاں ہیں۔ سیلون قومی کانگریس (Ceylon National Congress) نام ہی کی ہے۔ اور ہماری لبرل پارٹی کے اصولوں پر چلتی ہے مگر اب نوجوان اشتراکیوں کی ایک جماعت "لنکا ساما سماج" اقتصادی سوالوں کو لیکر اٹھی ہے۔ اس میں سب فرقوں کے لوگ موجود ہیں اور اس کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ سیلون کی سیاسی اور اقتصادی آزادی میں اس پارٹی کا وہی حصہ ہوگا، جو کانگریس کا ہندوستان میں ہے۔

رات کو خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ معلوم نہیں اب بریانی کب نصیب ہو۔ ۹ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا۔

پانی ہی پانی

۳۰۔ جون سے ۳۔ جولائی تک۔ چاروں طرف پانی ہی پانی۔ زمین کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ اب ہم کھلے سمندر (بحر ھند) میں ہیں۔ خط استوا کے بالکل قریب ہوتے جارہے ہیں۔ اس لئے گرمی بڑھتی جارہی ہے۔ کیبن میں بیٹھنا ناممکن ہے۔ پنکھے کی ہوا بھی گرم ہے۔ تمام دن مسافر ڈک پر یا سیلون (Saloon) میں تاش کھیل کر گذارتے ہیں۔ وقت کاٹنا مشکل ہے۔ زیادہ تر وقت باتوں میں گذرتا ہے۔ سکنڈ کلاس کے تین ہندوستانی مسافر بھی ہمارے کلاس میں آجاتے ہیں۔ اور سب ھندوستانیوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ کم از کم یہاں فرقہ وارانہ اختلافات نہیں۔ ھندو مسلمان، یہودی عیسائی سب ایک ہی ہیں۔ سب ھندوستانی مسافر ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جو لوگ جاپان جارہے ہیں ان کا اصرار ہے کہ میں بھی ہانگ کانگ پر اپنا جہاز تبدیل کردوں۔ اور شنگھائی نہ جاؤں۔ کیونکہ اس کے آس پاس اب بھی لڑائی ہورہی ہے۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ میرا ارادہ خطرہ کے مقام کے قریب بھی جانے کا نہیں۔ مگر پھر بھی یہ لوگ میری سلامتی کی فکر سے پریشان ہیں۔

جہاز کی دلچسپیاں

وقت گذارنے کیلئے مختلف دلچسپیاں ہیں۔ یوروپین مسافروں کے کئی گروہ تو دن رات تاش کھیلتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ بعض لوگ کینوس کے پانی کے تالاب میں مچھلی کی طرح پڑے رہتے ہیں ڈک پر کئی قسم کے کھیل ہیں۔ مگر دوپہر کو اتنی گرمی ہوتی ہے کہ انکی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کرتا۔ ھندوستانی مسافر زیادہ تر گپ میں وقت گذارتے ہیں۔ مجھے کئی سال کے بعد فرصت نصیب ہوئی ہے۔ چند کتابیں جو ساتھ لیکر چلا تھا وہ ختم کرکے جہاز کی لائبریری سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ پرل بک کے ناول جو چین کے متعلق ہیں پڑھ رہا ہوں۔ یہ مصنفہ وہی مشہور امریکن عورت ہے جس کو اس سال ادب کی خدمت کیلئے نوبل انعام ملا ہے۔ اس نے اپنی عمر کا کافی حصہ اپنے شوہر کے ساتھ چین میں گذارا ہے۔ اپنے ناولوں میں اس نے چین کے بدلتے ہوئے سماجی حالات کی نہایت دلچسپ اور سچی تصویر پیش کی ہے۔ چین کی قومی حکومت نے بھی اسکی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ کتابیں پڑھنے کے علاوہ لکھنے کا بھی آجکل بہت وقت ملتا ہے۔ دوستوں اور عزیزوں کو خط لکھے۔ "بمبئی کرانیکل" کے لئے اپنا ہفتہ وار مضمون تیار کیا۔ پھر بھی دن کاٹنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ آخر ایک ناول لکھنا شروع کردیا ہے۔ معلوم نہیں کبھی پورا ہوگا یا نہیں۔ اگر شنگھائی تک بجائے دس دن کے مہینے ڈیڑھ مہینہ کا راستہ ہوتا تو ضرور پورا ہوجاتا۔ جہاز پر آکر معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی معمولی زندگی میں کتنا وقت روزانہ ضائع کرتے ہیں۔ تقریباً تین گھنٹے تو روزانہ دفتر سے مکان آنے جانے میں بیکار جاتے ہیں اور معلوم نہیں کتنا وقت دوستوں سے گپ کرنے میں۔ کسی سے ملنے چلے گئے تو چند گھنٹے اس میں نکل گئے۔ اور یہاں جہاز پر سوائے کیبن سے ڈک پر آجانے کے اور کوئی جگہ ہی نہیں جہاں جاسکے۔ نہ یار دوست ہی ہیں نہ سینما نہ تھیٹر۔ نہ اپالو بندر اور نہ چوپاٹی اور مالابار ہل۔

سینما

مگر نہیں اور کچھ ہو نہ ہو سینما تو ضرور جہاز پر بھی موجود ہے۔ کولمبو چھوڑنے کے تیسرے دن سیلون میں اشتہار لگ گیا کہ آج رات کو فرسٹ کلاس کی ڈک پر سینما دکھایا جائے گا۔ دن بھر اسی امید میں گذرا کہ تفریح کی کوئی صورت تو

ہوئی۔ کھانے کے بعد فرسٹ کلاس کی ڈک پر گئے۔ آج پہلی بار ہماری اور اونچے درجے والوں کی ڈک کے درمیان کا دروازہ کھلا ہے۔ فرسٹ کلاس کے شاندار اور پُرتکلف کیبنوں میں جھانکنے کا موقع ملا۔ کھانے کا کمرہ، بیٹھنے کا کمرہ، لائبریری وغیرہ کو دیکھکر کسی راجہ کے محل کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو سوائے شیشوں میں سے جھانکنے کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں آکر اچھی طرح سے اس چھوت چھات کا پتہ چلتا ہے جو پیدائشی ذات پات کی تفریق کے بجائے امیری اور غریبی پر قائم ہے۔

سینما کا پروگرام کافی لچر ثابت ہوا۔ چار پانچ سال پُرانے فلم دکھائے گئے مگر یہ اطمینان تھا کہ پیسے نہیں دینے پڑے۔ اس کے علاوہ جہاز کی زندگی سے سب اس قدر اُکتا گئے ہیں کہ اگر اس سے بھی خراب فلم دکھائے جاتے تو وہ بھی غنیمت سمجھے جاتے۔ یہ سینما فرسٹ کلاس کی فراخ ڈک کے ایک کونے میں قائم کیا گیا تھا۔ ایک طرف پردہ لگا ہوا تھا اور اس کے آگے سو سوا سو کرسیاں ڈال دی تھیں۔ سمندر پر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کبھی کبھی لہروں کے شور میں فلم کے کرداروں کی گفتگو سنائی نہیں دیتی تھی۔ مجھے اپنے اخباری کام کے سلسلے میں تقریباً ہر روز ایک فلم دیکھنا پڑتا ہے۔ مگر یہ جہاز کا سینما دیکھنا ایک نیا اور دلچسپ تجربہ تھا۔

اڑنیوالی مچھلیاں

۳۔ جولائی۔ اس ماحول میں معمولی سے معمولی تبدیلی بھی سنسنی خیز بن جاتی ہے۔ آج صبح ہمارے کیبنوں کی گول کھڑکیاں (Port Hole) کھول دی گئیں۔ اب سمندر میں طوفان کم ہو گیا ہے۔ خدا خدا کرکے اب چین سے رات کو سو سکے ہیں۔ دن میں بھی اب کیبن بھٹی کی طرح نہیں تپتا۔ آج دن بھر جہاز کے دونوں طرف سمندر میں اڑنیوالی مچھلیاں نظر آتی رہیں۔ مگر ان کا اُڑنا پرندوں کی طرح نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ چند سکنڈ تک ہی وہ ہوا میں قائم رہ سکتی ہیں۔ مگر ایک جست میں کئی گز پار کر جاتی ہیں۔ شام کو قریب ہماری مخالف طرف سے آتا ہوا ایک جہاز قریب سے گذرا۔ تمام مسافر ڈک پر جمع ہو گئے۔ یہ جہاز بھی اسی کمپنی کا ہے اس لئے دونوں کے کپتانوں میں جھنڈوں کے اشاروں سے باتیں ہوئیں۔ آج کی شام بہت پُر فضا تھی۔ رنگ برنگ کے بادل سورج کی کرنوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ سورج جو ایک نارنجی گیند کے مانند چمک رہا تھا آخر کار خونی سمندر میں ڈوب گیا۔ دُور بہت دُور اپنے وطن ہندوستان میں اب بھی دن کی روشنی ہو گی۔ مغرب میں ابھی شفق کی سُرخی باقی تھی۔ مگر مشرق میں جلد ہی اندھیرا چھا گیا۔

سنگاپور

۴۔ جولائی۔ صبح آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے سرسبز زمین نظر آئی۔ جلدی ناشتہ سے فارغ ہو کر ڈک پر گیا تو نہایت دلکش سماں نظر آیا۔ جہاز ایک تنگ آبنائے میں سے گذر رہا تھا۔ ایک طرف سماٹرا کا جزیرہ ہے اور دوسری طرف خاکنائے ملایا۔ یہ محسوس کرکے کہ ہم ایک ہی وقت میں دو مختلف ملکوں کو دیکھ رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا جغرافیہ کے نقشے میں زندگی کا رنگ بھر دیا گیا ہو۔ اسکول میں جغرافیہ پڑھنے اور نقشہ دیکھنے کے بعد بھی دل میں شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ شاید یہ سب کسی نے ایسے ہی لکھ دیا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ گویا پہلی بار جغرافیہ پڑھ رہا ہوں۔ نہ صرف جغرافیہ بلکہ تاریخ اور بین الاقوامی سیاسیات۔ دائیں بازو سماٹرا کے خوبصورت جزیرہ پر ہالینڈ کا قبضہ ہے۔ بائیں طرف ملایا برطانیہ کی ملکیت ہے۔ دنیا کی بساط پر شہنشاہیت کے پھیلے ہوئے مُہرے!

دوپہر کو سخت گرمی رہی۔ نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آب ہم خط استوا کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ کھانے کے کمرے میں ایک نقشہ لگا ہوا ہے جس میں ہمارے جہاز کا راستہ ایک لکیر کھینچ کر دکھایا گیا ہے۔ ہر روز دوپہر کے بارہ بجے جہاں جہاز ہوتا ہے نقشہ پر اس جگہ ایک چھوٹی سی کاغذ کی جھنڈی لگا دی جاتی ہے۔ آج جب یہ جھنڈی لگائی گئی تو کافی ہجوم تھا۔ اوپر ڈک پر جا کر بعض مُسافر ادھر ادھر غور سے دیکھ رہے تھے۔ شاید اس امید میں کہ سمندر پر بھی خط استوا نظر آئیگا!

سہ پہر کے تین بجے سنگاپور پہونچ گئے۔

جنگی جہاز

سب سے پہلی چیز جو سنگاپور کی بندرگاہ میں نظر آئی وہ ایک زبردست برطانوی جنگی جہاز تھا جو ایک مہیب دیو کی طرح لنگر ڈالے کھڑا تھا۔ نقشہ دیکھنے سے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ کیوں برطانیہ نے سنگاپور میں اپنے جنگی جہازوں کا زبردست بیڑہ رکھا ہے۔ مشرق میں سنگاپور برطانوی بحری فوج کی سب سے بڑی اور اہم چھاونی ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ سنگاپور پر چین، ہندوستان اور آسٹریلیا کے راستے آکر ملتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں اپنی حکومت اور تاجرانہ کاروبار کی

حفاظت کیلئے ضروری تھا کہ اس مقام پر قبضہ کیا جائے۔ اسی بنا پر سے ۱۸۱۹ء میں سنگاپور کو برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد جاپان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھتے ہوئے اور بھی ضروری ہوا کہ اس مورچے کو اور مضبوط بنایا جائے۔ چنانچہ پچھلے سال کروڑوں روپے کے خرچ سے یہاں جنگی جہازوں کی زبردست چھاونی بنائی گئی ہے۔ مگر اس چھاونی کے آس پاس جانے کی اجازت نہیں ہے۔

چین؟

سنگاپور میں جو چند مہینے گذارے وہ بھی یادگار رہیں گے۔ اس لئے کہ چین کا پہلا منظر اس شہر میں دیکھا۔ جغرافیہ کے لحاظ سے بیشک سنگاپور چین میں نہیں بلکہ ریاستہائے ملایا میں شامل ہے۔ مگر یہاں کی زیادہ تر آبادی چینی ہے۔ بلا مبالغہ کی تعداد میں چینی یہاں کیوں آباد ہیں؟ جب انگریزوں نے سنگاپور کے قریب ٹین کی کانوں کو دریافت کیا۔ تب ان کانوں میں کام کرنے کیلئے چینی قلیوں کو لایا گیا۔ جن مکانوں میں وہ رہتے ہیں وہ سرمایہ داری نظام کے ظلم اور ناانصافی کا ثبوت ہیں۔ تنگ اور تاریک گلیاں ان میں کئی کئی منزل کے مکان۔ ہر مکان میں سینکڑوں کوٹھریاں۔ اور ہر کوٹھری میں ایک چینی مزدور کا خاندان۔ انہیں اسی تاریکی اور گندگی میں وہ پیدا ہوتے ہیں، انہیں میں رہتے ہیں، انہیں میں مر جاتے ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں بھی مزدور جن مکانوں میں رہتے ہیں وہ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مگر اپنے ملک کی مصیبت دیکھتے دیکھتے عادت ہو جاتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں ان حالات کو دیکھ کر زیادہ احساس ہوتا ہے۔

ہندوستانی

علاوہ چینیوں کے سنگاپور میں باقی آبادی ملایا کے باشندوں اور ہندوستانیوں کی ہے۔ ملایا والے عام طور سے چھوٹے قد اور گہرے سانولے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر مسلمان ہیں۔ ہندوستانی زیادہ تر ٹین کی کانوں یا ربڑ کے کارخانوں میں مزدوری کرتے ہیں۔ لیکن تھوڑی سی تعداد سندھی تاجروں کی بھی ہے جو سنگاپور کے کاروبار پر کافی حد تک حاوی ہیں۔ بازار میں برابر برابر تین دوکانوں کے بورڈ "لی ووڈ اینڈ کو۔ یتیم صالح۔ کشن چند" چینی۔ ملایا اور ہندوستانی تاجر۔ یہی تین قومیں یہاں آباد ہیں۔

بائیکاٹ

سنگاپور میں پہلی بار چین اور جاپان کی جنگ کا پتہ ملتا ہے۔ ہر چینی کی صورت پر اپنے وطن کی مصیبت کا احساس نظر آتا ہے۔ سینکڑوں چینی جو جاپان کے بموں اور گولوں کی بدولت بے گھر ہو گئے ہیں سنگاپور چلے آئے ہیں اور یہاں ان کے ہم وطن ان کی پرورش کرتے ہیں۔ حال ہی میں انگریزی حکومت نے سب چینیوں کا آنا بند کر دیا ہے۔ مگر اس کے خلاف سنگاپور کی چینی آبادی نے زبردست احتجاج کیا ہے۔ وطن پرستی اس کا نام ہے کہ گو خود بھوکے مرتے ہیں اور مصیبت سے رہ رہے ہیں مگر اپنے ہم وطنوں کی مدد کیلئے پھر بھی تیار رہیں۔ میں ایک سندھی تاجر کی دکان میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک متوسط درجے کی چینی لڑکی کپڑا خریدنے آئی۔ دکاندار سے کہا مجھے بہت سستا کپڑا چاہئے۔ اس نے کئی تھان سامنے رکھ دیئے۔ مگر یہ سب جاپانی مال تھا اس لئے لڑکی نے خریدنے سے انکار کر دیا۔ جب دکاندار نے کہا کہ سستا مال تو جاپانی ہی ہوگا۔ تو لڑکی نے جواب دیا "پھر میں اس سال کپڑا ہی نہیں بناؤں گی"

بعد میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنگاپور کی تمام چینی آبادی نے جاپانی مال کا پورا پورا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ حالانکہ اس وجہ سے انھیں بہت سی ضروریات سے محروم رہنا پڑتا ہے۔

چینی نواب

کئی سال ہوئے کسی ضرورت سے مجھے شمالی ہندوستان کی ایک ریاست میں جانا ہوا تھا۔ (ریاست کا نام لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ سب ریاستیں ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں) وہاں بعض افسروں کی مہربانی سے مجھے نواب صاحب کے محل کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ دولت اور بدمذاقی کا اچھا خاصا نمونہ تھا۔ ہر کمرے میں اتنی تصویریں لگی ہوئی تھیں کہ ان میں سے ایک کو بھی دیکھنا مشکل تھا۔ فرنیچر ہر قسم اور ہر زمانہ کا اس طرح بھرا ہوا تھا گویا کباڑی کی دوکان ہے۔ عظیم الشان میزوں پر چاندی کے قلمدان مگر دواتوں میں کبھی روشنائی ہی نہ پڑی تھی۔ ہر طرف بے ترتیبی، لاپرواہی اور بدمذاقی۔ تقریباً وہی منظر سنگاپور کے ایک چینی نواب کے محل میں دیکھا۔ جو شام کو تماشائیوں کیلئے کھلا رہتا ہے۔ آرٹ اور فن کے سینکڑوں نادر نمونے تھے مگر سب اس بری طرح سے کھچا کھچ بھرے گئے تھے کہ کمرے گودام معلوم ہوتے تھے۔ باہر شاندار باغ تھا جس میں چھوٹے چھوٹے مگر گڑیا کے گھر کے برابر مندر، مصنوعی پہاڑ، نقلی درخت، جانوروں کے بت۔ معلوم ہوتا تھا کسی دیو نے اپنے بچے کے دماغ سے اس مکان اور باغ کا نقشہ نکالا ہے۔ اس محل پر کہا جاتا ہے کئی کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ اگر اس روپے کا صحیح مصرف ہوتا تو سنگاپور کے

کوئی لاکھ چینی مزدوروں کیلئے معقول مکانوں کا انتظام ہو جاتا۔ اور وہ ان اندھیری اور گندی گلیوں سے نجات پاتے۔ جہاں وہ اب زندگی گزارتے ہیں۔ سرمایہ داری کے کھیل جو ہندوستان میں ہیں وہی سنگاپور میں ہیں۔

ہڑتال

سنگاپور کے اخبار پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ملایا کی اکثر ٹین کی کانوں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے وجہ یہ ہے کہ ان کو مزدوری کافی نہیں ملتی۔ اور کام کرنے کی شرطیں سخت ہیں۔ افسر ظلم کرتے ہیں۔ اب تک چینی مزدور یہ سب ظلم سہتے آئے تھے۔ مگر اب "بیدار ہو رہا ہے مزدور" اس صدی کا۔ انھوں نے مالکوں کے سامنے اپنی مانگیں رکھیں اور جب وہ منظور نہیں ہوئیں تو ہڑتال کر دی۔ اس ہڑتال میں ہندوستانی اور ملایا مزدور بھی ان کی ساتھ ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک اور واقعہ معلوم ہوا۔ چند ہفتے ہوئے چینی مزدوروں کو معلوم ہوا کہ جس کان میں وہ کام کرتے تھے وہاں سے ٹین جاپان بھیجا جا رہا ہے ہتھیار بنانے کیلئے۔ یہ سوچ کر کہ یہ وہی ہتھیار ہیں جن کی مدد سے جاپان ان کے ملک پر حملہ کر رہا ہے۔ انھوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ مالکوں نے ان کی جگہ ہندوستانی مزدوروں کو بھرتی کر لیا۔ اس پر چینی مزدوروں کے لیڈروں نے پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ کو ہندوستان تار دیئے۔ پنڈت جواہر لال نے فوراً تار کے ذریعہ سنگاپور کے بعض ہندوستانیوں سے کہا کہ وہ جا کے ہندوستانی مزدوروں کو سمجھائیں کہ اگر چینی مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی ہے تو ان کو بھی ساتھ دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس لڑائی میں ہندوستان چین کا ساتھی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مزدوروں نے بھی کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ہڑتال کامیاب ہوئی اور مالکوں نے وعدہ کر لیا کہ ٹین جاپان نہ بھیجا جائیگا۔

منحوس ستارے

شام کو جہاز پر واپس آنے سے پہلے ہم سنگاپور کی ہوائی جہازوں کی چھاؤنی دیکھنے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ تمام دنیا میں پیرس کے بعد یہ ہوائی جہازوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ پانچ چھ مختلف ہوائی راستے یہاں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ کی مشرقی سلطنت کی حفاظت کیلئے بھی سنگاپور میں ایک زبردست ہوائی چھاؤنی کی ضرورت ہے۔ ہم ابھی یہ جگہ دیکھ ہی رہے تھے کہ اندھیرا چھا گیا۔ چھت پر سے ایک عجیب اور دلچسپ نظارہ دیکھا۔ ایک ہوائی جہاز اپنے طویلے سے باہر نکالا گیا اور ایک آدمی اس کو اڑا کر اوپر لے گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوائی جہاز اندھیرے آسمان میں کھو گیا۔ آواز بھی نہیں سنائی دیتی تھی۔ مگر فوراً ہی تین بجلی کے ہنڈے روشن ہو گئے۔ اور ان کا رخ آسمان کی طرف کر دیا گیا۔ روشنی کی تین "انگلیوں" نے آسمان کو کھوجنا شروع کیا۔ اور جلد ہی ہوائی جہاز کو ڈھونڈھ نکالا۔ ہزاروں فٹ اونچا ہوائی جہاز ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک پروانہ روشنی میں آ کر پھنس گیا ہو۔ تب معلوم ہوا کہ یہ ہوائی جنگ کی مشق ہو رہی ہے۔ جہاز پر ہم واپس آ گئے اور آہستہ آہستہ جہاز چلنے بھی لگا۔ مگر اوپر آسمان میں یہی آنکھ مچولی کا کھیل جاری تھا۔ ہوائی جہاز ایک منحوس ستارے کی طرح سنگاپور پر منڈلا رہا تھا۔

حاکموں کا پسینہ

اگلے دن پھر ہم کھلے سمندر میں ہیں۔ اور تالاب پر خوب بھیڑ ہے۔ ہمارے کمروں کی کھڑکیاں پھر بند کر دی گئیں۔ کیونکہ سمندر میں بے چینی کے آثار نظر آتے ہیں۔ دن بھر سب لوگ ڈک پر بیٹھے رہے۔ گرمی کی وجہ سے ہندوستانی چینی، جرمن اور اطالوی مسافر نیکر، کرتا، پاجامہ یا اسی قسم کے ہلکے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ مگر انگریز مسافر اب بھی کالر ٹائی واسکٹ سمیت پورے سوٹ میں نظر آتے ہیں۔ پسینے میں شرابور مگر حکومت کے دبدبے کا اتنا خیال!

رات کو پھر سینما دکھایا گیا۔ اس دفعہ پھر چارلی چیپلن کا پرانا امریکن فلم دکھایا گیا جو نہایت غیر دلچسپ ثابت ہوا۔ اس کے بعد اٹلی کے متعلق دو چھوٹے چھوٹے فلم دکھائے گئے۔ ایک میں وہاں کے مشہور سیر کے مقامات دکھائے گئے۔ اور دوسرے میں اطالوی فوج کی پریڈ دکھا کر ہم پر اپنی فوجی طاقت کا رعب ڈالا گیا۔

جہاز پر پریڈ

۔۔ جولائی۔ صبح اٹھ کر ناشتے کے بعد چند اور مسافروں کی ساتھ جہاز کے دوسرے کنارے تک گئے۔ تیسرے درجے کی ڈک پر دیکھا کہ مسافروں کے بستر سامان وغیرہ ہٹا کر وہاں جہاز کے ملاحوں اور خلاصیوں کو فوجی پریڈ کرائی جا رہی تھی۔ یہی لوگ ایک دن مسولینی کے بڑھتے ہوئے ارادوں کی خاطر اپنی جان دیں گے اور دوسروں کی جان لیں گے۔

کل ہانگ کانگ پہنچنے پر جاپان جانے والے سب ہندوستانی مسافر اتر جائیں گے۔ آج دن بھر گپ ہوتی رہی۔ سب کا اصرار ہے کہ میں بھی ان کی ساتھ ہانگ کانگ اتر کر سیدھا جاپان چلا جاؤں۔ مگر میں شنگھائی دیکھنے کا یہ موقع نہیں کھونا چاہتا ہوں۔ یہ سب لوگ جو تجارت پیشہ ہیں اور جن کے سفر کی وجہ فقط کاروبار ہے

میرے اس شوق پر نہایت تعجب کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اس خطرے کے علاقے سے نکل جائیں۔ اگر حالات اجازت دیتے تو میں شنگھائی سے بھی آگے اندرونی چین میں جانیکی کوشش کرتا۔ تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ کس طرح بہادر چینی باوجود ہتیاروں اور فوجی سامان کی کمی کے جاپانی قوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ مگر جس علاقے میں جنگ ہو رہی ہو وہاں غیر ملکیوں کو آنے جانے میں نہ صرف دقت ہوتی ہے بلکہ خرچ بھی بہت ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑیگا۔

شام کو سکنڈ کلاس کے ہندوستانی مسافر بھی ہماری طرف آگئے۔ اور ڈک پر جمگھٹا رہا۔ ایک صاحب اپنا گراموفون نکال لائے اور دیر تک ہندوستانی گانوں کے ریکارڈ بجتے رہے۔ صبح چار بجے ھانگ کانگ پہنچ جائیں گے۔ اس لئے رات کا کھانا کھا کر سب سویرے سے سو گئے۔ بعض ایسے بھی شوقین مزاج ہیں جو اپنے کمبل اٹھا کر ڈک پر آگئے ہیں اور رات کرسیوں پر لیٹ کر گزاریں گے تاکہ سب سے پہلے ہانگ کانگ پر نظر ڈال سکیں۔

ھانگ کانگ

۸ جولائی۔ صبح ٹھیک چار بجے تھے جب میری آنکھ کھلی۔ جھانکا تو ایسا معلوم ہوا جیسے آسمان کے تارے زمین کے قریب آگئے ہوں۔ حواس درست ہونے پر یاد آیا کہ یہ ہانگ کانگ کی روشنیاں ہیں۔ جہاز ٹھیر گیا تھا فقط سامان اتارنے والی کرین کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جلدی جلدی کپڑے پہن کر اوپر ڈک پر گیا تو بہت سے مسافروں کو موجود پایا۔ بندرگاہ کی روشنی میں دیکھا کہ جہاز گودی پر لگ گیا ہے۔ سامان اتارنے کا انتظام ہو رہا تھا مزدوروں کے دھیمے دھیمے سائے حرکت کر رہے تھے۔ سماں دیکھنے کے قابل تھا۔ معلوم ہوتا تھا شملہ، نینی تال اور مسوری کو سمندر کے کنارے بسا دیا گیا ہے۔ ہانگ کانگ نیچی نیچی پہاڑیوں کے سلسلے پر آباد ہے اس لئے تمام شہر کی روشنیاں ایک وقت میں نظر آتی ہیں۔

چین کا دروازہ

ہانگ کانگ جنوبی چین کا دروازہ ہے یہاں پہنچ کر انسان آپ سے آپ اس زبردست ملک کی تاریخ اور موجودہ حالات پر غور کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یوروپین اور امریکن لوگ تمام مشرقی قوموں کی طرح چینیوں کو بھی غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ انگریزی ناولوں اور امریکن فلموں میں عام طور سے چینیوں کا کردار نہایت خراب دکھایا جاتا ہے مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آج سے ہزاروں برس پہلے جب یوروپ کی آبادی کھال لپیٹے پھرتی تھی۔ چین تہذیب تمدن، آرٹ اور ادب کا مرکز تھا۔ مغرب والوں کو اپنی سائنس کی ایجادوں پر بڑا فخر ہے۔ مگر دراصل انسانی زندگی کیلئے جتنی چیزیں چین میں ایجاد کی گئی ہیں وہ کسی اور ملک میں نہیں ہوئیں۔ ریشم، لکھنے کا کاغذ، سکے سکوں کے بجائے کاغذ کا نوٹ۔ چائے۔ آتشبازی ان سب چیزوں کا استعمال مغرب نے چین سے سیکھا۔ بارود چین میں فقط تفریح کیلئے آتشبازی بنانیکے کام میں آتا تھا۔ یوروپ والوں نے اس سے بندوق، توپ اور بم جیسے خوفناک ہتیار بنا ئے۔ چین کی تہذیب کا مقصد انسان کی سمجھ بوجھ کو ترقی دینا اور اس کی زندگی کی مشکلوں کو آسان کرنا تھا۔ اور مغربی تہذیب کا مقصد؟ دوسروں کو دھوکا دیکر ان پر ناجائز اثر ڈال کر، ڈرا کر، دھمکا کر، روپئے کے زور سے، ہتیاروں کے زور سے اپنی دولت اور اثر کو بڑھانا۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ دس ہزار میل کے فاصلے پر برطانیہ نے ہانگ کانگ پر قبضہ کرنا ضروری سمجھا ہے۔ کولمبو، سنگاپور، ہانگ کانگ غرض جہاں بھی جاؤ وہاں برطانوی شہنشاہیت (سامراج) کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ ہانگ کانگ پر برطانوی قبضہ دو وجہ سے ضروری تھا۔ اوّل تو فوجی نقطۂ نگاہ سے کولمبو اور سنگاپور کی طرح یہ مقام بھی ہندوستان کی "حفاظت" کیلئے نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی چین پر قبضہ کرنے کیلئے ہانگ کانگ اتنا ہی ضروری تھا جتنا شنگھائی شمالی چین میں۔ چین میں جمہوریت قائم ہونے کے بعد برطانیہ کا فوجی اور سیاسی اثر اس علاقے میں کم ہو گیا ہو مگر کاروباری دلچسپی باقی ہے۔ ہانگ کانگ کے دروازے سے انگریزی کارخانوں کا مال چین میں داخل ہوتا ہے۔ ہمارے جہاز میں سے بھی لاکھوں کا مال بندرگاہ پر اتارا گیا!

جاپان کا سایہ

ہانگ کانگ پر بیشک برطانوی قبضہ ہے جب جہاز سے اتر کر میں شہر کی سیر کو گیا تو ہر جگہ انگریزی دکانیں، انگریزی بنک، انگریزی گرجا اور انگریزی سپاہی نظر آئے۔ چین کی قومی حکومت پر دباؤ ڈال کر انگریزوں نے اس بندرگاہ پر اپنا قبضہ قائم رکھا تھا۔ مگر اب جاپان کا خوفناک سایہ بڑھتا ہوا آ رہا ہے۔ میں ھانگ کانگ کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر گیا۔ وہاں سے تمام شہر نظر آتا ہے۔ ھانگ کانگ کے دو حصے سمجھنے چاہئیں۔ شہر کا زیادہ تر حصہ تو ایک جزیرے پر آباد ہے۔

بمبئی کی طرح ۔ اس جزیرے اور چین کی سرزمین کے درمیان فقط ایک میل بھر چوڑا سمندر کا حصّہ ہے ۔ اس لئے شہر کا ایک حصّہ دوسری طرف بھی آباد ہے ۔ جس کو کاؤلون کہتے ہیں ۔ یہاں سے ریل کی لائن جنوبی چین کے سب سے بڑے شہر کینٹن کو جاتی ہے ۔ جو تقریباً سوا سو میل کے فاصلے پر ہے ۔ اس ریلوے لائن پر جاپانی ہوائی جہاز برابر گولے برساتے رہتے ہیں ۔ تاکہ چین کی حکومت ہتیار اور دوسرا ضروری سامان ہانگ کانگ کے راستے سے نہ لاسکے ۔ شنگھائی ختم ہونیکے بعد اب دوسرے ملکوں سے تجارتی تعلقات رکھنے کیلئے ہانگ کانگ ہی چین کا سب سے بڑا دروازہ رہ گیا ہے مگر جاپانیوں کی پوری کوشش ہے کہ یہ راستہ بھی بند ہو جائے ۔ جس وقت تک جاپانی چینی شہروں پر بم برساتے ہیں انگریز اطمینان سے بیٹھے رہتے ہیں ۔ مگر ان کو یہ نہیں معلوم کہ اگر جنوبی چین پر جاپان کا قبضہ ہو گیا تو پھر ہانگ کانگ کی بھی خیر نہیں ۔ کیونکہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو سامراجی طاقتیں نہیں رہ سکتیں ۔

جنگ کی برسی

جس دن ہم ہانگ کانگ پہنچے اس سے ایک دن پہلے تمام چین میں موجودہ جنگ کی پہلی برسی منائی گئی تھی ۔ سال بھر ہوا اسی تاریخ کو جاپانی فوجوں نے شمالی چین پر قبضہ کیا تھا ۔ چینی قوم پرستوں نے چین کے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں جلسے کئے اور اس جنگ کی اہمیت لوگوں کو سمجھائی، جاپان کے خوفناک ارادوں سے قوم کو آگاہ کیا ۔ اور ہر چینی مرد اور عورت نے قسم کھائی کہ اس وقت تک اطمینان سے نہ بیٹھیں گے جب تک جاپانی فوج کو اپنے ملک سے بالکل نہ نکال دیں گے ۔ ایک ہندوستانی تاجر سے معلوم ہوا کہ ہانگ کانگ میں بھی یہ برسی زور شور سے منائی گئی تھی ۔ علاوہ جلسوں اور جلوس کے ہانگ کانگ والوں نے ہزاروں روپیہ قومی حکومت کے جنگی فنڈ کیلئے جمع کیا ۔ آج کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ہماری ہندوستانی کانگریس نے ایک طبی مشن چین بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ اس خبر پر چینی اخباروں اور عوام نے نہایت خوشی کا اظہار کیا ۔ اور بہت سے چینی جو مجھے ملے انھوں نے اتنی گرمجوشی سے میرا شکریہ ادا کیا گویا یہ طبی مشن میں نے خود ذاتی کوشش سے بھجوایا ہے ۔

کینٹن پر بم

ہانگ کانگ کے شاندار کاروباری علاقے کو چھوڑ کر شہر کے اندر گلیوں کوچوں میں جا کر چینی آبادی کی مفلسی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ مزدور پیشہ چینی تو پہلے بھی غریب تھے مگر جب سے موجودہ جنگ شروع ہوئی ہے اندرون ملک سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ پناہ لینے کیلئے ہانگ کانگ آ گئے ہیں ۔ ان سب کے رہنے کھانے کا انتظام بھی ہانگ کانگ کے چینیوں نے کیا ہے ۔ اس لئے ان کی اقتصادی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئی ہے ۔ سینکڑوں بھیک مانگنے پر مجبور ہیں ۔ چند روز پہلے کینٹن پر بڑی سخت بم باری ہوئی تھی ۔ اس کی وجہ سے ہزاروں بے گھر ہو گئے تھے ۔ ان میں سے کافی تعداد نے اب ہانگ کانگ میں پناہ لی ہے ۔ میں ایک ہندوستانی تاجر سے ملا جو دو دن پہلے کینٹن سے آیا تھا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ کینٹن کی چینی آبادی کتنی بہادری سے جنگ کی مصیبتوں کا مقابلہ کر رہی ہے ہر دوسرے تیسرے روز جاپانی ہوائی جہاز شہریوں پر بم گراتے ہیں ۔ مگر پھر بھی شہر میں کسی قسم کی بھگدڑ یا بدانتظامی نہیں ہے حملہ ختم ہوتے ہی لوگ زخمیوں کو ہسپتال لیجاتے ہیں اور کاروبار پھر اسی طرح شروع ہو جاتا ہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں ۔

کشتی میں مکان

ہانگ کانگ کی آبادی کا کافی حصّہ زمین پر مکانوں میں رہنے کے بجائے کشتیوں میں رہتا ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بیچارے مکان کا کرایہ ادا نہیں کر سکتے ۔ دن بھر وہ اپنی کشتیوں میں ادھر سے ادھر سامان ڈھوتے پھرتے ہیں ۔ اور رات کو ان کشتیوں ہی میں پڑے رہتے ہیں ۔ ان میں سینکڑوں ایسے ہیں جنھوں نے ایک رات بھی زمین پر نہیں گزاری ہے ۔ میں نے دیکھا ان کشتیوں کو اکثر عورتیں بھاری چپّوؤں سے کھیتی ہیں ۔ جس ملک میں بھی جاؤ مزدور پیشہ عورتوں کو کام میں مصروف پاؤ گے ۔ ان بیچاریوں کو نہ سنگھار کرنیکی فرصت ہے اور نہ پردے اور برقع کے تکلفات کی ہانگ کانگ میں یہ دیکھکر بھی تعجب ہوا کہ اخبار عام طور سے عورتیں بیچتی ہیں

چینی حملہ

اپنے ہندوستانی ساتھیوں سے رخصت ہو کر (جو دوسرے جہاز سے جاپان جائیں گے) میں جہاز پر واپس آیا تو دیکھا کہ سینکڑوں کی تعداد میں چینی مسافر آ گئے ہیں ۔ یہ سب لوگ ہانگ کانگ سے شنگھائی جا رہے ہیں بعض کاروبار کے سلسلے میں سفر کر رہے ہیں مگر زیادہ تر وہ ہیں جو کینٹن یا کسی اور اندرونی شہر سے ہجرت کر کے شنگھائی تلاش معاش کے سلسلے میں جا رہے ہیں ۔ ان میں سے اکثر موجودہ جنگ کے شکار ہیں ۔ کسی کا عزیز جاپانی بم کا نشانہ بنا ہے ۔ کسی کا مکان

تباہ ہو گیا ہے۔ مگر پھر بھی میں نے ان کو نہایت ہنس مکھ پایا۔ وہ اپنی مصیبتوں کا اعلان نہیں کرتے۔ میرے کمرے میں تین چینی مسافر آ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک انگریزی بولتا ہے اس لئے سب سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ یہ نوجوان کوانگسی یونیورسٹی میں زراعت کا پروفیسر ہے اور چھٹیوں میں اپنے عزیزوں سے ملنے شنگھائی جا رہا ہے۔ ایک اور تاجر سے ملاقات ہوئی جو شنگھائی کا رہنے والا ہے اور ہانگ کانگ کاروبار کے سلسلے میں آیا تھا۔ بات کرنے پر معلوم ہوا کہ شنگھائی میں اس کا ایک سگرٹوں کا کارخانہ تھا جو جاپانی ہوائی جہازوں کا شکار ہو گیا۔ کہنے لگا۔ لاکھوں سگریٹ تھے جاپانی ہوائی جہاز نے ایک بم چھوڑا سب ایک ساتھ ہی جلنے لگے اور یہ کہہ کر خوب ہنسا۔ یہ ہے وہ اسپرٹ جس کے مقابلہ میں جاپان کی فوجیں بیکار ہیں۔ قوم کی خاطر ذاتی نقصان کی پرواہ نہ کرنا اور مصیبت کی حالت میں ہنس مکھ رہنا ہمیں ان چینیوں سے سیکھنا چاہیئے۔ مجھے یہ دیکھکر بھی خوشی ہوئی کہ عام ہندوستانیوں کی طرح یہ چینی یوروپین لوگوں سے ذرا نہیں دبتے۔ تمام جہاز پر چینیوں کا قبضہ ہے۔ یوروپین مسافروں کو بیٹھنے کیلئے کرسی بھی نہیں ملتی۔ انگریز تو غصّے کے مارے لال پیلے ہو رہے ہیں ان کا بس چلے تو سب چینیوں کو نکال باہر کریں۔ مگر نہ یہ ہندوستان ہے اور نہ یہ چینی ہماری طرح محکوم ہیں۔ باوجود از حد خودداری کے سب چینی نہایت با اخلاق اور تمیز دار ہیں۔ بات بات پر شکریہ ادا کرتے ہیں اور جھک کر سلام کرتے ہیں۔ رات کے کھانے پر ایک بڑے میاں اور ان کا پانچ چھ برس کا پوتا میری میز پر تھے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے ان دونوں کو کھانا نکال کر دیا۔ اور بچے کیلئے ایک اونچی کرسی منگوا کر رکھوا دی تو بڑے میاں اس قدر خوش ہوئے کہ کچھ حد نہیں اور اشاروں سے میرا اتنا شکریہ ادا کیا کہ میں پریشان ہو گیا۔

گاؤں میں یونیورسٹیاں

۹۔ جولائی۔ آج ہم پھر کھلے سمندر میں ہیں مگر ساحل سے دور نہیں ہیں۔ دن بھر چینی پروفیسر سے باتیں رہیں۔ چین کی موجودہ حالت جنگ کے امکانات، چین اور ہندوستان کے تعلقات، بین الاقوامی سیاست غرض ہر موضوع پر گفتگو ہوئی۔ پروفیسر کی یونیورسٹی اندرون ملک میں ہے۔ جنگ کے علاقے سے دور۔ مگر اس سے یہ معلوم کر کے نہایت تعجب ہوا کہ شنگھائی کی تمام چینی یونیورسٹیاں جو جاپانی قبضہ کے بعد بند ہو گئی تھیں اب اندرون ملک میں پھر کھول دی گئی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ان یونیورسٹیوں کے طالب علم پیدل چل کر اپنے نئے ٹھکانوں پر پہنچ گئے ہیں۔ اور پڑھائی پھر باقاعدہ شروع ہو گئی ہے۔ کیونکہ چین کی قومی حکومت کا خیال ہے کہ جنگ کی وجہ سے اسے اپنا تعلیمی پروگرام نہیں روکنا چاہیئے۔ کمال تو یہ ہے کہ اب پہلے سے کہیں زیادہ طالب علموں کی تعداد ان یونیورسٹیوں میں پڑھ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ سے پہلے یونیورسٹیاں اور کالج زیادہ تر ساحل کے بڑے شہروں شنگھائی، پیکنگ وغیرہ میں تھیں مگر اب وہ اندرون ملک کے قصبوں میں کھولی گئی ہیں جہاں دُور دُور سے طالب علم پڑھنے آتے ہیں۔ پروفیسر کا خیال ہے کہ جنگ کی وجہ سے چین میں تعلیم بہت پھیل گئی ہے۔ کیونکہ اب ایسے ایسے قصبوں میں کالج کھل گئے ہیں جہاں پہلے اسکول بھی نہ تھے۔

زراعت

ہندوستان کی طرح چین کا اصل مسئلہ بھی زراعتی ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر سے معلوم ہوا کہ چین کی حکومت مدت سے خاص کوشش کر رہی ہے۔ طالب علموں کو موجودہ زراعتی طریقے سیکھنے کیلئے امریکہ، روس، ہالینڈ وغیرہ بھیجا جاتا ہے تاکہ واپس آ کر وہ چین میں بھی زراعت کی حالت بہتر بنا سکیں۔ مویشیوں کو پالنے اور انکی نسل کو بہتر بنانے کیلئے بھی کافی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان چین سے خوش قسمت ہے۔ ہمارے ہاں ہر قسم کے مویشی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مگر چین میں مویشیوں کی کمی ہے۔ یہ چین کی حکومت کی قوم پرستی کا ثبوت ہے کہ باوجود جنگ کے وہ تعلیم اور اقتصادی ترقی کے مختلف ذرائع اختیار کر رہی ہے۔

فتح کس کی ہوگی؟

چینی پروفیسر سے باتوں کے دوران میں میں نے یہ بھی پوچھا کہ اس کی رائے میں چین باوجود اپنی فوجی کمزوری کے مدت تک جاپان کا مقابلہ کر سکے گا؟ پروفیسر کا خیال ہے کہ فی الحال جاپان بعض بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر سکتا ہے۔ لیکن آخرکار جاپانی فوجوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اس کی کئی وجوہات پروفیسر نے بیان کیں۔

(۱) جاپان کی سمندری فوج بہت زبردست ہے۔ چین کے پاس اس کا مقابلہ کرنے کیلئے کوئی جنگی جہاز نہیں ہیں۔ اس لئے ساحل پر اور بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے جہاں تک

جنگی جہاز جاسکتے ہیں جاپانی فوجیں شہر فتح کرسکتی ہیں۔ لیکن اندرونِ ملک میں خصوصاً پہاڑی علاقوں میں جنگی جہاز بلکہ ہوائی جہاز اور بھاری جنگی مشینیں، ٹینک وغیرہ بیکار رہیں۔

(۲) اپنی فوجی کمزوری کو دیکھتے ہوئے جاپانی حکومت نے طے کرلیا ہے کہ اس کی فوجیں خواہ مخواہ دشمن کا مقابلہ کرکے اپنا نقصان نہ کریں گی۔ اگر کسی بڑے شہر پر جاپانی قبضہ ہونیکا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ شہر خالی کردیتے ہیں۔ تمام آبادی اندرونِ ملک میں چلی جاتی ہے۔ جہاں ہزاروں نئے قصبے اور گاؤں آباد ہورہے ہیں۔ شہر خالی کرکے تمام عمارتوں میں آگ لگادی جاتی ہے تاکہ جب فتحیاب جاپانی فوجیں داخل ہوں تو ان کو سوائے کھنڈروں کے اور کچھ نہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ جس علاقے پر جاپانیوں کا قبضہ ہے اس کی آبادی بہت ہی کم ہے۔ جاپان کے بادشاہ کو چینی "کھنڈروں" کا شہنشاہ کہا جاسکتا ہے۔

(۳) جن علاقوں پر جاپان نے اپنا قبضہ کرکے فوجیں ٹھیرا دی ہیں وہاں بھی اُن کو امن نصیب نہیں ہے۔ چینی قوم پرستوں کے "بے قاعدہ" جنگی دستے شبخوں مارکران کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں جاپانی سپاہی مارے جارہے ہیں۔

(۴) مدت سے چینی مصیبت سہنے کے عادی ہوچکے ہیں۔ قحط، سیلاب، ٹڈی، وبا وغیرہ غرض قدرت کے تمام ظلم وہ جھیل چکے ہیں۔ اس لئے اور لوگوں کے مقابلے میں وہ موجودہ جنگ کی مصیبتوں کو آسانی سے جھیل سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ چین کے زبردست رقبے اور پچاس کروڑ کی آبادی کو فتح کرنا جاپان کیلئے آسان کام نہیں ہے۔

(۵) مگر اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ تاریخ میں پہلی بار تمام چینی قوم پوری طرح متحد ہے۔ اس سے پہلے جاپان نے اکثر آپس کے لڑائی جھگڑوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر اب ایسا ممکن نہیں۔ شمال اور جنوب کے آپس کے اختلافات مٹ گئے ہیں۔ کئی سال سے حکومت اور کمیونسٹوں میں جو جنگ جاری تھی وہ بھی اب ختم ہوگئی ہے۔ اور جاپان کے خلاف حکومت اور کمیونسٹوں نے متحدہ محاذ قائم کیا ہے۔ جب تک چین میں یہ اتحاد رہیگا جاپان کامیاب نہیں ہوسکتا۔

شنگھائی ۱۰۔ جولائی۔ آسمان پر گدلے بادل۔ سمندر کا پانی بھی گدلے رنگ کا۔ یہ ینگ سی اور وانگ پو دریاؤں کا متحدہ ڈیلٹا ہے۔ سمندر کو چھوڑ کر اب ہم دریا میں جارہے ہیں۔ پانی کا مخالف بہاؤ تیز ہے اس لئے جہاز چیونٹی کی رفتار سے چل رہا ہے۔ تمام مسافر ڈک پر کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر آج صبح سے چینی مسافر خاموش نظر آتے ہیں۔ ٹکٹکی باندھے کنارے کو دیکھ رہے ہیں جہاں دور تک کوئی آبادی کے آثار نہیں ہیں۔ مگر وہ کیسا شہر ہے اس کا نام "ووسنگ" تھا۔ ایک چینی مسافر بتاتا ہے "تھا" کیا معنی؟ قریب آنے پر "تھا" کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ میلوں تک کھنڈر چلے گئے ہیں۔ یہ شنگھائی کے نواح میں ایک بارونق دار شہر تھا۔ اب ہم ووسنگ کے بالکل برابر سے گذر رہے ہیں۔ ان کھنڈروں کو دیکھکر مشکل سے یقین ہوتا ہے کہ اب سے چند مہینے پہلے یہاں ہزاروں انسان رہتے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی۔ ایک مسافر مجھے بتاتا جارہا ہے۔ یہ کالج تھا۔ یہ تھیٹر ہال تھا یہ ہسپتال تھا۔ یہ کپڑے کا کارخانہ تھا۔ یہ رہنے کے مکان تھے۔ یہ بچوں کا مدرسہ تھا اور اب؟ ایک کھنڈر پر جاپانی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اور دُنیا کو بتارہا ہے کہ یہ سب کس کا کارنامہ ہے۔ چینی مسافر اسی متانت اور خاموشی سے کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے صبر پر حیرت ہوتی ہے . . . . . اب ہم وانگ پو دریا میں ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دُور پر جاپانی جنگی جہاز کھڑے نظر آتے ہیں۔ ووسنگ کے کھنڈر اور یہ جنگی جہاز۔ نتیجہ اور سبب۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس ڈک پر سے کھڑے ہوئے ہم تاریخ کا ایک خونی باب لکھا جاتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ دریا میں ایک موڑ آتا ہے۔ جہاز آہستہ آہستہ رُخ بدلتا ہے۔ اور اکثر مسافروں کی زبان سے بیساختہ نکل جاتا ہے "شنگھائی!"

رکشا شملہ اور نینی تال میں سرکاری افسروں، مسوری میں زمینداروں اور تعلقہ داروں اور کلکتہ میں موٹے موٹے ساہوکاروں کو رکشا میں جاتے دیکھکر ہمیشہ غصہ آتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا بوجھ اٹھائے یا گھسیٹے یہ کہاں کا انصاف ہے؟ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ مجھے بھی ایک روز اس منحوس سواری میں بیٹھنا پڑے گا۔ شنگھائی کی بندرگاہ پر اتر کر سامان امریکن ایکسپرس کمپنی کے آدمیوں کے سپرد کیا کہ کسٹم کا معائنہ کراکے لائے اور خود باہر نکلا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ سوائے رکشاؤں کے کوئی سواری ہی نہیں ہے۔ نہ موٹر، نہ گھوڑا گاڑی، نہ بس نہ ٹرام۔ دُور فاصلے پر ٹرام جاتی نظر آئی۔ مگر غیر شہر میں بغیر زبان جانے ہوئے اپنے ٹھکانے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں۔ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ رکشا والوں نے

آگھیرا۔ اور ایک دو نے تو مجھے اپنی اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اب وہ چینی میں کچھ کہہ رہے ہیں اور میں سمجھ ہی نہیں رہا ہوں۔ تنگ آ کر میں نے کہا "وائی۔ ایم۔ سی۔ اے" جہاں مجھے ٹھہرنا تھا۔ یہ کہنا ہی تھا کہ "یا بدست دگرے دست بدست دگرے" والا معاملہ ہوا۔ اور آنکھ کھلی تو میں رکشا میں اور رکشا ہے کہ اڑی جا رہی ہے۔ اوّل تو اس نامعقول سواری سے عمر بھر کی نفرت، اور پھر یوں زبردستی لاد دیئے جانا۔ پھر رکشا والا اتنا تیز جا رہا تھا کہ ٹوپی اڑ جانیکا خیال اور ہر قدم پر دوسری سواریوں سے ٹکر کھانیکا ڈر۔ راستے بھر یہ معلوم ہوا کہ ہر شخص میری حالت پر ہنس رہا ہے۔ کسی نہ کسی طرح وائی۔ ایم۔ سی۔ اے پہنچے۔ چودہ منزل کی شاندار سامنے ہی گھوڑ دوڑ کا میدان۔ میں نے سوچا جگہ تو اچھی ہے۔ اندر جا کر مسافری چک بُھنایا اور پوچھا کہ رکشا والے کو کیا دیا جائے۔ معلوم ہوا دس سنٹ (یعنی ہندوستانی سکے میں تقریباً ایک آنہ) یعنی دو تین میل تک مجھے گھسیٹ کر لانے کی مزدوری چار پیسے۔ اپنی ذات سے نفرت ہونے لگی اور سوچنے لگا کہ اگر میں رکشا والا ہوتا اور مجھے اتنی محنت کے چار پیسے ملتے تو کیا محسوس ہوتا۔ مگر موجودہ اقتصادی نظام میں احساس کہاں۔ مفلس کی مفلسی سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ رکشا والا غریب اتنی کم مزدوری پر کام کرنے کیلئے مجبور ہے۔ ورنہ بیکاری اور فاقہ کی نوبت آجائیگی۔

...... مگر مزدوری کا سوال چھوڑ کر بھی یہ سواری نہایت وحشیانہ ہے۔ شملہ وغیرہ کے رکشا قلیوں کی عمر پچیس تیس سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ چین میں تو اور بھی کم ہوگی کیونکہ یہاں کے لوگوں کے قویٰ اتنے مضبوط نہیں ہوتے۔ اور مزدوری بھی اتنی کم ہے کہ اس میں پیٹ بھرنیکو بھی کافی نہیں ملتا۔

ساجھے کی ہنڈیا

۱۱۔ جولائی۔ یہ شنگھائی بھی دُنیا کا سب سے عجیب وغریب شہر ہے اور سب سے عجیب چیز اس شہر کی حکومت ہے۔ موجودہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے شنگھائی شہر کے تین حصے تھے۔ اوّل تو چینی حصہ جو بذات خود بہت بڑا شہر تھا۔ یہ حصہ جمہوری چین کے علاقے میں تھا۔ اب اس پر جاپانی قبضہ ہے۔ مگر فقط کھنڈر ہی کھنڈر ہیں آبادی کا نام کو نہیں۔ تمام باشندے جاپانیوں کا قبضہ ہونے سے پہلے شہر چھوڑ چکے ہیں۔ دوسرا حصہ شنگھائی کا وہ ہے جو بین الاقوامی علاقہ (International Settlement) کہلاتا ہے۔

جب چین میں قومی جمہوریت قائم ہوئی۔ اور غیر ملکی طاقتوں انگلستان، فرانس، امریکہ وغیرہ کو اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا تو تجارت کی غرض سے بعض بندرگاہوں اور شہروں کو بین الاقوامی ملکیت قرار دیدیا گیا۔ ان میں سے ایک شنگھائی بھی ہے۔ اس شہر کو ساجھے کی ہنڈیا سمجھنا چاہیئے۔ اس پر برطانیہ، امریکہ، چین اور جاپان سب کا مشترکہ قبضہ ہے۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری زیادہ تر برطانوی اور امریکن فوج پر ہے۔ انگریزی فوج میں بہت سے سکھ اور پٹھان بھی ہیں جو ہندوستان سے لائے گئے ہیں۔ سامراجی شطرنج کے لاچار مُہرے۔ اسی علاقے کے ایک حصے کی ذمہ داری جاپانی فوج پر رکھی گئی تھی۔ جب جنگ شروع ہوئی تو جاپانیوں نے بلا تکلف اس پر اپنا قبضہ کر لیا۔ اور دوسرے ساجھی دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ بین الاقوامی علاقے کے علاوہ شنگھائی کا ایک حصہ بلا شرکت غیرے فرانس کی ملکیت بھی ہے۔ اس کو فرانسیسی اجارہ (French Concession) کہتے ہیں۔ ایک معاہدہ کی رُو سے چینی حکومت نے یہ حصہ فرانس کو دیدیا تھا۔ شہر کے ان مختلف حصوں کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ چینی شہر اور بین الاقوامی علاقے کے درمیان فقط کانٹے دار تاروں کا ایک جنگلہ لگا ہوا ہے۔ اس کے ایک طرف انگریز اور سکھ سپاہی پہرا دیتے ہیں اور دوسری طرف جاپانی۔ جہاں تک نظر جاتی ہے کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں۔ جن میں سب سے نمایاں شنگھائی نینکنگ ریلوے کا اسٹیشن ہے جو کبھی تمام مشرق میں ریلوے کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس تمام علاقے پر جاپانی ہوائی جہازوں نے بم پھینکے تھے۔ نشانہ کبھی کبھی خطا بھی ہو جاتا ہے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بین الاقوامی علاقے کی سرحد پر بھی بہت سے مکانوں کے کھنڈر نظر آتے ہیں اور نہ صرف سرحد پر بلکہ شہر کے بیچ میں بھی بعض اوقات گولے اور بم گرے ہیں۔ جب انگریزوں اور امریکنوں نے شکوے شکایت کئے تو جواب میں جاپانی حکومت نے مسکرا کر معافی مانگ لی۔ بین الاقوامی اور فرانسیسی علاقوں کے درمیان فقط ایک سڑک حائل ہے۔

پچ میل آبادی

جس شہر پر پانچ مختلف حکومتوں، (برطانیہ، امریکہ، فرانس، چین اور جاپان) کا قبضہ ہوگا اس کی عجیب وغریب آبادی کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ان پانچ قوموں کے باشندوں کے شنگھائی

میں کھگوڑے روسی بھی بہت سے آباد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو روس میں زار کی حکومت ختم ہونے پر اپنے ملک سے بھاگ آئے۔ ان میں سے زیادہ تر پرانے روسی رئیسوں، مالداروں اور تاجروں کی اولاد ہیں جن کو مزدوروں کے راج میں رہنا گوارا نہیں تھا مگر یہ گوارا ہے کہ ان کی عورتیں شنگھائی کے گلی کوچوں میں حسن فروشی کریں اور وہ خود مختلف قوموں کیلئے مخبری کرتے پھریں منچوریا، کوریا اور چین کے علاقوں سے بھی جن پر جاپانی قبضہ ہوگیا ہے ہزاروں کی تعداد میں لوگ شنگھائی میں پناہ ڈھونڈھنے آگئے ہیں۔ مدت سے چین مغربی سامراج اور کاروبار کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔ ملک کی غیر ساکن حالت کو دیکھکر یورپ کے کونے کونے سے ہر قسم کے لوگ پیسہ بنانے کی غرض سے آگئے ہیں۔ ان میں سوداگر بھی ہیں اور بدمعاش بھی۔ سیدھی طرح سے قانون کی حد میں رہکر اتنا روپیہ نہیں کمایا جاسکتا جتنا خلافِ قانون طریقوں سے، اس لئے شنگھائی میں ایسے لکھ پتیوں کی کمی نہیں جن کی دولت چوری کے سامان، افیم، کوکین، شراب اور ہتھیاروں کی ناجائز تجارت سے جمع ہوئی ہے۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے سرمایہ داری قانونی رستوں پر چلتی ہے مگر خلافِ قانون ذرائع سے بھی دولت جمع کرنے میں اس کو عار نہیں ہے۔ شنگھائی کے بین الاقوامی سرمایہ دار ہر اس جنس کی تجارت کرنے کیلئے تیار ہیں۔ جنس میں کافی منافع ہو تو خواہ وہ جنس انسان ہی کیوں نہ ہو! اگر کسی یوروپین کمپنی کو چین یا ملایا میں کانیں کھودنے کیلئے دس ہزار مزدور درکار ہیں یا شنگھائی کے کسی قحبہ خانہ کو پچاس لڑکیاں چاہئیں تو وہ یہ کام بھی کر سکتے ہیں۔ اگر منافع کافی ملے۔ ہر اس شہر کی طرح جہاں ملی جلی آبادی ہوتی ہے اور باشندوں کی کافی تعداد ناجائز ذرائع سے دولت کماتی ہے شنگھائی میں بھی گناہ کا بازار گرم ہے۔ مگر سیاست اور اقتصادی حالات کو یہاں بھی دخل ہے۔ منچوریا، کوریا اور اندرونی چین سے ہزاروں کی تعداد میں چینی لڑکیاں بیکسی اور لاچارگی کی حالت میں شنگھائی آتی ہیں۔ ان کے ماں باپ بھائی یا شوہر جاپانی سامراج کے بموں کے شکار ہو چکے ہیں۔ اس حالت میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ ان خونخوار انسانی بھیڑیوں کے فریب میں آسکتی ہیں جو چند ڈالر کی خاطر ان لڑکیوں کو بیچ ڈالتے ہیں۔ جاپان نے جو ظلم چین پر ڈھائے ہیں ان میں سے یہ بھی نہایت سنگین ہے۔

ناچ گھر شنگھائی میں نہ صرف ملی جلی آبادی ہے بلکہ یہاں کی فضا میں ایک بے چینی اور بد امنی ہے۔ کسی چیز کو سکون میسر نہیں۔ کل کیا ہوگا؟ کسی کو نہیں معلوم۔ جاپان کا خوفناک سایہ تمام ملک پر پھیلتا جا رہا ہے۔ لاوارثوں، یتیموں، بے گھروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ بین الاقوامی علاقے میں بھی جاپانی دست درازی شروع ہوگئی ہے۔ ایسی حالت میں ذہنی بے چینی اور اخلاقی بے قاعدگی قدرتی ہیں۔ جنگ اور اسی قسم کے ہولناک موقعوں پر زندگی اور اسکی دلچسپیوں کیلئے انسان کی خواہش بہت بڑھ جاتی ہے۔ سنا گیا ہے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے دوران میں لندن اور پیرس وغیرہ میں سینما، تھیٹر، ناچ گھر، شراب خانے وغیرہ ہمیشہ سپاہیوں سے بھرے رہتے تھے۔ جو اپنے مورچوں سے چھٹی لیکر آئے ہوتے تھے۔ یہی حال شنگھائی کا ہے۔ رات کو تمام تماشوں کے مقام کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں۔ میں نے چند ناچ گھر جاکر دیکھے۔ یہاں مغربی وضع کا ناچ ہوتا ہے۔ ناچنے والوں میں زیادہ تر تعداد چینیوں کی تھی۔ تھوڑی سی تعداد لباس پہنے ہوئے تھی۔ مگر زیادہ تر کا لباس ایک گلابند لمبا ریشمی کوٹ تھا جو متوسط درجے کے چینی عام طور سے پہنتے ہیں۔ پچاس کے قریب حسین چینی نوجوان لڑکیاں کرسیوں پر کمرے کے گرد بیٹھی تھیں۔ یہ پیشہ ور ناچنے والیاں (Taxi Dancers) ہیں۔ ان میں سے کسی کے ساتھ ایک بار ناچنے کا ٹکٹ دس سنٹ (تقریباً چار آنہ) میں ملتا ہے۔ اس میں سے اس لڑکی کو فقط تقریباً ڈیڑھ آنہ فی ناچ ملتا ہے۔ باقی سرمایہ داری کے اصول کے ماتحت اس ناچ گھر کا مالک رکھ لیتا ہے۔ اچھی ناچنے والیاں دو ڈھائی روپئے روز کما لیتی ہیں۔ یہ لڑکیاں صرف ناچتی ہیں۔ پیشہ ور کسبیاں نہیں ہیں۔ ان میں سے اکثر اچھے معزز متوسط درجے کے خاندانوں کی ہیں جو اقتصادی مشکلات سے مجبور ہو کر یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی ہیں۔ کیونکہ مجھے ناچنا نہیں تھا اس لئے میں ایک چینی دوست کے ساتھ ایک کونے کی میز پر بیٹھ کر چائے پیتا رہا۔ اس دوست کے ذریعے سے میں نے دو تین لڑکیوں سے باتیں کیں۔ اور چند سوالات پوچھے۔ اپنا حال بتاتے ہوئے ایک لڑکی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ ایک معزز تاجر کی لڑکی تھی اور جنگ شروع ہونے سے پہلے ایک اسکول میں پڑھتی تھی۔ جنگ کے پہلے مہینے میں اس کا باپ بھائی اور تمام خاندان جاپانی بموں کا شکار ہو گئے۔ اور ہزاروں بے گھروں، لاوارثوں کے ساتھ اس کو بھی شنگھائی کے

بین الاقوامی علاقے میں پناہ لینی پڑی "میرے سامنے دو ہی صورتیں تھیں"، اس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "اپنے جسم کی تجارت یا اس ناچ گھر کی ملازمت۔ اور اس جگہ اتنی بھیڑ اور شور میں کم از کم تھوڑی دیر کیلئے میں اپنی مصیبتوں کو بھول سکتی ہوں"۔ اتنے میں دو جاپانی سپاہی شور مچاتے نہایت بدتمیزی سے داخل ہوئے۔ اس لڑکی نے جس نگاہ سے ان کی طرف دیکھا اس میں غصہ، نفرت، حقارت اور انتقام کا جذبہ سب ہی کچھ تھا۔

چینی مسلمان

شنگھائی میں چار دن میں میں نے چین کی موجودہ حالت کے متعلق بہت کچھ سیکھا علاوہ اور لوگوں کے میں کئی انگریز اور امریکن اخبار والوں سے ملا جو شروع جنگ سے چین کی موجودہ حالت کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان سب کی یہی رائے ہے کہ تمام چین کو فتح کرنا جاپان کیلئے تقریباً ناممکن ہے۔ یہ سچ ہے کہ اپنے جنگی اور ہوائی جہازوں کے زور سے جاپان نے تقریباً ایک تہائی ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔ مگر اس علاقے میں بھی چینیوں کے بے قاعدہ سپاہیوں نے شبخون مار کر جاپانی فوج کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ خود شنگھائی کے ارد گرد جہاں جاپانی قبضہ ہوئے ایک سال ہو چکا ہے جاپانی فوجوں کو امن نصیب نہیں ہے۔ روز رات کو مشین گنوں اور رائفلوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جاپانیوں نے کئی بار کوشش کی کہ اپنے نامزد غدار چینیوں کی ایک حکومت اس علاقہ پر قائم کریں۔ مگر ہر دفعہ ان قوم فروشوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس کے علاوہ جاپانی مقبوضہ علاقہ میں کوئی آبادی ہی نہیں ہے جس پر وہ حکومت کریں۔ غریب چینی کسان جن کی عمر مصیبت جھیلتے گذری ہے جاپانی قبضہ ہونے سے پہلے ہی اپنا ہل کندھے پر رکھ، بیوی بچوں کو ایک گاڑی پر لاد اندرون ملک میں چلے جاتے ہیں...

شنگھائی میں مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ چین میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد آباد ہے۔ چند دوستوں نے میری دعوت ایک ہوٹل میں کی جو ایک چینی مسلمان کی ملکیت ہے۔ یہاں یہ دیکھکر مجھے نہایت تعجب ہوا کہ چینی مسلمان بھی شراب پیتے ہیں۔ مگر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اور لحاظ سے وہ اپنے مذہب کے کافی پابند ہیں۔ جمہوری چین میں ان کو پوری مذہبی آزادی اور شہری حقوق حاصل ہیں۔ موجودہ جنگ شروع ہونے پر جاپانیوں نے پوری پوری کوشش کی کہ چینی مسلمانوں کو ورغلا کر اپنی طرف توڑ لیں مگر ان کی یہ چال کامیاب نہ ہوئی۔ چینی مسلمان سب قوم پرست ہیں اور موجودہ جنگ میں ہر طرح جاپانی حملے کو روکنے کیلئے قومی فوجوں کے ساتھ ہیں۔ جنرل عمر جو ایک معزز مسلمان ہیں جنرل چیانگ کائی شیک کے دست راست سمجھے جاتے ہیں۔ لباس، زبان، طرز رہائش ہر لحاظ سے چینی مسلمانوں اور دوسرے چینیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب تک آپ خاص طور سے یہ سوال نہ کریں کسی چینی کے متعلق یہ کہنا ناممکن ہے کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ آپس میں شادیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ میرے ایک چینی دوست نے بتایا کہ وہ خود عیسائی ہے۔ اس کا باپ بُدھ مذہب کا پیرو ہے، اس کا بھائی لا مذہب اور اس کی عیسائی بہن نے مسلمان سے شادی کی ہے۔ باوجود اسکے وہ سب ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ اور ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ اور ملک کی خاطر برابر قربانیاں کرنیکو تیار ہیں۔ کاش میں اسکو ہندوستان کے متعلق بتا سکتا کہ ہمارے ہاں بھی اتنا زبردست اتحاد ہے!

آزاد عورتیں

شنگھائی میں میں جن لوگوں سے ملا ان میں مسٹر اور مسز چاؤ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں نوجوان میاں بیوی اخبار نویس ہیں۔ مسٹر چاؤ ایک انگریزی اخبار کے اسسٹنٹ اڈیٹر ہیں اور چینی سیاسی مسائل پر مضمون لکھتے ہیں۔ مسز چاؤ بھی جن کی تعلیم یورپ اور امریکہ میں ہوئی ہے مختلف اخباروں اور رسالوں میں لکھتی ہیں۔ وہ مادام چیانگ کائی شیک (چین کے پریزیڈنٹ جنرل چیانگ کی بیوی) کی دوست اور ساتھ کام کرنے والی ہیں۔ حال ہی میں وہ آسٹریلیا سے لوٹی ہیں جہاں عورتوں کی بین الاقوامی کانفرنس میں انھوں نے چین کی نمائندگی کی تھی۔ مسز چاؤ نے مجھے بتایا کہ آسٹریلیا میں لوگوں کو یقین نہ آتا تھا کہ ایک چینی عورت اس طرح آزادی سے ان کے سامنے انگریزی میں تقریر کر سکتی ہے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ موجودہ نسل کی چینی عورتوں کو دیکھکر ہر غیر ملکی کو تعجب ہوتا ہے۔ اب سے تیس چالیس برس پہلے تک چین میں عورت کی سماجی حالت نہایت خراب تھی۔ ان کو مردوں کی ملکیت سمجھا جاتا تھا بچپن سے ان کے پاؤں باندھ دئیے جاتے تھے تاکہ وہ آزادی سے چل پھر نہ سکیں۔ مگر جمہوری حکومت قائم ہونیکے بعد سے یہ سب حالت بدل گئی ہے۔ اب قانون نے مرد اور عورت کا فرق مٹا دیا ہے۔ دونوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں عورتوں کی تعلیم کی طرف حکومت نے خاص توجہ دی ہے۔ لاکھوں لڑکیاں

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
فی پرچہ ۸ر

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت
بھیجا جاتا ہے

جرعات

جلد ۲۰ — ساقی دہلی۔ بابت اگست ۱۹۳۹ء — نمبر ۲

قیمت فی پرچہ ۶ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ناظرینِ ساقی میں یہ خبر بہت خوشی سے سنی جائیگی کہ پروفیسر نورالحسن برلاس اور اُنکی اہلیہ سات سال بعد جاپان سے اپنے وطن دلّی اگست کے پہلے ہفتے میں آ رہے ہیں۔ برلاس صاحب ٹوکیو کے مدرسہ السنۂ غیر میں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ موصوف نے نہ صرف تعلیمی خدمات بدرجۂ احسن انجام دیں بلکہ ہندوستانیوں کا وقار جاپانیوں کی نظروں میں بڑھانے میں ہمیشہ ساعی رہے۔ مبلغ اسلام کی حیثیت سے بھی اُن کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ غرض اُن کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے حکومتِ جاپان نے بھی اُنہیں انتہائی نوازشات سے سرفراز فرمایا۔ پروفیسر برلاس پہلے ہندوستانی ہیں جنہیں دعوتِ شاہی میں مدعو کیا گیا اور اس طرح حکومت جاپان نے انتہائی عزت و تکریم کا ثبوت دیا۔ پروفیسر برلاس کی بدولت سینکڑوں جاپانی اُردو پڑھ لکھ رہے ہیں۔ ان کے شاگرد اور اسسٹنٹ پروفیسر آر۔ گامو۔ کے مضامین ساقی اور ادبی دُنیا میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو کے کئی ڈرامے پروفیسر اور مسز برلاس کے اہتمام سے جاپانی طلبا نے اسٹیج کئے اور بہت پسند کئے گئے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے متعلق جو غلط خیالات جاپانیوں کے ذہن نشیں تھے اُنہیں دُور کرنے کیلئے برلاس صاحب نے دامے، درمے، قدمے کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ جاپانی معاشرت کے متعلق نہایت بصیرت افروز مضامین ساقی میں لکھتے رہے اور ایک ۲۶۰ صفحے کا "جاپان نمبر" بھی مرتّب کیا جو اُردو صحافت میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔

مسز برلاس صحیح معنوں میں پروفیسر برلاس کی شریک حیات ثابت ہوئیں۔ ان کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتی رہیں اور تمام سماجی کارگزاریوں میں شریک رہیں۔ مضمون نگاری کا شوق اُنہیں جاپان جانے سے پہلے بھی تھا مگر جاپان پہونچکر اُنہوں نے جاپان کے متعلق بہت اچھے اچھے مضمون لکھے جن میں سے چند ساقی میں اور بیشتر "عصمت" اور "تہذیبِ نسواں" میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ سات سال کی طویل جُدائی کے بعد پروفیسر اور مسز برلاس واپس آ رہے ہیں، اور وہ بھی صرف چھ مہینے کیلئے۔ اِس مختصر عرصے میں اُمید ہے کہ جاپان کے متعلق تحریر اور تقریر دونوں کے ذریعے جدید ترین معلومات پیش کر سکیں گے۔

پروفیسر برلاس نے آرائشِ گل کا فن بطورِ خاص جاپان میں سیکھا ہے اور ایکنوبو کے ایک مستند ادارے سے ماہرِ فن کی سند بھی حاصل کی ہے۔ دورانِ قیام دہلی میں اِس فن سے ہندوستانیوں کو آگاہ کرنے کا ارادہ ہے۔ اسکے علاوہ جاپان کی اور صنعتوں کے متعلق بھی وافر معلومات برلاس صاحب سے حاصل کی جا سکے گی۔ جو حضرات خط و کتابت کرنا چاہیں ساقی کے پتہ سے خط بھیج سکتے ہیں۔

شاہ واجد علی شاہ بہادر اختر آخری تاجدارِ اودھ کی

علمی خدمات

آج سے بہت پہلے جس طرح شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی کے چند شاگردوں اور عقیدت مندوں نے بہادر شاہ ظفرؔ کے کمالِ فن پہ پردہ ڈالکر مشہور کیا کہ ظفرؔ کے تمام دیوان اُستاد ذوقؔ کی دماغی کلفتوں اور ذہنی کاوشوں کے ثمرات ہیں، مگر نکتہ رس طبائع اور اصحابِ ذوق نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ ہرچند شاگرد اُستاد کے رنگِ شعری سے متاثر ہے لیکن طرزِ شعرگوئی اور اندازِ بیان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔ اور دو مختلف راستوں کے چلنے والے اپنی اپنی منزل کی سمت رواں و دواں ہیں۔ اسی طرح اب حضرت سلطانِ عالم واجد علی شاہ بہادر کے علمی اور ادبی کارناموں پر چند ذمہ دار ہستیوں کی طرف سے خاک ڈالنے کی بے سود سعی کی جارہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت موصوف میں عالمانہ لیاقت اور ادبی صلاحیت ہی نہ تھی اور اُن کی تمام تصنیفات و تالیفات چند دیگر ہستیوں کی مرہونِ منت ہیں۔ اسی خیال سے متاثر ہوکر میں نے یہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔

شاہ واجد علی شاہ بہادر کی ولادت ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۲۲ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی، ظاہری حُسن و جمال، شان و شوکت کے ساتھ ساتھ خدانے باطنی اوصاف سے بھی آپ کو سنوارا تھا۔ بارگاہِ صمدیت سے دل و دماغ کی خاص قوتیں عطا ہوئی تھیں۔ طبیعت کی روانی اور ذہن کی رسائی دیکھکر اُستادانِ فاضل و اتالیقانِ کامل انگشت بدنداں رہ گئے۔ سالوں کے درس مہینوں میں اور مہینوں کے سبق دنوں میں ختم ہونے لگے۔ تھوڑی ہی مدت میں تمام علوم مروجہ سے فارغ التحصیل ہوکر جہانبانی اور کشورکشائی کے فنون سیکھنے میں مصروف ہوے اور اس میدان میں بھی گوے سبقت لے گئے۔ صورت و سیرت سے آراستہ و مجلّیٰ ہوکر اول بخطاب ناظم الدولہ محمد واجد علی خاں بہادر بعدازاں بہ لقب خورشید حشمت مرزا محمد واجد علی بہادر مفتخر و سرفراز ہوے۔ علیا جناب نواب بادشاہ محل صاحبہ بنت نواب علی خاں بہادر شریک زندگی ہوئیں۔ ابھی شباب کی پہلی ہی منزل میں قدم رکھا تھا کہ سلطنتِ اودھ کی مسندِ ولیعہدی پر جلوہ فرما ہوکر ابوالمنصور سکندر جاہ سلیمان حشم صاحبِ عالم ولیعہد مرزا واجد علی شاہ بہادر کہلائے۔ ہردلعزیزی کا یہ عالم بخت و اقبال کی یاوری اور لطف و کرم کی مدد سے تمام رعایا برایا اور اعیان و ارکینِ سلطنت کے دلوں کو دیکھتے دیکھتے مسخر کرلیا جاہ و مرتبہ کے دعاگویوں کا وہ ہجوم ہوا کہ کروبیاں کے گوشِ سماعت گر پڑ گئے۔ آخر نیّرِ حشمت و جلال طلوع ہوکر اوجِ کمال پر پہونچا اور ۲۶ صفر المظفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو پچیس سال کی عمر میں رونق افروزِ تخت جہانبانی ہوئے۔

شہِ عدل پرور سلیماں حشم	فزوں رتبۂ تخت شاہی نمود
زملک و ملک ایں صدا شد بلند	ملک رونق تاج شاہی فزود

۱۲۶۳ھ

قطعۂ تاریخ جلوس ہے مرزا محمد عسکری صاحب مترجم ہسٹری آف اردو لٹریچر مصنفہ جناب رام بابو صاحب سکسینہ ایم۔ اے: مبارک مبارک ہو شاہانہ تاج، کے اعداد ۱۲۶۳ھ کو سنِ جلوس قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ مصرع کے تحت میں آپ بھی ۱۲۶۳ھ ہی تحریر فرماتے ہیں۔ شاہی تخت و تاج سنبھالنے پر ابوالمنصور ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصرِ زماں سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ کے لقب سے ملقب

ہوئے اور اپنے نام کے سکّے جاری کئے ؎

سکہ زد بر سیم و زر از فضل و تائید الہ ظلِّ حق واجد علی سلطانِ عالم بادشاہ

مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہوئیں اطاعت وخلوص کی نذریں گزریں اور داد و دہش کی خُوب خُوب بارشیں ہوئیں۔ ہر خاص عام اور اعلیٰ و ادنیٰ اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ ’مشغلۂ سلطانی‘ سے عدل نوشیرواں کا نقشہ کھینچکر مظلوموں کی فریاد رسی کی گئی۔ بانکوں ترچھوں کے رسالوں اور ’حیدری‘ و ’اختری‘ پلٹنوں سے رستم و اسفندیار کا دبدبہ دکھا کر ملک میں مزید امن و امان قائم کیا گیا اور ہر طرف کامرانی و خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔

کارگزارانِ دولت اور مشیرانِ سلطنت پر بادشاہ کا اعتماد بڑھا تو اُمور شاہی سے طبیعت سیر ہونے لگی۔ بدخواہانِ ملک و ملّت اور ناحق شناسانِ جاہ و ثروت نے رہا سہا بادشاہ کے مزاج میں اور تغیّر پیدا کر دیا۔ عنانِ سلطنت اپنے خسر اور سمدھی نواب علی خاں وزیر اعظم کے ہاتھوں میں دیکر حضور عالم کے خطاب سے سرفراز کیا اور خود کو بجائے سلطانِ عالم کے جانِ عالم کہلوانے لگے۔ قیصر باغ کی بنیاد پڑی۔ محل اور بارہ دری کی تعمیر شروع ہوئی۔ دو کروڑ کی لاگت سے راجہ اندر کا اکھاڑہ تیار ہوا، چاروں طرف جنّت کی حوریں اور پرستان کی پریاں ہوا میں اُڑتی نظر آئیں۔ ہر سمت عیش و نشاط کی ایک لہر دوڑ گئی اور جا بجا رقص و سرود کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ ادنیٰ اہلکار سے لیکر اعلیٰ افسر تک سبھی ان رنگ رلیوں میں پڑے ہوئے تھے اور دادِ عیش پرستی دے رہے تھے۔ ملک میں فتنہ و فساد کا غلبہ اور بدنظمیوں کا زور ہوا، انجام کار انگریزی حکومت کی طرف سے ۱۳ جنوری ۱۸۵۶ء کو انتزاعِ سلطنت کا حکم سنایا گیا اور ریاست دہ سالہ سے دستبردار ہو کر حضرت سلطانِ عالم مع چند اعزا و رفقا بصد حسرت و یاس یہ شعر کہتے ہوئے کلکتہ کو سدھارے ؎

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں رُخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

صاحبِ وزیر نامہ اپنے درد نہانی کا یوں اظہار فرماتے ہیں ؎

دوراں کہ بصد طلسم سازیست در پردۂ او ہزار بازیست

از پردۂ ایں طلسم خانہ صد رنگ برآورد زمانہ

ایں بادۂ روزگار دارد یک مستی و صد خُمار دارد

حضرت سلطانِ عالم کانپور، الہ آباد اور بنارس ہوتے ہوتے ہوئے کلکتہ پہونچے تو شاہی مہمان کے اعزاز میں قلعہ فورٹ ولیم سے اکیس توپیں سر کی گئیں اور شاہانہ استقبال کیا گیا مگر مصالح ملکی کی بنا پر دو سال قلعہ میں نظر بند رکھا گیا۔ بعد ازاں مٹیا برج کے محلہ میں قیام ہوا اور دو کرور سالانہ آمدنی کے ملک سے پندرہ لاکھ روپے سالانہ گزارے کے لئے مقرر کر دیا گیا۔ بادشاہ کے آئینۂ شوق نے سواد مٹیا برج کی جلا کر کے چند دنوں میں خطۂ گلزار ارم بنا دیا اور قیصر باغ کی بارہ دری کا سماں آنکھوں کو نظر آنے لگا۔ آخر بمصداق کلُّ نفسٍ ذائقۃ الموت ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء مطابق ۳ محرم الحرام ۱۳۰۵ھ کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کا سفر کیا اور اندرون حلقۂ مٹیا برج مدفون ہوئے جو آپ ہی کا ساختہ اور تعمیر کردہ ہے۔

سیاستِ مدن

حضرتِ سلطانِ عالم سیاستِ مدن میں کامل دستگاہ اور قابلیت رکھتے تھے۔ چونکہ طبیعت فطرتاً جدّت پسند واقع ہوئی تھی اس لئے

آپ کی خداداد قوتِ اختراع و ایجادات طریق حکمرانی میں بھی دخیل رہتی تھی اور ایسے ایسے پسندیدہ قانون وضع کیا کرتی تھی جو رعایا کی ناموس اور جان و مال کے ہر طرح ضامن ہوتے تھے اور دستوبات کے نام سے مشہور تھے۔ یہاں تمثیلاً چند دستورات کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے آپ کی سیاستدانی اور ملک گیری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اوّل یہ کہ رشوت کا لینا دینا دونوں جرم ہیں اور شریعت کی رو سے مرتشی و راشی مورد قہر ربانی اور مستوجب عذاب سلطانی ہیں۔ دوم یہ کہ خودکشی کر کے حرام موت مرنے والے اشخاص، نوزائیدہ لڑکیوں کو ہلاک کرنے والے راجپوت اور ستی ہونے والی ہندو عورتیں سخت سے سخت سزا کی مجرم ہیں اور جو لوگ عورتوں کے ستی ہونے میں بجائے مزاحمت کے معاونت کرینگے وہ حکومت کی نظر میں قاتل ٹھہریں گے۔ سوم یہ کہ جو بنجارے قرب و جوار سے غلہ لا کر ارزاں فروشی کی کوشش کریں گے وہ شاہانہ انعام و اکرام کے سزاوار ہوں گے۔ چہارم یہ کہ باغات و مکانات کے مالکوں کو چاہیئے کہ اپنی ملکیت کو آباد رکھیں تاکہ ان میں بدمعاش و بدقماش پناہ گزیں ہو کر رات میں رہزنی و نقب زنی کی واردات نہ کر سکیں اور بغیر سمجھے بوجھے اور ضمانت لئے ہوئے کسی کو باغ یا مکان کرایہ پر نہ دیں اگر ان میں چور اور ڈاکوؤں کا مسکن پایا جائیگا تو ان کے ساتھ مالکانِ مکان سے بھی سخت باز پرس ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ وزیر السلطان نواب سید امیر علی خاں امیر صاحب وزیر نامہ میں فرماتے ہیں ؎

بنامی زد چہ آئین بہین است	کزیں منشور حکم عقل و دین است
دماغ افروز ہر شاہ و وزیر است	ادب آموز ہر برنا و پیر است
کمال خویش مستور نہ بود	وزیں بہ در جہاں دستور نہ بود
کسے کز شرح یک لفظش خبر یافت	ہزاراں معنیِ باریک دریافت

عدل وانصاف

خسروانہ عدل و انصاف کی ہمہ گیری اور شاہانہ ذہانت و طباعی کی کارگزاری ملاحظہ فرمایئے۔ مشغلۂ سلطانی کے نام سے چند نقرئی اور طلائی صندوقچے تیار کرائے جاتے تھے جو مقفل ہو کر بادشاہ کی سواری کے ساتھ ساتھ گشت کرتے تھے مستغیث اور امیدوار اپنی اپنی عرضیاں بے دھڑک اُن میں ڈالتے تھے، جن کو جلوس کی واپسی پر خود بادشاہ سلامت اپنے ہاتھوں سے کھول کر ہر مستحق کی کار برآری اور دادخواہوں کی فریادرسی فرماتے تھے چنانچہ صاحب وزیر نامہ کہتے ہیں ؎

صندوقچۂ خوشنما و نوایجاد	چوں سینۂ عادلاں پر از دولت داد
صندوقچہ بود یا دلِ جملہ جہاں	بنہفتہ درو ہزار طومار مراد

آئین رزم

فوجی قواعد کی تنظیم اور آئین رزم کی تعلیم بسا اوقات خود فارسی زبان میں فرماتے تھے اور ایسا دلکش پیرایۂ بیان اختیار کرتے تھے کہ ہر سر بازمست شجاعت و مردانگی ہو کر طلبگار رنیر و نظر آتا تھا تین تین چار چار گھنٹے مسلسل میدانِ جنگ میں کھڑے رہتے گرد و غبار کی شدت اور آفتاب کی تمازت برداشت کرتے ہر سوار و پیادہ کی تفنگ آزمائی، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور گولہ اندازی کا بہ نفسِ نفیس امتحان لیتے اور ضروری فہمائش کے بعد شاہانہ انعام اکرام اور القاب و خطابات سے علیٰ قدرِ مراتب سرفراز کرتے اور بہادروں اور جوانمردوں کے دل بڑھاتے۔ بفحوائے ؎

بہر سو کہ شبرنگ را تاختے	یلاں را بہ تعلیم بنواختے

دلیرانِ لشکر بہ کارِ آگہی　　کمر بستہ بر رسم و راہِ شہی

. . . .

شہِ کارفرما ز طبعِ رسا　　بہ تعلیم شاں کرد ایجادہا
باندازِ نو باخت ایں مردرا　　فروغے دگر داد ناوردرا
بیاموخت رزمیکہ نوساز بود　　ظفر را کزیں مایۂ ناز بود
سپہ شد ازاں آنچناں چیرہ دست　　کہ ہر لشکری لشکری می شکست

عادات واطوار

عیش کوشی اور شاہانہ اقتدار کے باوجود کبھی دامنِ شرم وحیا پر نفس پرستی کا داغ نہ آنے دیا کسی حُسن فروش کے غلبۂ عشق میں بھی شریعت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا اور نکاح یا متعہ سے حرام کو حلال کر کے محلسرا کی زیب وزینت بڑھائی۔ بدنگاہی کی کجلی گرا کر کبھی کسی کے خرمنِ ناموس کو جلا کر خاک نہیں کیا اور یہی وہ صفاتِ بشریہ ہیں جو انسان کو حدودِ بشریت سے نکال کر عالمِ ملکوت میں پہونچا دیتی ہیں ورنہ اس کیف و مستی اور جُنون و دیوانگی کی راہ میں بڑے بڑے پاکبازوں کو قدم قدم پر لغزشوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

ہر کجا سلطان عشق آمد نماند　　قوتِ بازوے تقویٰ را محل
پاکدامن چوں زید بیچارہ　　اوفتادہ تا گریباں در وحل

تاریخ وسیر

طبعِ اقدس کی نکتہ رسی اور نظرِ حق شناس کی معجز نمائی۔ نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ شاہانِ عقل وتدبیر کے لئے تاریخ وسیر کا مطالعہ ازبس ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ چنانچہ بہت تھوڑی مُدت میں تحقیق وتدقیق کی روشنی میں ایسی استعداد بہم پہونچائی کہ نور وظلمت اور صواب و ناصواب کو پہلی ہی نظر میں معلوم کر لیتے اور بہ یک اشارۂ چشم وابرو خیر وشر اور نفع وضرر دانش وبینش کی کسوٹی پر کس کے بمصداق "خذ ما صفا ودع ما کدر" اصلاح کار ور فاہِ عام کی خاطر قدم اُٹھاتے۔ چنانچہ مؤلف وزیر نامہ کہتے ہیں ؎

چکاندے از رگِ اندیشہ گر خوں　　بہ تحقیقش نبردے پے فلاطوں
نیاید از لبِ شیوہ زبانے　　کہ سنجد نکتہ از داستانے

ساخت وتعمیر

عمارات عالیہ اور ابنیۂ خیر کی ساخت وتعمیر سے کئی فائدے مقصود ہیں۔ شان وشکوہ اور نشانی ویادگار کے علاوہ ہزاروں محتاجوں اور لاکھوں فاقہ مستوں کی روزی کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ چنانچہ دُنیا کے بڑے بڑے شاہانہ اولوالعزم اور خسروانِ نامدار کو ہمیشہ فنِ تعمیر سے خاص دلچسپی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس ہوتے کہ وہ ہنگاموں اور شور وشغب سے دُور رہ کر شہر خموشاں کے مختلف گوشوں میں پڑے ہوتے تنہائیوں کے مزے لے رہے ہیں مگر باغات وقصور، مساجد وجسور، مدارس اور کاروان سراؤں سے ان کا نام آج بھی روئے زمین پر زندہ ہے اور جابجا فیوض وبرکات کے چشمے اُبل رہے ہیں۔ حضرتِ سلطانِ عالم کو بھی اس فن میں خاص مشاقی اور ملکہ حاصل تھا آپ کی تعمیر کردہ عمارتوں اور باغوں کی سیر وتفریح سے ہنر سنجانِ روزگار اور معمارانِ تجربہ کار آج بھی غریق لجۂ حیرت ہیں ؎

تا قلم بر صنع کاری یافت دست صد ہزاران نقشِ خود پر کار بست

فنِ موسیقی

فنِ موسیقی کو علومِ ریاضیہ کی ایک شاخ کہا جاتا ہے اس کی قدامت و لطافت کا اندازہ اشعارِ ذیل سے بخوبی ہو سکتا ہے ؎

آں روز کہ رُوحِ پاک آدم بہ بدن گفتند در آئی در آمد در تن
خوانند فرشتگاں بہ لحنِ داؤد در تن در تن در آئی در تن در تن

مولانا نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مثنوی مخزن اسرار میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں ؎

تا سخن آوازۂ دل در نہ داد جاں تنِ آزادہ بگل در نہ داد

غرضکہ سازِ الست میں چھڑے ہوئے اس نغمۂ سرمدی میں کچھ ایسی کشش و انجذاب کی قوتیں پنہاں کی گئیں جس کی ہر ہر صدائے جاں نواز و رُوح پرور نے انبیاء و اولیائے زماں اور شاہان و خسروانِ جہاں کے دلوں کو مسخر کر کے مست و بیخودِ دُنیا و مافیہا بنا دیا۔ آج بھی اس فنِ لطیف کی قدر و منزلت کا یہ عالم ہے کہ اہل اللہ کے اکثر حلقوں میں وسیلۂ قربِ الٰہی اور ذریعۂ معرفتِ ربانی سمجھا جاتا ہے حضرت سلطانِ عالم کو علم موسیقی سے کمال اُنس تھا۔ استادانِ فن سے اصول نادرہ اور نکاتِ غریبہ معلوم کرتے اور اُنہیں ہر طرح کے اعزاز و اکرام سے سرفراز فرماتے تھے۔ چنانچہ اس فن میں آپ کی اکثر کتب مدونہ مقبول و مشہور ہیں جن کا ہر ہر صفحہ بجائے خود ایک عالمِ موسیقیت ہے۔

شعر و شاعری

مختلف ملک و دَور کے بادشاہوں نے اپنی اپنی زبان میں طبع سخن پرور کے خُوب خُوب جوہر دکھائے ہیں۔ حضرت سلطانِ عالم کو بھی دیگر علوم و فنون کی طرح ذوقِ شعری وراثتاً ملا تھا۔ فارسی و اُردو میں اختر اور ہندی میں جانِ عالم یا تخلص فرماتے تھے۔ میر مظفر علی اسیر اور نواب فتح الدولہ برق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ دربار کملاء و فضلاء کا ملجاء و ماویٰ تھا۔ شفق، عیش، ہنر، قلق، امانت، بحر، ہلال و سرور، بڑے بڑے نامور شعراء و ادیب جمع ہو کر دامنِ دولت سے وابستہ ہو گئے تھے اور اکثر رفاقت و جاں نثاری کا دم بھرتے تھے۔ چنانچہ انتزاعِ سلطنت کے بعد مٹیا برج کلکتہ میں بھی یہ عالمانہ اور شاعرانہ صحبتیں گرم ہوتی رہیں۔ قلت مداخل اور کثرت مخارج میں تصنیف و تالیف کا شوق برابر ترقی کرتا رہا۔ سیر و تفریح کے وقت بھی ضروری حوالوں کیلئے [illegible]ی ہیں اساتذہ کی تصنیفات کے صندوق ساتھ رہتے، صاحبِ بوستانِ اودھ فرماتے ہیں "سخنوری اور معنی آفرینی میں حضرت سلطانِ عالم ابلغ البلغاء اور افصح الفصحاء خیال کئے جاتے تھے۔ مملکتِ ہندوستان میں اس فضل و کمال اور جامعیتِ علم و فن کا کوئی دوسرا بادشاہ نہیں گزرا ہے"۔ ممکن ہے یہ فقرے بربنائے خلوص و عقیدت زبان سے نکلے ہوں، اور دعوے کی نوعیت میں کچھ فرق ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ دیگر بادشاہوں کے مقابلے میں حضرت سلطانِ عالم کی علمی خدمات کا دائرہ کچھ کم وسیع نہیں۔ چھ دیوانوں اور مرثیوں کی تین جلدوں کے علاوہ حزنِ اختری و خطابات و محلات دو مثنویاں، قصائد المبارک فارسی و اُردو کے قصیدے، مباحثۂ بین النفس و العقل، صحیفۂ سلطانی، نصائح اختری، عشق نامہ، رسالۂ ایمان، دفتر پریشاں، دستورِ واجدی، صوت المبارک، ارشادِ خاقانی، جوہرِ عروض وغیرہ وغیرہ وہ قابل قدر تصنیفات ہیں جو شاہراہ علم و ادب میں شمع ہدایت بن کے روشن ہیں اور نا واقفانِ منازلِ شاہی کو راہِ راست پر آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ وزیر السلطان نواب سید امیر علی خاں امیر حضرت کی مدح میں اس طرح رطب اللسان ہوتے ہیں ؎

از تیرہ خاکِ ہند کم آید چو من دگر　　بایں زباں سحر بیاں ناظمِ دری
لیکن بہ بندہ حاجتِ اصلاح کلک تست　　زانرو کہ خسروی بدیارِ سخن وری
پوچیست نزد مرد سخن سنج بے سخن　　باحضرتش کسیکہ زند لاف شاعری
دانم کہ رہ بملک معانی برم آمیر　　خسروا اگر بہ تربیتم کرد رہبری

بخیالِ طوالت حضرت سلطانِ عالم کے فارسی و ہندی کلام سے قطع نظر کر کے میں یہاں مختلف رنگ اور صنف میں صرف اُردو کے چند اشعار تمثیلاً پیش کرتا ہوں۔ ردو قبول حسب استعداد و ذوقِ سخن ہے۔ طرزِ کلام اور اندازِ شعرگوئی سے مشاقی ظاہر ہوتی ہے۔ بندش و ترکیب سے نظم کی پختگی اور سلیقگی نمایاں ہے تشبیہ و استعارے میں کسی حد تک ندرت بھی ہے۔ محاورے اور روزمرہ کا خاص لطف ہے، رعایت لفظی اور بنوٹ بھی پائی جاتی ہے مگر یہ ماحول کا اثر ہے اور اس وقت کا یہی رنگ تھا۔ مُلاحظہ ہو:۔

ے　کمر دھوکا، دہن عقدہ، غزال آنکھیں، پری چہرہ　　شکم ہیرا، بدن خوشبو، جبیں دریا، زباں عیسیٰ
براے سیر محمد سارند میخانے میں گر آئے　　گرے ساغر، لنڈھے شیشہ، ہنسے ساقی، بہے دریا
جب کبھی برسات کی فصل آ گئی　　یاں گھٹا اُلفت کی دل پر چھا گئی
خضر دل تو چھوڑ دے اُلفت کی راہ　　اب طبیعت عشق سے گھبرا گئی
جمالِ شمع رویاں دیکھکر محفل میں جلتے ہیں　　مثالِ موم دل عشاق کے غم سے پگھلتے ہیں
لگا دیتا ہے گھُن عاشق کے دل میں عشق کا سودا　　نمک زارِ جہاں میں ہم نمک کی طرح گھلتے ہیں
شراب عشق سے ہے دِل کے جام کی رونق　　کہ جیسے شعر و سخن سے کلام کی رونق
اسی طرح صفِ عشاق کی نمائش ہے　　نماز جمعہ میں جیسے امام کی رونق

سوز و گداز اور درد و اثر سے کلام یکسر خالی نظر نہیں آتا، مُلاحظہ ہو۔

ے　اس عشق نے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا　　آہ دل ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا
بنا رے نور کا پتلا خدایا میری مٹی کو　　بتوں [illegible] کے واسطے پتھر کا کر دے قلب کو جی کو
اے پریزادہ تمہاری آگ نے پھونکا یہ گھر　　قاف سے تا قاف شہرہ اور فسانہ ہو گیا

دیکھئے یاس و حسرت کا نقشہ کن موثر لفظوں سے کھینچتے ہیں:۔

ے　یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں　　لکھنو پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا؟
یوں تو شاہانِ جہاں پر ہے پڑا وقت مگر　　ختم ہے اختر پہ کس پہ جفائے غربت
سخاوت کیا کروں گا داغہائے جسم عریاں سے　　خزانے میں وہ مُہریں جمع ہیں جو بٹ نہیں سکتیں
توقع صبح ہونے کی کسے ہوتی ہے فرقت میں　　وہ راتیں ہجر کی ہیں اے خدا جو کٹ نہیں سکتیں

سُنیئے عشق کی مدح فرماتے ہیں گویا خیالات کی رَو میں خود بہے چلے جاتے ہیں۔

ے　کبھی مردمک چشم مطلوب میں　　کبھی آئینہ بزم محبوب میں

جو آنکھوں میں پہونچا تو جادو ہوا
بیاباں میں آیا تو آہو ہوا
کبھی گیسوئے موجۂ آب ہے
کبھی گردشِ چشمِ گرداب ہے
کبھی تیرِ غم کا نشانہ ہوا
کبھی زلفِ شاہد میں شانہ ہوا
غرض رونقِ ہر مکاں عشق ہے
زمیں عشق ہے آسماں عشق ہے

ایک مثنوی میں ساقی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں، زبان کی صفائی اور بیان کی شوخی قابلِ غور ہے، فرماتے ہیں ؎

نیا ساقیا آج سامان ہو
وہ مے دے شرابوں کی جو جان ہو
بہار آئی کافر کدھر دھیان ہے
عجب تو بھی سیدھا مسلمان ہے
مے ناب خم میں کمر تک نہیں
بہار آئی سر پر خبر تک نہیں
سبو ہوں نئے اور ساغر نئے
کہ آتے ہیں یاں ماہ پیکر نئے
قدح نوش سرمست شیریں زباں
ہوا چاہتے ہیں ترے میہماں

اب ذرا آخر میں عتابِ شاہی کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ روانیِ کلام اور جوشِ طبع کی داد دیجئے۔ حضرت سلطانِ عالم قلعۂ فورٹ ولیم کلکتہ کی تشریف بری کے وقت حکیم شفاء الدولہ بہادر کو اشعارِ ذیل جواباً تحریر فرماتے ہیں، جو ترکِ رفاقت کر کے فیض آباد چلے گئے تھے اور وہاں سے عذرخواہی کی درخواست کی تھی۔

شقۂ عتاب آلود شاہی

بحث کے قابل نہیں میرا دماغ
دردِ زنداں سے نہیں مجھ کو فراغ
رمز اک سوجھی ہے موقع پر مجھے
بلبلِ غم نے دئے ہیں پر مجھے
گوشِ دل سے سن اے تو اے طبیب
پھر سمجھنا شاہ کو اپنا حبیب
مذہب اثنا عشر کے شاہ کو
تو نے چھوڑا قید میں اس ماہ کو
کب سکندر سے فلاطوں چھٹ گیا
کونسی لیلےٰ سے مجنوں چھٹ گیا
کون سے مالک کا بھاگا ہے غلام
بھاگ کر پایا ہے کس نے نیک نام
جاں کو پیارا جان کر اے قدرداں
لکھنؤ تم ہو گئے دم میں رواں
ہم کو چھوڑا قید خانے کے لئے
آپ جا پہونچے زمانے کے لئے
گر یہی طرزِ رفاقت ہے تو واہ
آپ کا مالک نہیں ہے بادشاہ
سلطنت کی تھی محبت ہو چکی
مال و زر کی تھی رفاقت ہو چکی
اب نہ میں مالک نہ تم مملوک ہو
اب مرے نزدیک تم مشکوک ہو
اصل چھوڑی مبت پرستی کیلئے
جام توڑا فرطِ مستی کے لئے

سلیم ناطقی کانپوری

لاٹری

کیا داد مل رہی ہے یورپ کی ساحری کی　　دُھومیں مچی ہوئی ہیں دُنیا میں لاٹری کی

لیلائے لاٹری کا دیوانہ ہر کوئی ہے　　اس "شمعِ زرگری" کا پروانہ ہر کوئی ہے

ڈربی کی لاٹری کا میں نے ٹکٹ خریدا　　بے رنج گنج پانے کا ہے یہی طریقہ

دس پانچ کے عوض میں ہوتے ہیں وارے نیارے　　بنتے ہیں بے مشقت ہم لکھشمی کے پیارے

ہر آرزوئے دل تھی دن کو "بہارِ رنگیں"　　اور رات کے سمے میں دولت کا "خوابِ شیریں"

تخئیل کا مصوّر نقشے بنا رہا تھا　　اور ایک ایک کرکے مجھکو دکھا رہا تھا

رنگینیٔ تصوّر اس درجہ دلکشا تھی　　جنت کی چلتی پھرتی تصویر گویا تھی

گرما گذارنا تھا کشمیر کے بنوں میں　　اور موسمِ زمستاں دکّن کے ہوٹلوں میں

اک ولولہ تھا دل میں حج کا بھی سیر کا بھی　　یعنی طواف کرنا کعبے کا دَیر کا بھی

تینوں میں کیا کہ تیرہ[1] میں بھی نہ نام نکلا!　　اور نوکری کے بیروں میں بھی نہ نام نکلا!

تخئیل ہنس رہی ہے میری حماقتوں پر　　اور ناز کر رہی ہے اپنی طلاقتوں پر

تخئیل اور تصوّر گویا بنا رہے تھے　　میری ہنسی یہ دونوں مل کر اُڑا رہے تھے

کمبخت مَیں نہ سمجھا رازِ درونِ پردہ　　اُمید بن کے ہمدم یوں دے رہی تھی دھوکا

ہے اتفاقِ نادر بے رنج گنج پانا　　غیرت کے ہے منافی محنت سے جی چُرانا

خارا شگاف ہو جا لعل و گہر کے طالب!　　دن رات ایک کر دے اے سیم و زر کے طالب!

مَردوں کا دین و ایماں ہیں سخت کوشیاں ہی

شایانِ شانِ انساں ہیں سخت کوشیاں ہی

امینِ حزیں

---

[1] نہ تینوں میں نہ تیرہوں میں اور نہ نوکری کے بیروں والی ضرب المثل کو شعر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

غمِ ایّام

[illegible]

جمیلہ!

پے در پے تمہارے چار پانچ محبت نامے ملے۔ مَیں بہت نادم ہوں کہ جواب لکھنے میں مجھ سے اتنی کوتاہی ہوئی۔ اور جو بُرا نہ مانو تو پھر تمہیں یہ بھی بتلائے دیتی ہوں کہ ممکن تھا کہ میں جواب دینے سے یونہی گریز کئے جاتی۔ لیکن جمیلہ! تم نے آخری خط میں یہ لکھکر "شاید بیاہ کی مسرتیں خط کا جواب لکھنے میں حائل ہو رہی ہیں" جو چرکا میرے دل پر لگایا ہے، مجھ میں تاب نہیں کہ اب خاموش رہوں۔ لیکن بہتر یہی تھا کہ مَیں یونہی خاموشی سادھے رکھتی۔ ؎

سمجھ میں خاک نہ آئینگے معنی و مطلب
مجھے نہ سن کہ بڑی دُور کی صدا ہوں میں

تمہیں تو مجھ سے یہ شکوہ کہ بیاہ کی مسرتوں میں کچھ ایسی کھوئی گئی کہ تمہارے خطوں کی رسید دینے کی بھی فرصت نہ رہی اور میرا یہ حال کہ ع:-

سینے کا زخم آہ کی تختی سے چھل گیا

جمیلہ! تم جانو اس وقت تم میرے سامنے بیٹھی ہو۔ میرا خط تمہارے ہاتھ میں ہے اور ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ تمہاری بھویں تنی سی ہیں اور تمہارا چہرہ تمہارے دل کی بیتابی اور اُلجھنوں کو عُریاں کر رہا ہے۔ تمہاری آنکھیں خط پر جمی ہوئی ہیں لیکن جو کچھ تمہاری نگاہ کے سامنے ہے تمہارا دل اُسے باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ سچ کہیو جمیلہ! ٹھیک ہے نا؟

لیکن میرے ساتھ کھیلی ہوئی اور مُنہ بولی بہن! تم جو کچھ پڑھ رہی ہو تمہیں باور کرنا ہی پڑے گا۔ دُنیا میں دُکھ درد بھی تو انسان کے لئے ہی بنا ہے۔ پھر اگر مَیں دُکھیاری ہوں تو کوئی اچنبھے کی بات تو نہیں۔ لیکن بہن! مَیں زبان پر لاؤں تو زبان جلتی ہے اور جو چپ رہوں، دل میں چھپا کر رکھوں تو مغزِ استخواں تک جل اُٹھتا ہے۔ اس دُنیا میں مجھ کمبخت کے دُکھ کا درماں نہیں۔

دُلہن بنکر پینس میں سوار ہونے سے پیشتر تم نے جو میرے چُٹکیاں لیں اگر وہ سوفار بنکر میرے جسم کو چھید ڈالتیں اور یہ زخم مرتے دم تک اندمال نہ ہوتے تو خُدا کی قسم مجھے اتنا دُکھ نہ ہوتا جو آج دُلہن بن کر ہو رہا ہے۔ مجھے رُخصت کرتے وقت تم سب تو رو رہی تھیں اور مَیں ارمانوں اور تمنّاؤں کی دُنیا آباد کر رہی تھی۔ مَیں رُخصت ہوئی تو تم لوگوں کا رونا دھونا بھی رُخصت ہوا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ سُسرال پہنچکر عمر بھر کا رونا میرے نصیب میں ہوگا۔

جمیلہ! خُدا تمہیں سلامت رکھے بہن۔ تمہیں چٹکیاں لینا اور مذاق کرنا خُوب آتا ہے۔ "بی سہاگن" نام تو تم نے بہت مزے کا پسند کیا۔ لیکن افسوس! مجھے تو یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ سہاگ ہوتا کیا ہے۔ اور سُہاگن کہتے کسے ہیں اور شاید اب مرتے دم تک بھی اس کیف آور لفظ کے دلکش تاثرات سے محروم ہی رہونگی۔

سُہاگن کون؟ مَیں؟ پھُوٹے نصیب میرے! میری قسمت میں سُہاگن ہونا کب لکھا تھا۔ سُہاگن! خدا کی قسم! یہ لفظ سُنکر میرے دل پر ایک چرکا سا لگتا ہے۔ لیکن اب دل کہاں؟ ہاں درد کی لذّت سے محروم نہیں ہوں۔ اور تم جانو! یہ زندگی جو اَب میرے لئے وبالِ جان ہے اسی ایک لذّت کی منّت پذیر ہے۔

جمیلہ! تم کہوگی تو سہی کہ یہ کیا بکے جا رہی ہے۔ تم کو تعجب ہوگا کہ ان تین چار مہینوں میں ہی اس پر کونسا کوہِ غم ٹوٹا جو یہ کمبخت یوں بلبلانے لگی۔ ہائے توبہ! کس زبان سے تمہیں اپنی مُصیبت کی داستان سُناؤں۔ وہ دن اب کہاں سے لاؤں جب ہم دونوں شادی بیاہ کے مسئلہ پر دوسروں سے چھُپ چھُپ کر

ہولے ہولے باتیں کیا کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا وہ راج کماری کی شادی؟ کمبخت نے مجھے تو بالکل ہی بھلا دیا۔ اور پھر جو اس کے دعوے ہوتے تھے۔ اور پھر اس کے سسرال سے واپس آنے پر جو مزے مزے کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور پھر اس کا ہمارے چٹکی لے کر کہنا کہ گھبراؤ نہیں جب سسرال جاؤگی تو شادی کی کیفیتوں سے خود بخود آگاہ ہو جاؤگی۔

بیاہ کی مسرتیں؟ اُف توبہ! کتنے کیف آور الفاظ ہیں! اور پھر اس خیال سے مچل مچل جانا کہ خوابِ زندگی کی تعبیر کس قدر دلپذیر ہوگی۔ لیکن افسوس! ۔ع۔

جب آنکھ کُھلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا

اری جمیلہ! دل چاہتا ہے کہ دل نکال کر تمہیں دکھاؤں اب جو اس راج کماری کی باتیں یاد آتی ہیں تو بس یہی کہنا پڑتا ہے کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا!

توبہ ہے! اب وہ دن کہاں جب ؎

کس طرح ہیں پُر کیف جوانی کے ترانے
سُنتا ہوں میں تاروں میں محبت کے فسانے
ہیں چاند کے کس درجہ دلآویز اشارے
گویا کہ ہیں مسحور یہ دریا کے کنارے
اور مجھکو خبر کچھ نہیں آلامِ جہاں کی!

لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ وہ دن بھی دور نہیں جب یہی جوانی کے ترانے اور یہی محبت کے فسانے فریاد و شیون بنکر میری زبان سے نکلا کرینگے۔ اب یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ آلامِ جہاں کسے کہتے ہیں اور کس طرح غمِ ایام سینہ کاوی کرتا ہے۔

بہن جمیلہ! مجھے معاف کرنا۔ میں جس رَو میں بہہ رہی ہوں مجھے بہے جانے دے۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں مجھے کہہ لینے دے۔ آندھی چل جاتے تو مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ بارش ہو جاتے تو گرد و غبار بھی ہٹ جاتا ہے۔ طوفان کے بعد جو سکوت پیدا ہوتا ہے اس سے

کائنات کو آرام اور راحت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح رولینے سے دل کی بھڑاس بھی نکل جاتی ہے۔ دُکھ درد کے اظہار سے دل کا بار ہلکا ہو جاتا ہے۔ مجھے تمہارے ہی سر کی قسم! میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ اپنا دُکھڑا تم سے کہکر تم کو بھی پریشان کروں۔ پریشان تو تم ہو ہی گی لیکن جمیلہ! ؎

مرے دُکھ پہ اب رنج اٹھانے سے حاصل
مُصیبت پہ اب تلملانے سے حاصل؟
مرے حال پر دل دُکھانے سے حاصل؟
کچھ بھی نہیں۔ خاک بھی حاصل نہ ہوگا۔

لو اب میری داستان سُنو!

سسرال پہونچی تو ایک دُنیا مجھے دیکھنے کو ٹوٹ پڑی۔ تم جانو! پانچ سات ہزار کے زیورات۔ دو ڈیڑھ ہزار کے ملبوسات اور اس کے علاوہ اور بہت سا سامان اور پھر اس پر یہ میری مُحور صورت، ساس کو ہر طرف سے مبارکباد مل رہی تھی۔

"چاند سی دُلہن بیاہ لائی ہے"
"اس گھر تو لچھمی آئی ہے"
"کیا رنگ روپ ہے"
"تصویر ہے تصویر"
"گہنا پاتا تو دیکھو سر سے پاؤں تک سونے سے لدی ہے"
"خُدا بنا بنی میں بناتے رکھے"

اسی قسم کی آوازیں ہر سمت سے آرہی تھیں۔ رات کھانے کے بعد دو چار جوان لڑکیاں جو رشتے ہی کی تھیں میرے پاس بیٹھی تھیں۔ میں چُپ تھی اور وہ کچھ کُھسر پھُسر کر رہی تھیں۔ کبھی خود بخود ہنسنے لگتیں۔ ان میں سے ایک میرا ہاتھ پکڑ کر بولی "دُلہن آؤ تمہیں سونے کا کمرہ تو دکھا دوں"

لیکن میں جو ذرا سمٹ کر بیٹھنے لگی تو ایک دو میرے گدگدیاں کرنے لگیں۔ پھر انہوں نے کھینچ تان کر مجھے اُٹھا ہی لیا۔ اور جلد عروسی

میں لے چلیں۔ دوسری منزل پر میرے سونے کا کمرہ تھا۔ کمرہ پھولوں سے آراستہ تھا۔ پلنگ پر بھی رنگ رنگ کے پھولوں کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ موم بتیاں جل رہی تھیں۔ دو کرسیاں ایک صوفہ ایک دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ ایک کرسی پر میرے شب باشی کے کپڑے تھے۔ انہوں نے مجھے پلنگ پر بٹھا دیا۔ ایک لڑکی وہ شب باشی کے کپڑے اٹھا لائی اور بولی: "لو دلہن یہ پہن لو۔"

"واہ!" ساتھ ہی آواز آئی: "یہ کپڑے کیوں پہنیں۔"

یہ میرے شوہر تھے۔ ان کے اندر آتے ہی لڑکیاں اٹھ کر چلی گئیں۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر پلنگ کے پاس آ بیٹھے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولے: "رشیدہ! مزاج تو اچھے ہیں؟"

میں خاموش رہی۔ وہ ہنسکر کہنے لگے: "سمجھ گیا! اس خاموشی سے یہی مطلب ہے نا کہ نہ جان نہ پہچان میں تیرا مہمان۔"

"جو کچھ آپ سمجھ لیں۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"شکر ہے!" انہوں نے میرا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر کہا: "کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔"

"کفر؟" میں نے ذرا انکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"رشیدہ!" وہ ہنسکر کہنے لگے: "مجھے تو خوف تھا کہ تم شاید بات بھی نہ کرو۔"

"میں گونگی تو نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن لڑکیاں سسرال آ کر گونگی بن ہی جایا کرتی ہیں۔" وہ بولے: "لیکن تم ایسی تعلیم یافتہ بیوی کے متعلق اس قسم کا خیال کرنا بھی شاید کفران نعمت ہی ہوگا۔ معاف کر دو رشیدہ؟"

"کیا؟"

"میری غلطی۔" وہ میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولے۔

"پھر تو کبھی نہ کیجئے گا؟" میں نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

"دیکھو جی۔" وہ کہنے لگے: "میں غلطی کروں تو تم روک دیا کرو!"

میں چپکی ہو رہی۔

وہ بولے: "رشیدہ نیند آ رہی ہے تمہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"سیر کو چلوگی۔" وہ کہنے لگے: "چاندنی ہے دریا کی سیر کا لطف خوب رہے گا۔"

"آپ کی مرضی۔" میں نے جواب دیا۔

"دیکھو جی!" وہ بولے: "ہماری مرضی کے دن تو ہو لئے۔ اب گھر والی کی مرضی پر سب کام ہوا کرینگے۔"

قصہ مختصر ہم موٹر میں سوار ہو کر دریا پر پہونچے۔ اور کشتی میں بیٹھکر دریا کی سیر کرنے لگے۔ پانی سیال چاندی کی طرح چمک رہا تھا اور کائنات چاندی کی ردا اوڑھے خاموش فضا کی گود میں سو رہی تھی۔ جمیلہ! اس وقت جو جذبات میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے، زبانِ قلم سے بیان نہیں ہو سکتے۔ ایک جوان عورت اور محبوب مرد کا قرب پھر تنہائی اور سکوت! تم ان باتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ خدا کی قسم! دن بھر کی کوفت۔ ماں باپ کے گہوارے سے چھوٹنے کا رنج۔ سہیلیوں سے بچھڑنے کا صدمہ صرف ایک شخص کے قرب سے حباب بر دریا ثابت ہو رہا تھا۔

وہ کشتی کھیتے ہوئے بہت دور چڑھاؤ کی طرف لے گئے۔ پھر چپو چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ کشتی خود بخود بہاؤ کی طرف ہولے ہولے آنے لگی۔

وہ بولے: "رشیدہ کبھی تم نے بھی کشتی چلائی؟"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔

"اچھا!" انہوں نے ہنسکر کہا: "اگر ہم سکھلا دیں تو کیا انعام ملے گا؟"

"اس میں سیکھنے کی بات ہی کیا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"تو آؤ نا ذرا!" وہ بولے: "دیکھیں تو بھلا تمہاری کرامت۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور میرا ہاتھ تھام کر

مجھے اپنی جگہ بٹھا دیا۔ لیکن مجھ سے تو چپّو ہی نہ پکڑے گئے۔ وہ خوب ہنسے
اور بولے "اجی جناب! جائے اُستاد خالی است"
اور میں نے ہنسکر کہا "یہ چپّو ہی کچھ بھاری ہیں"
"بالکل ٹھیک" اُنہوں نے پھر ہنسکر کہا "نازک ہاتھوں کے
لئے چپّو بھی نازک ہی ہوں تو کام بنے"
میں نے ہرچند کوشش کی لیکن ہاتھ چپّو پر ٹھیک بیٹھتا ہی
نہ تھا۔ آخر وہ مجھے آغوش میں لیکر بیٹھ گئے اور چپّو چلانا سکھانے
لگے۔ کچھ دیر یہی شغل رہا۔ پھر کہنے لگے "رشیدہ! محبّت کے متعلق
تمہارا کیا خیال ہے؟"
"کبھی خریدنے کا اتفاق نہیں ہوا!" میں نے ہنسکر کہا۔
"اجی جناب!" وہ بھی ہنسکر بولے "میرا یہ مطلب نہیں"
"اور پہیلیاں میں بھی نہیں بوجھ سکتی" میں نے ان کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔
"میرا مطلب یہ ہے" وہ بولے "کہ مرد اور عورت میں محبّت
کیسے ہوتی ہے؟"
"مجھے ابھی اس کا تجربہ نہیں ہوا" میں نے جواب دیا۔
"ایک ہندوستانی عورت میں یہی سب سے بڑا نقص ہے کہ وہ
شوہر کے گھر آکر اس سے محبت کرنا سیکھتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا
ہے کہ روز اوّل سے ہی دونوں میں بن نہیں آتی" وہ کہنے لگے۔
"تمہارا کیا خیال ہے؟"
"میں تو کہہ چکی" میں نے کہا "مجھے ابھی اس کا تجربہ نہیں ہوا"
"تمہیں مجھ سے محبت ہے؟" اُنہوں نے پوچھا۔
"میں جس چیز سے ناواقف ہوں اُس کے متعلق کیا کہہ سکتی
ہوں" میں نے کہا۔
"میں تمہارا شوہر جو ہوں" وہ بولے۔
"جی!" میں نے ہولے سے کہا۔
"اور تم میری بیوی ہو" اُنہوں نے کہا۔
"جی" میں نے جواب دیا۔
"تو پھر تمہیں مجھ سے محبت بھی ہونی چاہئے" وہ بولے۔
اور میں نے ہنسکر کہا "آپ نے بری میں بھیجی ہوتی تو میں
ساتھ لے آتی"
"اجی جناب!" وہ کہنے لگے "ہم تو بن دیکھے ہی ایمان لے
آئے تھے"
"شکریہ!" میں نے مسکرا کر کہا۔
"رشیدہ!" وہ کہنے لگے "واقعی تم بہت عقلمند ہو۔ اور
میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسی بیوی ملی۔ اب پہلی ہی ملاقات
میں میرا تم سے محبت کا تقاضا حماقت ہی تو ہے۔ کیا خیال ہے
تمہارا؟"
"دُرست ہے" میں نے ہولے سے کہا۔
اس پر وہ ایک قہقہہ لگا کر کہنے لگے "خُوب صاحب خُوب!
گویا تم بھی ہمیں احمق ہی سمجھ رہی ہو۔ لوجی! یہ اچھی رہی!"
"خدا نہ کرے مجھ سے ایسا گناہ سرزد ہو" میں نے کہا۔
"رشیدہ!" وہ بولے "مرد عورت میں جب تک محبّت
نہ ہو اُن کے تعلقات کبھی اُستوار نہیں ہو سکتے۔ خاوند کو چاہیے کہ بیوی
کو محبت کرنے کا موقع دے۔ بلکہ اُسے محبت کرنا سکھلائے۔ یہ نہیں
کہ بس ڈھور ڈنگروں کی طرح رہنے سہنے لگیں"

جمیلہ! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس موضوع پر اُنہوں نے
کوئی لکچر ازبر کر رکھا ہے۔ کیونکہ یہ سلسلہ تو کہیں ختم ہوتا نظر ہی نہ آتا
تھا۔ جب کشتی بہاؤ پر بہت نیچے آجاتی تو وہ پھر چپّو سنبھال کر بیٹھ جاتے
اور اُسے چڑھاؤ کی جانب لے جاتے۔ اب مجھے کچھ نیند سی بھی آنے
لگی تھی اور یہ گفتگو بہت بے کیف سی معلوم ہونے لگی تھی۔ اب
اس قصّے کو کہاں تک طول دوں۔ لوٹے اُس وقت جب مرغ سحر
پیغامِ عمل دے رہا تھا۔ گھر والے ابھی سوتے ہی تھے وہ مجھے خوابگاہ

یا حجلۂ عروسی میں لے گئے اور یہ کہکر کہ رشیدہ! مجھے تو سیر کا لطف کچھ آج ہی آیا۔ لو! اب تم بھی آرام کرو۔" دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

جمیلہ! یہ ہے اس شب اوّل کی داستان جو ہر نو کتخدا کیلئے باعثِ اضطراب ہوا کرتی ہے۔ اب اگر میں اس سرگذشت کو مسلسل لکھنے بیٹھوں تو شاید ایک کتاب بن جائے۔ لیکن میری کتابِ زندگی کا یہ ایک ورق۔ نہیں! نہیں! یہ پہلا ورق جس طرح بے کیف اور بے ربط ہے اسی طرح میری آج تک کی زندگی سمجھ لو۔ ناکامیوں اور نامرادیوں کی داستان، حسرتوں اور ارمانوں کی تباہی کا قصہ، تمنا اور شوق کی بربادیوں کا افسانہ، جذبات اور خواہشات کے خون کا مرقع۔ سننے والوں کیلئے دلکش اور دلچسپ ہو تو ہو لیکن کہنے والے کیلئے جسقدر تکلیف دہ ہو سکتا ہے، میرے سوا دوسرا اندازہ نہیں کر سکتا۔

شوہر کے گھر میں میرے لئے سب کچھ موجود ہے۔ دُنیوی نقطۂ نگاہ سے لوگ مجھے ایک خوش نصیب عورت سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ میری زندگی کیا ہے؟ زندہ درگور ہوں۔ نہ کسی کے سامنے رو سکتی ہوں نہ کسی سے اپنی حرماں نصیبی کی داستان کہہ سکتی ہوں۔ اور پھر کائنات کا ذرّہ ذرّہ جس طرح میرے جذبات کو اُبھارتا ہے۔ میرے سینے پر چرکے لگاتا ہے۔ میں کس سے کہوں؟

ایک روز منڈیر پر دو کبوتر آ بیٹھے۔ میں، برآمدے میں بیٹھی کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ دونوں کو محوِ اختلاط دیکھکر سینے پر بس سانپ ہی تو لوٹ گیا۔ وہ نر کا سینہ اُبھار اُبھار کر اور پر پھلا پھلا کر مادہ کے گرد گھومنا اور ادھر مادہ کا کبھی محبت سے سر جھکا دینا کبھی شوخی سے ایک آدھ ٹھونگا مار دینا۔ پھر دونوں کا چونچ میں چونچ لیکر دانہ بدلنا۔ جمیلہ! قیاس تو کرو، مجھ پر کیا گذر رہی ہوگی۔

برآمدے کی چھت میں چڑیا کا گھونسلا ہے۔ کچھ روز ہوئے چڑیا نے انڈے دئے۔ نر اور مادہ باری باری انڈے سیتے رہے۔ آخر انڈوں سے بچے نکلے۔ جس طرح دونوں بچوں پر نثار ہوتے ہیں بس میرا ہی دل جانتا ہے۔ گھر میں پھولوں کے گملے رکھے ہیں۔ کبھی کبھی خوبصورت پروں والی تیتریاں اُن سے بوس و کنار کرنے لگتی ہیں۔ جب تیتری کسی پھول پر بیٹھتی ہے تو وہ خوشی سے جھومنے لگتا ہے لیکن جب وہ اُٹھتی ہے تو فرطِ الم سے گُل کی ٹہنی جھک جاتی ہے۔ لیکن افسوس! میری خوشیوں کا چمن ہمیشہ اجڑا ہی رہیگا۔

جمیلہ! میں ان مسرّتوں سے محروم تو ہوں لیکن ان بے زبانوں کو ایک دوسرے سے محبت کرتے دیکھ دیکھکر میں بھی دل سے پوچھا کرتی ہوں کہ آخر میں نے کونسا ایسا گناہ کیا جس کی پاداش میں قسامِ ازل نے میرے لئے تڑپنا ترسنا اور آہیں بھرنا لکھدیا۔ ادھر تمہاری دولہا بھائی ہیں، جو بظاہر میری مصیبت سے بالکل بے پروا نظر آتے ہیں۔ میرے شوہر تو وہ بیشک ہیں لیکن خدا کی قسم! میری نگاہ میں اس شخص سے زیادہ ظالم، سفاک اور گنہگار اور کوئی نہ ہوگا۔ تم سوچو تو سہی کہ جس شخص کو قدرت نے شوہر بننے کے قابل ہی نہیں بنایا۔ اُسے کیا حق تھا کہ وہ ایک بیگناہ عورت کی زندگی تباہ کرتا۔ تم مجھے اتنا تو بتلاؤ کہ میں اپنے والدین کو کوسوں یا اس سوسائٹی پر لعنت بھیجوں یا اپنے ملک کے رسم و رواج کا ماتم کروں۔

شوہر میاں کے التفات میں تو کوئی فرق نہیں۔ لیکن تمہارے ہی سر کی قسم جمیلہ! میں اس زندگی سے بیزار ہو چکی ہوں۔ اب میرے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ سوسائٹی کے پاس میرے درد کا کوئی علاج نہیں۔ اور رسم و رواج نے مجھے کچھ اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ لبِ فریاد وا کرنا بھی میرے لئے حرام ہے۔ والدین نے جس جہنم میں مجھے جھونکنا تھا وہ جھونک چکے۔ ملک کا تمدن اور شاید قانون بھی میری دستگیری نہیں کر سکتا۔ رہا مذہب! تو اسے تو ہم لوگوں نے پس پُشت ڈال رکھا ہے۔ اور جو میں کہیں انصاف کیلئے آواز اُٹھاؤں بھی تو خاندان کے ننگ و ناموس پر حرف آتا ہے۔ اری جمیلہ! کتنا ظلم ہے کہ ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

لیکن تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ میں اِس ظلم کے خلاف آواز اُٹھاؤں۔ اور اس شخص سے اپنی مسرتوں، ارمانوں، اُمیدوں، تمناؤں اور جذبات کی بربادی کا انتقام لوں جو ان تمام مصائب کا ذمہ دار ہے۔ موت! ایک بہت ڈراؤنی چیز ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو انسان کے درد کا درماں صرف موت سے ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنی موت کا کیوں سامان کروں۔ اور اس ظالم کو موت کے گھاٹ کیوں نہ اتاروں جس نے محض دُنیا کو مغالطہ میں ڈالنے کے لئے یا ہم چشموں میں آبرو رکھنے کے لئے مجھے حرص و ہوس کا شکار بنایا۔ میرے پاس زہر بھی ہے۔ اور ان کی میز میں پستول بھی رکھا رہتا ہے۔ نہ زہر پینا مشکل اور نہ پستول کی لبلبی (گھوڑا) دبانا کٹھن۔ رہی یہ بات کہ میں زہر کا پیالہ پی کر زندگی کے اس جانگسل عذاب سے نجات حاصل کروں گی یا میری زندگی تباہ کرنے والا گولی کا نشانہ بنے گا اسکے لئے مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میرے صبر و تحمل کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے۔ بس ذرا سی ٹھیس یہ جھگڑا چکا دیگی۔ نتیجہ کچھ بھی ہو لیکن اس اندھی دُنیا کی آنکھیں تو شاید کھل جائیں۔

پیاری جمیلہ! اب تم سے رخصت چاہتی ہوں۔ اگر میں اِس دُنیا سے نامراد گئی تو اپنی دُعاؤں میں مجھے بھی شامل کر لیا کرنا۔

تمہاری بدنصیب

رشیدہ"

ایم۔ اسلم

کیوں جگاتی ہو مجھے بہرِ نماز؟

آہ نکہت کیوں جگاتی ہو مجھے بہرِ نماز؟ — آہ نکہت کیوں بُلاتی ہو مجھے بہرِ نماز؟
مجھ سے کیوں کہتی ہو اب اُٹھو سحر ہونے کو ہے — چہرۂ خورشید منظورِ نظر ہونے کو ہے
کروٹیں لیتی ہے خوشبو پھول کی آغوش میں — نیند سے بیہوش کلیاں آ رہی ہیں ہوش میں
دھو رہی ہے صبح اپنے مُنہ کو آبِ نور سے — اُٹھ کے دیکھو وہ حسیں ہے آسماں کی حور سے
کر رہی ہیں رقص گلشن میں خوشی سے ڈالیاں — دے رہے ہیں داد انہیں پتے بجا کر تالیاں
بارگاہِ ایزدی میں اُٹھ کے سر اپنا جھکاؤ — بھول جاؤ ہاں خیالِ ماسوا کو بھول جاؤ!"

آشنائے حاصلِ ذوقِ عبادت میں بھی ہوں — ہاں اسیرِ لذتِ شوقِ عبادت میں بھی ہوں
لیکن اپنے سر کو جب سجدے میں نیوہڑاتا ہوں مگر — سامنے صورت تمہاری جلوہ گر پاتا ہوں میں
اِس جہاں میں جلوہ فرما ہو تمہیں تم سُو بسُو — ہر گھڑی ہر آن ہر ساعت ہو میرے رُوبرو
خالقِ مطلق کے آگے سر جھکاؤں کس طرح — تم کو اپنے من کے مندر سے اُٹھاؤں کس طرح

خوف ہے مجھکو کہ حاصل بندگی کا کھو نہ جائے
گر اسے سجدہ کروں سجدہ تمہیں کو ہو نہ جائے

مہدی علیخاں

چمکتی ہوئی

(۱)

میں اور رحمت ڈرائنگ روم کے کونے میں بیٹھے چاء پیتے تھے کہ برابر کا پردہ ہلا۔ رحمت نے کہا "کون ہے .... موتی .... آؤ ...."
موتی آتے آتے رُک گئی۔ رحمت نے چاء کی پیالی رکھتے ہوئے کہا۔ "ہیں ... ارے! ان سے پردہ! اندھی کہیں کی .... آؤ .... بھائی سے پردہ!" اور ایک پھول سا مسکراتا ہوا چہرہ کھل کر رہ گیا۔ مجھے سلام کیا۔ میں نے کہا "اچھی ہو؟ پانچ سال بعد ملیں .... رحمت! جب تو یہ چھوٹی سی تھی ...." اور میں نے دیکھا کہ موتی کے خوبصورت چہرے پر پھول سے برسنے لگے۔ اور ہم اس پیاری صورت کو دیکھتے رہے۔ دل میں سوچے کہ جلدی سے بی۔ اے۔ پاس کر کے نوکر ہوجائیں پھر دیکھا جائیگا! جی ہاں۔ دیکھا جائیگا۔

(۲)

ہم دونوں بورڈنگ کے ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔
ڈاکیہ نے لاکر رحمت کو خط دیا۔ رحمت نے خط پڑھکر کہا "ارے یار غضب ہوگیا! ڈھینڈس کے ساتھ موتی کی شادی ہو رہی ہے" اور میرے اوپر بجلی سی گری! یہ ڈھینڈس رحمت کا بہت دُور کا رشتہ دار تھا۔ ایف۔ اے میں تین دفعہ فیل ہوگیا۔ پھر آوارہ گھومنے لگا۔ کوئی پوچھے تو کہدیتا ولایت جاؤنگا۔ کسی سے کہہ دیا پرائیویٹ امتحان دونگا۔ صورت ایسی گھناؤنی کہ جیسے سور۔ موٹا، بھدا، کالا، مگر روپے والا۔
رحمت نے کہا "یہ شادی ہم ہرگز نہ ہونے دینگے ...."
مَیں دل میں بہت خوش ہوا۔ ہم ڈھینڈس کی صورت سے جلتے تھے۔ ہمیشہ ہم سے لڑتا۔ ہم نے اُس کی گھناؤنی صورت کی وجہ سے اُس کا نام ڈھینڈس رکھدیا تھا۔

(۳)

رحمت نے کہا "اب کیا ہو؟"
میں نے کہا "صبر!"
کہنے لگا "ہرگز نہیں"
میں نے پوچھا "پھر کیا کروگے؟"
بولے "زنانے میں گھس کر خود موتی سے ملیں گے"
"پھر کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔
بولے "اُس سے کہدیں گے کہ جب نکاح کے وقت لوگ پوچھیں تو انکار کر دینا۔ "ہاں" کے بدلے "نہیں" کہدے اور جان چھوٹتی ہے"
میں نے کہا "زنانہ میں کیسے گھس چلوگے؟ پردہ ہے۔ سینکڑوں مہمان ......"
رحمت نے کہا "تم میرے ساتھ چلو ہم گھس چلیں گے"

(۴)

ہم دونوں نے کواڑوں کو زور دیتے ہوئے کہا "ہم توڑ ڈالیں گے" جواب میں اندر سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ چھ سات تھیں سب نے زور لگایا۔ ہم ہارے اور انہوں نے چٹخنی لگا دی۔ رحمت نے دیوار کے پاس کُرسی رکھی اور چڑھ گئے اور میں بھی چڑھ گیا۔ جھٹ سے اندر دونوں کود پڑے اور لپکے جو کمرے کی طرف تو ایک عورت نے بڑھکر کہا "ارے اُدھر" پردہ "ہے" مگر ہم کمرے میں گھس گئے اور روکے دروازے سے پردے والی لڑکیاں اور عورتیں بھاگ گئیں۔ لپک کر ہم سامنے والے کمرے میں گھسنا چاہتے تھے کہ ایک کشیدہ قامت سرو قد، نوعمر لڑکی نے دروازہ روک لیا۔ ایک بجلی سی چمک گئی۔ بجلی کی روشنی میں وہ چمکتی

ہوئی تصویر! چہرے پہ ذرا خفگی مگر جیسے چاندنی کھلی ہو! اس نقش و نگار کو ہم دیکھتے رہ گئے۔ چونکے۔

رحمت نے کہا: "آپ کون ہیں؟"

وہ بولی: "آپ کہاں جاتے ہیں؟"

رحمت نے کہا: "موتی کے پاس۔"

"نہیں جا سکتے۔"

"کیوں؟"

"میں آپ کو روکنے آئی ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ موتی آپ سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"بالکل غلط۔"

"بالکل صحیح۔ آپ اپنے والدین کا کہنا نہیں مانیں گے؟"

رحمت نے کہا: "انہوں نے کہدیا کہ تم جانو، اُن سے ملکر آرہا ہوں۔"

وہ بولی: "اور اگر یہ شادی خود اُسے پسند ہو؟"

"کسے؟"

"موتی کو!" مسکرا کر وہ بولی۔ آنکھوں میں کیسی چمک!! چہرے پر کیسا نور! میں تو اس دلکش تصویر کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا!۔

"ضرور۔" رحمت نے کہا: "کیوں نہو.... آپ ہیں کون؟"

"آپ کی ایک بہن... آپ مجھے خوب جانتے ہیں مگر کبھی دیکھا نہیں تھا۔"

"پھر بھی۔"

"آپ کی بہن کی بہن.... آپکی بہن..."

"تو راستہ چھوڑئیے۔" رحمت نے جھلا کر کہا۔

"ہرگز نہیں۔"

رحمت نے میری طرف دیکھکر کہا: "یہ یوں نہیں مانیں گی۔"

میں نے کہا: "پھر؟"

"یہ بہن ہیں نا......"

وہ بولیں: "جی ہاں۔" مسکراہٹ میں بجلیاں۔

رحمت نے اُن سے میری طرف انگلی اُٹھا کر پوچھا: "آپ انکو جانتی ہیں؟"

مسکرا کر بولی: "خوب اچھی طرح۔"

"دیکھو جی۔" رحمت نے مجھ سے کہا: "یہ بہن ہی تو ہیں جیسے موتی ویسے یہ......"

بات کاٹ کر وہ چمک کر بولی: "اور کیا.....؟"

"تو ان کو گلے لگالو۔" رحمت نے کہا۔

میں تو منتظر ہی تھا۔ اور شاید کہنے سے پہلے ہی جھپٹ پڑا۔ اور پکڑا جو میں نے انہیں تو چمک کر وہ گئیں! ہاتھوں میں سے نکل گئی۔ اور میرے مُنہ سے نکلا: "چمکتی ہوئی!"

راستہ صاف اور ہم دونوں جھٹ سے موتی کے کمرے میں گھس گئے۔ دلہن کا کمرہ! وہاں یہ دوسری طرف سے آکر موجود تھی۔ بہت خفا مگر بیحد خوبصورت۔ پہلے مجھے معافی مانگنی پڑی کہ "چمکتی ہوئی" کیوں کہا۔ میں نے اپنی غلطی مان لی اور کہا کہ "اچھا جناب بغیر چمکتی ہوئی سہی۔ منہ سے نکل گیا۔ معاف کیجئے۔ مگر میں نے آپ کو نہیں کہا تھا۔"

وہ خاموشی کے ساتھ نیچے دیکھنے لگیں۔

(۵)

موتی نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا اور روئے چلی جاتی تھی۔ ہماری بات کو سُنا تو جواب ندارد۔ کوئی جواب ہی نہیں۔ ہر طرح سمجھایا: "اندھی ہو گئی ہے۔ ایسے گدھے سے شادی ہوئی جاتی ہے۔" رحمت نے کہا۔ مگر وہ اسی طرح رو رہی تھی۔ کہ انہوں نے کہا: "اُسے گدھا ہی پسند ہو۔"

رحمت نے کہا: "ناممکن۔"

انہوں نے موتی سے ڈانٹ کر کہا: "کہہ کیوں نہیں دیتی صاف صاف کہ میری مرضی کی شادی ہو۔"

وہ چُپ رہی۔

اُنہوں نے پھر جھڑک کر کہا "کمبخت کہدے صاف کہ جاؤ۔"

اور موتی نے اُسی طرح منہ چھپائے کہا "آپ رہنے دیجئے۔"

"تیری مرضی کی ہے نا؟" وہ بولیں۔

رحمت نے کہا "موتی بولو۔۔۔۔"

"جی۔۔۔" موتی نے آہستہ سے کہا۔

ہم دونوں پر ایک بجلی سی گری اور اُنہوں نے مسکرا کر کہا "کہئیے!۔۔۔۔ اب آپ دونوں سو رہا یہاں سے جائیے۔۔۔"

میں نے پوچھا "آپ کا نام؟"

مسکرا کر بولی "آپ کو معلوم ہے۔ خوب جانتے ہیں۔"

"تو بتاؤ تو۔"

"بتاؤں کیسے؟" اُنہوں نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو جھکا کر مسکراتے ہوئے کہا "میرا آپکا 'پردہ' ہے۔"

(۶)

دو سال بعد

کپڑوں کی چمک! خوشبو! پھولوں کی مہک! کمرے میں کوئی اور نہیں تھا بجلی کی تیز روشنی میں۔۔۔۔ میں نے خوشی کے لہجہ میں پرانا جملہ دہرایا۔۔۔ "چمکتی ہوئی!"

پہلے تو میں نے زور سے گدگدایا۔ پھر منہ کھولتے ہوئے کہا "میرا آپ کا 'پردہ' نہیں ہے۔"

(۷)

چار مہینہ بعد کا ذکر ہے۔

سب نے کہا "جوان اور سہاگن کی لاش پر بنارسی دوشالہ ڈالو۔"

قبرستان کا منظر!۔۔۔۔ ٹوٹی ہوئی قبریں! جھکے اور لوٹے ہوئے پتھر! اور میں نے خاموشی سے آنسو بہاتے ہوئے بائیں طرف دیکھا۔ ایک قبر میں سوراخ تھا اُس میں سے کوئی جانور جھانک رہا تھا کہ غائب ہوگیا۔ میں لرز گیا۔ میں نے بنارسی دوشالے کو دیکھا۔ چپکے سے دل نے کہا "چمکتی ہوئی!"

جنازہ قبر میں رکھا گیا اور قبر کو ڈھکنے سے پہلے رشتہ دار آگے بڑھے کہ آخری دیدار کرلیں۔ میں بھی آگے بڑھا ایک بڈّھے رشتہ دار نے محبت سے مجھے روکا اور بولے "مرنے کے بعد تمہارا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اب وہ تمہاری کوئی نہیں۔ تمہارا اور اُس کا 'پردہ' ہے!!!"

(۸)

ایک دوست کچھ عرصے بعد ملے۔ کہنے لگے "سنا تھا تمہاری شادی ہوئی۔ بیوی کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "پردے میں"۔ اور دو آنسو چپکے سے میری آنکھوں سے نکلے تھے، جیسے چور، کہ میں نے اُن کو۔۔۔۔۔ ایک ٹھنڈی سانس لی میں نے اور میرے ہونٹوں کو جنبش سی ہوئی۔۔۔۔ "چمکتی ہوئی"

عظیم بیگ چغتائی

ایک ایکٹ کا ڈرامہ:-

طوطا

منظر:- ایک غریب کا گھر۔ گھر والی پنجرے کے سامنے کھڑی طوطے سے باتیں کر رہی ہے۔

عورت:- کیسا بچارا چپ چپ بیٹھا ہے! انہوں نے ایک روپے میں تجھے بازار سے خریدا ہے — ایک روپے میں! اور اُس ذرا سے چاندی کے گول ٹکڑے نے تیری آزادی چھین لی! آسمان پر اُڑنے اور پَروں کی جُنبش کا مفہوم تجھ سے چھن گیا۔ ستارے اور بہتے ہوئے چشموں کا شفاف نیلا پانی اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت سب تجھ سے چھن گئے! اے ہے، بچارا کیسا پھڑپھڑا رہا ہے! کیسی بے بسی میں سر ٹکرا رہا ہے! تیری رُوح کی زبان بند کر دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی تو اپنے جوڑے سے الگ کر کے قید کر دیا گیا ہے! تیری آنکھیں کس قدر غمناک ہیں! اے خوبصورت ہرے پرندے! تُو کس مایوسی سے پھڑپھڑا رہا ہے! تُو آزادی کے لئے تڑپ رہا ہے؟ لیکن یہ سب بے سود ہے۔ کسی نے تجھے ایک روپے میں خریدا ہے... کیا؟ کیا؟ کیا میں بھی تجھ جیسی ہوں — تیری طرح پنجرے میں بند!

(بیٹا داخل ہوتا ہے)

بیٹا:- ماں! ماں!

عورت:- میرے موتی! میری جان! میرے من کے بھید!

بیٹا:- ماں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں بادل ہوتا اور ہوا میں اُڑتا اُڑتا اُن کالے پہاڑوں کے پیچھے پہونچ جاتا۔

عورت:- (پیار کر کے) ہاں، ہاں، ٹھیک ہے۔

بیٹا:- جی چاہتا ہے میں مینہہ ہوتا۔ درختوں کے پتوں کو دھوتا۔ میں نیلی نیلی کہر ہوتا۔ پیلے رنگ کی چڑیا ہوتا اور لال لال پھول ہوتا۔ جی چاہتا ہے بجلی ہوتا۔ بس بجلی کی ایک لکیر... ماں — ہرا ہرا کھیت ہوتا۔

عورت:- ہاں ہاں میرے چاند۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ بن جائیں جو ہم نہیں بن سکتے۔

بیٹا:- اچھی ماں۔ میرا جی کیوں چاہتا ہے کہ میں دھنک بنجاؤں اور جگنو بن جاؤں اور سمندر پر چاند بنکر چمکنے لگوں؟

عورت:- میری ننھی سی جان، کبھی ایسا ہوگا کہ یہ سارے خوبصورت روپ تمہارے ہو جائیں گے۔

بیٹا:- اچھا ماں تو پھر میں درد بھری خوبصورت آنکھوں والا کتو کا پلا ہی ہوتا۔ جیسا پتاجی نے آج صبح اپنی بندوق سے مارا تھا، اور پھر لال لال آنکھیں کئے گھر آئے تھے۔ ماں، کیا پتاجی کی آنکھیں تم جیسی نہیں ہیں؟ تمہاری آنکھیں تو ٹھنڈی ہیں جیسے شام کو تالاب کا پانی۔ پتاجی کی آنکھیں لال اور دہکتی ہوئی ہیں جیسے چتا۔ پتاجی نے میرے چھوٹے سے پلے کو بندوق سے کیوں مار دیا؟

عورت:- میرے بچے اُسے بھول جا۔ آ میں تجھے پیار کرلوں۔

بیٹا:- ماں۔ دیکھنا جب پتاجی تمہیں پیار کرتے ہیں تو تمہارے دکھ ہونے لگتا ہے؟

عورت:- شی۔ شی... اچھا سنو... کل دیوالی کا تہوار ہے۔ ہم ایک چھوٹا سا مٹی کا قلعہ بنائیں گے... اور پھر ہم...

بیٹا:- ماں، میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔

عورت:- میرے تارے۔

بیٹا:- مگر مجھے پتاجی سے نفرت ہے۔

عورت:- میری جان کل ہم دیوالی میں سَو دیوے جلائیں گے۔

(مرد داخل ہوتا ہے۔ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا)

مرد:- کیا تُو نے کہا تھا کہ کل دیوالی ہے؟ ہا ہا ہا۔ پاگل کہیں کی۔ تو

نشے میں ہے۔ دیوالی آج ہے۔ گھر میں جتنے چراغ ہیں سب جلائے۔ اور دیکھ اگر میری آنکھوں کو ان سے تکلیف پہونچے تو سب کو غارت کر دے۔

عورت۔ تم ہمیشہ اس قدر پی کر گھر کیوں آیا کرتے ہو!

مرد۔ میں اپنے ہوش میں صرف اس وقت ہوتا ہوں جب میں پیا ہوا ہوتا ہوں۔ جبھی مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کیوں پیدا ہوا تھا۔ عورت کیوں ایجاد کی گئی تھی۔ میرے ہاتھ کیوں مضبوط ہیں اور تیرا منہ کیوں ملائم ہے!

بیٹا۔ ماں ماں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔

مرد۔ (بچے کے پاس جاکر اس کا منہ سونگھتا ہے) خدا تجھے غارت کر دے۔ تیرے منہ میں سے کیسی بو آرہی ہے! اچھا تو تو چھپ چھپ کر پیتا ہے؟ کیوں بے کتے کے پلے؟ جبھی تو چاہتا ہے کہ ٹڈا ہوتا۔ یہ ہوتا، وہ ہوتا۔ چھوٹے شرابی! تیری ماں اسے شاعری کہتی ہے! تیری ماں کہتی ہے کہ تو شاعر ہے۔ ابے دھاڑی شراب خور۔ تیرا منہ سٹر رہا ہے۔

عورت۔ اسکے نہیں تمہارے منہ میں سے بو آرہی ہے۔

مرد۔ تو نہیں جانتی کہ کیا بک رہی ہے۔ کیا کوئی بھی عورت جانتی ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے؟ آؤ بیٹے میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہارا منہ نمک کے پانی سے دھو دوں۔

عورت۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتی۔

مرد۔ تو نے اسے خوب برداشت کر لیا تھا۔

عورت۔ جا سو جا۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ کل رات پھر تیری پلک تک نہ جھپکی۔

مرد۔ کیوں نہیں سویا شیطان؟ رات تو سونے ہی کے لئے بنی ہے۔ یہ بدمعاش اندھیرے کو برا کہتا رہتا ہے۔۔۔۔ اندھیرے سے ضد کرتا ہے۔۔۔ رات بھر جاگ کر اس کی توہین کرتا ہے۔۔۔ گدھا کہیں کا۔۔۔ کیوں نہیں سویا رات کو؟

عورت۔ تم جو۔۔۔۔۔ رات بھر ہم تمہارے انتظار میں جاگتے رہے۔ آدھی رات کو ہمارے دروازے کے سامنے سے ایک مُردہ گیا جس کے ساتھ لوگ بھیانک آوازیں لگاتے جاتے تھے۔ میرا بچہ ڈر کے مارے سہم گیا۔ اور تم اب نیج ہوتے پیچھے آئے ہو۔

لڑکا۔ ماں۔ اب میں سوتا ہوں۔

مرد۔ ابے او کاہل لڑکے۔ میرے ساتھ چل سمندر میں نہانے۔ آہا۔ بیٹا ہم خوب گہرے پانی میں غوطے لگائیں گے۔ تیرے گرم گرم بدن کو موجیں پیار کریں گی۔ بیٹا وہ نیلا نیلا کالا گہرا پانی تیری سیاہ آنکھوں کو چومے گا۔ (بچے کو زور سے پیار کرتا ہے) آ۔ ہم آج شام کو نہائیں گے۔ جب سورج ڈوب جائیگا۔ جب سورج ڈوب جائیگا۔

عورت۔ آج شام کو نہیں۔ آج شام کو نہیں۔ کل سہی۔ کل۔

مرد۔ "کل" تو کوئی چیز ہی نہیں "کل" ایک احمقانہ جھوٹ ہے۔ "آج" حقیقی چیز ہے۔ وہ اب ہے، یہاں ہے، یہاں۔ کیا آج کو تو نہیں دیکھ رہی۔ محسوس نہیں کر رہی؟ آہا! شام کی روشنی شراب جیسی ہے۔ شراب۔ تھوڑی سی شراب اور۔

(اپنی جیب میں سے بوتل نکال کر پیتا ہے)

عورت۔ پھر۔ ہے پرماتما! یہ کیوں پیتے ہیں؟

مرد۔ ہر چیز نشے میں ہے۔ میز نشے میں ہے، دیوار، فرش، چھت۔۔۔۔ سب نشے میں ہیں۔ کیوں، تمہارے سیاہ بال نشے میں ہیں۔ اور ایشور خود نشے میں ہے! اس کے نشے میں ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ مینڈک، بچھو، سانپ، دریائی بچھڑے، گینڈے، سیلاب، کال، مندر، مہنت، مہاجن اور بڑھتے ہوئے قرضے کا وجود ہے۔ اس کا ذمہ دار نشے میں ڈوبا ہوا بے فکرا ہے۔ ہاں ایشور نشے میں ہے۔ بالکل بیہوش۔ انسانی خون پی کر وہ بیہوش ہو گیا ہے۔

(چیخیں مار مار کر روتا ہے۔ پھر زور سے قہقہے لگاتا ہے)

عورت۔ نہیں۔ آج شام کو اسے اپنے ساتھ مت لیجاؤ۔ ایشور کے لئے میں تم سے بنتی کرتی ہوں کہ اسے اپنے ساتھ مت لیجاؤ۔

سمندر بڑا ہتیاکاری ہے۔
مرد۔ بیٹا۔ تیرا جی چاہتا ہے کہ سمندر بن جائے ؟ ہا ! ہا ! ہا ! ایک ٹھنڈا اور نیلا اور پُرا سرار۔
بیٹا۔ ماں۔ ماں۔
عورت۔ بچے کو نیند آ رہی ہے۔
مرد۔ مو ہیں جاگ رہی ہیں۔
(بچے کو لیکر باہر چلا جاتا ہے)
عورت۔ (طوطے سے) پنجرے میں بند بے بس پرندے ! تیرے لئے پنجرا ہے اور میرے لئے قسمت۔ دونوں کس قدر تنگ و تاریک اور راجیرن ہیں۔ (دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز) کون ہے ؟
جہاں گرد۔ دروازہ کھولو۔
عورت۔ تم کون ہو ؟
جہاں گرد۔ مَیں ایک جہاں گرد ہوں۔
عورت۔ گھر کا مالک باہر گیا ہوا ہے۔ پھر آنا۔
جہاں گرد۔ ہم سب گھر کے مالک ہیں . . . . جسے دُنیا کہتے ہیں۔ دروازہ کھولو۔
عورت۔ (چراغ جلانے اُٹھتی ہے) ٹھہرو، میں چراغ جلالوں۔ (چراغ جلاتی ہے) یہ کس کی آواز تھی ؟ کیا چراغ بُجھ گیا ؟ نہیں۔ ایک خواب سا تھا۔ (دروازہ کھولتی ہے) اندر آجاؤ۔ لے ہے۔ تم تو بُڈھے تھکے ہوئے اور بھوکے نظر آتے ہو۔
جہاں گرد۔ مَیں بُڈھا ہوں۔ تھک کر چُورا ہو رہا ہوں۔
عورت۔ بچارا غریب۔
جہاں گرد۔ تمہیں مجھ پر اب بھی ترس آتا ہے ؟
عورت۔ اب بھی ترس آتا ہے ؟ . . . تم کون ہو ؟
جہاں گرد۔ تم نے مجھے نہیں پہچانا ؟
عورت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے بہت دن بیت گئے . . . . تمہاری آواز جانی پہچانی ہے۔ مگر مَیں تمہیں نہیں جانتی۔
جہاں گرد۔ نہیں پہچانا تم نے ؟
عورت۔ نہیں۔
جہاں گرد۔ تمہاری بھول پر مَیں تمہیں دوش نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میرے بال برف جیسے سفید ہو گئے اور تمہارے ابھی تک شبِ تار کی طرح ہیں جو اپنے جلو میں سپیدۂ سحر لئے ہو۔ میری آنکھیں زرد اور مُردہ اور سرد ہیں . . . . اور تمہاری ابھی تک جوان اور موسمِ بہار کی آرزو سے لبریز۔
عورت۔ تم کون ہو۔
جہاں گرد۔ مَیں وہ پہلا شوریدہ سر ہوں جس نے تمہارے آستانۂ نسوانیت کو سجدہ گاہ بنایا۔ کچھ عرصے کے لئے مَیں تمہارا پوشیدہ مہمان تھا۔ اور پھر ہم جُدا ہو گئے۔ مَیں اَب تمہارے پنجرے کی سلاخیں توڑنے کے ارادے سے آیا ہوں۔
عورت۔ میرے پنجرے کی سلاخیں ؟
جہاں گرد۔ کئی راتیں ہو گئیں، مَیں روزانہ تمہاری چیخیں سُنتا ہوں۔ وہ بزدل جسے قانون تمہارا شوہر کہتا ہے، اُس نے ایک دفعہ تمہارے ایک چُھری پھینک کر ماری۔ مگر تم بال بال بچ گئیں تاکہ کچھ عرصے تک اَور اُس کے کھیل کا نشانہ بنتی رہو۔ مجھے معلوم ہے کہ اُسنے تمہاری چوڑیاں توڑ کر تمہاری کلائی میں سے خون بہایا۔ او خدا ! او خدا ! اِس کُل عرصے میں مَیں تم سے محبت کرتا رہا۔ اور اب میں آیا ہوں آیا ہوں کیونکہ وہ وقت آگیا ہے کہ مَیں تمہارے پنجرے کی سلاخیں توڑ دوں اور تمہیں صاف کُھلے آسمان میں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ جہاں میرے ساتھ تم روشنی اور آزادی کے گیت گا سکو گی۔
عورت۔ مَیں نہیں آسکتی ــــ ابھی اِسی وقت ــــ مَیں نہیں آسکتی، نہیں آسکتی۔
جہاں گرد۔ مجھے اب جانا چاہیئے۔ مگر دیکھو جب کبھی تمہیں ضرورت

ہو تو مجھے بلانا نہ بھول جانا۔ میں سڑک کے اُس پار رہتا ہوں۔ سامنے وہ جو ایک چھوٹی سی کُٹیا ہے، اُس میں۔

عورت:۔ مت جاؤ۔ مت جاؤ۔ مجھے تم سے ایک راز کہنا ہے۔

جہاں گرد:۔ مجھے فوراً چلا جانا چاہیئے۔

عورت:۔ ٹھہر جاؤ۔ بچے کو دیکھکر جانا۔ وہ بڑا خوبصورت، اور بڑا شاندار بچہ ہے۔ بڑی بڑی آرزوئیں اُس کے دل میں بھری ہوئی ہیں۔ جیسے بادل بن کر تیرتا پھرے، چڑیا کی طرح اُڑتا پھرے.... گھومتا رہے، گھومتا رہے اور گھومتا گھومتا کہیں سے کہیں نکل جائے اور جہاں گرد بن جائے۔

جہاں گرد:۔ ایشور اُس پر اپنی دیا کرے۔

(باہر چلا جاتا ہے)

عورت:۔ (دروازے میں کھڑی رہتی ہے۔ مرد داخل ہوتا ہے... زور کا قہقہہ لگاتا ہے) بچہ کہاں ہے؟

مرد:۔ سمندر سے پوچھو۔

عورت:۔ کیا؟

مرد:۔ بچے کیلئے سمندر کی محبت تیری محبت سے زیادہ تھی۔ اے عورت! کیسا عجیب وغریب نظارہ تھا وہ!

عورت:۔ بچہ کہاں ہے؟

مرد:۔ موجیں اُس کے چاروں طرف ناچ رہی تھیں، تالیاں بجا رہی تھیں، اور ہوائیں پرندوں کی طرح سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ اور موتی آنکھوں کی طرح تہ میں سے اُچھل اُچھل کر اوپر آ رہے تھے۔ ہے ایشور! کیسا نظارہ تھا وہ! عورت! ٹھنڈا پانی جب اس کے جسم کو اپنی گود میں لے رہا تھا تو بچہ خوش ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "پتا جی تم گھر جاؤ۔ میں جل پریوں سے کھیلوں گا" جل پریوں کا بادشاہ اُچھل کر اوپر آیا اور غوطہ مار کر اُسے اپنے ساتھ سمندر کے اندر لے گیا۔ اے عورت! کیسا عجیب وغریب نظارہ تھا وہ!

عورت:۔ کیا؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا وہ سچ مچ ڈوب گیا؟ میرا بچہ۔ میرا بچہ! کہاں ہے میرا بچہ؟

مرد:۔ وہ کل واپس آجائیگا دیوالی کے تہوار کیلئے۔ ہا ہا!

عورت:۔ کیا وہ ڈوب گیا؟

مرد:۔ دیکھ عورت، سُن۔ میں تجھے سچ سچ بتاتا ہوں۔ سفید سچ۔ دنوں میں نے اُس بیوقوف کو آپ ہی آپ باتیں کرتے سُنا ہے۔ کبھی کچھ بننا چاہتا تھا کبھی کچھ۔ شرابی کی طرح بڑبڑایا کرتا تھا۔ ہاں، وہ تو خُون میں ہے۔ میرا پردادا شرابی تھا۔ میرا دادا شرابی تھا۔ میرا باپ شرابی تھا۔ میں شرابی ہوں۔ پانچ پیڑھیوں سے یہ خُون میں ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا بیٹا بھی شرابی بنے۔ اس لئے میں اُسے پکڑ کر سیدھا سمندر کی طرف لے گیا اور اُسے ڈبو دیا۔

عورت:۔ احمق۔ وہ تیرا بیٹا نہیں تھا!

(جہاں گرد خاموشی سے داخل ہوتا ہے اور شرابی کو گھورتا ہے۔)

(پردہ)

(ہرندرا ناتھ چٹوپادھیا) مترجمہ:۔ شاہد احمد

اُف یہ بچّے

میں نے سجے سجائے کمرے پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور ذرا پرے ہٹ کر اُس چوکی پر بیٹھ گئی جسے میں نے چادر منڈھ کر نہایت فیشن ایبل "دیوان" میں تبدیل کر دیا تھا۔ دو ایک کشن اِدھر اُدھر کئے اور پردوں کی چنٹ کو پھر سنوارا۔ آرام کرسیوں کو ذرا پوربی کھڑکی کی طرف سرکایا اور میز پوش کے کونے ذرا اور نیچے کھینچ دئے۔ اَب مس قلب نہیں اُن کے فرشتے بھی بے کہے سُنے آن دھمکتے تو مجھے خوف نہ تھا۔

دوپٹہ اتار کر کرسی کے ہتّے پر ڈال دیا اور رسالوں کے انبار میں سے کُرید کر ایک موٹا سا باتصویر رسالہ نکال لیا اور احتیاط سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ مادھوری کی دلکش آنکھیں .... دیوکا رانی کا چھلّوں دار جوڑا ــــ مسز سروجنی نائیڈو کا شاندار بازو ــ ہر ہٹلر کی دلفریب موچھیں ــ غنودگی کی وجہ سے ذرا دُھندلی دُھندلی نظر آنے لگیں ـــ خاؤ! میں نے جمائی کو روک کر اُن پانچ توام بچّوں کے چوکھونٹے چہروں کو دیکھا جو ڈبّوں کی طرح ایک قطار میں آراستہ تھے۔

"پانچ!" میں نے چپٹی ناکوں کو چھنگلیا سے گِنتے ہوئے سوچا "ایکدم!" دوسرا خیال آیا "شاباش ہے بچّی تیرے جیوڑے پر! تیرا ہی بوتا تھا۔ کوئی اور وال کی ہوتی تو سانس بھی نہ لیتی" پانچ۔ پورے پانچ۔ معجزہ ہے۔

قدرت سے بھول ہوگئی۔ کچھ ہاتھ بہک گیا ــ سُنتے ہیں ایک بھینس کے کبوتر کے بچّے پیدا ہوئے! کیا خبر بہن سنتے ہیں۔ آج کل یہ آنکھوں کے نُور دل کے سرور کچھ اِسی شان سے نزول فرمارہے ہیں۔ بھئی بچّوں کے دم سے ہی گھر کی رونق ہے ـــ دروازے پر ہلکی سی کھسر پھسر ہوئی اور مجھے چوکنا پڑا۔ جب چنّو کی کُتیا نے بچّے دئے تھے، ہمیں ذرا ہوشیار ہی رہنا پڑتا تھا۔ گھر کے ہر کونے میں موٹے موٹے پلّے "کوُں کوُں" کرتے پھرتے تھے۔ ناک میں دم تھا۔ کبھی برتنوں کی ڈلیا میں سو رہے ہیں۔ تو کبھی سل پر چھپکلیاں کھیلی جارہی ہیں .... تو کبھی میلے کپڑوں پر کُشتی ہو رہی ہے ــ تو کبھی کچھ! میں نے آہستہ سے ولائی میں مُنہ چھپالیا اور ہلکے ہلکے جھک کر جوتا اُٹھانے لگی کہ بس آتے ہی دوں ایک کس کے ــ دروازہ کُھلا ــ پردہ ہلا ــ میں نے جوتے کو ذرا زور سے دابا ـــ ارے مینو! خیر ہوگئی۔ ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ جوتا چھوڑ کر میں واپس لیٹ گئی۔ مینو جسے میں نے صبح ہی بمشکل کمرے میں سے نکالا تھا ــ پھر آگئی ــ لیکن خیر کیا ہرج ہے۔ ہرج ہی کیا ہے۔ جاگ تو رہی ہوں ــ کچھ بگاڑے گی تو دیکھا جائے گا۔ وہ آگے بڑھکر کُرسی کی آڑ میں آگئی۔ کمرے میں سُکوت طاری تھا۔ نیند نے پھر آنا شروع کیا۔ ایک بچّے کی موجودگی میں گو نیند آنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ بھلا کوئی کیسے سوسکتا ہے۔ وہ بھی ہیں اللہ کی پیاری بندیاں جو کلیجہ سے بچّوں کو چمٹا کر غافل سو سکتی ہیں ـــ نیند تو سُولی پر بھی سُنتے ہیں آہی جاتی ہے ــ خاموشی برابر طاری رہی۔ غنودگی بڑھکر غفلت میں ڈوب گئی۔

عجیب طِلسمی آہٹ سے میری آنکھ کُھلی "ارے!" یقین مانئے میری گھگّی بندھ گئی۔ ایک غیر انسانی ہیولا۔ جو کسی طرح بھی ایک بڑی لومڑی سے اُونچا نہ ہوگا، میرے سرہانے چاروں ہاتھ پاؤں کے بل ایک حیرت انگیز قلا بازی کھانے کو تیار تھا۔ میرے تعجب سے اُچھلنے پر وہ شے ایک دم کچھ ایسے پلٹی کہ اس کی کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ٹانگیں مع دو تربتر جوتوں کے میرے مُنہ اور تکیہ پر پڑیں۔

"ای ہی ہی ۔۔ وہ تتنے ہنسی۔

"لاحول ولاقوۃ مینو" میں بھی کس قدر ڈرپوک ہوں۔ میں نے سوچا۔

"اونہوں، اتر نیچے!" میں نے کیچڑ پانی اور صابن سی لتھڑی ہوئی بچی کو نیچے دھکیل کر اتارا۔ ذرا حواس درست ہونے پر کچھ عجیب قسم کی پاؤڈر صابن منجن اور دیگر لوازمات کی بو کیچڑ کی سوندھی خوشبو میں ملکر کمرے کو معطر کرنے لگی۔

اور یہ واقعہ تھا کہ سنگھار میز پانی پت کا میدان بنی ہوئی تھی۔ کریموزون! وہ حیرت انگیز کریم جسے اگر حبشی بھی استعمال کرے تو تین دن میں خاصہ گورا پڑجائے ـــ جو میں نے ڈھائی روپے خرچ کر کے سپلا کمپنی بمبئی سے دو روز ہوئے منگوائی تھی۔ جسے میں مارے کنجوسی کے صرف گالوں اور ناک پر چپڑ لیا کرتی تھی نہایت دریا دلی سے آئینہ میز اور خود مینو کی تھوتنی پر لپیٹی ہوئی تھی۔ دانتوں کے چودہ آنے والے برش سے بوٹ پالش کی شیشی کی زیریں تہ نکال کر کنگھے اور برش پر پوتی گئی تھی۔ "کوٹی" کا بہترین رنگ والا پاؤڈر میز کے اوپر اور چاروں طرف چھڑکا گیا تھا۔ کیوٹکس کی دونوں شیشیاں کہنیوں تک مینو پر روغن کرنے میں خالی کی جاچکی تھیں۔ لیکن جس چیز نے میرا خون خشک کر دیا وہ میرا خوبصورت "ڈچیز سیٹ" تھا۔ جسے میں نے لاہور کی نمائش میں ساڑھے پانچ روپے میں خریدا تھا اور آج ہی مس فلپ کی عزت افزائی کیلئے بچھا دیا تھا۔ صابن منجن اور ابٹنے میں لتھڑا ہوا نہانے کی چوکی پر رکھا ہوا تھا۔

سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ مینو میری نظریں بھانپ گئی اور چلی کتراتی ہوئی۔

"ٹھہر تو سؤر یا ـــ چل کہاں؟" میں نے دانت بھینچکر اسے ہاتھ پکڑ کر گھما ڈالا اور ایک میز پر بٹھا دیا جس کا میز پوش وہ پہلے ہی بالٹی میں بھگو آئی تھی۔

"آں ـــ چھوڑئیے" وہ اترا کر تتلائی۔

"ہوں!" میں نے میز پر سے یہ موٹا سا رول اٹھا کر اسے دھمکایا "بول اب؟"

"آں ـــ ہم دوامی سے کہدینگے" وہ مچلنے لگی۔

"دیکھوں تو تیری دوامی کو" میں نے اسے گال پکڑ کر پچھاڑا۔

"دوامی دیکھئے ـــ آں ہٹ" اس نے گھونسا دیا۔

"دوامی ـــ ی ـــ ی ـــ دیکھو مار رئیں ہیں!" وہ کچھ اور وصول کرنے سے پہلے ہی چلائی۔

"بھئی کیا آفت ہے ـــ کیوں کھائے لیتے ہو میری بچی کو" دوامی کہیں سے چلائیں۔

لے ہے بس آگ ہی تو لگ گئی۔ آبجے جو وہ ڈکرائی تو ننگے پیر صرف پیٹی کوٹ پہنے دوامی صاحبہ سوتے سے بھاگی آئیں

"سب ہی میری بچی کو مارتے ہیں۔ ہٹو بھی" وہ بھنبھنائیں۔

"ہوں اور یہ تمہاری منحوس بچی چاہے کسی کو قتل کر ڈالے کچھ نہیں" میں نے کہا۔

"واہ میری بچی کیوں ہوتی منحوس۔ آخر بات بھی ہو کچھ"

"یہ ـــ یہ کچھ بات ہی نہیں ـــ بات ہی نہ ہوئی ـــ یہ دیکھو۔ یہ دیکھو" میں نے اشارے سے انہیں وہ دردناک منظر دکھایا۔

"اوئی" وہ مسرت کو دبا کر بولیں "لے ہے" وقت کی نزاکت دیکھکر وہ بے تحاشہ ہنسنے سے باز رہیں۔ جب کوئی کسی کا نقصان کردے۔ بڑے ابا پھسل کر گر پڑیں۔ کسی کے بھڑیں لپٹ جائیں۔ یا ان کا بچہ کچھ بگاڑ دے تو دوامی کو ہنسی کا دورہ پڑجاتا ہے۔ وہ اپنی ناک پر آنچل رکھکر لوٹ لوٹ جاتی ہیں۔ یہی ہوا کہ وہ کھلکھلائیں اور میں سلگی۔

میں آگے بڑھی۔

"اے ہے تو کیا اس ڈنڈے سے مارو گی؟" وہ سیاہ رول

کو دیکھکر کانپیں۔

"ہاں! اور جب یہ ٹوٹ جائے گا تو مسہری کا بانس لیلیں گے"
میں نے اطلاع دی۔

"لے چلو۔ دیوانی ہوتی ہو۔ لاؤ میری بچی کو میں نہلاؤں"
وہ آگے بڑھکر فرمانے لگیں۔

"اب ایکدم ہی آخری دفعہ نہلا لینا" میں نے رول ہلایا۔

"اُس کے دُشمن نہائیں آخری دفعہ۔ چلو چھوڑو" انہوں نے
اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچا۔

"جی نہیں آج اُس پر ٹھیک طرح مار پڑے گی"

"بھلا مارنے سے کیا ہوگا" دوامی چہرے پر بھولپن لاکر
بولیں۔

"ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا"

"خاک پڑے تمہارے کلیجے پر کہ بچی کو مارے سے ٹھنڈا
ہوگا" وہ بگڑیں۔

اور ہم دونوں مینو کو ہوا میں معلق کرکے اپنی اپنی طرف
تاننے لگے وہ بولی "چیں"

"لے چھوڑو میری لونڈیا کا ہاتھ اُتر جائیگا واہ" وہ
غرّائیں ۔۔

"میری بلا سے ہاتھ ٹوٹ جائے۔ پھر تو یہ میرے کمرے میں
نہ آئے گی" میں نے جھنجوڑا۔

"اے ہٹو تم دام لے لینا۔ کتنے کی تھیں تمہاری چیزیں"

"کتنے کی تھیں تمہاری چیزیں" میں نے جلکر مُنہ چڑایا "کتنے
کی بھی تھیں۔ ہم دام نہیں لیتے ہم تو آج اِسے جی بھر کے دھنیں گے
یہ آتی ہی کیوں ہے یہاں"

"اللہ اب چھوڑو گی بھی۔ چلو اب وہ نہائے کمرے میں
ٹھوکے گی بھی نہیں۔ اور بھی کہہ تو دیا دام لے لو اور کیا کروں"
دُلہن بھابی لاچار ہی پر اُتر آئیں۔

"دام لے لو۔ دام لے لو بکے جا رہی ہو۔ یہ نہیں دیکھتیں اِسنو
کیسا ستیاناس کیا ہو میرے کمرے کا" میں نے نرم ہوکر۔

"اچھا بھئی اب نہیں کریگی۔ ابکے سے جو آجائے تو جی چاہے
جتنا مار لینا۔ بس؟"

"اچھا ابکے تو ملزمہ تمہاری ضمانت پر چھوڑی جاتی ہے۔
اگر اس کا چال چلن ...."

"ذرا ہوش میں! واہ بڑی آئیں میری بچی کے چال چلن
کو کہنے والی ۔۔ اُوئی ٹوٹا میری بچی کا کلا" انہوں نے اُس کا
گال میری گرفت سے گھسیٹ کر چھڑالیا "اب کبھی نہیں آئیگی وہ"
اُنہوں نے جاتے ہوئے کہا۔

"ہم کبھی نہیں آئیں گے" مینو شیر ہوگئی۔

"ٹھہر تو جا" میں نے رول لیکر دھمکایا اور بھاگیں دونوں
بے حیائی سے ہنستی ہوئی۔

اُف یہ بچے! بھلا کوئی کاہے کو سگڑاپا دکھائے! اور کیسے؟
جس اجڑے گھر میں کچھ نہیں تو ڈیڑھ درجن بچے موجود ہوں کیسے
کچھ کرے۔ لوگ کہنے کو تو ہو جائیں گے کہ "اوئی ذرا پڑھی لکھی
لڑکیوں کی حالت تو دیکھو"

کہو بھلا نصیبوں جلی پڑھی لکھی لڑکی کیا کرے؟ بچے سے
بچے ہیں گھر میں! خدا جھوٹ نہ بلائے ڈیڑھ درجن سے تو کیا کم ہونگے
ہر قوم اور قبیلے کی شکل کے۔ کالے، پیلے، کتھئی، دُبلے، پتلے، بھینگے
اور چپٹے۔ ہر سال دو کا اضافہ، ایک سے ایک نت نئے فرموں
میں ڈھل ڈھل کر آ رہا ہے۔ ابھی تو خیر سے دو بھائی کنوارے
ہیں۔ ورنہ وہ والد بزرگوار کا نام چلتا کہ کیا کہنے ۔۔ ایکدم میری
نظر اُن پانچ توام انسانی کیڑوں پر پڑی۔ اگر ایسی ہی ۔۔ کچھ
اس سے ملتی جلتی بھول قُدرت سے یہاں ہو جائے ۔۔ خود
میرے خاندان میں؟ مجھے پیٹھ پر کھنکھجورے سے رینگتے معلوم

ہوتے۔ ویسے ہی میں نے قلم تکیہ کے نیچے سے نکالا کہ لاؤ ان کے یونہیں سیاہی سے ڈاڑھیاں لگا دوں — یونہیں جل کر میں نے چاہا۔ ارے ! — جیسے کسی نے دھم سے میرے کلیجے پر موسل دے مارا ! میرا قلم ؟ — سبز اور کاہی ایور شارپ ! — آن بریک ایبل ! اُس کا نب پیچھے کی جانب ایسے جھکا ہوا تھا جیسے تلا لگانے سے پہلے نٹ اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھکر ایڑیوں سے سر لگا دیتا ہے۔ جی چاہا — بس کیا کروں ؟ گذشتہ زمانے کی ایک ہی یادگار۔ بھولے ہوئے خوابوں کی مٹتی ہوئی تعبیر۔ کسی کا اکلوتا تحفہ ! پلنگ کی پٹی پر بیدردی سے ٹھونکا گیا تھا۔

"یا اللہ ! کوئی راستہ نجات کا ہے !" میں اندھوں کی طرح اُس مظلوم قلم کو ٹٹولتی رہی — گھر کیا ہے چوراہا ہے۔ جو چیز دیکھو تباہ ہوئی جاتی ہے۔ جدھر دیکھو دو چار برتن بول رہے ہیں۔ چار پلنگوں پر اچھل رہے ہیں۔ دو کواڑوں میں جھول رہے ہیں۔ تین پنکھے میں لٹک رہے ہیں۔ دو نے نل کھول کر نہانا شروع کر دیا۔ دو چار بالس کے گھوڑے بنائے لٹیروں کی طرح سارے صحن میں کھڑکھڑاتے پھر رہے ہیں۔ وہ گھڑا اُلٹا، یہ سینی پلٹی — وہ دوپٹہ اُلجھ کے چلا کیچڑ میں لتھڑتا ہوا۔ دو تیز بالکل آپ کی پیٹھ کے پیچھے گتھم گتھا ہو رہے ہیں اور موسل جیسی ٹانگیں گدا گد کمر اور سر پر پڑ رہی ہیں — یا اللہ — مجھے جیسے چکر سا آنے لگا۔ ایک دو ہوں تو بھگتے، کوئی اس خوگیر کی بھرتی کو کہاں تک نبھائے۔ جو مارو تو فرمایا جاتا ہے "اے ہے کیسی بیدردی سے مارتی ہے۔ اے اپنا خون ہے"

اپنا خون ! خوب ! دس بچوں کی ماں کی اولا ہونے کی یہی سزا ہے۔ گھر کیا ہے محلہ کا محلہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آئے دُنیا کے بچے پٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاء اللہ سے گھر ہسپتال بن جاتا ہے۔ پتیلیوں صابو دانہ پک رہا ہے۔ سیروں کونین آ رہی ہے۔ پھوڑے پھنسی کے زمانے میں مرہم کا خرچ دال روٹی سے زیادہ جس کونے میں دیکھو پڑے پھائے اور مرہم کی ڈبیاں چپچپا رہی ہیں۔ ٹانگیں سڑ رہی ہیں۔ بخار چڑھ رہے ہیں۔ لینے کے دینے پڑے ہوتے ہیں۔ اور یہ لیجئے ! بیماری گئی اور وہ چیچڑیوں کی طرح پھریری لیکر کھڑے ہو گئے۔ پھر ایسا پلیچ پیچ کر کھایا کہ چار دن میں پھر ہمارے سینے پر کود دول دلنے کے لئے وہی کسی ہوئی توندیں اور مگدر جیسی ٹانگیں موجود ! سُنتے ہیں دنیا میں بچے بھی مرا کرتے ہیں ! مرتے ہونگے کیا خبر !

بس اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ دُنیا سے منہ موڑ کر الگ تھلگ پڑ رہوں۔ اور ہاں نہیں تو ! آج ہی سے لو۔ مینو تو خیر وعدہ ہی کر گئی ہے کہ اب کبھی نہ آئے گی۔ رہے مکھن تو انہیں بھی آج ہی دھتکار دیا جائے گا۔ بس ہو چکی دل لگی۔ تجو بھی ٹرکا دئے جائیں گے — اور چرّو ؟ چرّو مُردی کو تو بس ڈھیل ہی نہیں دونگی۔ نہ منہ لگاؤں گی نہ یہ سر پر چڑھ کر ناچیں گے۔ آخر کوئی صبر کی حد بھی ہوتی ہے ؟

"دیکھو — دیکھو — اب میں کہتی ہوں چنّی سے !" پاس کے کمرے سے آواز آئی۔

"کیا کہتی ہو چنّی سے" میں نے پھر خیالات کے سلسلہ کو جوڑا "جب سرو کا ربھی ہوا سے"

"ہائیں — چنّی ! یہ کُرتا نہیں پہنتی اِسے آگے مار تو" پھر کسی نے کہا۔

"وہ آئی دیکھ آگئی چنّی — لے اِسے مار۔ کُرتا پہنو پھر" وہی آواز بڑھی آگے۔

"بھاڑ میں جائے کُرتا اور چولھے میں جائے چنّی۔ ہاں نہیر تو۔ چنّی نہ ہوگئی اُنکی زرخرید لونڈی ہوگئی کہ اس سے "بی شادی" اور "ہوّے" کی خدمات بھی لی جانے لگیں۔ خُدا کی شان !" میں بڑبڑاتی رہی۔

"لو بس ! اب جاؤ دکھاؤ پھوپی جان کو" پھر لولیں۔

پڑی تھی مجھے غرض! میں نے عہد بھی ٹھیک وقت پر کیا۔

... مگر ہمت تو دیکھو! ابھی ابھی اماں بیٹیاں کان پکڑ کر کبھی نہ آنے کا وعدہ کر گئی ہیں اور دس منٹ بھی نہ گزرے اِس بے تکلفی سے آنے کو تیار۔ خیر!

میں بے رُخی سے پیٹھ موڑ کر آرام کرسی پر لیٹ گئی۔ اور اُن پانچوں توام بچوں کے بے رونق مکار چہرے گھورنے لگی۔

"پٹر پٹر!" چھوٹے چھوٹے پیر کمرے کی طرف آتے سُنائی دیے۔ پانچوں موٹے بنئے جیسے چہروں نے شرارت سے آنکھ ماری۔ اونہہ!

"دیکھیے پھوپی جان!" مینو نے اپنی چمکیلی آنکھوں کے وہ تمام تیر برسا کر کہا جن کا جادو وہ خُوب جانتی ہے۔

دوسرے لمحے وہ مع جوتوں کے میری گردن پر سوار تھی۔

"ہماری فراک!" اُس نے میری گردن میں گھٹنا اڑا کر ناک پر رال ٹپکاتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے؟"

اُف یہ بچے!!!

میں نے چاکولیٹ کا تازہ بنڈل کھولتے ہوئے سوچا۔

عصمت چغتائی

کلامِ فرحت

سُن او لذت کشِ غم! شکوۂ بیداد رہنے دے
نہ کر بدنام ضبطِ عشق کو فریاد رہنے دے

نہ باندھ اس طرح میرے پر کو اے صیّاد رہنے دے
ارے ظالم! قفس میں تو مجھے آزاد رہنے دے

نہ چھیڑ اے ضبط! دلکو مائلِ فریاد رہنے دے
جو خود آتش بجاں ہو اُس پہ یہ بیداد رہنے دے

بنے کیوں میری بربادی کا قصّہ رونقِ محفل
نہ کر یوں بزمِ دشمن میں مجھے برباد رہنے دے

تقاضائے جنوں ہے، دردِ دل کا راز افشا ہو
کمالِ ضبط کی تاکید ہے، فریاد رہنے دے

قفس کی تیلیاں کچھ کم ہیں میرا دل دُکھانے کو
نہ کر ذکرِ نشیمن مجھ سے اے صیّاد رہنے دے

ابھی تک تجھ کو آہِ بے اثر سے کچھ توقع ہے
دلِ درد آشنا بس ضبط کر فریاد رہنے دے

نہ چھیڑ اے ہمنفس مجھکو کہ میں اس حال میں خوش ہوں
مجھے برباد رہنے دے، مجھے ناشاد رہنے دے

پرستارِ نشیمن ہوں، قفس سے مجھکو کیا نسبت
مگر جب ذوقِ پابندی مجھے آزاد رہنے دے

وفا کی آرزو اور اس تغافل دوست سے فرحت
غنیمت ہے کہ وہ منت کشِ فریاد رہنے دے

فرحت کانپوری

ہمسفر

وہ پھولوں کا گلدستہ لئے پلیٹ فارم کے دوسرے سرے کی طرف جارہی تھی۔ اگر میں نوجوان ہوتا، میرا مطلب ہے اتنا عمر رسیدہ نہ ہوتا جتنا کہ دراصل ہوں، تو اُسے کچھ اور ہی نظروں سے دیکھتا۔ کشیدہ قامت، بیباک، اور خوبصورت ـــ اسٹیشن پر سارے آدمی اُسی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے اور آپس میں خاموشی سے اشارے کنائے بھی کرتے جاتے تھے ـــ جیوں جیوں ہم عمر میں بڑھتے جاتے ہیں عورتیں ہمارے احساسات پر کم اور متخیلہ پر زیادہ اثر انداز ہوتی جاتی ہیں ـــ لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُسے اچھی طرح جان سکوں، سمجھ سکوں ـــ میں اپنی جگہ تلاش کرنے چل پڑا ـــ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ میرے ہی ڈبے میں بیٹھی ہے ایک ایسے مبہم شکل والے مرد کیساتھ جو شوہر سے لیکر بھائی یا چچا تک سب کچھ ہو سکتا تھا ـــ ایسے نیرنگِ نظر کے ساتھ ہمسفری کے خیال نے میری کافی ہمت افزائی کی۔ اگرچہ میں پرے کو بیٹھا ہوا باہر کے لوگوں کی طرف بے پرواہی سے دیکھ رہا تھا لیکن اُس کی تیز نظروں کے حملے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یعنی مجھے اُس کی طرف دیکھنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ ہم دونوں نے دیکھا کہ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں ـــ ہاں بالکل یہی ـــ اُس نے پھر میری طرف غیر دلچسپ نظروں سے دیکھا اور اپنے "جاں نثار" کے ساتھ گفتگو کا ایسا لامتناہی سلسلہ چھیڑ دیا جو صرف اُسکے قہقہوں سے ٹوٹتا تھا ـــ ہنسی اُسے کتنا خوبصورت بنائے دے رہی تھی۔ جلیسے مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ علیگڈھ تک جارہے ہیں جو صرف چار گھنٹے کا سفر ہے، میری ساری دلچسپی ختم ہوگئی، لیکن میں اُنکی گفتگو سن سکتا تھا۔ ایک کتاب کی طرف دیکھتے رہنا اور نہ پڑھنا اُس کا آسان طریقہ تھا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا ـــ وہ شادی شدہ تھی اور وہ "جاں نثار" صاحب اُسکے شوہر نامدار تھے۔ جو شکل سے کافی حساس اور آپ ہی آپ شرما جانے والے معلوم ہوتے تھے ـــ میرا جی چاہتا تھا کہ یہ اُسکا پیارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ لیکن متوسط درجے کی معاشرت اس قسم کی عادتوں کی حمایت نہیں کرتی، سوائے چند مقامات کے، اور ریل کا ڈبہ فی الواقع ایسی جگہ نہیں تھی جہاں ایک مرد اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ سکے!! بہرحال، میرا جی چاہا کہ خود میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لوں، لیکن تقاضائے عمر اس لذت کے حصول میں مانع آیا۔

"میرا خیال ہے کار تو آئی ہوگی، ہمیں لینے" اُس نے کہا۔

"اوہ۔ ہاں۔ ہم تانگہ لے لیں گے" اُنہوں نے جواب دیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ جب تک ہم پہونچیں گے کافی اندھیرا ہوجائیگا اور پھر ہمیں کون دیکھے گا۔" اُس کے ذی عزت اور شریف ہونے میں کوئی کلام نہ تھا۔

"کل میں مندر گئی تھی ـــ دیکھو یہ چوڑیاں کیسی ہیں؟"

اُنہوں نے ایک مسکراہٹ سے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

میں نے چوڑیاں دیکھیں۔ واقعی بہت خوبصورت تھیں، لیکن اُس کے بازو ـــ گداز، بھرے بھرے اور سڈول۔ کاش میں اُنہیں چوم سکتا ـــ توبہ!! ـــ مالرے ([illegible]) کی دو سو صفحے کی کتاب میں ہفتوں لگ گئے اور میں اب تک اُسے ختم نہیں کرسکا ـــ کتنی شرمناک بات ہے!! ـــ لیکن وہ قریب ہی بیٹھی تھی اور اُس کی طرف دیکھنا کس قدر آسان تھا! میں نے دوبارہ اُس کی چوڑیاں دیکھیں ـــ اگر میں امیر ہوتا تو

اُسے میرے کرکے دست بند ہوا دیتا اور اُس کے ہاتھوں پر روغن بادام کی مالش کرکے اُن داغ دھبوں کو دُور کرتا جو زندگی کی تلخیوں نے ڈال دئے تھے۔

"دیکھو، وہ عینک لگائے ہوئے جو لمبا سا صاحب کھڑا ہے نا پلیٹ فارم پر" اُنہوں نے کہا "یہی ہمارا بڑا صاحب ہے۔ مسٹر نیسٹ" اُنہوں نے احترام بھرے لہجے میں کہا اور اُس انگریز کی طرف بغور دیکھتے رہے۔

"اچھا یہ ہیں مسٹر نیسٹ" اُسنے دبی آواز سے کہا "اُنہوں نے تمہیں دیکھا تو نہیں؟"

"کیا معلوم" اُنہوں نے جواب دیا "اُسے پانچ ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں" اُنہوں نے پانچ ہزار کو لمبا کرکے کہا۔

"پانچ ہزار روپے۔ !!" اُس نے ایک آہ کھینچی "کیا بہت امیر آدمی ہے"

"ہاں، اور بڑا سخت ہے ـــ سیلون میں سفر کرتا ہے۔ جو بالکل گھر کی طرح ہوتا ہے۔ تین چار کمرے ہوتے ہیں۔ نوکر، بیرے، خانساماں اور بہت سے آدمی اسکے ساتھ چلتے ہیں"

وہ اس امارت کے ذہنی تصوّر سے پسپا ہوگئی۔ پھر حواس مجتمع ہونے پر بولی "بہت خرچ ہوتا ہوگا"

"ہاں ہزاروں"

"کیا یہ بھی ایم۔ اے ہے" اس کا اشتیاق بڑھتا جارہا تھا۔

"معلوم نہیں"

"اتنے سارے روپوں کا کیا کرتا ہے ـــ کبھی تمہیں بھی مل سکینگے پانچ ہزار روپے ماہوار"

"ارے نہیں۔ میری تنخواہ کا حساب تو یہ ہے کہ ساٹھ روپے ماہوار پر پانچ روپے سال ترقی اور انتہا ڈیڑھ سو تک ہاں، اگر سپرانٹنڈنٹ بن گیا تو پھر ڈھائی سو ملنے لگیں گے"

"تو اسے پانچ ہزار کیوں ملتے ہیں۔ کیا بہت محنت کرتا ہے"

"نہیں نہیں۔ کام تو سب ہم لوگ کرتے ہیں۔ لیکن یہ بڑا صاحب ہے۔ اس کے بیرے کو ۷۵ روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے"

یہ باتیں اُسکی سمجھ سے باہر ہوتی جارہی تھیں، لیکن اُس کا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔

گاڑی چلدی اور ہوا کی آواز اُکتانے لگی۔ لیکن میں ماڈرن کی کتاب کسی طرح نہ پڑھ سکا۔ پانچ ہزار کا خیال اُس کے ذہن میں چکّر لگا رہا تھا۔ وہ گِن رہی تھی۔ اُس کے نازک ہونٹ ہل رہے تھے۔ اُس کی اُنگلیاں حساب کررہی تھیں۔ وہ چپ نہ رہ سکی۔

"جتنا تم کو دو مہینے میں بھی نہیں ملتا اُتنا اسے ایک دن میں مل جاتا ہے"

اُنہوں نے سر ہلایا اور غالباً دل میں سوچا کہ ایسی باتیں یاد نہیں رکھنی چاہئیں۔

"ستر دن تک تم برابر کام کئے جاتے ہو، اتوار کو بھی کام کرتے ہو اور پھر بھی اسے ایک دن میں تم سے زیادہ ملتا ہے"

"یہ ہے بھی تو بڑا صاحب" اُنہوں نے کہا۔

"ہاں ہے، پھر بھی تم کو کم از کم ایک مہینے میں تو اتنا ملنا چاہئے جتنا اسے ایک دن میں ملتا ہے"

مَیں سوچنے لگا کہ ذہانت عورتوں کے لئے بلا ہے یا نہیں ـــ

"مگر تم جو میرے پاس ہو۔ ہے نا؟" اُنہوں نے مسکرا کر کہا۔

اُسکی نگاہیں ایکدم سے نرم ہوگئیں اور وہ بھی مسکرا دی۔

مَیں بھی خواہ مخواہ مُسکرایا۔ ہاں، شاید، پانچ ہزار روپے ماہوار سے یہ بہتر ہے۔ لیکن ساٹھ روپے ماہوار کے ساتھ جوڑ کچھ ٹھیک نہیں بیٹھتا معلوم ہوتا تھا۔

وہ خاموش بیٹھے کھڑکی میں سے دیکھتے رہے اور مَیں اس کی پیاری باتوں سے محروم ہوگیا۔ پھر اُس کی شکل سے بھی

محروم ہوگیا کیونکہ وہ کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھ رہی تھی۔ بس صرف اُس کی پیشانی کا خم اور ہوا میں تیرتی ہوئیں زلفیں دیکھ سکا۔ عالمِ یاس میں پھر مالرے کی طرف متوجہ ہوا۔ اسپین کے حالات حقائق سے پُر تھے۔ لیکن اسپین بہت دُور تھا اور وہ اس قدر نزدیک۔ میراجی چاہا کہ میں اُسے چھُو سکوں، اسے بتا سکوں کہ اسپین میں لوگ اسی بات کیلئے لڑرہے ہیں۔ میں نے اجنتینا کے شاندار ماحول کے درمیان اس کا تصوّر کیا۔ کنگھی اور تھرکتی ہوئی آنکھیں، کاسٹینٹس اور ہوشربا نغمے۔ میری کنپٹیاں اِس نغمے سے، اس ریل کی آواز سے اور اُس جنگ کے خیال سے پھٹنے لگیں۔

"فرسٹ کلاس میں سفر کرو تو پورا بنچ اپنا ہوتا ہے۔" اُس نے پھر کہا۔

"ہاں، اگر پورا بنچ ریزرو کرالو تو پھر کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔"

"پورا بنچ اپنا ہوتا ہے چاہے بچھونا بچھا کر آرام سے سوجاؤ؟" اُس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں، چاہے بجلیاں گل کر کے پنکھا چلاؤ، چاہے جو کرو۔ ایک چھوٹا سا گھر ہوتا ہے۔ نہ جگہ کیلئے لڑنا پڑتا ہے نہ رات بھر جاگنا۔"

"کبھی تم نے فرسٹ کلاس میں سفر کیا ہے؟"

"نہیں۔ مگر بہت دن ہوئے جب میں ایک دفعہ سیکنڈ کلاس میں بیٹھا تھا۔ وہ بھی بہت آرام دہ ہوتا ہے۔ اور پھر ریسٹورنٹ کار میں بھی جاسکتے ہیں۔ وہ جو سفید لمبی گاڑی ہوتی ہے نا انجن کے پاس۔"

"جو جی چاہے کھا بھی سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ مگر چار روپے میں پورا انگلش ڈنر ملتا ہے۔"

"اوہو۔" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا ہم کبھی سیکنڈ کلاس میں سفر نہیں کرسکتے۔"

"کیوں نہیں۔ لیکن خرچ بہت ہوتا ہے اور اتنی گنجائش نہیں۔"

بے اختیار میراجی چاہا کہ میں ان سے کھانے کو کہوں، لیکن خود میں بھی اس قدر برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

وہ اپنی چوڑیوں سے کھیلتی رہی۔ خوبصورت، گلابی اور سبز چوڑیاں، وہ یقیناً اُس کے حُسن کو دوبالا کر رہی تھیں۔ کھانے کا وقت ہوگیا اور ریل ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُک گئی۔ تاکہ اُونچے درجے کے مسافر ریسٹورنٹ کار میں جاسکیں۔ بڑا صاحب بھی سگرٹ پیتا ہوا گزرا۔

"کیا ہم کسی ایسی جگہ نہیں جاسکتے جہاں سب کو پانچ ہزار ماہوار ملتے ہوں۔" وہ خاموش نہیں رہ سکی۔ "پھر تو ہم بھی سیکنڈ کلاس میں سفر کرسکیں گے اور تم خوب سگار پی سکو گے۔"

اُنہوں نے ایک بیڑی جلائی اور ایسی ہی جگہ کا خیال کرنے لگے۔ وہ باز نہیں آئی۔ اُس نے اُنہیں ٹھوکا دیا اور کہا۔ "کیا کوئی ایسا ملک نہیں ہے؟ تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے؟"

"کیسا ملک؟" اُنہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم سُن نہیں رہے۔" اُسنے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

میراجی چاہا کہ میں چیخ پڑوں اور کہوں کہ میں سُن رہا ہوں اس پر لعنت بھیجو۔ میں تیرے لئے ایسا ملک ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں تجھے اس ذلیل ملک میں فرسٹ کلاس میں لئے پھروں گا۔ کیپ کمورین سے کمبوڈیا تک، کس چٹکانگ، کہیں بھی....

"میں سُن رہا ہوں۔" اُس نے یقین دلایا۔ "لیکن ایسا کوئی ملک نہیں ہے۔"

اُسے ایسا صدمہ ہوا جیسے کوئی اُوپر سے نیچے گرادے۔

"لیکن کوئی نہ کوئی تو ایسا ملک ضرور ہوگا جہاں ہم سب فرسٹ کلاس میں سفر کرسکتے ہوں اور پوری بنچ اپنی ہو۔"

"ایسا ہو تو فرسٹ بھی تھرڈ بن جائے۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ میں بھی کیسی بیوقوف ہوں۔"

وہ ہنسی "لیکن اگر ہمارے پاس پانچ ہزار ہوتے تو ہم جو جی چاہتا کرتے ـــــ میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ میری بہن کو پانچ ہزار ملنے لگیں۔ تین لڑکے کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ لڑکی سیانی ہوگئی ہے۔ اُس غریب پر بُرا وقت پڑا ہوا ہے ـــــ اُفوہ کیسی اُس نے تکلیفیں اُٹھائی ہیں، اور اب بھی کیسی بُری حالت ہے ـــ کبھی کبھی تو اُن کے پاس سوائے چاول کے کچھ بھی کھانے کو نہیں ہوتا۔ اور جب سے بابا کی پنشن ہوئی وہ بھی کچھ مدد نہیں کر سکتے۔"

"مجھے معلوم ہے معلوم ہے۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے۔" اُنہوں نے عقلمندی سے کہا۔

"لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟" اُس نے ضدی لہجے میں کہا۔ "جی چاہتا ہے پرماتما ہم سب کو پانچ ہزار روپے ماہوار دے۔ ہم کو اور انسونیا کو اور بہلا موسی کو اور تمہارے دوست ماتھر کو، اُس کی بیوی کتنی اچھی ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔" اُسنے ایک دلپذیر تبسم کے ساتھ کہا۔

"اگر ہم سب کو پانچ ہزار ملنے لگیں تو کیسا مزا ہو۔" وہ اس اُمید افزا خیال پر زور سے ہنسی، اُس کا چہرہ تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی دھوئیں سے بھری ہوئی مدھم روشنی میں چمک اُٹھا۔ اُس کی آنکھیں منور ہو گئیں۔

"......یا ساٹھ روپے ماہوار۔" ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اُس کے گدگدیاں کر رہا ہے ـــ "اگر سب کو ساٹھ روپے ماہوار ملنے لگیں، کیسا لُطف رہے۔ پھر تو کوئی بڑا صاحب ہی نہو۔ ہم سب ایک سے ہی ہوں اور ہماری پڑوسن جو مارٹون ہے نا وہ بھی موٹے موٹے ہیرے نہ پہن سکے۔" وہ ہنستی رہی ـــ زور زور سے ہنستی رہی ـــ "سوچو تو کسی کو بھی ساٹھ روپے سے زیادہ نہ ملیں۔ کیسی مزیدار بات ہے ـــ کتنی عمدہ ـــ کتنی اچھی......"

مَیں بھی ہنسا۔ کسی خاص وجہ سے نہیں۔ یونہی ـــ یہ بھی بھول گیا کہ دُنیا میں کروڑوں کروڑوں آدمیوں سے لڑ رہے ہیں اسی "عجیب اور مزیدار بات" کی خاطر۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے بعد جو لوگ پیدا ہوں وہ ایسی دُنیا دیکھیں جس میں کوئی بھی پانچ ہزار روپے والا بڑا صاحب نہ ہو، بلکہ سب ساٹھ روپے والے بابو ہوں اور اُن کے پاس ایسے ہی دلکش ساتھی ہوں ـــ اب مجھے اِن دونوں کا جوڑا ٹھیک معلوم ہونے لگا۔

جب وہ دونوں علیگڈھ اسٹیشن پر اُترے تو رات کافی ہو چکی تھی اور اسٹیشن کے بڑے بڑے لیمپ اپنی آسیبی روشنی سے در و دیوار پر عجیب اور ڈراؤنی پرچھائیاں ڈال رہے تھے ـــ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ کوئی پریوں کی کہانی تو نہیں ہے۔ لیکن ہماری دُنیا کس قدر غیر طلسماتی ہے۔

از "نیرا"

مُترجمہ۔ انصار ناصری

انصار ناصری کی کتابیں

(بسلسلہ جون ۱۹۳۵ء)

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

جنابِ جگر مراد آبادی:- اِس عشق کے ہاتھوں سے ہرگز نہ مفر دیکھا
اتنی ہی بڑھی حسرت جتنا ہی اُدھر دیکھا
چین اسیرانِ قفس کو یادِ گلشن میں نہیں
دوڑتی ہیں بجلیاں سیلابِ خوں تا پیرہن

پروفیسر عندلیب شادانی:- (ا) "جتنا" کے بعد "ہی" بے تک ہے اور زائد۔ (ب) جسم میں خون کی گردش کو سیلان کہتے ہیں، سیلاب نہیں۔

عطاء اللہ صاحب پالوی:- "ہی" اور "بھی" "یا" "سیلان" اور "سیلاب" متحد الصورت ہیں۔ لہٰذا قرینہ کتابت کی غلطی کا ہے۔

حضرت اثر لکھنوی:- "شعلۂ طور" (دیوانِ جگر) میں پہلے شعر کا پہلا مصرع "بھی" نہیں، بلکہ "ہی" کے ساتھ تحریر ہے، اس لئے پہلا اعتراض خود بخود رد ہو گیا۔ کیونکہ "بھی" کی جگہ "ہی" وہ (معترض) بھی تجویز کرتے ہیں، اور مطبوعہ دیوان میں بھی یہی صورت ہے۔ دوسرے شعر میں "سیلابِ خوں" اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن "سیلان" نہ صرف قبیح اور مشتمل بر ذم ہے بلکہ غلط بھی ہے۔ غالباً دوران یا ہیجان بہتر ہوتا۔

مجیب صاحب پہلے اعتراض کا مفہوم نہیں سمجھے ــــ حضرت اثر نے بھی توجہ نہ فرمائی ــــ اعتراض "بھی" پر نہیں "ہی" پر ہے۔ یعنی "جتنا" کے بعد "ہی" "یا" "بھی" کسی لفظ کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ معترض نے جو شعر نقل کیا ہے اس میں لفظ "ہی" نہیں "بھی" ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شعر میں "بھی" سہو کاتب ہے۔ جس کی تصدیق "شعلۂ طور" اور عبارتِ اعتراض" دونوں سے ہوتی ہے۔ خود حضرت اثر کی عبارت میں بھی کتابت کی غلطی موجود ہے یعنی "پہلے شعر کا دوسرا مصرع" کی جگہ "پہلے شعر کا پہلا مصرع" لکھا گیا ہے ــــ بہرحال پہلا اعتراض بحالہ قائم ہے، رد نہیں ہوا۔

دوسرا اعتراض بھی دُرست ہے۔ یعنی "سیلاب" غلط ہے۔ اور اس کی جگہ پر "سیلان" بھی غلط ہے، تو "ہیجان" بھی برمحل نہیں۔ ہاں "دوران" بہ معنی گردش مُناسب ہے۔

جنابِ جگر مراد آبادی:- یہ جنوں بھی کیا جنوں ہے حال بھی کیا حال ہے
ہم کہے جاتے ہیں کوئی سن رہا ہو یا نہ ہو

پروفیسر عندلیب شادانی:- دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہیئے تھا کہ "ہم کہے جاتے ہیں کوئی سن رہا ہو یا نہ سن رہا ہو"

عطاء اللہ صاحب پالوی:- اس کا شمار نہ عیب میں ہے نہ غلطی میں، غالب کا مصرع ہے:- "قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت" یہاں "ہونا" ایک ضروری جزوِ مصرع تھا، مگر غائب ہے۔

حضرت اثر لکھنوی:- شادانی صاحب کا اعتراض غالباً "جنون" کے بعد "ہے" کے حذف پر ہے۔ ایسا حذف نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔

اعتراض دُرست ہے، اور مجیب صاحب کا استدلال بے بنیاد۔ مرزا غالب کے مصرع میں "ہونا" حذف نہیں ــــ حضرت اثر نے عبارتِ اعتراض پر توجہ فرمائی، اور نہ شعر پر۔ اعتراض پہلے مصرع سے متعلق نہیں، بلکہ دوسرے مصرع سے ہے کہ لفظ "نہ" اور "ہو" کے درمیان "سن رہا" محذوف ہونے کی وجہ سے مصرع مہمل ہو گیا ہے۔

جنابِ جگر مراد آبادی:- عالم جب ایک حال پہ قائم نہیں رہے
کیا خاک اعتبارِ نگاہ و یقیں رہے

پروفیسر عندلیب شادانی:- "نہ" کی جگہ "نہیں" استعمال ہوا ہے۔

عطاء اللہ صاحب پالوی :- چونکہ "نہیں" قافیہ کے طور پر استعمال ہوا ہے، اس لئے قابلِ اعتراض نہیں۔

جنابِ نیاز مدیر "نگار" :- شادانی صاحب کا اعتراض صحیح ہے۔

حضرتِ اثر لکھنوی :- میری رائے میں ہر سہ حضرات غلطی پر ہیں۔ اور شعر جس طرح موزوں ہوا بالکل درست ہے۔ "نہ رہے" "محض بیانِ واقعہ ہے" چشم دید ہو یا سنا سنایا۔ "نہیں رہے" میں اعتماد اور وثوق کے ساتھ ساتھ ان انقلابات کی طرف بھی اشارہ ہے جو تغیرات کا باعث ہوئے، اور گویا قائل کے پیشِ چشم ہیں۔ اگر "عالم" کو بصیغۂ جمع سمجھئے، اور "رہے" سے کلیہ قائم کرنے کے بجائے صرف فعلِ ماضی بصیغۂ جمع مراد لیجئے تو "نہیں" کا جواز اور بھی مستحکم، اور شعر کا حاصل بلند تر ہو جاتا ہے۔

اعتراض درست ہے ۔۔۔ اور حضرتِ اثر کی دونوں توجیہیں دور از کار ۔۔۔ اس لئے کہ جب "نہ رہے" کا "بیانِ واقعہ" ہونا تسلیم ہے تو پھر "روزمرہ" کے خلاف "نہیں" استعمال کرنے کو جائز بتانا کیا معنی؟

رہی دوسری توجیہہ، کہ "شعر زیر بحث میں "عالم" کو بصیغۂ جمع سمجھ لیں تو اس صورت میں "نہیں" کا جواز اور بھی مستحکم اور شعر کا حاصل بلند تر ہو جاتا ہے" ۔۔۔ تو بادب عرض کرنا پڑتا ہے، کہ اس موقع پر "عالم" بصیغۂ جمع استعمال ہی نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ اس کا شعر کے حاصل کو بلند تر بنانا ۔۔۔ کیونکہ یہاں عالم سے مقصود صرف ایک عالم، یعنی "عالمِ اجسام یا عالمِ ناسوت یا عالمِ اسباب یا دنیا" ہے جس میں ہر لمحہ انقلاب ہوتا رہتا ہے اور جو خود بقول حضرتِ اثر قائل کے پیشِ چشم ہے۔ اس عالم کے علاوہ، دوسرے عالم مثلاً "عالمِ معنیٰ" "عالمِ امر" "عالمِ ملکوت" "عالمِ جبروت" اور "عالمِ لاہوت" سے شعر کو کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے کہ نہ ان میں کسی تغیر و انقلاب کا امکان ہے اور نہ وہ قائل کے پیشِ چشم ہیں۔

جنابِ جگر مراد آبادی :- میں جگر لاکھ ہوں آوارہ و سرگشتہ مگر — دل ہر اک حال میں ہے حضرتِ احساں کے قریب

پروفیسر عندلیب شادانی :- "ہر" کے بعد "اک" زائد محض اور مخلِ فصاحت ہے۔ جگر کی تائید میں کوئی صاحب غالب کا یہ مصرع پیش نہ کریں۔ ع :-
"ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے" کیونکہ وہی اعتراض اس پر بھی عائد ہوتا ہے۔

عطاء اللہ صاحب پالوی :- میں شادانی صاحب کے حکم کے مطابق اُن کا پیش کردہ مصرع نظر انداز کئے دیتا ہوں، مگر اس کا کیا جواب کہ غالب نے ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ "ہر اک" لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو :- (۱) چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ۔ (۲) ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں۔ (۳) ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور۔

حضرتِ اثر لکھنوی :- اعتراض غلط ہے ۔۔۔ "ہر اک" اور "ہر" میں وہی فرق ہے جو انگریزی میں each اور every میں ہے: "ہر" کا اطلاق کسی نوع کے افراد پر من حیث المجموع ہوتا ہے۔ اور "ہر ایک" کا مجموعہ کے ہر فرد پر۔ جگر صاحب کو دکھانا تھا کہ میں کسی حال میں بھی ہوں، دل حضرتِ احسان کے پاس رہتا ہے، لہٰذا "اک" زائد کیسا ضروری ہے۔

اعتراض درست ہے ۔۔۔ محترم تبصرہ نگار کی طرح میں انگریزی کا عالم نہیں، لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ انگریزی لغات کی عام کتابوں میں لفظ "Each" کے معنی "Every one of any number taken separately" اور "either of two" یعنی "دونوں میں سے ایک" اور کسی مجموعہ کا ہر فرد، جدا جدا" اور لفظ "Every" کے معنی "each one of a whole" یعنی کسی کل کا ہر جزو" بتائے گئے ہیں۔ ان معانی میں ایسا کوئی فرق ظاہر نہیں ہوتا کہ ایک لفظ کے معنی "ہر" اور دوسرے کے "ہر ایک" سمجھے جائیں۔

آں جناب نے "ہر اک" اور "ہر" کا فرق سمجھانے کے لئے خود ہی ایک قاعدہ وضع کیا اور خود ہی توڑ دیا۔ اور کیوں نہ توڑ دیتے، "ہر ایک فرد

کوئی نہیں ہوتا سب ہر فرد ہوتے ہیں، چنانچہ آں محترم کے قلم سے بیساختہ ہر فرد ہی نکلا۔ اور نکلنا ہی چاہئے تھا۔

ہاں "ہر" کے بعد "اک" یا "ایک" کے جواز کی کسی قدر گنجائش اگر نکل سکتی ہے تو اُس جگہ، جہاں "اک" یا "ایک" بطور ضمیر استعمال ہوا ہو۔ جیسے عطاء اللہ صاحب کے پیش کردہ مرزا غالب کے مصرعوں میں سے دوسرا مصرع "ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں" یا فصیح الملک حضرت داغ کا یہ شعر ؎

"مے خانہ کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں"

جنابِ جگر مرادآبادی۔ دیکھی تری آنکھوں کی کیفیتِ رعنائی اب کس سے سنبھلتا ہے جامِ مے مینائی

پروفیسر عندلیب شادانی: "مینائی" محض بہ ضرورتِ قافیہ لایا گیا ہے۔ ورنہ شعر کا مطلب اس کے بغیر پورا ہو سکتا تھا۔

عطاء اللہ صاحب پالوی: جب غزل میں پورا پورا شعر محض جگہ بھرنے کیلئے لکھا جاتا ہے تو پھر ایک لفظ کے بے ضرورت استعمال کو غلط کیوں مانا جائے۔

جنابِ نیاز مدیر نگار: یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ غزل میں پورا پورا شعر جگہ بھرنے کیلئے کہا جاتا ہے، لیکن جگر کے شعر میں اگر لفظ "مینائی" زائد ہے، تو "مے" بھی زائد ہے، کیونکہ مفہوم صرف "جام" سے پورا ہو جاتا ہے۔

حضرتِ اثر لکھنوی: شادانی صاحب کا اعتراض غلط ہے "مینائی" نہ صرف منسوب بہ مینا کے معنی میں مستعمل ہے، بلکہ اس سے پرِ طاؤس کی طرح مخلوط الوان بھی مُراد لیتے ہیں۔ غالباً اسی سے "میناکاری" نکلا ہے، یعنی سونے چاندی کے ظروف یا زیوروں پر رنگین نقوش بنانا۔ مختلف رنگوں کے شیشے جو روشندانوں میں لگائے جاتے تھے انہیں بھی "ریزۂ مینا" کہتے تھے۔

جگر صاحب کے شعر میں لفظ "مینائی" نہایت خوبی اور سلیقے سے آیا، جس نے "رعنائی" کے تقابل کو اور اُجاگر کر دیا۔ مگر مجھے معاف فرمائیں تو عرض کروں، کہ ایک پامال لفظ "کیفیت" کے ایہام معنوی سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے، اگر لفظ "محجوبی" لاتے، اور پہلا مصرع یوں موزوں کرتے: "دیکھی تری آنکھوں کی محجوبی و رعنائی" تو جام نہ سنبھلنے کی ایک نادر توجیہہ پیدا ہو جاتی۔ موجودہ صورت میں ان کا یہ شعر سودا کے مشہور مقطع کا آفریدہ بن کر رہ گیا ہے ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

اسی باعث میں نے سامنے کا لفظ "مخموری" نہیں تجویز کیا، گو "کیفیت" سے وہ بھی بہتر ہوتا۔"

پروفیسر صاحب کا اعتراض بھی دُرست ہے، اور جنابِ نیاز کا بھی ـــــ "جامِ مے مینائی" کے معنی ہوئے، "مینا کی مے کا جام" اور اسکے مہمل ہونے میں کوئی شک نہیں ـــــ گو حضرتِ اثر نے اپنے مفید مطلب کوئی مثال پیش نہیں کی تاہم اگر ان کے بتائے ہوئے معنی فرض کر لئے جائیں تو مطلب ہوگا، "مختلف الالوان مے کا جام" ـــ بہ جائے کہ "مختلف الالوان مے،" آج تک نہیں سُنی گئی ـــ ہاں "جام" کو "میناکاری" کی نسبت سے "مختلف الالوان" کہہ سکتے ہیں، سو اس کا یہاں امکان نہیں، کیونکہ بہ لحاظ ترکیب "مینائی" "جام" کی نہیں، "مے" کی صفت واقع ہوئی ہے۔

رہی حضرتِ اثر کی ترمیمِ مصرع، سو اس سے بھی مجھے اتفاق نہیں، جنابِ جگر نے "کیفیت" کے ایہامِ معنوی سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اُنہوں نے لفظ "کیفیت" اس کے اصلی معنی (حالت) میں استعمال کیا ہے۔ یعنی "تیری آنکھوں کی رعنائی (کی حالت) دیکھی"۔ "نشہ" نہیں دیکھا۔ نہ وہ دیکھنے کی چیز ہے ـــــ ہاں حضرتِ اثر نے ضرورۃً "محجوبی" کے ایہامِ معنوی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ "محجوبی" کے اصلی معنی ہیں "مستوری یا پوشیدگی"۔ ثقات اس لفظ کو شرم و حیا کے معنوں میں استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں ـــــ بجائے کہ "کیفیت"، لفظ

بقول آں محترم "پامالیت" کی حد تک (بہ معنی نشہ) استعمال ہو چکا ہے۔

جنابِ جگرؔ مراد آبادی۔ سن کے افسانۂ غم باغ میں کملا گئے پھول شاق گزرا مجھے بُلبل کا غزل خواں ہونا

پروفیسر عندلیبؔ شادانی۔ "غزلخوانی" میں "سرور و شادمانی" کا مفہوم شامل ہے۔ اِسے "افسانۂ غم" سے تعبیر کرنا مقتضائے حال کے مطابق نہیں۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ اگر غزل اُس کلام کو بھی کہتے ہیں، جس میں درد، کرب، نالہ، تپش، سب کچھ ہو، تو "غزلخوانی" کو "افسانۂ غم" سے تعبیر کرنا درست ہے۔ (اسکے بعد مرزا غالب مرحوم اور جناب سیماب اکبر آبادی کا ایک ایک شعر پیش کیا ہے۔)

حضرتِ اثرؔ لکھنوی۔ شادانی صاحب کا اعتراض غلط ہے، اور عطاء اللہ صاحب کا جواب صحیح۔

اعتراض دُرست ہے، اور جواب ناقابلِ تسلیم۔ اگر "غزل" کو "افسانۂ غم" سے محض اس لئے تعبیر کر سکتے ہیں کہ اس میں "مضامینِ غمناک" بھی شامل ہیں۔ تو پھر ایسا کونسا نام بچے گا جو "غزل" کے لئے ناموزوں ہو۔ کیونکہ دُنیائے عمل و عالمِ خیال کا کوئی جذبہ نہیں جو (شاعرانہ یا غیر شاعرانہ انداز سے) غزل میں نظم نہ کیا گیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ باوجود نیرنگی و صدرنگیِ مضامین "غزل" پر "مسرت و نشاط" کا مفہوم اتنا حاوی ہو چکا ہے، کہ لفظ "غزل" کانوں میں پڑتے ہی، دل و دماغ "سرور و شادمانی" کے خیر مقدم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور "واہ" کے سوا "آہ" کا خیال کُجا، گمان تک نہیں ہوتا۔

ایرانی ہوں یا ہندی، معتمد و ثقہ شعرا کے کلام میں "غزل خوانی" کا لفظ "شادمانی" ہی کے مفہوم میں پایا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی اس کے خلاف بھی لکھے، تو معتبر نہیں۔ فاضل مجیب نے میرزا غالب اور جناب سیماب کا ایک ایک شعر پیش کیا ہے، مگر انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جنابِ سیماب کا تو ذکر ہی کیا، میرزا غالب کی زبان بھی مستند تسلیم نہیں کی جاتی۔

آخر میں خواجہ میر دردؔ کا ایک مشہور شعر بھی سُن لیجئے، اور خود فیصلہ کیجئے، کہ یہاں "غزل" کا لفظ کس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رُباعی کہاں کی غزل

اگر "غزل" اور "افسانۂ غم" میں کوئی تضاد نہیں، تو پھر ایک "غمزدہ انسان" اُسے اپنے حال کے مناسب کیوں نہیں سمجھتا؟

جنابِ جگرؔ مراد آبادی۔ سحر تک شمعِ محفل میں نے جل بجھنے کی ٹھانی ہے
ہمیں یہ دیکھنا ہے خاک ہو جاتے ہیں ہم کبتک

پروفیسر عندلیبؔ شادانی۔ پہلے مصرع میں "میں"، اور دوسرے مصرع میں "ہم" شترگربہ ہے۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ اساتذہ نے اسے جائز رکھا ہے۔

جنابِ نیازؔ مدیر "نگار"۔ پہلے شترگربہ معیوب نہ تھا، لیکن اساتذہ اس سے احتراز کرتے ہیں۔

حضرتِ اثرؔ لکھنوی۔ فی الحقیقت ان حضرات کا وہم ہی وہم ہے، کہ شعر میں شترگربہ ہے۔ "میں" سے شاعر نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ اور "ہم" میں وہ اور شمع شریک ہیں۔ شاعر شمع کو مخاطب کر کے کہتا ہے، کہ "میں نے بھی تیری طرح جل بجھنے کی ٹھانی ہے اب ہمیں (یعنی مجھے اور تجھے) یہ دیکھنا ہے کہ ہم میں (مجھ میں اور تجھ میں) کون سحر تک یا اس سے پہلے جلکر خاک ہو جاتا ہے۔"

محترم تبصرہ نگار نے پہلے مصرع میں اپنی طرف سے لفظ "بھی" کا اضافہ کر کے "ہم" میں شاعر و شمع دونوں کو شریک کر لیا۔ اور دوسرے مصرع کا یہ مفہوم بتایا ہے کہ "مجھ کو اور شمع کو یہ دیکھنا ہے کہ دونوں میں کون سحر تک یا اس سے پہلے جل کر خاک ہو جاتا ہے۔" بہ حالیکہ یہ امر مسلّم

ہی کہ شمع عموماً سحر ہی کو خاموش ہوا کرتی ہے۔ شاعر کو صرف اپنے متعلق شک ہو سکتا ہے، اور اسی لئے صرف اُسے یہ دیکھنا ہے کہ وہ کب تک خاک ہوتا ہے

— میری دانست میں اعتراض درست ہے۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ خود اپنے نشہ میں جھومتے ہیں وہ اپنا منہ آپ چومتے ہیں

خرابِ مستی بنے ہوئے ہیں ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں

پروفیسر عندلیبؔ شادانی۔ انسان کی یہ قدرت نہیں، کہ اپنا منہ آپ چوم لے۔ (الا آئینہ میں، مگر وہ عکس ہی اصل نہیں۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ گمنام شاعر و افسانہ نویس "پریم پجاری" کا ایک شعر ہے ؎

تم آئینے میں اپنے لب چوم لینا یہی دُور اُفتادہ کا پیار ہوگا

جنابِ نیاز مدیر "نگار"۔ مجیب کا استدلال میں یہ شعر پیش کرنا درست نہیں، کیونکہ آئینے میں اپنے لب چومے جا سکتے ہیں۔ لیکن اعتراض بھی صحیح نہیں، کیونکہ جگر کا مقصود یہ کہنا نہیں کہ "وہ واقعی اپنا منہ آپ چوم رہے ہیں"، بلکہ نشہ کی حالت میں جھومنے" کو اُس نے اِس بات سے تعبیر کیا ہے، کہ "گویا وہ آپ اپنا منہ چوم رہے ہیں"۔

حضرتِ اثر لکھنوی۔ آئینے کے سامنے جب امکان ہے، تو اعتراض باطل ہوگیا، یہ ضرور نہیں کہ شاعر آئینہ کی تخصیص کرے۔

فاضل مجیب کی طرح محترم تبصرہ نگار کا بھی خیال ہے، کہ "آئینے کے سامنے ممکن ہے تو اعتراض باطل ہوگیا"۔ لیکن اس صورت میں تخصیصِ آئینہ ضروری ہی کیونکہ محض "اپنے نشہ" یا "جھومنے" سے یہ لازم نہیں آتا کہ "وہ آئینے (ہی) کے سامنے جھوم رہے ہیں"۔

رہی جنابِ نیاز کی یہ توجیہہ، کہ "شاعر کا یہ مقصود نہیں کہ واقعی وہ آپ اپنا منہ چوم رہے ہیں۔ بلکہ نشہ کی حالت میں جھومنے کو آپ اپنا منہ چومنے سے تعبیر کیا گیا ہے"، سو اس تعبیر و توجیہہ کے جواز کی بھی کوئی دلیل نہیں نظر آتی۔

میری رائے میں اعتراض درست ہے — "اپنے لب" تو ایک حد تک بغیر آئینہ بھی چومے جا سکتے ہیں، لیکن "منہ" (سوائے عکس، اور وہ بھی بصورتِ تخصیص آئینہ وغیرہ) نہیں چوما جا سکتا۔ علاوہ ازیں پہلے مصرع میں لفظ "نشہ"، کا اشباع بھی ناگوار ہے — اور دوسرے مصرع میں "خراب .... بنے ہوئے ہیں" اور "ہلاک .... بنا رہے ہیں" بھی محلِ نظر ہے۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ قسم ہے تیری پشیماں نگاہیوں کی قسم مجھی کو خود مری شرمِ وفا نے لوٹ لیا

پروفیسر عندلیبؔ شادانی۔ قسم کی تکرار بالکل بے محل ہی، اور "قسم ہے" کا ٹکڑا محض بیکار۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ اساتذہ نے تکرارِ الفاظ سے بہت کام لیا ہے۔

حضرتِ اثر لکھنوی۔ تکرار حُسن بھی ہے اور عیب بھی۔ لیکن یہ تکرار بہت پُر لطف ہے جس نے قسم کھانے کی وجہ بتا کر قسم کی اہمیت بڑھا دی۔ "قسم ہی" مصرع سے نکال کر پڑھئے .... تاثیر فنا ہو جائے گی۔

میرے نزدیک "قسم ہے"، کا ٹکڑا بیکار نہیں، بلکہ آخری لفظ "قسم" بیکار ہے — یہ بات سمجھ میں آنی بہت مشکل ہے کہ "قسم کی تکرار نے (کیونکر) قسم کھانے کی وجہ بتا کر قسم کی اہمیت بڑھا دی"۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ عطا کرے جمالِ حُسن وہ داغِ محبت بھی زبانِ عشق میں جس کو گلِ شاداب کہتے ہیں

جمالِ حُسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے

پروفیسر عندلیبؔ شادانی :۔ "جمالِ حسن" کی ترکیب یکسر مہمل ہے۔ کیونکہ دونوں لفظ فارسی میں مترادف المعنی ہو گئے ہیں۔

عطار اللہ صاحب پالوی :۔ (ا) "حسن" اور "جمال" میں ایک نازک فرق ہے: "حسن" میں چہرے کے رنگ روپ اور "جمال" میں اعضا کے رنگ ڈھنگ دیکھے جاتے ہیں۔ (ب) فارسی شعرا نے "جمال" بہ معنی دیدار بھی استعمال کیا ہے ـــــ مگر افسوس کہ مجھے کوئی شعر یاد نہیں ـــــ اردو میں سیمابؔ کہتے ہیں ؎

جامِ شراب اور شبابِ جمالِ دوست　　یہ دَور تا ابد نہ سہی عمر بھر تو ہو

جگرؔ نے بھی دونوں شعروں میں "جمال" بہ معنی دیدار استعمال کیا ہے، اس لئے ترکیب درست ہے۔

جنابِ نیازؔ مدیر "نگار" :۔ "حسن و جمال" کا جو فرق مجیب نے بیان کیا ہے وہ درست نہیں، دونوں کے ایک معنی ہیں ـــــ سیمابؔ کے شعر میں "جمال" بہ معنی جلوہ استعمال نہیں کیا گیا۔

حضرت اثرؔ لکھنوی :۔ "حسن و جمال" میں دراصل یہ فرق ہے کہ "حسن" خوبصورتی ہے۔ اور "جمال" میں حسنِ سیرت بھی شامل ہے "جمال" کے معنی فارسی میں مجازاً "دیدار" کے بھی ہیں، مگر اس طرح "دادن" کے ساتھ آتا ہے ـــــ فارسی نیز اردو میں "جمال اور حسن" بلا کسی امتیاز کے مترادف سمجھے جاتے ہیں ـــــ مگر بعض دیگر مرادفات کی طرح ایک ساتھ نہیں آتے ـــــ "جمال" اردو میں بمعنی "دیدار" کبھی استعمال نہیں ہوا...... لہٰذا "حسن و جمال" عطف کے ساتھ لانا حشو ہے ـــــ اور "جمالِ حسن" یا "حسنِ جمال" بالکل بے معنی بات ہے ـــــ سیمابؔ صاحب کے شعر میں "جمال" کے معنی دیدار لینا غلط ہے...... اگر پہلے شعر میں "جمالِ حسن" کے بدلے "فروغِ حسن" ـــــ اور دوسرے میں تجلیات ہو ـــــ تو دیکھئے یہ شعر کہاں سے کہاں پہونچتے ہیں ؎

عطا کرلے فروغِ حسن وہ داغِ محبت بھی　　زبانِ عشق میں جس کو گلِ شاداب کہتے ہیں

تجلیات کی ہلکی سی لہر دوڑا کر　　نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے

"جمال" اور "حسن" میں درحقیقت اگر کوئی فرق ہے، تو یہ کہ "جمال" محدود ہے ـــــ اور "حسن" غیر محدود ـــــ یعنی "جمال" (بہ معنی خوبصورتی) صرف انسانی چہرے سے متعلق ہے، اور "حسن" پوری شکل انسانی یا غیر انسانی، ذی روح یا بیجان، مادّی یا غیر مادّی، غرضکہ ہر شے اور ہر جذبہ و خیال میں پایا جاتا ہے ـــــ اس لئے "جمالِ حسن" یا "حسنِ جمال" (اضافت کے ساتھ) واقعی مہمل ہے۔

"جمال" بمعنی دیدار، نہ تو زیرِ بحث اشعار میں استعمال ہوا ہے اور نہ سیمابؔ صاحب کے شعر میں۔

"حسن و جمال" کی ترکیب، اگر "جمال" کے معنی "دیدار" لئے جائیں تو بیشک غلط ہے۔ لیکن محدود و غیر محدود معنویت کے لحاظ سے صحیح۔ اس لئے کہ "حسن و جمال" کے معنی ہیں "زیبائی ظاہر و خوبیٔ باطن"۔ اگرچہ "حسن" ظاہر و باطن دونوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بیک وقت دونوں معنی نہیں دے سکتا، یعنی ایک بار میں صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں۔

رہی اصلاح، سو پہلے شعر کا مطلب اب یہ ہوا کہ "لے فروغِ حسن وہ داغِ محبت بھی عطا کر، جسے زبانِ عشق میں گلِ شاداب کہتے ہیں" اس میں اوّل تو لفظ "بھی" زائد معلوم ہوتا ہے جس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ "اب تک جو داغ ملے ہیں، وہ "گلِ فسردہ" کی حیثیت رکھتے ہیں" ـــــ اور یہ "فروغِ حسن" کی تنقیص ہے ـــــ دوسرے یہ کہ "فروغِ حسن" کسی کو داغ عطا نہیں کرتی، بلکہ محبت محب کو داغ عطا کرتی ہے ـــــ ورنہ "فروغِ حسن" پر جس کی نظر پڑ جائے اُسے داغ مل جائے، محبت کی قید نہیں۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں "تجلیات" بصیغۂ جمع بے محل ہے ـــــ "تجلی کی ہلکی سی لہر" تو خیر! لیکن "تجلیات کی ہلکی سی لہر" کیا معنی؟

مصرع دوم میں "نفس نفس" بھی محل نظر ہے۔ اس لئے کہ "جگمگاہٹ" کیلئے ظرفیت لازم، اور "نفس" کی ظرفیت معلوم۔

جناب جگر مراد آبادی۔ شمع چپ، پروانے ششدر، اہل دل سب دم بخود ہائے کیا تصویر کا عالم تری محفل میں ہے

پروفیسر عندلیب شادانی۔ شمع کبھی بولتی بھی تھی؟ جواب "چپ" ہے! اگر "چپ" خاموش کا ترجمہ ہے، تو شمع محفل میں کبھی ہوتی نہیں رکھی ہے۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ "چپ" سے مطلب شمع کی لو کا غیر متحرک جلنا ہے۔

جناب نیاز مدیر نگار۔ اعتراض درست ہے۔

حضرت اثر لکھنوی۔ "خاموشی کا اشارہ یوں بھی کرتے ہیں، کہ ہونٹوں پر کلمہ کی انگلی رکھ لی۔ شمع فروزاں اس اشارے کی مجسم تصویر ہے ــــ اور میں اس دانستہ یا نادانستہ مصوری پر جگر صاحب کو داد دیتا ہوں۔

دل نہیں چاہتا، کہ اس تعریف کے بعد شعر میں جھول نکالا جائے، مگر طبیعت (آپ "عیب جو" کا اضافہ کر سکتے ہیں، مگر کبھی یاد کیجئے گا۔) سے مجبور ہوں ــــ اگر "سب" کی جگہ "سو" پڑھئے ــ شعر کی تاثیر دوبالا ہوگئی ــ غور کیجئے اور سمجھیے"

حضرت اثر کی توجیہہ کام آسکتی تھی، اگر شاعر یوں کہتا، کہ "پروانے شور کر رہے ہیں، اہل دل نعرہ زن ہیں، اور شمع انہیں خاموشی کا اشارہ کر رہی ہے" لیکن آں محترم تسلیم کرتے ہیں، کہ "پروانے ششدر رہیں" اور اہل دل سو دم بخود" تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ شمع خاموشی کا اشارہ کسے کر رہی ہے؟ اور اس کے "اشارۂ خموشی کی مجسم تصویر" ہونے کا حاصل؟

"سب" نے اگر مصرع میں "جھول" پیدا کر دیا ہے، تو "سو" بھی اس "جھول" کو مٹا نہیں سکتا۔ "سب" تو خیر بے ضرورت ہے ہی، لیکن "سو" بھی برمحل نہیں، تینوں ٹکڑوں کا ایک ہی انداز ہونا چاہیئے۔

جناب جگر مراد آبادی۔ چیخی ہے کس انداز میں کرب و بلا سے دل ٹوٹ گیا نالۂ بلبل کی صدا سے

پروفیسر عندلیب شادانی۔ "کرب سے چیخنا" تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن بلا سے چیخنا کیا معنی؟

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ "کرب" اور "بلا" مترادف المعنی الفاظ ہیں۔

حضرت اثر لکھنوی۔ اعتراض صحیح ہے۔

اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے ــــ عطاء اللہ صاحب کا جواب درست ہے ــــ صرف مثالوں کی کمی ہے ــــ وہ ملاحظہ ہوں:۔ خرم شیرازی کہتا ہے ؎

حکایت کنم از زمین بلا ز کرب و بلا ہائے کرب و بلا

یک قطرۂ خوں بیش نہ باشد دلِ غمگیں از کرب و بلا یا دکند چوں زشہ دیں

جناب جگر مراد آبادی۔ نہ جانے محبت ہے کیا چیز لیکن بڑی ہی محبت سے ہم دیکھتے ہیں

پروفیسر عندلیب شادانی۔ جب آپکو معلوم ہی نہیں، کہ محبت کیا چیز ہے، تو پھر جس انداز سے آپ دیکھتے ہیں اُسے محبت سے تعبیر کرنا کیا معنی؟

حضرت اثر لکھنوی۔ اعتراض معقول ہے کہ جب معلوم ہی نہیں کہ محبت کیا چیز ہے تو اُسے محبت سے دیکھنا کیا معنی؟ ــ جگر صاحب کا شعر اس طرح درست ہوسکتا ہے ؎

تری طرح تری محبت ہے پیارے اُسے بھی محبت سے ہم دیکھتے ہیں

حضرت اثر نے پروفیسر صاحب کی عبارت غور سے ملاحظہ نہیں فرمائی ــــ اعتراض یہ ہے، کہ "جب جگر صاحب جانتے ہی نہیں کہ محبت کیا چیز ہے، تو پھر وہ جس انداز سے (محبت کو نہیں، محبوب کو دیکھتے ہیں، اُس (محبت کو نہیں) انداز کو محبت سے کیونکر تعبیر کر سکتے ہیں؟"

حضرتِ اثر کی عبارت، اور اصلاح بھی (اصل شعر کی طرح) قابلِ اعتراض ہے۔ اس لئے کہ "محبت کو محبت سے دیکھنا" کوئی معنی نہیں رکھتا۔

جنابِ جگر مرادآبادی :۔ کسی کے سامنے مشکل سے عرضِ حال ہوئی سنبھل سنبھل کے طبیعت مری نڈھال ہوئی

پروفیسر عندلیب شادانی :۔ اُردو میں "عرض" جب درخواست کے معنی میں آئے تو مؤنث ہے۔ مثلاً "میری یہ عرض ہے"۔ لیکن "عرضِ حال" کے معنی ہیں "اظہارِ حال"۔ . . . . اِسے مونث سمجھنا غلط ہے۔

حضرتِ اثر لکھنوی :۔ اعتراض بے بنیاد ہے۔ عرض کے معنی درخواست کے علاوہ گزارش یا کہنے کے بھی ہیں۔ مثلاً "میں نے عرض کی کہ آپ کا فرمان سر آنکھوں پر"۔

اعتراض دُرست ہے ــــ شعر میں محض "عرض" نہیں، بلکہ "عرضِ حال" ہے ــــ اور "عرضِ حال" یا "گزارشِ حال" کے معنی ہیں "اظہارِ حال" یا "حال کہنا" اور یہ بے شبہ مذکر ہے ــــ اِسے مونث سمجھنا غلط ہے۔

جنابِ جگر مرادآبادی :۔ بیانِ اہلِ دل ہو کب اسیرِ قیل و قال ہیں نظر ملی کہ ہو گیا تبادلہ خیال میں

پروفیسر عندلیب شادانی :۔ "تبادلہ" بہ معنی تبادل (exchange) نہ عربی ہے نہ فارسی نہ اُردو . . . . . . اُردو میں "تبادلہ" کے معنی ہیں ٹرانسفر (transfer) یعنی بدلی سو اس کا یہاں کوئی محل نہیں۔

حضرتِ اثر لکھنوی :۔ "تبادلہ" عربی یا فارسی نہ ہو مگر بہت اچھی اُردو ہے۔ تبادلۂ خیالات بھی جائز ہے، ہماری زبان میں رائج ہے، عوام نہیں ثقہ بھی بولتے ہیں۔ اور مبادلۂ خیالات سے ہر حال میں بہتر ہے . . . . . اس کے جواز میں کوئی دلیل کارگر نہیں ہو سکتی۔ خیال کو تبادلہ کسی ملازم کی بدلی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے کے خیالات معلوم کرنا اور اُن پر غور کرنا ہے۔ اور یہی معنی شعر میں بھی دیتا ہے۔ البتہ دونوں مصرعوں کی ردیف غلط ہے۔ "خیال کا تبادلہ" "خیال میں تبادلہ" سے بالکل مختلف ہے۔ "خیال میں تبادلہ" تو خیال میں تغیر و تبدّل ہوا، نہ کہ خیال کا لین دین۔ اسی طرح "قیل و قال میں اسیر ہونا" تو اُلجھ کر رہ جانا ہے، نہ کہ قیل و قال کا پابند یا محتاج ہونا ــــ لہٰذا ردیف "میں" کے بجائے "کا" ہونا چاہیئے۔

پروفیسر صاحب کا اعتراض معقول ہے ــــ

حضرتِ اثر فرماتے ہیں :۔ (ا) "تبادلہ عربی یا فارسی نہ ہو مگر بہت اچھی اُردو ہے"۔ "تبادلہ" کے اُردو ہونے سے تو پروفیسر صاحب کو بھی انکار نہیں، اعتراض صرف یہ ہے کہ "تبادلہ" بہ معنی "تبادل" غلط ہے۔

(ب) "تبادلۂ خیالات بھی جائز ہے، ہماری زبان میں رائج ہے، عوام نہیں ثقہ بھی بولتے ہیں، اور مبادلۂ خیالات سے ہر حال میں بہتر ہے"۔ "تبادلہ" اُردو اور "خیالات" عربی، دونوں کی ترکیب کیونکر جائز ہو سکتی ہے؟ یہ ترکیب "مبادلۂ خیالات" سے ہر حال میں بہتر شاید اس لئے ہوگی کہ "مبادلہ" اور "خیالات" دونوں عربی ہیں، ان کی ترکیب میں کوئی تنوع نہیں، اور "تبادلۂ خیالات" میں ایک لفظ اُردو ایک عربی، خاصہ تنوع ہے ــــ اگرچہ آں محترم نے کوئی مثال پیش نہیں کی، لیکن مان بھی لیا جائے کہ "تبادلۂ خیالات" آپ کی زبان میں رائج ہے، اور ثقہ بولتے ہیں۔ تو پھر بطور نتیجہ آں جناب کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ "لبِ سڑک" "قریب المرگ" اور اِسی قبیل کی دوسری "بہت اچھی" اور "رائج الوقت" ترکیبیں بھی دُرست ہیں۔

(ج) "تبادلۂ خیالات، کے عدمِ جواز میں کوئی دلیل کارگر نہیں ہو سکتی" ــــ اول تو ابھی ایک نہایت "کارگر" دلیل پیش کی جا چکی ہے،

اگرآں جناب اُسے تسلیم نہ کریں، تو "عدم جواز کی دلیل" کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ ضرورت تو "دلیلِ جواز" کی ہے، کہ بارِ ثبوت مدّعی کے ذِمّہ ہوتا ہے، نہ مُنکر کے۔

(د) "خیال کا تبادلہ، کسی ملازم کی بدلی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے کے خیالات معلوم کرنا، اور اُن پر غور کرنا ہے" اور یہی معنی شعر بھی دیتا ہے" ۔۔۔ اور یہی اعتراض بھی ہے کہ "تبادلہ" جو معنی شعر میں دے رہا ہے، وہ درحقیقت اس کے معنی نہیں، اس کے معنی وہ ہیں جس سے آپ انکار کر رہے ہیں۔ یعنی کسی ملازم کی بدلی ایک جگہ سے دوسری جگہ کو۔

ہمارے یہاں ثقہ ایک، دوسرے کے خیالات معلوم کرنے، اور اُن پر غور کرنے کا مفہوم ادا کرنے کے لئے "مبادلہ خیالات" بولتے ہیں۔ وجہ دفعہ (ب) میں عرض کی جا چکی۔

(ہ) "خیال میں تبادلہ، تو خیال میں تغیر و تبدّل ہوا، نہ کہ خیال کا لین دین" ۔۔۔ گویا آں محترم کی رائے میں شاعر کا مقصود، خیال کا لین دین یعنی ٹرانسفر یا بدلی (اپنا خیال دینا اور دوسرے کا لینا) ہے۔ حالانکہ ابھی آپ اس مفہوم سے انکار کر چکے ہیں۔

(و) "قیل و قال میں اسیر ہونا، تو اُلجھ کر رہ جانا ہے نہ کہ قیل و قال کا پابند یا محتاج ہونا" ۔۔۔ اور یہ مفہوم ردیف بدلنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اُلجھ کر رہ جانا اس وقت تک باقی رہیگا جب تک "اسیر" کو پابند یا محتاج سے نہ بدلا جائے گا۔

جنابِ جگرؔ مرادآبادی:۔ ہر وقت اک خُمار تھا، ہر دم سرور تھا بوتل بغل میں تھی کہ دلِ ناصبور تھا

پروفیسر عندلیب شادانی:۔ بہ یک وقت خُمار اور سرور دونوں کا پیدا ہونا کیا معنی؟

حضرت اثرؔ لکھنوی:۔ پیاپے خُمار اور سرور کا دَور دکھانے کی یہی صورت تھی جو شعر میں ہے۔

اعتراض دُرست ہے ۔۔۔ پیاپے خُمار اور سُرور کا دَور دکھانے کی وہ صورت نہیں، جو شعر میں ہے، بلکہ یہ ہے کہ: "ابھی خُمار تھا، ابھی سرور تھا" یا "خمار تھا سرور تھا، سرور تھا خمار تھا" جگرؔ صاحب کے پہلے مصرع میں یا تو "خمار" سے پہلے "اک" زائد ہے، یا "سرور" سے پہلے "اک" کم۔

جنابِ جگرؔ مرادآبادی:۔ جگرؔ بتاییے کچھ حالِ زار خیر تو ہے یہ کیوں برستی ہیں مایوسیاں نگاہوں سے

پروفیسر عندلیب شادانی:۔ منادیٰ اگر واحد ہو، تو اس کے لئے فعل بصیغہ جمع اس وقت استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ اس کے ساتھ کوئی کلمہ تعظیم بھی موجود ہو۔ ورنہ فعل بھی واحد ہی ہونا چاہیے۔ لہذا "جگرؔ بتا" یا "جگرؔ صاحب بتاییے" کہنا چاہیے۔

حضرت اثرؔ لکھنوی:۔ شادانی صاحب کو بربنائے قواعدِ اُردو جو کچھ معلوم ہوا ہو۔ مگر زبان کا ماہر "بتاییے" میں جو ہلکا سا طنز چھپا ہوا ہے، اس کی داد دیگا، اور قواعدِ صرف و نحو کو چولھے میں جھونکے گا۔

اعتراض دُرست ہے ۔۔۔ حضرت اثرؔ کا جواب اُن کے شایانِ شان نہیں ۔۔۔ اس "ہلکے سے پوشیدہ طنز" کے ساتھ جو ایک اشکال خامی سے پیدا ہوا ہو، کوئی "ماہرِ زبان" قواعدِ صرف و نحو کو چولھے میں جھونکنا پسند نہیں کر سکتا۔

اور پھر یہ کون کہتا ہے کہ "آپ "بتاییے" (جس میں ہلکا سا طنز چھپا ہوا ہے) کسی صورت میں نہ کہیئے۔ صرف "بتا" کہیئے" ۔۔۔ اگر آپ "بتاییے" کہنا چاہتے ہیں، تو "جگرؔ صاحب" یا "جنابِ جگرؔ" (جس میں اور زیادہ طنز پایا جاتا ہے) کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔

جنابِ جگرؔ مرادآبادی:۔ چاہیئے عشق میں مجھے آپ ہی کا جمال سا داغ ہر ایک بدر سا، زخم ہر اک ہلال سا

پروفیسر عندلیب شادانی:۔ "آپ ہی کا جمال سا" مہمل ہے۔ "آپ ہی کا سا جمال" چاہیئے۔

حضرت اثر لکھنوی:۔ اعتراض درست ہے۔ مصرع اس طرح درست ہو سکتا تھا:۔ "چاہیئے عشق کو جمال آپ ہی کے جمال سا"

اصلاح کے بعد بھی مصرع مکمل نہ ہو سکا۔ "عشق" بہ معنی "عاشق" اس صورت میں مناسب ہوتا، جب "جمال" بھی بہ معنی "جمیل" ہوتا۔ دوسرے مصرع میں "ایک اور راک" غیر متوازن ہونے کے علاوہ بے ضرورت بھی ہیں۔ "ہر داغ بدر سا، ہر زخم ہلال سا" کافی ہے۔

جناب جگر مراد آبادی:۔ زمانہ آج ہی غرقِ شراب تھا زاہد کچھ اور دیر جو وہ چشم نیم باز رہے

پروفیسر عندلیب شادانی:۔ "کچھ اور دیر" نامطبوع ہے، "کچھ دیر اور" چاہیئے۔

حضرت اثر لکھنوی:۔ ایسی خفیف تعقیدات پر اعتراض تضیع اوقات ہے۔

اعتراض درست ہے۔ خفیف سے خفیف تعقید بھی جو محاورہ یا روزمرہ کی ترتیب کو ابتر کر دے، معیوب ہے۔ ہاں، ہر جگہ ترتیب لفظی، نظم اور نثر میں ایک سی نہیں ہو سکتی۔

دوسرے مصرع میں "چشم" (بے اضافت) غیر فصیح ہے۔ فارسی کے ایسے الفاظ جن کا بدل فصیح موجود ہے بے ترکیب اضافی اردو میں لانا معیوب ہے۔ یہاں "چشم" کی جگہ "آنکھ" چاہیئے، یا "چشمِ مست"۔

پروفیسر عندلیب شادانی نے جناب جگر کے تقریباً سو اشعار پر صرف اغلاطِ زبان کے لحاظ سے اعتراضات کئے تھے۔ ان میں سے عطاء اللہ صاحب نے نصف اور حضرت اثر نے تین چوتھائی اعتراضات سے بحث کی۔

جن اعتراضات کے متعلق میں نے اظہارِ خیال کیا ہے، ان میں سے صرف چند ایسے ہیں جن میں فاضل معترض سے میں متفق نہ ہو سکا، باقی سب میں حضرت اثر سے مجھے کچھ نہ کچھ اختلاف ہے۔

اور یہ اختلاف صرف اشعار مندرجِ بالا ہی میں نہیں، بلکہ اس قسم کے اور بھی شعر ہیں، جن سے فی الحال بربنائے قلت وقت صرفِ نظر کرنا پڑا۔

کوکب شاہجہاں پوری

وہ کیا ہے! میں کیا ہوں!

وہ سرچشمہ ہے اور میں آبِ بقا ہوں
وہ ہے خضر، لیکن میں راہِ ہُدا ہوں

شفق وہ، میں رنگِ ردائے شفق ہوں
وہ نہرِ اُفق ہے، میں اُس کی ضیا ہوں

وہ حق ہے، میں ہوں کشتۂ حق پرستی
وہ ہے سازِ فطرت، میں اُس کی صدا ہوں

وہ ہے سوز! میں کیفِ سوز و تپش ہوں
وہ ہے نغمۂ غم، میں نغمہ سرا ہوں

وہ میخانہ، اور میں شرابِ محبت!
وہ سرمست، میں مستیٔ مدعا ہوں

وہ گل ہے، میں نکہت! وہ دل، آرزو میں
وہ ہے شعر، میں معنیٔ شعر زا ہوں

وہ میرے تاثر پہ ہے سایہ افگن!
میں اُس کے تفکر میں جلوہ نما ہوں

"دلفگار"

افشائے حقیقت

بھلا کب تک لے شاہ گردوں وقار　　بھٹکتا رہے گا غریب الدیار
نکلتی نہیں رُوح سے غم کی پھانس　　ہوائے چمن لاکھ ہو خوشگوار
مجھے پھر بھی تسکیں نہ ہوگی اگر　　مرے پاؤں دھو کر پئیں شہریار
مسرت کا احساس کیا ہو مجھے　　کہ بنیادِ اُلفت نہیں استوار
کہاں سے اٹھی اور کدھر جائیگی　　نہیں پوچھتے خاک سے شاہسوار
کسی کو کسی کی بھلا فکر کیا　　وہ مزدور ہو یا کہ سرمایہ دار
حریر اور اطلس کے انبار اُدھر　　گریباں اِدھر ہو گیا تار تار

سُناؤں تجھے اک حسیں سرگذشت　　فضائے نشیمن تھی جب سازگار
وہ اِک کھویا کھویا سا گنجان نیم　　وہ پھیلے ہوئے دُور تک مرغزار
وہ اُن کی نظر میں مرے خشک لب　　مِرے ہاتھ میں کاکلِ مشکبار
وہ پھول انکی زلفوں میں اُلجھے ہوئے　　مِرے چیتھڑوں پر وہ گرد و غبار
وہ دھڑکن دلوں کی وہ مدہوشیاں　　وہ بُلبُل کے نغمے سرِ شاخسار
وہ بیلوں کے دم خم وہ جھرنوں کے راگ　　بہت دُور اُودے سے وہ کوہسار
شعاعیں وہ موجوں پہ ہنستی ہوئی　　زمیں پر بہاریں فلک پر نکھار

ذرا آنکھ جھپکی تو حیرت ہوئی　　کہ تھا ذرّے ذرّے میں اک انتشار
نہ وہ دل رہا اور نہ وہ زندگی　　بس اک رُوح لے دیکے! وہ بھی فگار
نہ بھولا وہ خوابِ حقیقت نما　　بہت دیر تک میں رہا اشکبار
مِرے سر کٹے چار سانسوں کا کھیل　　اگر لوٹ آئیں وہ لیل و نہار
وہ کیوں سامنے میرے آتا نہیں　　اگر دل میں مستور ہے روئے یار
ہر اک چیز ہے رونے دھونے میں گم　　فلک ہے پریشاں زمیں بیقرار

مگر اب مجھے اُن سے شکوہ نہیں　　"شبِ زار نالید ابرِ بہار
کہ ایں زندگی گریہ پیہم است" [1]

احمد ندیم قاسمی؛

---

[1] لہ اقبالؒ (پیام مشرق)

معمّا

وہ بہت ہی حسین ہے!

بلا کی شوخ، لیکن نہیں، اُس میں سنجیدگی بھی تو ہے،

آپ سمجھے وہ کیسی ہے؟ لیکن آپ کو کیا معلوم!

اچھا ذرا ٹھیریے، مَیں ابھی بتاتا ہوں، وہ کیسی ہے۔

وہ چھریرے بدن کی گوری چِٹّی لڑکی ہے، اُس کا قد نہ تو کچھ ایسا زیادہ ہے نہ کم۔ بس یوں سمجھئیے کہ وہ میانہ قد ہے۔ بھرے بھرے بازو ہیں اور اُبھرا ہوا سینہ۔ سر کے بیچوں بیچ ایک لمبی سی سفید دھاری بنی رہتی ہے اور اس کے دونوں طرف لانبے لانبے سیاہ بال جو اکثر پریشان رہتے ہیں۔ اُس کی بھویں، آپ نے پہلی تاریخ کا چاند تو دیکھا ہی ہوگا بس کچھ اسی طرح کی ہیں۔ باریک باریک کمان کی طرح۔ اُس کی آنکھیں، دو جھیلوں کی مانند ہیں۔ ابھی پُرسکون۔ ابھی متلاطم۔ اُس کے لب مجھے تو بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے اوس میں ڈوبی ہوئی نوشگفتہ کلیوں کی پتیاں۔ میں آپکو کیا کیا بتاؤں، بس سمجھ لیجئے کہ وہ بہت ہی خوب ہے! جی ہاں، وہ بہت ہی خوب ہے!!

خدا معلوم اب بھی آپ سمجھے یا نہیں کہ وہ کیسی ہے۔ شاید نہیں سمجھے، خیر کچھ مضائقہ نہیں، میں ایک بار پھر کوشش کرتا ہوں۔ لیکن آپ پوری توجہ سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ کاش آپ تصور کر سکیں وہ کیسی ہے، عجیب قسم کی لذت محسوس کیجئے گا آپ!

تو آپ پوری توجہ سے سن رہے ہیں نا؟

وہ میری ہم جماعت ہے اور ابھی کوئی بیس بائیس دن ہوئے ہونگے کہ ہم نے بی۔ اے پاس کیا ہے۔ اُس کے والد یونیورسٹی میں ادبیات کے پروفیسر ہیں اور میرے والد فلسفہ کے، ہم لوگ ایک ہی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ کئی سال سے، ماں سے وہ بھی محروم ہے اور میں بھی۔ اُس کی ماں تو بچپن ہی میں مرگئی تھی۔ لیکن میری والدہ کو مرے ہوئے ابھی کچھ ایسا زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔ میری اُس کی دوستی اب تو بہت پُرانی ہوگئی ہے۔ لیکن اتنی پُرانی بھی نہیں جتنی ہمارے والدین کی۔ وہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہونے کے دس سال پہلے سے ایک دوسرے کے دوست ہیں اور انگلستان میں ایک ہی کالج میں تعلیم پائی ہے، لیکن ہم بھی ایک دوسرے کو اتنا ہی عزیز رکھتے ہیں جتنا وہ دونوں۔ کبھی کبھی ہم لڑ بھی لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے بولنا چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن یہ کشیدگی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ زیادہ سے زیادہ بس آدھا گھنٹہ!

کل رات مَیں پڑھتے پڑھتے کتاب سینہ پر رکھے ہوئے سو گیا۔ اُس نے میری فاختہ اُڑا دی۔ خدا معلوم وہ مٹی کا تیل کہاں سے لے آئی۔ ہمارے یہاں تو اس کا استعمال بھی نہیں۔ اس لیئے کہ ہمارے بنگلہ میں تو بجلی ہے۔ ایسے زور سے انگوٹھا اور انگلی جلی ہے کہ ابھی تک جلن باقی ہے۔ مَیں بوکھلا کر ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور پاؤں کو زور زور سے پٹخنے لگا۔ اس بوکھلاہٹ میں سلگتی ہوئی تھوڑی سی روئی میرے بستر پر جا پڑی۔ اور میری شال کئی جگہ سے جل گئی۔ یہ میری بہت ہی قیمتی شال تھی اور میں اُسے کشمیر سے لایا تھا۔ شور و غل سن کر برابر والے کمرے سے اُس کے ابا میاں آ گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی ہمدردی کریں، لگے زور زور سے قہقہے لگانے اور میں اس قہقہستان میں گُم سُم ایک ٹانگ پر کھڑا کھڑا اُن لوگوں کا منہ دیکھا کیا۔ تھوڑی دیر میں سنگار میز کے سامنے سے گذرتا ہوں تو منہ کالا، اچھا تو اس لئے قہقہے لگائے جا رہے تھے۔

"اچھا اب بہت کود پھاند چکے اور بہت شور مچا لیا۔ اب جاؤ۔ ہمیں بھی نیند معلوم ہو رہی ہے" اور یہ کہکر اس نے بجلی کا بٹن دبا دیا۔ اندھیرے گھُپ میں میری آنکھوں کے سامنے دیر تک تارے

تا چا گئے اور کنپٹیوں کی رگیں زور زور سے پھڑکا کیں۔ میری تو نیند اُچاٹ ہو گئی اور تکلیف علیحدہ دے دی اور آپ پڑی آرام کر رہی ہیں۔ میں دیر تک سوچتا رہا۔ کیا کروں۔ اور پھر بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس کی چارپائی لوٹ دی اور بال پکڑ کر اتنے چکر دیے، اتنے چکر دیے کہ چھٹی کا دودھ ہی تو یاد آ گیا ہوگا۔ لیکن وہ برابر ہنستی رہی اور مدافعت کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ اِدھر میرا سانس پھول گیا۔ ہاں، آپ خود ہی سوچئے ایک جوان لڑکی کو چکر دینا کوئی آسان بات ہے۔ میں ہانپتا کانپتا اپنے بستر پر آ کر پھر لیٹ رہا اور وہ وہیں فرش پر پڑی رہی۔ بہت دیر تک۔ پھر اُٹھی اور ساتھ والے کمرے کی الماری میں نہ معلوم کیا کھکوڑتی رہی۔ تھوڑی دیر میں واپس آئی۔ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی "لاؤ، تمہارے پاؤں میں دوا لگا دیں"۔ اور وہ میری پاؤں پر دوا لگا کر دیر تک اُسے سہلاتی رہی اور میری آنکھ لگ گئی۔ صبح کو جب آنکھ کھلی تو وہ میرے پلنگ کی پائنتی پر پڑی بیہوش سو رہی تھی، اس طرح کہ آدھا دھڑ پلنگ پر تھا اور ٹانگیں فرش پر، اور شیشی کی دوا گدے میں جذب ہو چکی تھی۔

اور پھر پرسوں صبح ــــــ

"آؤ چوری کریں"

"چوری!"

"ہاں، ہاں، چلو چوری کرنے چلیں"

"کیا معنی؟"

"کسی شخص کی ملکیت کو اُس کی غیبت میں اُسکی بغیر اجازت لے لینا یا استعمال کرنا چوری ہے"۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا"۔

"میں ابھی سمجھائے دیتی ہوں"۔ اور یہ کہتی ہوئی مجھے دھکے دیتی بنگلے سے باہر ملازموں کی کوٹھڑیوں کی طرف لیجانے لگی۔

اُس نے آہستہ سے اتا کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا؛ اور پنجوں پر چلتے ہوئے لبوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دبے پاؤں کوٹھڑی میں داخل ہوئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی گویا یقین کرنا چاہتی ہے کہ اُسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اور پھر وہ اتا کے بکس کے تالے کو کھولنے کی کوشش کرتی رہی، لیکن وہ نہ کھلا۔ تو میری منت سماجت کرنے لگی۔ میں حیرانی کے عالم میں یہ طے نہ کر سکا کہ تالا توڑوں یا نہ توڑوں کہ میری نظر اُس کے چہرے پر پڑی۔ وہ سراپا التجا بنی ہوئی تھی۔ مجھے اُس کی حالت پر ہنسی بھی آئی اور رحم بھی۔ اور تین چار ہی جھٹکوں میں لیور کا وہ چھوٹا سا تالا کنڈے سے الگ کر دیا۔ اُس نے جلدی جلدی بکس کے کپڑے الٹنا شروع کئے۔ وہ پسینہ پسینہ ہوتی جا رہی تھی۔ گویا سچ مچ ہی تو چوری کر رہی ہے۔ جلدی سے اُس نے ایک جوڑا کپڑا نکالا، اور باقی کپڑے بکس میں ٹھونس کر میری انگلی پکڑ کر آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگی۔ چپکے سے کوٹھڑی کی کنڈی لگائی اور اپنے کمرے میں جا چھپی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر سوچنے لگا کہ یہ کس قسم کی لڑکی ہے۔ اتنے دیرینہ تعلقات پر بھی میں آج تک اُس کو نہ سمجھ سکا۔ ابھی میں اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھے ملازم نے آ کر شکایت کی۔

"میاں صاحب ہم لوگوں پر ناراض ہونگے اور بٹیا مانتی ہی نہیں۔ کچن میں بیٹھی ہوئی برتن صاف کر رہی ہیں"۔

میں جلدی سے اُٹھا اور باورچی خانہ میں جا کر دیکھا تو وہ اتا کے کپڑے پہنے واقعی پتیلیاں مانجھ رہی تھی اور سامنے ایک ٹوکری میں میلے برتنوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ اتا "ہائیں، ہائیں" کرتی رہی، لیکن وہ اسی طرح دُنیا زمانے سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھی؛ گویا اگر وہ یہ کام دل لگا کر نہ کرے تو آج دوپہر کو اُس کو کھانے کو نہ دیا جائیگا۔ میں کھڑا کھڑا یہ سب کچھ دیکھا کیا۔ آپ ہی بتائیے میں کیا کہتا؟۔

کام ختم کرنے کے بعد جب وہ کپڑے تبدیل کر کے میرے کمرے میں آئی تو میں نے پوچھا "کبھی کبھی تم پر یہ دَورے کس قسم

سکے پڑنے لگتے ہیں ؟"

"دَورے !"

یہی کہ کبھی کبھی تم پاگلوں کی سی باتیں کیوں کرنے لگتی ہو"

"اس میں پاگل پن کی تو کوئی بات تھی نہیں، مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہر وقت گڑیا ہی بیٹھی رہوں۔ جی چاہا کہ آج میں بھی انّا کی طرح برتن صاف کروں، ویسے کسی سے کہتی تو بھلا مجھے ایسا کرنے دیتا۔ اس لئے سب کچھ چوری چوری کرنا پڑا !"

اور مَیں اُسکے چہرے کی سنجیدگی دیکھتا رہ گیا۔

"ایک بات کہیں ؟"

"کہو"

"تم مجھے بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہو، بہت ہی حسین !"

"اچھا تو پھر؟"

"کچھ نہیں، مجھے تمہاری صورت دیکھکر بڑی مسرّت ہوتی ہو اور جی چاہتا ہے کہ دیکھے ہی جاوٗں"

"تو دیکھتے کیوں نہیں، منع کس نے کیا ہے، میں تو تمہارے سامنے ہی بیٹھی ہوں" اس نے اُسی سنجیدگی سے میرا پلو درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں منع تو کسی نے نہیں کیا۔ لیکن۔ لیکن . . . .

- - - - - - - - - - - - -

"سُنتے ہو؟"

"کیا؟"

"ایک بات کہیں؟"

"ضرور!" میں نے کتاب کو بدستور پڑھتے ہوئے جوابدیا۔

"تم جب پڑھتے ہوتے ہو تو تمہارے لبوں کی جنبش بہت ہی دلکش معلوم ہوتی ہے"

"معلوم ہوتی ہوگی، لیکن مجھے اس سے کیا!"

وہ خاموشی سے اُٹھی اور میرے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ اور میری صورت کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیکر اپنے جلتے ہوئے لب میرے لبوں سے پیوست کردئے۔

مَیں جُنبش تک نہ کرسکا اور وہ دیر تک مجھے پیار کرتی رہی۔

اور اس واقعہ کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر تھی۔ ہم لوگ لان پر سے ٹینس کھیل کر آئے۔ میں نے اپنے کمرے میں آکر اپنا ریکٹ پریس میں رکھا اور ساتھ والے غسلخانہ میں غسل کرنے چلا گیا غسل سے جب فارغ ہوا تو وہ ابھی تک وہیں میرے پلنگ پر بیٹھی تھی۔

"تم نہائی نہیں ابھی تک، یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

"نہاوٗں کیسے۔ پسینہ تو خشک ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ دیکھو تو میرا دل کتنے زور زور سے دھڑک رہا ہے" اور یہ کہکر اُس نے میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھدیا۔ - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - میں نے ایکدم سے ایسا محسوس کیا کہ کوئی برقی رَو میرے سارے جسم میں دَوڑ گئی ہو چنانچہ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"تم اب بچی نہیں ہو، جوان ہوگئی ہو"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے، پھر؟"

"پھر ـــــ تمہیں کیسے سمجھاوٗں' اُسے، جوان لڑکیاں مَردوں کے ہاتھ اپنے سینوں پر نہیں رکھتی ہیں"

"یہ بھی ایک ہی رہی۔ اگر ہمارا دل زور زور سے دھڑکنے لگے تو ہم کسی کو دکھائیں بھی نہیں !!"

"اب یہ اندھیرے میں بیٹھی کیا پڑھ رہی ہو، آج ٹہلنے نہیں چلوگی؟"

"تمہیں ٹہلنے کی پڑی ہے اور یہاں امتحان کی فکر کھائے جاتی ہے"

"لیکن یہ تو پڑھنے کا کوئی وقت نہیں"

"جی ہاں، ہم سے راتوں کو تو آنکھیں پھوڑی نہیں جاتیں۔ خود تو دو دو تین تین بجے رات گئے تک پڑھ پڑھ کر سب کچھ ختم کر ڈالا۔ اب جو میں پڑھ رہی ہوں تو دیکھا نہیں جاتا۔ تم تو خدا سے چاہتے ہوگے کہ میں فیل ہو جاؤں اور تم آگے نکل جاؤ اور پھر مجھے خوب طعنے دو اور لوگوں کے سامنے ذلیل کرو۔ لیکن تم سے پیچھے رہنے والی نہیں"

. . . .

"تمہیں معلوم ہے، مجھے سب سے زیادہ کن لوگوں سے نفرت ہے؟"

"میں کیا جانوں"

"مجھے اُن لوگوں سے سب سے زیادہ نفرت ہے جو ہر وقت پڑھتے ہی رہتے ہیں اور پھر کچھ دنوں کے بعد موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگا کر اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کتاب کا ایک آدھ ہی حرف سُجھائی دے جائے" یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے ہاتھ سے چھین کر کتاب پھینک دی۔

"لیکن میرا امتحان . . . . !!!"

"یہ امتحان کی تیاری کا نہیں، ٹہلنے کا وقت ہے!"

"میں اتنی دیر سے آواز دے رہی ہوں اور تم جواب ہی نہیں دیتے"

"آخر ایسا کونسا ضروری کام تھا جو چیخے ہی جا رہی تھیں"

"میں ایک بڑے مزے کی بات سوچ رہی تھی ——— اچھا پہلے تم بتاؤ کہ میں ابھی ابھی کیا سوچ رہی تھی، پھر جانے تم کتنے قابل ہو"

"میں نے غیب دانی کا کبھی دعویٰ بھی تو نہیں کیا، پھر تمہارے دل کی باتیں، میرے بس کی بات نہیں"

"تو ہار گئے"

"اس میں ہارنے کی کیا بات ہے۔ میں نے کوشش ہی کب کی"

"میں سوچ رہی تھی، اگر میں خودکشی کر لوں تو کیا ہو ——— سب لوگ خوب روئیں اور بڑا مزا آئے"

"ہاں، ہاں، ضرور! خیال تو بُرا نہیں، تم آج چپکے سے کسی وقت خودکشی کر ڈالو"

"کیا واقعی؟"

"اور نہیں تو . . . . ؟"

"اچھا، یہ تو بتاؤ، تم بھی روؤ گے یا نہیں؟"

"مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ روؤں اور وہ بھی تمہارے لئے"

"تو پھر ہم خودکشی بھی نہیں کرتے"

"اچھا جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو ہمیں یاد کیا کرو گی"

"بہت"

"اور ہمیں اپنے گھر بلایا کرو گی؟"

"ہاں"

"روز؟"

"روز تو شاید نہیں لیکن تیسرے چوتھے دن ضرور"

"اور اگر تمہارے میاں نے کچھ کہا تو؟"

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں کہ اُس وقت میں کیا کروں گی"

"تم شادی کر لو، پھر دیکھا جائیگا"

"اوں ہوں، ہم شادی نہیں کرینگے"

"کیوں؟"

"تم تو اکیلے رہ جاؤ گے"

"پگلی کہیں کی۔ میں بھی اپنی شادی کر لونگا"

"پھر بڑا مزا آئیگا"

"جبھی تو تم سے کہہ رہا ہوں کہ جلدی سے شادی کر ڈالو"

"نا بھائی، ہم شادی نہیں کریں گے۔ بیکار کی مصیبت سر مول لیں۔ خدا معلوم کیسا میاں ملے، نہ معلوم اُس کی کیسی عادت ہو، اور اُس نے اگر تمہارے بلانے کو انکار کر دیا تو۔ شادی نہیں

کریں گے ہم شین الف زبر شا، دال یے زیر دی، شادی، ہم نہیں کریں گے۔ ہم نہیں کریں گے ——— اچھا ہم ایسا کیوں نہ کریں، ہم میں سے کوئی بھی شادی نہ کرے اور یونہی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں ——"

"عمر بھر یونہی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں —— لیکن یہ کیسے ممکن ہے"

"ممکن کیوں نہیں ہے، یہ تو بڑی آسان بات ہے۔ جیسے اب رہتے ہیں"

"تم بالکل ہی ناسمجھ ہو، بالکل بھولی!"

"لیکن تم تو ہمیشہ کہتے رہتے ہو کہ میں بہت شریر ہوں"

"ہاں، ہاں، بھولی بھی ہو اور شریر بھی"

"تو بتاؤ، پھر کیا کریں؟"

"میں کیا بتاؤں، بھلا تمہارے ابا میاں یہ کس طرح گوارا کریں گے کہ تم میرے ساتھ ہمیشہ یونہی رہو بغیر شادی بیاہ کے"

"تو پھر تم مجھ سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

"لیکن یہ میرے اختیار میں تو نہیں"

"تم ابا میاں سے کہتے کیوں نہیں؟"

"ہش۔ یہ باتیں اس طرح تھوڑا ہی کہی جاتی ہیں"

"تو پھر کیسے کہی جاتی ہیں؟"

"یہ باتیں کہی نہیں جاتیں بلکہ بلکہ . . . ."

"اچھا اگر تم نہیں کہتے تو میں کہوں گی"

"تم کہو گی؟"

"ہاں، ہاں، اس میں حرج ہی کیا ہے"

"کہہ سکو گی؟"

"کیوں نہیں!"

"اچھا کیا کہو گی؟"

"کہوں گی یہی کہ تم مجھے بہت پسند کرتے ہو اور میں تمہیں، اور تم چاہتے ہو کہ مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لو، بس کوئی اچھا سا موقع ہاتھ آیا اور میں نے کہا"

اور میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں وہ سچ مچ ہی نہ کہہ دے۔ وہ ابا دل میں کیا خیال کریں گے۔

شاہد لطیف

تجلّیات

وہ تو کہیے نگاہِ یار میں تھا — ورنہ دل بھی کسی شمار میں تھا

ہم ہیں مجبور شکر ہے ورنہ — جبر کب اپنے اختیار میں تھا

تیرا وعدہ فریبِ شوق سہی — ہیں مگر تیرے انتظار میں تھا

وہ بھی تر دامنی کا باعث ہے — جو لہو چشمِ اشکبار میں تھا

نہ رہا تجھ کو فضلِ عام میں یاد — اک گدا تیری رہ گذار میں تھا

آشیانہ کا اب نشان کہاں — وہ بھی گذری ہوئی بہار میں تھا

جب کی ایک شکل تھی یہ بھی — میرا دل میرے اختیار میں تھا

شکر ہے اُس نے لے لیا تابشؔ — ورنہ دل میرا خلفشار میں تھا

تابشؔ دہلوی

قطعات

تصوّر

ایک صبر آزما جدائی ہے ؛ ملنے جُلنے کی بند ہیں راہیں
میں نے اُس ماہرو کی گردن میں ؛ ڈال دی ہیں خیال کی باہیں

پیکرِ حُسن

باتیں کرنے میں پُھول جھڑتے ہیں ؛ برق گرتی ہے مُسکرانے میں
نظریں! جیسے فراخ دل ساقی ؛ خُم لُنڈھائے شراب خانے میں

نظارۂ پریشاں

روبرو ہے وہ چاند سی صورت ؛ جس کا ہردم خیال آتا ہے
مَیں ہوں بیتاب دیکھنے کیلئے ؛ اور دل ہے کہ دھڑکے جاتا ہے

لُطفِ ماہتاب

ہرطرف ایک بے حجابی ہے ؛ بے نقابی ہی بے نقابی ہے
تم بھی آجاؤ چاندنی بن کر ؛ آج کی رات ماہتابی ہے

عالمِ نشاط

ایک کافر ادا کو دیکھا ہے ؛ پُرشکن زُلف پُرفسوں آنکھیں
آج پھر لطف آرہا ہے مجھے ؛ داغؔ کے شعر گنگنانے میں

نگاہِ محبّت

رُخِ رنگیں پہ پڑگئیں نظریں ؛ اور نظروں سے لڑگئیں نظریں
مِل کے پلٹیں تو یہ ہوا معلوم ؛ عُمر بھر کو اُجڑ گئیں نظریں

اختر انصاری

چائے بازی

اِس مضمون کی سُرخی چائے بازی غالبًا ناموزوں ہے کیونکہ مَیں دراصل چائے کے بارے میں کچھ نہیں لکھ رہا ہوں۔ اوّل تو لکھنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ اگر پنج کہیں بلی تو بلی ہی سہی۔ اور پھر اب تو بچّوں نے (چائے کمیٹی یا *Tea Cess Committee* نے) چائے کے شعر یعنی اشعار گھر گھر دیواروں پر لکھا کر بچّے بچّے کی زبان پر رواں کر دیا ہے۔

چائے پیو جگ جگ جیو

نہ معلوم یہ شعر بھی ہے کہ نہیں۔ خیر مَیں تو شعر ہی سمجھتا ہوں۔ اگر کسی بحر میں نہیں ہے تو بے بحر ہی سہی، لیکن ہے شعر۔ دوسرے بھائی چائے کی مزمّت اور مَیں کروں (حالانکہ دل بہت چاہتا ہے) کیسے ممکن ہے۔ ویسے ہی بلا ناغہ روزانہ سالہا سال سے دن میں تین چار دفعہ بیگم سے اسی کمبخت چائے پر چخ پخ ہوتی ہے۔ فجر اور عصر کی چائے تو خاموشی سے مل جاتی ہے لیکن عشراق، ظہر، مغرب، اور عشا کی چائے بغیر بدمزگی طرفین مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہیں۔ میری عادت تو چھُوٹ ہی نہیں سکتی۔ کاش وہی اپنی عادت چھوڑ دیں اور ہنسی خوشی روزانہ چائے پلوا دیا کریں، مگر وہ بھی عادت سے مجبور رہیں۔ خیر ہم دونوں عادی ہو گئے ہیں۔ وہ بگڑنے کی عادی ہو گئی ہیں۔ مَیں برداشت کرنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ چائے کی میز سامنے آتے ہی میں چائے پینے لگتا ہوں اور وہ پھر ہنسی خوشی باتیں کرنے لگتی ہیں۔

البتہ اگر کبھی برسوں میں تہجد کی چائے کا چسکہ مجھے بیدار کر دیتا ہے تو اوّل تو مَیں برداشت کرتا ہوں، دل کو بہلاتا ہوں "اسے ذرا صبر کرو تھوڑی دیر میں صبح ہو گی، صبح کی چائے پی لینا۔ ماما ہے نہیں، بیگم کو خود اُٹھنا پڑیگا۔ بڑی ہائے ویلا مچائیں گی۔ اب ایسے ہی پڑے رہو۔" لیکن پھر جب دل کسی طرح مانتا ہی نہیں، اور چائے کے بارے میں مانے بھی کیسے تو بیگم کو جگاتا ہوں۔ خیر چائے مل بھی جاتی ہے۔ میں پی بھی لیتا ہوں۔ لیکن صاحب پھر وہ دن بڑی بُری طرح کٹتا ہے اور مہینوں تہجد کی چائے کے خیال سے طبیعت بدمزہ ہو جایا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے اب تو عرصہ دراز ہو گیا ہے کہ اس وقت کی چائے نہیں پی ہے۔ یہ حال ہے کہ اگر سوتے سے آنکھ کھُل بھی جائے تو پڑا جمائیاں لیتا رہتا ہوں اور یہ جو کہیئے کہ مردِ آدمی فورًا اُٹھ کر بنا لیا کرتو نا صاحب اس سے تو بندہ عرصہ ہوا توبہ کر چکا ہے۔ اب ایسی حرکت ہرگز نہیں کر سکتا۔ خُدا کی پناہ۔ اور نا نامرزا تو مرتے مرتے ہی بچے۔ اجی صاحب قصّہ یہ ہوا کہ میں نے سوچا کہ لاؤ آج ان کو نہ جگاؤں، خود ہی باورچی خانے میں جا کر چائے بنا لوں اور پی پا کر لیٹ رہوں۔ دبے پاؤں باورچی خانے میں گیا۔ لالٹین روشن کی، انگیٹھی میں کوئلے سُلگائے۔ جب تک پانی کھولے اطمینان سے بیٹھا سگرٹ پیا کیا۔ جب چائے تیار ہو گئی، مزے سے پی۔ خود محنت کی تھی پھر پچھلے پہر رات کی چائے، ویسے ہی بہت لُطف کی چیز ہے۔ چار پیالیاں پیں۔ طبیعت میں ایک قسم کی خوشی تھی۔ اپنے پر کچھ ناز سا ہو رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں چستی تھی۔ اس خیال سے کہ جلدی سے جا کر چُپکے سے لیٹ رہیں اور بھی پھرتی کی۔ لالٹین گل کر اندازے سے کونے میں رکھ جلدی سے نکل ہی پایا تھا کہ اندھیرے میں مراد آبادی سینی سے پیر ٹکرایا۔ اسی اندھیرے اور خاموشی میں برتن کھڑکھڑائے۔ کھڑکھڑائے تو کہنا غلط ہے یوں کہیئے کہ بڑے زور سے چلائے۔ اس کے ساتھ ہی صدر کے برآمدے میں کسی کے بعد بعد چار چھ قدم بھاگنے کی آواز آئی اور پھر بیگم کی دل دہلانے والی چیخیں تھیں۔ چور۔ چور۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ اے صاحب نہتا آدمی کیا کرتا اس لئے میں

بھی گلا پھاڑ کر چلّایا۔ چور، چور۔ بچّوں کی گھگیاں بندھ گئیں۔ چیخ پکار سے محلہ گونج گیا۔ محلے والے دوڑے۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر خاں صاحب رہتے ہیں۔ وہ اپنے کوٹھے سے ہمارے کوٹھے پر لٹھ لئے پھاندے تو میری بھی ہمت بڑھی۔ میں نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ انگنائی میں چار چھ اور لوگ لکڑیاں لیکر کھڑے ہو گئے۔ اب یہ ہوا۔ "کدھر تھا چور، کدھر گیا چور"۔ میں نے کہا "پتہ نہیں، صدر کی طرف بھاگتے ہوئے میں نے بھی دیکھا تھا"۔ بیگم رضائی کی آڑ میں سے بولیں "نہیں، پہلے تو باورچی خانے ہی میں تھا۔ پھر جب یہ (یعنی میں) باورچی خانے میں گئے تو بھاگ گیا"۔ انگنائی میں ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر تھا سب نے متفق ہو کر کہا "ہو نہ ہو اسی پر سے چڑھ کر کوٹھوں کوٹھوں بھاگ گیا"۔ اب سب نے میری بہادری کی تعریفیں شروع کر دیں۔ بڑے بوڑھوں نے نصیحت شروع کی "میاں چور کا پیچھا ہرگز نہ کرنا چاہیئے"۔ کوئی صاحب بولے "بھائی بڑی نادانی کی جو نہتے باورچی خانے میں چور کے پیچھے لپکے۔ اگر قرولی مار دیتا تو سب بہادری رہ جاتی"۔ رضائی کی آڑ سے بیگم کے بڑبڑانے کی آواز آئی "اِن کو کبھی عقل ہی نہ آئے گی، اللہ نے جان رکھ لی، مولی تُو نے مجھ پر بڑا رحم کیا"۔ کسی نے کہا "بھابی صبح ہوتے ہی صدقہ اتار دیجئے"۔ کوئی بولا "نہیں بہن مٹھائی بانٹئے"۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں اور میرے دل کی دھڑکن بھی کم ہو چلی تھی کہ برابر کے مکان سے نانا مرزا محمد کی آواز آئی "اماں کیاں ہواں، کیاں ہواں"۔

"نانا چور تھا چور"۔

"ٹھیرو میں آنیا۔ اریں میریں لکڑی ـــــ"

"نانا چور بھاگ گیا ہے"۔

"اماں میں آں رہاں ہوں۔ کوٹھڑیں کا دروازاں کھولو"۔

نانا مرزا محمد کا مکان ہمارے مکان سے ملا ہے اور ہماری کوٹھڑی میں سے ایک کھڑکی اُن کے مکان کے دالان میں کھلی ہوئی ہے، نانا کی عمر پینسٹھ برس کے قریب ہے۔ پُرانی وضع کے آدمی ہیں۔ افیون سے حسب دستور کافی شوق رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے محلہ بھر کو ایک دلچسپی رہتی ہے۔ کسی نے کہا "بلالو بھائی، بلالو کوٹھڑی کھولدو"۔ میں نے جا کر کوٹھڑی کی زنجیر کھول دی اور آواز دی "آیئے نانا"۔ کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ نانا چھوٹی سی کھڑکی سے اندر داخل ہوئے۔ کوٹھڑی میں کچھ کھڑبڑ ہوئی۔ اور پھر نانا کی بھرّائی ہوئی چیخیں "اریں۔ دوڑوں! اریں دوڑوں۔ چوں رنے میریں گردن پکڑلی۔ اریں مراں دوڑوں"۔

اب کیا تھا، میں اکیلا ہی تھوڑی بھاگا۔ صحن میں چار چھ اور آدمی تھے، وہ بھی بھاگے میں بھی بھاگا۔ بیگم اور بچّے بھی گرتے پڑتے بھاگے۔ صحن سے پار ڈیوڑھی۔ ڈیوڑھی سے پار باہر سڑک پر جا کر سب نے دَم لیا۔ نانا مرزا محمد ہیں کہ چیخ چیخ کر جان دئے دیتے ہیں "اریں دوڑوں چوں رنے گردن پکڑلیں۔ چوں رماں ریں ڈالتاں ہے"۔

خدا معلوم کیا ہوتا۔ وہ تو خانصاحب اپنے گھر سے پھر نکلے۔ اب جو اُن کو معلوم ہوا اور وہ چلے تو ہم لوگوں کی بھی ہمت بڑھی۔ آگے آگے وہ پیچھے پیچھے ہم لوگ دُور ہی سے چور کو ڈانٹتے، ڈپٹتے، ڈرتے ڈرتے کوٹھڑی تک گئے۔ خانصاحب نے بڑے زور سے چور کو ڈانٹ کر لالٹین کوٹھڑی میں ڈال کر جھانکا۔

کیا دیکھتے ہیں کہ زمین سے ملی چھوٹی سی کھڑکی کے برابر کچھ دُور جو گھڑونچی رکھی رہتی تھی، اس کے ایک خانے میں سر ڈالے گردن پھنسائے نانا اکڑوں بیٹھے ہیں۔ گھڑونچی کے ایک سرے پر بہت سا سامان رکھا تھا۔ اس لئے وہ اُن سے اُٹھ بھی نہیں سکتی تھی بیچارے

اپنی پوری طاقت چلّانے میں لگا رہے تھے۔ سب نے جا کر اُن کو نکالا۔ ہنستے ہنستے لوگوں کا بُرا حال ہوگیا۔ لیکن صبح ہوتے ہی میری ہنسی سب رفوچکّر ہوگئی۔

اب جو صبح سے چاء پر چاء میرے آگے آنا شروع ہوئی تو اَب نہیں رُکتی۔ پہلے تو مَیں سمجھا نہیں۔ یہی سمجھتا رہا کہ میری رات کی بہادری سے بیگم بہت خوش ہیں۔ اور قرولی کی زد سے بچ رہنے کا ان کے دل پر اثر ہے۔ مگر جب ایک ہی گھنٹے میں چوتھی مرتبہ میرے آگے چاء آئی اور میں نے ان کی صورت پر غور کیا تو مُنہ پُھولا ہوَا۔ خیر صاحب اب کیا کرتا چاء پیتا رہا۔ لیکن صبح دس بجے کے قریب آخر ہاتھ ہی جوڑنا پڑے۔ مگر وہاں مُنہ سُرخ، آنکھوں میں آنسو۔ "تمہیں ہماری جان کی قسم۔ اب تم چاء پیتے جاؤ، اگر انکار کرو تو ہمارا ہی مُردہ دیکھو — اب پیتے جاؤ"

اُس دن کی مُصیبت اب کیا بیان کروں۔

سیّد رفیق حسین

عورت

یہ مہ پارہ، یہ رنگ و نکہت کی پتلی ۔۔۔ حقیقت میں ہے اک دلیلِ خُدائی
یہ ہے رازِ خلقت، یہ ہے جانِ ہستی ۔۔۔ یہ ہے حُسنِ عالم، یہ ہے نورِ گیتی
یہ اِک مُنعقِد شعر دُنیائے خوبی ۔۔۔ یہ اِک مُنجمِد نغمۂ آسمانی
یہ تسنیم و کوثر کی نازک گُلابی ۔۔۔ یہ حُسنِ ازل کی مکمّل تجلّی
یہ گلزارِ ہستی کی پُر جوش تِتلی ۔۔۔ محبت کی ندّی، محبت کی پیاسی
یہ ماں ہو کہ بیٹی، بہن ہو کہ بیوی ۔۔۔ بہر رنگ ہے مہر و شفقت کی دیبی
یہ گہوارۂ لُطف، یہ مہدِ رافت ۔۔۔ یہ آغوشِ اُلفت، یہ فردوسِ ہستی
یہ گھر کا اُجالا، یہ دُنیا کا حاصِل ۔۔۔ یہ آنکھوں کی ٹھنڈک یہ دل کی تسلّی
یہ شمعِ مودّت، یہ ماہِ رفافت ۔۔۔ یہ مہرِ تعطّف، یہ ہمدردِ طفلی
یہ تعبیرِ خوابِ تمنّا و ارماں ۔۔۔ یہ سرمایۂ عشرت و شادمانی
جوانی میں دلدار، دم ساز، مونس ۔۔۔ بُڑھاپے میں غم خوار، ہم راز ساتھی
محبت میں گنگا، وفا میں ہمالہ ۔۔۔ نزاکت میں پھول، استقامت میں دھرتی
سُندرتا کا سنسار، شکتی کا ساگر ۔۔۔ پتی کی پُجارن، ستی، لاج ونتی
صفا میں یہ ہیرا، ضیا میں یہ تارا ۔۔۔ ادا میں یہ بجلی، بہا میں یہ موتی
شباب آفریں اس کا ایک ایک انداز ۔۔۔ جو بولی رسیلی، تو منظر میں نشیلی
تبسّم سراپا۔۔۔۔ تعطّر مجسّم ۔۔۔ چمن زار۔۔۔ اس سے۔۔ روِ زندگانی
یہ غربت میں راحت، یہ دُنیا میں جنّت ۔۔۔ یہ انعامِ قدرت، یہ احسانِ ہستی

کوکب شاہجہانپوری

تسکینِ حسرت

(۱)

گاؤں کے اکثر کھیتوں سے ربیع کی فصل کٹ چکنے کے بعد تال کی سیاہ کوال مٹی بہت ہی نمایاں معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک یہاں وہاں گیہوں اور بونٹ کے سنہرے کھیت شام کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ پچھوائی چل رہی تھی جس کی لہروں میں گیہوں کے خوشے اور بونٹ کی چھوٹی اور گداز ڈھیریاں جھول رہی تھیں۔ ہوائیں ہنوز گرمی تھی۔ گاؤں کے قریب بھیٹھ کی قسم کے کھیتوں میں ترکاریوں کی بیتن اور پودے اپنی ہریاول سے دل و نظر کو فرحت و تسکین بخش رہے تھے۔ ان سبز و شاداب کھیتوں کے درمیان کنوؤں پر لاٹھے لگے ہوئے تھے جو اکثر چل رہے تھے اور اُن کے چلنے سے مسلسل "چوں چوں" کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ دہقان کھیتوں کو پٹا رہے تھے۔ پنگھٹ اور پگڈنڈیوں پر عورتیں اور البیلی لڑکیاں پانی بھرتے یا گھڑوں اور کلسیوں کو سنبھالتے نظر آ رہی تھیں۔ اُن کی سُرخ اور زرد ساریاں، جن پر گذشتہ ہولی کے رنگوں کی گلکاریاں چیت کے شباب کی رنگ رلیوں کی خوشگواریاد دلا رہی تھیں، بہت ہی دلفریب تھیں۔ اِن کی چھلیں اور شرمیلی ہنسی اس سارے منظر کی رُوحِ رواں تھی۔ میدانوں میں لڑکے اور نوجوان کبڈی اور گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے اور گلیوں میں بھی گولیاں کھیلی جا رہی تھیں۔ گاؤں کی فضا پر مسرّت اور طمانیت چھائی ہوئی تھی۔

چودہ سال کا چھوکرا شبرتیا گاؤں کے زمیندار کے چھوٹے بچے کو گود میں لئے بنگلے کے چبوترے پر خیالات میں گُم ٹہل رہا تھا۔ وہ لڑکا کھلانے اور اُوپر کا کام کرنے پر مُلازم تھا۔ وہ سوچنے لگا "بلا سے، ہم ہی تو ایک نہیں۔ رحموا اور دھوا کو بھی تو رحمت بابو اور فرید بابو کے یہاں کے کام سے چھٹی نہیں ملتی — اور عیدوا" عیدوا کا نام ذہن میں آتے ہی شبرتیا آپ ہی آپ مسکرایا "یہ منجھلی دُلہن سے کیسی جوتیاں کھاتا ہے وہ" اُسے تسکین سی ہوئی۔ جیسے اُن جوتیوں کی مار سے وہ خود بچ نکلا ہو۔ "مگر للّو ساؤ بنیا کا لڑکا اور دمّو ور سونار کا چھوکرا، شرفو بابو، بھولا بابو، ننھیا ....." اپنے ہم عمر بہت سے لڑکوں کے نام اس کے خیال میں آئے۔ یہ لڑکے زمینداروں تاجروں اور فارغ البال کسانوں کے تھے۔ شبرتیا کے چہرے پر مایوسی اور حسرت کے آثار پیدا ہو گئے۔ زمیندار کا لڑکا اُس کی گود سے پھسلا جا رہا تھا۔ اُس نے لڑکے کو سنبھالا اور ٹہلنے لگا۔

"کلکتہ سے صغیروا کل ہی آیا ہے۔ اُس کا باپ بوٹ پر کماتا ہے اور صغیروا بھی بیڑی بنا کر خوب پیسے کما لیتا ہے" شبرتیا کی آنکھیں یک بیک چمک اٹھیں اور پھر بجھ سی گئیں۔ اُس کی چشمِ تصوّر نے صغیروا کی رنگ برنگی لنگی دیکھی اور جاپانی ربڑ کا پمپ شو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اُس خوبصورت لنگی کو خود پہنے ہوئے ہے اور وہی ربڑ کا جوتا اُسکے پاؤں کو گدگدا رہا ہے۔ لیکن یہ فریبِ تخیّل بہت جلد حقیقت کی بے رنگی کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

"ہم بھی کلکتہ کیوں نہ بھاگ جائیں اور پھر رنگ برنگی لنگیاں، پمپ شو اور سب سے بڑھکر آزادی۔ ہر کام سے آزادی" اُس نے اپنے طور پر کلکتہ کے وسیع شہر کا تصوّر کیا۔ پھر اُسے وہ قصّے یاد آنے لگے جو صغیروا اور دوسرے کلکتے سے آنے والے بیان کرتے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ لڑکے کو پٹک کر بھاگ نکلے اور جبّار میاں کی دکان پر جا کر کلکتے کے قصّے سُنے۔ اس ایک لمحے میں شبرتیا کے لئے زندگی کا

مقصد صرف کلکتہ کے قصّے سنانا تھا۔ ٹریم گاڑی، جادو گھر، چڑیا خانہ، ہوٹل، بائیسکوپ ... بیڑی کی دُکان، پیسے، رنگین لنگیاں اور پمپ شوٗ" ان کے متعلق اُس نے جانے کیا کیا تصوّر قائم کیا۔

زمیندار کا بنگلہ گاؤں کے کنارے ایک اونچی جگہ پر واقع تھا۔ شبرتیا نے پہلو کے میدان میں گاؤں کے لڑکوں کو کبڈی کھیلتے دیکھا اور دُور چند لڑکے پہاڑی کے کنارے والے آم کے باغ کی سمت میں جارہے تھے۔ اُس نے حسرت بھری نظر سے اُن لڑکوں کو دیکھا اور گود سے پھسلتے ہوئے بچے کو غصّے سے جھٹک کر کمر کے اوپر سنبھال لیا۔ سامنے کھیت میں کھیرے پھیلے ہوتے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ رات کو کھیروں پر شبخون مارے۔ اُسے پھر آم کے ٹکولوں[۱] کا خیال آیا اور اُسکے مُنہ میں پانی بھر آیا۔

"شبرتیا رے، شبرتیا رے! —" شبرتیا چوکنا ہو کر بنگلے کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے سمجھا کہ کسی اور سخت اور بدمزہ کام کے لئے اُسے بلایا جارہا ہے۔ پھر آواز آئی "شبرتیا! اے شبرتیا! کبڈی نہیں کھیلے گا؟ آ نہ رے شبرتیا!" رمضنیا اور رفنیا میدان سے شبرتیا کو آواز دے رہے تھے۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ذرا آگے بڑھکر وہ جواباً چلّایا "کیسے آویں ہم رے۔ ہم کو لالٹین صاف کرنا اور پانی بھرنا ہے" اسکی آواز گلوگیر تھی۔ لڑکے کبڈی کھیلنے لگے۔

"کبڈی کبڈی کبڈی .... کبڈی! کبڈّیہہ! کبڈّیہہ! .... چل کبڈی تارا۔ سلطان گنج مارا۔ سلطان گنج مارا ..." کیسی دلفریب آواز تھی۔ بول کا ترنّم شبرتیا کو بیقرار کئے دیتا تھا۔ وہ کچھ دیر چُپ چاپ بصد حسرت تماشہ دیکھتا رہا اور پھر ایک خشمگیں مایوسی کے ساتھ حویلی کی طرف چلدیا۔

(۲)

"اے او شبرتیا! مرگیا کمبخت! ہر وقت کھیل، ہر وقت تماشہ! بس بچّہ کو گود میں لے لیا، سارے کام دھندے سے فراغت، نظارہ بازی کو نکل کھڑے ہوئے۔ کام چور، نمک حرام — غارتی! مُردار! — سارے کام پڑے ہوئے ہیں اور حضور سیر سپاٹے کر رہے ہونگے ....."

یہ الفاظ بڑی بیگم کے تھے جو شبرتیا نے حویلی میں داخل ہوتے ہوتے سُنے۔ اس کا جی جل گیا۔ لیکن کیا کر سکتا تھا غریب۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ اس کے دل میں بغاوت کی کمزور سی لہر اُٹھی اور بے بسی کی اتھاہ گہرائیوں میں جاکر غائب ہوگئی۔ بڑی بیگم اُسے دیکھکر بیحد چراغ پا ہوئیں اور اُنہوں نے اِسے مسلسل نہایت ہی شگفتہ صلواتیں سُنائیں۔ جھڑکیاں سہتا ہوا شبرتیا اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ کنوئیں سے پانی لانا، جھاڑو دینا، لالٹین صاف کرنا وغیرہ وغیرہ۔ "اوپر کے کام" کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا جو آدھی رات گئے تک قائم رہا۔

(۳)

"کبڈی، کبڈی، کبڈی، کبڈی، کبڈّی ...."

"اے پاگل تو نہیں ہوگیا، موندی کاٹے۔ دن چڑھے تک سویا ہوا ہے" گھر کی بوڑھی ماما نے سوتے ہوئے شبرتیا کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"— چل کبڈی تارا۔ سلطان گنج مارا۔ سلطان گنج ...."

بوڑھی ماما نے شبرتیا کے ایک دوہتڑ دیا۔ وہ چونک کر گھبرایا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ پھر وہی "اوپر کے کام" کا غیر فانی سلسلہ۔

---

[۱] کیریوں کو بہار میں "ٹکولے" کہتے ہیں۔

بوڑھی ماما بڑبڑاتی، کوستی باورچی خانے کو چل دی۔ وہ دو روٹیوں کی آس لگائے ہوئے تھی۔ بوڑھوں کی زندگی کا اہم ترین مقصد صرف کھانا ہوتا ہے۔

شبرتیا ایک ہاتھ میں جھاڑو لئے اور دوسرے سے آنکھیں ملتا، جھکا ہوا ایک کمرے میں جھاڑو دے رہا تھا۔ اُسے بوڑھی ماما کا دوہتڑ اور بڑی بیگم کی صلواتیں یاد آ رہی تھیں۔ اُس کی گرد آلود پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ سوچ رہا تھا "یہ بڑھیا ہم کو مارنے والی کون ہوتی ہے۔ اِس کُتیا کا چڑا چڑا کر ناک میں دم نہ کر دیا تو میرا نام شبرتیا نہیں۔ اسے یہ بڑی بیگم کے برتے پر ہم کو آنکھیں دکھاتی ہے نا" بڑی بیگم کا خیال آتے ہی شبرتیا کو بڑی بیگم کے سارے مظالم اور اپنی ساری حسرتیں یاد آ گئیں۔ اُس کے چہرے پر خون کی پچکاری سی پڑ گئی "نمکحرام اور کام چور۔ اور اُوپر سے جوتیاں۔ ہم اب کبھی نہیں رہیں گے ان کے یہاں۔ میری عُمر کے لڑکے تو طرح طرح کے کھیل کھیلیں، کبڈی، لٹو، گلی ڈنڈا، تیرنا۔ اور ہم ان کے گھر سڑا کریں۔ آدمی نہ ہوئے بیل ہوئے۔ جیسے ہم بے جان سے ہیں، بیل سے بھی بدتر"

شبرتیا کا جی چاہتا تھا کہ ابھی فوراً بھاگ نکلے لیکن یک بیک اُسے اپنے ماں باپ کی غربت یاد آ گئی۔ وہ بھاگ کر کہاں جائے۔ کلکتہ؟ اتنی دُور پیدل جانا ناممکن اور پاس کوڑی بھی نہیں کہ ریل پر بیٹھ کر جائے۔ ریل پر بیٹھنے کے خیال سے اس کا دل ایک مبہم سے سرور کے احساس سے رُک رُک کر دھڑکنے لگا۔

وہ سوچنے لگا کہ اُس کے ماں باپ غریب کیوں ہیں۔ پھر اُسے دوسرے غریب لوگ یاد آئے اور اس کے بعد امیر لوگ اور آخر میں بڑی بیگم۔ بڑی بیگم سے اُسے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ شبرتیا جھاڑو دیتے دیتے بیٹھ گیا۔ خیالات و تصوّرات کی شدّت مانعِ حرکت و عمل ہوتی ہے۔ اُسکے دل میں اُلجھاوا سا تھا۔ وہ کچھ سمجھنا چاہتا تھا، صاف اور واضح طور پر۔

"۔۔۔ آخر ہم، رحموا، دھنیا، اور عیدوا کیوں آزادی سے کھیل کُود نہیں سکتے۔ کیا اس لئے کہ ہمارے ماں باپ غریب ہیں۔ ہاں شاید اسی لئے۔ ٹھیک! تب ہی تو بھولا بابو، شرفو بابو، شنکر جی، کرن ساد، منّے جی، خُوب آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ مگر حلیموا اور سلمتا، یہ تو ہم جیسے غریب ماں باپ کے بیٹے ہیں یہ کیوں آزاد ہیں؟" شبرتیا کو گذشتہ دوپہر کا وہ منظر یاد آ گیا جب حلیموا اور سلمتا لالہ کاشی لعل کی گھوڑی پکڑ کر نواری کی رسّی کا لگام لگائے اس کی کھلی پیٹھ پر سوار کھیتوں اور باغوں میں دندناتے پھرتے تھے۔ حویلی سے ملی ہوئی گلی میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ کسان اور مزدور زمیندار کے تالاب میں مچھلی مارنے جا رہے تھے۔ شبرتیا لوگوں کی آواز سُنکر چونکا ہوا "اوف او۔ آج مچھلی کی سالانہ پٹائی کا دن ہے۔ تالاب پر میلہ سا لگا ہوا ہوگا۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لوگوں کے جمع ہونگے" جال، چلون[1]، ٹاپے، ڈنڈے، مختلف ناپ تول کے چھوکرے، طرح طرح کے بوڑھے، قسم قسم کے گپاڑے، بھانت بھانت کے بے فکرے، زمیندار لوگ، لالہ، پٹواری، براہل، مجمع کا مجمع شبرتیا کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اُسے ناقابلِ برداشت طور پر اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا اس نے اس دُکھ کا علاج پھر خیالات کی دُنیا میں تلاش کیا۔ "آخر حلیموا اور سلمتا کو کوئی کچھ نہیں کہتا؟" شبرتیا کے حافظہ نے اس خیال کی فوراً تردید کی "نہیں، یہ دونوں تو کئی بار اپنے ماں باپ سے پٹے ہیں اور اُس دفعہ جب عماد بابو کے یہاں سے سلمتا بھاگا تھا تو پکڑے جانے پر عماد بابو نے اُسے کیسا ادھ مُوا کر دیا تھا۔ مگر اُس کی بلا مانے۔ وہ پھر ایسا بھاگا کہ جنم جنم کا آزاد ہو گیا۔ اور حلیموا نے تو کبھی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے ہی نہیں دیا" شبرتیا کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ شاید اُسے اپنے درد کا درماں حاصل ہو گیا تھا۔ اُسکے دل میں بغاوت

---

[1] چلون، مچھلی پھنسانے کے جال کی ایک قسم۔

کی ایک تیز لہر اٹھی اور اُس گھڑی وہ اپنے آپ کو آزاد اور سربلند محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں! امیر لوگوں کے، زمینداروں کے، مہاجنوں کے لڑکے آزادی سے کھیلتے ہیں اور غریبوں کے وہ لڑکے بھی جو کسی کی غلامی نہیں کرتے اور شیروں کی طرح آزاد رہتے ہیں۔ وہ ظلم سہتے ہیں مگر مَن کے ہٹیلے ہیں اور وہی کر گزرتے ہیں جو اُن کا جی چاہتا ہے۔ اور دَبو، بزدل غریب لڑکے جنم بھر کولھو کے بیل ہی بنے رہتے ہیں۔ ہم اب حلیموا اور سلمتا کی طرح آزاد رہیں گے اور کسی کی نہیں سنینگے، چاہے جو کچھ ہو"

"شبر تیا! ابے حرامزادے! ابھی تک جھاڑو ہی دے رہا ہے۔ ایک تو دوپہر کو سو کر اُٹھتا ہے اور اُس پہ ایک کام میں سو پہر لگا دیتا ہے۔ کمبخت! کام چور! کوڑھی!"

بڑی بیگم کی قاہرانہ آواز دالان میں گونجی۔ شبر تیا سہم کر رہ گیا۔ اُس کے سارے باغیانہ ارادے، حکم برداری کی عادت کے اثر سے کافور ہو گئے۔ وہ جلد جلد جھاڑو دینے لگا اور جھٹ پٹ یہ کام ختم کر، غسل خانے سے گھڑا اُٹھا، کنوئیں پر سے پانی لانے نکل کھڑا ہوا۔

پنگھٹ اور تالاب نزدیک ہی نزدیک تھے۔ راہ میں اور پنگھٹ پر شبر تیا محلے کے شکاریوں اور تماشہ بینوں سے ملا۔ فصل کی کٹائی ختم ہونے والی تھی۔ کسانوں کے گھروں میں اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اپنی تھوڑی سی اور لٹ جانے والی پونجی کے وقتی قبضہ کے احساس سے بھولے بھالے کسان پھولے نہیں سماتے تھے۔ لگن کا زمانہ بھی اب آ ہی چلا تھا۔ سب کے چہروں پر آنی جانی مسرت کے عبیر و گلال لگے ہوئے تھے۔ جہاں شادمانی اور فارغ البالی کا قحط ہو وہاں حقیر سی خوشی کا سامان بھی بہت بڑا سرمایۂ بہجت و نشاط ہوتا ہے۔ ع۔

اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

کھیت کے مزدوروں کی بے فکری تو کسانوں سے بھی بڑھی چڑھی ہوتی ہے۔ یہ لنگوٹی پر پھاگ کھیلنے والے سب سے زیادہ سرمست تھے۔ بیساکھ کا موسم اور گرہ میں تھوڑی مزدوری، پھر انہیں تاڑی کی لبنیاں لنڈھانے سے کون روک سکتا ہے، کوئی گاتا چلا آتا ہے، کسی کا چہرہ بیر بہوٹی بنا ہوا ہے، کوئی ترنگ میں مزے مزے کی باتیں کر رہا ہے۔ بدن پر لنگوٹی مگر مَن میں موج۔ غرض ساری فضا میں کیف و انبساط کی موجیں اُمڈ رہی تھیں۔ شبر تیا اس سے بلا متاثر ہوئے نہ رہ سکا۔ اُس نے بھی لہک کر ایک الاپ لگائی۔

ایلیٔ رے بھنوان دوار پر　　سندیہ لیکے یار کے....!

پیچھے سے سلمتا نے اسے ایک چپت رسید کی۔ شبر تیا نے اُسے مڑ کر دیکھا اور آپ خوب کھلکھلا کر ہنسا۔

سلمتا بولا "دور! غلام کا بچہ، آج بھی گھڑے ہی ڈھوتا رہیگا"

شبر تیا کے دل میں ایک تیر سا لگا۔ شرمندگی مٹانے کیلئے سلمتا کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ کنوئیں پر گھڑا رکھکر دونوں دوست تالاب کے کنارے چلے گئے۔ وہاں اُنکے ہمجولیوں کی قوم کی قوم مختلف ہیئت میں کھڑی ہوئی تھی۔

شبر تیا خود فراموشی و خود فریبی کے عالم میں دوسرے چھوکروں سے زیادہ خوش و خرم نظر آ رہا تھا اور سب سے بڑھ چڑھ کر کھیلوں اور شرارتوں میں حصہ لے رہا تھا۔ لیکن یہ غم غلط کرنے کی گھڑی بہت ہی گریز پا ثابت ہوئی۔

"شبر تیا! ابے شبر تیا! بی بی تیرے کھوج رہی ہیں رے! جلدی جا نہ رے سالا...." رام ٹہل سنگھ براہل کی گرجدار آواز نے سرمستی کے رنگین بلبلوں کو توڑ کر رکھدیا۔

شبرتیا ایک برق زدہ کی طرح کنوئیں پر واپس آیا اور پانی بھر کر مُنہ لٹکائے حویلی کی طرف گویا کشاں کشاں چلا۔ حویلی میں بڑی بیگم نے شبرتیا کی آج غیر معمولی طور پر خبر لی۔

(۴)

زمیندار کے دو منزلے کے رُخ پر ایک کھنڈر تھا جس میں دو بیر کے درخت اور چند بانس کی جھاڑیاں تھیں۔ گاؤں کے لڑکے اکثر آکر یہاں جمع ہوتے تھے، کھیلوں اور شرارتوں کے پروگرام بناتے اور کبھی کبھار یہیں کچھ کھیلنے بھی لگتے تھے۔ بیر کے موسم میں پاس کے نیچے مکانات بیر توڑنے والے لڑکوں کے ڈھیلوں کی زد میں ہوتے تھے۔

مچھلی کے شکار کے ایک ہفتہ بعد، ایک روز شبرتیا دو منزلے کے سائبان کے جنگلے سے لگا کھڑا تھا۔ اُس روز بھی زمیندار کا بچہ اُس کی گود میں تھا۔ سامنے کھنڈر میں بہت سے لڑکے جمع تھے۔ ایک جماعت لٹو کھیل رہی تھی، ایک ٹولی بیر کے درخت کے سایہ میں تاش سے شغل کر رہی تھی۔ اور ایک تیسرا گروہ پچیسی کے کھیل میں مشغول تھا۔ غریب شبرتیا سکتہ کے عالم میں حسرت سے سب کو دور سے تک رہا تھا خاموش، اُداس، مضمحل، تھوڑی دیر میں لڑکے سب کھیل سے اکتا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور آپس میں کسی تازہ مہم کی کھچڑی پکنے لگی۔ کچھ ردوکد کے بعد بہ اتفاق رائے یہ طے پایا کہ بابو مظہر کے آم کے باغ کی طرف رُخ کیا جائے۔ اُسی کے قریب بابو جاگو سنگھ کا باغ بھی تھا جیٹھ کے مہینے میں آم پک کر گرنے لگ جاتے ہیں اور نیم خام پھلوں کی تو کثرت ہوتی ہے۔ چلتے چلاتے عیدوا، بقر عیدوا اور رحموا نے شبرتیا کو دو منزلے پر دیکھ پایا۔ سب لڑکے اُسے پکارنے لگے۔ شبرتیا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور کہا :-

"ایک دن ہم بھی آوینگے رے۔ ایک دن ضرور۔ آوینگے اور خوب خُوب کھیلیں گے، خوب خوب خوب"

وہ اس تخیل سے لذت لے رہا تھا۔ لڑکے سب چلے گئے اور اب اُنکے قہقہوں کی صرف گونج باقی رہ گئی۔ شبرتیا دور کھیتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے دل کی ساری حسرتیں اس کی بے آس مگر آرزومند نگاہوں میں آکر مرتکز ہو گئی تھیں۔ اس کے تصور میں تصویریں بن اور مٹ رہی تھیں اور اُس کی بیتاب رُوح اتھاہ بے کیفی کے سرد غار میں ڈوبتی جاتی تھی۔ اس کے جذبات دم توڑ رہے تھے اور اُس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انتہائی بیپائی اور شکستگی کے بطن سے انقلاب جنم لیتا ہے، کس مپرسی اور مظلومی کی خاکستر سے بغاوت کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ دوسرے روز بے بس اور بے زبان شبرتیا سب کی آنکھوں کے سامنے زمیندار کے گھر سے دراتا ہوا نکل کھڑا ہوا وہ جا کر اپنے ہمجولیوں سے مل گیا۔ اُس نے ہر کھیل میں شرکت کی اور بے باکانہ شرکت کی۔ اُس نے خوب کبڈی کھیلی، خوب لٹو نچائے، خُوب خُوب آم کے باغوں کو غارت کیا، چھٹے ہوئے گھوڑوں پر چڑھا، تالابوں میں مچھلیاں مارتا رہا اور نہ جانے کس کس طرح اُس نے اپنی حسرت نکالی۔ اُسے نہ کھانے کی فکر تھی نہ پینے کا غم۔ وہ اپنے ماں باپ کے گھر بھی نہیں آتا تھا، اور دن رات ہوا کی طرح آزاد رہتا تھا۔ راتیں پہاڑی پر اور باغوں میں کاٹ دیتا اور دن قسم قسم کے کھیل کود میں۔ شبرتیا کی طبیعت میں ایک زبردست اُبال آیا ہوا تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر اس دباؤ کا ازالہ کر رہا تھا جو اُس کی خواہشوں پر عرصہ تک ڈالا گیا تھا۔ اس پر ایک ہیجان کی کیفیت طاری تھی، ایک بحران کا عالم۔

بڑی بیگم نے براہلوں کی وساطت سے شبرتیا کو گرفتار کروانا چاہا مگر وہ ہتے نہ چڑھا۔ کامل ایک ہفتے شبرتیا اسی بحرانی حالت

میں رہا۔ جیٹھ کی دوپہروں میں دُھوپ میں مارے مارے پھرنا، نہ کھانے کا ٹھکانہ، نہ سونے کا سامان، اس غیر معمولی زندگی سے شبرتیا کو شدید بخار آگیا۔ اُس کے باپ نے اُسے ایک شام آم کے باغ میں بخار سے جلتا ہوا پایا اور اُسے اُٹھا کر گھر لے آیا۔

شبرتیا کے بخار نے سرسامی رنگ اختیار کر لیا۔

"بڑی بیگم کے پنجے سے آزاد.... نہیں نہیں ہم نہیں اُٹھیں گے، ہم خُوب سوئینگے.... ماما امیرن۔ بوڑھی کُتیا —— وہ میرا کیا کر سکتی ہے؟ ہم آزاد ہیں! ہم آزاد ہیں!! ہم خُوب کھیلیں گے۔ خُوب! خُوب!! خُوب!! سلمتا! حکیموا، واہ دوست! ہم آزاد... چل کبڈی تارا۔ سلطان گنج مارا...." شبرتیا سرسام میں بُڑبُڑا رہا تھا۔

تیسرے روز شبرتیا مر گیا۔ اُس نے زندگی کا آخری کھیل بھی کھیل لیا۔ اُسکی حسرتوں کی مکمّل تسکین ہو چکی تھی۔

اختر اورینوی

بنامِ ساقیٔ فرخ نژاداں

مےِ عرفاں اگر سب کے لئے ذوق آفریں ہوتی
زمانہ میں جو شورش آج ہے، ہوتی؟ نہیں ہوتی

دیارِ قدس کو کیا واسطہ ناپاک شورش سے
نواحِ میکدہ ہے پاک ساقی کی نوازش سے

ہر اک میکش ہے خوش اُسکی مسرت ریز بخشش سے
مری طبعِ سرور آموز کیوں اندوہ گیں ہوتی

جو میخانے کی دلچسپی میسّر ہر کہیں ہوتی
یہی دُنیا کی جنّت رشکِ فردوسِ بریں ہوتی

نہاں ہے کیا فضائے میکدہ کی کیف سامانی
دکھاتا ہے مےِ خالص کی تاثیریں یہاں پانی

یہاں جو آگئے کیفیت ان سب کی ہے وجدانی
فضا ایسی نہ کیونکر چہرہ آرائے یقیں ہوتی

نصیبِ دیدۂ دل کاش یہ دولت یونہیں ہوتی
نہیں ہوتی طبیعت سیر جلوے سے نہیں ہوتی

طرب انگیز ہے مسرور کن ساقی کی شخصیت
اسی کی چشمِ میگوں نے بنایا مجھکو خوش نیّت

دکھائی جام بھرنے میں ہی ساقی نے وہ کیفیت
کئی ساغر چڑھانے سے بھی جو پیدا نہیں ہوتی

محبّت میرے ساقی کی جو سب کے دل نشیں ہوتی
منوّر اُس کے رُخ سے زاہدوں کی بھی جبیں ہوتی

درِ ساقی سے ہٹتی میری "عرفانی نظر" کیونکر
مری دانست میں ہے مرکزِ عرفاں اسی کا در

نہ ہوتی میرے ساقی کی عنایت ہی اگر مجھ پر
سوادِ دل کی طلعت کس کی چشمِ سُرمگیں ہوتی

نگہ محسوس مجھ سے بادہ کش کی بھی حسیں ہوتی
جو میری "پیش بینی" ناشناسِ آن واِیں ہوتی

نشاطِ بےخودی کیفِ خودی میں ہو رہی ہے حل
نہ خوش آیند ہو کیوں حال سے بھی میرا مستقبل

مری خوشیوں کو رقصاں دیکھکر زاہد ہے کیوں بیکل
خوشی کیا ایسے "ذہنی استحالہ" پر نہیں ہوتی

علی منظور

ریڈیائی ڈرامہ:۔

عہدِ اکبری کا ایک رومان

کردار

باز بہادر	کریم خاں
روپ متی	ادھم خاں
شہباز	انّا

پہلا سین

(ہندوستان میں شہنشاہ اکبر کا دور ہے۔ ملک مالوہ میں شیر شاہ کی طرف سے ایک شخص سجاول خاں حکمرانی کیا کرتا تھا۔ اُس کی موت کے بعد اُس کا بیٹا بازید خاں عرف باز بہادر اب حکمران ہے۔ مالوہ ابھی تک شہنشاہ اکبر کے زیرِ نگیں نہیں ہوا ہے۔ بازید خاں عرف باز بہادر بیحد حسین، سجیلا اور خوبصورت آدمی ہے۔ اِن خوبیوں کے علاوہ وہ گانے کے فن میں یکتائے روزگار ہے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں ——

بارہ کا گجر بجنا۔)

باز بہادر:۔ آدھی رات ہو رہی ہے مگر میری روح کے اضطراب میں کوئی کمی نہیں ہے۔ دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی نگاہوں کے سامنے ہو جو میرے اس اضطراب کو، اس بےچینی کو اپنے میں جذب کرے۔

کریم خاں:۔ عالیجاہ۔ ہر خطہ کی پریجمالیں حضور کے سامنے کئی مرتبہ پیش ہو چکیں۔ مگر حضور کی نظرِ انتخاب اُن سے بدرجہا بلند تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔

باز بہادر:۔ کیا کیا جائے؟ کریم خاں، تم مجھے عام نظر کا انسان سمجھتے ہو۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ دل نشتر کا طالب ہے، میری روح محبت کی بھوکی ہے۔ یہ حسین جو میرے سامنے آتے ہیں، بعض اوقات مجھے معیارِ حسن سے بھی بلند معلوم ہوتے ہیں لیکن ؎

نشتر سا چبھ رہا ہے اک میری زندگی میں
جو بات چاہتا ہوں ملتی نہیں کسی میں

کریم خاں:۔ بجا فرما رہے ہیں عالیجاہ۔ خانہ زاد کی ناقص فہم میں یہ رمز نہیں آسکا۔ ہاں خوب یاد آیا، سارنگپور کی ایک مغنّیہ روپ متی حاضر ہوئی ہے۔

باز بہادر:۔ مغنّیہ۔ کریم خاں، گانے کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ فن لطیف مردوں کے لئے خلق ہوا ہے۔ نہ کہ عورتوں کیلئے۔ تم کیوں میرے کانوں کو پریشان کرنا چاہتے ہو۔ اس ہستی پر رحم کرو جس کی رگ رگ بےچین ہو۔ جس کے دل میں دھواں اُٹھ رہا ہو۔

کریم خاں:۔ غریب نواز یہ الفاظ خانہ زاد کی آنکھوں میں آنسو لے آرہے ہیں۔ عالیجاہ کا کلیہ بالکل صحیح قطعاً درست ہے لیکن یہ مغنّیہ حضور کا نام نامی سُن کر آئی ہے۔ اب حضور غور فرمائیں کہ اپنے دل میں کیا کہے گی۔

باز بہادر:۔ اچھا بھائی بُلا لو۔ تم ماننے والے آدمی نہیں ہو۔

چھم چھم کی آواز۔ داخلہ

باز بہادر:۔ (آہستہ سے) کریم، عورت تو بلا کی حسین ہے۔

کریم خاں:۔ (آہستہ سے) حضور گانا بھی بلا کا ہے۔

روپ متی:۔ کنیز کورنش بجالاتی ہے۔

کریم خاں:۔ بیٹھ جاؤ، روپ متی۔ ہمارے آقائے نامدار کی طبیعت آجکل ناساز ہے۔ محض اس واسطے تمہیں باریابی دی گئی ہے کہ تمہارے قلب کو صدمہ نہ پہونچے۔ کچھ سناؤ۔

(روپ متی گاتی ہے)

باز بہادر:۔ آہ کریم، تو سچ کہتا تھا۔ یہ عورت حسن اور نغما دونوں میں کامل ہے۔

کریم خاں:۔ (آہستہ سے) عالیجاہ۔ دل کا کیا حال ہے۔

باز بہادر:۔ دل کا حال پوچھتا ہے۔ نادان۔ روح تک نے شراب محبت پی لی ہے۔

کریم خاں:۔ پھر۔

باز بہادر:۔ پھر کیا؟ سن۔ اب تک تو نغمۂ مضطرب سنا تھا۔ آج میں تجھے نغمۂ محبت سناتا ہوں۔

(باز بہادر گاتا ہے)

روپ متی:۔ عالیجاہ، چھوٹا منہ اور بڑی بات ضرور ہے لیکن میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ ایسا گانا کنیز نے زندگی میں پہلی بار سنا ہے۔

باز بہادر:۔ روپ متی۔ تم حسین ہو۔ خوبصورت ہو۔ لیکن تمہارے الفاظ بتا رہے ہیں کہ تم اب تک محبت سے بیگانہ رہی ہو۔ یہ نغمہ جو میں نے سنایا، مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ یہ اسی وقت کی واردات ہے۔ دل اور روح کی کیفیت نے ایک صدا میری زبان سے نکلوا دی۔

روپ متی:۔ عالیجاہ تقصیر معاف۔ میں ایک بار یہ نغمہ اور سننا چاہتی ہوں۔

باز بہادر:۔ ایک بار۔ بس حسین کافرہ۔ اب میری زبان پر صرف یہی نغمہ رہے گا اور اس کے سوز میں دن دونی ترقی ہوگی۔

روپ متی:۔ لیکن عالیجاہ۔ یہ لونڈی کیونکر اس نغمہ کو ہمیشہ سنے گی۔

باز بہادر:۔ اس طرح کہ آج سے مالوہ کی سلطنت پر بجائے باز بہادر کے روپ متی حکمرانی کرے گی، اور باز بہادر فقیرِ محبت بنکر جنگلوں کی خاک چھانے گا یا حسین روپ متی کے قدموں میں بیٹھا اُسے محبت کا نغمہ سنایا کرے گا۔

دوسرا سین

(دریا میں شاہی بجرا پڑا ہوا ہے۔ باز بہادر اور روپ متی بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے سازندے اپنے سازوں کو لئے ہوئے مؤدب بیٹھے ہیں۔)

باز بہادر:۔ ملکۂ حسن۔ گو باز بہادر کو تیرے قدموں میں دو سال مدہوشانہ زندگی بسر کرتے ہوئے گذر چکے ہیں لیکن بخدا ابتک ہوش نہیں آیا اور نہ خدا کرے تمام زندگی آئے۔

روپ متی:۔ میرے مالک، میری روح کے مالک۔ میری کائنات کے مالک۔ آپ کو دو برس یاد بھی ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل کا واقعہ ہے کہ سارنگپور کی ادنیٰ مغنیہ مالوہ کے بادشاہ باز بہادر کے حضور میں آدھی رات کو کانپتی ہوئی لرزتی ہوئی داخل ہوئی تھی اور ــــ اور ــــ اس عالیجاہ نے اسے ایک نظر میں اپنا کر لیا اور ہمیشہ کے لئے اُسے ایسی زندگی عطا کر دی جس کا نام بہشت ہے۔

باز بہادر:۔ میری روح۔ ایسے الفاظ استعمال نہ کر، جن میں میری اور تیری تفریق نمایاں ہو۔ بادشاہ مالوہ کو اس کا فخر ہے کہ حسن کی ملکہ نے اُس کے دل کی نذر کو قبول کر لیا۔ (سازندوں سے مخاطب ہو کر) کمبختو خاموش بیٹھے ہوئے ہو۔ کیوں کوئی ایسا راگ نہیں چھیڑتے کہ تمام کائنات گم ہو جائے۔ صرف باز بہادر اور روپ متی رہ جائیں۔

(آرکسٹرا بجتا ہے)

استاد ٹھرفو:۔ عالی قدر، حضور کریم خاں بہادر ساحل پر سفید جھنڈی ہلا رہے ہیں۔ اُن کا مقصد غالباً یہ ہے کہ بجرا کنارے پر پہونچا دیا جائے۔

کوئی ضروری امرِ سلطنت ہوگا۔

باز بہادر:۔ اُستاد ٹھہرو۔ پہلا ظلم تو تم نے یہ کیا کہ نغمے کو ناتمام چھوڑ دیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کائنات میں بجز روپ متی کے اور کچھ نہیں ہے۔ دوسرا ظلم یہ ہے کہ تم مجھے پھر دنیاوی آفات میں پھنسانا چاہتے ہو۔ آہ دُنیا کو میرا یہ سکونِ محبت بھی گوارا نہیں۔ اچھا بجرا ساحل پر لے چلو۔

(دریا میں بجرے کی روانی۔ ساحل پر لنگر کی آواز)

باز بہادر:۔ کہو۔ کریم خاں۔ جلد کہو۔ تم آخر مجھے میرے خواب سے کیوں چونکانا چاہتے ہو۔

کریم خاں:۔ عالیجاہ۔ غلام معافی کا خواستگار ہے۔ لیکن ایک ضروری امرِ سلطنت نے مجھے مجبور کر دیا۔

باز بہادر:۔ ضروری امرِ سلطنت۔ کریم خاں۔ ایک محبت کے دیوانے کو خدارا آزاد رہنے دو۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم لوگ سلطنت کا بار ایک ایسے شخص کے کاندھوں پر ڈال دو جس کی دُنیا بجز روپ متی کے اور کچھ نہ ہو۔ خدا کے لئے جاؤ۔ میری انگوٹھی لیتے جاؤ۔ جو جی چاہے حکم نافذ کر لو، اور مجھے اپنی روپ متی میں گم رہنے دو۔

کریم خاں:۔ حضور، معاملہ نازک ہے۔ شہنشاہِ اکبر کی طرف سے ادھم خاں چالیس ہزار سپاہ لیکر مالوہ کی طرف کوچ کر رہا ہے۔

باز بہادر:۔ تو کیا ڈر ہے۔ آج تک مالوہ کی سپاہ نے شاہی روٹیاں مُفت کھائی ہیں۔ کیا اب وہ لوگ مغل فوجوں کے مقابلہ میں پُشت دکھائیں گے۔

کریم خاں:۔ نہیں عالی جاہ۔ مالوہ کا بچہ بچہ اپنے آقا باز بہادر کے نام پر اپنے خُون کا آخری قطرہ تک بہا دیگا۔

باز بہادر:۔ تو جاؤ، مجھے اپنی روپ متی میں گُم رہنے دو۔ بالفرض اگر مغل فوجیں مجھ سے مالوہ لے بھی لیں تو یقین مانو کریم خاں، وہ مجھ سے میری روپ متی نہیں لے سکتے۔

تیسرا سین

ادھم خاں اور باز بہادر کی فوجوں میں مقابلہ ہو چکا۔ باز بہادر نے شکست فاش کھائی اور وہ جنگلوں میں جان بچا کر بھاگ گیا۔ مالوہ پر اب ادھم خاں کا قبضہ ہے۔ مالوہ کی بے انتہا دولت پر قابض ہو کر ادھم خاں کے دل میں بادشاہت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہ چند ہاتھی شہنشاہ اکبر کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجتا ہے۔ اس وقت ادھم خاں محل میں بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے پاس اُس کے مصاحبین ہیں۔

ادھم خاں:۔ شہباز، میں تیری ترکیب کا قائل ہوں۔ محض چند ہاتھیوں ہی کے ماتھے گئی۔ (قہقہہ)

شہباز:۔ عالی قدر سردار۔ اگر آپ کُل مالِ غنیمت کا حال شہنشاہ کو لکھ بھیجتے تو حضور کو حساب دینا پڑتا۔

ادھم خاں:۔ بات یہ ہے کہ میری عقل ذرا آجکل چوندھیا سی گئی ہے۔ کمبخت روپ متی کسی طرح راضی نہیں ہوتی۔ اس پر باز بہادر کا بھوت ایسا چڑھا ہوا ہے کہ خدا کی پناہ۔

شہباز:۔ حضور، ان دونوں کی محبت تو مشہورِ زمانہ تھی۔ باز بہادر کا واقعہ ابھی تازہ ہے، کچھ دنوں صبر فرمائیے۔ بھُول جائیگی۔

ادھم:۔ صبر، اچھا کہا تم نے۔ تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ روپ متی کے لئے میری رُوح بیقرار ہے، صبر کیونکر کروں۔ میں نے روپ متی کی انا کو دس ہزار روپے کل ہی دئے ہیں اور اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آج کی رات میری ہو جائیگی۔

شہباز:۔ تو کیا پروا ہے۔ لے لیجئے وہ انا جی خود آ رہی ہیں۔

(پیروں کی چاپ)

ادھم خاں:۔ آیئے آیئے انا جی۔ خوف کیا ہے۔ یہاں سب میرے جاں نثار بیٹھے ہیں۔

انّا۔ حضور بات ذرا خفیہ ہے۔

ادھم۔ کہئیے بھی۔ ان لوگوں سے میری کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔

انّا۔ حضور۔ بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تو باز بہادر کو کسی طرح بھولتی ہی نہیں۔ میں نے کہا چھوکری ہوش کی دوا کر۔ ادھم خاں کی جوتی کے برابر بھی باز بہادر خوبصورت اور سجیلا نہیں تھا۔ اری کیوں بھری تھالی میں لات مار رہی ہے۔ بڑی مصیبتوں سے منتوں سے راضی ہوئی ہے۔

ادھم۔ کارے کردی۔ انّا جی آپ نے مجھے مول لے لیا۔ فرمائیے پھر کب؟

انّا۔ کب؟ اوئی بھیا۔ کیا میں کچی گولیاں کھیلے ہوں۔ لے ابھی اسی وقت۔ میں ڈری کہ کہیں کچھ سوچ سارے بات سے نہ پلٹ جائے۔

ادھم خاں۔ شہباز۔ وہ موتیوں کا ہار انّا جی کو دو۔

انّا۔ حضور میں اپنے ہاتھ سے نہلا دھلا کر۔ پوشاک پہنا کر، دلہن بنا کر، روپ متی کو مسہری میں لٹا آئی ہوں۔ اب آگے حضور جانیں اور حضور کا کام۔

ادھم خاں۔ بس، بس تو چلوں۔

انّا۔ بسم اللہ۔

(چلنے کی آواز۔ سارنگی کی صدا)

ادھم خاں۔ یہ سارنگی کی آواز کیسی آرہی ہے۔

انّا۔ روپ متی کو گانے سے عشق ہے۔ اُس کے محل میں ہر وقت ساز بجا کرتے ہیں۔

ادھم خاں۔ انّا جی اب کدھر جاؤں۔

انّا۔ داہنے ہاتھ کو جو کمرہ ہے اس میں روپ متی کی مسہری ہے۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

ادھم خاں۔ اللہ ری زیبائش۔ کمرہ خود ہی دلہن معلوم ہو رہا ہے۔ مسہری میں کوئی لیٹا تو ہے اور منہ پر چادر پڑی ہوئی ہے۔ ذرا سا چادر تو کھسکاؤں۔

(چادر کھسکانے کی آواز)

ادھم خاں۔ ہائیں۔ چہرے پر موت کی زردی۔ ارے۔ نبض بھی سرد۔ ہائیں کیا اس نے زہر کھا لیا۔ آہ محبت۔ تو عجیب عجیب کھیل دکھاتی ہے۔

بہزاد لکھنوی

چار دن

پہلا دن:——

آج چار سال کی قید بامشقت کے بعد مجھے رہا کیا جا رہا ہے۔ ایک سپاہی مجھے آفس کی طرف لے چلا۔ آفس کے کیلنڈر پر میری نظر پڑی۔ ۷ فروری۔۔۔ میرے منہ سے ایک آہ نکلی۔۔۔ شاید آج پھر میرے آرام و سکون کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ ایک شکستہ کشتی کو اس وسیع سمندر میں قیامت خیز طوفان کا مقابلہ کرنے چھوڑا جا رہا ہے —— میرے دماغ سے سینکڑوں خیالات اس طرح گذر گئے جس طرح پانی پر بلبلے بنتے اور بگڑ جاتے ہیں۔ میرے سینے کی انتہائی گہرائیوں میں آزادی کی خواہش جگنو کی طرح کبھی کبھی چمک جایا کرتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ آرام و چین سے دن گذار دوں۔ میں اس آرام و سکون کیلئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار تھا۔ مگر —— کاش وہ کہیں میسر آتا! —— میں اسے قیدخانہ کہتا تھا، کیونکہ لوگ اُسے قیدخانہ کہتے تھے —— اور اس کے باہر آزادی —— لیکن آزادی کے صحیح مفہوم سے میں اب تک واقف نہیں ہوں —— اگر آزادی عبارت ہے اطمینان و سکون سے تو قید میرے لئے آزادی تھی اور آزادی قید —— یہاں مجھ سے محنت لی جاتی تھی اور اس کے معاوضہ میں آرام و سکون نہ سہی زندگی تو دی جاتی تھی۔ اور وہاں —— جسے لوگ آزادی کہتے ہیں۔ محنت کے بدلے —— فاقہ مستی —— میرے خیالات کا شیرازہ جمعدار کی بھاری آواز —"کیا نمبر ہے؟" نے توڑ دیا۔ جمعدار چشمے کو ناک پر گرا کر لال لال دیدوں سے میری طرف گھور رہا تھا۔

"۱۸۴۳" میں نے سینہ تان کر جواب دیا۔

اُس نے الماری میں سے ایک پرانی گٹھری نکالی اور اُسے میری طرف پھینکتے ہوئے کہا "یہ رہے تمہارے کپڑے"

آج سے چار سال قبل جس وقت میں یہاں داخل کیا گیا تھا تو یہ کپڑے اتار کر رکھ لئے گئے تھے۔ اور مجھے جیل کا لباس پہنایا گیا تھا۔

"جیل کا لباس اُتار کر اپنے کپڑے پہن لو" جمعدار نے اسی گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں کپڑے بدل کر صدر دروازے پر آیا۔ بوڑھا داروغہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ سپاہیوں کو دروازہ کھولنے کا حکم دیتے ہوئے میری طرف رجوع ہوا۔ میرے کانپتے ہوئے کاندھوں پر ہاتھ رکھکر مربیانہ انداز میں کہنے لگا "دیکھو! تم ایک جوان آدمی ہو۔ محنت و مشقت سے گذر اوقات کرو۔ چوری کرنا —— ڈاکے ڈالنا —— اور نقب لگانے سے انسان اپنی روح کو شیطان کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔ اسکے ضمیر سے نیکی کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم جائز طریقے سے اپنی روزی حاصل کرنے کی کوشش کرو گے"

"میں نہیں جانتا کہ جائز و ناجائز کسے کہتے ہیں" میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا —— "میرے سامنے صرف دو راہیں ہیں اگر میں ہاتھ پیر نہ ہلاؤں تو بھوکا مر جاؤں گا۔ دنیا اسے حرام موت کہتی ہے —— اور میں خود بھی تو مرنا نہیں چاہتا۔ آخر میں کیوں مروں —— اس لئے ہاتھ پیر ہلاتا ہوں تو زمانہ مجھے ایک خاص راہ پر ڈال دیتا ہے —— میں جانتا ہوں کہ یہ گناہ ہے، بدترین حرکت ہے لیکن میں وہی کرتا ہوں کیونکہ میں اس کے سوا کچھ کر بھی تو نہیں سکتا۔ میں بدی سے نفرت کرتا ہوں اور اس کے باوجود میں گناہ کا مرتکب ہوتا ہوں۔

میں مجبور ہوں۔ قطعی مجبور۔ میں مرنا پسند نہیں کرتا۔ زندگی میرے لئے ایک شکستہ گاڑی ہے جسے میں ایک ناہموار راستے پر مجبوراً گھسیٹ رہا ہوں۔ ــــــ "

داروغہ کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا ــــــ چھوٹا دروازہ آہستہ آہستہ کھلا۔ دُنیاوی ہواؤں کا ایک جھونکا میرے زرد رُخساروں کو چھوتا ہوا نکل گیا ــــــ میرے جذبات میں انقلاب پیدا ہوا۔ ایک عجیب سی مسرّت آمیز خواہش نے میرے سارے جسم کو کپکپا دیا۔ ـ کیا میں آزاد ہو رہا ہوں؟ ــــــ اس کا جواب مَیں خود نہ دے سکا۔ لیکن مَیں مسرور ضرور تھا۔ مسرور بہت مسرور ــــــ میں نے اس وسیع رنگین دُنیا کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ایک خوابیدہ انسان مدت کے بعد ہوشیار ہو رہا تھا۔ انسانی ہوسناکیوں نے مُردہ خواہشوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ جوانمردی نے ایک مست انگڑائی لی ــــــ دروازے کے باہر میری کلائی پکڑ کر ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے داروغہ نے کہا۔ " تو کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ دوبارہ یہاں نہ آؤگے اور ایک شریف ــــــ "

" ہاں! اگر زندہ رہنے کے لئے کہیں اور جگہ مل جائے " میں نے بات کاٹ کر جوابدیا۔

داروغہ بڑا ہی شریف آدمی تھا۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند، زاہد و پرہیزگار۔ قیدیوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتا۔ اسی وجہ سے اسکے افسر اس سے ناراض تھے۔ اس کے ماتحت بھی اس سے ناخوش تھے کیونکہ اس کی پرہیزگاری ان کے جیب گرم ہونے میں آڑے آتی تھی

" لو یہ سرکاری عطیہ " اُس نے دو روپے میرے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا " کوئی عمدہ وسیلہ پیدا کرو، شرافت کی زندگی بسر کرو " داروغہ کے الفاظ میرے لئے کوئی وقعت نہ رکھتے تھے۔ میں شاید تیسری مرتبہ یہ الفاظ سُن رہا تھا ــــــ " اچھا خدا حافظ " اُس نے آہستہ سے کہا۔ میں نے پیٹھ موڑی اور آہستہ آہستہ سڑک پر چلنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ دو نم آلود، ہمدرد نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔

جیل کے احاطہ سے باہر نکل کر مَیں نے ایک لمبی سانس کی۔ دُنیاوی ہواؤں کو پھیپھڑوں سے ٹکراتے ہی خیال گزرا کہ انسان صرف ہوا کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے پیٹ کی آگ کیلئے ایندھن کی ضرورت ہے۔ میں نے مٹھی کھولی، دو چمکتے ہوئے سکوں کو دیکھکر ایک لمحہ کیلئے آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس وقت قریب قریب دس بجے تھے لیکن پھر بھی مَیں سردی سے کانپ رہا تھا۔ آخر کار سامنے کے پُل پر دُھوپ کا لطف اُٹھانے بیٹھ گیا۔ میرے دماغ میں مستقبل کے خیالات گھوم رہے تھے۔ میں نے روپوں کو انگوٹھے پر رکھکر ترتیب وار ہوا میں اُچھالا۔ دونوں کھرے تھے۔ مگر سوال یہ تھا انہیں کس طرح استعمال کیا جائے۔ میرے سامنے قید خانہ کی چار دیواری تھی اور پیچھے شہر آباد تھا۔ میری نظریں بار بار جیل کی نیلی دیواروں سے ٹکرا کر رہجاتی تھیں۔ اگرچہ اس وقت مَیں آزاد تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ایک قیدخانے سے دوسرے قیدخانے میں ڈالدیا گیا ہوں۔ مجھے اپنے دوستوں کا خیال آیا۔ جو قیدخانے میں میرے ہم مشرب تھے۔ ہم اس حرص وہوس کی دُنیا سے کتنے دُور تھے۔ کس قدر بے فکر ــــــ قریب آدھ گھنٹے تک مَیں اُسی جگہ بیٹھا رہا ــــــ آخر کار اپنی جوانمردی کا مکر وفریب سے مقابلہ کرنے نکلا۔ شہر نے اپنا آغوش عصیاں میرے لئے وا کر دیا۔

شہر کی ایک چھوٹی سی سرائے، میں نے اپنے قیام کے لئے منتخب کرلی۔ محض دو آنے میں ایک حجام نے میری زندگی کے دس

سال مجھے واپس دیدتے۔ ایک پیسے کے صابن اور ٹھیکری نے مُردہ جسم میں شباب کی سُرخ لہریں دوڑا دیں۔

مَیں نے صبح سے ابتک کچھ نہ کھایا تھا۔غسل آزادی کے بعد دُھلا ہوا اُجلا لباس پہن کر شریف صورت بنائے سامنے کے ہوٹل میں پہونچا ــــــ ایک پردے کی آڑ میں کچھ لوگ کباب روٹی اور طرح طرح کے مزیدار کھانے اُڑا رہے تھے۔ اِن خوشبودار کھانوں کو دیکھکر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ مَیں ایک کونے میں کُرسی پر بیٹھ گیا۔

جب مَیں لال چونچ کر کے سگرٹ کا دُھواں اُڑاتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکلا تو میری جیب میں صرف ایک روپیہ سوا پانچ آنے پڑے تھے ــــ

مجھے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ آرام کی غرض سے سرائے کے وسیع دالان کے ایک کونے میں لیٹ گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں ایسا غافل ہوا کہ پھر تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ جب میں بیدار ہوا شام ہو رہی تھی۔ غریب مزدور دن بھر کی محنت کے بعد تھکے ماندے گھر واپس ہو رہے تھے۔ شام کی دلفریب فضانے سینکڑوں کاہل، ناکارہ انسانوں کو تفریح کے لئے باہر کھینچ لیا تھا۔ بہت سے نوجوان عیش پسند روسا جن کی نگاہیں بلندیوں پر پرواز کرنے کی عادی تھیں، اِدھر اُدھر تاک جھانک میں لگے ہوئے تھے۔ دُنیاوی مشین کا ہر پرزہ مصروف عمل تھا ــــ اچانک مجھے اپنے پیسوں کا خیال آیا ــــ مگر کیا دُنیا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو دوسروں کی غفلت سے فائدہ نہ اُٹھاتے ہوں۔

اَب مَیں پھر وہی چند سکّوں کی تلاش میں گھُوم رہا تھا جن کے بغیر مَیں اپنی جہنم کی آگ کو سرد نہ کر سکتا تھا۔ رات کے قریب نو بجے مجھے ایک بوجھ اُٹھانے کا کام ملا۔ ایک شخص کا صندوق اسٹیشن پہونچانا تھا۔ وہ صندوق اس قدر وزنی تھا کہ گردن اکڑ گئی۔ سر چکرانے لگا۔ قدم لڑکھڑائے لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ جوں توں کر کے اسٹیشن پہونچ ہی گیا۔ اس شخص نے اپنی دریادلی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک آنہ میری ہتھیلی پر رکھدیا۔ میں نے اس آنے سے اپنی شکم پُری کی اور سرائے میں آکر سو رہا۔

دوسرا دن۔ ــــــ

مَیں تلاشِ معاش میں گھُومتا ہوا ایک ایسی جگہ پہونچا جہاں ایک مکان زیرِ تعمیر تھا۔ ٹھیکیدار نے مجھے تین آنے روز پر نوکر رکھ لیا۔ مَیں اینٹیں ڈھوتا جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ انسان تین آنے روز میں کیونکر اپنا گذارہ کر سکتا ہے۔ یہ لوگ کیا کھاتے ہونگے۔ گھر کا کیا کرایہ دیتے ہونگے۔ بال بچّوں کی کیسے پرورش کرتے ہونگے اور اگر کوئی بیمار پڑگیا تو . . . . ؟ اُف! اس دُنیا میں زندگی کس قدر مہنگی ہے۔ کیا ہم محنت کے لیے خلق کئے گئے؟ کیا ہم مشقت کیلئے زندہ ہیں؟ ــــ زندہ رہنے کے لئے محنت کرنا چاہیئے؟ یا محنت کرنے کیلئے زندہ رہنا چاہیئے ــــ محنت انعام ہے زندگی کا؟ یا زندگی انعام ہے محنت کا؟ ــــ ہماری محنت کے بدلے ہمیں کتّوں کی سی زندگی دی جاتی ہے ــــ اور جو محنت نہیں کرتے عیاشی کرتے ہیں کاہل، آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں، اور محنتی بھی انسانی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتے ــــ یہ کیسی دُنیا ہے؟ یہاں کیسے لوگ رہتے ہیں؟ یہاں کیسے رہنا چاہیئے؟

اینٹیں ڈھوتے ڈھوتے میرے کاندھوں اور گردن میں درد ہونے لگا۔ بھلا ایسا کام میں نے کب کیا تھا۔ اس کے لئے وقت کی ضرورت تھی۔ مگر ٹھیکیدار دم نہ لینے دیتا تھا۔ وہ تو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام چاہتا تھا ــــ آخرکار میرا

کمزوری اور مجبوری کا یہ صلہ ملا کہ ٹھیکیدار نے ایک بجے چھ پیسے دیتے ہوئے کہا " مجھے تم جیسے کاہلوں کی ضرورت نہیں کوئی اور دھندا تلاش کرو۔"

چھ پیسے کھا پی کر میں بازار میں گھوم رہا تھا۔ شام کو میری حالت بہت ابتر ہوگئی۔ کچھ سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ اچانک ایک آواز کان میں آئی "کیا شرافت کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ ہے ؟" یہ میرے دوست کی آواز تھی جسے میں عرصے سے بھول چکا تھا۔ وہ مجھے اسی خاردار راستے پر پھر گزرنے کی ترغیب دے رہا تھا جس کے لوازمات وطور طریق کو قید کی محدود و مقید فضا نے ایک حد تک بھلا دیا تھا۔ میری شر انگیز، ولولہ خیز روح انگڑائی لیکر بیدار ہوئی ـــــ ایک خوش پوش کے بٹوے کے ساتھ ساتھ میری للچائی نظریں اس کے جیب میں پہونچیں۔ ایام قید نے مجھ سے میرے "ہاتھ کی صفائی" چھین لی تھی۔ میں کامیاب نہ ہوسکا۔ میری کمزوری نے مجھے سخت شرمندہ کیا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ اپنے شکار کی تلاش میں گشت کرنے لگا۔

ایک جگہ کوئی دقیانوسی حکیم اپنی بلند آواز، پھٹے دار، ظرافت آمیز تقریر کے ساتھ اپنی چھوٹی دواؤں کی تعریف کر رہا تھا۔ لوگ اس کی باتوں میں محو تھے۔ میں نے ایک رنگین بٹوے والی جیب کو اپنی مشق ستم کا نشانہ بنانے کے لئے تاکا۔ مجھے صرف ایک لمحہ غفلت درکار تھا ـــــ اچانک حکیم اپنی دوران تقریر میں کہنے لگا " دیکھئے ! ذرا اپنی جیبوں سے ہوشیار رہیئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ آپکی غفلت سے کوئی پورا پورا فائدہ اٹھائے ۔۔۔۔۔" لوگوں میں بیداری پھیل گئی۔ متجسس نگاہیں ایک دوسرے سے مل رہی تھیں۔ میری حالت اس شخص کی سی تھی جو چوری کرتا ہوا پکڑا جائے۔ میں اس خوف سے کہ مبادا کوئی میری آنکھوں سے میرا راز نہ پڑھ لے، نظریں نہ اٹھا سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت سی متلاشی نظریں مجھ پر پڑ رہی ہیں ـــ حکیم نے پھر تقریر شروع کی ـــ میں وہاں سے کھسک گیا۔ ـــ قریب ساڑھے گیارہ بجے رات، میں تھکا ماندہ، ناکام و نامراد سرائے واپس آیا۔

تیسرا دن ـــــ

رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ مارے بھوک کے برا حال تھا۔ تین چار سوتے ہوئے انسانوں پر میں نے خاموش حملہ کیا۔ لیکن انہیں بھی اپنا سا پایا۔ صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے شام، لیکن میں اس بھوک کے اژدہے کیلئے ایک ٹکڑا بھی فراہم نہ کر سکا۔

شہر کا بڑا بازار اس وقت پوری رونق پر تھا۔ دن بھر کی محنت کے بعد لوگ اپنی ضروریات خریدنے چلے آئے تھے۔ میں ایک بجلی کے کھمبے سے لگا کھڑا لوگوں کے چہروں کے اطمینان و مسرت کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ سامنے کی چاندی سونے کی دکان کو بجلی کی روشنی نے کہکشاں بنا دیا تھا ـــــ ایک سیٹھ جی مع ایک عدد وسیع توند اور ایک عدد میلی دھوتی پہنے بغیر شکن کے سفید فرش پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے ـــــ مستقل فاقے نے مجھ میں جسارت و دلیری پیدا کر دی تھی ـــ میں سیٹھ جی کے قریب پہونچا "کیوں سیٹھ جی! کیا نوکری بھی کہیں ملے گی ؟" میں نے "بھولے پن" سے دریافت کیا۔

"نوکری ؟" سیٹھ جی کی نظریں میرے قد کی لمبائی کے درمیان گشت کر رہی تھیں ـــ "پہلے کبھی نوکری کی ہے ؟" سیٹھ جی نے میرا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد لاپرواہی سے پوچھا۔

"ہاں ! ہاں !! ابھی جیل سے چھوٹ کر آ رہا ہوں" میں نے دلیری سے جواب دیا۔ "اور سیٹھ جی !" میں نے سادگی سے کہنا شروع

کیا: "ہم نے جیل میں سخت محنت و مشقت کے کام انجام دئے ہیں۔ اور ہم لکھے پڑھے آدمی ہیں سیٹھ جی! مڈل تک تعلیم پائی ہے۔ آپ اگر ہمیں نوکر رکھ لیں تو آپ کو بڑا فائدہ ہوگا۔"

اب سیٹھ جی کچھ گھبرائے۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ میری حالت کا جائزہ لیا اور ہمدردی سے کہنے لگے: "بھئی آجکل نوکری کہاں ـــــ اچھے اچھے پڑھے لکھے مارے مارے گھوم رہے ہیں۔ محنت و مزدوری بھی نہیں ملتی۔" ایک وقفے کے بعد کہنے لگے: "ابھی تو کوئی جگہ خالی نہیں ہے ـــ پھر کبھی آنا ـــ دوستوں سے پوچھ کر جواب دونگا۔"

جب میں دُکان سے نکل رہا تھا تو گلی والے چھوٹے دروازے سے ایک شخص کو اندر آتے دیکھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ فضلو تھا جو دوسری دفعہ کی جیل میں میرا ساتھی رہ چکا تھا۔ سیٹھ جی اس کو دیکھتے ہی گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ میں گلی کے موڑ پر چھپ کر کھڑا ہوگیا ـــــ سیٹھ جی نے جب اطمینان کر لیا کہ کوئی انہیں نہیں دیکھ رہا ہے، تو فضلو کو دُکان کے ایک تاریک کونے میں بُلا کر کہنے لگے: "کہو کیا ہے؟" سیٹھ جی نے کسی قدر آہستہ سے پوچھا۔

فضلو نے ایک پیلا چمکدار کڑا اُن کے سامنے کر دیا ـــــ سیٹھ جی نے ہتھیلی پر اُس کے وزن کا اندازہ کیا: "سب نقلی سونا ہے۔ پچیس روپے کا ہوگا۔"

"کیا کہتے ہو سیٹھ جی؟" فضلو نے حیرت سے کہا: "ڈیڑھ سو کا مال ہے ڈیڑھ سو کا۔"

"ہش! سب جھوٹا ہے نقلی ـــــ چالیس سے زیادہ کا مال نکل ہی نہیں سکتا ـــــ ایک بات کہتا ہوں پینتیس میں دے دو۔ اس سے زیادہ ایک پیسہ نہ ہوگا۔"

"غضب کر رہے ہو سیٹھ جی!" فضلو نے روتی آواز میں کہا۔

"بس کہہ چکا" سیٹھ جی نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"خیر جو حضور کی مرضی" لوگوں کو دُکان میں آتا دیکھکر فضلو نے معاملہ طے کر لیا ـــــ وہ جیب گرم کر کے دیکھتا بھالتا گلی کے موڑ پر آیا۔ میں نے پیچھے سے جا کر آہستہ سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھدیا۔ وہ گھبرا کر کانپنے لگا۔ پھر مجھے پہچان کر اُس نے کہا، "تم ہو راجو! تم نے مجھے ڈرا دیا۔ آجکل کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟"

"پہلے تم مجھے کہیں کھانا کھلا دو۔ دو روز سے فاقہ ہے۔"

وہ میری کلائی پکڑ کر ایک تاریک گلی میں لے چلا۔

ہم شہر کے غیر آباد حصے کے ایک چھوٹے سے قہوہ خانہ میں پہونچے۔ اس نے بتایا کہ یہ ہوٹل اُن کا خاص اڈّا ہے ـــ ہم یہاں بالکل آزادی سے بات کر سکتے تھے۔ ہم دونوں نے خُوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا ـــ اس کے بعد اس کے اصرار پر میں نے اُسے دوسری قید کے بعد سے اب تک کے تمام حالات سُنائے۔ جسے سُنکر وہ کہنے لگا: "اچھا تو آپ نے شرافت و ایمانداری کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کیا تھا" اُس نے قہقہہ لگایا۔ ایک لڑکے کو دو پیالی چاء لانے کا حکم دیتے ہوئے وہ کہنے لگا: "تم تین دفعہ جیل ہو آنے کے بعد بھی بچے ہی رہے راجو! ـــ ارے نادان! کہیں شرافت اور محنت و مزدوری سے بھی آرام و سکون حاصل ہو سکتا ہے؟ ـــــ

اور پھر ــــ اس دنیا میں ــــ جہاں زندگی عبارت ہے مکر، فریب، دھوکا، جھوٹ اور دغا سے ــــ تم کسانوں کو نہیں دیکھتے جنہیں انکی شرافت، سادگی و سادہ لوحی نے زندہ درگور کر دیا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس شرافت و سادگی کو آج کل دنیا حماقت و بیوقوفی سے تعبیر کرتی ہے۔ دور کیوں جاتے ہو؟ سیٹھ جی کی مثال لو، ابھی سب تمہاری سمجھ میں آجائیگا ــــ معلوم ہے! سیٹھ جی آج کل شہر کے سب سے بڑے رئیس ہیں۔ انسانی خواہشات اُن کی زر خرید لونڈیاں ہیں ــــ لیکن ابھی چند سال پہلے وہ ایک معمولی آدمی تھے۔ چھوٹی سی دکان تھی۔ ہم لوگوں سے چوری کا مال خرید کر گلا کر بیچنے لگے، سود میں لوگوں کو خوب مونڈا۔ بہت سوں کے گھر چھینے۔ سینکڑوں کی جاگیریں ضبط کیں۔ پولیس والوں کو رشوتیں دیں۔ صاحب لوگوں کی خوشامدیں کیں۔ افسروں کو پارٹیاں دیں۔ ڈالیاں دیں۔ رائے بہادر ہوئے۔ شہر کمیٹی کے صدر ہوئے۔ آج ہر طرف عزت ہے، لوگ جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ جلسوں کی صدارت کے لئے بلوائے جاتے ہیں ــــ سمجھے! یہ ہے دنیا ــــ یہاں شرافت و عزت کا دار و مدار انسانی پونجی پر ہے۔ اگر میرے پاس دولت ہے تو میں شہر کا سب سے زیادہ شریف و باعزت انسان ہوں! اگر اتفاقات زمانہ سے میں آج غریب ہو جاؤں تو کوئی میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا ــــ دولت کی چمک انسانی نگاہوں کو اس قدر خیرہ کر دیتی ہے کہ دولت مند کے عیوب بھی لوگوں کو اس کے محاسن نظر آتے ہیں۔ دولت کا چمکیلا جال اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ تم اپنے دشمنوں کو اس میں پھانس سکتے ہو۔ مخالفوں کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہو ــــ جب تک دولت نہیں ہوتی لوگ دولت حاصل کرنے کے طریقے کے جائز و ناجائز ہونے پر تنقید کرتے ہیں اور جب دولت آجاتی ہے تو تمام جائز و ناجائز کا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے"

فضلو ٹھنڈی چار کا آخری گھونٹ لے کر پھر کہنے لگا "اس دنیا میں کسی فعل کی اچھائی اور برائی کا دار و مدار اس کے کرنے والے کی قابلیت، لیاقت اور چالاکی پر ہے۔ اگر برے کام کو بھی خوشنما رنگ سے پیش کیا جائے تو وہ ایک نیک کام ہو سکتا ہے ــــ کسی جرم کا کرنا گناہ نہیں بلکہ اس کا پوشیدہ نہ رکھ سکنا گناہ ہے" اُس نے ایک سگرٹ خود جلایا ایک مجھے دیا۔ دھوئیں کے چھلے چھت کی طرف پھینکتے ہوئے کہنے لگا "سنو! میاں راجو!! کامیاب زندگی کا راز چاندی کے ٹکڑوں میں پنہاں ہے۔ انسانی عمل چمکدار بٹوں سے تو لا جا رہا ہے۔ انسان کا مفلس ہونا اس کی سب سے بڑی بدبختی ہے تم چند سکوں سے اپنی لوح قسمت کے دھندلے الفاظ کو سنہرا کر سکتے ہو" وہ گھڑی دیکھکر کہنے لگا "معاف کرنا مجھے ایک خاص کام پر جانا ہے۔ تم یہاں اطمینان سے رات بسر کر سکتے ہو"

میں بیدار ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں کھل چکی تھیں۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔

"میں تمہارا ممنون ہوں" میں نے آہستہ سے جوابدیا "لیکن کیا تم میری کچھ اور مدد کر سکتے ہو؟"

"وہ کیا؟" اُس نے پوچھا۔

"مجھے چند نقب لگانے کے اوزار دیدو"

چوتھا دن ــــ

آج ــــ جبکہ میری صحیفۂ حیات کے خوشنما و رنگین اوراق کو حوادثِ زمانہ کے کرم نے چاٹ کر بوسیدہ کر دیا ہے ــــ بارہ[12] سال بعد مجھے قید سے رہا کیا جا رہا ہے۔ . . . . صدر دروازے پر داروغہ کہنے لگا ــــ

"محنت و مزدوری سے گذر اوقات کرو ــــ شرافت کی زندگی بسر کرو . . . ."

ریاض رؤفی

کہاں پانی کی اَب ہلکی پھواریں ۔۔ فضا میں جھومتی ہیں تیز دھاریں
یہ گرتی موریاں بجتا ہوا ٹیں ۔۔ یہ ہمسائے میں بچّوں کی پُکاریں
ہواؤں میں اُڑا جاتا ہے سبزہ ۔۔ بچھی جاتی ہیں آموں کی قطاریں
گھنیرے باغ میں موروں کا جمگھٹ ۔۔ کھُلے میدان میں ہرنوں کی ڈاریں
یہ کشتی میں صدائیں مانجھیوں کی ۔۔ بھرے دریا کے سینے پر ملاریں
سنبھالے گاگریں جمنا کے تٹ پر ۔۔ نہانے آئیں بندرا بن کی ناریں
اُبلتی ہے گھٹاؤں کی جوانی ۔۔ پھٹی پڑتی ہیں ساون کی بہاریں

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہونچی ہے برسات

بھرے ساون کی یہ چڑھتی جوانی ۔۔ گھٹا ہے یا بلائے آسمانی
یہ شور انگیز دریا کا تلاطم ۔۔ یہ طوفاں خیز موجوں کی روانی
گلی کوچوں میں ندی بہہ رہی ہے ۔۔ سڑک پر آگیا نالے کا پانی
جواریں لہلہائیں، دھان لہکا ۔۔ کسانوں کی مٹی اب سرگرانی
زمیں پر جم گئی اڑتی ہوئی خاک ۔۔ اُٹھی مٹی سے بو سوندھی سہانی
گھٹاؤں میں چمک یہ جگنوؤں کی ۔۔ سیہ آنچل پہ جیسے کامدانی
یہ موسم ہے تو بے مانگے بھی ساقی ۔۔ پلائے گا شرابِ ارغوانی

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہونچی ہے برسات

کھُلا ہے پھر سے میخانے کا آغوش ۔۔ گھٹاؤں سے برستا ہے نیا جوش
سجی ہے پھر بساطِ بادہ نوشی ۔۔ ہوئے ہیں جمع اصحابِ بلانوش
شریکِ بزم زرّیں مسندوں پر ۔۔ حسینانِ گل آویز و گہر پوش
کھنکتے جام کی شیریں صدائیں ۔۔ ہوئی ہیں آج پھر سے جنتِ گوش
چلی ہے ساقیہ پھر رقص کرتی ۔۔ صراحی بر کمر پیمانہ بر دوش
خیالِ کفر و ایماں دُور ہو دُور ۔۔ خدا کے واسطے اے عقل خاموش!
جوانی عشرتِ امروز خواہد ۔۔ بجن افسانۂ فردا فراموش

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہونچی ہے برسات

جاں نثار اختر۔ ایم۔ اے۔

ادب پارے

اجنبی مسافر: آدھی رات سے مسافر جھونپڑی کے پار سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا......

اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے، بال گرد آلود اور چہرہ اُداس تھا۔

ہر طرف اندھیرا اور سنسان خاموشی تھی۔ جھونپڑی کے اندر سے سونے والے کی کروٹوں سے چارپائی کے بانس چرچرانے کی آواز آئی۔ مسافر کا دل ڈوبتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

وہ آدھی رات سے یونہی سر جھکائے بیٹھا تھا۔

آم کے درختوں کے اُس پار دھندلکے میں ایک دو کسان اپنے بیل لے جاتے نظر آنے لگے۔

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور جوان عورت اپنی لچکتی کمر پر گگری رکھکر کنوئیں پر جاتے ہوئے اسکے پاس سے گزری۔

مسافر کو خبر نہیں ہوئی۔ وہ یونہی اُداس سر جھکائے بیٹھا رہا ـــــ!

عورت اب لوٹ رہی تھی۔ مسافر نے آہستہ سے سر اُٹھاکر اپنی تھکی ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا... اُسکے لبوں پر سرد آہ تھی۔

عورت ٹھٹک گئی اور تعجب سے پوچھنے لگی: "تو کیوں اُداس ہے ـ ؟"

مسافر کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ہونٹ ہلائے۔ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا۔

آدھی رات سے جھونپڑی کے پاس بیٹھے ہوئے مسافر کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

فلاسفر: صبح سے شام تک تو کتب خانہ کی بھاری بھاری الماریوں کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے اور نہ جانے کس سوچ میں زندگی کے طویل دن گزار دیا کرتا ہے۔

آخر تو دنیا سے اتنا بیگانہ کیوں ہے؟

چاروں طرف زمانہ قدیم کی موٹی موٹی ضخیم کتابیں جن کے صفحات میں کیڑوں نے سوراخ کر ڈالے ہیں ڈھیر ہیں، اور تو سگار سلگا سلگا کر اُن پر جھکا ہوا اتنا مصروف ہے کہ سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔ مجھے بتا اِن میں کن دلفریب کہساروں کی دنیا چھپی ہوئی ہے جو تیرے کانوں میں اپنے آبشاروں کے سریلے گیت گنگنا کر تجھے ایک افریقہ کی صحرائی جادوگرنی کی طرح کھینچے لئے چلی جا رہی ہے؟

یا اس علم کے ذخیرے میں تجھے ایشیائی شاعروں کا محبوب جانور، کوئی خوبصورت آنکھوں والا سنہری ہرن نظر آگیا ہے، جس کے پیچھے تو سارے شکاریوں کو چھوڑ کر تنہا دیوانہ وار گھوڑا دوڑائے چلا جاتا ہے اور پھر کسی طلسمی محل کے اندر جا کر غائب ہو جاتا ہے؟

سوچتے سوچتے تیرے سر کے بال بھی سفید ہو چلے ہیں۔

اب بھی تو دنیا کی طرف سر اُٹھا کر نہیں دیکھتا اور ویسے ہی بیگانہ بنا ہوا ہے!

اللہ اس راز کا انکشاف کب ہوگا؟

انکشاف: جب میں بچہ تھی چاند کو پہروں ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی کہ شاید اس کے اس پار کے دور کے ممالک سے کوئی دھیمی سی آواز میرے کانوں میں آجائے اور اس کی حقیقت معلوم ہوجائے۔

پھر میں اور بڑی ہوئی تو درختوں کی بھوری قطاروں کے پرے منظر میں جما جما کر دیکھتی کہ شاید وہ نظر آجائے۔

آخر اس کا انکشاف کب ہوگا؟

پہلے میں حکمائے یونان کی طرح اپنے کو دنیا میں تنہا متلاشی خیال کرتی تھی۔

اب میں کتب خانہ کی ان موٹی موٹی کتابوں میں دیکھتی ہوں کہ دنیا کے بڑے بڑے عالموں اور فلاسفروں نے اس کی تلاش میں عمریں صرف کر دیں پھر بھی نہ پاسکے۔

وہ رستہ سے بھٹک گئے تھے۔

شاید میں ہی پاجاؤں۔

آئی۔ این:

مراسلات

"ترجمان الغیب"

مکرمی۔ انصار ناصری صاحب کی شکایت اُن عقل کُل (یعنی مجھ سے) نہیں بلکہ جناب سے ہے، یہی وجہ کہ مجھے آپ سے معذرت خواہ ہونا پڑا۔ کہے ناصری صاحب تو ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا (حافظ)

از نام بدم گفتی قربانِ زبانِ تو
دشنام بمن دادی شکر بدہانِ تو (قتیل)

بلکہ . . ۵ غزلوں میں بقول ناصری صاحب 'بعض بعض (یعنی اکثر نہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ واللہ اعلم تعریف ہے یا ہجو ہے) اشعار کا ترجمہ فی الواقع ایسا برجستہ ہوا کہ بالکل اوریجنل (اردو میں ایک اور لفظ کا اضافہ ہوا۔) معلوم ہوتا ہے' ایک 'ایسا' اوریجنل شعر عرض کرتا ہوں ؎

دیا دشنام میٹھا کر دیا مُنہ واہ کیا کہنا
جوابِ تلخ ان ہونٹوں کو؟ لب ہیں یا چھوہارا (مترجم)

کاش! یہ شعر اصل فارسی کا صرف ہم معنی بھی ہوتا تو میں پہلے دو اشعار لکھکر ہاتے، نہ کرتا۔ اس شعر کے حسن بیان (آدھا قتیل۔ آدھا حافظ۔ تیتر بٹیر) سے موثر ہوکر مجھے اس کی بھی معذرت چاہنی پڑی کہ میری کم علمی سے ناصری صاحب کی ہجو۔

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

آخر بیچارے ڈاکٹر نے ایسا کیا گناہ کیا ہے کہ وہ ادب سے محروم رہے۔ شاید یہ وجہ ہو کہ وکالت میں ادب (بمعنی تمیز نہیں۔) سکھایا جاتا ہو۔ میرے لئے تو یہ مسئلہ لاینحل ہے۔ لیکن مکرم ایڈیٹر صاحب۔ اس لئے کہ اپنے پیارے دوست انصار ناصری۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ وکیل کو آپ سے شکایت نہ رہے۔ اپنے مشفق کہنہ مشق کی توجہ صرف ریویو کی دو سطروں کی جانب مبذول کراتا ہوں ہر چند کہ ان میں پے در پے زبان و بیان کی فاش غلطیاں ہیں؛

"ترجمہ ہم ردیف، ہم قافیہ اور ہم بحر ہونے کی خصوصیت سے قابل ستائش ہے"؛

"مولوی صاحب نے اپنی انتہائی محنت اور علم پرستی کا ثبوت دیا"۔

صاف ظاہر ہے کہ میں مولوی صاحب کی علمیت اور قابلیت سے منکر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز بھی مکمل نہیں اس لئے گذارش ہے 'نظر ثانی کرتے رہیں تاکہ آئندہ ایڈیشن اور بھی بہتر ہو سکے؛ (اور بھی بہتر ملاحظ ہو۔) کہتے ہیں کہ عقلمند بیوقوف سے عقل سیکھتا ہے۔ مجھ بیوقوف سے اگر کسی عقلمند کو کچھ حاصل ہو تو کیا مضائقہ ہے۔

پھارسی تو میں نے سیکھی نہیں۔ ہاں 'پڑھیں فارسی بیچیں تیل' والی فارسی میں جانے پھانسی اور حبس قید کی عنایت سے رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر۔ کہکر شروع کردی ہے۔ لیکن اتنا پہلے سے ہی جانتا ہوں کہ مصلے اور سجادہ میں کیا فرق ہے اور رنگ لے جیسے رنگریزوا سے چوندریا رنگوا دے۔ مورے بالم اور رنگین کُن جیسے ہوری (ہولی) رسے میں نا مانوں۔ کھیلوں گی میں تو رنگ۔ میں کیا۔ خدا کرے 'وہ' مجھے 'چشم بدبین' ہی سمجھتے رہیں۔ لیکن کیا 'وہ' اتنی زحمت اُٹھائیں گے کہ ماہ جون کے نگار کا باب المراسلۃ والمناظرہ پر ایک نظر (مگر میری طرح 'چشم بدبین' نہیں بلکہ چشم وا یا کم از کم نیم وا) ڈالیں۔ اور دیکھیں کہ بسلسلہ ریویو حضرت نیاز فتحپوری جیسے ادیب نے 'جن کا ریویو خیر الکلام خاکسار، مترجم کے نقطہ نظر سے کسی 'بدفطرت خبیث کا کام' ہوسکتا تھا۔ بغیر پایۂ تہذیب سے گرے اور ذاتی حملے کئے، کیا کیا لکھا ہے اور اگر اصرار ہو تو کیا کیا لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ شاید میرے پیارے دوست نے سُنا ہو کہ اَلحَقُّ مُرٌّ۔ میری تو دُعا ہے کہ خدا کرے وہ کچھ بھی نہ سمجھیں۔ کیونکہ نداند و بداند کہ بداند کا درجہ بھی خوب ہوتا ہے۔

بھائی شاہد اگر ان الفاظ سے جس کا مدعا خدا گواہ ہے کوئی ذاتی عناد نہیں۔ کسی کو دُکھ پہونچے تو عرض ہے کہ ؎

گر نازنیں کہے سے بُرا مانتے ہیں آپ
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

صغیر ہاشمی

نواب ٹمبکٹو کی اصلیت

ساقی ماہ جولائی ۳۹ء کی اشاعتِ خاص میں جناب سید ابوطاہر داؤد۔ بی۔ ایس۔ سی، بی۔ ٹی، کے نام سے ایک ڈرامہ بعنوان "نواب ٹمبکٹو" شائع ہوا ہے۔ حالانکہ یہ ڈرامہ مرزا فتح علی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ جسے مصنف موصوف نے ترکی زبان میں لکھا تھا۔ مرزا صاحب موصوف نے پانچ اور ڈرامے قوم، ملک اور سوسائٹی کی اصلاح کے خاطر یورپین تمثیل نگاری کی تقلید میں لکھے۔ ان چھ ڈراموں کا مجموعہ کتابی شکل میں بعنوان "تمثیلات" ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا۔

فارسی کے ایک لائق ادیب مرزا جعفر نے ایران میں فارسی تمثیلات کو رواج دینے کی غرض سے ان چھ تمثیلات کا نہایت ہی شستہ اور بامحاورہ فارسی ترجمہ کیا۔ "سرگزشت وزیر خاں لنکران" ان ہی تمثیلات میں کی ایک نہایت ہی اچھی اور پُر مذاق تمثیل ہے۔

جناب ابوطاہر داؤد صاحب نے اس تمثیل کا صحیح عنوان "نواب ٹمبکٹو" سے تبدیل کر دیا۔ دوسری اصلاح یہ کی کہ افرادِ تمثیل کے ناموں کو بھی بدل ڈالا۔ حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ مثلاً لنکران کے بجائے ٹمبکٹو۔ مرزا حبیب کے بجائے "عاقل خاں"۔ حاجی صالح کے بجائے جمشید جی۔ شعلہ خاتون کے بجائے لالہ خاتون۔ نسار خانم کے بجائے دریا خاتون اور تیمور راق کے بجائے روشن اختر وغیرہ۔

ڈرامہ میں شاید واقعیت اور اصلیت پیدا کرنے کی غرض سے جناب موصوف نے تیسری اصلاح یہ کر دی کہ تاجر اور دیگر نوکروں کی زبان بالکل مقامی کر دی۔ میرے خیال میں جس زبان کو ابوطاہر صاحب نے تجویز کیا وہ بالکل نامناسب اور بے محل ہے۔ اسکی خامی یہ ہے کہ کسی محدود حلقہ کی ٹھیٹ زبان ہندوستان کے دیگر صوبوں کے لئے بالکل نامانوس ہی نہیں بلکہ ناقابلِ فہم ہو جاتی ہے۔ چاہیے تھا کہ نوکروں کے لئے سہل اور آسان زبان استعمال کرتے تاکہ ناظرین ساقی کو اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ بہ کیف ان سب تبدیلیوں سے بڑھکر جو غلطی جناب ابوطاہر داؤد صاحب نے کی وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس ڈرامے کو اتنا اپنا لیا کہ اصلی مصنف کے نام کو بھی ظاہر کرنا اپنے لئے ضروری نہیں سمجھا اور نام آوری کے جذبہ سے وہ اس قدر مجبور ہوئے کہ ڈرامہ کے آخر میں "ترجمہ" یا "ماخوذ" لکھنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ شاید اسی قسم کی غلطی کا دوسرا نام "ادبی سرقہ" ہے۔

میں نے مندرجہ بالا سطریں صرف واقفیت عامہ کے پیش نظر لکھی ہیں۔ اس سے میرا مطلب ذاتی نکتہ چینی ہرگز نہیں ہے۔ نکتہ چینی دو اقسام پر منقسم ہے۔ ایک ہمدردانہ اور دوسری مخاصمانہ۔ ہمدردانہ تعمیر و اصلاح کے لئے اور مخاصمانہ تخریب و فساد کے لئے۔ مگر فی زمانہ ہمدردانہ نکتہ چینی پر بھی یہی سمجھ لیا جاتا ہے کہ معترض خصومت اور عناد سے کام لیکر تخریب کا خواہشمند ہے۔

بہرحال اگر اس تمثیل کے متعلق میرے پیش کردہ خیالات کسی کی نظر میں بے بنیاد اور غلط معلوم ہوں تو گذارش ہے کہ اپنی مزید تشفی کے لئے بذریعہ ساقی مطلع کریں تاکہ شکوک و شبہات رفع کئے جائیں۔

معین الحق۔ بی۔ اے،

نقد و تبصرہ

فرہنگِ عامرہ:- محمد عبداللہ خاں صاحب خویشگی نے یہ نئی لغت ساری عمر کی کاوش و تحقیق کے بعد پیش کی ہے۔ یہ چالیس ہزار عربی، فارسی، ترکی وغیرہ الفاظ کی جامع فرہنگ ہے۔ الفاظ کے علاوہ مصطلحات کی بھی اس میں ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ سب سے بڑی خوبی اس لغت کی یہ ہے کہ ہر لفظ کا صحیح تلفظ حروف کے جوڑ الگ الگ بنا کر اور اعراب کے ذریعے بتایا ہے۔ یہ اس دشواری کا بہت اچھا حل ہے جو ہمیں اکثر عربی میں پیش آتی ہے کہ لفظ کو املا کے مطابق (جیسا کہ فارسی اور اردو کا قاعدہ ہے) نہیں پڑھا جاتا۔ مثلاً "رب النوع" میں بلحاظِ تلفظ "ا" اور "ل" کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ صاحب فرہنگ عامرہ نے اس کا تلفظ اس طرح بتایا ہے:- رَب۔ بُن۔ نَوْع۔ اسی طرح کی بے شمار تلفظی دشواریوں سے آئے دن سابقہ پڑتا رہتا ہے جن کے لئے "فرہنگِ عامرہ" سے بہتر اردو لغت ملنی ناممکن ہے۔ دیباچہ میں خویشگی صاحب نے برسبیل تذکرہ بیان کیا ہے کہ ڈاکٹر جانسن نے جب اپنی ڈکشنری پیش کی تو ارل آف چسٹر فیلڈ نے ایک رسالے کی دو اشاعتوں میں دادِ تحسین دی۔ مگر اسی زمانے میں خان آرزو نے اپنی فارسی فرہنگ "دلی والوں" کی نذر کی تو وہ خود بینی اور خود پسند طبائع کے غبار میں دب کر رہ گئی۔ اس کے متعلق ہمیں یہ کہنا ہے کہ ارل آف چسٹر فیلڈ کی خود غرضی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ جانسن اپنی ڈکشنری اُن کے نام سے منتسب کر دے اور اس سلسلہ میں وہ چٹھی بھی انگریزی ادبیات میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گی جس میں بڈھے ڈاکٹر نے منہ توڑ جواب دیا ہے۔ دلی والوں نے اگر خان آرزو کی بیاستائش نہیں کی تو اسے خود پسندی اور خود بینی سے تعبیر کرنا قرین انصاف نہیں۔ اس زمانے میں علماء اور فضلا دلی میں جتنے جمع تھے شاید ہی کبھی ہوئے ہوں۔ اگر خان آرزو کی لغت کو وہ مرتبہ نہیں ملا جو ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنری کو ملا تو اس میں شبہ کی کافی گنجائش ہے کہ آرزو کی لغت جانسن کی ڈکشنری کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ علمائے دہلی نے اگر جی کھول کر داد نہیں دی تو ہمیں یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ "سکوتِ سخن شناس" بے وجہ نہیں ہوا کرتا۔ زبان کے معاملہ میں صوبجاتی تعصب اور مرکزی فوقیت کا احساس بھی آرزو کے زمانے میں زیادہ تھا۔ سکوت میں اس کا بھی ضرور کوئی حصہ ہوگا۔ مگر اس زمانے میں کہ اردو سارے ہندوستان کی زبان ہے گڑے مُردے اکھاڑ کر دلی اور لکھنؤ وغیرہ کا سوال پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو خورجہ بھی زبان کا مرکز ہو سکتا ہے اور ایک خورجہ ہی پر کیا موقوف ہے سارا ہندوستان اردو زبان کا مرکز بن چکا ہے۔

"فرہنگِ عامرہ" کی ضخامت ۸۰۰ صفحات ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ جلد مضبوط۔ گرد پوش خوشنما۔ قیمت صرف دو روپے ہے جو بہت کم ہے۔

ملنے کا پتہ:- محمد عبداللہ خاں خویشگی۔ فیروز منزل متصل جامع مسجد۔ خورجہ۔

(ش)

دیہاتی گیت:- ڈاکٹر اعظم کریوی افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو میں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ منشی پریم چند کی طرح انہوں نے بھی دیہاتوں کی سیدھی سادی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ ان کی شیوہ بیانی نے دیہاتی زندگی کو نکھار دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہندی زبان کے بھی بہت اچھے عالم ہیں۔ ان کی کتاب "ہندی شاعری" مشہور و مقبول ہو چکی ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک اور نئی کتاب "دیہاتی گیت" کے نام سے عصمت بکڈپو۔ دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر اعظم سے بہتر اور کوئی خامہ فرسائی کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کتاب میں دیہاتی گیت، ساون کے گیت، چکی کے گیت، شادی کے گیت، کولھو کے گیت، اور مختلف دیہاتی گیت جمع کئے گئے ہیں۔ یہ گیت یو۔ پی اور مضافاتِ دہلی میں گائے جاتے ہیں۔ ان کی زبان کو ہم کھڑی بولی کہہ سکتے ہیں۔ ادب و انشا اور ثقہ شعر و شاعری کے تکلفات سے بری۔ جیسے سیدھے سادے دیہاتی لوگ ہوتے ہیں ویسے ہی سیدھے سادے اُن کے جذبات ہیں جو شعر کے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔ بحر، ردیف اور قافیہ کی قیود سے آزاد یہ گیت کچھ اس درجہ مؤثر ہیں کہ ہماری شاعری کا ایک بڑا حصہ ان پر سے

نثار کیا جا سکتا ہے۔ انہیں اگر ہم چاہیں تو سچی انسانیت کے دُکھ بھرے بول کہہ سکتے ہیں۔ ہندوستان کی نوّے فی صدی آبادی گاؤں اور قصبوں کی آبادی ہے۔ یہ گیت اِسی آبادی کے دردناک ترجمان ہیں۔ اِن گیتوں کے آئینے میں دیہاتی زندگی کے افسردہ خدوخال اُبھرے نظر آتے ہیں۔ دیہات سدھار کے مُدعی اِس مظلوم انسانیت کا نوحہ پہلے ان گیتوں میں سُن لیں تو بہتر۔ عصمت بکڈپو نے اس کتاب کو شائع کرکے دیہات کی مُصیبت زدہ عورتوں کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اُمید ہے کہ اس کے مطالعہ سے عبرت اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہونگے اور ہماری قومی حمیت میں کچھ توجوش آسکے گا۔ اس کتاب کی قیمت صرف ۸ر ہے۔ "ش"

انشائے سلمیٰ:۔ صاحبزادہ ولی احمد خاں صاحب ایم۔ اے کی تصنیف ہے جس میں خطوط نویسی کے آداب والقاب نمونے کے خطوط لکھکر بتائے ہیں۔ قدیم طرز کے القاب اور لگی بندھی لفاظی کا یہ زمانہ نہیں ہے۔ مرزا غالب کے خطوط کی اشاعت نے ہمیں بتایا کہ خط کی عبارت سادہ اور بے ساختہ ہونی چاہیئے گویا کاتب مکتوب الیہ سے باتیں کررہا ہو۔ اِس سادگی کو رائج پائے ہوئے بھی اب نصف صدی کا عرصہ ہوگیا اور انگریزی نے ہمارے خیالات اور ہماری زبان پر اتنا گہرا اثر کیا ہے کہ ہمارا ادب کچھ سے کچھ ہوگیا ہے۔ چنانچہ خطوط نویسی بھی اس کے اثر سے نہیں بچی اور القاب وآداب یکسر مٹ گئے۔ تخاطب کے لئے بغیر کسی امتیاز کے "ڈیر" کا الفاظ استعمال ہونے لگا۔ مگر ہماری تہذیب اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ ہمارے قدیم تمدن و معاشرت میں جو خوبیاں ہیں انہیں برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ انہی میں سے ایک حفظِ مراتب بھی ہے۔ ولی احمد صاحب نے قدیم وجدید تہذیب کا لحاظ رکھتے ہوئے اِس کتاب میں ہر قسم کے خطوط لکھے ہیں جن کا مطالعہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے ضروری ہے۔ ہماری رائے میں کوئی شریف ہندوستانی گھرانہ اِس کتاب سے بیگانہ نہیں رہنا چاہیئے۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ:۔ عصمت بکڈپو۔ دہلی۔ "ش"

دستکاری کی تین عمدہ کتابیں:۔ ہندوستان کے سب سے بڑے عورتوں کے کتب خانے، عصمت بکڈپو۔ دہلی نے جہاں بے شمار علمی وادبی کتابیں عورتوں کے لئے شائع کی ہیں وہاں دستکاری کی بھی متعدد عمدہ کتابیں چھاپی ہیں۔ حال ہی میں تین اور کتابوں کا اُن میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کے نام ہیں:۔ (۱) وصلی کی دستکاری۔ (۲) لکڑی کا باریک کام۔ اور (۳) کپڑے کی چھپائی۔ پہلی دونوں کتابیں سید رضا احمد صاحب جعفری کی لکھی ہوئی ہیں اور تیسری کتاب اقبال احمد صاحب کی۔ یہ دونوں حضرات اِن فنون میں اکسپرٹ ہیں۔ پہلی کتاب میں کارڈ بورڈ اور دوسری کتاب میں فریٹ ورک یعنی لکڑی میں پھول پتے وغیرہ کاٹنے اور آرائشی چیزیں بنانے کے طریقے بتائے ہیں۔ ان کتابوں کی قیمت آٹھ آٹھ آنے ہے۔ تیسری کتاب میں ہر قسم کے رنگوں کی تشریح اور طرح طرح کے کپڑوں کی چھپائی کے طریقے بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت ۱ر ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ تینوں کتابیں لڑکیوں اور عورتوں کے لئے بیحد کارآمد اور مالی اعتبار سے بھی مفید ثابت ہونگی۔ "ش"

زندگی کے کھیل:۔ لطیف الدین احمد صاحب اکبرآبادی کے بارہ افسانوں کا مجموعہ اس نام سے شائع ہوا ہے۔ اِن سب افسانوں میں حیاتِ انسانی کے مختلف رُخ پیش کئے گئے ہیں۔ سوسائٹی اور فرد کے تعلق کو کہانیوں کے پیرائے میں بیان کرکے دکھایا ہے کہ سرمایہ دار اور مزدور۔ غریب اور امیر۔ افلاس اور گناہ۔ محبت اور نفرت۔ فلاکت اور معصیت۔ زمیندار اور کسان۔ غرض جتنے بھی نشیب وفراز ہماری اجتماعی زندگی میں موجود ہیں اِن سب کی ذمہ دار سماج ہے۔ ایک ایسی سماج جس کی کل بگڑی ہوئی ہے اور اسے بدل دینے کی ضرورت ہے۔ لطیف صاحب مشہور انشاپرداز ہیں اور ان کا طرزِ تحریر مقبولیتِ خاص وعام حاصل کرچکا ہے۔ مگر اِن بارہ افسانوں میں اُنہوں نے سیدھی سادی لیکن مؤثر زبان اختیار کی ہے، جسے اگر ہم چاہیں تو ہندوستانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مُشتے نمونہ از خروارے ذیل کے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔ محبت کے متعلق آپ فرماتے ہیں:۔

"ایک ایسا جادو اثر افسانہ ہے جو اِس کٹھن زندگی میں پھولوں کی مہک اور شہد کی مٹھاس ملا دیتا ہے۔ جو اِس دُشٹ سنسار میں گیتوں کی موہنی اور سوم کا مدھ ملا دیتا ہے۔ یعنی دو دلوں کی دھڑکن اور اس دھڑکن کی ہم آہنگی کا افسانہ! دو روحوں کے سازمل جانے کا افسانہ! اب ہوائیں اس لئے سنکتی ہیں کہ ہنسی اور آمنہ کی سرگوشیوں کے زمزمے بن جائیں۔ اب چڑیاں

اِس لئے چھپاتی ہیں کہ ہنسی اور آمنہ کے پریم گیتوں
کے بول بن جائیں "۔

کتابت طباعت دیدہ زیب۔ کتاب مجلّد ہے۔ مضبوط گرد پوش۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ:۔ عظیم اطہر۔ منٹولہ۔ آگرہ! "ش"

ضبط تولید و اصلاحِ نسل:۔ مرتبہ حکیم حاجی مولوی عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی۔

دلی کے مشہور و معروف طبی رسالہ "ہمدردِ صحت" کا یہ خاص نمبر دورِ حاضر کے اس اہم اور نزاعی مسئلہ سے بحث کرتا ہے جس کا تعلق براہِ راست انسان کی عملی زندگی اور اصلاحِ نسل سے ہے۔

یورپ میں تو ایک مدت سے اِس مسئلہ کی مختلف حیثیات پر نقد و بحث جاری ہے۔ لیکن ہندوستان میں اب تک سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں ہوئی تھی۔ ہمدردِ صحت ہمارے شکریہ کا مستحق ہے کہ اُس نے اس مسئلہ کو چھیڑ دیا اور اس پر اس قدر تحقیق اور جامعیت کے ساتھ محققین و ماہرین یورپ و ایشیا کے افکار و آرا ملک کے آگے پیش کر دئے کہ اُن کی روشنی میں اب اس مسئلہ کی مختلف حیثیات کو سمجھنا مشکل نہیں رہا۔

فی الحقیقت یہ نمبر اُردو لٹریچر میں گرانقدر اضافہ ہے جسکے لئے ہم اس کے فاضل ایڈیٹر حکیم حاجی مولوی عبدالحمید کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

سائز ۲۲x۲۹ لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب۔ حجم تقریباً تین سو صفحات۔ ٹائیٹل پیج نہایت خوبصورت اور جاذبِ نظر۔ اِن ظاہری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ حکیم صاحب نے اس نمبر کی قیمت صرف ۱۲ آنے رکھی ہے جو ہمارے نزدیک مفت کے برابر ہے۔

دفتر رسالہ ہمدردِ صحت، ہمدرد منزل دہلی سے مل سکتا ہے۔ "م۔م"

حیات و کلّیاتِ اسمٰعیل:۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم کے نام سے شاید ہی کوئی اُردو خوان ہوگا جو واقف نہ ہوگا۔ ہزاروں نہیں لاکھوں نے اُن کی ریڈریں اور متفرق نظمیں اپنے زمانۂ طالبعلمی میں پڑھی ہونگی۔ ابھی چند سال ہوئے تک اُن کی اکثر کتابیں اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھیں جن میں سے "تزکِ اُردو" "کمکِ اُردو" "سوادِ اُردو" اور "سفینۂ اُردو" بہت مقبول و مشہور ہوئیں۔ ان کے علاوہ قواعدِ اُردو کے دو حصّے مولانا نے جدید اُصولوں کے تحت مُرتب فرمائے مگر قبولِ عام اس لئے حاصل نہ کر سکے کہ افسرانِ تعلیم کی ناقدری کا شکار ہوئے۔ پھر کتاب گردی کا زمانہ آگیا اور مولانا کی سب کتابیں جدید پبلشروں نے اپنے کتابوں کے سلسلوں میں کھپالیں۔ مگر اب بھی مولانا کی نظموں بغیر کوئی سلسلہ مُرتب و مکمل نہیں ہوتا۔ ہزاروں اُردو پڑھنے والے ایسے اب بھی موجود ہیں جنہیں مولانا کی نظمیں حفظ ہیں، اور یقین ہے کہ آئندہ بھی ان سدا بہار نظموں کے پھول گلستانِ ادب میں کھِلے رہیں گے۔

حضرت اسمٰعیل مرحوم ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۷ء میں راہیِ مُلکِ عدم ہوئے۔ اِس تہتر سال کے وقفے میں مولانا نے نظم و نثر کا کثیر سرمایہ چھوڑا جس میں سے کچھ حصّہ ضائع ہوگیا اور کچھ نامکمل رہ گیا مگر خدا کا شکر ہے کہ مولانا کی عمر بھر کی محنت ٹھکانے لگی کہ ہر پڑھے لکھے آدمی کی تعلیم میں مولانا کے فیضانِ علم کا جُزو شامل ہے۔

اِس وقت ہمارے پیشِ نظر ایک نہایت خوشنما ضخیم کتاب ہے جس کا نام "حیات و کلیاتِ اسمٰعیل" ہے۔ یہ کتاب حضرت محمد اسلم سیفی (خان بہادر) کی تالیف ہے۔ موصوف مولانا ئے مرحوم کے فرزندِ اصغر ہیں اور غالباً وہی ہیں جن کی بِلّی پر مولانا نے ایک نظم (اسلم کی بلّی) لکھی تھی۔ یہ نظم اکثر مجموعوں میں دکھائی دیتی ہے، اور کلیاتِ اسمٰعیل جدید کے صفحے (۸۱) پر درج ہے۔ اس کتاب کے دو حصّے ہیں:۔ (۱) حیاتِ اسمٰعیل، اور (۲) کلیاتِ اسمٰعیل۔ پہلا حصّہ ۳۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں حضرت اسلم سیفی نے بہت تفصیل سے مولانا ئے مرحوم کی سرگزشتِ حیات پیش کی ہے۔ اِسی ضمن میں اُن کے علمی و ادبی کارنامے بھی تاریخ وار بیان کئے ہیں اور اکثر نظموں کی شانِ نزول بھی ہمیں ملتی ہے۔ مولانا کی جملہ تصانیف کی ترتیب اور اُن کی پذیرائی کی کیفیت شرح و بسط سے بیان کی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کے احباب اور معاصرین کا تذکرہ بھی آیا ہے، جس سے مولانا کی سیرت سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مولانا اسلم نے جہاں تک ممکن ہو سکا نہایت کاوش و تحقیق سے مولانا کے وقائع حیات لکھے ہیں۔ یہ ایک بہت ضروری اور بڑی خدمت تھی جو حضرت اسلم کے ہاتھوں بطریقِ احسن انجام پائی۔ دوسرا حصّہ کلیاتِ اسمٰعیل

۲۵۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مولانا کی مثنویات، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مثمن، ترجیع بند، قصائد، قطعات، قطعات تاریخ، غزلیات، رباعیات، نظم بے قافیہ اور ابیات وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ منظومات فارسی کی بھی کثیر تعداد شریک ہے۔

"کلیات اسمٰعیل" کا پہلا اڈیشن مولانا کی زندگی میں حضرت اسلم سیفی ہی نے ۱۹۱۱ء میں مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ جدید اڈیشن میں شاعر کا کلام تدریجی ارتقا کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ اسکے علاوہ چند نظموں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ پہلا اڈیشن چھپنے کے بعد نایاب ہو گیا تھا۔ اب ۲۸ سال کے بعد یہ دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے مگر بمصداق دیر آید درست آید اس عمدگی اور سلیقہ سے شائع ہوا ہے کہ اردو کی بہترین کتابوں میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اس اڈیشن میں ایک درجن تصاویر کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ کتابت جلی و خوشنما۔ طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ دبیز۔ جلد مضبوط۔ سنہری ٹھپہ۔ قیمت چار روپے۔ اس کتاب کی بکری سے جو منافع ہوگا محمد اسمٰعیل گرلز اسکول کی عمارت بنانے میں صرف کیا جائے گا۔ یہ مدرسہ مولانائے مرحوم نے ۱۹۰۹ء میں مدرسہ بنات المسلمین کے نام سے قائم کیا تھا۔

"حیات و کلیات اسمٰعیل"، مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ دہلی سے منگائی جا سکتی ہے۔

"ش"

رفیعی مرحوم کے مضامین کا مجموعہ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ادیبِ لبیب حضرت رفیقی اجمیری (مرحوم) کے بلند آہنگ و حسین افسانوں کا جمیل مجموعہ نہایت آب و تاب کے ساتھ چھپ رہا ہے۔ دیدہ زیب کتابت، عمدہ طباعت و بہترین ۲۷×۱۷ کی سائز کے کاغذ پر یہ گرانقدر مجموعہ تیار کرایا جا رہا ہے۔ تبصرہ علامہ نیاز فتحپوری لکھینگے اور تعارف احقر کے قلم سے ہوگا۔

جادو نگار و سحر رقم رفیقی مرحوم نے اپنی مخصوص اسلوبِ نگارش سے جو بے پایاں شہرت حاصل کی ہے وہ کسی تعارف و تقریب کی محتاج نہیں۔ اس "قارونِ ادب" نے (مولانا نیاز کے الفاظ میں) بہت کم عمری میں لکھنا شروع کر دیا تھا اور بہت جلد یہ اقلیم شہرت کا تاجدار بن گیا تھا۔

اس بلند پایہ مجموعے میں مرحوم کے تین افسانے ہیں۔ ان کے علاوہ چند وہ علمی مضامین بھی ہیں جنہوں نے اردو داں طبقے کے اذہان میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے بلکہ اس مجموعے میں اس آتشیں نوا شاعر کی وہ تمام غزلیں اور نظمیں بھی شامل کر لی گئی ہیں جو مرحوم کی حیات ہی میں کافی سے زیادہ مقبول ہو چکی تھیں اور جن کو بہت سے ادیبوں نے اپنے افسانوں میں برمحل استعمال کیا ہے۔

ان خوبیوں کو اور مرحوم کی عظیم المرتبت شہرت کو دیکھتے ہوئے اس ضخیم کتاب کی قیمت کسی طرح چار روپے (للعہ/) سے کم نہیں ہو سکتی تھی لیکن پرستارانِ رفیقی کی جیبوں کا خیال رکھتے ہوئے اس کی قیمت صرف ۱۲/ رکھی گئی ہے۔

جن صاحبان کے آرڈر اواخر اگست ۳۹ء تک موصول ہونگے ان کو صرف ۱۲/ میں یہ کتاب دی جائیگی۔

کتب فروش حضرات کے ساتھ رعایت ہے۔

قیسی رامپوری

بتوسط ایڈیٹر "ساقی" دہلی

کتاب مفت لیجئے

چونکہ ادارۂ اشاعت اردو کے قیام کا مقصد عوام کی پسندیدہ کتابیں شائع کرنا ہے۔ اس لئے ہر موضوع پر ۲۰ کتابوں کی فہرست دیکر عوام سے ۱۲ کتابیں برائے اشاعت منتخب کرنے کی خواہش کی گئی تھی۔ کثرت آرا جن ۱۲ کتابوں کے حق میں تھی انکے نام درج ذیل ہیں:-

(۱) مسولینی کی آپ بیتی۔ (اراکین ادارہ کو خرچ ڈاک بھیجنے پر مفت بھیجی جائیگی)۔ (۲) جانِ ظرافت (مغرب کے مشہور مزاح نگاروں کے مضامین اور افسانوں کا ترجمہ)۔ (۳) سماج اور عورت۔ (۴) ہندوستان کی مشترکہ زبان۔ (۵) حیات جناح۔ (۶) خاک وطن (The Good Earth ناول جس پر ادبیات کا نوبل پرائز ملا کا ترجمہ)۔ (۷) سیاسات یورپ۔ (۸) ہندوستانی عورت۔ (۹) چند ڈرامے (دوسری زبانوں کے عمدہ ڈراموں کا ترجمہ) (۱۰) ہندوستانی مسائل حاضرہ۔ (۱۱) ہندوستانی فلم۔ (۱۲) جدید افسانے۔ (۱۳) شادی اور اخلاق (برٹرینڈ رسل کی تصنیف Marriage & Morals کا ترجمہ)۔

آج ہی دو روپے بطور امانت دفتر میں جمع کرا کے ادارہ کے رکن بنجائیے اور پہلی کتاب مفت لیجئے جو اگست ۳۹ء میں شائع ہو جائیگی۔ اسکے بعد ہر ماہ حسب ترتیب ایک کتاب شائع ہوگی جو مجلد، ضخیم اور باتصویر ہوگی۔ اراکین ادارہ کو ایک روپیہ (علاوہ خرچ ڈاک) داخل کرنے پر وہ کتاب دیجائیگی۔ اس طرح سے ۱۲ روپے میں ۱۲ کتابوں کے سٹ کی خریداری کے ختم پر ہی رقم امانت (۲) واپس کی جائیگی۔

معتمدین:- سید بادشاہ حسین حیدرآبادی۔ "ناکارہ" حیدرآبادی۔

ادارۂ اشاعت اردو۔ قریب ڈیوڑھی راجہ شیوراج بہادر۔ (چار مینار) حیدرآباد۔ دکن۔

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
فی پرچہ چھ آنے

جرعات

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت
بھیجا جاتا ہے۔

جلد ۲۰ | ساقی دہلی۔ بابت ستمبر ۱۹۳۹ء | نمبر ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

اکثر حضرات دریافت فرماتے ہیں کہ اگر ہم مضامین بھیجیں تو کیا آپ شائع کر دیجئے؟ عرض کیا جاتا ہے کہ آپ مضامین بھیجیے۔ اگر ساقی کے معیار کے مطابق ہوئے تو شائع کر دئے جائیں گے۔ دریافت فرماتے ہیں کہ ساقی کا معیار کیا ہے؟ عرض کیا جاتا ہے کہ ساقی ملاحظہ فرمائیے۔ پھر کوئی افسانہ یا غزل خاص ساقی کے لئے یہ کہکر بھیجی جاتی ہے کہ معیاری چیز ہے۔ عرض کیا جاتا ہے کہ یہ ناقابلِ اشاعت ہے۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ کیا خرابی ہے اس میں؟ اگر کوئی نقص ہے تو اصلاح کیوں نہیں دی؟ فلاں فلاں مضامین جو ساقی میں شائع ہوئے ہیں کیا وہ اس سے بہتر ہیں؟ آپ بہت متعصب ہیں۔ آپ صرف بڑے بڑے ناموں سے مرعوب ہوتے ہیں۔ آپ صرف اپنے دوستوں کے مضامین شائع کرتے ہیں۔ آپ نے ہمارا دل توڑ دیا۔ آپ کو شرم آنی چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جواب؟ خاموشی!

اردو صحافت میں ایک رسم چلی آتی ہے کہ اگر کسی رسالے میں کوئی بہت عمدہ مضمون شائع ہوتو لے اور رسائل بھی اپنے ناظرین کے لئے نقل کر لیتے ہیں اور ختم مضمون پر درج کر دیا جاتا ہے کہ کس رسالے سے نقل کیا گیا ہے۔ استفادہ کی یہ صورت لائق اعتراض نہیں ہے بلکہ ایک حد تک ہم اسے مستحسن سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ صریح حق تلفی ہے کہ کسی رسالے سے کوئی مضمون نقل کیا جائے اور اس کا حوالہ بھی نہ دیا جائے۔ یہ استفادہ نہیں سرقہ ہے اور سرقہ بھی ایسا جس سے اپنے ناظرین کو دھوکا دیا جائے۔ ساقی کے اکثر مضامین اخبارات و رسائل میں نقل ہوتے رہتے ہیں اور یہ ہمارے لئے باعث افتخار ہے۔ لیکن حال ہی میں چند خطوط مضمون نگار حضرات کے ایسے آئے ہیں جن میں شکوہ کیا گیا ہے کہ اُن کے مضامین فلاں فلاں اخبار میں بغیر کسی حوالے کے نقل ہوئے ہیں اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مضمون نگار نے براہِ راست اسکے لئے لکھے ہیں حالانکہ اس اخبار کیلئے ایک سطر لکھنا بھی صاحب مضمون کو گوارا نہیں۔ ذیل میں "دلفگار" کے خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> "میری نظم کے علاوہ اس میں ایک افسانہ جناب تنویر رامپوری کا بھی منقول ہے۔ جو دو تین سال ہوئے ساقی کے کسی خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ شاید میری نظم کی طرح اس افسانے کا بھی عنوان تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ عنوان بھی نہ بدلا گیا ہو۔ مگر میری نظم پر تو پورا پورا تصرف کیا گیا ہے۔ عنوان ہی اصل نہیں۔ دو ایک اشعار بھی غائب اور دو ایک اشعار میں لفظی ردّ و بدل بھی کیا گیا ہے۔ اعلیٰ معیاری صحافت میں دیکھا ہے کہ جس رسالے یا اخبار سے نقل کی جاتی ہے اس کا حوالہ ضرور دیا جاتا ہے۔ ...... نے ہم لوگوں کے نام تو ضرور دئے ہیں مگر ساقی کا حوالہ ندارد۔ گویا براہ راست یہ چیزیں ان کو بھیجی گئی ہیں۔ حالانکہ نامہ نگار کے نام سے زیادہ ضروری رسالے کا حوالہ ہے"
>
> یہ خط ...... کے اڈیٹر صاحب کو بھیجدیا گیا ہے۔ حق بحق دار رسید۔

اس کے علاوہ ہم یہ اور عرض کرتے ہیں کہ بعض مضمون نگار ہوتے ہیں جو ساقی کے کسی اور رسالے میں اپنے مضامین شائع نہیں کرانا چاہتے۔ بعض مضمون نگار اپنا مضمون صرف ایک بار شائع کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ بعض مضمون نگار معاوضہ پر لکھتے ہیں۔ بعض مضمون نگار کسی معاوضہ پر نہیں لکھتے، محض ساقی کی سرپرستی اور اڈیٹر ساقی کی خاطر انہیں منظور رہے۔ غرض ساقی کیلئے مضمون فراہم کرنے میں دامے، درمے، قدمے ہر طرح کوشش کی جاتی ہے۔ اس کاوش سے حاصل کئے ہوئے مضامین کا صلہ یہ کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتا کہ جب بے اجازت نقل کئے جائیں تو کم از کم ساقی کا حوالہ ہی دیدیا جائے۔

زیر نظر اشاعت میں برادرم صادق الخیری کا مضمون ایک خاصے کی چیز ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ علامہ راشد الخیری مرحوم کا اسٹائیل انکے بعد صادق کے ورثہ میں آگیا۔ اب ہم اپنی بہترین توقعات اس امید سے وابستہ کر سکتے ہیں کہ علامہ مرحوم کے اٹھ جانے سے جو جگہ اردو انشاپردازی میں خالی ہوگئی

پروفیسر برلاس اور انکی بیگم صاحبہ

سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی انچھر

نئی بولی کیسے بنتی ہے۔ جب کسی دیس کی بولی میں بدیسی بولوں کی ملاوٹ ہونے لگے تو ان بولوں کا رسان رسان آ آ کے ملنا اور اکٹھا ہونا کسی بھاشا کی نیو ڈالنے کیلئے سمجھنا چاہیئے۔ جب سے دیس کی بولی میں پرانے بولوں کا گھٹاؤ اور باہر کے نئے نئے بولوں کی بڑھوتری ہونے لگتی ہے، اور یہ گھٹ بڑھ یوں ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ نئی بولی بننے کے لئے بہت سی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ جن میں سے کچھ یہاں لکھی جاتی ہیں:۔

۱۔ جب بھاشا کے بول اپنے بوجھل اور ان گھڑ ہونے سے بات چیت میں روڑے اٹکاتے اور بولنے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں تو ان کے بوجھل اور کڈھب ہونے سے انکی جگہ برتنے کیلئے دوسرے ہلکے پھلکے بولوں کی ڈھونڈ اور ٹوہ ہوا کرتی ہے اور کبھی ان ہی ان گھڑ بولوں کو بگاڑ بگوڑ کے کچھ سے کچھ کر لیا جاتا ہے۔ جس سے اس بولی میں سے ایک نئی بولی کے نکلنے کی جگہ نکل آتی ہے۔

سنسکرت کی بڑھوتری کی گھڑی میں پراکرت اور پراکرت کے آگے بڑھنے میں پالی بھاشا منکھ اور پراکرت کے میل سے مل جل کے ایک ایسی تیسری بولی بن گئی جسے بڑی بیگھوں کے رہنے والوں نے اپنی بات چیت کیلئے الگ کر لیا وہ پراکرت کہلائی۔ اور چھوٹی بیگھوں کے رہنے والوں نے جسے اپنی بول چال کے لئے اٹھا لیا وہ پالی کہلائی جانے لگی۔ سریانی کے ہوتے عبرانی اور عبرانی کے ہوتے عربی پھیل جانے اور بولے جانے کا بھی یہی گُر اور بھید ہے۔

۲۔ کسی دیس کی بولی میں بیوپار اور لین دین کے سہارے سے بھی بہت سے باہر کے بول آتے اور جگہ پکڑ جم جاتے ہیں۔

۳۔ باہر سے آتے ہوئے وہ لوگ جو سچائی اور اچھائی کے دیوتا، من کے ستھرے، پرماتما کی پریم کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے آٹھوں پہر اُسی کے دھیان میں دھونی رمائے اور اسی سے لو لگائے رہتے ہیں۔ ان کی سچائی اور ان کا بڑاپن دیکھنے والوں پر ایسا منتر کر دیتا ہے جس سے انکی ایک ایک بات جی میں گھر کرتی چلی جاتی ہے۔ انہی ماننے والوں میں ان کی پریم میں ڈوبی ہوئی باتیں، من کو ستھرانے کی گھاتیں، سچائی کے گُر، اور اچھائی کے بھید پانے کے لئے ان کے بتائے ہوئے بھجنوں اور دوہوں کا ایک بول دیسیوں میں ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک ایسا جوں کا توں پہونچتا ہے جو پھر دھیان سے نہیں اترتا۔ اس ڈھب سے بھی بہت سے بدیسی بھاشا کے بول دیس کی بولی میں مل ملا کے اپنی جگہ نکال لیتے ہیں۔

۴۔ باہر والوں کا دھاوا کر کے کسی دیس میں گھس پڑنے اور وہاں کا راج پاٹ سنبھالنے سے جو بول ان کی بھاشا کے ساتھ آتے ہیں۔ یہ پردیسی یہاں سے چلے بھی جائیں تو جاتے جاتے اپنی بولی کے بہت سے بول چھوڑ جاتے ہیں اور جو یہ لوگ وہیں رہ پڑیں تو آئے دن کی مڈبھیڑ سے دیس والے پردیسیوں کی بات چیت سنتے سنتے ایسے ہو جاتے ہیں جو ان کے بول اپنی بول چال اور لکھت پڑھت میں بے جھجک لانے لگتے ہیں۔ جیسے:۔

شہاب الدین غوری کے راج میں چند کوی نے پرتھی راج راسا میں اور سکندر لودھی کے راج میں گرو نانک نے۔ ایسے ہی تلسی داس جی اور سور داس نے اپنی اپنی لکھتوں میں عربی فارسی کے بہت سے بول ملا لئے۔

عربوں کا یہاں آنا۔ پہلے پہل ۶۳۶ء میں یمن کے گورنر ابو العاص نے بمبئی کے تھانے پر دھاوا کر کے اسے چھینا۔ اس دھاوے سے اٹھائیس برس پیچھے ۶۶۴ء میں مہلب بن ابی صفرہ نے ملتان پر چڑھائی کی۔ اس چڑھائی سے اڑتالیس برس پیچھے ۷۱۴ء میں محمد بن قاسم سندھ پر چڑھ دوڑا۔

یہ سب عرب تھے جو ۷۶ برس تک یہاں اپنی بولی بولتے رہے اور بہت سے عربی بول دیس کی اس بھاشا میں ملا گئے جو ان کی راجدھانیوں کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ یہاں سے عربوں کے جانے پر پھر تو مسلمانوں کے دھاووں پر دھاوے ہونے لگے اور برج بھاکا میں بدیسی بول ایسے بڑھنے لگے جیسے آجکل اردو میں انگریزی بول گھسے پڑتے ہیں۔ مسلمانوں کے راج سے یہاں کی بھاشا عربی، فارسی، ترکی بولوں کو ساتھ لیکے آگے بڑھنے لگی۔

مسلمانوں کے چھوٹے بڑے راج۔ کچھ دن یہاں غزنویوں کا راج رہا۔ اٹھاون برس تک غوریوں کا جھنڈا لہرایا۔ چوراسی برس تک غلاموں کے گھرانے نے راج پاٹ سنبھالا۔ تیس برس تک خلجیوں کا ڈنکا بجتا رہا۔ چورانوے برس

تک دھن کی دیوی لچھمی تغلق کے گھرانے کی سیوا کرتی رہی۔ ۳۶ برس تک ہند کے اندھیرے میں سادات کے راج کا اُجالا رہا۔ ۷۶ برس تک لودھی اَن داتا بڑی موچھوں کو تاؤ دیتے رہے۔ ۳۲۱ برس تک مغلوں کی وہ دھاک بندھی جس کے سامنے گابھنی گابھ ڈالتی تھی۔

جب مغلوں کی راجدھانی میں اندھیرا پھیلنے لگا تو باہر کے جھتے کے جھتے ایک ایک کرکے ادھر دوڑ پڑے۔ کبھی یہاں پرتگیزوں نے چھاونی چھائی کبھی ولندیزوں کو ادھر کی لہر آئی۔ کبھی ڈنمارک والوں نے یہ نگری بسانا چاہی اور کبھی فرانسیسیوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی سب سے الگ بنائی۔ باہر والوں میں سے ایک انگریز ہی ایسے تھے جنہیں یہ جگہ راس آئی اور یہاں آتے ہی اُن کے بھاگ کھلے۔ پہلے یہاں کے راج نے اُن کا ساتھ دیا اور پھر انہوں نے پورے راج پاٹ کو اپنے ساتھ لے لیا۔

ہندی کا پہلا کبیشر

برج بھاکا کی پھلواری کا پہلا مالی امیر خسرو کو بتایا جاتا ہے۔ ان کی کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، ڈھکوسلے، گیت، کہاوتیں یہ سب اسی پھلواری کے نکھتے ہوئے پھول اور اسی سیپی کے چمکتے ہوئے موتی ہیں۔ کچھ کھوج لگانے والے میراں جی شاہ اور گولکنڈے کے قطب شاہ والے کبیشروں کو امیر خسرو کی جگہ دینا چاہتے ہیں۔ یہ سب تو اُوپری باتیں تھیں۔ ٹوہ لگانے سے اس کا پتا بہت آگے ملتا ہے۔

مسعود سعد سلمان غزنوی راج کا مانا ہوا کبیشر جو امیر خسرو سے دو سو برس پہلے ہوا ہے، یہ بہت اچھی ہندی جانتا تھا اور اسی ہندی میں سب سے پہلے اسی کی ایک بڑی پوری لکھت ڈھونڈنے والوں کے ہاتھ لگی۔ مجمع الفصحا میں لکھا ہے :۔

"ایں حاصل ہے راسہ دیوان بود تازی، ہندی و پارسی"

اک مجمع الفصحا کیا ایسی اور بہت سی لکھتیں مسعود سعد ہی کو ہندی کا پہلا کبیشر ماننے میں ایک سی ہیں تو پھر اسی کے ماتھے پر یہ سہرا ٹھیک بندھ سکتا ہے۔

والہ داغستانی کو اس بات پر بڑا اچنبا ہوا اور اسی لئے اُسے نہ مانا۔ کسی باہر والے کا دیسی بولی پر ایسا چھا جانا جو وہ اس کا پورا کبیشر بن جائے اور بدیسی بولی میں بڑی لمبی چوڑی لکھت لکھ لکھا کے ڈال دے۔ والہ داغستانی کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی اور اسی لئے اس کے نہ ماننے پر اَڑا رہا۔ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی نے اس گتھی کو اچھے ڈھب سے سلجھا دیا۔ انہوں نے پتہ لگا کے مسعود سعد کے گھرانے کو ایران کا اور اُسے لاہور کا بتایا۔ جب مسعود سعد کا جنم بھوم لاہور ٹھہرا تو پھر اچنبا کس بات پر۔ ایک دیسی اپنے دیس کی بولی اچھی سے اچھی لکھ پڑھ سکتا ہے۔

شیر شاہ کے راج میں ملک محمد جائسی ہوئے جن کے لگے کا ہندوؤں میں بھی اکا دکا ہی کوئی نکلے تو نکلے۔ انہوں نے پدماوت لکھی اور ایسی لکھی جو تلسی داس جی کی رامائن سے ٹکر کھاتی ہے۔ اس کے پرت کے پرت پڑھتے چلے جایئے۔ عربی، فارسی بول کہیں نہیں آنے پاتے اور یوں تو رامائن بھی ایسے بولوں سے نہ بچ سکی۔ جیسے :۔

رام اینک گریب نواجے لوگ بر بر بدو بیراجے
گنی، گریب گرام نرما کر پنڈت موٹے ملیں اوجاگر

اکبر کا راج اور ہندی

اکبر کے راج میں ہندی نے بہت پاؤں پھیلائے۔ اُونچے اُونچے گھرانے والے اس کے رسیا ہوگئے۔ کنور دانیال کے لئے تزک جہانگیری میں جہانگیر لکھتا ہے :۔

"بہ نغمہ ہندی مائل بود۔ بزبان اہل ہندو بہ اصطلاح ایشاں شعر میگفت"

مسلمانوں کو ہندی کی ایسی چاٹ پڑی اور اس کی مٹھاس ایسی اچھی لگی جو بہت سے ادھر جھک پڑے اور گھر گھر ہندی کی چوٹی کی لکھتیں رٹی جانے لگیں۔ میر ہاشم محترم کی باتیں لکھتے لکھتے امین رازی 'تذکرہ ہفت اقلیم' میں یہ لکھتا ہے :۔

"امروز در ہنداست۔ تمام کتاب مہابھارت را کہ مشتمل اسامی غریبہ و حکایات عجیب ست در ذکر دارد"

میر ہاشم محترم آج کل ہندوستان میں ہے۔ پوری مہابھارت کو جو کڈھب ناموں اور انوکھی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ رٹتا رہتا ہے۔

اکبر کے راج کے عبدالرحیم خاں، فتح اللہ شیرازی، شیخ مبارک، شیخ فیضی، شیخ ابوالفضل، شیخ عبدالقادر، شیخ سلطان، نقیب خاں، حاجی ابراہیم، مکھن خاں، جہانگیر کے راج کے شیخ شاہ محمد، ملا نوری، غواصی، عالمگیر کے راج کے ضمیر تھے، دانا، شیخ غلام مصطفیٰ، مولوی عبدالجلیل، سید نظام الدین،

سید رحمت اللہ، سید غلام نبی، سید برکت اللہ پیمی، یہ ان لوگوں میں سے گنتی کے کچھ لوگ ہیں جنہوں نے سنسکرت اور ہندی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا شیخ غلام مصطفیٰ کی سوجھ بوجھ کا کیا ٹھکانا ہے۔ بڑے بڑے ہندی جاننے والے اُن کے سامنے جھکتے اور چوٹی کے برہمن اُن سے ہندی کے گر سیکھا کرتے تھے۔ انہیں کی باتوں میں مولوی غلام علی آزاد لکھتے ہیں:۔

"علم ہندی بحیثیتے کہ اکثر براہمہ حل غوامض از خدمت شیخ می کردند۔ شعر ہندی نیز خوب می گفت۔ صنادید شعرائے ہندی درحضور او سر فرو می آوردند و اصلاح کبت و دوہہ می گرفتند۔"

شیخ ہندی ایسی جانتے تھے جو بہت سے برہمن ہندی کی گتھیاں سلجھانا ان سے سیکھتے، یہ ہندی چھند بھی بہت اچھی کہتے تھے۔ ہندی کے بڑے بڑے کوی ان کا لوہا مانتے تھے اور اپنے اپنے کبت اور دوہے انہیں دکھا کر ٹھیک کیا کرتے تھے۔

سید رحمت اللہ بھی ہندی کے بڑے کبیشر تھے۔ چنتامن ایک ہندو جس کے دوہوں کی بڑی دھوم تھی اور بڑے بڑے مانتے تھے۔ اسی کا ایک چیلا جانچنے کیلئے سید رحمت اللہ کے پاس آیا اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُس نے کبت اور دوہوں کی باتیں چھیڑ کر دھونس دینے کے لئے اپنے گرو کا کوئی دوہا کڑک کے پڑھا۔ انہوں نے سنتے ہی ایسی مین میکھ نکالی جسے چنتامن نے بھی مانا اور ایسا مانا جو اپنے ایک دوہے میں سید رحمت اللہ کو سراہا اور ان کی اچھائیوں کو پھیلا کے دکھایا۔

ان باتوں کی ہندی کی چندی دیکھنا ہو تو اس کے لئے سروآزاد کا دوسرا ٹکڑا دیکھنا چاہیئے۔ مولوی غلام علی آزاد نے سروآزاد کے دو ٹکڑے کئے ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں فارسی کہنے والوں کی رام کہانی ہے اور دوسرے میں ہندی کہنے والوں کی سبھا جمائی ہے۔

یہاں پہلے مسلمانوں کے راج کی گھٹ بڑھ ایسی رہی جیسے چلتی پھرتی چھاؤں۔ یہ جگہ کبھی ایک گھرانے کی راجدھانی بنی اور کبھی دوسرے کی۔ اس لئے کوئی ایک بولی نہ بن سکی۔ پھر بھی الگ الگ بولیوں کے بول ساتھ رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے سے ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہتے رہتے دھیان پر چڑھنے اور پنڈتوں کی پوتھیوں میں جگہ لینے لگے۔ مسلمانوں میں بہت سے سنسکرت پڑھ پڑھا کے مہا کبیشر اور گیانی پنڈت بن گئے۔ راجکمار دارا شکوہ کا اپنشدوں اور یوگ بششٹ پران کو فارسی کے سانچے میں ڈھالنا، خانِ خاناں کے اشلوک کون ایسا پڑھا لکھا ہو جو نہ جانتا ہو۔

مرزا خاں کی تحفۃ الہند:۔ کنور اعظم جاہ کے لئے مرزا خاں نے "تحفۃ الہند" لکھی اور لکھنے کا ڈھنگ ایسا سلجھا ہوا رکھا جس سے ایک ایک بات جی میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اس لکھت کے سات نمبر ہیں اور ان سات میں سے ایک نمبر بھی ایسا نہیں جو کٹھن نہ ہو۔ جیسے:۔ ۱۔ پنگل (عروض) ۲۔ تک (قافیہ) ۳۔ النکار (علم بدیع) ۴۔ سرنگار رس (عشق و محبت) ۵۔ سامدک (قافیہ) ۶۔ کوک (علم النسا) ۷۔ ہندی کی ایسی لکھت جس میں برج بھاشا کے بولے جانے والے بہت سے بول لکھ کے اُن کی ہندی کی چندی کی ہے۔

یہ بات بھی بڑے اچنبے کی ہے:۔ وہ عالمگیر جس کی ہٹ دھرمی اور چڑچڑے پن کا ڈھنڈورا پیٹا جا تا رہا ہے۔ اسی کے راج میں مسلمانوں نے برج بھاشا کو جتنا آگے بڑھایا، ہندی لکھتوں کو جتنے فارسی کے کپڑے پہنائے، برج بھاشا میں جتنی لکھتیں لکھ ڈالیں اس سے پہلے کبھی اس ڈھب پر برج بھاشا کی بڑھوتری نہیں ہوئی۔

سنسکرت اور برج بھاشا عربی میں:۔ یہ ایک نئی بات بھی دیکھئے:۔ عربی جسے سنسکرت اور برج بھاشا سے کوئی لگاؤ ہی نہیں اس میں تو سنسکرت اور برج بھاشا کی چیدہ چیدہ باتوں کا ڈھیر لگ جائے اور اردو کے پاس اس کے بول ہی بول رہیں اور کچھ ہاتھ نہ آئے۔ بات یہ ہے:۔ اب سے دو سو ساٹھ برس اُدھر تک اُردو بیٹی سمجھی جاتی تھی۔ آٹھوں پہر کی بول چال کیلئے اُسے رکھ لیا تھا۔ کچھ لکھنا لکھانا ہو تو اُس کے لئے فارسی تھی۔ رہیں ٹھوس لکھتیں وہ سب عربی میں لکھی جاتی تھیں۔

سُبحۃ المرجان:۔ سُبحۃ المرجان کے پرت کے پرت لوٹتے چلے جایئے۔ جگہ جگہ سنسکرت اور ہندی کی باتیں عربی کے بھیس میں دکھائی دینگی۔ ساتھ ہی ساتھ مولوی غلام علی آزاد لکھتے جاتے ہیں، یہ ہندی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی باتیں تھیں جو اب عربی کے سانچے میں ڈھال دی ہیں۔ جیسے:۔

ایک پریم کی پجارن اپنے پیارے کو پردیس جانے کی گھڑی پر نڈھال اور پردیس سے اس کا آنا سن کر چونچال ہو جانے کو یوں کہتی ہے:۔
جس گھڑی وہ جانے لگے میرا جی سنسنانے لگا اور میں ایسی دھان پان سی ہو کر رہ گئی جو کنگن ڈھیلے ہو کر آپ ہی آپ ہاتھ سے اتر کے گر پڑے

اور جب اُن کا آنا سُنا اور اُن اُترے ہوئے کنگنوں کو پھر پہننا چاہا تو اب وہ چڑھائے سے چڑھ نہیں سکتے تھے؛ اسی دھیان کو عربی میں یوں دُہرایا۔

لقد نحلت فی یوم راح حبیبھا الی ان ھوی من ساعدیھا سوارھا
ولما اتاھا مخبر عن قدومھا علیٰ ساعد الملآن ضاق سوارھا

ایسے ہی کوئی چنچل اپنے سوامی کے ہونٹوں پر کاجل کی کالک دیکھکر سمجھتی ہے کہیں کسی کا جل لگی آنکھوں کی پوجا سے یہ کالک لگی ہے۔ یہ سوچکر اپنے پتی سے کہتی ہے:۔ میں بتاؤں یہ تمہارے ہونٹوں پر کالک کہاں سے آئی اور کیسے لگی۔ کسی متوالی نے تمہارے ہونٹوں پر کاجل کا ٹیکا لگا کے اس لئے تمہارا مُنہ کیل دیا ہے جو تم کبھی مجھ سے بات نہ کر سکو، عربی میں اسے یوں ڈھالا ہے:۔

مالاح فی شفتیک کحل راق انی ابینہ بحسن بیان
ختمت علیٰ شفتیک ذات تدلل کیلا تکلمنی علی الاحیان

مولوی غلام علی آزاد جب اورنگ آباد میں تھے تو بلگرام سے اُن کے ماموں نے ہندی میں کچھ کہہ کے ان کے پاس بھیجا۔ اسی دھیان کو عربی میں انہوں نے یوں پھیلا دیا:۔

جائت سعاد بلا وعد فقلت لھا یا مرحبا بک من القاک فی التعب
قالت لقد جائنی غیم وکلفنی انی اجوب الیک الارض بالھدب
فقلت کیف طویت الارض ماشیۃ وقت الدجیٰ وسکوب للدمع من سحب
قالت ھدانی شعاع البرق مرحمۃ لمثلہ سرتہ فی القیعان والکثب
فقلت سیرک فی جنح الدجیٰ غلط بلا رفیق شریک فی حظی الطلب
قالت خیالک طول السیر کان معی فی حالۃ عن بحاہ العین لم یغب

ان سب کا نچوڑ یہ ہے:۔ سبے کہیں میری پیاری میرے پاس آئی۔ میں نے کہا تم پر دھن ہو۔ تم نے یہ کیوں کھکیڑ اُٹھائی۔ اُس نے کہا بادل جُھوم جُھوم کر اُٹھے اور تمہارے پاس آنے پر اُبھارا۔ میں نے کہا اندھیری رات اور مینہ برستے میں ڈگر کیسے دکھائی دی۔ بولی اپنی دیا سے بجلی نے اپنی چمک کو میرا ساتھی بنا دیا تھا۔ میں نے کہا اندھیری رات میں بے ساتھی کے یوں چلے آنا تو ٹھیک نہ تھا۔ اٹھلاکے بولی اکیلی کیوں آنے لگی، تمہارا دھیان جو کبھی پاس سے نہیں ہٹتا اور آنکھوں سے اوجھل ہی نہیں ہوتا وہی تو میرے ساتھ ساتھ تھا۔

چوڑیاں، کنگن، کاجل، مِسّی، بھلا عرب میں کہاں۔ یہ سب کے سب ہندی دھیانوں کے ڈھانچے ہیں جن پر عربی کی کھال چڑھی ہوئی ہے اور یہ دھیان آپ بتا رہے ہیں:۔ ہمارا جنم بھوم کون سی جگہ ہے اور ہم سب کس پیڑ کی ٹہنیاں ہیں۔

ہند، ایران، عرب میں چاہت کے الگ الگ ڈھب: پریم، پیار سنسار کا کونسا ایسا کونا ہے جہاں یہ نہ ہو۔ پھر بھی اس کا رُوپ جگہ جگہ الگ دکھائی دیتا ہے۔ جیسے:۔ ہمارا دیس۔ یہاں پریم کے دُکھ سُکھ کی بانسری پریم کی پجارن بجاتی ہے۔ بِرہا کی آگ میں جب یہ پھکتی ہوتی ہے تو اس کے مُنہ سے ایسی چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں جو سُننے والوں کو بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتیں اور جب یہ سکھ چین کے جھولے میں جھولتی ہوئی پریم کی ملار گاتی ہے تو سننے والے جھومنے لگتے ہیں۔ اس کے مُنہ سے نکلے ہوئے لچیلے اور میٹھے بول ایسے ہوتے ہیں جیسے دودھ میں کھانڈ گھول دی ہو۔ اس پر بھی پتے کی باتیں کھل کر نہیں دبا دبا اور چبا چبا کے ایسے ڈھب سے کہتی ہے جیسے کوئی اس ڈر سے جو کوئی دوسرا نہ سُن پائے۔ اِدھر اُدھر دیکھکر گھُم گھُم میں سب کچھ کہہ جائے۔

عرب میں پریم کی پجارن نہیں ہوتی۔ پجاری ہوتا ہے۔ وہاں یہ کہانی کوئی کہتی نہیں۔ کہتا ہے اور اس ڈھب سے کہتا ہے جس میں اپنے منچلے پن کی جھلک بھی نہ جانے پائے۔ یہ کسی بات کو چبا چبا کے نہیں کہتا۔ اسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے اور جب تک جی کی بھڑاس نہ نکلے چپ نہیں ہوتا اور نچلا نہیں بیٹھتا۔

امرا القیس جو عرب میں پریم کا جوگی ہوا ہے۔ کسی الّھڑ سے اپنے چُھپ چُھپ کے ملنے کی باتیں ایسے ڈھنگ سے کہتا ہے، جس سے اُسکا سورما ہونا بھی چُھپا نہ رہے:۔

وبیضۃ خدر لا یرام خباءُہا تمتّعت من لہوٍ بہا غیر معجل

ایسی گوری چٹی البیلی جس کی راؤٹی تک بھی کوئی نہیں پھٹک سکتا تھا، گھنٹوں میں اسی سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا ہوں۔

عرب اور ہندان دونوں سے ہٹ کر ایران نے چاہت کی ایک نئی ڈگر نکالی۔ وہاں "کہتی ہے" کا تو کہیں پتا تک نہیں۔ جو بھی ہے وہ "کہتا ہے" "اس جگہ کے پریم میں "کہتی ہے" اور "سنتی ہے" کیلئے کچھ تھوڑی سی بھی جگہ نہیں دکھائی دیتی۔ "کہتا ہے" سے پورا لٹریچر بھرا پڑا ہے۔ دونوں ایک ہی سے آپس میں کھُل کھیلتے ہیں اور جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ ڈھٹائی سے کہتے ہیں۔ گھر میں، باہر، میلوں میں، سبھاؤں میں، لڑائی بھڑائی میں، اندھیرے اجالے میں جدھر دیکھئے لونڈے ہی لونڈے دکھائی دینگے اور یہ وہ دھبا ہے جو فارسی لٹریچر سے جا نہیں سکتا۔ یہی دھیان اتنا آگے بڑھا جو بڑے بڑے لوگ شوالوں اور پاٹ شالوں میں لونڈوں کو گھورنے جانے لگے اور یہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کس ڈھٹائی سے کہتے ہیں:۔

لے دلِ عشاق بدامِ تو صید ہمہ من بتو مشغول و تو با عمرو زید

ایران کے کبیشروں میں سے بھی کبھی کسی کسی نے جہاں اپنے منہ میاں مٹھو بن کر اپنے آپ کو سراہا ہے وہاں اپنے منہ سے سجیلا، چھبیلا، پیار کرنے کے گُوں کا اپنے آپ کو کہا ہے۔ جیسے عرفی اپنے کو اپنے، اپنے چھندوں، دوہوں کو سراہتے سراہتے اپنی سندر مورت کو بھی سراہتا ہے اور کہتا ہے:۔

سر برزدہ ام بامہ کنعاں ز یکجیب معشوق تماشا طلب و آئنہ گیرم

میگویم و اندیشہ ندارم ز ظریفاں من زہرہ را مشگم و من بدر منیرم

کہنے کو تو یہ کہہ دیا۔ پر، جی میں چور تھا اور جانتا تھا لوگ سنکر کیا کہیں گے اور کیسی ہنسی اڑائیں گے اس لئے پہلے ہی سے کہتا ہے "میگویم و اندیشہ ندارم ز ظریفاں"۔ "مہ کنعاں" سے ٹکر لینا اور اپنے آپ کو پیار کرنے کے گُوں کا پتا نا بُرا سہی۔ پر اتنا بُرا نہیں جتنا ایک بھلے مانس کا ناچنے اور تھرکنے والی کنچنی بننا۔ نہ جانے یہ دھیان ایک ایران والے کو آیا کیسے۔

عرب اسلام سے پہلے۔ عرب، ایران، ہندان میں سے کونسی جگہ والوں نے اپنے جی کی باتیں فراٹے سے کہیں۔ اسلام سے پہلے عرب بڑے اجڈ، بڑے اکھڑ، ہتھ چھُٹ، منہ پھٹ اور اُٹھاؤ چولہا سے تھے۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ جہاں ڈیرے بھرے ہوئے ملے وہیں ڈیرے ڈالدئے۔ ان کے دیس میں جدھر دیکھئے ریت کے ٹیلے اور ببولوں کے جھنڈ۔ کھانے کے لئے کھجوریں۔ پینے کے لئے گدلا پانی اور اُونٹنیوں کا دودھ، کھاؤ۔ اور بیوا ایسے کہ وہ وہ جو بھی ملی وہ چٹ کر گئے۔ ڈھب ڈھب شروے میں چوری ہوئی موٹی موٹی روٹیاں جسے "ثرید" کہتے ہیں۔ یہ اُن کا اچھے سے اچھا کھانا تھا۔ جب لہر آگئی تو جی بہلانے اونٹنی پر چڑھ اپنے پڑاؤ سے کوسوں آگے نکل گئے۔ کہیں کسی گھرانے کی الھڑ لڑکیاں آپس میں چھُلیں کرتی، کُودتی پھاندتی، ہنستی بولتی دیکھ لیں تو اب کیا تھا دھم سے کُود پڑے اور کسی آڑ سے لگے تاک جھانک کرنے۔

عرب کا پریم۔ ہرنیوں کی ڈار آہٹ پا کے پہلے چوکنا سی ہوئی اور پھر کسی کو گھورا گھاری کرتے دیکھکر چھلانگیں مارتی، چوکڑیاں بھرتی یہ جا وہ جا، دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں اور یہ وہیں ٹھٹک کے رہ گئے اور جو اُس پرے میں سے کسی سے کبھی کی جان پہچان نکل آئی تو پھر وہیں آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے اور پھبتیاں ہونے لگیں۔ اسی چھیڑ چھاڑ میں جو دھیان آیا تو جس اُونٹنی پر چڑھ کے آئے تھے اُسی پر چھُرا نکال کے پل پڑے اور گھڑی بھر میں تکا بوٹی کر کے ڈالدی۔ بڑے بڑے ٹکڑے اور بڑے بڑے مچھے آگ پر بھون بھون کے ہنس ہنسکر آپ بھی کھائے اور اُس پورے پرے کو بھی کھلائے جس سے آنکھیں سینکی جا رہی تھیں۔ یہ جو بھی ہوا اپنے چھندوں میں جوں کا توں اُسی بھی ...لے آئے۔

ان کا چڑچڑا پن ایسا جو بیٹھے بٹھائے آپ ہی آپ اینٹھتے، اکڑتے اور جو کوئی ٹوکتا تو لڑ پڑتے۔ لڑنا لڑانا، مارنا مرنا تو اُن کی آئے دن کی باتیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اڑنے اور جھنے سے ایسی لڑائیاں چھڑ جاتیں جو برسوں رہتیں اور ایسی باتیں برس پیچھے عکاظ کے میلے میں بڑے گھمنڈ سے سناتے اور پہروں جھومتے۔ بُری گھڑی پر سات دینے والے ایسے جو کوئی مارا کھدیڑا کسی گھرانے میں آ کے چھپ چھپا گیا تو وہ پورا گھرانا ڈھال بنا اس کے سامنے چھاتیاں تانے دن رات چوکسی کرنے لگا اور وہیں ڈٹ گیا۔ اب چھپے ہوئے پہ ہاتھ ڈالنا کیسا۔ پہلے ان سب سے کوئی نبٹ لے تو جب کہیں وہ ہاتھ لگے۔ عرب کے راج والوں نے دیس کے کبیشروں سے کتنا کتنا اپنے سراہنے کو کہا اور کیسا کیسا لالچ دیا۔ پر کسی ایک نے بھی

کبھی اس کی ہامی نہ بھری اور جھٹ سے منہ پر کہدیا۔ پہلے کچھ کرکے دکھاؤ۔

یہ کسی سے دبنا اور جھجکنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ بات بات میں ہم ایسے، ہمارا گھرانا ایسا، ہمارے لڑکے بالے ایسے۔ ان کی ہماہمی، اکڑ مکڑ، بپھرنا، للکارنا دیکھنا ہو تو اس کے لئے حماسہ اٹھا لیجے یہ دکھائی دیگا جیسے امڈتا ہوا بادل اپنی بھیانک گرج اور کڑک کے ساتھ بڑھتا ہوا چلا آتا ہے۔

اسلام سے پہلے کے کوی عمرو بن کلثوم نے یونہی سی بات پر اپنے یہاں کے ایک بڑے راج والے عمرو بن ہند کو مار ڈالا۔ دونوں گھرانوں میں بڑا رن پڑا، سینکڑوں مارے گئے، ہزاروں ادھ موئے ہوئے۔ یہ بیچ بچا کے نکل آیا اور اس پر کچھ آنچ نہ آئی۔ عکاظ کے میلے میں انہیں باتوں کو چھندوں میں لاکر بڑے گھمنڈ سے سنایا۔ ان میں سے کچھ یہاں لکھے جاتے ہیں۔ اس کا بپھرنا دیکھیے۔

الا لا یجھلن احد علینا فنجھل فوق جھل الجاھلینا

دیکھو۔ کوئی ہم سے اکڑے نہیں۔ یہ سمجھ لو۔ ہم اجڈوں سے بڑھکر اجڈ ہیں۔

بانا نورد الرایات بیضا ونصدرھن حمرا قد رونیا

لڑائی بھڑائی میں ہم اجلے جھنڈے لیکر جاتے ہیں اور لال کرکے پلٹتے ہیں۔

اذا بلغ الفطام لنا صبی تخر لہ الجبابر ساجدینا

ہمارے گھرانے میں جب لڑکے کی دودھ بڑھائی ہوتی ہے تو جبھی سے بڑے اونچے گھرانے والے اسکے آگے منہ کے بل گر پڑتے ہیں۔

یہیں کا ایک اور شورما کہتا ہے:۔

ومن یفتقر منا یعش بحسامہ ومن یفتقر من سائر الناس یسأل

جب ہم میں سے کسی کے پاس کچھ نہیں رہتا تو وہ تلوار کے بل پر جیتا ہے۔ اور دوسرے گھرانے والوں میں سے جب کسی کے پاس کچھ نہیں رہتا تو وہ بھکاری بنجاتا ہے۔

وانا لنلھوا بالحروب کما لھت فتاۃ بعقد او سخاب قرنفل

گھمسان کی لڑائیوں سے ہم ایسا کھیلتے ہیں جیسے لڑیوں اور ہاروں سے لڑکی کھیلتی ہو۔

ان کی ہماہمی، ان کا کس بل، ان کی آن بان، ان کی اکڑ مکڑ پریم کی سبھا میں آکر بھی ویسی ہی رہتی ہے۔ انہوں نے پیار، پریم پر بھی جو کچھ کہا اس میں بھی جگہ جگہ منچلے پن کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ عرب اپنی جیتی سے ہنسنے بولنے اور چھیڑ چھاڑ میں بھی اپنا سورما ہونا نہیں بھولتا، اور باتوں باتوں میں اسے بھی جتا دیتا ہے۔ تو اس کی پریم کی کہانی بھی لڑائی بھڑائی کی ڈپٹ اور للکار سے الگ نہیں ہونے پاتی۔

ایران کی چاہت۔

بابل، نینوا، مصر، کو چھوڑ کر دیکھئے تو ایران بھی بڑی پرانی راجدھانی دکھائی دیگی۔ جہاں برسوں سے سکھ چین کے ہنڈولے میں لوگ جھولتے رہے ہوں، دیس کا دیس پھولوں سے پٹا پڑا ہو، جہاں کا کونا کونا پڑا مہکتا ہو، وہاں کی سی ٹیپ ٹاپ، سجوٹ، بال کی کھال نکالنا، چھوٹی سی بات کو پھیلا کے آگے بڑھانا، رائی کو پہاڑ بنانا یہ باتیں دوسری جگہ نہیں آسکتیں۔ راج کا بڑھنا اور پھیلنا ہی بانکپن، سجوٹ، بات کا بتنگڑ بنانا اور بات بات میں مین میکھ نکالنا سکھا دیا کرتا ہے۔

یہاں کے کبیشروں نے بڑی دھوم دھام کے کبت اور چھند لکھے۔ نئے نئے دھیان ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکالے۔ اچھوتی اچھوتی باتوں کی ٹوہ میں لگے رہے۔ یوں ہی سی بات کو پھیر دے دلا کے نئے نئے ڈھنگ سے کہا۔ پریم اور پیار کی باتوں پر لکھ لکھ کر ڈھیر کے ڈھیر لگا دیے اور ان میں سے کچھ اتنے اونچے اڑے جو دھیان کی آنکھوں سے بھی اوجھل ہو گئے۔ پر جانچنے بیٹھیے تو ان کی چھندوں کا ڈھیر ایسا دکھائی دے گا جیسے یہ کسی اور سنسار کا سپنا دیکھ کے چونکے ہیں اور جو سماں دیکھ آئے ہیں وہی دوسروں کو دکھا دینا چاہتے ہیں۔ اسی کا پرچھاواں ہماری اردو پر بھی پڑا اور اس کے چھند اور کبت بھی اسی کے سے ہو کے رہ گئے۔

منچلے پن پر بھی فارسی کی اتنی لکھتیں ملیں گی جنہیں گننا دوبھر ہو جائے۔ پر عربوں اور ایرانیوں میں بڑا الٹ پل ہے۔ انہوں نے جو باتیں کہیں وہ آپ بیتی۔ عربوں کی آئے دن جن باتوں سے مڈبھیڑ رہتی اور جو یہ آپ کرتے انہیں کو جوں کا توں کہہ دیتے تھے۔ ایرانیوں نے دوسروں کی باتوں کو

ایسا بڑھا چڑھا کے کہا جیسے یہ آپ بیتی ہیں۔

فردوسی کا شاہنامہ پڑھیے۔ اس میں کوئی سبھا دکھائی دیتی ہے تو اس کی سجاوٹ، لوگوں کے بیٹھنے کا ڈھنگ، ان کی بات چیت ایک ایک بات ایسی دکھائی دے گی جیسے وہ پوری سبھا آنکھوں کے سامنے ہے اور کہیں لڑائی کا سماں ہے تو ڈھالوں کی گھنگھور گھٹاؤں کا اٹھنا رہ رہ کے تلواروں کی بجلیوں کا چمکنا، گھوڑوں کا سرپٹ دوڑنا، لہو کے دریاؤں کا بہنا، ادھ موؤں کی چیخ پکار، ہتھیاروں کی جھنکار، اور سپاہیوں کی للکار سے آنکھوں کے آگے سماں بندھ جاتا ہے گا۔ پر فردوسی کی یہی باتیں آپ بیتی ہوتیں تو اس آگ کی چنگاریاں نہ جانے کہاں تک پہونچتیں۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ایران والوں کو بات کا بتنگڑ بنانا ہی آتا ہے۔ نہیں۔ انہوں نے جچی تلی اور اچھوتی کٹھن لکھتوں کے بھی ایسے ڈھیر لگا دئے جو عرب اور ہند میں نہیں اور کچھ ہوں بھی تو لکھنے کا وہ ڈھچر کہاں۔

ہند کا پیار۔ اب رہا ہند تو اس نے بھی نہ جانے کتنوں کی آنکھیں دیکھیں۔ کس کس کی آؤ بھگت کی، کس کس کا آگا تاگا لیا۔ ہندوستان کی اگلی باتوں میں پہلے پہل آریوں کا اس دیس میں آنا اور یہاں کے اندھیرے گھپ میں اپنی سوجھ بوجھ کا اجالا پھیلانا ابتک سب مانتے چلے آتے تھے۔ ٹوہ لگانے والے کبھی نچلے نہیں بیٹھتے اور آٹھوں پہر نئی بات نکالنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ رائے بہادر دیا رام جی، اور آر ڈی بنرجی برسوں انہیں مانی ہوئی باتوں سے کترا کے نکلنے اور آگے بڑھنے کی ادھیڑ بن میں رہے۔ پہلے تو کچھ سجھائی ہی نہیں دیا اور ہر بچھ کے وہی ڈگر سامنے رہی جس سے کترا کے نکلنا چاہتے تھے۔ آٹھ دن کے سوچ بچار اور لگاتار دھیان کے گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے اتنا تو ہوا جو کچھ مٹی مٹی اور دھندلی دھندلی سی پرچھائیاں سامنے آنے لگیں۔ پھر ٹکٹکی باندھنے سے ان کا دھندلاپن اجاگر ہو کر دھیان سے دوچار ہونے لگا اور پہلا سا اندھیرا جا کے کچھ کچھ اجالا پھیلتا دکھائی دیا جس سے ڈھارس بندھی۔

دھیان اسی سوچ بچار کی لاٹھی ٹیکتا اور ادھر ادھر ٹٹولتا ہوا وہاں تک پہونچ گیا جہاں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیر کچھ چھپاتے ہوئے پڑے تھے۔ یہ دیکھ کر سرجان مارشل اٹھے اور انہیں کے کہنے پر ۱۹۲۲ء سے سندھ اور راوی کی گھاٹیوں میں کھدائی کا لگا لگا۔ اور جب ان کھدائیوں کی گہرائیوں نے ہزاروں برس کے دبے دبائے "موہنجو دارو" اور "ہڑپا" جیسے دو بڑے نگر اگل دئے جن میں بڑے بڑے گھر، پتھر کی چوڑی چوڑی سڑکیں، ٹاؤن ہال، اشنان گھر، ڈھکی ہوئی پتھر کی موریاں اور وہ سب باتیں جو بڑی راجدھانیوں میں ہوا کرتی ہیں تو دڑاوڑی راج پاٹ کے کاٹ کباڑ کی مٹ بھیڑ سے دیکھنے والے بھونچکا ہو کر رہ گئے اور اب تک کی مانی ہوئی باتوں کی لڑیاں بکھر گئیں۔

پردیسی دڑاوڑی۔ اس سے پہلے دڑاوڑی جتھے کو یہیں تک سمجھا جاتا تھا۔ ان کھدائیوں سے جو کچھ نکلا اس کی چھان بین کرتے کرتے پتا چلا۔ یہ دڑاوڑی بھی دیسی نہیں پردیسی ہیں جو آریوں سے بہت پہلے یہاں آئے اور یہیں رہ پڑے۔ آریوں کے ادھر آنے سے تین چار ہزار برس پہلے اسی دڑاوڑی جتھے کا یہاں ایسا راج پاٹ پھیلا ہوا تھا جس سے آریوں نے بھی بہت کچھ لیا اور سیکھا۔ تو اب دیس کی کہانی میں آریوں کی جگہ دڑاوڑیوں نے چھین لی اور اس دوڑ میں آریہ پیچھے رہے اور دڑاوڑی آگے نکل گئے۔

یہاں یہ کب آئے اور کہاں سے آئے اس کی بہت کچھ چھان پھٹک ہوئی اور ہو رہی ہے۔ پھر یہ باتیں ہیں اتنے پہلے کی جہاں اٹکل کا ہاتھ بھی نہیں پہونچتا۔ اس گھڑی میں یہ ہوا اور اس برس میں یہ۔ گھڑیوں اور برسوں کی گنتی گنوانے کے ساتھ ساتھ تو آریوں کی بھی پوری باتیں پھر دوسروں سے نہیں کہی جا سکتیں۔ دڑاوڑی تو آریوں سے بھی کئی ہزار برس پہلے کے آئے ہوئے ہیں۔ بھلا اتنی پرانی باتیں ہاتھوں کی لکیریں کیسے بن سکتی ہیں۔ اس پر بھی پتہ چلانے والوں نے کچھ نہ کچھ کھوج لگا ہی لیا۔

اس جتھے کا جنم بھوم ابھی تک چھپا ہوا ہی۔ پر بہت سی باتوں سے دڑاوڑیوں کا پچھم سے دھاوا کر کے ہندوستان میں گھس آنا پایا جاتا ہے۔ وہ "بروہی" گھرانے جن کا بلوچستان میں جال سا بچھا ہوا ہے اور جن کی بہت سی باتیں گڈمڈ ہو جانے سے وہ ایران کے سانچے میں ڈھل کے رہ گئے ہیں۔ پر ان کی بول چال اور بات چیت ابھی تک کسی میل اور ملاوٹ سے بچی ہوئی وہی دڑاوڑی بولی ہے جو "بروہی" گھرانے والے بولتے ہیں۔ ٹوہ لگانے والوں نے اسی سے دڑاوڑیوں کا پچھم سے ہندوستان آنے کا پتا لگایا۔

---

[1] یہ باتیں یہاں پھیلا کے نہیں لکھی جا سکتیں۔ ان کے لئے سرجان مارشل کی لکھت کا پہلا ٹکڑا دیکھنا چاہیے۔

آج دڑاوڑی سکڑے سمٹے ہوئے دکھن میں جو دکھائی دے رہے ہیں پہلے ایسے نہ تھے۔ جب یہ ہندوستان آئے ہیں تو اُتر کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر پھیلے۔ کنبوں، گھرانوں اور بولیوں کے جانچنے والے ہند کے پورے ٹاپوؤں میں اُن کا پھیلاؤ اور ریل پیل بتاتے ہیں۔ جن میں پنجاب، سندھ اور بلوچستان بھی ہیں۔ ہند کے پورے ٹاپوؤں پر بسنے والے گھرانوں اور ان کی بولیوں پر دڑاوڑیوں کے راج کی پوری دھوپ پڑی اور یہ رنگ ان پر گہرا چڑھا۔

ہند کے نرمے دیسی۔ یہاں کے نرمے دیسی کالے کلوٹے، ٹھنگنے، چوڑی ناک والے ہیں اور یہی باتیں دیسیوں کو پردیسی دڑاوڑیوں سے الگ کردیتی ہیں۔ جب تک "ہنجو دارو" اور "ہرپا" مٹی میں دبے پڑے رہے تب تک مصر، عراق، اسوریا کی باتیں بہت پرانی سمجھی جاتی تھیں۔ پر۔ ان کھدائیوں سے ہندوستان بھی اپنے راج میں ان جگھوں کے لگ بھگ دکھائی دینے لگا اور اس دوڑ میں یہ کسی سے پیچھے نہ رہا۔

باہر سے آریوں کا آنا۔ دڑاوڑیوں کے بہت پیچھے یہاں آریا آئے۔ یہ کون تھے، کہاں سے آئے اور کب آئے اسے دھیان کی آنکھوں سے دیکھنا پڑے گا۔ پہلے پہل جب ایک جگہ رہنے سہنے والوں کی پود آگے نہیں بڑھی تو سب مل جل کے ایک ہی جگہ رہتے بستے تھے۔ جب ان میں دن دونی رات چوگنی بڑھوتری ہونے لگی اور نئی پود یہاں نہ سما سکی تو یہ اپنا الگ ٹھکانا بنانے اور پیٹ پالنے کیلئے اپنے بڑے بوڑھوں کے رہنے سہنے کی جگہ چھوڑ کر آگے بڑھی۔ آگے بڑھنے میں جونسی جگہ اسے اچھی لگی وہیں ڈیرے ڈال دئے اور وہیں رہ پڑے۔ جب یہاں والوں کی پود کی ریل پیل بھی یہاں نہ سما سکی تو یہ لوگ بھی یہاں نہ ٹک سکے اور اپنا پڑاؤ چھوڑ چھاڑ نکل کھڑے ہوئے۔ بڑھتے بڑھتے کالے کوسوں پہونچے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ایسے ہی جگہ جگہ جتھے کے جتھے اور گھرانے کے گھرانے اِدھر اُدھر بڑھ بڑھا کر پورے سنسار میں پھیل گئے۔

گھرانوں، کنبوں کی چھان بین کھوج لگانے والے بولیوں سے کیا کرتے ہیں۔ جو بولیاں اب بولی جا رہی ہیں انہیں جانچنے بیٹھئے تو بولیوں کی بناوٹ کو دیکھتے ہوئے ان کے تین گھرانے دکھائی دیں گے۔ جن میں بڑا گھرانا وہ ہے جسے آریائی کہا جاتا ہے، جو بولیاں ہندوستان، ایران، ترکستان، یونان، روم اور اسکینڈ نیوی راجدھانیوں میں بولی جاتی ہیں وہ آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ پرانی فارسی اور سنسکرت یہ دونوں کی دونوں ایک سی ہیں۔ جگہ جگہ اوستا اور رگوید کے ٹکڑے کے ٹکڑے ملے جلے ایک سے دکھائی دینے سے تاڑنے والے تاڑ گئے اور کہہ اٹھے ایسی بولیاں بولنے والے پورے جتھے جو ہندوستان سے اوقیانوس کے پنگھٹ تک پھیلے ہوئے ہیں یہ سب کے سب ایک ہی ہیں جو کبھی ایک ہی جگہ رہتے سہتے چلے آتے تھے جب ان کی پود بڑھی اور بڑھوتری پیٹ بھرنے میں رکاوٹ ڈالنے لگی تو ان میں سے جتھے کے جتھے پیٹ پالنے کیلئے اپنے جنم بھوم سے کالے کوسوں جا کے بس گئے اور اپنی بولی بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔

پرانی پرانی لکھتیں جیجوں، سیجوں کے پنگھٹوں کو آریوں کا جنم بھوم نہیں بتاتیں۔ ان کا جتھا اسی پرانی راجدھانی ایران کی ایک ٹہنی ہے جسے آپس کی تو تو میں میں اور آپا دھاپی کے جھگڑے نے ایران سے اکھیڑ کے جیجوں، سیجوں پر لا کے ڈال دیا۔ اور پھر اس دیس میں لا کے لگا دیا جس کے پھاٹک پر ہمالیا سا مہا دیو نجانے کب سے کھڑا دیس کی چوکسی کر رہا ہے۔ یہ نرا دھیان کا گورکھ دھندا نہیں سنسکرت اور پرانی فارسی کے بولوں کا ملا جلا ہونا، آریوں اور ایرانیوں کے تہواروں کا ایک سا ہونا، یہی باتیں ٹوہ لگانے والوں کو ایرانیوں اور آریوں کے ناتا جوڑنے پر اکساتی رہیں۔

تو جیجوں، سیجوں کے پنگھٹوں سے اٹھ کر مسلمانوں سے پہلے دیس میں آریا آئے اور ان کے پیچھے پیچھے مسلمان۔ جن کے راج نے اس بن کو کاٹ چھانٹ کے پھلواری بنا دیا۔ یہاں جو پریم کی باتیں اور چاہت کی گھاتیں ہوئیں وہ یہیں کے لئے ہیں۔ جس منہ کی گھر کی اور جھڑکی بھی امرت میں ڈوبی ہوتی ہو، ایسے منہ سے جی موہ لینے والی پیار کی باتوں اور اس کی پہل کرنے کی مٹھاس کا کیا ٹھکانا ہے۔ یہ بات دوسری جگہ نہ آسکی۔ اور کیسے آسکتی ہے، جب سارا دیس پریم نگر بن گیا ہو تو پریم نگر کا سا سماں اور جگہ کہاں، یہ لوچ، یہ تڑپ، یہ رسیلا پن، یہ مٹھاس، یہ روپ، یہ تیکھا پن جو یہاں کے چھندوں، گیتوں اور دوہوں میں ہے وہ ایسا ہے جس کا کوئی اور چھوڑ نہیں۔

ندی کا چڑھاؤ اور باتوں کا بہاؤ ایک سا ہے۔ بات میں سے بات نکلی چلی آئی اور میں جو کہہ رہا تھا اس سے آگے بڑھ گیا۔ اس سے پہلے

مَیں یہ دکھا رہا تھا۔ سنسکرت اور ہندی کی انمول باتیں مسلمان جہاں دیکھتے جھٹ سے انہیں اپنی عربی میں لے آتے تھے۔ یہاں کے لٹریچر کی مسلمانوں نے کیسی آؤ بھگت کی۔ اس کی ایک ایک بات کو کیسے سینت سینت کے رکھا۔ اپنے دھرم کی بولی عربی میں اس کا کیسا پرچار کیا۔ یہ سب کچھ دیکھکر ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم اور کٹر سے کٹر بھی مسلمانوں کو کبھی ہٹ دھرم نہیں کہہ سکتا۔

جیسے مسلمانوں نے کیا ایسے ہی یہاں سچے من والوں اور اچھائی پر مٹے ہوؤں نے اپنے دوہوں، ساکھیوں، گرنتھوں میں مسلمانوں کی بولی کے بہت سے بولوں کو جان بوجھ کے جگہ دی اور جگہ جگہ انہیں ایسا کھپایا جس سے اپنایت کا پتا ملے۔

اکبر سے پہلے تو یہاں بر دھوں دھوں رہی۔ اس کے راج میں لوگ ٹھکانے سے بیٹھے اور سکھ چین سے دن کاٹنے لگے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں گاڑھی چھننے لگی اور یہ دونوں کے دونوں مل ملا کے ایک ہو گئے۔ راج کی دیا کے بادل امنڈ امنڈ کر اٹھے اور لوٹ لوٹ کر برسے۔ راج کی سبھا میں فارسی کے کنول جل رہے تھے اور ایسا ہی اجالا اوروں کو بھی اچھا لگتا تھا۔ کایستوں نے تو سکندر لودھی ہی کے راج میں فارسی پڑھ پڑھا کے کچہریوں میں گھس پل کر اپنے لئے جگہ نکال لی تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی اور جتھے بھی اسی للک میں ادھر ڈھل آئے۔

مسلمانوں کے ساتھ آئے دن رہنے سہنے اٹھنے بیٹھنے سے ہندوؤں کو فارسی کا ایسا چسکا پڑا جو یہ ادھر ہی کے ہو رہے۔ کسی بولی کو یونہی سا جاننا، بولنا اور سمجھ لینا جاننا نہیں کہلاتا۔ جاننا اسے کہتے ہیں جو اس بولی کے لٹریچر پر پورا چھا جائے۔ جونسی بولی بھی ہو اس کے بولنے والوں (جنہیں اہلِ زبان کہتے ہیں) کے ساتھ رہنا، بات چیت کرنا، اُن کی بول چال کو کان دھر کے سُننا۔ نئی بولی سیکھنے کا بڑا گر یہی پہلے تھا اور آج بھی یہی مانا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کی بھلمنسات سے اُن کی سبھاؤں، تہواروں، میلوں میں ساتھ ساتھ رہتے رہتے ہندو بھی یہ چلتا ہوا منتر سیکھ گئے اور اس ڈھب کو ایسا پا گئے جس سے فارسی کی گہرائیاں ناپنے اور اس کی جانچ پرتال کرتے کرتے بڑے آکھے ہو گئے۔ یہی آکھا پن آگے بڑھا اور اسی نے انہیں فارسی میں مسلمانوں کی ٹکر کا بنا دیا۔ جب اس بولی میں یہ منجھ منجھا گئے تو بہت سی چھوٹی بڑی لکھتیں انہوں نے فارسی میں لکھ لکھا ڈالیں جیسے:۔

لب التواریخ، تاریخ شاہان ہند، تاریخ فرمانروایان ہنود، خلاصۃ التاریخ، سلطان التواریخ، تاریخ آصفی، تاریخ دلکشا، تاریخ کشمیر، خلاصۃ الہند، تاریخ سورت، فتوحات عالمگیری، نظارۃ السند، مخزن العرفان، واردات قاسمی، گوالیار نامہ، چار گلشن، قسطاس، سعید نامہ، تذکرۃ الامرا، سفینۂ عشرت، شام غریباں، سفینۂ خوشگو، سفینۂ ہندی، حدیقۂ ہندی، گل رعنا، امیر نامہ، ہمیشہ بہار۔

گرامر میں نوادر للصادر، بہار علوم، ہفت گل اور ڈکشنری میں گردھاری لال جی کی گنج لغات، پنڈت گنگا بشن کی شیر و شکر، سیالکوٹی مل وارستہ کی مصطلحات الشعرا، ٹیکچند بہار کی بہارِ عجم اور ابطالِ ضرورت۔ پرانے پڑھے لکھوں میں سے کون ایسا ہوگا جو انہیں نہ جانتا ہو۔

فارسی کی چاٹ نے ہندوؤں میں سے بہت سوں کو کوی اور کبیشر بھی بنا دیا۔ یہ اتنے ہیں جو گنے بیٹھیے تو گنتے گنتے آپ تھک جائیں گے۔

فارسی کے رسیا ہندو:۔ رائے منوہر لال منوہر، چندربھان برہمن، ایسری داس آرام، لالہ اوجاگر اُلفت، راجا پیارے لال اُلفتی، راجا امانت رام امانت، لال چند آتش، گوہر لال تفتہ، رائے امر سنگھ خوشدل، لالہ کالکا پرشاد موجد، لالہ فتح چند تشنہ۔ دھیان کی پوتھی سے گنتی کے یہ کچھ نام یہاں لکھ دئے۔ ٹوہ لگانے سے ایسے سینکڑوں ہزاروں فارسی کہنے والے ہندو آپکو مل سکتے ہیں۔

بات چھڑ گئی ہے تو ان کے فارسی کہنے کا ڈھب بھی دیکھ لیجئے اور جانچئے یہ لوگ فارسی میں کیسے منجھ گئے تھے۔ وہ ہندو جو کبھی فارسی پر کہنا تو بڑی بات ہے اس کے دو ڈھائی بول بھی ٹھیک نہیں بول سکتے تھے۔ کچھ ہی برسوں میں ان کی کایا پلٹ ہو گئی اور ان کے چھندوں میں ایرانیوں کا سا بانکپن، بات میں سے بات نکالنا، بولوں کی جرأت، دھیان کے ستھرے پن کی جھلکیاں دکھائی دینے لگیں۔ یہ سب ایکے کا کیا دھرا ہے۔ مسلمان اپنے راج کے گھمنڈ میں ہندوؤں کو مُنہ نہ لگاتے اور ہندو ڈر سے ان کے پاس نہ پھٹکتے تو یہ بات کہاں ہو سکتی تھی۔ اچھا اب انکے کچھ چھند سنیے:۔

لال چند آتش:۔

رُوحِ جمشید بر در شک بہ مینوشی ما	کہ لب یار بود مایۂ بے ہوشی ما
جائے رحم است خدا را نتواں کرد دریغ	ہست وابستۂ تیغ تو سُبکدوشی ما

رائے منوہر لال منوہر:۔

روز یکہ سموم حشر افزوں گردد	در آتشِ غم چو چہرہ گلگوں گردد

ما، در دوزخ چناں بذوقے سوزم — کز رشک دل بہشتیاں خوں گردد

چندربھان برہمن۔ کنم زسادہ دلی بند دیدہ مژگاں را — بہ مشت خس نتواں بست راہ طوفاں را

لالہ فتح چند منشی۔ نیست آسائش بمنزل جان از خود رفتہ را — ہر قدم دامست نقش پا شکار جستہ را

بسکہ از شرم تو در پرواز رنگ گلشن است — رشتہ نظارہ بند و در ہوا گلدستہ را

لالہ کالکا پرشاد موجد۔ رسائی نیست تا سر منزل او کفر و ایماں را — کہ دیر و کعبہ سنگ رہ بود گبر و مسلماں را

رائے امر سنگھ خوشدل۔ گرمست بسکہ نالہ آتش فشان ما — سوزد برنگ شمع زباں در دہان ما

منشی گوہر لال تفتہ۔ چند گوئی کہ نشاں نیست ز خونیں کفناں — مگر ایں لالہ کہ بینی ز شہیدان تو نیست

راجا امانت رام امانت۔ شکر للہ نقش پائے مہ جبینے یافتم — آرزوئے سجدہ میکردم زبینے یافتم

راجا الفت رائے الفت۔ نیست اہل آسماں را بردرت بے اذن یار — می کند گردوں طواف درگہت لیل و نہار

ہر چہ ناممکن بود آید ز تو بر روئے کار — از غبار درگہ عرش احترامست آشکار

لالہ اودیا گر الفت۔ در آمد شام غم در سینہ حسرت نام ہمانے — ز داغ دل کشیدم بے تکلف پیش او خوانے

الیسری داس آرام۔ جوان و صاحب بخت جوان نظام الملک — کہ باد ہمت از دم مردم دکن گیرند

شہاں ز صولت آں جم وقار آصف جاہ — رکاب توسن شاہنشہ زمن گیرند

راجا پیارے لال الفتی۔ چوں غنچہ جز سکوت نباشد بیان ما — پیچیدہ شد زبان سخن در دہان ما

اندیشہ تا ل نیاید ز ما درست — در دست دیگر است چو سود و زیاں ما

اکبر کے ربع میں سنسکرت اور ہندی۔ راماین اکبر ہی کے ربع میں ہندی سے فارسی میں آئی۔ ملا عبد القادر بدایونی، سلطان تھانیسری اور نقیب خاں ان تینوں نے مل کر مہابھارت کو فارسی میں کھینچ لیا۔ اتھرو وید کو حاجی ابراہیم سرہندی نے فارسی میں لے لیا۔ فتح اللہ شیرازی نے اکبر کے نورتنوں کے ساتھ مل کر زیچ میرزائی کو سنسکرت کے سانچے میں ڈھالا۔ پنج گنت، بھگوت گیتا، لیلاوتی۔ سنسکرت کی ان لکھتوں کو فیضی نے فارسی میں انڈیل لیا۔ اپنے ان داتا کے کہنے سے ابوالفضل نے بھی ایک فارسی لکھت ہندی میں نچوڑ لی۔

اکبر کی سوجھ بوجھ۔ راج پاٹ پھیلانے کے گر اور گھاتیں تو اسی کے لئے تھیں۔ کوئی دوسرا اس کے دھیان کی گہرائی نہیں پا سکتا تھا۔ انہیں چھوڑ کر بھی سینکڑوں جی موہ لینے والی باتیں اکبر میں ایسی چھپی ہوئی تھیں جیسے گلے میں سُر اور لے۔ چھندوں، دوہوں، گیتوں کے سڈول اور چمکیلے موتیوں کی لڑیاں ایسی پرکھتا جسے دیکھ کر بڑے بڑے جاننے والے بھوچکا ہو کر رہ جاتے تھے۔ جو بات مُنہ سے نکلتی وہ پتھر کی لکیر اور ایسی جچی تلی جسے کوئی نہ اُٹھا سکے۔ فغانی ایران کا بڑا گرو گھنٹال مانا جاتا ہے۔ اکبر نے جب اسکا یہ چھند سُنا۔

میسحا یار و خضرش ہمرکاب و ہمعناں عیسیٰ — فغانی آفتاب من بدیں اعزاز می آید

تو سُنتے ہی بول اُٹھا۔ محل آفتاب نیست شہسوار می باید گفت۔ سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ اکبر کا دھیان کہاں پہونچا اور فغانی کے یہاں وہ بول جو بے ہنگم تھا اُسے ہٹا کر ایک ایسا بول جڑ دیا جو ہٹانے سے ہٹ نہیں سکتا۔ اکبر کے "شہسوار" والے ٹکڑے کے سامنے فغانی کا "آفتاب" والا ٹکڑا کیسا پُھسپُھسا اور بے جوڑ دکھائی دیتا ہے۔

کہتے ہیں مہاراجا مان سنگھ کو جب اکبر نے اپنے اوپچیوں کے ٹڈی دل کے ساتھ کابل پر چڑھائی کے لئے بھیجا تو مہاراجا چلے اور چلتے چلتے اٹک کے پنگھٹ پر پہونچ کر اٹک گئے۔ کسی ندی کو پار کرنا دھرم مہاپاپ سمجھتا ہے' اس لئے مہاراجا پاپ سے بچنے کے لئے اٹک ہی پر اٹکے رہے اور آگے نہ بڑھ سکے۔ اکبر نے جب اس کی سُن گُن پائی تو یہ دوہا لکھ بھیجا۔

سبے بھومی گوپال کی یا میں اٹک کہا — جا کے من مان اٹک ہے سوئی اٹک رہا

مہاراجا یہ دوہا دیکھتے ہی پھر گھڑی بھر نہ ٹھہر سکے اور اٹک پار کر کے آگے بڑھے۔

جہانگیر اور اُس کی سُوجھ بُوجھ:- مغلوں کا راج اپنے پرلتے سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا اور سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرتا تھا۔ جیسے راج کی بولی فارسی کے کبیشروں پر ہُن برستا، ٹھیک ایسے ہی ہند کے کویوں کی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ جب اکبر اپنی جگمگاتی راجدھانی چھوڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا تو جہانگیر نے راج پاٹ سنبھالا۔ فارسی اور ہندی کبیشروں نے اس کے لئے بڑے دھوم دھامی چھند اور کبت کہے۔ کہنے والوں کے مُنہ موتیوں سے بھرے گئے اور ان پر رُپہلی، سُنہری پھولوں کا مینہ برسا۔ سورج سنگھ، جہانگیر کا مُنہ چڑھا راجا جب ایک دن راج کی سبھا میں کسی ہندو کوی کو ساتھ لئے پہونچا اور اسکے اچھوتے دھیان کے چھند جہانگیر کو سُنوائے تو جہانگیر نے اسکے ساتھ جو کیا اُسے "تزک" میں یوں لکھتا ہے:۔

"بایں تازگی مضمونے از شعرائے ہندکم بہ گوش رسیدہ، بہ جلدوے ایں مدح فیلے بہ او مرحمت کردم"۔

ہندوستان کے کبیشروں میں سے ایسا نیا اور اچھوتا دھیان اکا دکا سے سُنا گیا ہے۔ ایسے نئے ڈھب سے سراہنے پر میں نے اُسے ایک ہاتھی دیدیا۔

جہانگیر کے کہنے سے ہندی کا یہی دھیان فارسی میں یوں پھیلایا گیا:۔

گر پسر داشتے جہاں افروز | شب نہ گشتے ہمیشہ بودے روز
زانکہ چوں او نہفت افسر زر | بہ نمودے کلاہ گوشہ پسر
شکر کز بعد آں چناں پدرے | جانشیں گشت ایں چنیں پسرے
کہ ز شنقار گشتن آں شاہ | کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ

کہتا ہے:۔ سورج کے کوئی بیٹا ہوتا تو پھر کبھی رات ہی نہ ہوتی۔ ادھر سورج چُھپتا اور اُدھر اس کا بیٹا اُجالا پھیلانے نکل آتا۔ بھگوان کی دیا سے ایسے پتا کے پیچھے اُن کا ایسا پُتر بیٹھا جس کے ہوتے کسی کو بھی ان کے اُٹھ جانے کے دُکھ میں کالے کپڑے نہ پہننا پڑے۔

ایسے ہی کوئی ہندو دُو ڈھائی انگل کا ایک میلا سا پتر جس پر ایک رانی کو نہاتے اور ایک چھوکری کو جھانویں سے تلووں کا میل کھیل چھڑاتے ہوئے دکھایا تھا، یہ لئے ہوئے جہانگیر کے پاس پہونچا۔ ان نے اس پتر کو دیکھتے ہی دس ہزار دینے کیلئے کہا۔ اگلے لوگ بھی کیسے جیوٹ اور نڈر ہوتے تھے جو بڑے بڑے راجا مہاراجا کی سُوجھ بوجھ کو نئے نئے ڈھنگ سے چٹکی بجاتے میں جانچ لیتے تھے۔ ایک چھوٹے سے پتر کے دس ہزار ملتے سُنکر بھی پہلے تو یہ چُپ رہا اور پھر دونوں ہاتھ جوڑے آگے بڑھکر کہنے لگا۔ پرماتما اس راج میں اور چار چاند لگائے، پورے سنسار پر ان داتا کا ڈنکا بجے اور سارا جگ ان داتا کی راجدھانی بنے۔ بھلا یہ دُو ڈھائی انگل کا میلا سا پتر اور اسکے اکٹھے دس ہزار؟۔ ابھی یہ اپنی بات پوری نہ کرنے پایا تھا جو مسکرا کے جہانگیر نے کہا۔ کیوں بے تو ہمیں جانچتا ہے۔ دیکھ تری بنائی ہوئی اس مورت میں یہی بات دیکھنے کی ہے جو تو نے تلووں کی گدگدی کی پوری جھلک نہانے والی کے منہ پر دکھا دی ہے۔

ٹھیٹ ہندی بول فارسی میں:- آئے دن کی مڈبھیڑ، رات دن کا آمنا سامنا بھی کیسا چلتا ہوا منتر ہے جو اُجڈ سے اجڈ اور اکھڑ سے اکھڑ کو بھی ملنسار بنا کے چھوڑتا ہے۔ دیکھئے ایک جگہ کے رہنے سہنے اُٹھنے بیٹھنے سے میل ملاپ کے پینگ دیس میں ایسے بڑھے جو دیسیوں کے منہ پر بدیسی اور بدیسیوں کے مُنہ پر دیس کے بول چڑھنے لگے۔ جیسے:۔

لاڈلا، جھکڑ، جھروکا، درشن، جمدھر، اُگال، چوکھنڈی، جگت، کھچڑی، تنبول، دھوبی، پہاڑ، پٹھانی، راجپوت، چمپا، مولسری، گڑھل، نیم، کہار، پالکی، اوک، کٹار، پان۔

یہ اور ایسے اَور اَور ہندی بول فارسی میں بولنے اور کہنے والوں نے بے جھجک نئے ڈھب سے اپنے یہاں کھپائے۔

فتحپور سیکری کی پہاڑیاں کنور مراد کا جنم بھوم تھیں۔ اکبر اپنے اس بیٹے کو پیار سے "پہاڑی راجا" کہا کرتا تھا۔ جہانگیر کی چھوٹی بہن آرام بانو بیگم اکبر کی بڑی لاڈلی بیٹی تھی۔ اکبر اُسے بہت چاہتا تھا اور اُسے سکھ چین سے رکھنے کے لئے جہانگیر سے اُس نے جو کچھ کہا، اپنے باپ کی ان باتوں کو جہانگیر یوں دہراتا ہے:۔

"بابا بجہت خاطر من بایں خواہر خود کہ لاڈلۂ من است بعد از من باید بروشے سلوک کنی کہ من با او کنم"۔

بیٹا میرا دھیان کرکے اپنی اس بہن کے ساتھ جو میری چہیتی اور لاڈلی ہے۔ میرے پیچھے ایسا اچھا برتاؤ کرنا جیسا میں کرتا ہوں۔

کسی کی کھچڑی کی چاٹ عالمگیر کو نہیں بھولتی۔ رقعات عالمگیری میں اس ہندی بول کو اس ڈھب سے لکھتا ہے۔

"مزۂ کچڑی بریانی شما در زمستان یاد می آید۔ چہ خوش باشد کہ بیایند بخورند و بخورانند"

چلّے کے جاڑوں میں تمہاری بھُونی کھچڑی کے سلونے پن کا رہ رہ کے دھیان آتا ہے۔ کیا اچھا ہو جو تم آؤ اور کھاؤ اور کھلاؤ۔

عرفی نے دونوں کے اُجلے اُجلے چانولوں میں راتوں کی کالی دال ملا کے ماش کی کھچڑی کے ساتھ ساتھ پہلی چانولوں میں سُنہری دال ڈال کے ایک اور گنگا جمنی کھچڑی بھی پکا ڈالی۔ اس کے دھیان کے تھال میں سے ان دونوں کھچڑیوں کو چکھ کر دیکھئے۔

سیر گشتم ز کچری ایام — ہوس سیم و زر نمیدارم

مولسری کا سراہنا کلیم سے سنئیے۔ زموزوناں نظر دریوزہ دارم — کہ وصف مولسری را بر نگارم

ظہوری اپنی "سہ نثر" میں ہندی بول جگت کو یوں جگہ دیتا ہے۔

"بار جگت گردی عالم بر دوش گرفتہ مند"

"اُگال" ہندی ہے۔ ظہوری نے اس اگال سے اپنے دھیان کا کیسا منہ لال کیا ہے۔

شود چہرۂ زرد خورشید آل — دہندش اگر نازنیناں اُگال

امیر خسرو بھی اسی "اُگال" پر مٹے ہوئے ہیں اور کس ڈھب سے کہتے ہیں۔

پاں خوردہ بمن داد اُگال آں بتِ ہندی — ایں بوسہ بہ پیغام چہ رنگیں مزہ دارد

یہی خسرو "کٹار" جو ہندی بول ہے اسے یوں باندھتے ہیں۔

سرآں دو چشم گردم کہ چو ہندواں رہزن — ہمہ را بنوک مژگاں زدہ بر جگر کٹارا

ملا طغرا نے "راجپوت" اور "جمدھراں" دونوں ہندی بولوں کو یوں کھپایا۔

شوخ سوسن را نگو دل میربایدقشقہ ات — ذات رجپوت است ترسم دست بر جمدر کند

"جھروکا" ہندی ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے رقعات میں اسے یوں لکھا۔

"زیب النسا جروکہ برہم زد"

ملا طغرا نے اسے یوں باندھا۔

خوانیکہ ز سر کار کشند از پے خیر — از پیش جروکہ تا لب جیحوں باد

دونوں چلّو ملا کے چاہے پانی اور چاہے کچھ اور پینا۔ اسے "اوک" کہتے ہیں، ہندی بول ہے۔ امیر خسرو نے اپنے یہاں اسے بھی جگہ دی۔ پر، بہت ناک بھوں چڑھا کے۔ ہندوؤں کا اوک سے پانی پینا انہیں ایسا برا لگا جس پر بگڑ کے کہتے ہیں۔

زہے ابلہی ہندوان کلال — بہ اوک آب نوشند با صد سفال

بھٹی والے ہندوؤں کے گدھے پن کا کیا ٹھکانا ہے جو سینکڑوں مٹی کے برتن ہوتے ساتے اوک سے پانی پیا کرتے ہیں۔

ظہوری کی چوکھنڈی بنانا دیکھئے۔

سپہر از سرافرازیش در حساب — ز چوکنڈیش سایہ بر آفتاب

ابو طالب کلیم نے تو چُن چُن کے ہندی بولوں کا ایک جگہ ڈھیر ہی لگا دیا۔

منہ بر وعدۂ تنبولیاں دل — کہ جز خوں خوردن از وے نیست حاصل

غرورِ حُسن با جہل پٹھانی — چو گردد جمع نتواں زندگانی

بتاں راجپوت و شیخ زادہ — شکیب عاشقاں برباد دادہ

چہ چنبہ شعلۂ شمعیست بے دُود — کہ آتش می زند در خرمن عود

گل گڈہل نہ فہمید ست موسم — شگفتہ چوں رخ یار است دایم

نہال نیم از بس خوش نسیم است — دل طوبیٰ زرشک آں دو نیم است
زحسن شستہ دوبی چہ گویم — ازاں بے پردہ محبوبی چہ گویم

کہتا ہے:- تنبولیوں کے کہنے میں آ کے کہیں جی نہ دے بیٹھنا۔ یہ سمجھ لو اس میں لہو پینا پڑتا ہے۔ اپنے جوبن پر پٹھانی کا گھمنڈ اور اکھڑپن جب یہ دونوں ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو پھر جیتا نہیں ہو سکتا۔ راجپوتوں اور شیخوں کے بانکے ترچھے لونڈوں نے چاہنے والوں کا رکھ رکھاؤ اور ان کے کس بل کا ستیاناس کر ڈالا۔ چمپا کا پھول جلتے ہوئے دئے کی لو اور بے دھوئیں کی ایسی آنچ ہے جو اگر کے ڈھیر میں آگ لگا دیتا ہے۔ گر لعل کا پھول کسی رُت کو دیکھتا ہی نہیں۔ بارہ مہینے کسی کا پیارا مکھڑا اسا بنا ہوا کھلا رہتا ہے۔ نیم کے پیڑ کے ہلکے ہلکے جھونکے ایسے بھلے لگتے ہیں جس کے جلاپے سے طوبیٰ کا جی دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا ہے۔ دھوبی کے ستھرے اور نکھرے ہوئے جوبن کو کیا کہوں ایسی ڈھیٹ پیاسے کی باتیں کیسے کہی جائیں۔

کہار، جو دیس میں ڈولیاں ڈولے اور پالکیاں اپنے کندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتے ہیں فارسی کہنے والوں نے ان کہاروں کو بھی نہ چھوڑا اور انہیں بھی باندھ کے ڈال دیا۔ ملا طغرا کہتے ہیں:-

چوں کردہ رو بر پالکی گردید خاور پالکی — بنشست تا در پالکی نہ چرخ کہار آمدہ

کہار اکہرا بول تھا۔ بوجھ لاد کے اُسے دُہرا کر دیا۔ پڑھنے سے دکھائی دیتا ہے کہار اپنے بھاری بوجھ سے دبا ہوا کراہ رہا ہے۔

(باقی آئندہ) **سید ابوالقاسم سرور**

قطعات

کسی کے نام

بہارِ بے خزاں میری نگارش — نوا میری نوائے جاودانی
مجھے اپنی محبت بخش دو تم — بنا دوں گا میں تم کو غیر فانی

وداعِ شباب

جوانی اور جوانی کی اُمنگیں، — ہوا وہ سارا کاروبار اب ختم
محبت ختم، ختم ارمان و حسرت — اذیت ختم، راحت ختم، سب ختم

افشائے راز

کھلے اور پھر کھلے رازِ محبت — اسے پوشیدہ رکھ سکتا نہیں میں
دلِ بیتاب سینے میں نہاں ہے — مگر آنکھیں تو پردے میں نہیں ہیں

شباب رفتہ

میں پھر آنکھوں سے جُوئے خُوں بہا لوں — میں کر لوں دل کو پھر حسرت سے پامال
مگر اختر کہاں سے لاؤں اب میں — وہ اپنی عمر کا بائیسواں سال

اختر انصاری

"گلبانگِ حیات" زیرِ تدوین کا ایک ورق۔

نکات

حُسن اور عشق کی یکجائی ہے عنوانِ حیات
ایک ہی بیت کی کہلائی ہے دیوانِ حیات
عشق اور حُسن کی ہر ایک ہے نیرنگِ وجود
دم سے اس جوڑے کے آبادی ہے ایوانِ حیات

جوہرِ کیف ہے حُسن اور رگِ تاک ہے عشق
پیکرِ نورِ ازل حُسن ہے ادراک ہے عشق
ہوگیا آئنہ آئینۂ حیرت سے یہ راز
حُسن خود عینِ لطافت ہے جبھی پاک ہے عشق

ذوقِ معنی ہو اگر حُسن بھی ہے عشق بھی ہے
دانۂ دل کا ثمر حُسن بھی ہے عشق بھی ہے
تو ہی آگاہ نہیں ذات سے اپنی ورنہ
جوہرِ جانِ بشر حُسن بھی ہے عشق بھی ہے

حُسن اور عشق سے ہے گرمیِ بازارِ وجود
نقدِ سجدہ ہے اِدھر اور اُدھر جنسِ نمود
وا اگر چشمِ تعیّن ہو تو رمز آتا ہے
سرِ تخیل ہی تخیل ہے امیں عبد و معبود

امینِ حزیں سیالکوٹی؀

دِلّی وَالے اور برسات

اب ہم نشیں میں روؤں کیا اگلی صُحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

جن وقتوں کا یہ ذکر ہے، ان کو بیتے پچاس سال سے اُوپر ہوئے، ہر چند کہ غدر کے بعد دلّی والوں کی قسمت میں زوال آگیا تھا اور مصائب و آلام نے ان کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا، مگر امی جمی ہو جانے پر ان کی فطری زندہ دلی پھر سے اُبھر آئی۔ بیشک وقت اور حالات نے اُن سے سب کچھ چھین لیا تھا لیکن ان کے طور طریق، ان کا رکھ رکھاؤ، اُن کی قدیم روایات، اُن کا ہنسنا بولنا اور اُن کی وضعداریاں اُنکے سینوں سے لگی رہیں۔ مگر یہ سب باتیں بھی انہی لوگوں کے دم قدم سے تھیں۔ جب نئی تعلیم اور نئی تہذیب نے نئی نئی صورتوں کے جلوہیں اپنی جوت دکھائی تو شاہجہاں آباد کے وہ صدا بہار پھول کملانے لگے۔ اُن وقتوں میں دلّی والے اپنی زندگی ہنس بول کر گذارتے تھے سال کا ہر موسم اور مہینے کا ہر روز اُن کے لئے خوشی کا ایک نیا پیغام لاتا تھا۔ آندھی جائے، مینہ جائے اُن کو خوش رہنے اور خوش رکھنے سے کام، یادش بخیر، مینہ کا ذکر آیا تو برسات کے وہ سہانے سمے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ آج کی دہلی دیکھئے تو زمین آسمان کا فرق! اگلی باتیں تو خیر جانے دیجئے کہ اس زمانے میں خوش وقتی کا جو بدڑا بنا ہے وہ ہر بھلے مانس کو معلوم ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ اُن مبارک دنوں پر دلّی والے برسات کس طرح مناتے تھے:۔

جیٹھ بیساکھ کی قیامت خیز گرمیاں رخصت ہوئیں، اب برسات کی آمد آمد ہے۔ بہنوں کو سسرال گئے ہوئے مہینوں گذر گئے اور اُنکی آنکھیں میکے کے کاجل کیلئے تڑپ رہی ہیں۔ نیم میں نمبولیاں پکتی دیکھکر ان کو میکہ یاد آرہا ہے اور وہ چپکے چپکے گنگناتی ہیں:۔

نیم کی نمبولی پکی، ساون بھی اب آویگا
جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلا ویگا

لیجئے یہ وقت بھی آگیا۔ ساون کی اندھیری جھکی ہوئی ہے۔ لال کالی آندھیاں چل رہی ہیں۔ خاک اور ہوا کا وہ زور کہ الاماں الحفیظ! آخر مینہ برسنا شروع ہوا خاک دب گئی ہے اور پچھلے مہینوں گرمی نے جو آفت ڈھائی تھی اُس سے خدا خدا کر کے چھٹکارا ملا۔ بارش کے دو چار ہی چھینٹوں نے ہر شے میں نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔ لوؤں کے تھپیڑوں سے جھلسے ہوئے درخت اور پودے، جو سوکھ کر کھڑنک ہو گئے تھے، اب پھر ہرے بھرے ہو گئے ہیں۔ اُونچے اُونچے پیڑوں کی پھُنگیاں اور ٹہنیاں خوشی سے جھوم رہی ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے، مخملی فرش بچھا ہوا ہے۔ دلّی والے، سیلانی پنچھی، گھڑی گھڑی آسمان کو دیکھتے ہیں اور دل میں کہہ رہے ہیں:۔

کبھی ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں برسے
ایسا برسے میرے اللہ کہ چھاجوں برسے

دل سے نکلنے کی دیر تھی کہ دُعا مقبول ہوئی۔ برکھا رُت، نکھار کے دن، بارش کے مہینے، ابھی پھوئیاں پھوئیاں ہو رہی تھی کہ سہانی گھٹاؤں کی ریل پیل ہوئی اور دُھواں دھار مینہ برسنے لگا۔ ندی نالے بہ نکلے اور کہیں کہیں تو ایسے شفّاف گویا نور کی نہر ہیں۔ ایلو پہلو سبزہ مچل رہا ہے۔ سر سبز بیلوں اور دھانی پتّوں میں سُرخ اور زرد پھول رچے ہوئے ہیں۔ ہریاول مُنہ سے بول اُٹھی ہے۔ گھر گھر گھم گڑے ہیں، جھولے پڑے ہیں اور محلّے ملہاروں کی گونج اُٹھے ہیں۔ ساون کا مہینہ یونہی چین چان سے گذر کر بھادوں شروع ہو رہا ہے۔ اب گھر کی چار دیواری میں قید نہیں ہوا جاتا، بارانِ رحمت جوش میں آگیا ہے۔ کالی کالی بدلیاں اُمنڈ گھمنڈ کر چھا رہی ہیں۔

ساون بھادوں ہمارے ہندوستانی لٹریچر میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ہندی میں بہاری کا یہ دوہا مشہور ہے:۔

ساون بس اندھیار میں بھید پرے نہیں جان
رین دِوس جانو پرے، دیکھ چکئی چکوا ن

یعنی ساون کے اندھیرے میں کچھ بھید نہیں کھلتا، رات اور دن کا اندازہ صرف چکوی اور چکوے کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ ایک اور ہندی گیت کا ترجمہ سُنئیے:۔

"ساون آگیا۔ بھادوں میں گھاس ہری ہری ہو گئی۔ بادل گرج رہے ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، پر میرا کلیجہ کانپ رہا ہے۔ اے سکھی! میں کیا کروں، میری آنکھوں سے تو ساون بھادون

کی جھڑی لگی ہے۔ کیونکہ میرے پریتم پردیس چلے گئے۔

اے میرے من موہن! اگر تم گھر پر ہوتے تو میں رنگین لہنگا پہنتی اور ایسی چندری اوڑھتی کہ تم تعریف کئے بنا نہیں رہتے۔ چاروں طرف چراغ جلا دیتی اور جھم سے چڑھکر تمہارے پاس کوٹھے پر آجاتی"

اور اردو میں تو آپنے میر حسن کی غیر فانی مثنوی سحرالبیان میں یہ شعر پڑھا ہی ہوگا ؎

وہ رو رو کے دو ابرِ غم یوں ملے
کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے

غرض ان دنوں پانی کی فراوانی ہے اور دلوں کے کنول کھلے ہوئے ہیں۔ جھوم جھوم گھٹا اٹھ رہی ہے۔ مینہ کا جھمکا لگا ہے۔ آجکل کی طرح نہیں، کہ قدرت بھی بخیل، خلقت آسمان کو تک رہی ہے اور ساون بھادوں ہیں کہ بے حیا کے دیدے کی طرح صاف! نا بھائی نا' دریائے فیض جاری ہے۔ بارش چھما چھم ہو رہی ہے۔ لوگ باگ سیر کو جانے کی لپاک جھپاک تیاریاں کر رہے ہیں۔ مرد اور عورتیں' بچے اور بوڑھے، دلوں میں ایک نئی ترنگ محسوس کر رہے ہیں۔ رنج و غم کوسوں دور، دنیا کے جھنجھٹ قطعی محو۔ کہیں قطب صاحب جانے کے ارادے ہیں، کہیں یہیں باغات کے۔ شاموں شام گھر کے مرد انتظام کرتے پھر رہے ہیں۔ عورتوں میں الگ ہڑبونگ مچی ہے۔ بچھونے ٹھیک کئے جا رہے ہیں۔ بچوں کے کپڑے نکالے جا رہے ہیں، چیز بست رکھی جا رہی ہے۔ بچے ہیں' وہ تو کسی کے قابو ہی کے نہیں، ایک اودھم مچا رکھی ہے۔ غرض ایسی آپا دھاپی پڑی ہے، وہ چیخ پکار ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ رات بھر بھلا کر کو نیند آسکتی ہے؟ خوشی کے مارے آنکھیں بے خواب ہیں۔ اوّل شب سٹر پٹر میں گذری۔ کل کا کھانا تیار کر لیا گیا ہے۔ بچھونے باندھ دیے گئے ہیں، دو گھڑی تو لیٹنا ہی ہے۔ بارش کی بھیگی ہوئی، بان کی کھرّی چارپائی پر لیٹ رہے۔ ادھر سے چلی ٹھنڈی ہوا، ادھر گیلا گیلا بان، وہ مزے کی نیند آئی کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ فجر ہوتے ہوتے مینہ تھما اور عورتیں اور بچے گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ مردوں کو، جو گھوڑے بیچکر سوتے ہیں، جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا جا رہا ہے کہ گاڑیاں ابھی تک نہیں آئیں۔ مرد کسمساتے اٹھے اور قاضی کے حوض گاڑیاں لینے چلے گئے۔

دروازوں پر شکرمیں، بہارکیں، رتھیں، منجھولیاں بہلیاں اور اکا دکا پالکی اور ینس گاڑیاں کھڑی ہیں۔ پڑوس میں غریب غربا رہتے ہیں، ان کی خوشامد درآمد ہو رہی ہے کہ تم بھی ساتھ چلو۔ ہائے کتنے اچھے دن تھے! کیا مجال جو بڑی سے بڑی تقریب اور چھوٹی سی چھوٹی خوشی میں کوئی پڑوس کو بھول جائے۔ حق ہمسایہ، ماکا جایا، پشتینی شرافت کا یہی تقاضہ ہے۔ آخر کامیاب ہوئے۔ عورتوں نے پڑوسنوں اور مردوں نے پڑوسیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا، سر آنکھوں پر بٹھایا۔ سامان اٹا ٹٹ بھرا جا رہا ہے۔ سانگیوں اور ماچیوں میں جگہ نہیں رہی مگر کیا پروا ہے؟ سواریاں ایک دوسرے پر پل رہی ہیں' بچوں کی کچر دھان الگ ہے، لیکن کوئی منہ نہیں سکیڑتا۔ سب لدے پھندے چلے جا رہے ہیں۔

ابھی پوری طرح صبح نہیں ہوئی۔ مینہ نے ایک ذرا کی ذرا دم لیا ہے اور صرف کبھی کبھار سورج کی یونہی سی جھلک نظر آجاتی ہے، ورنہ آسمان پر گھٹا ٹلی کھڑی ہے۔ گاڑیاں آگے پیچھے لین ڈوری بنائے چلی جا رہی ہیں۔ راستے میں بیسیوں عمارتیں ہیں جن کی برجیاں اور مینارے اودی اودی بدلیوں میں اپنا روپ سروپ دکھا رہے ہیں۔ بچوں کچوں کی چیخ پکار، لڑکیوں بالیوں کی بولیوں ٹھولیوں، بہو بیٹیوں کے قہقہوں، گاڑیبانوں کی ٹخ ٹخ اور پہیّوں کی چرچر نے فضا میں ایک دلنواز موسیقی پیدا کر دی ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار نے اور لطف دے دیا ہے۔ گاڑیاں اسی طرح ٹلک ٹلک چلی جا رہی ہیں۔ دن ڈھلے مندر سے (صفدر جنگ کا مقبرہ) پہونچے۔ بھوک نے بلبلا دیا ہے۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اب کسی سے نہیں رہا جاتا۔ اس لئے تھوڑی دیر یہاں ٹھیریں گے۔ اندر پہونچے تو دیکھا کہ ایک میلا سا لگا ہے۔ بڑی بڑے بانکے اور سجیلے تاک جھانک میں مصروف ہیں۔ عورتوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں محوِ گلگشت ہیں۔ کچھ ٹکریاں یہاں اور کچھ وہاں کھانے پینے میں لگی ہیں۔ ان کو بھی یہیں کہیں جگہ مل جائیگی۔ دسترخوان بچھا دیا گیا۔ اس وقت کھانے میں ہری مرچیں اور قیمہ، روغنی اور بیسنی روٹیاں، اشٹو، آم کا اچار، لسّن اور کیری کی چٹنی ہے۔ بڑی بوڑھیاں نکال رہی ہیں۔ کنواری بیٹیاں ایک ایک کے آگے رکھ رہی ہیں۔ جب سب کھا چکیں گے تو بچا کھچا ان کے حصّے میں آئے گا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ ان بچاریوں کو اپنے گھروں میں اچھی طرح کھا پی لینے دو، پھر تو یہ ساون کی چڑیاں ہیں۔ کچھ دنوں میں سسرال کا ڈولا دروازے آلگے گا۔ کون جانے ان کی قسمت میں وہاں کیا لکھا ہے؟ بچوں کا کیا ذکر، بڑوں کو دیکھو کیسے خوش ہو ہو کر آموں کے چھلکے اور گٹھلیاں پانی میں پھینک رہے ہیں۔ جن بچاریوں کا کچا ساتھ ہے اُن کا تو

ناک میں دم ہوگیا، بچے ہیں کہ منہ سانے چلے جا رہے ہیں۔ ماؤں کو انہی سے فرصت نہیں، خود کیا خاک کھائیں؟ بادل گرجنے اور بجلیاں کوندنے لگیں۔ سب جلدی جلدی کھاپی گاڑیوں میں سوار ہوگئے۔ پُروا ہوا چلنے لگی ہے۔ کہیں برس گیا تو بہت بُرا ہوگا۔ ابھی تو آدھا راستہ باقی ہے۔ بیل تو وہی ہولے ہولے، ڈگمگ ڈگمگ چلیں گے۔ راستے کے مناظر کس قدر خوشنما ہیں۔ کہیں دُور چرواہے اپنی بانسریاں بجا رہے ہیں اور ان کے بھیگے ہوئے نغمے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ ہوتے، پیپل، املی اور نیم کی گھنی چھاؤں میں موروں نے ناچنا شروع کر دیا ہے۔ اُن کا طاؤسی حسن آنکھوں میں کُھبا جاتا ہے۔

وہ تو خدا نے بڑی خیر کی، جو بدلیاں ہوا میں تیرتی رہیں اور گاڑیاں، دونوں وقت ملتے صحیح سلامت قطب صاحب پہونچ گئیں۔ قطب صاحب سے تھوڑے فاصلے پر مہرولی کا بازار ہے جس کے دونوں طرف دومنزلے ہیں۔ نیچے دکانیں اُوپر کوٹھے۔ برسات میں یہ کوٹھے کرائے پر لے لئے جاتے ہیں۔ بچوں کی ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک زور کا کڑاکا ہوا اور آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والی بجلی دیواروں پر سے پھسلتی ہوئی یکلخت غائب ہوگئی۔ پھر تو بادل پھٹ پڑے، چھاجوں ہی پانی پڑ گیا، گویا اب برس کر پھر کبھی نہ برسے گا۔ کچی گھروندوں کا یہ حال کہ اڑاڑا دھم۔ صبح ہوتے دعائیں مانگی گئیں "الٰہی ابھی جھڑی نہ لگے ورنہ ہم بچاریوں کی سیر مٹی ہو جائے گی" اللہ میاں عورتوں کی دُعا جلدی قبول کر لیتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے، وہ دھواں دھار طوفان بوندا باندی ہوگیا۔ دکانیں کُھل گئیں۔ لوگ باگ ایلے گیلے پھرنے لگے۔ بھڑبھونجے کے ہاں بھیڑ لگی ہے۔ کوئی گرم گرم چنے خرید رہا ہے، کوئی بھنتے۔ اس وقت ان میں جو لذت ہے، وہ بریانی میں نہیں۔ بہت سے مرد تنوروں کے گرد بیٹھے روے میدے کے پراٹھے اور بیسنی روٹیاں پکوا رہے ہیں۔ قریب ہی قیمے کی گولیاں، لونگ چڑی، شامی اور سیخ کے کباب بک رہے ہیں۔ ان پر پیاز کے لچھے، ادرک کی پھانکیں، کیری کی قاشیں اور کتری ہوئی ہری مرچیں چھڑکی ہوئی ہیں۔ آگے بڑھئے، دسہری، فجری، سرولی، دیسی، مالدا، سفیدا، بادشاہ پسندہ، طوطا پری، سُرخا، زردہ، سویا، غرض قسم قسم کے قلمی و تخمی آم اور کالی کالی، موٹی موٹی جامنیں بک رہی ہیں۔ ایک طرف دودھیا بُھٹے بُھن رہے ہیں۔ بیچنے والوں کی صدائیں ایک سے ایک تحفہ، ذرا سُنئے:۔

کالے بھونرا لے، نون کے بتاشے ہیں نمکیں لو ——— یعنی جامنیں

پال میں ڈالے ہیں جی کرانے کے لڈو
پیڑ کے پکے امرود میں سیب کا ہی مزہ } یعنی آم

بُھٹے بھی لینا ہری ڈال والے
لینا جی یہ رتی کے کیلے ہی کا مزہ } یعنی بُھٹے

اِن چیزوں کو لے لوا گھر آئے۔ اتنے عورتوں نے بڑی روٹیاں، اچار، چٹنی اور سالن تیار کر لیا۔ اب کھانے پینے جھولنے اور پکوان کا سامان ساتھ لے سب سیر کو نکلے۔ پہلا نمبر قطب صاحب کی لاٹ کا ہے۔ یہ اتنی بلند ہے کہ چوٹی دیکھو تو ٹوپی گر جائے۔ اسکے چاروں طرف وسیع قطعات اور فصیلیں اور دیواریں ہیں۔ ہری ہری گھاس لہریں لے رہی ہے۔ اُونچے اُونچے درخت خوشی سے جھوم رہے ہیں۔ اَملتاس کے کھلے ہوئے بسنتی پھول، بہتا ہوا آبشار معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں مردوں کی کثرت ہے اس لئے عورتوں نے جھرنے کا رُخ کیا۔ کچھ دیر یہاں پانی سے کھیل کھالیں اور پھر جھرنے کے پیچھے اَمریوں میں چلی گئیں۔ پھوار پڑنے لگی ہے۔ جا بجا نت نیا سُبھاؤ ہے۔ دُھلی دُھلائی چٹانیں، گلابی تختے، پھولوں کی سیجیں، آنکھوں کو طراوت پہونچا رہی ہیں۔ درختوں میں رنگ برنگی جھولے پڑے ہیں اور اُن میں گنگا جمنی پٹڑیاں۔ مرد تو درگاہ میں فاتحہ پڑھنے یا کبڈی وغیرہ میں مصروف ہوگئے۔ بچے چنی منی کا پہاڑوا، جھائیں مائیں، کِل کِل کانٹے اور کوڑی ذقن کھیل رہے ہیں۔ بچیاں بیر بہوٹیوں کو چُن چُن کر جمع کر رہی ہیں اور بھولی بھولی باتیں ملکاتی جاتی ہیں۔ لڑکے بالے دوڑ بگے لگاتے پھر رہے ہیں۔ سُسرال میں رہنے والی بیٹیوں کو ساون کا جُھولا جھولنے، میکے کے عزیزوں سے ملنے اور ساتھ کی سہیلیوں سے کھیلنے کی بڑی تمنا تھی، آج وہ پوری ہو رہی ہے بھلا انکی خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ پر آہ! پپیہا بھی تو "پی کہاں؟ پی کہاں؟" رَٹے جا رہا ہے! کوئل بھی تو کوکے جا رہی ہے! جی میں ہوک سی اُٹھتی ہے، سیاں پھر کیوں نہ یاد آئیں؟

لیجئے اُنہوں نے جُھولا سنبھالا اور سارا باغ ساون کے گیتوں سے گونج اُٹھا۔ کچھ جھول رہی ہیں، کچھ جُھلا رہی ہیں۔ باقی اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی ہیں جیسے چمن میں تیتریاں ہوں یا جنگل میں ہرنیاں۔ بہو بیٹیوں کا سنگھار اور لباس دیکھکر آنکھوں کو فردوس کا گمان ہوتا ہے۔ گلناری، ملاگیری، گُلِ شفتالو، اُودے اور گیندئی جوڑے، دھانی چوڑیاں، آنکھوں میں سُرمہ، ہاتھوں میں پور پور مہندی رچی ہوئی، انگلیوں میں چاندی کے چھلے، دانتوں پر مسی کی دھڑی اور

لبوں پر لاکھا، گویا ایک رنگین خواب دیکھا جا رہا ہے یا حورانِ فردوس اپنی پوری رعنائی کے ساتھ فرشِ زمردیں پہ جلوہ گر ہیں۔ کروٹ میں ناظر کا باغ ہے، کچھ یہاں پہونچیں۔ ہنڈولا گڑا ہے۔ اس میں ہجولیاں جھول رہی۔ ان کی آپس میں ٹھٹولیاں دیکھنے کے لائق ہیں۔ داؤں پڑے تو وہ وہ فقرے کستی ہیں کہ مزہ آجائے۔ نزدیک کے جھولوں پر اونچے اونچے گھرانوں کی دلہنیں، چندے آفتاب، چندے ماہتاب، نک سے سُک حسن میں ڈوبی ہوئی، شرماتی، لجاتی، نندوں سے پیر جوڑے جھول رہی ہیں۔ سمدھنوں کو بھی جھلایا جا رہا ہے۔ آج بڑھاپے اور جوانی کی کوئی قید نہیں۔ سب جھولنے اور گانے میں لگی ہیں۔ امریوں کی فضا، بھنبیری آوازیں، کچھ ایسے لب ولہجہ میں لہک لہک کر گا رہی ہیں کہ دل تڑپ تڑپ جاتا ہو۔

دوپہر کو کھانے سے فارغ ہوئے تو چلنے پھرنے کی سوجھی۔ علائی دروازہ، اولیا مسجد، امام ضامن کا مقبرہ، بھیم کی چھٹنکی، چاہیر قبریں اور بکاؤلی کے قلعے ہوتے ہواتے شمسی تالاب پر آکر دم لیا۔ پھر یہاں سے اٹھکر شمسی باغ کی سیر کرتے ہوئے اندھیری باغ پہونچ گئیں۔ یہ قطب صاحب کا خاص مقام ہے۔ آم اور جامن کے درخت ایسے گنجان اور گھنے ہیں کہ روزِ روشن میں سورج بالکل نہیں دکھائی دیتا۔ پتوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں، آم اور جامنوں سے لدے ہوئے تناور درخت اور لمبے لمبے جھونٹوں والی جھولے دل کو لبھا رہے ہیں۔ پیڑوں کی جڑوں میں چولھے بنا کر، کڑاہیاں چڑھادی گئی ہیں۔ قلمی بڑے، پھلکیاں، پالک، مچھلی کے کباب، سموسے، چھاج کھجوریں، یہ، وہ، الم، غلم، غرض دنیا بھر کا پکوان موجود ہے۔ ایک سے ایک مزیدار سلونی اور میٹھی چیز حاضر ہے۔ کھاؤ اور منگاؤ۔ پیٹ بھر جائے پر نیت نہ بھرے۔ اس پر مستزاد یہ کہ بازار سے اندرسے کی گولیاں اور دودھ پھینیاں منگوا کر کھائی جا رہی ہیں۔ لمبی لمبی پینگوں کے زور سے جامنیں پٹاپٹ گر رہی ہیں۔ کھانے پینے کا یہ زور شور ہے، پر بھائی! بدہضمی کسی کو نہیں ہوتی جہاں پہاڑی کے چشمے یا بادشاہ پسند کنوئیں کا پانی غٹ غٹ پیا اور پیٹ صاحب بولے "کہو استاد! کچھ اور ہے؟" برسات کے تمام لوازمات پورے ہوگئے، عورتوں کی سیل من گئی، اور چاہیے ہی کیا ؎

یہ برسات کے پانچ تحفے ہیں بیگم
گھٹا، پھینیاں، آم، پکوان، جھولا،

قطب صاحب کو فی الحال چھوڑ کر آئیے ذرا اور مقامات کی بھی سیر کریں۔ عورتوں کی بدولت دوسرے باغات میں بھی گھما گھمی ہے۔ روشن آرا باغ، گلابی باغ، بیگم کا باغ، لکھی باغ اور محلدار خاں میں بڑی چہل پہل ہے۔ آنے جانے والیوں کا تانتا بندھا ہے۔ جھولے، گیت، پکوان یہاں بھی ہو رہے ہیں۔ مردوں نے فیروز شاہ کے کوٹلے، پرانے قلعے، ہمایوں کے مقبرے، سلطان جی اور حوضِ خاص میں رنگ جمایا ہے۔ سیلانی جیوڑے ابھی یہاں ابھی وہاں۔ دھنک نکل آئی ہے۔ آسمانِ نیلی فام پر قوس وقزح کے دلفریب رنگ کیسے کھِل رہے ہیں! اب ایک نیا منظر دیکھئے، جل تھل بھر گئے ہیں، جمنا بھر پور چل رہی ہے۔ تیراکی کے میلے ہو رہے ہیں۔ فنِ تیراکی کے وہ وہ جوہر دیکھنے میں آتے ہیں کہ عقل ششدر اور حیران ہے۔ کوئی چت تیرا، کوئی پٹ، کسی نے کھڑی لگائی کوئی گٹھڑی بنا بہاؤ پر چلا جا رہا ہے۔ کوئی سادھو کی طرح دھومی رمائے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ کوئی مینڈک کی طرح ملاحی تیرتا چلا آتا ہے۔ سامنے دو طرفہ سودا سلف بیچنے والے اپنے خوانچے لگائے بیٹھے ہیں۔ دکاندار گرم گرم اندرسے کی گولیاں پوری کچوریاں اور سہال اتار رہے ہیں۔ کھاؤ اور فن کاروں کی داد دیتے جاؤ۔ جمنا سے آگے بڑھیے تو اگرسین، نظام الدین اور دوسری باؤلیوں جھرنوں اور تالابوں میں کُدائی ہو رہی ہے۔ تماشبین پیسے پھینکتے ہیں اور لڑکے غوطہ لگا کر نکال لاتے ہیں۔

اور ہاں، ایک نظر اِدھر بھی تو ڈالیے۔ شہر کے بازاروں اور گلیوں محلوں اور کوچوں، مکانوں اور منڈیوں میں۔ موریاں اور نالیاں باقاعدہ اور کافی نہ ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ گندگی اور کیچڑ ہے۔ سڑکوں کے گڑھے اور موریاں برساتی پانی سے بھر گئی ہیں جن پر مچھروں کے ٹڈی دل کے دل منڈلا رہے ہیں۔ سانپ، بچھو، کھنکھجوروں اور کن سلائیوں نے آفت ڈھا رکھی ہے۔ اور دونوں وقت ملتے تو ناک میں دم آجاتا ہے۔ چراغ جلے اور پروانوں اور بھنگوں نے آن گھیرا۔ اب چاہے فانوس ہوں یا جھاڑ، ڈبیاں ہوں یا اگے، ان سے پناہ نہیں۔ سونے لیٹو تو اِدھر ان کا زور، اُدھر کھٹمل اور پسوؤں کی یلغار۔ مینڈک اور جھینگروں نے الگ شور مچا رکھا ہے۔

آموں وغیرہ میں سڑاند پیدا ہوگئی، لیکن غریب غربا سستے کے لالچ میں اُن پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ نتیجہ معلوم! یعنی بیماری پھیل گئی ہے۔ موسمی بخار سے، جو فصل کا میوہ ہے، بچے سے لگا بڑے تک لوتھ پڑے ہیں۔

گھر گھر ماندگی ہے۔ آخر کھانے پینے کی بندک بند ہوئی۔ پر بیماری کا علاج عجیب وغریب ہے۔ کوئی حکیم سے رجوع نہیں کرتا بلکہ آلو بخارا اور کچالو اڑاتے جا رہے ہیں، جن میں ہلاہل مرچیں اور جانے کیا کیا مسالے پڑے ہوتے ہیں۔ منہ جل رہا ہے زبان سے سی سی نکل رہی ہے، مگر یہ دلّی والے ہیں، مرچوں سے تھوڑی بھاگیں گے! جی بھر کے کھا چکے تو منہ لٹکا دیا۔ ناک، منہ، اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ گھڑی دو گھڑی رال ٹپکائی، بس بھاری سر ہلکا ہوگیا۔ منہ کا مزہ بدلا، بخار دم دبا کر بھاگا۔ طبیعت صاف رکھنے کے لئے شکنجبین اور تلنگنیاں بھی استعمال ہو رہی ہیں۔ پھر بھی اگر موسم کی خرابی یا عدم صفائی کی وجہ سے آب وہوا راس نہ آئی تو امیر امرا کچھ دنوں کیلئے گرد و نواح میں کسی مقام پر چلے گئے۔

اب پھر قطب صاحب چلتے ہیں۔ رات ہوگئی۔ پٹ بیجنے اپنی چمک دمک دکھا رہے ہیں۔ بعض درخت تو جگنوؤں سے ایسے پٹے پڑے ہیں کہ پتہ پتہ جھلل جھلل کر رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنی بائل نیٹ کی ٹوپیوں اور عورتوں نے اپنی کرتیوں میں پٹ بیجنے چھوڑ دئے ہیں اور ان کی جگمگ جگمگ سے محظوظ ہو رہی ہیں جنکا دم چھڑا نہیں ہے وہ اپنے بچوں کو ساتھ لے قیام گاہ پر آگئی ہیں۔ قصے کہانیاں کہی جا رہی ہیں، کہہ کرنیاں بیان ہو رہی ہیں۔ غرض سوتے سوتے دلچسپی سے بس نہیں۔ درگاہوں اور مقبروں میں، عرس، نیاز، فاتحہ اور قوالی ہو رہی ہے۔ بازاروں میں دن کی سی رونق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آج پھول والوں کی سیر ہے۔ دوسرے میلوں کی طرح اس میں بھی ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں۔ دونوں کے پنکھے الگ الگ اٹھتے ہیں۔ رات گئے ہندو پھول والوں نے اپنا پنکھا جوگ مایا کے مندر میں چڑھایا اور مسلمانوں نے درگاہ شریف میں۔ بھیڑ کا یہ عالم کہ تو مجھ پر، میں تجھ پر، کھوے سے کھوا چھل رہا ہے، تھالی پھینکو تو جھنکار نہ ہو۔

رات کا پچھلا پہر ہے، ناچ رنگ کی محفلیں جمی ہیں۔ بین اور ستار کے کمال، ڈھولک اور طنبورے کے جوہر دکھائے جا رہے ہیں، کسی کونے میں ایک شمع رو رہی ہے۔ اس کے قدموں میں سیکڑوں پروانوں کی لاشیں بے حس وحرکت پڑی ہیں۔ اس کے لمبے لمبے آنسو زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ دنیا فانی ہے، دنیا کے جلوے فانی ہیں، عیش وطرب کی مجلسیں فانی ہیں، کھیل تماشوں کے جھگڑے فانی ہیں۔ پر کوئی دیدۂ عبرت وا نہیں کرتا۔ سب کو اپنے اپنے مزے کی پڑی ہے۔ آج تو آرام سے گذرے، کل کی کل دیکھی جائے گی۔ المختصر، ہفتے دو ہفتے، مہینے ڈیڑھ مہینے، یہی رنگ رلیاں رہیں۔ بھری برسات میلوں ٹھیلوں میں گذر گئی۔

شہر آبادی کی جو باتیں میں نے آپ کو سنائیں، آج یہ خواب ہوگئی ہیں۔ اب کوئی گھرانہ اس دھوم دھام سے برسات نہیں مناتا۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ سستے سمے تھے اور اخراجات آمدنی کے مقابلے میں بہت کم۔ دھیلا، چھدام، دمڑی اور کوڑیاں تک رائج تھیں۔ اب پیٹ بھرنے کو تو ملتا نہیں، وہ سیر سپاٹے کہاں نصیب؟ آہ! وہ دلی اور وہ دلی والے ہی نہ رہیں تو پھر ان کی ادائیں کیسے رہتیں؟ ہاں، ان کی یادگار اور گذری ہوئی دلچسپیوں کی نشانیاں ابھی باقی ہیں۔ اب بھی برسات میں بڑھیاں، بڈھیاں میلے چیکٹ برقعے اوڑھے پٹاری یا کھانے کی پوٹلی ہاتھ میں لئے، بچوں کے ساتھ دلی دروازے کے باہر پھرتی نظر آتی ہیں اور دلِ مجروح انہیں دیکھکر اگلے لوگوں کی زندہ دلی پر دو آنسو بہا لیتا ہے ؎

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گذری بہت
اٹھ رہا ہے گل سے شمعِ بزم کے ابتک دھواں

(اس مضمون کا کچھ حصہ دلّی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہو چکا ہے۔)

صادق الخیری

آزادی

جذبات کا سیلِ بے اماں آزادی ہے زندگیِ دل کا نشاں آزادی
نسبت ہے جسے فرِّ جہانگیری سے وہ طنطنہ نُورِ جہاں آزادی

ہر درد و الم کی چارہ گر آزادی ہر حال میں مونسِ بشر آزادی
اِک نُسخۂ دل کشا ہے جس کا ہر حرف اس دہر کی وہ پیام بر آزادی

میخانے میں شغلِ جام و مل آزادی مسجد میں دُعائے جزو کل آزادی
تشبیہ ہے اک اور بھی آزادی کی آوارگیِ نکہتِ گلُ آزادی

الغام کن جملہ نعم آزادی دل جس پہ فدا ہو وہ رقم آزادی
بہتر ہے ہزار سال جینے سے کہیں اے مردِ خجستہ ایک دم آزادی

آوازۂ فطرت بلند آزادی شہنائے جانِ دردمند آزادی
حلقے میں ہیں جس کے عرش و کرسی بھی اسیر وہ ہمت عالی کی کمند آزادی

طوفانِ جوانی کی نمو آزادی دنیائے امل کی آبرو آزادی
سرسبز ہے جس کے دم سے کشتِ ہستی دہقاں کا ہے وہ گرم لہو آزادی

نہال سیوہاروی

سچی کہانی

ساقی کیلئے میں نے ایک سچی کہانی لکھی ہے جو آپ کے ملاحظہ کیلئے بھیج رہا ہوں۔ نجومی نے ناہید کا جو سراپا بیان کیا تھا وہ میں نے اس میں درج نہیں کیا۔ اگر کچھ مضائقہ نہ ہو تو ان سطور کو آپ پُر کر دیجئے ممنون ہونگا ....، "پریم پجاری"

بھائی شاہد۔ میرا جواب صرف ایک شعر تھا۔ سو میں نے لکھدیا۔ اب آپ اس کو شائع کرکے اُن کی نظروں تک پہونچا دیجئے۔ احسان ہوگا ....، زہرہ

"میں اگلی پچھلی سب باتیں بتا سکتا ہوں۔" بوڑھے نجومی نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا۔

"غیب کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور اگر کوئی اسکا دعویٰ کرے تو وہ یقیناً جلساز اور جھوٹا ہے۔" میں نے نہایت حقارت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ بوڑھا نجومی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے برہمی کے آثار نمایاں تھے۔

"تجربہ کے بغیر کسی کو جلساز اور جھوٹا کہنا اپنی بیوقوفی کو ظاہر کرنا ہے۔" اُس نے نہایت بیباکی کے ساتھ بگڑ کر کہا۔ "تم سمجھتے ہو کہ جو بات تم نہیں جانتے وہ کوئی نہیں جانتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔"

"لیکن اگر تم میرے سوالات کا صحیح جواب نہ دے سکے تو؟"

"تو اس وقت تمہیں اختیار ہے کہ مجھے جلساز، مکار جھوٹا جو چاہے سمجھو۔"

"اچھا تو میری گذشتہ، موجودہ اور آئندہ زندگی کے متعلق کچھ بتاؤ۔ میں کوئی خاص سوال نہیں کرتا۔"

"آئندہ زندگی کے متعلق میں کچھ نہیں بتاؤنگا۔ تم کہدوگے کسے معلوم کل کیا ہوگا۔ ہاں گذرے ہوئے زمانے کا حال سنو اور آجکل تم پر جو گذر رہی ہے وہ بھی۔ مگر ایک شرط ہے۔ بات سچی ہو تو اقرار کرلینا مجھے جھوٹا ثابت کرنے کیلئے خود جھوٹ نہ بولنا۔

میں نے کہا "نہیں، ایسا کبھی نہ ہوگا۔"

اُس نے میری ولادت کا سال پوچھا۔ پیدائش کا دن اور وقت دریافت کیا۔ پھر انگلیوں پر کچھ حساب لگایا۔ کچھ کاغذ پر لکھا۔ اپنا بستہ کھول کر اُس میں سے بانس کے کاغذ کی ایک بہت پرانی پوتھی نکالی۔ وہ سیاہ و سرخ روشنائی سے ہندی خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ اس پر بہت سی جدولیں اور نقشے تھے۔ اس نے ایک نقشہ کو سامنے رکھکر پھر کچھ حساب جوڑا اور مجھ سے کہا۔

"کئی برس سے تم سخت مصیبتوں میں پھنسے ہوئے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں یہ صحیح ہے۔ اور آگے چلو۔"

"تمہاری موجودہ زندگی نہایت رنج و غم کی زندگی ہے۔" اُسنے کہا۔

"تم نے یہ کونسی عجیب بات کہی۔ جو مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہو اسکی زندگی میں رنج و غم کے سوا اور کیا ہوگا۔" میں نے جوابدیا۔

اُس نے پھر اپنی انگلیوں پر کچھ حساب جوڑا۔ پھر پوتھی دیکھی اور بولا "خیر، یوں ہی سہی۔ مگر آج کل تمہارا وقت سخت تنہائی اور بیچینی میں گذر رہا ہے۔"

"ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔" میں نے کہا۔

"اور تم دیدہ و دانستہ ایک نئے خطرے میں پڑے ہوئے ہو۔"

"وہ کیا؟" میں نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

"تم نے ایک نئی مگر نہایت خطرناک محبت شروع کی ہے۔"

"بالکل غلط۔" میں نے نہایت متانت کے ساتھ کہا۔

"جھوٹ نہ بولو۔ جو دل کہہ رہا ہے وہی زبان سے بھی کہو۔ بوڑھے نجومی سے تم اپنے راز کو چھپا نہیں سکتے۔" اُس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ واقعی اُس نے میرے دل کا چور پکڑ لیا۔ مگر اُسے یہ بھید کیونکر معلوم ہوا؟ جسکا یہ راز ہے میں نے تو خود اُسے بھی آجتک نہیں بتلایا۔

مجھے خاموش دیکھکر اُس نے کہا "کچھ اور سننا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

"تم نے نادیدہ محبت کی ہے!"

"یہ سب تمہارے قیاسات ہیں" میں نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"خوب! یہ سب قیاسات ہیں؟ اچھا تو مفصّل سُنو۔ وہ" جوان ہے۔ دوشیزہ ہے۔ خوبصورت ہے۔ دولتمند ہے۔ اور بہت سی خوبیوں کی مالک ہے"

"واہ رے نجومی! کیا تفصیل بتائی۔ جوان ہے، خوبصورت ہے۔ ارے جوان اور خوبصورت سے نہیں تو کیا کوئی بوڑھی ڈھڈو سے محبت کرے گا"

"گھبراؤ نہیں، مجھے بات تو ختم کر لینے دو"

"اچھا کہو"

"وہ ایک ستارہ کی ہمنام ہے"

نجومی کے یہ الفاظ سُنکر میں اُچھل پڑا، اور سراپا شوق بنکر پوچھا "کس ستارہ کی؟"

"شُکر کی" اُس نے جواب دیا۔

شُکر کونسا ستارہ ہے مجھے معلوم نہ تھا۔ اس کا عربی، فارسی یا انگریزی نام وہ نہ بتا سکا۔ میں نے فوراً ہندی۔ انگریزی کی ایک ڈکشنری الماری سے نکالی۔ اس میں شُکر کے معنی venus لکھے تھے۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"کہو اب یقین آیا؟" اُس نے فاتحانہ انداز میں پوچھا۔

میں خاموش تھا۔

"کہو تو لفظوں میں اُس کی تصویر کھینچ دوں۔ مگر تم نے اُسے دیکھا نہیں۔ تمہیں کیونکر یقین آئیگا کہ یہ اُسی کی تصویر ہے؟"

"مضائقہ نہیں، تم بیان کرو"

"سُنو.............

چشم پُرنم، خاموش لب، چہرہ اُداس
یادگارِ بیکسی زہرہ تری تصویر ہے

(دیکھ لیا آپ نے؟ بس یہی نقشہ ہے آپکی زہرہ کا)

وہ کہہ رہا تھا اور میں بالکل ازخود رفتگی کے عالم میں سُن رہا تھا۔ جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ آخر وہ خاموش ہوگیا۔ مگر اسکے لفظوں نے میرے لئے جو ایک خیالی دُنیا بنادی تھی کئی منٹ تک میں اُسی میں کھو یا رہا۔ آخر چونکا اور بڑی منت کے ساتھ اُس نے کہا "اچھا ایک بات اور بتادو۔ اس محبت کا انجام کیا ہوگا؟"

"یہ نہیں بتاؤنگا۔ ہرگز نہیں بتاؤنگا۔ اور تم پوچھکر بھی کیا کروگے۔ جھوٹے، جعلساز نجومی کی باتوں کا اعتبار ہی کیا"

میں نے لاکھ منت کی مگر کمبخت ضدی بڈھا کسی طرح راہ پر نہ آیا۔

"غیب کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا" یہ کہا اور اپنا بستہ بغل میں دبا، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا میرے کمرے سے نکل گیا۔

زہرہ! بظاہر یہ ایک افسانہ ہے مگر دراصل واقعہ ہے اور حرف بحرف صحیح ہے۔ میں اس کے متعلق تمہاری آزادانہ رائے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کاش کوئی مجھے بتادیتا کہ نجومی نے میری venus یعنی "پریم" کی دیوی "ناہید" کی جو لفظی تصویر کھینچی ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ وہ بالکل اصل کے مطابق ہے۔ سرِمو فرق نہیں۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہیں اپنی عزیز ترین شے کی قسم، جو کچھ کہنا سچ سچ کہنا اور صاف صاف کہنا ورنہ میری اُلجھن اور بڑھ جائیگی۔ مجھے اس بدذات نجومی پر سخت غصہ آرہا ہے۔ کمبخت سے کتنا پوچھا، کتنی منت کی کہ بتادے اس محبت کا انجام کیا ہوگا مگر بدبخت نے نہ بتانا تھا نہ بتایا۔ کاش وہ ایک بار پھر مجھے مل جائے تو جس طرح بنے سارا حال اس سے پوچھ لوں۔

"پریم پجاری"

انتظارِ خط

غنیمت تھا کہ والد ایک معقول ترکہ کی رقم چھوڑ گئے تھے ورنہ میری تعلیم و آسائش وغیرہ سب دھری رہ جاتی۔ رشتہ داروں سے تو کچھ اُمید رکھنا ہی بیکار ہے۔ وہ کب کسی کے کام آتے ہیں۔ بالخصوص مُصیبت میں تو ایسی آنکھ پھیر لیتے ہیں گویا اِن تلوں میں تیل ہی نہیں۔

مَیں نہ تو غیر معمولی ذہین تھا اور نہ بالکل ہی غبی، نہ حسین تھا نہ بدصورت اور نہ شعریت پسند تھا نہ بالکل زاہدِ خشک۔ جب میں نے میٹرک پاس کیا تو اُس وقت میری عمر ۱۸ سال کی تھی۔ دوست و احباب پیدا کرنے کا میں زیادہ شائق نہ تھا۔ گنتی کے چند شناسا تھے اور اُن میں رمیش سے زیادہ بے تکلفی تھی۔

رمیش اور مَیں انٹر میں داخل ہوئے۔ یہ لڑکا بالکل میرے برعکس طبیعت کا مالک تھا۔ اس کو شعر و ادب سے بھی ذوق تھا، موسیقی اور آرٹ سے بھی دلچسپی رکھتا تھا اور عاشق مزاج —— بھی بعید تھا۔ بڑی باتیں بنایا کرتا تھا۔ آپ کو شاعری کا بھی خبط تھا اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ کہتا تھا اچھا کہتا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ آپ کے کلامِ بلاغت نظام کی تمام ہوسٹل میں کوئی داد نہیں دیتا تھا اس لئے زیادہ تر مجھ ہی کو سُننا پڑتا تھا اور داد بھی دینی پڑتی تھی۔ وہ مضامین بھی لکھا کرتا تھا اور میرا خیال ہے بیشتر اُن میں سے چھپ بھی چکے تھے۔ اس کے خیالات میں ایک ندرت ضرور تھی اور یہی مضمون نگاری کی جان ہے جس میں طرزِ تحریر چار چاند لگا دیتی ہے۔ قلم کے زور اور تخیل کی اٹھان نے اس کو بہت جلد صحافت میں مشہور کر دیا تھا۔ لیکن یہ اس کی مضمون نگاری میرے لئے ایک مستقل وجہِ مصیبت تھی۔ کیونکہ آپ واقع ہوئے تھے نہایت ہی بدخط۔ اس کے تمام مضامین مجھے صاف کر کے بھیجنے پڑتے تھے۔ یوں سمجھئے کہ مَیں اُس کا منشی تھا۔

مصیبت بن مانگے انسان کو مل جاتی ہے اور حصولِ مسرت میں انسان کی رُوح تھک جاتی ہے مگر وہ ہاتھ نہیں آتی۔ عاجز انسان لیکن آرزوئے مسرت کو اپنے سینے سے نہیں نکال سکتا۔ اسی تگ و دَو میں عمریں بیت جاتی ہیں اور سایہ مسرت تک ہاتھ نہیں آتا۔ اسکو نظامِ عالم کی بے ترتیبی سمجھئے یا معیشت کی خطرناک خرابی کہ سرمایہ داری پر تمام تر انحصارِ مسرت سمجھ لیا گیا ہے۔ کیا دُنیا میں ایک بھی ایسا سچا شاعر یا حقیقی فلاسفر نہیں ہے جو ہمکو اس ذلیل نقرئی دُنیا سے نکالکر کسی پاک اخلاقی عالم کا اپنے زورِ اجتہاد سے عادی بنا دے؟ ہائے مِلٹن کی وہ مجبوری کے عالم میں نکلی ہوئی تسکین کاذب کی ایک چیخ کہ خدا جس سے خوش ہوتا ہے اُس کو گرفتارِ مُصیبت کرتا ہے! ——

رمیش بھی زندگی کی ایسی ہی نامبارک کشمکش کا شکار بنا دیا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انسان طبعاً تمام بشری فضیلتوں کو لیکر پیدا ہو لیکن حیات کی ناسازگاریاں اس کے کیریکٹر کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہیں۔ ماحول میں اگر کردار سازی کی قوت تسلیم کر لی جائے تب بھی انسان کو اپنی مسرت کی تشکیل میں تمام تر غیر ذمہ دار تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ رمیش بھی اپنی چند کرداری کمزوریوں کا خود ذمہ دار تھا۔ ہاں جہاں تک اس کی غربت و بے سروسامانی کا تعلق ہے وہ اس باب میں بالکل بے بس تھا۔ اس کے چچا کی بے وقت موت نے اسکے تعلیمی انہماک کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن وہ پھر بھی پڑھے جا رہا تھا۔ ایک خوشگوار مستقبل کی موہوم اُمید میں۔

رمیش میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہ Take life as it is (زندگی جیسی بھی ہو اس سے مساعدت کرو) کے اُصول کا پورا پابند تھا یہی وجہ تھی کہ رنج اور دُکھ کی چبھن اُس کو زیادہ نہیں ستاتی تھی۔ بسرت پسندی بھی ایک حد تک آلام کی تابِ مقابلہ انسان میں پیدا کر دیا کرتی ہے اور وہ تھا شعریت پسند۔

گرمی کی تعطیلات آگئیں۔ کالج بند ہو گئے۔ لیکن میرا جی کلکتہ چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ رمیش کہیں چلدیا۔ ہم سنیما، باغ اور اپنے کمرے میں گرمی کی تعطیلات کا لطف لیتے رہے۔

دو ماہ کے بعد جب رمیش کلکتہ آیا تو اس میں مَیں نے نمایاں تغیر پایا۔ اس کی شاعری و مضمون نگاری بہت بلند ہو چکی تھی، اس پر ایک مسرت آمیز محویت سی طاری رہتی تھی اور وہ اپنے عاشقانہ اشعار کو نہایت رقت سے گنگنایا کرتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ عقد بیوگاں پر ایک سیر حاصل کتاب لکھ رہا ہے، ایسی بلند پایہ کتاب کہ اس کی اشاعت کے بعد ممکن نہیں کہ ہندو جاتی کا سدھار نہ ہو اور

بیوہ کی ذلیل پوزیشن بلند نہ ہو جاتی۔ میں نے اُس کی اس قیمتی کتاب پر اُس کو پنچگی مبارکباد پیش کی۔

ایک روز میں اس کتاب کے مسودے کو صاف کر رہا تھا کہ میں نے اُس کے ہینڈ بیگ میں خط لکھنے کے نہایت حسین کاغذوں کی کتاب بھی دیکھی۔ یقیناً رمیش اتنے اچھے کاغذوں پر اپنے مسودے کی نقل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو عشقیہ خطوط لکھنے کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ میں نے زیادہ تفتیش نہیں کی۔ انکو بند کر دیا۔

تین چار روز بعد مجھے دفعۃً تار ملا کہ والدہ صاحبہ کی طبیعت بہت خراب ہے مجھے جلد بردوان پہونچنا چاہیئے۔ دل تو کلکتہ چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن ماں کی دیکھ بھال بھی مجھ پر فرض تھی۔ فوراً بردوان پہونچا اور وہاں اُن کی نازک حالت دیکھکر سخت پریشان ہوا۔ پندرہ بیس روز تک والدہ کی حالت نہایت تشویشناک رہی جب ڈاکٹر نے یقین دلایا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہو گئی ہیں تو اطمینان ہوا۔ مرض میں افاقہ ہونے کے بعد اُن کا اصرار تھا کہ انکو تبدیل آب و ہوا کیلئے کسی گاؤں میں لے جایا جائے۔ مجھے کلکتہ کی لگن لگی ہوئی تھی لیکن دل پر جبر کیا اور شہری زندگی سے دور انکو ایک گاؤں میں لے گیا۔

اس گاؤں میں چند رؤسا نے اپنے وقتی قیام کے لئے چند اچھے مکانات بنا رکھے تھے۔ چنانچہ میں نے اُن میں سے ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ آس پاس کے تمام بڑے مکانات خالی پڑے ہوئے تھے ہاں غریبوں کی جھونپڑیاں آباد تھیں۔

ہم کو دو ماہ یہاں آئے ہوئے تھے۔ والدہ کی حالت بھی اب اچھی تھی۔ میں اُن کو صبح و شام تھوڑی دور ٹہلا لیا کرتا تھا پھر خود کبھی بہت دور تک جنگل میں سیر کو نکل جاتا۔ یہاں کی صحت بخش آب و ہوا نے میری تندرستی بھی بہت اچھی کر دی تھی۔

میں ایک روز صبح جو ٹہلنے کیلئے نکلا تو والدہ بولیں "راجو (میرا چھوٹا بھائی) کو بھی اپنے ہمراہ لے جاؤ۔ یہ میری بالکل نہیں سنتا ہے۔ دن بھر باغ میں بندر کی طرح امرود کے درختوں پر چڑھا بیٹھا رہتا ہے۔ دیکھنا کسی دن یہ اپنے ہاتھ پیر توڑ لے گا" میں نے جو باغ میں جاکر دیکھا تو واقعی راجو صاحب درخت پر چڑھے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی آپ وہیں سے کود پڑے۔

"کیوں ابھی کیا مرتا۔ تو بندر تو نہیں ہے کہ ہر وقت درخت پر ٹنگا رہتا ہے۔ چل میرے ساتھ"

"کہاں؟" اُس نے ڈرتے ہوئے اپنی جیبیں سنبھال کر پوچھا۔

"میرے ساتھ پھرنے چلو۔ تم بہت شریر ہو گئے ہو اور یہ آپ کی جیبیں زمین پر کیوں لٹکی پڑ رہی ہیں" میں نے جو انکو ٹٹولا تو کچی سفریاں اُن میں بھری ہوئی تھیں۔

"مر جائیگا اس قدر امرود کھا کر پھینک انکو!"

"واہ پھینکوں کیوں۔ بسنتی کو دیدونگا۔ اس نے منگوائے تھے ——"

"یہ بسنتی کون صاحبہ ہیں؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟ وہ اُس سامنے والے مکان میں آکر رہی ہے"

میں روز اس مکان کے سامنے سے گذرتا تھا لیکن اسکو خالی سمجھکر کبھی خیال بھی نہیں کیا۔ ہم جو اُس کے قریب پہونچے تو ایک چھ سات سال کی بچی راجو کو دیکھکر دوڑتی ہوئی آئی۔ ادھر راجو صاحب بھی لپک کر پھاٹک کے پاس پہونچے اور اپنی چھوٹی سی دوست کو نہایت محبت کے ساتھ امرود پیش کئے اور لگے باتیں کرنے۔ میں اسکو بلانے جب پھاٹک کے قریب پہونچا تو ایک بزرگ صورت انسان مجھے دیکھکر پھاٹک کے پاس آئے۔ میں نے انکو آداب کیا۔

"آپ بھی شاید یہاں تبدیل آب و ہوا کے لئے آئے ہوئے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں، میں اپنی والدہ صاحبہ کو لیکر یہاں آیا ہوں اور آپ . . . ؟"

"میں اپنی لڑکی کو لیکر یہاں آیا ہوں۔ چھ ماہ سے بیمار ہے ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں۔ کوئی بچنے کی توقع نہیں ہے" بوڑھے کے آنسو آگئے جنکو اُس نے اپنی دھوتی کے دامن سے پاک کر لیا۔

"آخر ایسی کیا بیماری ہے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ لاکھ علاج کرایا لیکن اسکی حالت خراب سے خراب تر ہی ہوتی جا رہی ہے"

"مالک رحم کرے" اسکے بعد میں نے بزرگ کو ڈھارس بندھائی اور راجو کو لیکر سیر کو نکل گیا۔

اب بسنتی روز ہمارے ہاں آنے لگی تھی۔ دونوں بچے کھیلا کرتے تھے۔ ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ راجو اور بسنتی دروازے میں کھڑے کسی بات پر جھگڑ رہے تھے کہ اتنے میں ڈاکیہ

آیا اور پانچ چھ خط اور اخبار وغیرہ مجھے دیکر چلا گیا۔ بسنتی لپکی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے خطوط کو حسرت سے دیکھتی ہوئی بولی " شنکر چاچا تمہارے پاس تو اتنے سارے خط آگئے مگر میری بیمار دیدی کے پاس ایک بھی نہیں آتا ہے۔ وہ روز بڑی بے کلی سے خط کا رستہ دیکھا کرتی ہیں ایک خط مجھے ان میں سے دیدو میں اپنی دیدی کو دیدونگی۔ روز پتاجی اور ماتا دیدی کو ڈانٹتے رہتے ہیں مگر وہ چٹھی کی باٹ دیکھا ہی کرتی ہیں "۔ بسنتی معصومانہ اپنے گھر کا بھید ظاہر کر رہی تھی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے

" لیکن میری چٹھی تمہاری دیدی کے کس کام کی ہے۔ اس پر اس کا نام تو لکھا ہوا ہے ہی نہیں "

" تم تو چاچا مجھے ٹال رہے ہو۔ لکھدو تم کسی چٹھی پر میری دیدی کا نام۔ اس میں تمہارا کیا بگڑ جائیگا "

" پگلی کہیں کی " آخر میں بولا " اچھا اب تم گھر جاؤ ماتاجی تمہارا راستہ دیکھ رہی ہونگی "

دوسرے دن بسنتی صبح ہی صبح پھر آموجود ہوئی اور میرے گھٹنے پر بیٹھکر بولی " لو چاچا یہ چٹھی لو اس پر دیدی کا نام لکھا ہوا ہے اب تم کسی چٹھی پر اس کا نام لکھکر مجھے دیدو۔ ہاں ہاں اچھے چاچا میری دیدی رات دن چٹھی کے انتظار میں روتی رہتی ہے۔ اسکو ڈھارس بندھ جائیگی "

میں نے آہستہ سے بسنتی کے ہاتھ میں سے خط لے لیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ تھی۔ یہ خط تو میرے دوست رمیش کا تھا۔ وہی بدخط وہی حسین کاغذ۔ رمیش جیسے بے فکرے کا اس لب گور لڑکی سے کیا تعلق تھا۔ میں سخت حیران تھا۔

" بسنتی یہ تو کہاں سے اڑا لائی ؟ "

" دیدی کے تکیے کے نیچے سے۔ وہ روز اپنے تکیے کے نیچے سے خطوط کو نکال کر پڑھتی ہیں پھر بہت دیر تک روتی رہتی ہیں۔ ماتا پتاجی سب کے خط روز آتے رہتے ہیں مگر میری دیدی کو کوئی خط نہیں بھیجتا اسی لئے وہ روتی رہتی ہیں۔ کیا کروں مجھے لکھنا نہیں آتا نہیں تو میں چٹھی لکھکر ڈاکیہ کو دیدیا کرتی کہ دیدی کو دیدینا "

یہ عجیب لڑکی تھی۔ خیر میں نے بدقت تمام اس کو بہلا کر باہر روانہ کیا اور کہدیا کہ دو ایک دن میں تیری دیدی کے نام چٹھی لکھدونگا اس کے بعد کپکپاتے ہاتھوں سے رمیش کا خط نکال کر پڑھا۔ وہی بھدا سوادِ خط تھا۔ بالکل غیر جذباتی اور خشک۔ تعجب تھا کہ اس قسم کے خط بھی ایک کشتۂ الفت لڑکی کی حیاتِ فسردہ کا سہارا بنے ہوئے تھے۔ ممکن ہے رمیش کی پسندیدگی کے باب میں یہ عشق زدہ لڑکی اور میں متحد المذاق واقع ہوئے ہوں۔

اس خط میں ظاہردارانہ طور پر گرمجوشی کا ثبوت دیا گیا تھا۔ شادی کی تجویز بھی تھی اس کے ساتھ ہی اسی کی تہ میں حصولِ جہیز کی آرزو بھی لپٹی ہوئی تھی۔ جس کو شاید اس فدائے محبت لڑکی نے سمجھا بھی نہوگا۔ سب سے زیادہ بھیانک چیز اس خط میں یہ تھی کہ کملا یہی کشتۂ محبت لڑکی بیوہ تھی اور رمیش اس کی بیوگی سے متنفر تھا۔ عقدِ بیوگاں کی زبردست کتاب کا مصنف خود بیوہ سے شادی کرنے میں ہچکچا رہا تھا! یہ ہوا کرتی ہے واعظین کی ذہنیت!! عملی زندگی میں وہ بالکل معطل ہوتے ہیں۔ سچ ہے تو بہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند۔

خط کو میں نے جیب میں رکھ لیا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ ابھی بسنتی آتی ہوگی کس طرح اس کے بے ضرر معصومانہ تقاضوں سے نجات حاصل کرونگا۔ پھر کملا کو بھی کسی طرح اس مصیبت سے نکالنا چاہیئے۔ یہ میرا فرضِ انسانی تھا۔ اپنے یا دوسروں کے غم کی سل کاش انسان اپنے دردمند ہاتھوں سے ہٹا دینے پر قادر ہوتا۔ کاش ہمدردی کا کوئی جاندار ہستی ہوتی جو بآسانی انسان سے مانوس کر لی جا سکتی!

میں انہی خیالات میں گم تھا کہ بسنتی آدھمکی اور آتے ہی خط کا تقاضا کیا۔

" بھاگ یہاں سے چٹھیاں اتنی آسانی سے نہیں لکھی جایا کرتی ہیں۔ کل پرسوں تک لکھدونگا " میں نے اس بچی سے کہا۔

" تو دیدی اس وقت تک مر بھی جائینگی۔ وہ کل کہہ رہی تھیں کہ اگر رمیش کا خط ایک دو دن میں نہ آیا تو میرا بچنا مشکل ہے "

میں نے خدا خدا کرکے اس وقت تو اس کو ٹالا اور اس کو کہا کہ چلو تم کو سیر کرا لاؤں۔ راج بھی ساتھ ہو لیا۔ جب ہم بسنتی کے مکان کے قریب پہونچے تو وہ ایک دم چیخ اٹھی " دیکھو چاچا وہ بیٹھی میری دیدی۔ وہ اس برگد کے درخت کے نیچے " میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک انسانی ڈھانچہ شال اور کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ چونکہ میں اس محبت اور بیوفائی کے ڈرامے میں شریک ہو چکا تھا اس لئے اس کا اب ہر سین دیکھنا مجھے لازم ہو گیا تھا۔ میں نے قریب سے دیکھا کہ ایک مرجھائے ہوئے چہرے پر سے دو بڑی بڑی بے رونق آنکھیں خلا میں جمی ہوئی ہیں۔

بستی لپکی ہوئی اُس کے پاس گئی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر بولی۔

"دیدی تم مت مرو۔ نہیں مرو گی نہ۔ کل ڈاکیہ تمہارا خط لے آئیگا"

دو فسردہ لب جدا ہوئے اور اُن میں سے یہ نحیف آواز نکلی۔

"تجھے کس طرح معلوم ہوا؟"

"میں جو کہتی ہوں اس پر یقین کرو۔ کل خط لے لینا بس۔ اب تو مت مرو میری پیاری دیدی" اُن اندوہگیں بڑی بڑی آنکھوں سے چند آنسوؤں کی بوندیں ٹپک پڑیں اور زمین پر گر کر خشک ہوگئیں۔

میری بیخواب راتوں میں ہر وقت وہ مُردنی چھایا چہرہ میرے پیش نظر رہنے لگا۔ افسوس میں کسی طرح اس لڑکی کو دُکھ سے نجات نہیں دلا سکتا تھا۔ رمیش کو ایک پند نامہ لکھتا تو یہ بیکار تھا کیونکہ وہ نہایت خودسر اور مغرور واقع ہوا تھا۔ عجیب پریشانی میں مبتلا ہوگیا تھا میں۔

ڈاکیہ روز دن کے ایک بجے آیا کرتا تھا۔ میں بستی کے مکان کی طرف نکل جاتا اور جب وہ چٹھیاں لے کر اس کے مکان میں داخل ہوتا تو نحیف وزار کملا اپنے خشک ہاتھوں سے کھڑکی کی جالی پکڑ کر کھڑی ہوجاتی، اس وقت اس کی تمام روح آنکھوں میں جمع ہوجاتی تھی جو مسلسل ڈاکیہ کی طرف نگراں رہتی تھیں۔ ادھر ڈاکیہ جاتا اُدھر وہ مفلوج ہوکر پلنگ پر گر پڑتی، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کی زندگی کے اس ڈرامے کا پردہ اختتامیہ گر چکا ہے۔

کملا کی الم رسیدہ بیجان مورت میں کیا روح کبھی ہنستی ہوئی کروٹ نہیں لے گی کیا اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر کبھی تبسم رقص نہیں کریگا۔ کیا کوئی صورت ہو سکتی تھی کہ زندگی کی اس مبہم تصویر میں پھر رنگ بھرا جا سکے؟ میں کوشش کروں گا۔ میں نے دل میں سوچا۔

آخر میں نے رمیش کا پارٹ ادا کیا۔ اس کی جانب سے کملا کو خط لکھا۔ رمیش کے سوادِ خط سے میں خوب واقف تھا۔ اس کی بدخط تحریروں کی کئی بار نقل کر چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم میں نے کیا کیا لکھ ڈالا۔ میں اس سے محبت تو کرتا نہیں تھا کہ حقیقی جذبات صرف کرسکتا، لیکن بیرحم رمیش کے ننگ جذبات کو بھی یہ توفیق نصیب نہیں ہوسکتی تھی جو مجھے فرضی عاشق بنکر اس لڑکی کی اداس روح کو خوش کرنے کو حاصل ہوگئی تھی۔ کملا کی مایوس تمنائیں ایسے پرسوز خط کی توقع بھی نہیں کرسکتی تھیں۔ اس طرح آخر کملا کی ناامید آنکھوں کے سامنے رمیش کا خط، ہاں وہ خط جس کے انتظار میں اُس کی روح تنِ زار میں اٹکی ہوئی تھی پہونچ گیا ــــ میں اس کو دور سے دیکھ رہا تھا۔ اس فسردہ چہرے پر زندگی کے آثار آنے لگے۔ اور ان خلاء کی نگراں آنکھوں میں ایک دم رونق پیدا ہوگئی۔

دوسرے دن کملا مر گئی۔ مر گئی بیچاری آخر۔ گھر میں آہ و بکا کے ساتھ بستی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی "ہائے دیدی تم مر گئیں میں تو تمہارے لئے اور بہت سی چٹھیاں لاتی"

جب اس کو چتا پر رکھا گیا تو ایک لفافہ زمین پر گر پڑا۔ میرا ہی خط تھا جس کو رمیش کی طرف منسوب کرکے لکھا گیا تھا، وہ اس خط کو اپنے ساتھ جنت میں لیجانا چاہتی تھی۔ پُرارمان لڑکی! میں نے اس خط کو بھی آگ کے ملتہب شعلوں کے حوالے کر دیا۔

تین چار ماہ بعد جب میں کلکتہ گیا تو رمیش سے بھی ملاقات ہوئی۔ اُس کی عقد بیوگاں کی حمایت میں لکھی ہوئی کتاب چھپ چکی تھی۔ ایک جلد اُس نے مجھے بھی اس کی نذر کی جس کو میں نے نہایت حقارت سے اُس کی آنکھوں کے آگے کھڑکی میں سے سڑک پر پھینک دیا۔ اس کے بعد غصہ سے بولا۔

"رمیش! اگر تم پھر میرے پاس کبھی آئے تو تمہارا بھی یہی حشر ہوگا جو تمہاری کتاب کا ہوا ہے"

* * *

قیسی رامپوری

نوائے زندگی

قدم آگے آگے بڑھاتا چلا جا! عزائم کے پرچم اڑاتا چلا جا!
زمینِ زماں پر تو چھاتا چلا جا! خدائی پہ قبضہ جماتا چلا جا!
دو عالم پہ سکہ بٹھاتا چلا جا!

قیودِ غلامی مٹاتا چلا جا! قصورِ تکبر گراتا چلا جا!
سلاسل کے پرزے اڑاتا چلا جا! مفاسد کی بنیاد ڈھاتا چلا جا!
نئی ایک دنیا بناتا چلا جا!

خمارِ تغافل سے سب کو جگاتا تباہی کے عفریت کا خوں بہاتا
فلاکت زدہ بستیوں کو جلاتا شبابِ ظفرمند کے گیت گاتا
ترقی کو رستہ دکھاتا چلا جا!

کہیں قیصری کے مظالم سے آہیں یہ سرمایہ داری کی مہلک نگاہیں
شقاوت سعادت کی تنگ راہیں شیاطیں کے پنجوں میں انساں کراہیں
بغاوت کے طوفاں اٹھاتا چلا جا!

دل و دست و بازو کو فولاد کر دے مصائب کی دنیا کو برباد کر دے
مسرت سے عالم کو آباد کر دے بنی نوعِ انساں کو دل شاد کر دے
ہر اک گام پر گل کھلاتا چلا جا!

حقائق سے بچنا تخیل کی پستی حقائق سے ڈرنا بزدل بت پرستی
حقائق سے پنجہ کشی اہلِ مستی ہے تخریب و تعمیر میں رازِ ہستی
حقائق کو تابع بناتا چلا جا!

جہاں گر نہیں تیری عظمت کا قائل زمانہ اگر ہے ستانے پہ مائل
حوادث کے زخموں سے گر ہے تو گھائل مصائب کے دریا جو ہوں راہ میں حائل
شجاعت کے جوہر دکھاتا چلا جا

فراغت! یہ کیا کہہ دیا تو نے ہمدم! نہیں ہے مرے زخمِ دل کا یہ مرہم
فراغت ہے روحِ بشر کے لئے سم عمل زندگی ہے عمل قاتلِ غم
تو رہوارِ ہمت بڑھاتا چلا جا

صداقت کا جب لُٹ رہا ہو خزانہ ہو ایثار کا بدلہ جب تازیانہ
نگاہِ وفا جب محض ہو فسانہ محبت کی نظریں بھی ڈھونڈیں بہانہ

شرربار نغمے سُناتا چلا جا!

فسردہ ہوں جب نوجوانوں کے تیور نیاموں میں سڑتے ہوں شمشیر و خنجر
گرجتا ہو جب سامنے آ کے عنتر دکھا بڑھ کے میدان میں زورِ حیدر

رَجز پڑھتا لڑتا لڑاتا چلا جا!

نہ احساس کو دے فریبِ مسرت جنوں ہے فراغت، مرض ہے فراغت
نہیں سرخوشی میں ہے پایندہ راحت عمل میں ہے جنت، عمل سے ہے جنت

جہنم کو جنت بناتا چلا جا!

فریبِ مے و نغمہ کھانے سے حاصل حسینوں کے جلوے بلا کے ہیں قاتل
فراغت فسوں ہے تعیش ہے باطل ہے منزل کا دھوکا، نہیں ہے یہ منزل

فریبوں کے پردے ہٹاتا چلا جا!

تبسم گریزاں ہے عشرت کا جلوہ ہے رازِ مے و نغمہ سوزِ شرارہ
سرابِ تمنا نگاہِ دل آرا فریبِ بہاراں یہ لب ہائے رعنا

حسینوں سے دامن چھڑاتا چلا جا

نہ غم زندگی ہے، نہ سم زندگی ہے ہیں کیوں مان لوں پر الم زندگی ہے
ہے دل جامِ جم، جامِ جم زندگی ہے تب ہاں کی تیغِ دو دم زندگی ہے

روانیِ تیغ آزماتا چلا جا!

زمانہ ہے مرکب، خودی تیری اکب زمان و مکاں پر ہے انسان غالب
ہے فطرت تری کارسازی کی طالب بدل دے ذرا اٹھ کے قدرت کا قالب

مشیت سے آنکھیں لڑاتا چلا جا!

خودی فرد کی خود پرستی نہیں ہے یہ اقوامِ عالم کی مستی نہیں ہے
شرابِ خودی آتی سستی نہیں ہے علو ہے یہ انساں کا، پستی نہیں ہے

نوائے مساوات گاتا چلا جا!

خودی نوعِ آدم کی ہے خود شناسی خودی آدمیت کی تقدیر سازی
خودی زندگی ہے، خودی غیرفانی خودی روحِ انسانیت کی خدائی

خودی کے دمامے بجاتا چلا جا!

اختر اورینوی

مُسلم واٹر ورکس

مسلمانوں کے تعمیری کارناموں میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ آبِ رواں کا وجود ہے۔ آپ خواہ کسی باغ کو دیکھنے جائیں، یا سلاطین و اُمراء کے مقابر پر جاکر "ماضیِ رنگیں" کو حیرتِ حال" کا موجب بنائیں، وہی ایک نُمایاں خصوصیت آپ کو مسلم طریقۂ تعمیر میں نظر آئیگی .... انظر فریب روشیں، بیچوں بیچ سنگین یا خشتی راستے، بہتی ہوئی نہریں۔ جن کے کنارے کنارے گھانس کے حاشیے چھوڑ کر چمن بندی کی گئی ہے، مسلم تعمیری ڈیزائن کا خاصہ ہیں .... چنانچہ مسلمانوں نے جہاں اور علوم و فنون کو اوجِ کمال تک پہونچا کر دم لیا تھا، وہیں ہمیں ایسے رسائل و کتب بھی دستیاب ہوتی ہیں جن میں پانی کو بلندی پر چڑھانے، پن چکیوں اور جھلاروں کے بُنیادی اُصولوں پر نہایت تفصیل سے شکلوں و علومِ ہندسہ و سیاق کی مدد سے بحث کی گئی ہے۔ اور جو مسلمانوں کی تعمیری فنون میں مہارتِ تامّہ پر دال ہیں۔

اسلام ایک ابرِ کرم تھا۔ جس نے خاکِ تیرہ کے کونے کونے کو اپنی بارشِ الطاف سے فیضیاب کیا۔ لیکن چونکہ "خمارِ تشنہ کامی بقدرِ ظرف" تھا۔ اس لئے جس خاک میں قبولِ اثر کی استعداد زیادہ تھی۔ اُسی قدر وہ زیادہ فیضیاب ہوئی۔ چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنے دیرینہ مذاق کے لئے وسیع میدانِ عمل پایا۔ اس لئے جہاں ہندوستان میں قلعوں، ایوانوں اور مسجدوں کی تعمیر کا انتظام کیا گیا وہیں بڑے پیمانے پر باغات وغیرہ بھی لگوائے گئے، جن کے حُسن و خوبی کو سیمابِ رواں کی نہریں اپنے خنک پرور اور خوشگوار اثرات سے چار چاند لگاتی تھیں —— امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مغلوں سے پہلے کے مسلمان شاہنشاہوں کے تعمیری کارنامے یا تو اس قدر شکستہ ہوچکے ہیں کہ "صورت بھی پہچانی نہیں جاتی"۔ اور یا صفحۂ دہر سے اس طرح مٹ چکے ہیں گویا ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ صرف مغل تعمیرات یا شاہانِ دکن کے ایوان و مقابر اپنی عبرت انگیز اداسی اور ویرانی سے چشمِ سیاح کو صحیفہ ہائے تاریخ و سیر کی مستعار معلومات کی اُجڑی کُھسٹی اور ادھوری سی تمثیل پیش کرتے ہیں —— !

اِن تعمیرات کی امتیازی خصوصیت، جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں، آبِ رواں کا وہ انتظام ہے جسے ماہرینِ فنِ تعمیر *Ornamental Water* یا "تزئینی آبیاری" کہتے ہیں۔ پہلے باغات کو لیجئے۔ آبِ رواں کا وجود **اتنا ہی لازمی** تھا جتنا کہ پھولوں، پارہ دریوں .... اشجار وغیرہ کا —— اور حق تو یہ ہے کہ یہی چیز مشرقی باغات کے ہاں مغربی گلستانوں کے مقابلہ میں مابہ الامتیاز ہے۔ اس کی تہ میں صرف آرائشی اور تزئینی مقاصد ہی نہ تھے۔ بلکہ ہندوستان کے گرم سورج سے جھلسے ہوئے میدانوں میں باغات کی فضا میں خنکی اور طراوت کے اثرات پیدا کرنے کیلئے ان میں چھوٹی چھوٹی نہروں اور جابجا مناسب مقامات پر خوبصورت حوضوں کی تشکیل و تعمیر ایک ضروری امر تھا۔ فوارے وغیرہ خالص تزئینی و آرائشی چیزیں سہی۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ان کی خوبصورت پھوار اور نفیس عمل سے ایک طرف تو باغ کے حسن و خوبی میں چار چاند لگاتا تھا اور دوسری طرف اپنے خنک پرور اثرات سے فضا کو خوشگوار بنانے میں ممد و معاون ہوتا تھا۔ چنانچہ باغات میں مرمریں جوئباروں، سنگین نالیوں اور خوبصورت نہروں کے ذریعے سے ہر کونے میں "چمکتے ہوئے سیماب" کو پہونچایا جاتا تھا۔ روانی میں مناسب لرزش اور تیزی پیدا کرنے کے لئے مصنوعی آبشاروں وغیرہ سے کام لیا جاتا تھا اور جگہ بہ جگہ خزانے اور حوض پانی کی ایک خاص مقدار مہیا کرنے کے لئے بنائے تھے۔ لیکن ہر جگہ حُسن آفرینی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی۔ مثلاً جوئباروں اور نہروں کی تہ کو چھوٹے چھوٹے قطار اندر قطار اُبھرے یا کھُدے ہوئے حلقوں سے مزیّن کیا جاتا تھا۔ مصفّا پانی میں روشنی کے انعکاس اور لہروں کے ردّ عمل سے پانی کی سطح پر ہزار ہا سیمیں اور زرّیں نقوش دکھائی دینے لگتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پانی علیحدہ علیحدہ دھاریوں میں بہ رہا ہے، مصنوعی آبشاروں کی تہ کو تو اور بھی منقش کیا جاتا تھا۔ پانی کی مناسب تیز روی، نقوش کی نظر فریبی اور روشنی کا خاص زاویوں سے انعکاس —— سب مل کر ایک عجیب "نیرنگیِ طلسم" کے خالق بن جاتے تھے۔ لاہور، کشمیر اور کابل کے شالامار، باغِ نشاطِ کشمیر یا بابر کا "نور افشاں" (رام باغ اکبرآباد) وغیرہ اِس

اجمال کی جیتی جاگتی تفصیل ہیں۔ بعض دفعہ پانی کو بلندی سے گرا کر ایک چھوٹا سا مگر چھ سات فٹ گہرا مرمریں حوض بنایا جاتا تھا۔ حوض کی دیواروں میں چاروں طرف چھوٹے چھوٹے طاقچے رکھے جاتے تھے۔ جن میں مختلف سائز کے روشن دیے رکھے جاتے تھے۔ پانی کی ہلکی شفاف سیمابی دھاریوں کی افتاد میں ان روشن چراغوں کی جھلکیاں عجیب لطف دیتی تھیں۔ چنانچہ لاہور اور کشمیر کے باغات اور لال قلعہ کی "ساون بھادوں" میں اب بھی وہ طاقچے موجود ہیں جن کو دیکھکر چشمِ تصوّر کے سامنے وہ رُوح پرور مناظر کھنچ جاتے ہیں جب حوضوں کے چاروں طرف مرمریں تختوں پر کمسن کنیزیں اور بادۂ حُسن اور دبدبۂ شاہی سے مخمور نوجوان شہزادیاں اور بیگمات بھری برسات کی مست و جوان راتوں میں گرتے ہوئے زرّیں پانیوں میں جھلکتے ہوئے چھوٹے بڑے چراغوں کی جھمجھاتی روشنیاں دیکھکر نقرئی قہقہوں سے باغ کی نکہت بیز فضا کو گونجا دیتی تھیں۔

بعض اوقات جوئباروں اور نہروں کی تہ میں مرمریں دھاریوں کا ایسا انتظام کیا جاتا تھا کہ پانی اپنی روانی میں اِن سے آہستگی مگر خاص التزام سے ٹکراتا تھا۔ مناسب جگہوں پہ مختلف الالوان پتھروں سے مَرمَر پر چھوٹی بڑی مچھلیوں کی اُبھری تصویریں تراشی جاتی تھیں، پانی کا اِن سے ردِّ عمل خوبصورت بھنوروں کی طلسم بندیاں کرتا تھا۔ انعکاسِ ضیا اور پانی کے اس ردِّ عمل سے وہ نظر فریب نیرنگیاں وجود میں آتی تھیں کہ سنگین مچھلی زندہ مچھلی کی طرح کروٹیں لیتی پانی میں تیرتی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مثالیں دہلی اور آگرہ کے باغات میں مل سکتی ہیں۔ اور خاص کر دکن میں اُس عظیم الشان باغ کی خوبصورت نہروں میں جو "بی بی مقبرہ" کو آغوش میں لئے ہوئے تھے۔

باغات میں فوّاروں کا وجود بھی اتنا ہی ضروری خیال کیا جاتا تھا جتنا کہ مذکورۃ الصدر جوئباروں کا یا سرو صنوبر کی قطاروں اور گلہائے رنگا رنگ کے نکہت فروش تختوں کا ـــــــ پھول اپنے 'خاموش حسن' سے بالیدگیِ رُوح کا افسانۂ رنگیں پیش کرتے تھے، تو فوّارے اپنی بیتاب نقرئی پھواروں سے جنّتِ نگاہ کی کسی غیر مرئی داستان سے نہروں کے متحرک پانیوں کے دل میں ارتعاش پیدا کر دیتے تھے۔ خصوصاً طشتِ فوّارہ میں پھوار کی اُفتاد اور سربلندی سے جو خفیف اور مدّھم نغمے پیدا ہوتے تھے ان کی نازکی اور دلآویزی پر 'بربطِ ناہید' کے ہزاروں قدسی نغمات قربان ہیں۔ چنانچہ فوّاروں کے ڈیزائن میں مسلمان انجنیروں کی طبعِ رسا نے جو جو گُل کھلائے ہیں وہ اُن کی عقلِ دُور رس کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ مغل باغات میں جب فوّارے ساکن ہوں تو اِن کا حُسن اور دیکھنے کا لُطف آدھا رہ جاتا ہے۔ آپ خیال فرمائیں کہ مخصوص مغل باغاتی ڈیزائن ـــــــ ایک حوض، . . . . چاروں طرف سے چھوٹی چھوٹی نہریں آکر گِر رہی ہیں اور نکل رہی ہیں، ہر طرف فوّارے اور بیچوں بیچ خوبصورت مَرمَریں تخت یا چھوٹی سی بارہ دری . . . . . یہ ایک تختۂ باغ اپنے گلہائے رنگا رنگ کی رعنائیوں، آبِ رواں کی نظر فریبیوں اور دلآرائیوں اور فوّاروں کی پھواروں کے ساتھ فردوسِ نگاہ نہیں تو اور کیا ہے! ـ ع:

پوچھتا ہوں مَیں کہ یہ کیا ہے اگر جنّت نہیں

کشمیر کے تینوں چاروں باغات کو دیکھئے یا لاہور و دہلی کے گلستانوں کو فوّاروں کے سکون کے وقت اُن کی دلکشی میں جو ناقابلِ محسوس خلا پڑ جاتی ہے اُسے عقلِ فسوں پیشہ کی کوئی مفاہمت بھی اپنی ہمہ اوستی کے زعم میں پُر نہیں کرسکتی۔

۲۔ اب محلات اور ایوانات کو لیجئے۔

دلّی ـــــــ جس کے متعلق عارفِ ہندی اقبالؒ کا ارشاد ہے:

سرزمیں دلّی کی مسجودِ دلِ غمدیدہ ہے
ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

ـــــــ کے لال قلعہ میں ہر کمرے اور ہر محل میں وہی ایک "نہرِ بہشت" گُزرتی ہے، جو مغل ماہرانِ تعمیر اور صنّاعانِ نادرہ کار نے جمنا سے کوئی ستر میل اوپر نکالی تھی۔ اِس نہر کے کنارے کنارے مناسب مقامات پر چمن بندی کی گئی ہے۔ جگہ بجگہ چھوٹی چھوٹی آبشاروں اور کنول نما خوبصورت حوضوں سے قولِ 'چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد' کی اِس خوبصورتی سے تعمیل کی گئی ہے، کہ زبانِ توصیف فرطِ تحیر سے گنگ کی گنگ رہ جاتی ہے۔ اِس کا وجود نہ صرف خنکی کا ضامن تھا بلکہ پانی کی نغمہ ریز روانی شہزادیوں اور بیگمات کی مترنم گفتگو کی ہلکی سہری بازگشت سے مل کر ایک عجیب غیر ارضی راگنی کی خالق بن جاتی تھی۔ اس سے قطع نظر مصفا آب کی نقرئی جھلکیاں سفید اور بے داغ مَرمَر کی جوئباروں میں عجیب لُطف دیتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہزادیاں اِن کنول نما حوضوں میں رنگ برنگ کی پالتو مچھلیوں سے کھیلا کرتی تھیں جن کی گردنوں کے گرد مرصّع حلقے اور طوق ہوتے تھے۔

حمامِ شاہی اپنی آب رسانی کے عجیب اور نادرِ روزگار سسٹم

کی بدولت مسلم فنِ تعمیر اور آبیاری انجنیرنگ کا محیّر العقول کارنامہ ہے۔
گرم اور سرد پانی کا انتظام اور حوضوں میں زمین دوز نالیوں سے پانی کی آمد و رفت کی ترکیب آج تک تمام قرونِ مابعد کے انجنیروں کے لئے ایک دلچسپ معمّہ ہے۔

چنانچہ تعمیرات میں آبِ رواں اور فوّاروں کی تعمیر و وجود کا خیال جنون کی حد تک کو پہونچ گیا تھا۔ مقبرہٗ آصف جاہ و جہانگیر، مزار نورجہاں، فتح پور سیکری، قلعہٗ اکبرآباد اور تاج محل یا مختلف مقامات کے شالامار و نشاط باغات اور آرام باغ وغیرہ تو ایک طرف رہے، جہانگیر نے جو کشمیر خطہٗ مینو نظیر کی بہاروں کا بہت دلدادہ تھا یہاں تک کیا کہ کشمیر جانے کا جو راستہ اُن دنوں "راہ نوردانِ منزلِ شوق" کا معمول تھا، اس پر جابجا منزل بہ منزل جو سرائیں یا تفرج گاہیں تعمیر کرائیں اُن میں اب تک شکستہ نہریں، ٹوٹے پھوٹے فوّارے اور حوض اپنے عظیم المرتبت بانی کا خاموش مرثیہ پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ باقی رہا آب رسانی کے عجائبات و محیّر العقول کارنامے تو انکی بھی کمی نہیں۔ قلعہٗ اٹک کی ڈھلواں اور سنگین گھاٹیوں پر تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پانی چڑھانا اور ہر منزل پر جانوروں اور سپاہیوں کے لئے پانی کا مناسب انتظام کوئی بازیچۂ اطفال نہیں۔ کہ موجودہ فنِ تعمیر و آب رسانی اس پر انانیت سے خندۂ استہزا کی جرأت کر سکے۔ اسی طرح اجمیر شریف میں قلعہٗ تاراگڑھ کے دامنوں میں "چشمۂ نور" کے ارد گرد عیش باغ اور بارہ دریوں کے باقیماندہ نشانات ایک مجوزہ واٹر ورکس کی عمارت کے کھنڈرات بھی نظر آتے ہیں۔ جو جہانگیر کے ذوقِ تعمیر کا "نقش فریادی" ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے قلعہٗ تاراگڈھ کی بلندیوں پر تقریباً ۸۰۰ فٹ کے ارتفاع تک پانی چڑھانے کے انتظام کی تجویز تھی۔ فی زمانہ برقی کلوں اور Elevators کی بدولت یہ کوئی مشکل بات معلوم نہیں ہوتی۔ مگر آج سے چار صدیاں قبل جبکہ بجلی اور اس کی متعلقہ کلیں اور عجوبہ روزگار کارنامے برتر از وہم و گمان تھے اُس وقت اگر یہ حقیقت منتظر لباسِ مجاز میں جلوہ گر ہو جاتی تو واقعی صنّاعی کا بیش کارنامہ ہوتی۔

سلاطینِ گولکنڈہ کا ذوقِ تعمیر ضرب المثل ہے۔ قلعہٗ گولکنڈہ جس کو مشرق کے مفکرِ اعظم نے "جولانگاہِ عالمگیر" اور "اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ" اور "پاسبانِ مقابر سلاطینِ قطب شاہیہ" سے خطاب کیا ہے۔ اس کی سنسان اور گورستانِ ہنگامۂ کہن،

پہنائی میں اب بھی چشمِ سیاح اُس سسٹم کو دیکھکر نظر بند نظر آتی ہے، جس کے باعث مٹی کے نلوں کے ذریعے پانی اُن تمام محلات، ایوانات اور بارہ دریوں تک پہونچایا جاتا تھا جو تقریباً ۵۰۰ فٹ بلند سطح پر اپنی تمامتر رعنائیوں اور زیبائیوں سے مسلم تمدن کے گہرہائے تابندہ کا امین تھے۔ اسی طرح قلعہٗ لاہور میں بیگمات کے محل جو تیسری منزل پر واقع ہیں، اُن میں بھی حوضوں اور فوّاروں کا ویسا ہی تسلی بخش اور خوبصورت انتظام تھا۔ جیسا کہ دوسرے ایوانات میں۔

بیجاپور میں قرونِ وسطیٰ کے مسلمان صنّاعوں کی عملی دستکاری کا وہ حیرت انگیز کارنامہ "ست منزلی" (ایوان) میں آب رسانی کا وہ مکمل اور نادر سسٹم ہے جو تمام منزلوں پر خوبصورت فوّاروں، سنگین حوضوں اور مرمریں حماموں کے لئے پانی کی مناسب مقدار مہیا کرنے کا ضامن تھا۔ اسی تاریخی شہر میں "مبارک خاں کے محل" کی تعمیر کا مقصد اوّلیں محض "آبی صنائع" کی نمائش تھی۔ جس کیلئے چابکدست معماروں اور شہرۂ آفاق انجنیروں اور صنّاعوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ "یارانِ نکتہ داں" کو یہ "صلائے عام" اور سرپرستیوں کی "جرأتِ رندانہ" کی بدولت یہ یگانۂ روزگار عمارت اس التزام سے تیار ہوئی کہ دُور سے دیکھو تو گنبددار سہ منزلی بارہ دری نما چیز تھی۔ مگر آب رسانی کا انتظام دیواروں یا چھتوں میں پوشیدہ نلوں سے اس طرح کیا گیا تھا کہ نلوں کی "بھول بھلیاں" ان محرابوں کے پاس منقطع ہوتی تھیں جن کو سنگِ موسیٰ کے منقش اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ جن کے اُوپری سروں پر محرابوں کے جوڑ میں یا کارنس کے نیچے باہر کی طرف سنگین طاؤس نما دیوارگیریاں Brackets ایستادہ تھیں۔ اِن سنگین طاؤسوں کی کلغیوں اور منقاروں سے پانی کی پتلی پھواریں خاص وقفہ کے بعد پھوٹتی تھیں۔ دوسری منزل بھی ایسی ہی تھی۔ تیسری منزل پر ایک بڑے حوض میں ایک خوبصورت فوّارے کے شکستہ نشانات ہیں۔ اور ان "باقیات الصالحات" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نلوں کی تمام ٹونٹیاں یہاں ختم ہوتی تھیں یا بالفاظِ دیگر اختتامی پھواریں یہاں پھوٹتی تھیں۔ روانی اور عمل کے ہنگام تمام سیّال چاندی کی منتظم پھواروں میں ترشح میں بھیگتی ہوئی نوعروس کی طرح معلوم ہوتی تھی۔

ایک اور نفیس اور نادر صنعتِ آبی کا ذکرِ جمیل یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جو بہت سی مسلم تعمیرات میں موجود ہے۔ لیسے بھی "آبی

جھل بھتیاں کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ فیتہ نما چھوٹی چھوٹی پانی کی مرمریں نالیوں پر مشتمل ہوتی تھی جو سنگین قدرتی ۔۔۔ صورت سے تراشی جاتی تھیں کہ ایک دوسرے نالی کے مابین باریک سی اوٹ حائل رہے۔ نتیجۃً پانی کی روانی ایک نہایت خوبصورت متحرک معمہ کی نادرہ کار رنمائی بن جاتی تھی جس میں دائیں بائیں متفاد سمتوں سے کروٹیں لیتا ہوا تیز پانی نوخیز پنہاریوں کی نازک کمر دل کی طرح بل کھاتا دکھائی دیتا تھا۔

الغرض مسلمان آبِ رواں کی متعلقہ صنعتوں کے عملی تزئینی پہلوؤں سے کما حقہ واقف تھے قطع نظر اس کے کہ انہیں موجودہ ترقی یافتہ ذرائع اور سہولتیں اور سائنسی ایجادات سے استفادہ کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ چنانچہ جہاں فنونِ تعمیر میں ان کے کارنامے دیدہ عبرت نگاہ کو ماضی رنگین کا وہ دلفریب مرقع پیش کرتے ہیں کہ بے ساختہ یہی جی چاہتا ہے کہ ع

اس کی اک تصویر پوشیدہ کفن میں لے چلوں

وہیں ان پُر شوکت ایوانوں اور نکہت فروش گلستانوں میں نفیس مرمریں فواروں کو چاندی کی برناتیوں میں گہر ریز دیکھکر وہ شاہی کرّ و فر کے مرعوب کن مناظر چشمِ تصور کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور دلِ رنجور کا ہدیۂ آہ، لب تک آتے آتے فریاد میں تبدیل ہو جاتا ہے ؎

زیب یارب زینتیں اِن شہ نشینوں کیلئے
یہ مکاں ترسا کریں کبتک مکینوں کیلئے

لیکن جن بدقسمت عمارتوں کا سہاگ بے رحم زمانہ کے ہاتھوں لُٹ چکا ہے۔ اور جن کی شان و شوکت و حسنِ صنعت کی داستانیں محض اوراقِ تاریخ کو زینت دے رہی ہیں ان کے متعلق۔ ع ؎

"منظرِ تاراجیٔ باغ و بہار ماست ایں"

کہکر خون کا گھونٹ پی کر چپکا ہو رہنا پڑتا ہے۔ سچ ہے:۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ، وَیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام

مختار صدیقی۔ بی۔ اے

تحریکِ شوق

کسی تارے سے جب آغوشِ مہ نزدیک ہوتی ہے
دلِ حسرت زدہ میں شوق کی تحریک ہوتی ہے

خدا محفوظ رکھے اس شبِ مہتابِ ہجراں سے
کہ اس کے نور سے دنیائے دل تاریک ہوتی ہے

نظر کے سامنے آکر حجابِ ہر نظر ہو جانا!
کہ پردے سے وقارِ حُسن کی تضحیک ہوتی ہے

وفورِ شوق میں خود اپنے ہی سجدے میں جھک جانا
جنونِ عشق کی یوں بھی کبھی تحریک ہوتی ہے

سمجھ میں گو نہیں آتا مگر اتنا سمجھتا ہوں
کہ تجھ پر غور کرتے سے نظر باریک ہوتی ہے

یہی ملبوس ہے لیکن تنِ گل پر ہے کیا عالم!
قبائے حُسن اک تیری ہی قد پر ٹھیک ہوتی ہے

ادھر جنبش ہوئی بجلی بنی اور گر پڑی دل پر
جبینِ حُسن پر جو اک شکن، باریک ہوتی ہے

خیالِ وصل پر ہلکا سا ہے اُمید کا سایہ!
دُلہن کے رُخ پہ جیسے اوڑھنی باریک ہوتی ہے

عسکری طباطبائی

ادیب بیوی

میں نے ایم۔ اے اور دیگر بہت سے امتحان پاس کر لئے تھے۔ اِن امتحانوں کے پاس کرنے میں میں نے اپنی جوانی کے شگوفے یعنی آنکھوں کی چمک، مُنہ کی گولائی، اور سر کے بال کھو ڈالے تھے۔ اور حالت یہ ہوگئی تھی کہ اَب مجھے امتحان، امتحان دینے والوں اور امتحان لینے والوں، سب سے نفرت ہوگئی تھی۔ یہ تو دل کا حال تھا مگر جسم کی حالت اَور بھی ناگفتہ بہ ہوکر رہ گئی تھی۔ رنگ جو پہلے ہی گندمی تھا اب مائل بہ سیاہی ہوگیا تھا۔ گال پچک گئے تھے۔ دل خواہ مخواہ دھڑکتا تھا۔ رات دن پڑھ پڑھکر چار اور سگرٹ پینے کی خوب عادت ہوگئی تھی۔ غرضکہ جی یہی چاہتا تھا کہ ــــ ایک سگرٹ کا ڈبہ ہو اَور اچھا سا چائخانہ ــــ اَور مَیں دن رات وہاں بیٹھا ہُوا، لیٹا ہُوا، سوتا ہُوا چار اور سگرٹ پیا کروں۔ مگر آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اَور۔ چنانچہ اِن ڈگریوں کے زور پر مجھے ایک سکول میں معقول تنخواہ پر ملازمت مل گئی اور چند مہینوں کے آرام کے بعد میری مُردہ رگوں میں خون دَورہ کرنے لگا۔ تو والدین کے کہنے پر میں شادی کرنے پر راضی ہوگیا۔

شہر کے ایک، خانصاحب کی دُختر نیک اختر کے ساتھ جنہوں نے بی۔ اے کا امتحان اس آسانی سے پاس کر لیا تھا جس طرح پُرانے زمانے کی عورتیں تندور میں روٹی لگا لیا کرتی تھیں یا دو بچوں کو بغل میں داب، دو گھڑے پانی کے سر پر اُٹھا کر کنوئیں سے گھر لے آتی تھیں۔ میرے گھر والے خوش تھے کہ خوب جوڑ ملا ہے۔ میری ہونے والی بیوی کے والد، خانصاحب نے بھی میری رو بہ صحت حالت دیکھکر خضابی مونچھیں مروڑتے ہوئے اس طرح سر ہلا دیا تھا گویا کہہ رہے تھے کہ "سب حالات مدِنظر رکھتے ہوئے بُرا نہیں۔"

مگر جو بات مجھے دُکھ دے رہی ہے، وہ یہ ہے کہ میں بھی اپنی شادی کی تجویز اور تیاریاں دیکھکر خوش ہو رہا تھا۔ میں نہیں جانتا کیوں۔ مگر کوئی احساس تھا۔ شاید دُلہن اجس کے تذکرے کتابوں اور افسانوں میں پڑھے تھے اُس کو اصلی زندگی میں دیکھنے کا شوق۔ مَیں چاہتا تھا کہ شادی کی تیاریاں جلد ختم ہو جائیں، اور قاضی جی ایکدم آکر نکاح پڑھ دیں۔ اور پھر چار نہ ہو تو نہ سہی

بس ــــــــ!

سگرٹ ہوں، دُلہن ہو، اک گوشۂ تنہائی۔

میں سوچا کرتا تھا کہ دُلہن سے پوچھونگا کہ کیا واقعی اُس نے شادی ہونے سے پہلے کے دن شمپئین کی تتلاتی ہوئی دوشیزہ کی طرح گزار کر کاٹے تھے۔

آخر وہ دن آیا۔ عقد ہوا۔ تماشائی۔ براتی اور رشتہ دار ایک ایک کرکے رفوچکر ہوگئے۔ شام ہوئی، رات آئی۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ آج رات اُن افسانوں والی دُلہن کی حیا اور شرم، ناز و انداز، مہندی سے رنگے ہوئے نازک ہاتھ اور پاؤں، سرخ و سفید چہرہ۔ جوانی سے مخمور آنکھیں یہ سب دیکھنے میں آئیں گے اور اُس کی آواز کے شیریں نغموں میں مجھے تان سین کی رُوح پھڑکتی نظر آئے گی۔ اس کے ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ۔ آہ کتنا شیریں خواب تھا۔

رات گزر رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں پلنگ پر پڑا سگرٹ کے دھوئیں کے بادلوں سے کھیل رہا تھا۔ اس دھوئیں میں بھی مجھے ایک نازک اندام، شیریں دہن، معطر دُلہن نظر آرہی تھی۔ آخر دروازہ آہستہ سے کھلا، اور میری دُلہن داخل ہوئی۔

لباس ریشمی تھا۔ ہاتھ اور پاؤں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ مگر حیا اور شرم، ناز و انداز جس کی لاکھوں خیالی تصویریں میرے دل پر نقش ہو چکی تھیں، وہ غائب تھے۔

دُلہن کمرے میں داخل ہوتے ہی کھانسی اور کسی حرات سکول ماسٹرانی کی طرح میرے [illegible] پروفیسر صاحب کے لہجہ میں بے تکلفانہ آواز نکالی شروع ہوئی۔

"اس طرح دروازے بند کرکے سگرٹ دھونکنا کونسی دانشمندی ہے آپنے تو کمرہ کا "بلیک ہول" بنا رکھا ہے!"

یہ کہا اور دُلہن نے بڑھکر کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں، اور مَیں بے پردگی کے خیال سے کانپ اُٹھا۔

شادی سے پہلے مَیں سوچا کرتا تھا کہ دُلہن مجھ سے شرم کریگی اور مَیں بڑی نفاست سے اس کا گھونگٹ کھولونگا۔ بلکہ میں نے تو

اس موقع کے لئے یہ شعر بھی زبانی یاد کر رکھا تھا کہ جب نازک دُلہن مُنہ نہ دکھانے پر اصرار کرے گی تو میں اُس کے کان کے قریب آہستہ سے کہوں گا ۔

صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں
خُوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں،

غرضکہ سب اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ آتے ہی نکتہ چینی۔ مَیں تو چُپ سا ہو گیا۔ بہت دیر تک دُلہن کا چہرہ دیکھنے کی بھی جرأت نہ کرسکا۔ ڈر تھا کہ کہیں کوئی اور بلائے ناگہانی نہ نازل ہو جائے۔

دُلہن آکر بڑی بے پروائی سے پلنگ کے پاس پڑی ہوئی کُرسی پر بیٹھ گئیں۔ ہائے میرے سہاگ کی پہلی رات! کیا اس کا خُون اِسی طرح ہونا تھا؟

دُلہن نے کُرسی پر بیٹھتے ہوئے میری طرف اس طرح دیکھا جس طرح کوئی ہاتھی کسی چڑیا کے بچے کی طرف دیکھتا ہے۔ میں سہم گیا۔ اور کرتا بھی کیا۔

دُلہن نے بولنا شروع کیا "تو حضرت سگرٹ بھی پیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کون کونسا نشہ آپکی طبیعت کا خاصّہ ہے؟"

میرا رنگین خواب لُوٹ چکا تھا۔ دُلہن کے جن خوشگوار نغموں کی آواز میں مَیں چند دنوں سے ڈوبا ہوا تھا وہ فنا ہو چکے تھے۔ کسی سازِ شکستہ کی طرح مَیں چُپ رہا۔

پڑھی لکھی دُلہن نے پھر آواز نکالی۔

"کیوں میاں! کبھی کچھ بولو گے بھی یا نہیں۔ بندۂ خدا پہلے دن ہی زندگی سے بیزار کر دو گے۔ حضرت آدم کے بیٹے۔ کچھ تو کہیئے کہ کس لئے چُپ ہو۔"

میرے لبوں کو مرنے والے کے ہونٹوں کی طرح جُنبش ہوئی اور یہ شعر زبان سے نکلا ۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اب تو اُدھر سے فصاحت و بلاغت کے گویا پٹ کُھل گئے دُلہن نے جو بولنا شروع کیا تو ایک گھنٹے تک برابر بولتی رہیں۔ اُس دوران میں اُس نے شاردا ایکٹ اور برتھ کنٹرول کے مسئلوں سے لیکر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، اور ہٹلر کی آمریت تک جیسے مشکل مضامین کو نچوڑ ڈالا۔ اور یہ میری شادی کی پہلی رات تھی ۔

حیف اُس شوہرِ بدبخت کی حالت غالب
جسکی قسمت میں ہو دُلہن سے پریشاں ہونا

خیر وہ رات کسی طرح گزر گئی اور ساتھ ہی ساتھ میری اُمیدوں کا خُون کرتی گئی۔ جو خیالی عمارتیں مَیں نے تعمیر کی تھیں وہ مسمار ہو گئیں۔ اب ہماری ازدواجی زندگی شروع ہوئی۔

میں کہہ چکا ہوں کہ مجھکو امتحان کے نام سے نفرت ہو گئی ہے۔ مگر بیوی نے شادی ہونے کے تیسرے دن بعد ہی مجھے سُنا دیا کہ اُن کا ارادہ ایم۔ اے پاس کرنے کا تھا۔ میں نے اُس نیک بخت کو بہت سمجھایا کہ بی۔ اے تک ہی تعلیم کافی ہے۔ مگر یہ سُنکر تو وہ آگ بگولہ ہو گئیں اور لگیں مردوں کے خود غرض ہونے پر درس دینے کہ مرد عورتوں کی ترقی کو پسند نہیں کرتے۔ وہ اُن کا ذہنی نشو و نما نہیں برداشت کر سکتے۔ بس وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ جب خاوند آوارہ گردی کر کے آئے تو عورت اُن کے جوتے اُتارے، گھر کے کپڑے پہننے کے لئے سامنے لا کر رکھے۔ کھانا اپنے ہاتھ سے پروس کر کھلائے۔ جھوٹے برتن خود اُٹھائے۔ پھر جب خاوند کو نیند نہ آئے تو پاس بیٹھ کر پاؤں دباتے ہوئے لوریاں سُنائے، اور جب خاوند صاحب کو اچھے کھانے اور بیوی کے نغموں سے نیند آجائے تو بیوی پاس پڑکر تارے گِنتے ہوئے خاوند کے خرّاٹوں کی آواز سُنا کرے!

غرضکہ مَیں کیا جواب دیتا۔ بیوی نے امتحان کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بڑی بڑی کتابیں منگوائیں۔ کاغذ، پنسل، سیاہی و دوات سب سامان فراہم کر لیا اور ایک کمرے کو پڑھنے کی بیٹھک بنا دیا اور مجھ کو حکم دیدیا کہ جب مَیں پڑھ رہی ہوں تو مجھے تنہائی پسند ہوتی ہے۔

میں نے جلکر جواب دیا "میں نے تم سے زیادہ امتحان پاس کئے ہیں۔ مجھکو معلوم ہے جو تم مجھ کو بتا رہی ہو۔"

غرضکہ امتحان کی تیاری کیا ہوئی۔ بیگم صاحبہ چوبیس گھنٹے اپنے پڑھنے کے کمرے میں بیٹھی پان کھایا کرتیں اور کتابوں کی ورق گردانی کرتی رہتیں۔ میں تنگ آگیا۔ آخر شادی کرنے کا مجھ کو کیا فائدہ ہوا۔ میاں کا چاہے پاجامہ پھٹا ہوا ہو یا ناشتہ تیار نہ ہو بیگم کو اس کی پرواہ نہیں۔ وہ تو ایم۔ اے کے مقابلہ کی تیاری میں مشغول تھیں۔ اُن کو کیا غرض جو شوہر کی زندگی میں ذرا بھی دلچسپی لیتیں۔ مَیں گویا شادی کر کے اِس بات کا ذمہ دار بن گیا تھا کہ جو بُرا بھلا ماما

پکا کے سامنے لا دھرے اُس کو بغیر اعتراض کئے نگل جایا کروں۔ جو میں
پسند سے کھانا چاہوں اس کو بیگم پسند نہ کرے اور اس لئے میں بیگم
کے پسند کے کھانے کھاؤں۔ اور مہینہ شروع ہوتے ہی تنخواہ بیگم
کی میز پر دُور سے ہی رکھدوں۔ اُسی طرح جیسے کوئی زمیندار مالیانہ
سرکار کے سامنے پیش کر دیتا ہے یا کوئی مُرغی انڈا دیکر اُٹھ کھڑی
ہوتی ہے۔

خیر میں نے ارادہ کر لیا کہ اس گھر میں جس قدر کم ہو سکے گا
زندگی بسر کرونگا۔ چنانچہ صبح کو گھر سے ناشتہ زہر مار کر کے سب سے
پہلا شخص جو باہر نکلتا تھا وہ میں ہوتا تھا۔ اور آخری چیز جو گھر کے اندر
داخل ہوتی تھی وہ بھی بلا مبالغہ میں ہی ہوا کرتا۔

میری اِس عدم موجودگی سے بیگم کے دل میں نہ ہی رحم کا
جذبہ پیدا ہوا نہ ہی شکوک۔ شاید اُن کو میری صورت سے یقین ہے
کہ کوئی عورت اس پر لٹّو نہیں ہو سکتی۔ وہ عام طور پر مجھکو بتلاتی
ہیں کہ میری رنگت چوکلیٹ کی طرح ہے اور اس پر میرا چوکلیٹ
کے رنگ کی شیروانی پہننا۔ بیگم کہتی ہیں کہ وہ اس موضوع پر اچھا
خاصہ شاعرانہ مضمون لکھ سکتی ہیں۔ مگر خدا کی قسم میرا رنگ کچھ اتنا
جامنی نہیں کہ میری بیوی سیاہ رنگ کی سیاہی سے اس کو اور بھی کالا
بنا کر دُنیا کی نظروں کے سامنے پیش کرے اور اگر ہے بھی تو کیا ہوا
نکاح کے وقت میں نے کوئی پوڈر تو مُنہ پر نہیں مل رکھا تھا یا میں
کسی میم کا بیٹا تو نہیں ہوں جو میری چمڑی گلاب کے پھول کی رنگت
کی طرح ہو۔ اس کے علاوہ بیگم کو کتابوں سے کبھی اپنی صورت آئینہ
میں دیکھنے کی فرصت نہیں ملی ورنہ اُن کو معلوم ہو جاتا کہ خود اُنکا
رنگ دودھ کی طرح سفید نہیں ہے۔ بعض اوقات تو میری شرعی
بیوی نے مجھکو "بلغم کے پتلے" کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ پھر
میں گھبراؤں تو کیونکر؟ اگر مجھکو مُرغ کا پلاؤ پسند ہے تو بیگم کو صرف
بینگن کا بھرتا یا تلے ہوئے کریلے۔ اگر مجھ کو تمباکو کھانے والے انسانوں
سے نفرت ہے تو بیگم صرف مجھ کو جلانے کی خاطر پان میں تمباکو کھایا
کرتی ہیں۔

شادی کو ایک سال گزر چکا تھا کہ میری ازدواجی زندگی
کے شریک میں دو اضافے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ میری خوش قسمتی سے
وہ ایک بچے کی ماں بن گئیں اور دوسرے میری بد قسمتی سے ایک
رسالہ کی ایڈیٹر۔ ظاہر ہے کہ بیوی صاحبہ ماں ہونا بالکل پسند نہ کرتی
تھیں اور اس پر مجھے اکثر اوقات جب کام سے فرصت ملتی یا میں
شومئی قسمت سے سامنے آجاتا بُرا بھلا کہتیں۔ اس کا جواب میں انکو
کیا دیتا۔ تنگ آکر کہہ دیتا کہ "بھئی آئندہ سے ایسی غلطی نہ کرونگا مگر
آپ بھی خیال رکھیئے۔"

بطرف دیگر بیگم صاحبہ کے ایڈیٹر بننے سے اُن کی مصروفیات
اور بھی بڑھ گئیں۔ ایک دن اتفاق سے سکول میں چھٹی تھی اور میں کسی
دوست کے گھر نہ گیا۔ اس لئے اپنے گھر ہی بیٹھا رہا۔ بہت دیر تک
اخبار پڑھا۔ جب وہ کام ختم ہو گیا تو اِدھر اُدھر کی کتابیں پڑھیں آخر
جوشِ پدریت کا غلبہ ہوا تو میں اُٹھکر سیدھا بیگم کے کمرے کی طرف
چلا تا کہ شادی کی زندگی کے اُس میٹھے پھل سے دل بہلاؤں جو میری
غلطی اور میرے شریک زندگی کی مجبوری کا نتیجہ تھا۔

بچہ پنگوڑے میں پڑا سو رہا تھا۔ پاس ہی بیگم چاروں طرف
کاغذ پھیلائے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں آکر بچے کے پاس
بیٹھ گیا۔ مگر زبان سے کچھ نہ نکالا۔ اس گھر میں تو صرف تین ہستیوں
کو بولنے کا حق تھا۔ بیگم کو درس دینے کا۔ ماما کو کڑ کڑانے کا اور
جب سے یہ راحتِ جان پیدا ہوا تھا اس کو رونے کا۔ میرا کام
صرف خاموشی سے اِن تینوں کی آوازیں سُننے کا تھا۔ اور دن کو
خاموش رکھنے کا کام میں سکول میں کافی کر آتا تھا اس لئے اسکی
ضرورت گھر میں نہ تھی!

بچہ جاگ اُٹھا اور میں نے اُس کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ میں نے
سوچا کہ بیوی سے تو محبت کی دو باتیں کرنے کی اُمید نہیں اسلئے۔

بیوی نہ سہی بچہ ہی سہی
ہم پیار کرینگے کہیں نہ کہیں

دفعتاً بیوی نے ایک کاغذ سے نظر اُٹھائی اور تمسخرانہ انداز
سے کہا کہ "اوہو۔ باپ بچے کو گود میں لئے بیٹھا ہے۔"

میں نے جل کر جواب دیا۔ "اور ماں کتابیں لکھ رہی ہے اور
باپ اور بچے دونوں کی پروا نہیں کرتی۔"

اُمید تھی کہ کوئی کرخت جواب ملے گا۔ مگر بیوی صاحبہ کسی بات
پر خوش تھیں۔ بولیں۔ "میرے ایک قلمی دوست کا خط آیا ہے۔ انہوں نے
میرے مضمون کو نہایت پسند کیا ہے۔"

میں نے قلمی سیب اور آم سُنے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی قلمی بردوں
کا بھی تذکرہ سُنا تھا۔ مگر قلمی دوست کے نام سے میں چکرا گیا۔ ہائے ری
قسمت مجھے قلمی دوستوں کا مزہ بھی چکھنا تھا۔ میں نے دل پر جبر کر کے
پوچھا۔ "یہ قلمی دوست کیا بلا ہے؟"

کہنے لگیں "کیوں بھولے بنتے ہو۔ قلمی دوست ان کو کہتے ہیں جن کی واقفیت بذریعہ خط و کتابت کی جائے۔ میرے یہ دوست دہلی کے ایک مشہور اُردو نویس ہیں اور میری نثر کے مدّاح "

میں نے کہا "آپکے مدّاح آپکو مبارک ہوں۔ بھلا مجھ سے انکا تذکرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے "

جواب مِلا "اِس لئے کہ شاید یہ حضرت آپ سے سکول پر ملنے آئیں "

اتنے میں بچہ رونے لگا اور میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا کہ اس کو بنگو رسے کے حوالے کروں یا آپ لے۔ اس پر چیں بجبیں ہوکر اُنہوں نے بچے کو مجھ سے لے لیا اور میں سگرٹ پینے اپنے کمرے کی طرف بغیر کچھ کہے چلدیا۔

آخر ایک دن وہ قلمی دوست میرے سکول آنکلے۔ دیکھنے میں عجب چھچھورے سے لونڈے معلوم ہوتے تھے۔ میں نے کچھ باتیں اِدھر اُدھر کی کرکے ان کو جہاں سے وہ تشریف لائے تھے واپس لوٹا دیا۔ آخر مجھے کیا غرض پڑی تھی جو بیوی کے قلمی دوستوں کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتا۔ خیر وہ بات آئی گئی ہوگئی۔

اس واقعہ کے کوئی بیس دن بعد ایک شام جو میں گھر واپس گیا تو بیگم عجب پریشانی کی حالت میں دالان میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر کسی شیرنی کی طرح ٹہل رہی تھیں۔ مجھکو دیکھتے ہی کہنے لگیں "عجب شوہر نصیب ہوئے ہیں آپ۔ جو میری زندگی کا ایک راز بھی چھپا کے نہ رکھ سکے "

یہ پیچیدہ تہمت ذرا بھی سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے کہا "ذرا واضح کرکے بیان فرمائیے کیونکہ میرا کند ذہن آپ کی ان ادبی گتھیوں کو نہیں سلجھا سکتا "

کہنے لگیں "آپکے بھلا پہلے کیا سمجھ میں آیا تھا جو آج میری بات سمجھ میں آجائے ۔۔ کچھ دن ہوئے آپ سے کوئی حضرت ملنے آئے تھے ! "

میں نے سوچ کر جواب دیا "جی ہاں آپ کے قلمی دوست ــــ تو ــــ ؟ "

بیگم نے گلا صاف کرکے کہنا شروع کیا "وہی میرے قلمی دوست تھے۔ مگر وہ یہ نہ جانتے تھے کہ میں شادی شدہ ہونے کے علاوہ ماں بھی ہوں "

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا "ماں ہونا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ خاص کر اس حالت میں جبکہ آپ میری منکوحہ بیوی ہیں اور آپ کا بچہ میرا بچہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ اس راز کو اپنے قلمی دوست سے پوشیدہ بھی رکھنا چاہتی تھیں تو میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں کہ میں نے آپ کے قلمی دوست پر یہ حقیقت واضح نہیں کی "

بیگم نے جواب دیا "آپ بجا فرماتے ہیں شوہر صاحب آپ نے اپنی زبان سے کچھ نہیں فرمایا۔ مگر اپنے پچھلے خط میں انہوں نے بچوں کو دعا لکھی تھی اور جب میں نے پوچھا کہ انہوں نے کس طرح جانا کہ میرے بچے بھی تھے تو آج کے خط میں لکھتے ہیں کہ "آپ کے شوہر کی چندھیائی ہوئی آنکھوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں مجھکو آپکے بچے نظر آئے تھے۔ نیز اُن کے سر کا گنجہ پن بھی اس بات کی دلیل پر چمک رہا تھا "

میں تو جل بھن کر راکھ ہوگیا۔ غور تو فرمائیے اگر کوئی قلمی دوست آپ کی بیوی کو آپ کے متعلق اِس قسم کے بیہودہ الفاظ لکھے اور اُس پر خود آپ کی بیوی آپ کو بُرا بھلا کہے تو کونسا وہ انسان ہے جو جل بھن کر کوئلہ نہ ہو جائے گا۔ مگر میں امن پسند واقع ہوا ہوں سو کوئلہ بن کر رہ گیا۔ (اگر میری بیگم صاحبہ کے ہاتھ یہ مضمون لگ جائے تو وہ یہ کہنے میں دریغ نہ کریں گی کہ آپ بنکر کیا کوئلہ بنینگے آپ کا تو رنگ ہی کوئلے جیسا ہے۔) اگر بچہ نہ ہوتا تو گھر بار چھوڑ کر فقیر بن جاتا۔ یا افیون کھا کر مرجاتا۔ یا شادی میں ملی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی چاٹ کر ہی جان دیدیتا۔ مگر کیا کروں جس کو دُنیا کے تختے پر لا کھڑا کیا ہے اُس کی پرورش کرنا بھی ضروری ہے ورنہ ضرور ہی مرجاتا۔

بیگم اب ایم۔ اے پاس کر چکی ہیں۔ مضمون نگار ہیں اڈیٹر ہیں قلمی دوست رکھتی ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ شادی کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "کرو یا نہ کرو بہر صورت پچھتانا ہوگا " اور میری زندگی کا یہ حال ہے کہ ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

بھارت چند کھنہ، ایم۔ اے

اہلِ عرب اور بُت پرستی

عرب میں بُت پرستی کا رواج کس طرح ہوا؟ اس موضوع پر قلم اُٹھانے سے پہلے، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عرب قدیم کی اجمالی تاریخ ناظرین کے سامنے پیش کر دی جائے، تاکہ موضوع کے تمام گوشے نگاہوں کے سامنے آسکیں۔ کسی ملک، قوم اور جماعت کے تمدن و تہذیب اور مذہبی رجحانات، یا کسی انقلاب کا تذکرہ، اسوقت تک نامکمل سمجھا جائے گا، جب تک اس ملک اور قوم کی قدیم تاریخ اور اُس زمانے کے لوگوں کے عواطف و میلانات نہ بیان کر دیے جائیں۔ کوئی شخص اگر ہندو مذہب کی تاریخ لکھنا چاہے تو اس کے لئے لازمات سے ہے کہ وہ بدھ اور جین مذہب کی تاریخ کا بھی ذکر کرے۔ کہ یہ تینوں تمدن اور مذہب آپس میں عظیم الشان تاریخی ربط و ایتلاف (Historical association) رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح عربوں میں بُت پرستی کے رواج کی تاریخ لکھنے سے پہلے، بُت پرستی کی تدریج کے قبل کی تاریخ بھی پیش کرنی ہوگی۔ تاریخ حقیقت میں واقعات کے اسی تسلسل کا نام ہے، اگر یہ تسلسل قائم نہ رہے تو پھر تاریخ اور افسانہ میں فرق ہی کیا رہیگا؟ اسی نقطہ سے مورخ کی ذمہ داری شروع ہو جاتی ہے اور یہیں سے افسانہ نگار اور مورخ ادب کی دو مختلف شاہراہوں پر گامزن ہو جاتے ہیں۔

اہلِ عرب کی نسلی تقسیم

اہلِ عرب اپنے نسب کے اعتبار سے تین طبقوں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں، اور ماہرینِ انساب نے ان کو تین ہی قسموں اور طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان قسموں اور طبقوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) عرب بائدہ۔ (۲) عرب عاربہ اور (۳) عرب مستعربہ۔

(۱) عرب بائدہ، عرب کے قدیم ترین قبائل ہیں، جن کے حالات کیلئے جب ہم عرب کی قدیم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں، تو تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ ان قبیلوں کا ذکر ایام جاہلیت کے اشعار میں کہیں کہیں آجاتا ہے، یا پھر الہامی کتابیں، اُن کے حالات کے متعلق کچھ اشارات پیش کرتی ہیں۔ قرآنِ پاک میں عاد اور ثمود کا جو ذکر آیا ہے، وہ یہی عرب بائدہ تھے اور طسم و جدیس وغیرہ قبیلے بھی عرب بائدہ سے تعلق رکھتے تھے۔

(۲) عرب عاربہ میں وہ قحطانی قبائل شامل ہیں، جو ملک یمن اور اُس کے آس پاس رہتے تھے۔ ان قبیلوں میں کہلان اور حمیر خاص شہرت رکھتے ہیں۔ عرب میں سب سے پہلی تاریخ عرب عاربہ کے اسی قبیلہ حمیر کے بادشاہوں کی لکھی گئی تھی۔ عرب عاربہ کے حالات تاریخ میں بہت کچھ ملتے ہیں، اور تاریخ کے کاغذی صفحات کے علاوہ انکی یادگاریں خود اُن کی زندہ تاریخ ہیں۔ جو سیاح کی نگاہوں کا دامن پکڑ کر کہتی ہیں کہ "مجھے عبرت کی نگاہ سے پڑھو"

(۳) عرب مستعربہ میں وہ قبائل شامل ہیں جن کی ابتداً حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہی وہ سلسلہ ہے، جس کی نسل آج تک عرب میں موجود ہے! اور عرب کی تاریخ اسی سلسلہ کے حالات اور تفصیلات سے لبریز ہے۔

آلِ اسمٰعیلؑ

حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہ۔ جب خدا کی "بن جتی زمین" (uncultivated place) "وادیِ غیرِ ذی زرع" یعنی مکہ میں آکر بسے تو وہاں جرہمی قبیلے بستے تھے۔ بنو جرہم میں حضرت اسمٰعیلؑ نے شادی کی، اور اس نسل کا نام "عرب مستعربہ" پڑ گیا۔ اور یہی سلسلہ عرب کا سب سے زیادہ معزز اور تاریخی اعتبار سے اہم بالشان ہے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بارہ بیٹے عطا فرمائے جن میں قیدار اور نابت بہت مشہور ہیں۔ قیدار کی اولاد میں عدنان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ قریش کے تمام قبیلوں کا ابو الآبا اور جدِ امجد یہی عدنان ہے۔ یہاں آکر مورخین میں قدرے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، بعض کہتے ہیں کہ عدنان کا سلسلۂ نسب نابت پر منتہی ہوتا ہے اور بعض کا بیان ہے کہ عدنان قیدار کی نسل میں تھا۔ لیکن کثرتِ آرا سے یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ عدنان کا تعلق قیدار ہی کی نسل سے تھا۔ حضرت محمدؐ پیغمبر اسلام، اسی عدنانی قبیلے میں پیدا ہوئے، اس اعتبار سے سلسلۂ عدنان کو تاریخ انساب میں ایک خاص عزت اور شہرت حاصل ہے۔

• • •

تمدّن اور زندگی ۔ عرب مستعربہ (آلِ قیدار یا اولادِ اسمٰعیل) بستیوں میں رہتے تھے اور دوسرے ملکوں سے تجارت کرتے تھے۔ اور یمن، مصر، اور شام وغیرہ ممالک سے اُن کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ توراۃ کے باب پیدائش سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اُن کے بھائیوں نے جب کنوئیں میں ڈال دیا تھا اور ایک قافلہ نے حضرت یوسف کو کنوئیں میں سے نکالا تھا، وہ قافلہ، عرب مستعربہ یعنی آلِ اسمٰعیل ہی سے نسبی تعلق رکھتا تھا۔

عربِ مستعربہ، جن کو ہم اب آلِ عدنان کہیں گے، غیر معمولی شجیع اور بہادر تھے۔ اُن کی فطرت کبھی غلامی پر قانع نہیں ہوئی اور دُنیا کی قوموں میں شاید یہ ہی ایک ایسی قوم ہے جس نے جان کی بازی لگا کر، دولتِ آزادی کی حفاظت کی۔ اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

تو سچ تو یہ ہے کہ یہ ریگستان کے رہنے والے زندگی کے بحرِ بیکراں کے مالک تھے۔ حقیقت یہ ہے آزادی ایک معجزہ ہے جو پتھر کی چٹانوں سے آبِ حیات ٹپکا دیتا ہے۔

اہلِ عدنان کی جنگجویانہ اسپرٹ نے، جہاں اُن کی آزادی کی حفاظت کی، وہاں اُن کو آپس کی خانہ جنگیوں میں مبتلا کر دیا۔ ذرا ذرا سی بات پر خون کے دریا بہ جاتے تھے۔ اور معمولی سا واقعہ اُنکی تلواروں کو نیاموں میں تڑپا دیتا تھا۔ ایامِ جاہلیت کے "رجزیہ اشعار" ان ہی خانہ جنگیوں کی یادگار ہیں۔

قریش کی وجہ تسمیہ ۔ آلِ عدنان (عرب مستعربہ) میں ایک شخص فہر پیدا ہوا جو اہلِ عرب میں بڑی عظمت اور شوکت کا مالک تھا۔ قدیم زمانے کے قریب قریب ہر ملک میں قاعدہ تھا کہ لوگوں کے نام جانوروں، درختوں اور ستاروں کے نام پر رکھے جاتے تھے۔ اس کو اصطلاحی طور پر "طوطمیت" (ٹوٹمزم) کہتے ہیں۔ فہر جو "قریش" کے لقب سے مشہور ہے اس کی وجہ بھی یہی "طوطمیت" ہے۔ "قریش" ایک بہت بڑی مچھلی کا نام ہے، جو دریا کے تمام جانوروں کو نگل جاتی ہے۔ اس نسبت سے "قریش" کے معنی "غلبہ اور عظمت والے" کے ہوئے۔ تاریخ میں فہر کی اولاد، قریش کے نام سے مشہور ہے۔ قریش کو اہلِ عرب میں جو عظمت و شوکت حاصل تھی، اُسکی گواہی خود تاریخ دیتی ہے۔

پیغامِ توحید ۔ مکہ معظمہ کی پاک سرزمین پر، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے مل جل کر خانہ کعبہ بنایا۔ اور ان خُدا کے نیک بندوں، اور توحید کے مبلغوں نے خُدا کی بڑائی بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ خُدا ایک ہے، اُسی کو پوجو، اور اُسی سے ڈرو۔ اسی مذہب کا نام "دینِ حنیف" ہے۔

"حنف" کے معنی "مُڑنے" کے ہیں۔ "دینِ حنیف" ایسا مذہب ہے، جو لوگوں کو سب طرف سے ہٹا کر اور موڑ کر، خدائے واحد کی طرف لاتا ہے۔ "دینِ حنیف" اس لئے خالص توحید کو پیش کرتا ہے ـــــ ایسی توحید، جس میں کسی قسم کی مشارکت اور غیریت نہیں پائی جاتی۔

حضرت اسمٰعیل کی اولاد (عرب مستعربہ) دینِ حنیف پر ایمان رکھتی تھی اور اُن کے سر ربِّ واحد اور معبودِ برحق کے آستانے پر جھکتے تھے۔ اور خانہ کعبہ شرک و بدعت کی آلائشوں سے پاک تھا۔

بُت پرستی کی ابتدا ۔ اُوپر بتایا جا چکا ہے کہ اہلِ عرب، یمن، شام، مصر وغیرہ ممالک سے تجارتی تعلقات رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں اُن کا وہاں آنا جانا رہتا تھا۔ اہلِ عرب میں سے ایک شخص عمرو بن لحیٰ جو کعبہ کا متولی تھا کسی ضرورت سے بلقاء (شام) گیا۔ وہاں اُس نے لوگوں کو بتوں کی پوجا کرتے دیکھکر اُن سے پوچھا کہ "یہ تم کیا کرتے ہو" اُن لوگوں نے جواب دیا کہ "یہ ہمارے خدا ہیں، ہم ان کی پوجا کرتے ہیں، اور اسکے بدلے میں یہ ہماری مدد کرتے ہیں اور پانی برساتے ہیں"۔ اس پر عمرو بن لحیٰ نے ایک بُت اُن لوگوں سے مانگا، اُنھوں نے ہبل نامی بُت اس کو دیدیا۔ عمرو بن لحیٰ اُس بُت کو لیکر مکہ آیا اور خانہ کعبہ میں رکھدیا۔ اہلِ عرب کے لئے یہ بالکل نئی چیز تھی۔ عمرو بن لحی نے بُت پرستی کی لوگوں میں تبلیغ کی، اور کہا کہ مَیں نے شام میں اپنی آنکھوں سے بڑے بڑے معززین کو بتوں کو پوجتے دیکھا ہے۔ یہ بُت شام کے رہنے والوں کی حاجت روائی کرتے ہیں۔ اس کی باتیں لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئیں۔ اور عرب میں اُسی زمانہ سے بُت پرستی کا رواج ہوگیا۔ یہ واقعہ تقریبًا بادشاہ سابور ذی الاکتاف کے زمانے کا ہے۔

اہلِ عرب میں بُت پرستی کی وبا کچھ اس طرح پھیلی کہ ایک

ایک گھر بُت کدہ بن گیا۔ اور وہ خانہ کعبہ، جو صرف خدائے واحد کی عبادت کیلئے بنایا گیا تھا اُس میں کم و بیش تین سو ساٹھ بُتوں کی پُوجا ہوتی تھی۔ مشہور بُتوں کے نام یہ ہیں :-

ہبل، لات، عزیٰ، منات، وِد، سواع، اساف اور نائلہ!

جھوٹے خداؤں کے تصورات نے سچے خدا کے تصور کو زائل کر دیا اور اب عرب بُت پرستی کی لعنت میں مبتلا ہونے کے ساتھ ساتھ بیشمار گناہوں اور خرافات میں گھر گئے۔ اس پُر آشوب اور شرک آلود زمانے میں جبکہ اہلِ عرب، بُت پرستی کی لعنت میں گرفتار تھے زید بن عمرو بن نفیل اور قصی جیسے خدا شناس لوگ بھی موجود تھے جو "ربِّ واحد" کی پرستش کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے، مگر کفر و شرک کے نقارخانہ میں باغ توحید کی ان طوطیوں کی کون سنتا تھا۔

بُت پرستی کا خاتمہ :- اُس زمانے میں جبکہ شرک اور اصنام پرستی کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، آفتاب رسالت طلوع ہوا۔ حضرت محمدؐ بن عبداللہ پیغمبر خدا نے بُت پرستی کے خلاف تبلیغ شروع کی۔ عرب ایک مدت سے بُت پرستی کے عادی تھے، توحید کی صدا سے اُن کے کان آشنا نہ تھے، اپنے معبودانِ باطل کی بُرائی سُن کر وہ برافروختہ ہوئے اور مُبلغ توحید کی مخالفت میں وہ سب کچھ کیا جو ایک شدید سے شدید دُشمن اور بدخواہ کر سکتا ہے۔ گالیاں دیں، راستے میں کانٹے بچھائے، نجاست ڈالی، گھر سے بے گھر کیا، اس پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ خدا کے سچے رسول سے جنگیں کیں، اور ان لڑائیوں میں بھی "ہبل اور عزیٰ کی جے" کے نعرے لگائے — مشرکین کو اپنے جھوٹے خداؤں پر کتنا اعتماد تھا! آخر کار، باطل سرنگوں ہوا۔ حق کو کامیابی ہوئی، اور فتح مکہ کے موقع پر اُس مقدس نبیؐ نے جس کی "بعثت" کیلئے خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت، حضرت ابراہیمؑ نے دُعا کی تھی، "کعبۃ اللہ" کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بتوں کی نجاست سے پاک کر دیا۔ اور اہلِ عرب کے تصورات پر بُت پرستی کا کوئی دھندلا سا نقش بھی باقی نہیں رہا ———!

کہا جاتا ہے کہ اوّل کو آخر اور آغاز کو انجام کیساتھ ایک خاص ربط اور نسبت ہوتی ہے، سو وہ تعلیم جس کا آغاز حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا وہ حضرت محمدؐ رسول اللہؐ کے ہاتھوں تکمیل کو پہونچی۔

ماہر القادری

غزل

عشق صادق جو اسیرِ طمع خام نہ تھا
سعی ناکام کے غم سے مجھے کچھ کام نہ تھا

طور کے لُطفِ خصوصی کی قسم، پہلے بھی
میرے دل پر اثرِ جلوہ گہِ عام نہ تھا

دوست کے حُسنِ توجہ سے نہیں شاد ابتک
نگہِ غمزدہ میں کیا کوئی پیغام نہ تھا

حسرتِ خوں شدہ ہر آن نئی شان میں تھی
رنگ جو صبح کو دیکھا وہ سرِ شام نہ تھا

دل لگی ہم سے کئے جاتے ہیں کیوں عیش پسند
کیا یہاں سوختہ کاموں کا کوئی کام نہ تھا

راز میں عشق تصور کی ہے لذت اے دوست
اور کیا چاہیئے آرام ہے، آرام نہ تھا

جانتا تھا جسے اپنی اُسی محفل میں گیا
جا کے غیروں کی طرح منتظرِ جام نہ تھا

میگُساری کیلئے مل گئے ہم ذوق بہت
غمگُساری کے لئے کوئی بھی ہم کام نہ تھا

اس زمانہ میں بھی الہام ہے منظور کا شعر!
میں کسی دور میں حسرت کشِ الہام نہ تھا

علی منظور

وہ نت نئے انداز دکھاتے ہوئے آئے

اک جلوۂ بیدار دکھاتے ہوئے آئے
سوتی ہوئی قسمت کو جگاتے ہوئے آئے

سنبل کو کبھی زلف سنگھاتے ہوئے آئے
نرگس کو کبھی آنکھ دکھاتے ہوئے آئے

کانٹوں کو کبھی دل سے لگاتے ہوئے آئے
دامن کبھی پھولوں سے بچاتے ہوئے آئے

گرتی ہوئی زلفوں کو اٹھاتے ہوئے آئے
اک دولتِ بیدار لٹاتے ہوئے آئے

غنچوں کو کبھی ہنس کے ہنساتے ہوئے آئے
بلبل کو کبھی نغمہ سناتے ہوئے آئے

کلیوں کو پسِ برگ چھپاتے ہوئے آئے
پھولوں کو سرِ شاخ نچاتے ہوئے آئے

جادو سا بہ ہر غمزہ جگاتے ہوئے آئے
محشر سا بہر عشوہ اٹھاتے ہوئے آئے

آنکھوں سے مئے ناب لٹاتے ہوئے آئے
ہر پھول کو پیمانہ بناتے ہوئے آئے

پیمانوں پہ شیشوں کو جھکاتے ہوئے آئے
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پلاتے ہوئے آئے

پیغمبرِ الفت کو جگاتے ہوئے آئے
دامن کو زلیخا سی چھڑاتے ہوئے آئے

ہر پھول کو رخسار دکھاتے ہوئے آئے
ہر خار کو گلزار بناتے ہوئے آئے

گفتار میں اک چشمۂ حیواں تھا درخشاں
رفتار میں اک حشر اٹھاتے ہوئے آئے

چھا کر کبھی ایمانِ محبت کی فضا پر
ہستی کے حجابات اٹھاتے ہوئے آئے

مستی میں کبھی مشکِ چمن زاد اڑا کر
کلیوں کی لطافت کو چراتے ہوئے آئے

بدمست اداؤں میں یہ بیدار نگاہی
ہر گام پہ سو پھول کھلاتے ہوئے آئے

ہر خارِ چمن کو بہ نگاہِ غلط انداز
افسانۂ منصور سناتے ہوئے آئے

اڑتے ہوئے گیسو ہیں کہ چلتا ہوا جادو
کافر و مسلماں کو بناتے ہوئے آئے

کونین کی ہستی کو نگاہوں سے گرا کر
فرحت مری ہستی کو جگاتے ہوئے آئے

فرحت کانپوری

کِریا کرم

لالہ گنیش داس کمیٹی کے ایک پرائمری مدرسہ میں مدرس تھے۔ کُنبہ اتنا بڑا نہ تھا کہ پریشان رہتے۔ ایک بیوی تھی اور ایک بیٹی۔ بیٹے کی آرزو میں ترستے رہے، یوگیوں کے پاؤں چُومے۔ ویدوں کے قدموں پر تین تین مہینوں کی تنخواہیں نچھاور کر دیں۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیشہ کے لئے مایوس ہو گئے۔ اپنی بیٹی مایا سے قدرتی طور پر وہ انتہا پریم رکھتے تھے، اور اُسے اتنے لاڈ پیار سے پالا تھا کہ محلے کے آس پاس کھاتے پیتے سیٹھوں کی لڑکیاں بھی اُس کی آن بان دیکھکر جھینپ جھینپ جاتی تھیں۔ قضائے الٰہی سے شہر میں گردن توڑ بخار کی وبا پھیل گئی۔ لالہ گنیش داس ایک دن بیمار رہے اور دوسرے دن سورگ سدھار گئے۔ مایا اور اس کی ماتا رام دئی نے سر پیٹ لئے۔ اِس بلائے ناگہانی کا پہلے سے علم ہوتا تو تنخواہ میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتے رہتے۔ لیکن موت بجلی کی طرح آئی اور بسا گھر اجاڑ کر چلدی۔ اب یہ دونوں بدنصیب رُوحیں بے دست و پا ہو کر رہ گئیں۔ کرایہ کا مکان تھا۔ تیسرے ہی دن وہاں سے کُوچ کر کے ایک اور محلے میں آگئیں۔ ایک اندھیری گلی میں ایک اندھیری کوٹھڑی تھی۔ آٹھ آنے ماہانہ کرایہ تھا۔ وہیں رہنے لگیں۔ دو چار روز بے حد پریشان رہیں۔ آگ جلاتی تھیں تو سارا دُھنواں کوٹھڑی میں گھومتا رہتا تھا۔ اور گھنٹوں وہ ہوا کے بجائے دُھنواں پھیپھڑوں میں بھرتی رہتی تھیں، اندھیرے کی وجہ سے ہوا میں ایک نمی سی پائی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے دُھنواں وہیں جم کر رہ جاتا تھا۔ جب بے چاری رام دئی پھونکیں مارتے مارتے اَدھ موئی ہو جاتی تو مایا اُسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچتے ہوئے کہتی: "ماتا جی میں آپ سے کَے بار کہہ چکی ہوں کہ اس کام سے میں نبٹ لونگی۔ لیکن آپ سنی اَن سُنی کر دیتی ہیں۔ اِدھر چٹائی پر ہو جائیے۔ میں آگ جلاتی ہوں۔"

رام دئی رو کر کہتی: "پُتری۔ جب تیری آنکھیں اِن گیلے اُپلوں کے دھوئیں سے سُوج کر سُرخ ہو جائیں گی۔ اور جب تیرے آنسو ڈھلک ڈھلک کر راکھ میں گرینگے، تو تیرے پتا جی کی آتما سورگ میں بے چین ہو جائے گی۔ اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی!" دس بارہ پھونکیں مار کر وہ پھر کہتی: "پُتری جبتک میں زندہ ہوں تجھے چولھے کے قریب نہ جانے دوں گی۔ آخر میں بڑھیا اور کس کام کی ہوں! بھگوان کرے تمہارے بھلے دن قریب ہوں!"

مایا سوچا کرتی کہ اَب بھلے دنوں کی دُعا سے ماتا کا کیا مطلب ہے! اندھیرے میں کھدر کی چادروں پر بیل بوٹے کاڑھ کر ماتا جی جو آنے دو آنے کماتی ہیں اُن سے پیٹ بھر لیا جاتا ہے۔ کوٹھڑی کا کرایہ مشکل سے ادا ہوتا ہے، ابھی پتا جی کے کِریا کرم پر جو رقم خرچ ہوئی تھی وہ بھی اُن کے دوست رام بھروسہ کو ادا کرنی ہے، پھر یہ بھلے دنوں کی آرزو کیسی!

بھولی مایا کو کیا معلوم کہ اُس کی بوڑھی ماں کا اِن بھلے دنوں کی آرزو سے کتنا گہرا مطلب ہے!

چند ہی دنوں میں وہ سامنے گلی سے گزرنے والوں کی صورت سے شناسا ہو گئیں۔ گلی آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ اور اُن کی کوٹھڑی سے گلی کے اختتام تک بس پانچ چھ مکان تھے۔ صبح و شام چار بابو لوگ اُن کے سامنے سے گزرتے تھے۔ اُن کی عمریں ڈھل چکی تھیں اور وہ اپنی بڑی بڑی پگڑیوں کے نیچے اپنے سفید بال چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ جیسے مسجدوں کے ٹوٹے ہوئے گنبدوں اور کلیساؤں کے پُرانے کلسوں پر امام اور پادری سبز بیلیں چڑھا دیتے ہیں۔

ان کے بچے کبھی کبھی کھیلتے کوٹھڑی کے قریب آجاتے۔ اور مایا ایسی من موہنی صورت والی لڑکی کو دیکھکر دم بخود رہ جاتے۔ مایا اُن سے پیار کرتی، اُنہیں اُن پریوں کی کہانیاں سُناتی جو بہت اونچی اڑیں۔ اور اِس جرم کی پاداش میں اندھیری، گہری اور بھیانک غاروں میں بند کر دی گئیں۔ ننھے بچے پوچھتے: "تو کیا اونچائی ایشور کو پسند نہیں؟" مایا جواب دیتی: "ایشور اُن لوگوں کو بہت پسند کرتے ہیں جو دھرتی پر چلیں پھریں اور دھرتی پر بیٹھیں اُٹھیں۔ تم چوتھی پانچویں منزل پر رہتے ہو خبردار رہا کرو۔ نہیں تو تمہارا انجام بھی اُن پریوں کا سا ہوگا!" بچے یہ سُنکر زور زور سے ہنسنے کی کوشش کرتے لیکن اُنکی ہنسی میں ایک رُکاوٹ سی پوشیدہ ہوتی۔ جیسے اُن کی آواز اُن کی مرضی کے خلاف نکل رہی ہے۔ تین چار روز تو یہ بچے آتے رہے،

پھر اچانک اُن کا آنا جانا بند ہوگیا۔ چوتھے پانچویں روز ایک بچی چھپتی چھپاتی مایا کے پاس آئی۔ اور بہت مدھم آواز میں بولی "اب ہم کہانیاں نہیں سُنیں گے"۔

مایا نے پوچھا "کیوں؟"

کہنے لگی "ماتا جی کہتی ہیں کہ اِن گندی کوٹھڑیوں میں رہنے والیوں کا سایہ بھی پڑ جائے تو سارا جیون دُکھی ہو جاتا ہے، پریاں تو ہیں ہی نہیں۔ کہتی ہیں یہ سب غریبوں کی من گھڑت باتیں ہیں اور اونچے رہنے والے ایشور کے زیادہ قریب ہوتے ہیں"۔

مایا بولی "اچھا سمترا، یونہی سہی"۔

لیکن وہ بچی اکثر ہفتہ دس دن کے بعد مایا کے ہاں ہو جاتی تھی، گلی سے صبح و شام ایک نوجوان مہترانی بھی گزرتی تھی۔ اُس کا صاف سانولا رنگ اور نکھرے نقوش دیکھکر انسان کو دھوکا ہو جاتا تھا کہ کہیں کسی امیر گھرانے کی لڑکی نے تو جھاڑو نہیں اُٹھا لی۔ وہ جھاڑو دیتے ہوئے ہمیشہ ایک گیت گنگنایا کرتی تھی:۔

پیتم تم بھی چلتے بنے
پیتم تم بھی چلتے بنے
اپنی داسی کو ٹھکرا کر
آشا دیپک کو بجھا کر
پیتم تم بھی چلتے بنے!

مایا کو اس مہترانی سے پریم سا ہو گیا تھا۔ وہ بڑے چاؤ سے اُس کی منتظر رہتی۔ اور جب وہ گلی کے آخر سرے سے "پیتم بھی جلنے لگے" کی مدھم لہراتی تان سُنتی تو کوٹھڑی کی دہلیز پر آکر بیٹھ جاتی۔ اور اس کا انتظار کرتی رہتی۔ وہ گلی میں جھاڑو دیتی ہوئی جب مایا کے قریب آتی، تو مُسکرا کر کہتی "سلام بی بی جی"۔

"سلام" مایا جواب دیتی۔ لیکن اُس کا دل پُکار پُکار کر کہتا۔ "بہن مہترانی، تیرا جیون مجھ سے کہیں اچھا ہے، مَیں تیرے اِس محبت بھرے سلام کے لائق نہیں"۔

ایک روز رام دئی محلے میں کسی کو چادر دینے چلی گئی۔ مایا اکیلی بیٹھی اپنی دل کی دھڑکنیں گن رہی تھی، کہ "پیتم تم بھی جانے لگے" کی رسیلی تان سے اُس کا دل رُک سا گیا۔ جب مہترانی اُس کے قریب آئی، تو اُس نے پُکار کر کہا "بہن"۔

مہترانی کی جھاڑو اُس کے ہاتھ سے گر گئی!

ایک اچھوت لڑکی کو ایک برہمن کی پتری بہن کہہ ڈالے!

کیا سُورج پچھم سے بھی اُبھرتا ہے! مہترانی حیرت زدہ ہو کر مایا کو گھورنے لگی۔

اُس نے پوچھا "آپ نے مجھے بُلایا ہے؟"

مایا نے جواب دیا "ہاں بہن"۔

اُس نے جھاڑو اُٹھائی اور مایا کے قریب آگئی "حکم؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا طبیعت اُداس تھی۔ تمہارا گیت سُنا تو خیال آیا کہ شاید تم بھی میری طرح دُکھی ہو"۔

"ہاں، بی بی۔ مَیں بیحد دُکھی ہوں۔ لیکن میرے دُکھ کی بپتا سُننے کیلئے تمہاری جوانی مناسب نہیں۔ میں نے بڑے بڑے دُکھ بھوگے ہیں بی بی جی۔ تم انکا حال سُنو تو عمر بھر روتی رہو"۔

مایا کانپ اُٹھی۔ اِس دُنیا میں ہر آتما دُکھی کیوں ہے؟ اس باغ میں ہر پھول کے سینے پر داغ کیوں ہے؟

مہترانی نے پوچھا "آپکی ماتا کدھر ہیں؟"

"محلے میں کہیں چادر دینے گئی ہیں"۔

"اچھا بی بی، مَیں جاتی ہوں۔ تمہاری ماتا نے مجھے تم سے باتیں کرتا دیکھ پایا تو جانے کیا ہو جائیگا"۔

مایا کے کلیجے پر چوٹ سی لگی۔ ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس لئے بات نہیں کر سکتا کہ ایک جھاڑو دیکر اپنا پیٹ پالتا ہے دوسرا جاوروں پر بوٹیاں کاڑھ کر! یہ بھی کیا قانون ہے، اس قانون کا بنانے والا کون ہے! اِس قانون کے چلانے والے کون ہیں! یہ مہترانی اپنے ہاتھ کی کمائی سے گزر اوقات کرتی ہے۔ میں دن بھر یہاں بیٹھ کر مکھیاں مارا کرتی ہوں، اور پھر بھی یہ مجھ سے جھجکتی ہے!

دُکھوں نے مایا کو بہت حسّاس بنا دیا تھا۔ بولی "لیکن بہن، مجھے تم اپنی بپتا تھوڑے الفاظ ہی میں سُنا دو۔ ورنہ میں پریشان رہونگی"۔

مہترانی نے جھاڑو دیوار سے لگا دی۔ آنکھیں دُور دُھندلے خاکستری آسمان پر گاڑ دیں۔ ایک اتنی گہری سانس لی کہ اس کا سینہ اُبھرتا ہی چلا گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ اُس کے گلے کی رگیں ایک ایک کر کے اُبھرنے لگیں۔ بڑی دیر کے بعد بولی "مایا دیبی۔ ٹوٹی سارنگی کیا خاک بجے گی۔ بُجھا دِیا کیا خاک راہ دکھائے گا۔ میں کیا بتاؤں۔ میں نے پریم کیا ہے، میرا پریمی بہت سُندر بہت بانکا چھبیلا جوان تھا۔ جب اندھیری راتوں کو مَیں شہر سے باہر کوڑا پھینکنے جاتی تھی۔ تو وہ ایک جگہ میرا منتظر بیٹھا ہوتا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کہتا تھا "سنتو۔ لا یہ ٹوکری مَیں پھینک

آوں۔" پھر وہ مجھ سے بہت میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔ میرے بالوں سے کھیلتا تھا۔ میری آنکھوں کو چومتا تھا۔ اُن دنوں میں سنے اتنی بھاری ٹوکریاں اُٹھائیں کہ آج کوئی نوجوان بھنگن اُٹھا دے تو جانوں۔ ایک بار شہر میں بھنگیوں نے ہڑتال کر دی۔ پُلس نے حملہ کیا تو میرا پریمی ایک سپاہی کے ہتھے چڑھ گیا۔ اتنے ڈنڈے کھائے کہ وہیں ڈھیر ہو گیا پر پیچھے نہ ہٹا۔ ہسپتال اُٹھا لائے۔ راستہ ہی میں ختم ہو گیا۔ مجھے پتہ لگا تو میں نے یوں سمجھا جیسے صاف سیدھی سڑک پر جاتے جاتے میں بہت گہرے کنوئیں میں گر گئی ہوں۔ اب بی بی، گاتی ہوں اور روتی ہوں۔ روتی ہوں اور گاتی ہوں۔ سوچتی ہوں میں نے کیوں پریم کیا۔ پریم کیا تو اُسے انت تک کیوں نہ نبھایا۔ اور اگر انت تک نبھاؤں تو میری بوڑھی ماتا کی کون سیوا کرے، وہ بھوکوں مر جائیگی۔"

مایا تھرا اُٹھی۔ سنتو جھاڑو اُٹھا کر چلدی۔ وہ دُور تک اپنی میلی چادر سے آنکھیں پونچھتی گئی۔

مایا کے دل پر سنتو کی باتوں نے ایک ایسا گہرا نقش چھوڑا تھا کہ وہ دن بھر پریشان رہی اور ساری رات جاگتی رہی۔ اُس کا دل اُچھل اُچھل کر اُسے کہیں لے جانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتی تھی، کچھ کرے۔ لیکن کیا کرے؟ یہ بات اُس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ کوئی اُسکے اتنا قریب ہو جائے کہ اُس کی سانسیں اُس کے چہرے پر کھیلنے لگیں۔ لیکن وہ کون ہو!۔ ماتا!۔ نہیں! تو پھر وہ کون ہو؟ مایا کی زندگی میں ماتا کے سوا کون تھا جو اُسکے اِس قدر قریب ہوا! اُسکے روئیں روئیں میں درد بسنے لگا۔ جب اُس کی ماتا چادریں دینے کہیں چلی جاتی تو مایا محسوس کرتی کہ کوئی اُس کی اندھیری کوٹھڑی میں آگیا ہے۔ ہر طرف نور ہی نور ہے۔ جدھر دیکھو وہی ہے۔ جس کونے میں جھانکو وہاں موجود ہے۔ وہ اُسے چھیڑتا ہے۔ اُس کے بالوں سے، اُسکے گالوں سے، اُس کے ہاتھوں سے کھیلتا ہے! اُس کا سینہ تپ رہا ہے۔ اُس کے لب دہک رہے ہیں۔ اس کا سر گھوم رہا ہے۔ وہ اُسکے قریب آجاتا ہے، بہت قریب آجاتا ہے۔ اس کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ وہ کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ وہ کچھ نہیں سوچ سکتی۔ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ جیسے وہ کہیں موجود نہیں۔ جیسے اُس کی ہستی بھاپ بن کر اڑ گئی ہے۔ اور اس اندھیری کوٹھڑی میں، باہر دُھندلی گلیوں میں، اونچے بالاخانوں پر، گرم فضا میں۔ خاکستری آسمان پر۔ ہر طرف وہی چھایا ہوا ہے —

یہ "وہی"، کون ہے؟

اُس کی ماتا حیران رہنے لگی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ مایا اندر ہی اندر چولا بدل رہی ہے۔ جب وہ چلی جاتی ہے تو کوئی اِس اندھیری کوٹھڑی میں آتا ہے اور اُس کی مایا سے اتنا کھیلتا ہے کہ وہ گھبرا جاتی ہے۔ آخر ایک دن رام دئی نے اپنی بیٹی سے یہ بات پوچھ ہی لی "مایا پُتری۔ تو چُپ چُپ کیوں رہتی ہے؟"

مایا بولی "ماتا جی۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ جی چاہتا ہے ایسی چُپ سادھ لوں کہ پھر کبھی نہ بولوں۔ آپکے دم سے ہر چیز موجود ہے۔ کسی شے کی کمی نہیں۔ پر جانے یہ سارا سنسار ویران کیوں نظر آتا ہے۔ ماتا جی۔ یہ کوئی بیماری تو نہیں؟"

"رام رام کر بیٹی، رام رام کر۔ ایشور بیماریوں سے بچائے۔ اصل میں کوٹھڑی تنگ ہے نا۔ تاریک، بدبو دار، گندی گلیاں، گندی ہوا۔ میں بھی کچھ سُست سُست رہنے لگی ہوں۔"

مایا تا دیر سوچتی رہی کہ شاید اُس کی گھبراہٹ کی یہی وجہ ہو، شاید یہ آب و ہوا کا اثر ہو!۔ شاید آب و ہوا کا اثر ہو!

کچھ دنوں کے بعد گلی میں سے ایک اور شخص بھی گزرنے لگا۔ یہ ایک نوجوان تھا۔ انگریزی لباس پہنے، ڈاڑھی مونچھ منڈائے، پانچ منزلوں والے مکان کی طرف چلا جاتا۔ اور جب واپس ہوتا تو مایا کی کوٹھڑی کے سامنے سے یونہی گزر جاتا۔ جیسے وہاں کوئی ذی نفس آباد نہیں۔ سیٹی بجاتا یا زیرلب کچھ گنگناتا بغیر نظریں پھیرے بے پروائی سے آگے بڑھ جاتا —

اور مایا سوچا کرتی یہ نوجوان کون ہے، اور یہ یہاں سے گزرتے وقت مجھے دیکھتا کیوں نہیں۔ اور میرا دل اس کی طرف کیوں کھچا چلا جا رہا ہے۔ اور میں کیوں چاہتی ہوں کہ یہ میرے پاس آکر مجھ سے باتیں کرے۔ اور میری انگلیاں اُس کی انگلیوں کو ڈرتے ڈرتے چھوئیں۔ اور یہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر مُسکرائے۔ کیا یہ "وہی" تو نہیں! اگر یہ "وہی" ہے تو میری اندھیری کوٹھڑی کو بقعۂ نور کیوں نہیں بناتا۔ یہ تو یہاں سے گزرتے وقت اِدھر دیکھتا تک نہیں۔ پھر یہ کون ہے اور میرا اس سے کونسا رُوحانی تعلق ہے کہ یہ میرے سُنسان طویل دنوں اور ویران اُجڑی راتوں پر چھایا جا رہا ہے۔

جب اُس کی ماتا باہر چلی گئی تو وہ دہلیز پر بیٹھ کر اُس پانچ منزلوں والے مکان کو دیکھتی رہی اور خود ہی ننھے ننھے گیت بنا کر گاتی رہی — ایک روز اُس نے ایک گیت گایا ؎

اُونچے بسنے والے میتم آجا میرے پاس
تجھ بن مجھ بے بس دُکھیا کی ہر ہر سانس اُداس

کون بندھائے آس
بیتم
آجا میرے پاس

مڑکر دیکھا تو مہترانی کھڑی دھیرے دھیرے جھاڑو ہلا رہی تھی، بولی "بی بی سلام۔ بڑا دکھی گیت گایا۔ کس کا ہے؟"

"چندی داس کا"۔۔۔ اور مایا اپنے آپ کو واقعی چندی داس ہی سمجھنے لگی۔ جس نے رادھا کی زبانی برہن کے گیت کہلوا کر تباہ حال استریوں کے ہردے مول لے لئے! اب مایا کا خاص مشغلہ جذبات بھرے گیت کہنا اور گانا تھا!

راتوں کو جب اُس کی ماتا لالہ گنیش داس سرگباش کی باتیں کرتے کرتے سو جاتی تو مایا چار پائی پر سے اُٹھتی اور باہر دہلیز پر بیٹھ کر اونچے بالاخانوں پر نظریں گاڑے رکھتی۔ جب تارے ٹمٹماتے اور اندھیری رات تنگ گلیوں میں سائیں سائیں کرنے لگتی، تو مایا اپنے وہ گیت گنگنانے لگتی، جو اُس نے بھگوان جانے کس مستی میں آکر کہے تھے اور جنہیں گا کر وہ یوں محسوس کرتی جیسے اُس کی ساری آشائیں پوری ہوگئیں۔

کئی بار وہ نوجوان گلی سے گزرا پر اُس نے پلٹ کر مایا کی طرف نہ دیکھا۔ مایا ایک بار گلی کے عین وسط میں ٹہلنے کے بہانے سے چلی گئی۔ وہ آیا۔ اور ایک طرف سے ہو کر نکل گیا۔ اُس دن مایا اس قدر روئی کہ آنکھیں گھنٹوں سُرخ رہیں!۔

ایک رات اچانک اس کی ماں کے پیٹ میں درد اُٹھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ گھر میں جو کچھ میسر آسکا استعمال کیا۔ سونف، پنیر، کالا نمک، خشک ہریڑ۔ لیکن رام دئی کو افاقہ نہ ہوا۔ اگلا دن بھی اسی درد و کرب میں گزرا۔ ایک بار مایا نے دیکھا کہ وہی نوجوان گلی میں جاتے جاتے رُک گیا ہے، اور اس کی بوڑھی ماں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اُسے اپنی گذشتہ ناکامیوں اور ماں کی پریشان کن علالت کے دکھ بھول گئے!

رات کو رام دئی اسی طرح چیختی رہی۔ دوسرے دن صبح کو اسکی حالت نازک ہوگئی۔ وہ نوجوان کوٹھڑی کے دروازے تک آیا اور بولا "کیا حال ہے ماتا جی کا؟"

مایا کچھ جواب نہ دے سکی۔ اُس کا گلا گھُٹ گیا۔ اُس کے آنسو اُمڈ آئے۔ اس کی زبان دو ایک بار لرزی مگر کوئی لفظ نہ ڈھال سکی۔ نوجوان مغموم اور اُداس واپس چلا گیا۔ اور مایا اس دُہری ناکامی پر بلک بلک کر روئی۔ اور اس کا رونا بند ہوا۔ اِدھر رام دئی کی پتلیاں پھر گئیں۔

مایا پکاری "ماتا جی۔ ماتا جی"

رام دئی کے نحیف لب لرزے۔ اور دھیمی سی آواز آئی "بھگوان دیا۔ دیا۔ بھگوان"

ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ٹمٹماتی شمع گل ہوگئی!

ایک مرنے والی اور ایک رونے والی ۔۔۔ ساری دُنیا میں تنہا۔ سارے سنسار میں اکیلی! مایا کی چیخوں سے متاثر ہو کر ننھی سمتراں اور سنتو مہترانی دوڑی آئیں اور اسکے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔ اور کوئی نہ آیا، وہ، بھی نہ آیا! وہ اِس خیال سے تڑپ اُٹھی۔

وہ اب ماتا کے خشک پنجر کو کہاں لے جائے۔ اُس کے پاس ایک کوڑی تک نہ تھی۔ اور گھر میں اتنا سامان نہ تھا کہ بیچکر چتا کے لئے لکڑیاں خریدی جاسکیں۔ کریا کرم پر تو بہت کچھ خرچ آتا تھا!۔

چار گھنٹے کے بعد دس بارہ آدمی آئے۔ اُنہوں نے رام دئی کی لاش اُٹھائی۔ مایا روتی چیختی اُن کے پیچھے ہولی۔ چتا تیار تھی۔ آگ بھڑکی اور پھر ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔

"ماتا!"

لکڑیوں کی چٹخ پٹخ کے سوا اور کوئی صدا سُنائی نہ دی!

وہ واپس لوٹی جیسے کوئی مُسافر اپنا سب کچھ کسی راہزن کے حوالے کرکے خستہ و درماندہ کسی طرف مُنہ اُٹھا کر چل دیتا ہے۔

راستے میں اُسے سمتراں ملی۔ اُداس چہرہ، مری مری چال۔ مایا نے پوچھا "سمتراں تجھے کیا ہوگیا"

ننھی بولی "آج بھیا رو رہے تھے، کہتے تھے مایا کو بہت دُکھ پہونچا"

وہ سمتراں کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف چلدی۔ اُس کا دماغ گھومنے لگا جیسے اُس نے شراب پی لی ہے!

دروازے پر پہونچی، اندر جانا چاہتی تھی کہ پیچھے سے اُسے کسی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا، وہی نوجوان آہستہ آہستہ آرہا تھا۔

وہ اس کے قریب آکر رُک گیا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

مایا کے دل میں بجلی کی کڑک کی سی آواز بلند ہوئی۔ اسنے آنکھیں جھکا کر پوچھا "تو کیا کریا کرم پر آپنے خرچ کیا؟"

"ہاں یہ میرا فرض تھا"

مایا چُپ ہوگئی۔

نوجوان بولا: "اور کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

مایا نے اسی انداز سے جواب دیا: "میرے کریا کرم پر بھی آپ ہی خرچ کیجئے گا۔ اور........"

"اور کیا؟" نوجوان نے پوچھا۔

مایا نے سامنے دیکھا۔ نوجوان کی نظریں جھک گئیں!

مایا کی جیسے کسی نے دل کی گرہ کھولدی۔

احمد ندیم قاسمی

وہ جب مجھ کو بلائینگے

ستاروں کی حسیں کرنوں کی بارش میں نہاؤنگی
گلوں کی مست خوشبو اپنے پیکر میں چاؤں گی

ملوں گی اپنے عارض پر حیا کا احمریں غازہ
لبوں پر سرخیِ خونِ عنادل میں لگاؤں گی

چمن کی تتلیاں چومیں گی آکر میرے عارض کو
میں اپنے آپ کو اک پھول جنت کا بناؤں گی

شکن اندر شکن کروں گی اپنی سنبلیں زلفیں
انہیں بل شاخ کا' انداز ناگن کا سکھاؤں گی

مری آنکھوں میں الفت نور بن کر مسکرائے گی
ستاروں کو درخشندہ نگاہی میں سکھاؤں گی

روش کے پھول کھل جائینگے میری خوش کلامی سے
لبوں سے بربطِ ناہید کے نغمے لٹاؤں گی

ستاروں کی شعاعوں سے بنونگی میں لباس اپنا
پہن کر پھر اسے اک روز اُن کے پاس جاؤں گی

قدم رکھتے ہی میں اُن کے شبستانِ معطر میں
نقاب اپنی اٹھا کر شمع رخ اپنی جلاؤں گی

وہ جب پروانہ وار آئینگے میری پیشوائی کو
حیا سے شرم سے میں اپنی پلکوں کو جھکاؤں گی

وہ جب میرے گلے میں ڈالدینگے پیار سے باہیں
میں اپنے دل کی دھڑکن انکے سینے کو سناؤں گی

نگاہوں سے مجھے جب دینگے پیغامِ ہم آغوشی
میں اپنے جسم و جاں کو اپنے قابو میں نہ پاؤں گی

گروں گی ہو کے بیخود اُن کی آغوشِ محبت میں
پھر اپنے کو ہمیشہ کے لئے میں بھول جاؤں گی

مہدی علی خاں

گھریات

۱۔ گھر

گھر کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اچھا سُنیئے۔ اوّل، بڑا گھر اور چھوٹا گھر۔ بڑا گھر بہت بڑا ہوتا ہے۔ چار دیواری اُس کی بہت اونچی ہوتی ہے۔ کمرے اس میں بے شمار ہوتے ہیں۔ چھوٹا گھر بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اونچائی اُس کی نفی میں ہوتی ہے (یعنی یہ زمین کے نیچے ہوتا ہے) مجھکو دونوں ناپسند ہیں۔ بڑے گھر کے رہنے والے مرد جھنجھناتے زیورات پہنتے ہیں، دن بھر چکیاں پیستے ہیں۔ رات کو لیٹ کر گھر کی دیواروں کی اونچائی کا اور کھڑکیوں کی مضبوطی کا تخمینہ لگایا کرتے ہیں۔ اور گجر دم اُٹھکر قطار میں بیٹھ کر مظاہرات قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مزید حالات معلوم کرنا چاہئے تو کسی قومی گیدڑ سے دریافت کر لئے جائیں۔

چھوٹا گھر بہت چھوٹا بہت مختصر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس میں نہ روشندان ہوتا ہے، نہ کھڑکی، نہ دروازہ۔ اس میں رہنے کو جو جاتا ہے کئی کئی ساڑھیاں سر سے پیر تک لپیٹ کر اکڑ جاتا ہے اور پھر بات نہیں کرتا۔ اندرونی حالات اس گھر کے کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے مجھے بھی معلوم نہیں۔ آپ کے محلّے کے ملّاجی جھوٹے ہیں خیالی گدّے لگاتے ہیں۔ مشاہدہ اور تجربہ اُن کو بھی اس گھر کا نہیں ہے۔ لہذا چھوڑیئے اس کو بھی۔

اس کے آگے بیان کرنے والے یوں بیان کرتے ہیں کہ دو قسمیں اور ہیں، انگنائی والے گھر اور بے انگنائی والے گھر۔ انگنائی والے گھر میں گھر انگنائی کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ اور بے انگنائی والے گھر میں انگنائی گھر کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ یہ کسی گلی میں ہوتا ہے وہ کسی روڈ پر۔ اس میں چند کوٹھڑیاں کمرے اور بے حساب طاق ہوتے ہیں۔ اس میں طاق۔ طاق طاق اور کمرے بے حساب ہوتے ہیں — بے آنگن کے گھر میں پاخانہ کوئی نہیں ہوتا غسلخانے بے شمار۔ آنگن والے گھر میں غسلخانہ کوئی نہیں ہوتا پاخانہ ایک لیکن بالکل بر پاخانہ۔ اس میں رہتے والے کم اور ملازم زیادہ ہوتے ہیں۔ اس میں رہنے والے زیادہ اور ملازم ندارد۔ بے صحن کے گھر میں کمانے والے میاں اور بیوی دونوں ہوتے ہیں۔ میاں کی کمائی خالص حرام کی ہوتی ہے۔ بیوی کی کمائی حرام یا حلال دونوں صورتوں کی ہوسکتی ہے۔ صحن والے گھر میں بڈّھا تو نکھٹّو ہوتا ہی ہے اور اگر بڑھیا سے کمانے کو کہو تو وہ بھی بگڑتی ہے۔ بہرحال گھر دونوں چلائے جاتے ہیں۔ یا چلائے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ (مگر گھر چلتے آج تک دیکھا نہیں) چونکہ گھر لوگ چلنے کے معاملے میں بہت اڑیل ہوتے ہیں، اس لئے اکثر مسز فضل قدیم یا چھمّی کی امّاں سختی سے ہنکائی کرنے لگ جاتی ہیں۔ گھر چلے یا نہ چلے اس سختی سے گھر والے ضرور چل پڑتے ہیں۔ وہاں صاحب بہادر غسلخانے میں گھس جاتے ہیں، بچّے باغ کی سیر کو نکل جاتے ہیں اور خانساماں کو دست آنے لگتے ہیں۔ یہاں جب چھمّی کی امّاں پھُنکنی پکڑتی ہیں تو بندہ اچکن ٹوپی پہن عینک آنکھوں اور پنسل کان پر لگا کر بغل میں مسودہ، ایک ہاتھ میں حقّہ دوسرے ہاتھ میں ڈاڑھی۔ سر نیچا کئے گھر سے نکل جاتا ہے۔ پھر میری جانے بلا اوروں پر کیا بیتی ہوگی۔ سُنا ہے بڑے صاحبزادے نے الحمدللہ میرا ہی ایسا رویّہ اختیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ بھی گھر سے نکل جاتے ہیں۔ پچھواڑے اِملی کے درخت کے نیچے لونڈوں کے ساتھ کوڑیاں پھینکنے کے مشغلہ میں کاٹ دیتے ہیں۔ ایسا ہی چاہیئے۔ کیا فائدہ چیمّا چیمّ پخ پخ سے۔

۲۔ بچّے

بچّے خدا کی دین ہیں۔ مفلسی اور بچّوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس وقت دُنیا کی فکریں لاحق ہوتی ہیں تو اِن ہی کے گوموت سے دل بہلتا ہے۔ جتنا کھاتے ہیں اُس سے زیادہ ہگتے ہیں۔ جتنا ہگتے ہیں اتنا ہی روتے ہیں۔ کیا کہنا گھر کی رونق اِن ہی سے ہے۔ جسکی آنکھیں دُکھ رہی ہیں وہ رو رہا ہے۔ جس نے ہگ دیا وہ رو رہا ہے۔ جو گر پڑا ہے وہ رو رہا ہے۔ جسے میں بہلا رہا ہوں وہ رو رہا ہے۔ باورچی خانے میں سویرا ہے اس لئے باقی چاروں بھی بسور رہے ہیں —!

گوشۂ دل، لختِ جگر، راحتِ جان، آنکھوں کے تارے۔ یہ میرے بچے ہیں۔ ان کا گوموت سر آنکھوں پر۔ لیکن جناب

دوسرے کے بچّوں کو کیا حق ہے۔ ناک بہتی، رال ٹپکتی، بدصورت، بدتمیز، مگر پھر بھی اِن کی اُٹھانا پڑتی ہے۔ دُنیا میں رہ کر دوستوں اور رشتہ داروں کو کیسے چھوڑ دیا جائے۔ آپ ہی پر آن پڑے تو کیا کریں۔ کسی رشتہ دار کے یہاں اگر آپ گئے ہیں اور ایک دفعہ سلسلہ کلام اس طرح بگڑتا ہے:۔ "لے ہاں بھائی تم نے بتول کے بچے کو تو دیکھا ہی نہیں؟ بیٹی انّا کو بلاؤ۔ یہاں لائے" اب آپ اُٹھ کے بھاگیں گے تھوڑی۔ لیجیے گبھے پر بچہ آپکے آگے پیش ہے۔ آپ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گبھا پکڑتے ہیں تو بتایا جاتا ہے:۔"اے اُلٹا اُلٹا، ادھر سے پکڑو" جوں توں گبھا آپ ہاتھ میں لیتے ہیں۔ دو چار گھر والے اور تماشا دیکھنے جمع ہوجاتے ہیں، دُلائی اُلٹی جاتی ہے۔ کچے گوشت کا لوتھڑا آپ کو نظر آتا ہے۔ آپ سمجھ لیتے ہیں بچّہ ہے۔ اب آپ سوچتے ہیں کچھ کہنا چاہیے۔ کیا کہیں سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر زور لگاتے ہیں۔ نہر پر چل رہی ہے پن چکی سے لیکر ہٹلر کی تازہ ترین اور آخری تقریر تک آپ جلدی جلدی یاد کر جاتے ہیں لیکن آپکو موقع کے مناسب کچھ یاد نہیں آتا۔ آخر بچے کی نانی جان ہی آپ کی مدد کرتی ہیں۔

"بھائی بتاؤ کس پر پڑا ہے" آپ گھبرا کر کہتے ہیں "کبھے پر" سب ہنس پڑتے ہیں۔ آپ کی پریشانی اور بڑھ جاتی ہے۔ نانی فرماتی ہیں:۔

"اوئی، لونج۔ لے یہ بتاؤ صورت کس سے ملتی ہے؟"

"اے یہی تو میں بھی سوچ رہا تھا، بالکل باپ کا نقشہ ہے۔"

سب ملکر کہتے ہیں" واہ وا۔ صاف تو ماں کا نقشہ ہے۔" آپ کہتے ہیں "ہاں ہے تو" اور ساتھ ہی جھک کر اپنے جوتوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ گیلا گیلا کیا ہے؟ ارے پتلون کے اندر بھی۔ ارے ارے اب سمجھے۔ دُلائی سے ڈھکی ڈھکائی مُڑے ہوئے گبھے کی نالی آپکے پیٹ کی طرف تھی۔ اس طرح پتلون کے نیفے میں دھار گئی۔ وہاں سے پائنچے میں ہوتا ہوا مُوت جوتے میں بھر گیا۔ اب آپ ہنسنا چاہتے ہیں اور رونا آتا ہے۔ غرض کہ دونوں کے سمونے سے جو حرکتیں پیدا ہو سکتی ہیں اُن کو ادا کر کے رخصت ہوتے ہیں۔

۳۔ امّائیں

امّائیں؟ اچھا امّائیں۔ گھر والیاں جتنی ہوتی ہیں سب امّائیں ہوتی ہیں۔ کوئی آپ کی امّاں ہیں، کوئی آپ کی امّاں کی امّاں ہیں۔ کوئی آپکے بچے کی امّاں ہیں۔ غرض کہ عورتیں سب امّائیں ہوتی ہیں لہٰذا مائیں نہیں عورتیں۔

۴۔ عورتیں

عورتیں؟ ـــــ عورتیں؟ (مشکل سوال ہے! تجربہ صرف ایک ہی گھر کا ہے) میرے گھر میں سات عدد ہیں۔ جن میں بڑھیا آگے آگے رہتی ہے اور باقی چھ اس کے پیچھے ـــــ نا صاحب آپ میرے مضمون پڑھیں یا نہ پڑھیں میں حاشا وکلا اس سلسلہ میں کچھ نہ لکھونگا۔ آپ لوگوں کے گھر میں تھوڑی، مجھے اپنے ہی گھر میں گذر کرنا ہے۔ اچھا یہ مضمون ختم۔ آپ لوگ گواہ رہیں میں نے ایک لفظ اِن لوگوں کے بارے میں اچھا یا بُرا کچھ نہیں کہا ہے۔

۵۔ پڑوسی

پڑوسیوں سے ہی محلہ آباد ہے۔ یہ نہ ہوں تو محلہ ہی نہ ہو۔ صرف آپ ہی کا اکیلا مکان ہو۔ یہ آپ کی دلبستگی کے واسطے ہیں۔ آپ اِن کی دلبستگی کے واسطے ہیں۔ آپ اِن کے گھر میں جھانکتے ہیں، یہ آپکے گھر میں جھانکتے ہیں۔ آپ اِن کی بُرائیاں کرتے ہیں یہ آپ کی عیب جوئی کرتے ہیں۔ یہی زندگی کے لُطف ہیں۔ آپس میں میل جول ہے۔ جھگڑے بکھیڑے بھی چلتے ہیں۔ فقرے بھی کسے جاتے ہیں۔ آپ ان کو دیکھکر جلتے ہیں، وہ آپ کو۔ آپ میلاد میں بتاشے بانٹتے ہیں تو وہ جلیبیاں۔ اب آپ پھر میلاد کراتے ہیں اور بالوشاہیاں بانٹ دیتے ہیں۔ پڑوسی صاحب پھر آپ کو نیچا دکھاتے ہیں۔ اب کی وہ پلاؤ قورمہ کی دعوت اڑا دیتے ہیں۔ اب آپ کو طیش آتا ہے اور دھڑاکے کی قوالی کراتے ہیں، اُن کو جو جوش آتا ہے تو گراموفون خرید لاتے ہیں۔ آپ ریڈیو لے آتے ہیں، اور وہ موٹر خرید ڈالتے ہیں ـــــ بھوکے سے بھوکا بھڑا دونوں کو غش آیا۔ ڈیڑھ سو کا موٹر اور اسّی کا ریڈیو۔ بیس روپے کا گراموفون مہینہ بھر کے بعد سب کے سب نخاس میں کباڑی کی دُکان پر پہونچ جاتے ہیں ـــ اُدھر آپ کی بیگم صاحبہ نے اور ہی گُل کھلا رکھا ہے۔ پہل ہلدی کی گرہ سے ہوئی تھی جس کے جواب میں پڑوسن نے لہسن کے دو جوے منگا بھیجے تھے۔ پھر نمک آٹا اور گھی کی مانگ سے بڑھتے بڑھتے دوپٹے بدلے گئے اور اب اِن کے بُندے اُنکے بُندوں سے اچھے بن رہے ہیں۔ اُن کے دست بند اِن کے دست بندوں سے بڑھیا کئے جانے کی فکر ہے۔ اُن کی ساڑھی سے بہتر اِنکو چاہیے اور اِن کے جوتے سے بڑھکر ان کو چاہیے۔ زیور کی بحث ہے؛

کپڑے کی بحث ہے، کھانے کی بحث ہے۔ گھر کی سجاوٹ کی بحث ہے، غرضکہ بحث ہی بحث ہے۔

۶۔ ماما

کھانا پکاتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کھاتی ہو۔ ہم کو پکا کر کھلاتی ہو اور بھی خوب پکاتی ہے۔ آٹے میں ناک ملاتی ہے، سالن میں جوئیں ٹپکاتی ہو اور گھر بھر کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہے۔ ہلدی، مرچیں، دھنیا سیروں نیفے میں چرا کر لے جاتی ہے۔

۷۔ بھنگن

تیسرے دن آتی ہے۔ اکٹھا لے جاتی ہے۔ جو سختی کرو تو چوتھے دن کی باری باندھ لیتی ہے۔ جو کچھ بھی کرتی ہے آپکے سر پر احسان کا ٹوکرا رکھتی ہے۔ ذرا دیکھئے تو سہی کیا کام کرتی ہے۔ اسی کا جگر ہے ورنہ دوسرے کا کام نہیں۔ ہنسنے کا مقام نہیں۔ عبرت لیجئے عبرت۔ ایک دفعہ ہمارے محلے کی بڑھیا بھنگن آٹھویں دن کا بھرا ہوا ٹوکرا لئے جا رہی تھی۔ برسات کے دن تھے، بیچاری پھسل پڑی۔ جب سے یہ ہوگیا ہے کہ جب وہ نکلتی ہے تو محلہ بھر کھڑا ہو کر خیر مناتا ہے۔ اس کے ہر ہر قدم پر سب بسم اللہ بسم اللہ کہتے ہیں۔

۸۔ دھوبن

صاف ہے ستھری ہے، چکنی ہے چپڑی ہے۔ آٹھویں دن کا وعدہ کرتی ہے مہینہ بھر بعد صورت دکھاتی ہے۔ پوٹلا بھرے جاتی ہے۔ کچھ کھوتی ہے کچھ جلاتی ہے۔ باقی دھو کر لے آتی ہے۔ کپڑوں کو پہلے بھٹی چڑھاتی ہے جب نہیں گلتے تو دریا پر لے جا کر پتھروں پر دے دے مارتی ہے۔ جب بھی نہیں پھٹتے تو خود پہنتی ہے کرایہ پر دیتی ہے۔ نئے کپڑے اسی کے دم سے بنتے ہیں۔ سفید پوش اسی کے بھروسے پر اکڑتے ہیں۔ لیکن ہے چغلخور، بیگم سے ایک ایک کی دو دو لگاتی ہے۔

۹۔ مولوی صاحب

مولوی صاحب تو علم کا پوٹلا بنے ہوتے ہیں۔ ان کی تو کوئی بات قیل و قال سے خالی ہی نہیں۔ حتیٰ کہ بچے کو پڑھاتے ہیں جب سو جاتے ہیں تب بھی حاوَ ۔ طاوَ ۔ طاوَ ۔ طاوَ ۔ ع ۔ ق ۔ کے خراٹے لگاتے ہیں۔ سوتے سے اگر چونک جاتے ہیں تو استغفراللہ کہتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ بلی کو خواب میں چھچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔ دیکھئے سوتے سے اٹھے تو بھی اللہ کو یاد کرتے ہوئے۔

ان کو دیکھکر ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اللہ میاں یاد آجاتے ہیں۔ بھاری جسم آسمانی لباس۔ عبا۔ قبا۔ صافہ اور عصا، سفید نورانی ڈاڑھی (جوؤں سے کیا ہوتا ہے، جوئیں سب کے ہوتی ہیں۔) برکت نما گول توند۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم کی تجوری لئے پھرتے ہیں۔ (بھنگن جھوٹی ہے، ایسے ہی بکتی ہے۔ اصل میں علم ہی علم بھرا ہے۔)

۱۰۔ سالار جنگ

ایک مکمل گھر کے واسطے آپ کا وجود لازمی ہے۔ وہ گھر جس میں سالا نہ ہو ایسا ہی ہے جیسے بے کھونٹے کی چکی۔ بلکہ ان کی ہستی کھونٹے سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہے۔ ان کا شانِ نزول خود اس بات کی دلیل ہے۔ یاد کیجے وہ دن جب بوئے گل ہر گوشے سے آتی تھی۔ جب بادِ سحر دامن سے اٹھلاتی تھی۔ جب دنیا میں شور بپا تھا۔ جب نغموں میں جوش بھرا تھا۔ اور جب؟ جب بادِ شباب بٹتی تھی۔ جب آپ بھی ہنستے تھے۔ دنیا بھی ہنستی تھی۔ اس وقت یہ حضرت نمونتاً آپ کو پیش کئے گئے تھے۔ (ہاں آپ کو ہوش کہاں تھا، آپ تو نشہ میں تھے) بعد میں بطور تحفہ یہ آپ کو جہیز میں ساتھ ملے تھے اور جب نئے نئے آئے تھے تو میاؤں بھی کرنا نہ آتی تھی۔ اب کھاتے ہیں اور غراتے ہیں اور پھر بھی آپ ناز اٹھاتے ہیں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ انہی کی حرکت ہے۔ ہو نہ ہو یہی حضرت ہیں۔ پڑوسی کہہ رہے ہیں۔ مسجد کا ملا کہہ رہا ہے آیا گیا کہہ رہا ہے، سارا محلہ کہہ رہا ہے لیکن آپ گھٹنے ٹیکے دے دیتے ہیں کہ نہیں ہرگز نہیں، یہ بیچارہ تو مسجد میں جاتا ہی نہیں۔ میں کیسے مان لوں کہ اس نے بدھنی توڑ ڈالی۔ آپ ایک ایک سے بحث رہے ہیں۔ دنیا آپ کو قائل کر رہی ہے اور آپ اکیلے سب کو جھٹلا رہے ہیں۔ کیا شان ہے سالے کی!

ساری خدائی ایک طرف
جورو کا بھائی ایک طرف

اب کون رہ گیا؟ — میں اور آپ۔ ہیں۔ ہیں۔ ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ہاتھ ملائیے۔ ہوں۔ ہوں۔ ہوں۔ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔ ۔ ۔ سلام علیکم۔

سید رفیق حسین

لمحۂ فکریہ

کچھ اس تیزی سے پیر وقت کی پسلی پھڑکتی ہے
کہ نبض عالم ایجاد سرعت سے دھڑکتی ہے

روانی جس میں طوفاں کی ہے یہ دنیا وہ ساحل ہے
نہیں ہے جس میں دم لینے کی گنجائش وہ منزل ہے

تفکر کی وہ کثرت وہ پریشانی کا عالم ہے
وفور اضطراب غم سے ہر شے مائل رم ہے

مسلسل یورش آلام سے راحت نہیں ملتی
سکوں سے فکر اور تدبیر کی مہلت نہیں ملتی

مگر کچھ واقعے ایسے بھی ہیں دنیائے فانی میں
بہا دیتے ہیں جو مجھ کو تصور کی روانی میں

ثمردار ایک شاخ سبز سے جب پھل ٹپکتا ہے
ہوا کی تیز رو میں جب کوئی ذرہ بھٹکتا ہے

لبوں میں دب کے جب بیمار کا دم ٹوٹ جاتا ہے
جب اک ہچکی میں قید زندگی سے چھوٹ جاتا ہے

اندھیری رات میں جب ڈر سے روحیں تلملاتی ہیں
جب اک ویران سے مرقد کی شمعیں جھلملاتی ہیں

جب اک دیوار پر ننھی سی چیونٹی گر کے چڑھتی ہے
کنارے کی طرف جب پیچ کھا کر موج بڑھتی ہے

کڑکتی دھوپ میں جب چن کے تنکے چیل لاتی ہے
گھنی شاخوں میں جب اک پیڑ پر مسکن بناتی ہے

جب اک سہما ہوا چیتا چکاروں پر لپکتا ہے
جب اک سہما ہوا خرگوش بل میں جا دبکتا ہے

بگولا اٹھ کے ہو جاتا ہے جب اوجھل نگاہوں سے
جب اڑ جاتی ہے تتلی بن کے بو خوشرنگ پھولوں سے

گل خنداں پہ آنسو بن کے جب شبنم برستی ہے
جب اک دیوانی بے معنی ہنسی حیرت سے ہنستی ہے

سر کہسار منڈلاتے ہیں جب بادل بگولا سے
دھواں سا دور جب اٹھتا ہو اک سادھو کی کٹیا سے

جہنم آفریں جب دھوپ ساون کی نکلتی ہے
جوانی لیکے اک انگڑائی جب کروٹ بدلتی ہے

نظر جھکتی ہوئی سی دل میں جب مسکن بناتی ہے
کثیر انبوہ سے جب اک دوشیزہ منہ چھپاتی ہے

ستارا تھک کے جب شمع سحر سا ٹمٹماتا ہے
فلک پر ایک دھاری سی بنا کر ٹوٹ جاتا ہے

جہاں میں دیو خونخواری کے جب تیور بگڑتے ہیں
نزاع و جنگ سے جب امن کے خرمن اجڑتے ہیں

تمنا کے لہو میں ڈوب کر جب زخم ابھرتے ہیں
فضا میں جسم غلطیدہ کے جب پرزے بکھرتے ہیں

نظر آتا ہے جب دنیا کا ہر ماحول غمگیں سا
اچانک ذہن کو جب سوجھتا ہے شعر زریں سا

تو پھر غوطے لگاتا ہوں میں سیلاب تفکر میں
میں اکثر ڈوبتا ہوں بحر پایاب تفکر میں

مخمور جالندھری

قلوپطرہ کی موت

افراد

۱۔ دُنیا کی ایک حسین ترین عورت، جس کا حُسن انقلابات اور خونریزیوں کا باعث ہوا۔ جس ساحرہ کے حسن و عشق کے قصّے آج بھی دریائے نیل کے ماہی گیروں کو ازبر یاد ہیں یعنی مصر کی رانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قلوپطرہ۔

۲۔ ایک خوبصورت ناگن، جس نے دُنیا کو بتا دیا کہ ایک ناکام عورت کس طرح اپنے ملک، اپنے محبوب کی تنزّلی کا باعث بنتی ہے اور کس طرح دیوتاؤں اور خبیث رُوحوں کے قہر کو دعوت دیتی ہے۔ یعنی قلوپطرہ کی داسی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چیرمیاں

۳۔ اوسارس کے پجاری کا بیٹا۔ قلوپطرہ کے خلاف باغیوں کا سرغنہ۔ مگر حسن کے پہلے بے پناہ حملے کے سامنے پسپا ہو جانے والا ناکام عاشق، اصلی نام ہرمشس۔ لیکن قلوپطرہ کے دربار میں شاہی طبیب کی حیثیت سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اولمپس۔

۴۔ ایک زبردست سالار جنگ، جس کے بازوؤں میں قوت تھی، تلوار میں تڑپ، اکھڑ اور جنگجو۔ فاتح اور مغرور، مگر آستانِ حُسن پر سر جھکا دینے والا قلوپطرہ کا میاب عاشق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انطونی۔

علاوہ ازیں آئرس اور ایک حبشی۔

زمانہ۔ جب ایک طرف سیزر اور انطونی جیسے بے بدل اور اولوالعزم فاتح پیدا ہوتے اور دوسری طرف قلوپطرہ، مصر کی رانی، ایک کافر جمال زہریلی ناگن جس نے ان بہادروں پر بھی فتح پائی۔

مقام۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسکندریہ

ہیلن، قلوپطرہ، میری (MARY OF SCOTS) وغیرہ اُن چند عورتوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنا حُسن سیاسی اغراض کیلئے استعمال کیا۔ اور جو کہ تاریخ عالم میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان گنتی کی عورتوں کی بابت بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ قلوپطرہ کی رومان انگیز زندگی کی کشش دیکھئے کہ شیکسپیئر، برناڈ شاہ اور رائیڈر ہیگرڈ جیسے مصنفین بھی اس طرف توجہ دئے بغیر نہ رہ سکے۔ رائیڈر ہیگرڈ نے قلوپطرہ کی داستان محبت کو ایک نئے پیرائے میں لکھا۔ مندرجہ ذیل ایک ایکٹ کے ڈرامے کو اس کی کتاب "قلوپطرہ" کا ایک باب سمجھنا چاہیے۔ قلوپطرہ نے ۳۹ برس کی عمر پائی۔ اُس کی موت کی بابت بہت سی روایات مشہور ہیں۔ چونکہ میں نے یہ واقعہ رائیڈر ہیگرڈ کی کتاب سے لیا ہے لہذا واقعہ میں کچھ قطع برید کے بعد موت کی روایت وہی قائم رکھی گئی ہے۔ غالباً ناظرین نے رائیڈر ہیگرڈ کی یہ کتاب پڑھی ہوگی یا اس کا ترجمہ بزبانِ اُردو ہی نظروں سے گذرا ہوگا۔ یا کم از کم مصر کی رانی قلوپطرہ کی بابت کچھ نہ کچھ تو سُنا ہوگا۔ اور پھر ساقی میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس طویل ناول کی کہانی مختصر طور پر بھی بیان کر دی جائے۔ اس لئے بندہ اس سے پہلے کے واقعات نہ لکھنے کیلئے معافی کا خواستگار ہے۔

بلونت سنگھ

منظر اوّل

شاہی عمارت کا ایک کمرہ۔

وقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صبح

ایک طرف دو بھاری ستون ہیں جن پر عجیب صورتیں اور سُنہری و روپہلی نقش و نگار بنے ہوتے ہیں۔ ان دو ستونوں کے درمیان دو دیو قامت برہنہ مجسمے ایسی صورت میں بنے ہوتے ہیں جیسے کہ وہ کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور اُنکے

ہاتھ ان کے زانوؤں پر ہیں۔ دیواروں پر قسم قسم کی صورتیں بنی ہوئی۔ ایک اونچے چبوترے پر تختِ شاہی ہے جس کے دونوں بازوؤں کی جگہ دو شیر ببر بنے ہوتے ہیں۔ کرسی کی پشت ایسی ہے جیسے مور پر پھیلائے رقص کر رہا ہو۔ تختِ شاہی کے آگے شیر کی کھال بچھی ہوئی ہے۔ کمرے میں خاموشی اور سکون ہے۔ ایک دروازے سے مہارانی قلوپطرہ اندر داخل ہوتی ہے اس کے ساتھ اس کی خوبصورت باندی چیرمیاں ہے قلوپطرہ کے سر پر تاجِ شاہی ہے، گلے میں قیمتی موتیوں کا ہار ہے۔ باریک لباس اور پاؤں میں چپلیاں جن پر ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے چہرے سے شاہانہ وقار، عزم و استقلال کے آثار عیاں ہیں اور ساتھ ہی سیاست دانوں کی سی سنجیدگی اور جہاندیدہ بزرگوں کی سی متانت بھی ہویدا ہے۔ وہ پُر وقار انداز سے چلتی تخت کے قریب پہونچتی ہے اور اک شاہانہ تکبر کے ساتھ اس پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کا سر اٹھا ہوا ہے نظریں سامنے کی طرف گڑی ہوئی ہیں۔ چیتا اس کے پاؤں کے قریب بیٹھ جاتا ہے اور چیرمیاں مورچھل کرنے لگتی ہے۔

قلوپطرہ۔ چیرمیاں!۔۔۔۔ کیا وہ آئرس ہی ہے نا؟

چیرمیاں۔ (ذرا آگے جھک کر) ہاں مہارانی! وہ آئرس ہی ہے۔۔۔۔۔ ملاحظہ کیجئے اس کی چال۔ ایک بزدل چھچھوندر کی طرح تاریک دیوار کے ساتھ ساتھ چلی آرہی ہے۔

(قلوپطرہ خاموش رہتی ہے۔)

چیرمیاں۔ اس میں کچھ راز ہے (بلند تر آواز سے) او آئرس! تو جو لومڑی کی طرح منہ لٹکائے چلی آتی ہے، تیری سیاہ آنکھوں میں آنسو ایسے پوشیدہ ہیں جیسے کالی گھٹاؤں میں پانی ۔۔ سچ بتلا کیا ماجرا ہے؟

قلوپطرہ۔ پیشتر اس کے کہ تو چیرمیاں کے سوال کا جواب دے اور پیشتر اس کے کہ تو ایک قدم بھی آگے بڑھائے۔ (تیز اور کرخت آواز میں) تو بتا کہ تیرے پیچھے تاریک گوشے میں دبکا ہوا سیاہ فام حبشی کون ہے؟

آئرس۔ (پہلے حبشی اور پھر قلوپطرہ کی طرف پُرنم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے) مہارانی!۔

قلوپطرہ۔ (فرش پر پاؤں مار کر) آئرس!!

آئرس۔ (رو کر) مہارانی!!

قلوپطرہ۔ (کڑک کر) چیرمیاں! نیزہ لاؤ۔

(آئرس تیر کی سی تیزی سے آتی ہے اور خود کو قلوپطرہ کے پاؤں پر گرا دیتی ہے۔ قلوپطرہ اس کے بال پکڑ اُسے اوپر اٹھاتی ہے۔)

آئرس۔ (ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے) مہارانی! مہارانی!! مجھے تاب نہیں۔۔۔ مجھے تاب نہیں۔۔۔ یہ حبشی عالیجاہ انطونی کے پاس سے آیا ہے۔

(قلوپطرہ نہایت خفگی کے ساتھ اس کے بال کھینچ کر پیچھے کی طرف زور کے ساتھ دھکیل دیتی ہے اور خود پھر اسی وقار کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے۔)

قلوپطرہ۔ او سیاہ فام غلام! بول۔

(حبشی کی ٹانگیں لرزنے لگتی ہیں۔)

قلوپطرہ۔ کیا تو شاہ انطونی کے پاس سے آیا ہے؟

حبشی۔ میرے نصیب میں یونہی لکھا تھا۔ شاہوں کو شاہوں کے پیغامات پہونچانا ہر ایک کی تقدیر میں نہیں ہوتا۔

قلوپطرہ۔ تو نے ٹھیک کہا۔ بتا تجھے اور کیا کہنا ہے؟

حبشی۔ کاش! میں یہ پیغام تحریر کی صورت میں پیش کر سکتا۔

قلوپطرہ۔ (چیرمیاں کی طرف ہاتھ بڑھا کر) نیزہ۔ (نیزہ ہاتھ میں لے لیتی ہے۔)

حبشی۔ (خوفزدہ ہو کر) او مہارانی! مجھے وہ الفاظ نہیں ملتے۔۔۔

قلوپطرہ۔ (نیزہ ہاتھ میں تولتے ہوئے) اچھا تو۔۔۔۔

(دوسرے لمحے حبشی فرش پر اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔)

حبشی۔ (سر اٹھا کر) پناہ! مہارانی! پناہ!! جب۔۔۔ جب عالیجاہ نے حضور کی موت کی خبر سنی تو انہوں نے اپنے سینہ میں خنجر گھونپ لیا۔

قلوپطرہ۔ (انتہائی غصہ میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے) کمینہ! کتا۔

حبشی۔ (گڑگڑا کر) بخشدے۔ مہارانی میں، عالیجاہ کے دسترخوان سے بچے کھچے ٹکڑے کھانے والا غلام ہوں۔

(قلوپطرہ کے ہاتھ کو حرکت ہوتی ہے اور وہ نیزہ جان کے خوف سے فرار ہوتے ہوئے حبشی کی پشت میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بھوکے بھیڑیے کی مانند ایک لرزہ خیز چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور پھر تڑپ کر مر جاتا ہے۔)

قلوپطرہ۔ (تخت پر بیٹھتے ہوئے) چیرمیاں! کیا ایسا پیغام لانے والے کو اس سے بہتر انعام دیا جا سکتا ہے؟

چیرمیاں۔ نہیں مہارانی جی۔

قلوپطرہ۔ (سکوت کے بعد سامنے خلا میں گھورتے ہوئے) چیرمیاں!

چیر میاں :- مہارانی

قلوپطرہ :- تو نے سنا اس سیاہ کتّے نے کیا کہا!

چیر میاں :- ہاں مہارانی جی اس نے کہا تھا کہ ....

قلوپطرہ :- اس نے کہا تھا — بس چیر میاں (اس کا ہاتھ تھام کر) بس وہ الفاظ ایسے نہیں جنہیں میں پھر سن سکوں۔

(اس کی گردن میں خم آجاتا ہے اُس کا سر جھک جاتا ہے۔ آئرس بڑھ کر اُسے سنبھالتی ہے۔)

آئرس :- مہارانی بیہوش ہوگئیں۔ جا چیر میاں تھوڑی سی شراب لے آ۔ (پیالہ لیکر پلاتی ہے) مہارانی جی! ہوش میں آئیے (سر اُٹھا کر) چیر میاں! یہ شور کیسا سنائی دے رہا ہے؟ دیکھو تو۔

چیر میاں :- (دریچے میں سے جھانک کر) ہائے! یہ تو عالیجاہ انطونی ہیں خون میں لت پت ہو رہے ہیں۔

آئرس :- انہیں اوپر لانا چاہیئے۔

چیر میاں :- مگر مہارانی نے دروازہ کھولنے کی ممانعت کر دی ہے۔

آئرس :- مہارانی کو ضرور کچھ خطرہ ہوگا۔ اتنے شور وغل میں دروازے کا کھول دینا مناسب نہیں۔

قلوپطرہ :- (ہوش میں آکر) کیا ہے؟

(چیر میاں پیچھے کی طرف سرک جاتی ہے تاکہ اُسے کچھ نہ کہنا پڑے۔ آئرس چیر میاں کو بولنے کیلئے اشارہ کرتی ہے)

قلوپطرہ :- (گھوم کر چیر میاں کی طرف دیکھتی ہے) کیوں او چیر میاں یہ کیا شور ہو رہے ہیں۔ آخر کیا بات ہے؟

(نیچے پھر شور وغل کی آوازیں اُٹھتی ہیں۔ چیر میاں بلا جواب دئے ایک رسّا لیکر دریچے کی طرف جاتی ہے۔ قلوپطرہ اور آئرس بھی دوڑ کر جاتی ہیں اور رسّا نیچے لٹکا دیا جاتا ہے۔)

قلوپطرہ :- (منہ ڈھانپ کر) چیر میاں یہ کیا۔

چیر میاں :- مہارانی جی! طبیعت کو سنبھالئے۔ لوگوں نے رسّا عالیجاہ کی کمر سے باندھ دیا ہے۔ آپ کی مدد کے بغیر انہیں اوپر کھینچنا مشکل ہے۔

(تینوں زور لگاتی ہیں۔ کئی دفعہ رسّا اُن کے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے مگر آخر کار وہ کامیاب ہو جاتی ہیں۔)

قلوپطرہ :- (ہانپتے ہوئے) آئرس! چیر میاں!! آؤ انہیں بستر پر لٹا دو۔ اور دیکھو وہ رسّا نیچے لٹکا دو تاکہ اولپس اوپر آجائے۔

(انطونی کو لٹا کر قلوپطرہ مارے غم کے ذرا دور جا کھڑی ہوتی ہے۔ انطونی ہوش میں آجاتا ہے۔)

انطونی :- (حیرت سے) قلوپطرہ۔

قلوپطرہ :- انطونی۔

انطونی :- آؤ، قلوپطرہ۔

(قلوپطرہ بازو پھیلائے ہوئے انطونی کے اوپر جا گرتی ہے)

قلوپطرہ :- (رو کر) میرے سرتاج! میرے مالک! میرے آقا!

انطونی :- تم زندہ ہو؟ یہ ہاتھ کس کا ہے؟ قلوپطرہ! قلوپطرہ!!

قلوپطرہ :- (دامن میں منہ چھپا کر) انطونی! تم نے مجھ پر شک کیا۔ تم نے سمجھا کہ میں نے لڑائی میں تمہیں دھوکا دیا۔ حالانکہ یہ بات ہرگز نہ تھی۔ میری روح ہی دہشت زدہ ہو گئی اس لئے میں میدان جنگ میں سے بھاگ نکلی۔ مگر میں تمہیں کس طرح سے سمجھاتی ہے۔ تم مجھ پر شبہ کرو؟ کیا یہ میرے لئے مرجانے کا مقام نہیں، میں تو عنقریب خودکشی کرنے والی تھی، اس لئے میں نے تمہیں اطلاع بھیجدی۔ لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ تم پر اس کا ایسا اثر ہوگا۔

انطونی :- قلوپطرہ! میرا دل صاف ہے۔ جو ہونا سو ہوا۔ اب لمحہ بھر کیلئے بیٹھو کچھ پیار کی باتیں کرو۔

قلوپطرہ :- (پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اور اپنے چہرے کو انطونی کے زخمی سینے پر رکھتے ہوئے) انطونی! انطونی!!

انطونی :- (خفگی سے) یہ تو نے کیا کیا؟ تمام چہرہ خون سے رنگین کر لیا۔ قلوپطرہ میرا آخری وقت ہے میں تیری ایسی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں قلوپطرہ کی وہی صورت دیکھتے ہوئے مرجانا چاہتا ہوں جو کہ میرے دل میں بسی ہوئی ہے۔ لاؤ میں یہ خون آلود چہرہ صاف کر دوں۔

(کپڑے سے قلوپطرہ کا چہرہ صاف کرتا ہے۔)

قلوپطرہ :- میرا جیسے دم گھٹا جا رہا ہے۔ آج اس دنیا کی وسعت بھی تنگ معلوم دے رہی ہے۔

انطونی :- تجھے اُن دیوتاؤں کی قسم جن کو تو نے اپنے افعال کی بدولت خفا کر دیا ہے اب یہ تقریر ختم کر۔ آ اس پرانی یاد کو تازہ کریں۔ وہ دن یاد ہیں جب گھٹائیں جھوم جھوم کر اُٹھتی تھیں، تم بربط کے ساتھ اپنی نقرئی آواز ملا کر جھوم جھوم کر گاتی تھیں اور میں ایک بچے کی طرح جھومتا تھا۔ بالکل ہمہ تن گوش .... آہ وہ دریائے نیل کی راتیں ....

(اُس کے ہاتھ سے قلوپطرہ کا ہاتھ چھوٹ جاتا ہے)

قلوپطرہ :- (گھبرا کر) انطونی!

انطونی :- (ہوش میں آکر) کیوں؟ میں زندہ ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ کیا میں خاموش ہو گیا تھا۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟ .... ہاں تو دیکھو کیا تمہیں وہ انطونی

یاد ہے جس نے اپنی کشتیِ حیات کے چپو تمہیں سونپ دئے تھے۔ اور تم جسکی باتیں سنتی نہ تھکتی تھیں، لو! اب اُس انطونی کے لبوں پر مہرِ سکوت لگنے والی ہے۔ ایسی کہ آئندہ وہ آواز تم کبھی بھی نہ سُن پاؤ گی۔

قلوپطرہ۔ (شدتِ غم سے چلاکر) میرے مالک۔ آخر تم ایسی دل دکھانیوالی باتیں کیوں کرتے ہو۔

انطونی۔ اور جب انطونی مرجائے تو تم صبر کرنا اور زندہ رہنا۔

قلوپطرہ۔ (چلاکر) ایسا نہیں ہوگا۔ (روتے ہوئے اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھتے ہوئے) میرے سرتاج، میرے آقا! آخر اسقدر بیقراری کیوں؟ ایسا کیوں ہونے لگا۔ نہیں تم نہیں مروگے۔

انطونی۔ (کمزور اور دھیمی آواز میں) کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص جو تلواروں کے سائے میں پروان چڑھا ہو، جس کی زندگی کا زیادہ حصہ میدانِ جنگ میں گزرا ہو، وہ آج میدانِ کارزار میں اپنے کسی ہم پلہ بہادر کی تلوار کے وار سے مرنے کی بجائے ایک حسینہ کے زانو پر سر رکھے جان دے رہا ہے۔ بحیثیت ایک جنگجو سپاہی کے مجھے یہ موت پسند نہیں۔ کیا کسی کشورکشا فاتح کو ایسی موت زیب دے سکتی ہے! مگر میں نے ایک بزدل کی طرح خودکشی کی اور پتھر کے کھردرے فرش زندگی کے آخری لمحات گن رہا تھا میرے خیال میں یہ موت اُس موت سے زیادہ راحت آمیز ہے۔ قلوپطرہ ... قلو......

قلوپطرہ۔ (دونوں ہاتھ اُٹھاکر چلاتی ہے) چیرمیاں! ربال نوچتی ہوئی پچھاڑ کھاکر گر پڑتی ہے۔)

(چیرمیاں، آئرس اور اولمپس اُس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔)

منظر دوم

وہی کمرہ۔

وقت - - - - - - بعد از دوپہر

ڈھلتے ہوئے سُورج کی کرنیں بڑے بڑے مجسّموں پر پڑ رہی ہیں۔ چیتا اُن کے قدموں میں دبکا پڑا ہے۔ دیواروں پر کئی تصاویر فراعنۂ مصر کی زندگی کے اہم واقعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک طرف لکڑی کی ایک طویل کشتی بنی ہوئی ہے جسے ملّاح کھے رہے ہیں، اور جس کے چپو سفید ہیں۔ مگر چپوّوں کے دستے سنہری ہیں۔ کوچ کے قریب بانسری، دف، بربط وغیرہ چند ساز پڑے ہیں۔ بھاری پردے لٹکے ہوتے ہیں۔ سامنے کے بڑے دریچے میں سے شہر کی عمارتوں کے چوڑے چوڑے پتھروں کی دیواریں نظر آرہی ہیں۔ دوسرے دریچے میں سے دریائے نیل کے کنارے گانے والے ملّاحوں کے دیہاتی گیتوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ ایک کونے میں ایک ہشت پہلو برتن رکھا ہے جس میں کوئی خوشبو جل رہی ہے اور دھوئیں کی پتلی سی لکیر بل کھاتی ہوئی چھت تک چلی گئی ہے۔ چیرمیاں پتھر کی بڑی میز پر کھانا چُن رہی ہے اور ساتھ ہی کوئی گیت گنگنا رہی ہے اولمپس بھی پاس کھڑا ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔

اولمپس۔ تم پھر گانے لگیں؟ مجھے بتاؤ کچھ کیا ہوا۔

چیرمیاں۔ یہ گھڑی تو خوشی منانے کی ہے۔ تم متفکر کیوں کھڑے ہو — آہ عورت کا عشق جس نے تمہیں تباہ کر ڈالا، اب بھی تمہارے دل سے گیا نہیں۔

اولمپس۔ (ایک قدم آگے بڑھکر) چیرمیاں! اب یہ طنز اور یہ مذاق ختم کر۔ اچھا تو قلوپطرہ بہت غمگین تھی۔ تم نے اس کی دلجمعی کرنی چاہی تو پھر اس نے کیا کہا۔

چیرمیاں۔ مہارانی مجھ سے خفا ہوکر کہنے لگیں: "میں مہارانی؟ کیا مذاق ہے مجھ سے بانسری بجانے والی چھوکریاں اچھی ہیں۔ وہ کسبیاں میری نسبت آرام میں ہیں جو کہ اسکندریہ کی سڑکوں پر بے باکی سے گھومتی پھرتی ہیں، میری نسبت تو وہ چھوکرے تک اچھے ہیں جو صبح کے وقت سبزیاں گدھوں پر لادے چلاتے اور شور مچاتے شہر میں آیا کرتے ہیں — کیا میں ہی وہ سرکش ملکہ ہوں، جس کے حسن و جمال کا شہرہ دُور دُور تک تھا۔ کیا میں ہی وہ رانی ہوں جس کا غلام بننے میں انطونی جیسے فاتح نے فخر سمجھا۔ کیا میں ہی وہ مہارانی ہوں جس کے ابرو کے ایک اشارے نے باغی ہرمشس کو نیچا دکھادیا۔ اور کیا میں ہی وہ حسینہ ہوں جس کی ایک ادا نے سیزر کو جنگ کے تمام داؤں پیچ بھلا دئے تھے، اور چیرمیاں میں انہیں رومیوں کے خوف سے یہاں دبکی بیٹھی ہوں، میں گرفتار کرلی جاؤں گی اور مجرموں کی طرح روم لے جائی جاؤں گی۔ پھر مجھے برہنہ جسم سڑکوں پر گھمایا جائے گا۔ رومی اور یونانی مجھ پر آوازے کسینگے۔ میرے جسم کی نرم و خوشنما جلد دھوپ کی تپش اور زمین کی گرد کی وجہ سے بھدی ہوجائیگی — بتا بتا! تو بتا تیری مہارانی کی یہ بے بسی؟ کیا اس ذلت سے بچنے کی کوئی ترکیب نہیں؟"

اولمپس۔ پھر تو نے کیا جواب دیا؟

چیر میاں:- میں نے کہا "ہاں مہارانی ہے"!

اولمپس:- خوب!

چیر میاں:- وہ ایک خشک ہنسی ہنس کر بائیں ہاتھ والے دریچے کی طرف چلی گئیں اور دُور دریا کی طرف دیکھنے لگیں۔ میں دبے پاؤں اُن کے قریب پہنچی اور اُن کی پشت پر ہاتھ رکھکر بولی "آپ ایک مہارانی کی طرح مر سکتی ہیں"

اولمپس:- شاباش!

چیر میاں:- پھر وہ میری طرف پلٹیں۔ اُن کی آنکھوں میں ایک نئی روشنی پیدا ہوگئی۔ اُنکے گالوں پر سُرخی دوڑ گئی۔ اُن کا سینہ تن گیا۔ مضبوط آواز میں کہنے لگیں "کیا میں مہارانی کی طرح مر سکتی ہوں؟" میں اور قریب ہوگئی اور بولی "بیشک مہارانی مرتے دم تک مہارانی ہی رہیگی"

اولمپس:- تُو نے خوب کہا۔ اچھا پھر؟

چیر میاں:- مہارانی جی نے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور کہنے لگیں "تُو نے ہر مرتبہ مجھے عمدہ ہی رائے دی" پھر اُنہوں نے مجھے سینے سے علیحدہ کیا، اور پکار کر بولیں "او اَئرس! جلد جا اور میرے غسل کا سامان تیار کر، میرے لئے بہترین لباس لا۔ قیمتی خوشبوؤں سے میرا جسم معطر کر دے —— مہارانی مہارانی ہی رہے گی"! تب اُنہوں نے کپڑے اُتار دیے اور مجھے آخری دعوت کیلئے لذیذ ترین کھانے چننے کے لئے کہا، اور تمہارے لئے یہ حکم دیا کہ جب تم دعوت میں شامل ہونے کیلئے آؤ تو سب سے زیادہ تیز اور پُرتاثیر زہر لیتے آؤ۔ کیا تم نے مہارانی کے حکم کی تعمیل کی ہے؟

اولمپس:- (مسکرا کر) یہ زہر تو میں نے تبھی تیار کر لیا تھا جب ہم دونوں نے یہ سازش کی تھی۔

چیر میاں:- (ہونٹوں پر انگلی رکھکر) خاموش! کہیں کوئی سُن نہ پائے۔

اولمپس:- (آہستہ سے) آہ! آخر کار اس کی موت کی گھڑی آن ہی پہونچی۔ —— میرا دل اب بھی اس عورت کی طرف مائل ہے جو میری بربادی کا باعث ہوئی —— میں اس سے آنکھیں کیونکر ملا سکونگا۔ میں کیسے بول سکونگا۔ میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی ہے۔

چیر میاں:- کیا بڑبڑا رہے ہو۔ بیٹھو، مہارانی آتی ہی ہونگی۔

(وقفہ)

چیر میاں:- لے لو! مہارانی آگئیں۔

(قلوپطرہ کا داخلہ۔ اس کا لباس حسین اور خوشنما ہے، سر پر تاج ہے جس پر گدھ کی شبیہ بنی ہوئی ہے۔ گدھ کے پھیلے ہوئے پر قلوپطرہ کے کانوں کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ وہ کوچ پر بیٹھ جاتی ہے۔ آئرس مورچھل لیکر اُس کے پیچھے کی طرف جا کھڑی ہوتی ہے۔ قلوپطرہ بلا کی حسین نظر آرہی ہے۔ کھانا شروع ہوتا ہے۔)

قلوپطرہ:- (مسکرا کر) آج اس آخری دعوت میں بہت کم مہمان شامل ہیں۔ بیسیوں غلاموں کی بجائے آئرس مختلف کام انجام دے رہی ہے۔ سینکڑوں کنیزیں لاپتہ ہیں، مگر ہاں شریر چیر میاں ابھی تک ساتھ دے رہی ہے۔ اور پھر میرے معزز مہمان اولمپس کی موجودگی میرے لئے انتہائی مسرت کا باعث ہے —— کیوں اولمپس! تم حُسن کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہو؟ کہو تو موت کے خوف نے میرے حُسن کو پھیکا تو نہیں کر دیا۔ (ہنسکر) آہ! ٹھیک ہے۔ دیکھو چیر میاں میرے خیال میں کسی بوڑھے مفکر کیساتھ اس قسم کی شوخیاں کچھ نامناسب سی معلوم ہوتی ہیں۔

چیر میاں:- (مُنہ بنا کر) اوہو، حسینوں کو اور کام ہی کیا ہے، بس ستانا، جلانا، رُلانا۔

قلوپطرہ:- (ہاتھ اُٹھا کر) نہیں چیر میاں نہیں دیکھ شرارت سے باز آ —— اور تو بھولتی جا رہی ہے کہ تو اس وقت کس کے سامنے بول رہی ہے۔ مگر نہیں میں آج تم سے ایسے باتیں کرونگی جیسے کوئی عورت اپنی کسی سہیلی سے۔ ہاں البتہ رومی کتے دیکھیں کہ وہ رانی کو باندی نہ بنا سکے۔

چیر میاں:- بوڑھے اولمپس نے مہارانی کو مرتے کبھی نہ دیکھا ہوگا —— (جھک کر) آہ! کیا آپ خفا ہو گئے؟

(اولمپس چُپ سادھے رہتا ہے)

قلوپطرہ:- خفا نہیں ہو گئے۔ لیکن یہ تو فلسفیوں کا قول ہے کہ بولو کم، سُنو زیادہ۔

چیر میاں:- تب تو بے لطفی ہی رہیگی

قلوپطرہ:- اگر تم بربط اُٹھا لو اور ایک گیت سنا دو تو ساری بے لطفی جاتی رہیگی۔ اتنے میں اولمپس کی زبان بھی کھل جائیگی۔

چیر میاں:- (بربط ہاتھ میں لیکر) جو حکم۔ (گاتی ہے:-)

اے میری مہارانی!
تجھے ہیلن کہوں، یا حُسن کی دیوی زُہرہ،
جسکی پوجا اسکندریہ کی کمسن کسبیاں کرتی ہیں۔
تیرے بال ایسے ہیں، جیسے
کالی گھٹائیں،
مانگ، جیسے
کالی گھٹاؤں میں بگلوں کی قطار،

جب تیری درخشاں پیشانی سے سیاہ زلفیں ہٹ جائیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یونانیوں کی دیوی آروڑا رات کے سیاہ پردے ہٹا مشرق کے روپہلی پھاٹک کھولدے،

آنکھیں، گویا
مے مدہوش کن سے لبریز دو جام، جن میں پسی ہوئی بجلیاں،
نگاہیں، جیسے
کالے بادلوں میں سے طلوع ہوتے ہوتے آفتاب کی کرنیں۔
لب، گویا
آب حیات کے چشمے
رخساروں کی لالی، جسے دیکھکر
شفیق و گلاب کی سُرخیاں سفید پڑ جائیں
ٹھوڑی، جیسے
سیب
لرزاں سینہ، گویا
کسی جھیل کی سطح آب پر متحرک کنول
آواز، جیسے
بربط کے تار پر پھولوں کی ڈالی آگرے
رفتار، جیسے
موسم برسات میں بادل دھیرے دھیرے اُڑے جا رہے ہوں۔
تیرا حسن، میری مہارانی!

پنہاں، شرمیلا، سہما ہوا اور ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنے والا نہیں، بلکہ تیرا حُسن عریاں، ہر ادا بیباک، ہر نگاہ برق، ہر غمزہ ایک فتنہ ہے، تیرے حُسن نے، اے میری مہارانی!

دن دہاڑے فاتح اور اکھڑ ڈاکوؤں کو لُوٹ لیا۔
مگر آہ! یہ مُٹھی بھر خاک
ہوا میں اڑا دی جائے گی، تیری ہڈیاں
زمین کے کیڑوں کی خوراک بنیں گی۔

(گانا ختم ہو جاتا ہے)

قلوپطرہ۔ (جھرجھری لیکر) تو نے سچ کہا، یہ ایک تلخ حقیقت ہے.... مگر تو نے حُسن کی تعریف کچھ ایسی بیباکی سے کی ہے کہ اولمپس جیسے خشک مزاج زاہد کے دل میں بھی لڈو پھوٹنے لگے۔

(اولمپس خاموش رہتا ہے)

قلوپطرہ۔ (محویت میں) کیسا حُسن ہوا ہوگا میرا، جب سیزر نے غالیچہ میں سے ایک نوخیز حسینہ کو نکلتے ہوئے دیکھا تو اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا، عورت ذات کا دشمن مغرور ہرمشس میری نگاہِ غلط انداز کے پہلے ہی تیر سے ایسا گھائل ہو گیا کہ جاں بر نہ ہو سکا۔ سرکش انطونی مجھکو اپنانے کیلئے بھیڑ کی طرح حلیم ہو گیا.... چیر میاں! جب کبھی خود پر نگاہ ڈالتی ہوں، اور اپنی عیش پسندیوں، ہوس رانیوں، نفس پرستیوں اور اپنی عجیب فتحیابیوں کو دیکھتی ہوں تو میں پھولی نہیں سماتی، میں مارے غرور کے تن جاتی ہوں۔

اولمپس۔ عورت سے زیادہ ناپاک مخلوق پیدا ہی نہیں ہوئی۔ کیسی خونریزیاں اور عیش پرستیاں اس کے نام سے وابستہ ہیں۔ عورت، گھناؤنی اور مکروہ نگاہوں کا مخزن ہے۔

قلوپطرہ۔ آج کے دن سب معاف ہے، ورنہ او بوڑھے اولمپس! یہ تیرے آخری الفاظ ثابت ہوتے، مگر بولو، اولمپس! بولو، تم کچھ کہو تو سہی۔ بوقت گفتار تمہاری لانبی ہلتی ہوئی مضحکہ خیز ڈاڑھی عجب بہار دکھلاتی ہے، اور تمہارے الفاظ کی تلخی ایک حد تک دور ہو جاتی ہے۔

(اولمپس مسکراتا ہے، قلوپطرہ اور چیر میاں کے لقرئی قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھتا ہے۔)

چیر میاں۔ (موضوع بدلتے ہوئے) آج مشرق کی طرف سے سیاہ گھٹائیں جھوم کر اٹھی ہیں، سخت آندھی اور موسلا دھار بارش کے آثار نظر آتے ہیں۔

قلوپطرہ۔ ایک بات یاد آگئی۔ کہتے ہیں اگلے زمانے میں ایک شخص تھا اس کا نام تھا سم عنج کرا، اسے برسات کے گیت خوب آتے تھے۔ کیوں ری! تو جانتی ہے یا نہیں کہ ایسے گیت بھی ہوتے ہیں جو کہ خاص برسات میں گائے جاتے ہیں، مجھے موسیقی سے بہت پیار ہے۔ فن کوئی بھی ہو اچھا ہے۔ تم بھولی تو نہ ہوگی ہرمشس کو۔ میں اسے گیت سنایا کرتی تھی اور وہ مختلف ستاروں کی گردش سے ایسے ایسے نتائج اخذ کرتا تھا کہ میں حیران رہ جاتی تھی۔

چیر میاں۔ وہ باغی شہزادہ؟ پجاری؟

قلوپطرہ۔ (ہوا میں تاکتے ہوئے) ہاں وہی، دیوی آئیسس کا پجاری، دیوی آئیسس جو کہ دیوتا اوسارس کی ماں بھی ہے بہن بھی ہے بیوی بھی ہے اور بیٹی بھی۔

چیر میاں۔ اچھا اب ایسی باتوں کے ذکر سے کیا حاصل۔

قلوپطرہ۔ ادھر آ تو، میں تیرے سینے پر ہاتھ رکھکر دیکھوں، کیا تیرا دل اس ناکام عشق کی یاد دہانی سے دھڑکنے لگا ہے ---- تیری محبت محض نفسانی تھی۔ تیرا عشق ادنیٰ قسم کا تھا۔ وہ باغی شہزادہ کبھی ناکامیاب نہ رہتا مگر وائے عورت کا رشک و حسد۔ اس کی کامیابی میں روڑا اٹکایا تو نے، اس کی بغاوت کا بھانڈا پھوڑا تو نے، مجھے اس سے شادی کرنے سے منع کیا تو نے، مگر اچھا

ہی ہوا ۔ مجھے انکلونی تو مل گیا ـــ لیکن (ہاتھ پھیلا کر) وہ اُلّو کی آواز سنکر کہا کرتا تھا کہ اُلّو نہیں بلکہ وہ ماں ہے جو اپنے بیٹے کو چھوڑ کر مر جائے اور وہ اپنے بچے کی یاد میں ایسی دردناک آوازیں روتی ہے، وہ پیارا نوجوان اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے اشارے کرتا اور کہا کرتا تھا کہ بدروحیں تاریک گلیوں میں گھومتی رہتی ہیں، سنسان گھروں کو اپنا مسکن بناتی ہیں۔ کچھ بدروحیں بڑی بڑی چمگادڑوں کی شکل میں پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی دھندلکے میں اُڑتی ہیں اور جب کسی راہگیر کو دیکھ پاتی ہیں تو اسکی نرم گردن سے چپک کر تمام لہو چوس لیتی ہیں۔ کبھی شیرنی کر دھاڑتی ہیں اور کبھی گیدڑوں کے بھیس میں بلند آواز میں روتی ہیں۔ ایسی چڑیلیں بھی ہیں جو کہ پہاڑوں کے غاروں اور دلدلوں میں رہتی ہیں اور کمسن بچوں کو اُٹھا کر لے جاتی ہیں اور ایک ڈائن ہوتی ہے جو ننھے بچے کو اپنے پھلے دیدے دکھا کر مار ڈالتی ہیں یا انکا دم کھینچ کر اُن کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آہ چیر میاں! اسکی شکل و شباہت اُس کی تیز اور روشن آنکھیں میں نہیں بھول سکتی۔ وہ مصر کے قدیم فنون کا ماہر اور ماضی کے رازہائے سربستہ سے بخوبی واقف تھا۔ کالا جادو، تیز منتر، بھوت پریت، غرض کیا تھا جس سے وہ بیگانہ تھا ـــ نہ معلوم آج میں اُس کی موجودگی کا احساس کیوں کر رہی ہوں، میرا دل بوجھ سے دبا جا رہا ہے، دماغ پر عجیب قسم کا سایہ ہے، اور میری روح پر ایک غبار سا چھایا ہوا ہے ۔ ۔ ۔ چیر میاں!

چیر میاں۔ (قلوپطرہ کا ہاتھ تھام کر) آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، کچھ اور بات کیجئے۔

قلوپطرہ۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) ہاں سکھی! تم ٹھیک کہتی ہو ایسی باتیں کرنے سے میرا چہرہ اُتر جائیگا ۔ ۔ ۔ مجھے تو تفریح و تعیش کا ذکر کرنا چاہیئے، ان البیلی اور بدمست حسین رقاصاؤں کا ذکر کرنا چاہیئے جو کہ اسکندریہ کی گذرگاہوں پر تھرک تھرک کر ناچتی ہیں، اور عاشق مزاج نوجوانوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہیں یا مجھے ان الھڑ، چھیل چھبیلی کمسن بانسری بجانے والیوں کی باتیں کرنی چاہئیں جو کہ باغیچوں میں بھیک مانگتی پھرتی ہیں۔ یا چیر میاں تم بابلیوں کی دیوی اشطر کے مندر میں جانے والی ان دوشیزاؤں کی رنگین داستانیں سناؤ جو کہ آزادی کے ساتھ عارضی طور پر کسی نہ کسی نوجوان کو اپنے لئے منتخب کر لیتی ہیں۔

چیر میاں۔ او ۔ لیجئے! آپ ہی سنائیے۔ بھلا آپ کی کنیز کو سوائے گانے کے اور آتا ہی کیا ہے؟

قلوپطرہ۔ (کچھ سوچکر) اچھا تو سنو ـ عشق کی داستانوں میں بابلیوں کی دیوی اشطر کا افسانہ بھی عجیب ہے۔ اس نے عشق کی راہ میں بہت سے مصائب کا سامنا کیا ـــ طاموز ایک گڈریا تھا جس پر آسمانوں کی دیوی اشطر اور پاتال کی دیوی الاطو دونوں عاشق تھیں ـــ طاموز مر گیا۔

چیر میاں۔ (نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے) ہائے یہ برا ہوا۔

قلوپطرہ۔ مرنے کے بعد طاموز کو پاتال میں جانا پڑا۔ جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی اور جہاں کھانے کیلئے کیچڑ ملتی تھی۔

چیر میاں۔ تو گویا طاموز، دیوی الاطو کے قابو میں آگیا۔

قلوپطرہ۔ ہاں۔ اور اِدھر دیوی اشطر اپنے محبوب کی تلاش میں روانہ ہوگئی۔ جب وہ الاطو کی سلطنت کی حد پر پہونچی تو محافظ نے اندر جانے سے روکا۔ اشطر نے کہا کہ وہ پھاٹک توڑ کر اندر چلی جائے گی۔ مگر محافظ نے کہا کہ ملکہ الاطو کی اُس کے داخل ہونے کے لئے اجازت حاصل کرنا سخت ضروری تھا۔

چیر میاں۔ میرے خیال میں الاطو نے ہرگز اجازت نہ دی ہوگی۔

قلوپطرہ۔ نہیں اجازت تو مل گئی مگر شرط یہ کہ اُس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے گا جیسا کہ اوروں کے ساتھ۔ یعنی دیوی کی حیثیت سے اُس کی کچھ رعایت بھی نہ کی گئی۔ الاطو نے انتقام کا موقع تاڑ کر اُس کو اندر آنے کی اجازت دیدی۔ پس پھاٹک کھول دیا گیا۔ اشطر اندر داخل ہوئی تو پہلے پھاٹک پر اُس کا تاج اتار لیا گیا۔ دوسرے پھاٹک پر اُس کے کانوں کی بالیاں اُتار لی گئیں۔ تیسرے پھاٹک پر اُس کا قیمتی ہار اتار لیا گیا۔ چوتھے پھاٹک پر اُس کے سینے پر کے زیورات اُتارے گئے۔ اور اسی طرح پانچویں پھاٹک پر اُس کا مرصع کمربند، چھٹے پر اُس کے ہاتھ پاؤں کے زیورات اور ساتویں پھاٹک پر شبک لبادہ تک اُتار لیا گیا۔ ہر پھاٹک پر اشطر اس دست درازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی مگر ہر دفعہ محافظ نے یہی جواب دیکر ٹال دیا کہ "دیوی الاطو کا حکم ہی ایسا ہے"۔

چیر میاں۔ (دلچسپی لیتے ہوئے) تو پھر کیا ہوا؟

قلوپطرہ۔ تب آسمان کی حسین دیوی، پاتال کی دیوی کے سامنے پہونچی مگر بالکل ننگی۔ الاطو نے اسی پر بس نہیں کی، بلکہ اُس کے جسم میں کئی اقسام کے جراثیم داخل کر دئے جس سے اشطر عجیب بیماریوں میں مبتلا ہوگئی۔ ادھر تو اشطر کا یہ حشر ہوا، اُدھر دُنیا کی شادابی جو کہ اسی کے وجود سے تھی ختم ہوگئی ـــ یہ ہیں عشق کے کارنامے۔

چیر میاں۔ لیکن کیا اشطر کو اپنے عاشق تک پہونچنے کا موقع ملا یا نہیں، اور کیا وہ وہاں سے رہا ہوئی یا قید ہی میں بند پڑی رہی۔

قلوپطرہ۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ آیا وہ طاموز سے مل گئی یا نہیں مل سکی مگر اتنا معلوم ہے کہ اے اور سن جیسے دیوتاؤں نے دیوی اشطر کو رہائی دلانے کیلئے

نادوشونا مرکو بھیجا جس نے اآلاطو کو دیوتاؤں کا حکم جا سنایا، اآلاطو یہ سنکر چھاتی پیٹ کر روئی۔ مگر مصیبت زدہ دیوی اشتطر کو رہا کرنا ہی پڑا۔

چیر میاں۔ آہ! وہ زمانے کدھر چلے گئے جب جوپیٹر کو محبت کرنے کیلئے عرش سے فرش پر آنا پڑتا تھا۔ اور جب اس دنیا کے خاکی نوجوانوں پر آسمانوں کی دیویاں عاشق ہوتی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ حکایتیں سن سنکر دل کی عجب کیفیت ہو گئی ہے۔

قلوپطرہ۔ (نظر اٹھاکر) دیکھو بادلوں کا منظارہ۔ (ایک لمحہ کیلئے قلوپطرہ ٹکٹکی باندھے سامنے کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر معاً اس کا چہرہ متغیر ہونے لگتا ہے۔) چیر میاں!

چیر میاں۔ مہارانی جی! ۔۔ وہ گھڑی اب نزدیک آرہی ہے۔

قلوپطرہ۔ (مسکراکر) وہ مبارک گھڑی جس کا کہ میں انتظار کر رہی ہوں ۔۔ سکھی دیکھ تو آج آئرس نے میرے جسم پر کیسا عمدہ تیل ملا ہے۔ آئیہ دیکھ میرے بدن سے خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں، میرے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ کیسا نکھرا ہوا ہے، بتا تو میں نے اپنی بھنوؤں کو کس عمدگی کے ساتھ سیاہ کیا ہے، بھلا آرائش بدن اور افزائش حسن کا وہ کونسا طریقہ ہے جس سے قلوپطرہ ناواقف ہے۔ غمزہ و ادا کا وہ کونسا پہلو ہے جس پر ایک عالم پر فوقیت رکھنے والی حسینہ حاوی نہیں۔ میرا حسن، او چیر میاں!! اب بھی بگڑی سلطنتوں کو بنا سکتا ہے اور بنی سلطنتوں کو بگاڑ سکتا ہے۔

(دور سے شہر کی عبادت گاہوں سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی ہیں ۔۔۔)

قلوپطرہ۔ آہا! یہ نرسنگھے اور ترئی کی ہلکی ہلکی آوازیں کتنی دلکش معلوم ہوتی ہیں۔

(قلوپطرہ محویت کے عالم میں چلتی ہوئی دریچے کے پاس پہونچ جاتی ہے۔ چیر میاں بھی پیچھے جا کھڑی ہوتی ہے)

چیر میاں۔ دریائے نیل کا یہ نظارہ کس قدر حسین ہے۔

قلوپطرہ۔ اس نیل سے میری محبت کی داستانیں وابستہ ہیں۔ یونانیوں کے دیوتا اپالو نے حسین دفنے سے کس شدت کے ساتھ محبت کی ہوگی یہ تو میں نہیں جانتی، البتہ میرے عاشقوں نے جس گرمجوشی کا اظہار کیا اس پر کوئی بھی عورت ہو رشک کرسکتی ہے۔ (سکوت کے بعد) پورب کے کالے بادلوں کی اٹھتی ہوئی گھٹائیں، ریت کے ٹیلوں کے پیچھے غروب ہوتا ہوا سورج، سطح آب پر تیرتی ہوئی ہلکی پھلکی کشتیاں، کیسا حسین منظر (پلٹ کر) جا سکھی بربط اٹھا لا میں ایک گیت گاؤنگی ۔ ۔ ۔ ۔ (بربط ہاتھ میں لیکر اُسکے تاروں کو اپنی نازک انگلیوں سے چھیڑتی ہے اور تار جواب میں ایک دردناک صدا دیتے ہیں۔) ۔ ۔ ۔ ۔ لو سکھی سنو اپنی رانی کا آخری گیت سنو۔

(گاتی ہے)

طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک اور غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک،

ان لہروں کا بس یہی شغل ہے،
انکی یہ سرگرمیاں کہاں سے شروع ہوئیں اور کہاں ختم ہونگی
اس کا انہیں خود بھی پتہ نہیں۔
شباب کی آمد آمد سے جس طرح ایک دوشیزہ کے قدم بار حسن کے سبب لڑکھڑاتے ہیں اسی طرح
موسم برسات میں نیل کی لہریں بھی لڑکھڑاتی ہوئی چلتی ہیں۔
شام کے وقت،
خورشید کی رخصت ہوتی ہوئی شعاعیں
دریائے نیل کے سینے میں آگ سی لگا دیتی ہیں۔
تب پورب سے سرد ہوا کے جھونکے آتے ہیں
دھوپ اور لو میں جھلسی ہوئی کلیاں نیم وا ہو جاتی ہیں۔
دن اور رات گلے ملتے نظر آتے ہیں اور پھر
ملکۂ شب کی حکومت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جب
آسمان سے شراب کی پھوار سی پڑتی ہے،
وہی مئے مدہوش کن پیکر کلیاں رات بھر بدمست پڑی رہتی ہیں
جبتک کہ صبح کا ستارہ طلوع نہیں ہوجاتا،
اور نسیم سحری گلاب کی خشک پنکھڑیاں لاکر ان کے قدموں میں بکھیر نہیں دیتی،
تب تلک وہ کلیاں انگڑائی نہیں لیتیں،
پھر محفل شب کی رونق بڑھانے کیلئے
سونے کے تھال کی مانند
نور میں نہایا ہوا چاند ایک لکۂ ابر کی اوٹ سے نکل آتا ہے جیسے
کسی سیمتن حسینہ کا شانہ دفعتاً عریاں ہوجاتے،
بدر کامل کی چاندنی سے خوفزدہ ہو کر
گیدڑوں کے غول تاریک گوشوں کی طرف لپکتے ہیں۔
ظلمت شب دم توڑ دیتی ہے، یا
تاریکی ملکۂ شب سے روٹھ کر غاروں میں اور درختوں تلے چلی جاتی ہے،
ماہ نو کی کرنیں کسی شوخ وشنگ، کافر جمال، برق رفتار

رقاصہ کی طرح

لہروں پر رقص کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں،
عالمِ تصور میں کسی کمسن مصری حسینہ کو گیلی ریت پر بیٹھے دیکھتی ہوں ـــــ

جو کہ اپنے عاشق کی فرقت میں رو رہی ہے اور اسکی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کے تار سے بندھ جاتے ہیں،

اس دو تاروں والے انوکھے ساز پر، دف بجا بجا کر وہ
عشق و محبت، وصل و فرقت کے گیت گاتی ہے۔
معاً یونانیوں کے دیوتا فیبس اپالو کی مانند ایک نوجوان نمودار ہوتا ہے۔

دوشیزہ، اپنے جسم کو مارے حیا کے دف کے پیچھے چھپا لینا چاہتی ہے۔

نوجوان عاشق کی بانسری کی آواز فضا میں گونجتی ہے
اور کمسن حسینہ کے غم کے آنسو خوشی کے آنسوؤں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

کاش! اس جسدِ خاکی کے ذرات منتشر ہو کر
بانسری کی شیریں آواز یا حسینہ کی دردناک لے میں حل ہو جاتے ہیں،
کل جہاں پر بیہوشی کا عالم طاری ہونے لگتا ہے
اِن بدمست لہروں، پھولوں، پیڑوں، اور نکھری ہوئی چاندنی کو کیا کہوں،
حسنِ خوابیدہ؟
اس منظر کی مدح کرنے سے اس کا حسن میلا ہوتا ہے۔
دُنیا و مافیہا سے بے خبر کر دینے میں یہ منظر شراب سے کچھ کم نہیں سوائے اسکے کہ
یہ شراب آنکھوں کے ذریعے پی جاتی ہے۔
اس حسنِ خوابیدہ کی تعریف میں
لب بند، دماغ مدہوش، قلم لرزاں، بس
دل میں آتی ہے کہ
اس ہوشربا منظر کو ایک ہی دفعہ اٹھا کر آنکھوں میں رکھ لوں اور پھر آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر لوں،
اس مٹھی بھر خاک کو کشتی کے سپرد کر دوں
اور کشتی اِن بیباک لہروں کے رحم پر چھوڑ دوں
پھر اپنا بھی یہی شغل رہے،
طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک اور غروبِ آفتاب سے طلوعِ آفتاب تک،

(گیت ختم ہو جانے پر وہ خاموش ہو جاتی ہے اور اپنے سامنے ٹکٹکی باندھے کھڑی رہتی ہے۔)

چیرمیاں۔ (آہستہ سے) کیسا حسین گیت، کیسی دلکش آواز، آنسوؤں کی کیسی انوکھی دُنیا، جہاں آنسو خوشی کے بھی ہیں اور غم کے بھی۔

قلوپطرہ۔ (خلا میں گھورتے ہوئے) چیرمیاں! تم کہاں ہو، آؤ میری چھاتی سے لگ جاؤ ــــ بادل چھا رہے ہیں، تاریکی بڑھ رہی ہے، اب مجھے جانا ہوگا، میرا سامان تیار ہے نا؟

چیرمیاں۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) میری مہارانی کا سب سامان تیار ہے۔

قلوپطرہ۔ ابھی تو زندگی کی شام بھی نہیں ہوئی ــــ مگر میں مہارانی ہوں، کنیز نہیں، اور مہارانیاں جب چاہیں سفر اختیار کر سکتی ہیں۔ (ہوا میں تاکتے اور مسکراتے ہوئے) آہا میرے سر پر مبارک گدھ والا تاج ہوگا۔ گدھ کے پھیلے ہوئے پروں کے نیچے میرے کان چھپ جائیں گے۔ میرا لباس شاہانہ ہوگا، میرے ہاتھ میں عصائے شاہی ہوگا، چیرمیاں! تو کوئی نغمہ الاپنا، بادل آنسو بہائیں گے، بجلی چمک چمک کر رستہ دکھائے گی، کس شان سے نکلے گی سواری مصر کی رانی قلوپطرہ کی۔ چلو، میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ (بلند آواز سے) ... اولمپس!۔

اولمپس۔ مہارانی!

قلوپطرہ۔ تم ایک قابل حکیم ہو مجھے یقین ہے کہ تم نے کافی تیز زہر تیار کیا ہوگا۔

اولمپس۔ مصر کی رانی قلوپطرہ کے حکم کی لفظ بہ لفظ تعمیل کی گئی ہے۔

(پیالہ آگے بڑھاتا ہے۔)

قلوپطرہ۔ (پیالہ ہاتھ میں لیکر) لیکن اگلی دنیا میں میرا استقبال کون کریگا۔

آئرس۔ (آگے بڑھکر) کنیز حاضر ہے۔

قلوپطرہ۔ لے او آئرس! تو اپنی مہارانی کو راہ دکھلا۔ (اولمپس کی طرف دیکھکر) اور میں یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ میرے حکم کی کہاں تک تعمیل کی گئی ہے۔

(آئرس زہر پیتی ہے، پیالی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا دباتی ہے پھر فرش پر گر کر، چند لمحوں کیلئے تڑپنے کے بعد فوراً مر جاتی ہے۔)

قلوپطرہ۔ (پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے) آہ! مر گئی، بہت جلد مر گئی، لاؤ اولمپس! اور لاؤ ... میری کنیز میری راہ تک رہی ہوگی۔

(اولمپس نظر بچا کر زہر کے پیالے میں تھوڑا سا پانی ملا دیتا

ہے، قلوپطرہ پیالہ ہاتھ میں لے لیتی ہے اس کی آنکھیں
بند ہیں، غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں دریچہ
میں سے ہوکر اس کے چہرے پر پڑ رہی ہیں۔)

قلوپطرہ۔ (آہستہ سے) سورج غروب ہو رہا ہے، کالی گھٹائیں پھیلتی جارہی ہیں، تاریکیاں چھا رہی ہیں ـــ سب دیوتا مجھ سے ناخوش ہیں میں دعا کس سے مانگوں؟ اس مختصر زندگی کے چند حسین واقعات میرے دماغ میں محفوظ ہیں، انہیں کی یاد لئے جاتی ہوں ـــ الوداع! دریائے نیل کی لہرو! الوداع! رخصت! ریگستان میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیو! ان بڑے بڑے کھجوروں کے درختوں کو سلام، گھاس کے خشک تنکوں کو سلام! الوداع اولمپس! اے عزیز چیرمیاں! ـــ انطونی!!..... (زہر پی کر پیالہ زمین پر پٹخ دیتی ہے۔) ..... میں زندگی سے پیار ضرور کرتی ہوں مگر موت سے بھی نہیں ڈرتی۔ خصوصاً جب شاہی وقار کا سوال درپیش ہو ـــ موت کس قدر راحت آمیز ہے۔ موت، آہ! (اس کے ہونٹ نیلے پڑ جاتے ہیں، وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن تھام لیتی ہے۔) لیکن اولمپس! موت کیوں نہیں آتی؟

اولمپس۔ (بھاری آواز میں) آئیگی۔

قلوپطرہ۔ (خوفزدہ ہوکر) کب؟

اولمپس۔ کبھی بھی آئے۔ آئے گی ضرور۔

قلوپطرہ۔ (چونکتی ہے اور پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اولمپس کی طرف دیکھتی ہے) مجھے تمہاری آنکھیں دیکھکر خوف کیوں معلوم ہوتا ہے۔

اولمپس۔ (آگے بڑھتا ہے اور اپنی آنکھیں قلوپطرہ کے چہرے پر گاڑ دیتا ہے۔) خوف کیوں معلوم ہوتا ہے؟ میری آنکھوں کی طرف ذرا غور سے دیکھو۔

قلوپطرہ۔ (سر تھام کر) میں... میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔

اولمپس۔ (سخت آواز میں) مگر میں کون ہوں؟

قلوپطرہ۔ (حیرت و خوف سے) تم کون ہو؟

اولمپس۔ (اور بھی قریب جاکر) میں ہرمشس ہوں۔

قلوپطرہ۔ (جھجک کر) ہرمشس؟ دغاباز؟ آہ! فریب... دھوکا....

(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند اور ستارے سب یکلخت بادلوں
میں چھپ جاتے ہیں۔ کیونکہ تاریکی ایک دم بڑھ جاتی
ہے، بادل گرجتے ہیں اور ہرمشس (اولمپس) خوفناک
قہقہے لگاتا ہے۔)

اولمپس۔ (قہقہہ لگاکر) ہاں، ہرمشس، باغی ہرمشس، جسے تباہ کرنے کے لئے تو نے اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں، جس نے تیری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنے دیوتاؤں کی خفگی مول لی۔ اور جس نے تیری خاطر اپنا مستقبل، دین و دنیا سب کچھ خراب کر لیا۔ جس نے تیرے ایک تبسم کے لئے اپنے عزیزوں، دوستوں اور ہموطنوں کی امیدوں کا خون کر دیا۔

قلوپطرہ۔ (لڑکھڑا کر اور پھر ایک کوچ کا سہارا لیکر) تو ابھی تک زندہ ہے۔ تیری موت کی خبریں یقیناً بے بنیاد تھیں۔

اولمپس۔ بیشک، اور میں ابھی زندہ رہوں گا۔ تو زمین کے سینے پر بوجھ ہے۔ تیری زندگی غلاظت میں رینگنے والے کیڑے سے بھی زیادہ مکروہ ہے۔ اور میں تجھے تیرے گناہوں کی سزا دلاکر ہی رہونگا۔

قلوپطرہ۔ (سر بلند کرکے) پروا نہیں او آئسس کے پجاری، اوسارس کے غلام، مجھے تیری دیویوں اور تیرے دیوتاؤں کی ذرہ برابر پروا نہیں۔

اولمپس۔ (کڑک کر) او رنگین جمال فسوں گر! او غارتگر سرمست، او دلفریب کافرہ، او فتنہ رفتار مہ لقا! او خوش چشم ڈائن! او حسن فروش دلربا! اب تیرا وقت آن پہونچا۔ تیری نفس پرستیاں اور ہوس رانیاں جن پہ تجھے ناز ہے اب ایک قلم ختم کر دی جائیں گی۔ او شوخ و بے باک، دیکھ، اب کیونکر تجھ پر دیوتاؤں کا قہر نازل ہوتا ہے۔

(قلوپطرہ عالم نزع میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے فضا میں
دیکھتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مردنی سی چھا جاتی ہے۔
خوبصورت پیشانی اور گردن پر نیلی نیلی رگیں ابھر آتی
ہیں۔ بادل گرجتے ہیں، بجلی چمکتی ہے، کمرے میں بارش
کی بوچھاڑ پڑنے لگتی ہے۔ اولمپس ہاتھ آسمان کی
طرف اٹھاتا ہے اور پاؤں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

اولمپس۔ (گرج کر) کھولدے، او اوسارس! دوزخ کے دروازے کھولدے، دیکھ او ڈائن! اب تیرا بھائی آتا ہے جسے تو نے زہر دے کر مار ڈالا تھا، کہاں ہے سیپا جسے قلوپطرہ نے ترسا ترسا کر موت کی گود میں سلا دیا۔ آ او شاہ مینکارا جس کا سینہ چیر کر اس چڑیل نے خزانہ نکالا اور اپنی خواہشات کی سیری کرنے کیلئے لٹا ڈالا۔ آؤ بد روحو! سب مل جل کر آؤ، او اوسارس! اپنے پجاری کی دعا قبول کر۔

(ایک بڑا چمگادڑ پر پھڑپھڑاتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے،
قلوپطرہ کے سر پر تین چکر لگاتا ہے، پھر اس کی چھاتی پر
لٹکے ہوئے ہیرے سے چمٹ جاتا ہے، تب وہ ایک
دردناک آواز میں چیختا ہے، اپنے پروں کو تین مرتبہ

پھڑپھڑا کر تیزی کے ساتھ اُڑتا ہوا کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک بڑھ جاتی ہے۔ اولمپس خوفناک قہقہے لگاتا ہے۔ کئی ڈراونی رُوحیں اندر داخل ہوتی ہیں۔ ایک طرف قلوپطرہ کا مقتول بھائی، دوسری طرف باغی سیپیا، اور شاہ میڈیکارا وغیرہ کی رُوحیں جنہیں قلوپطرہ نے برباد کیا تھا اُسے گھیر لیتی ہیں اور تاریکی پر اُسے ڈراتی ہیں، کوئی اسکی گردن کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے کوئی بھیانک قہقہے لگاتی ہے، کوئی دانت دکھاتی ہے۔ قلوپطرہ مارے خوف کے کانپنے لگتی ہے۔)

اولمپس:۔ (کڑک کر) جا او قلوپطرہ! اب تیرے لئے دوزخ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ جا بدبخت، جا ظالم، جا بیوفا، جا سنگدل، یہ بدروحیں تیرا ہی استقبال کرنے کے لئے جمع ہوئی ہیں۔ یہی تجھے دوزخ کا راستہ دکھائیں گی۔

(معًا بادل یوں گرجتا ہے جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ چیرمیاں بیہوش ہو جاتی ہے، قلوپطرہ ایک دلدوز چیخ مار کر کوچ پر گر پڑتی ہے۔ اور اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔ وہ دو قامت مجسمے لرز کر گر پڑتے ہیں۔ اور فرش سے گرد اڑکر قلوپطرہ کے حسین چہرے پر جا پڑتی ہے۔

(وقفہ)

خاموشی اور سکون۔ معلوم ہوتا ہے کہ بادل پھٹ گئے ہیں اور بجلی بھی سرد پڑ چکی ہے۔ اولمپس ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا ہے۔ اس کے قدموں کے قریب چیرمیاں بیہوش پڑی ہے۔ قلوپطرہ کا اکڑا ہوا جسم کوچ پر دراز ہے۔ کمرے میں دھندلی روشنی ہے ــــ دفعتًا دریائے نیل کے کنارے پر رونے والے کتے کی بلند اور مہیب آواز خاموشی کو توڑتی ہوئی نکل جاتی ہے ــــ)

بلونت سنگھ

خط کی چوری

کھُلی ہوئی جُرأت تو نکلے پہلو میں تھی۔ رسید پیام، جسمیں
لکھا تھا "سُرخی" سے حُسنِ القاب کیلئے تیرا نام جسمیں

"سلام و اظہارِ شوق" پر تھا بہ صد محبت سلام جسمیں
جھلک رہے تھے جھلک رہے تھی دلی اُمیدوں کے جام جسمیں

کیا گیا تھا "طلب" پہ "تاکیدِ خاص" کا اِحترام جسمیں
نہاں تھے دِلی پہونچکے ملنے کے مختلف اِنتظام جسمیں

میں جنکے پردے میں آ رہا تھا۔ لکھے تھے وہ "جھوٹ" کام جسمیں
فلاں.. فلاں راز جاننے والیوں کو تھے کچھ پیام جسمیں

جنہیں بتائے گئے تھے "ملنے کیواسطے" "صبح و شام" جسمیں
"اُسی" اِسکوائر کے پاس تجویز کی تھی جائے قیام جسمیں

کہا تھا جلا دیا سا نو لکھو "خنجرِ بے نیام" جس ہیں
ترے شلوکے کی جیب سے لے اُڑا اگر وہ جواب کوئی

سماج کی سختیوں میں آئے گا اور بھی انقلاب کوئی

شاد عارفی

اِسے کیا کہتے ہیں؟

"شانتا!"

"کون موہن بھیا، آیئے آیئے، کہاں تھے کئی دن سے؟"

"ذرا باہر گیا تھا، صبح ہی اماں نے خوشخبری سُنائی کہ تم امتحان میں فرسٹ آئی ہو، میں نے کہا لاؤ مبارک باد دے آؤں۔ مٹھائی ابھی لوگی یا دوپہر کو"

"جب دل چاہے دیدیجئے گا۔ پہلے آپ تو مُنہ میٹھا کر لیجئے"

یہ کہکر میں نے ملازمہ کو آواز دی اور موہن بھیا کے لئے مٹھائی منگائی۔ اس سے فارغ ہو کر وہ پوچھنے لگے "اچھا تمہارے کلاس کی اور لڑکیوں کا نتیجہ کیسا رہا؟"

"قریب قریب سب کا اچھا رہا، صرف دو لڑکیاں فیل ہوئی ہیں ــــ"

"اچھا۔ ہاں وہ، کیا نام ہے اس کا، وہی تمہاری سہیلی۔ ہیندر کی بہن۔ وہ بھی تو تمہاری کلاس فیلو ہے۔ اس کا کیا نتیجہ رہا؟"

"کون شیلا؟ ہاں وہ بھی پاس ہو گئی"

"خُوب یاد آیا تمہیں کچھ معلوم ہے ہیندر آجکل کہاں ہیں؟"

"کئی دن ہوئے شیلا کہتی تھی کہ الہ آباد گئے ہیں"

"مجھے انکا پتہ درکار ہے۔ ایک ضروری خط بھیجنا ہے، پتے بغیر پڑا ہے۔ اچھا تم ایک کام کرو آج شیلا کے یہاں جاؤ گی نا؟"

"ہاں شام کو جاؤں گی، روز ہی جاتی ہوں"

"اچھا تو لو یہ خط شیلا کو دیکر کہدینا کہ "موہن بھائی نے دیا ہے اس پر ہیندر کا پتہ لکھکر ڈالدو" دیدو گی نا؟"

"آں ہاں"۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں فرصت ملی تو کل صبح آؤنگا"

موہن بھیا کے جانے کے بعد میں نے لفافہ دیکھا، سادہ، بغیر ٹکٹ کا، بلا کسی نشان کے، خواہ مخواہ مجھے شُبہ ہوا کہ بغیر ٹکٹ کے بھیجنے کا کیا مقصد ہے اگر پتے کی ضرورت تھی تو پتہ پوچھوا لیتے۔ خط شیلا ہی کو کیوں بھیجا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس خط کو پڑھ لوں، چنانچہ بڑی احتیاط سے لفافہ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

شیلا، میرا خیال تھا کہ دُنیا کی ہر چیز میں تغیر ہو سکتا ہے، مگر محبت کرنے والے دل کبھی نہیں بدل سکتے۔ لیکن تمہاری ختم نہ ہونے والی خاموشی سے تو اب مجھے شُبہ ہونے لگا ہے کہ شاید میرا یہ خیال بھی محض واہمہ تھا۔ "ہاں میں خط لکھوں گی اور برابر لکھتی رہوں گی" کچھ یاد ہے یہ کس نے کہا تھا۔ کہو تو میں یاد دلادوں۔ نہ صرف اس قدر۔ اس کے سوا کچھ اور بھی "جلد ملنے کی کوشش کرونگی" میری سادگی دیکھو۔ میں نے کس قدر جلد، کس قدر آسانی سے تمہاری ہر بات کا یقین کر لیا۔ صرف اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ دُنیا کی ہر چیز میں تغیر ہو سکتا ہے مگر محبت کرنے والا دل کبھی نہیں بدل سکتا۔ لوہا گرمی پا کر نرم ہو جاتا ہے۔ اُس وقت جس طرح چاہو اُسے موڑ لو۔ جو شکل چاہو بنا لو۔ یہی حال شاید عورت کے دل کا بھی ہے۔ محبت کی آگ سے جب وہ پگھل جاتا ہے تو پھر ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے مگر دوری و مجبوری جب رفتہ رفتہ اُسے سرد کر دیتی ہے تو پھر وہ پتھر ہے۔ نہ اس میں احساس۔ نہ درد۔ نہ خلش۔ نہ سوز۔ ہاں شیلا! شاید اب تم اُسی دور سے گذر رہی ہو۔ بیدرد، بیوفا کبھی میری نمناک آنکھوں کے تصور نے بھی تمہیں بیچین نہیں کیا۔

میں کس قدر نادان ہوں۔ جانتا ہوں کہ تم پر میری تحریروں کا اب کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی لکھ رہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تمہارا دل بدل چکا ہے، سرد ہو چکا ہے۔ پھر بھی اس میں وہی پُرانی آگ بھڑکانے کی آرزو کر رہا ہوں۔ کاش میں بھی ایک ایسے دل کا مالک ہوتا جیسا قدرت نے تمہیں دیا ہے پھر کیوں اِن گلوں شکووں کی نوبت آتی۔ کیوں آنکھیں نمناک ہوتیں۔ کیوں دل ہر وقت زخمی پرندے کی طرح پھڑکتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم تک میرے خط کا پہونچنا کس قدر دشوار ہے پھر بھی میں نے کوشش کی اور خطروں میں پڑ کر ایک چھوڑ تین خط تمہیں بھیجے، مگر بے سُود۔ تمہارے پاس تو ایک ہی جواب ہے۔ خاموشی۔ کبھی نہ ٹوٹنے والی خاموشی۔ اچھا یہی کہدو کہ بس، ایک خواب تھا جو ختم ہو گیا۔ آنکھ کھل گئی۔ اب اسے بھول جاؤ۔ مگر لِلّٰہ کچھ کہو تو۔ کچھ مجھے معلوم تو ہو کہ تم نے دل میں کیا ٹھانی ہے۔ معاف کر دو، میری اچھی شیلا مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے کس قدر بدگمان ہوں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ مجبوریوں نے

تمہارے ہاتھوں میں زنجیریں ڈالدی ہوں اور تم لکھ نہ سکتی ہو۔ اِس مرتبہ میں نے خط لکھنے اور جواب منگانے کی ایک نئی ترکیب نکالی ہے اب اس سے فائدہ اٹھانا تمہارے اختیار کی بات ہے۔ شانتا کو رام کرلو تو خط و کتابت سہل ہے۔

تمہارا
موہن"

خط کے آخری فقروں سے میں جل ہی تو گئی، خوب، تو گویا انہوں نے مجھے اپنا پیغامبر بنایا اور ساتھ ہی بیوقوف بھی۔ موہن کو میں کیا سمجھتی تھی اس کا میں نے کبھی موہن سے اظہار نہیں کیا تھا۔ میں تو اس چیز کو خود اپنی ذات سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ موہن کو یقیناً حق تھا کہ وہ جس سے چاہیں محبت کریں مگر اس خط سے میرے دل پر چوٹ لگی۔ موہن کو دُکھ پہونچانا تو میرے اختیار کی بات نہ تھی مگر میں نے سوچا کہ تھوڑی سی چھیڑ میں کیا ہرج ہے۔

غالباً یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اُس دن میں شیلا کے یہاں نہیں گئی۔ دوسرے دن صبح کو موہن مع مٹھائی کے آئے اِدھر اُدھر کی بات چیت کرنے لگے آخر اُن سے صبر نہ ہوسکا۔ پوچھ ہی بیٹھے،

"کہو شانتا کل وہاں گئی تھیں؟"

"کہاں؟" میں نے انجان بنکر پوچھا۔

"شیلا کے یہاں"

"ہاں گئی تھی"

"وہ خط تو دیدیا ہوگا"

"نہیں خط تو میں نہیں دے سکی۔ ہوا یہ کہ جس وقت میں پہونچی شیلا گھر پر موجود نہ تھی، یہ سمجھکر کہ آپ خط جلد بھیجنا چاہتے ہیں اس کے باپ سے پتہ پوچھکر میں نے خود لفافہ پر لکھدیا اور ڈاک میں ڈلوا دیا"

"کیا؟ کیا تم نے خود پتہ لکھکر وہ خط ڈلوا دیا؟؟"

"تو پھر اور کیا کرتی آپ کا ضروری خط تھا۔ اچھا لائیے ایک آنہ ٹکٹ کا تو عنایت کیجئے"

"لیکن ــ !" وہ جملہ تمام کئے بغیر کمرے سے چلے گئے۔

اُس دن سے اُنہوں نے مجھ سے بولنا چھوڑ دیا ہے۔

* * *

عاصم پریمی

شیاطین

افراد

شیطانوں کا سردار — سہراب . . . ایک مزدور
شیطان نمبر ایک — کماری . . . مہاجن کی نوعمر بیوی
شیطان نمبر دو — ڈاکٹر
شیطان نمبر تین — مُلازم
شیطان نمبر چار — وزیر
دس پندرہ شیاطین۔

وقت۔ ایک بجے دوپہر۔

مقام۔ سڑک سے پانچ چھ گز کے فاصلہ پر ایک بڑا سا گھنا درخت۔ چاروں طرف کھُلا ہوا میدان۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور درخت۔ پس منظر میں بالکل ہی سناٹا ہے کہیں آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ سڑک بھی سُنسان ہے۔ دوپہر ہونے کی وجہ سے درخت کا سایہ بالکل نیچے ہی پڑ رہا ہے۔ سڑک کی طرف درخت کے نیچے دری کا فرش بچھا ہوا ہے اور درخت کی جڑ کے پاس اس کے اوپر ایک تخت۔ تخت پر سُرخ مخمل کا گدا۔ فرش پر تقریباً ڈیڑھ درجن شیاطین جمع ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ابھی سردار نہیں پہونچا اس لئے دربار آراستہ نہیں ہوا ہے۔ تمام شیاطین جسم اور قد کے لحاظ سے انسان کی بہ نسبت چھوٹے ہیں۔ اُن کی آوازیں تیز اور چیخنی۔ معلوم ہوتا ہے ناک میں بول رہے ہیں، حرکات بھی تیز اور پھرتیلی گویا مشین کے کھلونے ہیں جو کل دباتے ہی حرکت کرنے لگتے ہیں۔ کسی سے دو منٹ بھی نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اِدھر اچھل اُدھر کود۔ کوئی کسی کی پگڑی اُچھال رہا ہے کوئی چٹکیاں لے رہا اور دھول مار رہا ہے۔ کبھی بیچ بیچ لڑائی ہوجاتی ہے۔

درخت کی پشت کی طرف سے شیطانوں کا سردار نمودار ہوتا ہے۔ جماعت میں اتنا ہی مختصراً ایک سُنہری عبا اور سر پر سُنہری پھندنوں والی پگڑی باندھے ہوتے۔ ساتھ ہی سکا وزیر بھی اپنے لباس کی وجہ سے نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور شیاطین مختلف سامان لئے ہوتے ہیں۔

انکی آہٹ پاتے ہی سب شیاطین جو فرش پر جمع تھے اپنے کپڑے جھاڑ کر مودب کھڑے ہوجاتے اور سر جھکا کر سلام کرتے ہیں۔ سردار کے ہاتھ میں ایک عصا ہے اُسے ٹیک کر کھڑے کھڑے وہ ایک گہری نظر سب پر ڈالتا ہے پھر تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کے اراکین دربار دائیں بائیں صف باندھکر کھڑے ہوجاتے ہیں لیکن انکی حرکات میں اب بھی سنجیدگی کے بجائے بیچینی ہے۔

سردار۔ (ایک رعب دارانہ طریق سے سر اٹھاکر) کل جو لوگ مختلف کاموں پر بھیجے گئے تھے انہیں حاضر کرو۔

(وزیر جو بائیں صف میں سب سے آگے تھا دونوں صفوں پر نظر ڈالتا ہے۔ چار شیاطین آگے بڑھکر تخت کے سامنے آتے ہیں اور جھک کر اُسے بوسہ دیتے ہیں اور پھر دست بستہ کھڑے ہوجاتے ہیں۔)

سردار۔ تم لوگ اپنے کارنامے مفصل میرے روبرو بیان کرو۔

شیطان ۱۔ بندہ پرور کل دربار سے رُخصت ہوکر میں قریب کے ایک گاؤں میں پہونچا۔ وہاں ایک مکان سے بہت رونے اور پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پوشیدہ طور سے اندر داخل ہوا تو پتہ چلا کہ ایک

زمیندار بڑی جائداد اور مال و اسباب چھوڑ کر مر گیا ہے۔

سردار۔ (جو بہت غور سے سن رہا ہے) اچھا تو پھر؟

نمبر ایک۔ جہاں پناہ اُس کے تقریباً ایک درجن لڑکے لڑکی سب وارث موجود ہیں۔ لیکن ایک بھائی بھی ہے۔ حد سے زیادہ شرابی اور عیاش۔ اسی سلسلہ میں میری اس سے شناسائی تھی۔ میں نے اُسے ایسی پٹی پڑھائی کہ ایک جعلی دستاویز تیار کر کے تمام ترکہ پر خود قابض ہو گیا اور وارثوں کیلئے ایک پائی نہ چھوڑی۔

سردار۔ (بہت خوش ہو کر) شاباش! تمہارا یہ کام انعام کا مستحق ہے۔ (اپنے بائیں جانب دیکھتا ہے جہاں مختلف تھالوں میں دو شالے موتیوں کے ہار اور دوسرے جواہرات رکھے ہوئے ہیں) یہ کام انعام کا مستحق ہے۔

(ایک شیطان جو اسی طرف تخت کے پاس کھڑا تھا جھک کر
ایک بھاری دوشالہ اُٹھا کر سردار کے ہاتھ میں دیتا ہے
وہ نمبر ایک کو دیتا ہے۔)

سردار۔ (سیدھا ہو کر مجمع پر نظر ڈالتے ہوئے) اچھا! اب نمبر دو تم نے کیا حق وفاداری ادا کیا۔

نمبر دو۔ (جو بہت بے چینی کے ساتھ بار بار اپنا پیر ہلا رہا ہے۔) حضور یہ نمبر چار کو منع کر دیں۔ بار بار میرے پیر میں چٹکیاں لے رہا ہے۔

سردار۔ (غصہ کی آواز میں) نمبر چار! (وہ سامنے آتا ہے) یہ کیا حرکت ہے؟ کوڑوں سے تمہاری کھال اُدھیڑ دی جائیگی۔

نمبر چار۔ (ہاتھ جوڑ کر نرم آواز میں) جہاں پناہ! بندہ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ بغیر شرارت کئے ایک لمحہ چپکے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔

سردار۔ (فطرت کے عذر کو معقول مانتے ہوئے) یہ صحیح ہے لیکن اپنے ہی بھائی بندوں کو ستاتا ہے؟ (نمبر دو سے مخاطب ہو کر) تم اپنی کارگزاری سناؤ۔

نمبر دو۔ حضور اسے میرے پیروں سے نہ معلوم کیا عداوت ہے کہ ہر وقت چٹکیاں لیتا رہتا ہے۔ مجھ سے زمین پر کھڑا نہیں رہا جاتا۔ سارے جسم میں چیونٹیاں دوڑ جاتی ہیں۔ حضور اسے.....

سردار۔ خاموش! (غصہ سے) وزیر! نمبر چار کو لے جاؤ اور علیحدہ کھڑا کرو۔

(وزیر آگے بڑھ کر نمبر چار کا ہاتھ پکڑ کر اسے دائیں جانب
میدان میں لے جاتا ہے اور دو شیطانوں کی نگرانی
میں کھڑا کر دیتا ہے۔ نمبر چار بے چین ہے بار بار نمبر دو
کے پیروں کی طرف دیکھتا ہے۔)

سردار۔ (نمبر دو سے مخاطب ہو کر) کہو!

نمبر دو۔ (سر جھکا کر) بہت اچھا۔ (کن انکھیوں سے نمبر چار کی طرف دیکھتا جاتا ہے) جہاں پناہ کل جب میں یہاں سے روانہ ہو کر انسانوں کی بستی کی طرف چلا تو بہت دیر تک کوئی شکار ہاتھ نہ آیا۔ آخر آبادی کے قریب پہونچ کر دیکھا کہ ایک بڑھیا عورت اور اُس کی بیٹی درخت کے سایہ میں بیٹھی اُپلے تھاپ رہی تھیں۔ میں نے چاہا کہ ان دونوں میں کھٹ پٹ کرا دوں۔ کچھ تکرار ہو چلی تھی کہ اس کا داماد آگیا۔ (اپنے پیر کو بے چینی سے جھٹکتا ہے۔ روتی آواز میں ہاتھ جوڑ کر) حضور یہ کمبخت نمبر چار مجھے چین نہیں لینے دیتا۔

سردار۔ تم اپنی کارگزاری سناؤ میں نمبر چار کی خبر لونگا۔

نمبر دو۔ تو حضور اُس کے داماد نے آکر صلح کرا دی۔ پھر میں اور آگے بڑھا، ایک جگہ دیکھا کہ دو بھائی نہایت محبت سے گلے میں باہیں ڈالے کھیل رہے ہیں مجھے ان کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا، ایک خوبصورت گیند بن کر اُن کے سامنے لڑھکنے لگا کہ شاید وہ اسے اُٹھانے کے لئے لپکیں اور دونوں اسی پر لڑ پڑیں...

سردار۔ (اشتیاق سے) اچھا تو وہ لڑ پڑے؟

نمبر دو۔ جی نہیں حضور.... اس دفعہ میں ایک مدرسہ میں پہونچا اور چھپ کر تین چار لڑکوں کے چٹکیاں لینے لگا۔ وہ سمجھے کہ اُنکے قریب والے لڑکے یہ حرکت کر رہے ہیں اُٹھ اُٹھ کر آپس میں لڑنے لگے۔ تھوری دیر میں اتنا ہنگامہ ہوا کہ سب لڑکے مدرسہ چھوڑ چھاڑ بھاگ گئے۔

سردار۔ شاباش! بہترین خدمت! علم کی اشاعت کو روکنے سے زیادہ کوئی خدمت بارگاہِ عزازیل میں مقبول نہیں ہے کیونکہ یہی وہ حربہ ہے جس سے انسان عقل سیکھ کر ہمارے قابو سے باہر ہوا جاتا ہے۔ (وزیر کی طرف دیکھتا ہے۔) وزیر!

وزیر۔ (دست بستہ آگے بڑھتا ہے) جہاں پناہ!

سردار۔ ہمارے اس فدائی نے ہم کو اپنے فرض سے آگاہ کر دیا تم شیاطین کی ایک ایسی جماعت تیار کرو جو دنیا بھر میں گھوم گھوم کر علم کی اشاعت کو روکنے کی کوشش کرے۔

وزیر۔ جہاں پناہ آج ہی۔

(اپنی جگہ پر چلا جاتا ہے۔)

سردار۔ (اپنے گلے سے ایک بیش قیمت موتیوں کا ہار اُتار کر نمبر دو

کی طرف بڑھاتا ہے۔) یہ لو تمہارا انعام!
(نمبر دو جھک کر لیتا ہے اور پایۂ تخت کو بوسہ دیکر
دائیں صف کی طرف چلا جاتا ہے۔)
سردار۔ اچھا اب نمبر تین!
(نمبر تین سامنے آتا ہے لیکن اُس کے چہرے سے خوف و
ہراس ظاہر ہو رہا ہے، وہ تخت کو بوسہ دیکر خاموش
کھڑا ہو جاتا ہے۔)
سردار۔ نمبر تین تو خاموش کیوں ہے؟
نمبر تین۔ حضور دو روز سے میں ایک کاشتکار کے پیچھے ہوں
لیکن وہ ابھی تک راہِ راست پر نہیں آیا۔
سردار۔ اس سے مطلب؟
نمبر تین۔ حضور وہ بوڑھا ہو گیا ہے لیکن اب بھی دن رات محنت
کرتا ہے برسوں میں نے اُسے رغبت دلائی تھی کہ ہمسایہ کے یہاں
رات کو نقب لگا کر کچھ حاصل کرے لیکن .....
سردار۔ (غصہ سے) ایک لفظ جھوٹ نہ ہو۔ اُسنے تیرا کہنا مانا؟
نمبر تین۔ (خاموش)
سردار۔ بول!
نمبر تین۔ (ڈر سے کانپتے ہوئے) جی نہیں۔
سردار۔ (غصہ سے مشتعل ہو کر) اگر اپنی کاہلی اور نمک حرامی سے
تو اور تیرے بھائی بند کاموں میں ایسی ہی غفلت برتتے رہے تو
کچھ دنوں میں ہمارا شیرازہ منتشر ہو جائیگا۔
(اپنی جگہ سے اُٹھکر نمبر تین کے ایک بہت زور سے تھپڑ
مارتا ہے)
نمبر تین۔ (سر پکڑ کر چلاتا ہے) دہائی ہے حضور کی! (اس کے منہ
سے خون جاری ہو جاتا ہے۔)
سردار۔ (اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے) کوئی ہے؟ اسکی کوڑوں سے
کھال اڑا دو۔ ایسے کاہل اور نمک حراموں کی یہی سزا ہے۔
نمبر تین۔ دہائی ہے حضرت عزازیل کی! (آگے بڑھکر اُسکے پیر
پکڑ لیتا ہے) مجھے ایک روز کی اور مہلت عطا کی جائے۔
سردار۔ (غصہ سے اُس کے ٹھوکر مارتا ہے) نہیں کچھ نہیں سنا جائیگا۔
وزیر۔ (آگے بڑھکر) جہاں پناہ میں سفارش کرتا ہوں کہ اسے ایکروز
کی مزید مہلت دی جائے۔
سردار۔ اچھا! ..... نمبر چار!

(نمبر چار داہنی طرف سے آتا ہے، رستہ میں وہ نمبر تین کے دو
ایک چٹکیاں لیتا ہے، وہ اُچھلتا ہے اور اپنا سارا جسم
نوچنے لگتا ہے۔ نمبر چار اب سردار کے سامنے آکر کھڑا
ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرے سے شوخی اور عیاری ظاہر
ہو رہی ہے۔)
سردار۔ تم اپنی کارگزاری سناؤ!
نمبر چار۔ حضور کل میں نے ایک بہت ایماندار اور سفید ریش آدمی
سے چوری کرا دی۔
سردار۔ (غصہ سے اپنی جگہ پر اچھل کر) غلط بالکل غلط۔ میں حضرت
عزازیل کا رجسٹر دیکھکر آ رہا ہوں۔ ان سے کوئی بات پوشیدہ نہیں
رہتی۔ تو نے اسے بہکایا ضرور تھا لیکن وہ اس نیک ارادے سے
فوراً ہی پلٹ گیا! وزیر!
وزیر۔ (ہاتھ جوڑ کر) جہاں پناہ!
سردار۔ اس جھوٹے شیطان کے پچاس کوڑے لگواؤ۔
(یہ کہتے ہی درخت کے پیچھے سے ایک لمبا سا کوڑا نکلکر
اس پر سٹراسٹر پڑنے لگتا ہے۔ کوڑا مارنے والے کا ہاتھ
دکھائی نہیں دیتا۔ نمبر چار اُچھلتا کودتا اور دہائی دیتا ہے)

منظر دوم

(اسی دن دو بجے دوپہر کا وقت)

(سب سڑک، ایک نیم کا درخت۔ دھوپ بے انتہا شدید
ہے اور گرم ہوا سائیں سائیں کرتی گزر رہی ہے۔ چاروں
طرف صفاچٹ میدان ہے۔ اِدھر اُدھر اکثر چھوٹی چھوٹی
جھاڑیاں لیکن سوا اس درخت کے میلوں دوسرا درخت
نظر نہیں آتا۔ نمبر تین درخت پر چڑھا ہوا بندر کی طرح اس
شاخ سے اُس شاخ پر کود رہا ہے۔ پردہ اُٹھتے ہی وہ
سامنے والی سب سے نیچے کی شاخ پر آکر ایک ٹانگ اِدھر
ایک ٹانگ اُدھر لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے اور خود بخود باتیں
کرنے لگتا ہے۔)
نمبر تین۔ کیا بتاؤں عجب مشکل میں جان ہے اگر کل ساری دنیا
کا چکر لگا ڈالا لیکن کوئی کمبخت جنگل میں پھنستا ہی نہیں سے میں نہیں
مانونگا، انسان بہت چالاک ہو گیا ہے یا عزازیل کے چیلے پہلے
سے زیادہ بے وقوف ہو گئے ہیں۔ (کچھ سوچ کر) کیوں نہ خدا سے

دُعا مانگی جاتے۔

یاد گر آدم کز ابلیس بود کمتر ک

یاد گر ابلیس از بہر امتحان عقل و دیں

یا چناں کن یا چنیں

(شاخ پر جھومنے لگتا ہے اور گاتا ہے۔)

یاد گر آدم کز ابلیس بود کمتر ک

یاد گر ابلیس از بہر امتحاں عقلِ دیں

یا چناں کن یا چنیں

(پیچھے کی شاخوں سے ایک بڑا سا ہاتھ نمودار ہوتا ہے اور اس کے سر پر بڑی زور سے تھپیڑ پڑتا ہے۔)

نمبر تین۔ (رُک کر اپنا سر سہلانے لگتا ہے) یہ سزا کا ہے کی؟ خوب، سمندر میں ہو، پہاڑوں کے بیچ میں ہو جہاں کہیں ہو، دنیا کے کسی کونے میں چھپ رہو، جب چاہا تھپیڑ رسید کر دیا۔ گھونسا مار دیا، سڑا سڑ کوڑے پڑنے لگے۔ یا تو اس کمبخت نمبر چار ہی کو لگا دیا اُسنے چٹکیاں لے لے کر بدن چھلنی کر دیا۔ (سوچ کر) اب میں سمجھا..... خدا سے دعا مانگ رہا تھا اس کی سزا ملی۔ (اپنے پیروں کو جھٹکتا ہے) آگیا کمبخت نمبر چار! میرے سر پر بھی مسلط کر دیا گیا۔ حضرت عزازیل اب تم سے مدد مانگتا ہوں۔

(سامنے سڑک پر ایک آدمی پیٹھ پر بورا رکھے آتا دکھائی دیتا ہے وہ صرف ایک لنگوٹی باندھے ہوئے ہے۔ سر سے پیر تک پسینے میں نہایا ہوا اور ہانپ رہا ہے۔)

نمبر تین۔ وہ دیکھو سامنے ایک شکار! اب میری باری ہے.....

(انسان کی شکل میں درخت سے نیچے اتر آتا ہے۔ کُرتہ، پاجامہ پہنے ہوئے اور سر پر پگڑی۔ ہاتھ میں ایک ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا مٹی کا برتن ہے۔ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ مزدور جب قریب پہونچتا ہے تو بہت میٹھی آواز میں بولتا ہے۔)

اے بھائی مزدور! دھوپ بہت تیز ہے تمہیں پیاس لگ رہی ہوگی میرے پاس تھوڑا سا پانی ہے لیکر پی لو۔

(مزدور سُنتا نہیں اور دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔)

نمبر تین۔ (اسکے برابر پہونچتے ہوئے) میاں مزدور کیا تمہیں اس وقت پیاس نہیں لگ رہی ہے؟

مزدور۔ (مزدور رُک کر پانی کی طرف للچائی نظر سے دیکھتے ہوئے)۔ پیاس؟ پیاس کا کیا ذکر... میرا تو دم نکلا جا رہا ہے....

نمبر تین۔ پھر کیوں نہیں رُک کر ذرا دم لے لیتے؟

مزدور (ہانپتے ہوئے) رُک جاؤں...؟ اور یہ بورا...؟

نمبر تین۔ (پانی کا برتن زمین پر رکھکر) ٹھہرو۔ میں اتروا دیتا ہوں۔

(مزدور درخت کے سایے کے نیچے آجاتا ہے۔ نمبر تین بڑھکر اُسے بورا اُتارنے میں مدد دیتا ہے۔)

مزدور۔ (بورا زمین پر رکھکر کھڑا ہو جاتا ہے اور لنگی کے کونے سے چہرے اور ہاتھوں کا پسینہ خشک کرنے لگتا ہے) اس قدر تیز دھوپ.... قریب تھا کہ بیہوش ہو کر گر جاؤں۔ (درخت کی جڑ کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور نمبر تین کے ہاتھ سے پانی کا برتن لیکر سارا پانی پی جاتا ہے۔ پانی ختم کر کے دو تین اطمینان کے گہرے سانس لیتا ہے۔ پھر نمبر تین کی طرف دیکھکر) یہ درخت کا سایہ اور ٹھنڈا پانی، معلوم ہوتا ہے میری جان میں جان آگئی۔ آنکھوں میں نیند بھی آنے لگی۔ دھوپ کی طرف نگاہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی..... اے خدا یہ کیا انصاف ہے کہ میرا مالک بنیا تو خس کی ٹٹیوں میں پڑا ہوا آرام کی نیند سو رہا ہے اور میں یوں آگ میں گھسٹ رہا ہوں۔ (نمبر تین سے مخاطب ہو کر، جس کے چہرے پر فتح کی مسکراہٹ ناچ رہی ہے) اے فرشتہ رحمت! بتا تو کون ہے؟

نمبر تین۔ میں....؟ ابھی بتاتا ہوں.... لیکن پہلے تو یہ کہو کہ ایسی تیز دھوپ میں اتنا بڑا بوجھ اُٹھا کر چل کیسے سکتے ہو؟

مزدور۔ (پیشانی پر ہاتھ مار کر) یہ تقدیر جو کچھ کروائے۔

نمبر تین۔ تقدیر کیسی؟

مزدور۔ میرے مقدر ہی میں لکھا ہے کہ دو سوکھی روٹیوں کیلئے اس طرح بھری دوپہر کی آگ میں گھسٹتا پھروں۔

نمبر تین۔ اور اس مقدر پر بھی تم خوش نظر آتے ہو؟

مزدور۔ (حیرت سے) خوش؟ اپنی قسمت کو روتا ہوں۔ اپنے اعمال بھگتتا ہوں۔ ایک میرا مالک ہے جو اپنے روپے کے گھمنڈ میں صبح سے شام تک ہزاروں بے گناہ مظلوموں پر ستم توڑا کرتا ہے پھر بھی اُسے ساری دُنیا کا عیش میسر ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ اس طرح اپنا خون اور پسینہ ایک کئے رہتا ہوں۔

(افسردگی سے سر جھکا لیتا ہے)

نمبر تین۔ کبھی تم کو اپنے مالک جیسا بننے کا خیال نہیں آتا؟

مزدور۔ آتا کیوں نہیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟

نمبر تین:۔ میں بتاتا ہوں۔ لیکن (اپنا ہاتھ بڑھا کر) پہلے اِسے بوسہ دیکر میرے فرمانبردار بن جاؤ۔

مزدور:۔ (کھڑے ہوکر اُس کا ہاتھ لیتے ہوئے) ارے اس میں کیا؟ میں تو مُصیبتوں اور تقدیر کی گردشوں سے اس قدر عاجز آگیا ہوں کہ اگر شیطان بھی ان سے نکلنے کا راستہ بتائے تو خوشی سے میں اسکی پیروی کرنے کو تیار ہوں۔ (ہاتھ چومتا ہی) لو آج سے میں تمہارا مُرید ہوگیا چاہے تم شیطان ہی کیوں نہ ہو۔

نمبر تین:۔ (قہقہہ لگاکر) تم نے ٹھیک کہا دوست۔ میں شیطان ہی ہوں۔

مزدور:۔ (کسی قدر جھجکتا ہے لیکن پھر اس طرح گویا قائل ہوگیا ہی) پانچ برس پہلے اگر کوئی شیطان کا نام بھی میرے سامنے لے دیتا تو غصہ آجاتا لیکن اب تو محنت مشقت اور اس اندھی تقدیر کی گردشوں نے شیطان یا رحمان کا خیال ہی دل سے مٹا دیا۔ کہو تم کیا مشورہ دیتے ہو؟

نمبر تین:۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتا ہے اور خود بھی بیٹھ جاتا ہے) آؤ دوست، اب تم میری رائے پر چلو تو دیکھو چند دن میں کیا سے کیا ہوجاتے ہو۔

مزدور:۔ کہہ تو دیا، تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔

نمبر تین:۔ (چہرے پر مسکراہٹ ہی۔ سر ہلا ہلا کر) دیکھو تمہارا مالک بہت بوڑھا ہوگیا ہے، اُسکے اولاد تو ہے نہیں؟۔

مزدور:۔ نہیں۔

نمبر تین:۔ اور اُس کی بیوی؟

مزدور:۔ وہ تو ابھی بالکل لڑکی سی ہے۔

نمبر تین:۔ یہی تو اصل بات ہے۔ (اُس کے اور قریب سرک آتا ہی) میں تم کو ایک صاف سُتھری پوشاک دونگا اُسے پہن کر بیوی کے پاس جاؤ۔ وہ تمہیں اپنا منشی بنالے گی پھر کیا ہے کچھ دنوں میں...... (بالکل سرگوشی میں کچھ کہتا ہے پھر بلند آواز سے) مہاجن تو بوڑھا ہی آخر مر ہی جائیگا۔

مزدور:۔ (خوشی سے اُچھلتا ہی) ترکیب تو اچھی ہی دوست! لیکن یہ بتاؤ کہ کچھ دھوکا تو نہ دوگے۔

نمبر تین:۔ نہیں عزازیل کی قسم۔

(درخت کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، ایک کپڑوں کی گٹھڑی خود بخود اُوپر سے گرتی ہے اور اس کے ساتھ پانی کی ایک بالٹی ــــ)

مزدور:۔ (محوِ حیرت ہوکر) دوست یہ تو عجیب کرشمہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے سب چیزیں تمہارے سامنے خود بخود آموجود ہوئیں۔

نمبر تین:۔ ہاں! دیکھتے رہو... (کپڑوں کی گٹھڑی کھولتا ہی) یہ لو جلدی سے غسل کرکے یہ کپڑے پہن کر روانہ ہوجاؤ۔

(مزدور بالٹی سے پانی لیکر جلدی جلدی غسل کرتا ہے اور پھر جسم خشک کرکے کرتہ پاجامہ اور ٹوپی وغیرہ پہنتا ہی۔)

نمبر تین:۔ (اسکو آئینہ دکھاتے ہوئے) تمہاری صورت تو اُس بڈھے کھوسٹ مہاجن سے لاکھ درجہ اچھی ہی۔

مزدور:۔ (کسی قدر فخر کے ساتھ) یہ تو میں ہمیشہ ہی سے جانتا تھا... مگر تقدیر تو اس کی....

نمبر تین:۔ پھر وہی تقدیر! میرا کہا مانو دیکھو تمہاری تقدیر کیا کرشمہ دکھاتی ہی... اب تم فوراً روانہ ہوجاؤ۔

مزدور:۔ (اپنی کثیف لنگی درخت کے پیچھے پھینک کر چلتا ہی۔ گیہوں کے بورے پر نظر پڑتی ہے) اور یہ بورا؟

نمبر تین:۔ اس کی تم ذرا فکر نہ کرو۔ تمہاری صورت اسقدر بدل گئی ہی کہ وہاں پہونچنے پر کوئی تم سے بورے کے متعلق باز پُرس نہ کریگا۔

(مزدور شیطان کا ہاتھ چُوم کر سڑک پر جس طرف پہلے جارہا تھا اسی رُخ روانہ ہوجاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھتری بھی ہے اور چال نہایت اطمینان کی۔ وہ دُور نکل جاتا ہے۔)

نمبر تین:۔ (کھڑا دیکھتا رہتا ہے پھر قہقہہ لگاکر) وہ جارہا ہے! کیسا اُلو بنایا۔ ہاہا دیکھنا کچھ دنوں میں تجھے سیدھا جہنم کے گھاٹ اتارونگا۔ (گیہوں کے بورے پر نظر پڑتی ہے) اور یہ گیہوں کا بورا.....؟ اب کسی اور شامت زدہ کو اس رستے پر لگنے دو اس میں تو سو آدمیوں کی خوراک ہے پھر کون اُسے لیکر خوش نہ ہوگا۔ (اپنے پیروں کو بے چینی سے جھٹکتا ہے) یہ کمبخت نمبر چار تو نے اب میرا پیچھا لیا۔ چُھپ چُھپ کر مجھے ستاتا ہے۔ میں تیرا کچھ بنا نہیں سکتا۔ ذرا انسان کے بھیس میں آجا پھر دیکھ... ارے پھر چُٹکیاں... میں مرگیا ہوتا تو اچھا تھا۔ (دونوں پیروں سے اُچھلتا ہے۔)

منظر سوم

اس کے دو ماہ بعد

رات کا وقت۔ مہاجن کے مکان کا ایک کمرہ۔ خواب گاہ

معلوم ہوتا ہے۔ داہنے ہاتھ کی طرف کھڑکی اور سامنے کی دیوار میں دو دروازے۔ جن پر پھول دار خوبصورت پردے پڑے ہوئے ہیں۔ سب سامان نہایت بیش قیمت۔ فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے۔ بائیں ہاتھ کی طرف ایک مسہری ہے اس پر جالی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی گول میز اسکے پاس ایک صوفہ دو گدے دار کرسیاں۔

پردہ اٹھتے ہی مزدور (جس کا نام سہراب ہے۔) پردے کے باہر مسہری سے پیر لٹکائے بیٹھا ہے۔ اس عرصے میں عیش و آرام نے اس کی بالکل کایا پلٹ کر دی ہے، نقشہ وہی ہے لیکن رنگ نکھر گیا ہے اور جسم بھی خوب تندرست۔ انگریزی طرز کے بال بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت وہ ایک سفید دھوتی اور گلابی سلک کی قمیص پہنے ہے۔ لیکن چہرے پر بے چینی کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ بائیں ہاتھ پر پیشانی ٹیکے دیر تک خاموش بیٹھا رہتا ہے اس کے بعد ہاتھ جھٹک کر بے چینی سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

سہراب ۔ نیند! نیند!! کمبخت کدھر گئی؟ تجھے پھولوں کی سیجوں سے اس قدر جلن کیوں؟ دو گھنٹے سے بستر پہ پڑا کروٹیں بدل رہا ہوں لیکن ذرا پلک نہیں جھپکتی۔ بُرے بُرے خیالات ہیں کہ مُردہ خور گدوں کی طرح بھیجا چبائے جا رہے ہیں لیکن نیند.... ؟ نہیں آتی (دو قدم کرسی کی طرف جاتا ہے) یہ محل، یہ دولت، یہ عیش و آرام؟ سب کیا ہوگا؟ اگر نیند ہی نہ آئی جس سے دماغ کو سکون حاصل ہو۔ (کرسی پر گر جاتا ہے، دروازے کی طرف پشت ہے، ادھر اُدھر دیکھتا ہے) کماری کدھر گئی؟ اپنے بلبل کی سی شیریں آواز میں ایک گیت سناتی۔ شاید اس سے ذرا دیر کے لئے سو جاتا... (کچھ سوچتا ہے۔) لیکن آج وہ کیسے آئے گی؟ وہ تو اس کمبخت مہاجن کے پیچھے میں لگی ہوگی ــــ اسے بھی میری خاطر کتنے سوانگ بھرنا پڑ رہے ہیں ــــ اور وہ کمبخت مر کر بھی چین نہیں لینے دیتا۔ (سر پکڑ لیتا ہے) آہ نیند! نیند!! پھر وہی خیالات کا سلسلہ مجھے بہکائے چلا۔ شیطان کی فوج کی طرح وہ نہ معلوم کہاں سے ایک کے بعد دوسرے نکلتے چلے آتے ہیں۔ (شیطان کے خیال سے چونک کر) آہا میرا دوست نمبر تین یاد آگیا۔ لیکن آج تو وہ کسی بڑی مہم پر گیا ہوا ہے۔ کاش میرے دُکھ کا بھی علاج کر سکتا۔

نمبر تین ۔ (فوراً نمودار ہو کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس طرح گویا مسہری کے نیچے سے نکل آیا ہو) کہو تمہیں کیا تکلیف ہے؟

سہراب ۔ (چونک پڑتا ہے، خوش ہو کر) ارے تم کیسے؟ کیا آج اس امیرزادے کے پاس نہیں گئے؟

نمبر تین ۔ (جلدی کے لہجہ میں) وہیں سے تو آ رہا ہوں اور جلد واپس جاؤں گا۔ (بغل سے ایک شراب کی بوتل نکال کر دیتا ہے۔) لو یہ شربت تمہارے لئے تحفہ لایا ہوں۔ اِسے پی جاؤ، فوراً نیند آجائے گی۔

سہراب ۔ (کھڑے ہو کر بوتل ہاتھ میں لیکر روشنی کی طرف کرتا ہے۔ سُرخ سُرخ شراب اندر سے جھلکتی ہے) کس قدر خوش رنگ! دیکھتے ہی آنکھوں میں نیند آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

(نمبر تین غائب ہو جاتا ہے۔ سہراب سامنے میز پر سے جھک کر شیشے کا گلاس اٹھاتا ہے اور بوتل کھول کر شراب گلاس میں انڈیل کر پیتا ہے، کچھ لڑکھڑاتا ہے لیکن پیچھے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

سہراب ۔ نیند! لذت!... سرور... سب ایک ایک کرکے آ رہے ہیں۔ (دوسرا گلاس انڈیل کر پیتا ہے زبان کچھ لڑکھڑانے لگتی ہے۔) سب ایک ایک کرکے آ رہے ہیں اور میرے سامنے ناچ رہے ہیں۔ ان کے گھنگھروؤں کی ہلکی ہلکی دھمک اور... (کرسی کی پشت سے ٹک جاتا ہے) دامن کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا... مجھے نیند آ رہی ہے۔

(آنکھیں بند کرکے سو جاتا ہے)

(وقفہ)

(پشت کے دروازے کی طرف آہٹ۔ پردہ ہلتا ہے۔ اسکے پیچھے سے کماری نمودار ہوتی ہے۔ وہ آتی نہیں بلکہ پردہ دونوں ہاتھوں سے جدا کرکے اس کے درمیان کھڑی ہو کر ایک مسکراہٹ کے ساتھ پورے کمرے پر نظر ڈالتی ہے۔ وہ چھوٹے قد کی بے انتہا خوبصورت اور شوخ ہے۔ سہراب اس کی طرف پیٹھ کئے ہے۔ یہ دیکھکر وہ آگے بڑھتی ہے اور آنکھ مچولی کھیلنے کی غرض سے دونوں سفید چمکدار ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ سہراب غافل ہے جنبش نہیں کرتا۔

کماری ۔ (چونک کر پیچھے ہٹتی ہے) ہائیں! اتنی غافل نیند...

(کُرسی کے ڈنڈے پر بیٹھ کر اُسے ہلاتی ہے) میرے پتی! . . . تمہارے کارن میں نے وہ بہروپ کیسی جلدی ختم کر دیا۔ اور اس بڈھے کے تیجے کے غم میں، جسے شربت کے ایک گلاس نے ختم کر دیا کتنے آنسو بہا آئی ہوں۔ افوہ! اتنی نیند!

(سہراب ہوں ہوں کرتا جھومتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے اور دونوں مسہری کی طرف چلے جاتے ہیں۔)

منظر چہارم

سین۔ منظر اوّل کا سا۔ شیطان کا دربار آراستہ ہے۔ شیطانوں کا سردار تخت پر بیٹھا ہے اور سب اراکین مؤدب استادہ ہیں۔ سردار خاموش سر جھکائے بیٹھا ہے گویا کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ دوسرے شیاطین بھی خاموش ہیں۔ تھوڑی دیر یونہی خاموشی طاری رہتی ہے۔

سردار۔ (سر اُٹھا کر) نمبر تین اب تک نہیں آیا۔ آج وہ ایک خاص مہم پر گیا ہوا ہے۔

(نمبر تین یکایک سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے یہ نہیں معلوم ہوا کہ کدھر سے آیا ہے۔)

سردار۔ نمبر تین! اُس امیر زادے کا کیا حال ہے؟ میں تمہارے مُنہ سے کامیابی کی خبر سننے کے واسطے بے چین ہوں۔

نمبر تین۔ (آگے بڑھ کر پایۂ تخت کو بوسہ دیتے ہوئے) حضور! اس کا سارا مذہب، ساری تعلیم جو لمبی لمبی ڈاڑھی والے علما برسوں سے دے رہے تھے۔ سب میرے ورغلانے کے سامنے غائب ہو گیا۔ باپ کی موت کے دوسرے ہی دن میں نے اس کی محفل میں رباب نشاط کو پہونچا دیا۔

سردار۔ (اشتیاق سے) اور وہ مزدور!

نمبر تین۔ اُس کا تو دین ایمان اس طرح ہوا ہوا ہے گویا تھا ہی نہیں۔ اب میں نے شراب کا چسکا بھی لگا دیا ہے۔

سردار۔ شاباش! شاباش!! یہ کامیابیاں حضرت عزازیل کے اقبال کا نتیجہ ہیں۔ (پاس رکھے ہوئے تھال سے جھک کر ایک دوشالہ اُٹھاتا ہے) یہ لو تمہارا انعام!

نمبر تین۔ (آگے بڑھ کر دوشالہ لیتا ہے اور پایۂ تخت کو بوسہ دیکر پھر اپنی جگہ کھڑا ہو جاتا ہے) جہاں پناہ! اس امیر زادے کی طرف سے میں ابھی اندیشے سے خالی نہیں ہوں۔

سردار۔ کچھ نہ گھبراؤ! اقبال عزازیل سلامت ہے تو وہ کبھی راہِ راست پر نہیں رہ سکتا اور تمہیں ان خدمات کے صلہ میں انعامات سے مالا مال کر دیا جائے گا۔

نمبر تین۔ (اپنا پیر جھٹکتے ہوئے) یہ کمبخت نمبر چار! (بلند آواز میں ہاتھ جوڑ کر) جہاں پناہ میں اور کوئی انعام نہیں چاہتا۔ صرف اس نمبر چار کی گردن زدنی کا حکم دیدیا جائے۔ یہ اب میرے پیچھے لگ گیا ہے۔ اس قدر چٹکیاں لیتا ہے کہ میں ہر وقت بوکھلایا رہتا ہوں اور اپنی زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ زمین پر پیر رکھا نہیں کہ اُس نے چٹکیاں لینا شروع کر دیں۔

سردار۔ اچھا . . . . ہم دیکھیں گے۔

دربار برخاست ہوتا ہے سب شیاطین یکایک غائب ہو جاتے ہیں۔

منظر پنجم

مہاجن کا مکان۔ سین منظر سوم کا سا۔ وہی خوابگاہ ہے۔ دس بجے دن کا وقت۔ مسہری کے پردے اُلٹے ہوئے ہیں۔ سہراب (مزدور) بستر پر پڑا ہوا ہے۔ بہت کمزور، اُس کے چہرے کی رگیں نکل آئی ہیں۔ تندرستی اور رونق سب غائب۔ معلوم ہوتا ہے بہت سخت بیمار ہے۔ تکیہ پر سر پٹک رہا ہے۔

سہراب۔ (تکیہ سے سر اُٹھا کر کمزور آواز میں) سر درد سے پھٹا جاتا ہے۔ شراب . . . . شراب!! کہاں ہے وہ میری زندگی کا رس . . . (پھر سر ڈال دیتا ہے) کماری! کماری!!

(کماری بائیں دروازے سے نکل کر آتی ہے وہ پریشان سی ہے —)

سہراب۔ (ہاتھ پھیلا کر خوشامد آمیز لہجے میں) کماری ایک گلاس!.. صرف ایک . . . .

(کماری مسہری پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتی ہے اور اس کا سر اپنی گود میں لے لیتی ہے۔)

سہراب۔ (بچوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے۔) کماری! تم دیدو . . . . میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔

کماری۔ (پھسلاتے ہوئے) دو گلاس تو آپ صبح ہی پی چکے ہیں۔ ڈاکٹر نے بہت مشکل سے دو گلاس کی اجازت دی تھی۔ اب نہ مانگیے . . .

سہراب ۔ ایک گلاس اور . . . . (مایوسی سے) تم نہیں دوگی! اُف درد! کہاں گیا نمبر تین! اِس درد کا کچھ علاج بتائے گا؟

کماری ۔ (گھبرا کر) نمبر تین کون؟ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ (کھڑے ہو کر) میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔

(چلی جاتی ہے۔)

سہراب ۔ (بے چینی سے تکیہ سے سر رگڑتا ہے۔) نمبر تین تو کہاں گیا! سُرخ شراب کا صرف ایک گلاس! میں عمر بھر تیرا احسانمند رہونگا۔

نمبر تین ۔ (یکایک سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شراب سُرخ کی ایک بوتل بغل سے نکالتے ہوئے) میں نے عمر بھر ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا ایسے نازک وقت میں بیوفائی نہیں کر سکتا۔

سہراب ۔ (شراب دیکھکر سوکھے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔) سر درد سے پھٹا جاتا ہے۔ دے میری زندگی کا رس!

(نمبر تین پاس کی میز سے گلاس اُٹھا کر شراب انڈیل کر سہراب کی طرف بڑھاتا ہے، وہ نہایت کمزور ہے لیکن بہت کوشش سے بستر سے اُٹھکر ساری شراب دو منٹ میں چڑھا جاتا ہے اور پھر گلاس اُس کی طرف بڑھاتا ہے۔ نمبر تین دوسرا گلاس بھر کر خود اُس کے مُنہ سے لگا دیتا ہے آخری گلاس اُس کے لئے زہر قاتل ثابت ہوتا ہے۔ فوراً بستر پر گر جاتا ہے۔)

نمبر تین ۔ ہاہاہا دولت! ایسی تیز شراب تھی کہ پہلے ہی گلاس نے تمہارے جسم سے آدھی روح کھینچ لی ہوگی اور دوسرے نے تو . . . .

(کماری بائیں دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ اُس کے پیچھے ڈاکٹر آتا ہے۔ نمبر تین کھڑکی کی طرف کونے میں دبک جاتا ہے۔ وہ دونوں پلنگ کی طرف بڑھتے ہیں۔)

کماری ۔ (پلٹ کر ڈاکٹر سے دھیمی آواز میں) ڈاکٹر صاحب آپنے دو گلاس کی اجازت دی تھی۔ مریض نے صبح اُٹھتے ہی وہ دونوں گلاس زبردستی پی لئے اور اب پھر شراب! شراب!! کی رٹ لگا رکھی ہے۔

ڈاکٹر ۔ خاتون! تیسرا گلاس تو ان کے لئے زہر ہے۔ (مسہری پر جُھک کر مریض کا چہرہ، اس کے بعد جلدی جلدی اس کی نبض اور دل دیکھتا ہے۔ پھر خاموشی سے کھڑے ہوتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے آپ کی عدم موجودگی میں مریض نے اور شراب پی کر اپنا کام تمام کر لیا۔ (ملازم داخل ہوتا ہے)

(کماری سہراب پر جُھک کر اُسے دیکھتی ہے اور پھر چیخیں مار کر اس پر گر جاتی ہے۔)

نمبر تین ۔ (کونے میں کھڑے کھڑے) ہا ہا ہا۔ میرے دوست اب تمہاری رُوح سیدھی جہنم میں پہونچی ہوگی اور وہاں آتشی آنکھوں والا دوزخ کا داروغہ اسے جلتے ہوئے لوہے کے گرزوں سے اُچھال اچھال کر مار رہا ہوگا . . . . اب تم وہیں پڑے رہوگے . . . اور شراب کے بدلے کھولتا ہوا پانی اور پگھلا ہوا سیسہ پینے کو ملے گا . . . ہاہاہا۔ اور اس کے بدلے میں مجھے اس کمبخت نمبر چار کی چٹکیوں سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔ اب میں نہیں گاؤنگا۔

(گاتا ہے)

یا دگر آدم کز ابلیس بود کمترک
یا دگر ابلیس از بہرِ امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کُن یا چنیں

کیونکہ ابلیس اب بھی انسان پر قابو پائے ہوئے ہے۔

(پھر گاتا ہے)

یا دگر آدم کز ابلیس بود کمترک
یا دگر ابلیس از بہرِ امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کُن یا چنیں

ڈاکٹر ۔ (حیرت سے کونے کی طرف دیکھتا ہے) ہیں یہ آواز کیسی؟

نوکر ۔ (اشارہ کرتے ہوئے) اس کونے سے . . . .

(دونوں کونے کی طرف جاتے ہیں۔ نمبر تین غائب۔ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔)

(پردہ)

آئی۔ این۔

گھاٹ کے زینے

اگر تم پچھلے زمانے کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہو تو آؤ میرے زینوں پر بیٹھو، اور بہتے ہوئے پانی کی سرسراہٹ پر کان دھرو۔

ستمبر کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ پانی پورے چڑھاؤ پر تھا۔ میرے صرف چار زینے سطح سے اوپر نظر آ رہے تھے۔ پانی کنارے کے گڈھوں اور تالابوں میں بھر آیا تھا۔ جہاں کچھ درخت بہت گھنے اُگ رہے تھے۔ دریا کے اگلے موڑ پر اینٹوں کے تین پُرانے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ جن کے چاروں طرف موجیں لہریں مار رہی تھیں۔ ماہی گیروں کی کشتیاں ببلا درخت کے تنے سے بندھی ہوئی تھیں۔ اور تیز دھارے کے تھپیڑوں سے ڈگمگاتی جا رہی تھیں۔ ریتیلے کناروں پر اونچی گھاس کا خوشنما راستہ تازہ دم سورج کی سنہری کرنوں کی وجہ سے بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ گھاس نے حال ہی میں نمو پانا شروع کی تھی اسلئے پورے طور پر نہ اُگ سکی تھی۔

چھوٹی کشتیوں کے مختصر بادبان دریا کے اوپر، جس کا پانی سورج کی روشنی میں سنہرا ہو گیا تھا، عجیب انداز میں پھر پھرا رہے تھے۔ برہمن پجاری بھی اپنی لُٹیوں سمیت اشنان کیلئے آ چکا تھا اور عورتیں دو دو چار چار کی ٹولیوں میں پانی بھرنے آ رہی تھیں میں جانتا تھا کہ یہ وقت کسوم کے اشنان گھاٹ پر آنے کا ہے......

لیکن اُس دن میں نے اس کو وہاں نہ پایا۔ بھوپن اور سوار تھو گھاٹ پر آئیں لیکن مغموم۔ ان سے معلوم ہوا کہ اُن کی گوئیاں اپنے شوہر کے یہاں پہونچا دی گئی ہے۔ جو دریا سے بہت دُور رہتا ہے۔ جہاں کے لوگ عجیب و غریب ہیں۔ مکانات نرالے اور راستے انوکھے ہے۔

کچھ عرصے کے لئے وہ میرے دماغ سے اُتر گئی ——

ایک سال گذر گیا —— گھاٹ پر عورتیں شاذو نادر ہی کسوم کے متعلق گفتگو کرتیں....... ایک دن شام کو میں کسی کے آشنا پیروں کی چاپ سُن کر کچھ بے چین سا ہو گیا —— آہ —— یہ تو وہی پیر تھے لیکن کنگنوں سے خالی —— اور اپنی پرانی ترنم ریزیوں سے محروم۔

کسوم بدھوا ہو گئی تھی۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر کسی دُور دراز مقام پر کام کرتا تھا —— آہ —— کسوم کو اُس سے صرف ایک یا دو مرتبہ ملاقات کا موقع نصیب ہوا تھا۔ ایک خط آیا —— بہت رُوح فرسا —— اس میں لکھا تھا کہ اُس کا شوہر گذر گیا۔

آٹھ سال کی بدھوا —— اُف —— اُس کے ماتھے سے سیندور کی سُرخ لکیر دھو ڈالنا پڑی۔ چوڑیاں بھی توڑ دی گئیں اور وہ انتہائی دُکھ بھرے دل کے ساتھ اپنے پُرانے گھر، میکے، —— جو گنگا کے کنارے تھا —— واپس آ گئی۔ اب اس کی پرانی گوئیوں میں کوئی بھی نہ تھا۔ بھوپن، سوار تھو اور آمالا پہلے ہی بیاہ کر سسرال جا چکی تھیں صرف سرت باقی تھی اور وہ بھی، جیسا کہ لوگ کہتے تھے آئندہ دسمبر میں بیاہی جانے والی تھی۔

جس طرح گنگا بارش کی وجہ سے روزانہ چڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی طرح کسوم بھی اپنی سُندرتا اور جوانی کے ابھار میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی جا رہی تھی۔ لیکن اس کے بدرنگ کپڑوں اداس چہرے اور خاموش انداز نے اس کی جوانی کے نکھار پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس کے چاند سے مکھڑے پر غم کا ایک زبردست کُہر چھایا ہوا تھا وہ پھول تھی —— بہت ہی خوشنما —— لیکن قدرت کے گلچیں نے اس کو درخت سے علیحدہ کر کے زمین پر ڈال دیا تھا کہ گرد آلود ہو کر لوگوں کے پیر تلے کچل جائے۔

دس سال گذر گئے —— کسی نے بھی یہ محسوس کرنے کی کوشش نہ کی کہ کسوم اب پورے شباب پر ہے۔

ایک بہت پچھلے ستمبر کی اخیر تاریخوں میں ایک دن صبح —— ٹھیک آج کی طرح —— ایک دراز قامت، گورا جوان سنیاسی —— جس کے متعلق مجھ کو خود بھی نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا تھا۔ —— سامنے والے شیو مندر میں پناہ گزیں ہوا۔

اُس کے آنے کی خبر دُور دُور کے دیہاتوں میں پہونچ چکی تھی —— عورتیں اپنے اپنے گھروں کو باہر چھوڑ کر مندر کے اندر اس برگزیدہ انسان کی قدم بوسی کیلئے جمع ہو جاتیں۔ اژدہام روز بروز بڑھتا رہا۔ عورتوں کے طبقہ میں سنیاسی کی شہرت تیزی سے

بڑھ رہی تھی۔ کبھی وہ بھگوت پڑھتا، کبھی گیتا یا کبھی مندر میں بیٹھکر کسی مقدس کتاب پر وعظ کہتا۔

بعض لوگ اس کے پاس مشورہ کرنے آتے بعض دعا کرانے اور دوا دارو لینے۔

چند مہینے اسی طرح گذر گئے۔ اپریل میں سورج گرہن کے موقع پر ایک جم غفیر گنگا میں اشنان کرنے آیا اور ببلا کے درخت کے نیچے ایک میلا سا لگ گیا۔ بہت سے جاتری سنیاسی کی قدمبوسی کیلئے حاضر ہوئے۔ ان میں اس گاؤں کی عورتیں بھی تھیں جہاں کسوم بیاہ کر گئی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ سنیاسی مالا جپ رہا تھا کہ اچانک ایک عورت جاتری نے دوسری کے کہنی مار کر کہا "کیوں ری! یو تو ہمری کسوم کرا آومی آئے۔"

ایک دوسری عورت نے دو انگلیوں سے اپنا گھونگٹ اٹھایا اور بیساختہ چیخ اٹھی "اے باپ رے! یو ہے!! یو ہمرے گاؤں کرے چترگو گھرانے کا چھوٹ پوت ہوئے۔"

ایک تیسری نے اپنا گھونگٹ تھوڑا سا سرکاتے ہوئے کہا۔ "اوئی! یہ کی آنکھیں، ناک اور بھوں اوئی کی ایسن آئیں۔"

اسی طرح ایک اور نے بغیر سنیاسی کی طرف منہ پھیرے، اپنے گگرے میں پانی بھرنا شروع کیا۔ اور لمبی سانس لیکر کہنے لگی۔ "ہائے! او جوان اب اس سنسار ما (میں) نائی ہے اور نہ یہاں لوٹ کے ایہے (آئے گا) ہائے! کسوم کرا کرم!! (تقدیر)۔"

"ل (لیکن)" ایک نے اعتراض کیا "اِتی بڑی اوئی کی آنکھیں نائی راہیں۔"

دوسری "اواتا پاتر (دبلا) نائی را ہے۔"

"ہمار من کہت ہے کی او اتا اونچو (لمبا بھی) نائی راہے۔"

اس طرح معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اور بات زیادہ پھیلنے نہ پائی۔

ایک رات کو جبکہ پورا چاند نمودار ہوچکا تھا، کسوم آئی اور پانی کے قریب میرے آخری زینے پر بیٹھ گئی اور اپنی پرچھائیں میرے اوپر ڈال دی۔

اس وقت گھاٹ پر کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ میرے قریب ہی جھینگر جھنجھنا رہے تھے۔ مندر میں پیتل کے گھنٹوں کے بجنے کا شور ختم ہوچکا تھا ——— آواز کی آخری لہر مدھم سے مدھم تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اپنی جھلک کے مانند دور دراز کنارے کی جھاڑیوں میں غائب ہوگئی۔ گنگا کے تیرہ و تار پانی پر آفتاب کے عکس نے ایک چمکدار لیکن پتلا راستہ سا بنا دیا تھا۔

اوپر دریا کے کنارے، جھاڑ جھنکار میں، مندر کے آستانے کے نیچے، کھنڈروں کے عقب میں، تالاب کے ارد گرد تاڑ کے جھنڈ تلے اوٹ پٹانگ شکلوں میں سایہ پڑ رہا تھا۔ چھاتم کی ٹہنیوں سے چمگادڑیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ویران مکانوں کے قریب سے گیدڑوں کا اونچا شور سنائی پڑا اور یکبارگی خاموشی میں گم ہوگیا۔

سنیاسی آہستہ آہستہ مندر سے باہر آیا۔ گھاٹ کی چند سیڑھیاں اتر کر اس کو تنہائی میں بیٹھی ہوئی ایک عورت دکھائی دی۔ وہ الٹے پیروں واپس جانے والا ہی تھا کہ یکایک کسوم نے اپنا سر اٹھایا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ چادر اس کے چہرے سے سرک گئی ——— جیسے ہی اس نے اوپر دیکھا، چاند کی تیز مگر ٹھنڈی روشنی اس پر آپڑی۔

الو چلاتا ہوا ان دونوں کے اوپر سے گذر گیا۔ آہٹ پاتے ہی کسوم یکبارگی چونک سی پڑی۔ جلدی سے سر پر آنچل برابر کیا۔ اور سنیاسی کے قدموں پر جھک پڑی۔

اس نے اس کو دعائیں دیں۔

"تم کون ہو؟" اس نے دریافت کیا۔

"میں کسوم کے نام سے پکاری جاتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

اس رات کو مزید گفتگو نہ ہوئی۔ کسوم آہستہ آہستہ گھر ——— جو قریب ہی تھا ——— واپس چلی گئی۔ لیکن سنیاسی میری سیڑھیوں پر رات گئے تک دم بخود کھڑا رہا۔ بالآخر جب آفتاب مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہوگیا اور سنیاسی کا عکس پیچھے سے ہٹتے ہٹتے آگے کی طرف پڑنے لگا ——— وہ اٹھا اور مندر میں داخل ہوگیا۔

اس وقت سے برابر میں کسوم کو دیکھتا کہ وہ روزانہ سنیاسی کے قدموں پر جھکنے آتی۔ جب وہ کسی مقدس کتاب کے معنی بیان کرتا تو وہ ایک کونے میں کھڑی ہوکر اس کو سنا کرتی۔ صبح کی عبادت ختم کرنے کے بعد وہ اس کو اپنے پاس بلاتا اور مذہب و اخلاق پر اس سے گفتگو کرتا۔ وہ اس قسم کی گفتگو کو بخوبی نہیں سمجھ سکتی تھی لیکن پھر بھی متوجہ رہتی اور خاموشی کے ساتھ سنتی رہتی ——— اس نے اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔

جو ہدایت وہ کرتا اس پر نہایت سادگی کے ساتھ عمل کرتی۔

وہ روزانہ مندر میں خدمت گزاری کے لئے حاضر ہوتی ـــــ ہمیشہ پرمیشور کی عبادت کیلئے مستعد ـــــ پوجا کیلئے پھول چنتی اور مندر کی زمین دھونے کے لئے گنگا سے جل لیتی۔

جاڑے ختم ہو رہے تھے۔ ہوا ٹھنڈی چلتی لیکن کبھی کبھی شام کو گرم مگر خوشگوار ہوا بھی غیر متوقع طور پہ مغرب سے چلنے لگتی۔ آسمان سے جاڑوں کے آثار چھٹ رہے تھے۔ کبھی کبھی بانسری بھی بجتی اور کبھی ـــــ ایک مدت کے بعد ـــــ گاؤں میں گانا بجانا بھی ہوتا۔ کشتی بان اکثر اپنی کشتیوں کو دھارے پر چھوڑ دیتے، کھینا بند کر دیتے، اور کرشن جی کا کوئی گیت الاپنے لگتے۔ یہ موسم تھا۔

اسی زمانے میں میری آنکھیں کسوم کی متلاشی رہنے لگیں مگر کچھ عرصے سے اُس نے مندر میں، گھاٹ پر اور سنیاسی کے پاس آنا جانا ترک کر دیا تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ مجھکو علم نہیں۔ لیکن ایک عرصے کے بعد شام کے وقت وہ دونوں میری سیڑھیوں پر ایک دوسرے سے ملے۔

اُداس نگاہوں سے دیکھکر کسوم نے پوچھا "گرو جی! کیا آپنے مجھ کو یاد کیا تھا؟"

"ہاں۔ میں تم کو آج کل کیوں نہیں دیکھتا؟ .... تم دیوتاؤں کی خدمتگزاری سے غفلت کیوں برتنے لگیں؟"

وہ خاموش رہی۔

"تم بلا تکلف مجھ سے اپنے خیالات کا اظہار کرو۔"

وہ کچھ رُکی اور ساری کے آنچل سے چہرے کو ڈھانکتی ہوئی زینے پر سنیاسی کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی اور رونے لگی۔

سنیاسی تھوڑا اور سرکا اور کہا "جو کچھ تمہارے دل میں ہو مجھ سے کہہ ڈالو میں تم کو شانتی کا راستہ بتاؤنگا۔"

اس نے غیر متزلزل عقیدت کے لہجہ میں جواب دیا ـــ البتہ وہ کبھی کبھی الفاظ نہ پاکر رُک جاتی۔

"اگر آپ کا حکم ہے تو مجھ کو بتانا ہی پڑے گا۔ لیکن پھر بھی میں صاف طور پر سمجھا نہیں سکتی۔ آپ نے، گرو جی! سب کچھ تاڑ لیا ہوگا...................

میں ایک شخص کی دیوتا کے مانند پرستش کرتی تھی ـــــ عبادت کرتی تھی۔ میرا دل اُس کی انتہائی اُلفت کی مسرتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک رات میں نے سپنے میں دیکھا کہ میرے دل کا مالک ـــــ کسی مقام پر ـــــ ایک باغ میں ہے، میرا داہنا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں دبوچے ہے اور مجھ سے محبت بھری سرگوشیاں کر رہا ہے۔ یہ منظر میرے لئے بالکل تعجب خیز نہ تھا۔ سپنا غائب ہوگیا لیکن اُن کے تاثرات مجھ پر طاری رہے۔ دوسری مرتبہ جب میں نے اس کو دیکھا تو وہ پہلی مرتبہ کے برخلاف ایک دوسری روشنی میں تھا۔ سپنے کی مورت میرے دماغ پر مسلط رہنے لگی۔ میں دہشت کے مارے اس سے دور بھاگنے لگی لیکن وہ مورت میری نظروں میں چپک گئی ـــــ اُس وقت سے میرے دل کو شانتی نصیب نہیں ہوئی ـــــ میری اندر ہر چیز تاریک ہے۔"

جب وہ آنسو پوچھ پوچھ کر یہ دُکھ بھری داستان سُنا رہی تھی تو میں نے محسوس کیا کہ سنیاسی اپنے داہنے پیر سے میرے پتھر کی سطح پوری طاقت کے ساتھ دبا رہا ہے ـــــ وہ ضبط کرنیکی کوشش کر رہا تھا ـــــ

کسوم کی داستان ختم ہو چکی تھی۔ سنیاسی نے کہا "تم کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ تم نے کس کو اپنے سپنے میں دیکھا تھا؟"

اُس نے ہاتھ جوڑ کر لجاجت کی "میں نہیں بتا سکتی۔"

اس نے اصرار کیا "تم کو بتلانا ہی ہوگا کہ وہ کون تھا؟"

اُس نے اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے پوچھا "کیا مجھ کو یہ بتلانا ہی پڑے گا؟"

اُس نے جواب دیا "ہاں!"

بلبلا کر "تم ہی وہ ہو۔ گرو جی!" وہ منہ کے بل میرے پتھروں پر گر پڑی اور سسکیاں بھرنے لگی۔

جب ہوش میں آئی اور اُٹھکر بیٹھی تو سنیاسی نے آہستہ سے کہا "میں آج رات اس جگہ کو خیرباد کہہ رہا ہوں تاکہ تم مجھ کو کبھی نہ دیکھ سکو۔ سمجھو کہ میں ایک سنیاسی ہوں۔ اس سنسار سے کوئی علاقہ نہیں۔ تم کو چاہیے کہ مجھ کو بھول جاؤ۔"

کسوم نے نحیف آواز میں جواب دیا "ایسا ہی ہوگا گرو جی!"

سنیاسی نے اُٹھتے ہوئے کہا "میں رخصت ہوتا ہوں۔"

کسوم بغیر کچھ بولے قدم بوس ہوئی اور اُسکے پیروں کی خاک تبرکاً اپنے سر پر ڈال لی ـــ سنیاسی نے وہ جگہ چھوڑ دی۔

آفتاب غروب ہوگیا تھا۔ رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی۔ مجھکو پانی میں چھینٹے اُڑنے کی آواز سنائی دی۔ ہوا تاریکی میں بہک بہک کر چلنے لگی......

ربابِ شکستہ

میں آہ کر کے اپنے خیالوں میں کھو گیا کچھ ذکر تھا بہار و شبِ ماہتاب کا

آغازِ محبّت میں ناکام جُدا ہونا ایسا ہے کوئی جیسے مرجائے جوانی میں

وہ چاندنی میں تیرے تبسّم کی کہکشاں کیا ایک بار اور میسّر نہ آئے گی

نہ پونچھو میرے آنسو بس مجھے یونہی تڑپنے دو تم اتنے مہربان ہوتے تو دل کا خون کیوں ہوتا

لپکتے ہیں کیوں میری آنکھوں سے شعلے کوئی اور بھی آہ بیدار ہوگا

نالے تو کسی طرح روکے تھے مگر آہ آنکھوں سے ٹپکنے کو ہے اب راز کسی کا

کم ہوتی ہے نہ تڑپ دل کی تھمتے ہیں نہ بہتے آنسو ہی بجلی ہے کہ چمکے جاتی ہے بادل ہیں کہ برسے جاتے ہیں

روتا مجھے چھوڑ جانے والے کیا تجھ سے کہوں کہ حال کیا ہے
آنکھیں ہیں کہ آشیانِ ویران طائر جس میں سے اُڑ گیا ہے

"افسوس کہ تنگیِ وقت کے باعث ...... مگر تم مایوس نہ ہونا ..... خدا کو منظور ہے تو بہت جلد ......"

"پریم پجاری"

مُراسلات

مکرمی و محترمی۔ السلام علیکم۔

آپ مجھ سے ناواقف ہونگے لیکن میرا تعارف صرف اتنا کافی ہے کہ میں ساقی کا اُس وقت سے مداح ہوں جب میں نے کالج میں قدم رکھا۔ اُردو ادب کی جو بیش بہا خدمات ساقی انجام دے رہا ہے، میں اِس وقت اُس کا کوئی ذکر نہیں کرونگا بلکہ اس حقیقت کا اعتراف سینکڑوں اور انصاف پسند حضرات کی طرح میں بھی کرتا ہوں کہ ساقی نے دہلی ریڈیو اسٹیشن کی اصلاح کیلیئے جو کچھ کیا وہ ریڈیو کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اور میں یہ خط اِسی سلسلے میں تحریر کر رہا ہوں اِس اُمید کے ساتھ کہ ساقی کے گرانقدر صفحات میں کہیں جگہ پا جائیگا۔

دہلی ریڈیو نے ایک سلسلہ "اُردو نثر کی ترقی" نکالا ہے جس پر دو تین تقریریں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے دو کو مجھے بھی سُننے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک "افسانہ" پر، پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب کی نہایت عالمانہ اور تحقیق و تدقیق سے لکھی ہوئی تھی۔ دوسری کوئی صاحب آلِ احمد سرور ہیں، ان کی تھی۔ "ناول" پر، نہایت لغو اور ناقص۔ زیادہ تر انہوں نے وہی کہا جو دوسرے کہہ چکے ہیں گویا سرقہ کیا۔ مجھے نہیں معلوم آپ نے یہ تقریر سُنی یا نہیں[1] لیکن جب میں نے اُسے سُنا تو سخت کوفت ہوئی کہ "ناول" پر کس قدر گمراہ کُن اور واہیات تقریر ہے۔ میرے جن احباب نے اسے سُنا انہوں نے اس کے لئے مقرر سے زیادہ ریڈیو والوں کی لاعلمی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے متعلق ان حضرت کا فیصلہ ہے کہ اُن کے ناول وعظ اچھے اور قصّے بُرے ہیں۔ حالانکہ اپنے ادب کو مغربی معیار سے جانچنا پرلے درجے کی حماقت ہے، پھر آرٹ کے ساتھ اگر اخلاق مل جائے تو آرٹ کو بہتر بنا دیتا ہے، بد تر نہیں۔ لیکن ان بیچاروں نے یہ ساری عمر کبھی سُنا بھی نہ ہوگا۔ ایک اور بات سُنیئے، جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ فنی لحاظ سے اُردو کے اعلیٰ ناول نگار ڈپٹی صاحب تھے۔ مگر آلِ احمد صاحب یہ کیا جانیں؟ انہوں نے وہی ڈینگ۔ کی ہانکی ہے اور ابتدا میں ایسی داستانوں یا قصّوں کا ذکر کیا ہے جنہیں ناول نہیں کہا جا سکتا۔ ان "نقادِ ادب" کے مبلغ علم کا یہ حال ہے مرزا ہادی رُسوا کے ناول "اُمراؤ جان آدا" کا تو ذکر کیا مگر قاری سرفراز حسین مرحوم کے نام سے آشنا تک نہیں معلوم ہوتے ورنہ رُسوا سے پہلے قاری کا ذکر زیادہ ضروری ہے کیونکہ "امراؤ جان آدا"، قاری مرحوم کے شاہکار "شاہدِ رعنا" کے جواب میں لکھی گئی تھی اور اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ سرور صاحب نے اپنے "وسیع مطالعہ" کا رُعب منشی پریم چند کے ناولوں کا غیر ضروری اور بے موقع ذکر کر کے گانٹھا تھا۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ پریم چند جتنے کامیاب افسانہ نگار تھے، اُتنے ہی ناکام ناول نگار۔ ان سب باتوں سے قطع نظر حیرت یہ ہے کہ ناول پر تقریر ہوئی لیکن اُردو کے سب سے بڑے ناول نگار علامہ راشد الخیری مرحوم (جنکے ناول غیر فانی اور اُردو ناول کا بہترین سرمایہ ہیں) کے متعلق آخری پانچ سطروں میں صرف پانچ لفظ "راشد الخیری کے چند ناول" استعمال کئے گئے۔ بلاشبہ ان صاحب کی علمیت پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ ان کی کور مذاقی کا ثبوت تو یہی ہے کہ "لندن کی ایک رات" کو اس زمانے کا بہترین ناول قرار دیتے ہیں۔ یعنی ان کو یہ تک نہیں معلوم کہ ناول کہتے کسے ہیں۔ "لندن کی ایک" ایک طویل مختصر افسانہ ہے، ناول ہرگز نہیں۔ غرض تقریر کیا تھی کسی طفل مکتب نے ایک آدھ ناقص تاریخ اور دو چار کتب خانوں کی فہرستوں کو نقل کر کے سُنا دیا۔ افسوس اسقدر زبردست موضوع اور ایسی پوچ تقریر!

سرور صاحب کی اس سے پہلے بھی ایک آدھ بار تقریر سُنی اور ہر دفعہ مایوسی ہوئی۔ لیکن شکایت ان سے زیادہ ریڈیو والوں سے ہے کہ انہوں نے کیوں ایسے نااہل شخص کو تقریر کا انچارج مقرر کیا جو اُردو ادب سے ناواقف ہے اور جیسی بُری بھلی تقریر آتی ہے، پروگرام میں شامل کر لیتا ہے۔ میں نے ڈائرکٹر اسٹیشن اور تقریر کے انچارج کے نام علیحدہ علیحدہ شکایتی خطوط لکھے، کسی کو تسلی بخش جواب دینے کی ہمت (یا توفیق) نہیں ہوئی ہے۔ آج کل دورے پر ہوں ممکن ہے یہاں (شملے) جواب آنے میں تاخیر ہو گئی ہو، بہرحال دو چار روز انتظار کر کے کنٹرولر کو اس طرف متوجہ کرونگا۔

آپ سے بھی درخواست ہے کہ ایسی زبردست فروگذاشت پر ریڈیو والوں کی پرسش کریں۔ آپنے قلم روکا کہ پھر وہی بدعنوانیاں شروع ہو گئیں۔

مخلص محمود احمد خاں۔ بی۔ اے (آنرز)

[1] میں نے یہ تقریر نہیں سُنی۔ شاہد

—★—

نقد و تبصرہ

تمثیلی مشاعرہ۔ اس کے مصنف اُردو کے مشہور محقق جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ہیں۔ اس مشاعرے میں انہوں نے سودا، درد، میر، جرأت، مصحفی، نسیم، ناسخ، ذوق، مومن اور غالب کو جمع کرکے اُسے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ڈراما کی صورت میں پیش کیا جاسکے۔ نیز مصنف نے ہر شاعر کے کلام کی داد دیگر شعرا سے اپنے ذوق کے مطابق دلوائی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ مشاعرہ اُردو میں ایک نئی چیز ہے جس کے لئے کیفی صاحب تعریف کے مستحق ہیں۔ مگر جب ہم اس پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنے اچھے ادیب کے قلم سے اسقدر اسقام و اغلاط سے ملوث چیز کیسے نکلی۔

سب سے بڑی قابلِ اعتراض بات تو یہ ہے کہ کیفی صاحب نے متقدمین مثلاً میر، سودا وغیرہ کے کلام پر ردوقدح اور اصلاح فرمائی ہے۔ اس کے بعد دوسرے پہلو آتے ہیں۔ ابتدا میں "میر مشاعرہ" کا کردار بُری طرح کھٹکتا ہے۔ ایامِ گذشتہ میں "میر مشاعرہ" کے فرائض کم و بیش وہی تھے جو آج "صدرِ مشاعرہ" کے ہوتے ہیں لیکن تمثیل نگار نے اس سے "داعیِ مشاعرہ" کا کام لیا ہے جو گھڑی گھڑی شُعرا کے استقبال کیلئے (بجائے مسند نشیں ہونے کے) دروازے پر جاتا ہے۔ یہ نہ صرف مجلسی غلطی ہے بلکہ اس سے موصوف کی معلومات پر بھی حرف آتا ہے۔ بعض کرداروں کو پنڈت جی نے بڑے "پُر لطف" طریقے سے متعارف کرایا ہے، مثلاً سودا عالمِ برہمی و غضب میں آتے ہیں اور غصہ سے ہجو کا بستہ مانگتے ہیں، پھر خود ہی سنبھل جاتے ہیں، بس پاگل کی سی کیفیت دکھائی ہے۔ اس قسم کی اور بہت سی خامیوں کو چھوڑکر اب ذرا کیفی صاحب کی زبان ملاحظہ کیجئے جو انہوں نے ذوق و مومن جیسے اساتذہ کی زبان ظاہر کی ہے :۔

ایک جگہ ذوق سے کہلوایا ہے: "حضور کی حضوری اتنا وقت نہیں چھوڑتی کہ احباب کی ملاقات سے مسرت حاصل کروں۔" سُبحان اللہ کیا زبان ہے؟ کیا ہم اس پر فخر کریں؟ یہ ذوق کی زبان ہے یا کسی خانساماں اور انگریزی زدہ صاحبزادے کی؟ پھر یہ واقعتاً بھی غلط ہے، ذوق کی "حضوری" کم تھی اور اصلاح وغیرہ کی اپنی مصروفیت زیادہ۔ مومن سے کہلوایا ہے "کبھی تفتہ (مومن کا غالب کے ایک ادنیٰ شاگرد سے طرزِ تخاطب ملاحظہ ہو) ... کبھی کبھی اُردو پر بھی اپنی طبع وقاد کی روشنی ڈالا کرو۔" بیچارے مومن آج زندہ ہوتے تو اپنی گفتگو اور زبان کی اس ہیئت کذائی پر معلوم نہیں سر دُھنتے یا سینہ کوبی کرتے! اوّل تو مومن کی عظیم شخصیت سامنے رکھئے کہ اس مزاج اور طبیعت کا آدمی ایسی بیہودہ درخواست کیوں کرنے لگا؟ پھر یہ کہ مومن ایسے گرے پڑے نہ تھے کہ ایسے شخص سے جس نے کبھی اُردو میں شعر نہ کہا ہو یہ فرمائش کرتے۔ دوئم یہ کہ "روشنی ڈالنا" ٹھیٹ انگریزی ہے۔ مومن کے زمانے میں یہ محاورہ کسی نے سُنا تھا؟ سوئم یہ کہ "روشنی ڈالنا" کے معنی ہیں کسی شے کی وضاحت اور صراحت کرنا، شعر کہنے یا تصنیف کرنے کے معنی میں انگریزی میں بھی استعمال نہیں ہوسکتا۔ ایک جگہ ناسخ سا اُستاد کہتا ہے: "واللہ کیا مثنوی کہی کہ قلم توڑ دئے۔" تو صاحب، محاورہ ہے "قلم توڑ دیا"۔ دلّی والے جمع کے ساتھ کبھی نہیں بولتے۔ غرض زبان شاعر کے مخصوص رنگ اور اُس کی انفرادی طبع کے بارے میں کیفی صاحب نے بڑی بے احتیاطی برتی ہے۔ حالانکہ سارے "تمثیلی مشاعرے" میں یہی چیز کام کی تھی ــــ اور شروع میں ایک صاحب، پروفیسر کامل نے پیش لفظ (یعنی کیفی صاحب کی سخن فہمی اور ڈرامہ نگاری پر عجیب و غریب اور مضحکہ خیز طویل مقالہ، لکھکر تو کھوجڑا ہی کھو دیا۔

یہ جو کچھ لکھا گیا محض اس لئے کہ حضرت کیفی صاحب اُردو کے ایک بڑے عالم ہیں اور اس خاکپاک دلّی کے نام لیوا ہیں۔ جہاں زبان اور علم و عرفان کے چشمے بہے ہیں۔ نیز غیر زبان و بیان کر متذکرہ اشارے صرف نقاد اور مصنف کے لئے ہیں۔ کالجوں وغیرہ کے طلبار کے لئے یہ "تمثیلی مشاعرہ" خاصہ مُفید ہے اور شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے بھی یہ ایک خاصے کی چیز ہے۔ سائز ساقی کا نصف، صفحات سو سے زائد اور مجلد۔ کاغذ موٹا اور عمدہ۔ لکھائی چھپائی خوبصورت۔ قیمت عمر؍

ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو، دریاگنج۔ دہلی

"ص"

خواب کی دُنیا

خواب کی دُنیا۔ خواب کے حصے نے نفسیات میں ایک مستقل باب کی صورت اختیار کرلی ہے اور اس باب کو اُجاگر کرنے والا تحلیلِ نفسی کا باوا آدم ڈاکٹر فروآئیڈ ہے جس نے تجزیۃ النفس میں خواب و خیال کو بڑی اہمیت دی۔ زیرِ نظر کتاب خواب ہی کے متعلق ہے اور اس کے مؤلف مولانا عبدالمالک آروی ہیں۔ اس کتاب میں فروآئیڈ کی شہرہ آفاق تصنیف ——— (Interpretation of dreams) اور اس کے ضمن میں دوسرے ماہرینِ نفسیات کے نظریات کے علاوہ اپنے احباب کے اور مسلمان بزرگوں، بادشاہوں اور مختلف ممالک و اقوام کے خواب اور اُن کے متعلق واقعات بھی لکھے ہیں۔ "ماخذ" اور "مقدمہ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف نے بے شمار مصنفین کا مطالعہ کیا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن کم از کم Psycho- Analysis کو وہ (scientific student) کی طرح نہیں سمجھے۔ اتنا کچھ پڑھنے اور سوچنے کے بعد بھی اُنکا مفہوم اُلجھا ہوا اور خیالات مبہم ہیں۔ انشا، نہ صرف یہ کہ نتھری اور ستھری نہیں بلکہ معرب اور غیر فصیح ہے۔ لیکن اُن لوگوں کے لئے جو معرب و مفرس اُردو سمجھ سکتے ہوں اور خواب کی ماہیت کے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہوں، عبدالمالک صاحب نے مشاہیرِ مغرب و مشرق کے نظریات پیش کرکے خاصہ مواد بہم پہونچایا ہے۔ کتاب ۱۹۰ صفحات پر، خوبصورت کتابت طباعت کے ساتھ، اچھے کاغذ اور ساقی کے نصف سائز پر شائع ہوئی ہے۔ قیمت مذکور نہیں۔ ناشر۔ طاق بستاں۔ آرہ۔

جوہرِ تخلیق

جوہرِ تخلیق" اس نام سے سید محمد علی صاحب چشم نے ایرانی شاعری کے معلّمِ اوّل فردوسی کے شاہنامے کی جنگِ کاموس کشانی کو مختصر کرکے نظم میں ترجمہ کیا ہے مگر اختصار کی وجہ سے تسلسل کہیں نہیں ٹوٹنے دیا۔ ترجمہ بھی اچھا ہے، اصل کلام کی بہت سی خوبیاں اُردو نظم میں برقرار ہیں۔ البتہ کہیں کہیں فارسی حد سے زیادہ استعمال کی گئی ہے۔ ابتدا میں شاہنامے کا تعارف، اُس کی سرسری تاریخ، فردوسی کے حالات، شاہنامے پر ٹرنر میکن کا پڑھنے کے لائق تبصرہ اور خود اپنی (مترجم کی) "سخن فہمی اور شعر گوئی" کا ذکر ہے۔ بانگِ درا سائز۔ ۹۸ صفحات، لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ کتابت کی غلطیاں بعض مقامات پر ناگوار گذرتی ہیں۔ قیمت ۸؍

ناشر۔ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی

صادق الخیری

اُردو کی دو زندہ جاوید کتابیں

۱۔ انارکلی

سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے کا وہ معرکۃ الآرا المیہ تاریخی ڈراما جس کے محاسن کی پہنائی

۱۔ گورنمنٹ پنجاب نے مصنف کو ادبیات کا بیش بہا انعام دیا۔

۲۔ اُردو کے طالب علم جاپانیوں نے جاپان میں اسٹیج کیا۔

۳۔ اخبارات اور رسائل اور ریڈیو پر اتنے بہت مضامین نکلے جو موجودہ عہد کی کسی دوسری کتاب پر نہیں نکلے۔

۴۔ نقادوں اور ایکٹروں اور ڈائرکٹروں نے مُصنف کو ڈراما کے ایک عہدِ نو کا بانی قرار دیا۔

۵۔ مرزا محمد سعید ایم۔ اے۔ دہلوی تحریر فرماتے ہیں "انارکلی کی اشاعت ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے"

۶۔ سید سجاد حیدر یلدرم بی۔ اے: "ایک کتاب جس سے آنکھوں میں نور اور دل میں ہمدردیٔ عاشقِ مہجور پیدا ہوتی ہے"

۷۔ اے۔ ایس بخاری۔ ایم۔ اے (ریٹائرڈ) ڈپٹی کنٹرولر براڈ کاسٹنگ دہلی۔ "انارکلی اُردو ڈرامہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا"

۸۔ منشی پریم چند مرحوم: "مجھے جتنی کشش انارکلی میں ہوئی اور کسی ڈرامے میں نہیں ہوئی۔"

۹۔ عنایت اللہ خاں صاحب مترجم تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن: "یہ اُن کتابوں میں سے ہے اور ایسی کتابیں شاذ و نادر ہیں جنکو دیکھکر، پڑھکر اور اپنے پاس رکھکر ہمیشہ دل خوش ہوتا ہے اور انکو ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے" ہر عمر اور ہر مذاق کا شخص اسے پڑھتا اور بے اختیار سر دھنتا ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ۔ آرٹ کی رنگین تصاویر اور تزئینی نقش تیسرا اڈیشن قریب الختم قیمت فی جلد ۲؍ پُر تکلف اڈیشن دستخط شدہ مصنف ۵؍

۲۔ چچا چھکن

سید امتیاز علی صاحب تاج کے ظرافت نگار قلم کا وہ کامیاب کردار۔

۱۔ جس کے نام سے تعلیم یافتہ ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔

۲۔ جس کی کامیابی سے متاثر ہوکر اکثر ادیب اسی موضوع پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

۳۔ جسکے متعلق ایک اصلی یا نقلی مضمون شائع کردینا اکثر ادبی رسائل کے نزدیک اسکے خاص نمبروں کی کامیابی کا ضامن ہے۔

شستہ ظرافت جسے پڑھکر بچے بوڑھے عورت مرد لڑکے لڑکیاں سب لطف اٹھا سکتے ہیں قیمت ۱؍

ساقی بُک ڈپو دہلی کی دلکش کتابیں

سلامبو۔ دو ہزار سال پہلے قرطاجنہ کی تہذیب و معاشرت کے پس منظر پر حُسن و عشق کی خونیں داستان۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ قیمت ۳ے

نجم السحر۔ پانچ ہزار پہلے مصر کی شان و شوکت اور ایک ملکہ کی دلربا داستانِ عشق۔ ضخامت ۴۰۰ صفحے۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ ؍ ع

تائیس۔ سرزمین مصر کی عروسِ بازاری، نظر بھر کے دیکھنے سے جس کا حُسن میلا ہوتا تھا، اس کی عبرتناک داستان۔ ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ ع

ہیرودیاس۔ سلومی کا ناچ موت کا ناچ تھا۔ اُس نے پیغمبر یوحنّاں کا سر انعام میں مانگا اور اُس کے مُردہ لبوں کو چوما ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ ۱۲ر

چنگیز خاں کے سوانح حیات۔ خدا کا قہر چنگیز خاں کی صورت میں نازل ہوا۔ اس قہر اللہ کے حالات زندگی۔ ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ ۱۲ر

سحر بنگال۔ طاہرہ دیوی شیرازی کی دلکش نثر اور اچھوتے پلاٹ کے افسانوں کا مجموعہ۔ مجلّد ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

نرگس جمال۔ مورس مترلنک کی ایک رنگین تمثیل جس میں عشق و محبت پر بحث کی گئی ہے۔ مترجمہ شاہد احمد۔ مجلّد ۔۔ ؍ ؍ صہ

فاؤسٹ۔ شاعر کی مصوری اور مصور کی شاعری کی شہرہ آفاق کہانی۔ اُردو میں پہلی مرتبہ عام فہم پیرائے میں پیش کی گئی ہے ۔۔ ؍ ؍ عہ

سرگذشت عروس۔ دلہن کا روزنامچہ جس میں اُس نے اپنے دل کے تمام زخم کھول کر پڑھنے والے کو دکھا دئے ہیں۔ ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

پروین و ثریّا۔ بلجیم کے مفکرِ اعظم مورس ماترلنک کی دلدوز تمثیل جس میں محبت کا نازک موضوع پیش کیا گیا ہے مجلّد ۔۔ ؍ ؍ صہ

چندرا موہنی۔ انصار ناصری کا لکھا ہوا غمناک ناول جسے پڑھ کر آپ اپنے آنسو نہ ضبط کر سکیں گے ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ صہ

نجمہ نوری۔ ماں کی ممتا اس ڈرامے میں جس کامیابی کے ساتھ پیش کی گئی ہے کسی اور ڈرامے میں پیش نہیں کی گئی۔ ۔۔ ؍ ؍ ۱۲ر

سلمیٰ۔ شہرۂ آفاق آسکر وائلڈ کی تمثیل "سلومی" کا سب سے عمدہ ترجمہ۔ از انصار ناصری۔ مجلّد۔ ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ ۸ر

تعلیم زدہ بیوی۔ فضلِ حق قریشی کا لکھا ہوا ڈرامہ جس کو پڑھکر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔ عبرتناک بھی ہے۔ ۔۔ ؍ ؍ ۸ر

لال قلعہ کی ایک جھلک۔ سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے مغلیہ دربار اور محلات کے دلکش واقعات بیان کئے ہیں۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

دلی کا آخری دیدار۔ غدر سے پہلی کی دلی کی منہ بولتی تصویر آپ کو اس کتاب میں نظر آئیگی۔ یہ کہانی ایک شہزادی کی زبانی ہے ۔۔ ؍ ؍ ۱۲ر

اخوان الشیاطین۔ سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ۔ ایسے افسانے اُردو میں بالکل نہیں لکھے گئے۔ عجیب و غریب افسانے۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

عروسِ ادب۔ دل میں کھُب جانے والے افسانوں کا مجموعہ۔ تین سو صفحے کا مجموعہ۔ زبان نہایت سادہ اور صاف ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

جوشِ فکر۔ سلطان حیدر جوش کے نادر ترین افسانوں کا ترجمہ۔ زبان کی چاشنی اور خیالات کی بلندی ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

گناہ کی راتیں۔ عورت گناہ کرنے پر کس طرح مجبور ہو جاتی ہے؟ فطرتِ انسانی کے چند عبرتناک مرقعے۔ ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

یادِ رفتگاں۔ ہمشیرہ مشرف حسین کے لکھے ہوئے چند مؤثر اور دلکش مضامین۔ تخیلاتِ لطیف کا مجموعہ۔ ۔۔ ؍ ؍ ۶ر

ادب زرّیں۔ حجاب امتیاز علی کے مختصر مضامین۔ جن میں نفسیاتی تحلیل کے بے شمار نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ ۔۔ ؍ ؍ ۸ر

انقلاب ۵۷ء کا دوسرا رُخ۔ غدر میں ہندوستان پر جو جو ظلم ہوئے ہیں اُن کی تفصیل آپ کو صرف اسی کتاب میں ملے گی۔ ؍ ؍ عہ

خانم۔ دیورانی جٹھانی کی پُر لطف نوک جھونک۔ چغتائی صاحب کے پچیس دلکش مضامین۔ مجلّد سنہری ٹھپہ۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

کولتار۔ تھی تو بیچاری سانولی مگر شریر لڑکوں نے نام "کولتار صاحب" رکھدیا۔ پھر کیسے کیسے واقعات پیش آئے ہیں کہ ؍ ؍ عہ

کمزوری۔ عورت کی کمزور فطرت سے منہ زور مرد نے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور اس کی زندگی خراب کی۔ ۔۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

چمکی۔ عورت کی فطرت، جان جائے پر آن نہ جائے۔ غیرت اور شرافت کی منہ بولتی تصویر "چمکی" میں دیکھئے۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

رُوحِ ظرافت۔ "انگوٹھی کی مصیبت" اس کتاب کے آٹھ افسانوں میں سے ایک ہے۔ جس نے یہ افسانہ نہیں پڑھا اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ ؍ ؍ عہ

رُوحِ لطافت۔ "مہارانی کا خواب" اس کا پہلا افسانہ ہے۔ ایسا عبرتناک افسانہ آپنے آجتک نہیں پڑھا ہوگا۔ [illegible] مگر دلکش۔ ۔۔ ؍ ؍ عہ

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
فی پرچہ ۶؍

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت
بھیجا جاتا ہے

جرعات

جلد ۲۰ — ساقی دہلی۔ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء سنہ — نمبر ۴

خریداران ساقی سے گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ نیز پتہ خوشخط اور صاف تحریر کیا کریں۔ ورنہ تعمیل میں تاخیر کی شکایت سے معاف ؛

منیجر ساقی۔ دہلی؛

قیمت فی پرچہ چھ آنے ؛

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

اُردو کے مشہور رسالہ "ادبی دُنیا" لاہور نے اُردو کی جو قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں وہ ہمارے لئے باعثِ فخر ہیں اور جس عمدگی و شائستگی سے شائع ہو رہا ہے ہمارے لئے لائقِ رشک ہے۔ فلسفی ادیب منصور احمد مرحوم کے بعد کم توقع تھی کہ ادبی دُنیا اُسی شان سے شائع ہوتا رہے گا لیکن خدا کا شکر ہے کہ صلاح الدین صاحب نے اِس اندیشے کو غلط ثابت کر دیا۔ پرچہ اب بفضلہ بڑی آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے اور ترویج و ترقیِ اُردو کی نت نئی راہیں تلاش کر رہا ہے۔ چند ماہ ہوئے کہ "ادبی دُنیا" میں ایک نئے مستقل عنوان کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ عنوان ہے "دُنیائے ادب" اور اس کے ذیل میں اُردو کے تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ یہ بہت مفید تجویز ہے جس کے لئے ہمیں صلاح الدین احمد صاحب کا شکرگزار ہونا چاہیئے۔ انگریزی میں "دی لٹریری ڈائجسٹ" اور اسی طرح کے اقتباسی رسائل شائع ہوتے ہیں جن کا مقصد اعلیٰ درجے کے تازہ مضامین کو مختصراً پیش کرنا ہے۔ اُردو میں ایسا کوئی رسالہ شائع نہیں ہوتا۔ "ادبی دُنیا" میں دوسرے رسالوں کے خاص خاص مضامین نظم و نثر پر مبسوط تبصرہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ کس سالے میں کونسا مضمون کس پایہ کا شائع ہوا ہے۔ گویا ادبی معلومات کا ذخیرہ ہوتا ہے جس سے ہر صاحبِ ذوق کو مستفیض ہونا چاہیئے۔ اِسی عُنوان کے تحت چند پسندیدہ مضامین نقل بھی کئے جاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ ضروری سلسلہ جاری رہے گا اور اہلِ ذوق میں وقعت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

اُردو ہندی۔ زبان کا مسئلہ اب ادب کی حدود سے نکل کر سیاسیات میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کی تمامتر ذمہ داری گاندھی جی کے سر ہے۔ جنہوں نے "ہندی ہندُستانی" کی مضحکہ خیز ترکیب سے ہندُستانی کے طرفداروں کی آنکھیں کھول دیں۔ ہندستانی کے پردے میں ایک نقلی زبان اس طرح بنائی جا رہی تھی کہ آسان اُردو اور آسان ہندی کو سمو دیا جائے۔ اُردو والوں نے اِسے گوارا کر لیا اور اپنی زبان کو کافی حد تک مسخ ہو جانے دیا۔ مگر وار دھا کے مہاتما کو اس پر بھی صبر نہ آیا اور کھلم کھلا یہ اعلان کر بیٹھا کہ "اُردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان چاہیں تو اِسے زندہ رکھیں" یہ کہکر مہاتما جی ہندی ہندستانی کے ہو رہے۔ اُردو والوں کو فی الحقیقت گاندھی جی کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ اُن کے دل کی بات بے ساختہ زبان پر آ گئی اور ہمیں انہوں نے گویا جھنجوڑ کر جگا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم جاگ گئے اور اپنی زبان کی حفاظت کے لئے تیار ہو گئے۔ اور ہمارے ساتھ ایک بڑی تعداد ہندو حضرات کی بھی ہے کیونکہ ان کے آبا و اجداد نے چمنستانِ اُردو کو اپنے خُون سے سینچکر پروان چڑھایا ہے۔ اُردو کی ترقی میں ان کا تقریبًا برابر کا حصّہ ہے اور وہ اس قومی ورثہ سے کسی عنوان دستبردار ہونے کیلئے آمادہ نہیں ہیں۔

اُردو، ہندی اور ہندستانی کے مسئلہ پر آل انڈیا ریڈیو دلّی نے مُلک کے چھ سربرآوردہ حضرات سے تقریریں کرائی تھیں۔ ان چھ حضرات کے نام یہ ہیں:۔ ڈاکٹر تاراچند۔ بابو راجندر پرشاد۔ ڈاکٹر عبدالحق۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ پنڈت کیفی اور مسٹر آصف علی۔

ان چھ تقریروں میں ہر مقرر نے بقدرِ ظرف ہندستانی کی تعریف اور اس کا نمونہ پیش کیا ہے۔ حضرت ایم۔ اسلم نے اِن ہی چھ تقریروں پر اپنی گرانقدر رائے کا اظہار کیا ہے اور ایسی ایمان لگتی باتیں کہی ہیں کہ دل میں اُتر جاتی ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب ملک دین محمد تاجر کتب لاہور نے شائع کی ہے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ درجے کی۔ کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالبًا چار آنے کے ٹکٹ بھیجکر منگائی جا سکتی ہے۔ بہی خواہانِ اُردو کیلئے اس کتاب کا مُطالعہ ناگزیر ہے۔

شاہد

(بسلسلۂ گذشتہ)

سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی انچھر

مُسلمانوں کا اپنے راج میں یہاں والوں سے برتاؤ۔

آپ نے دیکھا؟ بدیسیوں نے دیسی بولی کی کیسی آؤ بھگت کی اور اُن کے بولوں کو اپنے یہاں جگہ جگہ کیسے کھپایا۔ پورے سنسار کا کونا کونا چھان ڈالیے۔ پر مسلمانوں کا سا سُتھرا پن، اُن کی سی دَیا اور اُن کا سا اچھا برتاؤ آپ کو کہیں نہ مل سکے گا۔ جس جگہ آپا دھاپی کا چکر چل رہا تھا، جہاں جھگڑے ٹنٹے کی کڑی دُھوپ سُکھ چین کو جلائے ڈالتی تھی۔ مسلمانوں کے راج کی چھاؤں جب تک اس جگہ نہیں آئی تب تک وہاں والے نچنت اور انند نہ ہو سکے۔

ان کا بڑھتا ہوا راج جس دیس میں لے گیا انہوں نے اس دیس اور دیس والوں کو اپنا سمجھا اور اپنی دیا سے اُن کے جی موہ لیے۔

دھیان کی آنکھوں سے دیکھیے۔ یہاں یہ نئے نئے آئے ہوئے۔ جی میں چونپ اور اُمنگ۔ راج ہاتھ باندھے ساتھ ساتھ۔ یہاں کا دھرم، بولیاں تہوار ان کے لیے سب نئے۔ پر انہوں نے دیس والوں کے دھرم، اُن کے لٹریچر اور اُن کے کلچر میں سے کسی ایک کو بھی مٹانا کیسا اور پھیلایا اور آگے بڑھایا۔ وہ بُری باتیں جو اُن میں جم گئی تھیں اُنہیں چھڑانے کے جتن کیے۔ انہیں لکھایا پڑھایا بھلا مانس بنایا۔ میل جول بڑھانے کے ڈھب بتائے۔ بھاری بھرکم بننے اور اپنے آپ کو لیے دیے رہنے کے گُر سکھائے اور پھر راج کی بڑی بڑی جگہیں اُنہیں دیدیں۔ یہاں کے راج پاٹ والے اپنے گھمنڈ میں جن جنتوں کو ٹھکراتے اور روندتے چلے آرہے تھے۔ دھرم کے پروہتوں نے جنہیں کتوں، بلیوں سے بھی گرا ہوا سمجھ کے اچھوت بنا دیا تھا اور وہ جن بندھنوں میں جکڑے ہوئے نڈھال پڑے تھے، مسلمانوں ہی نے ان سب بندھنوں کو توڑ تاڑ کے پھینکا۔ اور اپنے ساتھ لے اُنہیں ایسی چوڑی سڑک پر آگئے جس پہ بے روک ٹوک وہ جتنا چاہیں آگے بڑھ سکیں۔

مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہاں کا کیا ڈھچر تھا اور مسلمانوں نے اس دیس کو کیا سے کیا بنا دیا۔ اِسے مہاراشٹر کے بڑے لیڈر جسٹس راناڈے سے سُنیے:-

"اس زمانے کے ہندوؤں میں عملی قابلیت کا مادّہ نہ تھا اور خیالات باطلہ کی طرف عقیدہ جما ہوا تھا۔ ہندوؤں میں نہ تو جمہوری خیالات کا رواج تھا اور نہ مساوات انسانی کا۔ بے شمار فرقے عظمت اور ذلّت کے اَوج و حضیض میں گرفتار تھے۔ جس سے خواہ کتنی کوشش کریں نہ تو بڑھ سکتے تھے اور نہ موروثی عظمت سے گر سکتے تھے۔ ہندوستانی عورتیں بیکس و بے اختیار تھیں۔ عام ہندو میلے کچیلے رہتے تھے۔ پاکیزگی کا نام و نشان نہ تھا۔ عادتیں ردّی تھیں۔ چند خدا پرست برہمن بھی بجائے عملی نمونے کے لفاظی و لسانی کو برتتے تھے اور اس کو دانائی تصوّر کرتے تھے۔ ہندو سردار طمّاع اور ظالم تھے اور اجتماعی طور پر کوئی رفاہ عام کا کام نہیں کرتے تھے۔ بُزدلی، رذالت عموماً پائی جاتی تھی۔ پراگندگی اور انتشار بے شمار تھا۔ کوئی نظم و نسق نہ تھا۔ جنوبی ہند کی حالت اور ابتر تھی۔ مرد عورت سب وحشی، بے انتہا ذاتوں میں تقسیم، اپنے اپنے بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ ان کی قربانی دیتے تھے۔ عورتیں ستی ہوتی تھیں اور بعض ہندو مذہبی خیال سے گنگا میں ڈوب کر خودکشی کو مقدّس ایثار جانتے تھے۔ مندروں کے بُتوں کی گاڑیوں میں کچل کر جان دینا ذریعۂ نجات مانتے تھے۔

شمالی ہند اور جنوبی ہند کے ہندوؤں کی طرزِ معاشرت میں بھاری فرق پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کا فاتحانہ اور شاہانہ تعلق جنوبی ہند کی نسبت زیادہ رہا۔ اسی لئے شمالی ہند کے ہندو عموماً اسلامی معاشرت کے قالب میں ڈھل گئے اور لباس، صورت و شکل میں کسی ہندو خاندان اور شریف مسلمان میں برائے نام امتیاز رہ گیا۔ اور ہندوؤں کی معاشرت میں ایک حیرت انگیز انقلاب ہوا۔" (اخبار وکیل امرتسر۔ ۲۲ر اگست سنہ ۱۹۱۶ء)

بنگال کے ہندو لیڈر بابو بپن چندر پال کی لکھت بھی دیکھ لیجئے۔ وہ یہ لکھتے ہیں:-

"مسلمان اِس ملک میں فاتح بن کر آئے۔ مگر برطانوی روش کے خلاف اُنہوں نے ہندوستان کو بہت جلد اپنا وطن بنا لیا۔

اور مذہب کے سوا یہاں کے باشندوں میں اور اُن میں کوئی چیز مابہ الامتیاز نہ رہی۔ یہ مسلمانوں کی انتہائی ہمدردی اور خدا ترسی کا جذبہ ہی تھا جس نے ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک کی مذہبی زندگی اور خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور ایک فاتح کی حیثیت سے اس ملک میں داخل ہوکر ہزار ہا نفوس کی معاشرت و قلوب کو متاثر کئے بغیر نہ چھوڑا۔

اسلام نے یہاں آکر ہمیں جدید آئین و قوانین سے روشناس کیا۔ نئے طریقہائے انتظام بتائے۔ حکومت کے جدید اغراض مقاصد سے واقف بنایا اور ہندوستان کے مختلف افراد اور مختلف صوبوں میں ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جو پیشتر کی نسبت کہیں زیادہ وسیع سیاسی و اقتصادی مفاد و مقاصد کی حامل تھی۔ مسلمانوں نے انگریزوں کی آمد سے ایک مدت پیشتر ہی ہندوستان کی سلطنت کو منظم اور قوم کو متحد کرنے کا فخر و شرف حاصل کر لیا تھا۔ اسلام نے جب کچھ اقتدار حاصل کر لیا تو مسلمان غیر مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ اس رواداری کے ساتھ پیش آئے اور اُن کی آزادی اور حقوق کی محافظت کی جو دُنیا میں کی جا سکتی ہے۔" (پیام امن)

یہاں کے میل جول، بولیوں، لٹریچر پر مسلمانوں کی دَیا کی کہانی دکن کی ہندو لیڈر شریمتی نائڈو سے سُنیئے:۔

"اسلام کی حریت و جمہوریت آج سبق لینے کے لائق ہے۔ (جمہوریت میں سیاسی معنوں میں نہیں کہتی بلکہ عام معنوں میں بلاتخصیص) اسلام نے جب ہسپانیہ میں قدم رکھا تو ملکی عیسائیوں کو اُن کے دماغی، مذہبی اور روحانی ورثے سے محجوب نہ کیا۔ مفتوحین کو ہر قسم کی آزادی دی۔ عرب فوج یلغاریں مارتی ہوئی فرانس کے دروازے پر پہونچی تھی تو کیوں؟ کس لئے؟ فتح و ظفر و دولت کی غرض سے نہیں۔ ملک گیری اسلام کا عارضی مقصد رہا ہے۔ اس کا اصلی مقصد تھا حریت و آزادی کی اشاعت عمومی اور غلامی کا استیصال۔ آج کل ہم ملکی طاقت کے لئے مرتے ہیں اور علاقوں اور زمینداروں کا رونا روتے ہیں۔ مگر اسلام کا مطمح نظر کوئی صوبہ یا ملک یا خطہ نہ تھا بلکہ اس کا مقصد ساری دُنیا کی نجات تھا۔ مسلم داعی یہی دُھن لیکر ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے۔ کیا مسیحی مشنری ہندوستان میں صرف تبلیغ مذہب کا مقصد لے کر آئے ہیں؟ عربوں نے صرف ملک اور زمینیں فتح نہیں کیں۔ بلکہ دل و دماغ فتح کئے ہیں۔ انہوں نے قوموں کے لٹریچر اور خیالات کو متاثر کیا۔ زبان فارسی کو اس قدر شیریں، نازک و لطیف اور خوبصورت کس نے بنایا؟ اس آریائی و سامی اختلاط و امتزاج نے انہی عربوں کے فیضان نے فارس کو حافظ اور خسرو جیسے شعرا کی دولت بخشی۔

مسلمان بھائیو! ہمارے وہم و خواب (فلسفہ) کو حقیقت کا جامہ تمہیں نے پہنایا اور ہمارے افکار و تخیلات خالیہ میں حرکت و جان تمہیں نے ڈالی۔ آؤ ہم ناگوار تاریخی شکوہ و شکایت کو دلوں سے محو کر دیں۔ بُرائیاں بُھلا دیں اور ان احسانات کو یاد کریں جو اسلام نے ہماری زبان اور لٹریچر کے ساتھ کیا ہے۔ اسلام نے ہمیں ایک ایسی پیاری زبان (اُردو) بخشی ہے جو ہندو مسلم اتحاد کی ایک غیر فانی یادگار رہے۔ ہندوستان کے جس حصے میں چلے جاؤ تم قومی اتحاد کی یہ یادگار کسی نہ کسی حالت میں ضرور پاؤ گے۔

آپ حضرات جانتے ہیں کہ آپ (مسلمانوں) نے دُنیا میں علوم و فنون کی کیا خدمات جلیلہ کی ہیں۔ اخلاق، مردانگی و دلیری اور فیاضی ہمیشہ سے مسلمانوں کی قومی خصوصیات رہی ہیں۔ انہوں نے اشاعت علوم میں کبھی ہم ہندوؤں کی طرح بخل روا نہیں رکھا۔ یہ ہمیشہ بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں۔" (اخبار وکیل ۲۶ جنوری ۱۹۱۸ء)

پنجاب کے ایک ہندو مسٹر چونی لال آنند ایم۔ اے نے مسلمانوں کے برتاؤ پر جو کچھ لکھا ہے اُسے بھی دیکھ لیجیے:۔

"عربی جرنیل قاسم نے صوبہ سندھ پر حملہ کیا اور اُسے فتح کر لیا۔ قاسم سندھ میں زیادہ عرصے نہیں رہا۔ کیونکہ اُسے ۷۱۵ء میں حملۂ سندھ کے تین سال بعد واپس بُلا لیا گیا تھا۔ لیکن نیا صوبہ مختلف حالتوں میں سے گزرتا ہوا ۸۷۱ء تک عربی سلطنت کے ساتھ ملحق رہا۔ دیگر جگہ کی طرح ہندوستان میں عربی شورشیں دراصل توسیع سلطنت کے ارادے سے کی گئی تھیں اور اسلئے ان میں رعایا پر کوئی مذہبی تشدد نہیں کیا جاتا تھا۔ اپنے دیگر ہم وطن آدمیوں کی طرح قاسم جہنم رسید کرنے کی پالیسی پر یقین نہیں کرتا تھا۔ وہ ہندوؤں کی سوشل اور مذہبی رسوم و اعتقادات کی عزت کرتا تھا۔ اگرچہ اُس نے پیغمبر کے قوانین کے مطابق ان پر جزیہ لگا دیا تھا۔

ہندوؤں کو قانون کی ویسی ہی پناہ حاصل تھی جیسی کہ مسلمانوں کو تھی۔ ہندوؤں کی سوشل اور مذہبی رسوم میں کوئی مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔ وہ اپنے بتوں کی پرستش کرتے تھے اور اُن کے ایما پر اُن کے ذات پات کے قواعد کو بھی قواعد کا درجہ دیا گیا تھا۔ قاسم بُت شکن نہ تھا۔ نہ اُس کے بعد آنے والے امیروں میں کوئی تھا۔ توسیع سلطنت کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے لئے تمام سرکاری دفاتر کھول دئے گئے تھے۔ برہمنوں کو مالگزاری اور کلکٹری کے کاموں پر متعین کیا گیا تھا۔ اور قاسم نے وزارت کا اعلےٰ ترین عہدہ اپنے وقت کے مشہور ہندو فلاسفر مسمیٰ کاکسا کو عطا کیا تھا۔ عربوں کے ماتحت سندھ مذہبی آزادی کی سرزمین تھی۔"
(اخبار مسلم راجپوت، امرتسر ۲۳ مئی ۱۹۳۰ء)

مسلمانوں نے یہاں آکے کیا کیا اسے مسٹر رامس باسوایم۔ اے سے بھی سُن لیجئے:۔

"وہ درباروں میں ہندوستانی موسیقی کے لئے کیسا مذاق رکھتے تھے کس طرح انہوں نے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے عطا کر کے اپنی رواداری کا ثبوت دیا۔ کس طرح خود انہوں نے سیاسی اور مذہبی کتابیں لکھیں اور شہزادوں اور شہزادیوں کو مہذب اور متمدن ندیم رکھنے کی تربیت دی۔ اس طرح زمانہ گذشتہ کے ساتھ بڑی بے انصافی کی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مورخوں نے بعض حالات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہندوستان کی خوش قسمتی سے اب ہندو، مسلم اور عیسائی تمام فرقے کے فاضلوں نے اسلامی ہند کے مطالعہ کے لئے جدید وسائل معلوم کرلئے ہیں اور ہم مسلمانانِ ہند کے مختلف اور بیشمار تمدنی کارناموں سے واقف ہوگئے ہیں۔ اب ہم محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تمدن نے اِن باتوں کے ساتھ ملکر جو اُس نے ایشیا کے مغربی ممالک سے لی تھیں، ہندوستانی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر جدید اثرات ڈالے۔

پٹھانوں کی نیم وحشیانہ ابتدائی دور میں ہندوستانی مندروں، کتب خانوں اور صنعت و حرفت کے خزانوں کی تباہی کو نظر انداز کر دیا جائے تو مسلمانانِ ہندوستان اس ملک میں دوسرے ملکوں سے بہت سے جدید تُخم، خیالات اور اشیا لانے اور ہندوستان کے تنزل پذیر ہندوؤں اور اُن کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرنے پر بہت زیادہ تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔

بلند منارے، وسیع مسجدیں، شاندار محلات اور باغوں کی تفریح گاہیں یہ سب ظاہر کرتی ہیں کہ مسلمانانِ ہند، آرائش، نفاست اور شاندار عمارات کے بڑے شائق تھے۔ مغلیہ مصوّری ہندوستان کے مغل شاہزادوں کے لئے باعثِ شان و شوکت ہے اور انہوں نے ہندوستانی موسیقی کی بروقت اعانت کی اور اسے حاصل کیا۔ ورنہ اس کی ترقی غیر ممکن تھی۔"
(زمیندار ۱۹ اپریل ۱۹۲۵ء)

پروفیسر ایشوری پرشاد کی یہ لکھت بھی دیکھنے کی ہے:۔

"اسلامی فتوحات نے مختلف ریاستوں اور سلطنتوں کی بجائے جو ہمیشہ باہم دست و گریباں رہتی تھیں، ایک شہنشاہی اتحاد قائم کر دیا اور لوگوں کو یہ سکھلا دیا کہ وہ ایک ملک کے اندر ایک حکمران کی اتباع کریں جس سے ہماری قومیت کے ذخیرے میں رُوح اور سرگرمی کے اجزا کا اضافہ ہوا اور ایسی نئی تہذیب رواج پذیر ہوئی جو ہر طرح مستحق ستائش ہے۔ مسلمانوں کی رسوم و عادات نے اُونچی ذات کے ہندوؤں کی رسوم و عادات کو بہت کچھ اُبھارا اور جو لطافت اور نزاکت ہماری موجودہ سوسائٹی میں پائی جاتی ہے۔

سلاطین ہند کے بعض بڑے بڑے جرنیل اور وزرا ہندو رہے ہیں۔ یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ جو چیز اُصولاً جائز ہو عملاً اُس کا پیمانہ ہو۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کو ڈیڑھ صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ ہم میں فرطِ مسرت سے ایک دیوانگی سی آگئی۔ صرف اس لئے کہ ایک لارڈ سنہا کو ہندوستانی صوبے کی گدی پر جگہ دی گئی۔ لیکن مسلمانوں کے عہد میں مان سنگھ، جسونت سنگھ، جے سنگھ جیسے کتنے سنہا کہیں زیادہ بلند اور عظیم الشان عہدوں پر مامور کئے گئے۔ مذہبی رواداری جو دُور اندیشی اور فیاضی پر مبنی ہوتی ہے شاہانِ مغلیہ کا طریقِ حکومت تھا۔ نہ کوئی استثنا۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی تنگ نظری اور

مذہبی تعصب پر دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے ہیں۔ لیکن اس کے عہدِ حکومت میں بقول الفنسٹن ایسا کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ کسی نے ہندو مذہب کی خاطر سزائے جان و مال اور قید برداشت کی ہو۔ یا کسی شخص سے اس کی آبائی پرستش پر باز پرس کی گئی ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس متعصب شہنشاہ کے سب سے بڑے معتمد جنرل جسونت سنگھ اور جے سنگھ تھے۔ شیر شاہ پٹھان تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ اُس نے جو سلوک کئے وہ دیکھو۔ اس کا محکمۂ رفاہِ عام کافی مشہور ہے۔ جو میرے اظہارِ رائے کا محتاج نہیں۔ لیکن یہ بات شاید عام طور پر نہ معلوم ہو کہ اس نے جو بیشمار سرائیں اور مسافر خانے ملک بھر میں بنوائے تھے اُن میں ہندوؤں کے کھانے وغیرہ کا انتظام بھی نہایت بہتر تھا اور ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں اور مسلمانوں کا مسلمانوں کے ہاتھ میں۔ تاکہ کسی کے مذہبی جذبات میں ٹھیس نہ لگے۔

وہ زیادہ تر مسلمانوں کا طفیل ہے۔ مسلمانوں نے ملک کے طول و عرض میں ایک نئی زبان رائج کی جو اپنے اندر ایک حیرت انگیز ادبی ذخیرہ رکھتی ہے۔ انہوں نے شاندار اور خوبصورت عمارات تعمیر کر کے ہندوستان کے فنِ تعمیر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔"

(تاریخ ہند و قرونِ وسطیٰ)

سر پی سی رائے سائنسٹ یہ لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے کچھ ہی اسباب کیوں نہ ہوں۔ موجودہ زمانے میں وہ اس ملک کے اصلی باشندے اور مادرِ وطن کے حقیقی سپوت اسی طرح ہیں جس طرح ہندو۔

ہندو، مسلم صدیوں سے اس ملک میں بھائی کی طرح رہتے چلے آئے ہیں۔ ان کی زندگی ان کے مفاد اور ان کی خواہشات باہم اس طرح مل جل گئی ہیں کہ ان کا علیحدہ کرنا دشوار ہے اور اب یہ کہنا بے سود ہے کہ ہندوستان مسلمانوں کی سوتیلی ماں ہے اور ان کے حقیقی مفاد و تعلقات کسی اور ملک سے وابستہ ہیں۔ یہ صحیح نہیں کہ مسلمان ہندوستان میں آکر گھس گئے اور کچھ نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے یہاں کے فنِ تعمیر، موسیقی، ادب اور سیاسیات میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ہندوستان کی تربیت و تہذیب میں اسلام کی ذہانت و ذکاوت نے بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ وہ لباسِ زرّیں جو مسلمانوں نے ہندو دیوی کو پہنایا اگر اتار لیا جائے تو وہ کیسی بدنما نظر آنے لگے گی؟ اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس پر زیادہ کچھ کہنا بے سود ہے۔ قطب مینار، سکندرہ، تاج محل، کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

شیر شاہ کے متعلق دو انگریزی مورخین کی رائیں نقل کرنی کافی ہونگی۔ مسٹر ڈبلیو کروکس لکھتا ہے کہ شیر شاہ پہلا شخص تھا جس نے ایک ایسی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی جو رعایا کی مرضی پر مبنی ہو۔ مسٹر کین نے یہ لکھا ہے کہ کوئی حکومت حتیٰ کہ برطانیہ بھی نہیں جس نے اس پٹھان کی طرح دانشمندی کا اظہار کیا ہو۔

سلاطینِ مغلیہ کے جانشینوں کے متعلق میرے خیال میں تزین کی رائے کافی ہوگی۔ مصنف مذکور انٹونائن کے عہد کے متعلق لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ ٹرین، اینٹونینس، پیس اور مارکن جیسے رعایا پرور سلاطین کا باہم سلسلہ مغلوں کی تاریخ کے علاوہ اور کہیں نہ ملے گا جس میں بابر، ہمایوں اور اکبر جیسے شہنشاہ یکے بعد دیگرے ہوئے۔ ہندوؤں کے ہزار برس کی ذات پات کے رواج کو توڑنے میں اسلامی جمہوریت نے بہت مدد دی اور ہندو سوسائٹی میں بے تعصبی و روشن خیالی کا قوی جذبہ بھی پیدا کیا۔ بنگال کی وشنو تحریک اسی اثر کا نتیجہ تھی۔"

(اخبار نجات بجنور۔ ۱۵ فروری ۱۹۲۳ء)

پروفیسر ٹی ایل وسوانی ایم۔ اے کو دیکھئے یہ کیا کہتے ہیں:۔

"یہ کہنا ہرگز مبالغے میں داخل نہیں کہ ہندوستان کے خیال و نیز طرزِ معاشرت میں اسلام نے نمایاں اضافہ کیا ہے۔ اس مذہب نے ہندوستان میں قومیت کی بنا ڈالی اور اس خطۂ زمین کے فلسفہ، شاعری، فنِ تعمیر و دیگر علوم کو اپنی غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت سے چار چاند لگا دئے۔ چنانچہ تاج محل سے زیادہ خوشنما اور دلکش عمارت خیالی دنیا میں بھی اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اسلام

نے مساوات اور جمہوریت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا۔ گو ہندوستان و دیگر ممالک کے مسلمانوں سے اس کی پابندی نہ ہو سکی۔ مگر یہ یاد رہے کہ رسم غلامی پر پہلی ضرب حضرت عمرؓ خلیفہ دوم کے دستِ مبارک سے پڑی۔ جب بیت المقدس پر آپ نے غلاموں کی عام آزادی کا اعلان فرمایا۔ شہنشاہ اکبر نے ہندوستانی قومیت اور ہندوستان کی عظمت کا جو معیار پیش نظر رکھا تھا اُسکے پورا کرنے میں ہمارے انگریز فرمانروا قاصر رہے۔ پندرہ اور سولہ صدی کی اصلاحات جو گرو نانک اور کبیر کی تحریکات کی صورت میں رونما ہوئیں۔ اسلام سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور اکثر مسلمان درویش مثلاً تبریز ملتانی یا سیوان کے لال شاہ باز ابتک ہنود کو تسخیر کئے ہوئے ہیں۔" (مسلم راجپوت، امرت سر ۱۴ جولائی ۳۶ء)

مسٹر مکندی لال۔ بی۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لا کی یہ لکھت بھی دیکھئے:۔

"نوواردمسلمان بادشاہوں نے دستکاری کی طرف خوب دھیان دیا۔ اُنہوں نے ہندو کاریگروں اور مصوروں کو نوکر رکھا اور ان سے نئے نئے محل، مسجدیں اور مقبرے وغیرہ بنوائے۔ ہندوستان میں فنِ تعمیر کا نیا باب شروع ہوا۔ اور آجکل جو مشہور عالم مسجدیں، مقبرے اور قلعے وغیرہ ہندوستان میں نظر آتے ہیں وہ اسلامی تہذیب ہی کا پھل ہیں۔ ہماری نگاہ میں سب سے زیادہ اثر اسلامی حکومت کا ہندوستان کی مصوری اور فنِ تعمیر پر پڑا اور اس سے بڑا فائدہ ہوا۔ ہندوؤں کا فن مصوری قریباً مفقود ہو چکا تھا۔ نئے نئے محل، قلعے اور بڑی بڑی عمارتیں مُبت اور مندر بننے بند ہو چکے تھے۔ اگر مسلمان یہاں نہ آتے تو ہنر مندی قطعی مفقود ہو جاتی۔

لٹریچر کی ترقی بھی مسلمانوں کے عہد میں بہت زیادہ ہوئی۔ البیرونی نے جو احسان دُنیا اور ہندوستان پر لٹریچر کے ذریعے کیا اُس کا ذکر ہم مختصراً کر چکے ہیں۔ کئی مسلمان بادشاہ خود بھی صاحب تصنیف تھے اور اُن میں سے اکثر کے درباروں میں کئی ایک ادیب اور شاعر رہتے تھے۔ اس زمانے کے مشہور مسلمان ادیب حسن دہلوی، منہاج السراج، ضیا برنی اور مولانا عمرانی تھے۔ کئی مسلمان پنڈت سنسکرت کے بھی بہت بڑے فاضل تھے۔ سنسکرت میں قومی اور مذہبی لٹریچر کی اس وقت بڑی ترقی ہوئی۔ کئی اعلیٰ پیمانے کے ناٹک بھی لکھے گئے۔ رامانج کا برہم سوتر پارتھ سارتھی حسٹر کی کرم میمانسا، جے دیو کا گیت گووند، جے سنگھ سوری کا ہمیتر مدھردن۔ اور حسین شاہ کے وزیر، روپ گوسوامی کے للت ادھو کی تصنیف اسی زمانے میں ہوئی۔ وگیانیشور کی مت آکھشرا اور جیموت واہن کے دا ئے بھاگ بھی اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ کلہن نے اپنی مشہور تواریخ بھی اسلامی عہد میں ہی تصنیف کی۔ جین مذہب کے عالموں نے بھی کئی کتابیں لکھیں جن میں سے مشہور مصنف ہیم چندر ہے۔

ہندی زبان کی تنظیم بھی اسلامی عہد میں ہوئی۔ اس وقت کے مسلمانوں میں سب سے مشہور فاضل امیر خسرو کی تصانیف میں ہندی کے کچھ لفظ پائے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے عربی کی طرح ہندی کو بھی ایک اعلیٰ درجے کی زبان تسلیم کیا ہے۔ ان کی رائے تو یہاں تک تھی کہ ہندی ایران کی اعلیٰ درجے کی فارسی سے بھی اچھی ہے۔ ان کی رائے میں ہندی عربی کی طرح باقاعدہ زبان تھی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندی استعارات و مجازات سے مزین ہے۔

بنگال میں بھی اس وقت لٹریچر کی بڑی ترقی ہوئی۔ کیرت داس کی یہ بنگلا رامائن چودھویں صدی میں سنسکرت سے بنگلا میں ترجمہ ہوئی۔ نصرت شاہ کے ایک درباری ملی گھروشو نے بھاگوت کے دسویں اور گیارھویں کانڈوں کا ترجمہ کیا اور حسین شاہ کے ایک جنرل پرگل خاں کے کہنے پر کوینڈر پرمیشور نے مہابھارت کا بنگلا میں ترجمہ استری پرب تک کیا۔ اسی طرح مرہٹی زبان کی بھی اس زمانے میں خوب ترقی ہوئی۔

اِس مختصر سے مضمون میں ان تمام اُمور کے ذکر کی گنجائش نہیں۔ جن کی ترقی یا آغاز مسلمانوں کے آنے سے لیکر پندرھویں صدی کے آخر تک ہوئی۔ پس وہ زمانہ بھارت کی پستی اور تنزل کا زمانہ نہ تھا۔ بلکہ اُٹھنے اور ترقی کرنے کا تھا۔ ہندو تہذیب بوسیدہ طاقت اور زندگی سے خالی ہو چکی تھی اور اُسے بیرونی رگڑ کی سخت ضرورت تھی اور وہ ضروری دوائی جو

ہندوستان کو کمزور سے مضبوط بنانے وہ مسلمانوں کے حملوں اور یہاں حکومت کرنے سے حاصل ہوگئی۔

آج کل کے مغربی علما ہندوستان کے اُس زمانے کا مقابلہ موجودہ ترقی یافتہ ممالک سے کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اِس وقت کے ہندوستان کا مقابلہ اُسی زمانے کے یورپ سے کریں تو پروفیسر ایشوری پرشاد کے الفاظ میں ہمیں ناظرین کو یاد دلانا ہوگا کہ اس وقت یورپ میں رومن کیتھولک لوگوں نے بڑے بڑے ظلم اور سفاکیاں کیں۔ خیالات کی آزادی اور مذہبی حریت کا تو گلا ہی گھونٹ دیا گیا تھا۔ مگر مسلمان اس بات میں مغربی اقوام سے کہیں اچھے تھے۔ جس وقت اسپین کے بادشاہ فلپ دوم نے اعلان کیا تھا کہ آزاد خیال "ہیرے مانک" لوگوں پر حکومت کرنے سے حکومت نہ کرنی ہی اچھی ہے۔ جس وقت ولایت میں مہارانی ایلزبتھ آئرلینڈ کے رومن کیتھولک عیسائیوں کو تنگ کر رہی تھی، ان پر ظلم وستم ہو رہے تھے، اُس وقت شیر شاہ اور اکبر جیسے مسلمان بادشاہ مذہبی بردباری اور رواداری سے کام لے رہے تھے اور غیر مذاہب اور غیر مسلم اقوام میں باہمی میل ملاپ کا جذبہ پیدا کر رہے تھے۔ اسلامی حکومت کے زمانے میں آج کل کی طرح ہندوؤں کی بہادری اور مردانگی مفقود نہ تھی۔ ہندو راجے سردار اور زمیندار اُس وقت کے مسلمان حاکموں سے ہمیشہ لڑنے کو تیار رہتے تھے اور لڑتے بھی تھے، مگر ملک کی دولت ملک ہی میں رہتی تھی۔

مسلمان بادشاہ کتنے بھی عیاش اور فضول خرچ کیوں نہ ہوں مگر پھر بھی جو کچھ خرچ کرتے تھے وہ سب ملک ہی میں رہتا تھا۔ ہندوستان کی بے شمار دولت لُٹ جانے پر بھی اس وقت مدار زندگی ملک میں کافی تھا اور ملک سُکھی دھن دھان سے معمور تھا، اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اُس زمانے کے مسلمان حکمران اور بادشاہ غیر مہذب اور لٹیرے تھے، بالکل جھوٹ ہے۔

[illegible] زمانے میں [illegible] اور علاء الدین خلجی جیسے حکمرانی کے اصولوں سے واقف اور ہمہ صفت موصوف پیدا ہوئے۔ علم دوست فاضل محمد تغلق اور ابراہیم شاہ شرقی اور امن پسند حکمران ناصر الدین تغلق اور الغ خاں، جعفر خاں، ملک کافور جیسے کئی ایک بہادر اور جرنیل بھی اسی زمانے میں پیدا ہوئے۔ ہندوؤں کے آخری زمانے کے سب سے بڑے مصلح رامانند، چیتن، کبیر اور نانک جنہوں نے قوم اور مذہب کی کایا پلٹ دی اسی زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔ جس قوم میں ایسے دیندار مذہبی ریفارمر کلجگ میں بھی پیدا ہوں وہ قوم تنزل پہونچی ہوئی قوم نہیں کہلا سکتی۔

جس ملک میں حاکمانہ اختیار رکھو بیٹھنے پر بھی ایسے روحانی مرد پیدا ہوں وہ ملک مستقبل سے خالی نہیں ہو سکتا جس حکومت میں ایسے آزاد خیالات کی اشاعت اور اس کی تعلیم دینے والے پیدا ہوں اور نئے روادار مذاہب کا ظہور ہو۔ اس اسلامی حکومت کو رعایا کو دُکھ دینے والی، مذہب کی دشمن، غیر مہذب اور جابر کہنا گویا تاریخی واقعات پر پردہ ڈالنا ہے۔"

(رسالہ سرسوتی۔ الہ آباد)

جل تھل بھرنے والے بادل جیسے پھلواری اور گھورے پر ایک سا برستے ہیں، ایسے ہی مسلمانوں کی دیا کی گھٹائیں دیس کے اونچے گھرانے کے ہندوؤں اور ان کروڑوں سانس لینے والوں اور اچھوتوں پر جنہیں دیس والے ٹھکرا چکے تھے ایک سی برسیں۔ اِسی بات کو پروفیسر ٹی آرنلڈ یوں لکھتے ہیں:۔

"داعیانِ اسلام جب بنگالے میں پہونچے تو نیچ ذات کے ہندو اور وہاں کے اصلی باشندے جو ہندوؤں کے مذہب سے قریب قریب خارج سمجھے جاتے تھے اور اپنے آرین سرداروں کے ہاتھوں سے طرح طرح کی ذلتیں اور اذیتیں اُٹھاتے تھے، مسلمانوں کی طرف ہاتھ پھیلا کر بڑھے۔ ان لوگوں کے نزدیک جن میں مفلس مچھلی پکڑنے والے اور شکاری اور قزاق اور دنی قوم کے کاشتکار تھے۔ اسلام ایک اوتار تھا جو اُن کے لئے آکاش سے اترا تھا۔ وہ حکمراں قوم کا مذہب تھا اور اس کے پھیلانے والے وہ باخدا لوگ تھے جو توحید اور سب انسانوں کے برابر ہونے کا مژدہ ایسی قوم کے پاس لائے تھے جس کو سب لوگ ذلیل وخوار سمجھتے تھے۔"

(پریچنگ آف اسلام صد ۲۹۸)

مہاشا سنت رام بھی یہی کہتے ہیں:-

"شمال مغرب کی طرف سے اسلام کا حملہ ہوا۔ ہندو لوگ جات پات اور اونچ نیچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹے پڑے تھے۔ ان کو ایکتا میں باندھنے والا ایک بھی سوتر اور دھاگا نہ تھا۔ پس وہ اس حملے کی تاب نہ لاسکے۔ اسلام ان کروڑوں اچھوتوں اور شودروں کے لئے رحمتِ ربانی تھا۔ وہ ان کو انسانی مساوات کا حق دیتا تھا۔ پس یہ لوگ جوق جوق مسلمان ہوگئے۔"

مسلمانوں کے آنے سے پہلے دیس میں بیوپار اور ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا ایسا بھی نہ تھا جو کوئی اُسے دیکھ سکے۔ مسلمانوں نے ہندوستان کو ایسا بنا دیا جو پورے یورپ کی اِدھر ٹکٹکی بندھ گئی تھی۔ بابو بنکم چندر اپنی لکھت "شہنشاہ اکبر" میں یہ لکھتے ہیں:-

"بادشاہ اکبر نے صنعت و حرفت کو بھی بڑی ترقی دی تھی۔ ہندوستان کی ہر قسم کی دستکاری کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ دریاں بنانے کے لئے بہت سے مقامات پر سرکاری کارخانے قائم کئے گئے تھے۔ سرکاری کارخانوں میں ایسی خوبصورت دریاں، ٹوپیں اور بندوقیں تیار ہوتی تھیں کہ غیر ملکی سیاح دیکھکر دنگ رہ جاتے تھے۔ بادشاہ نے ہندوستان میں ریشم اور پشمینے کے کپڑے بنانے کے کام کو بھی بہت ترقی کی حالت کو پہونچایا تھا۔ کشمیر اور لاہور میں شال بنانے کی دستکاری کو بڑھانے کے لئے کئی تجاویز عمل میں لائی گئی تھیں۔ سینکڑوں سرکاری کارخانوں میں بہت سی چیزیں سرکاری خرچ پر تیار ہوتی تھیں۔"

یہ بات چھڑی ہے تو ایک آدھ اور بھی اسی لپیٹ میں مسٹر ہین کی یہ لکھت بھی دیکھ لیجئے:-

"۱۸۳۵ء تک روئی کے کپڑے کسی خاص صوبے میں ہی نہیں بنتے تھے۔ بلکہ سارے ہندوستان میں بنائے جاتے تھے۔ یہاں روئی اتنی ہی پیدا ہوتی تھی جتنا غلہ پیدا ہوتا ہے۔ بنگال عمدہ اور نفیس ململوں کے لئے مشہور تھا۔ کارومنڈل کے ساحل کا ملک عمدہ چھینٹوں کے لئے مشہور تھا۔ سورت کی مشہور اور پائدار کپڑے کیلئے خاص شہرت تھی۔ مچھلی پٹم میں بہت اچھے رومال بنتے تھے۔ دریائے کرشنا کے کنارے کے علاقے میں اعلیٰ درجے کے رنگ تیار ہوتے تھے۔ چھینٹوں کے تیار کرنے میں مچھلی پٹم کی بڑی ناموری تھی۔ اسکے علاوہ ہندوستان کا بنا ہوا اور کئی قسم کا کپڑا یورپ اور ایشیا کے بازاروں میں مشہور تھا۔ ہندوستان کی نہایت ہی ملائم اور باریک ململوں کے بارے میں یورپ کے بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہوگیا تھا کہ یہ انسانی ہاتھ سے نہیں بن سکتیں۔ بلکہ مکڑی جیسے کسی کیڑے کی بناوٹ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔"

ڈینئیل ڈفو کا یہ ٹکڑا بھی دیکھنے کا ہے:-

"اہل انگلستان ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑوں کی خواہش کرتے ہیں۔ ہندوستانی چھینٹیں اور چھپے ہوئے کپڑے پہلے فرش بنوانے کے کام آتے تھے۔ مگر اب ہمارے ملک کی شریف زادیاں تک انہیں پہننے لگ گئی ہیں۔ اَوروں کا تو ذکر ہی کیا خود انگلستان کی ملکہ بھی چائنا سلک اور ہندوستان کی چھینٹیں پہننا پسند کرتی ہیں۔ اس وقت چاروں طرف ہندوستانی کپڑا نظر آرہا ہے۔ ہماری نشستگاہوں میں، چھپر میں، ہمارے مکانوں کے لگے ہوئے پردوں میں، ہمارے بچھونوں اور تکیوں میں، ہماری بیویوں اور بچوں کی پوشاک میں غرضکہ چاروں طرف ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑے نظر آتے ہیں۔ تقریباً سارے کا سارا کپڑا ہندوستان ہی سے آتا ہے۔" (بھارت درشن ص۱۶۱)

مسلمانوں کے راج میں یہاں پڑھائی گھر کتنے تھے۔ اس کے لئے گاندھی جی کا بنارس والی اسپیچ کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا دیکھ لیجئے:-

"برٹش گورنمنٹ کی آمد سے قبل ملک میں تیس ہزار مدرسے تھے۔ جن میں دو لاکھ طلبا تعلیم پاتے تھے۔ آج حکومت دفتری بمشکل کچھ ہزار مدرسوں کا حوالہ دے سکتی ہے۔" (اخبار مسافر آگرہ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء)

یہاں جگہ نہیں۔ نہیں تو انہی باتوں پر ہندوؤں ہی کی اور ایسی بہت سی لکھتیں نکل سکتی ہیں۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا اس سے کہیں بڑھکر مسلمانوں کا یہاں کے بُرا ئیاں کرنے والوں کے ساتھ اچھائی اور سچائی کا برتاؤ ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا راج اپنے سے کسی کو بڑا ہوا دیکھ نہیں سکتا اور ناک چنے چبوا دیتا ہے۔ مسلمانوں کی بڑی راجدھانی میں اپنی اپنی جگہ کس کس نے راج کی جڑ کھوکلی کرنیکے جتن نہ کئے۔ مسلمان چاہتے تو اُن کی ہوں پر گھرانے کے گھرانے مٹ مٹا کے رہ جاتے۔ اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔ لہو کی ندیاں بہنے لگتیں۔ چھوٹے بڑے سب تلوار کے گھاٹ اتار دئے جاتے۔ پر مسلمان

راج نے جنہیں آپ آگے بڑھایا تھا اُنہی پر ہاتھ اُٹھانا اچھا نہ جان کے ان سے پوچھ گچھ تک بھی نہ کی۔ مبارک شاہ خلجی نے خسرو خاں آریا کو آگے بڑھا کر اور اس پر بھروسا کر کے اپنی راجدھانی اُس کے ہاتھ میں دیدی تھی۔ اُس نے مبارک شاہ کے ساتھ کیا کیا؟ اسے ایک ہندو نے اپنی لکھت "بھارت ورش کا اتہاس" میں یوں لکھا ہے:-

"۱۳۱۶ء میں علاء الدین مرگیا تو اُس کی جگہ مبارک تخت پر بیٹھا۔ لیکن تمام کاروبار خسرو خاں نامی ایک نیچ قوم کے آریا کے ہاتھ میں تھا۔ اس شخص نے پہلے ملک کافور کو مروایا۔ بعدازاں مبارک کو قتل کر کے خود تختِ حکومت پر بیٹھا۔ یہ شخص اگرچہ مسلمان ہو گیا تھا مگر دل میں وہ آریا ہی تھا۔ شاید اُس نے اس طرح دہلی میں آریا حکومت قائم کرنے کا منصوبہ باندھا ہو"

ہیمو بقال بھی اپنے اَن داتا کا بہت منہ چڑھا تھا اور جتنا اُسے مسلمان راج نے آگے بڑھایا اتنا ہی یہ جی ہی جی میں راج کا الّو بنکر چپکے چپکے دلّی میں ہندو راج کی نیو رکھنے کے جتن کرتا رہا۔ اسی دُھن میں دھوکے کا جال بچھا کے پہلے اپنے اَن داتا کو ٹھکانے لگایا اور پھر کیا کیا اسے پروفیسر بال کرشن ایم۔ اے سے سُنیے:-

"آگرہ اور دہلی جیت لئے اور وکرم ادتیا کے خطاب سے دہلی میں اپنا راجیا تلک لگایا" (بھارت ورش سنکشپت اتہاس جلد دوم)

وہ تو کہیے اکبر کے راج نے اُنہیں پاؤں پھیلانے نہیں دئے۔ نہیں تو ہیمو جی بڑی دون کی لیتے اور آگے بڑھکر نجانے کن بانٹوں سے راج کو تولتے۔

پرتھوی راج کو اکبر کی دیا نے کہاں سے کہاں پہونچایا۔ مہارانا پرتاب کو جب اکبر نے نیچا دکھا کے گھیر لیا اور اُس نے ہار مان کے ہتھیار ڈالدئے تو راج سے دیا چاہنے اور پھر کبھی راج سے نہ پھرنے کے لئے مہارانا پرتاب نے بہت گڑگڑا کے اکبر کو لکھا۔

"وہ خط اکبر نے اپنے وزیر پرتھوی راج کو دکھلایا۔ پرتھوی راج نے کہا کہ یہ خط جعلی ہے اور خود پرتاب کو ایسا خط لکھا جو ذومعنی تھا۔ مطلب یہ تھا کہ ڈٹے رہو ہارو نہیں آخر کامیاب ہو گے" (بھارت ورش کا اتہاس صفحہ ۱۰۴)

مان سنگھ کو کس نے مُنہ لگایا اور آگے بڑھایا؟ اکبر نے۔ اس نے کیا کیا؟ راج کمار کو بہکا کر اور بیٹے اور باپ کو لڑا دینے کے جتن کرنے سے بڑھاپے میں اکبر کو بہت دکھ دیا۔ پر اکبر نے اس سے کچھ نہ کہا۔

جوہر مل کو جہانگیر نے اپنے اوپچیوں کا جنرل بنا کے کانگڑے پر دھاوے کیلئے بھیجا۔ یہاں سے تو یہ چپ چاپ چلا گیا۔ پر وہاں پہونچتے ہی راج سے پھر گیا اور راج کے لاگوؤں سے جاملا۔

شاہ جی، سیواجی کا باپ دکن کے مسلمان راج کو ٹھکرا کے اورنگ زیب کے پاس چلا آیا اور پھر اسے بھی دھوکا دیا۔

جے سنگھ کا راتوں رات اپنا پڑاؤ چھوڑ کر نکل جانا کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ سب جانتے ہیں۔ جس رات یہ اپنی چھاؤنی چھوڑ کر نکلا ہے یہ وہ رات تھی جس کا سویرا ہوتے ہی گھمسان کی لڑائی ہونے والی تھی۔ ایسی بُری گھڑی میں پرایوں سے بڑھکر اپنوں نے توتے کی سی آنکھیں پھیر لیں۔ اورنگ زیب نے یہ سب دیکھا پر کچھ نہ کہا۔

جسونت سنگھ کو بڑی جگہ دینے والا کون؟ یہی عالمگیر۔ پر اورنگ زیب نے اُس کے ساتھ جتنا اچھا برتاؤ کیا اتنا ہی یہ جی ہی جی میں مسلمان راج مٹانے اور ہندو راج بنانے کی اُدھیڑبن میں لگا رہا۔ "بھارت ورش کے اتہاس" کا لکھنے والا کھلم کھلا اسی جسونت سنگھ کے لئے یہ لکھتا ہے:-

"جسونت سنگھ دل سے سیواجی کی ترقی چاہتا تھا"

کسی دیس میں باہر سے آئے ہوئے اپنا راج پھیلائیں اور اُسے اپنی راجدھانی بنائیں۔ دیس والوں کے دھرم اور لٹریچر کو ہاتھ تک نہ لگائیں اور دیسیوں پر اپنی دیا کا مینہ برسائیں۔ اپنے راج کی بڑی بڑی جگہیں دیکر انہیں لاج والا بنائیں۔ یہ سب کچھ ہونے پر بھی دیسی ان راج پاٹ والوں کی گھات میں لگے رہیں اور اُنہیں نیچا دکھلانے کے جتن سوچا کریں۔ یہ بات یونہی تو اٹکل پچو سی دکھائی دیتی ہے۔ پر جب یہاں کا وہ سماں دھیان کی آنکھوں سے دیکھئے جس میں پورا دیس کن کن بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا تو پھر یہ بات اوٹ پٹانگ نہیں رہتی۔

ہندوستان میں اُونچے نیچے گھرانوں کا اَل بل، آپس میں اُن کا برتاؤ اور چھوت چھات کی پھٹکار یہاں کب سے چلی آرہی ہے۔ بڑے بڑے راجا مہاراجا دھرم کے پروہتوں کے ہاتھ میں تھے اور انہی کے کہے پر چلتے تھے۔ شودر اور برہمنوں کو جوتے کے تلے رکھنا دھرم کی بڑی سیوا سمجھی جاتی

تھی۔ پروہتوں نے انہیں دودھ کی مکھی بنا دیا تھا اور پورا دلیر انہیں ٹھلا تا اور روندتا چلا آرہا تھا جو مسلمان لائے۔ انہوں نے چھٹائی بڑائی اور چھوت چھات کو برا سمجھا۔ سب کو ایک آنکھ سے دیکھا اور سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کیا۔

برہمن اور اونچے ٹھہرانے والے ہندو جو اونچ نیچ اور چھوت چھات کو ٹھیٹ دھرم سمجھے ہوئے تھے انہیں مسلمانوں کا سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ بہت کھلا۔ راج سے کھلم کھلا تو کچھ نہ کہہ سکتے تھے، پر جی ہی جی میں اونٹ اونٹ کے رہ جاتے تھے۔ اسی لئے ان میں سے جب کسی کو کوئی ایسی گھڑی، ہاتھ آجاتی جس میں یہ اپنے جی کی بھڑاس نکال سکیں تو کبھی چھپواں اور کبھی دن دہاڑے یہ مسلمان راج کی جڑ کھوکلی کرتے اور اس کی جگہ ہندو راج کی نیو رکھنے سے نہیں چوکتے تھے اور یہ دھیان تو بھول کر بھی نہ آتا تھا جس راج کو ہم مٹانا چاہتے ہیں اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا اور ہمیں کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

ہندوؤں نے جو کچھ بھی کیا۔ پر مسلمان راج نے پلٹ کر یہ بھی نہ پوچھا، تمہارے منہ میں کے دانت ہیں اور تو اور یہاں کی بولیوں در لٹریچر ہی کو دیکھ لیجے۔ مسلمانوں کے جی میں کچھ بھی کھوٹ ہوتی تو اپنے ایسے راج میں جسکے سامنے گابھنی گا بھ ڈالتی تھی دیس کی بولیوں کو مٹا کے رکھ دیتے اور ان کی جگہ اپنی ہی بولیوں کو بڑھاتے اور جی بھر کے پھیلاتے۔

آج ہندی، گجراتی، بنگالی، پنجابی لٹریچر کی جو بڑھت تیزی دکھائی دے رہی ہے یہ سب مسلمانوں ہی کے سہارے اور انہی کے بل بوتے پر۔ یہ بھی ہندوؤں کی سی چپ سادھ لیتے تو نہ جانے اب تک ان کی کیا گت بن چکی ہوتی۔ ہندوؤں نے اپنے راج میں کبھی انہیں منہ بھی نہ لگایا اور انہیں اس گوں کا بھی نہ سمجھا جو وید تو وید ان بولیوں میں رامائن اور مہا بھارت ہی کو لے آتے۔

(باقی۔ باقی)

سید ابو القاسم سرور

نغمۂ نور

سکوں نصیب ہوا اضطراب ختم ہوا
مری حیات کا پُرکیف باب ختم ہوا

نگاہِ ناز نے جھک کر بتا دیا سب کچھ
سوال ہو بھی نہ پایا جواب ختم ہوا

حدوں میں آگئی آلامِ عشق کی دنیا
خدا کا شکر غمِ بے حساب ختم ہوا

بجز الم کے نہیں کچھ مسرتوں کا مآل
جو خواب دیکھ رہا تھا وہ خواب ختم ہوا

وہ ایک رات محبت کی بن چکی رنگیں
سحر کو دورِ شبِ ماہتاب ختم ہوا

تری نظر جو اٹھی میری آنکھ بھر آئی
ترے سوال کے صدقے جواب ختم ہوا

کسی کی پھر گئی مجھ سے نگاہِ عشق طلب
مرے لئے تو محبت کا خواب ختم ہوا

میں اس نظر کے تصدق میں اس نظر کے نثار
کہ اس نظر سے جہانِ خراب ختم ہوا

خیالِ مے ہی سے مدہوش میں ہوا اے بہزاد
کسے خبر ہے کہ جامِ شراب ختم ہوا

بہزاد لکھنوی

گلبانگِ حیات

جُنوں سامانیاں میری نہ لا سکتی تھیں رنگ ابتک
مرا مسکن رہا تھا گوشۂ تاریک و تنگ ابتک

بھروسہ تھا ازل سے مجھکو جس کی "بے خطائی" پر
نکالا ہی نہ تھا ترکش سے میں نے وہ خدنگ ابتک

نظر کے دُور بیں ہونے پہ تھا مجھکو یقیں لیکن
نہ اُترا تھا مرے پہلو کے آئینے سے زنگ ابتک

فضائے کہکشاں اک عمر سے تھی منتظر جس کی
اسیرِ خاک تھی میری وہ "شاہینی اُمنگ" ابتک

میں اپنی ذات ہی سے آج تک دست و گریباں تھا
مرے اپنے ہی گھر میں گویا جاری تھی جنگ ابتک

تعجب ہے ندیمِ قیس ہو کر کھا گیا دھوکا!
رہے تھے مانع دیوانگی کیوں نام و ننگ ابتک

اہیں پھرتا تھا جسنے لامکاں کے کونے کونے میں
بندھے تھے کیوں گرہ میں اُسکی خاک و خشت و سنگ ابتک

امین حزیں
(سیالکوٹی)

چھ درویش

(سماجی انقلاب کی ایک مجلس)

پہلی شام

رمضان کی ایک شام۔ کالج ہوسٹل۔ قریشی کا کمرہ ایک درجن نوجوان طلبہ تیزی اور خاموشی سے پانچ منٹ تک خوانِ یغما پر ہاتھ اور مُنہ مارتے مارتے ذرا ڈھیلے پڑتے ہیں اور آوازیں شروع ہوتی ہیں۔

احمد۔ یارو افطار تو بڑا زوردار ہے۔ طالب علمی کی زندگی میں تو کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔

صغیر۔ جیسے آپ بڑے مسکین روزہ دار ہی تو ہیں۔ دن بھر پانچ کتّوں کی خوراک کھا کر ہمارے ساتھ افطار کرنے بیٹھے ہیں، اور کھانے پر یوں گرے پڑتے ہیں جیسے بیچارے دو روز کے فاقہ کش ہیں۔ قریشی تم نے ان حرام خوروں کو بلا کر ہمارے روزے بھی گندے کئے۔

احمد۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہم حرام کھا رہے ہیں۔ تم نے پہلے کیوں نہیں کہدیا؟ تم دو تین گدھوں کے سوا ان میں روزہ دار، اور آپ کے حسابوں افطار کا حقدار ہے کون؟ اور ان کے روزوں کی حقیقت بھی مجھ سے چھپی نہیں۔

زکی۔ کیا کیا؟ بتا دے بھیّا۔ یہ قریشی دینِ اسلام اور دینِ فطرت کے ناموں سے ہر وقت اور بے وقت ہم پر رعب گانٹھا کرتا ہے۔ اور صغیر دو چار پاروں کا حافظ یعلمون تعلمون حلق سے نکالنا کیا سیکھ گیا جب دیکھو امام غزالی بنا ہوا ہے۔

احمد۔ نمک کھاتے ہوئے نمک حرامی کو جی نہیں چاہتا، نہ میں خسارہ سہنے کو تیار ہوں۔ کھانے سے فراغت کر کے چائے پر بتاؤں گا۔ وہ دیکھو اتنی سی گفتگو سے بھی بڑا خسارہ ہو گیا۔ ملگوچھیاں سلیم نے پے در پے اپنے فراخ گلپھڑے میں اتار لیں اور رس ملائی کے سہ دو گولے انصاری صاف نگل گیا۔

(چائے کا دَور چلتا ہے۔)

احمد۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم میں کوئی ایسا سپوت تو نہیں جس کی اماں بارہ کتوں کی پُر تکلف خوراک اس دریا دلی سے افطار کے لئے بھیجیں۔ اور اتنی نمائش کے ساتھ۔ یہ چاندی سونے کے ورق، پستے، بادام، کھوپرے کی رنگا رنگ ہوائیاں۔ تم قیاس کر سکتے ہو کہ معاملہ کیا ہے؟۔

سلیم۔ بھئی یہ تو مجھے بھی کھٹک رہا ہے۔

انصاری۔ ہاں یارو ہے تو کچھ دال میں کالا کالا۔

قریشی۔ ابے چنے کی دال پر سیاہ مرچیں چھڑکی ہوئی تھیں اور کیا کالا کالا ہے، تو اتنا بھی نہیں جانتا کبھی روزہ رکھا ہو اور چنے کی دال کھائی ہو تو جانے۔ کرستان کہیں کا!

انصاری۔ احمد بھئی اس مومن کے روزوں کی حقیقت جلد کھولو۔ یہ بہت مُنہ آ رہا ہے۔

احمد۔ بات یہ ہے کہ قریشی کے ایک رشتہ کے خالو ہیں۔ بڑے متشرع ملّا اور دولتمند۔ ان کی ایک ہی لڑکی ہے۔ بڑے بڑے تعلقہ داروں اور اعلیٰ عہدہ داروں کے ہاں سے پیغام آتے ہیں، مگر اُن کی دینداری کے معیار پر کوئی لڑکا نہیں اُترتا۔ قریشی کی تلاوت قرآن اور روزوں نمازوں کی عمر یکسالہ ہے۔ بس بات پکّی سمجھو۔

قریشی۔ تم لُچّے ہو۔

احمد۔ سچ کہو یہ خوان تمہاری خالہ کے ہاں سے نہیں آتے؟

قریشی۔ بیشک۔ یہ کونسی انوکھی بات ہے؟ تمہارے جیسے نالائقوں کا کوئی چاہنے والا بزرگ نہ ہو تو میرا کیا قصور؟

احمد۔ اچھا تو جواب دو۔ نمبر ایک، احسن بھی تمہاری ان شفیق خالہ کا حقیقی بھانجہ ہے اور تم دُور کے۔ اُس کے گھر بھی کبھی یہی افطار آیا؟۔ نمبر دو، یہ طلائی نقرئی ورقوں اور رنگین ہوائیوں کی نمائش گھروں میں عزیزوں کیلئے بھی ہوتی ہے؟ نمبر تین، تمہیں سچ کہدو، روزہ رکھکر جُھوٹ نہ بولنا، تمہاری نسبت اُن کے گھر قرار نہیں پائی؟

(سب قریشی کا مُنہ تکتے ہیں۔ قریشی ایک منٹ خاموش رہتا ہے پھر کچھ بولنا چاہتا ہے۔)

چچپا:- دیکھو رمضان میں جھوٹ کو افطار میں شامل نہ کرنا عیب ہی کیا ہو۔ بڑی مسرت کی خبر ہے۔ اللہ ایسی سسرال سب کو نصیب کرے۔

انصاری:- اور بیوی خواہ کیسی ہی ہو؟

احمد:- اور کیا؟ عجب بیوقوف معلوم ہوتے ہو۔ کس صدی کی باتیں کرتے ہو؟ بیوی ایک ضمنی اور فرعی سوال ہے۔ عورت کا ہونا کافی ہے۔ سوال کچھ معشوق چننے کا تھوڑا ہی ہے۔ بیوی اور معشوق دو مختلف جنسیں ہیں جو ہندوستان میں کبھی اکٹھی نہیں ہوا کرتیں۔ جبھی تو معشوق کی ضرورت ہم خفیہ پوری کر لیتے ہیں اور بیوی کی علانیہ۔

قریشی:- یہ تمہارا ذاتی تجربہ ہوگا یا ــــ

احمد:- پھر منہ کھلواتے ہو۔ تم دولت کے سوا کس چیز سے بیاہ کر رہے ہو؟ میاں صغیر، جمیل، سلیم، انصاری، جیلانی، اور کتنے نام گناؤں؟ یہ ہمیں ایمانداری سے بتا دیں کہ ان کا معاشی مدار ان کے والدین پر کتنا ہے، اور سسرال پر کتنا؟ آج یہاں ہم ایک درجن احباب جمع ہیں۔ ان میں نصف درجن شادی شدہ ہیں، ایک کے گلے میں یہ رسی پڑا ہی چاہتی ہے، باقی پانچ شاید آزاد ہیں۔ کیوں نہ آج اس مہتم بالشان سماجی مسئلہ کا حل ہو جائے؟ اس طرح کہ سب اپنی اپنی بیوی کا تازہ خط پڑھیں۔

زکی:- ہاں بھئی یہ زور کی رہی۔ میں تائید کرتا ہوں۔

قریشی:- صدر میں ہوں۔ میری اجازت کے بغیر یہ تحریک اور تائید کیا معنی؟ اچھے آئے لوگوں کی بیویوں کے خط سننے۔ یہ شوق ہو تو جاؤ، "دلہنوں کی ڈائری"، روزنامچے، بازاری افسانے پڑھو، سینما میں یہ شوق پورا کرو۔ تم نے یہ غلط حلقہ تاکا ہے۔

احمد:- میں کہتا ہوں تم سب شادی شدہ لوگ اپنی بیویوں کے غلام ہو، اُن کی نظروں میں تمہاری کوئی وقعت نہیں۔ ان میں سے اکثر پھوہڑ، بدسلیقہ، بدمزاج، بھونڈی یا ناتندرست دائم المرض ہیں۔ ان کی دولت نے تمہیں پھانس لیا ہے یا تم نے اُن کو پھانس کر مفت کی دولت حاصل کی ہے۔ میرے دعوے کے ثبوت تمہاری جیبوں یا اٹاچیوں میں موجود ہیں۔ عدالت سے میری درخواست ہے کہ ان کو ان دستاویزوں کے حاضر کرنے یا خانہ تلاشی سے برآمد کرنے کا حکم صادر کرے۔

قریشی:- فریق مخالف کے پاس کیا جواب ہے؟

صغیر:- ہمیں عذر نہیں۔ صرف ایک ہفتہ کی مہلت چاہیئے ہے۔

چچپا:- جی۔ تاکہ آپ ایک ایک من مانا مسودہ گھر بھیجکر اپنی اپنی بیوی سے اسکی نقل منگوالیں اور ہم پر ان کی زلیخا منشی جما دیں۔ اس کی سہی نہیں۔ بس جو خط موجود ہیں ایمانداری سے نکال کر حاضر کیجئے۔ (سنجیدہ شکل بنا کر) دل لگی برطرف۔ شریف بیویوں کے خطوط ہیں، بازاری عورتوں کے نہیں۔ یقیناً ان میں کوئی بات شرم و حیا کے خلاف نہ ہوگی۔ کم سے کم میرا مقصود دماغی عیاشی یا آپ کی تضحیک نہیں۔ بلکہ میرے خیال سے یہ غیر شادی شدہ جوانوں کیلئے سبق آموز اور خرد افزا ہونگے۔ مذاق مذاق میں ہم نے سماج کی ایک دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ وقت کی ایک بہت بڑی سماجی اصلاح کیلئے بیویوں کے خطوط کیا ہیں، ہمیں کوئی قربانی بھی کرنا پڑے تو دریغ نہ رکھنا چاہیئے۔

(چچا کی سنجیدگی اور لہجہ کی رقت سب کو متاثر کر دیتی ہے)

قریشی:- میرا فیصلہ ہے کہ یہ مبارک کام ضرور انجام پائے۔ احباب اپنی بیویوں کے خطوط سے محظوظ نہیں مستفیض کریں۔

دوسری شام

بعد افطار۔ احمد کا کمرہ۔ پہلی شام کے احباب کے علاوہ
چند ہندو طلبہ بھی موجود ہیں۔

چچپا:- دوستو ہم جس غرض سے یہاں جمع ہوتے ہیں وہ آپ کو معلوم ہے۔ آج چار درویش کی کہانیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ چار کے عوض چھ درویش ہونگے۔ ایک خیال جو ہنسی کھیل میں پیدا ہوا تھا آج کسی قدر سنجیدگی سے اس پر غور کرنے اور عملی قدم اٹھانے کا موقع حاصل کیا جاتا ہے۔ اکثر بڑے بڑے کاموں کا آغاز حقیر، اتفاقی، بے ارادہ، بے معنی تفریح اور دل لگی میں ہوا ہے اور انجام عظیم الشان محیر العقول، انقلاب انگیز۔ خدا کرے ہمارے ہنسی کھیل کا نتیجہ بھی ایسا ہی ہو۔

پہلے میں اُن احباب کے شکریہ کی تجویز پیش کرتا ہوں جنہوں نے ایک بلند مقصد کی خاطر از راہِ قربانی اپنی بیگموں کے نجی خطوط بے تامل میرے حوالے کر دئے (تالیاں)، میں ایک ایک خط پڑھونگا اور مکتوب الیہ صاحب اپنی اپنی ازدواجی سرگزشت سے اسکی تشریح فرمائیں گے۔ (تالیاں)

(چچا ایک خط نکال کر پڑھتے ہیں)

ـلـہ عمر میں ساتھیوں سے کچھ زیادہ ہیں۔ ایک ہم جماعت ــــ رشتہ کا بھتیجہ ہے۔ نیک اور خاموش ہیں۔ فرنچ کٹ ڈاڑھی کے گنہگار بھی ہیں اس لئے چچپا کے لقب سے مشہور ہیں۔

"متواتر تین خط ملے۔ میری سہیلی جہاں آرا کی شادی تھی۔ جواب کی فرصت نہ ملی۔ نہ کوئی خاص بات قابلِ تحریر تھی۔ ہر طرح خیریت ہے۔ اتنی دریافتِ خیریت اور پریشانی کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ پوجا کی چھٹیوں میں اماں (ساس) نے رخصتی کیلئے لکھا تھا۔ امّی جان نے جواب دیا ہے کہ تمہیں تعطیل یہاں گذارو تو زیادہ بہتر ہے۔ اگر اماں نے تمہارے ایما سے یہ خط لکھا تھا تو تعجب ہے۔ کیونکہ یہ پہلے ہی طے پاچکا تھا کہ تمہاری فراغتِ تعلیم اور حصولِ ملازمت تک رخصتی نہ ہوگی۔

" ایک سو روپیہ کل ابا نے بیمہ رجسٹری سے روانہ کیا ہے۔ امتحان یونیورسٹی کی فیس اور دوسرے مطالبات کی رقمیں داخل کرنے کی تاریخ سے مطلع کرنا وقت پر وہ بھی پہونچ جائیں گی۔"

اب پہلے درویش جمیل صاحب جن کے نام یہ خط ہے اپنی سرگزشت بیان کریں۔

جمیل:۔ دوستو۔ میں ایک عالی نسب مگر غریب خاندان کا فرد ہوں۔ ہماری ساری آبائی جائداد دو بہنوں کی شادی میں بہنوئیوں کے مطالبات کی نذر ہوگئی۔ والد صاحب سکریٹریٹ میں کلرک تھے۔ دو یتیم بھتیجوں اور بھاوج کی پرورش کے علاوہ ایک بھتیجے اور میری تعلیم کا بارِ گراں انکے سر تھا۔ انٹرمیڈیئٹ میں پہونچتے ہی میری شادی کے پیام آنے لگے۔ ان میں ایک ذی ثروت لڑکی والے کی ڈاک سب سے اونچی تھی۔ میرا نیلام اسی کے نام پر ختم ہوا۔ انہوں نے مطالبات شادی کے علاوہ پانچہزار نقد اور میری بقیہ تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کا ذمہ لیا۔ گھر کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے کوئی تعرض نہ کیا۔

شادی ہوئی۔ مداراتیں ہوئیں۔ دونوں طرف سے لڑکی والوں ہی کا خرچ تھا۔ برات دھوم سے نکلی۔ سارا شہر، قصبات کے سارے رشتہ دار، شناسا و ناشناسا، سینکڑوں مہمان تھے۔ نکاح ہوا۔ جہیز بھی شاندار ملا۔ زیورات کے علاوہ سامانِ خانہ داری اور فرنیچر اتنے تھے کہ میرے گھر میں اُن کی گنجائش نہ تھی۔ سب کچھ دیا مگر پانچ ہزار نقد نہ دیئے قصہ بڑھا، قضیہ طول کھینچا، دلہن کو رخصت نہ کرلے جانے کی دھمکی دی گئی۔ مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ لوگ نازپروردہ بیٹی کو غریب خانے میں جانے دینا پسند کب کرتے تھے۔ برات دلہن کے بغیر لوٹی۔ ابّا طلاق کی دھمکی زبان پر لاتے لاتے رک گئے۔ پچاس ہزار دین مہر جس کا نصف بھی پچیس ہزار کا بھاری پتھر ہوتا ہے لب پر مُہر لگادی۔ آخر مجھے سسرال جانے سے روک دیا۔ مشکل سے ایک مہینہ رکا ہونگا کہ اوّل تو دلہن کا شبِ عروسی کا حُسن و جمال دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ ہمارے ہاں رونمائی اور خلوت نکاح کی رات میں عروس کے گھر میں ہی ہوجاتی ہے، آخر وہ میری دُلہن تھی، ملنے کیلئے دل بہانے ڈھونڈھنے لگا۔ دوسرے بعض رشتہ کے سالے جو میرے ہم جماعت تھے مجھے اپنے گھر لے گئے اور دُلہن سے ملا دیا۔ پھر میں ابا سے پوشیدہ وقتاً فوقتاً سسرال آنے جانے لگا۔ مداراتیں رہیں، خاطر داریاں ہوئیں، مختلف تقریبوں سے سینکڑوں روپے ملتے رہے۔ آخر ابا کو پتہ چل گیا۔ چپکے رہ گئے۔ مگر مجھ سے کچھ کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ امّاں نے بیچ بچاؤ کی بہتیری کوشش کی مگر ان کے دل سے کھٹک نہ گئی۔ اماں بہو کے دیکھنے کو تڑپا کیں، ابا کے خوف سے نہ اُن کو بلا سکتی تھیں، نہ آپ سمدھیانے جاسکتی تھیں۔

میں نے آئی۔ اے پاس کیا اور ابا کو دفعتاً نمونیہ ہوگیا۔ رحلت فرماگئے اور شاید کدورت ساتھ لیتے گئے۔ ساس سسرے آئے اور بیٹی کو ہمراہ لائے۔ امّاں غمزدہ اور بے حواس تھیں۔ کارخانہ میری ساس نے اپنے ہاتھ میں لیا، قرآن خوانی، فاتحہ، چہلم سب اپنے خرچ سے پورے تکلف اور نمائش سے انجام دئے اور بیٹی کو لئے گھر واپس گئیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ہمارا گھر کیسے چلے۔ میری ساس نہایت محبت سے میری والدہ اور سارے متعلقین کو اپنے گھر اٹھ چلنے کی دعوت دیتی گئیں۔ اماں نے اسے گوارا نہ کیا۔ اب میں یہ سوچنے لگا کہ تعلیم کا سلسلہ موقوف کرکے کوئی کام دھندہ دیکھوں۔ یہ سسرے کو گوارا نہ تھا۔ ایک دن مجھے بلاکر نہایت شفقت سے کہنے لگے :۔

" میں نے شادی میں تمہیں پانچ ہزار نقد دینے کا جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا نہ کیا، جس کا بھائی صاحب مرحوم (والد) کو مرتے دم تک ملال رہا۔ اللہ مغفرت کرے وہ میرا عذر اور عندیہ نہ سمجھ سکے۔ مگر اب تم سمجھ سکتے ہو۔ میں نے یہ رقم کچھ تو لی تھی مگر بجبر و اکراہ۔ یہ نہیں کہ ادا نہ کرسکتا تھا بلکہ بلاتقریب و توجیہہ محض تلک کے طور پر ایک سو بھی دینا یا داماد کی قیمت ادا کرنا برداشت نہ تھا، نہ کسی باعزت، غیور، شریف آدمی کو گوارا کرنا چاہیئے۔ تم نے دیکھا میں نے کسی تکلف میں کمی نہ کی۔ تم لوگوں کی توقع سے زیادہ جہیز تحائف اور دوطرفہ اخراجات شادی میں اُٹھا دئے۔ رسوم شادی کے طور پر یہ پانچ ہزار گنوانا میں نے اصولاً اور طبعاً شرمناک محسوس کیا تھا۔ مگر میں اپنی زبان پر قائم ہوں۔ ادا کرنے کو تیار ہوں۔ اتنا ہی نہیں، زیادہ۔ اس شکل میں کہ ماہوار تمہاری والدہ کو ایک معین رقم ادا کرتا رہوں۔ اُمید ہے کہ انہیں اپنی باقی کی واجب ادائی کی یہ صورت

قبول کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ رہے تمہاری تعلیم کے اخراجات، یہ اس کے علاوہ ہوں گے کیونکہ اس میں کم و بیش میرا ذاتی مفاد شامل ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے خسر ایک شریف خاتون کے نازک احساس کو خوب سمجھتے تھے۔ اماں کو اعانت قبول کرنے پر آمادہ کرنے کو یہ منطق پیدا کی تھی۔ ورنہ پانچ ہزار یا دو ہزار یا سات ہزار کی کوئی قید باقی نہ رہ گئی تھی۔ ان کی منطق کام کر گئی۔ اماں کو اعانت کے نام سے نفرت تھی، وصولی قرض کے نام پر راضی ہو گئیں اور گھر چلنے لگا۔ واقعی جیسا میر صاحب نے کہا تھا پانچ ہزار سے بہت زیادہ ہم لوگوں پر صرف کر چکے۔ میں بی۔ اے کی تعلیم کے لئے یہاں بھیج دیا گیا۔ اب اماں کا صرف ایک دلی ارمان رہ گیا ہے۔ وہ　　یہ کہ بہو اُن کے گھر آتی اور اُسکے والدین آنے نہیں دیتے۔ رخصتی کو میری فراغت تعلیم پر مشروط کر رکھا ہے۔

احمد:- یہ تو رہا معاشی پہلو۔ ازدواجی تعلقات آپ نے ابھی بیان نہیں کئے۔

جمیل:- کیا یہ خ[illegible] نمایاں نہیں؟ ویسے بیگم میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ کسی بات کی تکلیف ہونے نہیں دیتیں۔ مگر میرے اعزا سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جب دیکھو اپنے دولتمند اعزا کے سوانح اور واردات کے راگ گایا کرتی ہیں۔ کبھی ان کے دانستہ یا نادانستہ طعن آمیز فقرے پر کھنچ جاتا ہوں، منہ پھلا لیتا ہوں، پھر اُن کے چالاک اور بے پناہ عشوہ و ناز سے جلد بلا عذر من بھی جاتا ہوں۔ میں ایک کھلونا ہوں، جیسے چاہیں کھیلیں، دُور پھینکیں، پھر گلے لگالیں۔ سلیقہ کا یہ حال ہے کہ کھانا پکانا اُن کے گھر میں عیب ہے، باورچی پکاتا ہے، کپڑے سینا ان کے ہاں گناہ ہے، درزی سیتا ہے۔ کتابیں یعنی افسانے خوب پڑھا کرتی ہیں، میز پوش، غلاف اور رومال پر کشیدے خوب کاڑھ لیتی ہیں یا پان بنا لیتی ہیں۔ اب مَیں سوچتا ہوں کہ میری آئندہ زندگی بسر کرنے کی صرف تین صورتیں ہیں:-

(۱) یا بیگم میکے سے اتنی دولت لیکر آتے کہ پھوہڑ بد سلیقہ ہونے کے باوجود ہم زندگی بھر چین اڑائیں۔ مگر خسر صاحب کی جائداد تین بیٹوں چار بیٹیوں اور بیوی میں بٹ بٹا کر اتنی نہیں رہ جاتی کہ ایک جوڑے اور اس کے آنے والے بچوں کا گزارہ ہو سکے۔ میر صاحب ایک سینیر ڈپٹی کلکٹر ہیں اور زیادہ تر اُن کی بیش قرار تنخواہ پر اُن کے سارے ٹھاٹھ موقوف ہیں۔ بیش قرار رقوم پر زندگی کے بیمے ہیں۔ مگر اُن کے وارث صرف بیٹے ہیں۔ زمینداری کافی ہے مگر وصولی مالگذاری کی حالت ناگفتہ بہ ہے جسے آپ جانتے ہیں۔

(۲) یا میں ایسی ملازمت پا لوں کہ زندگی گذار سکوں۔

(۳) یا پھر تصور سے وحشت ہوتی ہے کہ سو پچاس کی ملازمت میں اِس پھوہڑ بیگم کے ساتھ کیسے گذارا ہو سکتا ہے۔ ابھی ایک بلبلہ ہے کہ ناچ رہا ہے۔ مخالف ہوا کا ایک جھونکا لگا نہیں کہ یہ پھوٹا اور سب نمود تمام (ایک لمبی سانس) میری کہانی تمام۔

احمد:- کیا اب بھی کوئی چارہ ممکن نہیں؟ تمہاری ساس سسر نیک دل، فرض شناس اور روشن خیال لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے کہو بیٹی کو اب بھی ایک غریب گھر کی بہو بننے کے قابل بنائیں۔ خانہ داری کے سلیقے سکھائیں۔

جمیل:- سبحان اللہ! وہ تو بیٹی سے زیادہ خود ایک بیوی ہیں خیر سے گود میں ایک بچہ بھی ہے۔ سیکھنے سکھانے کا نہ اب موقع ہے نہ ماں باپ کے بس کی بات۔

احمد:- تو تمہیں بیگم کو سمجھاؤ۔

جمیل:- میں باز کب آیا، مگر حس کسے؟ حس تو جب ہو کہ میں اکڑ جاؤں اور اُن کے پیسوں سے انکار کر دوں۔ جب تک مَیں اُن کا محتاج ہوں کسی نصیحت یا مشورے کا وزن نہیں، اور انکار کی مجال نہیں۔

احمد:- پیسوں کی مار سے بُری دُنیا میں کوئی مار نہیں۔ مَیں ایسے باپ کو بھی جانتا ہوں جو بڑھاپے میں بیٹے کے محتاج ہوئے اور خونِ جگر پی پی کر زندگی کے دن بھرے۔ شوہر اور داماد کا رشتہ تو پھر نسبتی رشتہ ہے۔

تیسری شام

بعد افطار جمیل کا کمرہ۔ وہی احباب۔ چچا ایک خط پڑھنے کیلئے نکالتے ہیں۔

چچا:- دوستو یہ ایک پُرانا خط ہے جو صغیر صاحب کے بکس سے نکالا گیا ہے۔ وہ قسم کھاتے ہیں کہ اس کے بعد کوئی خط وصول نہیں ہوا نہ خود انہوں نے لکھا۔

(خط سُناتے ہیں)

"آپ کے خط سے سخت ملال ہوا۔ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ برابر رویا کی۔ ابا جان کہنے لگے کہ "اگر ضرورت روپے کی تھی تو شادی میں موٹر کیوں مانگی تھی۔ چار ہزار

کی موٹر پندرہ سو میں بیچ دینا کیا حماقت ہے۔ نقد روپے ہی لے لیتے تب تے یا موٹر مجھے واپس کر دیتے، میں پورے دام دیتا؛ اس سے بڑھکر تو ان الفاظ سے میں کٹ گئی، "جسے ایک شوفر کی تنخواہ دینے کی صلاحیت نہ ہو اُسے موٹر مفت بھی مل جائے تو بلائے جان ہے"۔

دوسرے درویش صغیر صاحب تشریح فرمائیں۔

صغیر: بی۔ اے کے پہلے سال میں قدم رکھتے ہی میری شادی کے پیغام آنے لگے۔ ہر طرح کے خاندانوں سے، بعض ذی اثر، ممتاز، بعض عالی نسب، میرے ہم کفو متوسط الحال، بعض میرے جیسے غریب رشتہ دار، بعض دولتمند مگر نسب میں بہت پست۔ ان میں سب سے زیادہ کشش آخر الذکر خاندان میں تھی۔ جو دوسرے گرانقدر تحائف نقد و جنس کے ماسوا ایک سیڈ انٹ شیورلے تازہ ساخت پیش کر رہا تھا۔ ابا، ہڈی کی اونچی قیمت سے خوش، میں موٹر سے خوش، اماں کسی سے خوش نہ تھیں، وہ کہا کرتیں "آج سو پشتوں سے ہماری ہڈیاں کسی ادنی ہڈی سے نہ ملی تھی۔ ہماری برادری میں جس کسی نے ہڈی بیچی فلاح نہ پائی۔ ہمارے پاس کچھ نہ سہی، ایک بزرگوں کی ہڈی اور خاندان کی آبرو ہے اُسے تو نہ بیچو"۔ ابا نے قرآن حدیث سے اُن کا منہ بند کرنا چاہا کہ "اسلام میں ذات پات حسب نسب کوئی شے نہیں۔ یہ امتیازات ممنوع و مردود ہیں۔ ہم پر اسی مشرکانہ رسم کی نحوست ہے کہ آج ایسے خوار ہیں۔ حکمت سے ثابت کیا کہ مختلف خونوں کی آمیزش سے نسلیں جسم اور دماغ دونوں میں مضبوط ہوتی ہیں"۔ مگر اماں کے دو اعتراضوں کا جواب ان سے بن نہ پڑا، گو وہ خاموش رہنے والے نہ تھے۔ ایک تو یہ کہ ہڈی اور خون کی کوئی قیمت نہیں تو تم آج یہ کس چیز کی قیمت وصول کر رہے ہو اور کیوں؟ کیا یہ اصول مساوات نسل و خون صرف مالداروں سے رشتہ کرنے کی اجازت دیتا ہے، غریبوں سے نہیں؟ تندرستی، حسن صورت، تعلیم و شائستگی ہر لحاظ سے دوسری قوموں اور خاندانوں میں ایک سے ایک لڑکی موجود ہے۔ مگر اصل بات کیوں نہیں کہتے کہ اصول ہڈی بیچکر دولت لانا ہے، بہو سے مطلب نہیں، کیسی ہی ہو۔ قرآن حدیث، حکمت فلسفہ اس بیچ میں لا کھڑا کرنے اور ان کو ذلیل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ برادری میں ایک سے ایک تندرست، قبول صورت، نیک سیرت، سلیقہ مند، دیکھی بھالی لڑکیاں موجود ہیں۔ میری بھتیجی اور خود تمہاری بھانجیاں ہیں جن کے نباہ کا حق بہت کچھ ہم لوگوں کے سر بھی آتا ہے۔ سب کو نظر انداز کرکے ایک دوغلی لڑکی کا انتخاب اس میں مال کے سوا کیا لعل جڑے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا"۔

بات تھی سچی سولہ آنے کی۔ مگر مال کے زور کے آگے کوئی سچائی نہیں ٹھہرتی۔ قصہ مختصر، شادی ہو گئی۔ بارات دروازے لگنے سے پہلے کسی کو یہ خیال تک نہ آیا کہ موٹر لائی کس طرح جائیگی اور رکھی کہاں جائیگی۔ رہنے کو مکان واجبی ہی واجبی تھا، شوفر کا تقرر خارج از بحث تھا۔ ہمارے لئے موٹر رکھنا ہاتھی باندھنے سے کم نہ تھا۔ خیر ہوئی لڑکی والوں نے پوچھ لیا کہ "موٹر آپ کا شوفر لے جائے گا یا ہمارا؟" رخصتی اسی موٹر پر ہوئی تھی کہہ دیا گیا "آپ ہی کا شوفر لے جائے گا"۔ یوں پہلی بلا تو ٹل گئی۔ چوتھی کے بعد موٹر سسرال گئی تو وہیں چھوڑ دی گئی۔

میں نے ایک دوست سے موٹر چلانا سیکھا۔ ایک مہینے میں خاصہ چلانے لگا۔ دوسرے مہینے میں لیسنس بھی حاصل ہو گیا۔ گھر سے متصل ایک اصطبل کرایہ پر لے لیا اور بیگم کہو یا خانم یا شیخانی یا سیدانی یا مجموعہ یعنی بیوی کو اس پر بٹھالایا۔ گو رستہ میں دو جگہ دو دو گھنٹے اسکے نخرے برداشت ہوئے اور دو ٹائر اور پٹرول جل گیا، جو محض ناتجربہ کاری کا نتیجہ تھا۔

گھر پہنچکر یاروں نے موٹر کو خوب خوب رپیٹا۔ آخر پٹرول کا خرچ، اصطبل کا کرایہ، ایک چھوکرے کی تنخواہ، ٹائروں کے غلاف، پردہ نئی ہونے کے باوجود پرزوں کے ادل بدل، اضافہ اور آئے دن مرمت کے بل، وہ مصیبت ہو گئی کہ آخر ابا نے نوٹس دے دیا "اصطبل کو مقفل کر دو اور موٹر کی فروخت کا بندوبست کرو۔ مگر اعلان نہ ہو۔ سسرال کے چپ چپاتے بیچ ڈالو"۔ آخر پانچ ہزار کی نئی موٹر کے پندرہ سو دام لگے اور چوری کے مال کی طرح پندرہ سو پر بک گئی۔ یہ خبر وہاں پہنچی تو اس کا جو اثر ہوا جو تم خط میں سن چکے۔

اب سنو ہمارے ازدواجی تعلقات کا حال۔ دلہن بیاہ کر اوّل اوّل ہمارے گھر آئی تو ناک میں بلاق بھی تھا۔ ہمارے خاندان میں بلاق کا دستور نہیں، ہمارے ہاں ادنی طبقے کی عورتیں پہنتی ہیں۔ دلہن کی رونمائی کے ساتھ شوخ چھوکریوں نے غل مچا دیا "اسے یہ تو بی بلاقن ہیں!" تندوں نے کہا "بھابی یہ ناک سے کیا لٹکا چلا آتا ہے، صاف کرو"۔ دلہن کی اناذرا انہیں پوچھ دو"۔ دلہن کے ساتھ کی ماما بہت چراغ پا ہوئی مگر پرائے گھر کی مہمان شوخ لڑکیوں پر کس کا بس تھا۔ وہ بی بلاقن بی بلاقن مشہور ہو گئی۔ دلہن بھی ایسی بدمزہ ہوئی کہ دنوں مجھ سے کھنچی رہی۔ بلاق تو اسی رات اس نے اتار پھینکا۔ خیر وہ دل کی بری نہیں جلد ہی ہموار ہو گئی مگر اسکی ماں کو یہ بات ایسی ناگوار گزری

کہ پھوپھی کو سسرال رخصت نہ کیا۔

شب عروسی کے علاوہ دسہرے میں مجھ سے دو دو رسمیں کرائی گئیں کہ میری سو پشت نے نہ کی ہونگی نہ سُنی ہونگی۔ اماں کے منع کر دینے پر بھی بیس سے زیادہ بلاق کے کفارے میں آنکھیں بند کر کے سب بھتوں سے ملے گئے۔ سات پشتوں کے نام گالیاں سنیں۔ ہر درگاہ پر اور مخصوص درختوں کے نیچے فاتحہ پڑھوایا گیا۔ کنوئیں سے ایک ہاتھ سے پانی کھینچا۔ سالیوں کے ہاتھوں رنگ میں نہایا۔ کان مروڑوائے اور چوں نہ کی، جب کہیں یہ سرٹیفکٹ ملا کہ داماد نیک ہے، اس کا کچھ قصور نہیں۔

"دلہن تمہارے خود ایک نیکدل اور وفاشعار بیوی ہے۔ اسکے خط سے تم قیاس کر سکتے ہو کہ وہ اپنی نہیں، میری رُسوائی پر کڑھ رہی ہے۔ مجھ کو کوئی شکایت بیوی سے نہیں، اس کے گھرانے سے ہے، جہاں ہر تہوار، ہر جمعرات بلکہ مہینے میں کم سے کم بیس روز الانواع و اقسام کی بدعات و رسوم ادا ہوتی رہتی ہیں۔ نہ شرک کی تمیز ہے نہ کفر کی۔ اگر کوئی اعتراض کیجئے تو جھٹ اپنے پیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اُن کا فتوےٰ وحی والہام ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میرا اُن کا مباحثہ ہوگیا۔ میں نے قرآن و حدیث سے دلیل طلب کی وہ جواب میں مثنوی مولانا رومی، دیوان شمس تبریزی یا عراقی و سنائی کے شعر پڑھنے لگے اور الا اللہ کے نعرے سے سبکو خاموش و مرعوب کر دیا۔ گھر کا یہ رنگ دیکھکر میں نے قرآن مجید کا ترجمہ/مترجم حدیث، مرحومین مولانا نذیر احمد، مولوی احسان اللہ عباسی، مولوی راشد الخیری کے نصیحت آموز قصے، مولانا اشرف علی تھانوی کی بہشتی زیور پڑھا دیں۔ یوں بھی وہ میرے خاندان کی دینداری کی بنا پر میری اور ہمارے خاندانی روایات اور علم کی عزت کرتی ہیں۔ سلیقہ بھی بہت اچھا ہے۔ یقین ہے جب ہم اپنا گھر بسائیں گے تو اچھی گذرے گی۔ مگر آج مجھے ان جہال کی سرپرستی و محتاجی اور موٹر کی بھیک کا خیال بہت ستا رہا ہے۔ اور اس غلطی پر میں ہمیشہ پچھتایا کروں گا۔

چوتھی شام

بعد افطار صفیہ کا کمرہ۔ وہی احباب۔ چچا ایک خط نکال کر پڑھتے ہیں۔

"میں نے دو ہفتے سے خط نہیں بھیجا۔ تو مجبور تھی۔ لکھوانے کیلئے دوسروں کی محتاج۔ اختر کلکتہ چلے گئے۔ زکیہ سسرال میں ہے۔ لکھواتی کس سے؟ آج اختر آئے ہیں تو یہ خط لکھوا رہی ہوں۔ مگر آپ کو خط لکھنے میں کیا چیز مانع ہے؟ میں ویسی ہی ہوں جیسی آپ چھوڑ گئے ہیں ——!

یہاں درزی زنانہ کپڑے سینا نہیں جانتے۔ ایک ناپ کا شلوکہ اور کپڑے بھیجتی ہوں چھ اعلیٰ درجے کے بلاوز اور چار جمپر سلوا کر اپنے ساتھ لایئے گا۔"

تیسرے درویش انصاری صاحب تشریح فرمائیں۔

انصاری:- میری کہانی مختصر مگر افسوسناک ہے۔ دلالوں نے سبز باغ دکھا دکھا کر ایک دور دراز ضلع میں میری نسبت ٹھہرائی۔ لائق فرزندگی حیثیت سے میری رائے کو کوئی دخل نہ تھا۔ والدین نے جہاں مناسب سمجھا بات پکی کر دی۔ شادی ہوگئی۔ شب عروسی ہی میں دُلہن بخار میں جل رہی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مانجھوں کی طویل مدت میں دُلہن کا بند کمرے میں مقید رہنا، پھر بیاہ کے دن بناؤ سنگار سنوار کی طوالت، پہلو تک آپ سے بدلنے کا اختیار نہ ہونا، وہ شدائد ہیں جن سے اکثر دُلہنوں کو بخار چڑھ آتا ہے، لرزہ آجاتا ہے۔ میں یہی سمجھا۔ مگر دو چار روز میں ہی مجھ پر کھل گیا کہ یہ جنم کی روگی ہے۔ اسی لئے وہ نہ پڑھ لکھ سکی نہ گھر کے کام دھندوں میں لگائی جاسکی۔ آتا جاتا کیا خاک جب جان کے لالے پڑے ہوں۔ جوان ہوگئی، قرب و جوار میں کوئی بر نہ مل سکا تو دوسرے اضلاع میں طلائی ڈورے ڈالے گئے اور رئیس پھنس گیا۔ دین مہر بھی چالیس ہزار باندھا گیا اور نقد و جنس اتنی مقدار میں ملے کہ مہر کی رقم سے انکار کا مُنہ نہ رہا۔ جو دین واجب الادا نہ سمجھا جائے وہ چار ہو یا چالیس ہزار سب برابر ہے۔

اب مجھے بیوی کے علاج کی فکر ہوئی۔ اب تک ملیریا اور خرابی جگر کا علاج ہو رہا تھا۔ اب تک لیڈی ڈاکٹر سے رجوع نہیں کیا گیا تھا۔ کنواری لڑکی اندرونی حالت بیان نہ کر سکتی تھی، اور معلوم بھی ہو تو اس کا طبی معائنہ سخت عیب سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ تپ دق کا میلان اور امکان ہے۔ غالباً یہ ڈاکٹر کا گمراہ کن اخلاق ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ تپ دق موجود ہے۔ ساتھ ہی معمولات کی سخت اور مزمن بے قاعدگی اگر دفع ہوگئی اور خون صالح پیدا ہونے لگا تو صحت کی قوی اُمید بتائی جاتی ہے۔ نقل و حرکت، تبدیل آب و ہوا اور غذا میں سخت پرہیز سے اب اتنا ہے کہ بخار ہفتہ دو ہفتہ چھوٹ جاتا ہے، پھر ذراسی تکان یا بدپرہیزی سے آپہونچتا ہے۔ غرض شادی کے تمام تحائف اور جہیزات میں سب سے بڑا تحفہ جو میرے حصے میں آیا

ہے وہ دائم المرض بیوی کی دائمی نگرانی اور پریشانی ہے۔ اس بیچاری کے پاس نہ علم ہے نہ ہنر۔ زود رنج، کمزور اور محض واجب الرحم۔

یہ ہے میری ازدواجی زندگی۔ اگر صرف صحت میسر ہوتی تو مجھے سسرال کی محتاجی کی رسوائی بھی گوارا تھی۔ یہ بیماری کی کوفت مرے پر سو دُرّے ہیں۔

اب چوتھے درویش کی کہانی شروع ہو۔

چچا خط پڑھتے ہیں:-

"خط ملا چین آیا۔ جدائی کی کٹھنائی چند روز اور ہے۔ اسے جبر اور صبر سے کاٹئے۔ اللہ پھل میٹھا دیگا۔ میری تکلیف کا خیال نہ کیجئے اوّل تو مجھے کوئی تکلیف ہی نہیں اور ہو بھی تو حس نہیں۔ میں تو یہ سمجھ رہی ہوں کہ ہم نے ابھی زندگی شروع ہی نہیں کی ہے۔ اصل زندگی اُس وقت شروع ہوگی جب ہم اکٹھے بسر کریں گے۔ پیٹ تو آج بھی بھر جاتا ہے دل آپ کی صورت دیکھ دیکھ کر بھریگا۔"

چچا کی آواز بھرّا جاتی ہے۔ اور رومال نکالکر جھٹ آنکھ پونچھ ڈالتے ہیں۔

احمد:- چچا آپ دل گرفتہ کیوں ہو گئے؟ یہ تو خوش نصیب شوہر معلوم ہوتا ہے۔

چچا:- خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں اپنی روداد سناؤں گا تو میری دل گرفتگی کا سبب معلوم ہو جائیگا۔

چوتھے درویش سلیم صاحب خط کی تشریح فرمائیں۔

سلیم:- دوستو، میں آپ بیتی سنانے سے پہلے بطور تمہید اپنے بڑے بھائی کی کہانی سناؤنگا۔ جس نے میرے تخیل ازدواج کو بہت متاثر کیا اور میری زندگی کی تعمیر میں معاون ہوئی۔

بھائی صاحب کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا، دوسری کی تلاش ہوئی وہ منصف ہیں اور معاشی لحاظ سے خوش۔ معقول نسبتوں کو چھوڑ کر اُنہوں نے ایک اعلیٰ طبقہ کی تعلیم یافتہ نوجوان بیوہ پسند کی جس کا شوہر شادی کے ایک ہفتہ کے اندر ریل کے حادثہ بھٹا میں ہلاک ہوگیا۔ دولت وافر تھی، بیگم سے براہِ راست خط و کتابت شروع ہوئی۔ مراسلہ مکالمہ، معاشقہ کے سب مراحل طے ہو لئے تو عقد ہوا۔ ستّر ہزار دین مہر قرار پایا۔ احباب کہتے تھے یہ مثالی ازدواج ہے اور دولھا دُلہن کی زندگی قابل رشک ہوگی۔

بھائی ملازمت پر باہر رہتے تھے۔ چھ مہینے کے اندر ہی پتہ چلا کہ بیگم صاحبہ کی بے تکلفی ایک نوجوان سے ہے۔ بھائی نے تفتیش کی۔ رخصت لیکر بے وقت آدھمکے اُسے گھر میں پایا۔ مگر اُسے کارپرداز کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ بھائی نے برطرف کرنے پر اصرار کیا۔ بیگم نے اپنے نجی معاملات میں اس مداخلت پر احتجاج کیا اور اڑ گئی۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہونچی کہ بھائی نے اس نوجوان پر چوری اور مداخلت بیجا کا بہتان باندھکر چالان کرا دیا۔ بیگم نے ضمانت پر اُسے رہا کرا لیا اور پیروی کر کے بری کرا دیا۔ ایک طرف عدالت میں اُس نے اپنی صفائی کے بیان میں بیگم کی محبت کا اظہار کیا، دوسری طرف وہ بیگم کے گھر میں پھر رہنے سہنے لگا اور کارپرداز بنا رہا۔ بیگم اب میاں کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں۔ مہر کی نالش کے خوف سے بھائی سب کچھ دیکھتے ہیں اور دم نہیں مار سکتے۔ دوسری شادی کی مجال نہیں۔ بے کیف اور بے مآل زندگی بسر کر رہے ہیں۔

گھر بسانے کیلئے اب مجھ پر شادی کے تقاضے شروع ہوئے بھائی کا ازدواجی تجربہ میرے لئے کافی درس عبرت تھا۔ پیغامات آتے رہے میں انکار کرتا رہا۔ مال دولت، حسن و جمال، تعلیم و شایستگی، ہر چیز کا لالچ دیا گیا اور جال بچھائے گئے۔ میں نے کہا ؎

بروایں دام برمرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

نہ میں دولت و ثروت کا قائل رہا تھا نہ ملاقات و معاشقہ اور کورٹ شپ کا۔ میری نظر ابتدا سے اپنی بہن کی نند پر تھی۔ بہن کی سسرال والے ایک بار مونگیر کے زلزلہ سے پناہ لیکر ہمارے ہاں قامت گزیں تھے۔ میں کوئی چودہ پندرہ برس کا ہونگا وہ کوئی دس گیارہ برس کی۔ اس کے سدھارن خط و خال مگر شوخ سادگی میں ایسی دلکشی تھی کہ بتا نہیں سکتا کہ اس میں کیا چیز دلربا اور موہنی ہے۔

خوبی ہمیں کرشمہ ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

لہذا جمالیاتی تجزیہ ناممکن ہے۔ مجملاً موزونی کہہ لو۔ سیرتاً استغنا و سیرچشمی، بلند نظری، عالی ظرفی، جو بالخصوص غربت میں قابل قدر ہے ساتھ ہی تعلیم اور تعلیم سے زیادہ ذہانت، شایستگی سلیقہ نے میرے دل پر ایک پائدار نقش بٹھا رکھا تھا، نفسانی آلودگی سے پاک تین برس میں نے اس کی مشقوں کی تصحیح کی، ادبیات کے سبق دیتے تھے۔ لیکن بلا کی ذہین پایا۔ ان تعلقات کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ عرصے تک میرے سامنے آتی رہی۔ میں جب بہن کی سسرال جاتا تو نہ اس کی ماں مجھ سے پردہ کرتیں نہ حلیمہ کو چھپاتیں۔ چار سال یہ سلسلہ قائم رہا میری

گرویدگی بڑھتی رہی، چودھویں یا پندرھویں سال مجھ سے اس کا پردہ کیا گیا۔ کچھ دن بہن کی وساطت سے مجھے اصلاح مشق کے بہانے سے اسکے خط ملتے رہے۔ پھر بہن نے یہ راہ بھی مسدود کردی۔ حلیمہ خواب ہوگئی مگر ایسا خواب جو بھلائے نہ بھولے۔

بہن نے میرے دل کا بھید کچھ پالیا تھا۔ نند کے نباہ کا بوجھ بہت کچھ ان پر بھی تھا۔ اس کی کبھی کچا سکی نہ ہونے دیتیں۔ مجھ پر شادی کے لئے قدغن ہونے لگا تو بہن سے اشارہ کردینا کافی تھا۔ انہوں نے پوچھا "تمہارے مطالبات؟"

میں نے کہا "پوری جائداد میرے نام لکھوادو اور دس ہزار نقد دلواؤ۔ جہیز معاف"

بہن نے ہنسکر کہا "دل لگی چھوڑو، کام کی بات کرو، تم کیا چاہتے ہو—؟"

"حلیمہ کو"

"یہ تو ظاہر ہے۔ فرمائشات کیا ہیں؟"

"فرمائشات پوری کرنا مرد کا کام ہے۔ عورت سے فرمائشیں کرنے والے یا ان کی دولت اڑانے والے کون ہوتے ہیں بتادوں؟"

"عجب بھولے ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ان کو لوٹ لو مگر کم سے کم اتنا تو لے چلو جتنا ہمارے ابا نے میری سسرال کو بھرا ہے"

"آپا میں کہہ چکا، مجھے لڑکی بیاہنا ہے پیسے کمانا نہیں۔ اسے کھلانا ہے اس کا کھانا نہیں"

غرض شادی ہوگئی۔ میں نے کچھ طلب نہ کیا بجز اس کے کہ پانچ ہزار مہر بیراڑ گیا اور منوا چھوڑا۔ لڑکی کے والدین نے جو کچھ اور جتنا چاہا بیٹی کو دیا اور اپنی حیثیت سے اچھا کچھ دیا۔

حلیمہ دلہن بنکر ہمارے گھر آئی تو اس نے سارا کارخانہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اداس گھر یکبارگی جگمگا اٹھا۔ وہ گھر بھر کے لئے ایک لازمی ہستی بن گئی۔ اسی سال میں بی۔ اے میں ناکام رہا۔ امسال جب میں تعلیم کے لئے یہاں آنے لگا تو اسے بلاکر کہدیا۔

"حلیمہ، تم دل تنگ نہ ہونا۔ یہ گھر ویسے تو ہمارا ہے مگر جو پیسے تم اٹھاتی ہو وہ بھائی کی کمائی کی امانت ہیں۔ ان پر ہمارا جائز حق نہیں۔ میں نے ان کی اور اماں کی بے کیف زندگی میں جان ڈالنے کو انہیں کے اصرار اور خاطر سے شادی کی ہے اور تمہیں بھی ہاتھ سے کھونا نہ چاہتا تھا، ورنہ ابھی نہ کرتا۔ ہمارے پیسے وہ ہونگے جو میں خود کماؤنگا۔ ابھی یوں سمجھو کہ تم میکے میں ہو یا مہمان یا مسافر"

ذہین حلیمہ جو عقل کی سلیمہ بھی ہے سب کچھ آپ سمجھتی ہے۔ میری انتہائی کوشش ہے کہ ہم جلد سے جلد اپنا گھر بسائیں۔ اور حلیمہ نہ میکے کی محتاج رہے نہ سسرال کی۔ میرے گاڑھے پسینے کی کمائی اس کا مایۂ افتخار ہو۔ حلیمہ کی ذات سے ہمارا مستقبل بحمداللہ روشن ہے۔ آئندہ ہماری مالی حالت کیسی ہی ہو ہمیں بھروسا ہے کہ ہم خوش رہیں گے۔

پانچویں شام

بعد افطار۔ انصاری کا کمرہ۔ وہی احباب۔ چچا ایک خط نکال کر پڑھتے ہیں۔

"اچھے پڑھنے والے شوقین آئے۔ کیا پڑھنے کیلئے بیوی سے جدائی کوئی ضروری شرط ہے؟ ایک برس یہ ہوا۔ ایک برس میں آپ بی۔ اے کرینگے۔ پھر ایم۔ اے یا قانون یا ٹریننگ یا ملازمت کی تلاش میں کئی برس صرف ہوجائیں گے۔ رہنے دیجئے اپنے اصول اور قانون اپنے پاس۔ میں ان کو تسلیم نہیں کرتی۔ آپ یہاں نہیں رہ سکتے تو میں آپکے وہاں رہ سکتی ہوں اور رہونگی۔ میری پھوپی اماں وہاں مجھے بار بار بلاتی ہیں۔ آپ ان کے گھر میں قیام رکھنا نہ چاہیں تو میں زور نہیں دیتی۔ مگر میں چند مہینے وہاں رہونگی۔ آپسے ملاقاتیں تو ہوا کریں گی صورت تو دیکھ لیا کرونگی۔ خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں۔ اگر پھوپی اماں وہاں نہ ہوتیں جب بھی ہم کرایہ کا مکان لیکر وہاں رہ سکتے تھے اور آپ کے پڑھنے میں کوئی خلل نہ ہوتا۔ آپ کی فراغت اور مصروفیت روزگار تک ہم میاں بیوی ہونگے، دولھا دلہن کی حیثیت سے ساتھ رہنے کی گھڑی گذر چکی ہوگی۔ میں مردوں کا نہیں کہتی۔ عورت کی زندگی میں یہ سنہری گھڑی بہت مختصر ہوتی۔ بس ایک چنگاری کی تڑپ، یا بجلی کی کوند۔ اپنے خاص وقت پر یکبارگی آتی اور گذر جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے واپس نہیں لاسکتی۔ وہ کسی کے پروگرام کی پابند نہیں۔ بلکہ زندگی کا پروگرام اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھکر بنانا چاہئے۔ یوں بکنے کو منطقیں بہت ہیں مگر عورت کی فطرت جو عورت کے نقطۂ نظر سے میں نے پیش کی ہے ایک اٹل واقعہ ہے، ہر منطق سے بالاتر"

چچا۔ واللہ یہ بیگم سچ کہتی ہے اور میاں کی بے وقت شادی پر در پردہ ملامت کر رہی ہے۔ بیگم نہایت حساس، ذہین، دل کی مضبوط، عاقلہ معلوم ہوتی ہے جو سنجیدگی کو خوش طبعی کے نقاب میں چھپانا جانتی ہے۔ پانچویں درویش جیلانی صاحب تشریح کریں۔

قریشی:۔ چچا ہوگئے نا آپ محو۔ اسی لئے میں کہتا تھا غیر محرم نوجوان بیویوں کے خط نہ پڑھے جائیں۔

جیلانی:۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ میں خوش ہوں کہ چچا کے دل میں کوئی حرکت تو نمودار ہوئی۔ اِن تلوں سے تیل تو نکلا۔ رہی میری کہانی، سو یہ بہت مختصر ہے۔ دردناک بالکل نہیں۔ میری بیوی اپنی ماں باپ کی اکلوتی ہے اور زیادہ تر میکے ہی میں رہتی ہے۔ ہمارے گھر کی خانہ داری بھاوج کے ہاتھ میں ہے، اس لئے بھی وہ آزاد ہے۔ میں لمبی چھٹیوں میں گھر جاتا ہوں تو وہ بُلالی جاتی ہے اور جتنے دن رہتی ہے مہمان رہتی ہے۔ مگر یہ جُدائی کی طویل مدّت اُسے عذاب ہے۔ اُسے میکے سے رغبت ہے نہ سسرال سے دلچسپی۔ وہ تو اُس دن کو گن رہی ہے جب ہم ایک ساتھ رہیں گے۔ بظاہر وہ ٹھنڈی اور خاموش لڑکی ہے۔ چہرے سے معلوم نہیں ہوتا کہ دل میں محبت کی آگ سُلگ رہی ہے۔ محبت اسکا عقیدہ ہے، فلسفہ ہے بلکہ دین وایمان۔ تعلیم خاصی ہے، مگر تعلیم سے زیادہ اس کی ذہانت غیر معمولی ہے۔ تخیّل بعض وقت توہّم کے حد تک پہونچ جاتا ہے۔ وسیع معنی میں وہ شاعرہ ہے۔ اس کی تحریر، گفتگو، حرکات وسکنات سب شعر ہیں۔ گو کبھی اس ذوقِ لطیف کو وزن وقافیہ کی قید سے ملوّث نہیں کرتی۔

دوستو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میرا بیان درویش کی کہانی سے گذر کر قصیدہ خوانی بنا جاتا ہے جو اس صحبت کا مقصد نہیں۔ ہم اُس منزل پر ہیں جہاں دلوں کی واردات شرمندۂ زبان نہیں ہوتی۔ لہذا اسے ناگفتہ بہ ہی رہنے دیجئے۔ چچا اب خود آپ کی باری ہے۔

چچا:۔ عزیز دوستو، ایک ہم جماعت بھتیجے کے چچا پکارنے یا تم سے کچھ زیادہ عمر کے سبب یا میری عربیت اور ننھی سی ڈاڑھی کے احترام یا جرم میں یا کسی وجہ سے تم نے مجھے چچا کے مقدّس لقب سے ممتاز کر رکھا ہے۔ آج میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ بے وقت شادی کی بدولت تعلیم اور معاش کی کشمکش نے مجھے چچا بنا رکھا ہے۔ میں نے عمر کا اوائل حصّہ عربی کی تحصیل میں گذارا۔ میرے والد خود عربی ادبیات کے فاضل اور گھر کی فضا مذہبی تھی۔ میری سولہ برس کی عمر میں وہ راہی جنّت ہوگئے۔ تمہارے دادا یعنی میرے چچا جن کے ذمہ میری پرورش اور تعلیم ہوئی مغربی خیال کے بزرگ ہیں، صرف اس معنی کہ انہوں نے مجھے انگریزی تعلیم میں لگا دیا۔ میٹرک تک پہونچتے پہونچتے میرا عربی اور انگریزی کا گنگا جمنی کلچر مذاکروں، ادبی رسالوں اور نظموں پر نمایاں ہونے لگا۔ برادری ہی میں لڑکی والوں کی نظر انتخاب پڑنے لگی۔

میرے مربّی چچا کے اولاد نہ تھی۔ دوسرے چچا نے اپنی لڑکی سے شادی کی تحریک کی، اُسے بھی میری مربیہ چچی نے ہی اپنی گود میں پالا تھا۔ مربّی چچا نے یہ نسبت قبول کرنے پر اصرار کیا۔ موقع کی نزاکت کے لحاظ سے نیز اس لئے کہ لڑکی کے ذاتی محاسن چشم دید تھے، میں راضی ہوگیا۔ کیا کرتا۔۔۔؟ ع

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

میرے خسر دولتمند نہ تھے۔ جب تک ہمارے اولاد نہ ہوئی میں ایک گونہ بے فکر رہا۔ بچّہ پیدا ہوتے ہی ہم دونوں میاں بیوی نے محسوس کیا کہ ہماری بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو یہ چچا چچی نہ جان سکتے ہیں نہ پورا کرسکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں کوئی بیمار ہو تو وہ لوگ محلہ کے پُرانے حکیم صاحب کو بلا فیس دکھا کر، دو چار آنے کی دوا پر قانع ہوجانے کے عادی ہیں۔ مجھے اپنی بیوی یا بچے کا علاج ڈاکٹر کو دو دو روپے فیس بارہ آنے کی دوا اور چار آنے کے سیب یا سنگترہ، تین روپے سے کم میں ناممکن نظر آتا۔ یہ آئیں کہاں سے؟ میٹریکلیشن تو میں نے امتیاز کے ساتھ کرلیا۔ آئی۔ اے میں مالی اُلجھنیں بڑھیں۔ میں ناکامیاب رہا۔ کلکتہ چلا گیا۔ اور مختلف وقتوں میں تجارتی ملازمت، معلّمی، منشی گری، اخبار نویسی کے گوناگوں مشاغل سے بیوی بچّوں کی خبر لیتا رہا۔ کمائی کی کمی نہ تھی۔ ایک معمولی گریجویٹ سے بہت زیادہ حاصل کرلیتا تھا۔ اور مجھے اپنی آمدنی پر قانع نہ ہونے کی بجز ایک خلش کے کوئی وجہ نہ تھی۔ میں سوچتا تھا کہ ابتدا سے میں نے اپنی زندگی کا جو پروگرام بنا رکھا تھا وہ اُلٹ گیا۔ میں علمی امتیازات کا متمنّی تھا اور گریجویٹ بھی نہ ہوسکا۔ پانچ برس کی کشمکش کے بعد کسی اندرونی طاقت نے آہستہ آہستہ میری گردن کا پھندا رگڑتے رگڑتے توڑ ڈالا۔ میں نے صرف ٹیوشن پر قناعت کر کے امتیاز کے ساتھ آئی۔ اے کیا۔ بیوی بچّوں کے بالائی اخراجات کیلئے پندرہ روپے ماہوار کا انتظام کردیا۔ اگرچہ وہ تکمیل تعلیم کے بغیر میری آمدنی سے خوش اور مطمئن تھی مگر میرے میلانِ طبع سے واقف تھی۔ میرے دل کے خلا کو دیکھتی تھی۔ وہ گزارے کی اس قلیل رقم پر خوشی سے راضی ہوگئی اور اپنی خوشی اور آرام کو میری خوشی پر قربان کردیا۔ (بھرائی آواز)

چھ برس میں تین بچے ہوئے۔ دو مر گئے۔ آخری بچے کی ولادت ماں کی موت کا پیغام تھی۔

(سکوت، ضبط گریہ کی کوشش)

مرحومہ کی وفات سے ایک مہینے کے اندر چچا دوسری لڑکی سے

عقد کر لینے پر اصرار کرنے لگے۔ کچھ محبتِ فرزندی مگر زیادہ تر اُمید پر وہ میری بچی یا اپنی بیٹی کی نشانی کی پرورش کر رہے ہیں۔ مجھے شادی کے نام سے وحشت ہوتی ہے مگر کرنی ہے اور ہونی ہے۔ نہ کروں تو اُس کی نشانی کو کون پالتا ہے اور کب تک؟ اس جبری شادی سے دو سال کی مہلت لیکر یہاں آگیا ہوں کہ تکمیلِ تعلیم ہو جائے اور اس مشغلہ میں کچھ غم غلط بھی ہو۔

زکی:۔ چچا آپ نے یہ پھندا ایک بار ٹوٹنے کے بعد پھر گلے میں ڈالا تو آپ نرے چچا کے چچا ہی رہ جائیں گے۔ اپنا بچہ میرے حوالے کیجئے۔ ابتک میرے اولاد نہیں اور ہو بھی تو اُسے شوق سے پال لونگا۔

احمد:۔ اچھا تو آپ بھی شادی شدہ ہیں۔ لائیے بیگم کا خط۔

زکی:۔ بھئی ہوں تو شادی شدہ مگر میری جورو پڑھی لکھی نہیں، نہ کسی سے خط لکھوا کر بھیجتی ہے۔ نہ میری سسرال میں کوئی غالب یا اختر صاحب ہیں جو کان میلئے کی طرح کان پر قلم رکھے گلی گلی صدا لگاتے پھرتے ہوں:

؎ مگر خط اس کو لکھوائے کوئی تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور رکھکر کان پر اپنے قلم نکلے

احمد:۔ پھر آپ کی بیگم کے اوصاف کیونکر معلوم ہوں؟

زکی:۔ وہ میں خود عرض کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:۔

ہے وہ عالی مقام جورو کا   بے وضو لوں نہ نام جورو کا
سرفرازی کا اُس کی کیا کہنا   بن گیا جو غلام جورو کا
مَیں ہوں تہذیبِ نو کا شیدائی   کرتا ہوں احترام جورو کا
جَے پکاروں نہ نعرۂ تکبیر   وردِ ہے صبح و شام جورو کا
اُس کی مرضی خدا کی مرضی ہے   امرِ حق ہے کلام جورو کا
کیا مجال اُس کا حکم ٹل جائے   سخت ہے انتقام جورو کا
مجھے کیا کام دیر و کعبہ سے   گھر ہے بیت الحرام جورو کا
سخت جانی مری ہے داد طلب   ہوں خصم بے لگام جورو کا
سیم و زر رکھتی ہے وہ سرخ سپید   رُخ ہے گو مشک فام جورو کا
اٹھ چلا کھا کے تازیانۂ طنز   خرِ چابک خرام جورو کا
ہے دُعا اپنی کنجی چندیا پر   رہے سایہ مدام جورو کا
اے نکھٹو تمہیں پھسڈی ہو   سب پہ ہے لطفِ عام جورو کا

احمد:۔ حضرت نکھٹو، ہو تم چھٹے لُچّے۔ تمہاری جورو دورو کوئی نہیں، تم نے ان سب جورو والوں کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ بھئی قسم لے لو میں نے یہ سارے خطوط جس جذبہ کے ماتحت نکلوائے، پڑھوائے اور سُنے ہیں وہ مذاق اور تمسخر نہیں بلکہ خدمت اور خیر ہے۔ تھوڑی دیر کو سنجیدہ بنجاؤ۔ تم جانتے ہو ازدواج ہماری زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے۔ ہم میں سے شاید ایک آدھ ہی ایسا خوش نصیب شادی شدہ جوان ہوگا جو اپنی ازدواجی زندگی کو تلخی سے قطعاً پاک پاتا ہو اور یہ نتیجہ خود اسی کی غلطی کا نہ ہو۔ اگر ہم اس حالت کے سدھار میں کامیاب ہوئے تو شاید یہ سب سے بڑی سماجی خدمت ہوگی اور یہ انجام پا سکتی ہے انہیں کی مدد سے جو اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت چکے ہیں۔ آؤ ہم کوشش کریں کہ جو غلطیاں ہم کر اور بھگت چکے ہیں اُن سے ہمارے بھائی محفوظ رہیں۔ ہماری زندگیاں اُنکے لئے درسِ عبرت بنیں:

؎ مَیں کسی کام کے لائق تو نہ تھا اے کیفی
ہاں مگر دیدۂ بینا کے بہت کام آیا

محمد مسلم

کون آیا یہ کون آیا؟

دو جگ میں اُجالا چھایا دل رُک رُک کر تھرّایا
ماتھے پہ پسینہ آیا آنکھوں میں نُور سمایا
کون آیا یہ کون آیا؟

زُلفوں کے بل متانے رُخسار ہیں یا مے خانے
آنکھیں ہیں یا پیمانے پلکوں کے نیزے تانے
کون آیا یہ کون آیا؟

زُلفوں کی عنبر بیزی آنکھوں کی کیف انگیزی
محجوب تبسّم ریزی بیمار نظر کی تیزی
کون آیا یہ کون آیا؟

حلقے رُخسار میں رقصاں باہیں شانوں تک عُریاں
سینے پر زلف پریشاں لب لرزاں آنکھیں خنداں
کون آیا یہ کون آیا؟

چہرے پہ ملاحت طاری سانسوں میں نشے کی دھاری
آنکھوں کے پوٹے بھاری ہونٹوں سے لہو سا جاری
کون آیا یہ کون آیا؟

وہ قدم قدم پر گرنا ہچکولا لیکر پھرنا
افشاں کا جبیں سے گرنا جیسے پربت کا جھرنا
کون آیا یہ کون آیا؟

شرماتا اور لجاتا گھبراتا آنکھ بچاتا
راہوں پر نُور بچھاتا کلیوں کو پھول بناتا
کون آیا یہ کون آیا؟

لیتا پودوں کے سہارے تھمتا ہوا ڈر کے مارے
کیوں سہم گئے نظّارے کیوں ٹوٹ رہے ہیں تارے
کون آیا یہ کون آیا؟

بل کھانا اور اِٹھلانا پیہم آنکھیں جھپکانا
ہر سو نظریں دوڑانا رُک جانا جھینپ سا جانا
کون آیا یہ کون آیا؟

دل کو آئی انگڑائی اُمید کی بدلی چھائی
میری توبہ گھبرائی رُسوائی کی رُت آئی
کون آیا یہ کون آیا؟

(احمد ندیم قاسمی)

جب یاد تمہاری آتی ہے

جب وقت سُہانا ہوتا ہے اور کوئل نغمے گاتی ہے
جب پھول چمن میں کھلتے ہیں غنچوں کو ہنسی آ جاتی ہے
ہریالی لہریں لیتی ہے، اور موج پہ ندّی آتی ہے
فطرت کی ہر اک شے فرقت میں رہ رہ کر مجھے تڑپاتی ہے
تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے، جب یاد تمہاری آتی ہے

جب سُورج صبح نکلتا ہے، اور منظر سُتھرا ہوتا ہے
اک نُور کا دریا بہتا ہے اور غنچوں کا مُنہ دھوتا ہے
پانی بھرنے پنگھٹ پر جب پریوں کا جُمگھٹ ہوتا ہے
اک طرفہ میلا لگتا ہے، کوئی ہنستا کوئی روتا ہے
تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے، جب یاد تمہاری آتی ہے

جب غنچہ و گُل کو بادِ صبا پیغامِ مسرّت دیتی ہے
جب فطرتِ حُسن کی دیوی دل کو مژدۂ عشرت دیتی ہے
جب رات کو شبنم کلیوں کو نذرانۂ اُلفت دیتی ہے
دُنیا کی ہر اک شے میرے لئے اک درسِ محبت دیتی ہے
تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے جب یاد تمہاری آتی ہے

رودادِ محبت باغ میں بُلبُل گُل سے جب دُہراتی ہے
ہر داغ ہرا ہو جاتا ہے، ہر چوٹ اُبھر سی آتی ہے
فرقت میں تمہاری پیاری صورت آنکھوں میں کھِنچ جاتی ہے
پھر یاد تمہاری آتی ہے اور آ کے مجھے تڑپاتی ہے
تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے، جب یاد تمہاری آتی ہے

تم جانتے ہو سچ سچ تو کہو کیا دردِ محبت ہوتا ہے
کیوں مُفت کسی کے واسطے کوئی اپنے جی کو کھوتا ہے
جب یاد تمہاری آتی ہے، تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے
میں تنہا رویا کرتا ہوں، جب سارا عالم سوتا ہے
تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے، جب یاد تمہاری آتی ہے

تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے، میں تنہا راتوں روتا ہوں
میں تنہا راتوں روتا ہوں اور جی کو عبث ہی کھوتا ہوں
روتا ہوں کبھی سر دُھنتا ہوں، سر دُھنتا ہوں پھر روتا ہوں
میں چُپکے چُپکے روتا ہوں، تم جانتے ہو میں سوتا ہوں
تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے، جب یاد تمہاری آتی ہے

بیہوشی ہے خود ہوش مجھے، بیداری میں میں سوتا ہوں
میں اپنے ہاتھوں دُنیا میں خود اپنی ناؤ ڈبوتا ہوں
خود نیست زمانہ ہوتا ہے، میں خود کو خودی میں کھوتا ہوں
بس ہست تم ہی تم ہوتے ہو، میں محوِ پرستش ہوتا ہوں
تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے، جب یاد تمہاری آتی ہے

فرحت کانپوری؛

"دیکھیں — دیکھیں — ذرا ہٹو تو" زہرہ نے مجھے قریب قریب پیچھے لٹاتے ہوئے کہا اور اپنی زبردست ناک نعمت خانے جیسی باریک جالی سے چپکا دی اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، بالکل ہکا بکا! لیکن فوراً سنبھلی۔

"اُہّو کوئی بھی نہیں ایسا تو کوئی حسین بھی نہیں۔ سوکھا مارا" — زہرہ نے عینک پھڑکا کر کہا۔

"سوکھا؟ یہ سوکھا ہے؟ ذرا دیکھنا عذرا!" میں نے عذرا کو اپنے اُوپر لٹا لیا۔

"کوئی بھی سوکھا نہیں! — مگر وہ — وہ اُدھر ذرا اُدھر" عذرا نے بالکل دوسری طرف ہم لوگوں کو متوجہ کیا۔

"کون وہ ڈاڑھی؟ — لعنت!" زہرہ ہٹ گئی۔ میں نے بھی دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

"ارے نہیں وہ — ایک — دو — تین — وہ چوتھے نمبر پر ہیں نا زہرہ؟" عذرا نے تڑپ کر کہا۔ اور زہرہ کی گردن بالکل دائیں طرف کو مروڑ دی۔

"کیا بطخا؟؟" زہرہ بگڑ گئی۔

"ارے وہ نہیں — وُہ پچھلی لائین میں — وہ — وُہ وہ" عذرا نے بتایا۔

"اچھا وہ سا! میں نے کل ہی دیکھا تھا" طفیل نوٹ بک اُلٹ کر بولیں "تم نے دیکھا بھی نہیں؟"

"اے وہ کل تھا بھی۔ ہونھہ" عذرا کو بُرا لگا کہ کل وہ کچھ دیکھ ہی نہ سکی۔

"لو — کل تھا کیسے نہیں؟" سعیدہ بھی بول ہی دیں۔

"لو اور لو" ہم سب جل گئے یہ دونوں کل سے دیکھ رہی تھیں اور ہمیں ذرا جو پتہ ہو۔ اچھا خیر!

زہرہ نمبر ۲ ہماری مجلس سے باہر دُور کونے سے، ناک اُٹھائے ایک سفید ہاتھ کو تیزی سے قلم چلاتے دیکھ رہی تھی۔ ہم نے مُسکرا مُسکرا کر ایک دوسرے کو ٹھوکے دئے اور سوں سوں ناکیں بجانے لگے۔

"ارے — ارے" میں نے ایکدم مجروح ہو کر کہا۔ زہرہ بھی اُس کے ملٹری نما بُوٹ سے میرا پیر کُچل گیا۔

میں نے زہرہ اور عذرا کی گردنیں ایسی زور سے بائیں طرف جھکائیں کہ سکھٹوے کے تانگے کے کفر شکن جھٹکوں سے تین دن تک دُکھا کیں۔

"اچھا — ہاں — آدمی — مگر ہنستا کیسے ہے!" زہرہ نے بغور دیکھکر کہا۔

"ہاں ساری ڈاڑھیں تک نظر آتی ہیں" عذرا نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور کچلی پر سونا کیسا چمک رہا ہے" زہرہ نے ناک سکیڑی۔

"لو وہ پھر ہنسا۔ سچ کہتی ہوں کوا تک نظر آگیا" عذرا کھسکنے لگی دُور۔

"ہوں۔ کوا نہیں تمہیں تو اُس کے پھیپڑے نظر آنے لگے" میں چڑ گئی۔

"اور وہ — نیلی شیروانی" طفیل اپنی معصوم آنکھیں گھما کر بولی۔

"کون؟ وہ بطخا!" میں نے بُرا مان کر کہا۔

"کوئی نہیں بطخا تو نہیں ہے وہ!" طفیل اور بھی بگڑی۔

"بطخا نہیں تو پھر کون ہے۔ کیسے چیختا ہے کلّا پھاڑ کے" میں نے کہا۔

"واہ اُس کی تو اس قدر مردانہ آواز ہے۔ اتنا اچھا اسپیکر نکلے گا" طفیل شرمائیں۔

"اچھا — آ — آہیں۔ اُہیں" ہم سب نے طفیل کو گھسیٹ مارا۔

"آپ لوگ تو ظاہری شکل و صورت پر جاتی ہیں" طفیل نے بی اے میں فلسفہ لیتے لیتے چھوڑ دیا تھا۔

"اور پیٹ کے گُن اُس کے تم جانتی ہوگی" میں نے جلکر کہا اور بار بار گر جانے والے پردے کو پن سے اٹکا دیا۔

"آپ لوگ تو پھر گاندھی جی کو بھی نہ جانے کیا سمجھیں گی" طفیل کی مدد سعیدہ نے کی۔

"لو بھلا گاندھی جی کو ہم کیوں" کچھ "سمجھنے لگے۔ وہ ہمارے باپ برابر ہیں۔ واہ" ہم سب بُرا ماننے پر تُل گئے۔

"جب گاندھی جی دیکھنے کی چیز تھے تب تو انہیں" کچھ "سمجھ بھی سکتے تھے" عذرا بولیں اور مُسکرائیں۔

"اور اب وہ دیکھنے کی چیز نہیں" طفیل لڑپڑیں۔

"تم بھی دیوانی ہو۔ بھئی اس وقت اُن کا کیا ذکر ہے۔ اور ویسے تم جو یہ پوچھو کہ وہ حسین ہیں تو ہم ہاں کہنے سے رہے چاہے یہودیوں کی طرح ہندوستان باہر کر دئے جائیں" انصاف پسند زہرہ بولی۔

"غضب!!" زہرہ نمبر ۲ پھڑک کر بولیں۔ ہم سمجھے پروفیسر صاحب آگئے اور جلدی جلدی قلم ڈھونڈنے کے لئے گریبان اور جیبیں ٹٹولنے لگے۔

"وہ" زہرہ نمبر ۲ نے نہ جانے کدھر انگلی نچائی "وہ ——— عشرت صاحب کی بائیں موچھ کی نوک کی سیدھ میں" سب نے عشرت صاحب کی موچھ کی سیدھ لی اور غور سے دیکھا۔ پھر سب آہستہ آہستہ اپنی ناکوں کو جالی پر ٹہلانے لگے۔ ہاں بات نئی بھی تھی اور کام کی بھی، ایک کھلبلی سی مچ گئی اور ہم ایک دوسرے کے بازو دبانے لگے ——— !

"رنگت!" مجھے سانولی یا کالی رنگت سے چڑ ہی۔

"اوہو! رنگت سے کیا ہوتا ہے" عذرا کی اور میری ایک گھڑی نہیں بنتی تھی۔ اور یہی اس وقت ہوا۔

"جی ہاں رنگت کا سوال کیوں نہ کریں۔ ہوتا کیوں نہیں" میں نے اپنی دقیق بحث شروع کی۔

"اور کیا ہوتا کیوں نہیں گھر میں کالے کالے تمباکو کے ڈھیتے بچے لُڑکتے پھریں، توبہ میں تو گلا گھونٹ دوں" نفاست پسند نمبر ۲ زہرہ بولیں۔

"تو کوئی ہم تمہاری بات لیکر جا رہے ہیں اُس کے لئے ———" میں نے کاٹ کی۔

"تم اپنی اپنی کہو، میں تو خیر اتنی کالی بھی نہیں" زہرہ نے اپنی سفید جلد کو سرخ کر کے کہا ——— سفید جلد ——— چینی سے زیادہ سفید جلد۔

"شش ——— شی ——— شی ——— جیب صا ———" کھڑ کھڑ بنچیں سرکیں، اور سیاہ شیروانیاں جیسے کھونٹیوں پر لٹک گئیں۔ سب کھڑے ہوگئے۔

"اور قد ڈیڑھ فٹ" میں نے باہر جھانک کر خوشی سے مرتے ہوئے کہا۔ عذرا رو دی۔

———(۳)———

"لکس سوپ!" سعیدہ بولیں۔

"اِنوسینٹ آئیز" زہرہ نے چوٹ کی۔ سعیدہ شرما گئیں۔

"واہ وہ تو ... مجھے کہا ہے" میں نے اِٹھلا کر کہا۔

"اے چلو ——— دھنیہ جیسی آنکھیں!" عذرا بڑبڑائی۔

"اُہو۔ عینک کی وجہ سے ذرا ویسی لگتی ہیں۔ یہ دیکھو" میں نے عینک ہٹا کر کوئے تک آنکھیں پھاڑ دیں۔

"خیر ہونگی بڑی" عذرا نے بے دیکھے بک دیا۔ بے ہودہ کہیں کی۔

"ہاں مگر اِنوسینٹ تو ہرگز بھی نہیں۔ جیسے قبر بجو کی سی تو آنکھیں ہیں" زہرہ پر ہزیان کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور میرا جی چاہا سعیدہ کی بڑی بڑی آنکھیں کسی پھنسی پھوڑے سے پٹم ہو جائیں۔

"گلشن کہہ رہی تھیں کسی نے انہیں بتایا ہے کہ میرے ہی لئے کمبختوں نے کہا ہے" سعیدہ اِترائی۔

"تم مر بھی جاؤ تو تمہارے لئے نہیں کہا۔ ہم مان ہی نہیں سکتے" میں نے کہا اور سب نے مان لیا۔

"اگر کہا بھی ہوگا تو عذرا کو کہا ہوگا" زہرہ نے رائے دی۔ عذرا کی زہرہ سے بڑی دوستی ہے۔

"خیر عذرا کے لئے تو کبھی کہہ نہیں سکتے" عذرا کے لئے کہنے میں سعیدہ کی اُلو جیسی آنکھوں کی ہتک ہوتی تھی اس لئے اُس کا بگڑنا حق بجانب تھا۔

"اے ہے اِس چرخ چرخ سے تو میری جان جلتی ہے" میں نے باہر جھانک کر موضوع بدل دیا۔ اور سب نے جُھک کر ایک باریک شکل کی چڑیا جیسی موچھوں کو گھُورنا شروع کر دیا۔

"اے ہے تیل ڈال کر بال کیسے جمائے ہیں جیسے چپاتیاں!" زہرہ نے ناک پھڑکائی۔

"امتحان کی وجہ سے بھئی" طفیل تو کاش ڈاکٹری پڑھتیں۔

"امتحان کیسا؟ پٹیوں کا؟" میں نے کہا۔

"نہیں بھئی تیل سے دماغ روشن ہوتا ہے" طفیل نے کہا۔ "امتحان سر پر آرہے ہیں"

"ہاں بھئی سالانہ امتحان کی تیاری ہے" زہرہ میرے خلاف ہوگئیں۔

"ہوں۔ چاہے زندگی بھر امتحان میں فیل ہو جائیں" میں نے بڑبڑانا شروع کیا۔

"یہ کیسے؟ دیکھ لینا اوّل آتے گا فیل کیوں ہوگا؟" سعیدہ کی اور طفیل کی دوستی کی انتہا ہوگئی۔

"فیل ہی ہوگا، بھلا ان چمکتے ہوئے بالوں کو دیکھکر کوئی لڑکی سو میں سے دس نمبر بھی بہ مشکل دیگی" میں نے اکتا کر کتاب پر ناخونوں سے چارخانہ بنانا شروع کر دیا۔

"مگر محمود تو بھینگا ہے" زہرہ ہمیشہ بے کہے سُنے موضوع بدل دیتی ہے۔ یہی تو اس میں ایک عیب ہے۔

"کوئی بھینگا نہیں" میں نے بُرا مان کر لڑائی پر آمادگی ظاہر کی۔۔۔

"بیچ کھیت بھینگا" سعیدہ جلدی جلدی نوٹ نقل کرتی ہوئی بولیں۔

"لیکن "اس" سے تو اچھا نہیں" زہرہ نمبر ۲ نے باہر جھانک کر ہمارے تازہ ترین موضوع کی طرف آنکھ ماری۔

"اتھو بس "اسکی" تو سائیکل کے نیچے ایک دن آکر مرجاؤ" میں نے جل کر کہا اور طفیل کے ضروری نوٹ بک میں سے کاغذ پھاڑکر ناؤ بنانے لگی۔

"میں کہتی ہوں یہ نوٹ لئے جا رہے ہیں یا بَر دکھوئے ہو رہے ہیں" عذرا نے ڈانٹا۔

"ٹرٹر کئے جا رہی ہیں خاک جو لکچر سُنائی دے رہا ہو" طفیل نے اپنا منّا سا پاؤں ڈیسک پر رکھکر لیٹتے ہوئے کہا۔

ہم نے اسی دن سوچ بچار کے بعد پرنسپل صاحب کو لکھا کہ لکچر نہ تو ہماری سمجھ میں آئیں نہ سنائی دیں۔ ہمیں چھپے چھپائے نوٹ دیں تاکہ امتحان کے لئے رٹ لیں۔

۳

"اُس کی تو شادی بھی ہوگئی ہے اور دو تین لڑکیاں ہیں" زہرہ نے ماتمی لہجہ میں کہا۔

"ارے" اور ہم سب کے مُنہ اُتر گئے۔

"اور اُس کی نمبر ۴ ہم کی منگنی ہوگئی آئندہ سال ولایت جا رہا ہے" زہرہ نمبر ۲ پر طفیل نے گرز چلایا۔ وہ غریب چھ روز سے ہم سے بہت دُور کونے میں بیٹھکر چپکے "نوٹ" لیا کرتی تھی۔ ذرا سا مُنہ نکل آیا بیچاری کا۔

"اور وہ ---- وہی سا" ہم سمجھ گئے "پرسوں اُسکے گھر سے تار آیا ہے کہ لڑکا ہوا ہے" زہرہ نے ہنسی کو ضبط کر کے کہا۔

"اے ہے لڑکا" ہمیں کبھی خواب میں بھی تو یہ سوچنے کا موقع نہ ملا تھا۔ ہم تو سمجھتے تھے ---- خیر۔

"رہ گیا بھینگا" سعیدہ بولیں۔

"کہہ دیا کتنی دفعہ کہ وہ بھینگا نہیں۔ بھینگا نہیں۔ کل ہی میں نے اِدھر سے دیکھا تھا بالکل سیدھی تارہ جیسی آنکھیں ہیں" میں نے زخمی شیرنی کی طرح بڑبڑانا شروع کیا۔ جی ویسے ہی دُکھا ہوا تھا۔

"اور وہ چرخ ----" سعیدہ نے پھر چھیڑا۔

"اور وہ چرخ! ہوں! یونہی تو دس ڈاڑھیاں موجود ہیں" زہرہ کاٹنے پر تلی ہوئی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ اُس کے تین لڑکیاں ہیں" میں نے سوچا شاید ---- شاید کوئی غلطی ہوئی ہو۔

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ نفیس نے بتایا وہ اُسے جانتے ہیں۔ کہاں چھوٹی چھوٹی تین بلکہ ساڑھے تین لڑکیاں ہیں اُس کی" زہرہ نہ جانے نفیس سے کیسی کیسی واہیات خبریں لاکر ہم سب کا دِل دُکھایا کرتی تھی۔

"رہ گیا بطخا سو وہ ہم نے طفیل کو سونپا" عذرا نے ٹھنڈی سانس لیکر پہلو بدلا۔

"خواہ مخواہ "بطخا" وہ سُن پائے تو" طفیل نے دھمکی دی۔

"سُن کیا پائے گا۔ تم ہی اُس سے جڑ دوگی تو سُن لے گا۔ کریگا کیا چار اُنگلی کھائے گا"

"اور وہ ---- وہ جو ہے ---- وہ کیا نام ہے ---- ذرا گنجا سا" عذرا باوجود کوشش کے نام نہ یاد کر سکی۔

"اونہہ بخشو گنجے سے تو" میں مُنہ پھلا کر بنچ پر دراز ہو کر اُونگھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"گنجا بڑا خوش قسمت ہوتا ہے" میں نے کہا تاکہ طفیل نے فلسفہ لینے کا پختہ ارادہ کر کے چھوڑ دیا تھا۔

"معاف کرو بابا ہم بدقسمت ہی بھلے" عذرا نے کان پر ہاتھ رکھکر کہا۔

اُس دن ہم میں سے کسی کا دل نہ لگا۔ نہ ہی نوٹ لئے نہ لکچر سُنا۔ کیا سُنتے؟

۴

"جتنے باہر سے دِکھائی بھی دیتا ہے کہ نہیں" زہرہ نے اپنی سفید انگلیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم میں سے کئی کو دِکھائی دینے کے خیال سے ہی پھُریری آئی اور اپنے کھُردرے خشک پیروں کو ساڑھی کے کنارے سے چھُپا لینے پر مجبور ہو گئے کہ شاید نیچے سے نظر آتے ہوں۔

"نہ جانے کیسا دِکھائی دیتا ہوگا؟" زہرہ نے پھر ایک لمبی سانس لیکر کہا۔

"چلو کچھ بھی نہیں دِکھتا ہوگا" میرا دل چاہا کاش نہ دِکھائی دیتا ہو۔ "رنگ تو شاید نہ دِکھائی دیتا ہوگا" میں نے اپنے رنگ سے ڈر کر کہا۔

"ذرا دیکھیں ـــ ہیں ـــ جب سب چلے جائیں تو باہر جاکر وہاں سے دیکھیں دکھائی بھی دیتا ہے یا نہیں" زہرہ بڑی بڑی ترکیبیں بتایا کرتی ہے۔ ویسے بڑی چپکی ہے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے" سب نے یقین سے کہا۔

"تم سب یہاں بیٹھنا اور میں وہاں سے دیکھ کر بتاؤں گی" میں نے رائے دی۔

اور جیسے ہی کلاس ختم ہوئی اور بورڈنگ کی طرف جاتے ہوئے لڑکوں کی قطاریں آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں، میں زہرہ اور طفیل کے کندھے کا سہارا لیکر کھڑکی میں لٹک گئی اور رگڑ پر پیر اڑاکر اُس تختے کو پھاند گئی جو پردے کیلئے کھڑکی میں لگایا گیا تھا۔ ساری کُہنیوں پر کھروںچے آئے اور گٹا الگ چھل گیا۔ نئی وارنش سے دونوں ہاتھ چپچپانے لگے۔ میں ذرا بڑبڑاتی ہوئی اندر کُود گئی۔

"ارـــ رے!" میں نے حیرت سے مُنہ پھاڑ دیا۔ "اُفوہ سب دکھائی دے رہا ہے"

سب نے تڑپ تڑپ کر ایک دوسرے کو ڈھکیل کر سامنے آنے کی کوشش۔

"ذرا ٹھیک سے بیٹھو تو دیکھوں بھی" میں نے کُرسی پر چڑھکر کہا۔

اور سب سج سج کر جیسے تصویر کھچوانے بیٹھ گئیں۔

"اُفوہ ـــ بالکل صاف" میں نے مبالغہ کیا اور سب مسکرائیں۔

"زہرہ تم ـــ تم تو بس صاف "لکس سوپ" اور ـــ مگر "انوسینٹ" آئیز کا پتہ نہیں ـــ شاید ـــ شاید ـــ خیر!" میں شرمانے کی کوشش کرنے لگی۔

اندر سے سب نے بغاوت پر آمادگی ظاہر کی۔ شاید میری زیادتی پر۔

"اور سُنو تو" میں نے بلوے سے ڈر کر کہا "اور تمہاری ناک زہرہ نہ چپٹی لگے اور نہ اُرد کے چھلکوں کی پھلکی جیسی۔ بس کتارہ سی نظر آ رہی ہے" زہرہ نے خوشی سے عذرا کے چُٹکی لی۔

"مگر تمہارے پیر سعیدہ اور چپلوں میں سے کتھئی موزے ـــ" میں رک گئی۔

"لو میں موزے کب پہنے ہوں" سعیدہ نے شرما کر پیر اُونچے کر لئے۔

"سُنو تو" زہرہ کے گالوں کی سُرخی دھوئے گُلاب کی طرح چمکی "اُدھر سے تو دیکھو ذرا وہاں سے "ہم لوگ" کیسے دکھائی دیتے ہیں" وہ ذرا آنکھیں جھکا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی اُونچی ہو کر۔

"کوئی خاص نہیں ـــ ہا ـــ آں۔ مگر تمہارا دہانہ اِدھر سے ذرا پھیلا پھیلا نظر آ رہا ہے" میں نے گپ ماری اور زہرہ نے جلدی سے دہانہ سکیڑ لیا۔

"اور تمہاری آنکھیں تو دِکھائی ہی نہیں دیتیں" میں نے سعیدہ کا دل دُکھایا۔

"اور نہ تمہارے بالوں کی لٹیں" میں نے سعیدہ کے بڑبڑانے کی پروا نہ کرکے طفیل کو جلایا۔

"اور وہاں سے ـــ وہاں دیکھو" عذرا نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"کہاں سے؟ ـــ بھینگے کی سیٹ پر سے" میں نے دوسری لائن میں آکر کہا۔ عذرا ہٹ گئی۔

"لاؤ تمہارے بطخے کی سیٹ پر سے بھی دیکھ دوں" میں نے طفیل پر چھینٹا پھینکا۔

"اور وہاں سے پروفیسر صاحب کی کُرسی کے پاس سے" سعیدہ نے شوق کو چھُپا کر کہا۔

اوہو سعیدہ! ہمیشہ اُونچا ہاتھ مارتی تھی، ہمت تو دیکھو۔

"یہاں سے ـــ یہاں سے تم تو دِکھائی بھی نہیں دیتیں" میں نے جھوٹ بول کر جی ٹھنڈا کیا۔

سعیدہ نے پورا پردہ ہٹا دیا مگر میں نے اُسے دیکھنے سے قطعی اِنکار کر دیا۔

"اونہہ، اوّل تو دکھائی نہیں دیتیں جو ذرا سا دکھائی بھی پڑتی ہو تو بہت کالی موٹی اور بھدی" سعیدہ نے ڈر کر پردہ گرا دیا۔

سعیدہ موٹی تھی تو کیا تھا، کمزور تو حد سے زیادہ تھی بیچاری۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے۔

"دیکھو میں بتاؤں تم لوگ کیسے کیسے بیٹھا کرو۔" میں نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" سب شوق بھری آواز سے راضی ہو گئیں۔

"دیکھو تم ذرا اِدھر سرکو زہرہ ---- اِدھر ---- اِدھر بھئی۔" میں نے اُسے دونوں طرف سرکنے سے روکا۔ اور پھر کہا "بھئی اُدھر نہیں اِدھر اور اِدھر نہیں اُدھر۔"

"اُفّو تو کدھر سرکوں بھئی" زہرہ عاجز آ گئی۔ سرکتے سرکتے عاجز آ گئی پر میری نظر میں نہ جچی۔

"اور تم دائیں طرف سرکو عذرا ---- ہاں ---- اور سرکو ذرا ----"

"بھئی ---- میرے اُوپر کیوں چڑھی چلی آتی ہو۔ ہٹو" زہرہ اپنی جگہ سے ہل جانے کے خوف سے لڑ پڑی۔

"اے بہن۔ تو ذرا اُدھر ہٹو نا" عذرا نے زہرہ پر لد کر کہا۔ دونوں ایک ہی جگہ پر اڑ کر ایک دوسرے کو بھینچنے لگیں۔

"بھئی کیا مصیبت ہے عذرا" زہرہ غرّائی۔ مگر عذرا ڈٹی رہی۔

"اور میں کدھر بیٹھوں؟" سعیدہ نے آہستہ سے پوچھا بیچاری مجھ سے ڈرتی تھی۔

"اگر تم طفیل کی جگہ بیٹھو تو صاف اور اچھی دکھائی پڑو۔"

"ہٹنا ذرا بہن طفیل" سعیدہ نے ذرا پیار سے کہا۔

"بھئی میری کتابیں اِدھر رکھی ہیں" طفیل اپنی جگہ ہاتھ سے کیوں دیتی۔ اچھی اور عمدہ جگہ!

"اے ہے ایسا بھی کیا۔ ذرا سرک جاؤ نا اُدھر" سعیدہ نے خوشامد کی۔

"کوئی اور جگہ نہیں ہے جو میرے ہی سر پر چڑھو گی" طفیل چیخی اور ننھے سے جسم کو اکڑا لیا۔

"اچھا تم زہرہ نمبر ۲ کے دائیں ہاتھ پر آ جاؤ" میں نے دونوں دوستوں کی لڑائی سے ڈر کر کہا۔

زہرہ نمبر ۲ جھٹ پھدک کر اپنے ہی دائیں ہاتھ پر آن بیٹھی۔

"لو؟" سعیدہ نے مُردہ آواز میں کہا "بھئی کہہ دیا ہم لوگوں میں ذرا بھی ---- وہ نہیں ----"

"تو تم عذرا کی جگہ آ جاؤ" میں نے رائے دی۔

"بھئی میں کیوں اپنی جگہ سے ہٹوں واہ" عذرا بھویں چڑھا کر مُسکرائی۔

"اچھا تم وہاں سیڑھیوں کی طرف روشنی میں بیٹھو" میں نے کہا۔

سب رشک سے دیکھتے ہی رہ گئے اور سعیدہ عین روشنی میں اپنا مسکراتا ہوا چہرہ جالی سے لگا کر انتظار میں بیٹھ گئی کہ میں اب بولوں اور اب بولوں۔

میں نے دو ایک دفعہ اِدھر اُدھر جھک کر دیکھا اور منہ بنا لیا

"میں اب بھی صاف نہیں دکھائی دیتی؟" سعیدہ نے اُمید بھری آواز سے پوچھا۔

"نہیں!" میں نے جیسے ذلیل ہو کر کہا اور اسکی مُسکراہٹ کس قدر اُداس ہو گئی!۔

میں نے اِسے دیکھکر ہی نہ دیا۔

"چاپ ---- چاپ ---- چر ---- چر" اور قہقہہ ----!

لڑکے دوسری میٹنگ میں واپس آ رہے تھے۔ سعیدہ کا بُرا صبر پڑا۔ میں پر کٹی چڑیا کی طرح بچوں پر چھلانگیں مارنے لگی۔ کرسی اور اُس کے اُوپر ایک اور کرسی۔ کھڑکی میں آئی ---- ساڑھی چٹخنی میں پھنس گئی اور یہ بڑا کھونٹا صدری میں لگا مگر میں کود پڑی ---- چوڑیاں ٹوٹ کر اندر ہی رہ گئیں اور چُورا میری کلائی میں پیوست ہو گیا۔ وہ تو کہو عینک بچ گئی۔

"دھڑ... دھڑ.. دھڑڑ... کوئی باہر دروازے کو کوٹ رہا تھا۔ ارے!! باوجود اس سیاہی کے اس وقت میں سفید پڑ گئی۔ میں اندر سے دروازے بند کر آئی تھی!!

سُنا ہے دوسرے دن لڑکوں پر ڈانٹ پڑی کہ کرسیوں پر چڑھکر لڑکیوں کو جھانکتے ہیں۔ بچارے بچے کچھ نہ بولے!

عصمت چغتائی

ایکٹریس کی آنکھ

"پاپوں کی گٹھڑی" کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی، رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کیلئے خاص طور پر تیار کرایا تھا اور جس میں فرصت کے اوقات میں سب ایکٹر اور ایکٹریس سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، صوفوں اور اور کرسیوں پر اونگھ رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی سی تپائی کے اُوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اَوندھی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دُور کرنے کے لئے ان ایکٹروں نے پی تھیں۔ ان پیالیوں پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سُن کر کسی نووارد کو یہی معلوم ہوتا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔

دراز قد ولن جو شکل و صورت سے لاہور کا کوچوان معلوم ہوتا تھا، ریشمی سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز تھا۔ آنکھیں کھُلی تھیں اور منہ بھی نیم وا تھا، مگر وہ سو رہا تھا۔ اسی طرح اس کے پاس ہی آرام کرسی پر ایک مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا ایکٹر اُونگھ رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس ڈنڈے سے ٹیک لگائے ایک اور ایکٹر سونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ کمپنی کے مکالمہ نویس یعنی منشی صاحب، ہونٹوں میں بیڑی دبائے اور ٹانگیں، میک اپ ٹیبل پر رکھے، شاید وہ گیت بنانے میں مصروف تھے جو انہیں چار بجے سیٹھ صاحب کو دکھانا تھا۔

"اُوئی، اُوئی، اُوئی ..... ہائے ... ہائے"

دفعتاً یہ آواز باہر سے اس چوبی کمرے میں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہوئی۔ ولن صاحب جھٹ سے اُٹھ بیٹھے اور اپنی آنکھیں ملنے لگے۔ مونچھوں والے ایکٹر کے لمبے لمبے کان ایک ارتعاش کے ساتھ اس نسوانی آواز کو پہچاننے کے لئے تیار ہوئے۔ منشی صاحب نے میک اپ ٹیبل پر سے اپنی ٹانگیں اُٹھالیں اور ولن صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

"اُوئی، اُوئی، اُوئی ــــ ہائے .... ہائے!"

اس پر، ولن، منشی اور دوسرے ایکٹر جو نیم غنودگی کی حالت میں تھے چونک پڑے، سب نے کاٹھ کے اس بکس نما کمرے سے اپنی گردنیں باہر نکالیں۔

"ارے، کیا ہے بھئی!"

"خیر تو ہے!"

"کیا ہوا؟"

"اماں، یہ تو ــــ دیوی ہیں!"

"کیا بات ہے! دیوی؟"

جتنے مُنہ اتنی باتیں ــــ کھڑکی میں سے نکلی ہوئی ہر گردن بڑے اضطراب کے ساتھ متحرک ہوئی اور ہر ایک کے مُنہ سے گھبراہٹ میں ہمدردی اور استفسار کے ملے جُلے جذبات کا اظہار ہوا۔

"ہائے، ہائے، ہائے ــــ اُوئی ــــ ئی، ئی!"

ــــ دیوی، کمپنی کی ہر دلعزیز ہیروئن کے چھوٹے سے مُنہ سے چیخیں نکلیں اور باہوں کو انتہائی کرب و اضطراب کے تحت ڈھیلا چھوڑ کر اُسنے اپنے چپّل پہنے پاؤں کو زور زور سے اسٹیڈیو کی پتھریلی زمین پر مارتے ہوئے زور سے چلانا شروع کر دیا۔

ٹھمکا ٹھمکا بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل، کھُلتی ہوئی گندمی رنگت، خُوب خُوب کالی کالی تیکھی بھنویں، کھُلی پیشانی پر گہرا کسوم کا ٹیکا ــــ بال کالے بھونرا سے اور سیدھی مانگ نکال کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دیکر کنگھی کئے ہوئے، ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے شہد کی بہت سی مکھیاں چھتّہ پر بیٹھی ہوئی ہیں۔

کنارے دار سفید سوتی ساڑھی میں لپٹی ہوئی، چولی گجراتی تراش کی تھی، بغیر آستینوں کے، جن میں سے جوبن پھٹا پڑتا تھا، ساڑھی بمبئی کے طرز سے بندھی تھی۔ چاروں طرف میٹھا میٹھا جھول دیا ہوا تھا۔ اچھی گول گول کلائیاں جن میں کھُلی کھُلی جاپانی ریشمن چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں۔ اِن ریشمین چوڑیوں میں ملی ہوئی اِدھر اُدھر ولائتی سونے کی پتلی پتلی کنگنیاں جھم جھم کر رہی تھیں ــــ کان موزوں اور لویں بڑی خوبصورتی کے ساتھ نیچے جھکی ہوئیں، جن میں ہیرے کے آویزے، شبنم کی دو تھرائی ہوئی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں۔

چیختی چلاتی، اور زمین کو چپل پہنے پیروں سے کوٹتی، دیوی نے داہنی آنکھ کو ننھے سے سفید رومال کے ساتھ ملنا شروع کر دیا۔

"ہائے، میری آنکھ ــــ ہائے میری آنکھ ــــ ہائے!"

کاٹھ کے بکس سے باہر نکلی ہوئی کچھ گردنیں اندر کو ہوگئیں اور

جو باہر تھیں، پھر سے ہلنے لگیں۔

"آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے؟"

"یہاں کنکر بھی تو بیشمار ہیں ـــ ہوامیں اڑتے پھرتے ہیں"

"یہاں جھاڑو بھی تو چھ مہینے کے بعد دی جاتی ہے"

"اندر آجاؤ، دیوی"

"ہاں، ہاں، آؤ ـــ آنکھ کو اس طرح نہ ملو"

"ارے بابا ـــ بولا نہ تکلیف ہو جائیگی ـــ تم اندر تو آؤ"

آنکھ ملتی ملتی، دیوی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی۔

ولن نے لپک کر تپائی پر سے بڑی صفائی کے ساتھ ایک رومال میں چاء کی پیالیاں سمیٹ کر میک اپ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے چھپا دیں اور اپنی پرانی پتلون سے ٹیبل کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ باقی ایکٹروں نے کرسیاں اپنی اپنی جگہ پر جما دیں اور بڑے سلیقے سے بیٹھ گئے۔ منشی صاحب نے پرانی ادھ جلی بیڑی پھینک کر جیب سے ایک سگرٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔

دیوی اندر آئی۔ صوفے پر سے منشی صاحب اور ولن اٹھ کھڑے ہوئے۔ منشی صاحب نے بڑھکر کہا: "آؤ، دیوی یہاں بیٹھو"

دروازے کے پاس بڑی بڑی سیاہ و سفید مونچھوں والے بزرگ بیٹھے تھے، اُن کی مونچھوں کے لٹکے اور بڑھے ہوئے بال تھرتھرائے اور انہوں نے اپنی نشست پیش کرتے ہوئے گجراتی لہجے میں کہا۔

"ادھر بیٹھو!"

دیوی اُن کی تھرتھراتی ہوئی مونچھوں کی طرف دھیان دئے بغیر آنکھ ملتی اور ہائے ہائے کرتی آگے بڑھ گئی۔ ایک نوجوان نے جو ہیرو سے معلوم ہو رہے تھے اور بھینسی بھینسی قمیص پہنے ہوتے تھے، جھٹ سے ایک چوکی نما کرسی سرکا کر آگے بڑھا دی اور دیوی نے اُس پر بیٹھ کر اپنی ناک کے بانسے کو رومال سے رگڑنا شروع کر دیا۔

سب کے چہرے پر دیوی کی تکلیف کے احساس نے ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ منشی صاحب کی قوتِ احساس چونکہ دوسرے مردوں سے زیادہ تھی اس لئے چشمہ ہٹا کر انہوں نے اپنی آنکھ ملنا شروع کر دی تھی۔

جس نوجوان نے کرسی پیش کی تھی، اُس نے جھک کر دیوی کی آنکھ کا ملاحظہ کیا اور بڑے مفکرانہ انداز میں کہا: "آنکھ کی سُرخی بتا رہی ہے کہ تکلیف ضرور ہے"

ان کا لہجہ پھٹا ہوا تھا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ کمرہ گونج اُٹھا۔

یہ کہنا تھا کہ دیوی نے اَور زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور سفید ساڑھی میں اُس کی ٹانگیں اضطراب کا بے پناہ مظاہرہ کرنے لگیں۔

ولن صاحب آگے بڑھے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنی سخت کمر جھکا کر دیوی سے پوچھا: "جلن محسوس ہوتی ہے یا چبھن!"

ایک اور صاحب جو اپنے سولا ہیٹ سمیت کمرے میں ابھی ابھی تشریف لائے تھے، آگے بڑھ کے پوچھنے لگے: "پپوٹوں کے نیچے رگڑ سی تو محسوس نہیں ہوتی"

دیوی کی آنکھ سُرخ ہو رہی تھی۔ پپوٹے ملنے اور آنسوؤں کی نمی کے باعث میلے میلے نظر آ رہے تھے۔ چتونوں میں سے لال لال ڈوروں کی جھلک چک میں سے غروبِ آفتاب کا سُرخ سُرخ منظر پیش کر رہی تھی۔ داہنی آنکھ کی پلکیں نمی کے باعث بھاری اور گھنی ہو گئی تھیں، جس سے اُن کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ باہیں ڈھیلی کر کے دیوی نے دُکھتی آنکھ کی پتلی نچاتے ہوئے کہا۔

"آں... بڑا تکلیپھ ہوتی ہے... ہائے... اوئی!" اور پھر سے آنکھ کو گیلے رومال سے ملنا شروع کر دیا۔

سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے جو کونے میں بیٹھے تھے، بلند آواز میں کہا: "اس طرح آنکھ نہ رگڑو، خالی پیلی کوئی اور تکلیپھ ہو جائینگا"

"ہاں، ہاں.... ارے، تم پھر وہی کر رہے ہو" پھٹی آواز والے نوجوان نے کہا۔

ولن جو فوراً ہی دیوی کی آنکھ کو ٹھیک حالت میں دیکھنا چاہتے تھے، بگڑ کر بولے: "تم سب بیکار باتیں بنا رہے ہو...... کسی سے ابھی تک یہ بھی نہیں ہوا کہ دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے..... اپنی آنکھ میں یہ تکلیف ہو تو پتہ چلے...." یہ کہکر انہوں نے مڑ کر کھڑکی میں سے باہر گردن نکالی اور زور زور سے پکارنا شروع کیا: "ارے... کوئی ہے.... کوئی ہے؟ ـــ گلاب؟ ـــ گلاب!"

جب اُن کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی تو انہوں نے گردن اندر کو کر لی اور بڑبڑانا شروع کر دیا: "خدا جانے ہوٹل والے کا یہ چھوکرا کہاں غائب ہو جاتا ہے.... پڑا اونگھ رہا ہوگا اسٹیڈیو میں کسی تختے پر ـــ مردود، نابکار!" پھر فوراً ہی دور اسٹیڈیو کے اُس طرف گلاب کو دیکھ کر چلائے، جو انگلیوں میں چاء کی پیالیاں لٹکائے چلا آ رہا تھا: "ارے گلاب ـــ گلاب!"

گلاب بھاگتا ہوا آیا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ ولن صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اُس سے کہا: "دیکھو! ایک گلاس میں

پانی لاؤ... جلدی سے... بھاگو!"

گلاب نے کھڑے کھڑے اندر جھانکا، یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ گڑبڑ کیا ہے ـــ اس پر ہیرو صاحب للکارے "ابے دیکھتا کیا ہے ـــ لا، نا گلاس میں تھوڑا سا پانی ـــ بھاگ کے جا، بھاگ کے!"

گلاب سامنے، ٹین چھاتے ہوئے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔ دیوی کی آنکھ میں چبھن اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور اُس کی بنارسی لنگڑے کی کیری ایسی ننھی منی ٹھوڑی روتے بچے کی طرح کانپنے لگی اور روہ اُٹھکر درد کی شدت سے کراہتی ہوئی سوفے پر بیٹھ گئی۔ دستی بٹوے سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آئینہ نکال کر اُس نے اپنی دُکھتی آنکھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اتنے میں منشی صاحب بولے "گلاب سے کہدیا ہوتا ـ پانی میں تھوڑی سی برف بھی ڈالتا لائے!"

"ہاں، ہاں، سرد پانی اچھا رہے گا" یہ کہہ کر ولن صاحب کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر چلائے "گلاب ـــ ارے گلاب ـ پانی میں تھوڑی سی برف چھوڑ کے لانا"

اِس دَوران میں ہیرو صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے، کہنے لگے "میں بولتا ہوں کہ رومال کو سانس کی بھاپ سے گرم کرو اور اس سے آنکھ کو سینک دو ـــ کیوں دادا؟"

"ایکدم ٹھیک رہے گا!" سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے سر کو اثبات میں بڑے زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

ہیرو صاحب کھونٹیوں کی طرف بڑھے اور اپنے کوٹ میں سے ایک سفید رومال نکال کر دیوی کو سانس کے ذریعے سے اس کو گرم کرنے کی ترکیب بتائی اور الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ دیوی نے رومال لے لیا اور اُسے منہ کے پاس لے جا کر گال پُھلا پُھلا کر سانس کی گرمی پہونچائی، آنکھ کو ٹکور دی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔

"کچھ آرام آیا؟" سولا ہیٹ والے صاحب نے دریافت کیا۔

دیوی نے روتی آواز میں جواب دیا "نہیں... نہیں... ابھی نہیں نکلا... میں مر گئی!..."

اتنے میں گلاب پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ ہیرو اور ولن دوڑ کر بڑھے اور دونوں نے ملکر دیوی کی آنکھ میں پانی چوایا۔ جب گلاس کا پانی آنکھ کو غسل دینے میں ختم ہو گیا تو دیوی کچھ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور آنکھ جھپکانے لگی۔

"کچھ افاقہ ہوا؟"

"اب تکلیف تو نہیں ہے؟"

"کنکری نکل گئی ہوگی"

"بس تھوڑی دیر کے بعد آرام آجائیگا!"

آنکھ دُھل جانے پر پانی کی ٹھنڈک نے تھوڑی دیر کیلئے دیوی کی آنکھ میں چُبھن رفع کر دی، مگر فوراً ہی پھر سے اُس نے درد کے مارے چلانا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے ایک صاحب باہر سے اندر آئے اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر معاملے کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔

نو وارد کُہنہ سال ہونے کے باوصف چُست و چالاک معلوم ہوتے تھے۔ مونچھیں سفید تھیں، جو بیڑی کے دھوئیں کے باعث سیاہی مائل زرد رنگت اختیار کر چکی تھیں۔ اُن کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ فوج میں رہ چکے ہیں۔

سیاہ رنگ کی ٹوپی سر پر ذرا اِس طرف ترچھی پہنے ہوئے تھے۔ پتلون اور کوٹ کا کپڑا معمولی اور خاکستری رنگ کا تھا۔ کولھوں اور رانوں کے اُوپر پتلون میں پڑے ہوئے جھول اس بات پر چغلیاں کھا رہے تھے کہ اُن کی ٹانگوں پر گوشت بہت کم ہے۔ کالر میں بندھی ہوئی مَیلی نکٹائی کچھ اس طرح نیچے لٹک رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، وہ اُن سے روٹھی ہوئی ہے۔ پتلون کا کپڑا گھٹنوں پر سے کھچ کر آگے بڑھا ہوا تھا' جو یہ بتا رہا تھا کہ وہ اس بے جان چیز سے بہت کڑا کام لیتے رہے ہیں۔ گال بڑھاپے کے باعث پچکے ہوئے، آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں' جو بار بار شانوں کی عجیب جُنبش کے ساتھ سُکیڑ لی جاتی تھیں۔

آپ نے کاندھوں کو جنبش دی اور ایک قدم آگے بڑھکر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا "کنکر پڑ گیا ہے کیا؟" اور اثبات میں جواب پا کر دیوی کی طرف بڑھے۔ ہیرو اور ولن کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کر کے آپ نے کہا "پانی سے آرام نہیں آیا ـــ خیر ـــ رومال ہے کسی کے پاس؟"

نصف درجن رومال اُن کے ہاتھ میں دیدئیے گئے۔ بڑے ڈرامائی انداز میں آپ نے اِن پیش کردہ رومالوں میں سے ایک مُنتخب کیا، اور اُس کا ایک کنارا پکڑ کر دیوی کو آنکھ پر سے ہاتھ ہٹا لینے کا حکم دیا۔

جب دیوی نے اُن کے حکم کی تعمیل کی تو اُنہوں نے جیب میں سے مداری کے سے انداز میں ایک چرمی بٹوا نکالا اور اس میں سے اپنا چشمہ نکال کر کمال احتیاط سے ناک پر چڑھا لیا۔ پھر چشمے کے شیشوں میں سے

دیوی کی آنکھ کا دُور ہی سے اکڑ کر معائنہ کیا۔ پھر دفعتاً فوٹوگرافر کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے آپ نے اپنی ٹانگیں چوڑی کیں اور جب اُنہوں نے اپنی پتلی پتلی اُنگلیوں سے دیوی کے پپوٹوں کو وا کرنا چاہا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ فوٹو لیتے وقت کیمرے کا لینس بند کر رہے ہیں۔

دو تین مرتبہ ڈرامائی انداز سے اپنے کھڑے ہونے کا رُخ بدل کر اُنہوں نے دیوی کی آنکھ کا معائنہ کیا اور پھر پپوٹے کھول کر بڑی آہستگی سے رومال کا کنارہ اُن کے اندر داخل کر دیا۔۔۔ حاضرین خاموشی سے اس عمل کو دیکھتے رہے۔

پانچ منٹ تک کمرے میں قبر کی سی خاموشی طاری رہی۔ آنکھ صاف کرنے کے بعد اُسی ڈرامائی انداز میں فوٹوگرافر صاحب نے..... چونکہ وہ بزرگ فوٹوگرافر ہی تھے..... چشمہ اتار کر چرمی بٹوے میں رکھکر دیوی سے کہا "اب کنکر نکل گیا ہے۔۔۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا!"

دیوی نے اُنگلیوں سے آنکھ کے پپوٹوں کو چھوا اور ننھا سا آئینہ نکال کر اپنا اطمینان کرنے لگی۔

"کنکری نکل گئی نا؟"

"اب درد محسوس تو نہیں ہوتا!"

"سالا، اب نکل گیا ہوگا۔۔۔ بہت دُکھ دیا ہے اُس نے!"

"دیوی... اب طبیعت کیسی ہے؟"

یہ شور سُن کر فوٹوگرافر صاحب نے کاندھوں کو زور سے جنبش دی اور کہا "تم سارا دن کوشش کرتے رہتے مگر کچھ نہ ہوتا..... ہم فوج میں پچیس برس بھاڑ نہیں جھونکتا رہا..... یہ سب کام جانتا ہے..... کنکر نکل گیا ہے، اب صرف جلن باقی ہے، وہ بھی دُور ہو جائے گی!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دیوی جو آئینے میں روتی صورت بنائے اپنا اطمینان کر رہی تھی، ایکا ایکی مسکرائی اور پھر کھل کھلا کر ہنس دی۔۔۔ چوبی کمرے میں مترنم تارے بکھر گئے۔

"اب آرام ہے..... اب آرام ہے!" یہ کہکر دیوی سیٹھ کی جانب روانہ ہو گئی، جو ہوٹل کے پاس اکیلا کھڑا تھا، اور سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔

ہیرو جب صوفے پر بیٹھنے لگا تو منشی صاحب کی ران نیچے دب گئی۔ آپ بھنا گئے "اب کیا پھر سونے کا ارادہ ہے۔۔۔ چلو بیٹھو مجھے کل والے سین کے ڈائلاگ سُناؤ!"

ہیرو کے دماغ میں اُس وقت کوئی اور ہی سین تھا۔

سعادت حسن منٹو

میرانجھا

سرکنڈے کے چھپّر تلے ایک عورت بیٹھی تھی، اور کچھ دُور تالاب کے سبز پانی میں ایک دوشیزہ گاگر گھما رہی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ حدِ نظر تک سینۂ صحرا لرز رہا تھا۔ جوہڑ کے کنارے بیری کا ایک ٹنڈ منڈ درخت دُھوپ میں اکڑ گیا تھا۔ گاؤں کے جو پندرہ بیس گھر تھے، اُن پر قبر کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چھپّر اور تالاب کے وسط میں ایک بیمار کمزور کتیا دُم لٹکائے ایک جھاڑی کی طرف رینگتی جا رہی تھی ———— !

اچانک عورت کھنکارتے ہوئے زور سے پُکاری: "ہے آمی، اری وہیں جا کر مرگئی۔ تجھے گاگر گھماتے میں بڑا مزا آتا ہے! ایک ڈبکی دے لے اور لپک کر اِدھر آ۔ میرے پاؤں ٹوٹ رہے ہیں!"

[illegible] رہے ہیں! آمی کی آنکھیں، جو آسمان کی طرح نیلی اور سیپی کی طرح صاف تھیں جھپک گئیں۔ کیا بہانہ ہے! پاؤں ٹوٹ رہے ہیں! وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک اور آواز آئی، "اری سُن رہی ہے تو کہ مجھے اُدھر آنا پڑے گا؟ پچھل پائی! تو تو اب من مانی باتیں کرنے لگی۔ آنے دے اپنے چچا کو۔ حرامزادی کی چوٹی کٹوا دوں گی!"

آمی نے گاگر کھینچ کر سر پر دھر لی۔ پانی دو ایک بار چھلکا، اور اس کے شانوں اور سینے پر آگرا۔ اُس کا لباس اس کے جسم پر چپک گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چھپّر تک پہونچی۔ گاگر کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اُتارنے کے لئے جھٹکا جو دیا تو ———— دھڑاک کی آواز آئی۔ گاگر کی گردن آمی کی اُنگلیوں میں تھی اور دھڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر بکھرا پڑا تھا۔ پانی ایک ندی کی صورت میں دُور تک بہتا چلا گیا!

عورت کھاٹ سے اُچھل کر آمی کے پاس آئی، اور بغیر سوچے سمجھے چار پانچ دو ہتڑ جما دئے۔ آمی کے گال لال پڑ گئے۔ آنکھوں میں پانی آگیا۔ ہونٹوں کو تھرتھری چُھوٹ گئی۔ بُت بن کر رہ گئی۔ اور اُس کی باتیں سُنتی رہی: "ڈائن، تیرے نخروں کی کوئی حد بھی ہے؟ پرسوں پیالہ توڑ ڈالا۔ کل اپنے چچا کا حقّہ تازہ کرتے کرتے اُسے اوندھا مارا۔ آج گھڑے کو موت کے گھاٹ اُتار کر ٹک ٹک مجھے گھُور رہی ہے، جیسے میں نے ہی تو کہا تھا کہ اِسے زمین پر دے مار۔ بدذات، تُو تو میری گردن پر سوار ہوئی جا رہی ہے!"

آمی گاگر کے ٹکڑے اُٹھا کر چھپّر سے دُور جھاڑی میں پھینک آئی۔ بیمار کُتیا چیخ کر جھاڑی سے اُٹھی اور تالاب کے سبز پانی میں گھُس گئی۔ آمی کے آنسو آگئے۔

واپس آئی۔ اور پائنتی پر بیٹھ کر اُس کے پاؤں دبانے لگی۔ روتی رہی۔ اور اُس کے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک ڈھلک کر اُس کی جھولی میں گرتے رہے۔ موٹے کھدر کی مَیلی چیکٹ قمیص بھیگ گئی۔ آنکھوں کے ڈوروں میں آگ جلنے لگی۔ کنپٹیوں میں جیسے کوئی چاقو چبھو رہا ہے۔ وہ چاہتی تھی زور زور سے روئے اور دُنیا کو بتائے کہ میں بچپن سے یہاں عذاب جھیل رہی ہوں۔ مجھے کھانے کیلئے جَو کی روٹی ملتی ہے اور پینے کیلئے اس غلیظ جوہڑ کا سبز پانی۔ ایک ایک گھونٹ میں دس دس کیڑے ہوتے ہیں ———— میرے سونے کے لئے اب تک میرے چچا چچی کو ایک ٹوٹی کھاٹ کے سوا کچھ میسّر نہیں آیا۔ میں کون ہوں، میں یہاں کیسے آئی؟ میرے ماں باپ کون ہیں! میں پیدا ہوتے ہی اس دُنیا میں اجنبی بن کر کیوں رہ گئی!"

اُس کے دل سے یہ آوازیں روزانہ اُٹھتی تھیں۔ اور اُس کی رگ رگ میں آگ بھڑکا کر پھر دل کی گہرائیوں میں سو جاتی تھیں۔ جیسے کھلے سمندروں میں طوفان آتے ہیں۔ تھپیڑوں سے موجوں کو اُوپر اُچھال کر چلے جاتے ہیں۔ اور موجیں پھر نیچے جا کر سو رہتی ہیں!

اس کا چچا اس پر مہربان تھا۔ مگر اُس کی مہربانی صرف اس حد تک پہونچی تھی کہ وہ اُسے جھڑکتا نہ تھا۔ کبھی کبھی سر پر ہاتھ پھیر دیتا تھا۔ گاہے گاہے "بیٹی" کہہ کر پکار لیتا تھا۔ وقتاً فوقتاً بیوی کو یہ بھی کہہ دیا کرتا تھا کہ اِسے گیہوں کی روٹی پکا دیا کرے۔ اس لئے آمی کو اُس سے اُنس تھا۔ اور جب وہ آتا تھا تو وہ سمجھتی تھی کہ یک بیک اُسکے سر پر سے کسی نے دُشمن کی چٹان اُٹھا کر پرے دھر دی ہے!

لیکن پھر بھی وہ اِس آباد گھر میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتی تھی۔ چچی کے پاؤں پنڈلیاں دباتے دباتے اُس کی اُنگلیوں میں ورم آجاتا۔ اور جب اُس کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑنے لگتی تو چچی کا بھاری ہاتھ اس زور سے

اُس کے تالو پر پڑتا کہ وہ سمجھتی کہ اُس کا سر دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا ہے!

کئی بار وہ اونچی چٹانوں سے نیچے کود پڑنے کو تیار ہو جاتی کئی بار خوفناک تالابوں میں ڈوب مرنے کو دوڑ پڑتی۔ لیکن اُسے جو چٹان ملتی وہ پست ہوتی۔ اور جو تالاب ملتا وہ پایاب ہوتا۔ فوری موت کے خواہشمند کو اکثر تیز خنجر نصیب نہیں ہوا کرتا! پھر وہ مرنے سے کچھ نہ کچھ ڈرتی بھی ضرور تھی۔ اُس نے اپنی ایک سہیلی کو دم توڑتے دیکھا تھا اور وہ سوچا کرتی تھی کہ مرنا ضرور کوئی تکلیف دہ مرحلہ ہے۔ کیونکہ اس کی سہیلی موسم سرما میں نرم و گرم بستر پر لیٹے ہوتے بھی پسینے سے شرابور ہوتی جا رہی ہے!

زندگی اجیرن ہو رہی۔ اُس کیلئے دن اندھیرے میں لپٹے ہوئے تھے۔ اور ع:۔

رات تو پھر بھی رات ہوتی ہے!

اُس کے دل کی خلوتوں سے راتوں کو ایک دبا دبا نغمہ بلند ہوتا ــــ ایک دکھی دکھی نغمہ ــــ کاش میرا بھی کوئی غمگسار ہوتا! کاش مجھے بھی کوئی تسلیاں دے سکتا! کاش میں بھی کسی کو اپنا کہہ کر پکار سکتی۔ ہم دن کو اکٹھے ویران گھاٹیوں میں آوارہ پھرتے رہتے۔ راتوں کو ہم اکٹھے آسمان پر نگاہیں گاڑ کر تارے گنتے گنتے سو جاتے ــــ ایک سہیلی تھی وہ بھی چل بسی! اب میرا اس دُنیا میں کون ہے! ــــ میرا اس دُنیا میں کون ہے!

آمامی کو اپنے متعلق یہ بہت بڑی غلط فہمی تھی کہ اُس کا اِس دُنیا میں کوئی نہیں تھا۔ گاؤں کے تقریباً سارے خوشرو نوجوان اُس کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ اور ایک نوجوان دوست محمد کے متعلق تو یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ وہ "ہیر" گاتے گاتے ہیر کی جگہ آمامی کا نام لگا دیتا ہے اور رانجھے کی جگہ اپنا! چوپال والے اُسے اس پر جھڑکتے ہیں۔ اور وہ کہتا ہے کہ سچی بات کو چھپانا اُس کی فطرت میں نہیں!۔

آمامی نے بھی اُڑتی سی خبر سُنی کہ دوست محمد نے رات کو ہیر کی جگہ آمامی کا نام لیا تھا!

اور اگر چچا چچی سُن پائیں!

مگر آمامی کے گرد و غبار سے اَٹے ہوئے دل نے یک بیک ایک پھریری لی۔ اُسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ اُس کے سینے میں بھی ایک دل ہے اور وہ دھڑکتا بھی ہے۔ وہ جب غلیظ جوہڑ سے پانی بھرنے گئی تو بہت دیر تک سبز پانی میں اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اور گاگر اُٹھاتے ہوئے بڑے شرمیلے، مدھم مگر میٹھے انداز میں بولی "میرا رانجھا!"

اُسے محسوس ہوا جیسے بیری کے خشک پتوں پر کسی نے ہولے سے قدم رکھا ہے! اب اُٹھایا ہے، اب رکھا ہے، پھر اُٹھایا پھر رکھا ہے! کوئی اُس کی طرف آ رہا ہے! اِس چلچلاتی دھوپ میں کسی کا اِس گندے بدبودار جوہڑ پر کیا کام! اُس نے خوفزدہ ہرنی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا۔ گاگر نے چھلک کر اس کا منہ بھگو دیا! ایک طرف سے دوست محمد ڈرتے ڈرتے قدم اُٹھاتا اُس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ پلٹ کر تیز تیز قدم اُٹھانے لگی۔

"آمامی!"

"کون ہو تم؟" اُس نے بغیر مڑے پوچھا۔

"تمہارا رانجھا!"

آمامی وحشت زدہ ہو کر بھاگنے لگی۔ گاگر چھلک کر آدھی رہ گئی۔ کپڑے بھیگ گئے۔ بھیگا ہوا آنچل گھسٹتے گھسٹتے مٹی میں لت پت ہو گیا۔ جھونپڑے تک پہنچی۔ گھڑا ایک طرف رکھ دیا۔ مڑ کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ چچی پرلی طرف مکان کے سامنے بیٹھ کر ریلے کتر رہی تھی، پکار رہی تھی "آمامی۔ کیا جوہڑ میں کپڑوں سمیت نہاتی رہی ہے! کلموہی۔ یہ رنگ تو اچھے نہیں۔ تو رج تو توکل کلاں یہاں سے بھاگ کھڑی ہو گی!"

لیکن آمامی کی سانسیں اُلجھی ہوئی تھیں اور رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اس نے بہت دیر کے بعد تالاب کی طرف دیکھا۔ بیری کا ٹھنڈ منڈ درخت تالاب میں اپنے کبڑے جسم کا عکس دیکھ رہا تھا۔ اور اُسکے آخری ٹھنڈ پر ایک کوا بیٹھا زور زور سے کائیں کائیں کر رہا تھا۔

"میرا رانجھا!" آمامی نے گاگر کو ایک جگہ جماتے ہوئے اپنے آپ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

اُسے اکثر راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ مگر اُس رات کی بیداری میں ایک مزا تھا۔ ایک کیف تھا جو اُسے بُری طرح مخمور کئے ڈالتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ یونہی جاگتی رہے! ابد تک جاگتی رہے۔! اُس کے ہونٹ یونہی بھاری رہیں۔ اُس کا سینہ یونہی جلتا رہے! اُس کے بھاری ہونٹوں اور جلتے سینے پر اُس کا رانجھا.......

وہ آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آگے کیا سوچے۔ کلی کو کیا خبر کہ پھول کیسے مسکراتا ہے۔ پھول کو کیا خبر کہ پھل کیسے پکتا ہے۔

غلیظ جوہڑ سے وہ اپنے پینے کے لئے پانی بھرنے جاتی تھی ورنہ چچا کیلئے تو چشمے سے پانی آ جاتا تھا۔ وہ خود بھی چشمے پر چلی جاتی

مگر گھر کے کام کاج میں ہرج ہوتا تھا۔ اور چچی کی گالیاں اتنی سخت تھیں کہ ایک بار مسجد کے مولوی جی نے سُن کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس دی تھیں۔

دوسرے دن وہ پھر اسی وقت جوہڑ پر گئی۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی جھاڑیوں کے آس پاس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ اُسے کچھ نظر نہ آیا۔

"میرا رانجھا!" اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ اسے ایک انگڑائی آگئی۔ بازو پورے زور سے تانتے ہوئے اور سر پیچھے پھینکتے ہوئے پکاری۔ "اُف!"

وہ سمجھی کوئی اُس کے قریب کھڑا ہے۔ "امامی" کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "میری ہیر!"

"میرا رانجھا!" اُس نے ایک اور انگڑائی لی۔ اور گاگر بھرنے کے لئے پنڈلیوں تک کپڑا اُٹھا کر جوہڑ میں گھس گئی۔ گھم گھم گھم۔ گاگر بھر گئی۔ اس نے ایک بار پھر ادھر اُدھر دیکھا۔ چھم چھم چھم اس کا جی بھر آیا۔ گاگر سر پر رکھی اور چھپر کی طرف چلنے لگی۔

"امامی!" کوئی بیری کے تنے کی اوٹ سے بولا۔

"کون؟" اُس نے پلٹ کر پوچھا۔

دوست محمد درخت تلے کھڑا اُنگلیاں چٹخا رہا تھا۔ "تمہارا رانجھا!"

آج وہ ہولے ہولے قدم اُٹھاتی چھپر تلے آگئی۔ وہاں پہونچکر گھڑا رکھتے ہوئے اُدھر دیکھا۔ دوست محمد اسی حالت میں کھڑا تھا۔ امامی کو جیسے کسی نے ہوا میں اُچھال دیا ہے اچکراسی گئی۔ اچانک چچی کی آواز آئی۔ "اری کھڑی کس کو تاک رہی ہے؟ وہ چھوکرا کون ہے جوہڑ پر! اُسی سے اشارے ہو رہے ہیں نا! بدذات، کمینی! اسی لئے جوہڑ پر سارا دن گزار دیتی ہے تو۔ دن دہاڑے گھر کے سامنے یہ لچھن! کیا تُونے مجھے اندھا سمجھ رکھا ہے؟ ارے ڈائن۔ کنواری لڑکی جوان چھوکرے سے یوں تالاب میں کشتیاں کھیلے! زمانہ بدل گیا۔ آنکھوں میں حیا نہ رہی! کیا اندھیر نگری ہے کہ میرے سامنے ہی عاشق میاں سے اشارے ہو رہے ہیں۔ تجھے ہیضہ آئے۔ تُونے تو میرے مالک کی ناک کاٹ کر رکھدی، تجھے قبر بلائے تُونے یہ کیا کیا؟"

امامی کو اب محسوس ہوا کہ دوست محمد کا یوں دن کے وقت جوہڑ پر آکر اُسے چھیڑنا اور پھر خود اُس کا چھپر تلے کھڑے ہو کر اُسے گھورنا پرلے درجے کی نادانی اور ناعاقبت اندیشی ہے! گاؤں والیاں دوڑی آئیں۔ چچی کی آواز میں ایک جادو تھا کہ سب کھچی چلی آئیں۔ کیا ہوا؟ کب بات ہوئی۔ سوالات کا تانتا بندھ گیا۔ سب امامی کو چڑھی بھوؤں اور چبھتی نگاہوں سے گھورنے لگیں!

ایک بڑھیا چارپائی پر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے بولی: "نوج ذرا ایک پل تو چُپ ہو جاؤ۔ تمہاری زبانیں ہیں کہ قینچیاں۔ کوّوں کی طرح کائیں کائیں کئے جا رہی ہو۔ کچھ کہنے سننے بھی دو۔ نوچپ ہو جاؤ ایک پل کیلئے!"

خاموشی چھاگئی۔ امامی چھپر میں ایک بے جان ستون کی طرح دم بخود کھڑی تھی۔ کسی احساس نے اُس کے قدموں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اور دل میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ اس کی آنکھیں جھپکتے جھپکتے رُک گئیں۔ اُس کا دل دھڑکتے دھڑکتے ٹھہر گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے! اب کیا ہوگا! یہ کیا ہوا!

بڑھیا نے چچی سے پوچھا "لے اب بتا بہو رانی۔ کیا بات ہوئی؟"

چچی اب رو رہی تھی۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے ہجوم میں تھرائی آواز میں بولی: "کیا بتاؤں۔ ہم جیتے جی مر گئے۔ خاندان کی لاج ملیامیٹ ہو گئی۔ آبرو کی جڑ کٹ گئی۔ میں نے کہا تھا تمہارے بیٹے سے کہ ناگن کو پالنا دانائی نہیں۔ مولا جانے کہاں سے اُٹھا لایا۔ اور بیٹی بنا کر پالنے لگا۔ اب پتہ چلے گا اُسے کہ تونبا چاہے انگوروں میں بڑھے پر ہوگا کڑوا۔ میرے سامنے کھڑی جوہڑ پر کسی آوارہ چھوکرے سے اشارے کر رہی تھی۔ میری آواز سُن کر وہ تو کھسک گیا۔ اور خود چھپر تلے کھڑی مجھے یوں گھور رہی ہے جیسے بس چلے تو چبا ہی ڈالے گی۔ پرسوں سے آدھی آدھی رات کو میں اس کا بستر بھی خالی دیکھ رہی ہوں۔"

سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ امامی کو یہ سرگوشیاں بے شمار سانپوں کی پھنکاریں معلوم ہونے لگیں۔ جو اُسے کاٹ کھانے کیلئے اُس کے آس پاس لمبی لمبی دو دھاری زبانیں نکالے جُھوم رہے تھے! اُس نے محسوس کیا کہ جیسے اُس کا وجود جُھلسا جا رہا ہے۔ آناً فاناً یہ خبر سارے گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی، کہ امامی اپنے عاشق سے اشارے کر رہی تھی، کہ چچی نے آلیا۔ اور اب بھیگی بلّی بنے چھپر تلے بیٹھی ناخن سے مٹی کرید رہی ہے!

نوجوانوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ وہ کون تھا جس نے جوہڑ پر جاکر دن دہاڑے اُس مغرور چھوکری سے بات کرنے کی جرأت کی۔ اُس کی آنکھوں میں تو بجلی کی چمک ہے! یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کو آنکھ بھر کر دیکھے تو اُسے بھسم کر ڈالے!

"دوست محمد ہوگا دوست محمد" ایک گبرو بولا۔ "کل ہیر کی جگہ امامی پڑھ رہا تھا"

"ارے چھوڑو بھی۔ اُس سے یہ جرأت نہیں ہوسکتی۔ کوئی اور من چلا ہوگا۔"

دوست محمد بھی اُس مجمع میں موجود تھا، بولا "کوئی منچلا ہوگا۔"

اُس کا من پھیلنے لگا۔ اور ایک ہی پل میں وہ ساری کائنات پر محیط ہوگیا ___ ساری کائنات پر ___ جس میں دوست محمد اور آمامی کے سوا اور کچھ نہ تھا ___ وہ مبہوت سا ہوگیا، جیسے کھڑے کھڑے سو گیا ہے۔ ایک دوست نے اُسے جھنجوڑا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"ارے وہ منچلا مجھے ملے تو اُسے، گلے لگا لوں۔"

سب گبرو ہنسنے لگے! دوست محمد جی ہی جی میں اُن گبروؤں پر ہنسنے لگا!

اب جوہڑ پر کون ملے۔ چچی کھاٹ سامنے ڈال کر بیٹھ جاتی۔ اور آمامی گھڑا پانی میں ڈال کر سر پر رکھتی اور جھپاک سے چھپر تلے پہونچ جاتی۔ اُس کے چچا نے بھی اُسے بہت مدت کے بعد سخت سُست کہا تھا۔ اسلئے اب بھلائی اسی میں تھی کہ من کی آگ دبا کر بیٹھ جائے اور جو پڑے وہ جھیلے! آمامی کی حالت اُس پھول کی سی ہوگئی جو اپنے ہی بوجھ سے ایک طرف جھک گیا ہو۔ کونپل ٹوٹ گئی ہو اور اب پھول آہستہ آہستہ مرجھا رہا ہو!

ایک رات وہ کھاٹ پر پڑی تھی۔ گہرے سیاہ آسمان پر ٹکے ہوئے ننھے ننھے ستارے پسینے کے اُن قطروں کی طرح مضطرب نظر آرہے تھے، جو کسی پیاسے انسان کے ماتھے پر آہستہ آہستہ اُبھر رہے ہوں! دور جوہڑ کے کنارے بیری کا درخت اپنے بازو آسمان کی طرف اُٹھائے کسی بیمار دیو کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

نہ جانے اُسے کیا خیال آیا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چچی گہری نیند سو رہی تھی۔ چچا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ کھسکتی ہوئی چھپر تلے آگئی۔ اُسے بیری کے درخت سے ڈر سا محسوس ہونے لگا، جو سیاہ آسمان کے بالمقابل سیاہ بازو پھیلائے جیسے اس کا کلیجہ نوچ لینے کا منتظر کھڑا تھا۔ لیکن وہ لڑکھڑاتے اور رُکے رُکے قدموں سے آگے بڑھتی گئی ___ آہستہ آہستہ ___ ہولے ہولے ___ جیسے اُسکے پاؤں تلے کانچ بچھا ہوا ہے۔ اور اُسے اُس کے ٹوٹ جانے کا خطرہ دامنگیر ہے۔ جوہڑ کے کنارے پہونچی تو کالے پانی میں ستاروں کے دُھندلے دُھندلے عکس دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ پیچھے آسمان کی طرف گر جائے گی۔ نیچے اوپر آسمان اور جیسے وہ بیچ میں کسی نامعلوم قوت کی وجہ سے معلق کھڑی ہے۔ وہ گھبرا کر وہیں بدبودار کیچڑ پر بیٹھ گئی! ___ اور خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کرلیں!

بیری کے درخت تلے کسی نے خشک پتّوں پر دھیرے سے قدم دھرا!

بھوت!

اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا!

دوسرا قدم!

تیسرا!

چوتھا!

آمامی کو جیسے کسی نے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا ہے!

وہ گھبرا گئی۔ زبان تالو سے لگ گئی!

قدم مڑ گئے۔ اور بیری کے تنے کا چکر کاٹ کر پھر اُسی طرح آہستہ آہستہ خشک پتّوں پر پڑنے لگے۔

وہ زمین سے چمٹ گئی۔ اس کا تنفس بہت تیز ہوگیا۔

یکایک سرگوشی کی سی آواز آئی "میری ہیر!"

"میرا رانجھا!" آمامی نے زیرلب یہ الفاظ دُہرائے۔ گردن اُٹھا کر اُس طرف دیکھا۔ ایک سایہ بیری کے تنے کے اِردگرد طواف کر رہا تھا!

"کون ہو تم؟" گھبرائی ہوئی آواز میں بولی "جن بھوت ہو یا انسان؟"

"انسان!"

سایہ اُس کے قریب آگیا۔ اُس پر جھک گیا "تم کون ہو؟"

"آمامی"

"میری ہیر"

نیچے جوہڑ کے کالے پانی اور اوپر آسمان کے سیاہ سینے پر ستارے ناچنے لگے! بیری کا درخت اپنے بازو ہلانے لگا۔ تالاب کے کنارے خشک کائی میں کسی جھینگر نے نیند میں نغمہ چھیڑا اور چُپ ہوگیا۔ گاؤں میں دو چار کتے ایک ساتھ بھونکے اور پھر اچانک خاموش ہوگئے۔ کائنات نے ایک کروٹ بدلی! آمامی اُٹھ کھڑی ہوئی "تم کون ہو؟"

"تمہارا رانجھا"

"اُس دن تم مجھے گھورتے رہے؟"

"ہاں"

"بڑی بدنامی ہوتی"

"میں نے بھی سنا تھا!"

"تم یہاں کیوں آتے ہو؟"

"روز آتا ہوں"

"روز آتے ہو؟"

"ہاں روز آتا ہوں"

"کیوں؟"

"تمہارے لئے"

"میں تو چھپر کے اس پار سو رہی ہوتی ہوں"

"میں چھپر کے اس پار جاگ رہا ہوتا ہوں"

"کیوں؟"

"تمہارے لئے"

"کیا مطلب؟"

"کیا بتاؤں"

"تم میرا پیچھا چھوڑ دو"

"کیوں؟"

"یہ اچھی بات نہیں ہوتی"

"لیکن بدنامی تو ہو چکی"

خاموشی چھا گئی۔ دونوں کی سانسوں کی آواز ایک دوسرے کو سنائی دینے لگی۔ دونوں سر جھکائے کیچڑ میں انگلیاں پھیرنے لگے!

"اچھا میں اب جاتی ہوں"

"پھر کب ملوگی؟"

"کل!"

"یہیں؟"

"یہیں"

"اچھا!"

"اچھا"

وہ وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتی چھپر تلے آ گئی۔ مڑ کر دیکھا۔ اندھیرا وسیع میدان میں سنسنا رہا تھا! کیا یہ خواب تھا یا بیداری۔ اس نے اپنے سینے پر زور سے چٹکی لی! وہ جاگ رہی تھی۔ "میرا رانجھا!" اس نے اتنی گہری سانس لی کہ اس کا سینہ بہت دیر تک ابھرتا ہی چلا گیا! اس کی چچی ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ اپنی کھاٹ پر پڑ رہی اور صبح تک یونہی پڑی رہی! آج اسے بخار سا ہو رہا تھا!

"مجھے آج بخار ہو رہا ہے۔ میں کوئی کام نہیں کر سکوں گی"

"تجھے بخار لے جائے۔ تو اب میرے کام کی نہیں رہی" چچی نے ناک چڑھاتے ہوئے جواب دیا!

وہ تمام دن دیوار سے لگی بیٹھی رہی۔ پڑوسنیں آئیں اور چچی سے پوچھنے لگیں "آمی کو کیا ہو گیا؟"

"سانپ سونگھ گیا"

آمی جی ہی جی میں چچی پر مسکرا دی!

چچا آئے "کیا ہوا آمی؟"

"کچھ نہیں"

چچی بولی "صبح سے بخار کا بہانہ لیکر بیٹھی ہے، سچ کہوں اسکے ہوتے میں نہ جی سکوں گی"

چچا نے آمی کی نبض دیکھی "اوہ۔ بڑا گرم ہے اس کا جسم۔ اری پڑوسن سے جا کے چٹکی تو مانگ لا۔ آمی کو تو بہت سخت بخار ہو رہا ہے!"

آمی جی ہی جی میں چچا پر مسکرا دی!

رات ہو گئی۔ چچا پھر کسی کام پر چلے گئے۔ اور چچی کو تاکید کر گئے کہ آمی کی دیکھ بھال کرے۔ کہیں وہ بخار کی شدت سے رات کو بیہوش نہ ہو جائے۔ موقع پا کر آمی کھاٹ سے کھسک کر جوہڑ کی طرف چل دی! اور ادھر سے بیری کے تنے کے پاس سے ایک سایہ کھسکا اور اس کی طرف آیا۔

"آمی"

"دوست محمد"

"میری ہیر"

"میرا رانجھا"

آمی نے بہت مشکل سے یہ الفاظ ادا کئے —— بہت مشکل سے —— اور بہت آہستہ آہستہ! لیکن وہ سمجھی اس نے اپنے دل کا سارا بوجھ اتار کر جوہڑ کے غلیظ پانی میں پھینک دیا ہے! اور جیسے اب اس کے پر لگ گئے ہیں۔ اور وہ اڑ کر اس ٹھنڈ منڈ بیری کی آخری پھننگ پر بیٹھ کر اپنے رانجھا کے ہمراہ "ہیر وارث شاہ" گا رہی ہے!

"میں بہت دیر سے تمہارا منتظر کھڑا تھا"

"میں سمجھی تم ابھی تک نہ آئے ہوگے"

"میں شام سے یہیں بیٹھا ہوں"

"اوہو!"

"میں نے تمہیں ایک بار کھاٹ پر بیٹھتے دیکھا تھا"!

"اچھا!"

جوہڑ کے کنارے وہی جھینگر چیخ کر چپ ہوگیا۔ اور دور گاؤں میں وہی کتے ایک ساتھ بھونکے اور خاموش ہوگئے!

"آمی" دوست محمد نے رازدارانہ لہجے میں کہا "آمی، تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ میں یہاں کیوں آتا ہوں!"

آمی خاموش رہی۔

"آمی، میں اس لئے آتا ہوں کہ تم سے وعدہ لوں کہ تم میرے بغیر اور کسی کی نہ ہوگی"

آمی رو دی۔ بولی "میں چچا چچی کے بس میں ہوں دوست محمد"

"یہ زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں"

"نہ بھی ٹوٹیں تو میں تمہاری ہوں"

"آمی"

دونوں کے دماغوں میں ایک بے نام سی گونج پیدا ہوگئی۔ جیسے وہ کسی برق رفتار گھوڑے پر سوار پہاڑوں کی چوٹیاں اور سبز گھاٹیاں اور گھنے جنگل الانگتے پھلانگتے کہیں اڑے جا رہے ہیں۔

اسکے بعد ایک روز دوست محمد شہر کے سفید پوشوں کو اکٹھا کر آمی کے چچا کے ہاں لے آیا۔ اور آمی کے رشتے کا طالب ہوا۔ وہ بھی شاید آمی سے دامن چھڑانے کا منتظر بیٹھا تھا۔ پکار اٹھا "دینے کا مال ہے، انکار کیا کروں"

اتنا سستا سودا!

آمی نے بھی یہ خبر سنی۔ خوش ضرور ہوئی۔ لیکن دوست محمد کو رانجھا اور اپنے آپ کو ہیر کہنے سے ہچکچانے لگی۔ انہوں نے مصیبتیں جھیلیں۔ ہم نے صرف دو چار راتیں آنکھوں میں کاٹیں۔ وہ مرتے مر گئے لیکن جی بھر کر ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ ہماری کل کلاں شادی ہوجائے گی۔ نہ میں ہیر بن سکتی ہوں، نہ وہ رانجھا۔ دوست محمد اگر پہلے دن ہی میرا رشتہ پوچھ لیتا تو یہ دو چار دن کی الجھنیں بھی نہ دیکھنا پڑتیں۔

شادی سے ایک دن قبل شام کا کھانا کھا کر آمی دیوار سے لگی بیٹھی تھی کہ چھپر میں اسے دوست محمد کی آواز سنائی دی۔ وہ کھسکتی کھسکتی کھاٹ کی اوٹ میں چھپر کے قریب ہوگئی۔ چچی کہیں پڑوس میں چلی گئی تھی۔ اس کا چچا دوست محمد سے باتیں کر رہا تھا۔

"بیٹا دوست محمد۔ قبل اس کے کہ میں آمی کو تمہارے ہاتھ سونپ دوں، مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہیں ایک راز سے آگاہ کر دوں۔ مبادا بعد میں تمہیں یہ بات معلوم ہو اور تم وہ کر بیٹھو جو تمہیں نہیں کرنا چاہیئے۔ میں اپنی آخرت خراب نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے تمہیں دھوکا نہیں دونگا۔ تم جانتے ہو آمی میری بیٹی نہیں۔ لیکن تمہیں یہ خبر نہیں کہ میں نے اسے کہاں سے حاصل کیا۔ مدتیں گزریں، میں بھی تمہاری طرح جوان تھا۔ مجھے ایک نوجوان لڑکی سے محبت ہوگئی۔ بہت عرصے تک ہم ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے رہے، اور آخر ایک روز یہ سن کر میں بھونچکا سا رہ گیا کہ وہ عنقریب ماں بننے والی ہے ــــ اور باپ! ــــ وہ میں ہی کمبخت تھا۔

دوست محمد، تم ابھی ناتجربہ کار ہو، تم نہیں سمجھتے کہ میرے دل پر کیا گزری۔ مجھے اس لڑکی سے واقعی محبت تھی۔ اور اب عام دنیا کی طرح میں اسے یوں اجاڑ راہ میں چھوڑ کر اکیلا آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ میں نے اسے اس جوہڑ کی اس بیری تلے یقین دلایا کہ میں اسی کا ہوں اور اسی کا رہونگا۔ میں اسے اس کے گھر سے بھگا کر ایک غیر آباد کھنڈر میں لے گیا۔ وہاں اسکے ایک بیٹی ہوئی۔ وہی تمہاری آمی ہے"

آمی کی آنکھوں کی پتلیاں جیسے چنگاریاں بن کر باہر ابل پڑینگی۔ اس نے چاہا کھاٹ کے پائے سے اپنا سر پھوڑ ڈالے ــــ ناجائز اولاد! ــــ آمی کو محسوس ہوا جیسے وہ اس حقیر چوہیا سے بھی کمتر ہے، جو گلی میں کسی کے پتھر سے پچک کر کوڑے میں مل گئی ہو!

بہت دیر کے بعد دوست محمد بولا "اسکی ماں؟"

"وہ اسی دن مر گئی۔ کھنڈر میں زچہ کی خبر گیری کون کرتا۔ وہ اسی دن مر گئی! اور میں نے اسے چند دوستوں کی مدد سے دفنا دیا۔ اور بچی کو اٹھا کر گھر لے آیا۔ لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ جنگل میں یہ بے یار و مددگار پڑی ملی۔ اور میں اسے اٹھا لایا ــــ دوست محمد، کیا تم آمی سے متنفر تو نہیں ہوگئے؟"

"نہیں"

آمی تمام رات جاگتی رہی۔ اس کی آنکھیں سوج گئیں۔ کپڑے بھیگ گئے۔ ہونٹ پھٹ گئے۔

صبح اٹھی۔ جوہڑ پر پانی بھرنے چلی گئی۔ ایک طرف سے گاؤں کا بوڑھا کمہار گدھا لئے آ رہا تھا۔

"آج صبح صبح کدھر گئے تھے چچا؟" آمی نے پوچھا۔

"قصبے میں"

"کیوں؟"

"دوست محمد کا اسباب لاری کے اڈّے پر چھوڑنے۔"

"کدھر گیا وہ؟"

"بنّو، اُس کی نوکری لگ گئی ہے نا!"

"ارے ــــ!"

آمی کے ہاتھوں سے اُس کی گاگر چھوٹ کر جوہڑ میں جا گری اور بیری کا ٹھنڈ منڈ درخت بازو ہلا ہلا کر ناچنے لگا۔

"مگر ہیر رانجھا کی کہانی جھوٹی تو نہیں تھی!" آمی سوچتے سوچتے وہیں بدبودار کیچڑ پر سو گئی!

احمد ندیم قاسمیؔ

رقص کدہ

یہ آشیانِ مسرّت، یہ چار دیواری
یہ اِک سجی ہوئی فردوسِ معصیت کاری

حریمِ رقص و ترنّم، جہانِ نغمہ سرشت
شراب و شعر کی محفل، یہ مختصر سی بہشت

نشاط و عیش یہاں میہمان ہوتے ہیں
یہاں بجھے ہوئے نغمے جوان ہوتے ہیں

یہاں چھلکتی ہے مینائے آرزو میں شراب
یہاں مچلتا ہے مستی کی کروٹوں میں شباب

مذاقِ عشق کے ہوتے ہیں کامیاب یہاں
ہوس حجاب سے ہوتی ہے آشکار یہاں

طلسمِ ذوقِ نظر ہے یہاں فضائے جمال
یہاں دماغ میں اُٹھتے ہیں مستیوں کے اُبال

نگاہِ شوق یہاں آزمائی جاتی ہے
یہاں بساطِ تعیّش بچھائی جاتی ہے

لطیف ریشمی تکیے، یہ مسندِ گُل پوش
یہ رنگ رنگ کی زیبائشیں بہار بدوش

یہ نزہتوں کے چمن، ناز آفریں انداز
ہوس کی پیاس بُجھانے کے آتشیں انداز

لطافتوں سے مہکتی ہوئی سرائے بہار
امیر زادوں کی دل بستگی کا زندہ مزار

فریبِ حُسن کی جادو نگاہیوں کا ہجوم
یہ مجرمانہ جوانی کا پرتو معصوم

ہوس کی آگ بڑھاتی ہے شمعِ شعلہ فروش
یہاں پگھلتی ہے پہلو میں گرمیِ آغوش

سیاہ کاریاں چادر میں مُنہ چُھپاتی ہیں
یہاں رعونتیں پردوں سے جھلملاتی ہیں

یہاں مسرّتیں ہوتی ہیں آ کے خود نخچیر
یہاں اُترتے ہیں دل میں کمانِ عشق کے تیر

خدا بچائے یہ دھوکے، یہ ننگِ فکرِ معاش
یہاں صراحی کو ہوتی ہے خود سبو کی تلاش

جہانِ وضع و تکلّف ہے باریاب یہاں
نظر نواز ہے آئینۂ شباب یہاں

جبینِ ناز پہ قشقے لگائے جاتے ہیں
یہاں نگاہ سے جادو جگائے جاتے ہیں

خرامِ مست کی محشر طرازیاں توبہ!
دل و نگاہ کی عریاں نوازیاں توبہ!

شباب زارِ محبّت، حریمِ رعنائی!
یہ اِک صنم کدۂ حُسن و رنگ و زیبائی!

حسین مغنّیہ! تخلیقِ عشق کا اعجاز
جگائے چتونوں میں اپنی سحر کے انداز

نمودِ حُسن بڑھاتی ہے یوں بہ رنگِ تجلی
سمن کدے میں ابھی جیسے کھل رہی ہو کلی

خرام ایسا نگاہوں کو بے قرار کرے
نگاہ ایسی قیامت کو شرمسار کرے

بہارِ حُسن یہیں سوگوار ہوتی ہے
یہیں طبیعتِ سادہ شکار ہوتی ہے

سید فیضی جالندھری

اُس نے کہا تھا

"جب نمائش میں انوار نے یہ خبر سنائی، مجھے قطعی یقین نہ آیا۔ اور بھلا تم ہی بتاؤ میں کیونکر یقین کرتا ـــ میں تمہارے خاندان سے واقف ہوں۔ تمہارے والد، سید، مولوی، حافظِ قرآن ـــ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ مجھے کیونکر یقین آتا۔ تم انوار کو جانتے ہی ہو۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے بنا رہا ہے۔ لیکن جب اُس نے یہ کہا کہ تمہارے والد بھی بخوشی شریک ہوئے، تو میں کیسے مان لیتا؟۔ اُس کے منہ پر تو کچھ نہ کہا، لیکن تم سے ملنے کیلئے سخت بے چین تھا۔ خط تو لکھ نہ سکتا تھا۔ تم میری عادت سے واقف ہو۔ اور پھر آج کل بہت عدیم الفرصت ہو رہا۔ سارے کاروبار کا بار میرے سر پر ہے۔ والد صاحب تو اعتکاف میں بیٹھ گئے ہیں۔ اور پھر اس کساد بازاری کے زمانے میں تجارت میں جیسی اُلجھنیں ہیں تم جانتے ہی ہو۔ بڑی مشکل سے ایک دن کا وقت نکالا ہے ـــ میرا تار تو تمہیں مل گیا ہوگا؟۔ ارے یار! تم کیسے خاموش ہو؟ کچھ بولتے ہی نہیں؟۔ اور ہاں! تمہاری پریکٹس کا کیا حال ہے؟ کچھ مل جاتا ہے؟ مگر تمہیں اس کی کیا پروا۔ اماں یار! تمہارا مکان کتنی دور ہے! راستہ تو ختم ہی نہیں ہوتا ـــ تم ہنس رہے ہو! ـــ بھئی معاف کرنا۔ میں ایک کاروباری آدمی ٹھہرا۔ بکواس کرنے کی عادت پڑگئی ہے۔ معلوم نہیں کیا کیا کہہ گیا ... تمہیں دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے ـــ آج ہم کتنے عرصے کے بعد ملے؟ ـــ ہاں اب تم کہو۔ میں تو تم سے سننے آیا ہوں ـــ!"

"میں کیا کہوں؟ تم نے اسقدر سوالات کر ڈالے ہیں، میں سوچ رہا ہوں کہ پہلے کس کا جواب دوں۔"

"میرے بھولے وکیل پہلے اِس بات کا جواب دے کہ تیرا مکان اب کتنی دور ہے!"

ڈرائنگ روم میں ناہید بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ میں عشرت کا ہاتھ پکڑے، اندر داخل ہوا ـــ وہ ہمیں دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔

"مسز ناہید عسکری!" میں نے عشرت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ناہید! یہ ہیں میرے دوست مسٹر عشرت۔"

ناہید نے بڑھکر عشرت سے ہاتھ ملایا۔ مزاج پوچھا۔

"اور ہاں ناہید! دیکھو!! اس وقت ہم لوگ بارش پانی میں چلے آرہے ہیں ـــ گرم گرم چائے بڑا لطف دے گی ـــ کیا خیال ہے عشرت؟"

عشرت اب تک کسی خیال میں محو تھے۔ چونکے۔ جواب دینا چاہا لیکن ناہید اندر جاچکی تھی۔ عشرت نے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھکر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اماں یار!۔ تو گویا تم نے شادی کرلی ـــ"

"کیوں کیسا انتخاب ہے؟"

"واہ! کیا کہنا!! مگر ـــ میں نے کچھ اور بھی سنا ہے۔"

"تم نے جو کچھ سنا ہے، سب سچ ہے" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"سب سچ ہے؟" عشرت نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔

"آخر تمہیں اتنی حیرت کیوں ہوئی؟"

"یہ بھی ایک ہی رہی۔ ارے میاں جو سنے گا تعجب کریگا۔ آخر یہ تمہیں سوجھی کیا تھی عسکری؟ کیا تمہیں اور لڑکیاں نہ ملتی تھیں؟" اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہ بھی تو لڑکی ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ہے تو۔ مگر ـــ اور تمہارے والدین ـــ؟"

"وہ بھی میرے ساتھ ہیں۔ میری والدہ خود بہو کو دلہن بناکر لائیں ـــ"

عشرت مجھے گھور رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوکر ہم لوگ برآمدے میں آرام کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے، عشرت نے پھر وہی قصہ چھیڑا:

"تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار، انتظام خانہ داری میں طاق۔ خوش مزاج، با مذاق اور حُسن کا تو کچھ کہنا ہی نہیں ـــ واقعی عسکری! ـــ خوش نصیب ہے وہ شخص جسے ایسی بیوی ملے ـــ مگر دُنیا پھر بھی کب چوکتی ہے۔"

"زمانہ بدل گیا ہے عشرت! اب لوگوں کی آنکھیں کھل رہی

ہیں۔ وہ لوگ جو شرافت کے ٹھیکیدار تھے، اب مر چکے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب مالدار شخص سید اور نجیب الطرفین بن جاتا تھا۔ شرافت کا دارومدار خاندان اور سرمایہ پر تھا۔ لیکن اب لوگ سمجھنے لگے ہیں۔ شرافت کوئی نسلی چیز نہیں بلکہ ذاتی جوہر ہے۔۔۔ کہنے دو کہنے والوں کو۔ کون کسی کو روک سکتا ہے؟ عقلمند سب کچھ سمجھتے ہیں۔۔۔ میرے والد خود سخت خلاف تھے۔ لیکن اب وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔ لوگوں سے میری تعریف کرتے ہیں۔ تم خود غور کرو عشرت! کہیں بدی سے برائیاں دور کی جا سکتی ہیں۔ میانے والے نے بھی یہی کہا تھا۔ اگر آپ نے میری شادی ناہید سے نہ کی تو آپ اُسے ذلیل تر بننے پر مجبور کریں گے۔ اُس کے گناہوں کا بوجھ آپ کے سر ہوگا۔ ناہید کی والدہ بڑی نیک عورت تھی عشرت! مگر دُنیا نے اُسے کچھ اور بنا دیا۔۔۔ ڈرائنگ روم میں چلو۔ اطمینان سے بیٹھیں۔ میں تمہیں تمام قصہ سناتا ہوں۔"

"وہ ایک اچھے گھرانے کی لڑکی تھی۔ ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد بنارس کے ایک اسکول میں معلمہ ہوگئی۔ وہاں ایک عیاش، رنگین مزاج جج صاحب نے اُسے لڑکیوں کو پڑھانے نوکر رکھنا چاہا۔ وہ گھر جاکر پڑھانے پر ہرگز تیار نہ ہوتی مگر جج صاحب کے اثر سے مجبور ہوگئی۔ وہ عرصے سے تاک لگائے بیٹھے تھے۔ آخر ایک روز موقع پاکر اپنی حیوانیت کی پُرزور پھونکوں سے اُس کی عصمت و عفت کے چراغ کو گل کر دیا۔ اُس کی دُنیا تاریک ہو چکی تھی۔ وہ اطمینان و سکون کے لئے بھاگ رہی تھی اور بدنامی اور رسوائی اُس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ ڈوب مری ہوتی اگر ایک دوسری جان اُسے عزیز نہ ہوتی۔ اس معصوم لڑکی کا اس میں کیا قصور تھا؟ آخر کار زمانے کی تند و تیز ہواؤں نے اُسے ایک راہ پر ڈال دیا۔۔۔ وہ الہ آباد کی طوائفوں میں ریحانہ کے نام سے مشہور ہوئی۔"

"ہماری پہلی ملاقات دورانِ سفر میں ہوئی۔ دسمبر کی تعطیل میں ہم لوگ دہلی جارہے تھے۔ شاید نسیم اور اختر میرے ساتھ تھے، رنگین درجے کی تلاش تھی۔ ٹرین چلنے پر ہم لوگ ایک درجے میں گھس پڑے۔ اس میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی، تازہ انگریزی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ بارہ تیرہ برس کی ایک کمسن لڑکی بھی تھی۔ ہم لوگ سامنے والے برتھ پر بیٹھ گئے۔ نسیم نے للچائی ہوئی نظروں سے پاندان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اماں یار! پان لینا تو بھول گئے"۔ عورت نے فوراً پاندان بڑھادیا۔ "لیجئے نا! یہ آپ ہی کے پان ہیں"۔۔۔ تھوڑی دیر میں کافی بے تکلفی سے بات چیت ہونے لگی۔ معلوم ہوا وہ الہ آباد کی مشہور طوائف ریحانہ ہے اور دوسری اُس کی اکلوتی بیٹی۔۔۔ کسی رئیس کی شادی میں شریک ہونے دہلی جارہی تھی۔ وہ فنِ موسیقی میں کامل دستگاہ رکھتی تھی اور شاید اسی وجہ سے کافی مشہور تھی۔ یقین کرو عشرت! وہ اور دوسری طوائفوں سے بالکل مختلف تھی۔ اُس میں نہ شوخی تھی نہ شرارت بلکہ وہ ایک حد تک سنجیدہ تھی۔۔۔ اُس کے اخلاق، اُس کی گفتگو، اس کے طور طریق نے ہم لوگوں کو مرعوب کر لیا۔ ہم نے معلوم کر لیا کہ وہ کس تاریخ کو واپس ہوگی۔ ہم اس کے ساتھ ہی واپس ہونا چاہتے تھے۔ ہمیں اُس سے کافی دلچسپی ہوگئی تھی۔ رقص اور موسیقی کے علاوہ علم و ادب، شعر و شاعری سے اُسے ذوق تھا۔ فنِ نقاشی اور مصوری سے اُسے لگاؤ تھا۔۔۔ وہ موجودہ ملکی سیاست سے بھی واقف تھی۔ بعض مسائل پر وہ انفرادی رائے رکھتی تھی۔ جب ہم نے اسکے گذشتہ حالات دریافت کئے تو اُس نے کہا۔۔۔ مجھے وہ جملہ ابتک لفظ بہ لفظ یاد ہے:۔

"سازِ حیات کے خاموش تاروں کو نہ چھیڑئیے،
مبادا اُس سے خلافِ توقع ایسے راگ نکلیں جو
مسرت کے قہقہوں کو دردناک چیخوں میں بدل
دیں۔ کوئی شے اگر دُور سے خوشنما معلوم ہوتی ہو
تو خدارا قریب جاکر ذوقِ جمال کی شکستِ سامانی کا
موقع نہ بہم پہونچائیے"۔

اُس کی باتیں سُن سُن کر ہمارے دل میں اُس کے لئے ایک ہمدردی ایک احترام کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ جُدا ہوتے وقت اُس نے کہا: "یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں ایک پیشہ ور عورت ہوں لیکن آپ لوگوں سے ایک خاص قسم کی اُنسیت پیدا ہوگئی ہے۔۔۔ اگر کبھی الہ آباد آؤ تو بھولے بھٹکے غریب خانے کی طرف نکل آنا۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ عشرت! وہ اپنے پارٹ کو انجام دیتے ہوئے کسقدر تکلیف محسوس کرتی تھی"۔

"چند دن بعد یہ واقعہ میرے دماغ سے نکل گیا۔ لیکن۔۔۔۔ کرکٹ میچ کے وقت جب میں الہ آباد گیا تو اچانک مجھے اس کا خیال

آیا۔ اگرچہ مجھے اُس کے کوٹھے پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ مگر اُس کی محبت مجھے کھینچ کر لے گئی۔ ایک شاندار مکان تھا۔ بہت سے نوکر چاکر تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملی۔ خوب خاطر تواضع کی۔

ڈیڑھ سال بعد ـــــ امین آباد میں ایک لڑکی کو دیکھا۔ جو ریحانہ کی لڑکی سے بہت ملتی جلتی تھی۔ مجھے اُن لوگوں کی یاد آگئی۔ اُن سے ملنے کے لئے بے چین ہوگیا۔ چچا جان نے جو کانپور میں ڈسٹرکٹ جج تھے بی۔ اے کی کامیابی کی خبر سن کر مجھے بلوایا تھا۔ میں اس بہانے بجائے کانپور کے سیدھا الٰہ آباد پہونچا۔ ریحانہ کی عجیب حالت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غم اُسے اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔ لیکن بظاہر خوش رہنے کی کوشش کرتی تھی ـــــ

قانون پاس کرنے کے بعد چچا جان کا اصرار تھا کہ میں بیرسٹری کے لئے انگلینڈ چلا جاؤں۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ والد صاحب کی کوئی دو سو روپے ماہوار کی ذاتی جائداد تھی، اُس کا میں تنہا وارث تھا۔ میں نے مستقبل کا پروگرام مرتب کر لیا تھا اور اُسی پر عمل پیرا ہونا چاہتا تھا۔ میں نے بہت جلد اپنے ہم خیال نوجوانوں کی ایک جماعت بنالی اور ہم اپنے نظریوں کی نشر و اشاعت کرنے لگے۔

ایک مرتبہ حضرت گنج میں ریحانہ سے ملاقات ہوئی، وہ مستقل طور پر لکھنؤ آگئی تھی۔ یہاں اُس نے ایک کوٹھی خرید لی تھی۔ اس میں رقص اور موسیقی کا ایک اسکول جاری کر دیا تھا۔ وہ سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کو جمع کرتی، انہیں موسیقی اور رقص کی تعلیم دیتی اور اگر کوئی اچھا بر مل جاتا تو شادی کر دیتی ـــــ وہ کتنا نیک کام کر رہی تھی عشرت؟ ـــــ ہماری جماعت نے بھی اُس کے اسکول کی ہر طرح کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں اب اکثر اُس کے یہاں جانے لگا۔ اُس کے کام میں غیر معمولی دلچسپی لیتا ـــــ میری ہمدردی اب محبت میں تبدیل ہوچکی تھی۔

جب ان تعلقات کی خبر قبلہ والد صاحب کو پہونچی، تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ اُنہوں نے میری شادی کر دینا مناسب سمجھا ـــــ مگر میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں ریحانہ کی لڑکی ناہید سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سُنکر انہیں بڑی حیرت ہوئی اور شاید تکلیف بھی ہوئی ہوگی ـــــ مگر میں نے بہت جلد انہیں قائل کر لیا۔ وہ اِسے ایک کارِ خیر سمجھنے لگے۔ لیکن چچا جان نے سخت اعتراض کیا ـــــ اس کے چند خاص وجوہات ہیں ـــــ ایک تو وہ اپنی چھوٹی لڑکی سے میری شادی کرنی چاہتے تھے۔ دوسرے اُنہیں اپنی سادات اور خاندانی شرافت پر بڑا ناز تھا۔ اور حج بھی کر آئے تھے۔ یہ کیونکر برداشت کرتے کہ ایک حاجی کا بھتیجہ ایک طوائف کی لڑکی سے شادی کرے۔ دونوں بھائیوں میں بڑا جھگڑا ہوا ـــــ آخر وہ ناراض ہوکر چلے گئے اور قسم کھالی کہ ہم لوگوں کی کبھی صورت نہ دیکھیں گے ـــــ کہو اب کیا خیال ہے؟"

"میں کیا کہوں عسکری! ـــــ میں نے کبھی اِن مسائل پر غور نہیں کیا۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ تم نے بُرا نہیں کیا ـــــ اور ـــــ اب چھوڑو بھی اِن باتوں کو ـــــ میں ایک کاروباری آدمی ٹھہرا ـــــ اِن چیزوں پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ـــــ ہاں! یہ تو بتاؤ اَب ریحانہ کا کیا حال ہے؟"

"ریحانہ! ـــــ افسوس! ـــــ قریب دو ماہ ہوئے، اُس کا انتقال ہوگیا۔ لیکن اُس کے آخری ایام آرام و چین سے گزرے ـــــ اُس نے دوسری تمام لڑکیوں کی شادی کر دی تھی۔ اپنی ساری جائداد یتیم لڑکیوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دی تھی ـــــ ہاں! مرتے وقت اُس نے ایک عجیب راز کا انکشاف کیا ـــــ اب تم سے کیا پردہ ـــــ ذرا کان نزدیک لاؤ ـــــ راز کی بات ہے ـــــ اُس نے کہا تھا ـــــ میرے چچا ناہید کے حقیقی والد ہیں ـــــ"

ریاض روفی

مسٹر کرڈھلے

یعنی اعلیٰحضرت ہز ہائی نس دی ڈیوک آف ونڈسر کے نام کُھلا مکتوب۔ مرزا صاحب کی عجیب و غریب تصنیف۔ ایک نہایت سے زیادہ سنجیدہ اور باوقار مگر طول طویل مکتوب جو ہز رائل ہائی نس کی ارفع و اعلیٰ پوزیشن اور جملہ آدابِ شاہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ذمہ دار مصنف لکھ سکتا ہے۔ وہ بھی انتہائی ادب و لطافت کے ساتھ۔ قیمت ایک روپیہ عہ۔ ملنے کا پتہ۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

مارتھا

سارے شہر میں ایک چینی ہوٹل اور وہ بھی ایسی جگہ کہ عام طور پر لوگوں کو اس کا علم نہ ہوگا! پھر چینیوں کی خاموش زندگی ـــــ وہاں دوسرے ہوٹلوں کی طرح شور وغل ہی ہوتا اور نہ بظاہر اتنی چہل پہل ہی معلوم ہوتی۔ اس لئے کہ نہ معلوم کیوں ہوٹل کے دروازے اور کھڑکیاں عام طور پر بند رہتے اور خاص طور پر وہ جو سڑک کی طرف کھلتے تھے۔

ہوٹل کے اندر کی حالت بھی کچھ عجیب ہی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے، میزپوش، فرنیچر، غرض کہ ہر چیز کچھ اس قسم کی تھی کہ عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی۔ اور اگر کوئی اس وقت ہوٹل میں پہونچ جاتا جب چینی کھانا کھاتے ہوئے ہوتے تو وہ شاید سوائے چاولوں کے اُبلے اور کسی کھانے کو نہ پہچان سکتا!۔

لوئی، مسٹر لی فنگ کے ہوٹل کی خاص ملازمہ تھی۔ یوں تو وہاں سب ملازم انگریز تھے لیکن چینیوں میں جو مقبولیت لوئی کو حاصل تھی وہ کبھی کسی اور کو میسر نہ ہوئی۔ لمبی اور دُبلی پتلی۔ پیلا رنگ۔ لیکن لوئی کو بنے سنورے رہنے کا انتہائی شوق تھا۔ بالوں میں تیل، کپڑوں میں عطر اور چہرے سے لیکر بدن کے ہر اُس حصّے پر جو کھُلا رہتا وہ اس بُری طرح پاؤڈر لگاتی کہ کچھ اچھی نہ معلوم ہوتی۔ اور ان تمام چیزوں کی ملی ہوئی عجیب خوشبو بسا اوقات بہت ناگوار ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ اگر مسٹر لی فنگ کے ہوٹل میں کوئی بھولا بھٹکا انگریز آجاتا تو وہ لوئی کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔ لیکن چینیوں کا مذاق ہی نرالا ہے۔ اُن کی تو لوئی کو دیکھکر حالت ہی عجیب ہو جاتی۔ کوئی اسکی فراک کے دامن کو پکڑتا۔ کوئی اُس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا کوئی اُس کے بال چھوتا۔ لوئی عام طور اُن کے ہاتھوں کو جھٹک دیتی۔ اور بچتی ہوئی کمرے سے نکل جاتی۔ لیکن بعض اوقات جب اُس کی طبیعت بھی مذاق کی طرف مائل ہوتی تو وہ اُن کے پاس بیٹھ جاتی۔ خود ہنستی اور سب کو ہنساتی۔ اور اس وقت چینیوں کی حالت قابلِ دید ہوتی۔ کوئی اُس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتا کوئی اُس کے بالوں سے کھیلتا۔

لوئی کی اکلوتی بچی مارتھا بھی چینیوں میں کچھ کم مقبول نہ تھی اسکی عمر کوئی بارہ برس کی ہوگی۔ ماں کی طرح دُبلی پتلی پیلی رنگت، چھوٹی ناک، اور چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، چوڑا مُنہ جس میں گوشت نہ ہونے سے ہڈیاں بہت نمایاں تھیں۔ ان سب سے اُسکے گمنام باپ کی قومیت کا صاف پتہ چلتا تھا۔

لوئی خود جتنی بنی ٹھنی رہتی مارتھا کو اسی قدر بُری حالت میں رکھتی۔ ایک کالی فراک جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ہونے کے علاوہ اُس کے کسی قدر اونچی بھی ہوگئی تھی۔ کالے اونی موزے جو چھوٹے بھی تھے اور پھٹے ہوئے بھی، یہی اُس کا واحد لباس تھا۔ اُس کے بال بھی یونہی اُلٹے سیدھے بندھے رہتے، جن میں ہفتوں نہ تیل پڑتا اور نہ کنگھا ہی ہوتا۔

وہ ویسے بھی بہت ہی خاموش لڑکی تھی۔ لیکن جب کبھی بولتی تو اس انداز سے کہ وہ اُس کے معصوم چہرے پر اچھا نہ لگتا۔ اس کی باتیں بھی بڑے آدمیوں کی سی ہوتیں۔ مگر اُس کے دُبلے پتلے ہاتھ پیروں میں بلا کی پھُرتی تھی۔ لوئی ہوٹل کے کام سے تو مجبور تھی لیکن گھر پر تو وہ اُٹھکر پانی بھی نہ پیتی تھی۔ سارا کام مارتھا کو کرنا پڑتا تھا۔

جب سے مارتھا نے آنکھیں کھولی تھیں اُس نے اپنے آپ کو اسی ہوٹل میں پایا تھا۔ معلوم نہیں اُسے وہ دن یاد ہونگے یا نہیں جب کبھی اُسے اُس کی ماں ہوٹل میں لے آئی تھی تو تمام چینی اُسے لینے کے لئے جھپٹ پڑتے تھے، اور خوب کھلاتے تھے۔ لیکن جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی چینیوں کو اُس کی محبت اور زیادہ ہوتی گئی۔ معلوم نہیں وہ اُسے اپنا خون سمجھکر پیار کرتے تھے یا لوئی کی لڑکی کر کے!۔ مگر اب تک یہ حالت تھی کہ جب کبھی وہ ہوٹل میں آجاتی تو چینی خوش ہو جاتے۔ وہ اُسے اپنا عجیب وغریب ناچ گانا سکھانے کی کوشش کرتے جو وہ کسی قدر دشواری کے ساتھ اب سیکھ گئی تھی۔

لیکن مارتھا کا سب سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ دیواروں پر اور اُن کاغذوں پر جو اُسے پڑے ہوئے مل جاتے، لکیریں اور تصویریں کھینچنا تھا۔ وہ اپنے دل سے کوئی نہ کوئی تصویر بناتی۔ اور یہ دیکھکر بہت کچھ حیرت ہوتی کہ وہ اپنی عُمر کی نسبت سے اچھی خاصی تصویریں بنا لیتی۔ گو چینیوں کو اُس کی تصویروں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، لیکن چونکہ وہ اُسے بہت پسند کرتی تھی، وہ بھی اُس میں دلچسپی لیتے تھے۔ چینی اسے اکثر کاغذ پنسلیں لا لاکر دیتے اور مارتھا دن بھر

تصویریں بناتی رہتی۔

لوٹی کو مارتھا کا یہ مشغلہ پسند تو قطعی نہیں تھا اور جب وہ گھر کی دیواروں کو سیاہ کرتی تو اُسے غصہ بھی بہت آتا لیکن وہ باتوں کی وجہ سے وہ خاموش ہو جاتی۔ ایک تو اُس نے اکثر سنا تھا کہ کس طرح ایک انگریز لڑکی لوٹا بچپن ہی میں بہت کامیاب مصور بن گئی تھی اور اس کی تصویریں اتنی پسند کی جاتی تھیں اور اتنی قیمت پر بکتی تھیں کہ اُس کے ماں باپ محض اس کی کمائی پر عیش کرتے تھے۔ شاید اُس کی مارتھا بھی ایک دن ایسی ہی قیمتی تصویریں بنانے لگے؟ پھر تو اُسکے دن بھی عیش سے گذریں گے!

لوٹی نے ایک عرصے تک یہ خواب دیکھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ اُمید جاتی رہی مگر اُس نے پھر بھی مارتھا کو تصویریں بنانے سے منع نہ کیا۔ کیونکہ لوٹی جانتی تھی کہ اِس مشغلہ میں چینی بہت دلچسپی لیتے ہیں اور لوٹی کیلئے یہی کیا کم تھا کہ چینی خوش رہیں!!

اُس دن بھی مارتھا اپنی عادت کے موافق ہوٹل میں بیٹھی ہوئی تصویریں بنا رہی تھی۔ تمام چینی اُس کے چاروں طرف حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ وہ اُس کی عجیب وغریب تصویروں کو دیکھ دیکھکر خوش ہو رہے تھے اور مارتھا بڑی تیزی کے ساتھ تصویریں بنانے میں مشغول تھی۔ وہ جب ایک تصویر مکمل کرلیتی تو اس کاغذ کو پھینک دیتی۔ اور دوسرے کاغذ پر تصویریں بنانے لگتی۔

عام طور پر اگر کوئی یوروپین اس ہوٹل میں آجاتا تو وہ مارتھا اور مارتھا کی تصویروں میں بھی کوئی دلچسپی نہ لیتا تھا۔ لیکن اس روز ایک یوروپین جو بیٹھا چاء پی رہا تھا، اچانک اپنی جگہ سے اُٹھا اور چینیوں کے حلقے کو چیرتا پھاڑتا مارتھا تک پہونچ گیا۔ مارتھا اُس وقت عجیب وغریب تصویریں بنا رہی تھی۔ وال (اس یوروپین کا نام) نے مارتھا کی بنائی ہوئی ایک تصویر کو اُٹھالیا اور تھوڑی دیر تک بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے اُس تصویر کو اپنی جیب میں رکھ لیا اور اپنی جگہ آبیٹھا۔

تھوڑی دیر بعد لوٹی وہاں آئی اور اپنے ساتھ مارتھا کو لیکر چلی گئی۔

(۲)

لوٹی خوب دن چڑھے اُٹھنے کی عادی تھی۔ مارتھا اُسے بستر پر ہی چاء بنا کر دیدیتی اور وہ اکثر گیارہ بجے تک بستر پر لوٹ لگاتی رہتی۔ اس کی ہوٹل میں ڈیوٹی بھی شام ہی کے وقت ہوتی تھی۔ اسلئے اُسے اس دن بہت ہی تعجب ہوا جب کسی نے نو بجے ہی اُس کا دروازہ کھڑکھڑانا شروع کردیا۔

"کون ہے؟" لوٹی نے کسی قدر کرخت لہجہ میں پوچھا۔

"کیا مَیں اندر آسکتا ہوں؟" باہر سے ویسے ہی کرخت لہجے میں جواب ملا۔

"نہیں تم اندر نہیں آسکتے" لوٹی نے اُسے جواب دیا۔ اور پھر آہستہ سے مارتھا سے بولی "جاؤ دیکھو تو کون کمبخت ہے"

تھوڑی دیر میں مارتھا اور وال کی باتوں کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ یہ وال وہی شخص تھا جس نے کل مارتھا کی تصویروں کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔ لوٹی اُسے بہت اچھی طرح جانتی تھی اور اس کی کرخت آواز تو کون نہیں پہچان سکتا تھا؟ وہ ایک عرصے سے لوٹی کے مکان کے قریب ہی رہ رہا تھا۔ اُس کی زندگی کے حالات پوری طرح تو کسی کو معلوم نہیں تھے لیکن اتنا سب جانتے تھے کہ اُس کی محبوبہ نے اس کے ساتھ بیوفائی کی اور کسی دوسرے شخص کے ساتھ شادی کرلی۔ اس کا اس کو اتنا رنج ہوا کہ اس کا دماغ صحیح حالت میں نہ رہ سکا۔ اُس کی اس قابلِ رحم حالت کی وجہ سے سبکو اس کے ساتھ ہمدردی تھی۔ لیکن اس کی وحشیانہ گفتگو اور حرکتوں سے سب گھبراتے تھے۔

"مارتھا انہیں اندر بلالو" لوٹی نے چلا کر کہا اور تھوڑی دیر میں وال اور مارتھا کمرے میں داخل ہوگئے۔

"مَیں تمہارا زیادہ وقت خراب نہ کرونگا۔ تمہیں معلوم ہے مَیں بالکل تنہا رہتا ہوں۔ اس لئے مجھے ایک ایسی ملازمہ کی ضرورت ہے جو صبح کو میری چاء بنادے اور بس۔ اور باقی دن اور رات کا کھانا تو تمہیں معلوم ہی ہے مَیں ہوٹل میں کھاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اتنا کام تو تم بھی بڑی آسانی کے ساتھ کرسکتی ہو"

ذرا سے کام سے لوٹی کی آمدنی میں تو معقول اضافہ ہوسکتا تھا لیکن صبح سویرے کیسے اُٹھ سکتی تھی؟ — اس لئے اس نے انکار کردیا۔

وال جب چلنے لگا تو لوٹی کے دل میں ایک خیال آیا۔

"لیکن مسٹر وال تمہارا کام تو مارتھا بھی کرسکتی ہے۔ صرف صبح کی چاء بنانا ہی تو ہے۔ میرے لئے بھی تو چاء یہی بناتی ہے"

وال نے مارتھا کا نام سُنکر پہلے تو بہت ناک بھوں چڑھائی لیکن پھر راضی ہوگیا۔ اور مارتھا کی تنخواہ ۱۸ پنس فی ہفتہ مقرر ہوگئی۔

وال کی یہ حیل و حجت محض دکھانے کی تھی۔ ورنہ جونہی مارتھا کا نام اُس نے سنا اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے جنہیں وہ ظاہر نہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دراصل لوٹی کے آنے سے بھی اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا مارتھا کے آنے سے اُسے خوشی ہوتی۔ وہ آیا بھی اسی لئے تھا!

غریب وال کی زندگی بھی آہ! کتنی ناکامیوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اُن بدقسمت لوگوں میں سے تھا جو جس کام کو بھی شروع کرتے ہیں اس میں ناکامی ہوتی ہے۔ یہ ناکامیاں دیکھتے دیکھتے اُس کی زندگی اس کیلئے وبالِ جان بن گئی تھی۔ اس کے دماغ کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ آخر وہ کہاں تک صبر کرتا؟۔

آج سے دس سال پہلے۔ آہ! اس زمانہ کی یاد کتنی خوشگوار تھی۔ گویہ خوشی جلد ہی چلی جاتی اور وہ پھر پہلے سے بھی زیادہ غمگین ہو جاتا لیکن پھر بھی وہی دو چار سال کا زمانہ تھا جسے وہ اپنی تمام زندگی کا بہترین حصہ کہہ سکتا تھا۔ جب وہ خوش تھا۔ لوگ اُس کی عزت کرتے تھے جب اُسکو کسی سے محبت تھی اور کوئی اُس سے محبت کرنے والا بھی تھا!

کس طرح غریب ماں باپ کا یونہی برائے نام پڑھا لکھا لڑکا وال ایسی شہرت کو پہونچ سکا۔ ایک لمبی کہانی ہے۔ اور اس کا بتانا بھی یہاں مقصود نہیں لیکن کسی نہ کسی طرح وال نے ایک مصور کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کرلی اور دور دور اُس کی تصویریں مشہور ہوگئیں۔ وہ اپنے کام میں برابر ترقی کرتا گیا لیکن اس خوشحالی کے دور میں اُسکی ملاقات جینی سے ہوئی۔ یہ خوبصورت عورت رفتہ رفتہ اسکے دل و دماغ پر قبضہ جماتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وال کے دماغ میں سوائے جینی کے خیال کے اور کوئی خیال نہ رہا۔ یقینی بات ہے کہ جب کسی کو یکسوئی نہ ہو اور پھر اتنا وقت نہ ملے جتنا پہلے ملتا تھا تو وال کی تصویریں کس طرح اتنی کامیاب ہو سکتی تھیں! لیکن وال کو اس کی فکر نہ تھی۔ اے کاش وہ صرف اس کو حاصل کر لیتا جس کے لئے اُس نے ہر چیز بخوشی چھوڑ دی تھی! مگر یہ نہ ہوا! اور جس وقت اُسے غربت اور بیکاری کی حالت میں یہ خبر ملی کہ اُس کی زندگی کی واحد تمنا بھی پوری نہ ہوسکیگی اور جینی نے کسی دوسرے سے شادی کرلی ہے تو اس کا دل بیٹھ گیا اور دماغ کا توازن قائم نہ رہ سکا۔

یہ حالت ایک عرصے تک رہی۔ وہ اپنا کام کیا خاک کرتا جب اُسے اپنی ہی خبر نہ تھی۔ لیکن وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے اور جوں جوں وقت گذرتا گیا وہ ہوش میں آتا گیا لیکن اپنے ہوش میں آنے کے بعد بھی، نہ معلوم کیوں، اس کی طبیعت تصویریں بنانے میں نہیں لگتی تھی۔ یا تو شاید وہ اب ہر خوبصورت چیز سے نفرت کرنے لگا تھا اور یا اُسے ابھی تک وہ یکسوئی نہ حاصل ہوئی تھی جو ہر مصور کیلئے ضروری ہے!

وہ اپنی زندگی کے دن یونہی رو رو کر بغیر کسی اُمید کے گزار رہا تھا کہ اچانک یہ واقعہ پیش آیا۔ مارتھا کی بنائی ہوئی تصویروں میں اُسنے آرٹ کی جھلک دیکھی۔ ایک مصور تصویر کی خوبیوں کو زیادہ بہتر پہچان سکتا ہے اور اگر مارتھا کی تصویریں سب کے لئے محض بچے کا کھیل تھیں تو اُن کی خوبیاں وال سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ بلکہ اور سب کی بے اعتنائی نے اور مارتھا کی اپنی لاپرواہی نے اُس کے لئے ایک اور اُمید پیدا کردی۔ اگر وہ خود تصویریں نہیں بنا سکتا تو مارتھا کی تصویریں اپنے نام سے ضرور پیش کرسکتا ہے۔ اس کی اپنی گئی گزری شہرت اس وقت کام آسکتی ہے اور نہ کسی کو یہ خیال ہو سکے گا کہ وہ تصویریں اُس کی اپنی بنائی ہوئی نہیں ہیں اور نہ مارتھا ہی سے اور اس کی ماں سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس کی جعلسازی کا راز فاش کریں گی۔ کیونکہ وہ سب ان تصویروں کی خوبیوں سے خود آگاہ نہ تھے۔

انہیں خیالات کی بنا پر وہ صبح کو لوٹی کے گھر آیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب خود مارتھا اس کے گھر روز آیا کریگی تو اس سے زیادہ اس سے تصویریں بنوانے کا اور کیا موقع ہوسکتا تھا۔ اور جب وہ اُسے ذرا سی اصلاح دیگا اور عمدہ کاغذ اور رنگ لا لا کر دیگا تو پھر تو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تصویریں بنائے گی۔ اُسے اپنی کامیابی پر جتنی بھی خوشی ہوتی کم تھی!

رات کو سونے سے پہلے ہی وال نے کاغذ اور پنسل میز کے اوپر نکال کر ڈال دئے تھے۔ صبح کو جب مارتھا آئی تو وال سو رہا تھا۔ وہ جلد ہی اپنے کام سے فارغ ہوگئی۔ اور میز پر پڑے ہوئے کاغذ پنسل کو لیکر تصویریں بنانا شروع کردیا۔

اتنے میں وال نے جماہی لیتے ہوئے چلا کر کہا۔ "ابھی تک چاء تیار نہیں ہوئی؟"

"چاء تو بڑی دیر کی تیار ہے میں ابھی لا رہی ہوں"۔

وال کو چاء پلا کر مارتھا تو اپنے گھر چلی گئی۔ اور وال نے اٹھکر میز پر سے اُس کی بنائی ہوئی تصویروں کو اٹھا کر بڑے غور سے دیکھا۔

اور پھر اپنی الماری میں بند کر دیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر شرارت کی ہنسی کھیل رہی تھی!

اسی طرح روز مارتھا صبح کو چاء بنانے آتی اور چاء بنا کر تصویریں بناتی رہتی۔ رفتہ رفتہ وال کی الماری میں تصویروں کا نمبر بڑھتا گیا۔ بلکہ اب تو مارتھا اُس سے اتنی مانوس ہوگئی تھی کہ وہ چاء پلانے کے بعد بھی بڑی دیر تک تصویریں بناتی رہتی اور گھر برائے نام ہی جاتی۔

مارتھا کو تصویریں بنانے کا انتہائی شوق تھا اور وال کے یہاں اُسے کاغذ اور پنسل بغیر کسی دشواری کے مل جاتے۔ وہ اس کو زیادہ اور کچھ نہ چاہتی تھی۔ بلکہ ایک دن تو ایسا واقعہ پیش آیا کہ وال نے مارتھا کو کبھی کی اپنی بنائی ہوئی ایک تصویر دکھائی جو مارتھا کو پسند نہ آئی۔ اُس وقت وال کے دل میں حسد کی آگ جل اٹھی اور اُس نے مارتھا کو خوب مارا۔ لیکن مارتھا نہ تو وہاں سے بھاگی اور نہ اگلے دن سے اُس نے وال کے گھر آنا ہی چھوڑا۔ اس پر وال کو بہت ہی سخت افسوس ہوا اور اُسے یقین ہوگیا کہ مارتھا کو فطرتاً تصویروں سے عشق ہے اور وہ جہاں اُسے تصویریں بنانے کی سہولتیں ملجائیں وہاں بڑی سے بڑی مصیبت گوارا کرسکتی ہے!

ایک دن وال خلاف معمول سینما گیا۔ وہاں اُس کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو وال کی گئی گذری شہرت کے زمانے میں اس کی تصویروں کا بہت مداح اور مستقل خریدار تھا۔ اُسے وال کے ساتھ بہت ہمدردی تھی اور اس کا افسوس تھا کہ اُس نے تصویریں بنانا چھوڑ دیا۔ اُس دن سینما میں جو اُس نے وال کو دیکھا تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ وال نے اُس دن معمول سے زیادہ شراب پی تھی۔ لہٰذا اُس سے کچھ اچھی طرح باتیں تو نہ ہوسکیں لیکن جب اگلے دن وال سو کر اٹھا تو اُس کا نشہ غائب ہوچکا تھا۔ اچانک جو اُس کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں گیا تو اُسے ایک کارڈ ملا جس پر لکھا تھا: "ایڈورڈ میکنیٹر۔ سرے گیلریز"!

اس کارڈ کی مدد سے اُسے رات کی ملاقات کا خیال آیا۔ اُسے یہ تو یاد نہ تھا کہ رات اُس کی اپنے دوست سے کیا باتیں ہوئیں لیکن اتنا اس کو یقین تھا کہ اس کی باتیں تصویروں کے متعلق ہی ہونگی۔ وہ اس دوران میں خود بھی اسی کوشش میں تھا کہ کسی طرح کوئی صورت ان تصویروں کے بیچنے کی نکل آئے جو روز بروز اس کی الماری میں بڑھتی جارہی تھیں۔

وہ جلدی جلدی ناشتہ کرکے اپنے دوست کے گھر پہونچا۔ وہاں اُن میں بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ایڈورڈ نے وال کی دماغی حالت سُدھر جانے پر بہت خوشی کا اظہار کیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا اُس نے تصویریں بنانا پھر شروع کردیں یا ابھی نہیں۔ وال نے اُسے بتایا کہ ایک عرصہ سے ۔ وہ اسی کام میں منہمک ہے اور اس وقت اس کے پاس سینکڑوں تصویریں ہیں۔

ایڈورڈ نے اس پر اور بھی زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد یہ طے پایا کہ ایڈورڈ اپنے نام سے تصویروں کی ایک بہت بڑی نمائش کرائے اور اس میں دوسرے مصوروں کے ساتھ ساتھ وال کی تصویریں بھی رکھی جائیں، چونکہ نمائش میں روسا اور آرٹ کے قدردانوں کو خاص طور پر مدعو کیا جائیگا اس لئے اُمید ہے کہ اگر وال کی تصویریں ہاں پسند کرلی گئیں تو اُس کی کھوئی ہوئی شہرت پھر دوبارہ اُسے حاصل ہوجائے گی!

وال کو مارتھا کی بنائی ہوئی تصویروں پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ چاہے کتنی ہی بڑی نمائش ہو اُس میں کامیاب رہیں گی۔ مارتھا کے بچپن اور لوٹی کی لاپرواہی اور جہالت سے اُسے اس بات کا بھی اندیشہ نہ تھا کہ وہ یہ دعویٰ کریں گی کہ وہ تصویریں وال کی بنائی ہوئی نہیں ہیں!

گھر پہونچ کر اُس نے الماری سے تصویریں نکالیں۔ انہیں بغور دیکھا اور پھر سب پر اپنے نام کے حروف بنا بنا کر رکھتا رہا۔ اس وقت اُس کے دل کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ اُسے اپنی چالاکی پر دل ہی دل میں کسی قدر خفت بھی ہورہی تھی۔ کبھی اُسے مارتھا کے انتہائی بھولے پن پر افسوس بھی ہوتا۔ پھر اُسے دُنیا کی حالت پر رنج ہوتا کہ یہاں کس طرح کسی کی محنت اور قابلیت سے کوئی فائدہ اُٹھاتا ہے!!

تھوڑی دیر کیلئے وہ اپنی آنے والی دولت اور شہرت کا خیال کرکر کے خوش ہوتا۔ پھر ایک دم یہ خیال بجلی کی طرح سے اس کی تمام اُمنگوں کا خاتمہ کردیتا کہ اگر کسی طرح مارتھا یا لوٹی نے اس کا پتہ لگالیا کہ وہ کس طرح مارتھا کی محنت سے دولت کما رہا ہے تو اُس کا راز فاش ہوجائیگا۔ اور عزت خاک میں مل جائے گی۔ بلکہ ممکن ہے اُسے اس سے بھی بڑی سزا بھگتنی پڑے!

تصویروں کو اس نے دوبارہ الماری میں بند کر دیا۔ پھر کسی خیال کے یکایک آجانے پر وہ بازار چلا گیا اور وہاں سے بہت سا کاغذ، کپڑا اور رنگ خرید لیا۔

اگلے روز وہ مارتھا کو شہر سے باہر ایک چشمے کے کنارے لے گیا اور وہاں اس سے کہا کہ وہ ایک خوشنما منظر کی تصویر بنائے۔ اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مارتھا نے ایک بہت ہی خوبصورت مکمل آرٹ، تصویر بنا کر اسے دکھائی۔

وال رفتہ رفتہ اپنی آنے والی کامیابی کے خیال سے مست ہوتا جا رہا تھا۔ جو اندیشے اس کے دل میں آتے وہ جلد ہی انہیں دل سے نکال دیتا۔ اور مارتھا اور لوئی کے ساتھ انصاف اور ہمدردی اور اپنی چالاکی کی خفت کو تو اس نے جلد ہی اپنے دل سے نکال دیا۔۔
"جب دنیا ہی کا یہ دستور ہے کہ غریب محنت کرتے ہیں اور رئیس عیش اڑاتے ہیں، چالاک آدمی سیدھے آدمیوں سے ہی بیوقوف بنا کر روپیہ اینٹھتے ہیں تو میری ہی کیا انوکھی خطا ہے!!"

اب اس کے سامنے خوشحالی، دولت، عیش و مسرت کے دن تھے۔ اسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اگر ایک عورت نے اسے دھوکا دیکر اس کی زندگی برباد کی تھی تو اس نے بھی اس کا بدلہ ایک نہیں دو عورتوں کو دھوکا دیکر لیا۔۔ وہ اپنی کامیابی پر مگن تھا۔ اور شاید وہ یوں بھی خوش تھا کہ جب جینی اسے پھر خوشحالی اور عزت کی حالت میں دیکھے گی تو اسے اپنی غلطی پر بے انتہا قلق ہوگا۔ اور اسے جینی کو چھیڑنے میں اور لطف آئے گا۔۔ !

مارتھا اپنا زیادہ وقت وال کے یہاں گذارتی۔ لوئی اوّل تو تھی ہی سست اور اب جو تھوڑا بہت کام کرنا پڑ گیا تو ہوٹل کے کام میں ڈھیل پڑ گئی۔ اس کے علاوہ لوئی اوّل تو حسین تھی ہی کب اور اب جوں جوں عمر بڑھتی جا رہی تھی اور چہرے پر بے رونقی آتی جا رہی تھی۔ جینی اس سے ناخوش تھے۔ وہ نہ خود ہی اب آکر ان سے گپیں لڑاتی تھی اور نہ اب مارتھا ہی ہوٹل میں آتی تھی۔ لہذا جلد ہی اس سے مسٹر ڈی فنگ بھی ناراض ہوگئے اور آخر کار ایک دن صبح سویرے انہوں نے لوئی کو بلا کر صاف جواب دیدیا کہ اب اس کی ہوٹل میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔

وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس کے کانوں میں یہی الفاظ گونج رہے تھے "تم اب بڈھی ہوگئیں۔"

لوئی اب خود تو کچھ کمانے کے لائق نہ تھی۔ اس کی آئے دن کی بیماری نے اسے کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔ لہذا یہی ترکیب ہو سکتی تھی کہ مارتھا کو کسی ایسی جگہ نوکر کرا دیا جائے جہاں سے کم سے کم اتنے پیسے تو مل جائیں کہ ان دونوں کی روٹی چل جائے۔ اس کے دماغ میں ابھی یہ تو نہ آیا تھا کہ مارتھا کو کہاں نوکر کرائے لیکن اس کا اس نے مستقل ارادہ کر لیا کہ وہ اسے وال کے یہاں سے ہٹا لے۔ چنانچہ اس نے رات کو سوتے وقت مارتھا سے کہدیا کہ وہ صبح سے وال کے گھر نہ جائے۔ لیکن صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو مارتھا وال کے گھر جا چکی تھی۔ اسے اس پر بہت ہی غصہ آیا۔ وہ نہیں سمجھ سکی کہ مارتھا کا دل وال کے گھر اتنا کیوں لگتا ہے۔ ابھی اسکی عمر ہی کیا تھی جو وہ کسی اور بات کا خیال کرتی! لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ غصے میں بھری ہوئی وال کے گھر پہونچ گئی۔

وال رات کو بہت دیر میں گھر آیا تھا اس لئے وہ ابھی سو ہی رہا تھا کہ کواڑوں کی دھڑ دھڑاہٹ سے اسکی آنکھ کھل گئی۔ مارتھا اس کے پاس بہت پریشان کھڑی تھی۔

اتنے میں آواز آئی "نکلے گی نہیں کمبخت کی بچی۔ میں نے تجھ سے رات ہی کہا تھا کہ تو یہاں نہیں آئیگی"۔ وال نے بآسانی لوئی کی آواز پہچان لی۔

مارتھا وال سے لپٹ گئی۔

"تم نے غریب لڑکی کو کیوں پریشان کر رکھا ہے"۔ اس نے جھلا کر لوئی سے پوچھا۔

"تمہیں اس سے کیا مطلب۔ لڑکی میری ہے یا تمہاری۔؟" لوئی نے ڈانٹ کر کہا۔

"بڑی ماں بنی ہو۔ اس غریب کو پریشان کر دیا جیسے اسے مار ہی ڈالوگی"۔

"کچھ ہو، تم ہی بتاؤ اس کی ماں کون ہے؟ تم یا میں؟"

"اسے کھانا کون کھلاتا ہے۔ اس سے محبت کون کرتا ہے تم یا میں؟۔ اور وہ محبت کس سے کرتی ہے"۔

لوئی خاموش رہی۔

وال جھلاتا رہا "بڑی ماں بنی ہو"۔

"مارتھا۔ کیا تجھے میری محبت نہیں ہے؟ کیا تو اپنی ماں کے ساتھ نہیں آئیگی"۔ لوئی نے بڑے پیار سے کہا۔

مارتھا خاموش رہی لیکن اس نے وال کو اور مضبوط پکڑ لیا۔

"نہیں وہ تمہارے ساتھ نہیں جائیگی۔" وال نے لوئی سے کہا۔ "معلوم نہیں تم اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتی ہو جو یہ تم سے گھبراتی ہے اور بھاگتی ہے۔ کیا تم کو اس معصوم پر رحم نہیں آتا۔ تمہیں خدا کے یہاں اس کی بڑی سزا ملے گی۔"

"انہوں نے کچھ اور نہیں کہا بس یہ کہا تھا کہ میں کل سے یہاں نہ آؤں۔" مارتھا نے لوئی پر ترس کھاتے ہوئے وال سے کہا۔

"مسٹر وال میری لڑکی مجھے واپس دیدو۔" لوئی نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"نہیں یہ تمہارے گھر نہیں جائے گی۔" وال پر اس کی لجاجت کا کوئی اثر نہ ہوا۔

"تم نے آخر اسے کیا پٹی پڑھا رکھی ہے۔ تمہارا اس طرح اسے رکھنے کا کیا مطلب ہے؟ تمہیں شرم نہیں آتی۔" لوئی کو پھر غصہ آ گیا۔

"میرا مطلب کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ وہ تمہارے ساتھ جاتی ہوئی ڈرتی ہے، اور مجھ سے مدد مانگتی ہے۔ اب چاہے مجھے کتنی ہی مشکل اٹھانا پڑے میں اسے تمہارے ساتھ نہ جانے دونگا کہ تم اسے جان سے مار ڈالو۔"

"اچھا یہ بات ہے تو مارتھا جلدی بولو۔ تم میرے ساتھ چلنا چاہتی ہو یا وال کے پاس رہنا چاہتی ہو؟"

اس کا جواب مارتھا نے اس طرح دیا کہ اس نے وال کا کوٹ اور زیادہ مضبوط پکڑ لیا۔

لوئی نے بہت ہی مایوسی کی حالت میں "او خدا!" کہا اور وہاں سے چلدی۔

وال، لوئی کی اس انتہائی مایوسی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آہ! وہ اب کیا کریگی۔ اس کے پاس اس کی لڑکی بھی نہ رہے گی——!

یکلخت، دولت اور عزت کے لالچ، خوشحالی اور مسرت کی امنگوں پر شرافت کا وہ جذبہ غالب آ گیا جو اس کے دل سے ابھی تک بالکل نہ گیا تھا! اسے خود سے نفرت ہو رہی تھی۔ اس کے دماغ میں مختلف خیالات چکر کاٹ رہے تھے۔ ہونے والی تصویروں کی نمائش —— اور مارتھا کی تصویروں کی کامیابی —— پھر ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے لوئی کے مایوسی کے الفاظ "یا خدا" اور مایوسی کی حالت میں اس کا چوکھٹ پر گرنا —— آ گئے۔ وہ کانپ گیا۔ پھر ایک عزم کے ساتھ اس نے مارتھا کو اٹھا کر دروازے سے باہر نکال دیا۔ اور تمام تصویروں کے بندھے ہوئے بنڈل۔ رنگ برش اس کے اوپر پھینک کر دروازہ بند کر لیا۔ اور چلا کر کہا "جاؤ! اپنی ماں کے پاس ابھی چلی جاؤ۔"

نامراد وال کی کوئی امید بر نہ آئی —— مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا——!!

(رچارڈ ہیوز)

کرمانی۔ بی۔ اے

خواب

میں اُس زمانہ میں اپنی ماں کے ساتھ سمندر کے کنارے ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا تھا۔ میں اس وقت کوئی سترہ برس کا ہونگا اور میری ماں کی عمر صرف ۴۰ سال تھی۔ انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں شادی کی تھی۔ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تھا تو میں سات سال کا تھا، مگر وہ مجھے اچھی طرح یاد تھے۔ میری ماں دبلی پتلی اچھی صورت کی عورت تھی۔ میں نے اپنی ماں کی سی غمگین اور خوبصورت آنکھیں کہیں نہیں دیکھیں۔ ہم لوگ اعلیٰ پیمانہ پر امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ میں اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا اور وہ بھی مجھے بے حد چاہتی تھی۔ مگر پھر بھی ہماری زندگی مسرور نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پوشیدہ رنج اُس کے نخلِ زندگی کو اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔ اور اگرچہ میری ماں کو میرے باپ کی دائمی جدائی کا بے انتہا قلق تھا مگر یہ پریشانی صرف اس ہی جدائی کی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں کی زندگی میں کوئی راز پوشیدہ تھا جس کو جانتا میں نہیں تھا مگر محسوس کرتا تھا۔ مجھکو بے حد چاہنے کے باوجود بھی کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میری ماں مجھ سے نفرت کا اظہار کرتی تھی اور کبھی کبھی میری موجودگی اُس کے لئے باعثِ کوفت ہو جاتی تھی۔ میں اس کے اِس عجیب طرزِ عمل کو اُس کی رنجیدہ طبیعت اور پریشان اعصاب پر محمول کرتا تھا۔ میری ماں اپنے فرصت کا تمام وقت میرے اُوپر صرف کرتی تھی۔ اُس کی زندگی میری زندگی میں بالکل گھل مل سی گئی تھی۔ میں اِس قسم کے طرزِ عمل کو بچوں کے لئے مضر سمجھتا ہوں مگر جو بچے اپنے والدین کے اکیلے ہوتے ہیں ان کو اکثر اس مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ میری صحت ہمیشہ سے کمزور تھی۔ صورت اور نزاکت میں میں بالکل اپنی ماں سے ملتا جلتا تھا۔ میں اپنے عمر کے لڑکوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا اور طبعاً خاموش، شرمیلا اور تنہائی پسند تھا۔ یہاں تک کہ اپنی ماں سے بھی بہت کم بات کرتا تھا۔ میں پڑھنے کا بہت شوقین تھا اور تنہا ٹہلنے کا بھی ــــ اور میں اکثر خواب بھی دیکھا کرتا تھا۔ میرے خواب کس قسم کے ہوتے تھے یہ صحیح طور پر بتانا بہت مشکل ہے۔ میں بہت زیادہ سویا کرتا تھا اور خواب میری زندگی میں ایک اہم چیز بن گئے تھے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کسی مقفل کمرے کے سامنے کھڑا ہوں جس میں بہت سے راز بند ہیں۔ میں ان کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر نہیں معلوم کر سکتا۔ یوں تو میں ہر روز ہی طرح طرح کے خواب دیکھا کرتا تھا مگر ایک خواب مجھے بہت پریشان کیا کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کسی پرانے شہر میں ایک تنگ و تاریک اونچی نیچی گلی میں چلا جا رہا ہوں جس میں چاروں طرف اُونچے اُونچے چوٹی دار کئی منزلہ مکانات ہیں اور میں اپنے باپ کو تلاش کر رہا ہوں جو دراصل مرے نہیں ہیں بلکہ کسی وجہ سے ہم سے پوشیدہ ہیں اور ان ہی مکانات میں سے کسی ایک میں رہتے ہیں۔ میں ایک سیاہ اونچے سے دروازے میں داخل ہوتا اور ایک بڑے سے صحن کو جس میں اُونچی اُونچی شہتیریں ہوتی تھیں پار کرتا ہوا ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوتا جس میں چاروں طرف گول گول کھڑکیاں ہوتی تھیں۔ کمرے کے بیچ میں میرے باپ ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس پائپ ہاتھ میں لئے کھڑے نظر آتے تھے۔ وہ میرے اصلی باپ سے بالکل مختلف، لمبے اور پتلے ہوتے تھے۔ بال سیاہ، ناک اُونچی، عمر تقریباً چالیس سال کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس بات سے خفا معلوم ہوتے تھے کہ میں نے ان کو ڈھونڈ نکالا اور میں بھی اس ملاقات سے کچھ گھبرا سا جاتا تھا۔ وہ میری طرف سے منہ پھیر لیتے اور بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگتے۔ یکبارگی وہ جانے لگتے مگر مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے۔ میں انکا پیچھا کرنے کی کوشش کرتا، کمرہ اور مکان غائب ہونے لگتے، ان کی صورت چھپ جاتی مگر ان کی غرّاتی ہوئی شیر کی سی آواز مجھے دور سے سنائی دیتی۔ میرا دل ڈوبنے لگتا اور میری آنکھ کھل جاتی۔ دن بھر خواب کی یاد مجھے پریشان رکھتی، طبیعت پر وحشت اور اداسی سی چھائی رہتی اور کسی نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش بالکل بے سود ہوتی۔

(۲)

جون کا مہینہ ہمارے شہر کے لئے بڑی بہار اور مشغولیت کا ہوتا تھا کیونکہ سمندر کا کنارہ ہونے کی وجہ سے اکثر جہاز آتے رہتے۔ نئے نئے قسم کے لوگ، انوکھی صورتیں، طرح طرح کے لباس دیکھنے میں آتے۔ قہوہ خانوں اور رسٹورنٹ میں بڑی آبادی اور چہل پہل ہوتی۔ جہازوں کے ملاح اُتر اُتر کر کنارے کے رسٹورنٹ میں آ گھستے، شراب پیتے اور لڑکیوں سے عشق کرتے ــــ اسی زمانہ میں میں ایک دن ایک قہوہ خانے کے سامنے سے گذر رہا تھا کہ ایک شخص مجھے نظر آیا جس کی

طرف میری طبیعت ایکدم متوجہ سی ہوگئی۔ وہ ایک لمبا سیاہ دیہاتی وضع کا کوٹ پہنے تھا اور تنکوں کی ٹوپی جس سے اُس کی آنکھیں بھی ڈھک گئی تھیں۔ وہ خاموشی سے سینے پر ہاتھ باندھے بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ گھنگھر والے بال لٹک کر اُس کی ناک تک پہونچتے تھے اور اس کے پتلے پتلے لبوں میں ایک چھوٹی سی پائپ دبی ہوئی تھی۔ یہ شخص مجھے صورت آشنا سا معلوم ہوا۔ مجھے خیال ہونے لگا کہ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اُسکے زرد چہرے کا ایک ایک خط وخال کچھ اس طرح میرے دماغ پر نقش تھا کہ میں رُکے بغیر نہ رہ سکا اور کھڑے ہوکر دماغ پر زور ڈالنے لگا کہ اس شخص کو میں نے کہاں دیکھا ہے؟ خُدا جانے اُسے بھی میری پریشانی کا علم ہوا یا کیا بات ہوئی کہ اُس نے مُڑ کر میری طرف دیکھا، اور میری نظر اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں پر پڑی۔ بے ساختہ میرے مُنہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔ یہی وہ شخص تھا جسے میں خواب میں دیکھا کرتا تھا یہی میرا وہ باپ تھا جس کی تلاش میں میں سرگرداں رہا کرتا تھا۔ شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی، غلطی ہونے کا امکان نہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور جسم میں ایک چٹکی لی۔ یہ اصلیت تھی، خواب نہ تھا۔ لوگ چاروں طرف پھر رہے تھے۔ دن نکلا ہوا تھا نیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ اور میرے سامنے خواب کی دُنیا کی ہستی نہیں بلکہ ایک زندہ انسان بیٹھا تھا۔ ایک سچ مچ کا انسان! میں اس کے قریب والی میز پر جاکر بیٹھ گیا۔ اور نوکر سے اپنے لئے شراب لانے کا حکم دیا۔ وہ شخص نہایت سکوت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنا جھکا ہوا سر ذرا سا اُٹھاتا تھا اِدھر اُدھر دیکھتا تھا اور پھر جھکا لیتا تھا۔ جب وہ سر اُٹھاتا تھا تو مجھے اپنے باپ کی صورت دکھائی دیتی تھی اور میرے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا اُسے بھی میری پریشانی کا علم ہوا کیونکہ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس گھبراہٹ میں اس کی چھڑی جو کرسی سے ٹیکی رکھی تھی زمین پر گر پڑی۔ میں تیزی سے لپکا اور چھڑی زمین سے اُٹھا کر اُس کے ہاتھ میں دیدی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ تلخی سے مُسکرایا اور کہنے لگا "شکریہ۔ تم بہت سعید ہو بیٹا" اُس نے آہستہ سے غرّائی ہوئی آواز میں کہا "آج کل یہ سعادت کہاں؟ تمہاری تربیت بہت اچھی ہوئی ہے اس پر میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں"۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا جواب دیا۔ لیکن ہم دونوں میں گفتگو شروع ہوگئی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا اُس نے اپنا نام بیرن بتایا تھا۔ اُس کی طرزِ گفتگو میں ایک عجیب قسم کی غرغراہٹ تھی جو میرے خواب والے باپ سے بعینہٖ ملتی تھی۔ اُس نے پوچھا کہ میں کس کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ "اپنی ماں کے ساتھ"۔

"اور باپ؟" اُس نے سوال کیا۔

"اُن کا تو بہت مدت گذری انتقال ہوگیا" میں نے جواب دیا۔

اُس نے میری ماں کا مسیحی نام دریافت کیا اور معلوم ہونے پر ایک قہقہہ لگایا مگر جس کے لئے فوراً ہی اُس نے معافی مانگی۔ گفتگو کے شروع میں جو گھبراہٹ مجھے ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ کم ہوگئی اور ہم دونوں بات کرنے لگے۔ اس نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ پوچھا۔ مگر قبل اسکے کہ میں کچھ بتا سکتا۔ ایک حبشی جو سر سے پاؤں تک ایک کپڑے میں لپٹا ہوا تھا آیا اور آہستہ سے اُس کے کان میں کچھ کہا۔ بیرن نے مجھے سلام کیا اور انتظار کرنے کو کہہ کر قہوہ خانہ میں گھس گیا۔ آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ ایک گھنٹہ گذر گیا مگر بیرن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں عاجز آکر قہوہ خانہ میں گھسا۔ مگر بیرن وہاں بھی نہ تھا۔ میں نے قہوہ خانے کا ایک ایک کونا چھان مارا مگر بیرن کا کہیں نشان بھی نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دونوں کسی پچھلے دروازے سے نکل گئے۔ میرے سر میں خفیف درد ہونے لگا اور اپنی پریشان طبیعت کو ذرا دیر بہلانے کیلئے میں سمندر کے کنارے چلا گیا۔ تھوڑی دیر وہاں ٹہلنے کے بعد بھی مضمحل سا گھر واپس لوٹا۔

(۳)

جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوا ملازمہ بہت گھبرائی ہوئی دوڑی آئی۔ اور اُس کی صورت دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ کوئی واردات گھر میں ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ کوئی آدھ گھنٹہ قبل میری ماں کے کمرے سے ایک چیخ کی آواز سُنائی دی۔ جب ملازمہ اندر گئی تو اُس نے میری ماں کو فرش پر بے ہوش پایا۔ مالی کو جلدی سے ڈاکٹر کو لینے کے لئے دوڑایا گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کو ہوش آگیا۔ مگر وہ سہمی ہوئی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ مالی کا بیان تھا کہ جب میری ماں بے ہوش ہوئی تھی تو اُس نے ایک شخص کو لمبا سا ڈریسنگ گاؤن اور تنکوں کی ٹوپی پہنے پائیں باغ میں سے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر وہ اُس کا پیچھا نہ کر سکا کیونکہ اُسے ڈاکٹر کو بلانے بھیجدیا گیا تھا۔

لمبا سا ڈریسنگ گاؤن اور تنکوں کی ٹوپی! میرا سر چکرانے لگا۔ بیرن بھی تو یہی پہنے تھا! میں اپنے ہوش وحواس کسی طرح درست کرکے اپنی ماں کے کمرے میں گیا۔ وہ پلنگ پر پڑی تھی اور میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اُس کا چہرہ پلنگ کی چادر سے بھی زیادہ سفید تھا۔ مجھے دیکھکر وہ افسردگی سے مسکرائی۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اصل واقعہ کیا ہوا۔ پہلے تو وہ ٹالتی رہی پھر آخر اُسنے

اقرار کر لیا کہ وہ کسی چیز سے ڈر گئی ہے۔

میں نے پوچھا۔ "کیا کوئی یہاں گھس آیا تھا؟"

"نہیں تو۔" اُس نے جواب دیا۔ "مگر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ... کہ... میں نے کوئی بھوت دیکھا۔"

میرا دل چاہا کہ شام کے تمام واقعات اُس سے بیان کر دوں اور جو کچھ میں نے مالی سے سُنا ہے وہ بھی کہدوں مگر نہ معلوم کیوں میری زبان بند ہو گئی۔ پھر بھی میں نے اپنی ماں سے کہا کہ اُس کو وہم ہوا ہو گا، بھوت دن دہاڑے کبھی نہیں دکھائی دیتے۔ رات ہوتے ہوتے اُسے بُخار چڑھ آیا۔ اور وہ بُخار میں بکنے لگی۔ اُس کی باتیں ٹوٹی پھوٹی تھیں، مگر بالکل ہذیان نہ تھیں۔ بُخار ہونے کے باوجود اُس کے ہاتھ پیر بالکل ٹھنڈے تھے اور نبض بہت تیز چل رہی تھی۔ میں برابر اُس کے پاس بیٹھا رہا۔ آدھی رات کے قریب وہ ایکا ایکی اُٹھ بیٹھی اور مجھ سے جلدی جلدی [illegible] کرنے لگی۔

"سُنو بیٹے" اُس نے مجھ سے کہنا شروع کیا۔ "اب تم بچے نہیں ہو اس لئے تمہیں سب بات معلوم ہو جانی چاہیئے۔ میری ایک سہیلی تھی بہت نیک اور خوبصورت۔ اُس نے اپنے پسند کے آدمی سے شادی کی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش تھی۔ شادی کے بعد وہ کچھ دن کے لئے سیر کرنے ایک بڑے شہر میں گئے۔ وہاں وہ ایک ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ ہر جگہ سوسائٹی میں ملنے جلنے جاتے تھے۔ میری سہیلی غیر معمولی طور پر حسین تھی۔ اور ہوٹل کے تمام نوجوان اُس پر لٹو تھے۔ لیکن ایک فوجی افسر خاص طور پر تھا۔ اس کی سیاہ شریر آنکھیں ہر وقت اُس کو گھورتی رہتی تھیں اور وہ ہر وقت ہر جگہ اس کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ سیر و تفریح کا تمام لُطف اس عجیب و غریب ہستی کی وجہ سے برباد ہوتا تھا۔ وہ اس سے ملتا نہ تھا نہ کبھی بات ہوتی تھی اور نہ کسی نے ان دونوں کا تعارف کرایا مگر وہ اس کو ہر وقت گھورتا اور ہر جگہ اس کا پیچھا کرتا۔ ایک رات اُس کا شوہر کلب گیا ہوا تھا اور کمرے میں اکیلی تھی۔ کونے میں ایک مدھم سا لیمپ جل رہا تھا اور کمرے میں چاروں طرف ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے ملازمہ کو چھٹی دیدی اور دروازے وغیرہ احتیاط سے بند کر کے سونے کے لئے لیٹی۔ یکایک اُس کی طبیعت گھبرانے لگی۔ اور وہ خوف محسوس کرنے لگی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُس نے دیوار تلے کچھ کھڑکھڑاہٹ کی سی آواز سُنی۔ جیسے کوئی بلی یا کتا اپنے پنجوں سے دیوار کو کھرچ رہا ہو۔ وہ دیوار کی طرف تکنے لگی۔ اس میں سے ایک آدمی نمودار ہوا۔ وہ سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں والا آدمی! میری سہیلی نے چیخنا چاہا مگر خوف کے مارے اُس کی گھگی بندھ گئی اور آواز گلے ہی میں ختم ہو گئی۔ وہ آدمی جنگلی درندے کی طرح اُس کی طرف بڑھا، ایک سفید چادر سی اُس کے مُنہ پر ڈالدی۔ پھر کیا ہوا؟۔ مجھے یاد نہیں! مجھے بالکل یاد نہیں! جب وہ خوفناک موت کی سی تاریکی ختم ہوئی۔ جب مجھے —— میری سہیلی کے —— حواس دُرست ہوئے تو کمرے میں کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر وہ ساکت رہی پھر ایکدم سے چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی جب اُسے ہوش آیا تو اسکا شوہر بیحد پریشان اُس کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے اُس سے پوچھا کہ کیا ہوا مگر وہ چُپ رہی۔ کیا کہتی؟۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ جب وہ اکیلی رہ گئی تو اُس نے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ ایک کونے میں ریشمی پردوں کے پیچھے ایک چور دروازہ تھا! اُس کی شادی کی انگوٹھی بھی ہاتھ میں سے غائب تھی۔ یہ انگوٹھی بہت پُرانی خاندانی تھی۔ اور اس پر سات سُنہری اور سات روپہلی ستارے آڑے بنے ہوئے تھے۔ اس کے شوہر نے ہر جگہ انگوٹھی کو خوب تلاش کیا مگر وہ نہ ملی۔ خیال ہوا کہ کہیں گر گرا گئی ہو گی۔ اِن دونوں نے وہاں سے جلد از جلد چلنے کی تیاری کی اور جس دن ڈاکٹر نے گھر واپس جانے کی اجازت دی وہ چل دئے۔ مگر اتفاق دیکھئے کہ جب وہ دونوں گھر واپس جانے کیلئے سڑک پر سے گذر رہے تھے تو اُنہوں نے ایک لاش دیکھی جس کی موت سر پھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ اور یہ وہی شخص تھا۔ وہی سیاہ شریر آنکھوں والا شخص! معلوم ہوا کہ جُوا کھیلنے میں کہیں لڑائی ہو گئی اور اس ہی سلسلہ میں اس کی موت واقع ہوئی۔ میری سہیلی اپنے گھر واپس آ گئی اور اُس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ کئی برس تک اپنے شوہر کے ساتھ رہی مگر اِس واقعہ کے متعلق کبھی کچھ نہ کہا۔ اور کہتی بھی کیا؟ اس کو خود کچھ نہ معلوم تھا۔ اُن کے یہاں اور کوئی بچہ نہ ہوا سوائے اُس لڑکے کے۔"

میری ماں نے یہاں تک کہا تھا کہ اُس کا بدن کانپنے لگا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مگر یہ بتاؤ" اُس نے پھر چیخ کر کہا۔ "کہ اس میں اُس غریب لڑکی کا کیا قصور تھا؟ کیا کسی طرح وہ ملزم ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ اُس نے سخت مصیبت بھگتی مگر خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ سکتی ہے کہ بالکل بےقصور بھگتی۔ پھر ماضی کی پریشان تصویریں اب پھر سامنے آ کر کیوں اُسکی زندگی تلخ کئے دیتی ہیں"

اس کے بعد وہ زور زور سے ہذیان بکنے لگی۔ اس کا بخار اور بڑھ چلا تھا۔ میں نے اُسے زبردستی لِٹا دیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

۴

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ میرے اُوپر میری ماں کے اِس بیان نے کیا اثر کیا ہوگا۔ کیونکہ مَیں شروع ہی سے سمجھ چکا تھا کہ یہ قصّہ اُس کی ہی آپ بیتی ہے۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میرا خواب والا باپ، قہوہ خانہ والا بیرن، اور میری ماں کے بیان والا فوجی افسر ایک ہی انسان ہے۔ وہ پھر میری ماں کے پاس آیا ہوگا مگر اُس کا ڈر دیکھکر بھاگ گیا۔ تمام معاملہ روز روشن کی طرح مجھ پر صاف ہوگیا۔ صبح ہوکر میری ماں کو ہوش آیا۔ بخار اُتر گیا اور طبیعت بھی ہلکی تھی۔ اُس نے کچھ معمولی بات چیت کی۔ اور پھر سوگئی۔ اُس کو اپنے مکاندار کی بیوی کے سپُرد کرکے مَیں روانہ ہوا۔ سب سے پہلے قہوہ خانے گیا۔ وہاں ایک ایک شخص سے پوچھنے کے باوجود بھی کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور کہاں رہتا ہے۔ اور چونکہ نام بھی اچھی طرح سے معلوم نہ تھا اس لئے پولیس میں بھی اطلاع نہیں دے سکتا تھا۔ کھانے کے وقت تک مَیں اِدھر اُدھر اس فراق میں مارا پھرا۔ اور ناکام پریشان گھر واپس لوٹا۔ میری ماں بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر اُس پر ایک عجیب پریشانی طاری تھی جس کو دیکھکر میرے دل پر چھریاں سی چلتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے نادانستہ گناہ کے اقرار پر شرمندہ ہے۔ موسم بہت خراب تھا اور باہر طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تیز اور وحشت ناک ہوا چل رہی تھی۔ رات بھر پلنگ پر کروٹیں بدلنے کے بعد صبح کے قریب میری آنکھ لگی تھی کہ ایکدم سے مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے تحکمانہ لہجہ میں میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میری آنکھ ایکدم کھُل گئی۔ میں نے تکیہ پر سے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ لیکن بجائے ڈر لگنے کے مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری راہ مجھے مل گئی ہے۔ میں کُود کر بستر پر سے اُٹھا اور جلدی جلدی کپڑے پہن کر نکل کھڑا ہوا۔ اب طوفان ختم ہو چکا تھا مگر اُس کے نشانات باقی تھے۔ درختوں کی ٹوٹی ہوئی ڈالیاں، چمنیوں کے ٹکڑے، گھروں کے اکھڑے ہوئے سائن بورڈ گیلی زمین پر جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ مَیں اندھا دُھند جدھر میرے پاؤں لئے جا رہے تھے چلا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی غیر انسانی طاقت میری رہبری کر رہی ہے۔ یکایک ایک موڑ پر میں ٹھٹک سا گیا۔ میرے آگے وہ حبشی جا رہا تھا جو اُس دن بیرن کو قہوہ خانہ سے بلا کر لے گیا تھا۔ میں نے تیزی سے اُس کا پیچھا کرنا شروع کیا۔ وہ جلدی سے ایک لمبی تاریک گلی میں گھُس گیا۔ میں بھی اُس کے پیچھے گھُسا۔ مجھے خیال ہوا کہ ایسے اُونچے اُونچے دو طرفہ چوٹی دار مکانات میں نے کہیں دیکھے تھے اور یہ کہ میں اِس گلی کے چپّے چپّے سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ایکدم مجھے یاد آگیا۔ یہی وہ گلی ہے جس میں مَیں خواب میں چکّر لگایا کرتا تھا۔ بغیر ہچکچائے ہوئے مَیں ایک گھر میں داخل ہوگیا — یہی وہ گھر تھا۔ اُس کی لمبی لمبی شہتیریں، بڑا سا صحن، گول گول کھڑکیاں میرے دماغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ ایک دفعہ۔ دو دفعہ۔ تین دفعہ۔ چوتھی دفعہ بہت زور سے۔ دروازہ کھُلا اور اندر سے ایک ملازمہ نکلی۔

"کیا بیرن یہاں رہتے ہیں؟" میں نے اُس سے سوال کیا۔

"وہ یہاں نہیں ہیں۔ امریکہ چلے گئے کل" اُس نے کہا۔

"امریکہ!" میں نے تعجب سے کہا "مگر واپس تو آئیں گے نا؟"

"مجھے نہیں معلوم، بہت ممکن ہے کبھی واپس نہ آئیں"

"مگر وہ تو یہاں مدّت سے رہتے تھے" میں نے کہا۔

"نہیں تو، صرف ایک ہفتہ ہوا آئے تھے" اُس نے جواب دیا۔

اتنے میں مکان سے ایک اور شخص نکلا اور پوچھنے لگا "کیوں کیوں۔ کیا بات ہے!"

"یہاں کون رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے آقا" اُس نے جواب دیا۔

"کیا مَیں تمہارے آقا سے مل سکتا ہوں" میں نے سوال کیا۔

"ہاں کیوں نہیں مگر ذرا ٹھہر کر آئیے۔ دیکھئے کتنا سویرا ہے ابھی پو بھی نہیں پھٹی"

"اور وہ حبشی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیسا حبشی" اُس نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "مہربانی کرکے آپ اس وقت جائیں، جب ہمارے آقا سے ملنے کا وقت ہوگا تو آئیے گا" کہکر اُس نے دروازہ بند کرلیا۔

مَیں جس قدر خوش خوش آیا تھا اُس سے کہیں زیادہ مایوس واپس ہوا۔ گھر جانے کے خیال سے وحشت ہوتی تھی اِس لئے سیدھا سمندر کے کنارے کی طرف چلا۔ مَیں سر جھکائے اپنی دُھن میں چلا جا رہا تھا کہ سمندر کی خوفناک گرج نے مجھے متوجہ کرلیا اور مجھے معلوم ہوا کہ مَیں سمندر کے بہت قریب آگیا ہوں۔ پھر بھی میں بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ پانی میرے پاؤں سے چھونے لگا۔ کنارے کی بالو سب دلدل میں تبدیل ہو چکی تھی۔ بہت سی بھیگی ہوئی سیپیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں اور بڑے بڑے سمندری گدھوں کا چیختے ہوئے اِدھر اُدھر اُڑنا فضا میں ایک وحشت ناک اثر پیدا کر رہا تھا۔ کوئی سو قدم کے فاصلہ پر ایک چٹان پر

چھوٹی چھوٹی گنی جھاڑیاں کچھ بکھری بکھری سی ایک جگہ تھیں۔ اور انکے چاروں طرف موٹی موٹی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ جھاڑیوں اور گھاس کے بیچ میں کوئی لمبی سی سیاہ چیز اُس طرف پڑی تھی۔ گدھ بار بار اس طرف جاتے تھے اور پھر چیخیں مار مار کر اُڑ جاتے تھے۔ میں دو ایک منٹ تو کھڑا غور کرتا رہا پھر اُس چٹان کی طرف بڑھا۔ جیسے جیسے میں بڑھتا جاتا تھا وہ شے اور زیادہ واضح ہوتی جاتی تھی۔ کوئی دس قدم پر جاکر میں ٹھٹک گیا۔ یہ ایک انسانی لاش تھی! جسے سمندر کی موجوں نے کنارے پر پھینک دیا۔ میں بڑھتا گیا۔ قدرت نے میرے لئے ایک سخت آزمائش مقرر کر رکھی تھی۔ کیونکہ لاش کے پاس پہونچکر مجھے اپنی زندگی کا سب سے وحشتناک نظارہ دیکھنا پڑا۔ یہ لاش ہیرن کی تھی! وہ زمین پر چت پڑا تھا۔ بایاں ہاتھ سینے پر رکھا تھا، کچھ کچھ کھلے ہوئے لبوں کے اندر سے اس کے چھوٹے چھوٹے دانت برابر بیٹھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھوں کی پتلیاں نیم وا آنکھوں میں سے اتنی سفید دکھائی دیتی تھیں کہ اُن میں اور سفیدی میں مشکل سے امتیاز ہو سکتا تھا۔ اُلجھے ہوئے گھنگھر والے بالوں میں سمندر کے حباب اب تک نظر آتے تھے، نیلی رنگ کی ملاحی صدری، گلے میں بندھے ہوئے سُرخ رومال اور تمام جسم پر سمندری نمک، کہیں خشک اور کہیں تر لگا ہوا تھا۔ رات کا طوفان اپنا کام کر چکا تھا اور وہ شخص جس نے میری ماں کی ذلّت کی تھی، جس نے اُس کی صحت کو برباد اور اس کی زندگی کو محزون بنا دیا تھا ——

جو میرا باپ تھا —— قدرت کے زبردست ستم ظریف ہاتھوں کی بدولت امریکہ پہونچنے کے بجائے میرے قدموں کے پاس مرا ہوا پڑا تھا! میں نے دو ایک بار جُھک جُھک کر اُسے غور سے دیکھا۔ اِس اُمید میں کہ شاید وہ ساکت لب ہلیں، شاید اُن منجمد پتلیوں میں حرکت پیدا ہو۔ مگر نہیں وہاں خاموشی تھی۔ خوفناک اور وحشتناک خاموشی! گِدھ اُڑ چکے تھے، سمندر بھی کچھ کچھ ساکت ہو چلا تھا۔ ہوا کے تھمنے سے جھاڑیوں کی سرسراہٹ میں بھی کمی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس وقت دُنیا میں صرف میں ہوں یا وہ بے حس و حرکت جسم۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کسی کو بلا لاؤں اور اس لاش کو اُٹھوا کر لے چلوں۔ اِس بدنصیب انسان کو گدھوں اور مچھلیوں کا شکار ہونے کے لئے یہاں نہ چھوڑوں۔ مگر میرے اُوپر خوف طاری ہونے لگا اور میں وہاں سے تیزی سے چلا۔ کوئی دس قدم جاکر میں رُک گیا اور پھر مُڑ کر دیکھنے لگا۔ میری نگاہ ہیرن کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں ایک چمکتی ہوئی چیز پر پڑی۔ یہ ایک سونے کا چھلّا تھا۔ میں جلدی سے پھر لاش کے پاس پہونچا اور میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ میری ماں کی شادی کی انگوٹھی تھی!! مجھے تمام زندگی یاد رہیگا کہ کس طرح میں نے وہ انگوٹھی اُن بھیچے ہوئے سرد اور سخت اُنگلیوں سے نکالی۔ انگوٹھی ہاتھ میں آتے ہی میں زور سے بھاگا اور سیدھا گھر پہونچا —— میری پریشانی شاید میرے بُشرے میں ظاہر ہو رہی ہوگی۔ کیونکہ جب میں اپنی ماں کے پاس پہونچا تو اُس نے عجیب استفسار کی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر میری زبان لڑکھڑا گئی۔ اور بغیر کسی تمہید کے میں نے وہ انگوٹھی اُس کے ہاتھ میں دیدی۔ اُس کا رنگ ایک دم سے اُڑ گیا، زور کی ایک چیخ ماری، انگوٹھی کو مضبوطی سے مٹھی میں دبالیا اور چکرا کر گرنے لگی۔ میں نے اُس کو اپنے بازوؤں میں لیکر سہارا دیا۔ اور وہیں کھڑے کھڑے شروع سے لیکر آخر تک تمام حال سُنا دیا۔ اپنے خواب، پھر قہوہ خانہ میں ہیرن سے ملاقات اور اُس کے بعد کے تمام حالات۔ وہ آنکھیں پھاڑے ہوئے سنتی رہی۔ کبھی کبھی وہ ذرا سا کانپ جاتی تھی۔ پھر گہری سانس لے کر سُننے لگتی تھی۔ سب حال سننے کے بعد اُس نے انگوٹھی اپنی چوتھی اُنگلی میں پہن لی، ہاتھ میں چھتری اُٹھائی اور دروازے کا رُخ کیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟

"وہیں جہاں وہ پڑا ہے" اُس نے جواب دیا۔ "میں دیکھنا چاہتی ہوں ... میں جاننا چاہتی ہوں ... میں پہچان جاؤنگی"

میں نے اُسے جانے سے بہت باز رکھنا چاہا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہے، اس لئے میں اسکو سہارا دیکر لے چلا۔ آخرکار ہم لوگ سمندر کے کنارے پہونچے۔ اُن ہی جھاڑیوں، گھاس اور سیپوں میں سے گذرتے ہوئے اُس چٹان پر پہونچے۔ مگر وہ لاش وہاں کہاں تھی؟ البتہ جہاں وہ لاش پڑی رہی تھی وہاں ہاتھ پاؤں کے نشانات ضرور تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھاری جسم یہاں پڑا رہا ہوگا۔ مگر لاش غائب تھی! جھاڑیوں کے بیچ میں گیلی زمین پر پاؤں کے نشانات تھے جو چٹان سے نیچے جاتے جاتے ختم ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور اُس نے میری طرف۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے پیروں سے چل کر وہاں سے چلا گیا ہو؟

"مگر تم کو یقین ہے کہ تم نے اس کو یہاں مرا ہوا پڑا دیکھا" میری ماں نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے جواب میں صرف سر ہلا دیا۔ میری عقل حیران تھی۔ ابھی تین گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ میں نے اس کو مُردہ دیکھا تھا۔ اُس کے ٹھنڈے جسم کو محسوس کیا تھا،

اس کی سخت اُنگلیوں کی گرفت سے اپنی ماں کی انگوٹھی نکالی تھی۔ اور ابھی لاش وہاں سے غائب تھی !!۔ مجھے معلوم کرنا چاہیئے کہ یہ حرکت کس کی تھی، کس نے اُس لاش کو وہاں سے کھسکایا۔ مگر سب سے پہلے مجھے اپنی ماں کی خبر لینی تھی۔ بمشکل تمام میں اُس کو اپنے گھر واپس لایا۔ حواس آجانے کے بعد اس کی سب سے پہلی خواہش یہی تھی کہ میں "اس" کا پتہ چلاؤں۔ میں اس کی مرضی کے مطابق اطراف کے تمام جگہوں میں خود گھوما، اخباروں میں اشتہارات دیئے، معقول رقم انعام پیش کرنے کا اعلان کیا مگر کسی طرح کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

شروع شروع میں سب کا خیال تھا کہ جو جہاز امریکہ کیلئے اُس دن چلا تھا وہ طوفان کی وجہ سے تباہ ہوگیا اور اُس کے تمام مُسافر مرکھپ گئے، مگر بعد میں اُڑتی اُڑتی خبر سُنی گئی کہ وہ جہاز نیویارک کی بندرگاہ پر دیکھا گیا۔

ہر طرف سے مایوس ہوکر میں نے ایک اشتہار اُس حبشی کے نام نکالا اور معقول رقم انعام دینے کا وعدہ کیا۔ نوکروں کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میری غیر حاضری میں ایک لمبا سا حبشی سیاہ کپڑے پہنے ہوئے میرے گھر آیا تھا مگر مجھ سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ اس طرح میرے باپ کا نام ونشان ہمیشہ کے لئے تاریکی میں رہ گیا۔ مجھے اپنا وہ 'خواب'، پھر کبھی نہیں دکھائی دیا، نہ پھر کبھی میں نے خواب میں اپنے باپ کی "تلاش" کی۔

+ + +

رضیہ سجاد ظہیر

غزل

فرق جب لذّتِ احساس میں پایا نہ گیا　　درد دیکھا نہ گیا تم کو دکھایا نہ گیا

چُٹکیاں کون یہ رہ رہ کے لئے جاتا ہے　　میرے دل میں تو مری جاں کوئی آیا نہ گیا

لُطف یوں رنجشِ بے جا کے لئے پہروں تک　　بے سبب روٹھنے والے کو منایا نہ گیا

خوابِ پُر کیف کا منظر بھی نشاط آور تھا　　دوست کو اس لئے کچھ دیر جگایا نہ گیا

منع کرتی رہی جو خندہ جبینی اس کی　　دردِ دل اپنا کبھی اُس کو سُنایا نہ گیا

خود ہنساؤ یہ جوانی کی کرم بخشی ہے　　خُسروِ حُسن کو مجھ سے تو ہنسایا نہ گیا

دے تو دی ضبطِ محبّت کی قسم ظالم نے　　فائدہ ضبطِ محبت کا بتایا نہ گیا

کب دکھاتا ہے وہ بربادیِ حسرت کا سماں　　خاک میں جب مری حسرت کو ملایا نہ گیا

روشنی جس کی دکھاتی تھی مجھے بھول بھلیاں　　اُس قمروش کا وہ انداز بھلایا نہ گیا

طُور کی پوری طرح یاد دلائی نہ گئی　　ہوش چھینے تو گئے ہوش میں لایا نہ گیا ✓

میں ہوں سرشارِ مئے عشق علی منظور! اب
کیا درِ پیرِ مغاں تم کو دکھایا نہ گیا؟

علی منظور

قطعات

التہابِ عشق

لہو کھیلتا ہے تمنّا سے پھاگ
جنوں گا رہا ہے تباہی کے راگ
جوانی ہے شعلوں میں لپٹی ہوئی
لگی ہے محبت کے جنگل میں آگ

محبت

ربابِ جوانی کی لرزش تھی وہ
سحابِ فراغت کی بارش تھی وہ
جسے میں محبت سمجھتا رہا
شباب اور فرصت کی سازش تھی وہ

لمحاتِ مسرت

ہوائیں خنک، چاندنی پُرسکوں
وفورِ مسرت سے سرشار ہوں
یہ خواہش ہے اس وقت دل میں کہ میں
گزرتے ہوئے وقت کو روک لوں

شاعرِ حیات

صدا ہوں شکستِ تمنّا کی میں
نشاطِ محبت کی آواز ہوں
مری شاعری ہے سرودِ حیات
میں فطرت کے ہاتھوں میں اک ساز ہوں

اختر انصاری

یہ جھوٹ ہے

اگر ہم خود اس وقت جھوٹ نہ بول رہے ہوں، تو کہہ سکتے ہیں کہ پُرانے سے پُرانے دقیانوسی جھوٹ بولنے والے بھی، قصور معاف، ٹھیک ٹھیک نہ بتا سکے کہ جھوٹ کی ابتدا کیونکر ہوئی، پہلا جھوٹ کب بولا گیا، اور بولنے والا کون ذات شریف تھا؟۔

زیادہ سے زیادہ مواد جو اِس فنِ لطیف کے متعلق ماہرین کے سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے، اتنا ہی ہے کہ جھوٹ پہلے بولا گیا، پھر فن کے نمادموں نے اس کو محفوظ اور زندہ رکھنے کے لئے اتنی ترقی اور کی کہ جھوٹ لکھا بھی گیا، اور بس، گویا اسی ادھوری معلومات اور سرسری تحقیقات پر جھوٹ کی ترکی تمام، آ۔گے آیت، والسلام۔ عبرت کا مقام ہے کہ طوطن خامن کے مقبرے اُدھڑے، گڑے مُردے اُکھڑے، بال کی کھال نکلی، بلکہ کھال کے بال تک کھچ گئے، اور ہم سوتے بھاگوں، اس کل جگ میں بھی، کہ زمانہ سازگار، گردوپیش ہموار ہے، اُسی نقطے پر گھوم رہے ہیں جہاں سے چلے تھے، اور جھوٹ سے عالم پسند انسٹی ٹیوشن کے بارے میں محض اتنی ہی منطقی دریافت کرسکے ہیں جتنی یادش بخیر حاجی بغلول نے اونٹ کی پیٹھ کے متعلق کی تھی، یعنی، کچھ پیٹھ جو اونچی اونٹ کی، اونٹ کی اونچائی سے نہیں، ہئی پیٹھ اونچی اونٹ کی، اس افلاس اور نکمے پن کی بدولت جو نہ ہونا تھا ہوا، یعنی جھوٹ کے پُرانے حریف "سچ" نے موقع سے فائدہ اُٹھاکر، ڈنکے کی چوٹ، اوّلیت کا تاج اپنے سر پہ اوندھالیا، پھر، جیساکہ اُس کی جنم گھٹی میں پڑا ہے کہ میٹھا میٹھا ہپ، کڑوا کڑوا تھو، جھوٹ کو بھی شیطان کے سر تھوپ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑے، اور ڈھول بجا بجاکے یہ پروپگنڈا شروع کیاکہ ماں جھوٹ نقفتے میں کیا دم درود تھا، یہ تو یاروں کی ضد پر ٹلوا یا گیا ہے، اور بہر دیا ہے"، یہی نہیں جھوٹ کو بدنام کرنے اور اُس کی ہردلعزیزی کو صدمہ پہونچانے کے لئے، رقابت کی دُھن میں، سچ کے مُنہ بعض ایسے واقعات بھی سُننے میں آئے جن کی ہم جھوٹوں کو جھوٹوں بھی خبر نہیں، مثلاً طعنہ دیکر کہا گیا کہ جھوٹ خود اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا، بلکہ نقالی اور سچ کے پورے پورے چربے اُتارنے کا نام ہی جھوٹ ہے، اس دعوے کا ثبوت یوں دیا گیا کہ، فرض کیجئے ہماری جیب میں روپیہ نہ تھا، آپ نے مانگا، اور ہم نے کہا "نہیں ہے"، یہ ہوا "سچ"، اور جیب میں روپیہ نہ تھا، آپ نے مانگا، اور ہم نے اُن ہی سادہ تیوروں سے، پیشانی پر جھول ڈالے بغیر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے، جیب ٹٹولتے ہوئے کہا: "نہیں ہے"، اس کا نام ہے "جھوٹ"۔ اس موقع پر افسوس کے ساتھ ہمیں اپنی نااہلی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کافی مہارت ہونے پر بھی جھوٹ بولتے بولتے اکثر سچ کا متشابہ لگ جاتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ مسلسل کوشش کے باوجود ابھی تک ٹکسالی جھوٹ بولنے کی ڈگری نہیں ملی ہے، بڑی سعی سفارش اور جوڑ توڑ ملانے پر، جھوٹوں کی ہر "قومی کانفرنس" نے سادہ سادہ جھوٹ بولنے کا لائسنس دیا ہے، التماسِ دعا ہے کہ یہ بھی کسی صورت نبھ جائے، اور کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں جو ابکے ہمارے صدر مقام، ولایت میں منعقد ہونے والا ہے دیسی جھوٹ کی نمائندگی کرتے ہوئے ہم سُرخ رو ہوں، آرزو تو یہ بھی کہ اپنے جیتے جی دشمن ہی کے فراہم کئے ہوئے مواد سے جھوٹ کے متعلق اتنی تحقیقات ضرور چھوڑ جائیں کہ آنے والی نسلوں کے لئے سند ہو اور عندالضرورت کام آئے، مگر ع:۔

بہت ارمان ایسے ہیں کہ جی کے جی ہی میں رہتے ہیں

معلومات کے یہ انمول موتی، روم سے شام تک اتنے بکھرے ہوئے ہیں کہ اُن کی لڑیاں پرونے کے لئے، انسان کی تو کیا ہستی ہے شیطان کی عمر بھی پوری نہ کرے، ایک جھوٹ بولنے ہی کی پُرانی قسمیں اتنی ہیں کہ آخری سانس تک بولتے رہیئے پھر بھی آمدنی میں گولر کا پھول، برکت ہی برکت نظر آتے، جمع کی مد، بھری کی بھری رہے، ان پر چودھویں صدی کے محققوں نے جو کارآمد اور قیمتی اضافے کئے ہیں وہ گویا مدِ محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض کی افادی نوعیت اور مقبولِ عام حیثیت خاص طور پر تسلیم کی گئی ہے، جیسے شرعی جھوٹ، جسے بولنے میں ثواب بھی ہے اور سہولت بھی، ہمیشہ "انشاءاللہ" سے شروع ہوتا ہے، اور آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی لچک سے "سچ" کی جھلک دیتا ہوا "ضرور ضرور" یا "بسروچشم" پر ختم کیا جاتا ہے، البتہ یہ فیصلہ بولنے والے کے اختیارِ تمیزی پر ہے کہ موقع محل کے اعتبار سے بولنے کا رنگ ورتیکھا کرنے کے لئے "آپ کے سر کی قسم، واللہ باللہ" کی پٹ بھی اس میں دیتا جائے،

اسی جھوٹ کی ایک قسم وہ بھی ہے جو نکاح کے وقت کام آتی ہے، نوشہ میاں کسی "سرکار" کے خدمتگار رہی ہوتے ہیں۔ اور تیس دن، صبح شام چلمیں بھرنے کے بعد اگر خوش قسمتی سے نادر شاہی آقا کے جرمانوں سے صحیح سلامت بچ گئے تو اصل خیر سے مہینے پیچھے چھ روپلی کا مُنہ دیکھتے ہیں، مگر قاضی صاحب قبلہ کے آگے سر نیوڑھائے، سہرے مقنع کی آڑ میں، دبی زبان سے، چبا چبا کے، لجا لجا کے، جب کہتے ہیں کہ "مسماۃ فلاں بنت فلاں کو بہ عوض مبلغ پانچہزار سکۂ شاہی، ایک اشرفی رائج الوقت دین مہر کے قبول کیا میں نے" اور سسرالیوں پر جو، خطا معاف، اکثر اسی کشتی کے سوار، اور نیک نیتی کے سینر عہدہ دار ہوتے ہیں، اپنی ساکھ کی دھاک بٹھانے کیلئے، شین قاف کے صحیح مخرج اور زیر و زبر کی پوری پابندی کے ساتھ اس قول کی تکرار بھی فرماتے ہیں، تو اِس وثوق سے فرماتے ہیں کہ روپے کا ذکر تو "چوں مد بحساب اندر ہے" خطبہ ختم، رقم بے باق۔ اور دلہن بطور رسید وصول، اس معاملے میں توبہ توبہ بدگمانی سے بچنے کے لئے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ دولھا دُلہن کی یہ جوڑی اگر محض ہوا پر جینے کا تہیۂ کرلے، اور سنت پیغمبری کے ساتھ ساتھ بیاہی زندگی کے دوسرے واجبات میاں کے گلے نہ پڑیں تو معمولی ضرب تقسیم کا سوال ہے کہ چھ روپے ماہواری قسط سے پانچہزار کی خفیف سی رقم صرف اُنہتر سال پانچ مہینے اور دس دن کی قلیل مدّت میں ادا ہوجائے گی، رہی ایک اشرفی سو اُسے حسنِ کلام سمجھنے میں کوئی امر مانع نہیں۔

لکھے ہوئے جھوٹ کی ایک معمولی مثال وہ سارے دیوان، مثنویاں، واسوخت اور کلیات ہیں جو اس مٹی پانی کی دُنیا میں اگر وجود پاجائیں تو آپ ایک عجیب ہڑبونگ دیکھیں، عاشقوں کی بھرمار سے اِدھر دوافروش اور بزازوں کی دُکانوں پر اُلو بولنے لگے، اُدھر دُنیا بھر کے اسپتالوں اور گورستانوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملے، حسنِ "رہ گزرے یا "پسِ دیوارے" تعزیرات کی کسی نہ کسی دفعہ کے تحت جیل خانوں پر ہو، یا حبس دوام بہ عبور دریا رشور، ورنہ پھانسی گھر تو یقینی۔ اور ازالہ حیثیت کے مدعی، رقیب اور آسمان، وکیلوں کی درباری یا عدالت کے کٹہرے میں۔

اس جھوٹ کا نمونہ ملازمت کے کارناموں اور بیمہ کمپنیوں کے اقرار ناموں میں عمر کا خانہ ہے، جو سوچ سمجھ کے اس حساب سے بھرا جاتا ہے کہ آگے چل کر یا تو پنشن دیر سے ملتی ہے، یا پالسی کی رقم جلد ہات لگتی ہے۔

یہ عام جھوٹ کی مجمل تشریح تھی، اب جھوٹ کے دو ایک نادر نمونے پیش کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے، اگر پسند خاطر ہوں، آپ بے بڑھ کر نہیں، شوق سے کام میں لائیں، اتنا ہے کہ فن کے اس خادم ہیچمداں کو جس نے محض رفاہ عام کی خاطر ذات خاص کے لئے ان کا پیٹنٹ کرانا گوارا نہیں کیا دعاؤں میں یاد فرمائیں ؎

سُرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

عجیب بات ہے اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بولنے اور لکھنے کے علاوہ جھوٹ لگایا بھی جاتا ہے، اور اُن عمر دراز شوقین بزرگواروں کے کام آتا ہے جو نکاحوں کے عادی اور بیویوں کی اکھاڑ پچھاڑ کرتے کرتے پیشہ ور شوہر سے ہوجاتے ہیں۔ اس جھوٹ کی محرک یا تو وہ مشاطہ ہوتی ہے جو ہر پیغام کے وقت جناب ممدوح کے اوصافِ حمیدہ کی فہرست ہوئے سن و سال کو "برس پینتیس یا چھتیس کی لپیٹ" سے جس میں نزلہ بھی شامل ہوتا ہے نکلنے نہیں دیتی، یا خود اُن کا وہ مغالطۂ نفس جو چشم بد دُور پچپنویں سالگرہ کے بعد بھی کلوں پر ہر دوسرے تیسرے چیونٹی کے انڈے دیکھ کر سرکشی کرتا ہے، یا ہفتے وار مُنہ پر سفید چنور کا ہلنا برداشت نہیں کرسکتا، اس جھوٹ کا بازاری نام خضاب ہے، اور اس لحاظ سے نہایت لاجواب ہے کہ بڈھوں کو بہلا لو، بچوں کو ڈرا لو، اور بیوی کو پھسلا لو۔

اس سے عجیب تر جھوٹ وہ ہے جو دانتوں کی شکل میں لگایا جاتا ہے، کڑاکے کے جاڑے ہوں، پوپلے مُنہ میں چوکا جڑا ہو، بڑے میاں کہیں گے اور حلفاً آپ بیتی ہی کہیں گے کہ "میاں پانی دانتوں میں لگتا ہے، سردی کے مارے دانت سے دانت بج رہے ہیں" مگر جھوٹ کی یہ شکل جب عینک کی صورت میں لگائی جاتی ہے تو اکثر مخدوش ہوجاتی ہے، اور لگانے والے پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ ——
مایا تیرے تین نام، پرسا، پرسی، پرسرام —— مطلب یہ کہ لگائی نہ تھی برابر کا دیکھتے تھے، لگائی، ڈیوڑھا دُگنا دیکھنے لگے، جاتی رہی، اندھے ہوگئے۔

جھوٹ بول چکے، لکھ چکے، لگا چکے، اب لگے ہاتوں پہن بھی لیجئے، بٹیر سا چپکا ہوا سینہ، ڈھلے اُترے ہوئے شانے، ہنسلی کی ہڈیاں جیسے بندھیاچل کا پہاڑی سلسلہ، پتلی قرقرے کی سی گردن، گئے، اور جوڑا بدل کر برآمد ہوئے تو لے سبحان اللہ! یہ تو آواگون کا مسئلہ ہی طے ہوگیا، راست قد، چوڑا، اُبھرا اتنا ہوا چھاتا۔ سطح ایسا کہ فنگر بلیرڈ مزے

سے کھیل لیجئے، دونوں مونڈھے ایسے چورس کہ آپ کہیں رندہ کرکے بنائے گئے ہیں، گردن سیدھی، جس پہ سر ایسے گھومے جیسے لوہے کی سیخ پہ مرغ بادنما، یہ سب ملاکے ایسا چوکور کہ اقلیدس کے مربع کی تعریف جھوٹی پڑ جائے۔ اب اسے کوٹ شروانی، یا درزی کی کارستانی کہہ لیجئے ورنہ ہے دراصل یہ پہنا ہوا جھوٹ، اور اب اس کثرت سے پہنا جاتا ہے کہ کسرت حرام، ڈنڈ مگدر جرم، اور اکھاڑے مقفل۔

اور تو اور، جھوٹ رویا بھی جاتا ہے، اس کا مظاہرہ اکثر اس کنجوس باپ کی وفات حسرت آیات پر ہوتا ہے، جس نے اشرفی تولے کی اولاد کو، جیتے جی، کوڑی کوڑی کو ترسایا ہو، اور خود کوڑی کوڑی کو ہاتھ سے نہیں، دانت سے اٹھایا ہو، یہ جھوٹ حساب سے رویا جاتا ہے۔ یعنی ترکہ اگر بے منت غیر، مال موذی نصیب غازی ہونے والا ہے، تو آنسو موٹے موٹے لڑی بن کر گرتے ہیں، اور کم سے کم پھولوں تک مسلسل گرائے جاتے ہیں، اور مد محفوظ میں یہ گنجائش بھی احتیاطاً رکھی جاتی ہے کہ اس تقریب کے سلسلہ میں ہر نووارد کی آمد پر یہ جھوٹے موتی آنکھ بھر بھر کے نچھاور کئے جاسکیں۔ "حصہ رسدی" یا "واجبی ہی واجبی" ملنے کی صورت میں آب رسانی کی مشین البتہ کوتاہی سے کام کرنے لگتی ہے اور جھوٹ صرف پیچ کر ہی رہ جاتا ہے، رونے والے کا عالم یہ ہوتا ہے کہ حلق میں ہچکی، آنکھ میں لالی، لب پر آہیں، دل میں تجوری، اور نئی زندگی کا نقشہ پیش نظر، قصہ مختصر، یہ جھوٹ ہے اور بولنے والا آپ کا خادم۔

(۸ جولائی ۳۹ء کو حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔)

"آوارہ"

بکھرے ہوئے انگارے

شعلۂ تصور نے اس طرح سحر کر دی — رات جگمگا اٹھی دل کے جگمگانے سے
آہ کھینچ لی میں نے، ضبط کر لیا میں نے — اب تمہاری مرضی ہے آؤ جس بہانے سے
جس نظر سے جلووں کا جائزہ لیا میں نے — وہ نظر نہیں کوئی اس نگار خانے سے
چاند کے تبسم سے شب نکھر تو جاتی ہے — دل مگر نہیں کھلتا غم میں مسکرانے سے

نعمت سہی، یہ غم ترا راحت سہی مگر — اتنی خوشی نہیں کہ ابھی مسکراؤں میں
یا میرے پاس آنے کی دعوت قبول کر — یا انتظار کر کہ ترے پاس آؤں میں

دل کو دل سے راہ ہے اور دل کو دل سے کام ہے — اعتبارِ دوست کا شاید محبت نام ہے

ہے ابھی زخمِ گوش شورِ خزاں — کیا سنوں میں بہار کی باتیں
تھا سکون اور اضطراب بھی تھا — نہ سنو انتظار کی باتیں

مری نماز میں گنجائشِ سوال نہیں — دعا بھی اس لئے مانگی کہ یہ قبول نہ ہو

ادراک ہے ہر چیز کا الفت میں مصیبت — اچھا تھا جو تم واقفِ اسرار نہ کرتے
تکمیلِ محبت کو ترستا ہے مرا ذوق — وحشت جو مجھے دی تھی تو ہشیار نہ کرتے

مخمور راہِ عشق میں دل کو نہ کر تباہ — ایسا نہ ہو وہ کہہ دیں ترا دل نہیں تو ہیں

مخمور جالندھری

اُس وقت مجھے یاد آتی ہو

(ہر بار "جی نہیں" کہنے والی کی خدمت میں . . . . ایک بار نہایت آہستہ سے "جی نہیں" کہنے کے بعد!)

پھولوں کے معطر بستر پر   جب شبنم سونے آتی ہے
اور سرخ گلاب کی کلیوں کو   کچھ کہہ کر شرما جاتی ہے
جب مجھ سے سنبھلنے کی طاقت   یکبارگی چھین لی جاتی ہے
اُس وقت مجھے یاد آتی ہو،   رہ رہ کے مجھے یاد آتی ہو!

جب چاند روپہلی کرنوں سے   موجوں کو اشارہ کرتا ہے
اِک حسنِ مجسّم ہنس ہنسکر   اقرارِ محبت کرتا ہے
شوریدۂ الفت جب دل کو   وارفتۂ الفت کرتا ہے
مَیں دل کو اشارہ کرتا ہوں   دل مجھ کو اشارہ کرتا ہے
اُس وقت مجھے یاد آتی ہو   رہ رہ کے مجھے یاد آتی ہو!

جب رات کے سیمیں پہلو میں   مخمور ہوائیں سوتی ہیں
ساحل کی چمکتی ریتی پر   جب پریاں کھیلتی ہوتی ہیں
جب دل سے کبھی تنہائی میں   بس آپ کی باتیں ہوتی ہیں
اُس وقت مجھے یاد آتی ہو   رہ رہ کے مجھے یاد آتی ہو

جب رات کی خاموشی میں کبھی   برسات برہنہ ہوتی ہے
ارمان بھرے دل کے اندر جب   اک حسرت کروٹ لیتی ہے
جب بجلی تڑپ کر راحت کو   پیغامِ تجسس دیتی ہے
اُس وقت مجھے یاد آتی ہو   رہ رہ کے مجھے یاد آتی ہو

دریا کے کنارے دو دل جب   اک ساتھ دھڑکنے لگتے ہیں
"ہاں" اور "نہیں" کی اُلجھن میں   رخسار دہکنے لگتے ہیں
پھر کیفِ شباب کے آخر میں   جب سانس مہکنے لگتے ہیں
اُس وقت مجھے یاد آتی ہو   رہ رہ کے مجھے یاد آتی ہو!

جب حسن کی رنگیں نظروں میں   بیتاب شرارت ہوتی ہے
ہر بار "نہیں" کہہ دینے کی،   جب اُن کو عادت ہوتی ہے
اور رات کے پچھلے حصہ میں   آشفتہ قیامت ہوتی ہے
اُس وقت مجھے یاد آتی ہو   رہ رہ کے مجھے یاد آتی ہو!

جب کوئی شریرِ محبت کے   افسانے سنانے لگتا ہے
اور پچھلی باتیں یاد دلا کر   مجھ کو رُلانے لگتا ہے
پھر چپکے سے تصویر تمہاری   لا کے دکھانے لگتا ہے
اُس وقت مجھے یاد آتی ہو   رہ رہ کے مجھے یاد آتی ہو!

"آکاش کی نیلی وادی جب"   سیمابی، سُنہری ہوتی ہے
فطرت کی منور مانگ میں جب   سیندور کی سرخی ہوتی ہے
جب ظلمتِ شب کم ہوتی ہے   اور صبح کی آمد ہوتی ہے
اور صحنِ چمن کی ننھی کلی،   شبنم سے منہ کو دھوتی ہے
اُس وقت مجھے یاد آتی ہو   رہ رہ کے مجھے یاد آتی ہو!

جب صبح سویرے باغوں سے   موروں کی صدائیں آتی ہیں
رنگین قیامتیں سوتے سے   رہ رہ کے جگائی جاتی ہیں
جب ان کی مرمریں باہوں میں   انگڑائیاں رقصاں ہوتی ہیں
اُس وقت مجھے یاد آتی ہو   رہ رہ کے مجھے یاد آتی ہو!

راحت

پریشانیاں

بیخبری

برسات کی گھٹ‌ٹپ اندھیری رات کو اپنی تیز روشنی سے چیرتی! میل ٹرین چلی جارہی ہے۔ میدانوں اور جنگلوں میں سے، دلدل اور پانی سے لبریز کھیتوں میں سے سوتے ہوتے دیہاتوں کے پاس سے اور اُبلتے ہوئے دریاؤں کے اُوپر سے۔ مسافروں سے بھری گاڑیوں کی کھڑکیاں اپنی روشنیاں جھلملاتی نکلتی چلی جارہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشن جگمگاتے ہیں اور نکل جاتے ہیں۔ دریاؤں کے پُل کھڑکھڑاتے ہیں اور نکل جاتے ہیں۔ ریل کی چوکیاں چمکتی ہیں اور رہ جاتی ہیں۔ میل ٹرین اُڑی چلی جارہی ہے۔ اسٹیشن آیا اور نکل گیا۔ پہاڑ آتے اور نکل گئے۔ میدانوں اور کھیتوں پر سے نکلتی، میلوں اور کوسوں کو چھانٹتی، اسٹیشن پر اسٹیشن چھوڑتی، ڈاک گاڑی اس میں باہر سے بے خبر لوگ کھچا کھچ بھرے ہیں۔ کچھ لیٹے ہیں، کچھ بیٹھے ہیں، کچھ جاگ رہے ہیں، کچھ سو رہے ہیں۔ کچھ اونگھ رہے ہیں۔ ایک عورت بچے کو لئے لیٹی ہے۔ دودھ پلا رہی ہے۔ دس ہزار، ایک لاکھ، ایک کروڑ میں بھی نہیں، نہیں اسے نہیں بیچے گی۔ ایک بڈھا مارواڑی اکڑوں بیٹھا ہے۔ بیٹھے بیٹھے کمر دُکھ گئی ہے۔ برابر کے لیٹے ہوتے خانصاحب کو بس چلے تو توپ سے اُڑا دے، مگر مجبور۔ خانصاحب کے پیروں کی طرف ایک دھوبی سکڑا ہوا لیٹا ہے۔ لیکن ہر دس پندرہ منٹ کے بعد انچ دو انچ جگہ خانصاحب کی ہتیا لیتا ہے۔ اُس کی دھوبن گھونگٹ نکالے بیٹھی ہے۔ میکے جارہی ہے۔ مَیّا، جی جی اور بھوجی کو یاد کر رہی ہے۔ دل ہی دل میں ان سب سے باتیں ہو رہی ہیں۔ دوسری بنچ پر ایک نوجوان ترکی ٹوپی پہنے بیٹھا اپنے برابر کے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے جو اسی کے محلہ کا ہے اپنے بڑے بھائی کی بدسلوکیوں کا رونا رو رہا ہے۔ اور اپنی شرافت کے سلوک ایک ایک کرکے گنا تا ہے۔ کبھی کبھی اپنے بدلہ لینے کے منصوبے بھی بناتا ہے۔ اس کا ساتھی سر ہلاتا ہے اور داد دیتا ہے۔ اِن دونوں کے پیچھے ایک گرہ کٹ بظاہر بیٹھا اُونگھ رہا ہے لیکن کن انکھیوں سے دائیں اور بائیں دونوں طرف دیکھ لیتا ہے کیونکہ اُس کے پاس ہی ایک موٹی بنینی زیور سے لدی، سکڑی پڑی سو رہی ہے۔ بنیا بیٹھا سوچ سوچ کر پچھتا رہا ہے "کاہے کو گڑ کا سودا نہ کر لیا۔ چار سو بھیلی مال تھا۔ دو ٹکے کی تیزی ہوئی گئی۔ نتھو ل چو کھا رہا۔ بڑی بھول ہوئی گئی"۔

لیکن ایک پل میں کچھ نہ تھا۔ سوتے سوتے ہی رہے۔ جاگتوں کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ جیسے کے تیسے ہی جو اپنی فکر میں جہاں تھا وہیں سے غائب ہو گیا۔ اگر جاگے ہونگے تو دوسری دُنیا میں۔ اگر خبر ہوئی ہوگی تو فرشتوں نے بتایا ہوگا کہ کیا ہوا۔ ایک چھوٹے اسٹیشن پر کھڑی ہوئی مال گاڑی سے میل ٹکرایا۔ اور صرف دو باتیں اس طرح سے ہو گئیں جیسے جگمگاتے گھر کا سوئچ آن کر دو۔ شاندار زبردست ریل کے ڈبے یا تو جگمگاتے سنسناتے جارہے تھے یا پھر جو دیکھو تو ماچس کا سا ڈھیر پڑے تھے۔ رنج و خوشی، عیش و تکلیف، محبت اور نفرت، حسد اور ہوس کے تابع انسان یا تو دماغوں میں منصوبے گانٹھ رہے تھے یا لوہے اور لکڑی کی چھپٹیوں میں اُلجھا ہوا چیلوں کے دینے کا قیمہ پڑا تھا۔

درخت پر ایک گولر لگا ہے۔ جس کے جگر میں بُھنگوں کی ایک دُنیا آباد ہے۔ اس میں بچے ہیں، جوان ہیں، مادین ہیں، نر ہیں۔ آپس میں لڑائیاں ہیں، میل محبت بھی ہے۔ فکریں بھی ہیں خوشیاں بھی ہیں۔ اِسی چھوٹی سی دُنیا میں پھڑپھڑا کر اُڑتے ہیں۔ زیروں پر ناچتے بھی ہیں۔ گُودے میں گُھس کر رہتے سہتے بھی ہیں۔ نرم، تر، گرم خوشبو سے معطر ہلکی ارغوانی روشنی سے پُر۔ یہ ایک مکمل دُنیا ہے۔ اس کے باہر ان کے واسطے تا وسعتِ خیال کچھ نہیں ہے۔ کچھ ہونا تو 'ہونا' ہونے کا خیال بھی نہیں ہے۔ جو کچھ گولر میں ہے وہی ہوسکتا ہے اور وہی ہے۔ اِسی میں بُھنگوں کے خاندان ہیں۔ یہیں پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں مست ہیں۔ کوئی رس چُوستا ہے، کسی نے دوسرے کے زیرے پر قبضہ کر لیا ہے۔ دو آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایک مادہ اپنے انڈوں کو دیکھکر خوش ہو رہی ہے۔ دفعتًا اندھیرا ہوتا ہے۔ اس دُنیا کے زمین اور آسمان کانپتے ہیں اور شق ہوتے ہیں، رس کی دھاریں جابجا اُڑتی ہیں۔ فنا فنا۔ فنا فنا۔

ایک لڑکے نے گولر توڑ کر مُنہ میں رکھ لیا اور چبا کر کھا گیا۔

مُسافر!

کہاں سے آتا ہے مسافر؟ کہاں کو جاتا ہے مُسافر؟

دہلی کا اسٹیشن ہے۔ تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ ہے۔ صدہا چہرے ہیں، صدہا آوازیں، سینکڑوں رنگ ہیں سینکڑوں لباس ہیں۔ سب اجنبی ہیں۔ سب اپنی اپنی فکر میں ہیں۔ سب کے سب مسافر ہیں کہیں سے آئے ہیں، کہیں جا رہے ہیں۔ ان میں عورتیں ہیں، مرد ہیں، بچے ہیں۔ بوڑھے ہیں۔ ادھیڑ ہیں۔ جوان ہیں۔ کچھ لڑتے ہیں، کچھ ہنستے ہیں، کوئی گاتا ہے۔ کوئی خاموش ہے۔ کوئی پیسے گنتا ہے، کوئی حلوائی کی دُکان تکتا ہے۔

سب کے سب مسافر ہیں! کہیں سے آئے ہیں کہیں جا رہے ہیں!

کوئی بچھڑوں سے ملنے والا ہے۔ کوئی اپنوں سے جُدا ہونے والا ہے۔ کسی کی اُمیدیں بر آنے والی ہیں۔ کوئی نااُمید ہو کر جا رہا ہے۔ فقیر ہاتھ پھیلائے پیسہ مانگ رہا ہے۔ بنئے نے مُنہ پھیر لیا ہے۔

سب کے سب مسافر ہیں! کہیں سے آئے ہیں کہیں جا رہے ہیں!

کوئی مخمورِ شباب ہے۔ کوئی محوِ جمال ہے۔ کوئی مستِ خرام ہے۔ کوئی ٹکٹکی لگائے تاک رہا ہے۔ کسی نے گھونگٹ کی آڑ کر رکھی ہے۔ بڑھیا مارواڑن کھانس کھانس کے بلغم نکال رہی ہے۔

سب کے سب مُسافر ہیں! کہیں سے آئے ہیں کہیں جا رہے ہیں!

مسافر خانے کے ایک کونے میں رفیق بیٹھا رو رہا ہے کوئی ترس کھا کر پوچھتا ہے: "کون ہو؟"

"مُسافر۔"

"کیوں روتے ہو؟"

"بھٹک گیا صاحب، راستہ بھول گیا۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"معلوم نہیں۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"معلوم نہیں۔"

لاعلاج

محفل شب برخاست ہو چکی تھی۔ صحنِ باغ سونا پڑا تھا۔ کچھ شیشہ و ساغر کے ٹکڑے تھے۔ کچھ نُچے کھچے ہار پڑے تھے۔ کہیں کہیں پان کی پیکیں پڑی تھیں۔ کہیں مقیش اور افشاں کے ذرّے پڑے چمک رہے تھے۔ ہر سو پروانوں کی لاشیں تھیں۔ رفیق بیٹھے وہاں رو رہے تھے۔ میں نے کہا: "اے حضت چلئے۔ جلسہ برخاست ہوا۔ مے گئی، ساغر گیا، ساقی بھی گیا۔ شمع محفل جلکر خاک ہوئی۔ پھول کملائے۔ ہار باسی ہوئے۔ ماہ کامل اُفق میں غرق ہوا۔ اب دھوپ چڑھتی ہے۔ چلئے ـــ"

بولے: "ٹھہرو! ٹھہرو! یادِ محفل باقی ہے۔ ابھی چلتا ہوں۔ یہ بھی مٹ جانے دو۔"

میں نے کہا: "احمق ہوئے ہو۔" اور میں قہقہہ مار کر ہنسا۔ "یہ اب کیا مٹ سکتی ہے۔ تم کو مٹا کر مٹے گی۔"

رفیق دھاڑیں مار کر رو دیا۔

آج اور کل

خزاں کا موسم تھا راجہ کا باغ سونا پڑا تھا۔ صرف ایک گلاب کی ایک ہی ڈالی پر دو پھول کھلے تھے۔ مغرور تھے۔ مخمور تھے۔ اپنے اپنے حُسن پر نازاں تھے۔ ایک دوسرے پر ہنستے تھے۔

بڈھے راجہ کی سانسیں رُک رُک کر چل رہی تھیں۔ وید اور پنڈت جمع تھے۔ جلدی! جلدی شاہزادی کی شادی ہیں، مچی تھی، کہ راجہ کی آخری تمنا تھی۔ شام کو مالن دو ہار بنا کر لائی۔ ایک راجہ کے جنازے پر ڈالا گیا۔ دوسرا دُلہن کے ماتھے پر باندھا گیا۔ سفید پھولوں میں صرف ایک گلاب سہرے کو رونق دیتا رہا۔ سفید پھولوں میں صرف ایک گلاب جنازے پر حسرت کا نشان بنا رہا۔

راتیں مختصر ہوتی ہیں۔

صبحدم بادِ سحر نے جھاڑو دی۔ میں پکار اُٹھا: "ظالم آہستہ آہستہ۔ ارے کل کی یادگاریں مٹی جاتی ہیں۔"

بادِ سحر ہنس کر جھومی پھر حیرت سے بولی: "کل؟ کل؟ کل تو یاں سکندرِ اعظم کی فوجوں کا کوچ ہوا تھا۔ اُن کا کوڑا میں نے جھاڑا تھا۔"

؟

صبحدم بادِ صبا اِٹھلاتی آئی۔ کلی کو گدگدایا، وہ ہنسکر شگفتہ ہوگئی۔ شام کو پھر بادِ صبا اِٹھلاتی آئی۔ ڈالی کو جھٹکا دیا۔ کُملائے پھول کی پنکھڑیاں بکھر گئیں۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ ـــ یہ کیا ہو رہا ہے؟

نشان

مَیں نے ایک پُرانا قبرستان دیکھا۔ کچّی پکّی، چھوٹی بڑی، نئی پُرانی قبریں تھیں۔ مٹی ہوئی ہستیوں کی یادگاریں تھیں۔ ہستی نہ سہی ہستی کی یادگاریں ہی سہی۔ خیال آیا مَیں جب مَروں تو میری قبر پکّی اور مضبوط ہونا چاہیئے۔ یہ کچّی قبر کب تک رہے گی۔ دو چار برساتوں میں برابر ہو جائیگی۔ وہ بھی اچھی نہیں نام کے لئے پکّی ہے۔ ایک پُرانی قبر پر نظر پڑی۔ بہت پُرانی تھی۔ مضبوط تھی۔ ایسی ہونا چاہیئے۔ برسوں برسوں رہے گی۔ میں نہ سہی میری نشانی رہے گی۔ میں واپس آرہا تھا کہ دروازے پر تکیہ دار بولا "کیا دیکھتے ہیں صاحب! اب کیا رہ گیا ہے۔ ایک یہ ہے دو ایک اور ہیں۔ شاہی کے کیسے کیسے قبرستان تھے۔ سب مٹ گئے اب ان کا نشان بھی نہیں ملتا۔"

دل دَھک سے ہو گیا۔

✦ ✦ ✦

سیدرفیق حسین

کل کی سہاگن

"اپنی غم نصیب، ہم سبق کملا کے نام جن کے شوہر کے انتقال نے مجھے خُون کے آنسو رُلائے۔"

بھُولے نہیں ابتک مجھے وہ شوخ نظارے ... آکاش کی چادر میں جھپکتے ہوئے تارے
دامانِ شفق سے وہ نکلتا ہوا سُورج ... موجوں کے تلاطم میں وہ بیتاب نظارے
بکھری ہوئی موجوں میں وہ موجوں کا اُبھرنا ... جیسے کوئی کرتا ہوا اشاروں پہ اشارے
میدانوں میں بکھرا ہوا شاداب سا سبزہ ... بہتے ہوئے دریا میں وہ سیماب کے دھارے
وہ بادِ صبا جھومتی، اِٹھلاتی ہوئی سی ... وہ نیند سے ماتے ہوئے ہرنوں کے نظارے
ہر چیز کو بدمست کئے دیتی تھی فطرت ... میں بھی نکل آیا وہیں جمنا کے کنارے
بسری ہوئی باتیں مجھے یاد آگئیں اُس وقت ... آنکھوں میں بھرے عہدِ گذشتہ کے کنارے
بینائیِ دل نے مری وہ زور دکھایا ... تھرّا کے نکل آئے دو آنکھوں سے شرارے
پانی میں ٹپکتے تھے مری آنکھ کے موتی ... جمنا میں ہوئے غرق مری آنکھ کے تارے
ناگاہ نظر میری جو ایک سمت کو اُٹھی ... بیتاب دلِ خستہ ہوا شوق کے مارے
اِک حُسن کی ملکہ تھی یا اک پریم کی دیوی ... بیٹھی ہوئی مغموم سی دریا کے کنارے
باریک سی ساری میں وہ چھنتی ہوئی رنگت ... صورت پہ تھے قربان فلک، چاند، ستارے
اُف جذب شوق ہائے دھڑکتا ہوا سینہ ... آہستہ قدم مَیں چلا پتھر کے سہارے
ہر لحظہ مجھے گرم تنفس کا تھا احساس ... مزدور کوئی جیسے کسی کام سے ہارے
آخر میں اٹکتے ہوئے پوچھا کہ اے دیوی ... چھائی ہے کیوں افسردگی چہرے پہ تمہارے
کیا میری طرح تم بھی نہیں شاد جہاں میں ... بے کیف تمہارے بھی لئے ہیں یہ نظارے
بولی کہ مَیں ہوں کل کی سُہاگن مرے ہمدرد ... اب کون ہے دُنیا میں رہوں جسکے سہارے
اُف چھن گئے ہاتھوں سے اچانک مرے سرتاج ... آنکھوں سے نہاں ہو گئے وہ میرے پیارے
رنگینیٔ ہستی مری نظروں میں کہاں اب ... جب دوسری دُنیا مرے مالک ہی سدھارے
اب بھی شبِ تنہائی میں سُنتا ہوں تبسم ... آہستہ سے جیسے کہ کوئی مجھ کو پکارے

نشیمن بلبل امروہوی

بغداد کا جوہری

(جناب اشرف صبوحی دہلوی کا ناول "بغداد کا جوہری" زیر طبع ہے۔ اسکا ایک دلچسپ باب پیش کیا جا رہا ہے)

ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ ایرانی واعظ قمر الزماں ایک مرتبہ پھر محمود کے بیٹے اور بغداد کے سربرآوردہ جوہری آحمد کی محلسرا میں دکھائی دیا۔ وہی ایوان، وہی ایک طرف پہلے کی طرح پردہ پڑا ہوا۔ مغرب کی نماز ہوچکی تھی۔ فانوس اور شمعدان روشن تھے۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ دعوت میں پچھلی دفعہ سے زیادہ تکلف تھا۔ میزبان اور مہمان آمنے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھے۔ مزے لے لیکر نہایت اطمینان کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر آحمد نے محراب دار منقش چھت کی طرف دیکھا جسے خوبصورت اور نازک ستون سروں پر اٹھاتے ہوئے تھے اور مولانا سے خطاب کر کے کہا یا شیخ! بقائے دوام اور خلقتِ حسن کے متعلق گزشتہ صحبت میں جناب نے جن خیالات اور انکشافات کا اظہار فرمایا تھا۔ اس ناچیز نے ان پر غور کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ نے فلسفہ و حکمت کے دریا بہادئے، یہ واقعہ ہے کہ وہ میری نگاہوں میں انمول موتی تھے لیکن کیا عرض کروں مجھے اپنے عجز کا اقرار ہے کہ میں ان سے حقیقی فائدہ اٹھانے سے قاصر رہا۔ کیا آپ براہِ بندہ نوازی اسی سلسلہ میں ایک اور سوال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے؟

قمر الزماں:۔ میرے معزز میزبان! آپ آزاد ہیں۔ بے تکلف پوچھیں۔

احمد:۔ (کسی قدر تامل کے بعد) گستاخی نہ ہو تو میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کسی جمیل صورت سے جو آپ کے روبرو اور آپ کے تصرف میں آنے کے لئے تیار ہو صرف فنی نقطۂ نظر سے محض حسن کے تخیل میں لذت اندوز ہو سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی روح کی گہرائیوں میں سے خواہشات نفسانی کو بالکل نکال دیں اور وہ خالی جگہ فقط حسن کے تخیل سے رسی بسی رہے؟

قمر الزماں:۔ میرے لئے یہ ناممکن نہیں! میں ایسا کرنے پر قادر ہوں بلکہ ایک میں کیا ہر وہ شخص جس کو ایک بار بھی حظِ نفسانی کے مقابلے پر حسنِ ازل کی برتری کا احساس ہو گیا۔ اس کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مادی جذبات کے محدود امکانات میں قید رکھے۔ وہ آدمی ہی کیا جو حقیقت آشنا ہونے کے بعد بھی بحرِ مجاز میں غوطے کھاتا رہے۔

احمد:۔ جل جلالہ۔

قمر الزماں:۔ (لاپرواہی سے) اور کچھ ارشاد؟

احمد:۔ (نیچی نظر کرکے) میں نے ایک کنیز خریدی ہے۔ صورت میں پری۔ سیرت میں حور اور نزاکت میں شاخِ گل۔ نہایت شوخ، بے حد صاحبِ کمال۔ بے مثل ناچتی اور گاتی ہے۔

قمر الزماں:۔ بہت مبارک۔

احمد:۔ اگر جناب پسند فرمائیں تو اُسے بلاؤں؟ حسنِ دلکش کی تصویر ہے۔ اس کا ناچ دیکھئے گانا سنئیے۔ اور عملی طور پر بتائیے کہ تصور میں کس طرح زندہ حسن کے مزے لئے جاتے ہیں۔

اتنا کہتے ہی آحمد نے لونڈیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے تنبورے سنبھال ہم آہنگی کے ساتھ ہندوستانی گت بجانا شروع کی۔ مدھم سروں میں شیریں نغمے ابھی پرورش ہی پا رہے تھے کہ یک بیک ایوان کا درمیانی پردہ اٹھا اور ایک حسن کا شعلہ نکل کر سامنے آگیا۔

حسن کی یہ رقصاں تصویر، آسمان سے زمین پر اُتری ہوئی بجلی یا آنیس اُس وقت عجب توبہ شکن اور زاہد فریب روپ میں تھی۔ کولھوں سے فرش تک زرد باریک ریشمی پشواز جس کے کناروں پر طلائی کام۔ جھالر میں بڑے بڑے موتی ٹکے ہوئے۔ اُوپر کا حصہ سُنہری رنگ کے کسی عجیب کپڑے کی محرم سے کچھ کھُلا کچھ ڈھکا بازوؤں پر جڑاو بازو بند۔ پاؤں میں مینا کار جھانجن۔ ہاتھوں کی اُنگلیوں میں پور پور ہیرے، یاقوت، نیلم، اور زمرد کے انگوٹھی چھلے۔ سب سے بڑھکر زربفت کی دو پٹیاں حسنِ خداداد کو چار چاند لگا رہی تھیں۔ جن میں سے ایک بائیں ران پر بندھی ہوئی تھی اور دوسری نے اسکی پیشانی کو حلقہ میں لے رکھا تھا۔ جسکے نیچے بڑی بڑی نشیلی آنکھیں جادو گری کر رہی تھیں۔ مختصر یہ کہ دعوتِ نظر کا پورا سامان تھا۔

آنیس نے آتے ہی سازوں کے تاروں پر رقص شروع کر دیا۔ چلت پھرت سے خون کا دَور تیز ہوا۔ رُخساروں پر سُرخی دوڑنے لگی۔ مگر سینے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا دل تڑپ رہا ہے۔ وہ اس وقت ایک بے پناہ حسن کی مالک بنی

ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اُسے یہ بھی یقین تھا کہ اس کا جوشِ رقص عصمت فروش نہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ ہنگامی نشہ اُترتے ہی مائل بہ سکوں ہو جائیگا۔ وہ ایک دائرے کے اندر پنجوں کے بل ناچ رہی تھی۔ سارے جسم کا بوجھ پیروں کی انگلیوں پر تھا اس لئے ٹانگوں کی ہر رگ گوری کھال میں سے پھڑکتی دکھائی دیتی تھی۔ رقص ہندوستانی وضع کا تھا۔ اس کے ہاتھ اور بازو برابر حرکت کر رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی کہیں دور خوابوں کی دُنیا کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ حُسن اور اُس پر نئے نئے انداز ناچ کیا ایک قیامت تھا۔ دورانِ رقص میں جب وہ بشِراز کے دائیں بائیں دونوں سرے پکڑ کر اور ایک ادا کے ساتھ انہیں پھیلاتی ہوئی دونوں ہاتھوں کو سر کے اُوپر لے جاتی۔ ایک ٹانگ پیچھے کی طرف پھیلاتی اور دوسری پر نصف کھڑی ہو کر تیتری بنتی یا مور کا ناچ دکھانے کے لئے ہاتھوں کو تھرتھراتی اِدھر اُدھر جھومتی اور آگے پیچھے جھکتی تو دلوں کا تو کیا پوچھنا، ساکت وجامد در و دیوار میں بھی ایک تڑپ سی محسوس ہونے لگتی۔

خدا خدا کر کے یہ جادو کا تماشہ ختم ہوا۔ مگر انیس جلیس نے اپنا آج کا رقص معمول کے مطابق اپنے شوہر کے قدموں پر سر جھکا کر ختم نہیں کیا بلکہ ایک لمحہ ادائے خاص کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو سر کے اوپر ملائے کھڑی ہوئی اور پھر یکایک پردے میں روپوش ہو گئی۔ احمد کی حالت نہ پوچھو، مہمان کا لحاظ تھا، کلیجہ پکڑے بیٹھا رہا۔ اُس کا بس چلتا تو انیس کے پیچھے پیچھے پہونچتا اور اُسے چھاتی سے لگا کر اپنے بھڑکتے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرتا۔ قمر الزماں کے حواس بھی اپنے ٹھکانے پر نہیں تھے۔ بے چینی ظاہر تھی۔ کئی پہلو بدلتے ہوئے وہ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور دھیمی آواز سے متاثر لہجہ میں کہنے لگا "اے خوش نصیب نوجوان! جو میں نے ابھی دیکھا ہے، اس سے پہلے کہ میں اُس کی نسبت کچھ کہوں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کی کنیز دوبارہ صورت دکھائے گی یا اِسی ہندی رقص پر اُس نے اپنے کمال کا خاتمہ کر دیا؟"

احمد۔ نہیں، وہ ایک مرتبہ اور رقص کریگی۔

قمر الزماں۔ (اتنی دھیمی آواز سے کہ بمشکل احمد کے کانوں تک پہونچ سکی) تو مجھے اپنی رائے کو محفوظ رکھنا چاہیئے۔

قمر الزماں اس قدر سٹپٹایا ہوا سا تھا کہ اُس نے اپنے تاثرات چھپانے کی غرض سے اپنی شخصیت کی بھی پروا نہ کی اور سامنے رکھا ہوا نبیذ کا پیالہ اُٹھا کر بے تکلف مُنہ سے لگا لیا۔ تلچھٹ تک نہ چھوڑی۔

اور پھر تکیئے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ میزبان اور مہمان دونوں خاموش اور کسی نئے منظر کے منتظر تھے کہ باغ کی طرف سے کھڑکی کے راستے ایک عجیب سُریلی صدا آئی ؎

کچھ سوز تھا مطربوں کی لَے میں
کچھ آگ بھری ہوئی تھی نَے میں

اسلام میں راگ سُننے کی اسی لئے ممانعت ہے کہ یہ جذبات کو بھڑکانے کے پنکھے ہیں۔ آواز دلوں کو برما رہی تھی کہ اتنے میں پردہ حائل اُٹھا اور انیس دوبارہ باہر آئی۔ ابکے حُسن نے سادگی میں جلوہ دیا۔ سارے زیور اُتار دیئے گئے تھے۔ سفید لباس برہنگی کا پردہ دار تھا۔ وہ بھی اتنا باریک کہ اس میں سے سب کچھ نظر آتا تھا۔ کھڑکی میں سے آنے والی آواز قریب آنے لگی۔ اور اس کی گت پر ناچ شروع ہوا۔ ایک لوز تھا کہ فضا میں رقصاں تھا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں خواب زلیخا دیکھ رہی تھیں۔ یوسف کی جمالی شان تعبیر میں مصروف تھی۔ قمر الزماں کے باطن کو کون ٹٹولتا؟ احمد اپنے ہوش ہی میں نہیں رہا۔ انیس کی نسائی رعنائی اور اُس کے کھُلے ڈھکے اعضا کی نمائش نے اُس کا دل کیف و مسرت سے معمور کر دیا۔

یہ سماں زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ نسوانی شرم نے پاؤں پکڑ لئے۔ موسیقی بند ہو گئی۔ انیس کچھ کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی۔ یکایک اپنی عریانیوں پر اس کی نظر پڑی۔ چونکی اور بے تحاشہ بھاگ کر پردے میں جا چھپی۔ احمد کچھ دیر تو ٹکٹکی باندھے اس جگہ کو دیکھتا رہا جہاں وہ شمع حُسن فانوسی لباس میں کھڑی ہوئی تھی۔ پھر ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیکر اپنے مہمان پر نظر ڈالی۔ قمر الزماں آنکھیں جھکائے کسی ایسے گہرے غوطے میں تھا کہ نہ ہاتھ ڈاڑھی سے کھیل رہے تھے نہ ہونٹوں پر کوئی حرکت تھی۔ احمد نے اس کا سکوت توڑنے، تصور کے جمود کو حرکت میں لانے اور خیال کی سردی میں گرمی پیدا کرنے کی غرض سے نبیذ کا ایک جام پیش کیا۔ مگر ایرانی نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کرتے ہوئے کہا: "اس کی حِلّت و حرمت یا کراہت کے فقہی مسائل سے مجھے اس وقت بحث نہیں تاہم میں معافی چاہتا ہوں۔ شکر ہے دماغ ہر عارضی سرور سے پاک رہے تو بہتر ہے۔"

احمد اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ قمر الزماں کا پردۂ تقدّس چاک کرنا چاہتا تھا۔ انسان کی فطرت ہے خصوصاً جب مزاج بھی رنگین ہو کر جو اس کی صحبت میں آئے اسی جیسا ہو جائے۔ ایک حمام میں نہانے کی آرزو اور ننگے ہونے سے انکار؟ اُس نے تالی بجائی۔

ایک غلام اندر آیا۔ برابر کے چھوٹے کمرے کو کھولنے کا حکم دیا۔ کمرہ کھلا، دونوں، مہمان اور میزبان وہاں سے اُٹھے۔ جہاں حُسنِ عریاں کی پرچھائیاں ابھی تک نگاہوں میں رقص کر رہی تھیں۔

جب دونوں اِس چھوٹے آراستہ کمرے میں آکر بیٹھ گئے اور ماحول بدلا تو قمرالزماں نے کہا: "اچھا تو پہلے ہمیں اس حسین وجمیل کنیز کی جنسی خلقت پر تنقید کرنی چاہیئے۔ پھر اس کے اکتسابی کمالات سے بحث کریں گے۔ جہاں تک حسن اور دلکشی کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ وہ ایک بڑی حد تک نظرفریب ہے۔ گو قدرت کسی کے ساتھ بخل نہیں کرتی لیکن اصلی جمال کی شان تو کچھ اسی کو زیبا ہے۔ خیر مجھے اندیشہ ہے کہ آپ پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے۔ اس تبصرے کو چھوڑتا ہوں۔ اب رہا اس کا رقص جس پر غالبًا آپنے بہت کچھ خرچ کیا ہوگا، اور اُسے خود بھی ناز ہے۔ آپ کی نگاہ میں کیسا ہی حُسن کو آشکارا کرنے والا ہو۔ ایک نقاد کے لئے فن کی حیثیت میں کوئی چیز نہیں۔ کمال کے درجے تک پہونچنے میں بہت کسر ہے۔ رقص کے متعلق بعض ایسی بنیادی باتیں جاننے کے قابل ہیں جن سے ہر رقاصہ کو واقف ہونا چاہیئے۔ آپ کی کنیز اناڑی ناچنے والیوں کا سا ناچ ناچتی ہے۔ ہندوستانی ناچ میں اُس کی ساری خامیاں ظاہر ہوگئیں۔ جوشیلے اور محبت کے متوالے نوجوان! میرے اس تبصرے سے کبیدہ خاطر نہ ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں آپ کی فیاضانہ دعوت کی جس سے میرے حواسِ خمسہ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی، تضحیک کر رہا ہوں یا کم از کم شکرگزاری کا مادہ مجھ میں نہیں۔ بلکہ میری دلی خواہش یہ ہے کہ جس تنقیدی نظر سے میں لُطف اندوز ہوا ہوں آپ بھی اسے سمجھ لیں۔ ہر کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لئے طریقہ اور سلیقہ بڑا ضروری ہے۔ اُصول کے بغیر فروغ دیر تک آنکھوں کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ آپ اجازت دیں تو عرض کردوں کہ وہ مغرور لونڈی ان باتوں سے بے خبر ہے۔ ہندوستانی رقص کے وقت اُس کے کپڑے بے جوڑ تھے۔"

احمد:۔ (ایرانی کی بات کاٹتے ہوئے پیشانی پر بل ڈال کر) بجلی چمکنے اور کوندنے کے لئے کسی سلیقے یا ترتیب کی محتاج نہیں۔ حُسن کو جلوہ گری سے کام ہوتا ہے۔ آپ نے اُس کی ساحرانہ اداؤں پر توجہ نہیں کی؟

ایرانی:۔ جلد بازی نہ کیجیے۔ اس کی شکل و شمائل، حرکات و سکنات پر بھی روشنی ڈالوں گا۔ پہلے اس کے دوسرے ناچ کا تو حال سُن لیجیے۔

احمد:۔ (ذرا تیز لہجے میں) کیا اس میں بھی آپ کو خامیاں نظر آئی ہیں؟

ایرانی:۔ (متانت سے) ہاں، رقص کو اگر ایک تفریحی کھیل نہ سمجھا جائے تو وہ کسی ایک مُلک کا مخصوص ناچ نہ تھا۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ گت کہیں کی توڑا کہیں کا۔ ہاتھوں کی حرکت ایشیائی تھی تو پیروں کی جنبش افریقی......

عاشق کہیں معشوق کی تعریف گوارا کرسکتا ہے۔ احمد اُنہیں کی اس طرح ہتک کب گوارا کرتا۔ اس کے تلووں سے جو لگی تو دماغ تک پہونچی۔ بھڑک اُٹھا، اور طیش میں آکر بولا:۔

"بس جناب خاموش رہیئے۔ میں ایسی بکواس پسند نہیں کرتا۔ خدا جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی کہ آپ سے ملاقات ہوئی۔ (زیادہ جوش میں آکر) کلب ابن کلب! ریش دراز خنزیر! کوئی ایسا ہی سرد جذبات کا خواجہ سرا ہوگا جو ایسے سرمدی نظارے کے بعد تیری جیسی یاوہ گوئی کرے۔ دُور ہو۔ اس گھر سے نکل جا! اور بھولے سے بھی یاد نہ کر کہ احمد جوہری نے تجھے دعوت دی تھی۔"

یہ کہتے ہوئے احمد نے کمرے کے ایک طرف کا پردہ ہٹایا اور ایک تنگ چور راستے سے قمرالزماں کو باہر دھکیلتے ہوئے کہا: "کبھی خدا تمہاری صورت نہ دکھائے۔ مع اپنی ڈاڑھی کے تشریف لے جاؤ۔"

قمرالزماں اپنا جبہ و دستار سنبھالتا ہوا خاموش سر جھکائے روانہ ہوا۔ اور انیس جلیس کی پہلی نمائش یوں ختم ہوئی۔

اشرف صبوحی

اظہارِ حقیقت

پیاری کملا

تم حیران ہوتی ہوگی کہ مجھے کیا ہوگیا۔ چاہے دیر ہو جائے مگر میں ہمیشہ خط کا جواب ضرور دیا کرتا تھا اور تم جانتی ہی ہو کہ میرا قول تھا کہ ہر ایک خط کا جواب دینا چاہیئے خواہ وہ کسی پاگل نے ہی کیوں نہ لکھا ہو۔ لیکن کیا کہوں کہ اب میرے خیالات میرے اُصول اور میری زندگی میں ان گیارہ مہینوں میں کیا کیا زبردست تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔

میں شاید اس خاموشی کو اب بھی نہ توڑتا لیکن تمہارے اس نامہ شوق نے مجھے تڑپا دیا۔ تمہارے آخری الفاظ ... میں نے بہت آس کے تمہیں یہ خط لکھا ہے، سمجھ لینا کہ کملا تمہارے سامنے کھڑی تم سے کانپور چلنے کے لئے تمہاری خوشامد کر رہی ہے ... اُف انہوں نے مجھے بہت بےچین کر دیا اور میں تمہیں خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

اچھا اب تمہیں کیا لکھوں اور کیسے لکھوں۔ ہاں سب سے پہلے اپنی خاموشی کی وجہ؟ میں بہت مُصیبت میں تھا۔ اور اب بھی ہوں تمہیں کیسے لکھوں کہ میں کس اضطراب میں دن گزار رہا ہوں۔ تمہیں خط لکھنے کو جی نہیں چاہا بس اسی لئے نہیں لکھا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنا حال سُنا کر تمہارے دُکھ میں اضافہ کروں یا تمہاری خوشیوں کو الم میں تبدیل کر دینے کا باعث بنوں۔

آہ وہ دن! آہ آہ وہ بھی کیا دن تھے۔ جب ہم دونوں ساتھ ساتھ کالج میں تھے۔ کیا تمہیں اب تک اپنی شوخیاں یاد ہیں؟ مجھے تمہاری شرارتیں کتنی پیاری لگتی تھیں۔ کمپنی باغ کے مشرقی کونے میں اُس بڑے سایہ دار گولڈ مُہر کے درخت کے نیچے والا بنچ جس پر ہم اکثر بیٹھا کرتے تھے اور دیر تک نامعلوم کیا کیا باتیں کیا کرتے تھے۔ اُف اب مجھے اس طرف سے گزرتے ہوئے بھی وحشت معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے باغ میں چمیلی کی جھاڑیوں میں یا اُس نارنگی کے پیڑ کے پیچھے جس کے آس پاس فلاکس کے رنگ برنگی پھول لہلہاتے تھے اور جس پر موتیا کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں شام کے کھانے کے بعد تمہارا چھپ جانا۔ اور میرا تمہیں سیر پر ساتھ لے چلنے کے لئے ڈھونڈنا جب بارش ہوتی ہے تو وہ سفیدے کا درخت جو تم نے اپنے ہاتھ سے عشق پیچاں کی بیلوں کے سامنے لگایا تھا اور جو اب بڑا ہو گیا ہے بھیگی ہوئی فضا میں مست ہو کر غرور سے خوب جھومتا ہے۔ تمہیں یاد ہے جس سال بی۔ اے، کا نتیجہ نکلا تھا اُس سال دریا کتنا چڑھ آیا تھا؟ ہمارے بنگلے کی سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر آیا تھا! اور ہم پانی کے تیز بہاؤ کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سڑک سے پارک تک جاتے اور پھر واپس آتے۔ تمہیں کہاں تک لکھوں کہ کیا کیا باتیں یاد آتی ہیں اور کتنی یاد آتی ہیں۔ آہ آہ! میں بھولی بسری باتوں کو یاد کر کے تڑپنے کیلئے ہی بنا ہوں۔ اُن دنوں کا اب بھول جانا ہی اچھا ہے۔ مگر جس شخص کا مستقبل اندھیرے میں ہو اور حال نہایت ناخوشگوار اور پریشان ہو وہ ماضی سے ہی سکون حاصل کر سکتا ہے۔ گو اس سکون میں بھی ایک تڑپ ہوتی ہے۔

کملا اس وقت باہر کوئی شخص نہایت دردانگیز لہجہ میں گا رہا ہے:۔

دُکھڑا کسے سُنائیں
ہائے دُکھڑا کسے سُنائیں

تم تو جانتی ہی ہو کہ تمہارے جانے سے مجھے رنج ہوا ہوگا مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میری کوئی چیز کھو گئی ہو اور میں اُسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ اُف کتنی دلکش آواز ہے۔ میں کچھ دن بہت مغموم اور خاموش رہا۔ کیا لکھوں کہ دل میں کیا کیا خیالات آتے تھے۔ میں اپنے آپ کو اُس شخص کی مانند پاتا تھا جس کے سامنے سے نہایت تسلی و سنجیدگی کے ساتھ کوئی دوسرا شخص اُس کی نہایت قیمتی اور پیاری چیز لے جا رہا ہو لیکن ... خواہ وہ کس قدر اضطراب و جذباتی طوفان میں ڈوبا جا رہا ہو۔ چاہے بے صبری و الم سے اُس کا دل کیوں نہ پھٹا جاتا ہو۔ لیکن وہ اُنگلی تک نہ اُٹھا سکے کیونکہ وہ مجبور ہو۔ آہ دیکھو!

جس ڈالی پر بیٹھے ٹوٹی
ساجن روٹھا دُنیا روٹھی
اب ہم روئیں یا مُسکائیں
دُکھڑا کسے سُنائیں

اچھا ٹھیرو!

میں نے کھڑکی بند کر دی۔ مجھے اس راگی کے گیت سے وحشت

ہوتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کہیں دُور بیابان میں بہکا بہکا پھر رہا ہوں نہ جانے مجھے کہاں جانا ہے۔

تمہیں معلوم ہی ہے کہ تمہارے جانے کے دو ہی مہینے بعد والد قبلہ اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئے۔ ابھی میں اس مصیبت کے پہاڑ کے نیچے ہی دبا تھا کہ آہ جو کچھ ہوا وہ بھی تمہیں معلوم ہے۔ تمام عمر اپنے رفیقِ حیات کا ہر بات میں ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ آخری بار ساتھ نہ دیں۔ والدہ ایک ہی ہفتہ بعد حرکتِ قلب رُک جانے سے والدِ ماجد سے جا ملیں۔

اب میں ہوں اور سرسوتی۔ لیکن اگر اسی پہ قسمت اکتفا کرتی تو رحم کرتی۔

ہر چند کوشش کی کہ کہیں کچھ چھوٹی سی ہی جگہ مل جائے، مگر سب سعی بے سُود۔ پچاسوں دفتروں میں درخواستیں روانہ کیں، بیسیوں جگہ خود گیا، وائے ناکامی، روزگار نہیں۔ کیا مجھے اپنی بیکاری کے بارے میں تمہیں لکھتے شرم آنی چاہیئے؟ مجھے خود معلوم نہیں۔ لیکن اب مجھے بہت سی باتوں میں شرم نہیں آتی۔ میری ہی یہ حالت نہیں۔ مجھ ایسے ہزاروں نوجوان اور بھی ہیں جو اسی حالت میں ہیں۔ ہندوستان جو کہ کبھی سونے کی چڑیا کہلاتا تھا آج اپنے نوجوانوں کو معاش کیلئے محتاج پاتا ہے۔ اور میری مشکل یہ بھی تو ہے کہ کہیں باہر نہیں جا سکتا۔ سرسوتی کو اکیلا کہاں چھوڑوں۔

بمبئی میں ایک دفتر میں حال ہی میں تین اسامیاں خالی تھیں اور ان اسامیوں کیلئے معیارِ تعلیم صرف میٹریکولیشن تھا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ یہاں کچھ اُمید ہو سکتی ہے۔ میں نے بھی ایک درخواست لکھ بھیجی۔ ایک مہینے کے بعد مجھے انٹرویو کیلئے بلایا گیا۔ میں بمبئی پہونچا تو معلوم ہوا کہ تین اسامیوں کے لئے پانچ ہزار درخواستیں دفتر میں موصول ہوئی تھیں، جن میں سے تین صد اشخاص انٹرویو کے لئے بلائے گئے تھے۔ اور ان تین صد میں سے میں بھی ایک خوش قسمت تھا۔ "بڑے صاحب" کے کمرے کے باہر چپراسی کے بنچ کے قریب کھڑا میں سوچ رہا تھا کہ دیکھئے قسمت کتنا دیتی ہے کہ میرے انٹرویو کی باری آئی۔ میں دبے پاؤں اندر گھُسا اور آداب عرض کر کے خاموش منتظر کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے مجھ سے کیا کیا مشکل سوال کئے جائیں گے۔ نہ جانے کیا کیا معمے حل کروائے جائیں گے۔ کچھ سیاسیات کے بارے میں نہ پوچھ بیٹھیں۔ یہی خیالات میرے دل میں آ رہے تھے کہ "بڑے صاحب" کی کرخت اور نامہربان آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"آپ کا نام؟" اُنہوں نے میز پر رکھے کاغذوں میں سے میری درخواست نکالتے ہوئے لاپرواہی سے سوال کیا۔

"مجھے سروپ نرائن کہتے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"آپ کی عمر؟"

"چوبیس برس"

"آہا، آپ ایم۔ایس۔سی ہیں۔ آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں اس دفتر میں ایم۔اے۔ اور ایم۔ایس۔سی۔ لڑکے نہیں چاہیئں۔ ہم کیا کرتے مجبور تھے، آپ کو انٹرویو کیلئے بُلانا پڑا۔ کیونکہ آپ ایم۔ایس۔سی۔ تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ اس تیس روپے کی کلرکی پر خوش نہیں رہ سکتے۔ کیا آپ چاہیں گے کہ زندگی بھر صرف کر دینے کے بعد آپ اسّی روپے پر ریٹائر ہو جائیں"

"لیکن جناب......"

میز کے کاغذوں پر سے نگاہ اُٹھا کر اب مجھ پر گرائی گئی اور قطع کلام کر کے بولے "ہاں ہاں میں جانتا ہوں آپ یہ ہرگز نہیں چاہیں گے۔ یہاں کام بہت سخت ہے اور ترقی کی کوئی اُمید نہیں۔ آپ کے لئے زندگی بہت محنتی و ناخوشگوار ہو جائے گی اور پھر آپ جیسے اتنے پڑھے لکھے لوگ ان چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کو پا کر ہمیشہ شکستہ دل رہتے ہیں۔ یہ بھی ہم خوب جانتے ہیں ہمیں اپنے دفتر کیلئے اداس بیچین، ناخوش اور بے قناعت کلرک نہیں چاہیئے۔ ہم کسی ایم۔اے۔ یا۔ ایم۔ ایس۔سی۔ کو نہیں لینگے"

"مگر میں......"

"اور آپ تو جغرافیہ کے ایم۔ ایس سی۔ ہیں۔ جغرافیہ کے ایم۔ ایس سی تو بہت کم اشخاص ہیں۔ آپ کہیں اور کوشش کیجئے۔ کسی کالج میں یا اسکول میں کوشش کیجئے۔ آپ اُستاد کیوں نہیں بن جاتے۔ یا آپ جرنلزم کیوں شروع نہیں کرتے۔ کسی اخبار کے لئے آرٹیکل کیوں نہیں لکھتے اور کچھ نہیں تو کچھ دھندا ہی کیجئے۔ میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ ہمارے دفتر میں آکر کیا کیجئے گا۔ اچھا بس اب آپ جا سکتے ہیں"

معلوم تو ایسا ہونے لگا تھا کہ "بڑے صاحب" قیامت تک اپنی نصیحت آمیز تقریر ختم نہ کریں گے۔ لیکن جب میں نے "آپ جا سکتے ہیں" سنا تو بغیر آداب عرض کئے کچھ غصّہ اور کچھ مایوسی کی حالت میں

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے

گنگناتا ہوا باہر نکل آیا۔

(بقیہ بر صفحہ ۷۰)

نقد و تبصرہ

خاموش حُسن: پبلشرز جنرل بکڈپو۔ لاہور۔ سر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ از قلم نقاش فطرت۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

جہاں تک مُترجم کا نقطۂ نظر ہے ایک کامیاب ترجمہ ہے۔ اس سے زیادہ کچھ بھی کہنا سر رابندر ناتھ ٹیگور کے افسانوں پر تنقید ہوگی۔ سر رابندر ناتھ کا ہندوستان کے زمانۂ حال میں سب سے بڑے شاعر، فلاسفر، ماہر فنونِ لطیفہ اور ملک الشعرا ایشیا ہونے میں کسی کو پس و پیش نہ ہو لیکن ان کے افسانوں کا فن فسانہ نویسی کی کسوٹی پر کس دیکھئے۔ پھر افسانوں کے لطیف جذبات، تخیلات، نازک خیالات اور تشبیہہ و استعاروں کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ اس سے انکار نہیں کہ مترجم کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ مترجم نے لفظ نیز کا غیر فصیح استعمال انار کلی کہانی میں بار بار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳ ۔پیرا تین۔ ایسی خامیوں سے ترجمہ اگر پاک ہوتا تو بہتر ہوتا۔

من کی دُنیا: مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد۔ دکن۔ قیمت ایک روپیہ۔ از رشید قریشی۔ تعجب ہوتا ہے کہ سید محی الدین قادری صاحب زور نے کس طرح اقبال مرحوم کے "سوز و ساز و جذبِ شوق" کو "نوجوان کی "خیال کی بستی" اور "شباب کی تفسیر"، بعنوان شباب کی رعنائیاں، کا ہم معنی قرار دیا۔ شبابیات کے اظہار میں بھی گو نہ عریانی سے افسانہ نگار بچ سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بہترین تبصرہ خود رشید قریشی نے کیا ہے کہ "یہ مجموعہ میری پہلی ادبی کوشش ہے۔ فنی اور دوسرے نقاط نظر سے شاید اس میں خامیاں دکھائی دیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ جس وقت آپ ان غلطیوں اور فروگذاشتوں سے دوچار ہوں تو میری "پہلی کوشش" کا خیال آپکے دماغ میں رہے۔" افسانہ "شرارت" مختصر قصوں میں کامیاب کہانی ہے۔ اس من کی دُنیا میں نوجوان کیلئے تن کی دُنیا کی جھلک ضرور ہے۔

بے انصافی کا انصاف: وزیر ہند پریس۔ امرتسر۔ قیمت عہ۔ از پنڈت دیودت شرما۔ اوم۔ اللہ۔ واہگرو۔ خدا وند یسوع سے شروع ہوتی ہے اور اسی پر ختم۔ ڈرامہ نویسی کی بہترین ناکامیاب کوشش ہے۔ زبان، تنقید و تبصرہ کی حامل نہیں ہوسکتی۔ حجم زبردستی زیادہ کیا گیا ہے۔ کہانی اور پلاٹ اور بیان غیر مؤثر ہے۔ کتاب صرف اس لئے لکھی گئی کہ لکھی جانی تھی۔ خدا کرے پنڈت جی بہتر کوشش کرسکیں کیونکہ کتاب لکھنے کا اُن کو شوق معلوم ہوتا ہے۔

سخنورانِ دکن: سلسلۂ نشرات زاویۂ ادبیہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد۔ دکن۔ قیمت تین روپے۔

یہ انوکھا اور کارآمد تذکرہ سید تسکین عابدی کی محنت کا نتیجہ ہے۔ تسکین صاحب مصوّر بھی ہیں اور یقیناً ایک سنجیدہ اور تفکرانہ طرزِ بیان رکھتے ہیں۔ سنجیدگی کا ثبوت یہ ہے کہ حیدر آباد میں ۱۱۰۰ء سے ۱۳۵۰ء تک کے تمام شاعر ملکی و غیر ملکی دونوں کا ذکر بغیر غیر ملکی تعصب سے متاثر ہوئے قلمبند کیا گیا ہے۔ مزید خوبی یہ ہے کہ تذکرہ ردیف وار انتخاب پر محمول ہونے کے باوجود حیدر آباد کی شاعرانہ ترقی اور دماغی ارتقاء و رجحان کا صاف پتہ دیتا ہے۔ سید تسکین عابدی قابلِ مبارکباد ہیں کہ اُن کی یہ کوشش اوروں کو بھی تازیانہ کا کام دیگی۔ اگر ہر صوبہ اور ریاست اپنے شعرا کا ایسا تذکرہ شائع کرسکے تو یقیناً ان سب کا مجموعہ زبانِ اُردو کے شعرا کی بہترین تاریخ اور سوانح ہوگا۔

مدراس میں اُردو: مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد۔ دکن۔ قیمت عہ از نصیر الدین ہاشمی۔

اِس موضوع پر مستند کتاب کی موجودہ زمانے میں بہت ضرورت تھی۔ اور اس کمی کو ہر پہلو سے نصیر الدین ہاشمی نے پورا کیا تاریخی جُستجو اور صحیح اظہار واقعات ایک ممتاز خصوصیت ہے۔ آج جبکہ ہندوستان کی زبان ہندی، اُردو میں کشمکش پھیل رہی ہے۔ یہ صاف ظاہر کرتی ہے کہ اُردو کے حقوق بہت زیادہ ہیں۔

اُردو سے محبّت رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک قیمتی تُحفہ ہے اور اگر یہ اور اسی طرح کی کتابوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تو اُردو کی قسمت جاگ اُٹھے گی۔

من کی بپتا۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدر آباد۔ دکن۔ قیمت ۸/
از لطیف النسا بیگم۔

طبقۂ نسواں ابھی ارتقا کے درجے میں ہے۔ اس لئے کسی ایسی کتاب کو ادبی نقطۂ نظر سے دیکھنا نقاد کی زیادتی ہوگی۔ لطیف النسا بیگم کے خیالات متوسط طبقہ کی خواتین کی معاشرتی اور اخلاقی تصحیح کیلئے کارآمد ثابت ہونگے۔ حیدر آباد کی زبانِ اُردو اغلباً بہت جلد فصیح وسلیس مان لی جائیگی۔ مگر اس پہلو پر کچھ بھی کہنا اس کتاب کے حدود تبصرہ سے باہر ہوگا۔

"ہاشمی"

اظہارِ حقیقت

(بسلسلۂ صفحہ ۶۸)

تم نہیں محسوس کرسکتیں کہ مَیں کس جاں کنی میں دن گزار رہا ہوں!

تمام دن باہر نہیں نکلتا۔ چمگادڑ کی طرح اندھیرا ہونے پر ذرا باہر جاتا ہوں اور تھوڑی سی دیر کے بعد گھر لوٹ آتا ہوں لوگوں سے چھُپا چھُپا پھرتا ہوں۔ کبھی کوئی شناسا مل ہی جاتا ہے اور ضرور پوچھ بیٹھتا ہے "کہئے آج کل کیا شغل ہے؟" یہ الفاظ مجھے حد درجہ پشیمان کر دیتے ہیں۔ شاید لوگوں کو بے شغل نوجوانوں سے یہ پوچھ پوچھکر کہ کیا کرتے ہو؟ کیا شغل ہے؟ ستانے میں کچھ لذت ملتی ہے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو کہ ایک نوجوان کچھ کرتا ہے اور پھر یہ جاننا چاہیں کہ کیا کرتا ہے تو بھی ایک بات ہے لیکن یہ جانتے ہوئے کہ وہ کچھ نہیں کرتا ہے اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا کرتے ہو۔

"کچھ نہ کرنا" آہ یہ بھی کتنی جگر سوز لعنت ہے۔ اگر...... کمّلا اگر میں بیکار نہ ہوتا...... میں تمہیں کیسی کیسی باتیں لکھے جارہا ہوں..... آہ آہ! اگر مَیں بیکار نہ ہوتا تو دُنیا میں کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہ چھین سکتی۔

میری صحت کا کیا پوچھتی ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں دُبلا ہوگیا ہوں، شاید میں ہوگیا ہوں۔ ہاں بھوک اور نیند سے شناسائی جاتی رہی۔ اب مَیں اِن دونوں کے لئے ایک اجنبی ہوں۔ کبھی کبھی میں زندگی کے لاینحل معمہ پر غور کرتے کرتے اس قدر مغموم ہوجاتا ہوں کہ اکثر مجھے یہ اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ان لوگوں کے قلب کی کیا حالت ہوتی ہوگی جو ایک انتہائی غم اور بیزاری کی حالت میں خودکشی کر بیٹھتے ہیں، خیر اب یہ خط ختم کرتا ہوں نہ جانے تمہیں کیا اول جلول لکھ دوں۔

اچھا سلامت رہو بہن تمہیں خوش دیکھکر مجھے بھی خوشی ہوتی ہے۔

مَیں ہوں تمہارا
سروپ

"چاند"

ہیملٹ

مشہور عالم ڈرامہ نگار شیکسپیر کی شہرۂ آفاق تمثیل کا ترجمہ ملک کے سب سے بڑے مترجم مولانا عنایت اللہ دھلوی۔ (سابق ناظم دار الترجمہ حیدر آباد۔ دکن) نے کیا ہے۔ عبارت دل آویز، معانی اور مطالب کو اُردو کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ پڑھنے والے کو کہیں بھی شُبہ نہیں ہوتا کہ وہ ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ مولانا کے ترجمے بے ساختہ پن میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اُردو پڑھنے والوں کیلئے ہیملٹ ایک نادر تحفہ ہے۔ قیمت عہ محصولڈاک ۵/

مسز کرٹ ھلے

مصورِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اس کہانی میں حُسن وعشق کے دلچسپ واقعات دل رُبا انداز میں بیان کئے ہیں۔ کرٹھلے ایک اُجڈ مولوی تھا اور اُس کی بیوی حُسن ومحبّت کی جان تھی۔ مگر کیسی غیر تمند بیوی تھی! اور کیسی اطاعت شعار! کہانی اس قدر دلکش اور واقعات اس قدر پُر لطف ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے دل نہیں مانتا۔ قیمت عہ محصولڈاک ۵/

ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی دو تصویریں

ہندوستان سنے ٹون کے پہلے دو فلم

(۱)۔ "کون کسی کا"

دُکھی دلوں کی داستان سیلولائڈ کی زبان سے

ڈائرکشن ــــ لوہار میوزک ــــ رفیق غزنوی

مکالمہ ــــ وجاہت مرزا

(۲)۔ "مرد"

ساقی کے مشہور قلمی معاون سعادت حسن منٹو کا غیر فانی افسانہ؛

ڈائرکشن ــــ گنجال میوزک ــــ رفیق غزنوی

مکالمہ ــــ خلیل

بنانے والے:۔

ہندوستان سنے ٹون پریل ٹینک روڈ۔ بمبئی

اتاترک
(از محمد مرزا دہلوی)
ترکی کے نجات دہندہ اور بیسویں صدی کے حیرت انگیز آہنی انسان غازی مصطفےٰ کمال اتاترک کی ایک ایسی سوانح حیات مرتب کی گئی ہے جسے معلومات اور اس جلیل القدر ہستی کی سیرت کا لاجواب انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بجا ہے
یہ کتاب اتاترک مخالف اور موافق حضرات کی لکھی ہوئی پچاسیوں کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی گئی ہے جمہوریہ ترکی کی تاسیس و دستوری حکومت کا انتخاب۔ ملاؤں اور درویشوں کی قدامت پرستی اور شورش۔ اتاترک کے انقلابی ہنگامے۔ آئندہ ترکی کی پوزیشن۔ سیاست میں کیا ہوگی۔ اتاترک کی شخصیت کیا معنی رکھتی ہے۔ اس کے ذاتی خصائل نے ترکی کی تشکیل و تعمیر میں کیا کیا مدد دی۔ اور اس قسم کے دیگر سوالات کا جواب آپ کو مصطفےٰ کمال کی کسی سطحی سوانح عمری میں نہیں ملے گا۔ "اتاترک" اس کا صحیح عکس آپ کے سامنے پیش کرے گی۔ تین سو صفحات کی ضخامت ہے۔ اردو میں تاریخ و سیر کا یہ "ریسرچ ورک" کی حیثیت رکھتی ہے کتاب کا ڈیزائن اردو میں بے مثال مانا گیا ہے
دیگر تصاویر اور نایاب نقشے اردو میں اس تصنیف کو مدت العمر یادگار بنائے رہیں گے۔
ان خصوصیات ادبی اور طباعتی خوبصورتیوں کے باوجود قیمت صرف دو روپے (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔
لالہ رخ جدید مصور ایڈیشن
سنہ ۱۹۳۹ء کا ادبی کارنامہ
انگلستان کے مشہور شاعر طامس مور کی مثنوی جو خالص مشرقی تصورات اور نازک تخیلات عشق پر مبنی ہے تین ہزار گنی دے کر لانگ مین کمپنی نے اسے شائع کیا تھا اور تمام انگریزی داں طبقہ اس کو دیکھ کر چونک پڑا تھا۔ افسانے کا پلاٹ رومان اور طلسم کی ایسی دنیا میں آپ کو پہنچا دے گا کہ آپ خود اس قصہ کا ایک کردار بننا پسند کریں گے "مقنع نقاب پوش پیغمبر" "آتش پرستاران فارس" "پری اور بہشت" اور "نور محل" چار قصے ہیں۔
ترجمہ ملک کے نامور ادیب ل۔ احمد اکبر آبادی نے کیا ہے۔ کتب خانہ علم و ادب۔ اس کو مصور چھاپنے کے لئے تقریباً تین درجن آرٹ کی بہترین تصاویر کا اہتمام کیا ہے جو اس کے ایک نایاب ولایتی ایڈیشن سے خاص طور پر زر کثیر خرچ کر کے حاصل کی گئی ہیں۔ اردو میں ایسی بے مثل کتاب نہیں چھپی۔ بہترین کاغذ۔ بے پناہ ادب و رومان دل نشین تصاویر اور دیدہ زیب آرائش کے ساتھ اس نادر ادبی کارنامہ کو شائع کیا گیا ہے۔
مانگ کی کثرت کے باعث آرڈر جلد دیجئے نہ معلوم دوسرا ایڈیشن چھپنے کی کب نوبت آئے۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔
کتب خانہ علم و ادب۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء کی معرکتہ الآرا مطبوعات

دُنیا کی کہانی — از پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) اس مختصر سی کتاب میں دنیا کی ہزاروں برس کی تاریخ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ پڑھنے والا بادشاہ کی لڑائیوں اور تاریخوں کے گورکھ دھندے میں پڑے بغیر وہ سب سمجھ جاتا ہے جو تاریخ کا اصل مفہوم ہے۔ قیمت دو روپے (عا)

گئودان — مصنفہ منشی پریم چند۔ یہ دیہات کے ان پڑھ اور سادہ لوح انسانوں کی زندگی کا مرقع ہے۔ ایک غریب دیہاتی خاندان اور اس کی سماجی زندگی کا نقشہ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ برائیوں سے نفرت اور خوبیوں سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ۶۵۰ صفحات۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (عا؍)

ہندستانی — وقت کے اہم ترین مسئلہ پر ڈاکٹر تارا چند، مولوی عبدالحق، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت برج نرائن دتاتریہ اور مسٹر آصف علی بیرسٹر نے حل پیش کیا ہے۔ قیمت اردو ایڈیشن بارہ آنے مجلد۔ ہندی ایڈیشن بارہ آنے مجلد۔

بنی اسرائیل کا چاند — مصنفہ وائڈر ہیگرڈ عبدالمجید حیرت۔ قیمت مجلد دو روپے (عا)

مختار دلہن — از محمد مرزا دہلوی۔ یہ ایک تربیت یافتہ گھرانے کا قصہ ہے جو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے قیمت آٹھ آنے (۸؍)

دغا کا پتلا — مارس کیبلانک کے ایک مشہور ناول کا ترجمہ منشی تیرتھ رام فیروزپوری کے قلم سے آرسین لوپن کے کارناموں کی حیرت انگیز داستان۔ قیمت دو روپے (عا)

پیام اقبال — شاعر مشرق علامہ اقبال کے ہنگامہ خیز اور حیات افروز کلام پر ایک اچھی کتاب۔ قیمت مجلد دو روپے (عا)

افکار سلیم — مجموعہ کلام سید وحید الدین سلیم مرحوم پانی پتی۔ انکی شاعری میں وہی روانی زود بیانی اور شیرینی پائی جاتی ہے جو ایک اعلیٰ قابلیت کا انسان اقبال کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ قیمت تین روپے (سے)

صحرانورد کے خطوط — وادیٔ نیل کے ساحرہ جمیل کا مہیب رومان سرزمین ہاروت وماروت کی ہیبت ناک داستان۔ مظلوم سرفروش کا انقلاب انگیز افسانہ وطن پرستی۔ اور پھر غلام ملکوں کی آزادی کے راستے میں تحیر خیز قربانیاں۔ قیمت مجلد عا۔

مضامین محمد علی — مرتبہ پروفیسر سرور صاحب مولانا محمد علی کی سیاسی مذہبی ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلاویز مرقع جس میں انکی شخصیت وطن وملت کے مسائل۔ سیاسی تحریکات کی شکل میں پیش کیگئی ہے۔ یہ مولانا کی خود نوشت سوانح عمری ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔ (عا؍)

نغمۂ حرم — پنجاب کے مایۂ ناز شاعر حضرت اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا حسین وجمیل مجموعہ۔ قیمت مجلد عہ؍

تصویر احساس — ہندوستان کے مشہور انقلابی ورومانی شاعر الطاف مشہدی کا مجموعہ کلام۔ قیمت مجلد عا۔

حاجی لق لق کے افسانے — حاجی لق لق بحیثیت ایک ممتاز مزاحیہ نگار کے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس مجموعہ میں آپ کے بہترین مزاحیہ افسانے درج ہیں۔ آپ انہیں پڑھ کر ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔ قیمت مجلد ۱۲؍۔ حاجی صاحب کی دوسری کتابیں۔ درانتی عہ۔ فرشتوں کا امتحان ۸؍

حرف وحکایت — شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے

ہلال وصلیب — حضرت ایم اسلم کی معرکتہ الآرا کتاب قیمت مجلد دو روپے (عا)

شب غم — یہ بھی میاں ایم اسلم کا تازہ ترین دلچسپ ناول ہے۔ جو اس مہینے شائع ہوا ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے (عہ؍)

شعلے — فطرت انسانی کے اسرار ورموز آشکار کرنے والے ریاکاری کی خس وخاشاک جلانے والے "افسانے" وہ کتاب جسے ادیب وشاعر چھُپ چھُپکر پڑھتے ہیں زبانی کو ستے ہیں اور دل سے لگا کر رکھتے ہیں۔ احمد علی ایم۔اے (مصنف ضبط شدہ کتاب انگارے) مجلد ایک روپیہ۔

ترکی جمہوریہ — میں ترکی کی مختلف ترقیات کا حال نہایت دلپذیر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ترکی انقلاب سے پہلے کیا تھا انقلاب کے بعد ترکوں کے ذہن میں کیا انقلاب پیدا ہوا۔ ترکی کے متعلق مستند اور تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب بیحد مفید ہے از سید ضمیر احمد ہاشمی۔ قیمت مجلد دو روپے (عا)

طلسم خیال — افسانوں کا مجموعہ۔ ان کے افسانے ہماری زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن میں حیات انسانی کا گہرا مطالعہ ہے، موجودہ معاشرت پر طنز کے تیز نشتر بھی ہیں اور واقعیت کے ساتھ محبت ورومانیت کی خوشبو بھی! ۔ از کرشن چندر ایم۔اے۔ مجلد عہ؍

نقش دوام — جدید نظم گوئی کے ارتقا اور فلسفیانہ جذباتی رنگ سخن سے لطف اندوز ہونے کے لئے نقش دوام کا مطالعہ کریں از سید عبدالحمید عدم۔ مجلد ومطلا دو روپے (عا)

شہنشاہ حبشہ — دنیا کی سٹیج پر ابھی ابھی ایک نہایت دلدوز، لرزہ خیز اور دہشتناک ڈرامہ تمثیل ہوا ہے جس کا ہولناک نتیجہ دنیا کبھی نہیں بھول سکتی۔ از اختر اورینوی۔ ایم۔اے۔ قیمت پانچ آنے۔

عورتوں کے افسانے — ہندوستان کی عورتوں کے دکھ درد کو سمجھنے اور ان کے دکھے ہوئے دلوں کی آوازیں سننے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ کوثر چاندپوری۔ قیمت عہ؍

چاند کا گناہ — اس مجموعہ میں دنیا بھر کے نقادان ادب کے بہترین تسلیم شدہ افسانے جو اردو میں اب تک منتقل نہیں ہوئے تھے راجہ مہدی علیخاں مجلد مطلا (عا)

لینن

یقیناً یہ مزدوروں کا رہنما اُنیسویں صدی میں سب سے بڑا اِنسان تھا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے روس کی کایا پلٹ دی۔ کون ہے جو اِس لوہے کے انسان، اس مزدوروں کے پیغمبر، اس بہادر سپاہی کے سوانح حیات کو دلچسپی سے پڑھنا گوارا نہیں کرے گا۔ مصنفہ ڈی۔ ایس۔ مرسکی۔ مترجمہ ڈاکٹر محمد اشرف۔ قیمت مجلد ایک روپیہ

تین پیسے کی چھوکری (اور دیگر افسانے)

افسانہ نگاری کے شائق اور افسانوں میں حقیقی روح دیکھنے والوں کے لئے ان افسانوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قاضی عبدالغفار خاں (مصنف لیلےٰ کے خطوط) مجلد ڈیڑھ روپیہ (عہ)

دُنیا کی حُور (اور دیگر افسانے)

یہ کتاب خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اِس کا پلاٹ بالکل ہماری معاشرت اور تمدن کے مطابق ہے طبیعت خودبخود الفاظ کا اثر قبول کرتی ہے۔ از کوثر چاندپوری۔ قیمت مجلد ایک روپیہ (عہ)

بہادرشاہ اور پھول والوں کی سیر

اب سے سو برس پہلے جب لال قلعہ آباد تھا خاندان مغلیہ کی آخری شمع جھلا رہی تھی تو دلّی کی سوسائٹی کیسی تھی اور دلّی والوں کے رسم و رواج کیا تھے؟ بادشاہ سلامت شہزادوں اور شہزادیوں کا لائحہ عمل کیا تھا؟ امراء کے مشاغل کیا تھے؟ غربا کس طرح اپنا وقت گذارتے تھے؟ اس قسم کے ہزاروں سوال دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ان سب کا جواب آپ کو اس کتاب میں مل جائے گا۔ لال قلعہ کی چہل پہل، چوک کی گھما گھمی۔ برسات کی تمثیلی رات میں پھول والوں کی سیر جس میں راعی اور رعایا، ہندو اور مسلمان سب برابر کا حصہ لیتے تھے۔ بیگموں کی چھیڑ چھاڑ شرفائے دہلی کی تہذیب و معاشرت وغیرہ۔ از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی قیمت ۶/

نغمۂ نور

حضرت بہزاد لکھنوی کا مجموعۂ کلام "نغمۂ نور" کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ نغمۂ نور میں کیف انگیز غزلیں دلفریب نظمیں اور وجد پرور گیت شامل ہیں۔ یہ مجموعہ قوس و قزح کی طرح ستاروں کی روشنی کی پُرسکون اور قلبِ انسان کی طرح زندگی سے معمور ہے۔ ضخامت دو سو صفحات، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت نفیس، مضبوط جلد، رنگین گردپوش اور ان سب خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

دلّی کا سنبھالا

از خواجہ محمد شفیع دہلوی۔ مرحوم دہلی کے عروج کے آخری ایام کی مرقع نگاری۔ اندازِ بیان ایسا مؤثر ہے کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ماہ درخشاں

از بیگم مرزا احمد علی۔ یہ ایک معاشرتی ناول ہے جو تمام لوازم کے لحاظ سے پوری طرح کامیاب ہے پلاٹ میں اتنی رنگینی رکھی ہے اور عشق و محبت کی ایسی چاشنی دی ہے کہ بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ قیمت مجلد دو روپے (عما)

ریڈیو ڈرامے

مسٹر فضل حق قریشی دہلوی کی اُن ڈراموں کا مجموعہ جو ریڈیو پر نشر ہو چکے ہیں۔ مع مقدمہ پروفیسر رشید احمد صدیقی قیمت ایک روپیہ (عہ)

اندھی دُنیا (اور دُوسرے افسانے)

از اختر انصاری دہلوی۔ یہ جدید طرز کی ۲۳ کہانیوں کا مجموعہ ہے ان کہانیوں میں جذبات کی ترجمانی، جزئیات نگاری، تحلیل نفس، شعریت زبان و بیان کی لطافت اور افسانے کی تمام دوسری خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ یہ ہمارے سماجی، معاشرتی اور معاشی نظام کے بصیرت افروز اور عبرت انگیز مرقعے ہیں جن کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے لازمی ہے جو سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کا مذاق رکھتا ہو۔ عہ۔

باغی

اگر آپ کانگریس، مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء، لیڈر، مولوی، اڈیٹر، سیاست، وطنیت، اِنسانیت، مذہب اور اس قسم کے دیگر غیر معمولی موضوعات پر بے لاگ تنقید اور بیباک اظہارِ خیال چاہتے ہیں تو اس مجموعہ کو ضرور پڑھیئے۔ یہ موجودہ سیاست کا وہ آئینہ ہے جس میں آپ کو تمام حقیقتیں بے نقاب نظر آئیں گی۔ مجلد حسین ٹائٹیل رنگین دسٹ کور۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔

سچی کہانیاں

صحابی مردوں، صحابی عورتوں، اور بچوں کے زہد و تقویٰ، فقر و عبادت، علمی مشاغل، ایثار و ہمدردی، بے مثل جرأت و بہادری، حیرت انگیز جاں نثاری وغیرہ۔ قیمت بارہ آنے

محبت اور نفرت

مسٹر اختر حسین رائپوری کے پر درد سو افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ۔

کیفستان

حضرت قیسی رامپوری کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

خاموش حسن (اور دیگر افسانے)

ٹیگور کے افسانوں کا اردو ترجمہ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ

حیات اقبال

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کے حالات زندگی قیمت مجلد ایک روپیہ (عہ)

تاریخ راجگان ہند

اس میں جملہ ہندو اقوام وملل خصوصاً قوم راجپوت اور اُس کی مختلف شاخوں کا مفصل و مستند بیان از ابتدا تا انتہا موجود ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں ان غیر قوموں کی سچی تصویریں نظر آتی ہیں جو بیرونجات سے آئیں۔ اصلی باشندگان ہند کو مغلوب کر کے اقطاع ملک پر قابض ہوئیں اور ہندوستان میں رہکر "ہندو" کہلانے لگیں۔ ان قوموں کے بعد مسلمانوں کا آنا۔ ان کے اقبال و زوال کے حالات۔ پھر ان کے بعد انگریزی حکومت کا قائم ہونا وغیرہ وغیرہ تا زمانہ حال بیان کیا گیا ہے۔ رزم۔ بزم۔ جدال و قتال۔ روایات و رسوم۔ حالات تاریخی و جغرافیائی وغیرہ۔ قیمت چھ روپے (ے)

مضامین رشید

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت مجلد دو روپے

عالمگیر غازی

اس میں حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے مکمل حالات زندگی اور غیر مسلم معترضین کے تمام اعتراضات کے مفصل و مدلل جوابات درج کئے گئے ہیں۔ قیمت آٹھ آنے۔

صمدانی

حضرت ناکارہ حیدرآبادی کے مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ۔

اردو میں سیاست پر معرکتہ الآرا کتابیں

میری کہانی از پنڈت جواہر لال نہرو قیمت مجلد ہر دو حصہ چار روپے

انقلاب افغانستان از محمد حسین خاں بی ای علیگ - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

زوال غازی امان اللہ خان از عزیز ہندی - قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنہ

یورپ کی تہذیب کا دیوالہ از محب ہند مسٹر ایس - ای شٹوکس قیمت ۱ر

قومی تلوار از لالہ کشن چندر زیبا قیمت بارہ آنے

راجا پرجا از ٹالسٹائی - قیمت بارہ آنے -

پیغام آزادی از لوکمانیہ تلک قیمت عہ ۱۲ آر

تعمیر نو از مسٹر عبداللہ بیگ ایم - اے - قیمت مجلد عہ

وفاق ہند از علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری ایم - اے بار ایٹ لا - قیمت ایک روپیہ

مسولینی مسولینی ڈکٹیٹر اٹلی کی خود نوشت سرگذشت - قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنہ

یورپ کی حکومتیں از علامہ ڈاکٹر نجم الدین جعفری ایم - اے بار ایٹ لا قیمت ایک روپیہ -

ہندوستان کی پولیٹیکل اکاڈمی از نلنہ بالی - ایم - اے - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (۱۸ر)

آزادی ہند از چودھری افضل حق قیمت ۶ر

تلاش حق از مہاتما گاندھی قیمت مجلد ہر دو حصہ ۳ر

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش از خالدہ ادیب - قیمت مجلد ۶ر -

شہید میکسونی آئرلینڈ کے مشہور محب وطن میکسونی کی سوانح عمری - قیمت مجلد بارہ آنے - (۱۲ار)

انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ از منظر دہلوی قیمت مجلد آٹھ آنے (۸ر)

مضامین محمد علی مرتبہ پروفیسر سرور قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے -

روسی افسانے ہماری رگوں میں جوش بھرنے والے افسانے مصنفہ سعادت حسن منٹو قیمت ایک روپیہ (عہ)

آتش پارے آگ کی چنگاریاں دہکتے ہوئے انگارے - قیمت ایک روپیہ (عہ)

سوویٹ روس پنڈت جواہر لال نہرو کا سیاحت نامہ روس - قیمت ایک روپیہ - (عہ)

جمہوریت روس یعنی سوویٹ روس کے نظام کا راز منظہر علی اظہر - قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

انقلاب فرانس باری علیگ کے اپنے طرز بیان میں - قیمت بارہ آنے (۱۲ار)

انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ شیخ حسام الدین بی - اے - قیمت عہ

انقلابی شرارے پرنسپل چھبیل داس قیمت بارہ آنے (۱۲ار)

صحیفہ چین چین کی قدیم و جدید تاریخ پر نہایت محققانہ نظر ڈالی گئی ہے قیمت مجلد عہ

معاہدہ عمرانی از ژان ژاک روسو - یہ کتاب معنوی حیثیت سے فلسفہ سیاست کی اہم کتاب ہے - قیمت مجلد ۶ر -

آزادی یہ جان اسٹوارٹ مل کی کتاب "لبرٹی" کا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ ہے جو سیاسیات کے درس کا ایک اہم جزو ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے -

نہرو رپورٹ اس رپورٹ میں سیاسیات ہند اور ہندوستانیوں کے مطالبات کا بڑی وضاحت سے تذکرہ کیا گیا ہے - مکمل - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

کمپنی کی حکومت عہد کمپنی کے صد سالہ دور کی داستان مجلد - قیمت - ۱ہر

لینن مزدوروں کے پیغمبر روس کی کایا پلٹ دینے والی شخصیت کی سوانح حیات مجلد عہ

میری جدوجہد ہر ہٹلر ڈکٹیٹر جرمنی کی خود نوشت سوانح بہترین ترجمہ مجلد ۶ر

شہنشاہ جلشہ اطالیہ و جلشہ کی خونچکانیوں کی داستان الم ڈرامہ کی صورت میں قیمت پانچ آنہ (۵ر)

شعلے غلامی کی خس و خاشاک جلانے والے افسانے دوسرا ایڈیشن مجلد ایک روپیہ (عہ)

ترکی جمہوریہ ترکی کے متعلق مارچ ۱۹۳۹ء تک کے مکمل حالات مع سوانح اتاترک مجلد - قیمت دو روپے (۲ر)

قوم کی آواز مہاتما گاندھی کی زبان سے سوراج کی تشریح - قیمت ایک روپیہ (عہ)

مزدوروں کا پیغمبر کارل مارکس کی سوانح قیمت چار آنہ (۴ر)

سوشلزم مصنفہ پرنسپل چھبیل داس آٹھ آنہ

نپولین بوناپارٹ ناممکن کو ممکن بنانے والے سبق آموز کارنامے و حالات زندگی قیمت دس آنہ (۱۰ر)

ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں؟ اعداد و شمار کے ذریعہ مادر وطن کی منہ بولی تصویر - قیمت چار آنے (۴ر)

آئینہ ہندوستان ریبل انڈیا کا اردو ترجمہ قیمت ایک روپیہ (عہ)

چنگاریاں پرنسپل چھبیل داس قیمت بارہ آنے

گیری بالڈی مصنفہ لالہ لاجپت رائے قیمت بارہ آنے

تواریخ کانگرس مکمل تاریخ گیارہ سو سے زائد صفحات مجلد ۶ر

مشہور مُصنّفین کی دلچسپ کتابیں

مولوی عبدالحلیم شرر

- جویائے حق کامل — ے
- فتح اندلس — ۸ عہ ر
- ماہ ملک — ۸ عہ ر
- یوسف و نجمہ — ۴ عہ ر
- قیس و لبنےٰ — عہ
- طاہرہ — عہ
- دربار حرام پور کامل — ۸ ر
- ایام عرب کامل — ع۶
- فلپانا — ۴ عہ ر
- حسن کا ڈاکو — ۴ عہ ر
- شوقین ملکہ — ۴ عہ ر
- زوال بغداد — ۴ عہ ر
- ملک العزیز ورجنا قسم اول — عہ
- فلورا فلورنڈا قسم اول مجلد — عہ
- دلکش کامل — ۱۲ ر
- دلچسپ کامل — ۸ ر
- منصور موہنا — ۸ ر
- حُسن انجلینا — ۸ ر
- فردوس بریں — ۶ ر
- شہید وفا — ۸ ر
- مفتوح وفاتح — ۴ عہ ر
- شاہکار شرر — ۱۲ ر
- مشرقی حوریں — ۸ ر

- زاد راہ — عہ
- گنودان — ۸ ع۶ ر
- بیوہ — عہ
- میدان عمل — ۸ ع۶ ر

منشی پریم چند

- پردہ مجاز کامل — ۸ ع۶ ر
- نبن کامل — ۴ ع۶ ر
- آخری تحفہ — ۴ عہ ر
- فردوس خیال — عہ
- خواب و خیال — ۸ عہ ر
- واردات — عہ
- دودھ کی قیمت — عہ

منشی تیرتھ رام فیروزپوری

- آتشی کتا — ۴ عہ ر
- سنہری بچھو — ۸ عہ ر
- انمول ہیرا — عہ
- دغا کا پتلا — ع۶
- خونی چکر — ۸ ع۶ ر
- انصاف — ۴ عہ ر
- قاتل ہار — ۸ ع۶ ر
- وطن پرست — ے
- لعل مقدس — ۸ ع۶ ر
- تلاش اکسیر — ۸ ع۶ ر
- کارنامجات آرسین لوپن — ع۶
- مقدس جوتہ — ع۶
- ڈاکٹر نکولا — ۸ عہ ر
- نازک کٹار — ۸ ع۶ ر
- ستم ہوش ربا — ے
- کرنی کا پھل — ۸ ع۶ ر
- زہری بان — ع۶
- چڑیا کی تی — ع۶
- پہلا ہیرا — ع۶

مرزا عظیم بیگ چغتائی

- خانم — للعہ
- کولتار — ع۶
- روح ظرافت — ۸ عہ ر
- چمکی — ۱۲ ع۶ ر
- کمزوری — ۸ ع۶ ر
- تفویض — ۵ ر
- خطوط کی ستم ظریفی — ۸ ر

- کھرپا بہادر — ۱۲ عہ ر
- دیکھا جائے گا — عہ
- چینی کی انگوٹھی — ۸ ر
- چغتائی کے افسانے حصہ اول — ۸ عہ ر
- 〃 〃 〃 دوم — ۸ عہ ر
- شہزوری — ۸ ر
- مسنر کڑ ملے — عہ
- قرآن اور پردہ — ۸ عہ ر
- رقص و سرود — ۴ ر
- مزا جنگی — ۱۲ ر و ۸ ر
- ملفوظات حامی — ۱۲ ر

شوکت تھانوی

- موج تبسم — ع۶
- سیلاب تبسم — ع۶
- دنیائے تبسم — ۴ عہ ر
- سودیشی ریل — عہ
- دل پھینک — عہ
- بڑبھس — عہ
- خانم خاں — عہ
- سوتیا چاہ — عہ
- گہرستان — ۸ عہ ر

ایم۔ اسلم

- مرزاجی حصہ اول — ۴ ع۶ ر
- مرزاجی 〃 دوم — ۴ ع۶ ر
- کارزار حیات — ۴ ع۶ ر
- پیغام سرفروش — ۱۲ ع۶ ر
- نرگس — ع۶
- سلر ہستی — ۸ عہ ر
- گناہ کی راتیں — ۴ عہ ر
- بقائے دوام — عہ
- طلسم سامری — ۸ عہ ر
- مضامین اسلم — ۸ عہ ر

- ثمرۂ گناہ — عہ
- آشوب زمانہ — عہ
- چار سہیلیاں — عہ
- غزال — ۱۰ ر
- خط تقدیر — ۶ ر
- شیطان کا چرخہ — ۴ ر
- چور اور گرہ کٹ — ۳ ر
- انتقام — ۳ ر
- ارمغان عرب — ۴ ر
- حکایات عرب — ۴ ر
- امانت — ۳ ر
- ہجرت — ۳ ر
- کبڑا شہزادہ — ۳ ر
- ہلال و صلیب — ع۶
- شب غم — ۴ عہ ر
- مہدی — ے

مولوی عنایت اللہ

- انطونی اور کلا بطرہ — عہ
- سلامبو — ے
- نجم السحر — ۸ ع۶ ر
- تائیس — ع۶
- ہیملٹ — عہ
- ہرد و یاس — ۱۲ ر
- ڈانٹے کا جہنم — ۱۲ ر
- خواب پریشاں — ۴ ر
- چنگیز خاں کے سوانح حیات — ۱۲ ر

جوش ملیح آبادی

- شعلہ و شبنم — ے
- حرف و حکایت — ۸ ع۶ ر
- جنون و حکمت — ۸ ع۶ ر
- نقش و نگار — ۴ ع۶ ر
- فکر و نشاط — ۴ عہ ر

- شاعر کی راتیں — ۱۰ ر
- پیغمبر اسلام — ۱۰ ر

حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی

- لال قلعہ کی ایک جھلک — عہ
- مضامین فراق — عہ
- چار چاند — ۸ ر
- دلہن کی پری — ۶ ر
- دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ — ۴ ر
- بیگموں کی چھیڑ چھاڑ — ۴ ر
- سات طلاقنوں کی کہانیاں — ۴ ر

فطرت نگار سدرشن

- چندن — ۸ عہ ر
- سولہ سنگار — ۸ عہ ر
- سدا بہار — ۱۲ ر
- زہریلا آب حیات — ۱۲ عہ ر
- پارس — ۱۴ ر
- محبت کا انتقام — ۸ عہ ر
- راج سنگھ — عہ
- قدرت کے کھیل — ۱۲ ر
- خوش انجام — ۴ ر

مولانا نیاز فتحپوری

- جمالستان — للعہ
- نگارستان — ع۶
- ترغیبات جنسی — ے
- مکتوبات نیاز — ۸ ع۶ ر
- گہوارۂ تمدن — ع۶
- شہاب کی سرگذشت — عہ
- جذبات بھاشا ۱۲ ر سوال و
- مجموعۂ استفسار و جواب ہر حصہ للعہ
- مقالات نماز — ۸ ر
- چند گھنٹے علمائے قدم کے ساتھ — عہ

قابل مصنفوں کے تاریخی جاسوسی اور عشقیہ ناول

ایران کی حسینہ ۱۲؍
انقلاب سمرنا ۶؍
اسیر محبت ۱۰؍
انقلاب مصر ۱۲؍
باغی سپاہی ۱۰؍
جلاد بہرام عہ
بہرام کی رہائی عہ
قتل بہرام ۹؍
بہادر عرب حصہ اول ۱۲؍
؍؍ ؍؍ دوم عہ
بیگناہ حسینہ ۱۲؍
بہادر ڈاکو ۸؍
پہلی صلیبی جنگ حصہ اول ۱۲؍
؍؍ ؍؍ دوم عہ
پراسرار تصویر ۱۲؍
پراسرار انسان ۱۲؍
ترکی شمشیر ۱۲؍
ترکی فرشتے ۱۲؍
جانباز حسینہ ۱۲؍
جنگ بلقان عہ
جاپانی شہزادہ ۱۲؍
جوش جوانی ۱۰؍
حسین شکاری ۱۰؍
خونی شمشیر ۱۲؍
خوفناک ڈاکو ۵؍
دغاباز بیوی ۱۰؍
شہزادی عباسیہ اول ۱۲؍
؍؍ حصہ دوم عہ
؍؍ ؍؍ سوم عہ
شگفتلا ۱۲؍
طلسمی شیشہ ۱۴؍
طلسمی پنجہ عہ
طلسمی ہار ۷؍
صلیبی جہاد اول ۱۲؍
؍؍ حصہ دوم عہ

عرب کا چاند ۱۲؍
محمود و وزرا ۱۲؍
محمد قاسم ۱۲؍
مشرق کی حور ۱۲؍
خونی دلہن ۱۲؍
بیگناہ قیدی اول ۸؍
؍؍ ؍؍ حصہ دوم ۸؍
فتح سمرنا ۶؍
ہندوستانی غنڈہ عہ
خون کا بدلہ خون عہ
مہذب ڈاکو ۵؍
بہادر دلہن عہ
حور عرب عہ
ترکی اسیر حصہ اول ۱۲؍
؍؍ حصہ دوم عہ
مصر کا چاند حصہ اول ۱۲؍
؍؍ ؍؍ حصہ دوم عہ
سنگ دل ملکہ عہ
چار انقلابی ۸؍
حجاج بن یوسف عہ
پُراسرار دوشیزہ ۸؍
معاشقہ نپولین ۶؍
سادھنا کے تار عہ
اپاسنا کے تار عہ
راج سنگھ عہ
کرنی بھرنی ۸؍
افریقہ کے دو چاند عہ
افغانوں کی تلوار عہ
خانہ خراب عشق ۵؍
خفیہ جلسہ ۱۴؍
ایکٹ میں چار واردات ۶؍
عجیب تہ خانہ ۱۴؍
جنگ روس ۵؍
سنہری ٹولہ ۸؍
جنگ ہسپانیہ ۱۲؍

پھڑکتی آنکھ ۱۴؍
عاشق کا دل ۱۴؍
پھانسی کا تختہ ۵؍
فریبی جال ۹؍
عبدالرحمٰن ناصر عہ
نازنین مراکش ۸؍
انقلاب فرانس ۱۲؍
بیوی کا قاتل ۱۲؍
افسانہ پیرمزاد ۵؍
فرانس کی حسینہ ۱۲؍
شیر کابل عہ
ڈاکوؤں کا گرو گھنٹال ۸؍
طلسمی تاج ۱۴؍
بہادر حور حصہ اول ۸؍
؍؍ حصہ دوم ۱۴؍
؍؍ حصہ سوم ۱۴؍
بہادر دوشیزہ عہ
ترکی شہزادہ حصہ اول ۸؍
؍؍ حصہ دوم ۱۴؍
اندلس کے دو چاند اول ۸؍
؍؍ حصہ دوم ۱۲؍
؍؍ حصہ سوم ۱۲؍
؍؍ حصہ چہارم ۱۳؍
انطاکیہ کی حور حصہ اول ۸؍
؍؍ حصہ دوم عہ
عیاش شہنشاہ حصہ اول ۸؍
؍؍ حصہ دوم عہ
حلب کے دو چاند حصہ اول ۸؍
؍؍ حصہ دوم عہ
جنگ انطاکیہ حصہ اول ۸؍
؍؍ حصہ دوم عہ
عربی دوشیزہ حصہ اول ۱۲؍
؍؍ حصہ دوم عہ
؍؍ حصہ سوم عہ
سمرنا کے دو چاند اول ۱۴؍

سمرنا کے دو چاند حصہ دوم عہ
بہادر سلطان حصہ اول ۸؍
؍؍ حصہ دوم عہ
محبوبۂ نمرود حصہ اول ۸؍
؍؍ حصہ دوم عہ
شہزادی فلپانہ عہ
بصرہ کا چاند عہ
صبح ترکی عہ
عروس کابل عہ
محبوبۂ کربلا عہ
بحری طوفان عہ
خون ملت عہ
تاج عصمت عہ
شریف قاتل ۱۲؍
طلسمی تلوار ۱۰؍
چتوڑ کی دوشیزہ کامل ۱۰؍
پیاری ۱۴؍
خفیہ پولیس ۱۰؍
شمشاد ۱۴؍
چیلا عہ
محبت کا قیدی عہ
گہرا راز عہ
دنگے سیار ۱۲؍
ترکی شہزادہ ۶؍
معشوقۂ پنجاب ۱۴؍
افسانۂ بابل ۱۲؍
حسینہ کا انتقام ۱۴؍
امیرزادی خادمہ ۸؍
قلوپطرہ حصہ اول ۸؍
؍؍ حصہ دوم ۱۲؍
نور جہاں ۸؍
ماہ درخشاں ؏
جھانسی کی رانی عہ
کابل کی دوشیزہ حصہ اول عہ
؍؍ حصہ دوم عہ

سراج الدولہ ؏
کرنل کی بیٹی عہ
نیل کا سانپ عہ
گورا ؏
شارل عبدالرحمٰن ؏
حسن سرور ہر سہ حصہ کامل ؏
انقلاب عثمانی عہ
حجاج بن یوسف عہ
انقلاب سیاسی ؏
انقلاب کابل عہ
پیراہن آتشیں عہ
خونی شہزادہ ؏
خونی بھید عہ
خونی مصور ؏
خونی عاشق ؎
فاتح یورپ عہ
امراؤ جان ادا عہ
ماتا عہ
آنند مٹھ عہ
مقدس نازنین عہ
شمیم للعہ
انور ؏
شاہد رعنا ؏
خمار عیش ۱۲؍
سزائے عیش ۱۲؍
سعادت ۸؍
سراب عیش ۱۰؍
انجام عیش ۱۱؍
سعید ۸؍
ثروت دلہن عہ
بہار عیش ۸؍
عذرا کی واپسی ؏
باغ و بہار ۸؍
چندرا موہنی عہ
معاشقۂ نپولین عہ

لیڈی ڈاکٹر علیمہ ۱۰؍
داستان ؏
عروس کربلا عہ
یاسمین شام عہ
تیغ کمال عہ
محبوبۂ خداوند ۱۲؍
منازل السائرہ ؏
حیات صالحہ عہ
فانوس خیال ۸؍
دختر فرعون حصہ اول ؏
؍؍ حصہ دوم ؏
فاؤسٹ عہ
فسانۂ محبت ؏
ابن الوقت عہ
آسیب الفت ۱۰؍
تائید غیبی ۸؍
توبۃ النصوح ۱۰؍
جعلی کروڑپتی ۱۰؍
خوش نصیب کالا آدمی ۸؍
شاہی بھگتنی ۸؍
شاہی ڈاکو عہ
شاہی چور ۳؍
شاہی بھکاری عہ
فسانۂ مبتلا عہ
نواب کھرپا بہادر عہ
خطوط کی ستم ظریفی ۸؍
عشق کی گولیاں ۱۴؍
گم نام عورت کا خط ۱۴؍
تماشا پہ تماشا ۱۴؍
مرآۃ العروس ۸؍
بنات النعش ۸؍
افریقہ کے دو چاند عہ
دل پھینک عہ
سوتیا چاہ عہ
خانم خاں عہ

علامہ راشد الخیری کی نئی کتابیں

قرآنی قصے — اُن نبیوں اور پیغمبروں کے حالات جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ علامہ مغفور کے مخصوص و مؤثر پیرایہ میں عہ ۱

گدڑی میں لعل — عورتوں کی سگھڑ ہنرمند کفایت شعار اور منتظم بنانے کے لئے خانہ داری کے متعلق دلنشین پیرایہ میں بے بہا مشورے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ ۴ر)

نالۂ زار — عورتوں کی مظلومیت کا مرقع۔ اُن کے مصائب و آلام کی درد انگیز داستانیں وہ مضامین غیرفانی درجہ رکھتے ہیں۔ ۱۲ار

عروسِ مشرق — مغربی تہذیب کے زہر آلود اثر سے مشرقی خواتین کو محفوظ رکھنے کے لئے علامہ مغفور کے معرکۃ الآرا مضامین قیمت ۱۰ار

بزمِ رفتگان — اردو نثر کے بے مثل مرثیے جو ملک و قوم کی چند مایۂ ناز خواتین اور باکمال ادیبوں اور شاعروں کی یاد میں لکھے گئے۔ باتصویر۔ قیمت دس آنے (۱۰ار)

سیاحتِ ہند — ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبوں کی تعلیم یافتہ خواتین و حضرات کا تذکرہ مختلف صوبوں کے معاشرتی حالات خود علامہ مرحوم کے متعلق معلومات بھی ہیں۔ قیمت عہ

گردابِ حیات — عورتوں کی اصلاح و حمایت میں ۲۵ چھوٹے چھوٹے سبق آموز مؤثر افسانوں کا دلاویز مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

دادا لال بھبکڑ — اور چار نہایت ہی پرلطف مزاحیہ لیکن نتیجہ خیز قصے نانی عشو اور دلابی ہمی کے ساتھ کی کتاب۔ قیمت ۸ر

بےفکری کا آخری دن — اور دوسرے مضامین۔ لڑکیوں کیلئے جنہیں پڑھ کر وہ کنوار پنے کی قدر کرینگی اور اپنے فرائض سمجھنے لگیں گی۔ قیمت چار آنہ (۴ر)

احکامِ نسواں — عورتوں کے متعلق قرآن مجید کے احکام اور اُن کی تفسیر عام فہم صاف ستھری زبان میں۔ قیمت عہ

دُعائیں — حضرت علامہ مغفور کی آخری تصنیف۔ سوز و گداز اور درد و اثر میں ڈوبی ہوئی اردو زبان میں نظم و نثر کی دعائیں۔ ۸ر

دلی کی آخری بہار — نصف صدی پہلے کی تہذیب تعلقات وضعداری اور محبت کی پر درد کہانیاں اور بربادیٔ دلی کے جگر خراش افسانے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

محسنِ حقیقی — سرورِ کائنات صلعم کی مقدس زندگی کے چند متفرق واقعات اور مجالس میلاد کے متعلق اصلاحی مضامین۔ قیمت ۶ر

چمنستانِ مغرب — خانہ داری، تاریخ، معاشرت، ادب وغیرہ پر خواتین کے مطلب کے چند بہترین انگریزی مضامین کے عام فہم ترجمے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

مسلی ہوئی پتیاں — دلی کی ٹکسالی زبان میں چند خطوط جن کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کی طرح کلیجہ کے پار ہو جاتا ہے۔ ۸ر

داستانِ پارینہ — چند تاریخی مضامین (باتصویر) جن میں افسانہ سے زیادہ دلچسپی اور دلاویزی ہے۔ قیمت ۱۲ار

بلبلِ بیمار — لڑکیوں کی تربیت تعلیم اور پردہ پر طبقۂ نسواں کے سب سے بڑے نباض نے تہائی صدی تک غور و فکر کر کے جو نسخے تجویز فرمائے تھے ان کا مجموعہ۔ قیمت دس آنے (۱۰ار)

حور اور انسان — عصمت و تمدن میں اب سے ۲۵ سال پہلے جو معرکۃ الآرا افسانے شائع ہوئے تھے ان میں سے آٹھ افسانے۔ قیمت بارہ آنے (۱۲ار)

بساطِ حیات — حیاتِ انسانی کے متعلق جانوروں کا مشاہدہ۔ چار سبق آموز نہایت مؤثر افسانے۔ قیمت چھ آنے۔

نشیب و فراز — آٹھ عورتوں نے اپنی اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ یا مشاہدہ بیان کیا ہے۔ قیمت چار آنے (۴ر)

یادگارِ تمدن — تمدن حقوقِ نسواں کی حمایت میں پہلا اور آخری پرچہ تھا اسکے متعلق مضامین ہیں طرزِ بیان بےانتہا دلاویز ۶ر

مسلمان عورت کے حقوق ۱۲ار زیور اسلام عہ۔ خدائی راج عہ۔ ساجن ہونی شہزادی کا انتخاب ۱ر

جوانوں کے لئے نوجوان لٹریچر

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
دوشیزہ کی ڈائری	۶	طلوعِ شباب	عہ
عورت	۶	بہارِ عروس	عہ ۴ر
شبِ عروسی	عہ	شاہی کوک شاستر	عہ ۸ر
شبِ زفاف	عہ	لذت النکاح	عہ ۴ر
برتھ کنٹرول	عہ	بیوہ دوشیزہ	۱۲ار
شبِ عروسی کے افسانے	عہ	دولہا دلہن	عہ ۴ر
شب نامچۂ عروسی	عہ	عیش و نشاط	عہ ۴ر
شادی کی ۱۰ راتیں	عہ	مرد و عورت	عہ
دلہن کی ڈائری	عہ ۴ر	رنگینیٔ جوانی	۸ر
دلہن کانفرنس	عہ	شہزادی شبِ نور	عہ
بہارِ شباب	عہ	سیاہ کاریاں	عہ
کیفِ مواصلت	عہ	گناہ کی راتیں	عہ
لذتِ شباب	عہ	شرمناک افسانے	عہ
محبت کے پیغام	۸ر	بازاری دوشیزہ	۸ر
تاج العروس	۱۲ار	شباب کی آٹھ بہاریں	۸ر
ایرانی کوک شاستر	عہ	دوشیزہ	۸ر

بچوں کیلئے مذہبی، اخلاقی، دلچسپ کہانیوں کی کتابیں

نصیحت کا کرن پھول	۸ر	بچوں کا قاعدہ	۴ر	الاسلام	۴ر	مزیدار کہانیاں	۵ر
چند پند	۸ر	بچوں کی کتاب	۴ر	الآخرت	۶ر	مختصر دنیا	۵ر
منتخب الحکایات	۸ر	تاریخ ہند کی کہانیاں	۸ر	ہمارے نبی	۱۳ر	شہزادی نیلوفر	۱۲ر
عثمان کا خواب	۲ر	دھوئیں کی پھانسی	۸ر	آخری نبی	۲ر	بچوں کی دنیا	۷ر
طرابلس کی شہزادی	۲ر	کائنات	۴ر	قرآن پاک کیا ہے	۶ر	سات طلاقنوں کی کہانیاں	۴ر
فتح قسطنطنیہ	۲ر	دنیا کے بسنے والے	۵ر	آنحضرت	۴ر	دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ	۴ر
محمدی بوا	۴ر	دنیا کے بچے	۵ر	ہمارے رسول	۷ر	زنانہ لبستہ	عہ
اتاترک	۲ر	تعلیمی کھیل	۳ر	سرکار دو عالم	۸ر	بچوں کی کہانیاں	۸ر
ارطغرل	۲ر	بچوں کی نظمیں	۴ر	سرکار کا دربار	۶ر	قیدی شیر	۴ر
دکھیارہ شہزادہ	۲ر	بچوں کے اسمٰعیل	۵ر	خلفائے اربعہ	۸ر	بازیچہ	۴ر
لعل شہزادہ	۲ر	بچوں کا چڑیا گھر	۴ر	چار یار	۶ر	غنچۂ نعمت	۴ر
ٹھوری تارا ملکھے چاند	۲ر	ننھی مرغابی	۲ر	دس جنتی	۵ر	بچوں کی تعلیم و تربیت	۱۲ر
صبر بادشاہ زادہ	۲ر	بچوں کی کہانیاں	۲ر	عقائد اسلام	۱۰ر	گدھے کی سرگذشت	۶ر
شہزادہ نے نواز	۲ر	لال مرغی	۲ر	ارکان اسلام	۲ر	آویزہ گوش	۸ر
بچوں کے گیت	۲ر	جنگو کی بلی	۲ر	ہمارا دین	۲ر	دامن مریم	۸ر
بچوں کا تحفہ حصہ اول	۵ر	مرغی اجمیر چلی	۲ر	چالیس حدیثیں	۲ر	پر پرواز	۵ر
بچوں کا تحفہ ؍؍ دوم	۵ر	تابیل خاں	۲ر	اچھی باتیں	۱۳ر	آسمانی دولہا	۱۲ر
حکایات عرب	۳ر	یوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی	۲ر	نبیوں کے قصے	۵ر	جانورستان	۱۰ر
ملا دو پیازہ	۴ر	چھوٹا چھو	۲ر	اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں	۱۰ر	مرزا جنگی	۶ر
خط تقدیر	۶ر	نیت کا پھل	۲ر	حضرت زرتشت	۴ر	الہامی افسانے	۶
ارمغان عرب	۴ر	شید لا	۳ر	حکیم کنفیوشس	۵ر	چار سہیلیاں	عہ
مرزا پھویا	۲ر	چھدو	۳ر	وزیر منصور	۲ر	عروس ادب	عہ
آسمانی خزانہ	۲ر	انعامی مقابلہ	۳ر	محبت کا پھول	۴ر	دنیا کی حور	عہ
جادو کا برج	۲ر	بے کاری	۳ر	حضرت مسیح	۵ر	احکام اسلام کی پابندی	۴ر
ملک نم نم	۴ر	شہزادی گلنار	۴ر	الاعمال	۵ر	شجاعت نبوی	۴ر
حکایات ہشت بہشت	۶ر	عقاب	۴ر	خلیفہ عبدالرحمٰن	۲ر	اولیاء اللہ	۴ر
ساربان	۵ر	ترکوں کی کہانیاں	۴ر	شیخ ادریس	۲ر	تقدیر و تدبیر	۴ر
امانت	۳ر	دیانت	۲ر	الرسالت	۵ر	نعت خیرالوریٰ	۴ر
چور اور گرہ کٹ	۳ر	شریر لڑکا	۳ر	علمی کہانیاں	عہ	محبت کا پھول	۴ر
سپیرا شہزادہ	۳ر	قوم پرست طالب علم	۳ر	علمی پہیلیاں	۸ر	بچوں کی تندرستی	۶ر
انتقام	۳ر	بچوں کا انصاف	۳ر	راجہ رائے موہن رائے	۵ر	شیخ چلی کا پکوان	۱ر
شہزادہ عبدالرحمٰن	۲ر	اسکول کی زندگی	۳ر	گدگدیاں	۴ر	بلی حج کو چلی	۳ر
تدبیر کی سرزمین	۲ر	محنت	۳ر	یادرفتگان	۴ر	مکی چوہا	۳ر
شیطان کا چرخہ	۴ر	التوحید	۵ر	جاپانی کہانیاں	عہ	لومڑی مینا	۳ر

کتب خانہ علم و ادب اردو بازار جامع مسجد دہلی

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
فی پرچہ ۶؍

جُرعات

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت بھیجا جاتا ہے

جلد ۲۰ — ساقی دہلی۔ بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۹ء — نمبر ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

جناب سید ابو القاسم سرور جن کا تحقیقی مضمون "سوجھ بوجھ کے ڈھائی انچھر" ساقی میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے، اپنے گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"........ پہلی قسط میں کئی جگہ راج کو چھپائی نے "ربع" اور "اور جھور" کو "اور جھوڑ" بنا دیا۔ کل ایک صاحب یہاں مکتبہ سے اکتوبر کا ساقی لاکے پوچھنے لگے یہ بے ربط عبارت کیسی؟ دیکھا تو صفحہ کی اخیری پانچ سطریں سر پی۔ سی رائے سائنٹسٹ کے بیان کی پروفیسر الشوری پرشاد کے اقتباس میں نجانے کس طرح شامل ہو کر چھپ گئیں۔ ازراہِ کرم اس غلطی کی تصحیح کا اعلان کر دیا جائے تو مناسب ہے۔"

تصحیح کا اعلان تو کر دیا گیا لیکن مسودہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ مضمون صاف کرنے والے نے اسی طرح لکھا ہے جس طرح ساقی میں شائع ہوا ہے۔ راج کو ربع اور جھور کو جھوڑ بنا دینا کاتب کا ادنیٰ کرشمہ ہے لیکن مسودہ دیکھنے پر میں نے بھی پہلے ان الفاظ کو ربع اور جھوڑ ہی پڑھا۔ کیونکہ 'ا' اور 'ج' کو اگر ملا کر لکھا جائے گا تو 'ع' ہی پڑھا جائے گا۔ اور (ر) اور (ط) میں اگر لکھنے والا احتیاط نہ کرے تو امتیاز مشکل ہے۔ اس قسم کی غلطیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ مضمون نگار حضرات ہمیں بھیجنے سے پہلے خود ذرا سی تکلیف اٹھا کر مسودے پر نظرِ ثانی کر لیا کریں — ساقی میں تصحیح کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اگر مسودات صاف اور واضح ہوں تو اس قسم کی غلطیوں کا احتمال نہ رہے۔

دسمبر ۳۹ء کے ساتھ ساقی اپنی زندگی کے دس سال پورے کریگا۔ اس دسویں سالگرہ کے موقع پر سالنامہ نسبتاً زیادہ اہتمام سے شائع ہوگا۔ مضامین کیلئے ہماری کوششیں چھ ماہ سے جاری ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ ہماری کوششیں بڑی حد تک کامیاب ہو چکی ہیں۔ سالنامے کے متعلق مفصّل اعلان آپ آئندہ اشاعت میں دیکھیں گے۔

اُردو افسانہ نگاری کی ترقی میں ساقی کا خاص حصہ ہے۔ چند احباب کے ارشاد کے مطابق میں نے ساقی کے دس سال کی بیس جلدوں میں سے پچاس افسانے چھانٹے ہیں۔ یہ پچاس صاحب طرز فسانہ نگار حضرات کے (میری رائے میں) بہترین افسانے ہیں۔ اس مجموعے کا نام "ریزۂ مینا" تجویز کیا گیا ہے۔ ساقی کی دسویں سالگرہ کے موقع پر ناظرینِ ساقی کے لئے اس سے بہتر تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا مفصّل اعلان اسی پرچے میں کسی اور صفحے پر دیکھئے۔

برادرم صادق الخیری کو علامہ راشد الخیری مرحوم کے اُن خطوط کی ضرورت ہے جو علامہ مرحوم نے اپنی پچاس سالہ ادبی زندگی میں اپنے جاننے والوں کو لکھے تھے۔ اگر کسی صاحب کے پاس ایسے خطوط ہوں تو ازراہِ عنایت یا تو اصل خطوط صادق صاحب کو رسالہ عصمت دہلی کے پتہ سے بھیجدیں یا اُن خطوں کی نقلیں روانہ فرمادیں۔

اُردو میں بفضلہ بہت اچھی اچھی کتابیں ہر علم و فن پر موجود ہیں اور اُن میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اُن کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے جو بغرض تبصرہ رسائل کو موصول ہوتی ہیں۔ ساقی میں کوشش کی جاتی ہے کہ جہانتک ممکن ہو مطبوعاتِ موصولہ پر تبصرہ کیا جائے، لیکن بعض حضرات ایسی کتابیں بھی بھیجدیتے ہیں جنہیں اخلاقی حیثیت سے بہت پست کہا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ایسی کتابوں پر ساقی میں اظہارِ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر ہوگا اگر ناشرین پہلے اس پر غور فرمالیں کہ کس رسالہ کو کیسی کتاب بھیجی جائے۔

شاہد

(بسلسلۂ گذشتہ)

سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی انچھر

جیسے کبھی یورپ کلیسا کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی بنا ہوا تھا اور کلیسا کی دھاندلی، ڈانٹ ڈپٹ، مار دھاڑ نے بڑوں بڑوں کے چھکّے چھڑا دئے تھے۔ پر سُوجھ بُوجھ کے وہ دیوتا جن سے سوچ بچار کا سنسار آج تک جگمگا رہا ہے اُن کے نام کسی کے مٹائے نہ مٹ سکے۔ اپنی ہٹ دھرمی اور دھاندلی سے کلیسا نے اُنہیں کیسے کیسے دُکھ دئے، کیسا کیسا نیچا دکھانا چاہا پر وہ کسی جتن سے بھی نیچے نہ ہو سکے، اُونچے ہی رہے اور کلیسا کا بڑھتا ہوا ہاتھ سوکھ ساکھ کے رہ گیا۔

ایسے ہی یہاں کے دھرم کی کنجیاں برہمنوں نے اپنی مُٹھی میں دبا رکھی تھیں اور آئے دن من مانی باتیں منوایا کرتے تھے۔ پر یہ کب تک؟ ہوتے ہوتے بناوٹی دھرم کا بھرم کھُلا اور لوگوں کو یہ دکھائی دینے لگا۔ برہمن جہاں ہیں وہ جگہ اُن کی آپ بنائی ہوئی ہے۔ دھرم کسی بات میں نہ برہمن کی پچ کرتا ہے اور نہ شودر کو للکارتا ہے۔ وہ کسی کو نیچا اُونچا، چھوٹا بڑا نہیں بتاتا۔ وہ اچھائی سکھاتا اور بُرائی سے بچاتا ہے اور اسی سکھائی ہوئی اچھائی کو برت لیتا ہے اور اس جانچ پرتال میں وہ برہمن اور شودر کسی کی بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ یہی دیکھتا ہے کس نے اُس کی بتائی ہوئی اچھائی اور سمجھائی ہوئی بھلائی کو جی میں جگہ دے کر اُسے کتنا آگے بڑھایا اور پھیلایا۔ برہمن پاپی ہے تو دھرم اُسے آگ میں جھونک دیگا اور شودر اس کے کہے پر چل رہا ہے تو اُسے گلے سے لگا لے گا۔

کوئی دھرم بُری ڈگر پر نہیں چلاتا، اچھائی ہی سکھاتا ہے اس اٹکل سے میں نے یہ لکھ دیا۔ پر ٹھیک ٹھیک نہیں جانتا ہندو دھرم نے اُس کے جانچنے کے لئے کونسی کسوٹی بنائی ہے۔ ہاں اسلام کی باتیں بھروسے سے کہی جا سکتی ہیں۔ اُس نے تو پہلے ہی دن جتلا دیا تھا۔ چھُٹائی بڑائی کچھ نہیں۔ تم سب میں سے سچا اور اچھا وہی ہے جو بھلائیوں کا سنگم ہو۔ وہ آنے والا دن جس میں پل پل کی پوچھ گچھ کی جائے گی۔ اس کے لئے بتایا۔ ناتے اور اپنایت کے پورے بندھن اُس دن توڑ ڈالے جائیں گے۔ یہ نہیں پوچھا جائیگا۔ تم کس کے بیٹے، کس کے پوتے، کس کے بھائی اور کونسی گھرانے کے سپوت ہو۔ یہی پوچھا جائے گا۔ تم نے کیا کیا؟ سانس لینے کی گھڑیاں کیسے کاٹیں؟ اچھائی اور بُرائی میں سے کِسے جی کی نگری میں بسایا! اور اب یہاں کسے ساتھ لائے ہو؟

بنگالی بولی پر مسلمانوں کی دَیا

یہ تو بات میں سے بات نکل آئی۔ اچھا اسے چھوڑئیے اور مسلمانوں نے بنگالی بھاشا کو آگے بڑھانے میں جو کیا اُسے مسٹر دنیش چندر سین سے سُنیئے۔

"بنگالی کو ادبی معیار تک پہونچنے کیلئے بلاشُبہ اسلامی فتح کو بہت بلند درجہ حاصل ہے۔ اگر ہندو راجہ آزاد رہتے تو بنگالی کو راجاؤں کے دربار تک پہونچنا بہت مشکل تھا۔ پٹھانوں نے تیرھویں صدی کی ابتدا میں بنگال پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ بہت دُور سے یعنی بلخ، آکسس اور اس سے بھی آگے کے ملکوں سے آئے تھے۔ لیکن اُنہوں نے بنگال کے میدانوں کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور اپنے پہاڑی وطنوں کو واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پٹھان شہنشاہوں نے بنگالی سیکھی اور ہندوؤں کی اس کثیر آبادی کے ساتھ رہنے لگے جن پر وہ حکومت کرتے تھے۔ ان کی مسجدوں کے مینار و گنبد آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ اور ہندوؤں کے مندروں کے دوش بدوش قائم تھے۔ جب نو وارد شام کی نماز کے لئے ایک جگہ جمع ہوتے تھے تو مندروں سے سنکھ اور گھنٹے کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ ہندوؤں کے شاندار جلوس اور مذہبی رسمیں دُرگا پوجا وغیرہ اتنا ہی جوش و خروش کا اظہار کرتی تھیں، جیسا مسلمانوں کے محرم، عید، شب برات اور دوسرے تہواروں سے ظاہر ہوتا تھا۔ ان شہنشاہوں نے سنسکرت کی رزمیہ کتابوں کی شہرت سُنی، اور وہ فطرتاً مہابھارت اور رامائن کو جاننے کے خواہشمند اس لئے ہوئے کہ اُن کا ہندوؤں کی خانگی اور مذہبی زندگی پر گہرا اثر ہے۔ پٹھان شہنشاہوں اور سرداروں کو ہندو راجاؤں کا سا صبر نہیں تھا کہ مذہبی جوش کی وجہ سے برہمن عالموں کی سنسکرت کو سُنتے، ان کی علمی تفسیریں سمجھتے اور برسوں میں رامائن اور مہابھارت

کا دَورہ ختم کرتے۔ پٹھانوں نے ایسے عالموں کو مقرر کیا جو سنسکرت سے ان کتابوں کا ترجمہ اس بنگالی میں کریں جسے وہ بولتے تھے اور سمجھتے تھے۔ مہابھارت کا پہلا بنگالی ترجمہ نصیر شاہ کے حکم سے ۱۳۲۵ء میں ہوا۔ دوسرا ترجمہ پراگل خاں صوبہ دار چاٹگاؤں کے حکم سے کوندر پرمیشور نے کیا۔ نصیر شاہ بنگالی زبان کا اتنا حامی تھا کہ شاعر ودیاپتی نے اپنے قصیدے اسکے نام سے معنون کئے ہیں اور سلطان غیاث الدین کا بھی نہایت عظمت و احترام سے نام لیتا ہے"

بنگالی کو بڑھانے اور پھیلانے کے لئے مسلمانوں نے جو کیا اُسے لکھا جائے تو بڑی سے بڑی لکھت بن جائے۔ حسین شاہ، چھوٹے خاں، ماگن ٹھاکر مسلمان۔ امیر سلیمان یہ وہ لوگ تھے جن کے کہنے سے سنسکرت اور ہندی کی بہت سی لکھتیں بنگالی میں آگئیں اور مسلمانوں کا دھیان اِدھر دیکھکر بڑے بڑے برہمن اور پنڈت بھی ادھر ایسے ڈھلے جو بنگالی میں لکھت پڑھت کرنے لگے۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی یہاں کے راجاؤں نے بھی اس بولی کی پیٹھ ٹھوکی اور اسے برتنے لگے۔ تو مسلمانوں ہی کی دیکھ بھال سے بنگالی بھاشا کے دلدر پار ہوئے اور مسلمانوں ہی نے اسے راج رجایا۔

جب بنگالی بولی کی ٹیم ٹام جو کبھی ہوئی وہ مسلمانوں ہی کے سہارے سے تو پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا جو عربی، فارسی کو چھوڑ چھاڑ کے بنگالی آگے بڑھ جاتی اور ان دونوں کو سینے سے نہ لگاتی۔ فارسی، عربی بولوں کی بہتات بنگالی میں دیکھنا ہو تو ان بولوں کو دیکھنے اور جانچنے پرتا لنے بیٹھئے گا تو ایسے سینکڑوں، ہزاروں بول بنگالی میں سے نکلتے چلے آئیں گے۔

بنگالی میں فارسی بولوں کی بہتات

بنگالی	فارسی	بنگالی	فارسی	بنگالی	فارسی
جنور	جانور	مرگ	مُرغ	ددل	دل
ادا	ادرک	بدام	بادام	پیانج	پیاز
جوب	جو	گوم	گندم	شاکھ	شاخ
روج	روز	ہوپتا	ہفتہ	شوہور	شہر
کاباب	کباب	موشوک	مشک	ریشوم	ریشم
برشتی	بارش	شوبج	سبز	چاکور	چاکر
دوروان	دربان	دوکندار	دکاندار	موجور	مزدور
کاری گور	کاری گر	اسمانی نیل	آسمانی رنگ	داگ	داغ
شال گوم	شلغم	چراگ	چراغ	موگوج	مغز
کورما، کلیا	قورمہ، قلیہ	سیائی	سیاہی	ش	ء

یہ نہ سمجھئے گا بنگالی میں فارسی ہی فارسی ہے اور عربی کا کہیں پتا تک نہیں۔ عربی بولوں کی فارسی سے بھی بڑھ کر ریل پیل ہے۔ اس کے بھی کچھ بول دیکھ لیجئے:۔

بنگالی میں عربی بولوں کی بھرمار

بنگالی	عربی	بنگالی	عربی	بنگالی	عربی
شرو	شروع	تاریکھ	تاریخ	موشجد	مسجد
موکتب، مودرشا	مکتب، مدرسہ	کوام	قلم	کمینج	قمیص
شورائی	صراحی	نال بوند	نعل بند	مولوم	مرہم
اجہار	اظہار	انتجار	انتظار	انتجام	انتظام

بنگالی	عربی	بنگالی	عربی	بنگالی	عربی
انتکال[1]	انتقال	ہجور	حضور	دماگ	دماغ
گلام	غُلام	جامن	ضامن	جرور	غرور
گسل	غُسل	ہجم	ہضم	نجیر	نظیر
مشگول	مشغول	اجّت	عزّت	تاٗلک	تعلّق
توکو	توقع	خجر	خضر	جد	ضد
جبت	ضبط	کلب	قلب	کوائد	قواعد
کسور	قصور	کتل	قتل	نکل	نقل
ناکس	ناقص	نکسان	نقصان	مجبوت	مضبوط
گلت	غلط	گجل	غزل	گیب	غیب
اکیل	وکیل	موکھل	مخمل		

شاہجہاں کا راج۔

شاہجہاں کا جب راج آیا تو اس کی پوری راجدھانی کی چھوٹی بڑی جگھوں کے گنے چُنے چوٹی کے لوگ راج کی سبھا میں آئے دن رہنے کے لئے بُلائے گئے۔ دلّی میں جگہ جگہ کے لوگوں کا جمگھٹا رہنے لگا اور بھانت بھانت کا بکھیڑا اپنی اپنی بولیاں بولنے لگا۔ یہ ریل پیل یونہی بڑھتی رہی۔ جس میں سے ایک کی بول چال دوسرے کی بات چیت سے الگ ہوتی۔ ایک سے دوسرے کا ڈھنگ نرالا اور انوکھا ہوتا۔ جب آپس میں بات چیت چھڑتی تو دوچار بول اپنی بولی کے اور گنتی کے کچھ بگڑے بگڑائے بول دوسرے کی بولی کے سمجھانے کے لئے بولنا پڑتے۔ آئے دن کے ملنے جُلنے، ہنسنے بولنے، سبھاؤں، میلوں میں اکھٹے ہونے پر الگ الگ بولیاں بولنے والوں میں وہ وہ باتیں ہوتیں جن کا انوکھا پن آج بھی دھیان کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ رات دن یونہی آتے جاتے رہے اور عربی، فارسی، ترکی کا ملاپ ہندی سے بڑھتا رہا۔ پہلے پہل اسکی بھنک راج کے کان میں پڑی اور راج کے راج دلارے ہی اسے لے اُڑے۔ پھر کیا تھا اس نئی بولی کی لے آگے بڑھنے لگی۔ شاہجہاں نے اسے ہونہار سمجھ کے جگہ جگہ ہاٹوں میں ایسے لوگوں کو رکھا جو اپنے اپنے ہاٹ میں دن بھر کی بکری اور لین دین میں بیچنے والوں اور لینے والوں سے جو نئے بول سنیں انہیں جوں کا توں اپنے یہاں لکھ لیں۔ اسی لکھنے لکھانے کے لئے ہاٹوں میں جو لوگ رہا کرتے تھے انہیں "دلّال" کہا جاتا تھا۔

پردیس کی باتیں۔

گھر کی باتوں کا کیا ہے یہ تو ہوتی ہی رہیں گی۔ گھڑی بھر کے لئے انہیں چھوڑ کے دیس کے باہر کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجیے۔ یہاں کے مسلمانوں کیلئے تو کہا جا سکتا ہے، کہ آئے دن کے ساتھ رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے سے ہندوؤں کی بولیاں نہ سیکھتے تو کیا کرتے۔ پر باہر کے سنسکرت جاننے والے ان مسلمانوں کیلئے کیا کہا جائے گا جو نہ جانے کہاں کہاں سے ٹھوکریں کھاتے سنسکرت کی لَو لگاتے یہاں آتے اور پھر اُلٹے پاؤں لوٹ جاتے تھے۔

خلیفہ منصور۔

عباسیوں کے گھرانے میں سے خلیفہ منصور کو یہاں کے کسی پنڈت کا سنسکرت کی ایک لکھت سدھانتا لیجا کر دینا اور حکیم محمد بن ابراہیم فزاری کا منصور کے تیور پہچان کر سدھانتا کو عربی میں لے آنا۔ ہارون الرشید کا دھرم پرچار کے لئے اپنے

---

[1] انتکال پر ایک چٹکلا سُننے کا ہے۔ اپریل ۳۹ء کے "ہماری زبان" میں مولوی عبدالحق صاحب یہ لکھتے ہیں:۔

"میں اندور میں تھا۔ انہی دنوں ایک قابل مقرر اور سنسکرت کے فاضل وہاں تشریف لائے تھے۔ ایک عام جلسے میں لکچر ہوا جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ دنیا کی تمام زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں۔ چنانچہ یہ بھی فرمایا کہ عربی بھی سنسکرت سے نکلی ہے اور اس کی تائید میں انہوں نے کئی مثالیں پیش کیں۔ ان میں سے ایک یاد رہ گئی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ عربی کا لفظ "انتقال" دراصل سنسکرت کا لفظ "انت کال" ہے۔ جہالت بھی بڑی لعنت ہے۔ عربی سے ناواقف تھے۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ انتقال کا مادہ نقل ہے جو باب افتعال میں آکر انتقال ہو گیا ہے اور انت کال لفظِ مرکب ہے۔ "انت" کے معنی آخری اور "کال" کے معنی وقت کے ہیں۔"

یہاں کے بڑے چوٹی کے لوگوں کو ہندوستان بھیجا۔ یہ باتیں بتاتی ہیں۔ سنسکرت پر مسلمان ایسے چھا گئے تھے جو دھڑلے سے اپنی بولی کی سی بات چیت اور لکھت پڑھت سنسکرت جیسی کٹھن بھاشا میں کر سکتے تھے۔ طبقات الاطبا، کتاب الفہرست، کتاب الہند اُٹھا کے دیکھئے تو پتا چلے۔ مسلمانوں میں سنسکرت اور ہندی کتنی پھیل چکی تھی اور ان بولیوں کی چاہت ان کے دھیانوں میں کیسی گھر کر گئی تھی۔

ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی ۔ یہ ۴۰۸ھ میں یہاں آیا اور اس دیس کا کونا کونا چھانتا اور چپا چپا ڈھونڈتا، برہمنوں کی سیوا کرتا، پردیس کی ٹھوکریں کھاتا، سنسکرت سیکھتا پھرا۔ اس بولی کے سیکھنے اور ہندوؤں کی پُستکیں ڈھونڈنے اور پڑھنے میں اُسے بڑی کھکیڑیں اُٹھانا پڑیں۔ نیا دیس، نئے لوگ، جن کا اُٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، کھانا پینا، بول چال، بات چیت، پوجا پاٹ، تیج تہوار، ریت ویت، اس کیلئے سب کی سب نئی۔ پر یہ ایسا بات کا پورا اور دُھن کا پکّا تھا جو کوئی رکاوٹ اُسے پیچھے نہ ہٹا سکی اور یہ دندناتا ہوا آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ جس لئے اپنا دیس چھوڑ کر پردیس آیا تھا اُسے ایسا پورا کیا جس کا بڑوں بڑوں نے لوہا مانا۔

محمود غزنوی اور اُس کے بیٹے سلطان مسعود کے راج کا ٹھاٹ بھی اُس کی آنکھوں نے دیکھا۔ سلطان مسعود کے راج میں اُس کی بہت آؤ بھگت ہوئی اور قانون مسعودی لکھ چکنے پر اسی راج سے ایک ہاتھی چاندی بھی ملی۔ اُس کی بہت سی لکھتوں میں سے گنتی کی یہ لکھتیں جو بچ بچا گئیں جیسے آثار الباقیہ، قانون مسعودی، تفہیم، کتاب الہند انہیں چھوڑ کر کچھ کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں اور کچھ ایسی مٹیں جن کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔

یہاں رہ کر اُس نے سنسکرت کو تو مٹھی میں لے لیا۔ ہندوؤں سے جان پہچان، میل جول بڑھانے اور سوجھ بوجھ کی نئی ڈگر انہیں دکھانے کے لئے باتوں باتوں میں کئی عربی لکھتیں سنسکرت میں لکھ لکھا کے ڈال دیں۔ ایسے ہی سنسکرت کی اُلجھی ہوئی بہت سی کٹھن باتوں پر بھی بہت کچھ لکھ لکھا ڈالا۔ ہندوؤں کے رہنے سہنے، ملنے جلنے، ان کے دھرم اور اُن کی اور اور باتوں کو بہت پھیلا کے لکھا اور جو کچھ لکھا وہ ایسا نپا تُلا جس میں کہیں یونہی سا بھی کوئی ال بل نہیں۔

فلسفے اور دھرم میں اس کا دھیان بے روک ٹوک آگے بڑھتا ہے۔ دوسرے کے دھرم میں مین میکھ نکال کے اُسے بُرا ٹھیرانا، اپنی بات کی پچ کر کے دوسرے کو جھٹلانا یہ اسے نہیں آتا۔ سچائی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ سچ کہنے سے یہ کبھی نہیں چوکتا۔ ہندو دھرم کی پگڈنڈی سی کسی ہندو کو الگ ہوتے دیکھ کر اُسے وہیں ٹوکتا اور للکارتا ہے۔ پھر جہاں اُن کی اچھائیاں دکھانے پر آتا ہے تو کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی نہیں چھوٹنے پاتی اور ہندوؤں کی اچھی باتوں کو ایسا سراہتا اور پھیلاتا چلا جاتا ہے جس سے بڑھ کر کوئی ہندو بھی نہیں پھیلا سکتا۔ یہاں کے برہمنوں نے اس کے آگے بڑھنے میں جو روڑے اٹکائے اور دکھ پہنچائے کوئی دوسرا ہوتا تو جی کی بھڑاس نکالنے کے لئے برس پڑتا۔ پر اُس نے کہیں بھولے سے بھی نہ منہ سے کچھ کہا اور نہ ان کیلئے اپنی کسی لکھت میں بگڑ کر کچھ لکھا۔

ایسے رکھ رکھاؤ اور سوجھ بوجھ کے بھاری بھرکم لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کی کسی پُستک میں پھسپھسا پن اور بھول چوک دیکھنے پر بھی پوری چھان بین کرنے تک اس کے لکھنے والے پر جھٹ سے کوئی چھدا نہیں دھرتا اور اُلاہنا نہیں دیتا۔ کسی پر منہ آنا، چوٹ کرنا، پھبتیاں کہنا انہیں لڑاکو اور ان پڑھ لوگوں کے ہتیار سمجھ کر ہاتھ تک نہیں لگاتا اور اس بھول کو لکھت کی چوک مان کے اس کا پتہ چلاتا ہے۔ ہندو شاستروں، پورانوں کو سلجھا کے ایسے ڈھنگ سے اُس نے لکھا جو اس دوڑ میں کوئی اور اس کا ساتھی نہیں۔ اس کی کتاب الہند پر جرمنی پروفیسر سیکو کا یہ ریویو دیکھنے کا ہے:۔

• ہندوستان میں چینی سیاح فاہیان و سنگ یان اور ہیونگ شیانگ آئے۔ خاص کر ہیونگ شیانگ نے ہندوستان کی خوب سیر کی۔ البیرونی ان لوگوں سے بہت پیچھے آیا اور اپنے پیشرو سیاحوں سے سیاحی میں کم رہا۔ تاہم وہ لیاقت و اوصاف میں ان سب سے بازی لے گیا۔ البیرونی کے مقابلے میں وہ تصانیف جو یونانی اور چینی جاتریوں کی موجود ہیں۔ بچوں کی سی کتابیں اور غیر تعلیم یافتہ و نامعتبر لوگوں کی تصانیف معلوم ہوتی ہیں جو کہ اس عجیب ملک ہندوستان کو دیکھ کر حیرت زدہ اور حقیقت میں اس کی اصلیت کو بہت کم سمجھتے تھے۔ میگاستھنز کی کتاب انڈیکا جو کہ جزئی حالت میں پائی جاتی ہے البیرونی کی کتاب کے مقابلے کی ہرگز نہیں۔ لیکن ہیونگ شیانگ کی تصنیف سے بہتر و برتر ہے۔ ہمارے اس زمانے کی اصطلاح کے

مطابق یہ کتاب زمانۂ قدیم کی تحقیق کرنے والی کہی جا سکتی ہے۔

البیرونی نے صرف ملک اور اس کے باشندوں سے واقفیت حاصل نہیں کی۔ بلکہ اُن کی زبان اور علم کو خوب سیکھا اور اس لئے میگا ستھنز یا ہیونگ شیانگ کی بہ نسبت تحقیقات کے زیادہ وسائل میسر ہوئے وہ اپنے دیکھے سُنے اور پڑھے ہوئے واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اپنی طبیعت کے زور سے جو ریاضی، فلسفہ اور ارسطو، افلاطون، بطلمی اور جالینوس کے علوم سے مملو تھی مضمون کی تہ کو پہونچ جاتا ہے اور اس زمانے کے دستور کے موافق اس عمدگی سے اعتراض پیش کرتا ہے کہ زمانۂ حال کے علما بے اختیار تحسین و آفرین کرتے ہیں۔

وہ بالکل متعصب نہ تھا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے مضمون پر بڑے شوق سے محنت کی اور کبھی علم حاصل کرنے کے موقع پر محنت یا وقت صرف کرنے یا سچی بات کے معلوم کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ پکا مسلمان تھا۔ لیکن کافر، ہندو، فیلسوفوں کے ساتھ ہمدردی کرتا اور اُن کے مسائل کو پسند کرتا تھا۔ جب کبھی ہندوؤں کی جہالت کے زمانے کا ذکر آجاتا ہے تو مسلمانوں کی نخوت کم کرنے کیلئے وہ اکثر اُن کا مقابلہ قدیم زمانے کے جاہل عربوں سے کرتا ہے۔

مصنف کا انصاف اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ پڑھنے والا کتاب کے صفحے کے صفحے پڑھ جائے اور اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کا لکھنے والا کس مذہب کا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ راستی پسند ہے اور دروغ گوئی و افترا پردازی سے سخت متنفر ہے۔ اگر مسلمانوں کو اس عربی ادب کی بہترین کتاب پر فخر کرنے کا موقع ہے تو ہندوؤں کو بھی اپنی خوش قسمتی خیال کرنا چاہیئے کہ ایک سچے اور لائق آدمی نے انکے آباؤ اجداد کی صحیح تصویر کھینچی ہے۔

بعض اعزاض کی بنا پر شاید وہ کبیدہ خاطر ہوں لیکن وہ فوراً اقرار کرلیں گے کہ مصنف کا اصل مقصد تاریخی سچائی حاصل کرنے کا ہے اور وہ اس بات کا بھی ضرور اقرار کریں گے کہ مصنف نے ان کی تہذیب کی بھی حد سے زیادہ تعریف و توصیف کی ہے۔"

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا میں ہندوستان کے جوتشی اور بید گنکا کی باتیں لکھتے ہوئے اس کی ان لکھتوں میں سے ایک ایک کو گنوایا جو سنسکرت سے عربی میں آئیں۔ یہاں کا بڑا رشی اور بید چرک جو آج سے ساڑھے پانچ ہزار برس پہلے اپنے دھیان میں مگن رہتا تھا۔ اس کی ایک بڑی لکھت پہلے سنسکرت سے فارسی میں آئی اور پھر عبداللہ بن علی فارسی سے نکال کے اُسے عربی میں لے آیا۔ پہلے یہ ایک ڈگرسی بن گئی تھی جس پر چھوٹے بڑے آگے پیچھے چلے جاتے تھے۔ عربی، فارسی پڑھ پڑھا کے سنسکرت اور ہندی پر مسلمان جھک پڑتے اور تب تک نچلے نہ بیٹھتے جب تک ان بولیوں کو اپنے بس میں نہ کرلیتے۔ اسی دوڑ دھوپ نے مسلمانوں میں سنسکرت اور ہندی کے ان گنت ودوان (عالم) اور کبیشر (شاعر) بنا دئے۔

سنسکرت اور ہندی کے متوالے۔ ملا علی بن حسین الانصاری، ذوالفقار اردستانی، سید نظام الدین مدھنایک، عارف الدین، سید عبداللہ، بایزید انصاری، ملا محمد فاروقی، شیخ عنایت اللہ، شیخ ناصر علی، مبارک علی، میر سید قریش، یہ اور اور بہت سے اسی مندر کے پُجاری ہیں۔

محمد شاہ پیا۔ محمد شاہ رنگیلے نے تو سکھ چین کی وہ ہولی کھیلی جس کا اُور چھور ہی نہیں۔ راج کی سبھا گُنکریوں اور تانوں سے بڑی گونجتی تھی۔ اس راج میں راگوں راگنیوں کی بڑی ریل پیل رہی۔ جے پور کے راجا جے سنگھ نے اپنے ان داتا کا دھیان ادھر دیکھ کر برج بھاشا کو بہت آگے بڑھایا۔ ایک ایک دوہے پر دھن برستا دیکھ کے لوگوں نے ادھر ہی گھٹنے ٹیک دئے اور بھاکا ملی ہوئی اُردو کے گیت، ٹپے، راگ، راگنیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ یہ بات بھی بھولنے کی نہیں جو راجا جے سنگھ نے بیس لاکھ میں ایک جنتر منتر (رصدگاہ) بنوایا۔ یہاں کے مسلمانوں نے اسی راجا کے کہنے سے شرح چغمنی اور ایسی ہی اور کٹھن لکھتوں کو عربی سے لیکر ہندی کے سانچے میں ڈھالا۔ جاننے والے جانتے ہیں شرح چغمنی ایسی کڈھب لکھت ہے جو اُردو میں ابتک نہیں لائی جا سکی۔ وہ مسلمان کتنے بھاری بھرکم اور سوچ بچار کی کتنی اُنچائی پر ہوں گے جو ایسی اونچی اونچی لکھتوں کو ہندی کے پیچھے لے آئے۔ اسی بات کو آزاد نے سبحۃ المرجان میں یوں لکھا ہے:۔

قد نقل العلماء الاماثل بامر جے سنگھ شرح المجسطی وغیرہ من کتب الہیئۃ والہندسۃ من العربیۃ الی الہندیہ

جے سنگھ کے کہنے سے ہندوستان کے چوٹی کے پڑھے لکھے شرح مجسطی اور ایسی ہی اور لکھتوں کو جو ہیئت اور ہندسے میں تھیں عربی سے نکال کے ہندی میں لے آئے۔

اُردو کا پھیلاؤ

یہ دیکھ کر بڑا اچمبا ہوتا ہے۔ وہ بولی جو اونچیوں کی چھاؤنیوں سے نکل کر گھٹنیوں چل رہی تھی۔ ایکا ایکی اب وہی سپاٹے بھرنے لگی۔ کشمیر سے راس کماری اور کلکتے سے کراچی ہی تک اس کا دھاوا نہیں۔ پشاور، شیلانگ، کوئٹا، افغانستان میں بھی اس کی چھاؤنیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اور تو اور تبت تک بھی پہونچ گئی۔ عدن، مالدیپ، لنکا، انڈمان، سنگاپور، ہانگ کانگ، شانگھائی میں بھی اس کے گاہک بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ تیرتھ، جاترا کی چھوٹی بڑی جتنی بھی جگھیں ہیں ان میں سے کوئی جگہ بھی ایسی نہیں، جہاں دھرم والوں کے ساتھ ساتھ اُردو نہ پہونچی ہو۔ مکہ، مدینہ، کربلا، نجف، مشہد، بیت المقدس، بغداد یہ ہو آئی۔ مصر، شام، روم کا اُس نے چکر لگایا۔ انگلستان بھی آ جا رہی ہے۔ روس کو بھی جھانک آئی چین اور جاپان کو بھی چھان مارا۔

بہت سے دیس والے یہاں سے نکل کے جدھر منہ اُٹھا اُدھر چل دئے۔ باہر جا کر یہ ادھر اُدھر پھیلتے پھیلتے اپنے اپنے دھندوں کے لئے نجانے سنسار کے کس کس کونے تک جا پہونچے۔ امریکا، جرمن، فرانس، مباسہ، زنجبار، ٹرنسوال، کیپ کولونی، آسٹریا، افریقہ میں سے جہاں بھی ڈھونڈئے کوئی نہ کوئی اُردو بولنے والا مل ہی جائے گا اور جرمن کی اگلی گھمسان کی لڑائی تو دیس کے سورماؤں کو یورپ، افریقہ، عرب نجانے کہاں کہاں ساتھ لئے لئے پھری اور یہاں کے نچلے اونچیوں کے ساتھ اُردو کہاں کہاں کے سپاٹے بھرتی رہی۔

یہاں کی چھوٹی بڑی بولیوں میں سے اب کوئی بھی اُردو کی ٹکر کی نہیں۔ ان سب میں ایک یہی کا ایسا پھیلاؤ ہے جس سے یہ دیس بھاشا بن سکتی ہے۔ اُردو کی سی سکت، اُردو کا سا پھیلاؤ، اُردو کی سی لچک اور لوچ دیس کی کسی بولی کو چھو بھی نہیں گیا۔ یوں دھاندلی کی اور بات ہے جو اُردو کی اچھائیاں اور اسکی بڑھوتری کی باتوں سے منہ پھیر کے کسی ان گھڑ بولی کا پرچار کیا جائے۔

جیسے ایک پنچ دو جھگڑنے والوں میں سے اپنی اپنی جگہ ایک ایک کو دبا دبو کے جھگڑا چکا دیتا ہے کسی ملی جلی بولی کے بننے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ الگ الگ بولی والے ایک جگہ رہ سہ کر جب تک اپنی اپنی ہانکتے رہیں جسے دوسرا نہ سمجھ سکے تو یہ ایک جھگڑا ہوا۔ اس کا پنچ جو اس جھگڑے کو چکا دیتا ہے وہ، وہ چاہت اور وہ دھیان ہے جو ایک جگہ کے رہنے والوں کی الگ الگ بولیوں کو ملا جلا کے ایک کر دینا چاہتا ہے۔

الگ الگ بولیوں والوں پر اس پنچ کا دباؤ ایسا پڑتا ہے جس سے وہ آمنے سامنے رہ کر اپنی اپنی بولی میں کاٹ چھانٹ اور گھٹاؤ بڑھاؤ کرتے ہوئے ایسے ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے ہیں جس سے پہلے پہل کچھ کچھ اور پھر ایک کی پوری بات دوسرا سمجھنے لگتا ہے۔ بات سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جیسے ایک جتھا اپنی بولی میں کتر بیونت کرتا ہے ٹھیک ایسے ہی دوسرا جتھا بھی۔ تو دونوں جتھوں کا اپنے اپنے یہاں کاٹ کوٹ کرنا بھاشا کی دیوی کو بھینٹ دینا ہے اور جب دونوں جتھے اپنی اپنی بھینٹ چڑھا چکتے ہیں تو بھینٹ لیتے ہی نئی بولی کی دیوی اندھیرے گھپ کے کواڑ کھول کر سنسار کے اُجالے میں ہنستی ہوئی نکل آتی ہے۔

اُردو کے بننے میں بھی یہی ہوا۔ ہندو، مسلمان دونوں نے اپنی اپنی بولیوں میں کاٹ چھانٹ کی اور اپنی اپنی بولی کی بہت سی باتوں کو ایک ایک کر کے چھوڑا۔ اس بھینٹ دینے سے جو نئی بولی بنی اُسے دونوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہمارے یہاں کی یہی ایک وہ ملی جلی بولی ہے جو دیس کی پوری بولیوں کے آگے "دیس بھاشا" کہی جا سکتی ہے اور یہاں کی چھوٹی بڑی بولیوں میں سے کوئی بھی اس اُردو کے لگے کی نہیں۔

دلی، دکھن، پنجاب ان جگھوں میں سے کون سی جگہ سے اُردو نکلی اور ان میں سے کس جگہ کو اس کا جنم بھوم کہا جا سکتا ہے۔ یہ باتیں بہت پھیلاؤ چاہتی ہیں۔ پھر اب تک اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لئے اس الجھاوے میں اُلجھنے کی یہ جگہ نہیں۔ دیس کے جس ٹکڑے میں بھی اُردو نے جنم لیا یہاں اس کے جنم بھوم کا کھوج لگا کے کسی ایک جگہ کو چھانٹ کے دکھانا نہیں چاہتا۔ جو کہنا ہے وہ یہی دو ڈھائی بول ہیں۔

دیس کے دو ہاتھ

مسلمان، ہندو، دیس کے یہی وہ دو ہاتھ ہیں جن دونوں ہاتھوں کے ملنے سے اُردو کی تالی بجی۔ انہیں دونوں نے مل ملا کے دیس میں اُردو کا بیج بویا جو انہی کی دیکھ بھال سے پھوٹا اور بڑھا۔ بڑھتے بڑھتے یہی ننھا سا بیج ایسا بڑا

اور اُونچا پیڑ بن گیا جس کی چھاؤں میں اُس کے لگانے والے بیٹھتے رہے۔ اُردو کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی دیکھ بھال کرنے میں، دونوں کو ایک ہی سی کھکیڑیں اُٹھانا پڑیں۔ جیسے کسی پھلواری کے لگانے میں دو مالی ایک سی دوڑ دھوپ کریں۔ اسکے سینچنے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں تو ایسی پھلواری ان میں سے کسی ایک کی نہیں دونوں کی کہلائے گی۔ اُردو کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئیے۔ یہ دیس کے سپوتوں کی ملی جلی ایسی بھاشا ہے جسے ایک جتھے کی بولی کبھی نہیں کہا جا سکتا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک بھاری بھرکم نمبر اُردو پر جو کچھ لکھ گیا ہے اسے پڑھئے اور سوچئے۔ اُردو کو وہ یورپ کی اس بولی کے لگے کی بتاتا ہے جو پورے یورپ کی بولیوں میں کھلا ہوا کٹورا سا پھول سمجھی جاتی ہے اور جس سے یورپ والے اپنے اپنے دھیانوں کو بساتے چلے آتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"اُردو زبان کی اس وقت یہاں بعینہٖ فرینچ زبان کی سی حالت ہے کہ وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اُردو ہندوستان کے تمام ملک کے حصّوں میں بے تکلف سمجھی جاتی ہے۔ ملک کے کسی حصے میں کسی معاون اور کسی ترجمان کی ضرورت نہ ہوگی۔ اُردو زبان عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت کے میل سے بنی ہے اور فارسی خط میں بہ نسبت دیوناگری کے اس کا لکھا جانا زیادہ اور بامعنی ہوتا ہے۔"

فرانس کے ڈاکٹر لی بان نے ہندوستان کی بولیوں کی یوں چھان بین کی ہے:۔

"مختلف محاوروں کو چھوڑ کر ہندوستان میں آریا طبقے کی تقریباً سولہ زبانیں ہیں۔ ان میں سے ایک ہندوستانی (اُردو) زبان ہے جس کا سیکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ گویا ملک کی دولتی زبان ہے۔ اسی میں بہت کچھ خط و کتابت ہوتی ہے اور اخبارات و رسائل چھپتے ہیں۔ غرض کہ جن اشخاص کو ہند کے لوگوں سے کام پڑتا ہے اُن کو اُردو کا جاننا لازمی ہے۔ یہ زبان باوجود ملک میں عام ہونے کے بالکل ایک جدید زبان ہے اور چندرھویں صدی کی ابتدا میں قدیم آریا زبان ہندی، فارسی، عربی سے مشتق ہے اور عموماً یہ فارسی حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ یہ زبان زیادہ تر اُردو کے نام سے مشہور ہے۔"

ڈاکٹر لی بان نے ایک اور بڑی گتھی سلجھائی ہے اور بتایا ہے، ہندوستان میں جتنی بولیاں بولی جاتی ہیں ان میں سے ایک ایک کے بولنے والے کتنے ہیں۔ جیسے:۔

اُردو	بولنے والے	آٹھ کروڑ پچیس لاکھ	گجراتی	بولنے والے	پچانوے لاکھ
بنگالی	" "	تین کروڑ نوے لاکھ	اوڑیا	" "	ستر لاکھ
مرہٹی	" "	ایک کروڑ ستر لاکھ	کنڑی	" "	پچاس لاکھ
تلنگی	" "	" " "	ملیالم	" "	" "
پنجابی	" "	ایک کروڑ ساٹھ لاکھ	سندھی	" "	چالیس لاکھ
تامل	" "	ایک کروڑ تیس لاکھ	ہندی	" "	تیس لاکھ

انڈین نیشنل کانگریس نے بھی دیسی بولیوں کی جو جانچ پڑتال کی ہے، اُس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے اُردو کہاں کہاں بولی جاتی ہے اور ان سب کو گن کر اُردو جاننے والے سترہ کروڑ بیس لاکھ نکلتے ہیں۔ پر یہ گنتی بھی ٹھیک نہیں۔ اُردو تو وہ بولی ہے جسے پورا دیس سمجھتا ہے اور کانگریس ہی کے کہنے کو سچ مان لیا جائے جب بھی دیکھئے دیس کی پوری بولیوں میں سے ایک بھی تو اُردو کے جوڑ کی نہیں۔

اُردو، ہندی جھگڑے کی پہلی گھڑی ۱۸۳۷ء میں جب فارسی کی جگہ چھین کر اُردو کچہریوں میں گھس پڑی تو نہ کہیں سے کچھ چیخ پکار سنی گئی اور نہ کسی کے منہ سے ہندی وندی کا کوئی بول وول نکلا۔ سب چُپ چاپ رہے اور سب نے اسی اُردو کو اپنی بولی مانا۔ وہ لوگ بڑے آنکھے تھے۔ بیٹھے بٹھائے لڑنے جھگڑنے کو بُرا جانتے تھے۔ تو پھر اسے نہ مانتے تو کیا کرتے۔ دیکھ رہے تھے پورے دیس میں اُردو کے لگے کی کوئی بولی ہی نہیں۔ جب انگریزی راج نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہٹا کے پاؤں پھیلائے تو ہندوؤں کے ایک جتھے میں اپنے پرانے مٹے ہوئے کلچر کو جلانے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اس نئی چونپ سے سوامی دیانند سرسوتی آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے اور

سنسکرت پڑھنے پڑھانے اور بولنے کی دوڑ دھوپ میں لگ گئے۔ یورپ والوں کی پیٹھ ٹھونکنے اور ہاں میں ہاں ملانے سے یہ لے اور آگے بڑھی۔ پروفیسر مکس مولر، میڈم بلوٹسکوی، اینی بسنٹ اور کرنل الکاٹ کی لکھتیں اس آگ کیلئے پنکھا بن گئیں اور یہی گھڑی اس جھگڑے کی پہلی کڑی کہی جاسکتی ہے۔

پہلے پہل اس کا جو بیج بنارس میں بویا گیا وہ یو۔پی میں پھوٹا۔ بنارس اور الہ آباد میں سبھائیں بنیں اور کچہریوں میں ہندی پھیلانے کے جتن ہونے لگے۔ سر سید یہ آپا دھاپی دیکھکر بہت او نٹے اور اس جھگڑے کو دبانے کے لئے بہت کچھ لکھا اور ایسا لکھا جو اس کی اونچی ہوتی ہوئی لے نیچی ہونے لگی۔ پر سر انٹونی میکڈانلڈ لفٹنٹ گورنر کے بیچ میں کود پڑنے سے کی کرائی باتوں پر پانی پھر گیا اور مرجھائی ہوئی ٹہنی کو پھر ہرا ہوتے دیکھکر ہندی والے پھر ہندی کی مالا جپنے لگے۔ سر سید نے پھر اس پر بہت کچھ لکھا اور یہ کب جب اُن کی سانسوں کی گنتی پوری ہونے کو تھی۔ ہوتے ہوتے وہ گھڑی آ ہی گئی جس میں یہ سچا پریمی دیس سے بچھڑ گیا۔ اسکے بچھڑتے ہی ہندی پرچار بڑھ بڑھا کے کچہریوں میں پھیلنے لگا۔ اسی میں نواب محسن الملک اُردو کے بچاؤ کا بیڑا اٹھا کر اٹھے اور آگے بڑھنا چاہتے ہی تھے جو سر انٹونی میکڈانلڈ کی دھمکی سُنی اور اسی سے یہ چپ ہو کر رہ گئے۔

دھرم کی آڑ میں ہندی کی بڑھوتری

جب یہ جھگڑا بڑھا تو ہندی لٹریچر میں کچھ بھی نہ تھا۔ اِدھر اُدھر کی چھوٹی بڑی کہانیاں ہی کہانیاں بھری ہوئی تھیں جن میں ناگری میں چھپی ہوئی اُردو کہانیوں کی گنتی سب سے آگے تھی۔ پنڈت مالویہ کے شدھی اور سنگھٹن کے پھیلاؤ نے ہندی کو بھی لپیٹ لیا اور دھرم کے دودھ کے کھولتے ہوئے اُبال میں یہ کھولنے لگی۔ پنڈت جی کے بڑھاوے دینے سے اُن کے ساتھ والے بھی اُٹھے اور ہندی لٹریچر بڑھنے لگا۔ گاندھی جی "ساہتیا سمیلن" کے جب پنچ بنے اور ہندی کو پورے ہندوستان کی بھاشا بنانے کی ٹھان ٹھنکے تو سارے دیس میں ہندی کا ہلڑ ہو گیا۔ سرحد، پنجاب، مدراس ان جگہوں میں سے ایک جگہ کی بولی بھی نہ کبھی ہندی تھی اور نہ اب ہے۔ ان جگہوں کی بولیوں سے ہندی کا یونہی سا بھی کوئی لگاؤ نہ ہونے پر بھی مہاتما کے کہنے سننے سے ہندی پرچار وہاں بھی پہونچ گیا اور جگہ جگہ اپنی اپنی گورنمنٹ سے ہندی پڑھانے کیلئے لوگ کہنے سننے میں لگ گئے۔

اسی دُھن میں انڈین نیشنل کانگریس کا رزولیوشن بھی ٹھکر لکے لاکھوں کی پونجی اب اسی ہندی پر ایسی بہائی جانے لگی جیسے پانی۔ دکھاوے کے لئے کہا تو یہ جاتا ہے ہم پورے دیس کو ایک ڈگر پر چلانے اور اُس کی بول چال کے لئے ایک ایسی بولی رکھنا چاہتے ہیں جو یہاں والوں میں ملی جلی بولی جاتی ہو۔ پر وہ بھاشا جو برسوں سے دیسیوں کو ملا کے ایکے کے بندھن میں باندھے ہوئے چلی آرہی ہے۔ اسے توڑ تاڑ کے الگ پھینکدینے کے جتن بھی کئے جارہے ہیں۔

گنپت رام جی اور دیس بھاشا

سورت کے رہنے والے گنپت رام جی کو جب دیس بھاشا بنانے کا خیال آیا تو یہاں کی پوری بولیوں میں سے چھانٹ پھونٹ کے دیس بھاشا کے لئے اُنہوں نے ایک اُردو ہی کو الگ کیا۔ ۱۸۷۱ء میں بابو جی نے اسی پر ایک چٹھی سرسید مرحوم کو لکھی جس میں اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ دیس بھاشا کے لکھنے کے ڈھب پر بھی اُنہوں نے بہت کچھ لکھا اور یہ دیس بھاشا کے لکھنے کا ڈھب دیوناگری رکھنا چاہتے تھے۔

فرانس کا گارسان دتاسی جو اُردو کا بڑا رسیا اور اسی اُردو پر کئی لکھتیں لکھ لکھا چکا ہے۔ گنپت رام جی کی اس چٹھی پر آور رائیں لکھتے ہوئے یہ بھی لکھتا ہے:۔

"بابو گنپت رام نے اپنے ہم مذہبوں کی خاطر جو یہ خیال پیش کیا ہے کہ دیوناگری رسم الخط کو فارسی رسم الخط پر ترجیح دینی چاہئے تو میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں اس رائے سے متفق نہیں۔ اسکے وجوہ پہلے متعدد مرتبہ بیان کرچکا ہوں"۔

اُردو لکھنے کا ڈھب

اُردو اور دیوناگری میں سے لکھنے کا ڈھب کونسا سچا اور اچھا کہا جاسکتا ہے۔ اس کی جانچ پرتال بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ مسلمان جس ڈھب کو اچھا سمجھتے ہیں اسے ہندو اچھا نہیں سمجھتے۔ (ہندوؤں کا اچھا نہ سمجھنا ابھی ڈھائی دن کی بات ہے۔ اس سے پہلے تو یہ بھی اسے اچھا ہی سمجھتے رہے ہیں) اور جسے کچھ دنوں سے ہندو ماننے لگے ہیں اسے مسلمان نہیں مانتے۔ دونوں جگہ تول کے بات جب الگ الگ ہوں تو پھر کیسے کہا جائے ٹھیک تول یہی ہے۔ آپ کتنا ہی چیخیں، گلا پھاڑیں دوسرا اُسے کیوں ماننے لگا۔ اس لئے اس بات کے جانچنے اور پرتالنے کے لئے بڑی سوجھ بوجھ چاہیے۔ دیکھئے کسی بھاشا کے لکھنے کا ڈھب جانچنے میں دھرم کا اڑنگا لگانا نری دھاندلی اور ہٹ دھرمی ہے۔ اسے دھرم کا اڑنگا لگانا ہی کہا جائیگا جو سوچ بچار یہ پٹی پڑھائے:۔ لکھنے کا وہ ڈھنگ جو دھرم کی پستکوں کا ہو اس سے بڑھکر کوئی ڈھب سچا اور اچھا نہیں

ہوسکتا اس لئے اسی کو بڑھانے اور پھیلانے کے جتن کرنا چاہئیں۔

لکھنے کا ڈھب جو نا بھی ہو اُسے دھرم ہی کا سا سچا اور اچھا مان لینا بڑی بھول ہے اور جو اسی کسوٹی کو ٹھیک مان لیا جائے تو پھر اس سی بہت پہلے کا پُرانا برہمی لکھنے کا ڈھب چھوڑ چھاڑ کے ویدوں کو دیوناگری میں لکھنا کیوں اور کس لئے۔ بات یہ تھی۔ پُرانا برہمی ڈھب بہت کٹھن تھا اور اُسکے کٹھن ہونے ہی سے لگاتار لٹوہ لگاتے لگاتے سوچ بچار نے اس ڈھب کو نکالا جسے "دیوناگری" کہتے ہیں۔ تو لکھنے کا ڈھب کوئی سا کیوں نہ ہو اسے دھرم کی سچائی اور اچھائی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ لکھنے کا ڈھب وہی اچھا کہا جاسکے گا جو سیدھا سادا ہو، جس میں بہت اینچ پیچ، اونچ نیچ نہ ہو، چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب میں پھیل رہا ہو، جس ڈھنگ سے منہ سے بول نکلیں انہیں ویسے ہی اور جو کہیں جوں کے توں نہ آسکیں تو یونہی سے ال بل کے ساتھ لکھنے میں لے آئے۔

کسی بولی کے لکھنے کا ڈھب کوئی سا رکھنے میں اس بات کو تو نہ دیکھنا جو وہ کٹھن نہیں، سیدھا سادا ہے، پھیلا اور پھیلتا چلا جارہا ہے۔ بڑے بڑے جتھوں کی سوجھ بوجھ اور سوچ سمجھ میں بڑھوتری کا سہارا ہے۔ ان باتوں کو چھوڑ چھاڑ کے، دیکھنا تو یہ دیکھنا اور اُسے اچھا بتانا جس میں دھرم کی پُستکیں لکھی جاچکی ہیں۔ پھر وہ دھرم کی پُستکیں بھی ایسی جنہیں نہ سب سمجھ سکتے ہیں اور وہ بولی جس میں وہ لکھی گئی ہیں نہ کسی دیس میں پھیل سکتی ہے۔ اس پر بھی دھیان ادھر سے ہٹائے نہیں ہٹتا اور یہی پٹی پڑھائے جاتا ہے۔ دھرم کی ٹھیٹ بھاشا نہیں تو نہ سہی اس کے لکھنے کا ڈھب ہی سہی۔ دھرم والوں کے لئے یہ بھی بہت کچھ ہے۔ بھلا ایسے ڈھب کو دیس کے گیگلے اور انجان لوگوں کے گلے منڈھنا اور یہیں کے اور دوسرے جتھوں کا کچھ دھیان نہ کرنا کتنی بڑی بھول ہے۔

کھینچ تان کر دھرم اور دیوتاؤں کے ستھرے پن سے کسی بولی کے لکھنے کے ڈھب کا ناتا جوڑنا نہ جاننے اور سبے تکی پُرانی باتوں کو پورا پورا ماننے کی اس سے بڑھکر کوئی اور ڈگر ہو نہیں سکتی۔ سندھ والے سندھی اور ہندو سنسکرت لکھنے کیلئے فارسی لکھنے کا ڈھب برتیں تو کیا دیکھنے والے اسے فارسی لکھت کہہ سکیں گے۔ ایسے ہی عربی کو چینی لکھنے کا ڈھب کیا چینی بنا دیگا۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ سچائی اور اچھائی جو بھی ہے وہ دھیان ہی کی مانی جاتی ہے۔ لکھنے کا ڈھب چاہے جو بھی ہو اسے ان باتوں سے کوئی لگاؤ نہیں۔

وہ لوگ جو ہندوستان میں دیوناگری ہی پھیلانا چاہتے ہیں، ٹھنڈے جی سے کبھی انہوں نے یہ بھی سوچا جو یہاں سترہ، اٹھارہ لکھنے کے ڈھب پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے دیوناگری ہے کیا۔ اس کچھ نہ ہونے پر بھی اسی کو رکھیں اور سب کو مٹا ڈالیں یہ کون سی سمجھ کی بات ہے۔ اُردو لکھنے کا ڈھب جسے بہت سے ہندو آج سے نہیں برسوں سے اپنے پوجا پاٹ میں برت رہے ہیں۔ پھر یہ ڈھب سیدھا سادا اور دیس میں پھیل چکا ہے۔ آپس میں ایکا کرنے اور پیار بڑھانے کے لئے اسی کو رکھنا اور برتنا کیا ٹھیک نہیں۔ دھرم کی پچھڑ نہ لگائی جائے تو چٹکی بجاتے میں یہ جھگڑا چکا دیا جائے۔

اچھا اسے یوں بھی جانچ لیجے اور سب سے پہلے اس سنسار کے رہنے سہنے والوں کو گنیئے۔ گنتی میں یہ سب کے سب دو ارب کے لگ بھگ نکلیں گے۔ پھر اس میں سے مسلمانوں کو الگ کر کے دیکھئے یہ کتنے ہیں۔ انہیں چالیس کروڑ کے لگ بھگ پائیے گا۔ یہ گنتی گن چکنے پر پورے مسلمانوں کے لکھنے کا ڈھب اُردو سے بہت ملتا جلتا آپ دیکھیں گے۔ افغانستان، ایران، عربستان اور چینی مسلمانوں کے دھرم کی لکھتوں کا ڈھچر اُردو کا سا ملے گا۔ ان میں یہاں کے اب ان جتھوں کو بھی ملا لیجیے جو اُردو لکھنے کا ڈھب جانتے ہیں اور ان سب کو پندرہ کروڑ ہی مان لیا جائے تو ان پوری باتوں کا نچوڑ یہ نکلے گا۔

ساٹھ کروڑ سانس لینے والے بھلے مانس اُردو لکھنے کا ڈھب جانتے ہیں۔ رہ گئے وہ لوگ جو اُردو سمجھ لیتے ہیں انہیں بھی گن ڈالیے۔ گن چکنے پر دیسی ۳۴ کروڑ نکلیں گے اور بدیسی تین کروڑ۔ ان سب کو ملائیے تو ۳۷ کروڑ اُردو سمجھنے والے سامنے آجائیں گے۔ اس پھیلاؤ کے سامنے ہندی کو دیکھئے تو وہ سکڑی سمٹی ہوئی تھوڑی سی جگہ میں دکھائی دے گی۔ پھر، جس بولی کو "ہندستانی" کہا جارہا ہے اُردو اور ہندی لکھنے کے دونوں الگ الگ ڈھچروں میں سے کس ڈھچر پر یہ بولی ٹھیک اور پوری اُترتی ہے۔ اچھا ۱۸۴۶ء میں برٹش راج نے دیس کی پوری بولیوں میں سے اپنی کچہریوں کے لئے کس بولی کو چھانٹ کے الگ کیا تھا ــــــ کیا وہ بولی ہندی تھی؟

دیوناگری لکھنے کا ڈھب۔ گاندھی جی اپنے دھیان میں اُردو اور ناگری لکھنے کے ڈھب ان دونوں کی بے جانچ پرتال کئے اُردو سے دیوناگری کو

بڑھانے اور اسی کو سرا ہنے پر اڑ گئے ہیں۔ ہندوستان میں الگ الگ بولیوں کے جتنے لکھنے کے ڈھب پھیل چکے ان سب کا سنگم مہاتما دیوناگری ہی کو بتاتے اور اُسے سائنٹفک بھی منوانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ من مانی ناپ تول نہ جاننے والوں کو بھٹکا کے نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچا دے گی۔ سارے دیس میں دیوناگری پرچار کی دوڑ دھوپ لٹریچر کی بڑھوتری کے لئے نہیں اسے ہندو دھرم کی پچ اور اس کی بڑھوتری کی اپیل سمجھنا چاہیئے۔

ابتک کسی بولی کے لکھنے کی بات چیت دھرم سے الگ سمجھی جاتی تھی۔ دیکھ لیجے یہاں کے الگ الگ دھرم والے آپس میں ملتے جلتے، ہنسنے بولنے، بات چیت کرنے میں اُردو بولتے اور لکھتے چلے آرہے ہیں۔ پہلے تو اُردو لکھت کا دھرم سے کوئی جوڑ ہی نہیں اور جو یہ ناتا جوڑ بھی دیا جائے تو جب بھی اکیلے مسلمان ہی نہیں ہندو اور عیسائی تک اس لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ کسی جانچنے والے کو جیسے مسلم دھرم کی لکھتیں اُردو میں ملیں گی ایسے ہی گیتا، رامائن، اور انجیل یہ سب کی سب اُردو کے سانچے میں ڈھلی ہوئی دکھائی دینگی۔ جنہیں الگ الگ دھرم کے لوگ پڑھ پڑھا کے اپنے اپنے دھرم کی باتیں جانتے اور انہیں سچے جی سے مانتے ہیں۔

برسوں ہندوؤں کے بہت سے گھرانوں میں تہواروں کی ریت اسی اُردو میں پوری ہوئی اور ہو رہی ہے۔ گرجاؤں میں عیسائیوں کے دھرم کی اپیچیں اُردو ہی میں ہوا کرتی ہیں۔ یوں دیکھئے تو یہ اُردو دھرم کی پیاس بھی بجھاتی ہے اور یہاں کی الگ الگ ٹولیوں اور جتھوں کو ایک کلچر کے بندھن میں باندھ کے ایکا سکھاتی اور اسی ڈگر پر چلاتی ہے۔

مہاتما جی پورے دیس میں دیوناگری لکھنے کا ڈھب پھیلانا تو چاہتے ہیں، پر اس پرچار کے لئے بنگالی، گرمکھی، مرہٹی، ٹامل، تلنگو، ملیالم اور ایسی اور بولیاں جو اپنے اپنے لکھنے کا ڈھب ساتھ رکھتی ہیں۔ ان سب کو مٹا دینا پڑیگا۔ کیا وہ اس کی ہامی بھریں گے؟ اور دیوناگری کے پریم میں ان سب پُرانی بولیوں کو ٹھکرا کے وہ یونہی اپنی بات کی پچ کرتے رہیں گے۔ انہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ دھیان دیس کے آگے بڑھنے میں جگہ جگہ روڑے اٹکا دیگا اور کسی جگہ بھی چین کا پتا نہ مل سکے گا۔

ناگری لکھنے کا ڈھب جو سائنٹفک بتایا جاتا ہے وہ سمجھ کی کسوٹی پر ٹھیک نہیں اُترتا۔ جس ڈھنگ سے مُنہ سے بول نکلتے ہیں ناگری اُنہیں جوں کا توں نہیں لکھ سکتی۔ اُردو لکھنے کا ڈھب بے جھجک جن بولوں کو لکھ لکھا ڈالتا ہے۔ ناگری اپنی گھٹ بڑھ سے انہیں کچھ سے کچھ کر دیتی ہے۔ اسکی ہندی کی چندی مولوی عبدالقدوس صاحب نے جس ڈھنگ سے کی ہے اُسے بھی دیکھ لیجے۔

"ناگری میں ۳۷ حروف صحیح ویجن ۱۶ حروف علت سوَر اور ۱۶ ماترائیں یعنی اعراب ہوتے ہیں۔ یہ کل ۶۹ نقوش ہوئے۔ اُن پر ۵ اُن حروف کا اضافہ کیجئے جو خ، ز، غ، ف، ق کی آوازوں کے لئے نقطے لگا کر بنائے گئے ہیں کل ۷۴ حروف تہجی ہوئے۔ اس اتنے بڑے مجموعے میں ل، ہ اور ن، ہ کی مرکب آواز کے لئے کونسی ترکیب ہے۔ مثلاً لفظ "ننھا" اور لفظ "کولھو" میں ل کے ساتھ ہ کی اور ن کے ساتھ ہ کی مرکب آواز پیدا ہوتی ہے۔ ناگری میں باوجود اس قدر کثیر حروف تہجی کے اس کے لئے کوئی سامان نہیں ہے۔ آج کل جس طرح لکھتے ہیں وہ چترویدی دوارکا پرشاد شرما کی ڈکشنری ہندی شبدارتھ پاریجات سے نقل کرتا ہوں۔ 'کولھو' اور 'ننھا'، لیکن ان سے جو آواز پیدا ہوتا چاہیئے وہ "کول ہو" اور "نن ہا" ہے مرکب آواز نہیں ہو سکتی کیونکہ اس لغت میں ہندی اور تلپ بمعنی بستر کے لئے وہی ٹکڑے استعمال کئے گئے ہیں۔ اصل میں ناگری حروف کے ٹکڑے صرف ان حروف کے ساکن ہونے کو بتاتے ہیں۔ مرکب آوازوں کے لئے الگ الگ حروف ہوتے ہیں جیسے کھ، گھ وغیرہ مگر لام اور نون کے اس طرح ہ سے مرکب آواز کے لئے کوئی حرف موجود نہیں ہے۔

اسی طرح "کھاؤ" "بلاؤ" یعنی اُردو میں جو آواز ہمزہ اور واؤ سے ادا کی جاتی ہے اس کے لئے ناگری میں کوئی نقش موجود نہیں ہے۔ ہمزہ اور واؤ سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ یقیناً الف اور واؤ کے مرکب سے مختلف ہے۔ لیکن ناگری رسم الخط میں کوئی سبیل اس کے ادا کرنے کی موجود نہیں۔ یا دیکھو یا دیکھا اُو لکھنا پڑیگا" (ادبی دنیا، نومبر ۳۸ء)

پھر اس ڈھب میں پھیلاؤ اتنا جو چھوٹی سی چھوٹی بات کے لئے بڑی جگہ گھیرنا پڑتی ہے۔ چھاپا کا یہاں چل نہیں سکتا۔ گھنٹوں بیٹھے جو تیں مارا کیجے۔ اس سے بچنے کے لئے ایک اور ڈھب نکالنا پڑا جسے "موڑی" کہتے ہیں۔ پر دیوناگری جاننے والا پہلے سے جب تک اُسے نہ جانتا ہو "موڑی" لکھنا تو بڑی بات ہے اس کا ایک بول بھی نہیں پڑھ سکتا تو اس کے پرچار سے ایک پھوڑ دو دو بوجھ بیٹھے بٹھائے دیس کو اٹھانا پڑیں گے۔ ان باتوں میں سے اُردو میں

ایک بات بھی نہیں۔ چاہے اسے ٹھہر ٹھہر اور بنا بنا کے لکھئے اور چاہے کھینچ کھانچ کیجئے۔ اس کے لکھنے کا وہی ایک ڈھب رہے گا جس میں نہ دیوناگری کا سا پھیلاؤ دکھائی دیگا اور نہ دوسرے جھمیلے۔ تو سوچ بچار سے ناگری لکھنے کا ڈھب سائنٹفک نہیں ٹھہرتا۔ ہاں دھرم پرچار کا ہتھیار اسے کہئے تو ٹھیک ہوسکتا ہے۔

کسی بولی کے لکھنے کا ڈھب جانچنے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے جو اسے چھوٹی پود کیسے سیکھتی ہے۔ دیوناگری کے بولوں کے جوڑ اتنے الگٹ الگ روپ رکھتے ہیں جن سے لڑکوں کے لئے اس کا سیکھنا بہت کٹھن ہوجاتا ہے "سنجکت انچھر" کے تو روپ اتنے الگ الگ ہیں جن کے پھیلاؤ کو اچھے اچھے جاننے والوں کا دھیان بھی نہیں سمیٹ سکتا۔ یہ بات انکل پچو نہیں بڑے بڑے پنڈت اسے مانتے اور اس سے کترا کے نکلنے کی بھاگ دوڑ میں نہ جانے کب سے لگے ہوئے ہیں۔ پر ابھی تک کوئی ایسی سیدھی ڈگر نہ مل سکی جس پر بے کھٹکے چھوٹی پود دوڑ لگا سکے۔

رہی اُردو تو اس کے لکھنے کا ڈھب دیوناگری کے اُلجھاووں کے سامنے سیدھا سادا اور بہت سہج ہے۔ کھلنڈرے لڑکے ہنستے بولتے باتوں باتوں میں سیکھ کر فراٹے سے اُسے پڑھنے اور لکھنے لگتے ہیں جس ڈھنگ سے بھی جانچئے دیوناگری لکھنے کا ڈھب دھرم کی اپیل کے روپ میں کھائی دیگا اور یہ بگڑا ہوا رنگ ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہے۔ یہ اپیل دیس کے ملے جلے کلچر کا ستیاناس کرڈالے گی۔

آریا باہر سے جب یہاں آئے تو یہ اپنی بھاشا بھی ساتھ لائے جو یہیں پھولی پھلی اور سنسکرت کہی جانے لگی۔ اسکے لکھنے کا ڈھب بھی دیسی نہیں ولیسی ہے۔ پروفیسر ونٹرنیٹز نے یہاں کا سب سے پُرانا لکھنے کا ڈھب جس سے ناگری ڈھب نکلا اسے برہمی بتایا ہے۔ ٹھیٹ دھرم والوں کے دھیان میں اسے "برہما" ہی نے نکالا تھا اسی لئے یہ "برہمی" کہا جانے لگا۔ جارج بوہلر کی چھان بین اس کا ناتا سامی سے جوڑتی ہے اور کچھ لٹھ لگانے والوں کے دھیان میں "خروشتی" لکھنے کا ڈھب جو دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا "برہمی" پر اپنا پرچھاواں ڈال چکا ہے "برہمی" ڈھب پہلے دہنی سائڈ سے چلتا تھا پھر اس کے بڑھنے اور پھیلنے پر ہندوستان کو کلچر کی ایسی دھوپ پڑی جو دائیں کی جگہ بائیں سائڈ سے لکھا جانے لگا اور لگاتار اس میں گھٹ بڑھ ہوتے ہوتے دیوناگری لکھنے کا ڈھب نکل آیا۔

یہاں دڑاوڑی کلچر آریوں سے بھی بہت پہلے کا ہے۔ جس کی بولی "ٹامل" اور اس کے لکھنے کا ڈھب بھی بائیں سائڈ سے چلتا ہے۔ پر اس میں اور ناگری میں کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ دونوں کے دونوں ایسے الگ تھلگ ہیں جو ملانا چاہیں بھی تو یہ نہیں مل سکتے۔ ٹامل کے کچھ بول ایسے ہیں جنہیں ناگری چھو نہیں سکتی تو دڑاوڑی کلچر اور ان کی بولی ایسے ہی آریا کلچر اور ان کی بھاشا یہ دونوں الگ الگ گھرانے نہ کبھی ایک ہوئے اور نہ ہوسکتے ہیں۔

مسلمان یہاں آئے تو فارسی لکھنے کا ڈھب ساتھ لائے۔ یہ عربی کے سہارے سے "ارامی" اور "فنیقی" تک پہونچتا اور دائیں سائڈ سے لکھا پڑھا جاتا ہے۔ اسی کی بڑھوتری کا سچا اور اچھا روپ اُردو لکھنے کے ڈھب کو سمجھنا چاہیئے۔ یہ جتنا آگے بڑھا اور پھیلا دیوناگری میں کہیں اس کا پتا بھی نہیں۔ دیوناگری ڈھب دھرم پرچار کے اُلجھاووں میں پھنس کر آگے نہ بڑھ سکا اور اُردو ڈھب جتنا بڑھا اور بڑھتا چلا جارہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ گاندھی جی کہتے ہیں۔ پورے ہندوستان کی بولیوں کے لکھنے کے ڈھب اسی دیوناگری سے نکلے ہیں۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا۔ پر انہیں یہ دھیان نہ آیا یہ کہنا اُن اگلی باتوں کو جھٹلا رہا ہے جن میں اب کوئی گھٹ بڑھ ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے جاننے والے سُنیں گے تو کیا کہیں گے؟ بھلا دڑاوڑیوں کے کلچر اور بولی کو آریوں کے کلچر اور بھاشا سے کیا لگاؤ۔ دیوناگری سے ٹامل کا ناتا کسی جتن سے جُڑ ہی نہیں سکتا۔ جیسے ٹامل دیوناگری سے الگ ہے۔ ٹھیک ایسے ہی اُردو لکھنے کا ڈھب ناگری سے کچھ بھی میل نہیں کھاتا۔ یہ دونوں کے دونوں ایسے بے جوڑ اور بے میل ہیں جو اُن کی کسی بات میں بھی ایکا دکھائی نہیں دیتا۔ ناگری بائیں سائڈ سے لکھی جاتی ہے اور اُردو دائیں سے۔ یہ آئے دن کی بات چیت جوں کا توں لکھ لکھا ڈالتی ہے اور دیوناگری اس دوڑ میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ "برہمی" اور دیوناگری کہہ کر اس ڈھب کی رسان رسان بڑھوتری کے چُھپانے کیلئے باتیں بنانا اور دھرم پرچار کی دھن میں اس کا جنم بھوم دیس کو ٹھہرانا سچائی کی آنکھوں میں دھول ڈالنا ہے۔

یہ ہوسکتا ہے جو دیس کی دو ایک بولیوں کے لکھنے کے ڈھب پر کچھ "برہمی" چھاؤں پڑی ہو۔ جیسے گجراتی، مرہٹی، پنجابی بولوں کے جوڑ دیوناگری سے ملتے جُلتے ہیں۔ پر دو ایک پر دھیان کرکے سب کو ایک لاٹھی ہانکنا اور کھلم کھلا سب کا دیوناگری سے نکلنا بتانا نری ہٹ دھرمی ہے۔ ان پڑھ اور سمجھ کے ہیٹوں کو بہکا دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ انہیں سچائی کی سیدھی ڈگر پر چلانا ہی بڑی بات ہے۔ کلچر بڑھتی ہوئی سوچ سمجھ اور پھیلتی ہوئی سُوجھ بُوجھ ہی کا نام ہے اور اس سے پھیر کر لوگوں کو دوسری سائڈ میں چلانے سے کلچر کی بڑھوتری پیچھے ہٹنے لگتی ہے۔

دیس کی نیا پار لگانے والوں کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ وہ اتنا نہیں دیکھتے۔ سنسار کے اُبلتے ہوئے سمندر کا چڑھاؤ بڑھ رہا ہے۔ سامنے بھنور پہ بھنور پڑ رہے ہیں۔ پانی کے تھپیڑوں اور دڑیڑوں سے ڈگمگاتی ہوئی ایسے کی ناؤ پھوٹ! اور آبادھاپی کی بھنوروں میں پھنسا کے رہ گئی تو اپنے ساتھ یہ اسے بھی لے ڈوبیں گے۔ یہ بڑی کٹھن گھڑی ہے۔ پوری سوچ سمجھ سے آنے والی باتوں کو بھانپنا چاہیئے۔

گارساں دتاسی نے اُردو کے پھیلاؤ کی باتوں میں اپنے ایک ملنے والے کے کچھ بولوں کو یوں دُہرایا ہے۔

"میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر حصّے میں اُردو زبان نہایت مُفید ثابت ہوتی ہے۔ مَیں نے راس کماری سے ہمالیہ تک اور گنگا کے دہانے سے لیکر دریائے انڈس تک ہر جگہ یہ بات محسوس کی۔"

گارساں دتاسی کی یہ باتیں بھی سُننے کی ہیں۔

"پنجاب یونیورسٹی کی مجلس رفقا میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ سائنس پر اُردو زبان میں جو بہترین رسالہ لکھے گا اُسے سالانہ یونیورسٹی کی جانب سے انعام دیا جائے گا۔ اس لئے کہ ہندی کی بہ نسبت اُردو کے کم استعمال کی جاتی ہے۔ نیز یہ کہ اُردو میں دوسری زبانوں کے مستعار لئے ہوئے خیالات کی ترجمانی کرنے کی بہترین صلاحیت موجود ہے۔ اس میں دوسری زبانوں کے مستعار لئے ہوئے خیالات اچھی طرح ادا ہو سکتے ہیں اور اگر ان خیالات کے ادا کرنے کیلئے محاورے موجود نہ ہوں تو آسانی کے ساتھ بنائے جا سکتے ہیں۔

بابو نوین چندر رائے نے اس خیال سے مجلس رفقا میں اختلاف کیا اور وہی دلائل پیش کئے جو ہندی کے حامی اکثر پیش کیا کرتے ہیں اور جن کے جواب میرے خیال میں نہایت تشفی بخش طریقے پر بار ہا دئے جا چکے ہیں۔ چونکہ بابو صاحب ہندو ہیں اس لئے انہوں نے مذہبی حیثیت سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ ہم یورپین لوگ اس قسم کے مسائل پر زیادہ بے تعصبی اور غیر جانبدار سے رائے قائم کر سکتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں پنجاب یونیورسٹی کی مجلس رفقا کے فیصلے کو نہایت خوشی سے تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔"

الہ آباد کی ایک اسکیم

۱۹۱۲ء میں الہ آباد گورنمنٹ نے ایک ورنیکولر اسکیم کمیٹی بنائی۔ یہ کمیٹی اسکول اور کالجوں کے لئے اُردو، ہندی دونوں کا کورس ملا جُلا کے ایسا بنانا چاہتی تھی جو ایک سا ہو اور جسے ایک ہی سے بولوں کے ساتھ پڑھا جا سکے اور بھاشا لٹریچر بھی اُردو کورس میں بڑھا دیا جائے۔

مسٹر برن چیف سکریٹری نے اس کیلئے ایک بڑی اسکیم بنا ڈالی جس کے ۳ اور ۴ کا نچوڑ یہ تھا۔

"اُردو زبان اور ہندی زبان یہ دراصل ایک ہی زبانیں ہیں۔ کیونکہ ان کی گرامر متحد ہے اور جن دو زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے وہ زبانیں دراصل ایک ہی ہوتی ہیں۔ اس بنا پر ورنیکولر کورس ایسی مشترک زبان میں بننا چاہیئے کہ صرف رسم الخط کے فرق سے وہ اُردو اور ہندی دونوں بن جائے۔ لیکن ہندی زبان کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ اس کی نظم و نثر کی گرامر مختلف ہے۔ اس لئے ہندی نظم کی گرامر کی واقفیت اور مہارت کے لئے رامائن تلسی داس کورس میں داخل ہونی چاہیئے ہندوؤں کے لئے وہ لازمی کر دی جائے اور مسلمانوں کے لئے بھی اس کا پڑھنا مناسب ہوگا۔"

اِس کمیٹی کے ممبروں میں شمس العلما شبلی نعمانی بھی تھے۔ بھری کمیٹی میں اُنہوں نے مسٹر برن کی اسکیم کی ایسے ڈھنگ سے چھاڑ کی اور ایک ایک بات کی ایسی ہندی کی چندی کی جسے سب نے مانا۔ کمیٹی کے پورے ہندو ممبر اُن کا ساتھ دینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُردو ہندی بننے سے یوں بال بال بچی۔

یہ تو ستائیس برس اُدھر کی یونہی سی ایک جھڑپ تھی جو ہوئی اور سُوجھ بوجھ والوں کے بیچ میں آجانے سے دب دبا کے رہ گئی۔ اب پھر کئی برس سے اسی باسی کڑھی میں اُبال آرہا ہے اور اُبال بھی ایسا جو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہمارے دیس کی بھی کیا بات ہے۔ ادھر کچھ یونہی سی بات بڑھی اور لے لے کرکے سب اُدھر ہی جُھک پڑے۔ اُردو، ہندی جھگڑے کو سوچنے اور سمجھنے والے ڈھونڈئے تو گنتی کے کچھ ہی نکلیں گے۔ پر اِدھر اُدھر جدھر سے دیکھئے ایک سمندر امنڈا چلا آتا ہے۔ بات کا بتنگڑ بنا اور بن رہا ہے اور کسی ڈھب سے یہ لے دبنا کیسی اور اُونچی ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اس جھگڑے کو دھرم سے کوئی لگاؤ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ بڑے بڑے سوجھ بچار والوں میں سے جس سے بھی پوچھیئے وہ کبھی اس کی ہامی نہیں بھرینگے اور بھاشا اور دھرم دونوں کے گڈ مڈ کرنے کو بُرا بتائیں گے۔ پر کہنے اور کرنے کی ڈگر ایسی الگ الگ ہے جو کہیں ملتی ہی نہیں۔ جو کیا جا رہا ہے اُسے جانچیے تو یہ سب کا سب دھرم ہی کے لئے دکھائی دیگا۔

یہ ہلڑ دیکھ کر اچنبا ہوتا ہے اور دھیان آتا ہے۔ آنکھیں یہ کیا دیکھ رہی ہیں۔ ایک یہ گھڑی ہے اور ایک وہ تھی جس میں ہندو مسلمانوں نے مل ملا کے وہ کیا جس سے اُردو اُردو بنی۔ اِن دونوں کے میل ملاپ سے اُردو کا بننا، پھلنا پھولنا کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ یہ ایسی کھلی ڈلی بات ہے جسے جھٹلانا چاہنے پر بھی کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ یہ تو پُرانی باتوں کا دُکھڑا تھا اور اب کیا ہو رہا ہے؟ ہندوؤں میں سے جسے دیکھیئے وہ عربی فارسی کے گھلے ملے بولوں پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے اور انہیں نکال نکال کر ان کی جگہ کبھی نہ سُنے ہوئے اَن گھڑ بول اُردو میں ٹھونسنے پر اَڑا ہوا ہے۔

پنڈت نہرو کی اسپیچ کا ڈھنگ

کئی برس ہوئے جونا گپور میں کسی گھر کی نیو رکھنے کے لئے وہیں کے اور باہر سے بُلائے ہوئے ہندو ایک جگہ اکھٹے ہوئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے نیو رکھنے سے کچھ پہلے اسپیچ پڑھی۔ پنڈت جی بڑی سُوجھ بوجھ کے لوگوں میں سے ہیں۔ پر۔ کیسا ہی سُوجھ بُوجھ والا کیوں نہ ہو۔ کہنے سننے اور سکھائے پڑھائے میں وہ آ ہی جاتا ہے۔ دیکھ لیجے۔ اُردو، ہندی ایچ پچار سے یہ بھی ادھر ہی ڈھل گئے جدھر چلے جلے اور گھلے ملے عربی، فارسی کی کاٹ چھانٹ کرنے کا بیڑا اُٹھایا گیا ہے۔ یہ ہندی میں ایسی اسپیچ دینے کھڑے ہوئے جس میں عربی فارسی کا ایک آدھ بول بھی نہ آنے پائے۔

اسپیچ دینے میں رُک رُک کر، سوچ سوچ کر، ٹھہر ٹھہر کر منہ سے بول نکالتے اور چبا چبا کر باتیں کر رہے تھے۔ بدیسی بولوں کی بھیڑ ہٹانے اور اس سے بچ بچ کر نکلنے سے پنڈت جی کو اپنی اسپیچ میں جگہ جگہ رُکنا اور ٹھہرنا پڑا اور جب سوچنے پر بھی کہیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اپنے پاس والے سے پوچھنا پڑا۔ جیسے ایک جگہ سوچتے سوچتے تھک گئے تو اپنے کسی پاس والے سے چپکے سے پوچھنے لگے۔ کیوں بھئی ہندی میں "سنگ بُنیاد" کو کیا کہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی سمجھ کی بات ہے۔ جو کسی بولی میں سے گھلے ملے بدیسی بولوں کے نکالنے کی دُھن میں رہنا اور اُن کی جگہ نئے نئے بھدے پھسلے بولوں کو لا لا کے جمانا۔ یہ نری دھاندلی نہیں تو اور کیا ہے۔

(باقی۔ باقی)

سیّد ابو القاسم سرورؔ

مظلوم کا مذہب

سر پر آسماں نہیں، زیرِ پا زمیں نہیں — راندۂ جہان ہم، دہر کے مکیں نہیں
عیشِ آشیاں تمام، دانۂ قفس حرام — لیتے ہو وطن کا نام؟ وطن اَب کہیں نہیں
خیر، صدقہ، منتیں، طاعتیں، ریاضتیں — نیکیوں کی برکتیں باقی اَب ہیں نہیں
کارِ خیر کی جزا، فعلِ زشت کی سزا — ہو تو ہو پسِ فنا، جیتے جی کہیں نہیں
عیش و عشرت جناں، مانتا ہوں مہرباں — کہئے مُنہ سے کہدوں ہاں، دلکو کچھ یقیں نہیں
زار و خستہ و زبوں، آج غم سے دل ہی خوں — کل کی آس پر جیوں؟ نہیں نہیں نہیں نہیں
ایزد اَب ہے ناتواں، اہرمن ہی حکمراں — رب ظالمین ہے ہاں، ربِ عالمین نہیں
طاقت و تونگری، ملک و قوم پروری — حریت، برابری، کچھ بھی دلنشیں نہیں

جُرم و فتنہ و عناد، قتل و غارت و فساد
اب یہی سبق ہیں یاد، اور اپنا دیں نہیں

محمد مسلم

"گلبانگِ حیات" زیر تدوین کا ایک ورق۔

بیتابی

بیتابیوں سے رزمِ کشاکش ہے حیات میں
بیتابیاں ہیں دامِ نظر کائنات میں

بیتابیاں ہیں پنہاں سبھی جگہ
ہستی کے ذرّے ذرّے میں ہے جوہرِ لطیف سے پیدا حیات میں

یہ رزم گاہِ کائنات عجب آئی حیات میں
اک مہرِ نیم روز نکل آیا رات میں

فکر و نظر کا تاب بھی اس کی کرن کرن
جلووں کی کوئی حد نہ رہی کائنات میں

نغموں کی موج بھی یہی مضراب بھی یہی
نغمہ نواب بھی یہی نقاب بھی یہی

ہے عقدۂ کشمکش ہوئے آہنگِ کائنات
کیونکر نہ ہوں سوال کے اور جواب بھی یہی؎

جانِ حیات ہیں یہی جانِ حیات ہیں
بیتابیاں ہی نام و نشانِ حیات ہیں

رگ رگ میں اپنی آن کی رو بھر کے لائے ہیں
بیتابیاں ہی تاب و توانِ حیات ہیں

امین حزیں سیالکوٹی

؎ Repulsion & Attraction.

خار و گل

بھائی شاہد۔ سلام مسنون!

میں پونے دو مہینے کشمیر رہا لیکن آپ جانتے بیکار نہیں رہا اور اگر آپ یہ پوچھیں کہ آخر کرتا کیا رہا تو یہ بتلانے میں مجھے یوں تو کچھ تامل نہیں۔ لیکن اتنا خوف ضرور ہے کہ آپ مجھے سڑی یا پاگل نہ کہیں سمجھنے لگیں۔ اور اگر بفرض محال میرے متعلق آپ کی یہی رائے قرار پائے تو حضرت! یہ کچھ غلط بھی نہ ہوگا کیونکہ افسانہ نویسی ہے بھی تو محض دیوانگی ہی۔ بس قلب و جگر کو ذرا سی ٹھیس لگی تو جذبات کا ایک دریا اُمنڈ آیا۔

جس طرح آنسو بہا لینے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ یا کسی سے دُکھ درد کی بات کر لینے سے طبیعت پر سے ایک بار اتر جاتا ہے۔ اسی طرح جذبات کا اظہار کر دینے سے بھی قلب و جگر کو سکون اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ جذبات کو ٹھیس کیسے اور کیوں لگتی ہے تو فی الحال اس موضوع پر بحث کرنے کا موقع نہیں۔ میں نے ان تاثرات کا نام "خار و گل" رکھا ہے۔

ایک روز میں فارسٹ روڈ پر بیٹھا "ناگا پربت" کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ شام کا وقت تھا اور "ناگا پربت" کی برفانی چوٹی نیلے نیلے بادلوں میں سے اس طرح چمک رہی تھی جیسے خاک میں سے کندن۔ یہ "ناگا پربت" وہی برفانی پہاڑ ہے جس تک پہونچنے کے لئے کئی منچلے لوگ جانیں بھینٹ چڑھا چکے ہیں۔ مجھ سے ذرا ہٹ کر ایک نوجوان حضرت حفیظ جالندھری کا یہ شعر ؎

یہ زندگی فریبِ مسلسل نہ ہو کہیں
شاید اسیرِ دامِ بلا ہو گیا ہوں میں

ایک اندازِ بے فکری سے بیٹھا گا رہا تھا۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہماری زندگی واقعات سے بنتی ہے یا واقعی بقول شاعر یہ زندگی ایک فریب ہے جس میں تخلیقِ آدم سے ہم گرفتار ہیں۔

زندگی نام ہے جینے کا۔ ایک جینا تو وہ ہے کہ انسان اپاہج ہو، بیمار ہے یا مفلس اور نادار ہے، ستم رسیدہ اور مظلوم ہے۔ لیکن زندگی کے بُرے بھلے دن کاٹ رہا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی زندگی کا خوگر ہے جو راحت، آرام اور آسودگی سے محروم ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی کہہ لیں کہ جس ماحول میں وہ جی رہا ہے اس میں وہ مطمئن بھی ہے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ اور اگر ہم اُسے ایک جبری زندگی کے نام سے موسوم کریں تو شاید کفر بھی نہ ہو۔ قدرت سے اُسے زندگی عطا ہوئی ہے اور اب ایک مقررہ میعاد تک اس کو اس دُنیا میں رہنا سہنا ہے۔ اس لئے وہ جی رہا ہے اور اس سے اُسے کسی طرح گریز نہیں۔ حفیظ جالندھری نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ دُکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکرِ نعمت بھی کرتا جا دامن بھی پھیلاتا جا

دوسری زندگی آرام، راحت اور آسودگی کی زندگی ہے۔ تفکرات سے پاک۔ آلام سے ناآشنا۔ نہ فکرِ فردا نہ حال و ماضی کا خیال سوہانِ رُوح۔ دولت گھر کی لونڈی۔ راحت اور آسائش گھر کے دربان۔ اپنی نیند سونا اپنی نیند جاگنا۔ ہم چشموں میں عزت اور وقار سے رہنا۔ نوکر چاکر، سامانِ تعیش سب موجود۔ لیکن زندگی پر وہی موت کی قید مسلط! ایک شکمِ مادر سے غریب پیدا ہوتا ہے دوسرا پیدا ہوتے ہی ہنڈولوں میں سوتا اور جھولوں میں جھولتا ہے۔ ایک کو اس دُنیا میں قدم رکھتے ہی غربت اور مفلسی کی اوڑھنی ملتی ہے اور دوسرے کو قبائے زریں۔ پیدا کرنے والا، زندگی بخشنے والا تو ایک قادرِ مطلق ہے۔ غریب کا خدا بھی وہی اور امیر کا خالق بھی وہی۔ لیکن پھر یہ امتیاز کیسا؟

زندگی کی تگ و دو میں دونوں مشغول رہتے ہیں لیکن اتفاقات اور ماحول دونوں کے الگ الگ۔ ایک آلام، تفکرات، اور مصائب کی مسموم فضا میں پل کر، پروان چڑھ کر زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے خون اور پانی ایک کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر نانِ جویں کیلئے محتاج۔ پیٹ بھر کر روکھی سوکھی مل جائے تو اس کے لئے عید۔ ستر پوشی کے لئے پھٹے پُرانے کپڑے میسر ہو جائیں تو وہ قانع اور خوش، ہر حالت میں شکر گزار۔ تسلیم و رضا کا بندہ۔ نہ رشک سے آشنا نہ آتشِ حسد کی سینہ کاوی سے بے قرار۔ گویا ؎

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

لیکن اس پر بھی وہ فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ، ع ؎

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں

لیکن دوسرے کو ایک دُنیا کا عیش و آرام میسّر ہوتے ہوئے بھی قرار نہیں۔ ہل من مزید کا نعرہ زبان پر۔ دل حرص و ہوس سے معمور۔ زندگی کی جولانگاہ میں ہر حیلے بہانے سے ہم سفر حیات پر سبقت لے جانے کیلئے بیقرار۔ خودستائی اور خودنمائی کے مرض میں مبتلا اپنے آرام کیلئے اگر سینکڑوں پر پانی پھر جائے تو ان کی بلا سے۔ لیکن اپنے ہی جیسے بنی نوع انسان کے دُکھ درد پر دل نہ پسیجے۔ اور ایک چشم تماشہ بیں یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو جائے کہ ؎

چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے

شاہد! اسے کہتے ہیں دُنیا، کوئی حال مست کوئی مال مست!
لیکن شاید تم تو اس انتظار میں ہو گے کہ دیکھیں اصل سوال کا جواب یعنی "یہ زندگی واقعات سے بنتی ہے یا حقیقت میں زندگی ایک فریب ہے جس میں تخلیقِ آدم سے ہم گرفتار ہیں" میں کیا دیتا ہوں۔ میرے دوست! اس کا فیصلہ تو تمہیں کرنا ہوگا۔ ایک مسئلہ تو میرے پیشِ نظر تھا میں نے پیش کر دیا۔ مجھے خوف ہے کہ میرے کرمفرما میری اس تحریر کو کہیں ایک چیستاں ہی نہ تصور کرنے لگیں، اس لئے میں چند ایک واقعات بھی پیش کروں گا۔ وہ واقعات جو زندگی کو گداز کر دیں۔ وہ واقعات جو ایک انسان کی فطرت کا مرقع ہوں۔ وہ واقعات جسے کوئی تو تخیّل کی پرداز سمجھے۔ اور کوئی کسی کی آپ بیتی سمجھ کر صرف اتنا کہہ سکے کہ ؎

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

شاہد بھائی!
میں آج کل اس سرزمین میں ہوں جس کے متعلق کسی نے کہا ہے کہ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

لیکن افسوس! بقول علامہ اقبال ؒ ؎
آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر

گل مرگ جہاں میرا قیام ہے اگر میں اُسے قدرت کی دلفریبیوں کا ایک حسین مرقع کہوں تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ میرے مکان (جسے یہاں ہٹ کہتے ہیں) کے سامنے چیل کے درخت پہرہ داروں کی طرح قطار اندر قطار کھڑے ہیں۔ اور ان پہرہ داروں کی آغوش میں سبزے کا ایک بلند و پست لیکن بہت دلفریب میدان ہے۔ عقب پر کوہسار ہے جس کی چوٹیاں آسمان سے ہم کلام معلوم ہوتی ہیں اور ان میں سے بعض کو مشاطۂ قدرت نے برف کی قبا پہنا کر اور بھی سرفراز بنا دیا ہے۔ ان پہاڑوں کے دامن میں چھوٹی چھوٹی ندیاں طفلِ کوہسار کی طرح اچھلتی کودتی پتھروں سے ٹکراتی اور گل مرگ کے پہرہ داروں کے دامن سے لپٹتی ہوئیں نشیب کی طرف اس طرح رواں دواں ہیں جیسے کسی آبادی کے کہہ و مہہ کوئی تماشہ دیکھنے جا رہے ہوں۔ وادیوں سے بادل اُٹھتے ہیں۔ کبھی سر کہسار گرجتے ہیں کبھی کسی فیل مست کی طرح جھومتے ہوئے میدانوں پر چھا جاتے ہیں اور کبھی الف لیلے کے کسی جن کی طرح دھواں بنکر درختوں میں چکر لگاتے ہیں۔ گاہے برستے ہیں اور گاہے برس کر پھٹ جاتے ہیں اور آسمان کے دامن میں قوس قزح کے دلفریب رنگ بکھر کر بچے شور مچاتے ہیں کہ دیکھو وہ آسمان پر پینگ پڑی۔

میرے دوست! یہ وہی جگہ ہے جہاں میں نے "سراب ہستی" کا آخری حصہ لکھا تھا۔ تمہیں تو یاد ہی ہوگا۔ اسی جگہ جمنا داس اور رسا دھو کی ملاقات ہوتی ہے۔ اور اسی جگہ لاجونتی مذہب پر محبت کو قربان کر کے ایک دُنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیتی ہے اور پڑھنے والا یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ؎

خدا جانے یہ بندے کون سی آتش میں جلتے ہیں
کہ خاکستر کی اک مٹھی سمجھتے ہیں جہنم کو

لاجونتی اور جمنا داس کی داستانِ حیات بھی تو دونوں کی زندگی کے متعدد واقعات ہی ہیں۔ میں نے ان کو ترتیب دیا تو ایک کتاب بنگئی۔
آج بھی میں اسی طرح کچھ واقعات ہی پیش کروں گا۔ تم جانو! اس وقت ژالہ باری ہو رہی ہے۔ یعنی بادلوں سے برف کے موتی برس رہے ہیں۔ ژالہ باری سے میرے کمرے کی کھڑکیوں کے دو چار شیشے بھی چکنا چور ہو گئے ہیں۔ مکان سے کوئی دو سو گز کے فاصلہ پر دھوبی گھاٹ ہے۔ دھوبی جن کی مسلسل چھوا چھو نے فضا میں ایک ترنم سا پیدا کر رکھا تھا۔ ندی سے نکل کر لکڑی کے جھونپڑوں میں جا بیٹھے ہیں۔ اس وقت ایک چھوٹی سی لڑکی اپنی گائے ہانکتی ہوئی جنگل کی طرف بھاگتی جا رہی ہے۔ ارے توبہ! اس غریب کے لئے سر چھپانے کا اور کوئی آسرا بھی تو نہیں۔ شاید قدرت کو اس ننھی سی جان کی بیکسی پر ترس آگیا ہے جو ژالہ باری تھم گئی ہے۔ دھوبی جھونپڑوں سے نکل کر پھر ندی پر آ کھڑے ہوئے ہیں اور وہی چھوا چھو کا تار باندھ دیا ہے۔
خیر! دھوبی تو ہمارے میلے کچیلے کپڑے دھوتے رہیں گے مگر

میں تمہیں اس چھوٹی سی لڑکی کا قصہ سناتا ہوں جو ننگے پاؤں اور ننگے سر اِس ژالہ باری میں اپنی گائے ہانکتی لئے جارہی تھی۔

سرور

خطۂ کشمیر آب وہوا کے نقطۂ نظر سے اور مناظر کی دلکشی اور دلفریبی کے لحاظ سے واقعی جنت ہی کہلانے کے قابل ہے۔ لیکن مفلسی اور ناداری کے جو جانگسل مناظر یہاں دیکھنے میں آتے ہیں اپنے یہاں تو شاید ہی کسی نے دیکھے سُنے ہوں۔ ایک عام "کشمیری" کو دیکھتے ہی اس کی بیکسی اور بیچارگی پر دل پسیجنے لگتا ہے۔ یہاں مجھے ان مسائل پر بحث کرنا مقصود نہیں جو اس مُفلسی اور ناداری کا اصلی باعث ہے۔ لیکن اتنا کہنا تو شاید اخلاقی طور پر بھی گناہ متصور نہ ہوگا کہ حقدار کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ تن کی عریانی کے لئے کپڑا بھی مُشکل سے میسّر آتا ہے اور پھر اس پر قدرت کی ستم ظریفی بھی دیکھئے کہ سردیوں میں جاڑا اور وہ کڑکڑاتا جاڑا پڑتا ہے کہ بس توبہ ہی بھلی۔ چھ مہینے برف کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ لوگ اپنے گھروں میں متواتر کئی کئی روز اس طرح گھسے پڑے رہتے ہیں جیسے چوہے اپنے بلوں میں۔ رات اور دن آگ تاپتے ہیں، چائے پیتے ہیں۔ چاول یا باجرے کی روٹی پر گذران ہے۔ اور جسے یہ نعمت دونوں وقت میسّر ہو وہی سب سے زیادہ خوش نصیب۔

چھ بجے کے قریب جب ابرِ کہسار وادیوں کی آغوش میں کروٹیں بدل رہا تھا میں حسب دستور سیر کے لئے نکلا۔ میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرے مکان کے سامنے ایک خوبصورت اور سرسبز قطعہ زمین ہے۔ کہیں ڈھلوان ہے کہیں چھوٹا سا میدان ہے۔ کہیں اس میدان پر چھوٹی چھوٹی ندیاں سانپ کی طرح بل پیچ کھاتی ادھر سے اُدھر جاتی ہیں اس سرسبز میدان کے دونوں طرف پہاڑ اور جنگل ہے۔ کچھ دُور جاکر یہ میدان ختم ہوجاتا ہے اور پہاڑ آپس میں اس طرح مل جاتے ہیں جیسے مدت کے بچھڑے گلے مل رہے ہوں۔

بائیں جانب چیل کے پیڑوں کے نیچے ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے۔ کوئی گھاس پھوس کی جھونپڑی نہیں۔ چیل کے بڑے بڑے پارچے کاٹ کر اُن کو ایک دوسرے کے متوازی اس طرح کھڑا کیا گیا ہے کہ اُوپر سے سرے آپس میں ملے رہیں۔ ایک طرف تو آنے جانے کیلئے راستہ ہے اور عقب میں اسی طرح تختے کھڑے کرکے سر چھپانے کا آسرا بنا لیا ہے۔ اس جھونپڑی کا فرش بھی چیل کے پتّوں کا ہی ہے۔

جس وقت میں یہاں پہونچا گائے اور بھیڑیں ڈھلوانوں پر چر رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے میلے کچیلے کُرتے جو ٹخنوں تک پہونچتے تھے پہنے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ سروں پر میلی کچیلی ٹوپیاں تھیں پاؤں کی حالت صاف بتلا رہی تھی کہ روزِ تخلیق سے جوتا میسّر نہیں ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی یہ بچے میری طرف بھاگے اور پاس آکر "پانسہ (پیسہ) دو! بہت گلیب" (غریب) کہنے لگے۔

یوں تو سبھی بچوں کی شکل وصورت سے افلاس ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن ان میں کوئی چار ایک سال کی لڑکی دیکھکر تو میرا دل بہت پسیجا۔

نیلی نیلی آنکھیں، گورا رنگ۔ بھولی بھالی شکل وصورت۔ کُرتا اتنا پھٹا ہوا کہ ایک تار بھی ثابت نہ تھا۔ خوبصورت سیاہ بال تھے اور چہرے سے معصومیت ٹپک رہی تھی۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں۔ صورت سوال، میری طرف مُڑ مُڑ دیکھ رہی تھی۔ اور بچوں نے وہی "پانسہ دو۔ بہت گلیب" کی رٹ لگا رکھی تھی۔

میں نے اس بچی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر پوچھا "تمہیں پیسہ نہیں چاہیئے؟"

اُس نے معصومانہ انداز سے سر ہلاکر کہا "پانسہ دو! میلا (میرا) باپ مل (مر) گیا"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چھرور!" (سرور) اس نے جواب دیا۔

پاس سے ایک اور بچی بولی "میرا نام کھڈی۔ میرا باپ بھی مر گیا"

میں نے ہنسکر کہا "تم سب کا باپ مرگیا۔ ماں نہیں مرا"

سرور جس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا بولی "میلا باپ مل گیا" (میرا باپ مرگیا)

"تم پیسہ کیا کروگی؟" میں نے سرور سے پوچھا۔

"ٹوپی" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"تمہارے پاس ٹوپی نہیں" میں نے پوچھا۔

پاس سے وہی لڑکی جس نے اپنا نام کھڈی بتلایا تھا بولی "اسکی ماں کا گائے ہے۔ سُوکھ گئی اب"

شاہد صاحب!

بات میں بات نکل آتی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے بچے اُن گوجروں

سکے تھے جو دُور دراز علاقوں سے گرمیوں کے موسم میں اپنی گائے بھینس
دودھ بیچنے کے لئے ایسے مقامات پر لے آتے ہیں جہاں سیاح آکر
ٹھہرتے ہیں۔ اب تم اُردو زبان کی مقبولیت کا اسی سے اندازہ لگالو
کہ کشمیر کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی اسے سمجھتے اور بولتے ہیں۔ گو اُنکے
یہاں تذکیر و تانیث کا امتیاز نہیں تاہم یہ لوگ اپنا مطلب سمجھانے اور
دوسرے کا مفہوم سمجھنے کی پوری پوری قدرت رکھتے ہیں۔

دربار کشمیر کے کسی اخبار میں یہ اعلان دیکھ کر کہ اُردو کے دوش
بدوش ہندی کی تعلیم بھی مدارس میں جاری کی جائے، مجھے بڑا تعجب
ہوا۔ کیونکہ ایسے ملک میں جہاں ۹۵ فی صدی مسلمان آباد ہوں اس
قسم کی کوشش کرنا محض اپنی تعصب نگاہی کا اظہار کرنا ہے۔ حالانکہ
کشمیر ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہندی کے پاؤں جمنے نہ صرف مشکل
ہیں بلکہ ناممکن۔ تم اسے اُردو سے میری عقیدت مت سمجھ لینا۔ بلکہ یہ
ایک امر واقعہ ہے کہ اُردو اس ملک کے باشندوں کے رگ و پے میں اثر
کر چکی ہے اور نت نئے روز اسے ترقی حاصل ہو رہی ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کشمیر کے سوداگر اور مزدور پیشہ
لوگ سردیوں کے موسم میں بکثرت ہندوستان آتے ہیں۔ اور
پانچ چھ مہینے ہر سال یہاں قیام کرتے ہیں اور جو زبان اس
ملک میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اسے بہت جلد سیکھ
جاتے ہیں۔

دوسرے گرمیوں کے موسم میں وہ سیاح جو ہندوستان
کے گوشہ گوشہ سے کشمیر میں آتے ہیں اُن کو بھی مجبوراً اُردو زبان میں
ہی یہاں کے لوگوں سے بات چیت کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ اپنا مطلب
سمجھانے کیلئے ان لوگوں کو وہی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے جو عام
طور پر یہاں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔

"تو خیر!" میں نے سرور سے پوچھا "تمہاری گائے ہے؟"

"ماں کے پاس!" اُس نے بھولے پن سے جواب دیا۔

"دودھ دیتی ہے؟"

"نہیں!" اُس نے بھولے پن سے کہا "چھوک (سوکھ گئی)"

میں نے انہی لوگوں کا لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا ماں کدھر؟"

"لکڑی کو گیا!" سرور نے جواب دیا۔

پاس سے ایک بچہ بولا "اس کا ماں لکڑی کاٹ کر بیچتا ہے"

"سرور!" میں نے پوچھا "تم گائے لیکر آج باہر گیا"

سرور نے تو صرف سر ہلا دیا لیکن وہی کھڈی بولی "جب گولہ
(ژالہ باری) پڑا یہ جنگل سے آیا"

"سرور!" میں نے پوچھا "تمہیں جاڑا نہیں لگتا؟"

کھڈی پھر بولی "اس کا ماں بہت گریب!"

"اور تمہارا؟" میں نے ہنسکر پوچھا۔

"ہمارا چار گائے" کھڈی نے ذرا مسکراکر جواب دیا۔

"دودھ دیتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چاروں" اس نے ذرا سر ہلاکر جواب دیا۔

"پھر تم پیسہ کیوں مانگتا ہے؟"

"گریب۔ بہت!" کھڈی نے جواب دیا۔

یہ سنکر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے ایک ایک پیسہ سب بچوں کو دیا
اور ڈیرے پر واپس آگیا۔

بچے ایک کمرے میں گرم کپڑے پہنے کیرم کھیل رہے تھے۔ آتشدان
میں آگ جل رہی تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ اس وقت مجھے سرور کی بے سرو
سامانی کا خیال آیا اور میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ کل سرور کیلئے ایک
گرم کرتا اور ایک ٹوپی بازار سے خرید کرلے جاؤنگا۔

رات کے کھانے کے بعد جب میں برآمدے میں ٹہل رہا تھا تو
میدان کے آخری سرے پر بائیں جانب کی ڈھلوان کے اوپر مجھے آگ
جلتی نظر آئی۔ یہ آگ اسی کٹیا کے پاس جل رہی تھی جہاں سرور اور اسکی
ماں رہتی تھیں۔

ندی جو مکان کے سامنے سے گذرتی ہے اپنی دُھن میں زندگی
کے راگ الاپتی جا رہی تھی۔ اور زندگی کے راگ کیسے نہ الاپتی جبکہ دختر ابر
بادۂ حیات کے جام سرکہسار اس وقت بھی انڈیل رہی تھی۔ دھوبی گھاٹ
کی طرف سے گانے بجانے کی آواز آرہی تھی۔ چاند چیل کے پیڑوں کے
عقب سے کسی نرم رو عاشق کی طرح تاک جھانک کر رہا تھا۔ اس وقت
مکان کے پاس سے ایک "گھوڑے والا" کشمیری زبان میں بے سری تانیں
اڑاتا چلا جا رہا تھا۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گھوڑے والا!" اُس نے گھوڑا روک کر کہا "صبح چلے گا
حضور!"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"اپیترا!" اُس نے جواب دیا "برف دیکھنے کے قابل"

"تم کدھر جاتا؟" میں نے پوچھا۔

"گھر حضور۔"

"اس وقت؟" میں نے کہا "رات ہوگئی۔"

"پھر کیا حضور!" وہ بولا "بچے کو روٹی دینا۔"

یہ کہکر وہ پھر وہی گیت گاتا ہوا فارسٹ روڈ کی طرف چلا گیا۔

شاہد میاں! دیکھا تم نے! یہ بھی زندگی ہے۔ لیکن ایسی زندگی جس کے خیال سے ہی طبیعت کچھ پریشان سی ہونے لگے۔ علامہ اقبال مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں کہ ؎

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

دوسرے دن میں نے بازار سے ایک گرم کرتا اور ایک خوبصورت ٹوپی خریدی۔ اور ارادہ کیا کہ عصر کے بعد سرور کو جا کر دوں گا۔ لیکن دو بجے کے قریب مطلع آسمان پھر ابر آلود ہونے لگا۔ کوہ آپتر کی جانب جو پہاڑ ہیں ان پر بادلوں کی ایک قنات سی لگ گئی۔ پھر یہ بادل آہستہ آہستہ گل مرگ کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک چھوٹی سی سرخ اور سیاہ رنگ کی چڑیا جس نے مکان کی چھت میں کہیں گھونسلا بنا رکھا تھا، پھولوں کی کیاریوں میں کیڑے مکوڑوں کی تاک میں بیٹھی تھی۔ ادھر اُدھر سے دو ایک کیڑے چونچ میں پکڑتی اور بچوں کو چوگا دے آتی۔ اب جو بوندیں پڑنے لگیں تو وہ بھی اپنے گھونسلے میں جا بیٹھی۔ لیکن دھوبی گھاٹ کی جانب سے وہی چھوا چھو کی ترنم آفریں آواز پیہم آرہی تھی۔ یا وہ شوریدہ سر گاف کھیلنے والے تھے جو بارش میں بھی دیوانوں کی طرح کھیل میں مصروف تھے یا "پوش" کی آواز تھی جو ان کھلاڑیوں کے "اسٹک بردار" کسی راہگذر کو دیکھکر دیتے تھے۔

موسم کا تقاضہ تھا کہ یوں ہی گھر بیٹھا رہوں۔ لیکن ایک معصوم بچے کی مسرت کا خیال اُکسا رہا تھا۔

توجناب! میں اپنی برساتی اور چھتری لیکر گھر سے نکلا اور میدان کی راہ لی۔ سرور کی کٹیا تک پہونچتے پہونچتے میرا سانس پھول گیا۔ دونوں اندر بیٹھی تھیں۔ ایک طرف دو پتھر جوڑ کر ایک چولہا بنا رکھا تھا۔ چولھے پر ایک ہنڈیا چڑھا رکھی تھی۔ بارش چونکہ کچھ زیادہ ہونے لگی تھی میں اندر چلا گیا۔ ایک طرف سیاہ رنگ کا ایک پھٹا پرانا کمبل جسے یہ لوگ "لوئی" کہتے ہیں رکھا تھا۔ ایک کونے میں لکڑی کاٹنے کی ایک کلہاڑی پڑی تھی۔ ایک پانی کا گھڑا تھا اور مٹی کی سبز رنگ کی دو پیالیاں اور دو ایک اور برتن رکھے تھے۔

"بیٹھ جائیے حضرت!" سرور کی ماں بولی۔

"یہ تمہاری بچی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری سرور!" اُس نے بچی کی طرف پیار کی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کا باپ کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ غریب مرگیا!" عورت نے جواب دیا "تین برس گذرے۔"

"اور کوئی رشتہ دار نہیں؟"

"بس اللہ حضرت!" اُس نے جواب دیا۔

"گذر کیسے ہوتی ہے؟"

"جب اس کا باپ مرا" وہ بیٹی کی طرف دیکھکر بولی "ہمارے پاس چار گائے تھا۔ ہمارے گاؤں کا نمبردار بڑا پاجی۔ اُس نے دو گائے چھین لیا۔ ایک مرگیا۔ ایک ہے۔"

"دودھ دیتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو سوکھ گیا" اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔

میرے استفسار پر اُس نے بتلایا کہ وہ ہر روز جنگل سے لکڑی کاٹ کر لاتی ہے۔ پانچ چھ پیسے میں گٹھا فروخت ہوجاتا ہے۔ بس اسی پر گذر ہے۔ اس عورت کی عمر کوئی پچیس ایک برس ہوگی۔ میں نے پوچھا کہ وہ دوسری شادی کیوں نہیں کرلیتی۔ اس کا جواب اس نے یہ دیا کہ شادی تو وہ کرلیتی لیکن بچی چونکہ چھوٹی ہے اس لئے کوئی شادی پر رضامند نہیں۔ میں نے برساتی کی جیب سے گرم کرتا اور ٹوپی نکالی۔ اور سرور کی ماں سے کہا کہ وہ بچی کو پہنادے۔ میرا خیال تھا کہ نئی ٹوپی اور کرتا پہن کر بچی بہت خوش ہوگی لیکن نئی چیزوں کو دیکھکر وہ کچھ گھبرائی سی معلوم ہوتی تھی۔

"سرور!" میں نے پوچھا "ٹوپی پسند؟"

اس کا جواب صرف ایک معصومانہ نگاہ تھی۔ لیکن ماں محبت بھری نگاہوں سے بچی کی طرف دیکھ دیکھکر مسکرا رہی تھی۔

"چائے پیو حضرت!" عورت بولی۔

"ہنڈیا میں چائے چڑھا رکھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پھر کیا حضرت!" اُس نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا۔

"رات کیا کھاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"یہی قلچہ اور چائے!" عورت نے جواب دیا۔

"بس!" میں نے تعجب سے کہا۔

اُس کا جواب صرف "نصیب" تھا۔

شام ہوچکی تھی۔ پانی پڑ رہا تھا اور یہاں وہاں جھینگروں نے اپنا راگ چھیڑ رکھا تھا چیل کے ہرے ہرے پیڑوں پر ایک تحیّر خیز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی دھاریں ڈھلوانوں سے اُتر کر میدان کی طرف آ رہی تھیں۔ بھیگی بھیگی گھاس تھی جس پر چلنے سے ایک لُطف سا حاصل ہوتا تھا۔ جب میں گھر پہونچا تو نوکر نے میرے کمرے میں آگ جلا رکھی تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ میں نے برساتی اُتار کر کھونٹی پر رکھی اور آگ کے پاس کُرسی کھینچکر بیٹھ گیا۔ کمرے کی تمام فضا راحت اور آرام سے لبریز تھی۔

شاہد! یہ بھی زندگی ہے۔ اور اس کٹیا والی عورت اور ننّھی سرور کی بھی زندگی تھی۔ جہاں تک سانس کی آمد و شد کا تعلق ہے ہم دونوں زندہ تھے۔ لیکن دونوں زندگیوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اب تم ہی بتلاؤ کہ زندگی واقعات سے مبنی ہے یا حقیقت میں ہم تخلیق آدم سے زندگی کے فریب میں گرفتار ہیں۔ میرے دوست ؎

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

دوسرے روز جو میں پھر اسی جانب سیر کو گیا تو انہی ڈھلوانوں کے پاس ان گوالوں کے بچوں نے مجھے آگھیرا۔ ننّھی سرور بھی انہی میں شامل تھی لیکن نئی ٹوپی اور نیا کُرتا پہنے ہوئے۔ لیکن وہ آج بھی کل کی طرح پانسہ دو۔ بل گلیب (بڑی غریب) کہہ رہی تھی۔ مجھے اُسے دیکھکر ہنسی آگئی۔

ایم۔ اسلم

ایمائی انجام

ہے عشق سے نُورانی فطرت کا جلوہ خانہ
مجبورِ محبت کیا ہوتا نہیں فرزانہ
زد دل پہ محبت کی ہوتی ہو تو ہوتا ہے
احساس بھی مستانہ کردار بھی مستانہ

(۲)

جب عشق زدہ کوئی نکلا تو ہوا یہ غُل
اچھی ہے یہ نادانی اچھا ہے یہ دیوانہ
دیوانۂ ہوش افزا مجھ کو نظر آیا کیا
یاد آگیا مجنوں کا بھولا ہوا افسانہ

(۳)

مستِ مئے عشق انساں ہر دور میں ہوتا ہے
آتا ہے بغیر اس کے کب دور میں پیمانہ
بے عشق اثر اپنا دکھلائے یہ ناممکن
لُطفِ مے و میخانہ سحرِ بُت و بُتخانہ

(۴)

ہے عشق کے تخلیقی جلووں سے جہاں روشن
ضو پاش ہے یہ سب پر گلشن ہو کہ ویرانہ
ہاں عشق ہی انساں کو بیباک بناتا ہے
ہاں عشق کی اک تابش ہے جراَتِ رندانہ

(۵)

انساں کی خصوصیت اوروں میں نہیں لیکن
اوروں میں غنیمت ہے سوزِ دلِ پروانہ
پروانہ کا "ایمائی انجام" نہیں دیکھا؟
اے بوالہوس بتنک تُو ہے عشق سے بیگانہ!

یہ ہیچمیرزی ہے سرمایۂ صد عبرت
برباد نہ ہو جائے خاکسترِ پروانہ

علی منظور

(ریڈیائی ڈرامہ:۔)

محبت کی پیدائش

کالج سے ملحقہ باغ میں:۔

(خالد سیٹی بجا رہا ہے۔ سیٹی بجاتا بجاتا خاموش ہوجاتا ہے۔

پھر ہولے ہولے اپنے آپ سے کہتا ہے:۔)

خالد:۔ اگر پریم ہاکی یا فٹ بال کے میچوں میں کپ جیتنے تقریر کرنے اور امتحانوں میں پاس ہوجانے کی طرح آسان ہوتا تو کیا کہنے تھے..... مجھے سب کچھ مل جاتا سب کچھ!! (پھر سیٹی بجاتا ہے) نیلے آسمان میں ابابیلیں اُڑ رہی ہیں، اس چھوٹے سے بغیچے کی ہر پتّی خوشی سے تھرتھرا رہی ہے، پر میں خوش نہیں ہوں۔ میں بالکل خوش نہیں ہوں۔

کالج کے گھنٹے کی آواز بلند ہوتی ہے۔ (ٹن، ٹن، ٹن ٹن)

خالد:۔ میری زندگی کے گھنٹے میں نہ جانے کب آواز پیدا ہوگی۔ (آہ بھرتا ہے)

(چند لمحات خاموشی طاری رہتی ہے۔)

حمیدہ:۔ خالد صاحب!

خاموشی

حمیدہ:۔ خالد صاحب!

خالد:۔ (چونک کر) کیا ہے؟

حمیدہ:۔ میں ہوں!۔ مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔

خالد:۔ اوہ!.... حمیدہ.... کہو یہ ضروری کام کیا ہے؟... میں یہاں یونہی لیٹے لیٹے اونگھنے لگا تھا..... کیا کسی کتاب کے بارے میں کچھ کہنا ہے؟ بولو؟.... مگر تم نے مجھے خواہ مخواہ اتنی importance کیوں دے رکھی ہے۔ فلسفے میں میں اتنا ہوشیار نہیں جتنی کہ تم ہو... عورتیں فطرتاً فلسفی ہوتی ہیں۔

حمیدہ:۔ میں آپ سے فلسفے کے بارے میں گفتگو کرنے نہیں آئی Plato اور Aristotle اس معاملے میں میری اتنی مدد نہیں کر سکتے جتنی کہ آپ کر سکتے ہیں۔

خالد:۔ میں حاضر ہوں۔

حمیدہ:۔ میں بہت جرأت سے کام لے کر آپکے پاس آئی ہوں۔ آپ یقین کیجئے کہ میں نے بہت بڑی جرأت کی ہے۔ بات یہ ہے... مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے... مگر نہیں اس میں شرم کی کون سی بات ہے.... مجھے یہ کہنا ہے کہ پرسوں رات میں نے اپنے آبا جی کو امّی جان سے یہ کہتے سُنا کہ وہ آپ سے میری شادی کر رہے ہیں۔

خالد:۔ (خوش ہوکر) کیا سچ مچ؟۔

حمیدہ:۔ جی ہاں... میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ بات پکّی ہوگئی ہے اور فائنل کے بعد ہم ایک دوسرے سے بیاہ دیئے جائیں گے۔

خالد:۔ حد ہوگئی ہے، مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں۔ یہ چُپ چاپ اُنہوں نے بڑا دلچسپ کھیل کھیلا..... دراصل بات یوں ہوئی ہے کہ میں نے اپنی امّی جان سے ایک دو مرتبہ تمہاری تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ جو شخص حمیدہ جیسی.... حمیدہ جیسی.... حمیدہ جیسی، میں کہہ ہی کیوں نہ دوں.. حمیدہ جیسی پیاری لڑکی کا شوہر بنے گا، وہ کس قدر خوش نصیب ہوگا (ہنستا ہے) حد ہوگئی ہے، میں یہاں اسی فکر میں گھلا جا رہا تھا کہ تم کسی اور کی نہ ہوجاؤ۔ .... (ہنستا ہے، خوب ہنستا ہے).... نیلے آسمان میں ابابیلیں اُڑ رہی ہیں، اس چھوٹے سے بغیچے کی ہر پتّی خوشی سے تھرتھرا رہی ہے.... اور میں خوش ہوں... کس قدر خوش ہوں (ہنستا ہے) حمیدہ، اب تمہیں ہم سے پردہ کرنا چاہیئے۔ اور جب کالج کی دوسری لڑکیوں کو معلوم ہوگیا کہ ہمارا "یہ" ہوگیا ہے تو وہ تمہیں کتنا ستائیں گی... پر تم مجھ سے کہنے کیا آئی تھیں؟

حمیدہ:۔ میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ مجھے یہ شادی منظور نہیں۔

خالد:۔ یہ شادی منظور نہیں.... میں تمہیں ناپسند ہوں؟.... کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو حمیدہ؟

حمیدہ:۔ خالد صاحب میں اس معاملے پر زیادہ گفتگو کرنا نہیں چاہتی۔ میں آپ سے صرف یہ کہنے آئی تھی کہ اگر ہماری شادی ہوگئی تو یہ میری مرضی کے بالکل خلاف ہوگی — ہماری زندگی اگر ہمیشہ کے لئے تلخ ہوگئی تو اسکے ذمہ دار آپ ہونگے، میں نے اپنے دل کی بات آپ سے چھپا کر نہیں رکھی۔ جو فرض میرے ماں باپ کو ادا کرنا چاہیئے تھا، میں نے ادا کر دیا ہے۔ آپ عقلمند ہیں، روشن خیال ہیں، اس لئے میں آپکے پاس آئی، ورنہ یہ راز قبر تک میرے سینے میں محفوظ رہتا۔

خالد:۔ پر.... حمیدہ.... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

حمیدہ:۔ مگر میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔

خالد۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟

حمیدہ۔ اور اس میں میرا کیا قصور ہے؟

خالد۔ حمیدہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مَیں جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرا دل تمہاری اور صرف تمہاری محبت سے بھرا ہوا ہے۔

حمیدہ۔ لیکن میرا دل بھی تو آپ کی محبت سے معمور ہو.... میرے اندر سے بھی تو یہ آواز پیدا ہو کہ حمیدہ آپ کو چاہتی ہے.. میں بھی تو آپ سے جھوٹ نہیں کہہ رہی... اگر آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں تو آپ کی محبت اس وقت مجھ پر کیا اثر کرسکتی ہے۔ جب میرا دل آپکی محبت سے خالی ہے۔

خالد۔ ایک دیا دوسرے دئے کو روشن کرسکتا ہے۔

حمیدہ۔ صرف اُس صورت میں جب دوسرے دئے میں تیل موجود ہو... میرا دل تو بالکل خشک ہے، آپ کی محبت کیا کرسکے گی؟.... میں نے آجتک آپ کو اُن نگاہوں سے کبھی دیکھا ہی نہیں جو محبت پیدا کرسکتی ہیں لیکن میں آپکے بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ ایک نہایت اچھے نوجوان ہیں، با اخلاق ہیں، کالج میں سب سے زیادہ ہوشیار طالبعلم ہیں، آپ کی صحت، آپ کی علمیت، آپ کی قابلیت قابلِ رشک ہے، آپ ہمیشہ میری مدد کرتے رہے ہیں، مگر مجھے افسوس ہے کہ میرے دل میں آپ کی محبت ذرّہ برابر بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ممکن ہے دُرست نہ ہو، مگر یہ تمام خوبیاں جو آپکے اندر موجود ہیں ضروری نہیں کہ وہ کسی عورت کے دل میں آپ کی محبت پیدا کردیں۔

خالد۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو... مجھے اس کا احساس ہے۔

حمیدہ۔ توکیا مَیں اُمید رکھوں کہ آپ مجھے اس بے معنی کی شادی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرینگے۔

خالد۔ مجھ سے جو کچھ ہوسکے گا میں ضرور کرونگا۔

حمیدہ۔ تو مَیں جاتی ہوں.....

(چند لمحات خاموشی طاری رہتی ہے... پھر خالد
دردناک سُروں میں سیٹی بجاتا ہے۔)

خالد۔ نیلے آسمان میں ابابیلیں اُڑ رہی ہیں۔ اس چھوٹے سے بغیچے کی ہر پتّی خوشی سے تھرتھرا رہی ہے.... پر مَیں خوش نہیں ہوں..... بالکل خوش نہیں ہوں۔

اُسی روز شام کو۔ خالد کے گھر

خالد کا باپ۔ (دروازے پر آہستہ سے دستک دے کر) بھئی میں ذرا اندر آسکتا ہوں۔

خالد۔ آئیے آئیے ابا جی۔

خالد کا باپ۔ میں نے بہت مشکل سے تمہارے ساتھ چند باتیں کرنیکی فُرصت نکالی ہے، یوں کہو کہ ایسا اتفاق ہوگیا ہے کہ تم بھی گھر میں موجود ہو اور مجھے بھی ایک آدھ گھنٹے تک کوئی کام نہیں.... بات یہ ہے کہ تمہاری ماں نے تمہاری شادی کی بات چیت پکّی کردی ہے۔ لڑکی حمیدہ ہے، جسکو تم اچھی طرح جانتے ہو، تمہاری کلاس میٹ ہے اور میں نے سُنا ہے کہ تم دل ہی دل میں اُس سے ذرا... محبت وغیرہ بھی کرتے تھے۔ چلو اچھا ہوا.... اب تمہیں اور کیا چاہیئے.... امتحان پاس کرو اور دُلہن لے آؤ۔

خالد۔ مگر میں نے تو یہ سُن رکھا تھا کہ حمیدہ کی شادی مسٹر بشیر سے ہوگی جو پچھلے برس ولایت سے ڈاکٹریٹ لیکے آئے ہیں۔

خالد کا باپ۔ شادی اُسی سے ہونے والی تھی مگر حمیدہ کے والدین کو جب معلوم ہوا کہ وہ شرابی اور آوارہ مزاج ہے تو انہوں نے یہ خیال موقوف کردیا۔ مگر تمہیں ان باتوں سے کیا تعلق ــــ حمیدہ تمہاری ہو رہی ہے... ہو رہی کیا، ہوچکی ہے۔

خالد۔ حمیدہ راضی ہے کیا؟

خالد کا باپ۔ ارے راضی کیوں نہ ہوگی؟ اور جب میرے بیٹے خالد کی شادی کا سوال ہو تو اُس میں رضامندی وغیرہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔

خالد۔ You are flattering me Dad

خالد کا باپ۔ چلو، ہٹاؤ اب اس قصّے کو، مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں.... اچھا تو میں چلا.... پر ایک اور بات بھی تو مجھے تم سے کرنا تھی ــ تمہاری اماں نے تو ایک لمبی چوڑی فہرست بنا کردی تھی.... ہاں، یاد آیا.. ... دیکھو بھئی، نکاح کی رسم پرسوں یعنی اتوار کو ادا ہوگی۔ اس لئے کہ حمیدہ کا باپ صبح جانے سے پہلے پہلے اس فریضے سے سُبکدوش ہوجانا چاہتا ہے... ٹھیک ہے، ٹھیک ہے... ایسا ہی ہونا چاہیئے، میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ ہم سب تیار ہیں۔ تمہیں جن لوگوں کو invite کرنا ہو کرلینا، مجھے اس دردسری میں مُبتلا نہ کرنا بھئی، میں بہت مصروف آدمی ہوں۔

خالد۔ بہت اچھا ابا جی۔

خالد کا باپ۔ ہاں، ایک بات اور... ممکن ہے میں تم سے کہنا بھول جاؤں اس لئے ابھی سے کان کھول کے سُن لو... شادی کے بعد اپنی بیوی کو سر پر نہ چڑھا لینا، ورنہ یاد رکھو بڑی آفتوں کا سامنا کرنا پڑیگا، اپنی ماں کی طرف دیکھ لو، کس طرح مجھے نکیل ڈالے رکھتی ہے۔

خالد۔ (ہنستا ہے)... نصیحت کا شکریہ۔

خالد کا باپ۔ شکریہ وکریہ کچھ نہیں... تم سے جو کچھ میں نے کہا ہے،

اس کا خیال رکھنا اور بس... تو میں چلا... نکاح کے ایک روز پہلے مجھے یاد دلا دینا تاکہ میں کہیں اور نہ چلا جاؤں۔

خالد۔ بہت اچھا آپا جی۔

(دروازہ بند کرنے کی آواز)

خالد۔ (ہولے ہولے، گویا گہری فکر میں غرق ہے) بہت اچھا آپا جی..... میں نے کتنی جلدی کہہ دیا "بہت اچھا آپا جی... بہت اچھا" جو کچھ ہونا ہے ہو.... اب اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے؟.... نیلے آسمان میں ابابیلیں اُڑتی رہیں گی۔ بغیچوں میں پتّیاں خوشی سے تھرتھراتی رہیں گی اور یہ دل ہمیشہ کیلئے اُجڑ جائیگا.... اُجڑ جائے گا!!

چار روز کے بعد کالج میں — پرنسپل کا آفس

(گھنٹی بجائی جاتی ہے، پھر دروازہ کھولا جاتا ہے)

چپراسی۔ جی حضور۔

پرنسپل۔ خالد کو اندر بھیجدو۔

(دروازہ کھولنے اور بند کرنے کی آواز، پھر دروازہ کھلنے اور خالد کے اندر جانے کی آواز۔)

پرنسپل۔ (کھانستا ہے) تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟

(خالد خاموش رہتا ہے۔)

پرنسپل۔ (بارعب لہجے میں) میں پوچھتا ہوں تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟

خالد۔ (سنجیدگی کے ساتھ) کچھ نہیں، میرا دل صاف ہے۔

پرنسپل۔ تم گستاخ ہوگئے ہو۔

خالد۔ کالج میں اگر کوئی گستاخ لڑکا نہ ہو تو پرنسپل اپنی قوتوں سے بیخبر رہتا ہے، اگر اس کمرے کو جس میں آپ بیٹھے ہیں ترازو فرض کر لیا جائے تو میں اس ترازو کی وہ سوئی ہوں جو وزن بتاتی ہے۔

پرنسپل۔ تم مجھے اِس بیہودہ منطق سے مرعوب نہیں کر سکتے۔

خالد۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔

پرنسپل۔ (زور سے) تم خاک بھی نہیں جانتے۔

خالد۔ آپ بجا فرما رہے ہیں۔

پرنسپل۔ میں بجا نہیں فرما رہا۔ اگر میرا فرمانا بجا ہوتا تو کل تم ایسی بے ہودہ حرکت نہ کرتے جس نے ایکدم تمہیں سب لوگوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا ہے۔ اب تم میں اور ایک بازاری غنڈے میں کیا فرق رہا ہے؟

خالد۔ آپ سے عرض کروں؟

پرنسپل۔ کرو، کرو کیا عرض کرنا چاہتے ہو، میں تمہاری یہ نئی منطق بھی سُن لوں۔

خالد۔ بازاری غنڈا چوک میں کھڑا ہو کر جو اُس کے من میں آئے کہہ سکتا ہے، مگر میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ اپنے دل کا تالا کھول سکوں، جو تہذیب آج سے بہت عرصہ پہلے وہاں لگا چکی ہے — بازاری غنڈا مجھ سے ہزار درجے بہتر ہے۔

پرنسپل۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، تم اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکے۔ اس لئے جو سزا میں نے تمہارے لئے تجویز کی ہے قائم رہیگی۔

خالد۔ مگر.....

پرنسپل۔ میں کچھ سُننا نہیں چاہتا... میرے کالج میں ایسا لڑکا ہرگز نہیں رہے گا جو بدچلن ہو، آوارہ ہو.... تم نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑا چلایا ہے، اب اس میں دوسرے کیا کر سکتے ہیں؟ — تم نے ایک ایسی نازیبا حرکت کی ہے کہ اُس کی سزا دئے بغیر میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔

خالد۔ آپ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور فرمایئے، اتنی جلدی نہ کیجئے۔ آپ مجھے اپنے کالج سے باہر نہیں نکال سکتے۔

پرنسپل۔ (غصے میں) کیا کہا؟

خالد۔ میں نے یہ کہا تھا کہ آپ مجھے اپنے کالج سے کیسے باہر نکال سکتے ہیں — آپ کو.... آپ کو.... میرے چلے جانے سے کیا آپ کو نقصان نہ ہوگا؟۔

پرنسپل۔ نقصان؟ — تمہارے چلے جانے سے مجھے کیا نقصان ہو سکتا ہے.... تم جیسے دو درجن لڑکے میرے کالج سے چلے جائیں — خس کم جہاں پاک۔

خالد۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھے پرنسپل صاحب... مجھے افسوس ہے کہ اب مجھے خود ستائی سے کام لینا پڑیگا۔ آپ کے سامنے یہ کالا بورڈ جو لٹک رہا ہے، اس پر سب کے اُوپر کس کا نام لکھا ہے؟ — آپ بتانے کی تکلیف گوارا نہ کیجئے — یہ اسی آوارہ اور بدچلن کا نام ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ بی۔ اے میں وہ صوبے بھر میں اوّل رہا۔ اس بورڈ کے ساتھ ہی ایک اُردو بورڈ لٹک رہا ہے جو آپ کو بتا سکتا ہے کہ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کا ہوشیار سے ہوشیار طالب علم بھی آپ کے کالج کی کالی بھیڑ، خالد کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ تقریر میں اُس نے تین سال تک کسی کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ آپ کے پیچھے ایک تختہ لٹک رہا ہے، اگر آپ کبھی اس پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ خالد جب سے آپکے کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان بنا ہے، شکست ناممکن ہو گئی ہے۔ فٹ بال کی ٹیم میں مجھ سے بہتر گول کیپر آپ کہاں سے تلاش کریں گے؟ اخبار لکھتے ہیں کہ میں لوہے کا مضبوط

جالا ہوں، سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں .... اور جب پچھلے برس ہیچ کے دوران میں ہنگامہ ہو گیا تھا تو آپ کو بچانے کے لئے کس نے آگے بڑھکر ڈھال کا کام دیا تھا؟ ـــ اسی خاکسار نے ـــ آپ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کیجئے۔ ایم۔ اے کے امتحانات اور بیج بہت قریب آگئے ہیں۔

پرنسپل:۔ کیا اپنا احسان جتا کر تم مجھے رشوت دینے کی کوشش کر رہے ہو؟

خالد:۔ پرنسپل صاحب آج کل دُنیا کے سارے دھندے اسی طرح چلتے ہیں۔ بچّہ جب تک روئے نہیں ماں دودھ نہیں دیتی۔ یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں، مگر آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ پڑوس میں اگر بن ماں کا یتیم بچّہ رونا شروع کر دے، تو میری ماں دودھ کی بوتل لیکر اس طرف کبھی نہیں دوڑے گی۔ آپ مجھے صرف اس لئے عزیز سمجھتے ہیں کہ آپ میرے احسان مند تھے اور مجھے پسند بھی کرتے تھے اور میں نے اس روز آپکو اس لئے بچایا کہ وہ میرا فرض تھا۔ میں آپ کو رشوت نہیں دے رہا .... مجھے معلوم ہے کہ آپ سزا دے کر رہیں گے، مَیں خود سزا چاہتا ہوں مگر کڑی نہیں۔ رشوت تو وہاں دی جاتی ہے جہاں بالکل اجنبیت ہو۔

پرنسپل:۔ تم تقریر کرنا خوب جانتے ہو۔

خالد:۔ یہ کالا بورڈ بھی جو آپکے سامنے لٹک رہا ہے یہی کہتا ہے۔

پرنسپل:۔ میں حیران ہوں کہ تم نے شراب پی کر کالج میں اُدھم کیوں مچایا۔ تم شریر تھے مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم شراب بھی پیتے ہو ..... تمہارے کیرکٹر کے بارے میں مجھے کوئی شکایت نہ تھی مگر کل کے واقعہ نے تمہیں بہت پیچھے ہٹا دیا ہے۔

خالد:۔ جب کھائی پھاندنا ہو تو ہمیشہ دس بیس قدم پیچھے ہٹ کر کوشش کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی ایک گہری کھائی پھاندنے کی کوشش کی ہو۔

پرنسپل:۔ مجھے افسوس ہے کہ تم اس کوشش میں اوندھے مُنہ اُس گہری کھائی میں گر پڑے۔

خالد:۔ ایسا ہی ہوگا، مگر مجھے افسوس نہیں۔

پرنسپل:۔ تو اب تم کیا چاہتے ہو؟

خالد:۔ میں کیا چاہتا ہوں؟ .... کاش کہ مَیں کچھ چاہ سکتا! ـــ آپ سے میری صرف یہ گذارش ہے کہ سزا دیتے وقت پُرانے خالد کو یاد رکھئے گا اور بس۔

پرنسپل:۔ تمہیں ایک سال کے لئے کالج سے خارج کر دینے کا حکم لکھ چکا ہوں۔ ـــ یہ سزا تمہاری ذلیل حرکت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس سے تم معلوم کر سکتے ہو کہ پُرانے خالد کو میں نے ابھی تک اپنے دل سے محو نہیں کیا۔

خالد:۔ میں آپ کا بیحد ممنون ہوں۔ ایک سال کے بعد جب خالد پھر آپکے پاس آئیگا تو وہ پُرانا ہی ہوگا۔

پرنسپل:۔ اب تم چُپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ اور دیکھو اس تازہ غم کو دُور کرنے کیلئے شراب خانے کا رُخ نہ کرنا۔

خالد:۔ ایک بار جو میں نے پی ہے اس کا نشہ عمر بھر تک رہے گا۔ آپ بےفکر رہیں۔

(دروازہ کھلنے اور بند کرنے کی آواز)

پرنسپل:۔ بڑا پُراسرار لڑکا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ شراب پی کر کیا اِسے کالج ہی میں آکر اپنے آپ کو نشر کرنا تھا۔

(خالد جب کمرے سے باہر نکلتا ہے تو دس پندرہ لڑکے اُس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اُس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے ہیں۔)

ا:۔ کیوں خالد کیا ہوا؟

ب:۔ سال بھر کیلئے *expell* کر دئے گئے؟

ج:۔ تم نے سخت غلطی کی، شراب تو میں بھی پیتا ہوں مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

د:۔ نہ جانے اس کے سر پر کیا وحشت سوار ہوئی۔

س:۔ پہلی مرتبہ پی اور بُری طرح پکڑے گئے مرے یار۔

ز:۔ اب کیا ہوگا؟

خالد:۔ بکواس نہ کرو.... جو کچھ ہو چکا ہے وہ تمہارے سامنے ہے، جو کچھ ہوگا وہ بھی تم دیکھ لوگے .... دنیا سے کوئی چیز پوشیدہ بھی رہی ہے؟

(کالج کے گھنٹے کی آواز۔ ٹن، ٹن ٹن)

خالد:۔ جاؤ اپنی اپنی کلاس *attend* کرو.... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

(چند لمحات کے لئے خاموشی طاری رہتی ہے۔)

(کالج سے ملحقہ باغ میں)

خالد:۔ بڑے بڑے معرکہ خیز میچوں میں حصّہ لیا ہے، بڑی بڑی چوٹیں کھائی ہیں، مگر یہ تھکن جو اس وقت محسوس ہو رہی ہے آج تک کبھی طاری نہیں ہوئی۔ بینچ کی اِسی جھاڑی کے پاس حمیدہ نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کئے تھے .... اب یہیں تھوڑی دیر بیٹھکر اُن کو جوڑتا ہوں ....

دل ٹوٹا ہوا ہو، مگر پہلو میں ضرور رہنا چاہیئے . . . . اس کے بغیر زندگی فضول ہے . . . . اس وقت مجھے کسی ہمدرد کی کتنی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، مگر . . . . .

گانا:
کون کسی کا میت منوا . . کون کسی کا میت
راگ سبھا ہے دنیا ہے ساری جیون دکھ کا گیت
منوا کون کسی کا میت
رام بھروسے کھینے والے نیا کو منجدھار
اپنے ہاتھوں آپ ڈبوئے کیوں ڈھونڈے پتوار

ڈبو دی . . . . اپنے ہاتھوں آپ ڈبو دی . . . . .

حمیدہ:- خالد صاحب!

(خالد خاموش رہتا ہے)

حمیدہ:- (ذرا بلند آواز سے) خالد صاحب؟

خالد:- (چونک کر) . . . کیا ہے؟ . . . اوہ، حمیدہ ہے! . . . میں . . . میں . . . شاید گا رہا تھا۔

حمیدہ:- میں سن رہی تھی۔

خالد:- سن رہی تھیں؟ . . . . کیا سچ مچ؟ . . . . میں کتنا بے سُرا ہوں . . . اور یہ گیت جو میں گا رہا تھا کتنا اوٹ پٹانگ تھا۔ ہاں . . . تو . . . کیا تمہیں کسی کتاب کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے؟

حمیدہ:- میں یہ پوچھنے آئی ہوں کہ آپ نے میری غیر حاضری میں کل کیا گل کھلایا؟

خالد:- اوہ، تم کل کی بات پوچھ رہی ہو، مگر وہ تو کل کی بات ہو چکی، اسکے متعلق پوچھ کے کیا کرو گی؟

حمیدہ:- کیا آپنے سچ مچ کل شراب پی کر یہاں شور وغل مچایا؟

خالد:- یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟

حمیدہ:- مجھے یقین نہیں آتا!

خالد:- کہ میں نے تمہارے کہے پر عمل کیا ہوگا؟

حمیدہ:- میرے کہے پر؟ . . . . میں نے آپ سے شراب پینے کو کبھی نہیں کہا۔

خالد:- تو کیا زہر پینے کو کہا تھا؟

حمیدہ:- اور اگر میں نے کہا نہ ہوتا تو؟

خالد:- میں کبھی نہ پیتا۔

حمیدہ:- کیوں؟

خالد:- اس لئے کہ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں، اس میں کوئی شک نہیں، مگر میں اس محبت کی شکست پر اُس کو ہلاک کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پرانے عاشقوں کا فلسفہ میری نگاہوں میں فرسودہ ہو چکا ہے۔ جب تک میں زندہ رہ سکونگا، تمہاری محبت کو اپنے سینے میں دبائے رہونگا۔ تم میری آنکھوں کے سامنے رہوگی تو میرے زخم ہمیشہ ہرے رہیں گے . . . . جب ایک روگ اپنی زندگی کو لگا یا ہے تو وہ کیوں نہ عمر بھر تک ساتھ رہے . . . تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی محبت کا گلا گھونٹ دوں۔

حمیدہ:- تو آپنے صرف میری محبت کی خاطر اپنے آپکو رسوا کیا؟

خالد:- ظاہر ہے!

حمیدہ:- لیکن کیا آپ کو اس رسوائی کے علاوہ کوئی اور راستہ نظر نہ آیا؟

خالد:- کئی راستے تھے، لیکن مجھے یہی اچھا نظر آیا . . . تم خود دیکھ لوگی کہ ہینگ پھٹکری لگے بغیر رنگ چوکھا آئے گا . . . آج شام ہی کو جب تمہارے گھر میرے کان سے نکالے جانے کی خبر پہونچے گی تو تمہارا وہ کام فوراً ہو جائے گا جس کے لئے تم نے مجھ سے امداد طلب کی تھی۔ نہ میں نے اپنے والدین کی عدول حکمی کی اور نہ تمہیں اپنے والدین . . . . کو ناراض کرنے کا موقع ملا۔ بتاؤ میں نے کیا غلط راستہ منتخب کیا؟

حمیدہ:- لیکن یہ بدنامی، یہ رسوائی جو آپنے مول لی!

خالد:- مجھے اب شادی نہیں کرنا ہے۔ جو یہ رسوائی اور بدنامی میرے حق میں غیر مفید ہوگی۔

حمیدہ:- اور اگر آپ کو شادی کرنا پڑی تو؟

خالد:- پاگل ہوگئی ہو . . . . جب تم کسی ایسے مرد سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہو جس سے تم محبت نہیں کر سکتیں، تو میں کیونکر ایسی عورت سے شادی کر سکتا ہوں جس سے میں محبت نہیں کرتا؟

حمیدہ:- ممکن ہے آپ کو کسی سے محبت ہو جائے!

خالد:- یہ ناممکن ہے، جس طرح تمہارے دل میں میری محبت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح میرے دل میں تمہارے سوا کسی اور کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی . . . . مگر ایسی گفتگو سے کیا فائدہ میری روح کو سخت تکلیف پہونچ رہی ہے۔

حمیدہ:- آپنے یہ کیسے کہہ دیا کہ میرے دل میں محبت پیدا ہی نہیں ہو سکتی؟

خالد:- میں نے یہ کہا تھا کہ تمہارے دل میں میری محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔

حمیدہ:- اور اگر ہو جائے؟

خالد۔ یعنی کیا؟

حمیدہ۔ میرے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو جائے .... ایکا ایکی مجھے ایسا محسوس ہونے لگے کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں .... کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟۔

خالد۔ اپنے دل سے پوچھو۔

حمیدہ۔ ایسی بات پوچھی نہیں جاتی، اپنے آپ معلوم ہو جایا کرتی ہے۔ پڑوسی کے مکان میں آگ لگ جائے تو کیا آپ دوڑتے ہوئے پاس جاکر یہ پوچھیں گے، کیوں صاحب کیا واقعی آپ کا مکان جل رہا ہے؟

خالد۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

حمیدہ۔ میں ٹھیک سمجھا نہیں سکی۔ لیکن اب سمجھنے اور سمجھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ آپ چاہتے تھے اور جس کے متعلق مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا آج ایکا ایکی ہو گیا ہے۔

خالد۔ کیا ہو گیا ہے؟

حمیدہ۔ میرے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو گئی ہے .... اتوار کو ہمارا نکاح ہو رہا ہے۔

خالد۔ محبت؟.... تم .... میں .... میں .... نکاح .... وہ کیسے؟

حمیدہ۔ مجھے آپ سے شادی کرنا منظور ہے۔ جب گھر میں آپکے کالج سے نکال دئے جانے کی بات ہو گی تو میں سارا واقعہ بیان کر دوں گی .... اس طرح کوئی بدگمانی پیدا نہ ہو گی .... مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ کا ایک برس ضائع ہو گیا۔

خالد۔ ایک برس ضائع ہو گیا .... میں تمہیں اپنا بنانے کے لئے، تمہارے دل میں اپنی محبت پیدا کرنے کے لئے اپنی زندگی کے سارے برس ....،

حمیدہ۔ میں اب جاتی ہوں، مجھے پرنسپل صاحب سے ملکر یہ کہنا ہے کہ میں اس سال امتحان میں شریک نہیں ہو رہی۔ ہم اگلے سال اکٹھے امتحان دینگے۔

(چند لمحات خاموشی طاری رہتی ہے)

خالد۔ نیلے آسمان میں ابابیلیں اُڑ رہی ہیں، اس بغیچے کی پتی پتی خوشی سے تھرتھرا رہی ہے اور میں کس قدر حیرت زدہ ہوں .... کس قدر حیرت زدہ ہوں ....،

سعادت حسن منٹو

غزل

وہ رُوٹھے رُوٹھے ہیں بگڑے بگڑے وہ تازہ تازہ عتاب اُنکا
بڑھا بڑھا دستِ شوق میرا کھچا کھچا سا نقاب اُنکا

قدم قدم پر ہے اک قیامت، نظر نظر میں ہے ایک محشر
لباس رنگیں چمن چمن ہے بہار پر ہے شباب اُنکا

لٹک رہی ہیں جبیں پہ بوندیں، پسینہ آیا ہے رنگ و بو کو
ہوائیاں اُڑ رہی ہیں رُخ پر ستم ستم اضطراب اُنکا

یہ روکھی روکھی عجیب باتیں یہ پھیکی پھیکی شریر شوخی
یہ اُڑتا اُڑتا سا رنگ صورت، یہ بہکا بہکا شباب اُنکا

وہ گہری گہری سی آرزوئیں وہ ہلکی ہلکی خلش سی دل پر
وہ میٹھے میٹھے حسین جملے وہ نرم و نازک خطاب اُنکا

یہ شوخی شوخی یہ مستی مستی یہ شرم شرم اور بے کلی سی
وہ ہائے انگڑائی لے رہا ہے مچل مچل کر شباب اُنکا

یہ ہلکی ہلکی سی مُسکراہٹ، یہ گہری گہری شرابِ اُلفت
یہ تازہ تازہ پیام میرا یہ سادہ سادہ جواب اُنکا

وہ دیکھکر مجھ کو پہلے پہلے وہ اُنکا شرما کے بھاگ جانا
وہ پیچھے پیچھے وہ جھاڑیوں کے وہ ہچکچاتا حجاب اُنکا

تڑپ تڑپ کر وہ چھیڑتے ہیں، مچل رہا ہے وہ اُنکے ہاتھوں
وہ کھویا کھویا سا سازؔ اُنکا وہ پیارا پیارا رباب اُنکا

سازؔ برہانپوری

بھوت

جب بھیگی ہوئی شاموں کو چڑیوں کے قافلے ہواؤں کو چیرتے ہوئے دُور پھیکے پھیکے اندھیرے میں گم ہو جاتے۔ اور جب چولھوں اور تنوروں سے نکلا ہوا دُھواں ایک بہت گہرا بادل بن کر گاؤں پر چھا جاتا تو ولی سر جھکائے گھر سے باہر نکلتا، اور سرسبز کھیتوں کے گھاس سے ڈھکے ہوئے کناروں پر سے ہوتا ہوا سرکاری ذخیرے کے اُس حصے میں پہنچ جاتا، جہاں دن کو بھی انسان کے حواس قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ فلک بوس سیاہ چوٹیاں، گہری خوفناک گھاٹیاں، گنجان جھاڑیاں، جن میں سے اکثر سانپوں کے پھنکارنے کی آوازیں آتی تھیں۔ اور کئی راتوں کو تو چرواہوں نے موسلا دھار بارش میں بھی اِن گھاٹیوں میں دیئے جلتے دیکھے تھے۔ لیکن ولی کے قدموں میں نہ کوئی ہچکچاہٹ ہوتی، نہ اُس کی رفتار میں کسی قسم کی تبدیلی نظر آتی۔ وہ اسی طرح مست مست قدم اُٹھاتا اور سر جھکائے بڑھتا جاتا۔ گویا برسوں سے انہی راہوں پر چل پھر رہا ہے، وہ ان دشوار گزار پہاڑیوں پر سے اس آسانی سے نیچے اُتر جاتا۔ جیسے گول گول پتھر اُس کے قدموں کے نیچے جم کر رہ جاتے۔ وہ نیچے اُتر کر ایک چشمے کے کنارے بیٹھ جاتا، اور دردناک سُروں میں ایسے دُکھ بھرے گیت گاتا کہ آس پاس کی پہاڑیاں گونج اُٹھتیں اور کالی چوٹیوں کے کنارے پر ننھے ننھے ستارے شدتِ درد سے اس زور کے ساتھ کپکپاتے جیسے ابھی لپک کر اس گھاٹی میں آ رہیں گے۔ اِن گھاٹیوں کے اردگرد رہنے والے دہقانوں نے ولی کے اِن گیتوں کو بھی کسی غیر مرئی مخلوق کی دل لگی پر محمول کیا۔ اور پندرہ بیس دن کے بعد تو گاؤں بھر میں اس عجیب و غریب رُوح کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جو آدھی آدھی رات تک علاقے کی زبان میں ایسے ایسے شعر کہتی ہے، کہ .... کہ .... (اور یہاں وہ اپنے روایتی مبالغے سے کام لیتے) .... کہ چشموں کا پانی اُبلنے لگتا ہے، آس پاس چراغ جلنے لگتے ہیں۔ درختوں کی چوٹیاں جھک جھک کر زمین کو چھونے لگتی ہیں گھنگھروؤں کے جھنجھنانے کی آوازیں آتی ہیں۔ آسمان سے جو ستارا ٹوٹتا ہے وہ اُدھر ہی کا رُخ کرتا ہے!۔

گاؤں سے یہ باتیں نکل کر سارے علاقے میں پھیل گئیں۔ اور کچھ دن کے لئے چوپال پر انہیں کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتی رہیں!

لیکن ولی نے اپنے دُکھے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے یہ خوفناک جگہ صرف اس لئے تجویز کی تھی کہ یہاں وہ اپنی زندگی کی چند سُنہری گھڑیاں گزار چکا تھا۔ اور یہاں اُسے دُنیا کی جھوٹی دردمندی اور رسمی غمخواری نہیں ستا سکتی تھی! یہاں وہ جی کھول کر خدائے سمیع و بصیر کے حضور میں، وہ فریاد بے کھٹکے پیش کر سکتا تھا جو دن کے وقت اس کا دم گھونٹ لیتی تھی!۔

اپنے آپ کو بے درد لوگوں سے محفوظ رکھنے اور اُن کے شکوک کو اور زیادہ مضبوط کرنے کیلئے اُس نے دو چار موم بتیاں بھی خرید لیں۔ ایک دو گھنگھرو بھی جیب میں ڈال لئے۔ اب وہ گھاٹی میں چشمے کے کنارے موم بتیاں جلا دیتا۔ کبھی کبھی گھنگھروؤں کو ہلا دیتا۔ اور خود کسی چٹان کی اوٹ میں اپنے گیت گاتا رہتا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھتا اور پھر موم بتیاں بجھا کر اور گھنگھرو وہیں کسی جھاڑی میں چھپا کر واپس گاؤں آ جاتا۔

ایک رات اُسے رستے میں گاؤں کا بوڑھا چوکیدار مل گیا۔ بوڑھے نے زور سے پوچھا "خبردار، کون ہے تو؟"

اُس نے آہستہ سے کہا "ولی محمد"

بوڑھا نزدیک آ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "مگر بیٹا ایسی اندھیری رات میں کدھر نکل گئے تھے۔ تم نے سُنا نہیں سرکاری ذخیرے کی پورب والی گھاٹیوں میں آج کل جنات نے ڈیرے جما رکھے ہیں۔ آدھی آدھی رات تک بتیاں جلتی ہیں۔ گیت گائے جاتے ہیں۔ ناچ ہوتے ہیں۔ میں نے یہاں گاؤں میں کئی بار گھنگھروؤں کی آواز سُنی ہے۔ آجکل علاقے پر بڑا بھاری وقت آیا ہوا ہے، ہوش سے چلا پھرا کرو۔ کہیں کوئی بھتنا تمہیں دبوچ نہ لے۔ بڑی ظالم مخلوق ہوتی ہے یہ۔ راہ چلتے کو چھیڑتے ہیں اور پھر گردن مروڑ کر دم لیتے ہیں۔"

ولی نے جواب دیا "باباجی۔ مجھے خدا کی ذات پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ میں اُس کے سوا اب کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔"

بوڑھا زور سے کھانسا اور ولی کے اس عجیب و غریب عقیدے پر تعجب کا اظہار کرتا ہوا ایک گلی میں مُڑ گیا۔

گھر والے اس کے کھوئے کھوئے انداز اور موٹی موٹی آنکھیں

دیکھکر پریشان رہنے لگے، اُس کی نوجوان بیوی آدھی آدھی رات تک
جاگتی رہتی اور جب ولی واپس آتا تو پوچھتی تم آج پھر دیر سے آئے۔ آخر
چوپال والوں کو گپیں ہانکنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا؟"
اُسکی بوڑھی ماں بھی جاگ اُٹھتی اور کہتی "بیٹا، آجکل بھوتوں نے علاقے
میں اُدھم مچا رکھا ہے، اتنی دیر باہر نہ رہا کرو۔"

اُس کا ننھا سا بچہ بھی آنکھیں ملتا غوں غاں کرتا اُٹھ بیٹھتا۔ جیسے
اپنی توتلی زبان میں باپ سے اس رویّے کی وجہ پوچھ رہا ہے۔

ولی اِن سب کا جواب ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے دیتا۔ اور دم
سے کھاٹ پر دراز ہو جاتا۔

آج شام کو ذخیرے میں جانے سے پہلے وہ گاؤں کے عین
وسط میں ایک تنگ و تاریک گلی میں سے گزرا۔ اس گلی میں تین چار
چماروں کے گھر تھے۔ جن سے ہر وقت کچے چمڑے اور گلی سڑی کھالوں کی
بدبو آتی رہتی تھی۔ ان میں سے ایک گھر بالکل ویران پڑا تھا۔ دالان میں چند
صاف اور چوکور پتھر پڑے تھے۔ جن پر چمار چمڑا کوٹتے ہیں۔ ان پر آدھ آدھ
انچ گرد جمی ہوئی تھی۔ سرکنڈوں کا چھپر بارش کی وجہ سے نیچے جھک آیا تھا۔
صحن میں گاؤں کے آوارہ کتے کھیل رہے تھے۔ اور کوٹھے کی منڈیروں
پر بے شمار گلہریاں اپنی پھولی ہوئی دُمیں اُٹھائے ایک دوسرے کے پیچھے
بھاگ رہی تھیں۔ ولی اُس مکان کے قریب آکر رُکا، اندر جھانکا۔ حیران
کھڑا رہا۔ جیسے کوئی ملّاح اپنی کشتی ڈبو کر کنارے پر بیٹھا اپنے تاریک
مستقبل میں اُمید کی کرن ڈھونڈتا ہے اور نہیں پا سکتا۔ وہ صحن کے بوسیدہ
چولھوں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ مکان کا قفل ہاتھ میں لیکر انگلیوں کو
اس طرح پھیرا جیسے چابی گھماتا ہے۔ اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ آسمان کی طرف
دیکھا، زمین کو گھورا اور پھر وہاں سے نکل کر سرکاری ذخیرے کو چلدیا۔
جس کے اردگرد دو دو تین تین کوس کے فاصلے پر بھولے دہقان دیوں
کے جلنے بجھنے، گیتوں کے گائے جانے اور گھنگھروؤں کی جھنکار کے
منتظر تھے۔

اور اب اُس گلی کے چکر کاٹنا بھی اُس کا معمول ہو گیا۔

جب وہ نامراد انسان کے خیالات کی طرح بل کھاتے رستے
پر چڑھنے لگتا، اور ننّھے ننّھے کنکر اُس کے قدموں تلے سے کھسک کر نیچے
لڑھکتے۔ اور جب درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں سے اُس کی پگڑی اُلجھ
جاتی اور وہ اُسے چھڑانے کے لئے رُک جاتا۔ پھر جب درخت کی شاخوں
کو ہلتا دیکھ کر آشیانوں سے چیلیں پھڑپھڑاتی ہوئی نکلتیں اور دور کسی
چٹان یا اونچے درخت سے ٹکرا کر نیچے گر جاتیں تو فضا ایسی ہیئت
اختیار کر لیتی جیسے ہر طرف ارواح خبیثہ کی بادشاہی ہے، اور جیسے ان
درختوں کی آڑ میں بھتنے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ اور کھیلتے کھیلتے ہوا
میں اُڑ جاتے ہیں! ولی کو لوگوں کے اس شبہ کو یقین میں بدلتے دیکھکر
کچھ نہ کچھ روحانی تسکین حاصل ہوتی۔ کیونکہ دوسرے لوگوں کے احساسات
سے کھیلنے کی لذّت مرنے والے انسان کے دل میں بھی موجود ہوتی
ہے، لیکن جب وہ واپس گاؤں آتا۔ اور چوپال کی چھت پر سے کسی نوخیز
لڑکے کے گانے کی آواز آتی ؎

اجے نہیں سَن پُھلیاں پَھلیاں
ماہی توڑیاں آس دیاں کلیاں[1]

تو اُس کے دل سے کچھ ایسی دردناک ہوک اُٹھتی کہ وہ سینے کو دونوں
ہاتھوں سے دبا کر بیٹھ جاتا، اور سر نہ اُٹھاتا، جب تک اُس کی آنکھوں سے
آنسو بہتے بہتے ختم نہ ہو جاتے!

جب وہ آنکھیں بند کر کے اپنے سرد بستر پر لیٹتا تو اُس کی
نظروں کے سامنے اندھیرا ایک خاص شکل اختیار کر کے ناچنے لگتا۔
وہ دیکھتا کہ اندھیرے کا سیلاب ایک وسیع دائرے میں تبدیل ہو گیا
ہے، اور یہ دائرہ حرکت میں ہے، اندھیرے پردوں کے پیچھے بانسریوں
کی دھیمی دھیمی چبھتی لہریں بلند ہو رہی ہیں۔ اس اندھیرے سے بھی ایک
گہرا سایہ بانسریوں کی آواز میں لپٹا ہوا آہستہ آہستہ اُبھرتا اور اِس
دائرے کے کچھ اس تیزی سے چکر کاٹتا کہ آسمان و زمین لامحدود فضا
میں لڑھکتے محسوس ہوتے۔ یہ اندھیرا سایہ چکر کاٹتا، ناچتا، گاتا، بڑھنے
لگتا۔ بڑھتا جاتا، بڑھتا جاتا، حتیٰ کہ اس کا وجود اس کے سارے احساسات
پر چھا جاتا۔ وہ آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھتا۔ آسمان پر ستارے انسان
کی بے بضاعتی اور مضحکہ انگیز خیال آرائی پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور
ولی فضا میں اس طرح ہاتھ گھمانے لگتا، جیسے وہ کسی ٹھوس جسم کو چھونا
چاہتا ہے!

دن کو بیلوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جب ہل کی پھال سے
کوئی جنگلی پھول کٹ کر پرے جا گرتا۔ یا کوئی کیڑا مضطرب ہو کر کسی
سوراخ سے نکلتا۔ اور اپنا ننھا سا سر اُٹھا کر اپنی خانہ ویرانی کا ماتم کرنے
لگتا تو ولی بیلوں کو اس قدر پیٹتا کہ ان کی کمریں سوج جاتیں۔ وہ آنکھیں

---

[1] ابھی تک ان میں پھول پھل نہیں لگے تھے۔ ساجن نے میری آس کی کلیاں (قبل از وقت) توڑ لیں۔

پیٹھ پر شیشم کی پتلی چھڑی جماتے ہوئے کہتا "کمبخت، ذرا ادھر سے ہو کر گزر جاتے تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ ابھی اِس ننھی اُودی کلی نے دُنیا کا دیکھا ہی کیا تھا کہ تم نے اِس کو مسل کر خاک میں ملا دیا۔ اور اس ذرا سی جان نے تمہارا کیا قصور کیا تھا کہ اس کا گھر منہدم کر کے آگے بڑھے جا رہے ہو ــــ!"

آس پاس ڈھیریوں پر چرواہے وَلی کو اپنے آپ سے باتیں کرتا سُنتے تو اکٹھے ہو جاتے اور دبی دبی آواز میں کہتے "ارے، وَلی کس سے بول رہا تھا؟"

"بیلوں سے!"

"پاگل ہو گیا!"

"بیمار ہے بے چارا"

"پیر جی کے سلام کو نہیں جاتے"

"نماز نہیں پڑھتا"

"نقصان اُٹھائے گا"

"مر جائے گا"

اگرچہ وَلی اُن کی باتیں نہ سُن سکتا۔ لیکن اُن کو یوں سر جوڑے بیٹھا دیکھ کر اُسے معلوم ہو جاتا کہ وہ اُسی کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ اور اُنھوں نے اسکے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی۔

ایک روز وہ سویرے ہی ہل چلا کر گھر آ گیا۔ اور دل بہلانے کے لئے چوپال پر چلا گیا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ سرکاری ذخیرے کے بھوتوں کے متعلق بحث چھڑی ہوئی تھی۔ وَلی کو دیکھ کر ایک سفید ریش بزرگ بولا "وَلی آ رہا ہے، اُس سے پوچھو، چوکیدار کہہ رہا تھا کہ اکثر کالی راتوں کو وَلی گاؤں کے باہر دُور دُور تک چکر کاٹتا رہتا ہے، اور نہیں ڈرتا۔ کیا اس نے بھی کبھی کچھ دیکھا یا سُنا؟"

وَلی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور بولا "لوگوں سے تو یہ قصہ سُن رکھا ہے، لیکن نہ اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا ہے نہ کانوں سے کچھ سُنا ہے۔ اگر کہو تو آج رات گھاٹی میں جا کر اس سارے "اسرار" کا حال معلوم کر آؤں۔ اگر کچھ چیز ہوئی تو مجھے تو دکھائی دیگی۔ ورنہ مفت میں مسافروں کو گھاٹی کے اُس طرف روکے رکھنا اور گھروں سے ڈر کے مارے باہر قدم نہ دھرنا بہت بُری بات ہے۔"

بڑے بوڑھوں نے اُسے ایسے خوفناک اقدام سے روکا۔ اُس کے دوستوں نے اُس کی اِس جُرأت پر اظہارِ تعجب کیا۔ اور سارے چوپال والے حیران ہونے لگے کہ انسان بھوتوں سے لڑنے کی کیسے جُرأت کر سکتا ہے!

ایک بوڑھا بولا "بیٹے وَلی! اِس مخلوق سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔ کسی بھوت نے ہنسی مذاق میں ایک تھپڑ جما دیا تو مرتے دم تک چین نہ پاؤ گے۔ کسی نے بڑھ کر گردن اینٹھ دی تو ان لوگوں کا کیا بگڑیگا۔ ایک جوان بیوی کو بیوہ اور ایک معصوم بچّے کو یتیم کر جاؤ گے۔ ایسا نہ کرنا۔ وہ بھوت ہم انسان، وہ آگ ہم خاک۔ ہمارا اُن کا کیا مقابلہ!"

لیکن وَلی نے تہیّہ کر لیا کہ وہ آج سرکاری ذخیرے کے بھوتوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دے گا۔ وہ گھر واپس آیا۔ اس کی بوڑھی ماں اور نوجوان بیوی نے اُس کے ہاتھ جوڑے، منتیں کیں کہ اُدھر نہ جانا ڈائنیں کلیجہ نکال کر چبا جاتی ہیں اور پھر مرنے والے کے گھر پر دھاوا بول دیتی ہیں۔ لیکن وَلی انکار کرتا رہا۔ وہ جی ہی جی میں لوگوں کی اس غلط فہمی پر مسکراتا رہا اور سوچتا رہا کہ ایک دو راتیں یہ سوانگ بند رکھے گا۔ اور لوگوں کا تعجب بڑھانے کے لئے پھر یہی سلسلہ چھیڑ دیگا۔ وہ اپنے غمزدہ دل کو اِن لاحاصل مصروفیتوں میں ڈال کر بھلانا چاہتا تھا۔

اُس شام وہ گھر سے نکل کر چماریوں والی گلی کی طرف جانے لگا تو چوپال کے قریب اُسے ایک نوجوان ممّوں ملا۔ اُس نے پوچھا "ابھی تک نہیں گئے وَلی؟ بھوت تمہارا انتظار کر رہے ہونگے"

وَلی صرف مُسکرا دیا۔

ممّوں بولا "بھئی۔ مذاق کی بات نہیں اُدھر نہ جانا۔ اب یہ فتّو چمار کی لڑکی کا قصّہ تو تم نے سُنا ہوگا۔ لوگوں نے اُسے بھی آدھی آدھی رات کو اُس ذخیرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ایک روز ذرا دیر سے آئی اور بیمار پڑ گئی"

وَلی نے کہا "لیکن اُسے صرف بخار ہوا۔ اور پھر بدپرہیزی سے بڑھ گیا۔ اب چار ماہ سے سارا کنبہ جو لاہور کے بڑے ہسپتال میں ہے تو کسی اُمید پر ہی بیٹھا ہی نا۔ اُمید ہے چمارن اچھی ہو کر آئے گی"

ممّوں نے متعجب ہو کر کہا "اچھی ہو کر آئے گی! ـــــ تمہیں ابھی تک معلوم نہیں کیا؟ چمار ابھی ابھی چوپال سے دس بارہ آدمی بُلا کر لے گئے ہیں۔ اسٹیشن پر چمارن کی لاش آئی ہوئی ہے، وہ اُسے اُٹھانے گئے ہیں"

وَلی نے بہت دھیمی آواز میں کہا "اوہ بیچاری ـــ مر گئی؟"

وہ سر جھکائے خاموش سیدھا ذخیرے کی طرف چلدیا۔

ساری رات لوگ اُس کی واپسی کے منتظر رہے۔ اُس رات

نہ بتیاں جلیں، نہ گیت گائے گئے، نہ کنکر لڑھکے نہ چیلیں اُڑیں۔ نہ گھنگھرو جھنجھنائے اور نہ ناچ ہوا۔ ایک اُداس سا سناٹا ہر طرف منڈلاتا رہا سورج کے طلوع ہوتے ہی وَلی کی ماں اور بیوی کی چیخ و پکار سے مجبور ہو کر دس بارہ نوجوان گھاٹی کی طرف دوڑے۔ جب وہ چوٹیوں پر پہونچے اور نیچے گھاٹی میں جھانکنے لگے، تو دُور، بہت نیچے، چشمے کے کنارے انہیں وَلی کا بے حس و حرکت جسم نظر آیا —— اور گھاٹی میں خاموشی گونج رہی تھی!

"وَلی۔ وَلی۔ وَلی محمد۔ او ولی محمد! —" وہ چیخنے لگے۔ اور آس پاس بھیانک سیاہ چٹانیں اُن کی آوازیں دُہرانے لگیں۔ "بھوت" اُن کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ اچانک ایک جھاڑی پر سے ایک چڑیا اُڑی، اور چشمے پر پانی پینے لگی۔ پھر اُڑ کر وَلی محمد کے پیٹ پر بیٹھ گئی۔ پُھدکتی پھری، ناچتی رہی۔ اور آخر پُھر سے اُڑی اور اُوپر ہی اُوپر اُٹھنے لگی۔ نوجوان "بھوت۔ بھوت" پکارتے وحشیوں کی طرح گاؤں کی طرف بھاگے۔ اور جب چوپال پر پہونچے تو دُور سے اُنہوں نے ایک مجمع دیکھا، جو چمارن کی لاش اُٹھائے گاؤں میں داخل ہو رہا تھا —!

احمد ندیم قاسمی

پریشانِ آرزو

رنگینیِ فلک سے عیاں ہے پیامِ شوق
گویا شفق ہے جلوۂ عُنوانِ آرزو

پھر دامنِ فلک سَبد گلفروش ہے
پھر بڑھ رہی ہے وسعتِ دامانِ آرزو

پھر آ رہے ہیں جھونکے ہوائے بہار کے
پھر جوشِ عشق، دل میں ہے مہمانِ آرزو

پھر کالی بدلیاں نظر آتی ہیں چرخ پر
پھر اُڑ رہی ہے زلفِ پریشانِ آرزو

پھر ہو رہا ہے ابرِ بہاری گہر فشاں
پھر بچھ رہے ہیں شوق سی دامانِ آرزو

پھر برقِ شعلہ ریز کو جنبش ہے چرخ پر
رقصاں ہے پھر یہ شعلۂ عریانِ آرزو

پھر ماہتاب، بامِ فلک پر ہے جلوہ ریز
پھر ضَو فشاں ہی شمعِ شبستانِ آرزو

پھر باصرہ نواز ستارے چمک اُٹھے
پھر شعلہ زا ہے سوزشِ پنہانِ آرزو

پھر یاد آ گیا کوئی محفل فروزِ حُسن
پھر بڑھ رہی ہے رونقِ ایوانِ آرزو

پھر بڑھ گئیں کسی کے تصوّر کی شوخیاں
پھر تازہ کشمکش میں پھنسی جانِ آرزو

رُخصت ہوئی مناظرِ لطف آفریں کی سیر
اب میں ہوں اور کاوشِ پنہانِ آرزو

جمعیّتِ نشاط کا ساماں کہاں نصیب
اِک دل ہے اب سو وہ بھی پریشانِ آرزو

فرحت کانپوری

جہاں میں تھا

وہاں ہر آرزو "اس روز" مہماں تھی جہاں میں تھا
بہ طورِ میزباں کل بزمِ امکاں تھی جہاں میں تھا

"کسی دیوار پر جیسے کوئی "روشن جبیں" ابھرے"
درختوں میں وہ سعیٔ ماہِ تاباں تھی جہاں میں تھا

گھٹا کے سات پردوں سے تجلّی پھوٹ نکلی تھی
تجلّی سات پردوں سے نمایاں تھی جہاں میں تھا

فضا میں ہر ستارہ تیرتا معلوم ہوتا تھا
نظر بادل کے ہر ٹکڑے پہ رقصاں تھی جہاں میں تھا

چلے آتے تھے "کومل گیت" "پروائی" میں مل جل کر
انہیں گیتوں میں فطرت بھی غزلخواں تھی جہاں میں تھا

ہجومِ "کرمکِ شب تاب" "تھا" "نوشٹ" کے پھولوں پہ
دو بالا شوکتِ بزمِ چراغاں تھی جہاں میں تھا

پھپھک سبزے کی، خوشبو مختلف نوخیز کلیوں کی
سُہانی رات۔ شبنم عطر افشاں تھی جہاں میں تھا

سناؤں کیا وہ کیا ساعاتِ رنگینِ محبت تھے
مجسّم رونقِ شمعِ شبستاں تھی جہاں میں تھا

قدِ بالا پہ "باڈی" اور "پیٹی کوٹ" "نارنجی"
وہی "سورج مکھی" "سروِ خراماں" تھی جہاں میں تھا

سوادِ شامِ خلوت میں رُخ و گیسو کے نظارے
رہینِ شامِ خلوت، صبحِ خنداں تھی جہاں میں تھا

محبت صرفِ نازِ حُسن محوِ ناز برداری
جفائے "ہر حسیں" "افواہِ عُریاں" تھی جہاں میں تھا

تکلف ہی نہ تھا زیبِ قرینہ۔ ہر نفاست میں
تواضع بھی شریکِ ساز و ساماں تھی جہاں میں تھا

مہیا تھے وجوبی لازماتِ کیفِ خوش بختی
مری ناسازیٔ قسمت۔ پریشاں تھی جہاں میں تھا

سماعت کیلئے لب ہائے شیریں نغمہ گستر تھے
بصارت کیلئے "شوخی" "گل افشاں" تھی جہاں میں تھا

ادائے نو بہ نو مصروفِ دلداری پیہم تھی
مرے پہلو بہ پہلو برقِ رخشاں تھی جہاں میں تھا

"تمہاری ہو چکی" یہ کہہ کے سر شانے پہ رکھ دینا!
جبینِ آگہی سر در گریباں تھی جہاں میں تھا

وطن والوں سے دادِ ربطِ باہم کی توقع کیا؟
"کہیں ترکِ وطن" "تدبیر آساں" تھی جہاں میں تھا

خیالِ چاک دامانی۔ امینِ پاک دامانی
زلیخا اپنی کج فہمی پہ گریاں تھی جہاں میں تھا

اُدھر بھاری قدم رکھتے ہوئے رہگیر جاتے تھے
اِدھر انگشتِ حیرت زیرِ دنداں تھی جہاں میں تھا

ہر آہٹ پر "جھجک" "کر جھانک لیتی تھی دریچوں سے
وہ میری۔ بلکہ اپنی بھی نگہباں تھی جہاں میں تھا

مرے اشعار کے "اجزائے رُسوائی" پہ تنقیدیں
میں شاعر۔ وہ سخن فہم و سخنداں تھی جہاں میں تھا

زباں پر اُس کے توصیفِ حرم تحقیق کی حد تک
مرے ایمان کی دُنیا پشیماں تھی جہاں میں تھا

غرض اُس کیلئے لازم تھا میرا "مذہبی" ہونا
غرض وہ کافرہ عینِ مسلماں تھی جہاں میں تھا

شاد عارفی

ایک [illegible] سُرخ پھولوں والا اوورکوٹ۔

باپ اور بیٹا

یہ ایک بڑا پرانا واقعہ ہے ـــــ میری عمر اس وقت صرف چار برس کی تھی ـــــ لیکن جب سوچتا ہوں تو تمام منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ـــــ ایک بیل گاڑی تھی جس کی چھت پر لال کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ مَیں، والدہ اور میری بڑی خالہ اس میں بیٹھے تھے۔ ماموں صاحب خاکی لباس پہنے ایک سفید گھوڑے پر سوار تھے۔ انکے ساتھ دو سوار بندوق اور تلوار سے لیس، گاڑی کے آگے آگے چلتے تھے۔ پیچھے بھی پانچ سپاہی کندھوں پر بندوق لئے چل رہے تھے۔ ہماری گاڑی ایک سنسان جنگل سے گزر رہی تھی۔ اچانک گولیاں چلنے لگیں۔ گاڑیبان اندر دبک کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "سلطانہ آگیا سلطانہ آگیا"۔ خالہ نے پیچھے کا پردہ اٹھا کر دیکھا ـــــ ہمارے سپاہی بھاگ چکے تھے۔ ماموں گھوڑا موڑ کر گاڑی کے پیچھے آکھڑے ہوئے۔ پہاڑی پر سے چند لوگ شور مچاتے ہوئے اُتر رہے تھے۔ والدہ نے چیخ مار کر مجھے سینے سے لگا لیا ـــــ خالہ بھی رونے لگیں۔ مَیں تو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ لیکن والدہ اور خالہ کے رونے سے گھبرا گیا۔ اُن لوگوں نے آکر ماموں کو گھیر لیا۔ پھر ان کی ماموں سے کچھ باتیں ہونے لگیں۔ ایک شخص نے قریب آکر گاڑی کا پردہ اُٹھا کر دیکھا اور فوراً چلدیا ـــــ اماں اور خالہ کانپنے لگیں ـــــ کچھ دیر بعد ماموں نے گاڑیبان کو آواز دی ـــــ گاڑی چلنے لگی ـــــ ماموں نے گاڑی کے قریب آکر بتایا کہ سلطانہ نے صرف چھوڑا ہی نہیں بلکہ اپنے چند جوان ہماری حفاظت کے لئے ساتھ کر دئے ہیں۔ خالہ اور والدہ اُسے دُعائیں دینے لگیں ـــــ گاڑیبان اُس کے پُرانے قصّے سنانے لگا۔

والد پولس کے محکمہ میں افسر تھے۔ وہ اکثر گھر سے باہر رہتے تھے۔ وہ زمانہ بھی کچھ ایسا تھا کہ ہر طرف فتنہ فساد اور یورشیں رہتی تھیں۔ تمام راستے چور اور ڈاکوؤں سے بھرے پڑے تھے۔ یہ لوگ کبھی کبھی دن دہاڑے گاؤں میں آجاتے اور لوگوں کو لُوٹ کر لے جاتے۔ اسی سلسلہ میں والد کو بھی اِدھر اُدھر پھرتے رہنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ والد صاحب دیہات میں بیمار پڑ گئے۔ یہ خبر سُنکر والدہ سے صبر نہ ہو سکا۔ نانا جان نے لاکھ سر مارا لیکن وہ کب ماننے والی تھیں۔ ماموں کو ساتھ چلنے پر راضی کر لیا۔ خالہ بھی تیار ہوگئیں۔ نانا نے چند سپاہی ساتھ کر دئے اور اس کے بعد یہ حادثہ پیش آیا۔

والد صاحب اس واقعہ سے ذرا متاثر نہ ہوئے۔ بلکہ ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ "ایک روز مَیں اُسے ضرور گرفتار کرونگا"۔ وہ خاص طور سے سلطانا کو گرفتار کرنے پر تعین کئے گئے تھے۔

والدہ کہنے لگیں "وہ تو بڑا ہی رحمدل، نیک آدمی ہے۔ یہاں کے تمام لوگ اُس کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ کیوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے ہیں؟"

"نیک ہے وہ؟" والد کہنے لگے "تم کیا جانو! دن رات لُوٹ مار کرتا رہتا ہے۔ آج اس زمیندار کے ہاں ڈاکہ پڑا۔ کل اُس مہاجن کے ہاں چوری ہوگئی۔ جنگلی راستوں پر اُس نے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ لوگوں نے سفر کرنا چھوڑ دیا ہے ـــــ ہاں! اور اگر وہ چند غریبوں کی مدد کرتا ہے تو کیا وہ نیک ہے۔ غریبوں، مفلسوں عورتوں اور بچوں کو تو کوئی انسان ستانا پسند نہیں کرتا۔ یہ کونسی خاص بات ہوئی"۔ والد صاحب نے کچھ دیر بعد کہا "ذرا غور کرو! اگر کہیں وہ میرے ہتے چڑھ جائے اور مَیں اُسے گرفتار کر لوں تو ہمارا مستقبل کتنا درخشاں ہو جائے گا ـــــ بہت سے سرٹیفکٹ اور خطابات ملیں گے۔ سرکار کی نظروں میں ہماری کس قدر وقعت ہوگی۔ ہماری اولاد کے لئے ترقی کے راستے کھل جائیں گے"۔ اتنا کہتے ہوئے والد صاحب نے اپنے لمبے جوتوں کے بند باندھے، کوٹ چڑھایا اور چلدئے۔

گاؤں میں سلطانا ڈاکو کے عجیب عجیب قصّے مشہور تھے۔ یہ ضرور تھا کہ وہ ہمیشہ بڑے بڑے مکاروں پر ہاتھ صاف کرتا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ غریبوں اور بیکسوں کی مدد کرتا تھا۔ گاؤں کے بہت سے لوگ اس کے سہارے زندگی بسر کر رہے تھے۔ بہت سی بیوائیں اس کے بھروسے پل رہی تھیں۔ یہی لوگ ہمیشہ اُس کی گرفتاری میں آڑے آتے تھے۔ اسے حکام کی نظروں سے چھپا دیتے تھے۔ حکومت انہیں لاکھ لالچ دیتی ـــــ ڈرایا، دھمکایا

جاتا لیکن وہ کسی طرح اس کا پتہ نہ بتاتے تھے۔ مشہور تھا کہ اُس نے کبھی کوئی خُون نہیں کیا۔۔۔ اگر کوئی غریب اُس کے علاقے میں لُٹ جاتا اور فریاد لیکر اُس کے پاس پہونچتا تو وہ فوراً چور کا پتہ لگاتا۔ اس کا مال اسکو واپس دلا دیا جاتا۔

***

آخر تین سال کی انتھک کوششوں کے بعد والد صاحب کو کامیابی ہوئی۔۔۔ ایک دن صبح آٹھ بجے وہ خوشی خوشی گھر آئے اور والدہ سے کہنے لگے "لو! آج میں نے سلطانا کو گرفتار کر لیا"۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے مجھ سے میرا پیارا کھلونہ چھین لیا۔ مجھے اُس سے محبت ہو چکی تھی۔ اُس کے کارناموں کو بڑی دلچسپی سے سُنتا تھا۔ اُس کی زندگی میرے لئے ایک نمونہ تھی۔ وہ میرا ہیرو تھا۔۔۔ میں سوچتا تھا کہ میں بھی سلطانا ڈاکو بنوں گا۔ لوگ مجھے قدر کی نظر سے دیکھینگے۔ ہر شخص میری مہمان نوازی پر فخر کرے گا۔ جس دروازے پر پہونچ جاؤنگا وہاں میری آؤ بھگت ہوگی۔۔۔ یقیناً اُس کی گرفتاری سے مجھے سخت تکلیف پہونچی۔ میرے خیالات نے اس کو کبھی اس شکل میں پیش نہیں کیا تھا۔ وہ میرے نزدیک ایک نہایت ارفع و اعلیٰ شخصیت تھی۔ میں اپنے تخیلات کے اس خوشنما محل کی بربادی کی تاب نہ لا سکا۔ میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

***

شام کو والد کے ساتھ میں بھی اُسے دیکھنے کے لئے کوتوالی گیا۔ وہاں اچھا خاصہ میلہ لگا ہوا تھا۔ سلطانا کی گرفتاری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ دُور دُور سے لوگ دیکھنے آرہے تھے۔ وہ ہاتھ پیر میں بیڑیاں پہنے ایک مضبوط کوٹھڑی میں قید تھا۔ وہ دروازے کے سامنے ہی دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔ پیر مُڑے ہوئے تھے، دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھے۔ سر دیوار سے ٹکا ہوا تھا۔ وہ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے بال گردن تک آتے تھے۔ بڑی بڑی خمدار مونچھیں تھیں۔ دراز قامت، چوڑا سینہ، کسا ہوا مضبوط بدن تھا۔ سانولی رنگت اور چہرے کے موزوں نقش و نگار تھے۔۔۔ میرا ہیرو۔۔۔ واقعی ایک خوبصورت انسان تھا۔

اس کے پرستاروں میں عورتیں زیادہ تھیں۔ اُنکی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، وہ اُسے محبت اور ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ وہ محسوس کر رہی تھیں کہ اُن کا کوئی عزیز گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ساری آبادی میں سلطانا کے دوست بہت تھے اور دُشمن کم۔۔۔!

***

رات کھانا کھاتے وقت والد صاحب خلافِ معمول بہت خوش تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ کس طرح اُنہوں نے اُس کے ساتھی کو لالچ دیکر اپنی طرف کر لیا۔ "کل رات وہ جنگل میں ایک جھونپڑی میں سو رہا تھا۔ اُس کے ساتھی نے پولس میں آکر اطلاع دیدی۔۔۔ جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو پچاس بندوقوں کی نالیاں اُس کے سینے پر جُھکی ہوئی تھیں"۔

اچانک میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ میں نے پوچھا "اباجان! لوگ چوریاں کیوں کرتے ہیں؟"

"چوریاں!" والد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "چوریاں! ایسے! یہ بدمعاش، کمینے، ذلیل لوگ ہوتے ہیں۔ شرارت، فتنہ فساد، لوگوں کو لُوٹنا، انہیں تکلیف پہونچانا ان کی فطرت میں ہوتا ہے۔ انہیں اپنی ان ذلیل حرکتوں میں بڑا مزا آتا ہے۔۔۔ اور پھر۔۔۔ ان اوباش عیاش قسم کے لوگوں سے محنت مزدوری ہوتی نہیں۔ اور عیاشی کے لئے روپے کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔ انہیں شراب، چرس اور اس قسم کی چیزوں کا چسکا بھی ہوتا ہے۔ آخر یہ شوق کیونکر پورے ہوں۔ دوسروں کو ستاتے ہیں، چوریاں کرتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ کمینہ فطرت لوگ ہوتے ہیں یہ۔۔۔"

***

دن بیتتے گئے۔

دُنیائے آب و گل کا یہ چھوٹا سا پودا تیزی سے ارتقائی منازل طے کرنے لگا۔ اس کے نرم و نازک تنے میں آہستہ آہستہ سختی پیدا ہونے لگی۔ اب موسمی ہواؤں کے لطیف جُھونکے اس میں لچک پیدا نہ کر سکتے تھے۔ پھر ایک دوسرا دَور آیا۔ نئی نئی کونپلیں پھوٹیں۔ ننھی ننھی رنگین کلیاں کِھل کر خوبصورت پُھول ہو گئیں۔ مگر کچھ عرصے بعد پھول کا رنگ اُڑنے لگا۔ پنکھڑیاں جھڑنے لگیں۔ پتّوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ ہر طرف خزاں کے آثار تھے۔۔۔ یہ شاید آخری منزل تھی"۔

***

تیس سال تک پولس کی ملازمت کرنے کے بعد میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہو گیا۔۔۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی جگہ مجھے مل گئی تھی۔ اُنہوں نے سرکار کی جو خدمات کی تھیں وہ کیونکر

فراموش کی جاسکتی تھیں۔ میں نے بھی بہت جانفشانی اور تندھی سے نوکری کی۔ ان خدمات کے صلہ میں خان بہادری کے خطاب کے علاوہ بہت سے سرٹیفکٹ، تمغات اور انعامات بھی پائے ــــ سوائے بیماری کے میں نے کبھی ایک روز کی چھٹی نہیں لی۔ اب میری زندگی کے آخری ایام تھے۔ میں آرام سے رہنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے وطن میں ایک عالیشان کوٹھی بنوائی اور اس میں آرام وچین سے رہنے لگا ــــ مجھے کوئی فکر تو تھی ہی نہیں۔ اتنا روپیہ میں نے کمایا تھا کہ میری اولاد گھر بیٹھے کھا سکتی تھی۔ ایک لڑکی کی شادی کر چکا تھا ــــ بڑا لڑکا کالج میں پڑھتا تھا۔ دو لڑکے ہائی سکول میں تعلیم پاتے تھے۔ دو لڑکیاں ابھی چھوٹی تھیں ــــ دن بھر دوستوں میں بیٹھکر شطرنج کھیلنا اور حقہ پینا۔ بس یہی دو میرے محبوب مشغلے تھے۔

گرمیوں کا زمانہ تھا ــــ کالج اور سکولوں میں چھٹیاں تھیں۔ بچے سب گھر ہی پر تھے۔ ان کی وجہ سے بڑی رونق تھی ــــ ایکدن علی الصبح شہر میں یہ سنسنی خیز خبر پھیلی کہ سیٹھ دولت رام کے ہاں چوری ہوگئی۔ آدھی رات کو بہت سے نقاب پوش ہاتھوں میں طمنچے لئے مکان میں داخل ہوئے۔ گھر کے تمام افراد اور ملازمین کو باندھ کر ڈال دیا۔ سیٹھ جی کی پیشانی پر طمنچہ رکھکر اُن سے کُنجیاں رکھوا لیں۔ تجوری میں سو بیس ہزار نقد اور قریب ساٹھ ہزار کے زیورات و جواہرات لیکر غائب ہوگئے ــــ ہر شخص سہما ہوا تھا۔ جہاں دو چار بیٹھ جاتے، بس یہی ذکر چھڑ جاتا ــــ لیکن تیسرے ہی دن پولس نے تمام چوروں کو گرفتار کر لیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ تمام پڑھے لکھے تعلیمیافتہ لوگ تھے ــــ

رات کھانا کھاتے وقت چھوٹی لڑکی شاہدہ نے پوچھا: "اباجان! یہ لوگ چوریاں کیوں کرتے ہیں؟"

فوراً ہی ایک پرانے واقعہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ والد مرحوم کے الفاظ کان میں گونجنے لگے ــــ میں نے کہا "ارے! یہ چوریاں! یہ بدمعاش لوگ ہوتے ہیں۔ کمینے۔ ذلیل۔ شرارت۔ فتنہ فساد۔ لوگوں کو لوٹنا، انہیں تکلیف دینا ان کی فطرت میں ہوتا ہے۔ انہیں اپنی ان ذلیل حرکتوں میں بڑا مزا آتا ہے اور پھر......"

....

...میز کے دوسرے سرے پر میرا بڑا لڑکا نظر جھکائے کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ اسکے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔

ریاض رؤفی

مَیں جانتا ہوں کہ مجھ سے تمہیں محبت ہے

مَیں جانتا ہوں کہ مجھ سے تمہیں محبت ہے ‖ تمہاری چشمِ سیہ مست، مستِ اُلفت ہے
تمہارے دل میں پریشاں ہیں نغمہ ہائے شباب ‖ تڑپتے رہتے ہیں آنکھوں میں عشرتوں کے خواب
تمہاری رُوح میں بیدار کچھ فسانے ہیں ‖ تمہارے ہونٹوں پہ خاموش سے ترانے ہیں
ربابِ شوق سے طوفاں اُٹھا دیا تم نے ‖ حسین نغموں کو پھر سے جگا دیا تم نے
نگاہیں دکھے ہوئے دل سے ہمکنار ہوئیں ‖ بجھی ہوئی ہیں تمنّائیں بے قرار ہوئیں
یہ چاہتی ہو محبت کا کیوں نہ دوں اقرار؟ ‖ نظر کے پردوں میں اُلفت کا کیوں کروں اظہار؟
سُنو! میں اشکوں سے دیتا ہوں زیست کا پیغام ‖ یہی حقیر سا تحفہ ہے، حُسن کا انعام
جگا رہا ہوں فغاں سے مَیں سوز و سازِ حیات ‖ اُٹھا رہا ہوں مَیں دُنیا کے جور و نازِ حیات
یہ فرطِ شوق سے آنسو مرے نکل آئے ‖ یہ گرم خون کے طوفان اُف! اُبل آئے
یہ اشک گر نہیں اظہارِ مدعا کے لئے ‖ یہ رنج گرچہ ہے اِک آہِ نارسا کے لئے
میں پھر بھی تم سے یہ اقرار کر ہی لیتا ہوں ‖ مَیں راز اپنا خموشی سے کھولے دیتا ہوں

"میں پوجتا ہوں تمہیں، تم کو پیار کرتا ہوں!"

منیب الرحمٰن

متفرقات

ابتلاء

اربابِ بزم میرا جہانِ وسیع ہیں ⁞ کوئی شریکِ درد، کوئی ہمنوا نہیں
مخمورِ خستہ حال ہوں دیوانگی پسند ⁞ جویائے عقل و ہوش دلِ مبتلا نہیں

خود فریبی

دلِ دردآشنا ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل ⁞ یونہی طے کرنے پڑتے ہیں مراحل امتحانوں میں
عبث دشتِ محبّت میں ہے خوفِ آبلہ پائی ⁞ ہمارا کام کیا عیش و طرب کے قیدخانوں میں

عجز

بیچارگی سے پہلے تو مجبور کر دیا! ⁞ پھر دل کو آرزوؤں سے معمور کر دیا
اُف! دامنِ اُمید نہ چھٹ جائے ہاتھ سے ⁞ ناکامیوں نے سینے میں ناسور کر دیا

حوصلۂ جنوں

اُف! شعلہ زارِ شوق کی جادو طرازیاں ⁞ جل جائیگا اگرچہ وجودِ خیال بھی
لیکن جنونِ حوصلہ افزا کو کیا کروں! ⁞ بے سود زندگی ہی عبث بھی محال بھی

چاندنی

شرابِ بیخودی مجھے پلا رہی ہے چاندنی ⁞ تاثراتِ سوز و غم مٹا رہی ہے چاندنی
یہ سرخوشی بے سبب ہے چیستاں مرے لئے ⁞ سرور بنکے دل پہ آج چھا رہی ہے چاندنی

"دلفگار"

برمی افسانہ

نفرت کے دو حسین راستے

انگونیو نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور دریا کے کنارے پانی سے دُھلے ہوئے سفید چمکدار پتھر پر بیٹھکر برما کی خاموش اور خوشگوار دوپہر کے منظر سے لُطف اندوز ہونے لگا۔

اس کی سُرخ سلک کی لنگی اور ارغوانی و نارنجی رنگ کے ملے جُلے پھُول بوٹیوں کا رومال موسم بہار کی حسین رنگینیوں کا جُزو معلوم ہوتے تھے۔ دریا کے کنارے کنارے دُور تک جاتے ہوئے اُونچے درخت املی اور جنگلی پھلوں کے پیڑ اور ہوا کے نرم جھونکوں سے جُھومتے ہوئے پودے پُر رومان نظر آرہے تھے۔

اتنے میں ایک حسین خوبصورت پروں والی تیتری اپنے نرم و نازک پروں سے فضا میں ہلکا سا تموّج پیدا کرتی ہوئی ایک جنگلی نیلے پھُول پر جا بیٹھی۔ انگونیو اس کو غور سے دیکھنے لگا۔ اور اُس کے دماغ میں بوڑھی ماماؤں کی وہ کہانیاں چکّر لگانے لگیں جن میں بتایا گیا تھا کہ تیتریاں خوابیدہ لوگوں کی آوارہ رُوحیں ہوتی ہیں۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے اپنے والدین کا حکم پھر یاد آیا اور وہ پریشان ہوگیا۔

"میں ماہ لون سے کبھی بھی شادی نہ کرونگا" کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے آخری فیصلہ کر لیا۔ اور سگار کا کش لگانے کے بعد آپ ہی آپ کہنے لگا "ماہ لون کو میرے والدین نے پسند کیا ہے، مَیں نے تو آج تک اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ شادی کے معاملہ میں مجھے پورا پورا اختیار ہونا چاہیئے۔ مگر مجھے اس قدر جلدی شادی کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

"مگر نہیں مجھے شادی کر لینی چاہیئے" ان متضاد خیالات نے اس کو بے چین کر دیا اور وہ سوچنے لگا کہ ان دونوں میں سے کس پر عمل کرنے سے اس کی رُوح کو تسکین حاصل ہوگی۔

وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ سگار کا ہلکا ہلکا [illegible] سامنے کے حسین منظر اور اس کے درمیان ایک باریک پردہ بنکر حائل ہو رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا تمام فضا پر ایک ہلکے کالے رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہے اور وہ اس دُھندلے منظر کو خواب کی حالت میں دیکھ رہا ہے۔ اسے دریائے اراودی کے کنارے بھورے رنگ کی لکڑی سے تعمیر شدہ خانقاہ دُھندلی دُھندلی نظر آرہی تھی جس کے متعدد کمروں کی اُونچی چھتیں اور مینار جس کی چوٹی ٹُوٹی ہوئی چھتری کی مانند تھی دریا کی رقصاں لہروں پر لرزاں سائے ڈال رہے تھے۔

اس خانقاہ نے انگونیو کے بچپن میں خاصا انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ یہ خانقاہ اُس کے باپ نے بنوائی تھی۔ اور اس مذہبی خدمت کے صلہ میں اس کو "کیانگ ٹاگا" کا خطاب ملا تھا جس کے معنی ہیں "خانقاہ بنوانے والا"۔ انگونیو نے اپنا بچپن اسی خانقاہ میں گذارا تھا۔ وہ گیروے رنگ کے لمبے لمبے کُرتے پہنے خانقاہ میں عبادت گذار جوگیوں کی خدمت میں حاضر رہا کرتا اور ایک چیلے کی مانند اُنکی دل و جان سے خدمت کرتا۔

بچپن کے واقعات اُس کے دماغ پر ایک کیف آگیں سُرور طاری کر رہے تھے۔ آہ! وہ زمانہ کتنا خوشگوار اور لذّت آفریں تھا جب وہ خانقاہ کے وسیع صحن میں جوگیوں کو اِدھر اُدھر جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں بھیک کے پیالے ہوتے تھے، جن میں وہ غریب اور مسکین لوگوں کے لئے کھانا جمع کیا کرتے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ اس زمانے میں اس کی زندگی کیسی خوشگوار تھی۔ لیکن کیا اس کی فضا اب بھی انگونیو کے دامن زندگی کو مسرّت و انبساط کے بے بہا جواہرات سے مالا مال کر سکتی ہے؟ کیا اب بھی اس کے لئے خانقاہ کی "جوگیانہ" زندگی میں کوئی دلکشی باقی ہے؟ کیا خانقاہ کی جمود پرور زندگی اب اُس کی اس آرزو کو پورا کر سکے گی، جو اُسکو دُور دراز ملکوں اور قدرت کے حسین و جمیل نظاروں کو دیکھنے کیلئے مجبور کر رہی ہے؟

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خانقاہ کے سُنہری دریچوں سے نکلتی ہوئی گھنٹے کی سُریلی آواز نے اس کے سلسلۂ خیالات کو درہم برہم کر دیا۔ اور وہ گھنٹے کی شیریں آواز کو سُننے لگا جو فضا میں ایک حسین ارتعاش پیدا کرتی ہوئی دُور تک جاتی معلوم ہوتی تھی۔

انگونیو کا سگار جل چُکا تھا۔ اور وہ خود بھی تخیّل کی طلسمی فضا سے نکل آیا تھا جو اسکے دل و دماغ پر سحر آگیں کیف طاری کئے ہوئے تھی۔ وہ اُٹھا اور جنگل کی طرف جاتی ہوئی پگڈنڈی پر ہولیا۔

(۲)

پھونس اور درخت کے پتّوں سے ڈھکی ہوئی چھتوں والی جھونپڑیوں کے سامنے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ان ڈھیروں کا مقصد یہ تھا کہ وہ رات کے وقت آوارہ پھرنے والی شریر اور بد روحوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیں۔ اور ان کو اپنے تعفن اور گندگی سے خوش کریں۔ ان کو راضی کرنے کیلئے لوگوں نے درختوں کی ٹہنیوں پر رنگین پھولوں کے ہار بھی لٹکائے تھے جن میں سے کچھ تو تازہ اور خوش رنگ تھے اور باقی مُرجھائے ہوئے ہوا میں ہل رہے تھے۔ درختوں کے نیچے نارنگیاں، کیلے، پھل پھلاری، مچھلیوں کے ٹکڑے، پان کے بیڑے اور نذر نیاز کی مٹھائیاں آبخوروں میں گندہ رُوحوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے غرض سے رکھی ہوئی تھیں ــــ

جب انگونیو نے ان چیزوں کو دیکھا تو ایک کمزور خیال لرزتے ہوئے اس کے دماغ میں آیا۔ اگر وہ بھی اپنی طرف سے کچھ وہاں رکھدے تو شاید بدرُوحیں اس کی مدد کریں۔ مگر وہ ان فرسودہ اور لغو رسومات کی چیزوں پر حقارت آمیز نظریں ڈالتا ہوا گذر گیا۔

تاریکی کے ہلکے ہلکے سبک خرام سائے دوش فضا پر تیرنے لگے۔ انگونیو نے سوچا کہ گھر پر اس کا انتظار ہو رہا ہوگا۔ مگر اس خیال کے آتے ہی اُس کے چہرے پر ضد اور سرکشی کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس کے والد نے آج شب لوگوں کو ایک خاص تقریب پر مدعو کیا تھا۔ ظاہر تو یہ کیا تھا کہ یہ دعوت آگ کے دیوتا کو خوش کرنے کی غرض سے کی جا رہی ہے مگر انگونیو سمجھ گیا کہ وہ ماہ لون کو اس دعوت میں بُلا کر ان دونوں کے حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

"لیکن ماہ لون کا ہونے والا دولہا وہاں موجود نہ ہوگا"

اس کی ہلکی آواز تاریکی میں جلدی ہی تحلیل ہو کر رہ گئی۔ اور بجائے گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلنے کے وہ دریا کی طرف مُڑ گیا۔ تاکہ اس کے کنارے خوشیاں منانے والے لوگوں میں شامل ہو کر اس رُوحانی اذیت سے بچ جائے جو اس نامعلوم لڑکی کو پہلی ہی نظر دیکھنے میں اسکو محسوس ہونے لگے گی۔

گاؤں کے سادہ اور کچے مکانات بڑھتی ہوئی تاریکی میں اُونگھ رہے تھے۔ ہر ایک جھونپڑی کے سامنے ایک چھوٹا سا چراغ جل رہا تھا۔ درختوں کی شاخوں سے کاغذ کی لالٹینیں اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے سُرخ سُرخ سیب باغوں میں نظر آتے ہیں۔ کچھ بچے باہر میدان میں آتشبازی میں مصروف تھے۔ انگونیو ان کے مسرت خیز قہقہوں کی آواز صاف سُن رہا تھا۔

وہ دریا کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر خاموش چلا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ اُس کے آگے پیچھے دریا کی طرف جا رہے تھے جس جگہ یہ پگڈنڈی ختم ہوتی تھی اس جگہ دریائے اراوادی نہایت سکون کے ساتھ بہتا تھا۔ اور حسین تاروں کا عکس ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اسکی تہ میں ہزارہا جواہرات پڑے جگمگا رہے ہیں۔

دریا کے کنارے مردوں اور عورتوں کا ہجوم تھا۔ ہر ایک چھوٹا سا چراغ جلا کر لہروں کے سپرد کر رہا تھا جب اُن کی اُمیدوں کا چراغ دریا کی لہروں میں محفوظ دُور تک بہتا چلا جاتا تو وہ خوشی کے مارے تالیاں بجانے لگتے اور حصول کامرانی کی اُمید میں پھولے نہ سماتے۔

چراغ کبھی ٹمٹمانے لگتے اور کبھی ایک طاقتور لَو کے ساتھ جلنے لگتے۔ کبھی ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے کہ ڈر تھا کہ کہیں ٹکرا کر ڈوب نہ جائیں اور کبھی لہروں کی رَو میں دُور تک بہتے ہوئے الگ الگ ہو جاتے۔ لوگوں کی نگاہیں اُن کا دُور تک تعاقب کر رہی تھیں۔ اگر چراغ جلتا ہوا دُور تک چلا جاتا یہاں تک کہ نظروں سے غائب ہو جاتا تو انکی آرزوؤں کا پورا ہونا یقینی ہو جاتا تھا۔ اور اگر وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ڈوب جائیں یا ہوا کا تیز جھونکا ان کو گل کر دیتا تو انکو یقین ہو جاتا کہ وہ حصولِ مقصد میں ناکام رہیں گے۔

کئی چراغ تو بہتی ہوئی ٹہنیوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ اور کئی دوسرے کنارے کی جھاڑیوں میں اس طرح جل رہے تھے کہ اُن پر جگنوؤں کا شُبہ ہوتا تھا۔

انگونیو نے سوچا کہ اس کو بھی ایک چراغ جلا کر لہروں کے سُپرد کرنا چاہیئے۔ اور اس سے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے خواب کی تعبیر لینی چاہیئے۔ چنانچہ اُس نے بھی ایک چراغ خرید لیا۔ مگر اسکو وہیں لوگوں کے سامنے دریا کی لہروں کے سپرد کرنے کی ہمت نہ پڑی، اور وہ جا کر کاٹ کر ایک سنسان جگہ جا پہونچا جہاں ایک پتلی سی نہر گاؤں سے آکر دریا میں ملتی تھی۔

وہ کنارے پر اُگی ہوئی گھاس کو روندتا ہوا اور جنگلی پودوں کو ایک ہاتھ سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور چراغ کو اراوادی کی لہروں کو سپرد کر دیا۔ اور تمنا بھری نظروں سے اُس کو جلتے ہوئے دیکھنے لگا۔

وہ اپنی آرزوؤں کے چراغ کو اُمید و بیم کی حالت میں دیکھ ہی رہا تھا کہ نہر کے دوسرے کنارے کی جھاڑیوں میں حرکت ہوئی اور کسی نے ایک جلتا ہوا چراغ دریا میں چھوڑ دیا جو ڈگمگاتا ہوا انگونیو کے چراغ کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ انگونیو حیرت و استعجاب کے عالم میں نہر کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس خاموش اور سُنسان گوشے میں بھی کوئی اس کے پیچھے پیچھے آگیا تھا۔ انگونیو کا دل دھڑکنے لگا جب اُسنے دیکھا کہ دونوں چراغ ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے تھے کہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ڈوبنے والے تھے۔ مگر وہ کچھ دیر تک برابر برابر بہتے رہے اور شومئ قسمت سے ایک بہتی ہوئی شاخ میں پھنس کر رہ گئے جو اس سمت جارہی تھی۔

"کیا اس کی آرزوؤں کا چراغ گُل ہوجائے گا" انگونیو کا دل اس خیال سے کانپ اُٹھا۔ مگر وہ اس سے بے خبر تھا کہ نہر کے دوسرے کنارے ایک اور مضطر دل اسی پریشانی میں دھڑک رہا ہے۔ اور اُس سے کہیں زیادہ بےچین ہے۔ اتنے میں نہر کے دوسرے کنارے سے کسی کی مترنم آواز آئی:۔

"آہ! اس کو ڈوبنے سے بچالو! میری تمناؤں کے سفینے کو ڈوبنے سے کوئی بچالو!!"

انگونیو آواز کو سُنکر کچھ دیر کے لئے اپنے چراغ اور اُس منحوس ٹہنی کو بھول گیا۔ بلکہ وہ دُنیا کی ہر ایک چیز کو بھول گیا تھا سوائے اس مترنم اور رسیلی آواز کے جو اُس کے کان کے نازک پردوں میں شیریں ارتعاش پیدا کررہی تھی۔ اس کے بعد کسی نسوانی قہقہے کی آواز فضا میں بلند ہوئی اور تاریکی میں اس طرح پھیلتی گئی جیسے پگوڈا کی سُریلی گھنٹیوں کی جھنکار دوشِ فضا پر بکھر جاتی ہے۔

انگونیو ہنوز اس سیمیں قہقہہ کے سحر آگیں کیف سے پوری طرح لُطف اندوز نہ ہونے پایا تھا کہ جھاڑیوں کو ہٹاتے ہوئے دو پتلے پتلے گورے ہاتھ نکلے اور اُس کی آنکھیں ہلکی چاندنی میں دریا کے کنارے پر جھکی ہوئی ایک حسین جمیل دوشیزہ پر جم کر رہ گئیں، جو شباب کی تمام رنگینیوں سے معمور نظر آرہی تھی۔ تاروں کی حسین روشنی میں اس کا گورا گورا چہرہ اور ہلکا نیلی لباس انگونیو کے لئے فردوسِ نظر بنا ہوا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ دریا کی حسین پری چاندنی میں دریا کے کنارے سیر کرنے آئی ہے۔

اس حسین لڑکی کی پریشان نظریں انگونیو کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جو اس سے تھوڑے سے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ اسکی آنکھوں میں خوف و اُمید کی جھلک کے ساتھ ساتھ معصومانہ التجا بھی شامل تھی۔

"کیا آپ ان کو ڈوبنے سے بچالیں گے؟" اس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ مگر پھر کسی خیال کے آتے ہی جلدی سے بولی:۔ "نہیں۔۔۔۔ نہیں!! ایسا نہ کرنا۔ کیونکہ ان آرزوؤں کے پاک سفینوں کو چھُونا گُناہ ہے"

"ارے دیکھو!" انگونیو خوشی سے انگلی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہ دونوں الگ الگ ہوگئے ہیں"

حسین لڑکی نے دیکھا کہ دونوں چراغ الگ الگ بہے چلے جارہے ہیں۔ دونوں کی نگاہیں بہت دُور تک اُن کا تعاقب کرتی رہیں یہانتک کہ وہ نظروں سے غائب ہوگئے۔

حسین دوشیزہ نے اطمینان کا سانس لیا اور مترنم آواز میں بولی "ہماری دلی آرزوئیں یقیناً بارآور ہوں گی۔ کیونکہ ہماری تمناؤں کے چراغ بادِ حوادث کے جھونکوں سے محفوظ دُور تک بہتے چلے گئے یہاں تک کہ ہماری نظریں اُن کا پیچھا نہ کرسکیں۔ تم دُعا کرو کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں۔ اور میں بھی تمہارے لئے یہی دُعا کرتی ہوں"

"تم اس قدر پریشاں کیوں نظر آتی ہو" انگونیو نے کہا "کیا تمہیں کسی بڑی چیز کی آرزو ہے؟"

"ہاں! آرزو تو ایک بڑی چیز کے لئے ہی ہے" وہ بولی، "یہ تمنا دُنیا کی ہر ایک تمنا سے برتر و اعلیٰ ہے۔۔۔۔ ایسی آرزو۔۔۔۔ ۔۔۔۔جیسی کہ ہر ایک چیز۔۔۔۔" وہ راز کو چھپانے کی کوشش میں آخری فقرے کو صاف نہ کہہ سکی۔

"اگر تم چاہو کہ میں اپنی آرزو تم کو بتادوں تو تمہیں بھی اپنی آرزو کا انکشاف مجھ پر کردینا چاہیئے" انگونیو حسین لڑکی کی آنکھوں کو چمکتے ہوئے دیکھکر بولا۔

"میری آرزو۔۔۔۔" وہ یہ کہکر ذرا رُکی اور پھر سنبھلکر کہنے لگی "میں چاہتی ہوں کہ کیچین گاؤں میں جو چرچ مشن ہے اس میں داخل ہوجاؤں مگر اس کی اجازت ملنی مشکل ہے۔۔۔۔ تم جانتے ہو وہاں کس قدر کام ہے۔ معصوم بچّوں کی تربیت، اسپتال میں مریضوں کی دیکھ بھال۔ مشن اسکول کی تعلیم میں ختم کرچکی ہوں اور اب وہاں جانے کی تمنا ہے۔ اور جس بات پر والدین اصرار کررہے ہیں میں اسکو ناپسند کرتی ہوں"

"اوہو۔۔۔ تو ہم تم ایک طرح سے ایک ہی منزل کی جانب

رواں ہیں" انگوتیو بولا "کیونکہ جو کچھ والدین میرے لئے تجویز کر رہے ہیں میں بھی اُسے ناپسند کرتا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور کسی قسم کی مداخلت نہ کریں۔"

"وہ کونسا راستہ ہے جو تم اختیار کرنا چاہتے ہو؟" لڑکی نے پوچھا۔

"راستہ... میرا راستہ" انگوتیو کا راز اس کے لبوں پر تھا، "مگر میں نے ابھی آخری فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ اس پر غور کر رہا ہوں بعض اوقات تو میں چاہتا ہوں کہ کسی خانقاہ میں رہ کر زندگی کے باقی دن گذار دوں۔ مگر جب وہاں کی سرد اور سکون پرور زندگی کا خیال آتا ہے تو دل ہٹ جاتا ہے.... وہاں کوئی کام نہیں سوائے جمود پرور عبادت کے۔"

"میں جانتی ہوں.... میں جانتی ہوں" حسین لڑکی سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی "جب سے میں نے مشن کی تعلیم ختم کی ہے میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں۔ بعض طبیعتیں دُنیا میں کارہائے نمایاں کرنے کیلئے بیچین رہتی ہیں۔"

"تو تم دوسری لڑکیوں کی طرح شادی کرنے اور گھریلو زندگی بسر کرنے کو اچھا نہ سمجھتی ہوگی؟" انگوتیو نے پوچھا۔

"میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی" وہ متانت آمیز لہجے میں بولی "میں نے مشن چرچ جانے کی خواہش والدین کے سامنے پیش کی تھی تو اُنہوں نے میری مخالفت کی۔ اور اس خیال کو دل سے نکال ڈالنے پر اصرار کیا۔ آپ جانتے ہیں میری خواہش والدین کے ان خوشگوار و زرّیں تجاویز کو خاکستر کر دے گی جو اُنہوں نے میرے متعلق قائم کی ہیں۔"

حسین لڑکی کی آنکھوں سے شوخی ٹپک رہی تھی۔ اور اُس کا ملاحت آگیں حسن انگوتیو کے دل و دماغ پر بجلیاں گرا رہا تھا۔

"اُنہوں نے تمہارے لئے کیا تجویز کیا ہے؟" انگوتیو نے پوچھا۔

"اُن کی تجویز.... آہ!" وہ ٹھنڈا سانس بھر کر کہنے لگی۔ "ایک نوجوان ہے جس کو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اُس سے شادی کرنے پر رضامند ہو جاؤں۔ میرا خیال ہے کہ وہ نوجوان اور اس کے والدین مشن چرچ میں داخل ہونے کی مخالفت کریں گے اور اس لئے میں اس رشتے کو ناپسند کرتی ہوں۔"

"مگر میرا تو خیال ہے کہ کسی شخص کو بھی اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیئے" انگوتیو نے آہستہ آواز میں کہا۔

"میں تو خود یہ چاہتی ہوں کہ وہ اس رشتے کو ناپسند کر دیں۔ اور میں آزاد ہو کر مشن چرچ میں داخل ہو سکوں۔ خدا کرے وہ نوجوان بھی میری اس آرزو کی مخالفت کرے۔"

"ہو سکتا ہے وہ نوجوان بھی تمہارے ساتھ مشن چرچ کی زندگی کی آرزو کرے۔" انگوتیو غیرارادی طور پر بول رہا تھا۔

"مگر ایسا ممکن نہیں" وہ سر کو جنبش دیکر بولی۔

"شاید وہ ایسا ہی کرے" انگوتیو بولا "تم یقین کرنا میں بھی دُور دراز پہاڑوں کے پیچھے جا کر عجیب و غریب چیزیں دیکھنا چاہتا ہوں اور وہاں جا کر کام کرنے کی آرزو میں ہر وقت بیچین رہتا ہوں۔"

"لیکن تم تو وہ نوجوان نہیں ہو" لڑکی نے بے صبری سے کہا "اور صرف یہی بات ان آرزوؤں اور والدین کی تجاویز کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دیتی ہے۔"

"شاید یہی بات ہو۔ مگر مجھے تو اس پر یقین نہیں آتا۔ کیونکہ میرے والدین بھی مجھکو اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لوں جس کو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"کیا واقعی؟" وہ تعجب سے بولی۔ اس کی حسین آنکھوں میں اُمید رقص کر رہی تھی۔

"ہاں ہاں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں" وہ بولا "یہی وجہ تھی کہ میں چھپکر یہاں نکل آیا۔ تاکہ اس لڑکی سے شادی نہ کر سکوں۔"

"اوہ..." وہ مسکرائی "میں نے بھی بالکل ایسا ہی کیا ہے یعنی یہ کہ....."

"اچھا تو مجھے یہ بتاؤ کہ اُس نوجوان کا کیا نام ہے جس کو تمہارے والدین تمہارے لئے منتخب کیا ہے؟" انگوتیو نے پوچھا۔

انگوتیو کو کبھی تو مسرّت و کامرانی کی دیوی رقص کرتی نظر آتی اور کبھی غم و اندوہ کا بھیانک چہرہ اس کی مسرت کو لرزا دیتا۔ وہ پتلی نہر کے کنارے ذرا جھک گیا تاکہ اس لڑکی کو غور سے دیکھے اور اسکی نظروں میں فردوسی محبت کو رقص کناں دیکھے جو اس لڑکی کے دل میں کسی طرف سے پیدا ہو گئی تھی۔

"اس کا نام..." اس کا چہرہ شرمندگی کی وجہ سے سُرخ ہو گیا کچھ دیر ہچکچانے کے بعد وہ بولی "اس کا نام انگوتیو تھا۔"

"اور اس لڑکی کا نام جو میری دُلہن بننے والی تھی" انگوتیو جذبۂ مسرت کو بمشکل دباتے ہوئے بولا "ماہ لون تھا۔"

(بقیہ بر صفحہ ۴۴)

میں انسان ہوں

میرا قبضہ ہے زمیں پر آسماں زیرِ نگیں　　بحر و بر پر میرا سکّہ میں شہِ دُنیا و دیں
میرے سر کا تاج میری شان و شوکت کی دلیل　　سلطنت کی وسعتیں ہیں میری عظمت کی دلیل
میری نظریں ہیں تجلّی، میری فطرت آفتاب　　برہمی میری قیامت، بجلیاں میرا عتاب
میرے ایواں خُلد و کوثر سے بھی بڑھکر پُر نشاط　　رات دن رہتا ہوں میں حوروں سے محوِ اختلاط
زر فشاں میرا لباس اور میرے بستر نرم نرم　　فیضِ حُسن و عشق سے رہتے ہیں جو ہر وقت گرم
ہے رعایا میری عزّت اور مصاحب نام و ننگ　　میرے معمولی اشارے پر ہی چھڑ سکتی ہے جنگ
نعمتیں ساری میسّر ہیں کوئی حسرت نہیں　　وہم ہے بالکل کہ میرے حُکم میں طاقت نہیں
لیکن اک دن یوں بھی ہوتا ہے کہ گھبراتا ہوں میں　　اپنی فطرت سے بہت محجوب ہوجاتا ہوں میں
جی میں آتا ہے کہ دیوارِ تکلّف توڑ کر　　میں نکل جاؤں کہیں جاہ و حکومت چھوڑ کر
پتھروں پر سوؤں بے کھٹکے بیاباں میں رہوں　　کھاؤں تازہ تازہ پھل اور نہر کا پانی پیوں
خود کو تنہا چھوڑ دوں تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
پھُول کی مانند مہکوں رنگ و بو کے گاؤں میں

آدمیّت کا میں اک ارذل تریں معیار ہوں　　مُفلسی کی قسمتِ ناشاد کا شہکار ہوں
میرے آنسو میرا زیور، چیتھڑے میرا لباس　　دل بھی میرا پاش پاش اور میری دُنیا بھی اُداس
سانس میری آہ ہے، ادراک جاں فرسا کراہ　　اس خراب آباد میں ہر طرح سے ہوں میں تباہ
آرزوئیں مضمحل ہیں حسرتیں ہیں غرقِ خوں　　سنگِ غم سے ٹکڑے ٹکڑے ہے مرا جامِ سکوں
لیکن اکدن یوں بھی ہوتا ہے سنبھل جاتا ہوں میں　　چار سو فرطِ خوشی سے نُور برساتا ہوں میں
جوشِ نخوت میں خدا کے قہر سے ڈرتا نہیں　　جاہ و حشمت، شان و شوکت پر نظر کرتا نہیں
دو جہاں کا میں سمجھ لیتا ہوں خود کو حکمراں　　اپنے قدموں پر جُھکا لیتا ہوں فرقِ آسماں
زندگی پر اس قدر مغرور ہو جاتا ہوں میں
زور و تاج و تخت کو نفرت سے ٹھکراتا ہوں میں

مخمور جالندھری

قدیم ہندی ادب پر ایک سرسری نظر

ہرش نے شمالی ہند میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، اس کے مرتے ہی ہر طرف بدامنی اور طوائف الملوکی کے آثار پیدا ہوئے۔ یہ حالت مسلمان حملہ آوروں کے وقت تک قائم رہی۔ چار صدیوں تک ہندوستان میں امن و امان کا نام بھی نہ تھا۔ اس دَورِ تاریکی میں راجپوتوں کے کئی مقتدر اور مشہور خاندان پیدا ہو گئے۔ آئندہ زمانے کی تاریخ ان کے روشن کارناموں کا مرقع ہے۔

یوں تو یہ ریاستیں آپس میں برابر لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں لیکن جب پچھم سے مسلمان آنے لگے تو ان کے کان کھڑے ہو گئے اور یہ سب متحد ہو کر اس نئے دشمن کے مقابلے کے لئے تیار ہو گئیں۔ کابل، پنجاب اور سندھ پہ مسلمانوں کا پیشتر ہی سے قبضہ تھا لیکن ہندوستان کا بیشتر حصہ آزاد تھا۔ محمد غوری نے دُور دراز تک اپنا تسلط جما لیا اور ہندوستان میں مسلمانی راج کی بُنیاد ڈالی۔ ہندو بھی سوتے نہ تھے۔ اپنے نجی جھگڑوں کو پس پشت ڈال کر انہوں نے پرتھوی راج کو اپنا رہنما تسلیم کیا۔ ۱۱۹۱ء میں اُنہوں نے ترائن کے مقام پر مسلمانوں کو پسپا کر دیا۔ لیکن دوسرے ہی سال اسی مقام پر انہیں شکست نصیب ہوئی۔ پرتھوی راج کو غنیم نے گھیر لیا اور مار ڈالا۔ دلی مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئی۔ اب دن بدن مُسلمانوں کی سلطنت وسیع ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ محمد تغلق کے زمانہ میں سارا ہندوستان مسلمانوں کے زیر تسلط تھا۔ اگرچہ بہت سی ہندو حکومتیں مٹ گئیں اور راجپوتانہ کے مشہور مشہور قلعے حملہ آوروں کے ہاتھ لگے پھر بھی راجپوت پوری طرح مسلمانوں کے قبضے میں کبھی نہ آئے۔ انہوں نے نئی نئی حکومتیں قائم کیں۔ مسلمان جب انہیں مغلوب نہ کر سکے تو مجبوراً اُن کے دوست بن گئے۔

اسی زمانے میں ہندوستان کی موجودہ زبانوں کا ہیولیٰ تیار ہو رہا تھا۔ ادب کے قدیم ترین شہ پارے وہ ہیں جنہیں ہندوستان کی شجاعانہ نظمیں کہتے ہیں۔ راج درباروں میں بھاٹ اور شاعر ہوتے تھے۔ ان کی نظموں میں اس "دورِ رستخیز" کا نشان ملتا ہے۔ راجہ مہاراجہ ان کی قدر کرتے تھے۔ اگرچہ مدح و توصیف اور داستان آمیزی نے ان نظموں کا تاریخی وقار بہت گرا دیا ہے پھر بھی ان میں ہندو مسلمانوں کی معرکہ آرائی اور ایثار و قربانی کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ اس دَور کے لٹریچر میں سب سے بلند مرتبہ چند بردائی کو حاصل ہے جو پرتھوی راج کا شاعر تھا۔ اسی زمانے میں جگ نایک نامی مشہور شاعر بھی ہوا ہے۔ وسط چودھویں صدی کا مشہور شاعر سارنگ دھر ہے جس نے رنتھمبور کے ہمیر بادشاہوں کے راگ گائے ہیں۔

پندرھویں صدی کے آغاز میں رام کی بھگتی کا زور تھا۔ اس تحریک نے دیسی زبانوں کو شعر و نغمہ سے مالا مال کر دیا۔ ویشنو فرقہ کرشن کا پرستار تھا اور اسے وشنو میں چھپا ہوا پاتا تھا۔ اسلامی تمدن کا جب اہلِ ہند پر اثر ہوا تو بُت پرستی کے خلاف تحریک ہوئی اس نئی تحریک کے بانی کبیر صاحب تھے۔ اب ایک قابل ذکر مذہبی بیداری کا زمانہ آگیا۔ مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں ہندی سے کام لیا گیا۔ اس وجہ سے ہندی کا ابتدائی یا بُنیادی ادب مذہبی اُصولوں اور اعتقادات کا ذخیرہ بن گیا ہے۔ اس کے بنانے والے ویشنو مبلغ تھے۔ یہ تجدید مذہب کا دَور لگ بھگ ۱۲۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں نامدیو۔ کبیر۔ ودیاپتی۔ میرابائی۔ اور ملک محمد جائسی وغیرہ شعرا گزرے ہیں۔ ان سے پیشتر راجپوتانہ کے پُرانے شاعر پراکرت آمیز زبان میں نظم لکھتے تھے کیونکہ ہندی اُس وقت عہد طفولیت میں تھی، لیکن متذکرہ بالا شعرا کے زمانے میں ادبی زبان تو خیر بول چال کی زبان بھی آج کل کی سی تھی۔ لیکن سنسکرت سے ابھی ابھی دیسی زبان نے انحراف کیا تھا اس وجہ سے اس وقت کے ادیب بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہندی پر شباب کا رنگ چڑھنے والا تھا۔

ہندوستان کی دیسی زبانوں کا سُنہرا دَور تقریباً ۱۵۵۰ء سے ہوتا ہے۔ اور مغلوں نے ایک زبردست نظام حکومت قائم کیا اور ساتھ ساتھ ادب اور فنونِ لطیفہ کو بھی ترقی دی۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کا زمانہ ملک کی تاریخ میں حروف زر سے لکھا جاتا ہے، حُسن اتفاق کہیئے کہ اسی زمانے میں ہندی بھی معراجِ کمال کو پہونچی۔

انگلستان میں یہی دَور ملکہ الیزبتھ کا ہے۔ ہند اور برطانیہ میں اُسی وقت راہ و رسم پیدا ہوئی جو بعد کو نہایت اہم سیاسی نتائج کا باعث ہوئی۔ ایک خاص بات یہ ہوئی کہ ادب کو فن لطیف سمجھا جانے لگا۔ شاعری کی زبان زیادہ منجھ گئی۔ اب کیشو داس اور دوسرے بڑے بڑے شاعروں نے شاعری کو اُصول و ضابطہ کا پابند بنایا۔ ہندی کے بعض مایۂ ناز ادیب اسی عہد کی یادگار ہیں۔ تلسی داس، سور داس، بہاری لال، ترپاٹھی، سیناپتی اور دیوکوی نے ہندی کے دامن کو موتیوں سے بھر دیا۔ اسی زمانے میں سکھوں کا گرنتھ صاحب مرتب ہوا۔ دادو پنتھی اور کبیر پنتھی بھی اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ ان کے شعر اور بھجن کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ ہندی شاعری میں ملتا ہے۔ ادب کا یہ شاندار دَور تھا جو مغل خاندان کے زمانۂ عروج میں برابر قائم رہا۔ مغلوں کا زوال ان کے زوال کا پیش خیمہ تھا۔ اعلیٰ ہندی ادب کا اس کے بعد فقدان ہوگیا۔ پھر اچھے ادیب اور شاعر کہاں سے پیدا ہوتے۔

اُنیسویں صدی کی ابتدا ہی سے یورپ کا اثر ہندی ادب پر پڑنے لگا۔ اس سے پیشتر انگریزوں اور فرانسیسیوں میں ہندوستان کی حکومت کے لئے معرکے ہو رہے تھے۔ انگریز کامیاب رہے۔ ادھر مرہٹے بھی دب گئے اور مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ اب انگریزوں کا سکہ اس ملک میں اچھی طرح جم گیا۔ ہندوستانی معاشرت پر انگریزی اثر تیزی سے پڑنے لگا۔ ملک کے اندر امن و امان کا راج تھا۔ یورپ کی اعلیٰ خیالی پڑھے لکھے ہندوستانیوں کو پسند آگئی۔ ہندوستانیوں کی فطری ذہانت پھر چمک اُٹھی۔ ادب کے لئے یہ دَورِ بیداری تھا جو اب تک نت نئے کرشمے دکھا رہا ہے۔ اس دَور کے شروع میں للوجی لال نے جدید ہندی نثر کی بُنیاد ڈالی۔ موجودہ کھڑی بولی بھی انہیں کی رہینِ منت ہے۔ چھاپہ خانہ نے ادب کی نشر و اشاعت میں بڑی مدد دی۔ پھر ہرلیش چند نے ہندی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ہندی ڈرامہ بھی اسی عہد کی پیداوار ہے۔

الغرض ہندی ادب کے عہدِ طفولیت میں شجاعانہ شاعری کا دَور دَورہ تھا۔ پھر نئی نئی قوتیں ادب پر اثر انداز ہوئیں۔ اسکی تاریخ ۱۳۰۰ء سے شروع کی جاسکتی ہے۔ یہ پہلا دَور تھا۔ وشنو تحریک کا مذہبی اثر ہندی پر اُسی وقت پڑا۔ دوسرا دَور ۱۵۵۰ء سے شروع ہوتا ہے جب ادب میں فنونِ لطیفہ کی چاشنی دی گئی۔ تیسرا دَور ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتا ہے جب مغربی خیالات کا ادب پر اثر پڑنے لگا۔ ہر دَور میں وہی ادب قابلِ ذکر ہے جس میں رنگِ زمانہ جھلکتا ہو۔ ایسا اُسی وقت ممکن ہے جب شاعر یا ادیب رفتارِ زمانہ سے واقف ہوں۔

گوری سرن لال۔ ایم۔ اے۔

نفرت کے دو حسین راستے

(بسلسلہ صفحہ ۱۴)

"اوہ.... وہ تو میں ہوں" ماہ لون کی مترنم آواز کسی قدر بلند تھی...... "اور وہ شخص..... وہ نوجوان تم......"

آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

کچھ دیر تک دونوں حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں اپنے دلوں کی دھڑکن کو دریا کے خراماں خراماں بہتی ہوئی موجوں کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ پا رہے تھے۔ خوش خرام ٹھنڈی ہوا کے جھونکے درختوں کے بے شمار پتوں میں ایک رومان آفریں سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔

انگونیو ماہ لون کی جانب ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے سے بھاگتے رہے۔ مگر ہمارے راستے ایک ہی جگہ جا کر ختم ہوتے اور ہم دونوں مل گئے۔ ......ہمارے چراغ دریا کی لہروں پر بہتے ہوتے چلے گئے۔ اُن کو کوئی نہ بُجھا سکا...... ماہ لون تم خوش ہو...... یا ناراض.....؟"

"خوش!" ماہ لون نے نگاہوں کو نیچے کرتے ہوئے جواب دیا۔ "انگونیو میں بہت خوش ہوں۔"

(ترجمہ)

عبدالجلیل دہلوی

آنکھوں میں نشہ، باتوں میں مستی، چڑھے ہوئے ابروؤں اور دہکتے ہونٹوں کی جملہ سحر آفرینی سے انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔
"میں کہتی ہوں فانی کے اس شعر کا جواب نہیں۔ بڑے آئے اصغر کی "نورانیات" پر وجد کرنے والے ——— اونہہ!"
اور یہ کہتے کہتے منہ پھیر کر انہوں نے فانی کا یہ شعر لہک لہک کر عجیب ایمائی انداز سے پڑھا ؂

دلِ حاصلِ حیات ہے اور دل کا ماحصل
وہ بے دلی، کہ جانِ تمنا کہیں جسے!

"تو پھر میں کیا کروں؟"
"بس یہی کہ اب بھی مان جاؤ"
"کیا؟"
"یہ کہ ——— دلِ شکستہ و نجمِ شکستہ یکساں نیست!"
"واہ! بزور منوانے کی سند نہیں۔ دلیل سے قائل کیجئے۔ یہ تو منظور کہ "دلِ شکستہ" اور "نجمِ شکستہ" میں فرق بیّن ہے۔ لیکن یہ چیز کہ ان پر تفوق کا سزاوار کون ہے۔ ذرا غور طلب ہے!"
"کیوں دلِ شکستہ کا تفوق تو واضح ہے!"
"وہ کیسے؟"
"اس لئے، ؂

ستارہ ٹوٹ کے پھر ہوگیا فروغِ نظر
چراغِ بزمِ فلک کے کوئی بجھا نہ سکا!
مگر ستم کشِ شبہائے غم کے پہلو میں
وہ دل جو ٹوٹ گیا، پھر نمود پا نہ سکا!

"مگر آپ کے استدلال سے تو ستارۂ شکستہ کی فوقیت اور بھی مسلّم ہوجاتی ہے، کیونکہ ایک چیز جو ٹوٹ کر بھی جنتِ نگاہ رہے۔ ہرگز اس جیسی بیہٹی نہیں جو ٹوٹ کر خاک میں مل جائے"
"ابھی حضرت دیکھنا یہ ہے کہ ایک چیز کے ٹوٹ کر بھی جنتِ نگاہ رہنے میں اور دوسری کے مقابلۃً ٹوٹ کر یہ توقصہ مختصر ہوجانے میں صانع کی نادرہ کار صنعت گری پر تو کوئی حرف نہیں آتا؟ اچھا۔ باقی رہا یہ سوال، کہ کس کو کس پر فضیلت ہے۔ تو اس ضمن میں عارفِ ہندیؒ کا فرمان "قولِ فیصل" ہے، کہ آئینہ ؂

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں؟

"اچھا تو پھر نتیجہ کیا ہوا؟"
"یہی کہ فانی کے درد و اثر پر اصغر کی ہزار "بیخبری" "غیاب و حضور" "ہوالموجود" اور "رنجش بیجا" قربان ہیں!"
"لیکن یہ یاد رہے کہ شہابِ ثاقب جس کو آپ نجمِ شکستہ کہہ رہی ہیں۔ بہرحال دلِ شکستہ سے افضل ہے کہ وہ علوی چیز ہے اور یہ خاکی ——— اس کا قالب "خاکِ تیرہ دروں" سے ڈھلا ہے۔ اور اس کا ہیولا نورِ سماوی سے ——— اور پھر فانی کی "جملہ باقیات" تو ہماری "نئی شاعری" کے ایک بے قافیہ "مصرع" میں آجاتی ہیں۔ کہ

شام کی لمبی اداسی میں
ہجو کے سرد آہوں کے!

وہی ——— "فریاد کہ قاتل کوئی نہیں" ——— اور باقی "درجہ بدرجہ خیریت"
——— مگر اصغر کے "شعلہ ہائے عریاں" بھی تو کسی قسمت والے کی سمجھ میں آتے ہیں۔ وہ صرف ایک محدود نقطۂ نظر اور مخصوص میلانات کے ترجمان ہیں۔ جن کی اپیل صرف اُس "طبقۂ نوری" تک ہی جو "جمالیات" اور "خلش ہائے نالۂ بے سود" تصوّف اور عرفاں سے دلچسپی رکھتا ہو۔ اور تاثیر اور سلاست، جو غزل کی جان ہے، ان کے ہاں بالکل مفقود ہے۔ فانی اس دور کے میر ہیں۔ مگر ان میں سوداکا سا دفتر (سو tistioguez) ہے"
"مگر وقر کے اعتبار سے تو سیماب اکبرآبادی کا کلام اس دور میں بیمثل ہے!"
"شاید! مگر یہ تمہیں ماننا ہی پڑے گا کہ اصغر کے ہاں ایسے اشعار کا پتہ نہیں جن میں اس بلا کی حسرت ہو کہ دل آنکھوں کی راہ سے اشر بنکر ٹپک جائے۔ یہ صرف فانی ہی کا حصہ ہے"
میں جواب میں کچھ کہنے ہی کو تھا، کہ پاس کے کمرے سے زیبا کے گانے کی آواز آئی۔ کتنا بے پناہ شعر تھا اور کس درجہ دردانگیز راگ، ——— زیبا بار بار ایک عالمِ بے خودی میں اُسے دُہرا رہی تھی۔

وہی ڈھلکا ہوا آنچل، وہی بکھرے گیسو
آن آئی ہے وہاں سے شبِ ہجراں ہوکر

میرے دل میں جیسے زور سے کسی نے ایک چٹکی لی ـــــ میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

دوسرے دن صبح :ـــ

"سنو . . . . ."

"کیا؟"

"زیبا کیا کہتی ہے"

"کیا ہے زیبا؟" میں نے زیبا سے ذرا نرمی سے استفسار کیا۔ جو دور اس کونے میں منہ پھلائے کوچ پر بیٹھی تھی۔

"دیکھئے۔ یہ مجھ سے خواہ نخواہ الجھتی ہیں" زیبا نے روتی آواز میں کہا "آج صبح صبح کہہ رہی تھیں کہ تم تو پریم پجاری کے اشعار اور اختر انصاری کے قطعات پڑھ پڑھ کر دیوانی ہوئی جاتی ہو۔ حالانکہ ان میں کوئی خاص بات نہیں"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا ان میں سادگی اور سلاست کا جوہر خلوص اور درد و اثر کے ساتھ مل کر سحرِ بابل کا حکم رکھتا ہے . . . . ."

"اری بنو" انہوں نے چمک کر کہا "تم سے ہزار بار کہدیا کہ پریم پجاری کی نثر ضرور دلآویز اور پُر تاثیر ہے۔ مگر پھر وہی بے معنی باتیں، کہ اس کے متفرق اشعار اس کے نثری کارناموں کی جان ہوتے ہیں۔ حالانکہ جہاں تک نثری اسلوب کا تعلق ہے اس کا نثری اسلوب تاثیر اور غمناکی میں راشد الخیری مرحوم کے بعد منفرد ہے۔ مگر ہر وقت، ہر جگہ، یکسانی و یکرنگی ـ کیا ایک بار اور ہمیشہ نہ آیگی یہ اکتا دیتی ہے"

"مگر اختر کے قطعات؟" زیبا بولی۔

"اختر کے قطعات میں تاثیر اور خلوص واقعی درجۂ اتم تک ہیں۔ لیکن کوئی کہانتک "سہانی یادوں" کا افسانہ سنے"

میں نے چھیڑنے کی غرض سے کہا "اور فانی . . . . . ؟ کوئی کہاں تک

بہانے درد و الم، درد و غم کی لذت ہے

کا سبق رٹتا رہے؟"

"یہ آپکے اصغر صاحب ہی کا فرمان ہے، فانی ان "درسیات" سے کہیں بلند ہے!"

"مگر ہے تو فانی کی "باقیات" کا ملخص خواہ کسی بھی کا ہو"

"اچھا! ہوا کرے، تم تو کج بحث ہو تم سے کون مغز مارے"

"دیکھئے بھائی جان" زیبا نے کہا "میں بتاؤں اصغر بیچارے انکے نزدیک اسقدر "مجرم" کیوں ہیں؟"

"دیکھ زیبا، خبردار اگر کچھ بکا تو۔!" انہوں نے آنکھیں دکھا کر کہا۔

"بھائی جان" زیبا نے کمرے کے آخری کونے پر پہونچتے ہوئے اور بزعمِ خود ان کی "زد" سے دور ہٹتے ہوئے شوخی سے کہا "اسلئے کہ دولہا بھائی اصغر کو موجودہ تمام غزل گو شعرا کا امام مانتے ہیں!"

"لیکن عارف بھائی کے اصغر کو غزلگوؤں کا امام ماننے اور انکے اصغر پر اس تخریبی تنقید میں تعلق؟"

"میں نہیں بتاتی! یہ مجھے ماریں گی!"

"تم فکر نہ کرو، زیبا، ہم سفارش کر کے چھڑا لیں گے"

"بڑے آئے زیبا کے حمایتی بن کر ـــ رہ تو جا مردار اگر تیری اچھی طرح خبر نہ لی ہو تو کہنا ـــ حرافہ کہیں کی"

خیریت ہوگئی کہ اتنے میں منّے نے آکر ان سے کہا "سرکار آپ کی ڈاک آئی ہے!"

ڈاک کا نام سنکر وہ تو اُدھر گئیں اور میں نے موقع پاکر زیبا سے پوچھا "کیوں زیبا وہ کیا بات تھی؟"

اُس نے چوکنا ہو کر آس پاس دیکھکر کہا "احمد بھائی تمہیں نہیں معلوم یہ دولھا بھائی سے لڑ کر آئی ہیں۔ کہتی ہیں اب عمر بھر ان کا منہ نہ دیکھوں گی"

"لیکن کیوں؟" میں نے تشویشناک لہجے میں سوال کیا۔

"اس لئے کہ ان کی ضد تھی کہ دولھا بھائی اصغر مرحوم پر اپنے "معرفتی مقالات" کتابی صورت میں شائع کرانے سے باز رہیں۔ کیونکہ وہ اصغر پر تھے، ان کے چہیتے فانی سے متعلق نہ تھے"

"پھر؟ ـ"

"پھر کیا، انہوں نے انکار کیا، اور انہوں نے اصرار، بات بڑھ گئی۔ انہوں نے اپنی محبت کا واسطہ دیا۔ مگر دولھا بھائی نے جواب دیا کہ ادبیات میں ناقدانہ نقطۂ نظر کے معاملے میں ذاتی تعلقات کیوں حارج ہوں؟ یہ تو اپنا اپنا خیال ہے ـــ یہ بگڑ گئیں ـــ بیچ بیچ دوسرے چھوٹے موٹے مناقشات بھی ضمناً "چیزے فزوں کند" کی تعمیل کرتے رہے ـــ"

(بقیہ بر صفحہ ۷۰)

محبوبۂ آمون را

۔۔۔۔۔ ۱ ۔۔۔۔۔

فرعونِ مصر توتمس اور اُس کی ملکہ تھاسو کا عہدِ سلطنت ہے۔ یہی وہ سال ہے جب زہریلی مکھیوں نے مصر میں طاعون پھیلایا تھا۔ جنوب کا عظیم الشان شہر ہے جس کا نام بطلیموسی یونانیوں نے تھیبس رکھا تھا۔

جیرا کا نوجوان بیٹا ''انوآمون'' جو بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی اور فرعون کا نے نواز تھا۔ دریائے نیل کے قریب اپنی جھونپڑی کے دروازے کے سامنے پڑا تھا۔ کبھی اُسے اپنے بچپن کا قحط کا زمانہ یاد آتا تھا اور کبھی وہ اُس زمانے کا خیال کرتا تھا جب طاعون پھیلا تھا، اور ساتھ ہی حبش کا حملہ بھی ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کماندار تو طاعون کی مکھیوں سے بھی بدتر تھے مکھیاں تو بستر پر ہی مارتی تھیں، مگر یہ کماندار کمبخت آدمیوں کو پکڑ کر زندہ جلا دیتے تھے۔ انوآمون حملہ آوروں کے خلاف اپنے وطن کے تیراندازوں کے ساتھ لڑا تھا۔ مصر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ اور بھاڑ جیسے گرم ریگستان میں مصریوں کا خوفزدہ ہو کر پسپا ہونا اُسے خوب یاد تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ حبشی تھے جو ڈھول بجا بجا کر یہ اشارہ کر رہے تھے کہ کوئی دشمن نکلنے نہ پائے۔ دو دن تو اُس پر ایسے گزرے تھے کہ راستے بھر اُسے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ملا تھا، اور اُسے استسقا کا مزا آ گیا۔ اُسے وہ جلا بھنا تیسرا پہر بھی یاد تھا کہ جب ایک اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے وہ پیدل چل رہا تھا اور غلبۂ تشنگی کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اونٹ کے پسینے کو بار بار اپنی انگلی سے چاٹ لیتا تھا۔ اِس مصیبت کی یاد ہی نے اُس کا منہ سکھا دیا تھا۔ اُس نے خوشبودار پتیاں ملے ہوئے ٹھنڈے پانی کا تونبا اٹھایا اور تھوڑا سا پانی پیا۔

دریا کے دونوں جانب وہ شہر پھیلا ہوا تھا جس پہ مصر بھر کو فخر تھا اور جسے سورج دیوتا کا محبوب سمجھا جاتا تھا۔ صبح صادق کا وقت تھا، باشندگانِ شہر نیند میں غرق تھے، اور دریائے نیل پر بھی بلا کی خاموشی طاری تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں بول چال کی آوازیں، مندر کی گھنٹیوں کی صدائیں اور مرغوں کی اذانیں بلند ہونی شروع ہوئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد سورج اس شان سے نمودار ہوا گویا وہ ایک کرۂ آتشین ہے۔ انوآمون سیدھا کھڑا ہو گیا اور ہاتھ اٹھا کر یہ مختصر سی دعا پڑھنے لگا۔

"اے زندگی بخشنے والے معبود!

مجھے شکر گزاری سے معمور دل عطا فرما!"

پھر ایک آہ کے ساتھ کہنے لگا: "اور وِشتی!"

اُس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سورج کی طرف نگاہ کی۔ سورج نے مندروں کے دروازوں اور ستونوں کو اپنے سُرخ رنگ میں رنگ رکھا تھا۔ فرعون کے محل کا دروازہ جواہرات کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا، اور مندروں کے چمکدار پتھر نور کا لکہ بنے ہوئے تھے۔ سامنے میدان اور باغ میں، جو "فضائے گل" اور "باغِ فراموشی" کے نام سے موسوم تھے، پھول اور پتے ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جلتا بلتا پیالہ نما آسمان اُنہیں ڈھکے ہوئے ہے اور اُن کے جسم کو جھلسائے ڈالتا ہے۔

انوآمون کی لکڑی کی جھونپڑی امتدادِ زمانہ سے سیاہ ہو گئی تھی۔ اُس کے اِرد گرد خوشبودار پودے لگے ہوئے تھے جو گملوں کو اور بھی دلکش بنا رہے تھے۔ ہمارا نے نواز اُس وقت ایک ترنگ میں تھا۔ وہ سادہ اور صاف سُتھرا رہتا تھا۔ اُس کے لباس میں ایک طرح کی لطافت تھی، اور وہ وقت و زمانہ کے طرز سے جو مختلف فرعونوں کے ساتھ پیدا ہوتے اور مرتے رہتے تھے، بالکل ناآشنا تھا۔ اس کی عمر پچیس برس کی ہو چکی تھی مگر وہ ابھی تک کنوارا تھا۔ یہ بات اُس تمدن کے خلاف تھی، جہاں کی رسم کے موافق پندرہ برس کے لڑکے بھی شادی کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ وہ فرعون کا نے نواز تو تھا ہی مگر ملکہ تھاسو کا معتمد بھی تھا۔ وہ ایک مصاحب کے ہنر سے بھی خالی نہ تھا۔ اُس کی گفتگو مسحور کُن ہوتی تھی اور اُس کا نغمہ دلکش۔ غرض کہ کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو اُس کے ذریعے پوری نہ ہو سکتی ہو۔

اُس نے ایک سفید لبادہ اور ایک گول ٹوپی پہنی اور روانہ ہو گیا۔ اُس کے آگے آگے ایک شخص بڈھے فقیر کے بھیس میں لاٹھی سے راستہ ٹٹولتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ شخص ایک کھڑکی کے سامنے رکا جس میں سے ایک ایشیائی طرز کی عورت جھانک رہی تھی۔ اُس نے اپنی لاٹھی پر دو انگلیاں رکھ کچھ اشارہ کیا اور چلتا بنا۔ یہ وہی مکان تھا جس کی طرف انوآمون جا رہا تھا۔ عورت نے جو بڈھے کے اشارے پر ہنسنے لگی تھی، اُسکی

آمد پر اپنی اس خوشی کے اظہار کو روک لیا۔ نوجوان مکان میں داخل ہوا، اور ایک لڑکی کی طرف جو فرش پر بیٹھی تھی، سر ہلایا۔ لڑکی بھی اپنی ماں کی طرح اُس بھیس بدلے ہوئے بڈھے کے اشارے کو سمجھ گئی تھی۔ یہ لڑکی ملکۂ ہتاسو کی رقاصہ وشتی تھی۔ اُس کے اس اسیرین نام کے معنی ہیں "شعلۂ درخشاں" اُس کے چہرے کا رنگ بہ نسبت مصریوں کے زیادہ سیاہی مائل تھا، اُسکے رخساروں کی ہڈیاں فرعون کے کمیرا (Chimera) کی طرح اُبھری ہوئی تھیں، اور اُس کے بھرے ہوئے ہونٹ چمکدار دانتوں کے مقابل خوبصورت رنگ سے جلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ انوآمون نے اُسے بارہا ستاروں کی روشنی میں ساکت کھڑے ہوئے اور ہموار زمین پر دور دور نظر ڈالتے ہوئے دیکھا تھا، جس سے وشتی کے دل میں اسیریا کے اُن پہاڑوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جنہیں اُس نے دیکھا تک نہ تھا، بلکہ وہ یاد اُسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ آئیسس دیوی کی طرح سبک پا تھی۔ وہ ایک بلا آستین کا لباس پہنے رہتی تھی، اُس کے ننگے پیروں میں پازیب ہوتے تھے، اور اُس کی گردن کے گرد ایک نیلا رومال۔ اُسنے رنجیدہ چہرہ بنا کر ملاقاتی کو سلام کیا جس کا مقصد اُسے بڈھے کے اشارے کا مطلب سمجھانا تھا کہ وہ تھوڑی دیر میں بادشاہ کے محل کو تحفے کے طور پر لے جائی جائیگی، کیونکہ اُس دن فرعون کی سالگرہ تھی۔

فرعون کی سالگرہ کا دن تھا۔ وشتی کی ماں، بعل زیفن، لنگڑی ہونے کی وجہ سے خواہشمند تھی کہ فرعون آج اُسے چھو دے۔ مذہبی پیشواؤں نے فراعنہ کو سکھا دیا تھا کہ معالجہ صفاتِ ربانی میں سے ایک ہے، اور اس طرح لوگوں اپنے ہاتھ سے چھو کر شفا دینے سے بادشاہ اپنا درجہ دیوتاؤں کے برابر شمار کر سکتا تھا۔ بادشاہ سے شفا مانگنے والا جذامی اپنے اس عقیدے کو ظاہر کرتا تھا جس کا مخرج مصریوں کی غلامی تھا اور جب فرعون اُسے چھو کر کہتا "میری مرضی ہے کہ تو اچھا ہو جائے" تو وہ شاہانہ اقتدار کے ساتھ بولتا تھا۔

بعل زیفن نے اپنے مکان کو آراستہ کر کے، جنگلی بلیوں کی کھال کا لباس اور کفتار کے دانتوں کا لباس پہنا، اور اپنے کالے بالوں میں قیمتی خوشبو لگائی۔ وہ جانوروں اور پیدائشی نقص رکھنے والے بچوں کے علاج میں کافی مشہور تھی۔ اس وقت بہت خوش تھی، اور اس خیال میں لطف لے رہی تھی کہ جلد ہی اُسے اپنی بیماری سے نجات حاصل ہو جائیگی اور اپنی خوبصورت لڑکی کے بدلے میں بہت سا روپیہ اُسکے ہاتھ آئیگا۔

اُس نے وشتی کو یقین دلاتے ہوئے کہا "فرعون کے چھونے سے صرف ایک چیز ہی بہتر ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ سُرخ کمیرا مجھے اپنی زبان سے چاٹ لے"

"یہ سُرخ کمیرا کیا چیز ہے؟" وشتی نے یقین نہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا، غور سے سُن، کمبخت" اُس کی ماں نے سنجیدگی سے جواب دیا "مینتوہیتپ کے عہد میں کہ جب مصر کے عُروج کا آغاز ہی تھا اور تصویروں کی شکل کا طرزِ تحریر ایجاد ہوا تھا، بے سی لسک (Basilisk) نے جو صحرا میں رہتا تھا، کمیرا کو تلاش کیا۔ اور اُس سے کہا "اے خوشی میں گانے والے لوگوں کے محبوب، تو مجھ سے تصویروں کا طرزِ تحریر سکھانے کی کیا اُجرت لیگا؟" یہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ کمیرا نے سوچا، کیا میں اس ذلیل کو عقل کی باتیں سکھا دوں! اور کہنے لگا "اے نیند کے باپ، تو مجھے اپنا وہ تحفہ دیدے، جس سے میں اپنے کانوں سے سُن سکوں اور لوگوں کے دل کے خیالات معلوم کر سکوں، تو میں تجھے وہ طرزِ تحریر سکھا دونگا۔ لیکن تو اپنے دادا کے داہنے ہاتھ کی قسم کھا کہ تو ضرور ایسا کریگا" اس پر بے سی لسک نے اپنا اکیلا تحفہ کمیرا کو دیدیا۔ تحفہ ملتے ہی کمیرا نے بے سی لسک کا پیٹ پھاڑ ڈالا، اور وہ مرگیا۔ اس واقعہ کے بعد سے لوگوں نے بے سی لسک پر ہنسنا اور اُسکا مذاق اُڑانا شروع کیا۔ کمیرا کو مصر میں اقتدار حاصل ہوگیا، لیکن بیسی لسک کی ہڈیوں کو ناپاک کیا گیا"

وشتی نے دوبارہ دریافت کیا "لیکن کمیرا ہوتا کیا ہے؟"

اسکی ماں نے جواب دیا "تم کمیرا کو اس سے شناخت کر سکتی ہو کہ وہ اپنے ہی سائے کے سر پر قدم رکھتا ہوا چلتا ہے"

جب انوآمون داخل ہوا تو بعل زیفن نے حقارت سے اپنی پیٹھ پھیر لی، اور ایک گول کیتلی کی طرف متوجہ ہوگئی جس میں وہ ٹکڑے پڑے ہوئے تھے جنہیں اُس کی مادری زبان، کلدانی میں "غریب کا ناشتہ" کہتے ہیں۔

نے نواز وشتی کے قریب آیا اور کہنے لگا "تم تُوتمس کی سالگرہ کے تحفے کے طور پر محل میں فروخت کر دی گئی ہو، لیکن اگر تم میری قسمت میں شامل ہونا پسند کرو تو ماہی گیر امیسس ہمیں فوراً اپنی تیز رو کشتی میں لے جائیگا"

اسکے چُپ ہوتے ہی بعل زیفن مُڑی اور خاموشی سے جس میں نا رضی بھی شامل تھی، اُسنے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

نوجوان گرم ہو کر بولا "تمہیں جس چیز کی خواہش ہے وہ صرف ایک چمکیلی چیز ہے جو کل فنا ہو جائے گی ـــــ یہ تو ایک خوش آیند مگر شرمناک طریقہ ہے"

دشتی سے چار آنکھیں ہوتے ہی وہ رکا۔ اسکی آنکھوں میں ایک ایسا پیام تھا جس کو اس نے غائب ہونے سے پہلے ہی پڑھ لیا۔

اُس کے پیچھے پیچھے لڑکی باہر گلی میں جہاں وہ اکثر پہلے بھی ملے تھے اس طرح چلی گئی کہ کسی نے بھی اُسے نہ دیکھا۔ وہ ایک حوض کے کنارے پر بیٹھ گئی، اور سنجیدگی سے کہنے لگی: "اگر اب بھی رہائی ممکن ہو تو میں تمہارے ساتھ چلی چلوں، لیکن تم سے زیادہ اور کون جانتا ہے کہ یہ بالکل ناممکن بات ہے، وہ لوگ ہمیں واپس پکڑ لائیں گے، اور ہمارے کوڑے مارے جائینگے۔ یہی تو تھاسو کا طریقہ ہے"۔

اُنوآمون بات کاٹ کر بولا: "تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دریا کے کنارے کے دیہاتوں میں گُم ہو جائیں؟"

دشتی نے جواب دیا: "رہائی کا تو صرف ایک ہی دروازہ ہے، ملکہ سے کہہ دینا کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہو چکی ہے۔ تب ثوتمس کو میری ضرورت باقی نہ رہے گی، تھاسو ہم دونوں کو اپنی زندگی سے نکال باہر کریگی"۔

وہ یہ بات بالکل نہ جانتا تھا کہ خود ملکہ ہی اپنی خادمہ کو اپنے شوہر کو جو اُس کا سوتیلا بھائی بھی تھا، تحفہ میں دینا چاہتی ہے۔ اس لئے اُس نے یہ خیال اپنے دل میں جما لیا کہ صرف ملکہ ہی اپنی خادمہ کو اس طرح پیش ہونے سے بچا سکتی ہے۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

آدھ گھنٹے کے بعد اُنوآمون ملکہ کے کتب خانہ میں بلایا گیا جہاں وہ پہلے بھی اکثر گیا تھا۔ یہ کمرہ بہت بڑا تھا، اس میں آبنوسی کام کی ایک میز تھی جس پر کاغذ، جواہرات کے چراغ، چینی کی دواتیں، پروں کے قلم اور گول مُہریں رکھی ہوئی تھیں۔ صوفے اور کُرسیاں بھی تھیں، اور بکری کی کھال کے غالیچے اور شیر کی کھال کے فرش بھی۔ ملکہ اکثر ایک تخت پر بیٹھا کرتی تھی جس کے چاروں کونوں پر اُس کے خاندانی دُشمنوں، آسیرین، بنی اسرائیل، بدّو اور حبشی کے سر بنے ہوئے تھے۔ دیوار کے قریب ایک سیپ کی الماری تھی جس کے پاس ہی میز پر مُہرے اور بساطیں رکھی تھیں، دیواروں پر دھات کے آئینے، ہاتھی دانت کی ایک سارنگی، شتر مُرغ کے پروں کے پنکھے، اور اس کے مرحوم باپ کی ہلاکت خیز کمان ٹنگی ہوئی تھی۔ پردے اس کی خوابگاہ کے دروازے کو آدھا چھپائے ہوئے تھے۔ خوابگاہ میں ایک پروں کا بستر، ایک سونے کی سلفچی اور ایک لباس کی میز تھی جس پر مصنوعی بال رکھنے کی تپائی، بال بنانے کا سامان اور عود دان رکھے تھے۔ اس اندرونی کمرے سے بھی اُنوآمون واقف تھا۔

سنہ ۱۵۰۰ ق م میں ملکہ تھاسو تیس سال کی تھی۔ اُس کا یہ نام، جس کے معنی ہیں "اعلیٰ ترین لوگوں میں سر برآوردہ" اُس کے باپ نے رکھا تھا۔ خود اُس نے غرور سے اپنا نام "ماکارا" یا "محبوبہ آمون را" رکھ لیا تھا۔ مذہبی پیشواؤں نے خاندانی فوائد کو مدِ نظر رکھکر اُس کی شادی اُس کے سوتیلے بھائی سے کر دی تھی اور اُس کے چہرے میں ناقابلِ فہم زردر موجود تھا۔ اُس کی لعل کی سی آنکھیں سورج کی روشنی میں جھپک جاتی تھیں۔ اسکے سر پر بال نہ تھے، اس لئے وہ مصنوعی لمبے اور سیاہ بال استعمال کرتی تھی۔ اُس کے جوتے نرم ہوتے تھے، اور وہ ایک نیلگوں عبا میں ملبوس رہتی تھی۔ اسکی گردن اور انگلیوں پر تعویذ بندھے رہتے تھے۔ طاقت کا جرأت آزما کھیل کھیلنے والی ملکہ کی حیثیت سے اُس نے مدت سے تمام زنانہ آرائشوں اور نمائشوں کو خیرباد کہہ رکھا تھا۔

جب اُنوآمون داخل ہوا تو وہ تنہا تھی، اور جو غلام اُسے لیگئے تھے وہ بھی کمرے کی دہلیز ہی سے واپس ہو گئے۔ نے نواز رک گیا، اور کسی سنسنی خیز یاد کے ساتھ اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ کتنی ہی مرتبہ اُس نے تھاسو کے ہاتھ کو محبت آمیز اشارے کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُسے ملکہ کی مہربانی یکایک بلا کسی توقع کے ہی حاصل ہو گئی تھی۔ ملکہ کی اِس عنایت پر غور کرتے رہنا پانچ سال سے اس کا مشغلہ تھا، لیکن اِس مہربانی کے اندر جو اندیشے پنہاں تھے اُن سے بھی وہ غافل نہ تھا۔ کیونکہ کسے خبر ہے کہ ملکہ کی لطف و عنایت کب پھانسی کے پھندے کی شکل میں تبدیل ہو جائے۔ یقیناً یہ اسکی موسیقی کا ہی اثر تھا جو اُس کے جذبۂ محبت کو دریا کی پُر اسرار آواز اور صاف آسمان کی شعریت کے ساتھ مترنم بنا دیتا تھا۔

اس ایک لمحے کے سکوت میں ملکہ نے غور سے اُس کی طرف دیکھا، اور پھر نہایت خاموشی سے آگے بڑھی، اور دفعتاً اُس کے کندھے پکڑ کر اُسے اس طرح بوسہ دیا گویا وہ اُس کی رُوح ہی کو بوسہ دینے کی متلاشی تھی۔ اُن کے بدن میں ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی جس سے اُنہیں احساس ہونے لگا کہ اُن کے لب آخری مرتبہ مل رہے تھے۔

"اے ملکہ!" اُسکے عاشق نے کہا: "کیا یہ کسی دیوی کا تحفہ نہیں ہے کہ میں اتنی جرأت کرتا ہوں، اور پھر بالکل نہیں ڈرتا!"

ملکہ تھاسو نے جواب دیا: "تمہیں پوری ہمت سے کام کرنا ہوگا۔ کمیرا نے تو بادشاہ کے دماغ میں زہر بھر دیا ہے۔ یہ قابلِ نفرت جانور ایسا ہی عمر رسیدہ ہے جیسی مصیبتیں، اور ایسا ہی قوی جیسی قریب الموت شخص کی اور زندہ رہنے کی خواہش۔ جب وہ دھوپ میں کھڑا ہوتا ہے تو میں اُس کے خونی خیالات جان جاتی ہوں۔ خواب میں میں کمیرا کے الزامات سُنتی رہتی ہوں، اور بارہا میں ثوتمس کے چہرے سے اُس کی یہ

خواہش معلوم کرچکی ہوں کہ میں مرجاؤں۔ اس خواہش اور ایسے حکم میں ایک قدم ہی کا تو فرق ہے۔"

اُنوآمون کو فوراً یہ موقع مل گیا۔ اُس نے غور کرکے کہا: "ایک گھنٹے کے اندر ہی پختہ کام ہونا چاہیئے، اور ہمیں بدگمانی کرنے والوں کو فوراً نہتا کر دینا چاہیئے۔"

تھاسو نے اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا "لیکن ایسا ہو کس طرح؟"

اُس نے ہمت کرکے جواب دیا: "ہماری موجودہ حالت میں ایک بہادرانہ قربانی کی ضرورت ہے۔"

ملکہ نے اُس کے الفاظ کو پہلے ہی سے سمجھتے ہوئے کہا: "اور فرض یہ ہو کہ ...."

"بشرطیکہ ہم میں ہمت ہو، یہ ایک جرأت آمیز ضرب ثابت ہوگی۔"

ملکہ نے تھرتھراتے ہوئے لبوں سے دُہرایا: "وہ جرأت آمیز ضرب! کیا تم اُس کی تعریف کرسکتے ہو؟"

"فرض کیجئے" نےنواز نے کہنا شروع کیا: "کہ میں شادی شدہ ہونے کا بہانہ کر دوں۔"

ملکہ نے لاپرواہی سے پوچھا: "کس کے ساتھ؟"

"کسی کے ساتھ سہی، آخر یہ ایک بہانہ ہی تو ہے، غور تو کیجئے اس سے کتنی جلدی بادشاہ کی ناراضی رفع ہو جائیگی۔"

"کیا تم سوچ چکے ہو کہ کون اس کے لئے مناسب ہوگی۔"

اُنوآمون نے تجویز کیا: "آپ کی خادماؤں یا رقاصہ لڑکیوں میں سے کوئی ایک۔"

"رقاصہ لڑکیاں!" ملکہ نے زور دیکر کہا: "وہ جس کے ساتھ تم دیکھے گئے ہو ــــ وہ جس کا خیال میرے دل میں موجود رہتا ہے، جس کا چہرہ ہر سائے میں نظر آتا ہے، جس کا سانس میں اپنے شانے پر محسوس کرتی ہوں، جس کو میں آج تو مُس کر دے رہی ہوں ــــ دشتی!"

اُنوآمون اس نام پر چونک پڑا اور خاموش کھڑا ہو کر تھاسو کو جس کا چہرہ ہلاکت خیز غصہ سے سُرخ ہو گیا تھا، اپنے ہاتھ مروڑتے ہوئے دیکھنے لگا۔

اُس نے رُک رُک کر کہا: "ملکہ، آپ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟ کیا میری اس بات میں کوئی خوفناک شرارت پنہاں ہے؟"

اس کے جواب میں ملکہ بے قابو ہو کر رونے لگی۔ اُنوآمون کو معلوم ہو گیا کہ اُس غیر مرئی ہاتھ نے جو اکثر تعجب خیز تبدیلیوں کا باعث ہوتا ہے، ایک بند دروازہ کو کھول دیا ہے۔

تھاسو آخر کار بولی: "میرے سابق دلدادہ، میں تیرا راز تیری آنکھوں سے معلوم کرچکی ہوں۔ ہفتوں دشتی تیرے ساتھ رہی ہے اور نہ معلوم تو کیسا بدل گیا ہے کہ تجھے ایک ملکہ کے لبوں تک پہونچنے کا درجہ مل چکا تھا، اور اب تو ایک غلام کے پیروں پر سر رگڑ رہا ہے۔"

نوجوان نے اُس کی ناراضی دُور کرنے کی بے فائدہ کوشش کی۔ اُس نے آہستہ سے کہا: "اگر میں نے لاپرواہی سے کوئی بات کہہ دی ہے تو اب معاف فرمائیے۔ آسمان پر ابر ہونے کی وجہ سے پھولوں کا کھلنا بند نہیں ہوتا۔ آنسو صرف پانی ہی تو ہیں ــــ دو دلوں کے ملتے ہی وہ خشک ہو جاتے ہیں۔ آپ اور میں ہرزہ گوئی سے بالاتر ہیں۔ ہم اُس زمانے میں واپس ہو گئے ہیں جب دیوتا زمین پر آتے تھے اور دخترانِ آدم سے محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ ہماری زندگیاں ہمیشہ موسمِ بہار سے قریب رہنی چاہئیں۔ اِسی غرض سے میں ہر موسمِ بہار میں رنگین پہاڑوں پر پھول چننے کے لئے جاتا رہا ہوں جن سے آپ کے وعدے کی خوشبو آتی ہے، اِسی غرض سے میں آپ کے بیان کئے ہوئے پیچ وخمِ حیات کے معنی دُہراتا ہوا دریا کے کنارے ٹہلتا رہا ہوں۔"

ملکہ نے سرد مُہری سے بات کاٹتے ہوئے کہا: "کیا یہ سب اسی غرض سے تھا کہ دشتی بھی اُنہی الہامات کی متلاشی تھی؟"

اُنوآمون بلاتوجہ کئے کہتا رہا: "میں کبھی اُس وقت کی مسرت کو نہیں بھولا کہ جب میں نے آپ کو سب سے پہلے دیکھا تھا، مجمع کے سامنے کھڑی ہوئی ایک شہزادی، ایک مجسمۂ حُسن کہ بادِ صبا بھی جس کی تابانی کی نشر و اشاعت کر رہی تھی۔"

"ہاں" تھاسو نے جواب دیا: "تم نے میرے سامنے ایک دلیر دل ہدیہ میں پیش کیا تھا، اور اس کا کچھ نہ کچھ حصّہ باقی رہے گا ہی۔ چڑیا اپنے ساتھی کی یاد میں گایا ہی کرتی ہے۔ ناآزمودہ چیزوں کے درمیان تم ہی میری آرزو تھے، اور جب تم آجاتے تھے تو میرا دل محوِ ترنم ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ ثمرِ ممنوعہ جسے ہمیں نہیں چکھنا چاہیئے تھا، ناپائیدار ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ہم کبھی ملے ہی نہ ہوتے؟ اچھا، الوداع۔ اپنا راستہ لو، اور مجھے میری قسمت پر چھوڑ دو۔"

اپنے دلدادہ کے چلے جانے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس گئی، اور سُورج دیوتا کی طرف ہاتھ اٹھا کر یہ دُعا پڑھنے لگی:۔

"تو شعلے کی طرح پاک صاف ہے، مجھے پاکیزہ رکھ۔

اے روشنی کی آنکھو، تم سائے کے غرور سے واقف ہو،

مجھے بُرے خیالات سے بچاؤ۔
گفتگو میں مجھے غلط اقدام سے محفوظ رکھ۔
مَیں زندگی کے دریا کو اُس کے مقررہ راستے سے کبھی نہ ہٹا سکوں۔
اے ہمیشہ قائم رہنے والے، مجھ پر رحم کر جس کی زندگی یک شب روزہ ہے؛
اے لا انتہا! مجھے محفوظ رکھ جو فضا کا ایک ناچیز ذرّہ ہے۔
اے حکمتوں کے مالک! مجھ اندھیرے میں چلنے والی کو روشنی دِکھلا ——!
اور سب سے زیادہ یہ کہ میری اِس دُعا کو قبول فرما کہ پھر کبھی مجھے اذیتِ عشق سے واسطہ نہ پڑے۔"

—— ۲ ——

حالانکہ وہ چہرے پر جھرّیاں پڑجانے اور بال اُڑجانے کی وجہ سے زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا مگر یہ فرعون کی تینتیسویں سالگرہ تھی۔ اُس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں، دانت خراب ہو چکے تھے اور ہونٹ ہمیشہ لٹکتے رہتے تھے۔ وہ سر پر آگے کی طرف مصری طرز کے بال رکھتا تھا، اور اُس کی پیٹی میں چار پیتل کی کُنجیاں لٹکی رہتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اُن مُصیبتوں سے جو بادشاہوں کی منتظر رہتی ہیں ڈرتا رہتا تھا، لیکن بادشاہ ہونے کی وجہ سے اُس میں سختی پیدا ہو گئی تھی جس سے وہ سمجھنے لگا تھا کہ مُلک کی ہر چیز اُس کی ملکیت ہے؛ وہ لوگوں کو چیوپس (Cheops) کے اقوال بہت شوق سے سُنایا کرتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مناسب مثالوں سے اُن کی تشریح بھی کرتا جاتا تھا۔ اُس کی آرزو، جو خود اُس کی کمزوری کی دلیل تھی، یہ تھی کہ لوگ اُسے طاقتور سمجھیں۔ اُس کے گرد صدیوں کی عظمت و شان کی نشانیاں موجود تھیں، اور وہ ہمیشہ یہ غور کیا کرتا تھا کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کی مختصر زندگی کی کیا نشانی باقی رہیگی۔

وہ اُس عُمر کو پہونچ گیا تھا کہ جب اکثر لوگوں کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اُن کے اُمور اگر بہتر طریقے پر انجام پاتے تو اچھا ہوتا۔ اب تک بازیِ حیات اُس کے مخالف ہی رہی تھی، غلام، جن کا دردناک نالہ و بُکا اُس تک پہونچتا تھا —— اُس کی وحشی اور کاہل حبشی فوج جو حملہ آور بدوؤں کا ایک خوفناک حصہ تھی۔ سرکش، کاہن، کبھی خوش نہ ہونے والے دیوتا۔ اُس کی اقتدار جتانے والی بیوی، جو سوتیلی بہن بھی تھی —— یہ سب تھیں اسکی تکلیفیں۔ تو کیا تعجب ہے اگر پھولوں میں سے صُبح کی تازگی غائب ہو گئی تھی۔ اب بھی اُس کے دل میں پُرانی خواہشات کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی، اور وہ صرف یہ جانتا تھا کہ وہ جام جو اوسی رس (Osiris) نے اُس کو عطا کیا تھا اُس کے ہاتھ سے کسی طرح نکل گیا ہے۔ ہر ایک چیز میں ناکامیاب ہو کر وہ دوسروں کے بہادرانہ کارناموں سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ اپنی حالت پر افسوس کرتا تھا لیکن سوائے ایک آہ کے اور کچھ کہتا نہ تھا، یا پھر خاموشی سے ہاتھ ہلانے لگتا تھا۔ کیا اب بھی یہ مناسب نہ تھا کہ وہ اپنی شیطان صفت ملکہ کے لئے بازیِ حیات کو نہ بگاڑے، اور اپنے آپ تاج پہن لے؟۔

آج اُسے دو کام کرنے تھے، قابلِ نفرت فرائض کا انجام دینا اور پھر شاہانہ عیش و عشرت میں مشغول ہو جانا۔ دوپہر کے وقت اُسے مفلوج اور بیمار لوگوں کو چھونا تھا۔ تو تمس کو خوف تھا کہ بجائے معالجہ کے کہیں خود اُسی کو کوئی بُری بیماری نہ لگ جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اِس کام کو ختم کر کے اُسے دعوت میں حصّہ لینا تھا۔ ذرا ہی دیر پہلے اسکے معالج کاہن نے اُس کے حلق میں ایک پَر سے دوا لگائی تھی کیونکہ اُسے خناق کا عارضہ تھا۔

اس وقت وہ باغ میں لیٹا ہوا تھا، اور دریائے نیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس کی لامحدود روانی کے اسرار نے عہدِ عتیق کے کاہنوں کو زندگی کے دوامی مسائل پر غور کرنے میں لگا دیا تھا۔ دریا ناقابلِ فراموش دلکش منظر کے درمیان چمک رہا تھا، اور قریب ہی پُرانی پہاڑیاں جو تکوینِ عالم کے زمانے کی یاد دلاتی تھیں، سربلند کھڑی تھیں۔ ہلکے سے سُرخ رنگ کے بخارات دریا سے اُٹھ رہے تھے جو دیوتاؤں کا سانس معلوم ہوتے تھے۔ ایک پایاب جگہ میں بہت سے گھڑیال پڑے سو رہے تھے، اور قریب ہی ایک چہا اپنے پر پھیلائے اُڑ رہا تھا۔ اُس کے پَیروں کے نزدیک نرکل کے جھنڈ تھے۔

یہ مسحور کُن اور دلکش "باغِ فراموشی" فراعنہ کے غور و تفکر کیلئے خلوت گاہ کے طور پر الگ بنایا گیا تھا۔ اُس کے پتّوں میں سے ہو کر صرف دن کی ہلکی سی روشنی آتی تھی۔ وقتاً فوقتاً نیلوفر کھلنے والے کاہنوں میں سے کوئی منتخب شخص وہاں اکتشافاتِ فنا پر حیران کُن گفتگو کرنے کے لئے لایا جاتا تھا۔ باغ کے انار اور کنیر کے درختوں کے گرد عبادت کے بخورات کی سی بُو اُڑ رہی تھی۔ وہاں سونے والوں کے لئے کُنج بنے ہوئے تھے جن سے عشق کے رنج اور مسرّتیں پیدا ہوتی تھیں۔ آئی سس کا سنگِ سماق کا ایک مجسمہ بھی نصب تھا جس کی گود میں اُس کا بچّہ ہورس (Horus) بھی تھا۔ پُشتہا پشت سے اس مجسمہ کے مسحور کُن اثر کے ماتحت شاہی عاشقوں نے بوسے دئے تھے۔

اس سے ایک رات پہلے فرعون نے ایک غیر معمولی اہمیت رکھنے

والا خواب دیکھا تھا۔ حالانکہ وہ سو رہا تھا، مگر اُسے احساس ہوگیا کہ کمیرا کی درخشاں آنکھیں اُس کی طرف غور سے دیکھ رہی ہیں۔ اُس کو یاد تھا کہ آخری مرتبہ جب کمیرا کا چہرہ زندگی سے معمور ہوکر اُس کے سامنے نمودار ہوا تھا تو وہ خاموش سطحِ آب سے باہر نکلا تھا۔ اُس نے حرکت کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس عجیب جانور نے اُس کی رُوح کو حکم دیا کہ وہ بغیر بیدار ہوتے اُس کے ساتھ چاندنی میں چلے۔

کمیرا نے کہا: "اے بلند مرتبت شخص میں اُن پوشیدہ جالوں کو جو تیرے لئے بچھائے جارہے ہیں تجھ پر ظاہر کرنے کیلئے آیا ہوں۔"

تُوتمس نے جواب دیا: "میری زندگی اُن چیزوں کی متلاشی رہی ہے جن کو کوئی بھی نہیں پاسکتا۔ اور مجھے اُس چیز کی آرزو رہی ہے جسے تو کہتا ہے موجود ہی نہیں۔ تجھے ایسے شخص کے خوش آیند وعدوں سے حاصل ہی کیا ہے؟"

کمیرا بولا: "تمام انسان اور تو بھی جسے آنوبس ( ) کے ساتھ بیٹھنے کا شرف حاصل ہونے والا ہے، چاہتے ہیں کہ غیر متوقع واقعات سے فائدہ اُٹھائیں۔ ایسا فائدہ حاصل کرنے کا ایک موقع ہی وہ تحفہ ہے جو میں دیتا ہوں۔"

بادشاہ نے چلا کر کہا: "اس کا کیا سبب ہے کہ تو ہمیشہ آکر بری خبریں ہی سُناتا ہے؟"

"اچھا، ایک مرتبہ اور سہی، لے تو جیسا جی چاہے سمجھ، اچھا یا بُرا۔ یہ دیکھ لینا میرا کام نہیں ہے کہ جام میں کتنے قطرے شراب کے ہیں۔"

نیم خوابی میں کچھ کچھ سمجھتے ہوئے تُوتمس نے تھاسو کی دلسوز اور نفرت انگیز باتوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ وہ صرف نام ہی کی بیوی تھی، تاہم اس شادی سے، جسے صرف کاہن ہی شادی سمجھتے تھے، دو بچے ہوئے تھے۔

یہ بلّی کی شکل کا جانور اُس کے خیالات سمجھ گیا، اور دبی ہوئی آواز میں کہنے لگا: "دورانِ حیات میں فانی انسانوں کے زیادہ نزدیک نہ رہ۔"

"غیر فانی دیوتاؤں میں سے کون تجھے میرے ستانے کے لئے بھیجتا ہے؟"

"اپنے آپ اندازہ لگا لے۔ دریا کے تمام نیلوفر اور کنول مُرجھا رہے ہیں، کل صبح دھواں تین سمتوں میں اُڑ رہا تھا۔ کل شام ہورس کے باز اپنے مرثیے پڑھ رہے تھے، چاند نکلتے وقت میں نے تمام سلجھائے آسمانی پر سائے دیکھے تھے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھے کوئی شدید خطرہ گھیرے ہوئے ہے۔ میں نے ایسی کیا خطا کی ہے کہ اس سزا کا مستوجب قرار دیا گیا ہوں؟ ——— میں جس کے دل میں ہر نئی اور غیر معمولی چیز کی نفرت موجود ہے۔"

"تنبیہہ کے ساتھ ساتھ میں تجھے بہت سی باتیں بتاتا ہوں۔ اکثر جب تو سوتا ہوتا ہے تو میں شعلوں کے قریب بیٹھ کر تیری زندگی پر اثر کرنے والی قوتوں کی پرستش کرتا ہوں۔"

تُوتمس جھجکا اور زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "ایک مرتبہ تو نے ملکہ کے بارے میں کچھ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔"

کمیرا نے تُوتمس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی کتا اپنے مالک کی طرف دیکھتا ہے، اور بولا: "میں تجھے دو مرتبہ بتا چکا ہوں کہ وہ آمون را کی محبوبہ ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا: "اے دانشمند، آمون را کس انسان کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔"

"یہ شاید تجھے آج معلوم ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص تجھے تخنے میں سُناروں کی سی ترازو پیش کرے تو سمجھ لے کہ وہی انسانی شکل میں دیوتاؤں کے اوصاف کی نقل اُتارتا ہے، اور جب اپنی بدی پر آجاتا ہے تو ایک مُہلک خطرہ بن جاتا ہے۔"

یہ کہکر کمیرا خوابِ پریشاں کی طرح فضا میں تحلیل ہوگیا۔

فرعون کے خواب کا تار ملکہ تھاسو کی آواز سے ٹوٹا جو اسے سالگرہ کی مبارکباد دینے اکیلی آرہی تھی۔

وہ کہنے لگی: "اے شاہباز بلند پرواز، آپ کی عظمت و جبروت کے نغمے روز بلند ہوتے رہیں گے! میری دُعا ہے کہ آپ کو آئی سس کے جام سے شراب پینی نصیب ہو۔"

بادشاہ آگے بڑھا، اور ملکہ کو ایک صوفے پر بٹھا کر جواب میں کہنے لگا: "تمہارے الفاظ شہد کی طرح شیریں ہیں، میری دُعا ہے کہ تم اتنی سُبک خرام ہوجاؤ کہ چلنے میں تمہارا پیر زمین پر کبھی نہ لگے! میں اس وقت اس خواب آور خاموشی میں بیکار بیٹھا تھا، اور سامنے فرش پر نسل ہا نسل کی عورتوں کی متناسب چلنے کی آوازیں سُن رہا تھا جو تحیر زا برہنگی کے ساتھ آجا رہی تھیں۔"

ملکہ نے کہا: "زندگی کے لئے فرعون ہونا اور زرّیں گھنٹوں کو جلد جلد گزرتے ہوئے دیکھتے رہنا ہی کافی ہے۔ لیکن عجب اتفاق ہے کہ آپکی

دلچسپی کے لئے ایک نیا سامان پیدا ہوا ہے۔ میں آج دعوت کے وقت آپ کو ایک لڑکی پیش کرونگی جو ایک ایسے ملک سے لائی گئی ہے جو نغمہ سے معمور اور رقص کا مرکز ہے۔ اے درخشاں جواہرات پہننے والے، تجھی کو یہ کھلونا پیش کیا جائے گا!"

"ہوں! اس کا نام کیا ہے؟"

ملکہ نے جواب دیا "وشتی، جس کے معنی ہیں "شعلۂ تاباں" وہ آپ کو پنکھا جھلے گی، جام بھر دیگی، گائے گی، اور رقص بھی کریگی"

اُس کے شوہر نے افسردہ دلی سے جواب دیا "بہت خوب، میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اُس کا رقص دیکھنے سے کل رات کے وحشتناک خواب کا اثر رفع ہوجائیگا۔ تمہیں دیوتاؤں کے ساتھ چلنے کا رتبہ حاصل ہے، کیا تم بھی کبھی عقل کو منور کرنے والے خواب دیکھتے ہو؟"

ملکہ نے اختصار کے ساتھ زور دیتے ہوئے کہا "فرعون کی زندگی ہمیشہ وقفِ تغیر رہنی چاہیئے۔ وہ زندگی جس کا کوئی اُصول نہ ہو صرف ایک سایہ ہے۔ لیکن کل رات کا خواب تھا کیا؟ کیا کمیرا اپنی نیند ہی میں چل کر آیا تھا؟ فرعون، بتلائیے تو سہی، اور دیوتا بھی اُسے سُنتے جائیں گے"

بادشاہ کے جواب سے پہلے ہی وہ اسکی اہمیت اور خطرے کو سمجھ گئی، اور بے چین ہوکر جواب کے انتظار میں اُس کی طرف جھک گئی۔

بادشاہ نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا "ہاں، کمیرا ہی رات مجھے خواب میں دکھائی دیا تھا، اُس نے نہایت عمدہ پیشین گوئی کی تھی اور اُسنے اشارے ہی میں اتنی صفائی سے سمجھا دیا تھا جیسے انوبس پیمانہ، گز اور دوسرے آلات سے سمجھاتا ہے"

اکثر لوگوں کو خطرے کا احساس بھی عجیب اور نایاب فرحت بہم پہونچاتا ہے۔ جب ملکہ تھاسو جواب دینے لگی تو اُسکے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بے پرواہی سے اسکی مذمت کریگی۔

"اب آپ کے وہ عزلت گزینی کے ارادے کیا ہوئے؟ اب وہ خاموشی کہاں ہے جو اگر ہمت پیدا نہیں کرتی تو کم از کم اُس سے بادشاہوں کے دل میں بلندی تو ضرور آجاتی ہے؟ لیکن خیر، اُس خواب سے آپ کو کیا معلوم ہوا؟"

تُوتمس نے جواب دیا "اُس کے الفاظ کی صداقت کا امتحان تو ابھی ہوجائیگا۔ اگر آج ایک بات واقع ہو تو ایک ایسے شخص کا جُرم ظاہر ہوجائے جو تخت سے بہت نزدیک ہے"

متردد ہوئے بغیر ملکہ نے پوچھا "تو وہ شخص شاید میں ہونگی؟"

"آمون را ایسا نہ کرے" تُوتمس نے بات ٹالتے ہوئے جواب دیا۔ اور اپنے اس طنزیہ فقرے پر زیرِ لب مُسکرایا "وہ نشانی اگر عیاں ہوجائے تو ایک پوشیدہ سازش کا پتہ دے گی۔ جس طرح سایہ اپنی اصلی چیز کو ظاہر کرتا ہے"

اور زیادہ سوالات کو لاحاصل سمجھکر اُس نے یہ گفتگو چھوڑ دی۔ اور کہنے لگی "اگر کسی نے ایسی حرکت کی تو اُس کی جڑ اکھاڑ دینی چاہیئے"

بادشاہ نے طعنہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "یہ تو شاید ناممکن ہے" اُس کے لبوں پر ہنسی نمودار ہوئی، اور اُس نے چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

تھاسو نے اُس کی طرف نفرت کی نظر سے دیکھا "ناممکن!" وہ مردانہ تحکم کے ساتھ بولی "وہ شخص فرعون نہیں جو دوسروں کی آرزوؤں کو نہ توڑ سکے۔ اپنے پسندیدہ چیوپس کا قول یاد رکھئے کہ وہ غلام جس پر بہت زیادہ سختی کی جاتی ہے دونوں کانوں سے سُنتا ہے اور ایک لمبی زبان سے بولتا ہے"

تُوتمس نے جواب دیا "ہمیں جلد ہی معلوم ہوجائیگا۔ کاہن کہتے ہیں کہ جو شخص معالجہ کی قدرت رکھتا ہے وہ غلطی نہیں کرسکتا۔ میری خواہش ہے کہ تمہاری وشتی مجھے خوش کرسکے"

جب ملکہ چلنے لگی تو اُس نے سُنا کہ وہ مچھلی کی صورت کے دیوتا سوبیک (SOBEK) کا یہ گیت گا رہا تھا۔

"ہر روز ایک شخص ظلمت میں پہونچ جاتا ہے،
اور میں قائم رہتا ہوں، اس پر حیرت کرتا ہوں، اور ساکن ہوجاتا ہوں ــــ"

وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس سے پہلے فرعون نے اُنوآمون کو بُلا بھیجا تھا، اور اب وہ باہر دیوان خانے میں انتظار کر رہا تھا۔

بادشاہ دیوان خانے میں آیا، اور ایک کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوکر بہار کے دلکش مناظر دیکھنے لگا۔ اُسے جوانی کا عیش و نشاط یاد آیا جس نے اُس کے دل میں ہلکا سا درد پیدا کردیا۔ تیئیس برس کی عمر ہی میں وہ اپنے آپ کو عمر رسیدہ تصور کرنے لگا تھا۔ وہ اپنے ضعف کو محسوس کرتا تھا، اور اُس کے خاندانی غرور نے اُسے اِس سے نفرت کرنا سکھادیا تھا۔ اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مدتوں سے تھکا ہوا ہے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ صدیوں سے اُسے کسی لطیف قدرِ حیات سے واقفیت حاصل ہے گویا کسی نامعلوم وقت میں وہ ان حقائقِ زندگی پر غور کرچکا تھا، جن کے کاہن ابتک متلاشی تھے۔

اُنوآموں اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ فرعون تو زرخیز سرزمین اور حسین مناظر پر غور کر رہا تھا، لیکن اُنوآمون سمجھا کہ وہ ایک کامیاب شخص کی طرح اپنی شادمانی پر خوش ہو رہا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور اپنی موجودگی ظاہر کرنے کیلئے نہایت تعظیم سے آداب بجالایا۔

اُس نے ادب سے کہنا شروع کیا "جب آپ کی تگ و دوئے حیات، جواب شروع ہوئی ہے، ستاروں کے درمیان اپنی منزل پر پہونچ جائیگی تو آئی سس اور اوسی ریس اُس معطر زمین پر جس سے فرعون محبت کرتے تھے برکتوں کی بارش کرینگے"

تونمس نے لاپرواہی سے سر ہلایا اور مسند پر بیٹھکر کہنے لگا "میری حیثیت رات کو ایک فقیر سے زیادہ کیا ہوتی ہے؟"

نے نواز نے حیرت آمیز دلچسپی سے اُس کی طرف دیکھا۔ فرعون ہوتے ہوئے بھی تیئیس برس کی عُمر میں زندگی سے عاری ہونا بعید از قیاس تھا۔ اُس نے قریب آکر کہا "اے آقا، آج تو اپنے دل کے شیرازۂ مُنتشر کو جمع کیجئے"

بادشاہ نے سر پھیر کر دیکھا اور کہنے لگا "حیوپس کی کتاب میں لکھا ہے کہ 'کچھ زندگیاں گہرائیوں تک پہونچ جاتی ہیں، کچھ دور تک جاتی ہیں' اور کچھ صرف دھوپ ہی میں محوِ خواب رہتی ہیں، اے تحفہ کے مالک' بتا کہ تو میری زندگی کو ان میں سے کس قسم کی خیال کرتا ہے؟"

اُنوآمون نے سنجیدگی سے جواب دیا "میری تو یہ دُعا ہے کہ ملکہ کے ایک لڑکا پیدا ہو"

تونمس نے بےچینی سے اُسے روک دیا۔ اور کہا "کمیرا نے مجھے بتایا ہے کہ اُس لڑکے کی رگوں میں آمون را کا خون رواں ہوگا"

نے نواز نے اعتراض کے لہجے میں کہا "کمیرا تو اُسی دن سے دغابازی کر رہا ہے جس دن اُس نے دبے سی لسک کو دھوکا دیا اور جس دن اُس نے ملک کے سب سے پہلے بنی اسرائیلی سے سودا کیا"

فرعون نے پوچھا "وہ سب سے پہلا بنی اسرائیلی کون تھا؟"

اُنوآمون نے جواب دیا "اُس کا نام یوسف تھا، اُسی نے یہ "باغ فراموشی" اپے پا کے تاریک عہد میں بنایا تھا۔ یوسف اُس کی نظروں میں مقبول ہوگیا تھا کیونکہ وہ دوسرے لوگوں سے زیادہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ خواب میں یوسف نے کمیرا سے پوچھا "تو ایسے ننھے درختوں کی کیا قیمت لے گا جن کی بہار کبھی مبدل بہ خزاں نہ ہو" کمیرا نے جواب دیا "میں وہ سونے کے سکے لونگا جو بنی اسرائیل استعمال کرتے ہیں اور مصری اُن سے واقف بھی نہیں ہیں۔ میں ایسے خالص سونے کے سکے لونگا جن سے میں اپنے دل کی ہر خواہش پوری کر سکوں"

کمیرا کو یوسف کے دل کی بات معلوم ہوگئی کہ وہ سیسے کے ٹکڑوں پر ملمع کر کے اور اپے پا کی مُہر لگا کر دے دیگا۔ اس لئے اُس نے ننھے پودے لئے اور خوبصورت رنگوں میں رنگ کر "باغ فراموشی" میں لگا دئے۔ چند ہی دن بعد اُن کی خوشنمائی زائل ہوگئی۔ یوسف کو اس پر بہت غصہ آیا، اور کہنے لگا "اے بدبخت، کیا تو نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ ان کی دلفریبی ہمیشہ قائم رہے گی؟" کمیرا ہنسا اور بیکار سکوں کو اُس کی طرف پھینک دیا۔ تاہم کمیرا کے چُھونے سے درختوں پر ایسا جادو کا سا اثر ہوگیا تھا کہ آجتک درختوں کے سوکھے ہوئے ہونیکے باوجود وہ اکثر دلکش انداز سے چمکنے لگتے ہیں"

تونمس نے کہا "میں نے یہ قصہ سُنا ہے۔ جس کاہن نے مجھے یہ قصہ سُنایا تھا اُس نے کہا تھا کہ کمیرا کسی طرح بھی ایک بنی اسرائیل سے کم نہیں ہے"

اُنوآمون نے آگے کہنا شروع کیا "آج تک بنی اسرائیل سونے کے سکے بناتے ہیں، اور اُنہیں ایک چھوٹی سی ترازو میں تولتے ہیں۔ اسی قسم کی ایک ترازو جس پر عبرانی الفاظ کندہ ہیں میں آپ کو سالگرہ کے تحفے کے طور پر پیش کرنے لایا ہوں، اور جب میرے دل کا وزن کیا جائیگا تو اس میں آپکی طرف سے کوئی بُرا خیال نہ نکلے گا"

جس تحفے کی کمیرا نے پیشین گوئی کی تھی اُسے دیکھتے ہی فرعون کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ وہ کُود کر کھڑا ہوگیا، اور اُس نے وہ ترازو پیش کرنے والے کے چہرے پر کھینچ ماری ——،

ترازو کے زمین پر گرتے ہی نوجوان کا رنگ سُرخ ہوگیا اور پھر سفید۔ بلا غور کئے اور بلا خیالات کا سلسلہ ملائے وہ سمجھ گیا کہ فرعون کی آنکھوں میں خوفناک دھمکی موجود ہے۔ فرعون ساکت کھڑا زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے کانوں میں جانے والے مطربوں کی آواز آئی، اور ایک درد کے ساتھ اُسے حیوپس کا قول یاد آیا کہ آمون، اُن بادشاہوں اور بادشاہ بیگموں کے گھر آتا ہے جن سے وہ محبت کرتا ہے ——

(۳)

فرعون کی دعوت میں پچاس آدمی شریک تھے۔ چاروں طرف رقاصہ عورتیں، مُطرب اور بازیگر اپنے کمالات سے لوگوں کو محظوظ کر رہے تھے۔ کمرے میں کھانا چُننے والے اور پانی پلانے والے اِدھر اُدھر

پھر رہے تھے۔ دوپہر کی دُھوپ کمرے کی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ کونوں میں عوددان رکھے تھے جن میں خوشبوئیں جل رہی تھیں۔ فرش پر مصر کے ایشیائی اور افریقی دُشمنوں کی تصویریں منقوش تھیں۔ فرعون کھانا کھانے سے پہلے اُن تصویروں پر قدم رکھتا تھا اور اس طرح اپنے دل کو تسکین دیتا تھا۔ اس موقع پر غیر ملکوں کے سردار بھی تھے۔ اسوقت ایک دوسرے کی تعریفیں ہو رہی تھیں، اور اکثر مذاقیہ فقرے بھی ہو جاتے تھے۔ کمرے میں ہورس کا مجسّمہ نصب تھا۔

مُطرب خوش ادائی کے ساتھ اپنے رباب بجا رہے تھے۔ منوّر روشنی اور رُوح افزا خوشبو کے درمیان موسیقی فضا میں شعلہ باری کر رہی تھی، اور اُدھر جام پر جام چل رہا تھا۔

ثوتمس سیدھا مندر سے آرہا تھا جہاں اُس نے دیوتاؤں کی حمد و ثنا میں رقص کیا تھا۔ اُس نے مہمانوں کے سلام کے جواب میں اُن کی طرف ایک نظر ڈالی اور اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا۔ خادموں نے اُسکے سامنے کھانے اور شرابیں لاکر رکھ دیں۔ اُسکے گلے میں دوا لگا دی گئی تھی، مگر اُسے ابتک کھانسی پریشان کر رہی تھی۔

کھانا اُن برتنوں میں لگایا گیا تھا جو مصریوں نے بنی اسرائیل سے حاصل کئے تھے اور جن کے ضائع ہونے کا بنی اسرائیل کو ہمیشہ افسوس رہا، کھانے میں مختلف قسم کا گوشت اور ترکاریاں تھیں، ثوتمس کے قریب ملکہ بیٹھی تھی، لیکن وہ کھانے میں حصّہ نہیں لے رہی تھی۔ اُس کے سڈول بازو شانوں تک برہنہ تھے، اور اس کی سیاہ آنکھوں سے ناراضگی ٹپک رہی تھی جس نے بادشاہ کے دماغ کا سکون درہم برہم کر دیا تھا ــــــ

وشتی آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کا سڈول بدن ایک زردی مائل نیلے لباس میں ملبوس تھا جو نہایت باریک اور ملائم تھا۔ اُس کا چہرہ، اس کا آدھا کھلا ہوا کلدانی لباس، اُس کے بال صاف طور سے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کسی غیر مُلک کی ہے۔ اُس کے وہاں آتے ہی شراب کا دَور بند ہو گیا، اور لوگ اُس کے رقص کے انتظار میں خاموش بیٹھ گئے۔ اُس نے بے توجّہی سے لوگوں کی تعریفیں اور اس سے حسد رکھنے والی حبشی رقاصہ کا حقارت آمیز قہقہہ سُنا۔

فرعون کے ہاتھ کے اشارے پر اُنو آمون نے اپنی بانسری اُٹھائی اور نغمہ ریزی شروع کر دی۔ ثوتمس ہمیشہ اس کی نے نوازی میں اپنی اُس زندگی کا عکس پاتا تھا جس کی اُسے آرزو تھی، لیکن اس وقت وہ صرف دل کے درد و غم کا ذکر کر رہا تھا۔ گیت کا عنوان تھا۔

"نغمۂ برگہائے نواسنج" فرعون کی غیر متوقع سختی اور تھاسو کی وحشیانہ نفرت کے درمیان نے نواز محسوس کر رہا تھا کہ چکّی کے پتھروں میں کتنا تھوڑا فاصلہ ہوتا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ وہ وشتی کو آخری بار دیکھ رہا ہے اور اگلے دن تک وہ دوسری دُنیا میں ہوگا۔ تو یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی کہ وہ ایک خاص جذبہ کے ماتحت گا رہا تھا جس سے ثوتمس چونک پڑا، کیونکہ ـــ کیا یہ آمون را کی آواز نہیں تھی؟

وشتی فوراً اس انداز سے کھڑی ہو گئی گویا موسیقی نے اُس کے دل پر گہرا اثر کیا ہے۔ اُس نے فرعون کو نہایت تعظیم سے آداب بجا لانے کے بعد اپنا رقص شروع کر دیا۔ اُس کے نیلے لباس میں سے اُس کا زرد بدن ہاتھی دانت کی طرح چمک رہا تھا۔ اُس کے رقص میں لمح ثانی تیوہاروں کے رقص کی طرح تلمیحی اشارات تھے، وہ مصری مردوں اور عورتوں کے نشانات (نیلوفر اور کنول) کو اپنے اعضا کی مختلف حرکات سے ظاہر کر رہی تھی۔ اُس جگہ جو شادمانیِ حیات کا مرقع تھی اور جہاں صدیوں سے رقاصہ لڑکیاں ناچتی رہی تھیں، وہ نہایت سُبک پائی سے رقص کر رہی تھی۔ وہ بھی اِس وقت اپنی زندگی کے نازک لمحات سے گزر رہی تھی کیونکہ وہ فرعون کی طرف ایک کِھلونے کی طرح پھینک دی گئی تھی۔ جب اس کا رقص اور وہ موسیقی جس سے اُنو آمون کی دلی آرزو ٹپکتی تھی ختم ہو گئی تو ثوتمس کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ دونوں چیزیں ایک ایک ہچکی کے ساتھ مر گئیں۔

فرعون نے وشتی کی طرف تعریف کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "خُوب!"

ملکہ نے کہا "اُسے ایک مرتبہ اور رقص کرنے کا حکم دیجئے، لیکن اِس بار بغیر اس تکلیف دہ لباس کے"

"ٹھیک ہے" فرعون نے جواب دیا "لڑکی، اُس عبا کے بغیر اُن خوش آیند حرکات کو پھر دُہراؤ۔ اِسے اُتارو، شعلۂ تاباں، اور رقص کرو ـــ!"

اِس حکم کو سُنتے ہی وشتی کانپنے لگی، اُس کا مُنہ بند ہو گیا، دانت بجنے لگے، اور قدم لڑکھڑا گئے۔ اُس نے پریشانی سے لوگوں کے متحیّر چہروں کو دیکھا، اور آخر میں اُس کی آنکھیں اُنو آمون سے چار ہوئیں۔ وہ فرعون کی طرف مُڑی، اور نیچی آواز میں بولی "میں ایسا نہیں کرونگی"

سب پر خاموشی چھاگئی، بادشاہ کا تبسم غائب ہو گیا اور اُسکے لبوں پر سختی آگئی۔ تھاسو کو موقع مل گیا، اور اُس نے اُسے ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اُس نے فرعون کے کان میں کہا "اس کے انکار کی وجہ

یہ ہو کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہو؟"

نوٹس نے دریافت کیا "وہ کون ہے جس سے وشتی محبت کرتی ہے ــــ؟"

تھاسو نے انوآموں کی طرف اشارہ کرکے کہا "وہ، آپکا مقبولِ نظر۔ آج صبح میں نے اُسے اپنے سامنے سے چلے جانیکا حکم دیدیا تھا، اور اُس وقت سے یہ قابلِ نفرت شخص مجھے اب نظر آیا ہے"

بادشاہ نے انوآموں کی طرف دیکھا، اور اُسکے جسم میں نفرت آمیز حسد کی لہر دوڑ گئی۔ اُسے کمیرا کی تنبیہہ اور ترازو کے تختے کا مطلب یاد آیا تو اُس کے سفید چہرے پر شکنیں پڑ گئیں۔ اُس نے تیر اندازوں کے سردار کو بلایا اور سوچنے لگا کہ انوآموں کو قتل کر دینا چاہیئے۔

ملکہ نے اس کے کان میں کہا "کیا شیر یہ برداشت کر سکتا ہے کہ گیدڑ اس کا شکار لے جائے؟"

جب وہ دونوں مہمانوں کی طرف متوجہ ہوئے تو اُنہوں نے دیکھا کہ وشتی اور انوآموں غائب ہیں۔

انوآموں خطرے کو سمجھ گیا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ فرعون کے کمزور ہاتھ میں موت کی تلوار ہے، لیکن اُسے یہ بھی یاد تھا کہ وہ ہاتھ جو قتل کرنے کے لئے اُٹھتا ہے اکثر تھوڑی دیر کے لئے رُک بھی جاتا ہے۔ اگر اُنہیں چند گھنٹے کا وقفہ مل جائے تو وہ کمیرا کے جسد سے بھی باہر ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے اُسے چاہیئے کہ بادشاہ کے کمرے میں جائے اور اپنی بانسری توڑ کر وہاں پھینک دے جہاں سے فرعون تھوڑی دیر میں گزرے گا۔

وہ فوراً شاہی کمرے میں گیا جہاں وہ جانتا تھا کہ ایک شخص ہتھیار صاف کر رہا ہے۔ اُس وقت وہ شخص کھانا کھانے گیا ہوا تھا اور اپنے پالش وغیرہ وہاں ہی چھوڑ گیا تھا۔ ایک الماری میں دوسری دواؤں کے ساتھ وہ عرق بھی رکھا تھا جو فرعون کے حلق میں لگایا جاتا تھا۔ اُس نے وہ عرق پھینک کر اُس شیشی کو ہتھیار صاف کرنے کے ہلاکت خیز پالش سے بھر دیا۔ لیکن اُس نے اپنی بانسری نہیں توڑی کیونکہ اس سے لوگوں کو شبہ پیدا ہو جاتا۔

اس بات کو سوائے سُرخ کمیرا کے اور کسی نے نہیں دیکھا جسکی شکل ایک پردار چیتے کی سی تھی اور جو ایک طاق میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ابوالہول کی طرح ساکت رہتا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ زمانۂ مستقبل پر غور کرتا رہتا ہے۔ جسے صرف وہی سمجھتا تھا۔ وہ اس طرح رکھا گیا تھا کہ کھڑکی سے نکلتے ہوئے سورج کو دیکھ سکے۔ صدیوں سے وہ اسی طرح مصر کے خاموش میدانوں اور سورج کو دیکھتا رہا تھا۔ نئے نواز نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ کمیرا کی آنکھوں سے ایک شعلہ نکلا، لیکن اُس نے اپنا خیال دُور کر دیا۔ یہ سوچ کر کہ کمیرا ابھی بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے شخص سے ڈرتا ہے، وہ اپنے آپ کو محفوظ خیال کرنے لگا۔

وہ دل میں خوش ہوتا ہوا جا رہا تھا کہ محل سے باہر گلی میں اُسے وشتی ملی جو ایک لبادے میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت خوفزدہ تھی، اور رو رہی تھی، اُس کا رنگ سفید ہو گیا تھا، اور مکھیاں اُسے گھیرے ہوئے تھیں۔

وہ کہنے لگی "وہ مجھ سے اپنی مرضی کے خلاف کام نہیں کرا سکتا"

نئے نواز نے زہریلی مکھیوں کو اُس پر سے اُڑایا، اور کہنے لگا "آؤ میرے ساتھ چلو .... سمندر کی طرف ..... سمندر ہم سے باتیں کریگا"

اُس نے وشتی کے بالوں کو دُرست کیا، اور وہ مسکرانے لگی۔

"ہاں ضرور" اُس نے کہا "میں ہر شخص کی آواز سُن سکتی ہوں سوائے فرعون کے"

انوآموں نے جواب دیا "ہمیں جلد چلنا چاہیئے۔ ہماری سلامتی مختصر سے وقت پر منحصر ہے۔ ہر زمانے میں خاموش مگر رہنمائی کرنیوالے ساتھی ہوئے ہیں ــ شاید ہمیں بھی کوئی ایسا مل جائے"

انوآموں اُسے اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ اگر تیر اندازوں کو ذرا سی بھی دیر ہو جائے تو وہ دونوں دریا پر پہونچ جائیں گے، اور کسی کشتی میں روانہ ہو جائیں گے۔

وہ ذرا سی دیر میں تیار ہو گیا۔ اُس نے ایک کدو شراب کا، تھوڑا سا گوشت، اور ایک خونخوار تلوار ساتھ لے لی۔

اُس نے غور سے راستے کی طرف دیکھا، دریا صرف پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کے قریب وشتی تیار کھڑی تھی، اور دریا کے اس حصے کو دیکھ رہی تھی جہاں لڑکیاں روزانہ غسل کیا کرتی تھیں اور اس وجہ سے فرعون اُسے "دریائے نیل کا سینہ" کہا کرتا تھا۔

انوآموں کہنے لگا "آؤ ہم اِس زندگی سے دوسری زندگی میں چلیں"

اُس کے الفاظ غیب نما تھے۔ وشتی اور انوآموں کے گلی پر ملنے کے وقت ہی سے لوگ پوشیدہ طور سے اُن کے پیچھے لگے ہوئے تھے، اور اب وہ اپنے شکار پر جھپٹ پڑے۔ وشتی کے قلب کی حرکت

بند ہوگئی ــــ وہ خوفزدہ جانور کی طرح کودی، مگر خطرے کی طرف آدھے درجن تیراندازوں میں سے ایک کے سر پر اُنوآموں کی آبنوس کی چھڑی ٹوٹی۔ ایک دوسرے تیرانداز نے اپنے تیر سے اُنوآموں کا بازو زخمی کر دیا۔ اور اس کے بعد زور شور سے لڑائی شروع ہوگئی۔ تیراندازوں کے سردار نے اُنوآموں کا گلا پکڑ لیا، لیکن وشتی نے ایک چھوٹا سا خنجر جو اس کے بالوں میں لگا رہتا تھا تیرانداز کے گھونپ دیا جس سے اسکی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ لڑائی بھاری ڈنڈوں سے ہو رہی تھی، اور ساتھ ہی غل شور بھی ہو رہا تھا۔ ان دونوں نے حملہ آوروں سے اپنا پیچھا چھڑایا اور جھونپڑی میں داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا۔

اِس تکلیف کے باوجود اُنوآموں کا خیال تھا کہ فرعون نے رحم کھاکر یہ حکم دیا تھا کہ اُسے زدوکوب کیا جائے، قتل نہ کیا جائے، تاکہ اُس کا دل بادشاہ کی رحمدلی سے متاثر ہو۔ وشتی نے اُسے پانی پلایا، اور اس کا زخم باندھا۔ وہ کہنے لگا "معمولی سا زخم ہے۔ یہ تو فرعون کی ہلکی سی سزا ہے"

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اُنوآموں لیٹا ہوا دن کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی فیروزہ گوں پہاڑوں پر پڑ رہی ہوگی۔ اور اُسے اس خیال سے تکلیف پہونچ رہی تھی کہ وہ اب کبھی اُنہیں نہیں دیکھ سکے گا۔ اِس وقت تمام زمین اپنی قدیم یادگاروں کی طرح خاموش تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پہاڑ دلکش رنگوں سے چمک رہے ہونگے۔ وہ کاہنوں کی آوازیں سُن رہا تھا جو قربانی کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ مندروں سے بلند ہو رہی تھیں۔ اس خیال سے اُسے ہنسی آرہی تھی کہ مصری دماغ اُس کے دریچے سے گزرنے والی سورج کی شعاعوں کو، آمون را کی غائب ہونے والی انگلیاں سمجھتا ہوگا۔

۴

یہ رات اُن دونوں کیلئے بہت لمبی ثابت ہوئی۔ اُنوآموں بہت زخمی تھا اور وشتی خوفزدہ۔ زہریلی مکھیاں اس کے کان پر بھن بھنا رہی تھیں۔ صبح کے وقت اُنہوں نے کچھ باتیں کیں، اور ایک دوسرے کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ نوجوان نے وشتی کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا "ڈرو مت آج کل موسم سرما ہے۔ مگر میں دریچہ سے بہار کو آسمان سے آتے ہوئے دیکھ رہا ہوں"

یہ سُنکر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور وہ ایک لمحے کے لئے اُنوآموں کے زخمی بازوؤں میں آگئی۔ وہ کہنے لگی "اُن ستاروں سے جن میں میرے ملک والے نوشتۂ تقدیر پڑھتے ہیں، میرے حصے میں ایک ناگزیر مصیبت آئی ہے"

اُنوآموں نے جواب دیا "اگر ستارے معبود ازلی و ابدی کی مخلوق ہیں، جیسا کہ تمہارے نجومی کہتے ہیں، تو وہ ہمارے اُوپر رحم کیوں نہ کرینگے؟ لیکن بھوک سے میرا دم نکلا جاتا ہے۔ ہم کئی دن تک باہر نکلنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ مجھ سے ہلا تک نہیں جاتا۔ باورچی خانے میں جاؤ، اور تھوڑا سا کھانا لاؤ"

جب وہ واپس آئی تو اُنوآموں منقش پہاڑیوں کا خیال کر رہا تھا جہاں اُس نے ایک سال پہلے خزاں میں وشتی کو سب سے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اُس نے وشتی کو اپنے قریب بُلایا۔ وہ اُس کے آنسو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُس نے وشتی کے بھیگے ہوئے رخساروں کو ہاتھ سے صاف کیا، اور کہنے لگا "کیا تمہیں وہ دن اور وہ الفاظ یاد ہیں جو میں نے تمہارے کان میں کہے تھے؟"

لڑکی نے فوراً اس طرح جواب دیا جیسے کہ وہ بھی اُسی ملاقات کا خیال کر رہی تھی "ہاں میں سمجھ گئی تھی کہ تمہارے الفاظ "شارخ رقصان" کا مطلب مجھ ہی سے تھا۔ میری والدہ نے اسے سُن لیا تھا، اور وہ ہم دونوں پر خفا ہوئی تھیں"

اُنوآموں نے اُسے آغوش میں لیتے ہوئے کہا "غیر متوقع حادثات کی کارفرمائی بھی عجب ہے کہ اب ہم صرف دو مفرور ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تمہاری قسمت میری تقدیر کے ساتھ وابستہ ہوچکی ہے! اور یہ بات آج آخری دن ثابت ہوگئی!

صبح کے گھنٹے ایسی خاموشی سے گزر گئے کہ وہ تعجب کرتا تھا کہ وشتی نے نہ تو اُس سے گفتگو کی، اور نہ اُس کے قریب آئی۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا، وشتی اُسی جگہ لیٹی تھی جہاں وہ رات سوئی تھی۔ وہ کھانا نہیں لائی تھی، بلکہ سیدھی لیٹی تھی۔ اُس کی آنکھیں کُھلی تھیں اور بخار کی شدت سے چمک رہی تھیں۔ اُس کے ہونٹ برابر تھرتھرا رہے تھے۔ اُسکی انگلیاں بار بار اس چادر کو کھینچتی تھیں جسے وہ اوڑھے ہوتے تھی، اور مکھیوں نے اُسے گھیر رکھا تھا۔

اُنوآموں سرسامی حالت میں تھاسو کی پانچ سال کی محبت پر غور کر رہا تھا۔ وہ پھر اپنے آپ کو محبت کرنے والا سورج دیوتا سمجھنے لگا۔ اور اس پر تعجب کرنے لگا کہ تھاسو پہلے اُس سے اکتا گئی یا وہ تھاسو سے؟ وہ خوش ہوکر ہنسا اور کہنے لگا "میری زندگی بیکار نہیں گئی کیونکہ میں نے آمون را کے جوتے پہنے ہیں" لیکن وشتی کا زرد چہرہ اور اُسکے لبوں پر سُرخ کف دیکھکر اسکی خوشی ختم ہوگئی۔

"تم اُس کی طرف خوب دیکھ سکتے ہو"۔ ایک ایسی آواز نے کہا جسے اُس نے پہلے کبھی نہ سُنا تھا۔ "وہ ستاروں کا نغمہ سُن رہی ہے"۔

الوآمون نے سر اُٹھایا، اور ایک سایہ دیکھا جسے وہ سمجھ گیا کہ فرعون کا کمیرا ہے۔ اُس نے اس منقوش عفریت کو فرعون کے محل میں دیکھا تھا جہاں وہ بہت سے بادشاہوں کے زمانے میں رہ چکا تھا۔

جانور کہنے لگا: "میں اپنے آقا کے دل کی قسم کھاتا ہوں۔ کیا ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا کہ تمہارے مُسکرانے کے بعد ایک آنسو چمکنے لگتا ہے؟ دن ختم کے قریب ہے، اس لئے مجھے جانا چاہیئے۔ تجھ جیسے شخص کو اُس افضل محبت کا تحفہ فضول دیا گیا جس کی تلاش اُن دیوتاؤں کو بھی ہوتی ہے جو دُنیا میں انسان کی لڑکیوں سے محبّت کرنے آتے ہیں۔ ایک معمولی سازندے کو جس کی گردن میں ربوبیت کا طوق ہے، یہ عزّت دی گئی کہ وہ ملکہ کے لبوں کو چھُو سکے .... اور اب وہ جس کی خواہش فرعون کو بھی تھی تیرے قدموں پر جان دے رہی ہے۔" پھر اور قریب آکر بولا: "وہ شخص جس کا تخت تو نے غصب کر لیا ہے، اپنے آخری سانس میں بھی تجھے بد دعا دے رہا ہے"۔

الوآمون نے دیکھا کہ عفریت نے اپنے پر اُس کی طرف پھڑپھڑائے، اور وہ سمجھ گیا کہ تیر زہر آلود تھا، کمیرا کی آنکھیں غائب ہوگئیں، اور اُس کا سایہ رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔ الوآمون یہ تعجب کرتے ہوئے کہ وشتی ایسی خاموش لیٹی ہے، سو گیا۔

یکایک اُسے تھاسو کی آواز آئی، اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے آدمیوں کی بھی جو اُس کا دروازہ پیٹ رہے تھے۔ اپنے لازوال جذبے کا ملکہ پر ایسا اثر ہوا کہ اُسے اپنی اِس محبت کی خواہش پیدا ہوئی حالانکہ دوسری محبت اُسے چھوڑ رہی تھی۔ اُسے وہ محبت بھرے الفاظ اور وہ جوش و خروش یاد آرہا تھا۔ وہ پُکار کر کہہ رہی تھی: "اے میری زندگی کی خوشی، کیا مجھے اتنی دیر ہوگئی ہے کہ میں اب تجھے نہیں بچا سکتی۔ تیری جھونپڑی ہی وہ گھر ہے جسے میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ اے محبوب، گھنٹوں پہلے بھی میرا پُر درد دل تیرے ہی ساتھ تھا"۔

تھوڑی دیر بعد وہ الوآمون کے بستر کے قریب کھڑی تھی، اُس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور وہ اُن آنکھوں کی طرف تک رہی تھی جو اَب اُس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ اس نے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں ایسے پُر محبت الفاظ کہے کہ الوآمون کے دل میں ایک لمحے کے لئے دوبارہ جان آگئی۔

وہ کہنے لگی: "تو نہیں مریگا! اگر تو نفرت بھی کر سکتا ہے اور محبت بھی، تو زندگی پر تیرا بہت بڑا حق ہے۔ میرے دلدادہ، رات کا وقت ہے۔ آ میرے ساتھ چل، اور ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان کے نیچے پہلے کی طرح ٹہل۔ میں تجھے وہ بھرپور زندگی دوبارہ دیدونگی جسے تیری اس خادمہ نے تقریبًا برباد کر دیا تھا"۔

الوآمون نے سرسامی حالت میں کوشش کر کے وہ ہاتھ پکڑ لیا جس سے وہ محبت کرتا تھا، اور آخری مرتبہ اسے بوسہ دیا۔

. . . .

کمیرا کی طرف سے ملکہ کی نفرت روز بروز بڑھتی گئی کیونکہ اُس نے ملکہ کا راز طشت از بام کر دیا تھا، اور صرف وہی اب تک سر خم کئے بغیر اس کا مقابلہ کر رہا تھا، ملکہ یہ جانتی تھی کہ ایک عفریت اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس سکتا ہے، اس لئے وہ "باغ فراموشی" میں گئی جہاں کمیرا اکثر ٹہلا کرتا تھا، شام کے وقت کمیرا ملا، اور وہ کہنے لگی: "اے صدیوں کے دوست، تو نے بہت سے فراعنہ کی حفاظت کی ہے، میں تجھے مرنے سے پہلے کیا انعام دوں؟"

مصر میں ایک "حقیقت" رہتی تھی جو مردہ بے سی لسک کی رشتہ دار تھی اور جسے لوگ "فردائے مسرور" کہتے تھے۔ اُس کی محبت حاصل کر لینا کاہنوں کی ہنرمندی سے بھی باہر تھا جو چیوپس کے اقوال اور "مُردوں کی کتاب" کے عالم تھے۔ کمیرا نے جواب دیا "مجھے فردائے مسرور تک دسترس حاصل ہو جائے"۔

ملکہ کمیرا کو باغ میں اِدھر اُدھر پھراتی رہی، اور کمیرا کو خوبصورت ہاتھوں اور دلکش لبوں کی خواہش بڑھتی گئی۔ جب "فردائے مسرور" اُس کے قریب آئی اور وہ اُس کی طرف بڑھا تو ملکہ نے اُسے بہت خوفناک بد دعا دی۔ "فردائے مسرور" غائب ہوگئی، اور کمیرا کے ہاتھ خالی رہ گئے۔ ملکہ زور سے چلائی: "اے زور آور، آخر کار تو بلندی اقبال سے نیچے گر ہی پڑا، اور اب انسانوں کے درجے پر آگیا"! ان الفاظ نے گنہگار کے قلب کی حرکت بند کر دی۔

جب تھاسو کی زندگی پوری ہوگئی، اور وہ نزع کی تکلیف کا مقابلہ کر رہی تھی تو اُس کے آخری الفاظ خوشی کے تھے، لوگوں نے سُنا کہ وہ کہہ رہی تھی: "میں دیوتاؤں کی محبت کا مزا چکھ چکی ہوں، اور کمیرا کو بھی شکست دے چکی ہوں جس کی چالاکی کا احاطہ زمین سے بھی اُوپر پہنچتا تھا"۔

. . . .

عزا کے عجائب خانے میں تو تمس دوم کی مومیائی ایک شیشے کے صندوق میں کمیرا کے مجسمے کے قریب ہی رکھی ہوئی ہے، اس کا چہرہ

کالا پڑ گیا ہے اور اُس پر سفید دھبے ہیں جو کسی اور مومیائی پر نہیں پائے جاتے۔ یہ دھبے صدہا برس گزر جانے کی وجہ سے نہیں پڑے۔ بلکہ اُس کی موت کے بعد ہی پڑ گئے تھے۔ انسانیت کے اس ہولناک بقیہ حصے کو دیکھتے ہی وہ مہلک ہتھیاروں کا پالش یاد آجاتا ہے جو فرعون کے حلق میں لگا یا گیا تھا۔

قریب ہی گیلری میں سُرخ عقیق کا کمیرا رکھا ہے جو متعدد فراعنہ کے عہد میں زندہ رہا تھا، اُس کی شکل ایک بیٹھے ہوئے جوان چیتے سے مشابہ ہے اور اُس کے پَر مڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایک ستون کے اُوپر زنجیر سے بندھا ہوا ہے کیونکہ پہلے جب وہ بندھا ہوا نہیں تھا تو کئی بار عجائب خانے میں پُراسرار طریقے سے آگ لگ چکی تھی ــــ کبھی تو کوئی شمعدان اُلٹ جاتا تھا اور کبھی کسی آتشگیر مادے میں آگ لگ جاتی تھی۔ کیا اس کی تمام صفات ختم ہو چکیں، یا عجائب خانے کے منتظم کا خیال دُرست ہے کہ یہ خوفناک جانور اب بھی زندہ ہے، اور کبھی ختم نہ ہونے والے مسئلوں پر غور کرتا رہتا ہے؟

وہ ایسی جگہ رکھا ہے جہاں سے وہ شاداب میدانوں، چمکتے ہوئے دریا، اور مصر کے حسین سورج کو غروب ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے، شاید اُس کی نظر اُفق سے بھی آگے ان دنوں تک پہونچتی ہو جب اُس نے بے سی لیک کو قتل کیا تھا، یوسف کے دل کا حال معلوم کیا تھا، اور بادشاہوں کے رازوں پر قابض ہو گیا تھا۔

. . . .

وہ مرموز عبارتیں اور تصویریں جو تھاسو کے مندر پر منقوش ہیں، اس فہم کے واقعات بتاتی ہیں جو اُس نے پنٹ (Punt) کے ملک میں بھیجی تھی۔ یہ ملک موجودہ سوئیز سے ایک ہزار چھ سو میل کے فاصلے پر ہے، مندر کی دیواریں، کتبوں اور تھاسو کے مجسموں سے ڈھکی ہوئی ہیں جنہیں اُس کے جانشین نے بہت حد تک برباد کر دیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ قصہ ملکہ کی زندگی کا مجسمہ ہے ــــ اپنی دُھندلی اور بگڑی ہوئی شکل میں، بلکہ ایک بھولے ہوئے خواب کی طرح، یہ ایک ایسی ہستی کا چہرہ ہے جس نے نامعلوم شے میں درسِ محبت تلاش کرنے کی جرأت کی، اور خوف زدہ نہ ہوئی۔ اِس چہرے کے دلکش خطوں میں ایک نغمہ ہے ــــ اُس احساسِ موسیقی کی طرح جو ایک خاموش رباب کے گرد موجود رہتا ہے۔

کچھ زمانے بعد یونانی تھاسو کی طرح کی ہی زندگیوں سے فلسفے کے اُصول سیکھنے مصر آتے تھے۔ ہماری فطرت کے معمے ہر زمانے میں یکساں ہی رہتے ہیں۔ وہی باتیں جن پر قابو پانا دشوار ہوتا ہے، جذبات کا وہی پیچ و خم، وہی بہار اور وہی رنگ، وہی مکر و دغا، وہی غرور، اور وہی رنج، تمام چیزوں کی وہی ناداری اور لغویت ــــ

لکزر میں تُوتمس اول کے مندر کے پیچھے وہ کمرہ واقع ہے جہاں سنہ عیسوی سے پندرہ سو سال پہلے تھاسو کی ملاقات آمون را سے ہوئی تھی۔ آج ہم ایک دوغلی نسل کے شور و غل کے درمیان اُس فرش پر پھرتے ہیں جہاں تھاسو چلا کرتی تھی۔ اب بھی گرتے ہوئے ایوانوں پر بیٹھ کر ہُدہُد عتیقیت کی یادگاروں کے درمیان اپنا وجد آور نغمہ سنگ مرمر کے دیوتاؤں کو سُناتا ہے۔

عہدِ عتیق میں حسین عورتوں کے اپنے معبودوں کے ساتھ محبت کے واقعات اکثر پائے جاتے ہیں۔ ایک قابلِ ذکر واقعہ (فیلقوس مقدونوی) کی ماں کا ہے۔ ایک مرتبہ جب اس کا خاوند کسی جنگ پر گیا ہوا تھا تو زیوس اُس سے ملاقات کرنے آیا۔ جب سکندرِ اعظم مصر آیا تو کاہنوں نے اُس کے سامنے اپنے مذہب اور علوم کی وضاحت کی۔ اور جب اُنہوں نے آمون را کا ذکر کیا جو زیوس کا مصری نمونہ ہے تو فاتح فخر سے پکار اُٹھا ــــ "میرا دادا"

مترجمہ۔ محمد حسن عسکری

تم سے ــــــ!

("گرلس کالج کی لاری" کے نام ـــــ کسی "جاں نثار" سے انتہائی معذرت کے ساتھ)

چھپ کے آؤنگا میں بھیگی ہوئی برساتوں میں
گُدگُداؤنگا تمہیں سوتے ہوئے راتوں میں

اپنے نغموں کو میں آوارۂ منزل کرلوں
پھر سناؤنگا تمہیں قصۂ غم باتوں میں

جسقدر تم نے ستایا ہی ستاؤنگا تمہیں
چٹکیاں لونگا محبت کی حسیں راتوں میں

آپ کو یاد دلاؤنگا وہ جھوٹے وعدے!
یاد ہیں کون سے؟ وہ پہلی ملاقاتوں میں

"واہ! یہ کس نے کہا تھا ذرا کھانا تو قسم"
اب نہیں مانونگا تم لاکھ کہو باتوں میں

تم سے سَو بار کرالوں گا نہ توبہ جبتک
میں نہ آؤں گا ہمیشہ کی طرح باتوں میں

اپنی بیدار تمنا کو سُلالوں تو چلوں
دل کی کشتی میں تمہیں ساتھ بٹھالوں تو چلوں

راحت

حیوانِ ناطق

"روز نہلاؤ موئے کو۔" ثریا نے پیار سے ہاتھی کے پیٹ پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ "بڑے لاڈلے بچارے، اتراتی شکل، جیسے راجہ کے راج کنور یہی تو ہیں۔"

ہاتھی نے سونڈ اونچی کر کے پانی کا آخری تریڑا اپنی پیٹھ پر ڈالا اور ایک طوفانی جنبش کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ثریا بھی چھپ چھپ کرتی ندی سے باہر نکل آئی۔ ہاتھی نے دو چار جھرجھریاں لیں اور ثریا اپنا پلو نچوڑ ہی رہی تھی کہ سونڈ میں لپیٹ کر اٹھا لیا۔ ثریا ہوا میں جھولتی ہوئی ادھر پہونچ گئی۔ ہاتھی ٹھمکتا ہوا گھر کی طرف چلا۔

"آج تجھے گھر چل کے ماروں گی پیلو! تو بہت چل نکلا ہے۔ بالکل کہہ میں نہیں رہا۔ سارے کپڑے چوڑا کر دئے۔" ثریا پیلو کی گردن پر بیٹھی پلو نچوڑتی بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ پیلو نے سونڈ اٹھا کر اس کے پیروں سے لپیٹ دی۔ یہ لجاجت کا ایک طریقہ تھا۔

یہ ذکر، اب سے کم و بیش سوا سو برس پہلے چنبل ندی کے کنارے کا ہے۔ ثریا کا باپ ہمیر پور کے راجہ کا مہاوت پیلو پر مقرر تھا۔ ثریا روز اسے ندی پر نہلانے پانی پلانے کو لاتی تھی۔ ہاتھی بھی کچھ اس قدر اس سے مانوس تھا کہ اس کے سوا کسی کے ساتھ ندی پر نہ جاتا۔ گھر پر بھی وہی اس کا دانا پانی کرتی تھی۔ گنّے دیتی، روٹ کھلاتی، اور کچھ نہیں تو چھلیں ہی کرتی، مارتی کوٹتی، چمکارتی، پیار کرتی اور یونہی اٹکھیلیوں میں لگی رہتی۔ اس جانور نے بھی غضب کی سمجھ پائی ہے۔ اپنے مالک کے ذرا ذرا سے اشارے کو تاڑ لیتا ہے۔ پیلو بھی ثریا کے ایک ایک تیور کو پہچانتا تھا۔ روٹھ جاتی تو چاپلوسی کرتا۔ بہت بکتی جھکتی تو خود بگڑ بیٹھتا۔ حد تو یہ ہے کہ ثریا ماندی ہو جاتی تو پیلو بھی دانا پانی چھوڑ دیتا۔ غرض ہاتھی کیا تھا ساتھی تھا۔ یا ایک جیتا جاگتا بھاری بھرکم کھلونا۔ مہاوتوں کی اس چھوٹی سی بستی میں ثریا کا ہمجولی بچپن سے پیلو ہی رہا تھا، یا پھر ارجن اس کی بھابی کا چھوٹا بھائی جو ان اٹکھیلیوں میں اس کا شریک ہوتا تھا۔ یہ دونوں پیلو ہی کے گرد جھائیں مائیں، کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔

ثریا کو سب چنچل بتاتے تھے، کہتے کیا بکل لڑکی ہے دن بھر الانگیں مارتی پھرتی ہے۔ کبھی جو نچلی بیٹھ جائے۔ بعض اوقات تو ارجن بھی اس کی کان مروڑی سے تنگ آ جاتا اور پیلو بھی سونڈ میں بل دے کے بھینچ دیتا۔ مگر اب ان خوش وقتیوں میں خود بخود ایک فرق پیدا ہونے لگا تھا۔ ثریا کی چونچالی تو اب بھی ویسی ہی تھی، وہی طبیعت کی شوخی اور الھڑپن، مگر اب اس کی کھلکھلاہٹ اور اعضا کی جنبشوں میں وہ پھڑک اور چھپاکہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات، بات چیت کا انداز، اٹھ بیٹھ کا طریقہ طبیعت کی بےچینی کا پتہ تو اب بھی دیتے تھے، مگر اس کے اعضا اب ایک غیر محسوس دباؤ کے آگے مغلوب سے ہوتے جا رہے تھے۔ یہ سن شعور کی آمد آمد تھی۔

یہ کہنا کہ وہ بہت حسین تھی، ممکن ہے زیادہ صحیح نہ ہو۔ لیکن اگر فطرت کی معصومیت اور سادگی و بےتکلفی واقعی حسن کے امتیاز میں کوئی اہمیت رکھتے ہیں تو ثریا سے زیادہ کون حسین ہو سکتا تھا۔ وہ نظریں جو حسین چہروں میں رنگینی و رعنائی تلاش کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔ ثریا کو شاید خصوصیت کی نظر سے نہ دیکھتیں، لیکن اگر سنگ مرمر کی ایک شفاف سل یا کاغذ کا ایک ستھرا تختہ جاذب نظر ہو سکتا ہے تو ثریا بھی ضرور جاذبیت رکھتی تھی۔ مگر اس کے ماحول میں اس کے حسن کا جائزہ لینے والا ہی کون تھا۔ شائستگی اور تمدن کی دنیا سے دور چنبل کے ایک نامعلوم موڑ پر رہنے والے غریب لوگ کیا جانیں کہ حسن تو کیسے ناپا یا تولا جاتا ہے۔ اس کے بوڑھے ماں باپ کی نظروں میں اس سے زیادہ کون کھب سکتا تھا۔ مگر وہ اسے حسین سمجھ کر پیار نہیں کرتے تھے۔ بستی کے اور لوگ صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ اب جوان ہو گئی ہے۔ رہا ارجن، تو ثریا خوبصورت نہ بھی ہوتی تب بھی شاید اسے اتنی ہی اچھی معلوم ہوتی۔ ان دونوں کا تعلق ان اوپری ملحوظات سے زیادہ گہرا تھا۔ گھر کے دوارے میں، چنبل کے کنارے، پیلو کے گرد، بچپن کی باہمی چک پھیریوں نے اس میں سینکڑوں البیٹیں دے کر پکا کر دیا تھا۔ آپس کے اس اخلاص و پیار کی بنیاد بچپن کی معصومیت نے اپنے ہاتھ سے رکھی تھی، رنگ و روپ کو اس میں کیا دخل، یہ ایک ترکہ تھا جو طفلی نے شباب کے سپرد کیا۔

ثریا حسب معمول پیلو کے ساتھ ندی پر کھڑی اُس کی سونڈ تھپک رہی تھی کہ اچانک کسی نے پیچھے سے آکر آنکھیں میچ لیں۔ ثریا ان ہاتھوں کے لمس کو خوب پہچانتی تھی، فوراً بولی "ارجن!" پیلو نے دونوں کو سونڈ میں لے لیا۔ دونوں ہنسنے لگے۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بارہا پیلو نے ان دونوں کو اسی طرح کولی بھر کے اٹھایا ہے، مگر نہ جانے آج ثریا کو پیلو کی یہ حرکت کیوں نئی معلوم ہوئی۔ اُس کا کھلکھلاتا ہوا دہانہ ایک دم کچھ سکڑ گیا۔ اُس نے گردن موڑ کر ارجن کی طرف دیکھا۔

"اوہو! آج تو بڑا موج میں دکھائی دے رہا ہے"

"ہاں تو پھر۔ اور کیا بیٹھ کے روؤں" ارجن نے قہقہہ مار کر کہا۔

"اچھا۔ بہت کھلا پڑ رہا ہے۔ کیا بات؟"

"تجھے نہیں بتاؤں گا" ارجن نے کہا اور ندی میں ایک لمبی سی چھلانگ ماری۔

"لے میں بتا دوں" ثریا بولی "کالی نے بچہ دیا ہوگا" یہ ارجن کے باپ کی ہتھنی تھی۔

"چل نگلی" ارجن کمر کمر پانی میں سے بولا "تجھے کیا، تو اپنی اس منا، جامیں نے کہہ دیا تیری بات ٹھہر رہی ہے"

"چل مکرا۔ تیری ٹھہر رہی ہوگی" ثریا تڑاق سے بولی۔ ارجن ندی میں لمبے لمبے ہاتھ مارتا دور نکل گیا۔ پیلو نے سونڈ سے تلووں کو تھمارا دیا، ثریا اوپر پہونچ گئی اور گھر کی طرف چلی۔

ہر چند کہ کوئی نئی بات نہ ہوئی تھی مگر آج کی تمام ہستی ثریا کو کچھ انوکھی سی لگی۔ پھر چلتے چلتے ارجن نے ایک شگوفہ اور چھوڑ دیا تھا۔ ثریا کچھ سوچ میں پڑ گئی "ارجن آج کئی روز بعد ندی پر آیا تھا، جانے کل بھی آئے گا کہ نہیں۔ اس میں یہ بڑا روگ ہے۔ بات پوچھو تو ڈھنگ سے نہیں بتاتا۔ کیا سچ مچ میری بات لگ رہی ہے؟ پھر میں اپنے پتی کے گاؤں چلی جاؤں گی۔ اور جو چاچا بستی ہی میں کسی سے ٹھہرا دیں؟" پھر جانے کیا کیا خیال آیا۔ یونہی دل سے باتیں کرتی جا رہی تھی کہ یکایک چونکی۔ مڑ کر دیکھا۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز تھی۔ ثریا کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ یہ مرہٹوں کی لوٹ کھسوٹ کا زمانہ تھا۔ سیندھیا اور کمپنی کی فوجیں تمام ملک کو چھانتی پھرتی تھیں۔ جنبل کے اُس پار کئی بڑے معرکے بھی ثریا کے ہوش میں ہو چکے تھے۔ ندی کے اس طرف مہاراجہ سلطان سنگھ کی حد تھی، مگر اکثر سپاہیوں کے دستے ادھر بھی نکل آتے تھے۔ چنانچہ ثریا کا یہ اس تنہا تھا۔ پھر وہ ندی اور گھر دونوں سے دور وہاں بالکل اکیلی بھی تھی۔ سہم سی گئی۔ معاً خیال آیا، اس وقت ارجن ساتھ ہوتا، تب شاید وہ اتنا نہ ڈرتی۔ گھوڑے قریب آگئے۔ ثریا کا خوف ایک دم سے دور ہو گیا وہ اور پیلو دونوں آنے والے کو پہچان گئے۔ یہ تو اُس کے اپنے ان داتا شری یوراج بہادر تھے! ثریا کے منہ سے اچانک ایک قہقہہ نکل گیا اور پھرتی سے نیچے اتر پڑی۔ اُس نے بعد میں سوچا کہ اسے زیادہ تحمل سے کام لینا چاہیے تھا۔

راج کنور بلبیر سنگھ جی، راجہ سلطان سنگھ کے ولیعہد تھے۔ سلطان سنگھ جی بڑے نامی راجہ تھے۔ اور واقعی تھے بھی بڑے لائق اور نیک دل۔ رعیت کا جس قدر انہیں خیال تھا بہت کم راجاؤں کو ہوتا ہوگا۔ ان کا عہد ہمیر پور کی تاریخ میں ایک یادگار عہد تھا۔ وہ بلبیر کو بھی بچپن سے اپنے نقش قدم پر چلاتے تھے۔ اور بڑی سخت نگرانی میں رکھتے تھے۔ خصوصاً بڑھاپے میں ان کو بیٹے کی تادیب و تربیت کا خیال اور زیادہ رہنے لگا تھا کہ کیا خبر کب آنکھ بند ہو جائے ایسا نہ ہو کہ ہمیر پور راج کی روایات میں فرق آئے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اب بلبیر کو باپ کی یہ روک ٹوک کھٹکنے لگی تھی۔ اگر سلطان سنگھ سا باپ حاکم نہ ہوتا تو وہ اب تک اس قید و بندش کو بالائے طاق رکھ چکا ہوتا۔ تاڑنے والی نظر باپ کی سخت گیری کا ردِ عمل اُس کی آنکھوں کی ہر جنبش میں پہچان سکتی تھی۔

کچھ تو یوراج کی آنکھ خود بڑی متجسس تھی، کچھ ثریا کا بے اختیار قہقہہ اور والہانہ انداز جاذب نظر ہوئے۔ گھوڑے قدم تولتے ہوئے آرہے تھے۔ ٹھہر گئے۔

"یہ کس کا ہاتھی ہے؟" بلبیر سنگھ نے مہمل سا سوال کیا۔

"یہ مہاراج کا ہاتھی ہے مہاراج! یہ بڑے مہاراج کا ہاتھی ہے" ثریا نے اٹک اٹک کر سادگی سے جواب دیا۔

یوراج مسکرا دئے۔ انکے ساتھی نے بھی ہونٹ بنایا۔

"نہیں یہ ہاتھی آپ ہی کا ہے مہاراج" ثریا بڑی کوشش سے ذرا شائستگی پیدا کر رہی تھی۔

"اچھا!" یوراج نے کچھ اور لوانا چاہا "تو یہ یہاں کیسے آیا۔۔۔؟"

"مہاراج میں اسے ندی میں پانی پلانے لائی تھی" اب کے ثریا بغیر لکنت کئے بولی "میں اسے روز پانی پلانے لاتی ہوں، اور روز

نہلاتی ہوں، یہ میرے ہی ساتھ پانی پینے آتا ہے، چاچا کو چھوڑ کے اور کسی کے ساتھ نہیں آتا۔" یوراج کی شفقت آمیز مسکراہٹ سے حوصلہ پاکر ثریا کے لہجے کی روانی عود کر رہی تھی۔

سادگی کا جادو چلے بغیر نہیں رہتا۔ ہرچند کہ یوراج کے حکومت مآب دل کی دیواریں اس سے زیادہ مستحکم تھیں کہ کوئی لطیف جذبہ ان میں بار پا جاتا۔ اس دہاوت کی لڑکی کیلئے۔ مگر ثریا کے قہقہے نے ایسا تیر نہیں چھوڑا تھا کہ بالکل ہوا میں رہ جاتا۔ اس کی سادہ پرکار ادائیں بلبیر کے اندر ایک وقتی دلچسپی پیدا کرا دینے کو بہت کافی تھیں۔ اُس نے ایک دو ایسے ہی سوال اور کئے جن کا ثریا نے اُسی معصومانہ جرأت اور بے تکلفی سے جواب دیا، اور آگے بڑھ گیا۔ "یہ آدمی بھی کتنی آسانی سے خوش کئے جا سکتے ہیں۔" اُس نے اپنے دل میں کہا اور بلا ارادہ پیچھے مڑ کے دیکھا، ثریا بھی اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ایک دفعہ اور ہنس دی۔

اب کیا تھا۔ ثریا خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی۔ یوراج مہراج نے اُس کی بات پوچھ لی تھی۔ گھر جاکر باپ سے اس یادگار واقعہ کا ذکر کرنا لازمی تھا۔ راج رئیسوں کی چال ڈھال پر ارادتمندانہ نظر رکھنا اور اُن کی عادات و اطوار کے گُن گانا رعیت کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ رہا ہے۔

بلبیر سنگھ جی بھی اپنی پرجا میں بڑا نام رکھتے تھے۔ لوگ عقیدتمندی سے وہی روایتی جملے دُہراتے کہ "کیا ہیرا سپوت ہے، کیسا لاڈ والا اور ہنس مکھ۔ کیا بھلے گُن پائے ہیں۔" ثریا کا باپ تو خیر اُن کا نمکخوار ہی تھا ہنسکر بولا "ہاں بیٹی بڑے بھولے ہیں یوراج۔ بڑے سیدھے۔ ٹھیک سلطان سنگھ جی کا لڑکپن دکھائی دیتا ہے۔"

ثریا نے ارجن سے بھی اس اچنبھے کا ذکر کیا۔ اُسے یقین نہ آتا تھا۔ بولا "جھوٹی ہے۔ بھلا بلبیر سنگھ جی تجھ سے بات کریں گے۔ سپنے میں دیکھا ہوگا۔ پاگلی یہ بیٹھکر تو بھی اپنے آپ کو رانی سمجھنے لگی ہے۔"

مگر بالآخر ارجن کو ماننا ہی پڑا کہ ثریا سچ کہتی تھی۔ ہمیر پور سے یہ مقام کوئی دو ڈھائی میل پر تھا۔ یوراج ہر کھونٹ گھوڑے کی سواری کو جاتے رہتے تھے۔ اس طرف بھی اُن کا مکرر آنا ہوا۔ یہاں پہونچکر پچھلی بات کا خیال ناگزیر تھا۔ ان کے بافراغت دماغ میں اس کے لئے کافی گنجائش موجود تھی۔ ایک آدھ دفعہ وہ خود ندی کے قریب تک گئے۔ ثریا کا اُن سے پھر ملنا ہوا۔ پیلو کے ساتھ اس کی بے باک چہلیں بھی اُنھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھیں۔ رفتہ رفتہ ثریا کی البیلی طبیعت بھی اپنے رنگ پر آگئی۔ وہ جب کبھی اِدھر آتے اس تماشے سے محظوظ ہوکر جاتے۔ اس کی نیازمندانہ ادائیں اُنکے تخیل پر ایک جادو کرنے لگی تھیں۔

اس بات نے البتہ کوئی چرچا نہ پایا۔ اس میں ارجن کی ہوشیاری کو بڑا دخل تھا۔ وہ ثریا کی بات سچ ہوجانے پر ذرا جھینپا تو سہی، مگر بولا "دیکھ ثریا، یوراج کے آنے کی خبر چاچا کو نہ ہونے پائے۔" یہ بات کچھ ثریا کے دل کو نہ لگی، مگر ارجن نے اُسے بڑی بڑی قسمیں کھلا دیں۔ وہ ارجن کی بات کا بڑا مان کرتی تھی۔ اب اُس کا ندی پر ساتھ ہونا اور ہنسنا بولنا اُسے پہلے سے بھی زیادہ اچھا لگتا تھا۔ یوں تو خیر کب ارجن کی صحبت اُسے نہ بھاتی تھی مگر وہ بچپن کی بیخبری کا زمانہ تھا اب وہ اپنی کیفیات سے باخبر بھی رہنے لگی تھی۔ روز اسی اُمید میں دریا پر جاتی کہ ارجن آئے گا۔ اور کیا خبر یوراج بھی نکل آئیں۔ مگر ارجن دنوں ندی پر آتا۔ ثریا کو اس کے یہ غوطے بہت بُرے معلوم ہوتے تھے وہ جب کبھی آتا اپنے بشاش چہرہ اور سہانی باتوں سے اس کا دل کرجاتا۔

ایک دن ثریا ندی سے لوٹ رہی تھی، آج پھر یوراج کی سواری ادھر آئی تھی۔ اب صرف ارجن ہی رہ گیا تھا جس کو وہ یہ روئداد سُناتی تھی۔ اچانک ارجن سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ ثریا نے بے اختیار پکارا، مگر وہ منہ پھیرے نکلا چلا گیا۔ ثریا کو بڑا بُرا لگا۔ وہ بھی روٹھ کر کچھ بڑبڑاتی گھر چلی آئی۔ مگر ارجن کے اس بیگانہ پن پر اُسے بُرا وسواس پیدا ہوگیا تھا۔

گھر آکر عقدہ کھلا۔ ظالم جوانی نے ایک اور گل کھلایا تھا۔ آج ارجن کی ماں اور باپ گھر پر آئے تھے۔ ان دونوں کی بات پکی ہوگئی تھی۔ ارجن کچھ تو جھینپا تھا اور کچھ بن رہا تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ اب اُسے ارجن کے آگے گھونگٹ کاڑھنا پڑیگا اور ان کا میل جول ایک عرصے کے لئے ختم سمجھا جائیگا۔ یہ واقعہ ثریا کے عین مبارک سہی مگر نوری پابندی کا خیال اُسے آزردہ کر دینے کو کافی تھا۔ اور بھی کچھ دھیان دل میں صنفی تقاضے سے آئے ہونگے۔ وہ آج روئی۔

مگر ثریا جیسی چنچل لڑکی رسمی پابندیوں کو زیادہ سختی سے نہیں نبھا سکتی تھی۔ ارجن سے اُس کا تعلق صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کا منگیتر ہے۔ بہت سے تقاضے تھے جو رسم و ریت پر غالب آکر رہے۔ ندی کا کنارہ عین محفلہ کی جگہ تھی۔ ارجن اور ثریا اب بھی

چوری چھپے بات چیت کر لیا کرتے تھے۔ اب ان ملاقاتوں میں رومان زیادہ
نمایاں رہنے لگا تھا۔ ایک دن یہ دونوں منگیتر اسی طرح کھوئے ہوئے
سے بیٹھے تھے کہ اچانک یوراج ادھر سے گذرے۔ وہ آج تنہا تھے۔
سریا سے ایک آدھ بات کر کے جانا اُن کا معمول سا ہو گیا تھا۔ مگر وہ
سیدھے نکلے چلے گئے اور گھوڑا ڈپٹاتے ہوئے دور نکل گئے۔ ان
دونوں کو تاکے جانا اب منظور تھا اور نتا کا بھی تو یوراج نے! دونوں
کی طبیعتیں بدمزہ ہو گئیں۔ ارجن تو کچھ ہراس زدہ بھی ہو گیا۔

بلبیر کو اس لڑکی سے ذرا دلچسپی تو پیدا ہو گئی تھی۔ تقاضائے
بشری سے کون مجبور نہیں۔ اُسے ان دونوں کی یہ بے تکلف یکجائی
کچھ چبھ سی گئی۔ اُسے معاً خیال آیا کہ یہ نچ دیہاتی مجھ سے زیادہ آزاد ہے!
اُس کے حاکمانہ مزاج کو ٹھیس سی لگی۔ دوسرے دن وہ پھر ندی پر گیا۔
سریا ملی وہ کسی طرح یوراج کی مجرم نہ تھی مگر اُس کی آنکھیں زمین میں
گڑی جا رہی تھیں اور برابر کسمسا رہی تھی۔ بلبیر نے اس کی بے چینی کو
تاڑا اور دو چار ہی جملوں میں اُسے بحال کر لیا۔ وہ پھر کھل گئی۔ اُسے
یوراج شفقت و مہربانی کے دیوتا معلوم ہو رہے تھے۔ وہ خود نیاز مندی
کی پتلی بن گئی۔ یوراج ہنس رہے تھے اُنہوں نے اپنا یادگار جملہ دہرایا
"کیوں سریا یہ ہاتھی کس کا ہے؟"

"آپ ہی کا ہے مہاراج!" سریا ہنس دی۔

"اور تو کس کی ہے؟" یوراج نے دفعتاً پوچھا۔

"میں بھی آپ ہی کی ہوں" سریا سادگی سے کہکر رک گئی۔

"اچھا سریا یہ ہاتھی دوڑتا بھی ہے؟"

"ہاں مہاراج، موج میں آجائے تو بڑا فرّوٹ جاتا ہے۔ گھوڑے
سے بھی آگے۔"

یوراج کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ اُنہوں نے آزمانا چاہا۔
کچھ دور دونوں جانور جنبل کے کنارے کنارے دوڑے۔ سریا کے
دماغ کو مرعوبیت کے ہجوم میں اتنی مہلت کہاں تھی کہ محل و موقع کا
خیال کرتی۔ دونوں خاصی دور نکل گئے۔ جنبل اکثر جگہ اونچی نیچی چٹیل
پہاڑیوں کے بیچ میں سے بہتا ہوا گیا ہے جن کے سبب سے یہ علاقہ
خاصا وادی نما بن گیا ہے۔ ایسے مقامات پر عموماً شام اچانک آتی
ہے۔ سورج پہاڑی کے پیچھے گیا اور دن تمام ہوا۔ دیکھتے دیکھتے دھندلکا
چھا گیا۔ سریا چونک سی پڑی۔ ہاتھی رک گیا۔ یوراج نے بھی باگ کھینچ
لی۔ گو اُن کے نزدیک ابھی دوڑ فیصلہ طلب تھی۔ مگر سریا کو اُسے جاری
رکھنا منظور نہ ہوا۔

"تو اچھا اب تو گھوڑے پر آجا" یوراج نے بالآخر صلاح
دی، مگر بیکار۔

اُنہوں نے اپنا رُعب و اثر بروئے کار لانا چاہا۔ چند لمحوں
میں سارے رنگ بدل دیکھے۔ مگر سریا نے بے اختیارانہ ہاتھی کو
موڑ ہی لیا۔ "آئیے مہاراج اب ادھر دوڑینگے" اُس نے پکار کے کہا
اور ریلو اُسے لیکے سیدھا ہو لیا۔ بلبیر آزردہ سا ہو گیا۔ سریا گھر چلی
گئی۔ وہ بھی ہمیر گڑھ کو روانہ ہوا۔ مگر چلتے چلتے کسی نے سامنے آکر
ہانپتے ہوئے کہا "مہاراج باپ دادا کی لاج کو نہ بھولئے۔ ہماری نسلوں
میں بھی راجپوتی لہو ہے!"

یہ ارجن تھا۔ اُس کا سانس پھول رہا تھا۔ اُس نے اس دوڑ
کا تماشا خود دوڑ دوڑ کر دیکھا تھا۔ اس کی منگیتر بغیر اُس کے ملک الموت
کے ساتھ بھی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ سائے کی طرح ندی میں تیرتا ہوا
گیا۔ محبت کی آنکھیں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ اس نے پہلے ہی دن وہ
سب کچھ تاڑ لیا تھا جسے سریا آج بھی نہ سمجھ سکی۔

بلبیر کے دل پر بجلی سی گری۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا
آگیا۔ اُس کی راج رگ پھڑکنے لگی۔ اُس نے ارجن کی طرف گھُور
کے دیکھا، مگر کچھ بول نہ سکا۔ گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور ہوا ہو گیا۔
مگر وہ سچ مچ مجبور تھا۔ اُس کی یہ برہمی قہر درویش سے زیادہ نہ
تھی۔ یہ کسی اور کا نہیں سلطان سنگھ کا راج تھا۔ اور پھر سریا سے
اس کا بے جوڑ اختلاط چاہے اب تک کتنا ہی چھپا ڈھنکا رہا ہو بات
بڑھ جانے پر ہمیر پور کے راجا کو گوارا ہو سکتا تھا نہ پرجا کو۔ یہ راجپوت
نگری تھی۔ یہاں کی ریت اب تک کچھ اور ہی رہی تھی۔ یہاں بہو بیٹیاں
گھر سے باہر بھی سدا گھر کے آنگن کی طرح پھرتی تھیں۔ مگر بلبیر بھی
راج کنور تھا۔ سیاست اُس کے رگ و ریشے میں تھی۔ ذرا سی دیر
میں کتنے ہی نقشے اس کے دماغ میں آکر مٹ گئے۔ اور تھوڑی
ہی دیر بعد اس نے ایک کھسیانے مگر مغرور شاطر کی طرح اس بساط
کو لاپرواہی سے اُلٹ دیا۔ ہمیر گڑھ پہونچتے پہونچتے اس کی کیفیات
بالکل درست ہو چکی تھیں۔

دوسرے دن اُس کا ندی پر نہ جانا صریح شکست تھی۔ جسے
اُس کی خودداری کبھی قبول نہ کرتی۔ وہ پھر آیا۔ پھر سریا سے ملا۔ اُسکے
چہرے پر تردد کے مطلق آثار نہ تھے۔ وہی تمکنت اور بشاشت
موجود تھی۔ سریا اُس کی نظر میں کوئی بڑی چیز تو خیر کبھی بھی نہ تھی۔
مگر اب وہ سچ مچ ایک چوگان کی گیند بن کر رہ گئی تھی۔ آج بلبیر کی

نظریں اُس پر زیادہ جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے اُسی تمکنت آمیز مُسکراہٹ سے پوچھا "یہ کیوں سَریا! کل کی دوڑ میں کون جیتا تھا؟"

"جیتا تو پیلو ہی تھا مہاراج!"

"پیلو جیتا تو جیسے تو ہی جیتی — ہے نا؟" یوراج نے جھوٹ نہیں کہا۔

"ہاں مہاراج۔ مگر پیلو ہے تو آپ ہی کا"

"اچھا ہم تجھے کل کی دوڑ کا انعام دیں گے" یوراج نے کہا اور ایک ہلکی پھلکی سی انگوٹھی اس کی خوش وضع مگر ناسزاوار انگلی میں پہنادی۔

یہ ٹھیٹ راجایانہ چال کا ایک مخصوص مہرہ تھا جو سَریا کی طرف بڑھا۔ ظاہر ہے یہ زیور سَریا کی اُنگلیوں کے لئے اتنا ہی غیر متناسب تھا، جتنا کہ اُس کی کلائی کے لئے راجکمار کا پنجہ جو اُسے گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ مگر سَریا کو سوائے قبول کرنے کے کیا چارہ ہو سکتا تھا۔ وہ محض لجا کر رہ گئی۔

آج راجکمار کم ہی ٹھہرے۔ اُنہوں نے سَریا کو دوبارہ دوڑنے کی دعوت تو دی مگر اُسے اپنی چھوٹی سی سرکار سے حکم مل چکا تھا کہ وہ اب زیادہ راجکمار کے ساتھ نہ لگی رہا کرے گی۔ راجکمار کے معاملے میں کیوں ارجن ایسی اوندھی اوندھی صلاح دیتا تھا، یہ سَریا کی سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ اُس نے کل کی دلچسپ دوڑ کا حال اُسے ہنس ہنس کر سُنایا مگر اُس نے کچھ دھیان سے نہیں سُنا۔ انگوٹھی بھی سب سے پہلے اُسی کو دکھائی۔ مگر اُس نے اُلٹا مُنہ بنالیا۔ بولا تو یہ بولا "چھپا کر رکھیو! چاچا کو مت دکھائیو!" سَریا کھسیانی سی ہوگئی۔

مگر آج بے اختیار ارجن کے بازو اُس کی کمر تک آ گئے۔ سَریا کی آزردگی کافور ہوگئی۔ وہ اس کی بات کیوں نہ مانتی، اسکا دھرم پتی تو وہی ہونے والا تھا۔

"تو میں اسے سینت کے کہاں رکھوں گی؟ کیا پیٹ میں کھ لوں؟" سَریا نے ہنس کر کہا۔

"چل پگلی کلیجہ کٹ جائیگا" ارجن اُسے سینے سے لگاتے ہنستے بولا۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ دونوں ایک لمحہ کیلئے کھوئے سے گئے۔ پھر اپنے اپنے گھر کو چل دئے۔ آج سَریا کی نظروں میں سوائے ارجن کے کچھ نہ تھا۔ سینکڑوں ہیرے کی انگوٹھیاں اسکے سر سے نچھاور تھیں — محبت پر سیاست کی یورش محض حقیر ثابت ہو چکی تھی۔

اس بات کو خاصے دن گذر گئے۔ سَریا کا اس عرصے میں بلبیر سے ملنا نہیں ہوا۔ وہ اب ندی پر اُوپر نہیں ہونے دیتی تھی۔ پیلو کو بھی منا منا کر جلدی ہی لے آتی۔ یہ سب ارجن کی ہدایتیں تھیں، مگر ایک واقعہ ایسا ہوا کہ خود یوراج کو بستی تک آنا پڑا! یہ زمانہ امن وامان کا نہیں تھا۔ مرہٹوں کی "چوتھی لڑائی" چھڑی ہوئی تھی۔ دکن تک میدانِ کارزار گرم تھا۔ تمام وسط ہند پر مہاراجہ سیندھیا کا دور دورہ تھا۔ ہمیر پور کو بھی زیر اثر رجواڑے کی حیثیت سے گوالیار کا شریک کار ہونا لازمی تھا۔ رنگروٹ بھرتی ہو رہے تھے۔ فوج کی آدھی کمان یوراج کے سپرد ہوئی تھی۔ فوجی بھرتی کی چھان بین اور دستہ بندی اُنہیں ذاتی نگرانی میں کرنے کا حکم تھا۔ اس بستی میں بھی قدیم ملازمین کے علاوہ جو گنے چُنے آدمی تھے، یوراج کے سامنے پیش ہوئے اور سب دھر لئے گئے۔ سَریا کی زندگی میں اس سے زیادہ پریشانی کا موقع کبھی نہ آیا تھا۔ اس کا بھیّا اور چاچا دونوں سدھار رہے تھے۔ پیلو کو تو اُن کے ساتھ جانا ہی تھا۔ ارجن کے متعلق اُسے اطمینان تھا کہ وہ رہ جائے گا۔ بیماروں کو چھوڑ دینے کا حکم تھا اور ارجن دس بارہ دن سے سخت بخار میں پڑا ہوا تھا۔ کوئی شخص بھی اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بتا دیتا۔ مگر افسوس اُس کے باپ کی منت وزاری محض ڈھونگ اور اسکی بیماری محض مکر قرار پائی۔ غرض ارجن بھی بخار میں لھلاتا ہوا سدھارا۔ حکم حاکم مرگ مفاجات!

سَریا کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ اس کا اندازہ ہر شخص کیلئے آسان نہیں۔ اس کے دل کی ایک ایک کل چھن گئی تھی۔ اس کا بوڑھا باپ، اس کا جوان بھائی، اُس کا پیار منگیتر اور اس کا چہیتا پیلو سب ایک نامعلوم مدت کیلئے اُس سے رُخصت ہوگئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُسے ایسی سخت جُدائی کا مُنہ دیکھنا پڑا! بستی ان لوگوں کے کوچ کرجانے کے بعد سے اور اُجاڑ ہوگئی تھی۔ سَریا کا چنبل جانا بھی موقوف ہوا۔ اُس کے لئے کسی کام میں کوئی مزا باقی نہیں رہا تھا کامل دو مہینے اُس پر سُکھ کی نیند حرام رہی۔ بارے رفتہ رفتہ کچھ اطمینان کے آثار پیدا ہوئے اور یہ دُکھوں دُور ہوتی دکھائی دی۔ بوڑھے بالے ہمیر پور سے خبریں سُن سُن کر آتے تھے کہ مہاراج کی سیندھیا سے اَن بن ہوگئی ہے۔ وہ لڑنے سے پھر گئے ہیں۔ اب لشکر واپس آجائے گا۔ کھلا بھی یہی۔ راجہ سلطان سنگھ انگریزوں کی حمایت میں آگئے تھے۔ لڑائی چھڑ کر رہ گئی۔ فوراً ہی امان کا حکم پہنچ گیا تھا۔ گاؤں گاؤں بے چینی سے لشکر کی واپسی کا انتظار شروع

ہوا۔ ایک ایک کر کے دستے برخاست کئے جا رہے تھے۔ یہی کمپنی بہادر کی رضا تھی۔ ثریا نے ایک مہینہ اور بے چینی میں گذارا اس کے بعد اس کے گھر میں پھر سے اجالا ہو گیا۔ اس کا باپ اور بھائی صحیح سلامت واپس آ گئے تھے۔ ارجن کا حال انہیں تو کچھ معلوم نہ تھا مگر گاؤں کے ایک اور رنگروٹ نے بتایا کہ وہ اس کو دیکھ کے آیا تھا۔ اس کا بخار دو چار ہی دن میں باقاعدہ فوجی معالجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بالکل تندرست معلوم ہوتا تھا۔

اب ثریا کے بدن کی ایک سوئی اور باقی رہ گئی تھی۔ ابھی اسے کل نہیں پڑی تھی۔ اس نے ارجن کے انتظار میں گھڑیاں اور پل گننے شروع کئے۔ دو کٹھن ہفتے اور بیت گئے۔ ثریا کی بیکلی ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی۔ اسے ایک ایک دن بھاری معلوم ہو رہا تھا۔

"وہ تو آج بھی نہیں آئے ببلو!" وہ رونکھی سی ہو کر کہہ رہی تھی۔ "ابو ساکھو چاچا کے گھر کے لوگ بھی آ گئے۔ آج تو بھی گڑھ کو جائیگا۔ صاحب لوگ آ رہے ہیں نا؟ دیکھ ابکے ارجن کو ساتھ لوا کے لائیو! نہیں تو مجھے شکل مت دکھانا!"

کئی روز سے لوگ ہمیر پور گئے ہوئے تھے۔ وہاں جلوس اور دربار کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ رستے سجائے جا رہے تھے۔ بڑی گھما گھمی تھی۔ فرنگی افسروں کی آمد آمد کا موقع تھا۔ یوراج انہیں کی سر براہی کیلئے ٹھہر گئے تھے۔ تمام ہمیر پور چشم براہ تھا۔ خدا خدا کر کے ورود کا دن بھی آ ہی پہونچا۔ تمام نگر خوشی سے گونج اٹھا۔ ان کے ساتھ فوج کے باقیماندہ دستے بھی پہونچنے والے تھے۔ بہت سے بچھڑے ہوئے دیس کو واپس لوٹے۔ ارجن کے باپ نے اسے ناحق ان میں تلاش کیا۔ اس کا نام لڑائی میں کام آنے والوں کی مختصر فہرست میں درج تھا! مگر وہ خود یوراج کی راج ہٹ پر بھینٹ چڑھ چکا تھا! ابتو یوراج کو اس کا نام ونشان بھی کہاں یاد رہا ہوگا۔ ایک تنکا تھا کہ شعلے سے بھڑا اور فنا ہو گیا۔

ثریا چنبل کے کنارے بیٹھی اپنے کرموں کو رو رہی تھی۔ بچپن سے ابتک کی سینکڑوں باتیں اس کی نظروں میں پھر گئیں۔ ارجن کا ایک ایک بول اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ "جا میں نے کہدیا تیری بات لگ رہی ہے!۔ ہاتھی پہ بیٹھ کے اپنے آپ کو راجکماری سمجھنے لگی ہے!۔ دیکھ ثریا چاچا سے مت کہیو!۔ چل پگلی کلیجہ کٹ جائیگا۔" ثریا چونک سی پڑی اس کے کلیجے میں درد تھا۔ وہ اسے کاٹ کے پھینکدینا چاہتی تھی۔

آج ببلو ہمیر پور سے زنجیر تڑا کے بھاگا تھا۔ وہ چار دن سے پیاسا تھا۔ اسے ثریا کی تلاش تھی۔ سیدھا ندی پر پہونچا۔ ثریا اب اس جہان میں نہیں تھی۔ یوراج کا عطیہ نیگ لگ چکا تھا۔ اس کی لاش ندی کے کنارے پڑی حیوانِ ناطق کے ستم کی حیوانِ مطلق سے داد طلب کر رہی تھی۔

ببلو نے اسے سر پر اٹھالیا ——— اور سیدھا دریا میں اتر گیا۔

م۔ ش۔ حقی دہلوی۔ بی۔ اے۔ (علیگ)

منظومات

یاسمیں

یاسمیں کی یاد میں اے دوست رونے دے مجھے!
آنسوؤں میں عمر کی کشتی ڈبونے دے مجھے!

قافلہ بزمِ ثریا کا تھکن سے چُور ہے
چشمِ ماہِ موسمِ گُل نیند سے مخمور ہے
نیند آنکھوں سے مری ابتک مگر کافور ہے
یاسمیں کا گھر ہزاروں میل یاں سے دُور ہے

یاسمیں کی یاد میں اے دوست رونے دے مجھے!
آنسوؤں میں عمر کی کشتی ڈبونے دے مجھے!

جھانکتی ہے یاسمیں آکر ستاروں سے مجھے
تاکتی ہے، چھُپ کے، پھولوں کی قطاروں سے مجھے
ڈھونڈتی ہے ہو کے بےکل کوہساروں سے مجھے
پوچھتی ہے آہ جا جا کر بہاروں سے مجھے

یاسمیں کی یاد میں اے دوست رونے دے مجھے!
آنسوؤں میں عمر کی کشتی ڈبونے دے مجھے!

عُمر بھر مجھکو رہے گا یاسمیں کا انتظار
حشر تک یہ دُکھ بھری آنکھیں رہیں گی اشکبار
اب نہ آئے گی مرے لب پر تبسم کی بہار
سو بھی خوابِ مرگ اے دل اُلٹ چکا تیرا اقرار

یاسمیں کی یاد میں اے دوست رونے دے مجھے!
آنسوؤں میں عمر کی کشتی ڈبونے دے مجھے!

اے خُدا کیا یاسمیں کو میں بھی اب تک یاد ہوں
میں جو اس کی یاد میں اک عمر سے ناشاد ہوں
آہ قیسِ عامری ہوں نامۂ فرہاد ہوں
جو لبِ نَے پر ہو لرزاں آہ وہ فریاد ہوں

یاسمیں کی یاد میں اے دوست رونے دے مجھے
آنسوؤں میں عمر کی کشتی ڈبونے دے مجھے

آخرِ کار ایک دن خاموش ہو جاؤں گا میں
اس کے سپنوں کے حسیں سایوں میں سو جاؤنگا میں
اک نہ اِک دن عشق کی وادی میں کھو جاؤنگا میں
آنسوؤں میں عمر کی کشتی ڈبو جاؤنگا میں

یاسمیں کی یاد میں اے دوست رونے دے مجھے
آنسوؤں میں عمر کی کشتی ڈبونے دے مجھے!

مہدی علیخاں

علمبردارانِ انسانیت سے تین سوال

قانون؟

چند ژولیدہ دماغوں کے تدبّر کا نکھار
چند اربابِ حکومت کی عنانِ اختیار

دشمنِ انصاف، برقِ عدل، شمشیرِ سکوں
مکر کا ساغر، شرابِ زور، مینائے فسوں

بربریت کا مرقع، چیرہ دستی کی کتاب
کاوشِ اعمال کی زنجیر، طوقِ احتساب

خوشنما سانچوں میں پیالے زہر کے ڈھالے ہوئے
چند مارِ آستیں اور دودھ سے پالے ہوئے

لعبتِ تہذیب کا عشوہ، تمدّن کی پھبن،
دل کی دھڑکن، ذہن و لب کی خامشی، مُہرِ دہن

حیدری صورت سے ظاہر کارو بارِ عنتری
جُرم زاروں میں عوض کی پُر غرض سوداگری

جذبۂ ایمان و آزادی کا اک پھیکا اُبال — حریت کے ولولوں کو روکنے والا خیال
ایک فرعونی تموّل، ایک شدّادی غرور — ذہنیت سرمایہ داری اور فطرت مکر و زور
آبروئے شہریاری، اک کلیدِ انتظام — اک ترازو جس کے ہر پلڑے میں تیغ انتقام
پردۂ انصاف میں جبر و تشدد کا امیں — ساز جمہوری ہے لیکن راگ جمہوری نہیں

جس کی گردن پر ہزاروں بیکسوں کا خون ہو
ہوشمندو! پوچھتا ہوں کیا یہی قانون ہے؟

جُرم؟

لب کشائی کی اجازت ہے نہ ہے فریاد کی — گھُٹ کے مرجاؤں یہ مرضی ہو مرے صیاد کی
بزم ہستی کا ہر اک رنگیں فسانا جُرم ہے — کھلکھلانا اور ہنسنا، مُسکرانا جُرم ہے
جُرم ہے اک سعیِ جائز، جُرم ہے شوقِ عمل — جُرم ہے سرمایۂ افکار میں ردّ و بدل
ایک حرفِ راستبازی، ایک سنجیدہ نگاہ — عفو کے قابل نہیں یعنی کبیرہ ہے گناہ
اپنی مجبوری سے اک مجبور حسرت کوش ہے — دیکھتی ہے آنکھ یہ منظر، مگر خاموش ہے
جُرم ہے ہرچند پاکیزہ رہے دامِ نظر — پھر بھی کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتا ہے خطر
اب کہاں موجِ صبا کو خواہشِ آوارگی — حکمرانی اختیار اور بندگی بیچارگی

مُہرِ خاموشی لبوں پر ہے، نظر حیران ہے
آرزوئیں زخم خوردہ، زندگی ویران ہے

سزا؟

آہنی طوق و سلاسل کے وہ انبارِ گراں — سرد شعلے، آتشِ خاموش، ٹھنڈی بجلیاں
ذلتوں کا تازیانہ، بے بسی کی پاسدار — رہزنِ انسانیت، دامِ خرد، ننگِ وقار
جُرم کا بدلہ، تمنائے حقیقت کا صلہ — ناتوانی کے لبوں پر عدل کا مضطر گلہ
رُونما ہوتا ہے مردانہ عزائم میں زوال — تیغِ ہمت کُند ہو جاتی ہے، شہزوری نڈھال
موت، جرمانہ، مشقت، قید، دردِ لاعلاج — جا بجا بڑھتا ہوا رشوت ستانی کا رواج
خودستائی، زعمِ ثروت، شانِ اربابِ قضا — کیوں نہ پھر لہرائے جھنڈا جا بجا انصاف کا
یہ رعونت کوش پیکر، سیم و زر کے لاڈلے — کھیلتے ہیں ناتوانوں کے دلی جذبات سے

ایسا قانون اور ایسا جُرم اور ایسی سزا — ہے خلافِ فطرت انسان و آئینِ خدا
کاش پاداشِ عمل فطرت پہ ہوتی منحصر — کاش اس انسان کو انسان سے ہوتی مفر
کاش تعمیرِ رواداری میں رہتے صبح و شام — کاش آئینِ محبت سے ٹپکتا انتظام
آنکھ ان سفاکیوں کی تاب لاسکتی نہیں — اس قدر بارِ گراں فطرت اٹھا سکتی نہیں

ایک دن دورِ جہاں میں وقت ایسا آئے گا
دفترِ خود ساختہ بیکار سمجھا جائے گا

سید فیضی جالندھری

چھیڑ چھاڑ

روؤں گا نہ تڑپوں گا نہ مَیں آہیں بھرونگا
سچ کہتا ہوں اب تجھ سے محبت نہ کرونگا

جب کہتی ہے تو "تیری محبت ہے فسانہ!" — بے سُود ہے اشکوں کے ستاروں کو گنوانا
تُو سُن نہیں سکتی میری افسُردہ کہانی — تو خوش ہے کہ اُجڑ جائے اگر میری جوانی
تُو دیکھ رہی ہے کہ مری رُوح ہے ناشاد — ہستی مری آزردہ ہے بستی مری برباد
تُو دیکھ رہی ہے کہ مَیں آلام کا مارا — بیٹھا ہوں ترے در پہ لئے تیرا سہارا
احباب سے ناخوش ہوں عزیزوں سے خفا ہوں — چُپ چاپ مگر تیرے ہی قدموں میں پڑا ہوں
روتا ہوں کہ رونا ہی محبت کی غذا ہے — تو کیوں مرے دن رات کے رونے سے خفا ہے؟
کرسکتی ہے جب تُو مرے رونے کا مداوا — پھر یہ تری افسُردہ نگاہی ہے دکھاوا!
دیتی ہے تسلی مجھے شعلوں میں گرا کر — کرتی ہے اشارے مجھے محفل سے اُٹھا کر
اُمید کی لاش آج نکالی ہے جگر سے — کیوں دیکھ رہی ہے مجھے یوں ترچھی نظر سے؟
جاتا ہوں تری بزم سے ہر چیز گنوا کر — سینے کی امانت ترے قدموں میں لُٹا کر

روؤں گا نہ تڑپوں گا نہ مَیں آہیں بھرونگا
سچ کہتا ہوں اب تجھ سے محبت نہ کرونگا

کوہسار کی تاریک گپھاؤں میں دبک کر — بپھرے ہوئے دریاؤں کے سینوں پہ لپک کر
گدڑی کو کسی ریت کے ٹیلے پہ بچھا کر — مغموم نگاہوں کو ستاروں پہ جما کر
گاؤں گا نئے گیت بجاؤں گا نئے ساز — گونجے گی دو عالم میں مرے قلب کی آواز
سُنکر مری فریاد کو ناچیں گے ستارے — لوٹیں گے مری گود میں وہ کیف کے مارے
گانے مرے سُن پائیں تو جھومیں گی ہوائیں — چُومیں گی لبوں کو مرے پھُولوں کی قبائیں
کچھ آئیں گے منڈلائیں گے طائر مری سر پر — ہوگا نہ کوئی زخم مرے قلب و جگر پر
مجبور نہیں ہوں ابھی مجبور نہیں ہوں، — میں مرد خود آگاہ ہوں معذور نہیں ہوں
مغرور ہے تُو حُسن پہ میں عشق پہ نازاں — نفرت ہے تجھے عشق سے۔ میں حسن سے نالاں
مغموم ہے کیوں اور تو کیا سوچ رہی ہے؟ — غیروں کی صبوحی! تیرا اپنا یہی ہے؟
محفل میں تری اور بھی ہیں چاہنے والے — مَیں اُٹھتا ہوں اب غیر کو قدموں میں گرالے

روؤں گا نہ تڑپوں گا نہ میں آہیں بھرونگا
سچ کہتا ہوں اب تجھ سے محبت نہ کرونگا

احمد ندیم قاسمی

عجیب

(بسلسلہ صفحہ ۴۶)

"اور اب؟"

"اب تقریباً ہر تیسرے روز دولہا بھائی کا خط آتا ہے جس میں نہ معلوم کیا لکھا ہوتا ہے۔ مگر یہ خط پڑھکر اور بھی الال سیلی ہوجاتی ہیں۔ غالباً التجائیں، اور سمجھانے بجھانے کے قرینے ہوتے ہونگے — آج بھی اُن کا خط آنے کا دن ہے!"

"لیکن اب کیا ہوگا؟"

"کون جانے" زیبا نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا" مگر ان کی صحت روز بروز انحطاط پذیر ہے۔ نہ کھاتی ہیں، نہ پیتی ہیں۔ بس فانی کی "باقیات" آنکھوں سے لگی رہتی ہے۔ گھر بھر میں اگر میں یا ناصر میاں اگر کسی وقت بھولے سے بھی اصغر مرحوم کا کوئی شعر پڑھ دیں، تو قیامت آجاتی ہے۔ وہ ڈانٹ پلاتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی معلوم نہیں آپ کس طرح بچ گئے۔ شاید اس لئے کہ اتنی مدت بعد آپ کل ہی آئے ہیں — ہاں میں تو بھول ہی گئی۔ میں نے اصغر کی ایک غزل کی ایک نئی دُھن نکالی ہے سنیئے گا؟"

"اچھا۔ سنادو زیبا" میں نے ایک ہلکی سی آہ بھر کر کہا۔

زیبا نے اپنی سوز بھری آواز میں ؎

جانِ بُلبل کا خزاں میں نہیں پُرساں کوئی
اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عُریاں کوئی!

کچھ اس درد سے کہا کہ میں تڑپ اُٹھا۔ زیبا ہنس دی۔

اتنے میں وہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ تمتمایا ہوا چہرہ۔ سُرخ آنکھیں، اُڑتے ہوئے بال — غم و غصہ کی مجسم تصویر — آتے ہی کوچ پر برہمی کے انداز سے بیٹھ گئیں۔ میں یہ منظر دیکھ نہ سکا۔ دل مچل اُٹھا، حلق میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اور میں تڑپ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

زیبا گاتی رہی.....

دل میں اک بُوند لہو کی نہیں رونا کیسا
اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

جب اِس شعر پر پہونچی، تو میری طرف مُسکرا کر دیکھا۔ میں اِس "بے محل" تبسم کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

کیا مرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا قاصد
تُو نے دیکھا تھا "ستارہ" سرِ مژگاں کوئی؟

یکایک اُنہوں نے چیخکر کہا۔ "بس زیبا، خدا کے لئے بس!"
میں نے مُڑ کر دیکھا۔ ان کی خوبصورت آنکھوں سے جیسے آنسوؤں کا سوتا کُھل گیا۔

زیبا گھبرا کر ہارمونیم کے پاس سے اُٹھ گئی۔

اُنہوں نے بائیں آستین سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ لیکن اُن کے ہاتھ سے ایک کچلا ہوا، مڑا تڑا کاغذ نکل کر گرا۔ میں نے اس غیر معمولی واقعے کی وجہ معلوم کرنے کیلئے "لطیفۂ غیبی" جان کر اس کاغذ کو جلدی سے اُٹھایا۔ شکنیں دُرست کرنے پر دیکھا، کہ عارف کا خط ہے زیبا کے نام۔ تمام ورق خالی ہے اور درمیان میں ٹوٹے پھوٹے حروف میں یہ شعر لکھا ہے ؎

کیا مرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا۔ قاصد"
تُو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی؟

میری آنکھوں سے دو آنسو گالوں پر ڈھلک آئے!

مختار صدیقی۔ بی۔ اے؛

نقد و تبصرہ

معارفِ جمیل: اُردو کے مشہور و معروف شاعر حضرتِ آزاد انصاری کے عاشقانہ، رندانہ، متصوفانہ اور فلسفیانہ کلام کا مجموعہ اس نام سے شائع ہوا ہے۔ شروع کے ۹۲ صفحات میں خود موصوف کے قلم سے اپنے اور خاندانی حالات پھر اپنی شاعری، شاگردی، مطالعہ، تتبع، اساتذہ کی اصلاح اور اپنے کلام کے تدریجی ارتقا کا ذکر ہے۔ اپنی شاعری پر انہوں نے تبصرہ بھی کیا ہے جو بڑی حد تک مناسب ہے۔ اس کے بعد ڈھائی سو صفحات پر موصوف کی غزلیں، نظمیں، سہرے، رباعیات وغیرہ درج ہیں۔

کلام کی اصلی ترتیب، سلاست وصفائی زبان، ندرتِ بیان حسین و مترنم الفاظ کی تکرار، صنعت ترصیع و تقابل اور شعر میں اصطلاحات علمیہ کا استعمال اُن کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ ابتدائی کلام کو چھوڑ کر ان کی ساری شاعری پر، میرؔ، مومنؔ اور غالبؔ، اور اندازِ بیان پر حالیؔ کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اُن کی شاعری زندگی و موت۔ جوانی اور بڑھاپا، فراق وحسرت، محبت وحسن اور دنیا و آلام پر محیط ہے اور وہ کم سے کم الفاظ میں گہری سے گہری باتیں کہہ جاتے ہیں۔

کلام کی اتنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ "معارفِ جمیل" میں چند باتیں بُری طرح کھٹکتی ہیں۔ حضرت آزاد نے انگریزی لفظ (scene) باندھا ہے، ضرورت شعری ہو تو خیر مگر اس پر اڑنا کہ "اسے جائز سمجھتا ہوں" میری رائے میں غلط ہے۔ آزاد سے اُستاد کے لئے یہ بالکل آسان تھا کہ وہ منظر نہ سہی "سماں" استعمال کر لیتے نیز چند اشعار میں ذم کا پہلو بھی نکلتا ہے، الفاظ کی تبدیلی سے اس نقص کو دُور کیا جاسکتا تھا۔ صفحات ۲۰۷،۳۰۷ پر موصوف نے حالیؔ سے ایک بات منسوب کی ہے کہ اُنکی رائے میں آزاد کا یہ شعر۔

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

مومنؔ کے مشہور شعر (تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ___) سے کہیں افضل ہے۔ غالبؔ، مومنؔ کے شعر پر تو نہیں، البتہ اگر آزاد کے شعر پر (جسے حالیؔ نے تین دن میں ساٹھ مرتبہ سُنا) قربان کر دیتے تو افضل وانسب تھا۔ یقین نہیں آتا کہ حالیؔ نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی!۔

"معارفِ جمیل" ساقی کے نصف سائز پر ساڑھے تین سو صفحات پر مجلّد شائع ہوئی ہے۔ کاغذ اور چھپائی خاصی ہے۔ کتابت بُری اور غلطیوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ مجھے بے ساختہ اُسے دیکھکر مولوی شاہد احمد کا یہ فقرہ یاد آگیا" افسوس ہے عروسِ جمیل کو لباسِ حریر میسّر نہ آیا"۔ کتاب کی قیمت عہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ کاشانۂ ناز۔ بازار گھانسی، حیدر آباد۔ دکن۔

چوپال: جناب احمد ندیم قاسمی اُن چند نوجوانوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری اور فسانہ نگاری کی بدولت بہت جلد شہرت حاصل کی، اور یہ شہرت غلط بھی نہیں۔ ان کی شاعری میں ایک نئی تڑپ ہے اور فسانہ نویسی میں ایک نیا تخیل۔ حال میں اُنکے چودہ افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا ہے جو سب کے سب دیہات سے متعلق ہیں اور اسی نسبت سے اس مجموعے کا نام "چوپال" تجویز ہوا ہے اور بہت مناسب ہے۔ احمد ندیم فطرتاً حزن پسند ہیں اس لئے انہوں نے ہرجائی اور انتقام کے علاوہ باقی تمام افسانوں کو غم انجام بنایا ہے۔ ان کی تحریر میں سلاست اور روانی ہے اور پلاٹ اس قدر سادہ ہیں کہ بیشتر افسانے محض مصنف کے "تجربات" یا "حادثات" معلوم ہوتے ہیں۔ "بوڑھا سپاہی" جو ہیر رانجھا کی سرزمین کا ایک حسرتناک رومان ہے اور جس میں ضمنی طور پر جنگ کے ہولناک تجربے پڑھکر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ "مسافر" جس کے پڑھنے سے کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ہارڈی کے (Far from the maddening Crowd ___) کی دہقانی دُنیا میں گم ہوگئے ہیں جہاں کسانوں اور بھیڑوں کے گلّے کا دلچسپ حال بے تکان سناتا چلا جاتا ہے، اور "انتقام" جس میں محبت، نہایت خاموشی سے، ایکا ایکی، دبے پاؤں، عین خاتمے پر آتی ہے اور پڑھنے والا متحیر رہ جاتا ہے، اس مجموعے کے بہترین فسانے ہیں۔ باقی فسانوں میں محبت مفلسی اور خودداری کے بعض نہایت عمدہ مناظر پیش کئے ہیں۔ "غیرت مند بیٹا" میں بیوہ ماں کہتی ہے "شاباش بیٹے! فاقے کر لیں گے لیکن کمینے نہ بنیں گے۔ اپنا گلا کٹتے دیکھ سکیں گے

لیکن روئیں گے نہیں۔ آنسوؤں کو اگر سستا کر دیا جائے تو ان کی قدر کون جانے۔ یہ موتی دل ہی میں محفوظ رکھنے کے قابل ہیں۔ مٹی میں ملانے کے لائق نہیں۔" "آرام" کا عنوان "خلش" بہتر تھا۔ "یہ دیا کون جلائے"۔ افسانے سے زیادہ بیان ہے۔

منشی پریم چند اور ڈاکٹر اعظم کریوی کے یو۔پی کے دیہاتی افسانے ہمارے افسانوی ادب کا زبردست سرمایہ ہیں۔ ندیم کے افسانے پنجاب کے دیہات سے تعلق رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے انہوں نے اردو میں ایک نئے اور قابلِ قدر باب کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے ان افسانوں میں چند خامیاں رہ گئی ہیں۔ اس کی وجہ انہوں نے خود ہی لکھی ہے کہ ان کا مطالعہ چند رسائل میں محدود رہے اور انہوں نے اچھے اور معیاری افسانے کافی نہیں پڑھے، مزید برآں وہ ذہن پر کبھی زور نہیں دیتے اور لکھنے سے پہلے پلاٹ کو اچھی طرح نہیں سوچتے۔ یہ چیز بہت کھٹکتی ہے کہ ہر افسانے میں پڑھنے والے کو ایک دو موتوں سے زبردستی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا ہم کو افرادِ قصہ سے ہمدردی ہونے کے بجائے مصنف پر جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے۔

زبان و بیان میں بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی، نیز دیہاتی لوگوں میں کثرت سے "مصافحہ" کرنا "جناب" کہنا اور "تمہارا اس بے معنی کھانسی، اور لمبے لمبے قہقہوں سے کیا مطلب ہے؟" قسم کے انگریزی فقروں سے احتراز کرنا چاہیئے تھا۔ شروع میں انوکھا تہدیہ، عرض حال مصنف اور عبدالمجید سالک کا مختصر مگر دلچسپ تعارف ہے۔ اس کے بعد ایک صفحے کا غیرضروری سا دیباچہ ہے جس میں دیباچہ نگار کا یہ فقرہ غور طلب ہے کہ "منشی پریم چند اپنے اکثر افسانوں میں ایک شہری کے نقطۂ نظر سے ان (دیہاتیوں) کی زندگی کو دیکھتے محسوس ہوتے ہیں" حالانکہ پریم چند کی پیدائش، اوائل عمر، ابتدائے تعلیم، جوانی کے اکثر ایام اور آخری وقت دیہات ہی میں بسر ہوا اور ان کے دیہاتی افسانوں میں کسی قسم کی اجنبیت ہرگز محسوس نہیں ہوتی۔

ساقی کے نصف سائز کے ۲۰۴ صفحات مجلد۔ کاغذ، لکھائی چھپائی، عمدہ۔ کتابت میں غلطیاں رہ گئی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ناشر: دارالاشاعت پنجاب۔ لاہور۔

صادق الخیری:

وداعِ راشد: "وداعِ ظفر" کے مصنف علامہ راشد الخیری مرحوم کی کتابِ حیات کا آخری باب "وداعِ راشد" کے نام سے مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولانا رازق الخیری نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں علامہ مرحوم کی آخری علالت، مرض الموت، دمِ واپسیں اور تجہیز و تکفین تک کے جملہ حالات اس قدر مفصل اور مؤثر لکھے ہیں کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے آگے سینما کے فلم کی طرح نظر آنے لگتے ہیں۔ حزن نگاری کے بادشاہ کے آخری وقت کی روح فرسا تکلیفیں اور ان کے بے مثل ضبط و صبر کا بیان نہایت رقت انگیز ہے۔ رازق الخیری صاحب نے اپنے عظیم المرتبت والد کا اچھوتا طرز تحریر گویا ورثہ میں پایا ہے۔ بیگم راشد الخیری نے اس جانکاہ صدمے کو جس طرح برداشت کیا وہ ہماری خواتین کے لئے ایک سبق آموز نمونہ ہے۔

"اماں جان! اللہ کس دل گردے کی عورت ہیں،
اُن کی راجدھانی لُٹ گئی۔ اُن کا ۴۵ سال کا رفیق
بچھڑ گیا۔ اُن کا سہاگ اُجڑ گیا۔ دل کے ٹکڑے
ہو گئے، مگر آنکھوں میں آنسو تھا نہ زبان پر آہ۔
اُنہیں کپکپاتے ہاتھوں سے جن پر ابا جان
قربان ہوتے تھے اماں جان نے ڈھاٹا باندھا"

علامہ راشد الخیری کے گھرانے کے افراد پر اس حد درجہ غمناک واقعہ نے کیا کیا اثرات مرتب کئے؟ ان سب کا مفصل بیان "وداعِ راشد" میں مرقوم ہے۔ مولانا رازق الخیری کا یہ مضمون بہت قابلِ قدر ہے۔ اُمید ہے کہ وہ وقت بھی جلد آئیگا کہ علامہ مرحوم کی مبسوط سوانح عمری بھی ان کے قلم سے نکل کر مقبول ہوگی۔

"وداعِ راشد" کی قیمت ۸ر ہے اور دفتر عصمت دہلی سے مل سکتی ہے۔

"بشس"

عصمت کی کہانی: یہ رسالہ عصمت دہلی کی اٹھائیس سالہ زندگی کی کہانی مولانا رازق الخیری کی زبانی ہے۔ آج کل "عصمت" اتنا مشہور اور اتنا مقبول ہے کہ شاید ہی کوئی معقول ہندوستانی گھرانا اس سے محروم ہو۔ لیکن شاید یہ بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ علامہ راشد الخیری مرحوم نے عصمت کو ربع صدی سے زیادہ زندہ رکھنے کیلئے کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائیں اور اس کی خاطر کتنی دفعہ اپنی محنت کی کمائی کا آخری پیسہ تک اُس پر صرف کر دیا۔ ۲۸ سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا اور اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کو اس طویل عرصے میں بہت کم سُکھ کی گھڑیاں میسر آئیں۔ عصمت کا پہلا پرچہ جون ۱۹۰۸ء

میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۱۸ء سے مولانا رازق الخیری نے کچھ کچھ ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں علّامہ مرحوم نے عنانِ ادارت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور فروری ۱۹۳۶ء تک مرحوم کی نگرانی میں عصمت شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد علّامہ مرحوم جنّت کو سدھارے اور اُن کی یادگار میں عصمت جاری رہا۔ اب بفضلہ سب سے کامیاب اور پیش پیش ہے۔ اس کی تدریجی ترقی کی مفصل کیفیت "عصمت کی کہانی" میں درج ہے۔ ضخامت ۹۰ صفحات۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ عصمت بکڈپو۔ دہلی۔ "ش"

ہلال و صلیب:۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی مفصل سوانحعمری حضرت ایم۔ اسلم نے کاوش و تحقیق سے مُرتب کی ہے۔ اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ابتدا میں دیباچہ کی طور پر حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ایک طویل نظم بھی شامل ہے جس کے چند متفرق اشعار درج ذیل ہیں:۔

خُدا کا ہاتھ اُٹھا اور بڑی تعجیل سے اُٹھا
اچانک ایک ابر سبز رود نیل سے اُٹھا
وفا کا ایک بندہ۔ شمع دیں کا ایک پروانہ
صداقت کیش مُسلم۔ بادۂ غیرت کا مستانہ
مفاسد کو مٹانے کے لئے باصد خوش اسلوبی
اُٹھا تیغ و سپر لیکر صلاح الدین ایوبی
خدا نے ظالموں کو ظلم کی پاداش دی آخر
صلاح الدین نے یورپ کو شکستِ فاش دی آخر
ہوا ضو ریز پھر اس ملک پر توحید کا جلوہ
صلاح الدین کا چہرہ تھا صبح عید کا جلوہ

ضخامت ۲۷۴ صفحات۔ مجلّد۔ رنگین خاک پوش۔ قیمت عار ملنے کا پتہ:۔ اُردو اکیڈمی پنجاب۔ لوہاری گیٹ۔ لاہور۔ "ش"

شہزادی نیلوفر:۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں بچّوں اور بچّوں کیلئے گیارہ کہانیاں محترمہ سرور رعنا نے لکھی ہیں۔ یہ سب کہانیاں بہت دلچسپ ہیں اور اس لائق ہیں کہ چھوٹی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کو پڑھائی جائیں۔ ضخامت ۲۰ صفحات، قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ عصمت بکڈپو۔ دہلی۔ "ش"

کیلے کا چھلکا:۔ سندباد جہازی اُردو کے مشہور ظرافت نگار ہیں۔ ان کے مضامین کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ مزاح کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ ان کے ۱۸ مضامین کا مجموعہ حال میں شائع ہوا ہے۔ مجموعہ کا نام ہے "کیلے کا چھلکا" اور دوسرے مضامین۔ مضامین دلچسپ اور خندہ خیز ہیں۔ کتاب مجلّد ہے اور رنگین گرد پوش سے آراستہ ہے۔ ضخامت ۲۶۷ صفحات۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ اُردو اکیڈمی پنجاب۔ لاہوری گیٹ۔ لاہور۔

پطرس کے مضامین:۔ مسٹر احمد شاہ بخاری کے نام سے کم لوگ واقف ہیں لیکن ان کا قلمی نام (پطرس) ہر صاحب ذوق جانتا ہے۔ پطرس اُردو مزاح نگاری میں یک خاص امتیاز اور مرتبہ رکھتے ہیں۔ انکے دس مضمونوں کا مجموعہ عرصہ ہوا دار الاشاعت لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس پر ساقی میں مفصل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ پیش نظر مجموعہ پطرس کے مضامین کا تیسرا اڈیشن ہے جو حالی پبلشنگ ہاؤس، اُردو بازار دہلی کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اس اڈیشن کی نظر ثانی مشہور نقاد و محقق پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی نے کی ہے جنہیں پطرس پر حقِ اُستادی بھی حاصل ہے۔ دوسری خصوصیت اس مجموعے کی یہ ہے کہ اس میں پطرس کا مشہور مضمون "لاہور کا جغرافیہ" بھی شامل ہے جو اس سے پہلے دو اڈیشنوں میں شریک نہیں تھا۔ کتابت و طباعت روشن، کاغذ عمدہ، جلد کپڑے کی، خوشنما گرد پوش۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات۔ قیمت عہ۔ "ش"

افسانۂ پدمنی:۔ چتوڑ کی رانی پدمنی اور علاء الدین خلجی کے معاشقہ کی مشہور کہانی کی مورّخانہ تحقیق مولوی احتشام الدین صاحب ایم۔ اے نے نہایت کاوش سے کی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ یہ کہانی محض لغو اور مہمل روایات پر مبنی ہے۔ مولوی صاحب کی تحقیق بتاتی ہے کہ اس قصّے کے تین ماخذ ہیں:۔ (۱) پدماوت (۲) کھمان راسا اور (۳) تاریخ فرشتہ۔ مولوی محمد حسین آزاد نے قصصِ ہند میں جو پدمنی کا قصّہ لکھا ہے وہ بھی انہی سے ماخوذ ہے۔ مولوی احتشام الدین صاحب نے ان ماخذوں اور آزاد کے لکھے ہوئے قصّے کی تحقیق و تنقید کی ہے اور علاء الدین خلجی جیسے سلطانِ ذیشان کا دامن اس گندی روایت سے پاک ثابت کر دکھایا ہے۔ اس تحقیقات کی روشنی میں آئندہ اس کو ملنے کی تاریخوں میں سے اس قصّے کو خارج کر دینا چاہیئے۔ مولوی صاحب کا یہ کارنامہ اس لائق ہے کہ تاریخ کے نصاب میں جگہ پائے اور کوئی اسکول اور کالج کی لائبریری اس سے خالی نہ رہے۔

کتابت جلی اور خوشنما۔ ضخامت ۵۰ صفحات قیمت عار۔ کتبخانہ علم و ادب دہلی سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔ "ش"

ساقی کا سالنامہ ۱۹۴۰ء

دسمبر ۱۹۳۹ء میں ساقی اپنی زندگی کے دس سال پورے کریگا۔ اس تقریب میں ساقی کا سالگرہ نمبر گزشتہ سب خاص نمبروں سے بڑھ چڑھکر شائع ہوگا۔ جو حضرات ساقی کا مطالعہ کرتے رہے ہیں جانتے ہیں کہ مضامین کے اعتبار سے ساقی کے سالگرہ نمبر میں چند ایسے ادبی نوادر ہوتے ہیں جو کسی اور رسالے میں نہیں ہوتے۔ ۱۹۴۰ء کے سالنامے کیلئے ہم نے جو مضامین جمع کئے ہیں اُن کی مختصر فہرست دسمبر کے ساقی میں پیش کی جائے گی۔ اس وقت صرف اتنا سن لیجئے کہ ساقی کے خاص قلمی معاونین نے اپنے اپنے بہترین مضامین ہمیں بھیجدیئے ہیں۔

اُردو کی دو زندہ جاوید کتابیں

۱۔ انارکلی

سید امتیاز علی صاحب بی۔ اے کا وہ معرکتہ الآرا المیہ تاریخی ڈرامہ جس کے محاسن کی بناپر:۔

۱۔ گورنمنٹ پنجاب نے مصنف کو ادبیات کا بیش بہا انعام دیا۔

۲۔ اُردو کے طالب علم جاپانیوں نے جاپان میں اسٹیج کیا۔

۳۔ اخبارات اور رسائل اور ریڈیو پر اس قدر بہت مضامین نکلے جو موجودہ عہد کی کسی دوسری کتاب پر نہیں نکلے۔

۴۔ نقادوں اور ایکٹروں اور ڈائرکٹروں نے مصنف کو ڈرامہ کے ایک عہدِ نو کا بانی قرار دیا۔

۵۔ مرزا محمد سعید ایم۔ اے تحریر فرماتے ہیں:۔ انارکلی کی اشاعت ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

۶۔ سید سجاد حیدر یلدرم بی۔ اے: ایک کتاب جس سے آنکھوں میں نور اور دل میں ہمدردی عاشقِ مہجور پیدا ہوتی ہے"۔

۷۔ اے۔ ایس۔ بخاری۔ ایم۔ اے (پطرس) ڈپٹی کنٹرولر براڈ کاسٹنگ دہلی۔ "انارکلی اُردو ڈرامہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا"۔

۸۔ منشی پریم چند مرحوم: "مجھے جتنی کشش انارکلی میں ہوئی اور کسی ڈرامے میں نہیں ہوئی"۔

۹۔ عنایت اللہ خان صاحب مہتمم تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن: "یہ ان کتابوں میں سے ہے اور ایسی کتابیں شاذ و نادر ہی ہیں جنکو دیکھکر پڑھکر اور اپنے پاس رکھکر ہمیشہ دل خوش ہوتا ہے اور انکو ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے"۔

ہر عمر اور ہر مذاق کا شخص اسے پڑھتا اور بے اختیار سر دھنتا ہے۔ کتابت و طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ آرٹ کی رنگین تصاویر اور تزئینی نقش تیسرا اڈیشن قریب الختم۔ قیمت فی جلد عہ۔ پر تکلف اڈیشن دستخط شدہ مصنف للعہ۔

۲۔ چچا چھکن

سید امتیاز علی صاحب تاج کے ظرافت نگار قلم کا وہ کامیاب کردار:۔

۱۔ جس کے نام سے تعلیمیافتہ ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔

۲۔ جسکی کامیابی سے متاثر ہوکر اکثر ادیب اسی موضوع پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

۳۔ جس کے متعلق ایک اصلی یا نقلی مضمون شائع کر دینا اکثر ادبی رسائل کے نزدیک انکے خاص نمبروں کی کامیابی کا ضامن ہے۔

شستہ ظرافت جسے پڑھکر بچے بوڑھے، عورت مرد لڑکے لڑکیاں سب قہقہے لگاسکتے ہیں قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت پنجاب۔ لاہور

ساقی کے دس سال کا انتخاب

ریزۂ مینا

جسمیں پچاس مشہور افسانہ نگار حضرات کے بہترین افسانے شامل ہونگے

اِن پچاس بے مثل افسانوں کا انتخاب شاہد احمد صاحب اڈیٹر ساقی نے کیا ہے۔

کتاب زیرِ طبع ہے۔ ضخامت چھ سو صفحات۔ کتابت و طباعت اعلیٰ درجے کی۔ جلد مضبوط کپڑے کی اور سنہری ٹھپہ والی ہوگی۔

مندرجہ ذیل حضرات کے افسانے اس جلد میں شامل ہیں۔

(۱) خان بہادر میر ناصر علی مرحوم۔ (۲) میر باقر علی مرحوم (داستانگو)۔ (۳) علامہ راشد الخیری مرحوم۔ (۴) شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن۔ (۵) حضرت خواجہ حسن نظامی۔ (۶) خواجہ ناصر نذیر فراق مرحوم۔ (۷) خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی۔ (۸) مولوی عنایت اللہ دہلوی۔ (۹) منشی پریم چند آنجہانی۔ (۱۰) مولانا اسلم جیراجپوری۔ (۱۱) آغا شاعر قزلباش۔ (۱۲) پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی۔ (۱۳) سلطان حیدر جوش۔ (۱۴) مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔ (۱۵) ل۔ احمد۔ (۱۶) ایم۔ اسلم۔ (۱۷) ڈاکٹر سید عابد حسین۔ (۱۸) خواجہ غلام السیدین۔ (۱۹) پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی۔ (۲۰) سید امتیاز علی تاج۔ (۲۱) سُدرشن۔ (۲۲) سید وزیر حسن دہلوی۔ (۲۳) دیوانہ بریلوی۔ (۲۴) ڈاکٹر اعظم کُریوی۔ (۲۵) پروفیسر عبدالقادر سروری۔ (۲۶) رفیقی اجمیری مرحوم۔ (۲۷) قیسی رامپوری۔ (۲۸) پروفیسر محمد مسلم۔ (۲۹) ناکارہ حیدرآبادی۔ (۳۰) حجاب امتیاز علی۔ (۳۱) انصار ناصری دہلوی۔ (۳۲) فضل حق قریشی دہلوی (۳۳) ظفر قریشی دہلوی۔ (۳۴) صادق الخیری دہلوی (۳۵) پروفیسر احمد علی۔ (۳۶) مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ (۳۷) پریم پجاری۔ (۳۸) سعادت حسن منٹو۔ (۳۹) اختر حسین رائے پوری۔ (۴۰) مرزا نہیم بیگ چغتائی۔ (۴۱) اشرف صبوحی دہلوی۔ (۴۲) محمد محسن۔ (۴۳) پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ (۴۴) ممتاز مفتی۔ (۴۵) شاہد لطیف۔ (۴۶) عصمت چغتائی۔ (۴۷) سید رفیق حسین۔ (۴۸) اسعد الاشرفی دہلوی۔ (۴۹) علامہ مضحک دہلوی۔ (۵۰) ڈاکٹر ایس۔ اے۔ ہاشمی۔

دسمبر میں یہ کتاب شائع ہوجائے گی۔ اِس نایاب مجموعے کی قیمت نسبتاً بہت کم تجویز کی گئی ہے۔

ساقی کے مستقل خریداروں کیلئے دو ۲ روپے علاوہ محصولڈاک

نوٹ۔ خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

جو حضرات ساقی کے مستقل خریدار نہیں ہیں اُن کے لئے تین ۳ روپے علاوہ محصولڈاک۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ کتاب شائع ہوتے ہی آپ کو مل جائے تو اپنا آرڈر بھیج دیجئے۔ تاکہ بذریعہ وی پی بھیجدی جائے۔ قیمت پیشگی بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

مہتمم۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔

عہدِ حاضر کے بڑے لوگ

حصہ اوّل (باتصویر) ہندوستان

اس حصہ میں مہاتما گاندھی، رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم، ڈیش بندھو سی آر داس آنجہانی اور قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کے حالاتِ زندگی اور سیاسی نقطۂ نظر کو اختصار کے باوجود اس جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد ہندوستان کی موجودہ سیاست کو سمجھنے کے لئے کسی اور کتاب کے مطالعے کی ضرورت باقی نہیں رہتی خصوصاً گاندھی جی کی مشہور تحریک ستیہ گرہ پر جس زاویہ سے نظر ڈالی گئی ہے وہ اس قابل ہے کہ اُسے بار بار پڑھا جائے۔

حجم ۱۲۸ صفحات لکھائی چھپائی دیدہ زیب، ٹائیٹل پیج نہایت خوبصورت سہ رنگا۔ ان ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ۸؍ علاوہ محصولڈاک۔

حصہ دوم (باتصویر) چین و ایران

چین کے مشہور قائد مارشل چیانگ کائی شک اور ایران کے شہنشاہ اعلیٰ حضرت رضا شاہ پہلوی کے حالات اور کارنامے ہمارا دعویٰ ہے کہ آج تک اُردو تو اُردو کسی اور زبان میں بھی اس جامعیت کے ساتھ اکٹھے نہیں ہوئے جس جامعیت اور تفصیل کے ساتھ ہم نے اس حصہ میں پیش کئے ہیں۔ مارشل چیانگ کے حالات میں چین اور جاپان کی موجودہ جنگ پر اگست تک کے واقعات کو سامنے رکھکر نہایت جامع تبصرہ کیا گیا ہے اور رضا شاہ کے حالات میں ایران قدیم اور جدید کے تقابل کے علاوہ کمال اتاترک اور رضا شاہ کی شخصیتوں کا نہایت ہی دلچسپ موازنہ کیا گیا ہے۔ حجم ۱۲۸ صفحات۔ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ، ٹائیٹل پیج جاذب نظر سہ رنگا قیمت صرف ۸؍ علاوہ محصولڈاک۔

تیسرا حصہ (باتصویر) عراق و عرب

اس حصے میں امیر فیصل بن حسین الہاشمی اور سلطان عبدالقدیر ابن سعود کے حالاتِ زندگی۔ جنگ عظیم کے دوران میں ان کے "کارنامے"۔

بدنام زمان کرنل لارنس کی جاسوسانہ سرگرمیاں۔

حکومت برطانیہ کی شاطرانہ چالیں نہایت شرح و بسط سے دکھائی گئی ہیں۔ ان کے ساتھ امیر فیصل اور ابن سعود کی ذات کے متعلق غیر عرب ممالک کا نقطۂ نظر بھی پوری دیانت داری کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔

ٹائیٹل پیج سہ رنگا دیدہ زیب۔ حجم ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۸؍ علاوہ محصولڈاک۔

چوتھا حصہ (باتصویر) مصر و مراقش

اس حصے میں مصر کے اولوالعزم قائد احمد زغلول اور ریف کے مشہور مجاہد غازی محمد بن عبدالکریم کے حالاتِ زندگی، یورپین قوتوں سے اُن کے کامیاب محاربے نہایت دلچسپ اندازِ بیان میں پیش کئے گئے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ مصر اور مراقش کی پوری تاریخ۔ ان دونوں ممالک پر برطانیہ، فرانس، اور اسپین کے انتداب کے حالات پوری تفصیل سے جمع کر دئے گئے ہیں۔

ٹائیٹل پیج سہ رنگا۔ دیدہ زیب۔ حجم ۱۲۸ صفحات۔ قیمت صرف ۸؍ علاوہ محصولڈاک۔

(نومبر کے پہلے ہفتے میں شائع ہوگا)

ملنے کا پتہ:-

ساقی بک ڈپو۔ دہلی

سقراط کی آخری تقریر

(مترجمہ جناب مولانا محمد عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی)

تمہید

یونان قدیم کی اعلیٰ ترین رُوحانی زندگی کی کیفیت افلاطون نے اپنی تصانیف میں حکیم سقراط کے حالات لکھ کر ہمارے لئے زندہ کر رکھی ہے۔

خود افلاطون حکمت وفلسفہ کا زبردست عالم تھا۔ گو طبیعت شاعرانہ پائی تھی۔ سقراط جس بلندی خیال پر پہنچنا چاہتا تھا اُسے افلاطون خوب سمجھتا تھا۔ اور خود بھی وہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ افلاطون نے مکالمات کی صورت میں کسی قدر تمثیلی رنگ بھر کر سقراط کے ذاتی حالات اور اس کے فلسفیانہ افکار قلمبند کئے ہیں۔ سقراط نے خود کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مگر اس کی عقل و دانش کے مقولے یونان کے دو بڑے بزرگوں یعنی افلاطون اور زنوفن نے سقراط کی دوستی سے قوت پا کر تحریر کئے ہیں۔

سقراط بیٹا تھا ایک شخص سفرانقس نامی کا جو ایتھنز میں بت تراشی کا پیشہ رکھتا تھا۔ ایتھنز سے باہر مگر شہر سے بالکل پاس ایک مقام پر ۴۶۸ برس قبل ولادت مسیح علیہ السلام وہ پیدا ہوا تھا۔ جسے آج دو ہزار چار سو سات برس گذر چکے ہیں۔ اپنے شہر ایتھنز سے سقراط کو عشق تھا۔ جوانی میں اس کے لئے لڑائیاں بھی لڑ چکا تھا۔ زندگی کا مطالعہ اس طرح کرتا تھا کہ لوگوں سے اتحاد و اشتراک رکھ کر اُن سے گفتگو کرتا۔ سیاسی قضیوں سے دور رہتا۔ کیونکہ اس نے اپنی زندگی کو اس بات کے لئے وقف کر دیا تھا کہ وہ قوائے انسانی کو اس جنگ اور کشمکش کے لئے آمادہ کر دے جس کا مدعا اس زندگی سے جو چاروں طرف نظر آتی ہے کہیں بڑھ کر زندگی تک پہنچانے کا ہو۔ کسی مکتب یا مدرسے میں بیٹھ کر پڑھاتا نہ تھا۔ لوگوں کے گھروں کارخانوں، اکھاڑوں یا بازاروں میں جہاں کہیں کسی جوان یا بڈھے سے ملتا اس سے گفتگو کر کے اس کے خیالات کو بلند کرنا چاہتا۔ اور ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ کوشش ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ جس سے بات کرے اُسے اپنے قلب کی طرف براہ راست نظر دوڑانے پر مجبور کرے۔ اور جس بات کو وہ شخص سمجھتا ہے کہ وہ جانتا ہے اُسے واقعی صاف اور روشن طریقے پر سمجھے کہ واقعی وہ کیا چیز ہے۔ اور اس طرح لوگ اعلیٰ مطمح نظر تک پہنچ جائیں۔ گویا غلامی سے بادشاہی تک پہنچ جائیں۔

سقراط عامۃ الناس کی سمجھ اور عقل کا قائل نہ تھا۔ جن سے ملتا اُنھیں نصیحت کرتا کہ حکومت نے جن بتوں کو پوجنے کا حکم دیا ہے اُنھیں پوجو۔ مگر اصلی مقصد اس کی روحانی تعلیم کا یہ تھا کہ وہ لوگوں کو سبب اول یا علت العلل کو سمجھنے کی طرف مائل اور راغب کرے جو سب میں خالق اور جلیل القدر ہے۔ اور ایسی لایعنی علامتوں سے جیسے کہ بُت یا پتھر ہیں اُن کی توجہ کو ہٹا کر اس حق کی طرف رجوع کرے جو ان پتھروں اور بتوں میں پنہاں ہے۔ جب شہر میں اُس کی ان باتوں کا چرچا ہوا تو ارباب سیاست اور مندروں کے پروہتوں نے اس کی مخالفت پر کمر باندھی۔ آخر کار مجلس جمہوریں اس پر مقدمہ چلوا دیا۔ چنانچہ چھ آدمیوں کی کثرت رائے سے سقراط پر یہ الزام ثابت ہو گیا کہ وہ بدعت کا حامی اور اس کی تعلیم دینے والا ہے۔ اب سقراط نے اس سخت حکم کو دفع کرنے کے بجائے اپنے فعل وعمل کو بالکل درست اور جائز بتانا شروع کیا۔ اس پر جمہوریہ کو اور غصہ چڑھا۔ اور اب اُنھوں نے اسّی ارکان کی کثرت رائے سے اسے سزائے موت کا حکم سُنا دیا۔ اس حکم کو سُن کر

سقراط نے کہا۔ چونکہ الزام سے بریت کے لئے میں نے ایمان داری سے کام لیا ہے اس لئے وہ اپنا مرجانا اس سے بہتر سمجھتا ہے کہ حکم سزا کو مسترد کرانے کے لئے وہ عفو اور رحم کی درخواست کرے۔

اس حکم کے بعد تیس ۳۰ دن تک سقراط قید خانے میں رہا۔ اور اس زمانے میں جو لوگ قید خانے میں اُس سے ملنے آتے تھے اُن سے بے تکلف بات چیت کرتا رہا۔ موت کے حکم کے بعد کیوں سزا فوراً نہ دی گئی۔ اس کی خاص وجہ تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ ہر سال تھیورس کا مقدس جہاز دیلوس کے مندر کو نیاز نذر کی چیزیں لیجایا کرتا تھا۔ جب تک کہ جہاز واپس نہ آجاتا، ایتھنز میں کسی مجرم کو سزائے موت نہ دی جاتی۔ غرض یہ زمانہ ایسا ہی تھا کہ دیلوس سے جہاز ابھی تک واپس نہ آیا تھا۔

اب یہاں وہ مکالمہ آتا ہے جو سقراط نے اپنی زندگی کی آخری ساعتوں میں کیا تھا۔ یعنی ۳۹۹ ق۔م میں جب کہ اُس کی عمر سُتّر سال کی ہو چکی تھی۔

افلاطون جو اس مکالمے کا تحریر کرنے والا ہے سنہ ۴۲۷ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ سقراط کی موت کے وقت اس کی عمر ۲۸ برس کی تھی۔ افلاطون ایتھنز کے ایک معزز خاندان کا رکن تھا۔ خداداد ذہانت کے ساتھ تعلیم بھی اعلیٰ درجہ کی پائی تھی۔ بیس برس کی عمر تھی کہ سقراط کی شاگردی اختیار کرکے اس کا بڑا شیدا اور شیفتہ شاگرد ہوگیا۔ سقراط کے مرنے کے بعد وہ اور سقراط کے اور شاگرد حفاظت کے خیال سے ایتھنز چھوڑ کر میگارا میں جا بسے۔

قریطو جسے افلاطون اپنے استاد کے اس مکالمے میں لایا ہے جو دیلوس سے جہاز کی واپسی سے کچھ ہی پہلے ہوا تھا ایتھنز کا بڑا دولتمند باشندہ تھا۔ سقراط سے اسے بے حد تعلق تھا۔ خود قریطو نے بھی حکمت اور فلسفہ میں سترہ مکالمے لکھے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ سب ضائع ہوگئے۔ قریطو اپنی دولت ہمیشہ اچھے کاموں میں صرف کرتا تھا۔ سقراط کو اس نے فکر معاش سے آزاد کر رکھا تھا۔ اور استاد کی جان بچانے کے لئے اُس کے قید خانے سے بھاگنے کا پورا انتظام کر لیا تھا جیسا کہ افلاطون کے اس مکالمے میں بیان آئے گا۔ افلاطون نے اس مکالمے کے دو نام رکھے تھے۔ ایک قریطو۔ اور دوسرا "ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

قریطو کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر سیموئیل جانسن (۱۷۰۹ء تا ۱۷۸۴ء) کے انتقال کے ایک سال بعد شائع ہوا تھا۔ اور اسی کا اُردو ترجمہ آج آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

قریطو
یا
ہمیں کیا کرنا چاہیئے

حکیم سقراط ا قریطو

(مقام قید خانہ)

سقراط۔ کیوں۔ ایسی جلدی پھر کیوں چلے آئے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تو بہت سویرا ہے۔

قریطو۔ جی ہاں۔

سقراط۔ بھلا کیا وقت ہوگا؟

قریطو۔ دن نکلنے کو ہے۔

سقراط۔ تعجب ہے کہ داروغہ جیل نے تمھیں کیسے اندر آنے دیا؟

قریطو۔ وہ میرا جان پہچان ہے۔ اس کے پاس میرا اکثر آنا جانا

رہتا ہے۔ اور میرا کسی قدر اس پر احسان بھی ہے۔

سقراط:۔ کیا تم ابھی آئے ہو۔ یا آئے ہوئے دیر ہوئی؟

قریطو:۔ جی میں کچھ دیر سے آیا ہوا ہوں۔

سقراط:۔ آتے ہی تم نے مجھے جگا کیوں نہ لیا؟

قریطو:۔ توبہ۔ توبہ! بھلا مجھ سے ایسا ہو سکتا تھا! میں خود تو ایسے صدموں اور غموں کو دُور بھی کر سکتا ہوں جو میری آنکھ جھپکنے دیں۔ لیکن جب میں اس کمرے میں آیا تو آپ غافل سو رہے تھے۔ جگانے کی ہمت نہ ہوئی کہ تھوڑی دیر کو تو آپ نے آرام کیا ہے۔ اُس میں بھی خلل ڈالوں۔ اصل یہ ہے کہ جب سے مجھے آپ سے نیاز حاصل ہوا ہے مجھے آپ کے صبر و استقلال اور طمانیت خاطر پر ہمیشہ حیرت ہوئی ہے۔ بالخصوص موجودہ حالت میں تو یہ حیرت اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ باوجود اس کے آپ کی نظروں سے ایک آسودگی اور اطمینان ظاہر ہو رہا ہے۔

سقراط:۔ ہاں۔ واقعہ یہی ہے۔ قریطو۔ مجھ جیسی عمر کے آدمی کے لئے موت سے ڈرنا بہت ہی نامعقول بات ہوگی۔

قریطو:۔ بجا ہے۔ مگر کتنے آدمی ہیں جنھیں روزانہ ہم اسی مصیبت میں دیکھتے ہیں۔ لیکن بڑھاپا موت سے ان کا خوف دُور نہیں کرتا

سقراط:۔ یہ سچ ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اتنے سویرے تمھارے یہاں آنے کی وجہ کیا ہوئی؟

قریطو:۔ میں آپ کو ایک نہایت ہی پریشان کرنے والی خبر سُنانے آیا ہوں۔ گو اس کا اثر آپ پر کچھ نہ ہوگا۔ لیکن ہمیں اور آپ کے اعزا و احباب کو اتنا صدمہ اور رنج ہے کہ وہ حقیقت میں ناقابل برداشت ہے۔ خلاصہ یہ کہ میں آپ کو ایک ایسی وحشتناک خبر سناتا ہوں جس سے زیادہ وحشتناک خبر سننی ممکن نہیں۔

سقراط:۔ وہ کیا خبر ہے۔ کیا ویلوس کے مندر سے وہ جہاز واپس آگیا ہے جس کی واپسی پر میں جان سے مارا جاؤں گا؟

قریطو:۔ ابھی یہاں آیا تو نہیں ہے۔ لیکن کچھ لوگ سونیام سے خبر لائے ہیں کہ وہ جہاز وہاں آگیا ہے۔ اور یہ لوگ اُسے وہیں چھوڑ کر آئے ہیں۔ اس حساب سے جہاز آج یہاں کسی وقت آجائے گا۔ اور کل آپ ہلاک کر دیئے جائیں گے۔

سقراط:۔ اس میں بُرائی کیا ہے؟ جب خدا کی مرضی یہی ہے تو ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ جہاز آج یہاں پہنچ جائے گا۔

قریطو:۔ یہ رائے آپ نے کس قیاس پر قائم کی ہے؟

سقراط:۔ مجھے یہی کہنا ہے کہ جہاز کے آنے کے دوسرے دن تک میں نہیں مارا جاؤں گا۔

قریطو:۔ کم سے کم جو لوگ آپ کی جان لینے کے لئے مقرر ہوئے ہیں ان کا تو یہی خیال ہے۔

سقراط:۔ وہ جہاز یہاں کل تک تو آئے گا نہیں۔ یہ حال مجھے ایک خواب سے معلوم ہوا ہے جو میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ تم نے آتے ہی مجھے جگایا نہیں۔

قریطو:۔ فرمائیں کہ وہ خواب کیا تھا جو آپ نے دیکھا ہے۔

سقراط:۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑی قبول صورت عورت میرے نزدیک آئی ہے۔ اور میرا نام لے کر کہتی ہے کہ "آج سے تین دن کے اندر تم فتھیا میں ہوگے۔

قریطو:۔ بلاشبہ ہوگا یہی۔ مگر اس وقت تو میری گذارش ہے کہ آپ یہاں سے بھاگ چلیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے اگر آپ دنیا سے چل بسے تو علاوہ اس نقصان کے کہ ایک دوست سے محروم ہو کر اس کو یاد کر کے میں ہمیشہ رویا کروں گا مجھے اس بات کا فکر ہے کہ بہت لوگ جو نہ آپ سے واقف ہیں اور نہ مجھے جانتے ہیں، اس بات کا یقین کریں گے کہ ایسی سخت حالت میں میں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور آپ کو قید خانے سے نکال لیجانے میں میں نے اپنی دولت سے جبکہ یہ بات میری قدرت میں تھی کچھ کام نہ لیا۔ میری بدنامی کے لئے اس سے زیادہ اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ میں نے روپے کا پاس کیا۔ اور اپنے دوست کا پاس نہ کیا۔ کیونکہ لوگوں کو اس کا یقین نہ آئے گا کہ یہ آپ تھے جنھوں نے باوجود ہمارے اصرار کے قید خانے سے بھاگنا منظور نہ کیا۔

سقراط:۔ میرے عزیز قریطو۔ تمھیں لوگوں کے کہنے اور ان کی رائے کا اتنا خیال کیوں ہوا۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ لوگوں میں ہم صرف ایسے آدمیوں کے کہنے کا خیال کریں کہ جو عقل اور سمجھ اور کل واقعہ کا اس کی اصلی شکل میں علم بھی رکھتے ہیں۔

قریطو:۔ لیکن جناب والا اس کا بھی تو لحاظ کریں کہ عوام الناس کے شور اور غوغا کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ خود جناب کی مثال ایسی موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عوام کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ کچھ کم نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ نقصان

پہنچانے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور اُن لوگوں پر بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنا غصہ اُتار سکتے ہیں جن کے بارے میں وہ اپنی رائے خلاف دے چکے ہوں۔

سقراط:۔ مجھے علم ہے کہ عوام زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر نقصان پہنچانے کی قابلیت ان میں سب سے زیادہ ہے تو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے پر بھی وہ قادر ہیں۔ لیکن جو بات سب سے زیادہ مسرت کی ہے وہ یہ ہے کہ نہ اُن سے یہ ممکن ہے نہ وہ۔ کیونکہ وہ آدمیوں کو نہ عقلمند بنا سکتے ہیں نہ بے وقوف۔

قریطو:۔ جو کچھ آپ نے فرمایا۔ میں اُسے تسلیم کرتا ہوں لیکن میری ایک بات کا آپ جواب دیں۔ وہ یہ کہ کیا یہ میری یا دوستوں کی محبت ہے کہ آپ یہاں سے قدم باہر نکالنا نہیں چاہتے۔ یا خوف ہے کہ آپ کے یہاں سے بھاگ جانے پر ہم کسی آفت میں مبتلا ہو جائیں گے اور ہم پر یہ الزام عائد ہوگا کہ ہم آپ کو قید خانے سے نکال لے گئے۔ اور اس جرم کی سزا میں ہمارا مال و متاع سب ضبط سرکار ہو جائے گا۔ یا کوئی بھاری رقم جرمانے کی ہمیں بھگتنی ہوگی۔ یا کوئی اور سزا ہمیں دی جائے گی۔ اگر آپ کے دل میں ایسا کوئی خوف ہے تو میں ارباب فلک کی قسم دلا کر آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آپ ایسے خوف کو دل سے دور کر دیں۔ کیا خطروں میں پڑ کر اور اگر موقع ہوا تو شدید خطروں میں پڑ کر بھی آزادی حاصل کر لینی عقل کی بات نہ ہوگی۔ میرے اچھے سقراط۔ میں ایک مرتبہ اور نہایت عاجزی سے عرض کرتا ہوں کہ آپ میری بات کا یقین کریں۔ اور ہمارے ساتھ یہاں سے نکل چلیں۔

سقراط:۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ اس قسم کے خیالات اور ان کے علاوہ اور چند باتیں میرے ذہن میں بھی آئی تھیں۔

قریطو:۔ میں آپ سے بمنت عرض کرتا ہوں کہ آپ کسی بات سے نہ ڈریں۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کی رہائی کے لئے جو رقم طلب کی گئی ہے وہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ علاوہ اس کے آپ کو معلوم ہے کہ جو لوگ ہمیں گرفتار کرنا چاہیں گے وہ کیسی ذلیل اور خوار حالت میں ہیں۔ بہت تھوڑا سا روپیہ دے کر اُن کا منہ بند کیا جا سکتا ہے۔ میرے پاس اتنا روپیہ ہے کہ یہ کام بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اگر مجھ سے اس کام کے لئے آپ کو روپیہ لینے میں عار ہو تو بہت سے باہر کے لوگ یہاں ایسے آئے ہوئے ہیں جو خوشی سے آپ کو حسب ضرورت روپیہ دینے کو تیار ہیں۔ اور وہ

اسے اپنے حق میں بڑی عزت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ تھیبی کا رہنے والا سیمیاس بھاری رقمیں ساتھ لئے یہاں اسی غرض سے آیا ہے۔ اسی طرح قابیس اور اور چند لوگ یہاں چلے آئے ہیں۔ اس لئے کسی طرح کا خوف یہاں سے فرار ہونے میں آپ کا مانع نہ ہونا چاہیئے۔ اور جیسا کہ آپ نے اس دن عدالت میں مجھ سے کہا تھا کہ اگر آپ یہاں سے فرار بھی ہو گئے تو آپ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ پھر آپ کی وجہ معاش کیا ہوگی۔ اس کا آپ مطلق فکر نہ کریں آپ جہاں کہیں بھی ہوں گے لوگ آپ سے ادب اور محبت سے پیش آئیں گے۔ اگر آپ نے تھسلی کے علاقہ میں جانا چاہا تو وہاں میرے دوست احباب ایسے موجود ہیں جو آپ کا وہی ادب و احترام کریں گے جس کے آپ مستحق ہیں۔ اور آپ کی تمام ضروریات مہیا کرنے میں دل سے خوش ہوں گے۔ اور اپنے وطن میں آپ کو تمام خطروں سے پناہ میں رکھیں گے۔ اور آپ کو کسی طرح کا خوف پیدا نہ ہونے دیں گے۔ لیکن جناب والا اگر آپ نے اپنے تئیں دشمن کے حوالے کر دیا۔ جس صورت میں یہاں سے فرار ہونا آپ کی قدرت میں ہے تو اس میں آپ بڑی بے انصافی کریں گے۔ اور گویا اپنے دشمنوں کی خواہشوں کو پورا کرنے میں مدد کریں گے۔ اس میں آپ نہ صرف اپنے ساتھ بے وفائی کریں گے۔ بلکہ اپنے بچوں کے ساتھ بھی ان کو اپنے حال میں چھوڑ کر بدسلوکی کریں گے درحالیکہ آپ ان کی پرورش اور تعلیم کا بخوبی انتظام کر سکتے تھے۔ آپ کو اس وقت اُن کی مطلق پروا نہیں ہے کہ اس کے بعد ان پر کیا گذرے گی۔ اُن کی حالت اس کے بعد نہایت مفلس اور تنگدست یتیموں کی سی ہو جائے گی۔ انسان یا تو اولاد نہ رکھے۔ اور اگر رکھے تو اس کی تربیت اور پرورش کی تکلیف برداشت کرے۔ مجھے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ آپ جیسا بے پروا اور ناعاقبت اندیش دوسرا دنیا میں نہ نکلے گا۔ حالانکہ آپ کا مقصد اور ارادہ ایک فیاض طبیعت کا سا ہونا چاہیئے تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ آپ کی عمر کا کوئی دن ایسا نہیں تھا جس میں نیکی پہ عمل کرنے پر آپ نے فخر نہ کیا ہو۔ جناب والا۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں آپ کی اور آپ کے عزیزوں کی وجہ سے سخت محجوب و شرمندہ ہوں۔ کیونکہ دنیا یہی یقین کرے گی کہ یہ ہماری پست ہمتی اور بزدلی تھی کہ آپ قید خانے سے فرار نہ ہو سکے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ آپ پر الزام لگائیں گے کہ آپ نے خود اپنے اوپر مقدمہ

اپنی صفائی میں بیان دینے کو کیوں تیار ہو گئے؟ اور آخری بات جو سب سے زیادہ شرم اور ندامت کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا ہم سب پر لعنت کرے گی کہ خوف اور پست ہمتی کی وجہ سے ہم نے آپ سے پہلو تہی کی۔ اور آپ کو قید خانے سے نکلنے نہ دیا۔ لہذا جناب والا غور فرمائیں کہ اگر آپ نے خود اس مصیبت کو نہ روکا جو آنے والی ہے تو آپ کو اس ذلت اور شرمندگی سے حصہ لینا ہوگا جو ہم سب کو اُٹھانی پڑے گی۔ پس جناب جلد اس بات پر غور فرمائیں اور میرا خیال ہے کہ آپ کے سمجھانے کے لئے وقت اب بہت تنگ ہے۔ اب زیادہ سوچ بچار کا وقت نہیں ہے۔ جو کچھ کرنا ہے جلد کیا جائے۔

سقراط:۔ میرے نہایت عزیز قریطو۔ تمھارا یہ نیک ارادہ نہایت قابل تعریف اس وقت ہوتا جب کہ وہ عقل کے مطابق ہوتا۔ لیکن اگر عقل سے اُس نے تجاوز کیا ہے تو میرا تمھارا قصد جس قدر قوی ہے اُسی قدر قابل الزام ٹھیرتا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ سے میرا یہی طریقہ رہا ہے کہ بہت غور و خوض کے بعد جو کچھ عقل مجھے بتاتی ہے اس کا پابند ہوا کرتا ہوں۔ گو اس وقت تقدیر مجھے غضب کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے لیکن میں کبھی اپنے اصول سے جس پر میرا ہمیشہ عمل رہا ہے تجاوز نہ کروں گا۔ یہ اصول ہمیشہ ایک ہی سے رہتے ہیں۔ اور میں ہمیشہ ایک ہی طریقہ پر ان کا پابند رہا ہوں۔ پس جو کچھ تم کہتے ہو اگر اس کے لئے قوی سے قوی دلیل تمھارے پاس موجود نہیں ہے تو یقین مانو کہ میں کبھی تمھارا کہنا نہ کروں گا۔ اس میں چاہے عوام الناس کی کل مجموعی قوت بھی میرے خلاف اپنا عمل کرے یا نہ کرے۔ یا وہ مجھے ایک بچے کی طرح ڈراوے اور دھمکاوے دے۔ اور میری ان ہتھکڑیوں اور بیڑیوں پر اور زیادہ اضافہ کرے۔ اور مجھے اس بات کا ڈراوا دے کہ زیادہ سے زیادہ بھلائی کرنے سے وہ مجھے روک دیں گے۔ اور زیادہ سے زیادہ اذیت کے طریقوں سے جان نکالنے پر وہ مجھے مجبور کریں گے۔

قریطو:۔ تو پھر ہم اس مسئلے کو کس طرح انصاف اور راستی کے ساتھ حل کر سکتے ہیں؟

سقراط:۔ یقینی بہتر سے بہتر طریقہ یہ ہوگا۔ کہ جو کچھ جمہور کی رائے تم نے بیان کی ہے اس پر پھر غور کیا جائے۔ اور دیکھیں کہ اُن میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن کے کہنے کا خیال کیا جائے۔ اور کتنے ایسے ہیں جن کے کہنے کی مطلق پروا نہ کی جائے۔ اور سمجھا جائے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں محض نادان بچوں کی سی باتیں ہیں۔ اس موقع پر میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تمھارے سامنے میں جو کچھ تم کہتے ہو، اس کے ماننے نہ ماننے کو اس تعلق سے تحقیق کروں کہ جو اصول میرا ہے وہ اسی شکل و صورت میں ہے جو موجودہ حالت سے پہلے میں رکھتا تھا۔ یا اس میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ کہ تمھاری بات ماننے یا نہ ماننے کے لئے وہ ہمیشہ ایک ہی سا رہا ہے۔

اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ امر یقینی ہے کہ بعض لوگ جو اپنے کو صاحب عقل سمجھتے ہیں اُن کا مقولہ ہے کہ لوگوں کی جتنی رائیں ہوتی ہیں اُن میں بعض قابل توجہ ہوتی ہیں اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن کا مطلق خیال نہ کرنا چاہئے۔ قریطو! میں تمہیں تمام بتوں کی قسم دلاکر پوچھتا ہوں کہ کیا تمھارے نزدیک یہ قول معقول نہیں ہے۔ جہاں تک حالات ظاہر کرتے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ کل جو جان سے مارا جائے گا وہ تم نہ ہوگے۔ اور یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت کا خوف تم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ بس۔ اس بات پہ اچھی طرح غور کرلو۔ کیا تم یہ خیال نہیں کرتے کہ جن لوگوں کا قول ہے کہ تمام آدمیوں کی رایوں کا لحاظ ہمیشہ نہ کرنا چاہئے، اُن کا یہ کہنا انصاف پر مبنی نہ تھا۔ اس بارے میں تمھارا کیا کہنا ہے؟ کیا تم اس قول کو صحیح اور درست نہیں سمجھتے؟

قریطو:۔ بات بالکل سچی ہے۔

سقراط:۔ تو پھر ہمارا فرض بہر کیف یہ ہے کہ اچھی رایوں کی ہم قدر کریں۔ اور ناقص رایوں کی پرواہ نہ کریں۔

قریطو:۔ بلا شبہ بات صحیح یہی ہے۔

سقراط:۔ تو کیا اچھی رائیں عاقلوں کی اور بری رائیں احمقوں کی نہیں ہوتیں؟

قریطو:۔ بالکل بجا ہے۔ بجز اس کے دوسری بات نہیں۔

سقراط:۔ اچھا۔ آؤ۔ دیکھیں تم اس کا کیا جواب دیتے ہو؟ ایک آدمی جو سبق کے وقت ورزش کرنے لگے تو اس کی اس حرکت کے متعلق جو شخص پہلے اس کے سامنے آئے اُس کی رائے کا خیال کیا جائے یا اس شخص کی رائے کا جو طبیب ہو یا استاد؟

قریطو:۔ بلا شبہ اُستاد کی رائے کا خیال کرنا چاہئے۔

سقراط:۔ پس لا محالہ اُسے ایک ہی شخص کے اعتراض سے خوف یا اس کی تعریف کی قدر کرنی چاہئے۔ اور دوسرے جو کچھ

کہیں اس کی پرواہ نہ ہونی چاہیئے۔

قریطو:۔ بلاشک۔

سقراط:۔ پس اسی وجہ سے اس نوجوان آدمی کو تاوقتیکہ استاد اجازت نہ دے نہ کچھ کھانا چاہیئے نہ پینا یا کوئی اور کام کرنا۔ یہ استاد صاحب عقل ہے۔ اور اس نوجوان کو دوسروں کی باتوں کی مطلق پرواہ نہ ہونی چاہیئے۔

قریطو:۔ بالکل بجا اور درست فرمایا۔

سقراط:۔ اچھا۔ یہاں تک جو کچھ میں نے کہا تم نے تسلیم کیا لیکن فرض کرو کہ وہ نوجوان اپنے استاد کا کہنا نہیں مانتا۔ اور نہ وہ استاد کے اعتراض یا تعریف کا کچھ خیال کرتا ہے۔ کم عقل جاہلوں کے گروہ کی خوشامد اور تعریف کا بالکل اندھا بن کر خیال کرتا ہے تو کیا اس وجہ سے کسی نہ کسی دن وہ سخت نقصان نہ اُٹھائے گا؟

قریطو:۔ بجز نقصان کے دوسری بات کیا ہو سکتی ہے۔

سقراط:۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ نقصان کس قسم کا ہوگا، جو اس نوجوان کو پہنچے گا۔ اور اس نوجوان کے کس حصے کو تکلیف پہنچائے گا؟

قریطو:۔ یقینی اس کے جسم کو کوئی تکلیف پہنچے گی۔ اور اس طرح وہ نوجوان اپنے تئیں غارت وتباہ کرے گا۔

سقراط:۔ بہت درست۔ تو کیا اس مقدمہ میں بھی وہی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ یعنی یہ کہ انصاف یا عدم انصاف۔ دیانت، یا عدم دیانت کے معاملات میں جو اس وقت ہماری بحث کا موضوع ہیں ہمیں عوام الناس کی رائے کا پاس و لحاظ کرنا درست ہوگا یا بہ نظر انصاف اس عاقل اور تجربہ کار شخص کی رائے کا جو ہم سے باقی دنیا کے مقابلہ میں سب سے زیادہ عزت اور تکریم کا مستحق ہے اگر ہم اس عاقل اور تجربہ کار شخص کی رائے کا لحاظ نہ کریں گے تو پھر یقیناً اپنے تئیں تباہ و برباد کرلیں گے۔ اور وہ چیز جو حقیقت میں زندہ ہے اور عدل و انصاف سے قوت حاصل کرتی ہے۔ یا بے انصافی سے غارت اور فنا ہوجاتی ہے، ہاتھ سے کھو دیں گے یا پھر ہم ان باتوں کو کچھ سمجھیں ہی نہیں۔

قریطو:۔ میں جناب کی رائے سے متفق ہوں۔

سقراط:۔ پس میں التجا کرتا ہوں کہ جاہلوں کی بات کو ماننے سے پرہیز کرو۔ جاہلوں کی بات ماننے میں ہم اس چیز کو غارت کردیتے ہیں جو تندرستی سے قائم ہوتی ہے اور بیماری سے زائل ہوجاتی ہے۔ کیا تم اس خرابی کے بعد خواہ اس میں ہمارا جسم ہو یا کوئی اور چیز ہو زندہ رہ سکتے ہیں؟

قریطو:۔ بجا ہے۔ یہ بات بالکل یقینی ہے۔

سقراط:۔ تو کیا اس خرابی اور جسم کے غارت ہوجانے کے بعد کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟

قریطو:۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

سقراط:۔ لیکن جو چیز صرف انصاف کی بنا پر قائم ہے وہ خرابی کے بعد بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ لیکن بے انصافی سے وہ فنا ہوجاتی ہے۔ تو پھر کیا وہ چیز (جو کچھ بھی وہ ہو) جس کی غرض وغایت انصاف یا بے انصافی ہو اس کی قدر جسم سے کم ہونی چاہیئے؟

قریطو:۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

سقراط:۔ تو کیا وہ چیز زیادہ قدر کے قابل ہے؟

قریطو:۔ بلاشبہ وہ چیز زیادہ قدر کے قابل ہے۔

سقراط:۔ تو پھر پیارے قریطو جو کچھ عوام کہیں تمھیں اس کا کچھ خیال نہ ہونا چاہیئے۔ خیال صرف اس شخص کی رائے کا ہونا چاہیئے جو جانتا ہے کہ انصاف کیا چیز ہے۔ اور عدم انصاف کیا ہے۔ اور حق وہی ہے جو کچھ وہ کہے۔ پس تم دیکھتے ہو کہ تم نے غلط اصول اس بارے میں قائم کئے تھے کہ عوام کی رائے میں کونسی بات انصاف کی ہے اور کونسی بات نیکی اور دیانت داری کی۔ اور کونسی باتیں ان کے متضاد ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس پر معترض ہوں کہ عوام کے اختیار میں انسان کی موت وزیست کیوں رکھی گئی ہے۔

قریطو:۔ اس اعتراض کا پیدا ہونا یقینی ہے۔

سقراط:۔ یہ اعتراض صحیح تو ہوگا۔ لیکن اس کے متعلق جو کچھ ہم نے ابھی تک کہا ہے اس میں فرق پیدا نہیں ہوتا۔ وہ بجائے خود قائم ہے کیونکہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ زندگی ہی نہیں۔ بلکہ نیک زندگی وہ چیز ہے جس کی آرزو رکھنی چاہیئے۔

قریطو:۔ یہ بالکل سچ ہے۔

سقراط:۔ لیکن یہ بھی یقینی نہیں ہے کہ نیک زندگی کے لئے انصاف اور دیانت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

قریطو:۔ بالکل درست ہے۔

سقراط:۔ اچھا۔ اس بحث میں آگے کچھ کہنے سے پہلے مناسب ہے کہ جن اصول پر ہم متفق ہوگئے ہیں، اُن کو جانچیں اور معلوم کریں کہ بغیر اہل ایتھنز کی اجازت کے میرا یہاں سے چلا جانا قرین انصاف

ہوگا یا بے انصافی پر دلالت کرے گا۔ اگر معلوم ہوا کہ قرین انصاف ہے تو پھر اس کے لئے جہاں تک امکان میں ہو کوشش کرنی چاہئے لیکن اگر وہ انصاف کے خلاف ہوا تو پھر یہاں سے نکل جانے کی تدبیر سے کنارہ کرنا درست ہوگا۔ اور جو غور طلب امور تم نے ابھی بیان کئے تھے یعنی روپیہ۔ بدنامی۔ اولاد اور خاندان کی تباہی یہ کل امور کالعدم ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ادنیٰ اور ذلیل عوام کے خیالات سمجھے جا سکتے ہیں جن کا کام بے گناہوں کو جان سے مارنا ہوتا ہے۔ اور کچھ دنوں اور اُن مردوں کو زندہ کرنے کی آرزو ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں اپنے خیالات کو دوسری طرف رجوع کرنے ہیں یہ دیکھنا ہے کہ روپیہ جو ہم اپنی فراری میں مدد حاصل کرنے کے لئے کسی کو دے کر اُس کے زیر بار احسان ہوتے ہیں تو اس میں ہم کوئی بات ایسی تو نہیں کرتے جو انصاف کے خلاف نکلے۔ اگر ایسا کرنا خلاف انصاف ہے تو پھر اس بات کو بحث سے خارج کر دینا چاہئے اور ہمیں صبر و شکر کے ساتھ جینا اور مرنا چاہئے۔ بجائے اس کے کہ اس سے بھی کوئی بدتر طریقہ موت کا اپنے لئے تجویز کرائیں۔

قریطو:۔ سقراط! آپ بجا فرماتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بحث میں آگے کیا آتا ہے۔

سقراط:۔ اب ہم دونوں اس بحث کو شروع کرتے ہیں۔ اگر اس میں کسی سوال کا آپ کو جواب طلب کرنا ہو تو جو کچھ مجھے کہنا ہے اس کو سننے کے بعد آپ مجھ سے دریافت کریں کہ میں جواب سے آپکا اطمینان کروں۔ اگر ایسا ہو تو پھر مہربانی کر کے آپ اس بات پر اصرار نہ کریں کہ میں بغیر اہل ایتھنز کی اجازت کے یہاں سے فرار ہو جاؤں اگر آپ نے واقعی مجھے فراری کی ترغیب دے دی تو میں بہت خوش ہوں گا۔ لیکن تاوقتیکہ آپ اس کی صحت کا یقین نہ دلا دیں گے میں ہرگز اس طرف راغب نہ ہوں گا۔ پس آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ میرے طرز استدلال سے آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو آپ میرے سوالات کا جواب دینے میں کوشش کریں۔

قریطو:۔ میں ایسی ہی کوشش کروں گا۔

سقراط:۔ کیا یہ بات حق ہے کہ ہم کسی انسان کے ساتھ بے انصافی نہ کریں؟ کیا یہ قانون کے مطابق ہوگا کہ ایک شخص کے ساتھ بے انصافی کرنا تو جائز ہوگا اور دوسرے کے ساتھ بے انصافی کرنے کی ممانعت ہوگی؟ اور کیا یہ بات بالکل صحیح نہیں ہے کہ کسی طرح کی بے انصافی بھی نہ نیکی ہے نہ دیانت داری جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں؟ یا وہ خیالات جو ہم پہلے رکھتے تھے چند روز میں بالکل غائب ہو گئے۔ اور کیا یہ ممکن ہے کہ برسوں تک جو متین تقریریں ہم کرتے رہے ہیں وہ اب بچوں کی باتیں سمجھی جائیں۔ اور ہم اس بات کو محسوس تک نہ کریں؟ کیا جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اُس پر قائم رہنا ضروری نہیں ہے؟ اور جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ بھی حق بات ہے کہ ہر قسم کی بے انصافی اس کے لئے جو اس کا مرتکب ہو سخت بدنامی بلکہ مہلک ہوا کرتی ہے۔ لوگوں کا جو جی چاہے وہ کہیں۔ لیکن ہماری تقدیر نہ ایسی اچھی ہے۔ نہ کبھی ہوئی۔

قریطو:۔ یہ بالکل یقینی ہے۔

سقراط:۔ تو پھر ہمیں قلیل سے قلیل بے انصافی سے بھی بچنا چاہئے۔

قریطو:۔ یقیناً۔

سقراط:۔ چونکہ قلیل سے قلیل بے انصافی کرنے سے ہمیں بچنا چاہئے اس لئے اُن کے ساتھ بھی ہمیں بے انصافی نہ کرنی چاہئے جو انصاف نہیں کرتے۔ باوجود اس کے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اُسے لوگ قرین انصاف سمجھتے ہیں

قریطو:۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

سقراط:۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں کوئی بُرائی کرنی چاہئے۔ یا نہیں؟

قریطو:۔ بے شک۔ کوئی بُرائی نہ کرنی چاہئے۔

سقراط:۔ تو کیا انصاف ہوگا کہ بُرائی کے بدلے جیسا کہ عوام کا خیال ہے بُرائی کی جائے۔ یا ایسا کرنا خلاف انصاف ہے؟

قریطو:۔ یہ بات ہرگز انصاف کی نہ ہوگی۔

سقراط:۔ تو پھر سمجھنا چاہئے کہ کسی خلاف انصاف بات اور بُرائی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قریطو:۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں۔

سقراط:۔ تو پھر ہم کو کم سے کم بُرائی یا بے انصافی کسی انسان کے ساتھ بھی نہ کرنی چاہئے۔ لیکن وہ جو جی چاہے ہمارے ساتھ کرے۔ مگر قریطو اس بات کی احتیاط رکھو کہ اس رعایت میں تم کوئی بات اپنے خیالات کے خلاف تو نہیں کرتے ہو۔ میں خوب جانتا ہوں کہ بہت کم لوگ اس حد تک اس معاملے کو سوچیں گے۔ اور اس مسئلے میں جو لوگ مختلف خیالات رکھتے ہیں ان کے لئے متفق الرائے ہونا غیر ممکن ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ایک کا دوسرے کی رائے کی تحقیر

کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے جسم کو بھی حقارت سے دیکھتا ہے۔ بس اس بات کو سوچ لو کہ اگر تم میری رائے سے اتفاق کرتے ہو تو ہمیں اس اصول پر اپنے دلائل کو قائم کرنا چاہیئے کہ برائی کے بدلے ہم کبھی برائی نہ کریں۔ اور نہ اُن لوگوں کے ساتھ بے انصافی سے پیش آئیں جنھوں نے ہمارے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ میں خود کسی دوسرے اصول کا پابند نہ ہوں گا۔ اب بتاؤ کہ تم نے اپنا خیال بدل دیا یا نہیں۔ اگر نہ بدلا ہو تو جو کچھ میں کہتا ہوں اُسے سُنو۔

قریطو:۔ فرمایئے۔ میں سنتا ہوں۔

سقراط:۔ اگر کسی شخص نے کوئی نیک وعدہ کیا ہے تو اس وعدے کا ایفا اس پر لازمی ہے۔ یا وعدہ خلافی ؟

قریطو:۔ نہیں۔ اُسے اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیئے۔

سقراط:۔ اگر میں یہاں سے اہل ایتھنز کی مرضی کے بغیر چلا گیا تو میں چند لوگوں کو نقصان پہنچاؤں گا۔ اور یہ لوگ ایسے ہوں گے جو نقصان اُٹھانے کے مستوجب نہ ہوں گے۔ تو کیا ہم ایسی صورت میں اس اصول کے پابند رہ سکیں گے کہ ہر شخص کے ساتھ انصاف کرنا چاہیئے ؟

قریطو:۔ میں اس کا کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔

سقراط:۔ ذرا مہربانی کر کے سمجھو کہ اگر ہم نے یہاں سے بھاگنے یا چلے جانے کی (جو کچھ بھی تم اسے کہو) تیاری کی اور فرض کرو کہ قانون اور جمہور سب مل کر ہمارے مقابلے پر آئے اور وہ کہنے لگیں "سقراط۔ تم یہ کیا کرتے ہو۔ جو کچھ تم نے اس وقت سوچا ہے اگر اس پر تمھارا عمل ہوا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم قطعی طور پر ریاست اور ریاست کے قوانین کو مٹاتے ہو۔ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ کوئی شہر جہاں سے قانون کی طاقت زائل ہو چکی ہے یا وہاں کے غیر سرکاری لوگ اس قانون کو جس طرح چاہیں مروڑ تروڑ سکتے ہیں اور اسے پامال کر سکتے ہیں تو کیا وہ شہر قائم اور سلامت رہ سکتا ہے" قریطو بتاؤ کہ اس سوال کا یا ایسے ہی اور سوالوں کا ہم کیا جواب دے سکتے ہیں ؟ قانون جس کے بموجب کوئی حکم نافذ ہو چکا ہے اُسے توڑا جائے تو کوئی خطیب اس کے لئے کیا عذر پیش کر سکتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ جمہوری حکومت نے فیصلہ غلط کیا ہے۔ اور حکومت نے ہم پر یہ غیر منصفانہ حکم سزا جاری کیا ہے

قریطو:۔ بلاشبہ یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سقراط:۔ اچھا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ قوانین اس عذر کے متعلق کیا کہیں گے۔ وہ کہیں گے کہ "سقراط کیا یہ بات صحیح نہیں ہے کہ تم ہم سے اس امر میں متفق ہوئے کہ تمھارا مقدمہ سب کے سامنے کیا جائے"؟ اگر ہم نے ان کے اس جواب پر حیرت بھی ظاہر کی تو وہ کہیں گے "سقراط۔ حیرت نہ کرو۔ بلکہ ہماری بات کا جواب دو۔ کیونکہ تم تو خود سوال جواب۔ جرح و استدلال میں اُستاد ہو۔ پھر بتاؤ کہ جمہوری حکومت سے یا ہم سے تمھیں شکایت کرنے کا کیا موقع رہتا ہے کہ تم اس قدر شوق سے اس حکومت کو تباہ کرنے کے درپے ہوتے ہو۔ کیا تمھارے دنیا میں آنے کا باعث ہم نہیں ہوئے ؟ یہ ہم تھے جن کی اجازت سے تمھارے باپ نے اُس عورت سے شادی کی جس سے تم پیدا ہوئے۔ شادی کے متعلق جو قوانین جاری ہیں اُن میں تم ہمارا کیا قصور بتا سکتے ہو ؟" میں اس کا یہی جواب دوں گا کہ میں ان میں ان کا کوئی قصور نہیں بتا سکتا۔ پھر وہ پوچھیں گے کہ بچوں کے کھانے پینے اور اُن کی پرورش یا تمھاری تعلیم کے لئے جو قواعد ہیں یہ قواعد اور قوانین انصاف پر مبنی نہیں ہیں ؟ جب کہ ہم نے انھیں وضع کیا ہے۔ اور جن سے کہ ہم نے تمھارے باپ پر یہ احسان کیا کہ وہ تمھیں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم اور جسمانی تربیت دے سکے" میں اس کا یہی جواب دوں گا کہ وہ قواعد نہایت انصاف کے تھے۔ پھر وہ کہیں گے۔ جب کہ تم ہمارے زیر اثر پیدا ہوئے۔ پرورش۔ تعلیم و تربیت پائی تو کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تم ہمارے پالے پوسے بچے نہیں ہو؟ اور تم پر ہماری اطاعت ایسی ہی واجب ہے جیسے کہ اپنے باپ کی فرمانبرداری ہے۔ لیکن اگر تم اپنے خیال میں وہی اختیارات رکھتے ہو جو ہم رکھتے ہیں۔ تو پھر تم ہمارے حکم کو کیسے ٹال سکتے ہو ؟ چونکہ تم اپنے باپ یا استاد کے مقابلہ میں اس قسم کا اختیار نہیں رکھتے کہ برائی کا بدلہ برائی سے اور نقصان کا بدلہ نقصان سے کرو تو پھر تم کیسے اپنے ملک اور قوانین کے خلاف کسی اختیار رکھنے کے مستحق ہو سکتے ہو ؟ اور یہ اختیار بھی اس درجہ کا کہ جب ہم تمھیں مار ڈالنے کی کوشش کریں تو تم ہمارے مزاحم ہو کر اپنے ملک اور اپنے قوانین کو تباہ کرو۔ کیا تم اپنے اس فعل کو انصاف کہہ سکتے ہو ؟ بالخصوص تم جو ہمیشہ نیکی کا وعظ کہتے رہتے ہو۔ اور نیکی کے پابند بھی ہو۔ کیا تم اس بات سے لاعلم ہو کہ تمھارا یہ ملک بڑی عزت والا ہے۔ خدا، انسان تمھارے والدین اور تمھارے عزیزوں کی نظر میں نہایت واجب التعظیم

ہے۔ یہ بات کہ تمھیں اپنے ملک کی عزت کرنی چاہیئے اُس کی اطاعت
کو بھی تم پر لازم کر دیتی ہے۔ اور تمہارا فرض ہوتا ہے کہ ماں باپ
سے جو غصّے میں ہو اس کی عزت زیادہ کرو۔ یا تو تم اپنے نیک
مشوروں سے اُسے اپنا بناؤ۔ یا اُس کے حکموں کو مانو۔ اور بغیر
شکایت کے جو سزا وہ تمھیں دے اُسے بھگتو۔ اگر وہ حکم دے کہ
تمھیں تازیانے لگائے جائیں۔ یا تمھیں لڑائیوں پر جاکر مرجانا چاہیئے،
یا وہ تمھیں لڑائی پر روانہ کرے کہ وہاں تم اپنا خون بہاؤ تو بغیر چون
وچرا کے تمھیں وہی کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں چاہیئے کہ جُوا اپنی گردن سے
اُتار پھینکو۔ یا تذبذب وتامل کرو۔ یا اپنی جگہ سے ٹل جاؤ۔ غرض چاہے
لشکر میں ہو۔ چاہے قیدخانے میں یا کہیں اور تمھیں ہر حال میں اپنے
ملک کے قواعد وقوانین کی پابندی کرنی یا اپنے صلاح ومشورے
سے ملک کی مدد کرنی ضروری ہے۔ کیونکہ اگر ماں باپ کی نافرمانی
کوئی جرم ہے تو پھر اپنے ملک پر ناواجب طریقے سے دباؤ ڈالنا اس
سے بھی بدتر جرم ہے۔" قریطو۔ تم ہی بتاؤ کہ ان باتوں کا جواب ہم
کیا دے سکتے ہیں؟ کیا ہم وضع شدہ قوانین کی صحت وسچائی کو
تسلیم نہ کریں؟

قریطو:۔ اُنھیں ہم کیسے نظر انداز کرسکتے ہیں؟

سقراط:۔ اچھا پھر وہ ہم سے کہیں گے کہ " سقراط۔ تم دیکھتے ہو
کہ وہ کیا وجہ ہے جس سے ہم تمھاری یہاں سے فرار ہونے کی کوشش
کو انصاف کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور باوجود اس کے ہم اطاعت کے لئے
کوئی سختی یا تشدد اختیار نہیں کرتے۔ ہر شخص کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے
ہیں کہ یا تو وہ اپنے مشوروں اور التجاؤں سے ہمیں اپنا بنائے یا ہمارے
احکام کو بجالائے۔ لیکن وہ یہ کرتا ہے نہ وہ۔ سقراط ہم سمجھتے ہیں کہ
جو کچھ قصد تم نے اس وقت کیا ہے اگر اس پر تمھارا عمل بھی ہوا۔ تو
پھر تم پر یہ الزام بہ نسبت ایک عام آدمی کے جو ایسی بے انصافی کا
مرتکب پایا گیا ہو زیادہ سختی اور شدت سے عائد کئے جاسکتے ہیں"۔
اگر میں نے اس کی وجہ پوچھی تو بلا شبہ یہ کہہ کر وہ میرا منہ بند کردیں
گے کہ " سقراط۔ تم نے قطعی طور پر ان کل شرائط کو تسلیم کیا تھا" اور
وہ یہ بھی کہیں گے کہ" ہمارے پاس کافی ثبوت اس بات کا موجود
ہے کہ تم ہم سے اور حکومت جمہور سے ہمیشہ خوش رہے کیونکہ
اگر یہ شہر دوسرے شہروں کے مقابلہ میں تمھاری طبیعت کے موافق
نہ ہوتا تو کبھی تم اور ایتھنزیوں کی طرح یہاں نہ رہتے۔ سیر تماشے
ہمیشہ ہوتے تھے۔ مگر تم شہر سے باہر نہ جاتے تھے۔ بجز ایک مرتبہ کے
کہ اسمس کے کھیلوں کو دیکھنے لگے تھے اور کبھی تم شہر سے باہر نہ
نکلے۔ اور لوگوں کی طرح تم نے بحری سفر بھی نہیں کیا۔ دوسرے
شہروں کے دیکھنے کا شوق کبھی تمھیں نہیں ہوا۔ اور نہ وہاں کے قوانین
کو معلوم کرنے کی آرزو ہوئی۔ کیونکہ تم ہم سب میں اور ہماری جمہوری
حکومت میں راضی خوشی رہتے تھے۔ علاوہ اس کے تمہارا صاحب
اولاد ہونا بھی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ تم اس شہر کو پسند کرتے
تھے۔ لیکن اگر اس اخیر موقع پر تمہیں جلاوطنی کا حکم دیا جاتا تو تم
حکومت کی اجازت سے وہی کرتے جو اب بغیر اس کی اجازت کے
تم کرنا چاہتے ہو۔ اگر تم ایسے عالی حوصلہ اور موت سے بے پرواہ
تھے کہ خود کہہ کر تم نے موت کو جلاوطنی پر ترجیح دی تو کیا اب
اپنے کہے کا بھی تمھیں مطلق لحاظ نہیں۔ اور تمھیں اپنے شہر کے قوانین
کا بھی کچھ خیال نہیں؟ کیونکہ تم نے اس کے قوانین کے برخلاف
کارروائی کرنی چاہی۔ تمھارا حال تو اس وقت ایک کمینے غلام کا سا
ہو رہا ہے کہ تم اپنے معاہدے کے خلاف جس پر تم خود دستخط کرچکے
ہو یہاں سے فرار ہونا چاہتے ہو۔ اس معاہدے سے تم شہر کے
قواعد وقوانین کی پابندی کے ساتھ یہاں رہنا منظور کرچکے ہو پس
مہربانی کرکے ہماری ان باتوں کا جواب دو"۔ کیا تمہارا یہ کہنا سچ
نہیں ہے کہ تم نے اس معاہدے کے مطابق یہاں آباد ہونا منظور نہیں
کیا تھا۔ بلکہ ہمارے قواعد وقوانین پر عمل رکھنا بھی منظور کیا تھا"۔ قریطو
اب تم ہی بتاؤ کہ ان باتوں کا کیا جواب دیا جاسکتا ہے؟ اور بجز اس
کے کیا چارہ ہوگا کہ ہم ان کی سب باتوں کو درست اور صحیح بتائیں

قریطو:۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟

سقراط:۔ پھر وہ یہ بھی پوچھیں گے کہ کیا تمھارا یہ فعل اس معاہدے
اور اس کی جملہ شرائط کے خلاف نہیں ہے جس پر بلا جبر یا محض اتفاقیہ
طور پر بغیر کافی وقت ملے تم نے اپنے دستخط کئے تھے۔ ستر برس کا
زمانہ تمھارے پاس تھا۔ یہ اتنی بڑی مدت تھی کہ اگر تم ہم سے ناراض
ہوتے یا ہمارے قوانین کے انصاف پہ مبنی ہونے کا یقین نہ رکھتے
تو ہم سے کبھی کے پھر جاتے۔ نہ تم نے لکدیمون کو پسند کیا۔ نہ اقریطش
کو جہاں کی حکومتوں کی سب تعریف کرتے ہیں۔ نہ تم نے یونان کے اور
شہروں میں سے کسی شہر کو یا غیر ملکوں میں سے کسی ملک کو اپنی سکونت
کے لئے پسند کیا۔ شاید لنگڑے اور اندھے بھی تم سے زیادہ اس
شہر سے باہر گئے ہوں گے۔ یہ کافی ثبوت ہے کہ تم اس شہر سے
خوش تھے۔ اگر اس شہر کے قوانین اچھے نہ ہوتے تو کون ایسا

کر سکتا تھا۔ اس پر بھی تم اپنے معاہدے سے پھرتے ہو۔ لیکن سقراط
اگر تم ہماری نصیحت مانو گے تو ہم یہی کہیں گے کہ اپنے معاہدے پر
قائم رہو۔ اور یہاں سے نکل کر اپنی ہنسی نہ اڑواؤ۔ اور مہربانی کرکے
اس بات پر بھی غور کرو کہ جو تدبیر سوچی ہے اُس پر عمل کرنے سے
تمھارا یا تمھارے دوستوں کا کیا نفع ہوگا۔ ضروری ہے کہ تمھارے
دوست یا تو اپنے تئیں سخت خطروں میں ڈالیں گے۔ یا وہ ملک بدر
کردئے جائیں گے۔ یا ان کی جائیدادیں ضبط سرکار ہوجائے گی۔
رہے تم تو اگر کسی پڑوس کے شہر میں جاکر آباد ہوگئے جیسے کہ تھیبز
اور میگارا کے شہر ہیں جہاں کی حکومتوں کے اچھا ہونے میں شبہ ہے
تو وہاں کے لوگ تمھیں دشمن سمجھیں گے۔ جو لوگ اپنے ملک سے محبت
رکھتے ہیں وہ تمھیں قوانین کا مخرب اور بگاڑنے والا کہیں گے۔ علاوہ
اس کے یہاں کے جن لوگوں نے تمھیں سزا دی ہے اُن کو بہت اچھا
سمجھنے لگیں گے۔ اور اُن کے دلوں میں ایسے لوگوں کی طرف سے
اچھے خیالات مضبوط ہوجائیں گے۔ اور جو حکم سزا تمھیں دیا گیا ہے
تمھیں اسے اچھا سمجھنے کی تحریک ہوگی۔ کیونکہ جو شخص قوانین کا مخرب
ہو اس کی نسبت جلد گمان ہوسکتا ہے کہ وہ نوجوانوں اور دیہات
کے لوگوں کو گمراہ کرنے والا ہے۔ تو پھر کیا آپ ان اچھی حکومت والے
شہروں سے۔ اور وہاں کے انصاف پسند لوگوں کے مجمعوں اور
مجلسوں سے اپنے کو علیحدہ رکھ سکیں گے۔ اگر آپ علیحدہ رہے
تو پھر وہاں آپ کے گذر اوقات کی کیا صورت ہوگی؟ کیا آپ
وہاں بھی اسی طرح وعظ و نصیحت اور عدل اور قوانین کی تعظیم
کرانے میں مصروف ہوں گے جیسے کہ آپ یہاں کیا کرتے تھے
ذرا خیال کیجئے کہ آپ کے یہی پند و نصائح ان کے کانوں کو کیسے
مضحکہ خیز معلوم ہوں گے۔ آپ کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہئے
یہ نہیں ہے کہ آپ ان اچھے شہروں کو چھوڑ کر تھسلی میں قریطو
کے دوستوں کے پاس جارہیں۔ لیکن وہاں کا نظم حکومت ناقص
ہے۔ اور وہاں اوباشی اور عیاشی بڑھی ہوئی ہے۔ اور کچھ عجب
نہیں کہ وہاں کے لوگ آپ سے پوچھیں کہ ایتھنز کے قید خانے
سے آپ کونسا بھیس بدل کر بھاگے تھے؟ کیا بدن کو چیتھڑے لگے تھے
یا کسی جانور کی کھال پہن رکھی تھی یا کوئی اور شکل یا بھیس بدل رکھا
تھا جیسے کہ اکثر فراری اختیار کیا کرتے ہیں؟ وہاں ہر شخص یہ کہنے
کو موجود ہوجائے گا کہ "یہ بڈھا جس کے پاس زندہ رہنے کو
بہت کم وقت باقی ہے وہ جیتے رہنے کا اتنا شائق ہے کہ نہایت
متبرک قوانین کو پامال کرکے اُن سے اپنی جان بچائی ہے۔ غرض
اس قسم کے لغو قصے اور کہانیاں تمہارے خلاف مشہور ہوکر تمھارا
موجب آزار ہوں گی۔ اور اگر تم نے اس کی شکایت کی تو اور
ہزاروں قصے گھڑ کر تمھیں ستائیں اور دق کریں گے جو تم جیسے
نیک آدمی کی نسبت کہنے ہرگز روا نہ ہوں گے۔ تمہارا کل وقت
اسی تکلیف اور ندامت میں کٹے گا۔ ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ سب لوگ
تم پر مہربان ہوجائیں مگر سب کا غلام اور زیر دست بننا پڑے گا
اس کے سوا اور کیا کرسکو گے۔ تھسلی میں رات دن ضیافتیں کھانی
پڑیں گی۔ اور لوگ سمجھیں گے کہ انھی ضیافتوں اور تکلفات کے لئے
تم اپنے شہر سے نکلے ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ عدل اور نیکی پر جو تقریریں
تم یہاں کیا کرتے تھے وہ کہاں جائیں گی؟ اس کے علاوہ اگر تم
اپنے بچوں کی خاطر جان بچانی چاہتے ہو تو وہاں تم اپنے بچوں کی
پرورش نہ کرسکو گے۔ اور بجز اس کے کہ وہاں تمہاری اولاد
غیر اور اجنبی سمجھی جائے اور کوئی خدمت تم اُس کی نہ کرسکو گے
اور اگر تم نے اپنے بچوں کو یہیں چھوڑا تو اگر یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری
عدم موجودگی میں تمھارے دوست ان کی غور پرداخت بہتر طریقہ
پر کرسکتے ہیں تو کیا تمھارے مرنے پر تمھارے دوست اُن سے
ویسے ہی خبر گیراں نہیں رہ سکتے جیسے کہ ایتھنز سے تمھاری عدم
موجودگی میں رہ سکتے ہیں۔ سقراط سمجھ لو کہ جو لوگ اپنے کو تمہارا
دوست کہتے ہیں وہ تمہاری اولاد کا خیال ہر حال میں ایک ہی طریقہ
پر رکھ سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سقراط۔ ہم جو دلائل پیش کرتے ہیں انھیں
مانو۔ یعنی اُن لوگوں کی نصیحت کو مانو جنھوں نے تمھیں پرورش کیا ہے
عدل و انصاف کے مقابلے میں نہ اولاد کو۔ نہ اپنی جان کو یا کسی اور
چیز کو جو تمھاری ہو تولو۔ اور اس وقت کا خیال ذہن میں رکھو جبکہ
پلوٹو کی عدالت میں حاضر کئے جاؤ گے۔ اور عدالت کے رکنوں
کے سامنے تمھیں اپنی صفائی کرنی ہوگی۔ دیکھو۔ کسی دھوکے فریب
میں نہ آجانا۔ اگر تم نے وہ کیا جو اس وقت سوچا ہے تو اس میں نہ
اپنے مقدمے کو سنوارو گے اور نہ اپنے فوق کی کوئی بھلائی کرو گے۔
اور تم نہ اس عالم میں نہ دوسرے عالم میں انصاف کو ترقی دو گے
اور نہ اُسے بزرگی اور تقدس حاصل کراؤ گے۔ لیکن اگر تم نے ہمت اور
بہادری سے جان دی تو پھر تمھاری موت کی وجہ قوانین نہیں بلکہ
انسان سمجھے جائیں گے۔ لیکن اگر تم قید خانے سے بھاگ گئے اور اس
بے عزتی سے اپنے دشمنوں کی بے انصافی کا جواب دیا کہ یک لخت

اپنے ایمان سے پھر گئے اور اپنے معاہدے کو توڑ دیا اور اتنے بے گناہوں کو یعنی اپنے کو۔ اپنے دوستوں کو اور ان کے ساتھ ہم سب کو بھی نقصان پہنچایا تو اس پر بھی جب تک تم زندہ ہو تو ملک کے قوانین اور نہ صرف ملک کے قوانین بلکہ اس کے مثل وہ قوانین بھی جو دوسرے عالم میں جاری اور ساری ہیں سب تمھارے دشمن ہو جائیں گے۔ اور جب تم دوسرے عالم میں پہنچو گے تو کوئی تمھارا خیر مقدم خوشی سے نہ کرے گا۔ کیونکہ وہاں علم ہوگا کہ تم نے دنیا کے قوانین کو توڑنا اور خراب کرنا چاہا تھا۔ پس جو نصیحت ہم تمھیں کرتے ہیں اُسے قریطو کی صلاح پر ترجیح دو۔"

اے میرے بہت پیارے قریطو۔ یہ باتیں جو میں نے ابھی کہی ہیں میں انھیں اس طرح سنتا ہوں جیسے سیبلی کے کاہن اپنے خیال میں جھانجوں اور بانسریوں کی آواز سنا کرتے ہیں یہ باتیں جو میں نے ابھی کہی ہیں میرے کانوں میں ایسی بسی ہیں کہ کوئی اور آواز وہ مجھے سننے نہیں دیتیں۔ اور اگر تم کچھ بات کرنی چاہو گے کہ میں اُن آوازوں کو نہ سن سکوں تو یہ بے کار ہوگا۔ لیکن اگر تمھیں اپنی کامیابی کی امید ہو تو میں تمھیں روکتا ہوں۔

قریطو:۔ میں اب کچھ نہیں کہہ سکتا۔

سقراط:۔ تو پھر خاموش رہو۔ ہمیں بڑی ہمت اور حوصلے سے اس کام کو انجام دینا چاہیئے۔ کیونکہ خدا مجھے بُلا رہا ہے۔ اور یہی راستہ وہ اپنے پاس پہنچنے کا بتا رہا ہے۔

محمد عنایت اللہ

طاقت

طاقت سے ثبات ہے خُدا کی سوگند
طاقت سے نجات ہے خدا کی سوگند
طاقت ہی حیاتِ دہر کا مبدء ہے
طاقت ہی حیات ہے خُدا کی سوگند

طاقت ہی سے ابتدا ہے۔ طاقت کی قسم
طاقت ہی پر انتہا ہے، طاقت کی قسم
طاقت ہی کے آگے سب کے سر جھکتے ہیں
طاقت ہی فقط خدا ہے، طاقت کی قسم

آزاد انصاری

*گلبانگِ حیات؛ زیرِ تدوین کا ایک ورق۔

نکات

لالے پڑے ہیں جان کے جینے کا اہتمام کر
جنمیں ہو کیفِ زندگی بہرِ خدا وہ کام کر

"طورِ حیات" سے اڑا "جذبۂ زیستین" کی آگ
جب کہیں جا کے نیتِ زندگیِ دوام کر

پہلے یہ سوچ دام کے توڑنے کی سکت بھی ہے
بعد کو دل میں خواہشِ دانۂ زیرِ دام کر

تجھکو تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہے کائنات
بات یہ راز کی نہیں اپنا خود احترام کر

حیف! سمجھ رہا ہے تو اپنی جھجک کو محتسب
"میکدۂ حیات" میں شوق سے مے بجام کر

"نقشِ نوی" نہیں ہے تو صفحۂ روزگار پر
مٹنے سے گر نہیں مفر مٹکے ہی اپنا نام کر

"بندۂ خواہشات" کو کہتا ہے کون "عبدِ حُر"
چاہیئے حریت اگر دل کو ابھی غلام کر

ہینن خنیپ سیالکوٹی

(بسلسلۂ گذشتہ)

سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی انچھر

پُرانے ہندی بولوں کی جگہ نئے اَن گھڑ بول۔ عربی، فارسی بولوں کی کاٹ چھانٹ کرتے کرتے اب ایک اور نئی اپج سُوجھی ہے اور نئے ڈھب پر روک ٹوک کی جا رہی ہے۔ یہ چٹکلا بھی سُن لیجئے، جسے ایک اچھے کے ساتھ ایک ہندو ہی نے سُنایا۔ وہ کہتے تھے "الہ آباد کے اسٹیشن پر سگرٹ سلگانے کے لئے اپنے پاس کے ایک پنڈت جی سے میں نے دیا سلائی کی ڈبیا مانگی۔ اُنہوں نے میرے مانگنے پر دیا سلائی دے تو دی، پر ساتھ ہی یہ بھی کہا آپ اِسے دیا سلائی نہیں کہتے۔ اس کہنے کو میں ہنسی سمجھا۔ اور ہنس کر پوچھا اچھا تو پھر اسے کیا کہتے ہیں؟ پنڈت جی نے میرے پوچھنے پر جو کچھ کہا میں اُسے نہ سمجھ سکا۔ پھر پوچھا تو وہی بول اُن کے مُنہ سے نکلا جسے میں نے آج تک کسی سے نہیں سُنا تھا۔ اب مجھے ہنسی سوجھی اور ان سے پوچھ پوچھ کر رٹنے لگا، جب کہیں یہ "دھومو شلاکا" دھیان پر چڑھا۔ پر اب بھی اس کے بولنے میں ٹھوکر سی لگتی ہے۔ اور اس کی بناوٹ پر ہنسی آتی ہے۔

"دیا" اور "سلائی" یہ دونوں ٹکڑے ہندی کے ہیں۔ اس لئے "دیا سلائی" یہ پورا بول ٹھیٹ ہندی کا ہوا۔ پھر کب سے یہ بولا جا رہا ہے۔ ایک آدھ نہیں، چھوٹے بڑے سب کے سب ہی اسے بولتے ہیں۔ ایسے جیتے جاگتے بول کو الگ کر کے اُس کی جگہ ایک بھدیلے اور بے ڈول بول کو دینا نری ہٹ دھرمی ہے۔

مالوی جی کا ایڈریس۔ پنڈت مدن مالویہ نے کئی برس اُدھر الہ آباد یونیورسٹی کے کانوکیشن میں جو ایڈریس پڑھا وہ پورا سنسکرت ملی ہوئی ہندی میں تھا۔ جب اُنہیں کوئی ہندی بول نہیں ملتا تھا تو اُسے انگریزی میں کہنے لگتے تھے اور سنسکرت کے وہ کٹھے اور وہ بول جن کی ایڈریس میں بھرمار تھی انہیں بھی انگریزی میں سمجھایا جا رہا تھا۔ پنڈت جی کا یہ ڈھچر دیکھکر کسی نے چلا کے کہا آپ کی یہ بولی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ تو جب کہیں یہ چَونکے پر چَونکنے پر بھی ایڈریس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہی رہا۔ پنڈت جی جیسے سنسکرت اور انگریزی اچھی جانتے ہیں ایسے ہی اُردو بھی۔ کئی برس پہلے اُردو میں ان کی اسپیچیں جن لوگوں نے سُنی ہیں وہ اُنہیں اُردو کا اچھا اسپیکر سمجھتے ہیں۔ یہ، آج کل دیس میں جو کیچڑ اُچھل رہی ہے یہ بھی انہیں کیچڑ اُچھالنے والوں میں جا کے مل گئے۔ جب ایسے ایسے پرانے لوگ اوروں کی دیکھا دیکھی ایسی ہولی کھیلنے لگیں تو پھر نئے جو بھی کچھ نہ کریں بہت تھوڑا ہے۔

مسٹر بوس کی اسپیچ۔ یہ دیکھکر جب مسٹر سوبھاش چندر بوس کی اس اسپیچ کو دیکھتے ہیں جو اُنہوں نے کانگریس کے پریسیڈنٹ ہونے سے پہلے انگلستان میں سینکڑوں ہندو مسلمانوں اور سکھوں کے سامنے پورب اور پچھم کے ال بل پر اُردو میں پڑھی تو اس پر بڑا اچنبا ہوتا ہے۔ بڑے بڑے لوگ سنسکرت ملی ہوئی ہندی کی بھرمار کو جب بڑی بات سمجھ رہے ہوں، ایسی گھڑی میں مسٹر بوس کا سیدھی سادی اُردو میں اسپیچ دینا بڑی بات ہے۔ پر۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہ آسکی، یہی مسٹر بوس پریسیڈنٹ ہو چکنے پر پھر یہ یہ نہ رہے اور نجانے کیا ہو کے رہ گئے۔ ان کی اسپیچ کا یہ ٹکڑا دیکھئے :۔

"ہندی اور اُردو کے درمیان جو فرق بتایا جاتا ہے وہ اصلی نہیں ہے۔ مصنوعی اور بناوٹی ہے۔ ہماری مشترکہ قومی زبان وہی ہے جو مُلک کے ایک وسیع حصّے میں عموماً بولی جاتی ہے چاہے اُسے اُردو رسم خط میں لکھا جائے یا دیوناگری میں۔"

پھر انہی کا وہ ایڈریس جو کانگریس کے پنڈال میں پریسیڈنٹ بن کر یہ پڑھ چکے ہیں، اُٹھا لیجئے اس کا ایک ایک بول اسی گنگا جمنی ڈھچر کا دکھائی دے گا جس پر نئی ہندی بنانے والے مٹے ہوتے ہیں۔ ایک یہی نہیں اور بہت سے ہندو جو اُردو اچھی لکھ پڑھ سکتے ہیں وہ جان بوجھ کر کھلے ملے بولوں کو چھوڑ کے رکچھا، آشا، دشا، ویاکرن، سمپتی کی مالا جپنے کے لئے کہاں سے کہاں نکل گئے ہیں۔ ہندوؤں کی یہ ملی بھگت بھی دیکھنے کی ہے۔ ہمارے تارا چند جی اچھی اُردو لکھ لیتے تھے۔ پر اب کیا ڈھنگ ہے اس کے لئے جنوری ۴۳ء کا "اُردو" اُٹھا لیجئے۔ ہندوستانی اکیڈیمی کی برس پیچھے کمیٹی کی اور بہت سی باتوں کے ساتھ اسی "اُردو" میں لکھا ہے :۔

تاراچندجی کی گنگا جمنی اُردو۔ "ڈیڑھ بجے ڈاکٹر تاراچند معتمد ادارۂ ہٰذا نے اپنا مضمون سُنانا شروع کیا، اور اگرچہ یہ عام خیال تھا کہ یہ مضمون غالباً ان تمام کاموں کی جو انجمن نے سال گذشتہ انجام دیتے ہیں ایک تفصیلی رپورٹ ہوگی۔ مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ جب معتمد صاحب نے بھی اپنے پیش روؤں کی آواز میں آواز ملاکر وہی راگ الاپنا شروع کیا کہ مُلک کے لئے ایک قومی زبان کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے اُردو اور ہندی کی آمیزش سے ایک نئی زبان بنائی جائے اور اُن کا مضمون یقیناً اِس ہندوستانی کا جو اُن کے پیش نظر تھی نہایت عمدہ نمونہ تھا۔ چنانچہ قابل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اس امر کا التزام کیا تھا کہ اگر ایک جملہ فارسی الفاظ اور فارسی ترکیب کا گراں بار احسان ہو تو دوسرا سنسکرت کے سرچشمے سے سیراب کیا گیا ہو۔ عجب مضحکہ خیز منظر تھا۔ چنانچہ جب معتمد صاحب کا مضمون ختم ہوجانے کے بعد جلسہ برخاست ہوا تو پنڈت کشن پرشاد کول اور دیگر حضرات ڈاکٹر تاراچند صاحب سے یہ دریافت کرتے ہوئے سُنے گئے کہ جناب والا آخر یہ مضمون کونسی زبان میں لکھا تھا۔ آیا "تاراچندی" میں یا گنگا جمنی میں۔ اور اِس سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب موصوف مُسکرا کر خاموش ہوجاتے تھے ۔"

اُردو پر پنڈت نہرو کی لکھت۔ پنڈت جواہر لال نہرو اسی اُردو، ہندی کے جھگڑے پر جو کچھ لکھ چکے ہیں اُسے کیسے کوئی سچ مانے اور ٹھیک جانے۔ بات یہ ہے اس میں پنڈت جی نے سوچ بچار نہیں کیا۔ نہیں تو اُردو کو بڑی جگہوں کی بولی اور ہندی کو گاؤں کی بولی کبھی نہ لکھتے۔ آج کل جو نئی گنگا جمنی بولی بنائی جارہی ہے جسے ہندی کہا جاتا ہے، ایسی اَن گھڑ بولی دیس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی نہیں بولی جاتی۔ ہندی کے گول مول بول سے نجاننے والا تو دھوکا کھاسکتا ہے پر جاننے والا اِس جھانسے میں کبھی نہیں آسکتا۔ دیکھئے اِس گُر کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔ بُری بھلی جیسی بھی ہے اب اُردو ہی دیس بھاشا ہے۔ اسی کے پھیلانے اور اِسی کے آگے بڑھانے میں دیس کی بھلائی اور اچھائی چھپی ہوئی ہے۔

دیس کی کسی بولی سے مسلمانوں کو لاگ نہیں۔ اب رہیں دیس کی اور چھوٹی موٹی بولیاں تو اُن سے کوئی لاگ اور بَیر نہیں۔ یہ جینا چاہتی ہیں تو جئیں اور بڑھنا چاہتی ہیں تو بڑھیں اِن میں سے کسی کی روک ٹوک نہ چاہیئے۔ پر، دیس کی ایک ایسی بولی جو سب میں پھیل سکے وہ اکیلی اُردو ہی ہے جو دیس کا پورا پورا ساتھ دے سکتی اور اُس کا ہاتھ بٹا سکتی ہے یہی اب تک ملی جلی بولی سمجھی جاتی رہی اور ملی جلی بھاشا ہی کی جگہ جیسے یہ پہلے ڈٹی ہوئی تھی ویسے ہی اپنی اُسی جگہ اب بھی ڈٹی ہوئی ہے۔ اب رہی ہندی تو ہمیں نے اِسے پالا پوسا، بڑا کیا۔ ہمیں نے اُسے آگے بڑھایا اور پھیلایا۔ تو بھلا ہم اور اُس کی کاٹ کریں اور اس سے لاگ ڈانٹ رکھیں، یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔

یہاں آکے مسلمانوں نے کیا کیا۔ مسلمان جب یہاں آئے تو جگہ جگہ کی بولی ایسی الگ الگ تھی جسے دوسرا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ نہ پورے دیس کی کوئی ایک بولی تھی اور نہ کوئی ایک راج۔ پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ آنا جانا بھی بہت کٹھن تھا۔ اس لئے دیس کی چھوٹی چھوٹی سی بولیاں اپنی اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں اور اپنے الگ الگ ٹکڑوں ہی میں گھری ہوئی رہتی تھیں مسلمان یہاں فارسی بولتے ہوئے آئے۔ جب دِلّی ان کی راجدھانی بنی تو وہاں کی ایک بولی سے جو "کھڑی بولی" کہلاتی تھی فارسی کی مڈبھیڑ ہوئی۔ ہندو مسلمانوں میں جتنا میل ملاپ بڑھتا گیا اتنا ہی ان دونوں بولیوں میں میل جول بڑھنے لگا اور آگے بڑھکر تو یہ دونوں گھل مل گئیں۔ مسلمانوں کے راج کے ساتھ ساتھ یہ بولی بڑھتی اور پھیلتی رہی اور اس سے پہلے جس بولی کو کوئی پہچانتا بھی نہ تھا۔ مسلمانوں کے سہارے سے وہ سارے دیس میں پہونچ گئی۔

راج کے اوپچی، جوگی، سنیاسی، پنڈت، گیانی، کوی، کبیشر، گورو اور اُس کے ساتھی جہاں بھی گئے اس بولی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دیس کے چپے چپے میں پھیلا دیا۔ کبھی بھول کر بھی کوئی اُس سے بیر نہیں رکھ سکتا۔ اس بولی سے لاگ ڈانٹ رکھنا، اس کی کاٹ کرنا اور اس کے مٹانے کے جتن کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاتھ سے اپنے پیر پر کلہاڑی مارنا۔ اُردو کی نیو تو یہی ہے۔ کون ایسا ہوگا جو اپنے گھر کی نیو کھود کر بنے بنائے گھر کو ڈھانے کے جتن کرتا پھرے۔ آج ہندی کو اُردو سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اُس کے الگ ہوتے ہی پھر اُردو اُردو ہی نہیں رہ سکتی۔

بے تکی نئی ہندی۔ اب رہی وہ نئی ہندی جو دیس والوں میں پھوٹ ڈالنے کیلئے بنائی جارہی ہے۔ جسے دھرم پرچار کیلئے چھانٹا گیا ہے۔ جس کی تینچی اسی لئے بنائی ہے جو برسوں کے ملے جلے عربی، فارسی بولوں کو کتر کتر کے الگ کرے۔ اور اُن کی جگہ سنسکرت اور ہندی کے نئے نئے بھدّے بیلے بول دھیان اور چاہت کی لیئی سے جوڑتی اور چپکاتی رہے۔ تو ایسی ہندی ایک آنکھ نہیں دیکھی جاسکتی۔

اُردو کی کھوٹ۔ اُردو میں یہ ایک نئی کھوٹ نکالی جارہی ہے۔ وہ کوئی ٹھوس بھاشا نہیں۔ پچ میل مٹھائی ہے۔ ایسی باتیں بنانے والے نہیں جانتے اُردو کا ملا جلا ہونا ہی تو اُس کی بڑی اچھائی ہے۔ اسی سے اس کے بولوں کی بہتات اور اس کا پھیلاؤ دن دونا اور رات چوگنا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی سے اُردو لکھنے والے کو نئے نئے ڈھنگ سے الگ الگ دھیانوں کو لکھنے اور اچھے سے اچھے بولوں کے چھانٹنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ اُردو کے ملے جلے پن اور پچ میل مٹھائی ہونے ہی سے نئے نئے بول بناتے اور اُن میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ جوڑ کر پھیلانے کے لئے چوڑی چکلی انگنائی ہاتھ آجاتی ہے۔ جو سمجھ اچھائی کو بُرا بتائے تو اُسے کیا کہا جائے۔ پھر، جونسی بڑی سے بڑی بولی کو دیکھئے وہ جانچنے میں کبھی ایک ٹھوس بھاشا نہیں نکل سکتی۔ آس پاس کی بولیوں کی کچھ نہ کچھ ملاوٹ اس میں دکھائی دیگی اور آگے بڑھنے والی بولیاں ایسی ملونی سے کبھی بچ نہیں سکتیں۔

نئی ہندی کے متوالے اپنی بھاشا اچھوتی بنانے کیلئے عربی، فارسی بولوں کی کاٹ چھانٹ میں لگے ہوئے ہیں اور اُن کی جگہ سنسکرت اور ہندی کے نئے نئے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کی جارہی ہے۔ ایسے اَن سُنے اور بوجھل بولوں کا کسی کی سمجھ میں آنا نہ آنا یہ کچھ نہیں جانتے۔ انہیں تو اپنی بولی کو اچھوتا بنانے کی دُھن ہے۔ اور یہ تب تک پوری نہیں ہوسکتی جبتک جی بھر کے گھلے ملے بولوں کی کاٹ کوٹ نہ کی جائے۔ پر۔ سوچنے سمجھنے کی جو بات ہے اُسے کوئی آنکھ اُٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔

جب ایسی آپا دھاپی ہو تو کوئی کس سے کہے اور کسے سمجھائے۔ دیکھنے کی یہ بات ہے۔ آئے دن کی بول چال، بات چیت میں سے لکھنے والے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے اچھے سے اچھے بولوں کو چھانٹنا چاہیئے۔ چاہے یہ چھانٹے ہوئے بول کسی بولی ہی کے کیوں نہ ہوں۔ کون کون سے بول کس کس دھیان کو پورا پورا سچے اور اچھے ڈھب سے دکھا سکتے ہیں۔ ایسی ہی باتیں جانچنے اور برتا لنے کی تھیں۔ جنہیں چھوڑ کر اب اس اُدھیڑ بن میں دن رات کٹ رہے ہیں۔ یہ اتنے بول دیسی ہیں اور اتنے بدیسی۔ بھلا یہ ڈھنگ پنپنے کے ہیں۔ ایسے جتن بھاشا کو گھٹا سکتے ہیں بڑھا نہیں سکتے۔ یوں تو دیس والے سینکڑوں باتوں میں الگ رہے اور اب بھی ہیں۔ پر۔ بولی ٹھولی میں تو انہیں ایسا ہی ایک ہوجانا چاہیئے تھا جیسے پہلے تھے۔ پہلے کیسے آپس کے میل ملاپ نے آگے بڑھ کر اُردو کو سدھارا اور سنوارا۔ چاہیں تو پھر وہی سماں آسکتا ہے۔ پر اس اندھیر کھاتے سے آپس میں ایکا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ بات تو کچھ بھی نہیں۔ جو بھی ہے وہ سمجھ کا پھیر ہے۔ مت اُلٹی ہونے سے اندھیرے کو اُجالا سمجھا جارہا ہے۔

سکسینا بابو کی اسپیچ۔ یو۔ پی پولٹیکل کانفرنس میں پنڈت جواہرلال نہرو، بابو موہن لال سکسینا اور ایسے ہی اور بہت سے لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ ان میں سے جس نے بھی اسپیچ پڑھی سب کا ڈھنگ ایک سا تھا۔ بدیسی گھلے ملے بولوں کی جگہ دیسی بھولے بسرے بول رُک رُک کر اور سوچ سوچ کر مُنہ سے نکل رہے تھے۔ یوں دیکھئے تو اس جتھے میں سے بہت سے بے جھجک اچھی اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ پر۔ نئی ہندی کے پرچار کے لئے یہ کھکیڑ اُٹھائی جارہی تھی۔ اسپیچ دینے میں سبھوں کا ٹھہر ٹھہر کر بوجھل بولوں کا مُنہ سے نکالنا بتا رہا تھا یہ لوگ ابھی آپ ہی اپنی بنائی ہوئی ہندی فرّاٹے سے نہیں بول سکتے۔ سکسینا بابو کی یہ نئی اُپج بھی دیکھنے کی تھی۔ نئی ہندی کی سوچ ساچ میں دھیان نہیں رہا اور ابھی انہیں بہت کچھ کہنا تھا۔ گھڑی دیکھی تو اپنی اسپیچ کی گھڑی پوری ہونے میں کچھ منٹ رہ گئے تھے۔ یہ دیکھکر پہلے تو کچھ سٹپٹائے اور پھر ایکا ایکی زنّاٹے سے اسپیچ کی گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چھوڑتے ہی دیکھنے والوں نے دیکھا نئی ہندی کے متوالے بابوجی اُردو کی چھاؤں میں دوڑتے چلے جارہے ہیں۔

یہ تو اسپیچ پوری کرنے کے دُھن میں بوکھلائے ہوئے سے تھے۔ پر جانچنے والے ان بولوں کو جو یہ فرّاٹے سے بول رہے تھے سُن سُن کر مُسکرا رہے تھے۔ بابوجی بڑی روک تھام سے تب تک نئی ہندی اٹک اٹک کے بول سکے جب تک اس کے بولنے کا پورا پورا دھیان رہا اور جب دھیان بٹا تو پھر وہی بولی بولنے لگے جسے اُردو کہتے ہیں۔ جو بولی رچ گئی ہو، بے جھجک بولی جارہی ہو اسے چھوڑ چھاڑ کے ایک نئی ان گھڑ بھاشا کو اٹک اٹک کر اور ہچکیاں لے لیکر بولنا اور اسکے پرچار پر اَڑنا، ہٹ کرنا، مچلنا یہ بالک ہٹ نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

تاراچندجی کی گنگا جمنی اُردو۔ "ڈیڑھ بجے ڈاکٹر تاراچند معتمد ادارہ ہٰذا نے اپنا مضمون سُنانا شروع کیا، اور اگرچہ یہ عام خیال تھا کہ یہ مضمون غالباً ان تمام کاموں کی جو انجمن نے سال گذشتہ انجام دیتے ہیں ایک تفصیلی رپورٹ ہوگی۔ مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ جب معتمد صاحب نے بھی اپنے پیش روؤں کی آواز میں آواز ملاکر وہی راگ الاپنا شروع کیا کہ مُلک کے لئے ایک قومی زبان کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے اُردو اور ہندی کی آمیزش سے ایک نئی زبان بنائی جائے اور اُن کا مضمون یقیناً اِس ہندوستانی کا جو اُن کے پیشِ نظر تھی نہایت عمدہ نمونہ تھا۔ چنانچہ قابل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اس امر کا التزام کیا تھا کہ اگر ایک جملہ فارسی الفاظ اور فارسی ترکیب کا گراں بار احسان ہو تو دوسرا سنسکرت کے سرچشمے سے سیراب کیا گیا ہو۔ عجب مضحکہ خیز منظر تھا۔ چنانچہ جب معتمد صاحب کا مضمون ختم ہوجانے کے بعد جلسہ برخاست ہوا تو پنڈت کشن پرشاد کول اور دیگر حضرات ڈاکٹر تاراچند صاحب سے یہ دریافت کرتے ہوئے سُنے گئے کہ جناب والا آخر یہ مضمون کونسی زبان میں لکھا تھا۔ آیا "تاراچندی" میں یا گنگا جمنی میں۔ اور اِس سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب موصوف مُسکرا کر خاموش ہوجاتے تھے ــــ"

اُردو پر پنڈت نہرو کی لکھت۔ پنڈت جواہرلال نہرو اِسی اُردو، ہندی کے جھگڑے پر جو کچھ لکھ چکے ہیں اُسے کیسے کوئی سچ مانے اور ٹھیک جانے۔ بات یہ ہے اس میں پنڈت جی نے سوچ بچار نہیں کیا۔ نہیں تو اُردو کو بڑی جگہوں کی بولی اور ہندی کو گاؤوں کی بولی کبھی نہ لکھتے۔ آج کل جو نئی گنگا جمنی بولی بنائی جارہی ہے جسے ہندی کہا جاتا ہے، ایسی اَن گھڑ بولی دیس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی نہیں بولی جاتی۔ ہندی کے گول مول بول سے نجاننے والا تو دھوکا کھا سکتا ہے پر جاننے والا اِس جھانسے میں کبھی نہیں آسکتا۔ دیکھئے اِس گُر کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔ بُری بھلی جیسی بھی ہے اب اُردو ہی دیس بھاشا ہے۔ اسی کے پھیلانے اور اِسی کے آگے بڑھانے میں دیس کی بھلائی اور اچھائی چھپی ہوئی ہے۔

دیس کی کسی بولی سے مسلمانوں کو لاگ نہیں۔ اب رہیں دیس کی اور چھوٹی موٹی بولیاں تو اُن سے کوئی لاگ اور بیر نہیں۔ یہ جینا چاہتی ہیں تو جئیں اور بڑھنا چاہتی ہیں تو بڑھیں، ان میں سے کسی کی روک ٹوک نہ چاہیئے۔ پر، دیس کی ایک ایسی بولی جو سب میں پھیل سکے وہ اکیلی اُردو ہی ہے جو دیس کا پورا پورا ساتھ دے سکتی اور اُس کا ہاتھ بٹا سکتی ہے یہی اب تک مِلی جلی بولی سمجھی جاتی رہی اور مِلی جلی بھاشا ہی کی جگہ جیسے یہ پہلے ڈٹی ہوئی تھی ویسے ہی اپنی اُسی جگہ اب بھی ڈٹی ہوئی ہے۔ اب رہی ہندی تو ہمیں نے اِسے پالا پوسا، بڑا کیا۔ ہمیں نے اُسے آگے بڑھایا اور پھیلایا۔ تو بھلا ہم اور اُس کی کاٹ کریں اور اس سے لاگ ڈانٹ رکھیں، یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔

یہاں آکے مسلمانوں نے کیا کیا۔ مسلمان جب یہاں آئے تو جگہ جگہ کی بولی ایسی الگ الگ تھی جسے دوسرا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ نہ پورے دیس کی کوئی ایک بولی تھی اور نہ کوئی ایک راج۔ پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ آنا جانا بھی بہت کٹھن تھا۔ اس لئے دیس کی چھوٹی چھوٹی سی بولیاں اپنی اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں اور اپنے الگ الگ ٹکڑوں ہی میں گھری ہوئی رہتی تھیں مسلمان یہاں فارسی بولتے ہوئے آئے۔ جب دلّی ان کی راجدھانی بنی تو وہاں کی ایک بولی سے جو کھڑی بولی، کہلاتی تھی فارسی کی مڈبھیڑ ہوئی۔ ہندو مسلمانوں میں جتنا میل ملاپ بڑھتا گیا اتنا ہی ان دونوں بولیوں میں میل جول بڑھنے لگا اور آگے بڑھ کر تو یہ دونوں گھل مل گئیں۔ مسلمانوں کے راج کے ساتھ ساتھ یہ بولی بڑھتی اور پھیلتی رہی اور اس سے پہلے جس بولی کو کوئی پہچانتا بھی نہ تھا۔ مسلمانوں کے سہارے سے وہ سارے دیس میں پہونچ گئی۔

راج کے اونچے، جوگی، سنیاسی، پنڈت، گیانی، کوی، کبیشر، گورنر اور اُس کے ساتھی جہاں بھی گئے اس بولی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دیس کے چپے چپے میں پھیلا دیا۔ کبھی بھول کر بھی کوئی اُس سے بیر نہیں رکھ سکتا۔ اس بولی سے لاگ ڈانٹ رکھنا، اس کی کاٹ کرنا اور اس کے مٹانے کے جتن کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاتھ سے اپنے پیر پر کلہاڑی مارنا۔ اُردو کی نیو تو یہی ہے۔ کون ایسا ہوگا جو اپنے گھر کی نیو کھود کر بنے بنائے گھر کو ڈھانے کے جتن کرتا پھرے۔ آج ہندی کو اُردو سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اُس کے الگ ہوتے ہی پھر اُردو اُردو ہی نہیں رہ سکتی۔

سیدھے سادے گاؤں والے عربی، فارسی کے وہی بول بولتے چلے آتے ہیں جو اپنے بڑے بوڑھوں سے سنتے چلے آئے۔

گانوؤں میں اندھیر اب وہاں یہ اندھیر ہو رہا ہے جو ان گیگلوں سے ان بولوں کی چھینا جھپٹی کی جا رہی ہے اور پرانے گھلے ملے بولوں کی جگہ نئی ہندی کے کٹھن اور کٹھب بول رٹوانے پر ہندی پرچار والے اڑے ہوئے ہیں۔ گاؤں میں پرائمری اسکولوں کے لڑکے اپنے پڑھانے والے کو پکارنے پر "حاضر جناب" کہا کرتے تھے۔ اب انہیں "اپسٹھت شویمان" جیسے بھدے پسلے اور بوجھل بول سکھائے جاتے ہیں۔ کیا مارے باندھے سے کوئی بولی آگے بڑھ سکتی ہے۔

پنڈت پیارے لال شرما کا اردو کے بچاؤ کیلئے اپنی جگہ چھوڑ دینا۔ ہندوؤں ہی میں سے جو پوری سوجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ کبھی بھول کر بھی ہندی اردو ہلڑ مچانے والوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ جیسے سر تیج بہادر سپرو، پنڈت پیارے لال شرما، پنڈت کشن پرشاد کول، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ ایسے ہی اور من کے ستھرے اور بات کے سچے ہندو پہلے ہی سے اس آپا دھاپی اور تو تو میں میں کرنے والوں سے الگ تھلگ رہے اور ابھی تک ہیں۔ ان کا الگ تھلگ رہنا ہندی پرچار والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ایسے لوگوں کو متھارنے اور چکنی چپڑی باتیں بنا کے انہیں ملانے کے لئے نئے نئے جال بچھائے گئے۔ پر یہ لوگ نہ پھنس سکے۔ پنڈت پیارے لال شرما کا ایکا ایکی اپنی جگہ چھوڑ چھاڑ کے الگ کھڑا ہو جانا ابتک ایک بھید سا تھا۔ پہلی اپریل ۱۹۳۹ء کے "ہماری زبان" نے اس گتھی کو یوں سلجھا دیا۔

"صوبہ متحدہ کے سابق وزیر تعلیم پنڈت پیارے لال شرما نے جب استعفا دیا تو اس کی بہت سی وجہیں بتائی گئیں۔ کسی نے کہا کہ ان کے اور حکومت کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ چونکہ وہ سر تیج بہادر سپرو کے دوست ہیں اور جب الہ آباد جاتے ہیں تو انہیں کے یہاں رہتے ہیں اور چونکہ سر تیج بہادر سپرو اکثر اشارۃً اور کنایتہً کانگرس پر اعتراض کرتے ہیں، اسلئے پنڈت گوبند ولبھ پنت کو پنڈت پیارے لال شرما اور سر تیج بہادر کی دوستی پسند نہ آئی۔ اس زمانے میں تو اس پر کافی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں اور کھلا نہیں کہ اصل معاملہ کیا تھا۔

اب مسلم ڈیبیٹنگ یونین، پٹنہ کے نائب صدر کے بیان سے جو دکن ٹائمز مورخہ یکم فروری ۱۹۳۹ء میں چھپا ہے اس معاملہ پر روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے سر تیج بہادر سپرو سے ملاقات کی اور اس کے متعلق ان سے چند سوالات کئے۔ سر تیج بہادر سپرو نے کہا کہ اصل وجہ اختلاف ہندی، اردو کا مسئلہ تھا۔ پنڈت پیارے لال شرما اس معاملے میں ایک آزاد خیال آدمی ہیں اور دوسرے وزرا پنڈت جی کے خیال کے حامی نہیں تھے، اس لئے پنڈت پیارے لال شرما کو وزارت سے علیحدہ ہو جانا پڑا۔ جب پنڈت جی سے کہا گیا کہ وہ اردو کے مقابلے میں ہندی کو ترقی دیں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس صوبے میں گنواری زبان رائج کرنا نہیں چاہتا۔ اس پر "گنواری زبان" کے حمایت کرنے والے برہم ہو گئے اور پنڈت جی کو مجبورًا استعفا داخل کرنا پڑا۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ وزارت کو اردو کے معاملے میں پنڈت پیارے لال شرما کی آزادروی بالکل نہیں بھاتی تھی۔ اس لئے اس نے ان کو ہٹا کر شری سمپورنانند جی ایسے سوشلسٹ کو بلایا جو ایک زمانے میں عہدہ قبول کرنے کے سخت مخالف تھے اور اب جو اس جگہ پر براجمان ہیں۔"

سندر لال جی کی چھٹی کئی برس ہوئے جو اسی جھگڑے پر سندر لال جی نے ایک بڑی چھٹی مہاتما جی کو لکھی تھی۔ کہیں کہیں سے اس کے کچھ ٹکڑے بھی دیکھ لیجیے۔ نہ جانے کس نے مہاتما کے جی میں یہ بات بٹھا دی تھی جو وہ بے سمجھے بوجھے بیدھڑک یہ لکھ بیٹھے۔

"اردو نام خاص طور اور خاص مطلب سے رکھا گیا۔"

اسی بات کا بے تکا پن سندر لال جی اپنی چھٹی میں یوں دکھاتے ہیں۔

"یہ بات بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اردو زبان کی تاریخ سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ نام اسی طرح خود بخود اس سے پہلے کی ہندی یا ہندوی کے ساتھ بہت سے ایسے عربی، فارسی، ترکی شبدوں اور محاوروں کے میل سے بنی ہوئی زبان کے لئے رائج ہو گیا

جو لشکری لوگوں میں بولے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ بالکل قدرتی تھا۔ کسی بھی خاص مطلب کے لئے کسی نے یہ نام نہیں رکھا تھا۔ اس کے بعد عرصے تک اس نئی ملی جلی اور مروّجہ زبان کے لئے ہندی اور ہندوی شبد بھی استعمال ہوتے رہے۔ یہ دونوں نام بھی مسلمانوں ہی کے رکھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں ہی نے پہلے پہل اس زبان کو جو اُن سے پہلے ہندوستان کی راجدھانی کے آس پاس بولی جاتی تھی، ہند سے ہندی یا ہندوی کہنا شروع کیا۔ اسے اپنایا اور اُسے ترقی دی۔ بعد میں جب اس زبان میں فارسی، عربی، ترکی سو کچھ شبد اور محاورے لیکر اس کا روپ بدلا تو ہندی نام کی جگہ صرف اُردو نام کا استعمال ہونے لگنا بھی ایک قدرتی چیز تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں فارسی میں "اُردو" لشکر یا لشکر گاہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے دلّی میں اُردو بازار تھا، جہاں اس نئی زبان نے شکل اختیار کی۔"

کبھی گاندھی جی نے ہندی، اُردو کے جھگڑے سے بچنے کیلئے "ہندوستانی" بول کے برتنے اور اسی کے پرچار کرنے کو اچھا سمجھ کے دلیئے والوں کو اسی بات کے ماننے پر اُبھارا تھا۔ پھر آپ ہی آپ۔ اسے چھوڑ بیٹھے۔ سندرلال جی نے یہی بات مہاتما کے سامنے یوں دُہرائی ہے۔

"ہندی اور اُردو ان دونوں کا جنم کبھی بھی اور کسی طرح ہوا ہو اور ان کے مصدری معنی کچھ بھی ہوں، اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ آج یہ دونوں نام ہندوستانی زبان کی دو الگ الگ شکلوں کے لئے استعمال ہو رہے ہیں اور ان کے دو صاف الگ الگ مروّجہ معنی ہیں۔ ایسی صورت میں جو لوگ ان دونوں شکلوں کو پھر سے ملا کر ایک زبان بنانا چاہتے ہوں، انہیں کسی تیسرے نام کا سہارا لینا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں اس سچائی کو محسوس کر کے ہی آپنے خود کچھ سال پہلے "ہندوستانی" لفظ کو استعمال کیا تھا اور ملک کو سکھایا تھا۔ پھر اب وہ حالت بدل گئی"

کسی کی پٹی پڑھانے سے مہاتما نے اُردو والوں کو گرامر میں کا یا پلٹ کرنے والا سمجھ کے یہ لکھ دیا تھا۔

"اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وے (یعنی اُردو والے) بھاشا کا دیا کرن بھی بدل دیتے ہیں"

اسی نرالے دھیان پر سندرلال جی کا تیوری چڑھا کے یہ لکھنا دیکھئے۔

"آپ کے یہ الفاظ پڑھ کر مجھے اور بھی دُکھ ہوا اور حیرانی ہوئی۔ اگر آپ ہندی، اُردو دونوں کے ودوان (عالم) منشی پریم چند سو دریافت کر لیتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اصلیت اس سے ٹھیک برعکس ہے۔ مجھے خود کم سے کم اٹھائیس سال سے آج کل کی کثر ہندی (اس شبد کا استعمال میں مروّجہ ہی معنی میں کر رہا ہوں) مصنّفوں سے اس معاملے میں کافی شکایت ہے"

جو نئی ہندی بنائی جا رہی ہے وہ کیسی ہے اس کا کچا چٹھا گھر کے بھیدی ہی سے سُنیئے۔ سندرلال جی اس کا بھرم یوں کھولتے ہیں۔

"شاید آپ کے دھیان میں یہ بات نہیں ہے کہ اس وقت کی کتابی ہندی ہندوستان کے کسی بھی ضلعے یا نگر یا گاؤں کی بول چال کی زبان نہیں ہے۔ الہ آباد کے تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ پنڈت (کاشمیریوں کو چھوڑ کر) جب اپنے گھروں میں بات چیت کرتے ہیں "ہمرے دوارے ایک مہرارو کھڑی با" (ہمارے دروازے پر ایک عورت کھڑی ہے) بنارس کے پنڈت تو اور بھی عجیب زبان بولتے ہیں جس کو نہ میں سمجھتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں۔ ان الہ آباد اور بنارسی زبانوں کا دیا کرن ہندی یا اُردو کے ویاکرن سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ کشمیری بلاشبہ خالص ہندوستانی بولتے ہیں۔ لیکن اگر اُن کی بول چال کی زبان کو اُردو یا ہندی دونوں میں سے ایک نام دینا پڑے تو وہ اُردو ہے ہندی نہیں۔ اگر آپ کسی ان پڑھ کشمیری بڑھیا کو بٹھا کر اُسے کسی اُردو اخبار کا ایک کالم پڑھ کر سنائیں اور پھر اسی طرح کے مضمون پر کسی ہندی سماچار پتر کا ایک کالم سنائیں تو جتنا اُردو اخبار سے اس کے پلے پڑے گا اُتنا ہندی سماچار پتر سے نہیں پڑے گا۔ برخلاف اس کے آج کل کی اُردو بلاشبہ کچھ مقامی بول چال کی زبان ہے۔ لکھنؤ، دلّی، میرٹھ، مراد آباد اور اس کے آس پاس کے کچھ علاقوں میں بھی خالص اُردو بولی جاتی ہے۔ لکھنؤ اور دلّی کی زبان میں بھی فرق ہے۔ لیکن وہ اتنا باریک ہے کہ بڑے سے بڑے ودیشی یا دیگر صوبوں کے عالم بھی کبھی کبھی اُسے نہیں پکڑ پاتے"

گاندھی جی کو سمجھانے اور منوانے کیلئے یہ اپنے ہی گھر کی بول چال اور بات چیت کا ڈھچر دکھاتے ہیں۔

"آپ کی اجازت سے میں اپنے ہی گھر کی مثال دینا چاہتا ہوں۔ میری دادی وہاں کی رہنے والی تھیں جو برج کا مرکز ہے، اور ان پڑھ تھیں۔ ماں دلّی کی تھیں۔ میرے گھر میں ٹھیک یہی زبان بولی جاتی تھی جس میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محض دو باتوں میں فرق تھا، ایک تو سنسکرت شبدوں کی جگہ اُردو، فارسی کے زیادہ عام فہم الفاظ تھے اور دوسرے وہ زبان زیادہ بامحاورہ تھی۔ میری زبان اِدھر اُدھر گھومنے اور ہر طرح کی چیزیں پڑھنے کی وجہ سے کھچڑی ہوگئی۔ میری ان پڑھ دادی "ون" نہیں سمجھتی تھیں۔ "قرضہ" سمجھتی تھیں۔ "بڈھائی" کے بجائے انکی زبان پر "مبارک باد" زیادہ چڑھا ہوا تھا۔ اور "منش" "جیو" "پرتھومی" "وشا" وغیرہ کی جگہ آدمی، زبان، زمین اور حالت ان لفظوں کا استعمال کرتی تھیں۔ یہی زبان میری ماں کی زبان تھی۔"

دیکھئے یہ اُردو، ہندی کا دُکھڑا کہتے کہتے کُھلم کُھلا اور کیا کیا کہہ گئے۔

"اگر اُردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں شمار کریں تو یہ بات بالکل سچّی ہے کہ ہندی کہیں کی بھی بول چال کی زبان نہیں ہے۔ اُردو ہے۔ یہ بھی بالکل سچ ہے کہ آج کل کی ہندی زیادہ تر کتابی اور بناوٹی زبان ہے۔ کچھ تو فرقہ وارانہ جذبے اور زمانۂ قدیم کی طرف جانے کی خواہش۔ کچھ ایک قومی زبان تعمیر کرنے کا خیال اور کم سے کم شروع میں ایک حد درجے تک حکّام کے خود غرضانہ اشارے اور ان کی مدد۔ ان تمام چیزوں کے سہارے پچھلے تیس چالیس سال سے ملک میں رائج کی جا رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں اُردو ایک قدرتی اور زندہ زبان ہے۔ رہا سوال دیاکرن کا۔ آج کل کی ہندی کو اپنا ویاکرن اور ڈھانچا ظاہر ہے اُردو ہی سے لینا پڑا۔"

اُردو لکھنے کا یہی ڈھب جو پورے دیس میں پھیل چکا اور جس نے بڑھتے بڑھتے ہزاروں ہندوؤں کے پوجا پاٹ میں بھی برسوں سے اپنی جگہ نکال لی۔ انہیں باتوں سے سندرلال جی اسے رکھنا چاہتے ہیں اور اس کی جگہ دیوناگری کو دینا نہیں چاہتے۔ یہ اپنی چٹھی میں اسی بات کو یوں لکھتے ہیں۔

"آپ کو شاید یہ بھی معلوم ہوگا کہ شمالی ہند میں کم سے کم ہزاروں ہندو گھر ابھی تک ایسے ہیں جہاں دسہرے کے دن پوجا کے وقت "پورب کا بردا" اور "پچھم کا گھوڑا" "اتر کا تیر" اور "دکھن کا چیر" یا اس سے ملتے جلتے الفاظ کاغذ پر اُردو حرفوں میں لکھے جاتے ہیں۔ اب اگر اس طرح کے لوگوں کو دھرم سے گرا ہوا کہکر علیحدہ کر دیا جائے یا مُہلک تنگ خیالی کے اثر میں ہم ان طریقوں کو بدلنے کی کوشش کریں تو دوسری بات ہے۔"

ایک اور بات جو بے سوچے سمجھے گاندھی جی کے مُنہ سے نکل گئی تھی اُسے یہ اس ڈھنگ سے جھٹلاتے ہیں۔

"یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ اُردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اگر ہم اُردو کو قرآن کے حرفوں میں لکھنے کی کوشش بھی کریں تو معمولی حرفوں کی شکلیں تو کافی بدل ہی جائیں گی۔ ہمیں "پڑوسی" کو "فروسی" لکھنا پڑے گا۔ "چاند" کو "جاند" اور "گلے" کو "کاتے" یا "غاتے"۔ "کھانا" کو "کانا" وغیرہ۔ آج کل کے فارسی حروف جن میں ہندوستانی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لئے کچھ نئی علامتیں جوڑ کر اُردو لکھی جاتی ہے۔ عربی حروف (خطِ نسخ) سے صدیوں پہلے کی ایجاد ہیں۔ دونوں میں تو مشابہت بھی ہے۔ لیکن مشابہت تو گجراتی، بنگلا اور ناگری حرفوں میں بھی کافی ہے۔ آوازیں تو بالکل وہی ہیں۔ اسکی بنا پر یہ کہنا تو شاید ٹھیک نہ ہوگا کہ گجراتی اور بنگالی، رگوید کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔"

سندرلال جی دُھن کے پکّے، من کے سچّے، اُردو کے پجاری اور کھری کھری سُنانے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے جتنی باتیں کہیں سب کی سب جچی تلی اور سچّی۔ ایسے ہی من کے ستھرے کچھ اور سپوت دیس کو مل جاتے تو پھر بھاشا واشا کا کوئی جھگڑا ٹنٹا ہی نہ رہتا۔ نئی ہندی بنانے والوں کے ہاتھ سے اپنی اُردو کی گت بنتے دیکھکر یہ نہ رہ سکے اور مہاتما جی جو اس جھگڑے میں سب سے آگے آگے ہیں۔ انہیں ایک بڑی پوری چٹھی لکھ کے جی کی بھڑاس نکالی اور سچّے پتے کی باتیں کہہ ڈالیں۔ پر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور کسی نے سُنا بھی نہیں اور جو ایک آدھ نے کچھ سُنا بھی تو اس ہڑبڑاہٹ میں سُنی ہوئی بات کو ان سُنی بنا دیا۔

مدراس میں ہندی پرچار۔ مدراس اور ہندی بھلا ان دونوں کا کوئی بھی جوڑ ہے۔ تامل، تلنگی، ملیالم، جس جگہ یہ بولیاں بولی جاتی ہوں وہاں

ہندی سیکھنے اور بولنے کے لئے مار دھاڑ کرنا ایسا ہی ہے جیسے عربوں اور ایرانیوں میں دھاندلی سے پشتو کے پرچار کے لئے اَڑنا۔ مدراس والے ایسی بے جوڑ بولی جسے اُن کی بولیوں سے کوئی لگاؤ نہیں کیسے بول سکتے ہیں۔ اس کے پیچھے مدراس میں جو ہوا اور ہو رہا ہے اُسے کون نہیں جانتا۔ پر اپنی بات کی پچ کرنے والے ابھی تک ہندی پرچار ہی پر اَڑے ہوئے ہیں۔

مدراس میں ہندی کو پھیلانا اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ وہاں جتنی بولیاں بولی جارہی ہیں وہ سب دڑاوڑی ہیں۔ اور دڑاوڑی بولیوں کے لکھنے کا ڈھچر، اُن کی بناوٹ، اُن کی گرامر، ان باتوں میں سے کسی ایک بات سے بھی ہندی کا کوئی لگاؤ نہیں۔ مدراس والے ہندی کو تو ٹھکرا رہے ہیں اور بُری بھلی جیسی بھی سہی وہاں اُردو بولی جارہی ہے۔ یہ کتنے بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ ہندی کو ٹھکرانا اور اُردو کو چھاتی سے لگانا کس لئے؟ پہلے اِسے سوچئے اور سوچ بچار پر بھی سمجھ میں نہ آئے تو سُوجھ بوجھ والوں سے پوچھئے۔

یہ پیچ پکار سُنتے سُنتے اکتا کر جب ادھر سے مُنہ پھیر لیتے ہیں تو جی بہلانے کے لئے پچھلی باتوں کے پرت کے پرت دھیان سامنے پھیلا دیتا ہے۔ جنہیں اُلٹ پلٹ کے دیکھتے ہوئے انڈین نیشنل کانگرس کے اس ریزولیوشن تک پہونچتے ہیں جس میں ڈنکے کی چوٹ "ہندوستانی" کو دیش بھاشا مان کے اُردو، ہندی جھگڑا چکا دیا گیا تھا۔ تو کانگرس کا دیس بھاشا کے لئے "ہندوستانی" کو چھانٹنا اور ہندوؤں کا اُسے اب تک روندتے اور ٹھکراتے ہوئے چلے آنا بتاتا ہے، یہ ریزولیوشن بھی ایک گہری چال تھی جو چلی جاچکی اور جب کانگریس دکھاوے کے لئے یہ ڈھنڈورا پیٹ رہی تھی تو ایک جتھا مُنہ پھیر کر اس پر مُسکرا رہا تھا جس کی مُسکراہٹ کا اب بھرم کھُلا اور کھلتا جارہا ہے۔ ہندوؤں نے کانگریس کے سمجھوتے کو نہ کبھی مانا اور نہ اسکے کہنے کو کبھی کان دھر کے سُنا۔ یہ جتھا پہلے ہی سے اپنی دُھن میں رہا۔ اسی لئے آج تک یہ ادھر نہ آسکا اور جب اب تک نہ آسکا تو پھر آگے کیا آسکے گا۔

سر تیج بہادر سپرو بڑے بھاری بھرکم لوگوں میں سے ہیں۔ انہیں راج بھی چاہتا ہے اور دیس والے بھی۔ یہ باتیں بنانا نہیں جانتے۔ جو کہتے ہیں وہ ناپ تول کے اور جانچ پڑتال کے۔ کوئی مانے مانے، نہ مانے وہ جانے۔ اُردو لکھنے لکھانے کا جو ڈھنگ اُن کا پہلے تھا وہی اب بھی ہے۔ ان کی اگلی پچھلی لکھتوں کا ڈھچر ایسا ایک سا ہے جس میں کہیں یونہی سی بھی گھٹ بڑھ نہیں۔ ہندوؤں میں سے اچھے اچھے لکھنے والے اِسی ہندی، اُردو جھگڑے کے جھکڑ میں آندھی کا کوا بن گئے۔ پر۔ یہ جہاں تھے وہیں ہیں۔ اس جھگڑے سے پہلے جیسا لکھتے تھے، ان کی لکھت کی وہی بات آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے، ایک ہی ڈگر پر چُپ چاپ چلے جارہے ہیں۔ سکھانے پڑھانے سے بڑے بڑے سنّی بھول جاتے ہیں، اور بھٹک بھٹکا کے کہیں سے کہیں جانکلتے ہیں۔ پر۔ جو اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہو اور اپنی پہلی ڈگر اور ڈھرا نہ چھوڑے تو ایسا اکیلا لاکھ پر بھاری ہے۔

سر سپرو کی اِسپیچ

فروری ۱۹۳۸ء میں سر سپرو نے اُردو پر بہار کی ایک سبھا میں جو کچھ کہا اس کا ایک ٹکڑا لکھتا ہوں۔ اس میں دیکھ لیجیے نئی ہندی کے بھدیسلے بولوں کا کہیں پتا تک نہیں۔ سُنئے سر سپرو کیا کہتے ہیں اور کس ڈھب سے کہتے ہیں:-

"دراصل اُردو زبان کے وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے سے متحد ہوسکیں۔ میں یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوں کہ اُردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور اُردو جاننے والے محض مسلمان ہیں۔ میں اخباروں میں زبان کے معاملے کے اختلاف کو بڑے افسوس سے دیکھتا ہوں۔ مگر نہ تو اُس کو ہندو سمجھتے ہیں نہ مسلمان۔ ہم اس ذریعۂ اتحاد کو کمزور کرتے چلے جاتے ہیں۔ پچاس سال پیشتر یہ ہوتا تھا کہ جب ایک بچّہ مکتب میں پڑھنے جاتا تھا تو پانچ روپے والے مولوی صاحب سے تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس وقت کوئی یونیورسٹی نہ تھی۔ مگر اس وقت یہ ہوتا تھا کہ ایک ہندو بچّہ اسلامی تعلیم سے اور مسلمان بچّہ ہندو تہذیب سے واقف ہوتا تھا۔ ہمارے بزرگوں نے اُردو کی بُنیاد اتحاد کیلئے ڈالی تھی۔ اگر آپ اتحاد کے جویا ہیں جس کے بغیر ہندوستان ترقی نہیں کرسکتا، تو آپ اُردو زبان کو ترقی دیں۔"

اُردو میں ہندوؤں کا فارسی بول بڑھانا

اُردو میں فارسی بولوں کی بُہتات کو مسلمانوں کا کیا دھرا سمجھ کے ناک بھوں چڑھائی جارہی ہے۔ پر ایک بے لاگ پتا لگانے والا جو نہ ہندو ہے نہ مسلمان، وہ اس ریل پیل کو یہاں کے ہندوؤں ہی کے کرتوت بتاتا ہے۔ "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" کے ۱۹۲۹ء والے اڈیشن میں دیکھئے وہ کیا لکھتا ہے:-

"اُردو کا اتنا زیادہ فارسیت آمیز ہوجانا ایرانی اثر سے زیادہ ہندی اثر سے تھا۔ اگرچہ اپنی اصل کے لحاظ سے اسلامی تھا۔

تاہم اس میں زیادتی سے فارسیت کی آمیزش کرنے والے اُن ایرانیوں یا ایرانی نژاد لوگوں سے کہیں زیادہ وہ ہندو عُمّال تھے جو حکومتِ مُغلیہ کے مُلازم اور فارسی داں تھے۔ کیونکہ وہ (ایرانی اور مغل) صدیوں سے اپنے علم و ادب کے لئے صرف اپنی فارسی زبان ہی استعمال کرتے چلے آتے تھے"۔

اُردو کی دو ٹکسالیں:- دلّی اور لکھنؤ کے بڑے بوڑھوں اور سُوجھ بوجھ کے پُتلوں نے اُردو کے لئے ایک ایسی پگڈنڈی بنا دی ہے جس سے چاہیں تو ایک اور لیک نکال سکتے ہیں۔ انہوں نے بڑے سوچ بچار سے بہت سے بولوں کو بوجھل و رکڈھب جان کے اپنی بول چال اور لکھت پڑھت سے ایسا نکال دیا جیسے دودھ میں سے مکھی۔ اسی کو کیبشروں کے جتھے میں "متروکات" کہا جاتا ہے۔ جیسے:-

"سوں، سیں، کوں، ہمن کو، آتیاں، جاتیاں، جیوڑا، اودھر، ایدھر، کیدھر، اُتنے، جتنے، کسو، کبھو، واچھڑے، بھلا رے، بل بے، جھمکڑا، لوہو، ٹک، تسپہ"

ایسے اور بہت سے اسی ڈھنگ کے بول یہ وہ پُرانے کرڑ کھائے پتے ہیں جنہیں اُردو کی دیکھ بھال کرنے والے اپنی اُردو کے پیڑ سے چُن چُن کے توڑتے اور توڑ توڑ کے الگ پھینکتے رہے۔ بِپت جھڑ میں جیسے پیڑوں سے پتے جھڑتے اور گرتے رہتے ہیں، ایسے ہی بھاشا کے پیڑ میں سے بھی بوجھل بولوں کے پُرانے پتوں کی توڑ تاڑ ہوتی رہی ہے اور سوچ سمجھ کے اسی ڈھب پر اُردو میں کاٹ چھانٹ کی جاسکتی ہے۔ عربی، فارسی، سنسکرت کے وہ موٹے ٹموٹے اور بھاری بھاری بول جو اپنی بڑائی جتانے کے لئے بولے جاتے ہیں اور اس سے ہٹ کر وہ کسی گوں کے نہیں، ان سب کو اُردو میں سے نکال ڈالنا چاہیئے۔ ہمارے یہاں کے نئے نئے مُلّا جو اپنی بولی اُردو کو ایسا نہیں جانتے جیسی عربی جانتے ہیں۔ برسوں عربی پڑھنے پڑھانے سے اس کے سینکڑوں بول ان کے دھیانوں پر چھا جاتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی بات بات میں بھاری اور بوجھل عربی بولوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ جیسے:-

عربی کے بوجھل بول:- تقاطرِ امطار، دفعِ مضار، اختلافِ لیل و نہار، رواجِ بلاد و امصار، اوائلِ ریعان، لائقِ تشکّر و امتنان، بدوِ شعور، اشکالِ بحور، مُرورِ دہور، اغذیہ لذیذہ، اشربہ لطیفہ، تشتّتِ خاطر، سحابِ مقاطر، انقباض و تکدّر، آلامِ تحسّر، نوعیتِ قعود، ہیئتِ نزول و صعود، ہما امکن، واضح و مبرہن، استتار و بروز، التہابِ تموز، ادوارِ مختلفہ، اعصارِ ماضیہ، ادلّہ و براہین، استحقاقِ مساکین، تطویلِ کلام، انقضائے ایّام، اوقع فی النفس، اظہر من الشمس۔

جو لوگ ایسی سرگم بھر رہے ہوں تو ایسی سرگم بھرنے والوں کی راگ راگنیوں کا کیا ٹھکانا ہے۔ پر سچّی بات یہ ہے:- یہ سب نجانے اور ان کے بھولے پن سے ہوا اور ہو رہا ہے۔ یہ لوگ کبھی اس اکھاڑے میں اُترے ہی نہیں۔ اسی لئے اس کے پیچ، گھاتیں اور ان کا توڑ کچھ نہیں جانتے۔ انہیں کیا پتا جو بھاشا بھاری بھاری اور بوجھل بولوں کو اُگل دیا کرتی ہے اور یہ کھانا اُسے کبھی نہیں پچتا۔ اور اس کے انگ کو نہیں لگتا۔ ان میں اتنی سوجھ بوجھ کہاں جو یہ دیکھ سکیں:- بوجھل بولوں کا بوجھ آئے دن کوئی بھاشا نہیں اُٹھا سکتی۔

اپنی بولی کے تیور نہ پہچاننے سے بات چیت میں یہ لوگ من من بھر کے پتھر یونہی لڑھکاتے رہتے ہیں۔ ایسے روڑے اور ایسے پتھروں سے اُردو کی انگنائی کا گھرنا ٹھیک نہیں۔ جہانتک ہو سکے جھٹ پٹ ان کو ہٹا کے الگ کر دیا جائے۔

ایسے ہی سنسکرت اور ہندی کے "شبد ساگر" میں ڈبکی لگانے والے اپنی اپنی جھولیاں کنکر، پتھر، ریت، کیچڑ سے بھر بھرا کے نکلتے ہیں اور انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کرا کے ایک کٹھن اور بناوٹی بولی کا آشرم بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہندی کی پُرانی پُرانی لکھتوں سے چُن چُنا کے نئے نئے اَن گھڑ بول ایسے لکھے جا رہے ہیں جو لکھ بِکنے پر اپنی ہی لکھت کو آپ ہی نہیں سمجھ سکتے۔ بھدیسلے بولوں کا چُنتا اور چھانٹنا دیکھئے:-

ہندی کے اَن گھڑ اور بھدیسلے بول:- ہودے (جناب) تتھا (اور) کیول (صرف) پرکشا (امتحان) آشا (آس، اُمید) دشا (حالت) شبد (بول، لفظ) شکشا (تعلیم) وایو (ہوا) بھالو (ریچھ) سمے (وقت)، سماچار پتر (اخبار) دیاکرن (قاعدے)، رکشا (حفاظت) سندیہ (شک) سمادہ (گڑھا، غار) سمبندھ (رشتہ ناتا) پرتگیا (وعدہ)، رکت (لہو، خون) رکت چندن (سرخ صندل) ودھوا (بیوہ) پرنتو (پر، لیکن) گنو (گن) برہمنو (برہمن)۔۔۔ دھوموشلاکا (دیاسلائی) منش (آدمی) سوموار (پیر) پدھارنا (بیٹھنا) شروان (ساون) بھادرایا (بھادوں) اسوج (کنوار)

یدی (اگر) پھالگن (پھاگن) بیچھم (پچھم) دکھش (دکن) کٹھنائیاں (مشکلیں) ادھک (بہت) وواہ (بیاہ)۔

جیسے "اوقع فی النفس" "اظہر من الشمس" "ابین من الامس" "ایسے ہی" "آشنا" "دشا" "کشمکش" "کیول" "ادھک" "ہو دے" اور ایسے اور بہت سے بوجھل اور بے ڈھب بول اُردو کے گون کے نہیں۔ یہ سب کے سب چھوڑ کر عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی کے وہ ملے جلے اور گھلے ملے بول جو برسوں سے اُردو ادب کو بڑھاتے ہوئے ساتھ ساتھ چلے آتے ہیں ان میں کی ایک لکیر بھی ایسی نہیں جسے مٹایا جاسکے۔ اس ڈھب کے بول جوں کے توں رکھنے کے ہیں اور نئے نئے بولوں کی ڈھونڈ ڈھانڈ اس گھڑی ہوا کرتی ہے، جب کسی اور بولی کی کوئی لکھت اُردو میں لانا چاہیں۔ اس سے ہٹ کر تو نئے بولوں کی کھپت کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں۔ آج کل جو اُردو کے پرانے ملے جلے بولوں کی کاٹ کوٹ اور اُن کی جگہ بھرنے کے لئے کڈھب اور ان سُنے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کی جارہی ہے یہ سب اُردو کے بگاڑنے اور مٹانے کے جتن ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے دھیان یہی ہے، جیسے بھی ہو دیس کے دھرم کی بولی ٹھوس بھاشا بن جائے۔

بنارس کے کرتوت۔ بنارس سے ہٹ دھرمی کی گھنگھور گھٹا اُٹھ اُٹھ کر ایسی پھیلتی چلی جاتی ہے جس سے اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ وہ لوگ جو ہندوستان میں پورا ایکا کر کے آگے بڑھنا چاہتے تھے وہ جی ہی جی میں اونٹ رہے ہیں اور انہیں ایسے لوگوں کی بجھ پر اچنبا ہوتا ہے جو یوں تو بڑی ڈینگیں مارتے ہیں۔ پر ہلڑ مچانے والوں کا اکسانا اور سکھانا پڑھانا دیکھئے تو یہ سب انہیں کے کرتوت ہیں۔ کیا یہ لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اُردو کسی دوسرے دیس کی بولی ہے۔ اور جو یہ نہیں تو پھر کیا مسلمانوں ہی کو یہ بولی اچھی لگتی ہے اور مسلمان ہی ہندی کی ہتیا پر تلے ہوئے ہیں۔ اس مہاپاپ کا گہرا دھبا کیا یونہی دُھل سکتا ہے جو عربی، فارسی بولوں کو دیس باہر کر کے ان کی جگہ دھرم کی بولی سنسکرت کو دیدی جائے۔

دھرم کی آڑ پکڑ کے دیس کے جھتوں میں کھلبلی ڈالنے کے جتن کرنا یہ بھی تو بڑا پاپ ہے۔ دھرم اور بھاشا ان دونوں کے ڈانڈے الگ الگ ہیں۔ ان دونوں کو اپنی بات کی پچ کے لئے گڈمڈ کر کے ایک سمجھ لینا یہ وہ بات ہے جسے سوجھ بوجھ والے کبھی اچھا نہیں سمجھتے۔ کسی دھرم کے آگے وہی لوگ جھک سکتے ہیں جو اسے جی سے مان لیتے ہیں۔ بھلا دوسرے دھرم والا اس کے سامنے کیوں جھکنے لگا۔ پر کسی بڑی سے بڑی بھاشا کے مندر کو دیکھئے۔ الگ الگ دھرم والے کتنے اس کے پجاری نکلیں گے جو دھرم الگ ہونے پر بھی اسی دیوی کی پوجا کر رہے ہیں۔

پنجابی بولی کے پجاری۔ پنجاب کے مسلمان، عیسائی، ہندو، سکھ دھرم الگ الگ ہونے پر بھی پنجابی بولی کے سہارے کیسے ایک دکھائی دیتے ہیں۔ بھاشا اور بولی کا ایک ہونا یہ وہ امرت ہے جس کے سامنے دھرم کا الگ ہونا اور آپس کی تنا تنی بات چیت کی کڑواہٹ اس کی مٹھاس کو گھٹا نہیں سکتی۔ پنجاب سے باہر جس جگہ جی چاہے دیکھ لیجئے ایک پنجاب کا مسلمان اور ایک وہیں کا سکھ اسی پنجابی بولی کے سہارے سے ایسے پیار اور پریم کے ساتھ ہنستے ہوئے آپس میں ملتے ہیں جس کو دیکھ کر نہ جاننے والوں کو اپنایت کا دھوکا ہوتا ہے۔

دھرم اور آپس کی ان بن اور تین پانچ سے ایک بولی والوں کے من کی گہرائیاں ایسی اُونچی نیچی نہیں ہوتیں جیسی دیس اور بھاشا کے جھگڑے ٹنٹے سے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دیکھا ہوگا۔ اپنا دیس چھوڑ کے کہاں کہاں سے ان میں پڑھنے کے لئے لڑکے آتے رہتے ہیں۔ ایک ہی دھرم کے بہت سے لڑکے ایسے ملیں گے جو اپنے دھرم والوں کو چھوڑ کر اپنے دیس اور اپنی بولی بولنے والوں کے ساتھ جن کا دھرم ان سے الگ ہے ہاتھ میں ہاتھ لئے ہنستے بولتے چلے جارہے ہیں۔ دھرم کے الگ ہونے کی کوئی پروا نہ کر کے یہی پڑھنے والے اور انہیں پڑھانے والے پروفیسر دونوں کے دونوں ایسی سبھاؤں کو ڈھونڈتے ملیں گے جو اُن کے دیس کی بولی سے پورا پورا نہیں تو ادھورا ہی لگاؤ رکھتی ہوں۔

وہ بولی جس کی بھنک ماں کی گود سے کانوں میں پڑی ہو، پردیس میں کوئی اس کا جاننے والا مل جائے تو اس سکھ اور چین کا کیا پوچھنا۔ یہ دکھائی دیتا ہے:۔ مارے باندھے کی بولی بولتے رہنے سے چھاتی پر جو ایک بوجھ سا تھا، گھڑی بھر اپنی بھاشا میں بات چیت کر لینے سے وہ بھاری بوجھ اُتر کے جی ہلکا ہوگیا۔

(باقی باقی)

سید ابوالقاسم سرور

باقیاتِ فانی

کچھ بس ہی نہ تھا ورنہ یہ الزام نہ لیتے
ہم تجھ سے چھُپا کر بھی ترا نام نہ لیتے

نظریں نہ بچانا تھیں نظر مجھ سے ملا کر
پیغام نہ دینا تھا تو پیغام نہ لیتے

کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی
اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

قابو ہی غمِ عشق پہ چلتا نہیں ورنہ
احسانِ غمِ گردشِ ایام نہ لیتے

ہم ہیں وہ بلا دوست کہ گلشن کا تو کیا ذکر
جنّت بھی بجائے قفس و دام نہ لیتے

اک جبر ہے یہ زندگیِ عشق کہ فانیؔ
ہم مُفت بھی یہ عیشِ غمِ انجام نہ لیتے

آرام اسی میں تھا کہ آرام نہ لیتے
ہم صبح سے پیغامِ سرِ شام نہ لیتے

خاموش بھی رہتے تو شکایت ہی ٹھہرتی
دل دیکھئے کہاں تک کوئی الزام نہ لیتے

اللہ رے ترے دل کی نزاکت کا تقاضا
تاثیرِ محبّت سے بھی ہم کام نہ لیتے

تیری ہی رضا اور تھی ورنہ ترے بسمل
تلوار کے سایہ میں بھی آرام نہ لیتے

فانیؔ یہ نہ سمجھے دمِ آخر ہے یہی آہ
اتنے کے لئے آہ کا الزام نہ لیتے

فانیؔ بدایونی

موقع پر

(۱)

ضلع کے ہیلتھ آفیسر صاحب ماشاء اللہ ہمہ صفت موصوف واقع ہوئے تھے۔ انتہا درجے کے مغرور، نہایت خود پسند، ماتحتوں پر بیحد سخت، معمولی سی خطا بھی کسی کلرک یا ویکسی نیٹر سے ہو جاتی تو غضب آجاتا۔ معافی و درگذر، عفو اور چشم پوشی صاحب بہادر سے کوسوں دُور رہتی تھی۔ ان کے ہاں رعایت ذرا سی بھی نہ تھی۔ لیکن کام اس قدر شدت سے لیتے تھے کہ ماتحت غریبوں کی جان آفت میں تھی۔ اخلاقی سلوک بھی ان سے اچھا نہ تھا۔ نہ کسی پر اعتبار کرتے، نہ کسی کو سچا سمجھتے۔ گالی گلوچ سے پیش آنا اور تُو تڑاخ سے بولنا اُن کا روزمرہ کا شیوہ تھا۔ کوئی چھٹی مانگتا تو صاف انکار۔ ترقی چاہتا تو کام پر ہزار اعتراض۔ ذرا بھی غفلت یا سُستی ہو جائے تو فوراً جُرمانہ ہو جاتا۔ چاہے جتنی محنت سے کام کرو، نہ شاباش ملتی نہ حوصلہ افزائی ہوتی۔ جب بھی ماتحتوں سے ملتے تو اِس حالت میں کہ ؏

نتھنے پھولے، مُنہ چڑھا، ماتھے پہ بل، ابرو کھبیں

اِسی "حسنِ سلوک" کا نتیجہ تھا کہ صاحب بہادر کے سارے ماتحت اُن کے مارِ آستیں تھے۔ ظاہر میں بیحد خوشامد کرتے اور پیٹھ پیچھے دل کھول کے گالیاں دیتے۔

(۲)

چاند خاں ویکسی نیٹر ویسے تو بہت بھلا مانس اور نیک آدمی تھا۔ فرض کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی بھی نہ کرتا تھا۔ مگر اُس میں ایک "عیب" بہت بُرا تھا۔ وہ یہ کہ نہ صاحب بہادر کی خوشامد کرتا، اور نہ کبھی اُن کی کوٹھی پر سلام کرنے جاتا۔ ظاہر تھا کہ اتنا بڑا "جرم" صاحب بہادر کس طرح معاف کر سکتے تھے۔ لہذا ہمیشہ اس سے ناراض رہتے۔ اور اُس کے ہر کام پر اعتراضات کرتے رہتے۔ لیکن خبر نہیں چاند خاں کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ ہوا کے رُخ کو بالکل نہ پہچانتا۔ اور صاحب بہادر کی ذرا بھی پروا نہ کرتا۔ اِدھر صاحب بہادر ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ ذرا بھی موقع لگے تو چاند خاں کو اس کی سرکشی، آزادروی اور تکبر کی ایسی سزا دوں کہ ساری عمر یاد رکھے۔

صاحب بہادر نے اس کام کے لئے موقع کا انتظار کیا۔ لیکن چاند خاں کی ہوشیاری اور مستعدی کی وجہ سے موقع نہ آیا۔ اب صاحب بہادر نے سوچا کہ لاؤ خود موقع پیدا کریں۔ چنانچہ صاحب بہادر ضلع کے ایک ایسے گاؤں میں پہونچے، جس میں تین چار روز پہلے چاند خاں دورہ کر گیا تھا۔ اور گاؤں کے چار پانچ معزز لوگوں کو اس کام کے لئے تیار کیا کہ وہ ڈپٹی کمشنر کے سامنے اس امر کی گواہی دیدیں کہ چاند خاں ہمارے گاؤں میں بچوں کے ٹیکہ لگانے آیا تھا۔ اور جن والدین نے اپنے بچوں کے ٹیکہ نہ کرانا چاہا اُن سے فی کس دو دو روپے رشوت لیکر واپس چلا گیا۔

صاحب بہادر سے گاؤں والوں نے نہایت پختہ وعدہ کیا کہ "ہم یہ ساری گواہی ضرور آپ کے حسب منشا دیدیں گے۔ بالکل مطمئن رہیے"۔ صاحب بہادر اپنا پورا اطمینان کر کے خوش خوش اپنے مستقر پر چلے آئے۔ دوسرے دن دفتر پہونچے، اور پہونچتے ہی فوراً چپراسی کو حکم دیا: "چاند خاں کو بُلاؤ"۔

چاند خاں حاضر ہوا تو صاحب بہادر نے بہت کڑک کر اس سے کہا: "کیوں چاند خاں اب تُو نے بھی پَر پُرزے نکالے۔ تمام رام گڑھ والے تیری جان کو رو رہے ہیں کہ تو اُن سے بیس روپے رشوت کے لے آیا۔ دیکھ اب تیری ساری اکڑ کس طرح نکلتی ہے؟ مَیں صاحب ڈپٹی کمشنر کو ابھی رپورٹ کر رہا ہوں۔ برخاستگی سے کم سزا نہیں ملے گی۔ اچھا جب تک تیرا فیصلہ ہو تجھے معطّل کیا جاتا ہے۔ جا دفع ہو"۔

چاند خاں نہایت حیران پریشان مگر خاموش اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور صاحب بہادر نے فوراً ڈپٹی کمشنر کو چاند خاں کے متعلق رام گڑھ کے دس آدمیوں سے رشوت لینے کی رپورٹ کر دی۔ اور لکھ دیا کہ "میں نے خود گاؤں میں جا کر تحقیقات کی ہے۔ گاؤں کے معزز آدمی گواہی دیتے ہیں کہ ہمارے سامنے ملزم نے رشوت لی"۔

اب کیا تھا۔ چلتے مقدمہ قائم ہو گیا اور صاحب ڈپٹی کمشنر نے ایک پیشی لگا کر گواہوں کی حاضری کا حکم دیدیا۔

(۳)

تمام ویکسی نیٹروں کو چاند خاں سے قدرتاً ہمدردی تھی۔ مگر مقدمہ ایسے ڈھب کا تھا کہ کوئی شخص کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ہر چند سوچا، مگر کوئی علاج سمجھ میں نہ آیا۔ صاحب بہادر اپنی ہٹ سے کس طرح باز آتیں؟

گاؤں والے گواہی سے کس طرح رو کے جائیں ؟ دونوں باتیں ناممکن تھیں۔

ویکسی نیٹر اسی اُدھیڑبن میں تھے اور پیشی کی تاریخ آگئی۔

(۴)

گاؤں کے جتنے آدمیوں کو صاحب بہادر گواہی کے لئے تیار کر آئے تھے، تاریخ پیشی پر کوئی غیر حاضر نہ تھا۔ عدالت کے سامنے ملزم بھی موجود تھا اور گواہ بھی حاضر تھے۔ اس خیال سے کہ میری موجودگی مقدمے کے لئے نہایت مُفید رہے گی اور گواہ میرے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کہہ سکیں گے، صاحب بہادر خود بھی موقع پر تشریف لے گئے۔ اور ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔

(۵)

مقدمہ شروع ہوا۔ عدالت نے پوچھا۔

"آپ لوگوں کے سامنے چاند خاں ویکسی نیٹر نے آپکے گاؤں سے رشوت لی ؟ جو کچھ تمہیں اس کے متعلق معلوم ہے صاف صاف کہہ دو۔"

گاؤں کا چودھری آگے بڑھا اور اُس نے کہنا شروع کیا۔

"حضور! اس سے پہلے کہ اس مقدمے کی کارروائی شروع ہو، ہمارا ایک انصاف حضور ضرور فرمادیں۔ یہ ٹوپ والا صاحب جو حضور کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہے، کچھ دن ہوئے ہمارے گاؤں میں گیا تھا دو روز ٹھہرا۔ تین مُرغیاں اور تیرہ انڈے چوکیدار سے منگا کر کھا گیا۔ مگر پیسے نہیں دئے۔ اب اتفاق سے حضور کے سامنے یہ آگیا ہے تو حضور اس سے ہمارے دام دلوادیں۔ حضور کی بڑی ہی مہربانی ہوگی۔"

یہ سُنتے ہی انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ ڈپٹی کمشنر نے ہیلتھ آفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔

"آپ خود رشوت لیتے ہیں اور غریب ویکسی نیٹروں پر رشوت کے مقدمے قائم کراتے ہیں۔ فوراً اسی وقت مُرغیوں اور انڈوں کی قیمت گاؤں والوں کے حوالے کریں۔"

اگرچہ سردی کا موسم تھا مگر مارے خجالت اور ندامت کے صاحب بہادر کو پسینہ آگیا۔ وقت اور موقع ایسا تھا کہ اگر انکار بھی کرتے تو کسی کو یقین نہ آتا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب غصّے میں۔ گاؤں والے سب متفق اللفظ۔ اس حالت میں صاحب بہادر اپنی بے گناہی کس طرح ثابت کرتے۔ ناچار جیب سے چار روپے نکالے اور میز پر رکھدئے۔

چودھری نے ہاتھ بڑھایا اور روپے لیتے ہوئے ڈپٹی کمشنر سے کہنے لگا۔ "حضور آپ کی بڑی ہی عنایت ہوئی جو آپنے یہ رقم صاحب بہادر سے دلوادی ہیں تو یہ قیامت تک نہ دیتے۔ اور ہاں حضور! چاند خاں کے متعلق سچی بات یہ ہے کہ صاحب بہادر نے ہمیں گاؤں میں جاکر مجبور کیا کہ اُس کے خلاف رشوت لینے کی ہم گواہی دیں۔ مگر ہم ایسے ایمان فروش نہیں۔ جیسا بے ایمان یہ صاحب ہے۔ چاند خاں ہمارے گاؤں میں گیا بیشک تھا مگر رشوت کا اُس نے ایک دھیلا کسی سے نہیں لیا۔ حقیقت یہی تھی جو ہم نے حضور سے عرض کردی۔ آگے حضور مالک ہیں۔"

صاحب بہادر کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ ع۔

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

(۶)

ڈپٹی کمشنر صاحب نیک اور سنجیدہ انسان تھے مگر انہیں یہ حیرت انگیز ڈرامہ دیکھکر سخت غصہ آیا اور اُنہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً انسپکٹر جنرل کو ہیلتھ آفیسر کے متعلق رشوت لینے اور جھوٹا مقدمہ بنانے کی رپورٹ بھیجدی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محکمانہ تحقیقات ہوئی جس میں دونوں جُرم ثابت ہوگئے۔ اور ہیلتھ آفیسر صاحب کو برخاستگی کی سزا دی گئی۔

ماتحتوں کے لئے یہ عید کا دن تھا، بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھکر۔

محمد اسماعیل پانی پتی

مجرم کون؟

(۱) گلِ خندہ

کوئی پندرہ سال ہوئے کہ میں نے پہلی مرتبہ گلِ خندہ کو دیکھا۔ ذرا سی بچی، رنجیدہ چہرہ۔ اپنی بیمار ماں کے سہارے کھڑی رو رہی تھی۔ باپ کی طرف دیکھکر بولی: "بابا، یہی وہ فرشتہ ہے جو میری ماں کو اچھا کر دے گا"۔ باپ نے کہا: "ہاں"۔ وہ دونوں ہاتھ کھولے میری طرف دوڑی اور ٹانگوں میں لپٹ گئی: "اچھے فرشتے میری ماں کو اچھا کر دے۔ دیکھ تو"۔ یہ کہکر وہ دوڑی دوڑی اپنی گڑیا اٹھالائی "میری گڑیا، پانچ دن سے نہ نہائی نہ منہ ہاتھ دھویا کپڑے میلے ہوگئے ہیں، کرتے کے بٹن ٹوٹ گئے۔ اماں اچھی ہوں تو گڑیا نہائے دھوئے، اچھے اچھے کپڑے پہنے"۔ میں نے پیاری بھولی بچی کو گود میں لے لیا: "بیٹی ماں بہت جلد اچھی ہوجائے گی"۔ وہ تالیاں بجانے لگی۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑکر دعا مانگنے لگی: "خدایا پاک، اماں اچھی! اماں اچھی! ــ"

چار دن بعد گلِ خندہ کی ماں کو پھر دیکھنے گیا۔ نمونیہ کا اثر زائل ہوچکا تھا۔ گلِ خندہ اپنی گڑیا لائی: "اماں نے میری بانو کے کپڑے بدل دئے، وہ سلام کرنے آئی ہے اور یہ مٹھائی لائی ہے"۔ شریر بچی، ایک منی سی ٹین کی پلیٹ میں چار دانے چنے کے۔ وہ کھلکھلاکر ہنس پڑی: "مٹھائی کھا لیجئے اور کیا۔ میں بہادر کی بچی ہوں۔ ماں کے بدلے جان دے سکتی ہوں۔ کبھی ضرورت پڑے لے لیجئے گا"۔ میں نے کہا: "بیٹی گل میرا کام جان لینا نہیں۔ اللہ کا حکم ہو تو جان بچانا ہے"۔

"واہ ڈاکٹر صاحب، ہمارے بابا کہتے ہیں کہ ہمارے خاندان کے لوگ قول دیکر واپس نہیں لیتے"۔

"خندہ چپ ہو، گم شو"۔ اس کے باپ نے کہا۔

یہ تھی گلِ خندہ جس کی عمر اس وقت چھ سال کی ہوگی۔

ایک عرصہ گذر گیا۔ اور میری آنکھوں کے سامنے، میرے ہاتھوں پر اور میرے گھٹنوں پر پل پل کر گل اب صرف گل ہی نہ رہی تھی بلکہ سچ مچ گلِ خندہ بن گئی تھی۔ جس کی تمثیل اور تشکیل دونوں ناممکن تھیں۔ کبھی کبھی کہا کرتی: "میری بڑی مشکل ہے۔ کس کو چھوٹے بابا کہوں اور کس کو بڑے بابا۔ ڈاکٹر صاحب کو چھوٹے کہوں اور بیمار پڑگئی تو کڑوی دوا دینگے، اور بابا کو کہوں تو اچھے کپڑے کون دیگا"۔ گل کا باپ کہتا: "گل ابتک پاگل ہے"۔ اور میں کہتا: "بابا تم نہیں جانتے۔ میری گل پاگل نہیں خندہ ہے"۔

کوئی چھ مہینے ہوئے، گل خندہ بیمار پڑگئی۔ یہ پہلا دن تھا کہ وہ اپنا حال بتاتے ہوئے جھجکی۔ نبض دکھاتے ہوئے شرمائی اور نظر اٹھاتے ہوئے حیا و حجاب میں کھوگئی۔ اور مجھ سے اس کے باپ نے کہا: "گل تو بالکل پاگل ہے"۔ میں نے کہا: "تیرا باپ سچ کہتا ہے"۔

.... لیکن میں دن بھر کام نہ کرسکا۔

نفسیات کا مشاہدہ ہے کہ بعد از حصول چیز کے تخیل کا وجود انکارِ اصلیت سے پیدا ہوکر، تکرارِ حقیقت پر عیاں ہوتا ہے۔ وہ منحوس دن جس طرح بھی ہوا گزر گیا۔ لیکن رات اپنی تاریک خاموشی میں بجائے تسکین کے ایک تلاطم اور احساسات کی فنا کر دینے والی طوفانی موجیں لئے آئی۔ معاذ اللہ۔ گل خندہ۔ میری بیٹی۔ میں باپ کے برابر۔ پاگل پاگل پاگل۔ وہ، یا میں، پر وہ شرمائی کیوں تھی؟ اور کیوں نہ شرماتی؟ کیا دماغی نشوونما کا فعل شرمانا قدرتی امر نہیں ہے۔ عمر کا تقاضا ہے۔ اسکی زندگی کی پُراسرار تبدیلی کی نشانی ہے۔ ممکن ہے اس تبدیلی کے احساس کی کہانی ہو۔ مجھے اس سے کیا۔ میں باپ کے برابر، وہ میری بیٹی۔ پاگل۔ عمر ہی پاگل پن کی ہے...... یہ ایک سیاہ رات تھی لیکن انسان کے نفس سے پھر بھی بہت روشن۔ لیکن اس رات کی صبح ــــ چہ مبارک سحرے بود ــــ وہ صبح جس نے میرے نفس کی تاریکیوں کو رات کی تاریکیوں کے ساتھ چاک کر دیا۔ میں باپ تھا۔ اور گل بیٹی۔ میں ٹکرا کر حقیقت سے بچ نکلا۔

ایک سال اور گذر گیا۔ گل خندہ کے باپ نے اپنی عادت کے خلاف بغیر مشورہ کے گل کی نسبت ٹھہرادی۔ مجھے غصہ بھی تھا اور رنج بھی۔ شاید میں رسم کی ادائیگی میں شامل بھی نہ ہوتا۔ لیکن گل نے آگھیرا: "ابا آپ ضرور آئیں۔ دیکھیں تو وہ کیسے ہیں؟ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ آپ تو مجھے بتادیں گے"۔ "اُنکا نام آفندی ہے۔ بی۔ اے پاس"۔ گل کا چہرہ خوشی اور شرم سے اور بھی سرخ ہوگیا، جب اس نے کہا: "اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے ملازم۔ آپ کو آنا ہی پڑیگا"۔ یہ کہتی ہوئی وہ بھاگ گئی۔ میں رسم میں شامل ہوا۔ آفندی میرے

سامنے آیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑگیا اور میں کچھ کھو سا گیا۔ دُنیا بھر کے آفندی مر گئے اور گُل کے لئے یہ آفندی ملا۔ یہ آفندی جو ایک مہلک مرض میں مبتلا تھا میرا مریض۔ یہ شادی کیسے کر سکتا ہے۔ اور میری گُل خندہ سے۔ . . . . . میں وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ خندہ کا باپ سمجھا کہ میں اُس سے رنجیدہ خاطر ہوں۔

ذرا مجھ مجرم کے احساسات سے سنو۔ اگر کان رکھتے ہو۔ اور محسوس کرو اگر تم بھی قانون کی طرح صرف بُرائی کے لئے ہی ایک آنکھ نہیں رکھتے۔ ایک طرف ڈاکٹر کا اخلاقی اور آئینی فرض۔ مریض کا ہر علم صیغۂ راز ہے۔ دوسری طرف باپ کا فرض بیٹی کی طرف۔ جان پر کھیل جائے لیکن بیٹی کا بال بیکا نہ ہو . . . . سات آٹھ دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ اگر زمانے کی اس گردش میں جس کا شمار دنوں سے ہے کچھ بھی احساس ہوتا تو وہ بھی گزرنا بھول جاتی جیسے میں کام کرنا بھول گیا تھا۔ لیکن گردش بھی سرمایہ دار کی طرح بے حس ہے۔ پیستی آئی ہے، پیستی گئی اور یوں یہ آٹھ دن گذر گئے۔

پہلے دن آفندی ڈرا ڈرا میرے پاس آیا۔ میں نے اُس کو سمجھایا۔ اس کا اخلاقی فرض، خاندانی وقار، شرافت کا جوہر، ہر پہلو سے پھسلایا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ دوسرے دن دھمکی دی کہ راز فاش کر دونگا۔ لیکن گُل تو شراب بنکر سر پر چڑھ چکی تھی۔ وہ بیباک بن گیا۔ "راز فاش کر دیجئے۔ دیکھوں میرا کیا بگڑتا ہے۔" اس نے کہا۔

تیسرے دن خوشامد کی۔ وہ بازی جیت چکا تھا، ہنستا رہا۔ چوتھے دن لالچ دیا۔ وہ مالدار نکلا۔ بولا "بس ڈاکٹر صاحب سب داؤں ختم ہوگئے۔ میری عمر کم سہی لیکن اس دُنیا کا راز پا چکا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب، اس دنیا میں زندگی اتفاقات کا مجموعہ ہے۔ حوادثات اس کی لڑیاں ہیں، میرا مرض، گُل خندہ کا وجود۔ یہ بھی اتفاقات میں سے حادثے ہیں۔ کامیاب انسان وہی ہے جو اتفاقات کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ سمجھے آپ۔ اور پھر آپ کو کیا۔ آپ کی تو بیٹی بھی نہیں۔ ہاں اگر پہلے آپ کی منگیتر ہوتی تو اور بات تھی۔"

"چپ بے شرم نکل جا آفندی" میں نے کہا۔ مگر میرا قلب ایک حرکت بھول گیا۔

آفندی نے باہر جاتے ہوئے معذرت کے لہجہ میں کہا "پرسوں انجکشن کے لئے حاضر ہونگا۔"

وہ دن قہرِ خدا تھا۔ عذابِ الٰہی تھا۔ انکارِ اصلیت چشم زدن میں تکرارِ حقیقت میں تبدیل ہوگیا۔ اور میں پھر نفس کے اس بوقلموں جال میں اُلجھ گیا جو دُور سے دیکھنے والے کو زنگ آلود، آہنی اور تاریک نظر آتا ہے۔ لیکن نخچیر کو روشن، طلائی اور منوّر نظر آتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ آئینی اور اخلاقی فرض بے معنی حدود ہیں۔ اور گُل خندہ سچ مچ میری بیٹی بھی تو نہیں . . . . . زیادہ سے زیادہ بیس سال کا فرق ہوگا . . . . . میں خود گُل خندہ کو اس کا وعدہ یاد دلاؤں گا۔ اُس نے کہا تھا "جان دیدونگی"۔ میرے لئے جان دینا اس کا خاندانی فرض ہوگا۔ اور آفندی۔ وہ تو اس کا کچھ ہے ہی نہیں۔ یونہی بات چیت لگی ہے۔ پھر جب آفندی کی تمام بُرائیاں اور اُسکی بیماری ظاہر کر دونگا وہ اس سے یقینی نفرت کرنے لگے گی۔ رہا میں۔ وہ مجھ سے اُنسیت رکھتی ہے۔ اور محبت تبدیل ہو سکتی ہے۔ کیا واقعی تبدیل ہو سکتی ہے؟

گُل کا باپ اپنی بھول پر پشیمان تھا۔ معذرت کرنے لگا۔ اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ بھلا وہ میری مجبوریوں کو کیا سمجھتا؟ مجھے دیکھتے ہی گُل دوڑی ہوئی آئی "اتنے دن کہاں رہے۔ میں کئی دفعہ آپکے پاس گئی۔ آپ کے نوکر بھی کیسے گدھے ہیں۔ بیٹی کو بھی باپ سے نہیں ملنے دیتے۔ لمبا سا منہ بنایا۔ 'کسی سے ملنے کا حکم نہیں ہے' واہ واہ" باپ کے جاتے ہی اُس نے پوچھا "اچھی بتائیے آفندی کیسا ہے؟"

میرا ارادہ مصمم تھا۔ میں نے کہا "گُل سُنو، تم میری بیٹی نہیں ہو"

گُل نے کہا "یہ کب سے؟"

بھولی پاگل۔ کیا جواب دیتا۔ لکنت کھا گیا۔ "میری بات مت کاٹو گُل تمہیں یاد ہے تم نے اپنی ماں کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو میرے لئے اپنی جان بھی نثار کر دو گی۔ یاد ہے۔ کیا تم وعدہ پورا کر سکتی ہو؟ ہاں یا نہیں کہدو۔ پھر بتاؤں گا آفندی کیسا ہے؟"

اُس کی شوخی متانت میں تبدیل ہوگئی۔ اُس نے غرور سے اپنا سر اُونچا اُٹھا لیا "جی ہاں۔ مجھے یاد ہے، میں جان دینے کیلئے حاضر ہوں۔ لیکن آپ بھول گئے۔ آپنے کیا کہا تھا: بیٹی گُل میرا کام جان لینا نہیں۔ اللہ کا ہو تو ہو۔ میرا کام جان بچانا ہے۔"

چہرہ دماغی کیفیات کا آئینہ ہے۔ میں نے گُل کو کہتے ہوئے سنا "اچھے ابّا۔ آپ کو کیا ہوگیا، یہاں کرسی پر بیٹھ جائیے۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں!" یہ سب کچھ سُنا ضرور لیکن دماغی احساسات ایک لمحہ میں رنج، مایوسی، نفرت، پشیمانی، تلاطم، پاگل پن، انکارِ اصلیت، تکرارِ حقیقت کی غضبناک آگ میں سوزاں ہو کر جوہرِ نایاب کی طرح صرف شفقت میں تبدیل ہوگئے۔ وہ زانو گُل کو اُٹھایا سر پر ہاتھ پھیرا "بیٹی گُل تیرا باپ آج کل کچھ پاگل ہوگیا ہے۔ تو جانتی ہے باپ کا فرض ہے کہ بیٹی کا بال بھی بیکا نہ ہو۔ رہا آفندی۔ اُس کو میں جانتا ہوں مگر طبیب کی حیثیت سے اور

کسی مریض کا ذکر ڈاکٹر اپنی بیٹی سے بھی نہیں کر سکتا۔ کبھی۔ خدا سے دُعا مانگ کہ تیرا باپ اپنے فرائض سے منحرف نہ ہو۔ گل تیرا دل معصوم ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں کی ضرور سنتا ہے۔ اللہ تجھے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

آزمائش۔ آزمائش۔ زندگی اتفاقات کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ آزمائشوں کا سلسلہ ہے۔ کس طرح اپنے فرائض سے سبکدوش ہوں۔ شادی کی تاریخ بدلوا سکتا ہوں۔ کیوں نہ ایسا ہی کر دوں۔ لیکن شبہ جو پیدا ہو گا۔ رہنے دوں۔ لڑکی کی زندگی خراب نہ ہو جائے۔ کوئی اور طریقہ ہونا چاہیئے۔ آدھی رات بیت گئی۔ ایک بجے رات کو ایک مریض دیکھنے گیا۔ پہلے تو انکار کر دیا۔ لیکن شبہات کے نیم کش نشتروں سے چار ڈول کی تاریک سے تاریک رات اور ٹھنڈ میں سے ٹھنڈی ہوا بھی بہتر ہے۔ پُر تخیلات کے لشکر سے یوں بچ کر بھاگ نکلا۔

ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں مریضہ، کوئی اٹھارہ سال کی عمر ہو گی، دم توڑ رہی تھی۔ کیا ہوا تھا؟ بھلی چنگی تھی۔ افیم کھا لی۔ کیوں؟ ایک بڑی بوڑھی بولی "زمانہ ہی ایسا ہے۔ بے شرمی کا" لڑکی کی ماں بولی "تمہارے کلیجے کو ٹھنڈک پہونچی۔ چچازاد بھائی ہے۔ شادی کر دو چاہے بدچلن ہو۔ میری بچی کی حیا کو دیکھو، مُنہ سے اُف بھی نہ کی۔ ایسے آدمی کے ساتھ رہنے سے تو موت اچھی۔"

"خدا کے واسطے چُپ رہو" میں نے کہا۔ میرے اللہ کیا دُنیا بھر کی آزمائشیں میرے لئے ہی پیدا ہوئی تھیں۔ اس لڑکی کو مرنے دوں جوان مرگ شادی سے تو بچ جائیگی۔ اور اگر تریاق کا انجکشن دوں۔ میرا فرض ہے۔ لیکن عمر بھر دوزخ میں جلے گی۔ دوزخ سے بچنے کے لئے موت۔ موت۔ انجکشن۔ زہر۔ شادی۔ کیا؟ شادی۔ زہر۔ انجکشن۔ موت، بالکل آسان۔ آفندی۔ شادی۔ انجکشن۔ زہر۔ موت۔ اور گل خندہ بچ گئی۔ میرا رات کو اتنی دُور آنا کارآمد ہوا۔ غریب کے تاریک مکان میں روشنی دکھائی دی۔ ہابیل قابیل کی کہانی اس صدی میں بھی دُہرائی جاتی ہے۔

آج سویرے وقت سے پہلے اپنے ہسپتال پہونچا۔ نرس کو بُلا کر پچکاری صاف کروائی۔ دوبارہ خود احتیاط سے صاف کی۔ کتنا آسان کام ہے۔ آٹھ دن پریشان رہا۔ صرف دو گنی مقدار کی وہی دوا علاج بھی اور زہر بھی۔ جلد تیار کر لینی چاہیئے۔ مریضوں کا وقت ہونے والا ہے۔ گھڑی کس زور سے ٹک ٹک کر رہی ہے۔ کچھ تیز بھی چل رہی ہے۔ نہیں تو۔ یونہی اسکی آواز سے تنہائی میں دل گھبراتا ہے۔ لیکن میں نے اسکی ٹک ٹک کا احساس آج سے پہلے کبھی نہیں کیا۔" نرس دروازہ آہستہ سے بند کر دو۔ ابھی میرے ہاتھ سے پچکاری گر جاتی۔" ڈاکٹر دروازے پر تو ربر لگا ہوا ہے۔" ربر ہے لیکن دھکا کا ضرر ہوا۔ ربر خراب ہو گیا ہو گا۔ آج بدلوا دو۔ اور دیکھو اس پچکاری کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ انجکشن تیار ہے۔ میں کیس بند کر دیتا ہوں۔ تم مجھے کیوں حیرت سے دیکھ رہی ہو"

"جی نہیں تو۔"

"نہیں۔ اوہ! میں تمہیں حیرت سے دیکھ رہا ہوں۔"

"ڈاکٹر پندرہ منٹ سے مریض میز پر انتظار کر رہا ہے۔"

"مریض، کون مریض۔ ابھی وقت نہیں ہوا۔"

"پندرہ منٹ ہو چکے۔"

"جواب مت دو جی۔ ابھی نہیں دیکھتا۔ میرا مطلب ہے، ابھی آتا ہوں۔"

.... دس بج گئے اور آفندی آگیا.... بے پروا اور بیباک۔ میں تیار تھا۔ کسی شکاری سے دریافت کیجئے کہ وہ کس شوق سے شکار کی سمت نظر اٹھاتا ہے۔ میں نے بھی اُسی شوق سے آفندی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک حسین جوان تھا۔ زندہ رہنے کے قابل۔ اور اُس کو زہر دینا ہو گا۔ پھر الف لیلہ دُہرائی پڑیگی۔ وہی بیہودہ خیالات۔ اور آزمائش۔ میرا فرض ہے اس کو زہر دینا۔ اور ڈاکٹر کا فرض؟ خوب ایک فرضی فرض کی خاطر اصلی فرض کو نثار کر دو گے۔ ہرگز نہیں۔ میں زہر کا انجکشن نہیں دوں گا۔ آفندی میرے پاس کھڑا تھا۔ میں نے دوسری پچکاری نکالی۔ علاج کے مطابق دوا بھری۔ میز پر رکھ دی۔ میں بہت خوش تھا اور قلبی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ ایک مریض نے کچھ پوچھا۔ اس کو جواب دیا۔ ایک گونہ محبت سے آفندی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اندر کے کمرے میں گیا۔ آفندی کوٹ اُتار کر میز پر لیٹ گیا۔ کہنے لگا "ذرا جلدی کیجئے۔ مجھے جانا ہے۔" میں نے نرس کو آواز دی "نرس وہ پچکاری دیجاؤ۔"

"آفندی تم بڑے جلد باز ہو اور شوخ۔ مجھے معلوم ہے کہاں جانا ہے۔ گل کے گھر۔" اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی۔

"تم بہت خوش ہو۔ میں بھی آج بہت خوش ہوں۔" میں نے احتیاط سے سوئی ورید میں داخل کرتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہے کیوں خوش ہوں اس لئے کہ میں ایک آزمائش سے بچ نکلا۔"

آفندی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "آج کی دوا بہت تیز ہے۔ گلے میں خشکی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔"

میری نظر اُس کے چہرے سے پچکاری پر پڑی۔ وائے قسمت، نرس نے پہلی زہر کی پچکاری مجھے لا دی۔ اس کو کیا معلوم کہ دوسری میز پر رکھی ہے۔ اب میں کیا کر سکتا تھا۔ زہر خون میں مل چکا تھا۔

"آفندی۔ آفندی۔ حادثہ۔" اُس نے بچپن نگاہوں سے میری طرف دیکھا

"ہاں آفندی تم اُس دن کیا کہتے تھے۔ اس دُنیا میں زندگی تفاقات کا مجموعہ ہے، اور حوادثات اُس کی لڑیاں ہیں۔ آفندی گھبراؤ مت، یہ بھی ایک حادثہ ہے۔ ہماری زندگی کی آخری کڑی۔ آفندی اس قدر ڈراؤنی آنکھوں سے مجھے مت دیکھو۔ پریشان مت ہو، اپنی شادی کا خیال کرو۔ گل خندہ کا خیال کرو۔ تمہارا خیال تھا کہ تم ناپاک ارادوں سے ایک معصوم گل کو برباد کر دوگے۔ قدرت کو منظور نہ تھا۔ وہ میری بیٹی ہے۔ اب اس کا بال بیکا نہ ہوگا۔ میں کیا کرنا چاہتا تھا کیا ہوگیا — سنتے ہو آفندی — اب کیا حال ہے؟"

"پانی! خدارا پانی دو" بمشکل آفندی کے مُنہ سے الفاظ نکلے۔

"ہاں آفندی پانی پی لو۔ اچھی طرح پیاس بجھالو۔ اور اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کرلو۔ جب تمہارے گناہ بخشے جائیں تو میرے ناکردہ گناہ کے لئے دُعا کرنا۔ تم اگر اُس دن میری بات مان جاتے تو یہ حادثہ نہ ہوتا اور تمہاری زندگی کی لڑیاں اس اتفاق سے بچ جاتیں۔"

آفندی نے پہلے چند قطرے اور پھر دو تین گھونٹ پانی پیا۔ اسکی حالت ناگفتہ بہ تھی پھر بھی اُسکی آنکھوں میں کرب و بےچینی کے بجائے فہم کی چمک پیدا ہوگئی۔ اس نے کوشش کی اور غیر مربوط لفظوں میں کہنا شروع کیا

"ڈاکٹر کس، کس لئے۔ ز۔ ہر۔ دیا۔"

"آفندی میں نے نہیں دیا۔ کاش کہ جان بوجھ کر دیتا۔ اس میں کم ازکم لطف کردار تو ہوتا۔"

وہ کوشش کرتے ہوئے ہنسا۔ "اس لئے کہ... میں گل خندہ سے شادی نہ... نہ کرسکوں۔ وا... واللہ زندگی دُنیا میں اتفا۔ ق... آت کا مج..... موعہ ہے... اور... اور... حوادثات۔ اُس... اُسکی... لڑیاں۔ پ۔ پانی۔ شکریہ... تم کر گزرے... باپ کا حق... ادا کیا... لیکن بدقسمت ہو... لذّتِ عمل سے... محروم... زہر دیدیا... حادثہ ہے... آخری کڑی... نہیں... ایک اور... اور باقی ہے۔ میرا راز... میرا راز... تم نے نہیں بتایا... اخلاقی فرض... ادا کیا... لیکن دُنیا... میں سب... تم جیسے نہیں... سُنو فتح میری ہی رہی... میں۔ پانی... شکریہ... میں ہمیشہ اتفاقات میں... کامیاب ہوا... آخری لڑائی... میرا۔ ان... انتقام ہے... سُنو۔ ڈاکٹر... سُنو۔ یہ بھی... ایک... حادثہ... ہے... کہ میری... منگنی... گل خندہ... سے... کل... شام... ٹوٹ چکی ہے —" اور وہ آفندی ایک آخری کوشش کے ساتھ ایسا کھلکھلا کر ہنسا جیسا کہ ایک فاتح اور کامیاب ہی ہنس سکتا ہے۔ اور اسی طرح ہنستے ہنستے خاموش ہوگیا۔

ڈاکٹر ہاشمی؛

تجلّیات

تیرے ہر ناوک کو دل میں آسرا دیتا ہوں میں — دیکھ! اُلفت دُشمنی کا یہ صلہ دیتا ہوں میں

تابِ غم مجھکو نہیں یہ بدگمانی اُن کو ہے — حالِ دل وہ پوچھتے ہیں مُسکرا دیتا ہوں میں

بڑھ کے کفرِ عشق تک پہونچا ہے ذوقِ بندگی — اپنے ہر نقشِ قدم پر سر جھکا دیتا ہوں میں

بے نظر، بے جلوہ، تجھکو دیکھتا ہوں برملا — چشمِ نظارہ سے ہر پردہ اُٹھا دیتا ہوں میں

وہ ستم سے باز تو آیا! کسی صورت سہی — مختصر یہ ہے کہ دُشمن کو دُعا دیتا ہوں میں

بیدلی کے غم سے بھی محروم کرتا جا مجھے — تجھکو نازِ دلبری کا واسطہ دیتا ہوں میں

دُور سے دلکش اشارے میں سمجھ سکتا نہیں — دل تجھے درکار ہے؟ نزدیک آ دیتا ہوں میں

منعکس کرتا نہیں پھر بھی جمالِ روئے دوست — بار بار آئینۂ دل کو جِلا دیتا ہوں میں

وجہِ رُسوائی نہ ہو تابش کہیں اُن کے لئے
داغِ دل کچھ بھی سہی لیکن مٹا دیتا ہوں میں

تابش دہلوی

گیسو دراز

جے پور کی پرانی راجدھانی آمیر اپنی نوعیت اور قدامت کے اعتبار سے راجپوتانہ کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اسکے راستہ کا طویل پیچ و خم جو ایک بلند کوہستانی سلسلہ سے ہوکر گزرتا ہے اپنی متعدد دلفریبیوں کے باوجود چشمِ حقیقت نگر کیلئے حیاتِ انسانی کی تفسیر کا ایک عبرت آموز ورق ہے۔

آمیر سے متصل ایک وسیع اور سنسان میدان میں ایک قدیم اور غیر آباد عمارت استادہ ہے جو "جل محل" کے نام سے موسوم ہے۔ کسی کتبہ یا تاریخی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ "جل محل" کب، کس لئے اور کون سے راجہ کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا۔ لیکن عمارت کی مضبوطی اور بنیاد کی پختگی زبانِ حال سے عرفی کا مصرعۂ معروف "آثار پدید ست صنادید عجم را" دہرایا کرتی ہے۔ قرب و جوار میں بہت دور تک کوئی آبادی نہ ہونے کے باعث "جل محل" کے ساتھ بہت سی مشکوک روایات وابستہ ہوگئی ہیں اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عرصہ سے اس پر بھوتوں کا استھان ہے اور اسی وجہ سے آج تک کسی شخص کو اُس طرف تنہا جاتا ہوا نہیں دیکھا گیا۔

کوئی ڈیڑھ سال گزرا ہوگا اس جل محل میں کہیں باہر سے ایک فقیر آکر مقیم ہوئے۔ چونکہ اس غیر آباد اور خطرناک مقام کی طرف کوئی دلیر سے دلیر آدمی بھی کبھی رُخ نہ کیا کرتا تھا اس لئے فقیر موصوف کا وہاں شب و روز قیام کرنا معجزہ سے کچھ کم نہ تھا۔ پھر اُن کا تقدس مآب چہرہ، چمکتا ہوا رنگ، پھیلا ہوا سینہ، چوڑی پیشانی، ستواں ناک، گول گول سیاہ آنکھیں، خشخشی ڈاڑھی اور لمبے لمبے گیسو تسخیرِ قلوب کا حکم رکھتے تھے۔ ان کی کم گوئی، خاموش منشی اور بے طمعی نے بہت جلد اُن کے تقدس کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا۔ اور عام طور پر وہ "میاں گیسو دراز" کے نام سے پکارے جانے لگے۔

سب سے بڑی کسوٹی جو اس زمانے میں پیروں اور فقیروں کو پرکھنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے استغنا ہے۔ اور اُسی قدر متقی، خدا رسیدہ اور صاحبِ مکاشفہ کسی پیر کو خیال کیا جاتا ہے جتنا اس کے لئے یہ مشہور ہو کہ وہ کسی سے کچھ لیتا دیتا نہیں۔ یہی صفت ہمارے "گیسو دراز" کے ساتھ مخصوص تھی۔ طمع سے اُن کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ کسی سے لینا تو الگ رہا اکثر وہ خود لوگوں کو اٹھنیاں، چونیاں اور دوانیاں تقسیم کیا کرتے تھے اور معتقدین اپنی اپنی سمجھ اور استعداد کے مطابق اُن سے پُر اسرار مطالب اخذ کیا کرتے تھے۔

ایک مدت گزر گئی اور اسی طرح صاحبانِ غرض جوق در جوق "میاں" کی خدمت میں حاضر ہو ہوکر اپنے دامنِ امید کو گوہرِ مراد سے بھرتے رہے۔ خوش عقیدگی یہاں تک بڑھی کہ اکثر و بیشتر یہاں عورتوں نے بھی آنا شروع کیا۔ بلکہ تسخیر کا یہ عالم تھا کہ عمائدینِ شہر کو بھی میاں نے کھینچ بلایا اور جل محل کے سہانے موٹروں، بگھیوں اور بہلیوں کا ہر وقت جمگھٹ لگا رہتا تھا۔

نوخیز رشیدہ کا شوہر عقیل تین مہینے سے گم تھا۔ عقیل کے والد سعید مرزا نے اپنے لختِ جگر کی تلاش میں سینکڑوں روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔ اخباروں میں نکلوایا کہ جو کوئی عقیل کا پتہ دیگا اُس کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ خود شہر در شہر مارے مارے پھرے مگر کہیں عقیل کا پتہ نہ لگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عقیل سعید مرزا کے بڑھاپے کا عصا اور اُن کی ضعیفی کا سہارا تھا۔ ان کو عقیل کی جدائی کا جتنا بھی رنج ہوتا کم تھا۔ مگر اُس کی گمشدگی کا اثر جتنا رشیدہ کی ذات کے ساتھ وابستہ تھا کسی دوسرے کے ساتھ نہ ہو سکتا۔ بدنصیب رشیدہ نے سینکڑوں تعویذ گنڈے اور ہزاروں جتن کئے مگر بے سود۔ شہر میں جو "میاں گیسو دراز" اور اُن کے کرامات کی خبر مشہور ہوئی تو مایوس اور حرماں نصیب رشیدہ کے کان میں بھی بھنک پڑی۔ سوچا کہ جہاں اتنی تدبیریں کی ہیں ایک آخری جتن یہ بھی سہی کہ گیسو دراز کی بارگاہ میں جاکر خشوع و خضوع کے ساتھ اپنی التجا پیش کروں۔ کاش وہ کچھ توجہ کریں . . . . . !

عورت کو اپنے جذبات پر جو قدرت ہوتی ہے مرد اُس کا عشرِ عشیر بھی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ہرچند وہ فرقت کی آگ میں جلتی تھی اور کبابِ سیخ کی طرح پہلو پر پہلو بدلتی تھی مگر یہ ممکن نہ تھا کہ وہ فرطِ جوش پر کوئی ایسا کام کر گزرتی جو ایک نوعمر لڑکی کے شرم و حیا کے منافی ہوتا۔

گھر میں اللہ رکھے دو دو دیور اور دو دو مامائیں تھیں اگر چاہتی تو ان میں سے کسی کی زبانی اپنے دل کا درد "میاں" کو کہلا سکتی تھی، مگر شرم مانع آتی تھی کہ دل پر جو گزر رہی ہے وہ گھر میں کس کو سنائے۔ کئی روز اسی تشویش میں گزر گئے مگر کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک طرف تو بے پناہ شرم و حیا تھی جو ادھر رخ کرنے میں مانع آتی تھی، دوسری طرف میاں گیسو دراز کی عالمگیر شہرت اور اُن سے رجوع کرنے میں کامیابی کا یقین دامنِ دل کو کھینچتا تھا کہ چل اور چل......

٭٭٭

موسمِ گرما کی رات ہے۔ پچھلے پہر کی خاموش فضا میں گرجا کے گھنٹے نے تین بجائے۔ رشیدہ نے ہلکی سی انگڑائی کے ساتھ کروٹ بدلی اور گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک سناٹا تھا۔ اور نسیمِ صبحگاہی سب کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔ وہ چارپائی سے اُٹھی۔ آہستہ سے دوپٹہ سنبھالا، دو منٹ کھڑی رہی اور کچھ سوچ کر پھر بیٹھ گئی.........

دس منٹ کے بعد وہ پھر اٹھی۔ چاروں طرف دیکھ کر کسی بات کا جائزہ لیا اور چپکے سے گھر سے نکل گئی۔

٭٭٭

"آمیر کے راستہ میں جو جل محل ہے وہی نا؟ بچی میں آمیر جاتے ہوئے میں نے بارہا دُور سے جل محل کو دیکھا ہے۔ اسی میں گیسو دراز رہتے ہیں۔ سنا ہے بڑے رحمدل اور خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ یقیناً وہ مجھ پر رحم کریں گے اور کوئی نقش ایسا دیں گے کہ 'وہ' واپس آجائیں۔ گیسو دراز نے سینکڑوں اُمیدواروں کی اُمیدیں اور ہزاروں آرزومندوں کی آرزوئیں پوری کی ہیں۔ وہ ضرور میری بھی مدد کریں گے۔ میں اُن سے التجا کرونگی اُن کے قدم پکڑ لوں گی۔ اپنی عصمت اور اُن کی بزرگی کا واسطہ دلا کر مدد کی درخواست کروں گی۔ وہ سُنیں گے اور ضرور سُنیں گے اور خدا سے دُعا کرینگے کہ میرے......... 'وہ' آجائیں۔ اُن کے آنے پر میں بڑے پیر صاحب کی نیاز دلاؤں گی اور گیسو دراز کی خدمت میں آمیر کی گھنجیاں[1] بھجواؤں گی۔ (قدم تیز اٹھنے لگتے ہیں) اُف! اُن کے واپس آنے کا خیال کتنا دلکش اور روح افزا ہے۔ میرے بہارِ حُسن کے گلچیں، میری اُجڑی تمناؤں کے بسانے والے، میرے ارمانوں کی دُنیا، میرے سرتاج، میرے آقا، واپس آجائیں گے۔ سب گھر والے خوشی کے مارے پھولے نہ سمارہے ہونگے اور میں دل ہی دل میں مسکراؤنگی کہ یہ محض گیسو دراز کی جوتیوں کا صدقہ ہے (اور تیز قدم) رات کو جب وہ میرے کمرے میں آئیں گے تو میں سوجانے کا بہانہ کرکے لیٹی رہونگی۔ مجھے سوتا دیکھ کر وہ کچھ جھجکیں گے۔ پھر محبت سے میری نزدیک بیٹھ جائیں گے اور اپنے ریشمیں رومال سے ہلکے ہلکے میری پیشانی کا پسینہ پونچھیں گے۔ میں بے حس و حرکت پڑی رہونگی۔ وہ چپکے سے میرے زیرِ بغل گدگدائیں گے۔ میں سنجیدگی کے ساتھ کروٹ بدل لونگی۔ اُن کو میری دل آزاری کا احساس ہوگا اور اتنے عرصے اپنے غائب رہنے کی تاویل کرنا چاہیں گے۔ میں اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے الگ بیٹھ جاؤں گی اور خوب خوب قائل کرونگی کیا اسی برتے پر پیمانِ وفا باندھا تھا۔ جو یوں تنہا چھوڑ کر چلتے ہوئے۔ آپ کو تو سیر سپاٹے سوجھتے ہیں۔ آپ کو کسی کی فکر کیوں ہونے لگی، وہ اپنی گردن نیچی کئے ہوئے میری ساری شکایتیں سنیں گے اور پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی ندامت کا اعتراف کرینگے۔ اور جوشِ محبت میں مجھے اپنے دونوں بازوؤں میں لیکر زور سے بھینچیں گے، اتنی زور سے کہ........"

جل محل آگیا۔ رشیدہ اپنے بدن میں ایک سنسنی سی محسوس کر رہی تھی۔ کچھ ٹھٹکی، رُکی، بار بار واپس ہوجانے کا ارادہ کرتی تھی۔ مگر دل کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی کھینچے لئے جارہا ہے۔ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھی۔ نبض کی حرکت تیز ہوتی جارہی تھی اور دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ ہلکے سے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے کسی نے پوچھا "کون ہے؟"

"ایک بدنصیب خاتون" رشیدہ نے جواب دیا۔

گیسو دراز نے رشیدہ کو اوپر بلایا اور تمام حال سنا۔ پھر تسلی دیتے ہوئے ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

٭٭٭

صبح سات بجے گیسو دراز کے عقیدتمندوں کا گروہ جو جل محل پہونچا تو ایک ہولناک واقعہ درپیش تھا۔ میاں گیسو دراز کا کہیں پتہ نہ تھا اور ایک نوعمر لڑکی کی لاش بارہ دری میں پڑی ہوئی تھی۔ پولس کو اطلاع دی گئی۔ (راقم الحروف) سپرنٹنڈنٹ پولس موقع پر پہونچا اور معائنہ سے ظاہر ہوا کہ لڑکی کے بائیں ہاتھ میں ایک ہیرے کی انگوٹھی تھی جس کو چوس کر اس بدنصیب نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ میں ابھی گیسو دراز کی تفتیش میں مصروف ہوں۔

محمد علیخاں۔ آنر۔ ایم۔ اے

[1] آمیر کی ایک خاص مٹھائی ہے۔

شوہر کی نشانی

گرمیوں کا موسم تھا۔ میں بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا کہ سید صاحب تشریف لے آئے۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں ایک بچہ کہیں سے آنکلا۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ جوڑ کر بولا "حجور کھپن (کفن) لے دو!"

ایک معصوم بچے کی زبان سے یہ خوفناک الفاظ سن کر دل کانپ ہی تو گیا۔ بھولی بھالی صورت، میلے کچیلے کپڑے، گورا چٹا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، چہرے پر معصومیت کی جھلک، کچھ ایسے ہی ہاتھ جوڑے اور سر جھکائے سامنے کھڑا تھا۔

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"ہم گریب ہیں" اس نے اسی طرح بھولے پن سے کہا، "اماں کہتی ہے کھپن لے دو"

"ابے!" سید صاحب نے ایک پیسہ دکھلا کر پوچھا "پیسہ لیگا ــــ؟"

بچے نے للچائی ہوئی نظروں سے پیسے کی طرف دیکھا اور پھر کہا تو یہی کہا "اماں نے کہا ہے کھپن لے دو"

"تمہارا باپ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بھولے پن سے بولا "اماں کہتی ہیں ابا سو رہے ہیں"

"تمہاری ماں کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"باہر ہے" اس نے جواب دیا۔

"جاؤ!" میں نے کہا "اسے بلا لاؤ!"

بچہ بھاگا بھاگا گیا اور اپنی ماں کو ساتھ لے آیا۔

"بی بی!" میں نے پوچھا "تم کون ہو؟"

"بیکس ہوں جناب!" عورت جو برقعہ پہنے ہوئے تھی، بولی "رحم کیجئے!"

"یہ بچہ کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے باپ کیلئے کفن مانگتا ہے جناب! غریب صبح سے بے گور و کفن پڑا ہے"

یہ خوفناک الفاظ سنکر میرے دل پر چرکا سا لگا۔ لیکن عورت کا ضبط و تحمل قابلِ تعریف تھا۔

سید صاحب نے جیب سے ایک اٹھنی نکال کر بچے کے ہاتھ پر رکھدی۔ لیکن عورت نے برقعہ میں سے ہاتھ نکالا اور بچے کے ہاتھ سے اٹھنی لیکر بولی "اس میں کیا ہے گا جناب! میں بھکارن نہیں۔ لیکن کیا کروں۔ قسمت میں یہ دن بھی تو دیکھنا تھا"

بات کرنے کا انداز اور خوبصورت ہاتھ شاہد تھے کہ واقعی وہ بھکارن نہیں۔

"بی بی!" میں نے پوچھا "تم کہاں رہتی ہو؟"

"جنگل کے پاس" وہ بولی "دریا کے نزدیک"

"جنگل کے پاس!" میں نے تعجب سے کہا "دریا کے نزدیک؟"

"جی ہاں!" وہ بولی "میری بپتا پھر کسی وقت سن لیجئے گا۔ فی الحال تو نام اللہ اگر ہو سکے تو کفن کا انتظام کر دیجئے"

لیکن یہ الفاظ کہنے کے ساتھ دامنِ صبر و تحمل بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ روتے ہوئے بولی "اس غریب کی تو لاش کے پاس بھی کوئی بیٹھنے والا نہیں"

ماں کو روتے دیکھکر بچے کی پیاری پیاری آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے۔

"صبر کرو بی بی!" میں نے کہا تھا "ابھی انتظام ہوا جاتا ہے"

اس کا جواب ایک دلخراش آہ تھی۔

میں نے نوکر کو بھیجکر ضروری سامان منگوایا۔ پڑوس کی مسجد سے ملا کو ساتھ لیا۔ جب تانگوں میں سوار ہونے لگے تو سید صاحب بولے "جنازہ اٹھائیگا کون؟"

عورت ایک آہ بھر کر بولی "وہیں کہیں گڑھا کھود کر دفنا دیجئے"

"نہیں!" سید صاحب بولے "تم چلو۔ میں کچھ انتظام کر کے ابھی آتا ہوں"

دریا سے ذرا ہٹ کر جنگل میں ایک کنواں تھا اور کچھ مزروعہ زمین تھی۔ ایک پیپل تھا اور اسی پیپل کے سائے میں ایک جھونپڑی تھی۔ اس جھونپڑی میں ایک کھاٹ، پر وہ اللہ کا بندہ حیات سے دی

کے مزے لے رہا تھا جس کے لئے اس کی بیوہ اور ایک معصوم بچہ کفن مانگ کر لاتے تھے۔ ملا جی نے میرے نوکر کے ساتھ مل کر اُسے غسل دیا پھر کفن پہنایا اور آخری منزل کے سفر کے لئے تیار کر دیا۔ بدنصیب عورت بچے کو گود میں لئے الگ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ بچہ ماں سے کہہ رہا تھا۔

"امی! اب ابا اُٹھتے کیوں نہیں؟"

"امی! ابا نے آج نئے کپڑے کیوں پہنے ہیں؟"

"ہمیں بھی نئے کپڑے لے دو امی!"

"امی! ابا سو رہے ہیں کیا۔ ہم بھی اُن کے پاس جائیں!"

آپ جانتے! یہ الفاظ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں اس جگہ سے ہٹ کر راستے پر آکھڑا ہوا اور سید صاحب کی راہ دیکھنے لگا۔ ملا جی میت کے پاس بیٹھے قرآن حکیم کی تلاوت کر رہے تھے، خاصے خوش الحان تھے۔ ایک جنگل دوسرے ایک بیکس عورت کی آہیں۔ اور موت کی بھیانک تصویر۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچا ہوا تھا۔ دور کسی پیڑ پر سے کوئل کی کوک طبیعت پر اور بھی چرکے لگا رہی تھی۔ اتنے میں سید صاحب چار آدمی لیکر آگئے۔

"غسل دیدیا؟" انہوں نے آتے ہی پوچھا۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر میت اُٹھائیں؟" سید صاحب بولے

"لے کہاں جایئے گا؟" میں نے پوچھا۔

یہ سُنکر سید صاحب بھی کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کہنے لگے، "یہیں کہیں دفن کر دیں؟"

وہ عورت پاس آکر بولی: "کیا سوچتے ہیں آپ؟"

"یہ کھیت کس کے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"زمیندار کے ہیں!" اس نے جوابدیا۔

"تو اس سے پوچھنا چاہئیے!" میں نے سید صاحب کی طرف دیکھکر کہا۔

"کچھ مجھ سے تو کہئے" عورت بولی "بات کیا ہے؟"

"قبر کے متعلق سوچتے ہیں" میں نے کہا۔

"وہ شیشم کے درختوں کے اس پار گاؤں ہے" عورت نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہاں گاؤں والوں کا قبرستان بھی ہے"

"تو بس!" میں نے کہا "وہاں ہی لے چلتے"

اور سید صاحب نے پوچھا "ان کھیتوں کا مالک بھی تو وہیں ہوگا؟"

"وہ تو جناب چھ مہینے سے قید میں پڑا ہے" عورت نے جواب دیا۔

جب ہم لوگوں نے جنازہ اُٹھایا تو اس بدنصیب عورت کی بیقراری اور آہ و زاری دیکھی نہ جاتی تھی۔ روتی تھی اور چارپائی سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ ادھر معصوم بچہ ماں سے لپٹ لپٹ کر رو رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔

"امی! یہ لوگ ابا کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"ہم بھی جائیں گے امی ساتھ!"

"ابا! ہم سے بولتے کیوں نہیں امی"

معصومیت کی یہ باتیں سُنکر اور یہ دلخراش منظر دیکھکر میرے آنسو بھی گرنے لگے۔ خدا بھلا کرے سید صاحب کا انہوں نے عورت اور بچے کو تسلی دی اور ہم انہیں اسی جگہ چھوڑ کر جنازہ گاؤں کی طرف لے گئے۔

اللہ! اللہ! یہ گاؤں والے بھی کتنے سادہ دل اور سادہ مزاج لوگ ہوتے ہیں۔ جو شخص جنازے کو دیکھتا کام چھوڑ کر کندھا دینے آجاتا۔ ان لوگوں نے کمال ہمدردی سے اپنے قبرستان میں خود ہی قبر کھودی۔ ان میں سے اکثر مرنے والے کو جانتے تھے۔ کوئی دو بجے تک ہم اس مقدس فرض سے فارغ ہو گئے۔ سید صاحب نے ان آدمیوں کو جنہیں ہم شہر سے ساتھ لائے تھے حق خدمت دیکر رخصت کر دیا۔

ہم دونوں جھونپڑی کی طرف واپس چلے۔ سید صاحب بولے "بہت حساس دل ہے آپکا"

"طبیعت کی کمزوری سمجھئے!" میں نے کہا "مجھ سے تو کسی کو مصیبت میں گرفتار دیکھا نہیں جاتا"

"دلِ دردمند تو ایک نعمت ہے!" سید صاحب نے کہا۔

"سید صاحب!" میں نے کہا "اب اس عورت کا کیا بنے گا"

"میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں" سید صاحب نے جوابدیا۔

اسی طرح باتیں کرتے کرتے ہم اس جگہ جہاں ہم اُس عورت کو چھوڑ آئے تھے، پہونچ گئے۔ بچہ گھاس پر سو رہا تھا اور وہ بدنصیب

ایک پھٹا پرانا کوٹ زانو پر رکھے رو رہی تھی۔ غالباً یہ مرنے والے کی نشانی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اُس نے گھونگھٹ نکال لیا۔ ہم دونوں اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔

"بی بی!" میں نے کہا "اب صبر کرو۔"

"ہاں جناب!" وہ بولی "آج نہ سہی کل سہی! اب صبر کے سوائے میرے لئے رہ ہی کیا گیا ہے۔"

"اللہ مالک ہے!" میں نے کہا "جس نے پیدا کیا ہے وہ جینے کا سامان بھی کر دیتا ہے۔"

"سچ ہے جناب!" وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "اگر کفر نہ ہو تو اتنی بات تو میں بھی کہہ دیتی کہ اللہ نے تو ہم غریبوں کو ایک مدت سے بھلا رکھا ہے۔"

"بی بی!" میں نے کہا "اللہ کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں۔" اتنے میں بچہ بھی جاگ پڑا اور آنکھیں مل مل کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"یہ لوگ ابّا کو کہاں چھوڑ آئے امّی؟" اُس نے ماں کی گود میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ میاں کے پاس!" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے کسی ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح پھر آنسو گرنے لگے۔

"اب ارادہ کیا ہے بی بی؟" میں نے پوچھا۔

"در در کی ٹھوکریں نظر آ رہی ہیں!" اُس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"تم کہیں جانا چاہو تو ہم تمہارے بھیجنے کا انتظام کر دیں۔" میں نے کہا۔

"میرا اب دنیا میں کوئی نہیں" وہ بولی "اللہ کے بعد جس کا سہارا تھا اُسے آپ مٹی میں دبا آئے۔"

"گھبراؤ نہیں" سید صاحب بولے "تمہارا بچہ کوئی دن میں جوان ہو جائیگا۔ دن سدا ایک سے نہیں رہتے۔"

"جو اللہ کی مرضی!" اُس نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"اب تم جاؤ گی کہاں؟" سید صاحب نے پوچھا۔

"بھیک مانگوں گی جناب!" اُس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"مایوس نہیں ہونا چاہیئے!" میں نے کہا "اللہ کارساز ہے۔"

"مجھے اپنی تو فکر نہیں" وہ بولی "فکر تو اس معصوم جان کی ہے۔ جسے ہوش سنبھالتے ہی بھیک مانگنا پڑی۔ جب تک وہ جیتے ...."

لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

***

"کیا کیا جائے!" میں نے سید صاحب سے انگریزی میں کہا۔

"گھر میں ماما کی ضرورت ہے!" سید صاحب نے بھی انگریزی میں ہی جواب دیا "شاید یہ کچھ کام کاج کر سکے۔"

"ضرور موقع دیجئے اسے!" میں نے کہا "کچھ میں بھی کوشش کروں گا۔"

"بی بی!" سید صاحب بولے "تم چاہو تو ہمارے یہاں چل رہو۔ کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔"

"خدا بھلا کرے آپ کا" وہ بولی "میرے لئے تو آپ رحمت کے فرشتے بن گئے۔"

"تو پھر اُٹھو!" سید صاحب نے کہا "سامان لے لو تانگہ موجود ہے۔"

"سامان!" اُس نے جھونپڑی کی طرف حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا "بس یہی ایک کوٹ اُن کی یادگار ہے۔"

اس واقعے کے دو چار روز بعد میں تبدیلِ آب و ہوا کے لئے پہاڑ پر چلا گیا۔ اور یہاں "سرابِ ہستی" یا "دھرم پتنی" لکھنے میں اتنا مصروف رہا کہ احباب سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی کچھ بند ہو گیا۔ ایک روز سید صاحب کا خط آیا اُس میں اس عورت کا بھی ذکر تھا۔

"لیجئے! وہ غریب بھی چل بسی۔ لیکن دمِ واپسیں تک آپ کو دعائیں دیتی رہی۔ اس دکھیاری کی داستان آپ کے لئے ایک نہایت الم انگیز افسانے کا سامان فراہم کر دے۔ تو اچھا ہے۔"

میں پہاڑ سے جب واپس آیا تو سید صاحب سے پہلی ہی ملاقات میں اس عورت کا ذکر آ گیا۔

میں نے پوچھا "ہاں! یہ تو بتائیے اُسے ہوا کیا؟"

"غم کھا گیا اُسے!" سید صاحب نے جواب دیا "واللہ! بڑی ہی نیک اور باسلیقہ عورت تھی۔ مرنے سے چند روز پہلے اُس نے مجھ کو اپنا قصہ کہا۔ لیکن جس ڈھنگ سے بیان کیا اُس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ہمارے یہاں آتے ہی اُس نے سب کے دل میں گھر کر لیا۔ پانچوں وقت نماز کی پابند اور تہجد گزار۔ میں نے اکثر دیکھا کہ اس

اللہ کی بندی نے ساری ساری رات عبادت میں گذار دی۔ وہ کہا کرتی کہ مرنے والے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے میرے پاس دعاؤں کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ کوئی مہینہ بیس روز تو وہ اچھی رہی۔ پھر اُسے بخار آنے لگا۔ خیال تھا کہ موسمی بخار ہے کیونکہ شہر میں بخار کی عام شکایت تھی۔ علاج معالجہ کیا لیکن بخار تو موت کا پیغام لیکر آیا تھا جان لیکر ہی ٹلا۔ لیکن ہزار آفریں ہے اسکی ہمت پر بیماری میں بھی گھر کے دھندے میں ہی لگی رہتی۔ پہلے حکیم جی کا علاج تھا۔ والدہ نے چاہا کہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیا جائے لیکن رشیدہ نہ مانی۔"

"رشیدہ نام تھا؟" میں نے پوچھا۔ "اور اس کے شوہر کا نام؟"

"رشید!" سید صاحب نے جواب دیا۔ "اور بچے کا نام بدر ہے۔ تو خیر علاج تو حکیم جی ہی کا رہا لیکن اس کی طبیعت دن بدن بگڑتی ہی گئی۔ ایک روز گھر کے لوگ کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ میں جو کہیں باہر سے آیا تو اُسے چٹائی پر لیٹے دیکھکر کہا کہ بی بی! تم چارپائی پر کیوں پڑ نہیں جاتیں۔ وہ مسکرا کر بولی کہ چارپائی ہو تو چٹائی ہو تو آخر ایک روز مٹی میں ہی ملے گی۔"

"آج طبیعت کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شکر ہے!" اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "موت کی راہ دیکھتی ہوں۔ جانے نگوڑی کہاں بیٹھ رہی۔"

"اللہ کے فضل سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے" میں نے کہا۔ "میرے خیال میں تو تمہیں ڈاکٹر کا علاج کرنا چاہیئے بخار ہی تو ہے اُتر جائے گا۔"

"میاں!" وہ بولی۔ "میرے تو روئیں روئیں سے آپ کے لئے دعا نکلتی ہے۔ خدا جزا دے بڑی بیگم صاحبہ کو جن کی بدولت دنیا کے تفکرات سے جان بچی ہے۔ آج اگر میری ماں بھی زندہ ہوتی تو شاید اتنی فکر تو اُسے بھی میری نہ ہوتی۔"

"بی بی!" میں نے ہنسکر پوچھا۔ "تمہاری ماں بھی ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

"اللہ ہی جانے!" اُس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "میں اُنکے لئے مر گئی وہ میرے لئے۔"

"بی بی!" میں نے پوچھا۔ "تم کہاں کی رہنے والی ہو!"

"چھوڑیئے اس قصے کو!" وہ بولی۔ "یہ آپ کے ہاتھ میں کیسا ہے؟"

"انگریزی کا ایک رسالہ ہے" میں نے جواب دیا۔

"کیا ہوتا ہے اس میں؟" اُس نے پوچھا۔

"یہی قصے کہانیاں" میں نے جواب دیا۔

"میں بھی آپ کو ایک قصہ سناؤں" اس نے ذرا مسکرا کر کہا۔ "سنیں گے آپ؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ!" میں نے ہنسکر جواب دیا۔

"سنیئے!" وہ کہنے لگی۔ "کسی قصبے میں ایک بہت مالدار زمیندار رہتا تھا۔ اُس کی صرف ایک ہی بیٹی تھی۔ اس کا نام پریم کور تھا۔ پریم کور کوئی پانچ ایک سال کی تھی کہ اس کی ایک بہت بڑے گھرانے میں شادی کر دی گئی۔ لیکن قسمت دیکھئے کہ ابھی اس غریب کے ہاتھوں کی مہندی بھی میلی نہ ہوئی تھی کہ اس کے پتی کو قضا نے آدبوچا! آپ جانتے ہیں جب کوئی ہندو لڑکی رانڈ ہو جائے تو اس غریب کے سر پر مصائب کا آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہی پریم کور جو دونوں گھروں کا کھلونا تھی اب اس کی اتنی بھی قدر نہ تھی جتنی ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے کی ہوتی ہے۔ وہی لڑکی جو موسم بہار کے پھول کی طرح شگفتہ اور بلبل کی طرح چہچہاتی اب ایک خانہ برباد چڑیا کی طرح دبک کر خاموش بیٹھی رہتی۔ اب ہنسنا کھیلنا بھی اس کے لئے حرام اچھا کھانا پینا بھی حرام۔ اور تو اور ماتا کی ماری بھی اب گھر والوں کی موجودگی میں اپنے جگر کے ٹکڑے سے پیار محبت نہ کر سکتی تھی۔

پریم کور اگرچہ معصوم تھی، لیکن اُسے اس مصیبت اور اپنے دکھ کا احساس ضرور تھا۔ خاندان میں اگر کوئی کھلے بندوں اُس سے ہمدردی کرتا تو وہ اس کا چچیرا بھائی پریم چند تھا۔

پریم چند عمر میں پریم کور سے کچھ بڑا تھا۔ اور قصبے کے مدرسے میں تعلیم پاتا تھا۔ جس وقت مدرسے سے چھٹی ہوتی پریم کور کے یہاں آجاتا اور دونوں مل کر کھیلتے۔ لیکن سب سے الگ تھلگ! یا یوں کہئے کہ وہ سب سے ملکر کھیلنا پسند نہ کرتا۔ کبھی مٹی کے گھروندے بنانے، کبھی آنکھ مچولی کھیلنے، گاہے جھولا جھولتے۔

ایک روز کوئی تہوار تھا۔ سبھی بچے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پریم چند بھی سرخ ساٹن کی ٹوپی اور سرخ ساٹن کا کوٹ پہنے ہوا تھا۔ لیکن پریم کور غریب کے آج بھی وہی گاڑھے کی دھوتی بندھی تھی۔

"پریم!" پریم چند نے تعجب سے پوچھا۔ "تم نے آج بھی گوٹے

کناری والے کپڑے نہیں پہنے؟"

پریم کور بولی: "ماں کہتی ہے۔ اب میں گو نے کناری والے کپڑے کبھی نہیں پہن سکتی"

پریم چند بولا "کس نے منع کر رکھا ہے؟"

پریم کور بولی "ماں کہتی ہے بھگوان نے"

پریم چند بولا "ہمیں تو بھگوان منع نہیں کرتا!"

پریم کور بولی "ماں کہتی ہے بھگوان ناراض ہو گئے"

"اور تم میلے میں بھی نہیں چلوگی؟" پریم چند نے پوچھا۔

"نہیں"

"اچھا! پریم چند بولا "میں تمہارے لئے بھی کھلونے لاؤنگا"

پریم چند کے علاوہ سارے گاؤں میں مسجد کے مُلا کی لڑکی عائشہ تھی۔ جسے پریم کور کے ساتھ بہت پیار تھا۔ گاؤں کی مسجد کیلئے پریم کور کے باپ نے ہی جو ایک گیانی آدمی تھا زمین دی تھی۔ اور فصل پر مُلاجی کو اسی زمیندار کے یہاں سے کچھ اناج وناج بھی مل جاتا تھا۔ مسلمانوں کے لڑکوں کو مسجد میں مُلاجی پڑھاتے تھے اور گھر پر اُستانی جی لڑکیوں کو قرآن پڑھایا کرتیں۔ عائشہ اور پریم کور ہم عمر تھیں۔ عائشہ کی ماں بھی پریم کور سے بہت محبت کرتی۔ گاہے گاہے پریم چند بھی اسی جگہ آجاتا اور تینوں مل کر کھیلتے۔ سارے گاؤں میں ایک اس مولوی کا ہی گھر تھا جہاں پریم کو ہنس سکتی تھی۔ کیونکہ مولوی اور اس کی بیوی اس بچی کو منحوس نہ سمجھتے تھے۔ ان دونوں کو اس غریب کے دکھ کا احساس تھا!

وقت اسی طرح گذرتا گیا اور پریم کور ککڑی کی بیل کی بڑھتی گئی۔ لیکن عمر کے ساتھ کچھ سمجھ بھی آگئی۔ احساس کا مادہ بھی ترقی کر گیا۔ اور اب وہ ادھم مچانے کے دن بھی تو بیت گئے تھے۔ اب پریم کور کا زیادہ تر وقت عائشہ کے یہاں ہی گذرتا۔ جب عائشہ سبق لیتی تو پریم کور بھی پاس بیٹھکر سنا کرتی، پھر سہیلی کی دیکھا دیکھی اس نے بھی پڑھنا شروع کر دیا۔

پریم چند سے ملاقات اب یا تو جوہڑ پر جہاں وہ اپنی گائے کو پانی پلانے آیا کرتی تھی، ہوا کرتی یا زمیندار کے کھیتوں میں دونوں گھڑی دو گھڑی کے لئے مل بیٹھتے۔ اب اُن کے لئے اتنا ہی غنیمت تھا۔ لیکن وہ بھولی بھالی باتوں کے بجائے اب گفتگو کا انداز بھی کچھ بدلا بدلا سا تھا۔

ادھر عائشہ کی صحبت میں پریم کور نے نماز بھی سیکھ لی۔ اور اُردو کی دو چار کتابیں جو عائشہ کے پاس تھیں وہ بھی سبقاً سبقاً پڑھ لیں۔ ایک روز پریم کور کا باپ دالان میں چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ دو تین زمیندار اِدھر اُدھر چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں ایک بولا "چوہدری کچھ سنا تم نے بھی؟"

"کیا؟" پریم کور کے باپ نے پوچھا۔

"تمہاری چھوکری تو اب مولوی سے پڑھتی ہے"

"تو اس میں ہرج ہی کیا" پریم کور کے باپ نے ہنسکر کہا۔

"لیکن نماج (نماز) پڑھنا تو بڑے ہرج کی بات ہے" پاس سے ایک نے ڈرتے ڈرتے کہا "دھرم بھرشٹ ہو جائیگا"

"واہ چودھری!" پریم کور کے باپ نے ہنسکر کہا "بھگوان کا نام لینے سے دھرم بھرشٹ کیوں ہونے لگا۔ کسی نے رام کہہ لیا کسی نے رب! بات تو ایک ہی ہے"

"اور نماج؟" پہلے نے پوچھا۔

"بھائی!" پریم کور کا باپ بولا "مولوی کی چھوکری کی دیکھا دیکھی وہ بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہوگی"

"چوہدری تم جانو!" وہی جاٹ بولا "خربوزے کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ جوان چھوکری دن بھر مسلمان کے گھر گھسی رہتی ہے۔ مجھے تو یہ ڈھنگ اچھے نظر نہیں آتے"

"بپتا جو پڑتی غریب پر!" پریم کور کے باپ نے ایک آہ بھر کر کہا "جس نے پریم سے بلایا اسی کے پاس جا بیٹھی۔ زندگی کے دن بھی تو بچی کو پورے کرنے ہیں کسی طرح۔ مولوی کی بیوی تو پریم پر جان چھڑکتی ہے اور وہ بھی اُسے ماتا کہتی ہے۔ اور اس کی چھوکری عائشہ (عائشہ) سے اس کا بہناپا ہے۔ بھائی پریم کا نام دھرم ہے جو پریم نہیں تو کچھ بھی نہیں"

بھنگن کہیں پاس ہی جھاڑو دے رہی تھی۔ اس نے جو یہ باتیں سُنیں تو مولوی کی بیوی سے جا کر کہدیں۔ اب اسے فکر ہوئی کہ کہیں پریم کا باپ ناراض نہ ہو جائے۔ وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ پریم بھی آگئی۔ مولوی کی بیوی ہنسکر بولی "پریم! ایک بات پوچھوں"

"پوچھئے!" پریم نے بھی ذرا مسکرا کر کہا۔

"جھوٹ تو نہیں کہے گی" مولوی کی بیوی بولی۔

"نہیں ماتا!" پریم بولی "جھوٹ نہیں کہونگی"

"تمہارے پتاجی یہاں آنے سے ناراض تو نہیں"

"نہیں ماتا!" پریم بولی "بالکل نہیں۔ آپ سے کس نے کہا؟"
"اور یہ جو تو عائشہ کے ساتھ کبھی کبھی نماز بھی پڑھ لیتی ہے اگر کہیں چوہدری کو خبر ہو گئی تو پھر؟" مولوی کی بیوی نے پوچھا۔
یہ سنکر پریم کور ہنسنے لگی۔
"ماتا جی!" پریم بولی "آج انہوں نے مجھ سے بھی پوچھا تھا"
"کیا؟" مولوی کی بیوی نے پوچھا "نماز پڑھنے کے متعلق"
"ہاں!" پریم کور نے اس ہاں کو ذرا لانبا کر کے کہا۔
"پھر کیا جواب دیا تم نے؟"
"میں نے سچی بات کہدی!" پریم کور نے جواب دیا۔
"سچ!" مولوی کی بیوی بولی "پھر تو وہ بہت ناراض ہوئے ہونگے"
"نہیں!" پریم کور نے جواب دیا "میرے پتا کوئی تنگ خیال آدمی نہیں۔ وہ بہت ہنسے"
عائشہ کی ماں مطمئن ہو گئی۔

عائشہ کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اور پریم کور کچھ اُداس اُداس سی نظر آتی تھی۔ گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک ندی بہتی تھی۔ ایک روز سائے ڈھل چکنے کے بعد وہ گھر سے نکلی اور ندی کی طرف ہولی! ملی کے پیڑوں میں کونپلیں آئی ہوئی تھیں۔ پرندے ڈالیوں پر بیٹھے ایک دوسرے سے دکھ سکھ کی کہہ رہے تھے۔ کبھی کبھی ہرل کی میٹھی سیٹی بھی کہیں سے سنائی دیتی۔ ایک بندر جس کے لئے تسام ازل نے جانے نچلا بیٹھنا حرام کر دیا ہے اِدھر اُدھر چھلانگیں لگا رہا تھا۔ کبھی جو کہیں سے ہوا کا ایک آدھ جھونکا آجاتا تو درخت کسی سرمست شباب کی طرح جھومنے لگتے اور پتے ہل ہل کر تالیاں بجاتے۔

پریم کور ندی پر پہونچکر ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی۔ پتیوں کا سایہ بھی اس وقت سینہ آب پر رقص کر رہا تھا اور دُور فاصلے پر سقفِ فلک کے نیچے پہاڑوں کے دُھندلے دُھندلے سے نشان نظر آرہے تھے۔

پریم کور کی آنکھوں میں جوانی کا خمار تھا۔ اور دل جوانی کے جذبات سے لبریز۔ لیکن بے رحم سماج نے اس کی قسمت پر مہر لگا دی تھی۔ اور اس وقت جوانی کا خمار اور جوانی کے جذبات۔ کا خیال تک آنا بھی اس بدنصیب کنیا کے لئے پاپ تھا۔ لذت گیر ہونے کا تو ذکر ہی کیا۔

ایک مولوی کے گھر میں نشست و برخاست زیادہ ہونیکے باعث وہ مسلمانوں کے رسم و رواج اور اُن کے عقائد سے بہت کچھ واقف ہو چکی تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ اسے اس طرح کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔ اور اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ یہ سراسر قوانین قدرت کے خلاف ہے کہ ایک جوان لڑکی اپنے جذبات، اپنی خواہشیں، آرزوئیں اور زندگی کی مسرتوں سے محض اس لئے محروم رہے کہ قسمت نے بچپنے ہی میں اسکی پیشانی پر بیوگی کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔

اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ ایک بیوہ کو شادی کی اجازت نہ دینا مذہب میں ہرگز جائز نہیں۔ اور مذہب نے کہیں ایسا حکم نہیں دے رکھا کہ ایک بیوہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ دوسری شادی نہ کرے۔

وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور آہ بھر کر کہا۔
"بھگوان! تو سب کا بھگوان ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تیرے بندوں کے لئے تیرے احکام بھی ایک سے نہوں"
اُسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے اُس نے آنچل سے آنکھیں خشک کر لیں۔ لیکن جب غم کے بادل اُمنڈ کر آئیں تو پانی کیسے نہ برسے۔
وہ خاموش بیٹھی اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہی تھی کہ پریم چند بھی کہیں سے گھومتا گھامتا آنکلا۔
"پریم!" اُس نے تعجب سے کہا "تم رو رہی ہو۔ کیا ہوا؟ کچھ پتا جی نے تو نہیں کہا؟"
"پتا جی کیا کہتے" پریم بولی "اپنے کرموں کو رو رہی ہوں"
"سمجھ گیا!" پریم چند مسکرا کر بولا "تمہاری سہیلی عائشہ کی شادی جو ہونے والی ہے۔ اب اکیلے رہ جانے کے خیال سے تم روتی ہو گی۔ ٹھیک ہے نا پریم؟"
"تمہارے بھی تو بیاہ کی بات چیت ہو رہی ہے!" پریم کور نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
"تم سے کس نے کہا؟" پریم چند نے پوچھا۔
"تمہاری ماتا جی تو کل کہہ رہی تھیں" پریم کور نے جواب دیا۔
"ماں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے" پریم چند بولا "کوئی زبردستی کا سودا تو ہے نہیں"
پریم کور نے پریم چند کی طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ اُسے ہنسی آگئی۔

"کیا دیکھتی ہو پریم؟"

"تم شادی نہیں کروگے؟" پریم کور نے پوچھا۔

"کروں گا کیوں نہیں" پریم چند نے مسکرا کر کہا "لیکن...."

"لیکن کیا؟"

"پہلے تم یہ بتلاؤ کہ تم یہاں بیٹھی کیا سوچ رہی تھیں؟" پریم چند نے پوچھا۔

"میں یہ سوچ رہی تھی!" پریم کور بولی "کہ کیا اچھا ہو جو یہ ندی جس طرح خس و خاشاک بہاتے لئے جا رہی ہے۔ اسی طرح مجھے بھی بہا لے جائے اور ایسی سرزمین میں پہونچا دے جہاں....."

پریم کور کے آنسو نکل آئے۔

"جہاں کیا؟" پریم چند نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "کیا ہو پریم؟"

"کچھ نہیں!" پریم کور اپنا ہاتھ چھڑانے کی خفیف سی کوشش کرتی ہوئی بولی "کچھ نہیں"

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے ان پہاڑوں کی طرف دیکھتے رہے جن پر انسان کی بے ثباتی کے خیال سے کچھ اداسی سی چھائی ہوئی تھی۔ پھر پریم کور ایک لانبا سانس لیکر بولی "تو گویا شادی کرنے کا تمہارا ارادہ نہیں"

"پہلے تم میری ایک بات کا جواب دو" پریم چند بولا۔

"کیا؟"

"ناراض تو نہیں ہوگی"

"نہیں"

"ہنسوگی بھی نہیں"

"نہیں"

"سچ کہوگی نا؟"

"سچ!"

"میری بنوگی پریم!" پریم چند نے پوچھا۔

یہ سنکر پریم کور نے ایک آہ بھری اور کہا "کیسے بن سکتی ہوں؟" یہ کہتے ہوئے پریم کور کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"کون روکتا ہے؟" پریم چند نے پوچھا۔

"دھرم!" پریم کور نے جواب دیا۔

دونوں کے سر خود بخود جھک گئے۔

پریم چند چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھا اٹھا کر ندی میں پھینک رہا تھا۔ پانی میں گرداب پڑتے تھے اور دنیائے ناپائدار کی طرح ایک جھلک دکھا کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ اور پریم کور ان دور افتادہ پہاڑوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جو انسان کی بیچارگی کا شکوہ فلک پیر سے کرتے معلوم ہوتے تھے۔

"لیکن دھرم پاپ تو نہیں سکھلاتا" پریم چند نے پریم کور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں" پریم کور نے جواب دیا۔

"اور دھرم!" پریم چند پھر بولا "انسان کو دنیا کی لذتوں سے محروم رہنے کا حکم بھی تو نہیں دیتا"

"نہیں!" پریم کور نے جواب دیا۔

"اور جیون ناش کا حکم بھی تو کہیں دھرم کی کتابوں میں نہیں لکھا" پریم چند نے کہا۔

"نہیں!" پریم کور نے جوابدیا۔

"تو پھر تم نے اپنی زندگی کیوں برباد کر رکھی ہے پریم؟" پریم چند نے پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کروں؟" پریم نے ایک آہ بھر کر کہا "کہاں جاؤں"

"رام جانے!" پریم چند بولا "مجھ سے تمہارا دکھ دیکھا نہیں جاتا"

"بیاہ ہو جائے گا تو مجھے بھی بھول جاؤگے!" پریم کور نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

"پریم!" پریم چند دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا "اگر تم میری ہو جاؤ تو یہ جان بھی حاضر ہے"

"اور دھرم؟" پریم کور نے ہولے سے کہا۔

"دھرم کا اس میں کچھ دوش نہیں" پریم چند نے جوابدیا "ہم نے رسم ورواج کی زنجیریں خود پاؤں میں ڈال رکھی ہیں"

"یوں ہی سہی!" پریم کور بولی "لیکن یہ زنجیریں اب ہمارے توڑے ٹوٹ بھی تو نہیں سکتیں"

"ٹوٹ سکتی ہیں پریم!" پریم چند بولا "تم چاہو تو آج ہی ٹوٹ سکتی ہیں"

"پاگل تو نہیں ہو گئے؟" پریم کور نے ذرا تعجب سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم میری بات کا جواب دو" پریم چند نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر

کہا: "میری بنو گی"؟

"سچ مچ ہی پاگل ہو"! اب پریم کور نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"رام کے لئے میری بات کا جواب دو"۔ پریم چند نے اب منت سے کہا۔

"کیا جواب دوں"، پریم کور نے آسمان کی طرف دیکھکر کہا۔

"پریم!" پریم چند بولا "تم ہاں کر دو تو میں دنیا بھر کے رشتے ناطے پر لات مارنے کو تیار ہوں"۔

"میری ہاں سے کیا ہوتا ہے" پریم کور بولی: "نہ تم میرے ہو سکتے ہو نہ میں تمہاری بن سکتی ہوں۔ نہ دھرم، نہ سماج، نہ رسم و رواج اور نہ ہی بھگوان کا کوئی بھگت میری مصیبت ٹال سکتا ہے"۔

"لیکن عائشہ کا باپ؟" بے ساختہ پریم چند کے منہ سے نکلا۔

یہ سنکر پریم کور تعجب اور خوف سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں کی پیشانی پر عرقِ انفعال کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ لیکن جب وہ گاؤں کو لوٹے تو اُن کی آنکھوں میں مسرت کی جھلک اور چہروں پر کامرانی کی سُرخی تھی۔

اب اُن کی اُمیدوں کا دارومدار عائشہ کے باپ پر تھا لیکن جب ایک سادہ لوح مولوی کے سامنے انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ خوفزدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے خوف تھا کہ اگر گاؤں والوں کو پتہ چل گیا تو جانے اس کا کیا حشر ہو۔ لیکن عائشہ اور اُس کی ماں کے سامنے آخر اُسے جھکنا ہی پڑا۔ پہلے اس نے ان دونوں سے توحید کا اقرار کرایا اور پھر اسی وقت انکا عقد کر دیا۔

جس روز عائشہ کی برات آئی اُسی روز گاؤں کے ایک مہاجن کی لڑکی کی بھی برات آئی۔ لڑکے والے طائفہ بھی لائے اور آتشبازی بھی۔ لوگ تو تماشہ دیکھنے میں مشغول تھے اور وہ دونوں ....."

"کون دونوں"؟ میں نے پوچھا۔

وہ ہنسکر بولی: "رشید اور رشیدہ!"

"اچھا تو وہ دونوں موقع پاکر گاؤں سے نکل گئے"! میں نے کہا۔

"جی ہاں! اس سے بہتر اور کیا موقع ہو سکتا تھا، دونوں رات کے اندھیرے میں وطن سے نکلے اور کئی روز کے بعد ایک بڑے بارونق شہر میں آبسے۔ یہاں رشید کو ایک کارخانے میں ملازمت مل گئی۔ کام گو سخت تھا لیکن معاوضہ بھی کچھ بُرا نہ تھا۔ بسر اوقات بے فکری سے ہونے لگی۔ لیکن تقدیر کے سامنے تدبیر کی کب پیش جاتی ہے۔ ایک روز رشید کا کام کرتے کرتے ہاتھ کٹ گیا۔ ادھر رشیدہ کی گود ہری ہونے والی تھی۔ رشید کو ہسپتال گئے کوئی ہفتہ عشرہ ہی ہوا تھا کہ اللہ میاں نے ان کو ایک بیٹا عطا کیا۔ کوئی ڈیڑھ مہینے بعد رشید ہسپتال سے واپس آگیا۔ کارخانے والوں نے ترس کھا کر اسے چپڑاسی کی جگہ دیدی۔ رشیدہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر کچھ سلائی وغیرہ کا کام اِدھر اُدھر سے لے آتی۔ لیکن وہ تو جنم کی منحوس تھی۔ ایک روز منیجر کی میز پر سے کسی نے سو روپے کا نوٹ اُٹھا لیا اور الزام رشید پر لگا۔ غریب کا تھا کون جو امداد کرتا۔ عدالت سے سال بھر کی قید ہو گئی۔ آپ جانیئے! جب کمانے والا گرفتار بلا ہوا تو بیچاری بدنصیب رشیدہ پر کیا گذرتی ہوگی۔ وہ پانچوں وقت اس بیکس کیلئے بارگاہِ ایزدی میں دُعا کرتی اور اس سے ملنے کی آس میں زندگی کے دن کاٹتی۔

رشید کو جیل گئے ابھی کوئی دو ایک مہینے ہوئے تھے۔ ایک روز رشیدہ کوٹھڑی میں بیٹھی تھی کہ اچانک رشید سامنے آکھڑا ہوا۔ رشیدہ اُسے دیکھکر خوشی سے کچھ بے حواس سی ہو گئی۔ اُس نے اپنے بچے کو گود میں لیکر سینے سے لگا لیا۔ اور ہنسکر بولا: "رشیدہ! کیا ڈر گئیں تم"؟

"تم آگئے؟" رشیدہ نے تعجب اور خوشی سے پوچھا: "کیسے آگئے تم؟"

"اللہ نے بے گناہوں کی فریاد سن لی"، رشید نے جواب دیا۔

فرطِ خوشی سے رشیدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ رشید نے جیب سے دس دس روپے کے دس نوٹ نکال کر رشیدہ کے سامنے رکھدئے۔

"یہ کہاں سے ملے؟" رشیدہ نے ہنسکر پوچھا۔

رشید نے کہا کہ "روپے دراصل یہ ہمارے چرائے تھے منیجر نے اس نوٹ کے نمبر کا جو گم ہوا تھا اعلان کر رکھا تھا۔ کچھ روز ہوئے اسی پہرے والے نے کسی صراف کی دوکان پر سے کچھ زیور خریدے اور وہی نوٹ نکال کر دیا۔ صراف کو نوٹ کا نمبر معلوم تھا اس نے اسی وقت گرفتار کروا دیا۔ اور عدالت نے اصل مجرم کی گرفتاری پر مجھے آزاد کر دیا اور سو روپیہ بطور معاوضہ دلوا دیا"۔

جیل میں جو یہ دو ایک مہینے رشید رہا تو اُس سے اس کی صحت پر بُرا اثر پڑا۔ یہاں اُسے ایک زمیندار کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑتا تھا۔ یہ زمیندار بہت رحمدل آدمی تھا۔ رشید کی بپتا سُنکر اُسے بہت ترس آیا۔ دونوں میں دوستی ہوگئی۔ اب جو رشید جیل سے آیا تو وہی زمیندار جو جیل میں ملازم تھا دسویں پندرھویں اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ رشید کا ارادہ تھا کہ اس سو روپے سے کچھ بنج بیوپار کرے۔ لیکن زمیندار نے اسے کھیتی باڑی کی صلاح دی۔ زمیندار کی دریا کے قرب وجوار میں کچھ اراضی تھی۔ زمیندار کا باپ کسی مقدمے میں ماخوذ تھا زمین پڑتی پڑی تھی۔ رشید زمیندار سے کچھ لین دین کا سمجھوتہ کر کے اُس کی زمین پر اُٹھ آیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ایک آدھ بیل مل جائے تو اس کے ساتھ مل کر زمین کاشت کرے۔ کبھی کبھی وہ پڑوس کے گاؤں بیل کی تلاش میں بھی جاتا۔ لیکن ابھی اُسے کوئی بیل پسند نہیں آیا تھا۔ اور جو پسند آتا اُس کی قیمت بہت زیادہ مانگی جاتی۔ رشید اور رشیدہ کو یہاں آئے کوئی دس پندرہ روز ہوئے تھے کہ ایک روز تین چار آدمی جھونپڑی میں آگھسے۔ اُنہوں نے آتے ہی رشید کو رسیوں سے جکڑ دیا اور کوٹھڑی کا کونہ کونہ کھود مارا لیکن وہاں رکھا ہی کیا تھا جو اُنہیں ملتا۔ پھر وہ سنگدل غریب رشید کو مارنے لگے کہ بتا نقدی کہاں رکھی ہے۔ خاوند کو مصیبت میں دیکھکر رشیدہ نے وہی سو روپے کے دس دس نوٹ نکال کر اُن کے حوالے کئے۔ ظالموں نے گھر میں جھاڑو پھیر دی۔ گھر کے سارے سامان میں سے ایک دو چارپائیاں اور رشید کا ایک پھٹا پُرانا کوٹ بچ رہا۔ رشید اپنے دوست زمیندار کے پاس گیا۔ دونوں نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

***

صبر کے سوا اور ہو کیا سکتا تھا۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ اب دن کیسے کٹیں گے۔ خدا بھلا کرے اس زمیندار کا اُس نے پانچ سات روپے بطور قرض دئے اور بیل مہیا کر دینے کا بھی اطمینان دلایا۔ رشید پھر اُسی کارخانے میں جاکر نوکری کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اُسے بُخار آنے لگا۔ پھر کھانسی نے بھی آدبوچا۔ دو چار روز بعد تھوک کے ساتھ خُون بھی آنے لگا۔ رشیدہ شہر آکر خیراتی ہسپتال سے اس کے لئے دوا لے جاتی۔ لیکن موت کا کیا درماں۔ رشید کوئی پانچ سات روز یہ دُکھ سہہ کر عدم کو سدھارا.....؛

مریضہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"تو جناب!" وہ دوپٹے سے آنکھیں خشک کر کے بولی: "دیکھ لئے آپ نے قدرت کے کھیل۔ وہی لڑکی جو کبھی سونے میں کھیلا کرتی تھی اسکے شوہر کو گھر سے کفن تک بھی نصیب نہ ہوا۔ اب کمبخت رشیدہ اکیلی رہ گئی"! اُسے صرف ایک ہی تمنا تھی کہ جب اس کا وقت آئے تو کوئی اللہ والا رشید کا وہی پھٹا پُرانا کوٹ جو ابھی تک اس کے پاس تھا اس کے ساتھ ہی دفن کر دے"

اتنا کہکر سید صاحب بولے "کیوں جناب! ہے نا دلگداز داستان"

"بہت دردناک!" میں نے کہا "بچہ کہاں ہے؟"

"بچے کو تو گھر والے آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے" سید صاحب نے جواب دیا "وہ تو گھر والوں کا کھلونا ہے"

"سچ ہے!" میں نے کہا

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تفسیر ہے

"ہوگئے قائل اب تو!" سید صاحب نے مُسکرا کر پوچھا۔

"بیشک!" میں نے جواب دیا۔

ایم۔ اسلم؛

***

(سماجی انقلاب کی دوسری مجلس)

دُکھیارنیں

پہلا منظر

سرسبز وادی۔ چشمے کا کنارہ۔ پک نک پارٹی۔ شانتا پاربتی، سوشیلا، قمرن، رقیہ، رضیہ وغیرہ کالج کی ایک درجن طالبات۔

سوشیلا:۔ پیاری بہنو! میں نے آج یہاں تمہیں ایک ایسی خوشخبری سنانے کو اکٹھا کیا ہے جس کے لئے تم تیار نہ ہوگی۔ شانتا کماری دیوی کی بات پکی ہوگئی، اور ہمارے کالج کے بھائیوں ہی میں سے ایک کے ساتھ۔ بھلا بوجھو تو کس کے ساتھ؟ جو بوجھ لے اُسے انعام ملے گا۔

پاربتی:۔ کیا انعام؟

سوشیلا:۔ جو شانتا دیوی نے پایا۔

قمرن:۔ شانتا دیوی کی شریک بنائی جاؤگی۔ (قہقہے)

پاربتی:۔ ہم نہیں بوجھتے۔ یہ شرکت والا انعام تم ہی لے لو۔ اچھا میں بلا انعام بوجھے دیتی ہوں ــــ منورنجن دادا؟

سوشیلا:۔ نہیں۔

پاربتی:۔ اچھے کمار دادا؟

سوشیلا:۔ نہیں۔

پاربتی:۔ شاما موہن دادا؟

سوشیلا:۔ نہیں۔

پاربتی:۔ تو پھر کون۔ مہاتما گاندھی جی؟ (قہقہے)

سوشیلا:۔ مہاتما جی کے نام سے کم ادبھت نہیں۔ احمد بھائی۔

پاربتی:۔ کیوں ری شانتا تو نے سب جات بھائی کو چھوڑ کر احمد بھائی کو تاکا؟ بیچاری کیسی بھولی بھالی دِکھ پڑتی تھی جیسے بڑی بھگتن ہے۔ تو بات پیچھے ہمیں اُپدیش دیا کرتی تھی۔ اب بتا یہ کرتوت بھی کوئی سبق ہے؟

شانتا:۔ کیوں نہیں؟ سب سے بڑا سبق، کالج کے تمام کورس سے زیادہ ضروری۔ تو ملے سے کرتوت کہتی ہے جیسے میں نے کوئی پاپ کیا ہو۔

پاربتی:۔ ملیچھ مسلمان سے لگن۔ جانا پاپ نہیں تو اپن سہی، یہ بتا تیری پتا جی کیسے راضی ہوگئے؟

شانتا:۔ تو جانتی ہے ہم برہمو ہیں۔ ہمارے ہاں جات پات، چھوت چھات کا بچار نہیں۔ ہمارے دھرم میں مورتی پوجنے والے کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ برہمو سماج میں بگاڑ پیدا ہوجانے کے سبب سے برہمو سناتن دھرمیوں میں مل جل گئے ہیں مگر میرے پتا جی کٹر برہمو ہیں۔ وہ ان پر مسلمان کو فوقیت دیتے ہیں۔ اُنہوں نے تمہارے احمد بھائی سے کچھ سوال جواب کرکے اطمینان کرلیا اور خوشی سے انکی درخواست مان لی۔

قمرن:۔ پاربتی دیوانی ہے۔ شانتا دیدی اگر سناتن دھرمی بھی ہوتی تو یہ کون سا دوش تھا۔ جیون کے جس آنند سے سماج نے ہمیں نراس کر رکھا ہے۔ شانتا دیدی نے اُسے پالیا۔ پریم سے بڑھکر عورت کے لئے کوئی دھرم نہیں اور اسی کا دروازہ ہم پر بند ہے۔ پاربتی تو جاتی اور برادری کی لاج کا نام لیتی ہے اُس پر خدا کی پھٹکار۔ آج میں تمہیں وہ آپ بیتی سناتی ہوں جو آبتک کالج میں زبان پر نہیں لائی تھی۔

میں ایک شریف ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی۔ بارہ برس کے سن میں بارہ ہزار تلک اور بھاری دان جہیز دیکر میرے ماتا پتا نے ایک جاتی کے باعزت مالدار مگر روگی لڑکے سے میرا بیاہ رچا دیا۔ برس لگتے لگتے وہ بیکنٹھ کو سدھارے۔ سسرال میں ساس نندوں جٹھانیوں نے زندگی اجیرن کردی۔ ماتا جی نے گھر بلوالیا۔ میکے میں بھاوجوں نے اُٹھتے بیٹھتے طعنوں میں ناک میں دم کردیا۔ ایک دن مجھ پر ایسا ناپاک دوش لگایا کہ نراس ہوکر میں گنگا میں جا کودی۔ پر گنگا جی نے مجھے قبول نہ کیا۔ مجھے سُدھ نہ تھی پھر کیا ہوا کیسے نکلی۔ جس نے نکالا تھا وہ میرا پتہ نشان پوچھتا رہا میں کچھ بتا نہ سکی۔ پوچھا میرے گھر چلتی ہو؟ میں بے سوچے سمجھے ساتھ ہولی۔ وہ ایک شریف مسلمان نوجوان تھا۔ اور میں اپنا دھرم اپنی جنم استھان میں چھوڑ آئی تھی۔ اور بے مقصد زندگی گزارنے لگی۔ اسکے ماں باپ نے میرے ساتھ ایسے پریم کا برتاؤ کیا کہ میں گھر بھول گئی۔ اور زندگی میں رس معلوم ہونے لگا۔ اس جوان کے سبھاؤ اور برتاؤ نے میرے دل پر اس کی سچی شرافت نقش کردی۔ وہ شاید پہلے دن سے ہی مجھ پر لٹو تھا۔ پر شروع سے آخر تک کبھی پریم کا ایک شبد زبان پہ نہیں لایا۔ ماں باپ نے کچھ سمجھ کر مجھے اسکول میں بھرتی کرادیا۔ میں کچھ پڑھی ہوئی

تھی۔ مڈل میں نام لکھا گیا۔ جی لگا کر پڑھتی رہی۔ پہلے ہی برس اوّل آئی اور میٹریکلیشن تک اوّل دوم ہوتی رہی۔ آخر امتحان میں اوّل ہوئی۔ ادھر خانصاحب بی۔ اے میں تھے۔ باپ بیٹوں میں شادی کے لئے قصّہ ہونے لگا۔ خانصاحب نے صاف صاف کہدیا کہ کسی غیر تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی نہ کریں گے۔ یعنی کرینگے تو قمر النساء سے۔ یہ نام ان لوگوں نے مجھے دیا تھا۔ خانصاحب اکثر مجھے اسکول کا کورس پڑھاتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے "دی ہرمٹ" پڑھاتے ہوئے مجھے اینجلینا کے نام سے پکار کر اپنے آپ کو جوگی بتایا اور اس طرح میرا عندیہ بھانپ لیا اور رنجنت ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ اکلوتے بیٹے تھے۔ ماں باپ مجھ سے بھی خوش تھے۔ صرف برادری کی پخ تھی۔ بیٹے کی ضد مان لی۔ خانصاحب کی آرزو تھی کہ میں بی۔ اے پاس کرلوں، ماں باپ کی اِچھا تھی ابھی بیاہ ہو جائے۔ آخر درمیانی راستہ طے پایا کہ شادی ہو جائے اور میری تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ مجھے سرکاری وظیفہ بھی مل گیا اور یہاں بھیجدی گئی۔ اب کہو پاربتی میری جاتی نے میرے ساتھ کیا کیا اور غیر جاتی نے کیا کیا؟

پاربتی:- بہن صرف تمہاری نہیں، میری اور کالج کی قریب قریب سب لڑکیوں کی زندگی ایسی ہی کوئی دُکھ بھری کہانی ہے۔ یہ بیس بائیس برس کے سن تک کالج میں سکشا پانے کی مُہلت تو ہندوستان کی کسی قوم کی لڑکیوں کو مل نہیں سکتی۔ ولی کو ولی پہچانتے ہیں۔ ہمیں کالج میں ایک دوسری کو دیکھکر جیسا سنتوکھ ہوتا ہے وہ گھروں میں یا برادری میں کہاں نصیب، ہم سب سماج کے مارے ہوئے تسکار ہیں اور اس پر دھکار بھیجنے میں ہمزبان۔ میرے پتاجی کایستھ ہیں اور ماتاجی اگروالی جن کو وہ کلکتہ سے لے آئے تھے۔ ان کا پریم بندھن تھا اور پریم جیون۔ پرنہی پریم میرے بیاہ میں بھاری روڑا تھا۔ مجھے میٹریکلیشن تک سکشا دینے پر بھی کوئی بھلا مانس بڑی بڑی تلک کی رقموں پر بھی ہاتھ نہ آیا۔ پتاجی مجھے بہت مانتے ہیں، کسی نالائق جوان یا بوڑھے مالدار کے ہاتھ بیچنا نہیں چاہتے۔ انہوں نے برادری کے انیائے سے دُکھی ہو کر مجھے اُونچی سے اُونچی سکشا پانیکے لئے آزاد چھوڑ دیا اور یہ آزادی بھی دی ہے کہ کسی سماجی یا مذہبی بندھن کی چنتا بنا جو کوئی مجھے قدر اور پریم سے مانگے اور میں پسند کروں وہ اُن کو بھی منظور ہوگا۔

قمرن:- تو تم نے کسی کو چنا ہے یا کسی نے تم کو؟ تم نہیں نہیں کہہ سکتیں یہاں کسی کا بھید کسی سے چُھپا نہیں۔

شانتا:- کون نہیں جانتا کہ مسٹر چودھری کی اس پر خاص نظر ہے اور یہ اُن سے آنکھیں چُرائے پھرتی ہے۔ منہ سے کہلوانے کی کیا ضرورت ہے۔ بہن رُکو تم چُپ چُپ نظر آتی ہو۔ تم بھی اپنی کہانی سُنا کر جی ہلکا کر لو۔ یہ کہنا سننا فضول گپ نہیں، ایک خاص مقصد ہے ہمیں آگے کام کرنا ہے، زندگی کی لڑائی کا نقشہ تیار کرنا ہے۔

رقیہ:- مجھے عذر نہیں۔ بہنو، میں بیاہی کنواری یا بیوہ سہاگن ہوں۔ عقد کے بعد اُدھر سے پیام آیا کہ صاحبزادے جو بی۔ ایس۔ سی میں فیل ہوئے تھے انگلستان جائیں گے اور وہاں سے لوٹنے کے بعد بیاہ ہوگا۔ صرف یہی نہیں ادھر سے موٹر دینے کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس کے عوض ولایت کے خرچ کی پہلی قسط دس ہزار روپئے حوالہ کر دو۔ ابّا نے کہا کہ "اتنی بڑی رقم یکمشت ادا کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ پھر اور بیٹے بیٹیاں بھی ہیں اور سب کا حق برابر ہے۔ ایک کو قرض وام کر کے یا جائداد بیچکر دس ہزار دیا بھی کر دئے جائیں تو اور اولاد کا کیا سامان ہوگا؟"

ایک برس گذر گیا اور وہ لوگ اپنے مطالبے پر اَڑے رہے۔ آخر عاجز آکر ابّا جان نے وہ مطالبہ بھی منظور کر لیا۔ پھر بھی وہ لوگ اَڑے ہی رہے کہ رسمِ رخصتی ولایت سے لَوٹ کر دو برس کے بعد انجام پائے گی۔ اسی دباؤ سے وہ ولایت کی تعلیم کا سارا خرچ وصول کرنے کی نیت رکھتے تھے۔ جس کی مُدت اور مقدار لا معلوم تھی۔ ابّا نے کہا جب ہندوستان میں رہ کر تم نے ایک سال میں یہ ناچ نچایا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم ولایت سے مجرد آؤ گے اور رسمِ رخصتی میں دوسرے بہانے نہ نکالو گے۔ وہ اس شرط پر دس ہزار روپیہ دینے کو تیار تھے کہ شادی فوراً ہو جائے اور سفر انگلستان اگلے سال تک ملتوی رہے۔ وہ کسی طرح نہ مانے۔ آخر روپیہ حاصل کرنے کی کوئی اور صورت نظر نہ آئی تو ذات بیچی۔ ایک دولتمند پست نسل والے خاندان میں پیام دیا۔ عقد ہوا۔ روپے نقد لیکر صاحبزادے ولایت سدھارے۔ تین سال کے بعد ولایت سے ایک میم لیتے آئے۔ قانونی پریشانی کے سبب سے نہ صرف مجھے بلکہ اُس بیچاری کو بھی طلاق دیدی جس کی بدولت ولایتی صاحب بنے، مگر رہے بزرے صاحب ہی، کوئی ڈگری وگری نہیں۔ سنتی ہوں میکانیکل انجنیری سے متعلق کوئی سرٹیفکٹ لائے ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو، اس ایک شخص نے جیتے جی بیک وقت دو لڑکیوں کو رانڈ بنا رکھا ہے۔ خبر ہے کہ دوسری لڑکی کے باپ دین مہر کی نالش کرنے والے ہیں پھر بیٹی کا دوسرا عقد۔ جو اُن کی برادری میں ممکن ہے مگر ہماری برادری میں ناممکن ہے۔ یہی غنیمت ہے کہ قانون کے خوف سے مجھے طلاق بھی دیدی، ورنہ ولایت سے وہ طلاق کیلئے بھاری رشوت کے طالب تھے۔ اب میں مطلقہ کی حیثیت سے اپنے خاندان میں بیوہ سے بدتر اور ناکارہ ہوں۔ علمی مشاغل پر

اپنا غم غلط کر رہی ہوں۔

شانتا۔ آخر کب تک؟ تمہارا خاندان تمہیں پناہ نہیں دیتا تو لعنت بھیجو اس پر۔ تمہارا حق ہے کہ جہاں پناہ ملے لے لو، جس ذات، نسل یا مذہب میں ہو۔ پرسو تم یا لوتم پر ریجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر تم کو بھی محبت ہو تو پریم سب سے اُتم دھرم ہے۔ جس میں ذات پات، نسل خون کا بچار نہیں۔ ان سب سے بغاوت کرو۔ چلو ہم سب پریم بستی جدا بسائیں۔

جس بہن کی تھاہ ہمیں اب تک نہیں ملی ہے وہ روزی ہیں۔ سر سے پاؤں تک بند بھید۔ روزی تم بھی اپنی بپتا کہہ سناؤ۔

روزی۔ شانتا بہن تم دُلہن ہو اور سب کی خوشی کا مرکز۔ تمہارا حکم میں ٹال نہیں سکتی۔ اگرچہ میری کہانی سُنانے کے لائق نہیں ؎

سرگذشتِ بلاکشاں نہ سُنو
نہ سُنو میری داستاں نہ سُنو

میں مسلمان ماں باپ کی بیٹی ہوں۔ والدہ مجھے پانچ برس کی بچی چھوڑ کر قضا کر گئیں۔ والد ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار ہیں۔ گھر میں کوئی رشتہ دار بیوی مجھے مذہبی، اخلاقی یا خانہ داری کی تعلیم و تربیت دینے والی نہ تھیں۔ ابا نے میری دماغی تعلیم میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ دن سکول میں صرف کرتی، شام موٹر میں تنہا ہوا خوری میں۔ شوفر ایک شریف ہی جوان تھا، قبول صورت، خواندہ، منچلا۔ میری تنہائی نا تجربہ کاری اور آزادی سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے مجھ پر ڈورے ڈالے۔ کوئی نگراں نہ تھا۔ میں اس کی ہوس اور اپنی بے لگامی کا شکار ہو گئی۔ ابا کو کلب، رنڈی اور شراب سے فرصت نہ تھی۔ میرے بل چکانے کے سوا اُن کو میرے معاملات سے واسطہ نہ تھا۔ بہت جلد میں نے اپنے گناہ کا پھل محسوس کیا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں، کہاں بھاگ جاؤں یا جان دیدوں۔ وہ کمبخت بھی یہ حال دیکھ کر نوکری چھوڑ بھاگا۔ قبل اس کے کہ ابا میری کالک دیکھ لیں میں شرم اور خوف سے لکھنؤ بھاگ آئی۔ ایک عیسائی مشن کی سسٹر کبھی مجھے گھر میں پڑھایا کرتی تھی۔ اس کے پاس پہونچی اور عیسائی ہو گئی۔ میرے گناہ کا بیج مشن میں پروان چڑھ رہا ہے اور مجھے میری خواہش سے اس کالج میں بھیج دیا گیا۔ اب میری زندگی بے مقصد ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ زندگی ہی نہیں ایک مشین کا پتلا ہوں۔ جذبات سے خالی۔

شانتا۔ افسوس، اب کیا ارادہ ہے بہن! شادی کرو گی؟

روزی۔ نہیں۔ بی۔ اے پاس کر کے کسی سماجی خدمت میں عمر کاٹ دونگی۔ ہر گناہ کا کفارہ ہے مگر عورت کی ایک لغزش کا کوئی کفارہ خدا قبول کرے تو کرے سماج قبول نہیں کر سکتا۔

شانتا۔ مجھے ایسا دکھائی پڑتا ہے کہ ہم سب بہنیں جو اس کالج میں جمع ہیں، کیول شکشا کے لئے نہیں بلکہ اور اور کارنوں سے یہاں ڈیرا لگایا ہے۔ ہم سب ایک طرف دُکھ اور بپت کے ودّیالوں کی ودّیارتھی اور دوسری طرف آرٹ اور سائنس کے کالج کی تعلیم یافتہ ہیں۔ ہم سماج کی ٹھکرائی دھتکاری دُکھیاریاں ذری ہمت کریں تو اپنے ہی کشٹ نہیں، بے منہ کی اور دُکھیاری بہنوں کے دُکھ بھی ہرا سکتی ہیں۔ یہ دُکھ ہی ہمارا سب سے بڑا دھن اور گُن ہے۔ منش کی سیوا کا موقع ہم سے زیادہ کسی کو میسر نہیں۔ بہنو نراس نہ ہو، دھیرج رکھو۔ اسی سماجی انیائے کا مقابلہ کرنے اور شانتی کی دُنیا بسانے کے لئے ہمارے بھائیوں نے ایک سبھا بنائی ہے۔ آؤ ہم ان کا ہاتھ بٹائیں۔ سب سے الگ اپنی دنیا بنائیں۔ اتنی اُونچی جہاں سماج کے پاپیوں کی آواز نہ پہونچ سکے نہ ہاتھ۔ اور پرماتما کے سوا کسی کا بھے نہ رہے۔

پاربتی۔ تو یہ کہو کہ احمد بھائی نے یہی پٹیاں پڑھا کر تمہیں رام کیا ہے؟ خیر بہن دل لگی الگ، میں تیار ہوں۔

روزی۔ میری زندگی کا تو یہی سہارا ہوگا۔ ہمیں اس خدمت میں مردوں سے زیادہ قربانیاں دینی ہیں۔ یہ ہمارا اپنا کام ہے۔

قمرن۔ میں اور خانصاحب بھی اس سبھا کی شرکت کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ سوا راج، پورن راج اور دین دھرم کی لڑائیاں سب بیکار ہیں۔ جب تک ہم اندر سے آزاد نہ ہونگے، یہ باہری آزادی ہمارے لئے بے معنی ہے، دھوکا ہے۔

رقیہ، سوشیلا، اور سب سہیلیاں۔ ہم سب اس نئے شوالہ کی پجارن ہونگی۔ (سب مل کر گاتی ہیں۔)

سچ کہدوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنمکدوں کے بُت ہو گئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تُو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خُدا نے
تنگ آ کے ہم نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوٹے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خُدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ۔ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سُونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی

آ۔ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دُنیا کے تیرتھوں سے اُونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسمان سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

دوسرا منظر

ولسن ہال کالج کے طلبہ اور طالبات سے معمور ہے۔
معزز خواتین کی کافی تعداد بھی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر
ہیش کی صدارت کی رسمی تجویز و تائید کے بعد مسٹر
احمد کھڑے ہوتے ہیں۔

احمد:۔ معزز صدر، بہنو اور بھائیو۔ قبل اس کے کہ میں آپکے سامنے اس اجتماع کے مقصد پر تقریر کروں آپ کو روزنامہ امرت بازار پتریکا سے ایک خبر کے تراشے پڑھکر سنانے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"کلکتہ ۲۰ فروری ۱۹۳۷ء ۔ ۷۰ اگوبند اسٹریٹ میں بابو سنتوش کمار سین کے گھر میں اُن کی تین لڑکیاں عمر ۱۷، ۱۹، ۲۱ ایک کمرے میں مخدوش حالت میں پائی گئیں۔ پولیس فوراً جائے وقوع پر پہونچی۔ دروازہ توڑا گیا اور ایک مُردہ اور دو بیہوش لڑکیاں پائی گئیں اور ہسپتال پہونچا دی گئیں۔ دو میں ایک کی حالت امید افزا ہے۔ دوسری چند گھنٹوں کی مہمان ہے۔"

"۲۱ فروری۔ جو دو لڑکیاں ۷۰ اگوبند مترا اسٹریٹ سے بیہوش ہسپتال لائی گئی تھیں اُن میں سے ایک کسی اظہار کے بغیر قضا کر گئی۔ مرنے والیوں کی تعداد اب دو ہوئی۔ تیسری صحتیاب ہو رہی ہے۔ مجسٹریٹ نے اس کا جو بیان لیا اُس سے معلوم ہوا کہ تینوں بہنوں نے سازش کر کے افیون مہیا کی اور رات کو ایک ساتھ پی کر سو گئیں۔ دو کو قے ہو گئی اور آدھی رات کرب میں گزارنے کے بعد بیہوش ہو گئیں۔ تیسری سویرے سے بے خبر موت کی نیند سوتی رہی۔ زہر خوری کا سبب یہ بتایا "ہمارے والدین ہماری شادیوں کی فکر میں دردناک طور پر بیچین تھے۔ نسبتیں آتیں اور تلک کی محال رقموں کے مطالبہ سے ٹوٹ جاتیں۔ والدین کی دلی، جسمانی، اور مالی پریشانیوں کا سبب ہم تھے، ان کی خطرناک حالت دیکھکر ہم تینوں بہنوں نے اپنی جانوں کا خاتمہ کر ڈالنے کی ٹھان لی۔ میں سخت جان بچ رہی اور دو نے مُراد پالی۔"

لاشوں کے پوسٹ مارٹم ہوئے۔ سبب موت افیون سے خودکشی قرار پایا۔"

"۳ مارچ ۷۰ اگوبند مترا اسٹریٹ میں ایک لڑکی کے اقدامِ خودکشی کا مقدمہ پیش ہوا۔ عدالت کا ہال تماشائیوں کے ہجوم سے بھرا ہوا تھا۔ خودکشی کرنے والے لڑکیوں کے بدنصیب باپ بابو سنتوش کمار سین کا بیان ہوا۔ "میں کلکتہ ہائی کورٹ کا وظیفہ خوار جج ہوں۔ میرے پانچ بیٹیاں تھیں اور دو بیٹے۔ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور صورت شکل کا نمونہ یہ ملزمہ لڑکی ہے جو آپکے سامنے اجلاس پر موجود ہے۔ پہلی دو لڑکیوں کی شادی میں تلک کے دس دس ہزار روپے دیئے تھے۔ ہائیکورٹ کی ججی سے علیحدہ ہونے کے بعد میری تنخواہ تھوڑی رہ گئی۔ جس شیشے کے کارخانے کا مینجنگ ڈائرکٹر تھا وہ بھی فیل ہو گیا۔ باقیداروں نے پنشن کا نصف حصہ قرق کروالیا۔ بقیہ حصہ وظیفہ میں سے مجھے ایک بیٹے کو جو یورپ میں صنعت کی تعلیم حاصل کر رہا ہے دو سو روپے ماہوار بھیجنا پڑتے ہیں۔ میرا خاص مکان بِک گیا تو ہم گوبند مترا اسٹریٹ میں ساٹھ روپے ماہوار کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ ہماری مالی حالت بہت زبوں ہو گئی۔ پھر بھی لڑکیوں کی بہترین تعلیم میں میں نے کوئی کمی نہیں کی۔ اور سارے اخراجات کم کر دئے۔ موٹا پہن کر اور روکھا کھا کر بسر کرتے رہے۔ ہمیں اس کا چنداں رنج اور تکلیف نہ تھی۔ جو دُکھ ہمیں گھُلا رہا تھا وہ لڑکیوں کے بر نہ ملنے کا تھا۔ ہر لڑکے کا باپ وہی دس ہزار تلک طلب کرتا تھا جو میں پہلے دو داماوں کو دے چکا ہوں۔ اور یہ مطالبہ کرنے والے ناسمجھ جاہل نہ تھے بلکہ سب کے سب تعلیمیافتہ عاقل لوگ تھے۔ یہاں جہیز کے سامان تو تھوڑا تھوڑا کر کے مہیا ہو چکے تھے۔ مگر نقد ایک ہزار بھی نکالنا مشکل تھا۔ آخر ایک نسبت طے پا گئی۔ خیال ہوا کہ دُنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں جو شادی روپے کی خاطر نہیں شایستہ دُلہن حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ مگر ۱۹ فروری کو وہاں سے بھی آٹھ ہزار کے مطالبہ پر اصرار کا خط آ گیا۔ اور اس شرط کو اٹل بتایا گیا۔ اسی شب کو یہ حسرتناک واقعے پیش کئے۔ اپنی پیاری بیٹیوں کی موت اور اقدام خودکشی کا سبب میں ہوں اور میرا قصور عزت آبرو کے ساتھ افلاس، خوشحالی کے بعد شکستہ حالی ہے۔ کاش ہم سب کو ایک بار موت آ جاتی اور اس سماجی کشٹ سے پیچھا چھوٹتا۔"

جانبر لڑکی کی عمر اور غیر معمولی حالات کی رعایت کر کے مجسٹریٹ نے تنبیہ کے بعد رہا کر دیا۔"

حضرات یہ خبریں ہیں جو ۲۰ فروری سے ۳ مارچ ۱۹۳۷ء تک ہندوستان کے طول و عرض میں شائع ہوا کیں۔ ہے آپ میں کوئی اہلِ دل دیالو جس نے دارالعوام اور دارالامرا کے ردّ و بدل یا صدر جمہوریہ کے استعفا اور تقرر کی خبروں سے زیادہ ان کی طرف اعتنا کی ہو۔ اور اشاعت روزنامہ کی صبح کی چائے کے بعد کبھی دل میں اس بدنصیب خاندان کا خیال گذرا ہو۔ اس واقعہ کی حیثیت مقامی نہیں، نہ کسی قوم سے مخصوص۔ یہ مصیبت صرف ہماری ہندو بہنوں اور بھائیوں تک محدود نہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی یہ بلا ویسی ہی پھیلی ہوتی ہے جیسی ان میں۔ ناموں کا فرق ہے۔ ان کے ہاتھوں تو مذہبی رسم کا بہانہ بھی ہے ہمارے ہاں کوئی عذرِ شرعی نہیں مسلمانوں میں بھی ہندوؤں کی طرح نسلوں اور جاتیوں کا امتیاز پیدا ہو گیا ہے۔ سادات کا بیاہتا سادات میں، پٹھانوں کا پٹھانوں میں، مغلوں کا مغلوں میں، نور بافوں کا نور بافوں میں، ملک اور کمبوہ کا ملک اور کمبوہ میں محدود ہے۔ لڑکوں کی تعداد بھی محدود اور لڑکیوں کی نامحدود، یا ان بدنصیبوں کی پیدائش زیادہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مردوں کی خواہ ناکارے جواں ہوں یا از کار رفتہ بوڑھے، قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ غریب والدین اپنی لڑکیاں اپنی قوم اور ذات کے انہیں لالچی لائق نالائق جوانوں یا بوڑھوں سے اپنی پونجی کے مطابق جس سے وہ ان کو خرید سکیں بلکہ قرض وام لیکر بیچ کر بیاہ دیتے ہیں۔ جہاں جورو اور دولت دونوں اکٹھی ہاتھ آجائیں وہاں تحصیلِ علم اور کسب معاش میں دماغ کا تیل کون نکالے اور ہڈیاں کیوں گھسے۔ ایک طرف بیٹیوں والے بیٹیاں جننے کے جرم میں ساہوکاروں کے دائمی غلام بن رہے ہیں۔ دوسری طرف مالِ مفت کی امید پر نالائق ناکارے اپاہج ڈنڈ پیلنے والے جوانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

بھائیو! اس طوفان میں ہندو مسلمان ایک کشتی میں سوار ہیں۔ گو ہندو بھائیوں نے مذہبی رسم کے باوجود اسے توڑنا شروع کر دیا ہے۔ غیرتمند نوجوانوں نے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی ہے۔ مختلف جاتیوں میں بیاہتا بھی ہونے لگا ہے۔ جوان بیواؤں سے بھی شادیاں ہونے لگی ہیں۔ تلک سے دست برداری کے واقعات بھی آئے دن اخباروں سے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ مجلس قانون ساز میں ایک مسودہ قانون پیش کر کے تلک کی رسم بند کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ مگر مسلمان جنہوں نے یہ بدعت ہندو بھائیوں سے سیکھی ہے۔ شاید افلاس، جہالت اور غلامانہ ذہنیت کی بدولت اس گداگری پر اڑے ہوئے ہیں۔ کمسنی کی شادیوں، تلک، گداگری وغیرہ سماجی اصلاحات کے جو قانون پیش آتے ہیں اس کے خلاف شخصی آزادی میں مداخلت کا شور بلند کرتے ہیں۔ ایسی قوم کو نہ شخصی آزادی میسر آسکتی ہے نہ اجتماعی۔

سب سے زیادہ افسوسناک یہ امر ہے کہ اس گدایانہ حرکت کا ارتکاب جہلا اتنا نہیں کرتے جتنا تعلیم یافتہ طبقہ۔ اس لئے اسکے انسداد کی ذمہ داری ہم پر ہی عائد ہوتی ہے۔

دوستو! ہم ملکی اور سیاسی عقدوں کا حل بڑے بوڑھوں پر چھوڑ سکتے ہیں مگر اس سماجی اصلاح کا بار صرف ہمارے کندھوں پر ہے۔ کیا آپ یہ بوجھ اٹھانے کو تیار ہیں؟ اگر ہم نے ادھر توجہ نہ کی اور اپنی پست ہمتی اور بیحیائی سے جورؤوں کی گداگری اور محتاجی گوارا کرتے رہے تو لعنت ہے ہماری تعلیم پر اور تف ہے ہماری شرافت پر۔ (تالیاں)

مس شانتا کماری سنہا ایک بی۔ اے کی طالبہ مقرر کی میز کی طرف جا کھڑی ہوتی ہے، تالیاں بجتی ہیں۔

بھائی اور پیارے بھائیو، میں سب سے پہلے اپنی بہنوں کی اور سے کنیاؤں پر میا کی تازہ لگن پر جو آپ کے دلوں میں اٹھی ہے آپکو دھنباد دیتی ہوں۔ اصل میں یہ بِشئے آپ کے دکھ سکھ کا اتنا نہیں جتنا ہمارا ہے۔ اس کی چنتا زیادہ ہمیں چاہیئے تھی۔ پر آپکے سہارے بنا ہم بےبس تھے۔ ستی کہنے کو اٹھ گئی پر جیتے جی ہم بھیتر بھیتر جس پر کار سے جھلس رہے اور بنا موت مر رہے ہیں اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ ہمارے ماتا پتا کا بھی یہ حال ہے کہ بیٹیوں کے بیاہ میں جب تلک کا بوجھ سر پر پڑتا ہے تو بلکنے لگتے ہیں، پر وہی جب بیٹوں کا بیاہ رچانے بیٹھتے ہیں تو سب دکھ بھول کر شیر بنے ہوئے وہی بوجھ دوسروں کے سر ڈال کر پیسنے لگتے ہیں اور کسی کے دکھ کی سدھ نہیں لیتے۔ تلک اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا بیوپار بنکر رہ گیا ہے۔ ایک بیاہ کے دلال پانڈے نے ایک بار میرے پتا جی سے کہا۔ "لوگ تلک کے لئے اتنی چنتا کیوں کرتے ہیں؟ جمائی تو سینت مینت سے لیکر بہ مول کے ملتے ہیں۔" پتا جی نے پوچھا، "سینت مینت میں کیسے؟" وہ بولا۔ "اجی صرف سینت مینت میں نہیں بلکہ اوپر سے آپ ہی دام لے لیجئے۔ وہ ایسے کہ ذرا آدھ بیس رنڈوا یا بیاہا جمائی قبول کیجئے۔ یا بنس میں ذری مری کسر ہو تو تلک رہا الگ، کنیا جدی سندر اور جاتی کی ہو تو منہ مانگے دام آپ ہی لے لیجئے۔ اور جوان تندرست چاہیئے تو لنگوٹے اپاہج سے لیکر اسٹوڈنٹ، ماسٹر، وکیل، ڈپٹی کلکٹر، دیسی ولایتی گریجویٹ اور سول سروس کے افسر تک

سو دو سو سے دس بیس ہزار تک بازار میں ہر مول کے جمائی موجود ہیں۔ جیسا مال ویسے دام۔ اور دام بھی ہر حال میں نقد ادا کرنا ضروری نہیں۔ اگر کوئی غریب لُوّر اسٹوڈنٹ قبول کرلو تو سستا سودا پٹ جائے۔ پھر اسے پڑھا لکھا کر چاہو کرانی بناؤ، چاہو ولایت بھیج کر جج، کلکٹر، بیرسٹر۔

یہ سچ ہے کہ گھوڑے بیلوں کا مول اُن کی عمر، کس بل، ڈیل ڈول صورت شکل کے فرق سے بیش و کم ہوتا ہے۔ ہم ان جمائیوں کو گھوڑے بیل ہی سمجھ لیتے، پر یہ اُلٹی بانی ہمارے سمجھ میں نہیں آتی کہ جو کنیائیں جمائیوں کے دام دیں وہی ان زرخرید غلاموں کی جنم بھر کو لونڈیاں بنائی جائیں۔ صرف ان کی نہیں بلکہ ان کی ماتا پتا، بھائی بہنوں سب کی کڑی کڑوی سہا کریں۔

ایتھاس میں ہم نے پڑھا ہے کہ عرب اور راجپوتانہ کے عزت دار باپ، بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ آج ہم ان کو بہت بُرا کہتے ہیں اور ہے بھی بھاری پاپ۔ اُس سمے میں کارن جو کچھ بھی ہو پر آج تو بیٹیوں کو جنم لیتے ہی لون چٹا کر مار ڈالنا ہی اُچیت دکھائی پڑتا ہے۔ یوں ماتا پتا اور بھائیوں پر کال بنکر یا کلنگ کا ٹیکہ لگا کر جیون بتانے سے تو یہی اچھا ہے۔ اگر اس بپت کا سدھار نہ ہوا تو ہزار سکشا پھیلے، یا تو کنیائیں یونہی جانیں گنوایا کریں گی جیسے کلکتہ کی ان لاجونتی دیویوں نے گنوائیں یا پھر منہ میں کالک لگا کر آزاد پھریں گی۔ یا بنا موت زندگی کے دن بھرا کریں گی۔ یہ درگ وشا تو کنواریوں کی ہے، جوان بدھواؤں کی بپتا کون سنتا ہے۔ ہمارے مرد سوراج جیتیں، آزادی لیں، سُکھ چین پائیں، جو چاہیں لیں پھر دیش کی آدھی سے زیادہ آبادی نہ صرف غلام رہے بلکہ غلامی میں بھی جینے کی آ گیا ہو! کیا ایسی قوم کو آزادی دینا پرمیشور کا نیائے ہوگا جو دوسروں کو غلام بنائے رکھے، لوٹے مارے اور کوئی راتی دہائی نہ سنے؟

اس انیائے کے مٹانے کا صرف ایک اُپائے تھا اور وہ جوانوں کی جاگ، خود پتروں اور پتنیوں کی ہمت ہے۔ ہمارے لئے آج کا دن ایک بھاگوان ادرشیہ سمے ہے کہ ہمارے بھائی جاگ اُٹھے اور مسلمان بھائی آگے آگے دکھائی پڑتے ہیں۔ اگرچہ دُکھ زیادہ ہندو کنیائیں جھیلتی ہیں۔ بھائیو ہمیں ناکاری بے بس نربل جان کر اس لڑائی میں پیچھے نہ ڈالو، بشواش رکھو کہ ہمیں ہر سمے ہر پرکار کے بلیدان کے لئے تیار پاؤ گے۔ اور یہ دیا آپ اپنے اُوپر ہوگی۔ بھائیو، یہ ہے سچا دھرم، منش کی سیوا اگر سب دھرموں کا نچوڑ ہے تو آج ہندو مسلمان، جین سکھ، پارسی نوجوان اس بپتے پر ایک ہوکر زور لگائیں کوئی وجہ نہیں کہ ہم کامیاب نہ ہوں۔ آئیے ہم سب مل کر جیون کی اس کٹھن گانٹھ کو کھول کر دیس میں آنند کی کرنیں پھیلا دیں۔ نہیں تو جیسا میرے اگلے بھائی نے کہا ہے دھتکار ہماری تعلیم پر!۔ (تالیاں)

بابو پرسوتم پرشاد کھڑے ہوتے ہیں۔ (تالیاں)

صاحب صدر، بھائی بہنو۔ میں اپنی پیشیرو بہن کے ساتھ مسلمان بھائیوں کو احساسِ ہمدردیِ نسواں میں ان کی اوّلیت پر مبارکباد دیتا ہوں اور ہندو نوجوانوں کی تنگدلی اور بے حسی کے باوجود آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں۔ کہ زیر غور تحریک میں آپ ہمیں یعنی ہندو طلبہ کو پیچھے نہ پائیں گے۔ یہ ہمارے ذاتی فائدے اور غرض کا معاملہ ہے۔ جس گناہ میں ہم آگے رہے ہیں اس کا پراشچیت اور کفارہ بھگتنے میں بھی خدا چاہے تو آگے ہی رہیں گے اور جو قربانی بھی درکار ہو ہم دریغ نہ رکھیں گے۔

اس سلسلے میں میں مسئلے کے عملی پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ یہاں تین سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہماری ازدواجی پریشانیوں کے اسباب کیا ہیں؟ دوسرے یہ کہ تدبیر و علاج کیا ہیں؟ تیسرے یہ کہ ان تدابیر میں کون کون سی اختیار کی جاسکتی ہیں؟

اسباب جو ممکن ہیں یہ ہیں۔ جہالت، افلاس، لڑکیوں کی کثرت، ذات پات کا بچار۔ ان میں جہالت کا عذر صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ بلا تعلیم یافتہ طبقہ میں ویسی ہی پھیلی ہوئی ہے، جیسے غیر تعلیم یافتہ میں۔ پتر یکا سے جس خبر کے تراشے ابھی پڑھے گئے ہیں وہ معزز تعلیمیافتہ خاندانوں سے متعلق تھے۔ افلاس کا عذر بھی مہمل ہے۔ کیا بیٹوں کے والدین مفلس ہوتے ہیں اور بیٹیوں کے والدین قارون کے وارث؟ اور اگر بیٹے والے مُفلس ہوتے ہیں تو دولت سمیٹنے کے لئے دوسرے راستے کھلے ہیں، جائز بھی اور ناجائز بھی۔ بھیک مانگیں، چوری کریں، اپنی عزتیں بیچیں، پر شریف کنیاؤں کی زندگی اجیرن نہ بنائیں۔ لڑکیوں کی کثرت ایک حد تک اُن کی ارزانی اور دامادوں کی گرانی کا سبب ہے۔ پر اس کا علاج ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ ذات پات کا بچار بہت حد تک اس دُکھ کا کارن ہے۔ اگر آج جاتیوں کی بندھن ٹوٹ جائے تو ناکارے نوجوانوں کا مول گھٹ جائے اور مسلمان بھائی بھی جنہوں نے یہ بدہوائی ہم سے لی ہے ہمارے ساتھ اس کشٹ سے چھٹکارا پائیں۔ ہندو مسلمانوں کی قسمتیں صرف سیاسیات میں نہیں بلکہ روحانی اور سماجی لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ غرض اس عذاب کا سب سے بڑا کارن ذات پات کی بندھن ہے۔

رہا علاج۔ سو ایک تو تعلیم تھا وہ ہم میں کافی موجود ہے۔ پھر بھی

کارگر نہیں۔ دوسرا پردہ اُٹھاتا ہے۔ اگر پردہ قطعی اُٹھ جائے اور نوجوانوں کو جوڑے کے انتخاب میں اُن کا قدرتی حق بخشدیا جائے تو یکشت آپ ہی آپ دُور ہوجائے، لڑکوں لڑکیوں کی مخلوط تعلیم جو ابھی جاری ہوئی ہے اس کا ایک فائدہ مند پھل یہ بھی ہو سکتا ہے گو میں جانتا ہوں کہ اس راہ میں خطرات بھی بہت ہیں۔ ناتجربہ کار نوجوانوں کی راہ میں نفس کے دیو اور کامنا کے بھوت پریت رہزنی کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ پھر ہماری تعلیم صحیح اصول پر ہو، مشرقی روحانیت کا دامن ہاتھوں میں مضبوط ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے ازدواج کا مسئلہ حل نہ ہوجائے اور خانگی زندگی مسرت و اطمینان کی کرنوں سے روشن نہ ہوجائے۔ تیسرا علاج جو ابھی عرض کر چکا ذات پات کی بندھن توڑنا اور ہڈیوں کے ناجائز مول کو گھٹا کر نوع انسان کو ایک سطح پر لانا ہے۔

اس بِشے میں ہمارے ہندو بھائی مجھے معاف کریں اور اجازت دیں تو اپنا ذاتی خیال عرض کروں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ مذہب ایک ذاتی رشتہ ہے اور افراد اور خدا کے درمیان جس میں کوئی تیسرا وجود دخل نہیں رکھتا، اگر مذہب میں سلامت روی اور تہذیب اخلاق جزو مشترک ہے تو اپنا اپنا مذہب اور روحانی میلان اپنے ساتھ مخصوص رکھتے ہوئے مختلف مذاہب اور اقوام کے درمیان ازدواجی رشتہ قائم کرنے میں کوئی دوش نہیں معلوم ہوتا۔ جس دن ہندوستان پر یہ شبھ گھڑی آجائے تو نہ صرف موجودہ مسئلہ کا حل ہوجائے بلکہ زبانوں، تہذیبوں، قوموں اور نسلوں کے حقیقی اتحاد سے صحیح معنی میں ہندوستانی قومیت کی تعمیر ہوجائے۔

"سنو سنو" کے ساتھ دیر تک تالیاں پٹتی ہیں۔ "ہندوستان زندہ باد، اتحاد، انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے کالج کی عمارت، میدان اور سڑکیں گونج جاتی ہیں۔

بچا کھڑے ہوتے ہیں۔ تالیاں بجتی ہیں۔

جناب صدر، معزز بہنو اور بھائیو۔ میں اپنے پیشرو مقررین کی جذباتی تقریروں سے بہت متاثر ہوں، اُن کے جوش کی دل سے قدر کرتا ہوں اور اس کے استقلال و ثبات کی دعا کرتا ہوں۔ ہمیں مسئلہ کے عملی پہلو پر غور کرنا رہ گیا ہے جسے میں آپ کے سامنے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ اور بعض وہ پہلو آپکو دکھانا چاہتا ہوں جن پر آپکی نگاہ نہ پڑی۔

ہماری ازدواجی زندگی کی تلخیوں میں ایک حصہ بے وقت شادیوں کا بھی ہے۔ ہمارے دستور العمل میں یہ بھی داخل ہونا چاہیئے کہ نوجوان برسر روزگار ہونے سے پہلے والدین کی سرپرستی کے بھروسے پر شادیاں نہ کریں بلکہ اپنے اختیار، تمیز اور ذمہ داری پر۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ والدین کی رائے کو قطعی دخل نہ ہو۔ ہو مگر مشورہ تک محدود ہو، عموماً والدین کا مقصد اپنی زندگی کا آخری ارمان یا ہوس پورا کرنا ہوتا ہے مگر اولاد کو زندگی کا سب سے [illegible] عقدہ حل کرنا ہوتا ہے۔ جس کی کامیابی اور ناکامی پر اسکی زندگی کا دُکھ سُکھ موقوف ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں اُنہیں کا فیصلہ قطعی اور ناطق ہونا چاہیئے۔

پردے کی مضرتوں کے متعلق میرے پیشرو مقرر نے جو کچھ فرمایا مجھے اس سے بالکل اتفاق ہے مگر پردہ شکنی ہماری زیرِ نظر مصیبت کا علاج نہیں ہوسکتی۔ دُنیا کی مہذب ترین بے پردہ قوموں کے تجربے ہمارے لئے شمع ہدایت ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں کتنے جوڑے خوش اور مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں اور کتنی طلاقیں واقع ہوتی ہیں۔ میاں بیوی کے خانگی تعلقات کتنے واقعی خوشگوار ہوتے ہیں اور کتنے اندرونی طور پر تلخ و دردناک۔ آپ کے سامنے تصریح کی ضرورت نہیں۔ اخبارات اور انگریزی افسانے اور سینما کے پردے آئے دن ہمیں اسکی زندہ تصویریں دکھایا کرتے ہیں۔ اگر مخلوط معاشرت اور تعلیم ہندوستان میں ویسی ہی عام ہوگی جیسی یورپ اور امریکہ میں تو نماز بخشوانے کے عوض روزے گلے پڑیں گے۔ آج رونا بَر کے مہنگے ہونے کا ہے یا افلاس کا، کل کو اخلاقی تباہی اور بے لگامی سے ہماری ازدواجی زندگی اس سے زیادہ ناقابل برداشت ہوجائے گی جتنی یورپ کی ہے۔ یہاں افلاس سب پر مستزاد ہوگا۔ آج سب مصیبتوں کے باوجود ہماری فرض شناس، روحانی نور سے منور دلوں والی دیویوں نے ہمارے گھروں کو امن و سکون کی بہشت بنا رکھا ہے۔ خدا کے لئے یہ بہشت ہم سے نہ چھینو۔ ان کو پردے کی قید سے آزاد کرو مگر زینتِ محفل نہ بناؤ۔ نور کو نور رہنے دو آگ نہ بناؤ اور لکڑی سے نہ ملاؤ۔ فطرت کی خاصیت کسی تعلیم و تربیت سے بدل نہیں سکتی اور آگ لکڑی [illegible] بغیر نہیں رہ سکتی۔

حضرات، پردہ ہمارا موضوعِ بحث نہیں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ پردہ دری ہمارے فرض کا علاج نہیں، نہ اس پر سب طبقے متفق ہوسکتے ہیں۔

ازدواج بین الاقوامی ایک مبارک تحریک ہے مگر افسوس ہے کہ جس ملک میں ایک طبقے کا دوسرے سے چھو جانا بھی غضب ہے، ایک ساتھ کھانا پینا ناممکن ہے وہاں ازدواج کیونکر ممکن ہوگا۔ مذہب کے نام پر بھنگیوں، چماروں اور اچھوتوں سے چھوت اُٹھایا جا رہا ہے مگر عیسائی اور مسلمان ان مُردار خواروں سے زیادہ ناپاک سمجھے جاتے

ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے بہتیرے تعلیم یافتہ ہندو احباب چُپ چپاتے ہمارے ساتھ کھا لیتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ یہ ہمیں جی ہڑوں سے زیادہ پاک سمجھتے ہیں۔ مگر آج تک کسی مہاتما یا لیڈر نے ہم سے چھوت اُٹھانے کی صلاح نہیں دی۔ موجودہ ذہنیتوں میں ازدواج بین الاقوامی کی آرزو ایک مبارک تصوّر ہے مگر ناقابلِ عمل۔ ابھی دلّی دُور ہے اور ہندوستان پر ایسی مبارک صبح کے طُلوع ہونے میں بہت دیر ہے۔

تمام مجوّزہ علاجوں میں لے دیکر ہمارے پاس ایک ہی ممکن علاج رہ جاتا ہے اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جُدا جُدا جاتیوں اور نسلوں کے امتیازات کا اُٹھا دینا ہے۔ یہ علاج مرض ہی کا نہیں بلکہ سبب کا ہوگا۔ شکر ہے کہ ہندو مصلحوں نے اسے ہندوؤں سے دفع کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ حالانکہ مذہب ان کی راہ میں حائل ہے۔ اسلام ان امتیازات کا مخالف ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان ان کو ایک دم میں توڑ کر نہ رکھدیں۔ اس ایک نقطہ پر ہندو مسلمانوں کا اشتراکِ عمل ممکن اور ضروری ہے۔ آیئے ہم نوجوان ہندو مسلم ملکر دشمن کے قلعہ پر اسی مقام سے حملہ شروع کر دیں۔

ہماری ازدواجی زندگی کا ایک اور دردناک پہلو ہے، جس کا تعلق اگرچہ صرف مسلمانوں سے ہے، ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور وہ دین مہر ہے۔ شرعًا یہ بیوی کا حق ہے جسے شوہر یا غصب کر لیتے ہیں یا عورت عدالت میں چارہ جوئی کرے تو تباہ ہو جاتے ہیں اور صرف اس سبب سے کہ شان بڑھے اتنی بڑی رقم مہر قبول کر لی جاتی یا کرا لی جاتی ہے، جسے شوہر عمر بھر ادا نہیں کر سکتا نہ واجب الادا سمجھتا ہے۔ لیکن اگر میاں بیوی میں موافقت نہ ہوئی تو بیوی کبھی اپنی زندگی میں دعویدار ہوتی ہے زیادہ تر اس کے مرنے پر ورثا شوہر کی جائداد پر دعویٰ کر دیتے ہیں۔ جس سے شوہر اور اُس کی جائداد تباہ ہو جاتی ہے۔ بیوی کیسی ہی بُری ہو شوہر مہر کے خوف سے طلاق کا نام زبان پر نہیں لا سکتا۔ سہتا ہے سکتا ہے اور چوں نہیں کر سکتا۔ اس طرح یہ گراں مہر عورت اور مَرد دونوں کے حق میں عذاب ہوتا ہے۔

حضرات ہمارے سامنے کام بہت کٹھن ہے مگر کسی دھوم دھام کی اسکیم بنانے اور اخباروں میں شہرت دینے کے عوض ہم سادگی اور خاموشی مگر ہمت سے اسے یوں شروع کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ بن بیاہے ہندو مسلم جوان جو ہمارے ہم خیال ہوں ذیل کے حلف نامہ پر دستخط کریں اور دوسروں کو ہم خیال بنا کر اُنکے دستخط حاصل کریں۔ یہی حلف نامہ ہمارا رزولیوشن ہے۔ (پڑھتے ہیں)

میں اپنی عزت کا واسطہ دیکر اور خدا کو گواہ کر کے اقرار کرتا ہوں کہ

۱۔ جب تک میں اپنی معاشی حالت دُرست کر کے اپنے پاؤں پر آپ نہ کھڑا ہو سکوں شادی نہ کرونگا۔

۲۔ شادی کیلئے ذات اور نسل کی پابندی لازم نہ سمجھونگا۔

۳۔ شادی میں لڑکی والوں سے کوئی نقد یا جنس جو لڑکی کی ذاتی ضروریات سے زائد ہو اپنے لئے قبول نہ کرونگا۔

۴۔ میں ہر ایسی شادی کی دعوت رد کر دونگا جس میں لڑکے والوں نے لڑکی والوں سے تلک یا کسی بہانہ سے روپیہ یا اس کا بدل لیا ہو۔

۵۔ دین مہر کی انتہائی رقم اپنی موجودہ آمدنی کی شرح سے پانچ سال کی مجموعی آمدنی سے زیادہ منظور نہ کرونگا۔

۶۔ مہر کی رقم قدرت حاصل ہوتے ہی اوّل موقع پر ادا کر دونگا۔

(تالیاں)

پاربتی دیوی:۔ اس پاک کام میں جو عورتوں کی بھلائی کے لئے شروع کیا جا رہا ہے عورتوں کو کوئی حصہ نہیں دیا گیا۔ آپ بسواس رکھیں ہم ہر قربانی کیلئے تیار ہیں اور ہمارا قدم آپ سے پیچھے نہ ہوگا۔

موہن لال ورما:۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ لڑکی والوں کی حیثیت رشوت دینے والوں کی ہے اور لڑکوں کی لینے والوں کی۔ ہم غرض کے ماروں کو رشوت دینے سے نہیں روک سکتے۔ پہلے ہم لالچی رشوت خواروں کو روکیں گے۔ اگر جوانمردوں کی جدوجہد کامیاب ہو گئی تو بہنوں کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اگر زیادہ سخت تدابیر کی حاجت ہوئی تو ہم ستیہ گرہ کریں گے۔ ایسے کمینے بھکاریوں کی تشہیر کریں گے، ان پر عیش حرام کر دینگے۔ (تالیاں)

صدر:۔ عزیز دوستو۔ مَیں الفاظ میں اپنے تاثر کے اظہار سے قاصر ہوں۔ میں نے اپنی تعلیم کے دَوران میں جن بلند حوصلوں کی اپنے دل میں پرورش کی اور تکمیل تعلیم کے بعد پیشۂ معلّمی جس خواب کے زیرِ اثر اختیار کیا اس کی تعبیر مجھے آج دس برس کے بعد اس ہال میں مل گئی۔ آج مجھے تم پر فخر اور اپنے کالج پر ناز ہے جس نے ایسے درد مند، بلند ہمت سپوت پیدا کئے اور جنہوں نے تعلیم کا اصل مقصد پورا کیا۔ رات زیادہ گذر چکی ہے، رسمی صدارتی تقریر پر وقت صرف کرنا غیر ضروری ہے۔ جاؤ ہماری دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم نے ہمیں بھی سکھا دیا کہ آئندہ ہمیں کس لائن پر تعلیم دینا چاہیئے۔ اس مسئلہ پر ہمیں کافی غور اور پھر کام کرنا ہے۔ (مجلس برخاست)

محمد مُسلم

●●●

گوری ہو گوری

چونکہ ہماری بے پایاں وسیع زبان کی بے حساب خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ لفظوں کی ادائیگی اور لہجے سے طرح طرح کے معنی اور باریک خیالیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے مجبوراً میں نے اس افسانے میں چند نئے نشانات لفظوں، فقروں اور آوازوں کے پڑھنے اور لہجے کی ادائیگی کے واسطے اختراع کر کے شامل کئے ہیں اور آئندہ میرے ہر افسانے میں یہ نشانات شامل ہوا کریں گے۔

۱۔ ⟵ جس پر یہ نشان ہو کھینچ کر پڑھا جائے۔ ... مثلاً کوئی ہے۔

۲۔ ⟶ جس پر یہ نشان ہو جلدی سے پڑھا جائے۔ مثلاً حضور

۳۔ ↓ جس پر یہ نشان ہو زور دے کر پڑھا جائے ...... مثلاً چھوٹے منشی کو بھیجو۔

۴۔ ــــ جس پر یہ نشان ہو باآواز بلند پڑھا جائے ... مثلاً ملازم باہر آکر آواز دیتا ہے "منشی جی"

۵۔ ــــ جس پر یہ نشان ہو آہستہ آواز میں پڑھا جائے مثلاً منشی جی پوچھتے ہیں "خیر تو ہے"

۶۔ یہ نشان آپس میں بھی مل سکتے ہیں۔ مثلاً نوکر ڈراتا ہے "چلیے چلیے آج خیر نہیں"

سید رفیق حسین

چوماسہ کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے۔ ٹر، ٹر، ٹر پیپل کے سوکھے ڈگالے پر الو کہتا تھا۔ ہک ہو۔ ہک ہو۔

بسنتی نے کروٹ لی، پھر منہ پر تھپڑ مارا۔ بولی "ہائے رے۔ ارے رام، کیسے ڈانس لاگیں۔"

پیپل پر الو بولا "ہک ہو۔ ہک ہو۔"

چھ مہینے کا بچہ پاس لیٹا تھا، اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی "مری جائے، پھر آئے بیٹھا۔ بولت کیسے ناس پیٹا۔"

ہک ہو۔ ہک ہو۔

"اجی۔ او جی۔ اجی او جی۔ اٹھو نا۔ گھگھو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔"

مادھو نے اس کا ہاتھ جھٹکا، بولا "سون دے ری۔ اری نا کھائے لے تو ہے۔"

"اٹھو جی اٹھو۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اڑائے دے او انھو۔"

مادھو "ادھ سے تو را ڈر" کہتا ہوا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ کھٹیا سے نیچے پیر لٹکایا جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کر نیچے دیکھا پھر ادھر ادھر دیکھا۔ چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ پھوٹی چمنی کی دھوئیں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھلجھلا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔

مادھو بولا "جو کا ہوا رے۔"

بسنتی گھبرا کر اٹھی، بولی "اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام۔ بھیکا کو جگا لو۔ ارے رمکلیا کو جگا لو۔ ارے ان ہن کی پیرھی لو پانی آئے گیا رے۔ ارے او بھیکا۔ رمکلیا ہو۔ اری او رمکلیا۔ سوئے جات رے۔ ارے اٹھ اٹھ او بھیکا۔"

آٹھ برس کی دبلی پتلی رمکلیا جاگی۔ چھ برس کا بھیکا جاگا۔ دودھ پیتا پاس لیٹا بچہ جاگا۔ یہ رویا، وہ چلائے "او متیا رگی" "موہے لئے لے بابو رے" "اری متیا رگی"

"چپ کرو چپ" مادھو نے ڈانٹا۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے، بسنتی نے دھیان دیا۔ دور کہیں سے آواز آرہی تھی گڑ ڈپ شل شل شل گڑ ڈپ شل شل شل۔

گھگھو بولا۔ ہک ہو۔

بسنتی روتی ہوئی چلائی "ارے پریتم بھیا آئے گئی۔ ارے مورے بچے لی جو رے۔"

کھٹولے سے کود۔ پانی میں چھپچھپاتے بچے ماں سے چمٹے۔ مادھو اٹھا دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روتی "اجی جا دت کہاں ہو جی"

باہر سے آواز آئی "مادھو بھیا ہو۔ او مادھو۔ ارے باڑھ آئی۔ اٹھ رے اٹھ"

شڑاپ، گھڑاپ، شل شل شل۔ پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

مم مم، میں۔ کہیں بکری بولی۔ ماں ہاں آں۔ ماں ہاں آں کہیں گتیاں چلا رہی تھیں۔ بارہ گھر کے گوجر پُردے میں ہلچل مچ گئی۔ سب جاگ اُٹھے، سب بھاگنے لگے۔ کوئی پکارتا تھا، کوئی چلاتا تھا۔ کوئی روتا تھا۔

مادھو نے رمکلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ بھیکا کو گود میں لیا۔ سامان رکھنے اور اُٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے چون کی مٹکی اُٹھائی۔ تیرتی ہنڈیا پکڑی۔ مٹکا لٹرایا ہوا پرے سے نکلا جاتا تھا اُسے پیر سے روکا۔ کھٹیا نے سر ہلایا۔ پھر وہ بھی گھومی۔ دری، بچھورا، کھتری۔ سب کچھ اس پر تھا۔ لو وہ بھی چلی۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلا رہے تھے۔ گھر کے اندر رمکلیا اور بھیکا رو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا۔ "بھاگو بھاگو۔ او بسنتی نکل۔ ارے مادھو، بھاگ"

پانی نے ہچکولا لیا۔ پنڈلی سے اُچکا رانوں تک آیا۔

"بھاگو۔ بھاگو۔ مادھو بھیا بھاگو رے۔ ارے کا ہوئے گیا۔ نکلت کاہے ناہیں" باہر سے آوازیں آئیں۔ پانی نے پھر ہچکولا لیا۔ آگے بڑھا پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔

بسنتی روئی "ارے مورے گرڈوے، ارے موری ہنسلی تو نکال لے رے"

"چل چل، تو چل نکل، میں لایا۔ ارے لون چون تو لئے لوں۔ اُڑھنا بچھورا تو دبائے لوں"

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلانا تھا۔ دروازے پر دھکے تھے۔ وہ کھل گیا آدمی گھر میں آ گئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر کھینچا "چالو، چالو۔ سب چھوڑو۔ جان ہی بچائے لو۔ چالو چالو"

اس گڑبڑ میں، جلدی میں، گھبراہٹ میں، اندھیرے میں۔ دری، بچھورے، کپڑوں کے لئے پکارتی، ناج اور ناج کی کٹھیوں کے لئے روتی برتنوں اور زیوروں کے لئے پھڑکتی۔ بسنتی نے یہ بھی کہا "بھیا رے رمکلیا کو کوتو لے لے رے" لالٹین ڈوب چکی تھی اندھیرے میں کسی نے جواب دیا۔ "موں اُٹھائے لوں تو تو چل۔ اری نکس باہر رے"

پانی کی شل شل، رات اندھیری، بادل کی گرج۔ بجلی کی چمک۔ کمر کمر سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی، پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا۔ ہر جانور چلا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا دوسرا سنبھالتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا دوسرا اُبھارتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے پردے سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے ہو کر پون میل کے فاصلے پر دُور ریل کی اونچی پٹری کا رُخ کیا تھا۔ لیکن جو جو آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

مادھو اور بسنتی ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے تھے۔ دودھ پیتی لڑکی اور بھیکا اُنکے ساتھ تھے۔ رمکلیا کو بھی کسی نے کوٹھے کے زینے پر سے اُٹھا لیا تھا۔ ان کو اس کا اطمینان تھا۔ مگر مادھو کو اپنی گائے اور چار بیلوں کی فکر تھی۔ جو کہ گاؤں سے باہر کوئیں کے پاس بنگلیہ پر اس کے سالے کے ساتھ رہتے تھے۔ بسنتی کو ڈھوروں کی اتنی فکر نہ تھی۔ اب وہ اپنے بھائی کے لئے بیتاب تھی۔ "اُدھر تو وہ اکیلا ہی رہتا ہے۔ نہ جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے آیا کہ نہیں" مادھو نے گرتی ہوئی جورو کو سنبھالتے ہوئے دہرایا "کو جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے بردے کھولے کہ ناہیں"

اندھیری رات تھی ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر اور کمر سے اونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ اِدھر اُدھر دور اور نزدیک آوازیں انکی آ رہی تھیں۔

"جانکی ہو جانکی"

"آئے رہوں دادا"

"مرلی رے مرلی"

"بھلا رے بھلا چالے چالو"

مادھو بھی بار بار سالے کو پکارتا تھا "ناگا او ناگا" اور جواب نہ آتا تھا۔ اب پانی میں شور کے ساتھ زور بھی بڑھا۔ کسی نے اندھیرے میں پکار کر کہا "لین کے لگے نریا ہے نریا" کوئی بولا "سنبھلے سنبھلے نکلے چالو" کسی نے کہا "ڈٹے رہو بھیا۔ ڈٹے رہنا بھیا۔ آئے گئی لین"

ایک دفعہ اندھیرے میں ناگا کی آواز آئی "مادھو بھیا ہو۔ کوؤ مادھو بھیا دیکھو"

کسی نے جواب دیا "بڑا دکھوئی یا۔ ہاتھ لو تو لوکت ناہیں"

مادھو نے جلدی سے پکار کر جواب دیا "بھلی ہے بھلی، آت ہوں بروے لے آیا رے"

ناگا چلایا "بسنتی کتے، بولت ناہیں"

"ارے ہے رے موئے ساتھ بروے کتے چھوڑے سے آیا رے"

"آئے جاؤ آئے جاؤ" آر۔ کے۔ آر۔ کی لائن پاس آ گئی تھی۔ ناگا

دوگز پر پانی کے باہر کھڑا تھا۔

ٹکراتی بھینسیں، چلاتیں گائیں، ممیاتی بکریاں، روتے بچے، سہمی عورتیں، پکارتے مرد، سب بھیگے، سب پانی ٹپٹپاتے ریل کی پٹڑی پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سونی پٹڑی آباد ہوگئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آگیا ہے اور کون کون رہ گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔ آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی ہوئی۔ جانور سب موجود تھے آدمیوں میں ایک چمار کا لڑکا اور دو سگے بھائی کرمی کم تھے بچوں میں رمکلیا کم تھی۔

بسنتی نے رمکلیا کے واسطے اور چمار، چمارن نے لڑکے کے واسطے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ دونوں کرمی بھائیوں کے رشتہ داروں کو اطمینان تھا۔ کیونکہ ایک تو دونوں تیراک تھے، دوسرے کافی اونچے مکا کے کھیت میں بہت مضبوط اور اونچے مچان پر وہ دونوں سوئے ہوئے تھے۔

رمکلیا کی ماں تڑپ تڑپ کر روتی تھی۔ سب دلاسا دیتے تھے، ہر کوئی سمجھاتا تھا۔ رو دھونا صبر کر۔ شاید دونوں کرمیوں میں سے ہی کوئی آگیا ہوگا۔ کسی درخت پر ہی لیکر بیٹھ گیا ہو۔ چمار کا لڑکا بھی تو وہیں تھا۔ اس ہی نے تو کہا تھا کہ گودی لے لےگا۔ وہی اس کو لیکر کسی درخت پر چڑھ گیا ہوگا۔ پر ممتا کی ماری دکھیاری چپ کیسے ہوتی۔ اس کا تو دل ہی ٹوٹا جاتا تھا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ ناگا ہچکیاں لیتا تھا اور وہیں پر ان کی گوری گائے کھڑی ارّاتی تھی۔ "تو کاں آں ھ۔ تو کاں آں ھ" یہ بھی دکھ پیٹی ماں ہے۔ ارے کوئی جانے نا جانے، بچھڑا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دکھیا روتی ہے۔ تو۔ کاں آں ھ۔

روتی، ہچکیاں لیتی ہوئی بسنتی کے پاس، بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اسکی گردن میں باہیں ڈالدیں اور روئی۔

گوری رے موری رمکلیا ... ایھ ایھ ایھ ایھ
گوری رے اب توہے کون چرائے .. ایھ ایھ ایھ ایھ
گوری رے اب توہے کون کھلائے۔ اُوھ اُوھ اوھ اوھ
گوری رمکلیا تو کئی رے .. اُوھ اُوھ اوھ اوھ
گوری توری رمکلیا ...... ایھ ایھ ایھ ایھ

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی۔ "تو کاں آں ھ"
کوئی جانے نہ جانے دل کی لگی رام جانے۔ گائے نے چلّا چلّا کر اور بسنتی نے سسکیاں لے لیکر آخر صبح ہی کر دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پروے کی طرف اٹھ گئیں۔ سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔ اس ہی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پروا آباد تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ آموں کے درخت تو تھے مکان بہہ چکے تھے۔ اور اگر کوئی بچا کھچا مکان ہوگا بھی تو درختوں کی آڑ میں ہوگا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا۔ جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلاتے مل رہے تھے۔ اور پھر ان کے پار۔ میلوں میلوں جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔ ریل کی لائن کے قریب ہی جہاں پر چھوٹا نالہ تھا، پانی کا دھارا تیزی سے چل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی چار نوجوانوں نے ہمت کی لنگوٹی کس پانی میں کود پڑے۔ تیرتے ہوئے آموں کے باغ تک گئے۔ وہاں چمار اور دونوں کرمی بھائی تو موجود تھے رمکلیا نہ تھی۔ چمار کو تیرنا نہ آتا تھا، اور پھر ڈرتا بہت تھا۔ ان لوگوں نے ایک پٹیلا ڈھونڈ لیا تھا۔ جو کہ درختوں میں الجھکر تیرتا ہوا رہ گیا تھا۔ سب نے چمار سے بہت کہا کہ اس پٹیلے پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے اور یہ لوگ کھینچتے ہوئے اسے لے جائیں۔ مگر اس کی عقل میں ہی نہ آئے، ڈر کے مارے مرا جائے، پانی میں اترتا ہی نہیں۔ بہت سمجھایا۔ بڑی خوشامد کی لیکن راضی ہی نہ ہو، اور جب یہ لوگ اسے درخت پر چھوڑکر چلنے کو تیار ہوں تو پھر بری طرح سے دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک کی سمجھ میں آگیا۔ چمار کے، درخت پر چڑھکر اور اس کی گردن پکڑ، مارے کس کس کے جو ہاتھ دو تو جھٹ راضی ہوگیا۔ پٹیلے کے تختے پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیرتا ہوا سب کے بیچوں بیچ ساتھ ہولیا۔ اور سب باری باری پٹیلے کو دھکیلتے ہوئے لے چلے۔ رستے میں کسی نے کہا: "لے اب بہائے رے سانچی ناہیں ڈبوئے دین تو ہے اتے ہی"۔ بچارے نے سب اگل دیا کہ ہاں وہ ڈر کے مارے ان چار آدمیوں کے ساتھ ساتھ تھا جو کہ مادھو اور اس کی بیوی بچوں کو نکالنے گئے تھے۔ اور بسنتی کے چلانے پر اسی نے کہا تھا کہ وہ رمکلیا کو گودی لے لیگا۔ لیکن سب کے سب تو جلدی سے گھر میں سے نکل گئے اور وہ اکیلا جو رہ گیا تو ڈر کے مارے سیڑھیوں کے پاس سے ہی لوٹ آیا۔ باہر آیا تو وہ لوگ بھی نہ ملے۔ پانی اور بڑھ گیا تھا۔ آخر جب باغ میں پہونچا تو اکیلے چلنے کی ہمت نہ پڑی۔ درخت پر چڑھ گیا۔ یہ سنکر سب نے کہا "ڈبوئے دو ایسے پاپی کو۔ کیا کرنا لیجا کر ایسے دشٹ کو"

لیکن ڈبویا نہیں بلکہ ریل کی پٹڑی پر اتار ہی دیا۔

وہاں سیوا سمتی کے بھولے بھالے سچے خدمت گار، کانگریس کے

ذرا بڑے اور ذرا مغرور، تھوڑا کام اور بہت باتیں کرنے والے لیڈر۔ لال صافے والے پولس کے اینٹھتے اکڑتے سپاہی موجود تھے۔ مدد ان کی سب ہی اپنی اپنی طرح کر رہے تھے۔ تیل، گھی، لکڑی، آٹا، دال سیوا سمتی والے لاتے تھے۔ امن، انتظام اور احکامات پولیس والوں کی طرف سے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چھولداریاں اور مرہم پٹی کا سامان کانگرس والوں کی طرف سے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہنسی خوشی کھانے پکنے لگے۔ کڑھائیاں چڑھ گئیں۔ پوریاں تلی جانے لگیں۔ دو چار، جنکے اندھیرے میں پانی میں گرتے پڑتے چلنے سے چوٹیں آئی تھیں، ان کی مرہم پٹی ہوئی۔ لیکن بسنتی کے زخمی دل کی مرہم پٹی کون کرتا۔ مادھو اور ناتھا خود ہی پریشان تھے۔ ایک ہمدرد گوری تھی جو رات بھر اس کے ساتھ روئی تھی۔ اب وہ بھی نہ تھی۔ کا جانے بھور بھئے سِکتے چال گئی۔

جب تک اندھیرا رہا ہڑپ، گڑلپ گڑاپ۔ کرتے پانی نے رمکلیا کو خوب ہی ڈرایا۔ اور روتے روتے بے دم گز بھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے اپنی بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا دیا۔ ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے تو نہ مکان ہیں، نہ گاؤں ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ ایک کونے پر خود بیٹھی ہے، دوسرے کونے پر ایک کالا سانپ کنڈلی مارے بل کھایا بیٹھا دہری زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ جس میں سے اکا دکا پیڑ کہیں کہیں جھانک رہے ہیں۔ پیچھے آم کا باغ آدھا ڈوبا آدھا نکلا طرح طرح کی لہریں اپنے درختوں میں سے نکال رہا ہے۔

ہراس اور خوف سے رمکلیا چلائی اور پھر چلائی۔ ڈری، سہمی اور چاروں طرف اس نے گھبرا کر دیکھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایک وہ تھی دوسرا کالا ناگ تھا۔ اور پانی ہی پانی تھا جس میں پھر کی ایسی گھومتے کٹورے بنتے تھے اور ہڑپ گڑپ کر کے غائب ہو جاتے تھے۔

رمکلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موندھ لی تھیں۔ اور "اری متیا ری۔ او میری متیا" کہہ کر بلک رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی۔ "تو کاں آں ھ"

رمکلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے مردہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آئی۔

"تو کاں آں ھ" آواز پھر آئی۔

رمکلیا نے "ہرے رام گوری بولے" کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ گائے دکھائی تو دی نہیں لیکن رمکلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا۔ "گوری ہو گوری"

جواب آیا "تو کاں آں ھ"

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رمکلیا نے پھر پکارا۔ وہ اس کی طرف بولتی ہوئی بڑھی۔ لیکن دور سے ایک اور آواز آئی "آو ماں آں ھ" باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اس آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رمکلیا کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی پھر بھی اپنی سکت بھر چلائی "گوری ہو گوری"

گوری ہو گوری۔
ارے گوری رے آئے جا۔
ہائے رے متیا ناہیں آوت
گوری ہو گوری
گوری متیا آئے جا ری

لیکن گوری نے رخ نہ بدلا البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رمکلیا کی طرف دیکھا۔ اڑا کر بولی اور پھر ادھر ہی تیرتی چلی گئی جدھر سے بچھڑے کی آواز آ رہی تھی۔

باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آگیا۔ جہاں سر شام وہ، اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی لیکن اب سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ماں بچے کی آواز کا جواب دیتی ہوئی تیرتی تیرتی اس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی۔ اسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی۔ مگر بچہ نہ چلا۔ وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ پھر چاروں طرف گھومی۔ برابر آکر اپنی کمر اور پیٹ سے اسے دھکیلا۔ ایک طرف چلی۔ بچہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ کچھ سمجھ گئی۔ بچہ چھ فٹ نیچے زمین میں گڑے ہوئے کھونٹے میں رسی سے بندھا ہوا تھا اور رسی بس اسی قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جاتے تو رسی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر چلاتے بچے کو وہیں چھوڑا اور پھر رمکلیا کی طرف رخ کیا۔

رمکلیا رونے چلانے کی تھکن۔ ڈر خوف اور آخر میں انتہائی ناامیدی کا اب تک برابر مقابلہ کرتی رہی تھی۔ لیکن آخر آٹھ برس کی ننھی سی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے آکر کئی آوازیں دیں اور

جب بھی رمکلیا کو ہوش نہ آیا تو پھر لمبی، کھردری گرم گرم زبان سے اُس کا مُنہ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آگیا۔ پہلے تو ڈری پھر گوری کو دیکھا۔ "گوری متیا گوری متیا" کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دو پیر مارے آگے بڑھی۔ رمکلیا چھت سے گھسٹ پانی میں آگئی۔ اُس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور جھپٹ چپٹا کر گوری کی پیٹھ پر آگئی۔ اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چمٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس گئی۔ وہی حرکتیں پھر کیں کئی دفعہ اُس کے گرد چکر کھائے اور چلی۔ اور جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو پھر لوٹ آئی۔ اب رمکلیا کی بھی سمجھ میں آگیا تھا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی رمکلیا نے اوندھے لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسّی کی گانٹھ نکال دی، بچھڑا آزاد ہوگیا۔ گائے اور بچہ دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رمکلیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹڑی کی طرف سے دھار چل رہی تھی اس لئے یہ دونوں بہاؤ کی ہی طرف تیرتے چلدئے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد بہت چکر کھا کر پھر اسی ریل کی پٹڑی پر چڑھ آئے۔ لیکن جہاں

گاؤں والے تھے اُن سے تین میل دُور یہ تینوں نکلے تھے۔ یہ سب بہت سویرے ہی چل دئے تھے، اور جب گاؤں کے بہادر تیراک تیرتے ہوئے باغ میں آئے تو وہاں نہ بچھڑا تھا نہ رمکلیا تھی۔ بلکہ مادھو کے مکان کا بچا کھچا حصّہ بھی بہہ چکا تھا۔ دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، پیٹھ پر رمکلیا۔ پیچھے بچھڑا "آؤ ماں آں ھ" "ہاں، آں اں ھ" کے سوال جواب کرتے گاؤں والوں میں پہونچے تو ہلچل مچ گئی۔ لوگ مارے خوشی کے کودتے تھے۔ بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوتی کبھی رمکلیا کو گلے لگاتی تھی کبھی بچھڑے کو۔ اور کبھی گوری کے چمٹتی تھی اور گائے کہتی تھی "تم۔ ماں آں ھ۔ ہم۔ ماں آں ھ"

آواز آئی "بول گوری متیا کی جے"

پچاس آوازوں نے جے پکاری۔

پھر آواز آئی "بول گئو ماتا کی جے"

* * *

سید رفیق حسین

اسیری و آزادی

صبح آنکھ کھلنے پر میں اپنی کوٹھڑی کی کشادہ کھڑکی کے پاس جاکر کھڑا ہوجاتا ہوں،

کھڑکی میں سیاہ آہنی سلاخیں ٹھکی ہوئی ہیں۔

میں اپنا سر باہر نہیں نکال سکتا۔

ہوا کے سرد اور فرحت بخش جھونکے گاتے ہوئے آتے ہیں اور میری کھڑکی کے پاس سے گذر جاتے ہیں۔

میں ان سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔

موسم بہار کی آمد ہے۔ سامنے سڑک کے اُس پار سبزہ لہلہا رہا ہے، ہرے بھرے درخت مست ہو ہو کر جھوم رہے ہیں اور زندہ دل طیور نغمہ پر نغمہ الاپ رہے ہیں۔

لہلہاتا ہوا سبزہ اور جھومتے ہوئے درخت مسرت سے بیخود ہیں، اور زندہ دل طیور کے نغمے آزادی کے گیت ہیں۔

مگر مجھے مسرت اور آزادی سے کیا واسطہ؟

میں مسرت اور آزادی کا خیال ہی دل میں کیوں لاؤں؟

میری زندگی تو ایک سیاہ آہنی سلاخوں والی کوٹھڑی سے وابستہ ہے۔

میں اس سے باہر قدم نہیں نکال سکتا، نہ معلوم کس وقت میری ضرورت پڑ جائے!

آزادی کا زمانہ گذر گیا۔ اسیری کے دور کا آغاز ہے۔

مگر آزادی کی ایک دھندلی سی تصویر دل میں اب بھی سمائی ہوئی ہے۔

* * *

کل منہ اندھیرے سامنے والے مکان کی بنگالی دوشیزہ نے ایک راگ چھیڑا۔

آواز کیسی دھیمی تھی، کیسی شیریں اور صاف!

ہوا کی لہروں سے ہم آغوش ہوکر باہر آگئی۔

فضا میں ایک تڑپ پیدا ہوگئی۔

ایک انسانی دل ہجوم جذبات سے بیتاب ہوکر پھڑک اٹھا۔

آزادی کی دھندلی تصویر کچھ روشن ہوگئی۔

یہ راگ آزادی کی مسرت کا راگ تھا۔

بیکس انسان کی طرح گھر کی چار دیواری میں بند نہ رہ سکا۔

آزادی کا پیام سنانے کے لئے تڑپتا ہوا باہر نکل آیا۔

آجکل

محوِ کرم وہ خسروِ خوباں ہے آج کل
ہر نقشِ زیست نقشِ سلیماں ہے آج کل

ہر گل میں نورِ جلوۂ جاناں ہے آج کل
ہر نَے میں نغمۂ سازِ نیستاں ہے آج کل

ہر لب پہ اک تبسمِ پنہاں ہے آج کل
ہر منظرِ حیات، گلستاں ہے آج کل

پھر مائلِ کرم شہِ خوباں ہے آج کل
ہر مشکل و محال پھر آساں ہے آج کل

پھر اُن کے لب پہ خندۂ پنہاں ہے آج کل
پھر محوِ رقص، عالمِ امکاں ہے آج کل

دُنیا کا ذرہ ذرہ جمالِ نگار سے
بازارِ مصر و یوسفِ کنعاں ہے آج کل

ہر منظرِ حیات میں اک تازہ رُوح ہے
خود محفلِ جمود بھی رقصاں ہے آج کل

ہر لغزشِ نظر سے اُچھلتا ہے خونِ دل
یعنی ہر ایک داغ گلستاں ہے آج کل

ہر گل کسی کے عشق و محبت کے جوش میں
مجنوں کی طرح چاک بداماں ہے آج کل

فیضِ خرامِ ساقیِ تقویٰ گداز سے
سروِ خموش، سروِ خراماں ہے آج کل

جھونکوں میں اُڑ رہا ہے لباسِ سبک خرام
زلفوں کی طرح کوئی پریشاں ہے آج کل

اُڑتا ہوا سا ہے مری محرومیوں کا رنگ
سہمی ہوئی سی گردشِ دوراں ہے آج کل

مقدور میں حیات و سکونِ حیات ہے
امکاں میں، دورِ عالمِ امکاں ہے آج کل

چاہا جدھر سے پھیر دیا رُخ حیات کا
قابو میں اپنے گردشِ دوراں ہے آج کل

فہمائشِ ندیم کی پرواہ ہے کسے
خود مہرباں وہ خسروِ خوباں ہے آج کل

عقل و خرد کو اذنِ وداعِ حواس ہے
کفرِ شباب، رہزنِ ایماں ہے آج کل

اب کس کو ہے شکایتِ تیرِ نگاہِ ناز
زخمِ جگر پہ سایۂ مژگاں ہے آج کل

پھر سادگی پہ یورشِ کفر و شباب ہے
پھر وہ نگاہ، فتنۂ دوراں ہے آج کل

پھر برگِ بوستاں پہ برنگِ لبِ حبیب
شیرینیِ تبسمِ پنہاں ہے آج کل

آنکھوں کو پھر ہے دعوتِ نظارۂ جمال
ہر گل حدیثِ حسن کا قرآں ہے آج کل

پھر ہے دلِ غریب پر اُن کی نگاہِ لطف
پھر ربطِ حسن و عشق نمایاں ہے آج کل

پھر ہے نگاہِ ناز میں ایمائے دست و بُرد
پھر مرگ و زیست، دست و گریباں ہے آج کل

عشووں میں اک پیامِ محبت لئے ہوئے
پھر وہ نگاہ، سلسلہ جنباں ہے آج کل

فرحت کے جذبِ شوق کو حاصل ہے لطفِ زیست
پھر وہ نگاہِ ناز پشیماں ہے آج کل

فرحت کانپوری

آؤ جھوٹ بولیں

لاجونتی:۔ (ایکا ایکی، بڑے اشتیاق سے) آؤ جھوٹ بولیں۔

کشور:۔ ارے ۔۔۔ تمہیں بیٹھے بیٹھے یہ کیا سوجھی؟

لاجونتی:۔ نہیں، نہیں ۔۔۔ آؤ جھوٹ بولیں۔

کشور:۔ پھر وہی ۔۔۔ جھوٹ بولیں؟ ۔۔۔ کس سے جھوٹ بولیں؟ ۔۔۔ اور پھر.... تم نے مجھے....

لاجونتی:۔ (بات کاٹ کر) کوئی جھوٹا سمجھا ہے، یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟

کشور:۔ ہاں، ہاں اور کیا؟

لاجونتی:۔ تو اپنے الفاظ فوراً واپس لے لو۔

کشور:۔ وہ کیوں؟ ۔۔۔ میں نے جھوٹ تھوڑی بولا ہے۔

لاجونتی:۔ بات کو بڑھاؤ نہیں، میں اس وقت لڑنے کے mood میں نہیں ہوں ۔۔۔ جو کہہ رہی ہوں سیدھے من سے مان لو۔ آؤ جھوٹ بولیں!

کشور:۔ پر سوال ہے کہ ہم جھوٹ کیوں بولیں ۔۔۔ میرا دماغ پھرا ہے جو بیٹھے بیٹھے جھوٹ بولنا شروع کر دوں۔

لاجونتی:۔ ایسا کرو کھڑے ہو جاؤ ۔۔۔ میں بھول ہی گئی تھی تم زیادہ تر کوٹ پہن کر کلب جاتے وقت ہی جھوٹ بولا کرتے ہو۔

کشور:۔ لاجونتی ۔۔۔ تمہیں آج کیا ہو گیا ہے؟

لاجونتی:۔ میں چاہتی ہوں ہم تم دونوں جھوٹ بولیں... آؤ کبھی کبھار میری بات بھی مان لیا کرو۔

کشور:۔ تم اکیلی بولو، مجھے کیوں ساتھ ملاتی ہو۔

لاجونتی:۔ میں بالکل اناڑی ہوں اور تم اس فن میں خوب طاق ہو۔ میں تمہاری شاگرد بننا چاہتی ہوں۔

کشور:۔ (بڑی سنجیدگی کے ساتھ) لاجونتی ۔۔۔ میں تم سے ایک بات کہوں ۔۔۔؟

لاجونتی:۔ (چونک کر) کہو؟

کشور:۔ (ناامید ہو کر) کیا کہوں، کیسے کہوں؟

لاجونتی:۔ یہ تم میں بڑی بُری عادت ہے۔ بات کرتے کرتے بیچ میں رُک کیوں جایا کرتے ہو؟

کشور:۔ تو کہوں؟

لاجونتی:۔ ہاں، ہاں کہو۔

کشور:۔ (تھوڑے وقفے کے بعد) نہیں نہیں، میں نہیں کہتا۔

لاجونتی:۔ دُور دفع... کیسی بُری عادت ہے؟....

کشور:۔ تم سمجھو گی میں جھوٹ بول رہا ہوں!

لاجونتی:۔ تم مُنہ سے تو پھوٹو ۔۔۔ میں تمہارے جھوٹ کو بھی سچ سمجھوں گی۔ لو اَب کہہ ڈالو۔

کشور:۔ مجھے تم سے بہت پریم ہے.....!

لاجونتی:۔ اب لگے چونچلے بگھارنے.... چلو بہت کیا تو مان بھی لیا.... پر وہ چڑیل، وہ مُوئی حرافہ جس کا فوٹو تم اپنی پاکٹ بک میں چھپا کے پھرتے ہو؟.....

کشور:۔ (سٹ پٹاتا ہے) چڑیل ۔۔۔ حرافہ۔ پاکٹ بک..... کون سی پاکٹ بک؟

لاجونتی:۔ وہی جو اس وقت سرکار کے کوٹ کی اندر والی جیب میں پڑی ہے اور جس کی طرف ابھی ابھی آپ کا داہنا ہاتھ بے اختیار اُٹھ گیا تھا۔

کشور:۔ (کھسیانا ہو کر) پاکٹ بک.... ہاں، پاکٹ بک.... میں سمجھا۔ پاکٹ بک کی بات کر رہی ہو!

لاجونتی:۔ میں پاکٹ بک ہی کی بات کر رہی تھی، پر میں پھر اس کا ذکر چھیڑنا نہیں چاہتی۔

کشور:۔ لیکن... لیکن... مجھے تمہارے دل سے شُبہ بھی تو دُور کرنا ہے.... پاکٹ بک میں جو فوٹو ہے نا.... وہ ایک....

لاجونتی:۔ ایکٹرس کا ہے!

کشور:۔ (تھوک نگل کر) ایکٹرس کا ہے....

لاجونتی:۔ جس سے تمہارا کل ہی انٹروڈکشن ہوا ہے، جس کے گھر میں کل تم دفتر سے اُٹھ کر چار بجے ہی گئے تھے.... نرائن صاحب بھی تو آپکے ساتھ تھے۔

نرائن:۔ بڑی عمر ہے میری، بڑی عمر ہے میری، اُدھر آپ نے میرا نام لیا اور اِدھر میں کمرے میں داخل ہوا.... میں ان کے ساتھ تھا بھابی جان، پر قصہ یہ ہے.... قصہ یہ ہے کہ مس....

لاجونتی:۔ اُرملا دیوی۔

کشور:۔ (حیرت زدہ ہو کر بے اختیارانہ) ارے؟

نرائن:۔ شکریہ! ـــ تو قصہ یہ ہے کہ مس اُرملا دیوی کے یہاں میرا جانا ایسا ہی تھا۔

لاجونتی:۔ جیسا ایک ایکٹرس کے شیدائی کا ہو سکتا ہے۔

نرائن:۔ (بادلِ نخواستہ) یقیناً یقیناً... آپ فوراً ہی سمجھ گئیں، دراصل سمجھانے کا بھی سلیقہ ہونا چاہیئے.... کشور تم سمجھوگے میں اپنی تعریف کر رہا ہوں، پر یہ واقعہ ہے کہ تمہیں بات کرنے کا بالکل.... بالکل ڈھنگ نہیں آتا، (کھسیانی ہنسی ہنستا ہے) میں نے چند لفظوں ہی میں سارا جھگڑا چکا دیا (ہنستا ہے) چند لفظوں ہی میں... اور چٹکی بجاتے میں.... (ہنستا ہے)

پانچ چھ سکنڈ تک مکمل خاموشی طاری رہتی ہے۔

نرائن:۔ (خاموشی کا ایکا ایکی احساس کرتے ہوئے).... تو یہ قصہ ہے..... ارے بھئی کوئی بات تو کرو... چُپ کیوں ہو گئے ہو؟ ـــ ارے بھابی جان آپ بھی گُم سُم ہو بیٹھیں۔ معلوم ہوتا ہے مُنہ میں گھنگھنیاں بھری ہیں.... کوئی بات کیجئے!

لاجونتی:۔ (اچانک) آپ جھوٹ بولیں۔

نرائن:۔ (ہکا بکا ہو کر) جھوٹ... یعنی....

کشور:۔ یہ ڈیڑھ گھنٹے سے مجھے اس بات پر مجبور کر رہی ہیں اور پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی ہیں کہ میں جھوٹ بولوں.... اب تم سے بھی یہی کہتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انکا..... د

لاجونتی:۔ دماغ بہک گیا ہے.... کہدو، کہدو، کہتے کیوں نہیں ہو۔

کشور:۔ ارے بھئی تم تو ناحق بال کی کھال نکالتی ہو، خود ہی پھاڑتی ہو، خود ہی رفو کرتی ہو۔

نرائن:۔ ٹھہرو ٹھہرو، اب تم اپنا لکچر شروع نہ کرو، مجھے ان سے پوچھنے تو دو..... ہاں بھابی جان ارشاد!

لاجونتی:۔ میں نے آپ سے یہ کہا تھا کہ آپ جھوٹ بولیں۔

نرائن:۔ بندہ حاضر ہے۔ پر شرط یہ ہے کہ آپ بھی میرا ساتھ دیں۔

لاجونتی:۔ شروع کیجئے، میں ساتھ دونگی، لڑ میں لڑ ملاتی جاؤنگی۔

نرائن:۔ لیجئے.... اس وقت چار بجے ہیں۔

لاجونتی:۔ یہ تو آپ سچ بول رہے ہیں۔

نرائن:۔ جی ہاں، اب اسکے آگے جھوٹ ہی جھوٹ ہوگا۔

لاجونتی:۔ فرمائیے!

نرائن:۔ اس وقت چار بجے ہیں، میرے اور کشور کے درمیان ابھی یہ باتیں شروع ہونگی۔ میں اس سے کہونگا کہ چلو بھئی چلیں، ہاکی کے میچ دیکھنے کا وقت ہو گیا ہے، اُٹھو اُٹھو جلدی کرو۔ اور وہ آپ کے مُنہ کی طرف دیکھیگا گویا اجازت مانگ رہا ہے۔ اس پر آپ کیا کہیں گی۔

لاجونتی:۔ آپ شوق سے لے جا سکتے ہیں، مجھ سے پوچھ کے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ مَردوں کو کھیل کُود میں ضرور حصّہ لینا چاہیئے۔ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔

کشور:۔ کاش یہ میٹھے میٹھے بول سچے ہوتے!!

نرائن:۔ بھئی تم بیچ میں نہ بولو۔ مجھے اور ان کو جھوٹ بولنے دو۔

کشور:۔ مجھے بھی اس میں شامل کر لو، اس طرح وہ نرمی جو آج تک مجھے نصیب نہیں ہوئی شاید مل جائے۔ گو وہ جھوٹ موٹ ہی کی ہوگی پر نہ ہونے سے تو بہتر ہے۔

لاجونتی:۔ آپ کو کس نے روکا ہے ـــ بولئے، پر یہ تو جھوٹ موٹ کا جھوٹ ہے اور آپ ٹھہرے سچا جھوٹ بولنے والے، کیا مشکل محسوس نہ ہوگی؟

نرائن:۔ اب یہ سچی باتیں بعد میں شروع کیجئے گا، اس وقت ہم سب کے سب جھوٹے ہیں۔

لاجونتی:۔ آپ پھر سے شروع کیجئے۔

نرائن:۔ میرے اور کشور کے درمیان یہ باتیں شروع ہونگی۔ میں اس سے کہونگا "چلو بھئی ہاکی کا میچ دیکھنے چلیں۔ اُٹھو اُٹھو جلدی کرو، وقت ہو گیا ہے" اور وہ آپ کی طرف دیکھیگا۔ اس پر آپ کیا کہیں گی؟

کشور:۔ ٹھہرو ٹھہرو لاجونتی، میں بولتا ہوں... مجھے ایک ایک لفظ یاد ہے۔ "آپ شوق سے جا سکتے ہیں، مجھ سے پوچھ کے جانے کی کیا ضرورت تھی، مَردوں کو کھیل کُود میں ضرور حصّہ لینا چاہیئے۔ اس سے صحت اچھی رہتی ہے" ـــ کیوں ٹھیک ہے نا؟

لاجونتی:۔ بالکل!

نرائن:۔ تو پھر ہم دونوں میچ دیکھنے چلے گئے اور شام کو سات بجے جب واپس آئے تو آپنے....

لاجونتی:۔ چار تیار کی، آپ دونوں کو پلائی ـــ چونکہ یہ تھکے ہوئے تھے، اس لئے میں نے ان کا بدن دبایا، بوٹ اتارے، جرابیں اتاریں، انکے پیروں کی انگلیاں چٹخائیں اور.....

کشور:۔ بس اتنا ہی کافی ہے ـــ زیادہ شکر نہ ڈالو لاجونتی، سب مزا کرکرا ہو جائے گا..... (ٹھنڈی سانس بھر کر) نرائن، کیا وہ دن بھی آئیگا جب میرے لئے یہ سچ مچ ایسا سورگ بن جائیگی؟

نرائن:۔ مجھے اس وقت جھوٹ بولنا ہے، سمجھے۔ ایسی قابلِ رحم صورت نہ بناؤ تم پر ترس کھا کر اگر میرے مُنہ سے کوئی سچی بات نکل گئی تو میرا ذمہ

نہیں — سمجھے؟

کشور:- سمجھتا ہوں، سب سمجھتا ہوں، لیکن جسے تم سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو، بہت چالاک ہے، جو بات تمہارے دل میں ہے، اس کے ناخنوں میں ہے۔

لاجونتی:- اگر سچ بولنا ہو تو آپ خاموش بیٹھے رہیں، اپنی للو روکے رہیں۔

نرائن:- بالکل ٹھیک — تو آپنے ایک پتی ورتا استری کی طرح ان کی خدمت کی اور انہوں نے ایک اچھے پتی کی طرح آپ کا شکریہ ادا کیا اور جب اچھی طرح تھکاوٹ دُور ہو گئی تو آپ سے کہنے لگے "عجب مصیبت ہے، ان افسروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ گراؤنڈ میں بڑے صاحب مل گئے کہنے لگے، آج چند ضروری کاغذات تیار کرنا ہیں، اس لئے ٹھیک آٹھ بجے میری کوٹھی پر پہونچ جانا — اب تم ہی بتاؤ سٹینو ٹائپسٹ کی زندگی کیا غلاموں سے بدتر نہیں — جی چاہتا تھا کہ آج دو گھڑی تمہارے پاس بیٹھوں، تم سے وہ غزل سُنوں ... دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے ..... مگر ... !!"

لاجونتی:- میں نے ان کو جب اس طرح کُڑھتے دیکھا تو کہا "افسروں کو ناراض نہیں کرنا چاہیئے منا کے ابا — آپ جائیے، میرے لئے آپ اتنی چنتا نہ کیا کریں — میں جانتی ہوں کہ آپ کو بہت کام کرنا پڑتا ہے پر آپ ہو کیا سکتا ہے۔ اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے۔ پرماتما آپ کو شکتی دے۔"

کشور:- کیا سُہانا سپنا ہے — میں اس ہمدردی کے قربان۔ اس شوہر نوازی کے صدقے۔

نرائن:- جی — تو آپنے ان سے یہ کہا "آپ جائیے، پرماتما آپ کو شکتی دے" — پرماتما اس کو شکتی دے .... ہاں، تو یہ کوٹ دوٹ پہن کر باہر نکلے، میں ان کے پیچھے چلدیا۔ میرا یہاں بیٹھے رہنا بالکل فضول تھا، کیوں بھابی؟

لاجونتی:- جی ہاں، آپکو بھی تو کسی کام سے جانا تھا؟

نرائن:- میں بھول ہی گیا تھا، اچھا ہوا جو آپنے یاد دلا دیا۔

(گھڑی پانچ بجاتی ہے۔)

نرائن:- میرا خیال ہے کہ اب سچ بولنا چاہیئے — جھوٹ ہم کافی بول چکے — کیا خیال ہے بھابی؟

لاجونتی:- میرا شوق تو پورا ہو گیا۔ اگر آپ کا بھی جی بھر گیا ہو تو سچ بولنا شروع کر دیجئے — پر یہ دھیان رہے کہ اس میں جھوٹ کی تھوڑی سی بھی ملاوٹ نہ ہو۔

نرائن:- ارے، توبہ کیجئے صاحب — یہ تو مذاق میں اور آپ کو خوش کرنے کے لئے میں نے جھوٹ کے پُل باندھے تھے ورنہ مجھے تو اس سے سخت نفرت ہے۔

لاجونتی:- (طنزیہ انداز میں) جی!

نرائن:- آپ یقین نہیں کرتیں، پر آپ کو یاد ہے، پچھلے ہفتے جب آپکے "انہوں" نے کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے رات کو تھیٹر جانے کی تیاریاں شروع کی تھیں تو میں نے آپسے صاف صاف بات کہہ دی تھی .... اور ابھی ابھی آپنے جب مجھ سے پوچھا کہ تم اُرملا دیوی فلم ایکٹریس کے یہاں چار پینے گئے تھے تو میں نے فوراً اقرار کر لیا — دراصل ... دراصل ... سچ بولنے سے میں کبھی نہیں گھبرایا ... اور دیکھئے اگر آپ کے "یہ" ابھی ابھی آپسے کہیں کہ انہیں چھ بجے اپنے بڑے صاحب کی کوٹھی پر کاغذات ٹائپ کرنے جانا ہے، تو میں آپ سے فوراً کہدوں گا کہ یہ غلط ہے — بڑے صاحب میرے دوست ہیں اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آج انکو چھ بجے نہیں بلکہ ساڑھے سات بجے بُلایا گیا ہے اور یہ ڈیڑھ گھنٹہ اِدھر اُدھر سیر سپاٹے میں گزارنا چاہتے ہیں۔

لاجونتی:- میں نے کب کہا ہے کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ تو میں ذرا انہیں ستا رہی تھی۔ آپ میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

نرائن:- آپنے کہا تو سچ ہے — کشور خفا ہو جائے گا پر کوئی ہرج نہیں .... دیکھئے کل جو انہوں نے مجھے اُس چڑیل اُرملا دیوی کے ہاں جانے کو کہا تو میں نے صاف انکار کر دیا "میاں تمہیں اپنی بیوی کا ڈر نہ ہوگا پر مجھے ہے اور پھر میں ایسی واہیات عورتوں کے تو پاس تک پھٹکنا نہیں چاہتا" مگر اس نے زور دیا اور مجھے جانا ہی پڑا، یعنی میں ذرا ٹھٹکا تھا کہ یہ مجھے گھسیٹ کر لے گیا۔

کشور:- تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سراسر جھوٹ۔ اس بات کا اوّل جھوٹ آخر جھوٹ۔

نرائن:- جی ہاں، جھوٹ بول رہا ہوں، مگر پرماتما کے لئے آپ سچ نہ بولئے گا .....!

کشور:- پر سوال یہ ہے کہ جھوٹ بولنے سے، پہلے میرا کونسا کام بن گیا ہے جو میں اب سچ بولنا چھوڑ دوں، یہ دیوی جو میرے پاس بیٹھی ہیں، میرے جیون پر تو مارشل لا بن کے رہ گئی ہیں — جھوٹ بولوں تو وہ بھی سنسر ہو جاتا ہے اور سچ بولوں تو اُس پر بھی دفعہ ایک سو چوالیس لگ جاتی ہے، آپ بولو، میں کروں تو کیا کروں — میرا تو یہ حال ہے کہ جیسے پنجرے میں پنچھی — بس پھڑپھڑا کے رہ جاتا ہوں .... اب اگر اس سے کہوں کہ اگر

اورجلدی سے چاء بنادو کیونکہ مجھے سات بجے بڑے صاحب نے کوٹھی پر بلایا ہے تو.. بس جیسے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ ڈنک پر ڈنک پڑنے لگیں۔ منہ سے اُف کرنے کی بھی تو اجازت نہیں!

نرائن۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ بڑے صاحب نے تمہیں ساڑھے سات بجے بلایا ہے۔ اسی جھوٹ پر تو سارا فساد ہے!

کشور۔ اب تم بھی اس کی طرفداری کرنے لگے۔ سات اور ساڑھے سات میں فرق ہی کیا ہے۔

نرائن۔ واہ بھئی واہ! آدھ گھنٹے کا تمہارے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں۔ پاؤ گھنٹے میں دُنیا اِدھر کی اُدھر ہوسکتی ہے اور تم آدھے گھنٹے کو یونہی بے کار سمجھ رہے ہو۔ سنا بھابی آپ نے۔ وقت میں بھی یہ فضولخرچی کرنے سے باز نہیں آتا۔

لاجونتی۔ میں آپکی باتیں بڑے غور سے سُن رہی ہوں۔

نرائن۔ آپ کی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ ورنہ بندہ کس لائق ہے!!

لاجونتی۔ نرائن صاحب! انہیں آج کیا سچ مچ کہیں جانا ہے؟ یعنی جانا ہے تو صاف صاف کہدیں، میں کیوں روکنے لگی۔

کشور۔ جانا ہے بابا جانا ہے، بڑے صاحب کی کوٹھی پر جانا ہے، کہیں عیش کرنے نہیں جانا ہے، سمجھیں؟

لاجونتی۔ میں مسٹر نرائن سے بات کررہی ہوں۔

نرائن۔ آپ مسٹر نرائن سے بات کررہی ہیں، تم خاموش رہو۔ ہاں تو بھابی جان آپ کے سوال کا جواب۔ یہ ہے کہ انہیں آج سچ مچ اپنے بڑے صاحب کی کوٹھی پر جانا ہے، سات بجے نہیں۔ ساڑھے سات بجے اور انہیں وہاں زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے کا کام ہے۔ یعنی ٹھیک گیارہ بجے انہیں یہاں پہونچ جانا چاہئے۔

کشور۔ اور اگر وہاں تین کے بجائے چار گھنٹے صرف ہوگئے تو؟

نرائن۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ تمہارا بڑا صاحب رات کو ٹھیک گیارہ بجے سو جایا کرتا ہے، اگر وہ گیارہ بجے نہ سوئے تو پھر اُسے رات بھر نیند نہیں آتی۔

لاجونتی۔ تو میں انہیں اجازت دیدوں؟

نرائن۔ میں آپکو مجبور نہیں کرتا، پر حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔... کہ آپکو اجازت دینا ہی پڑیگی۔

لاجونتی۔ تو چاء پینے کے بعد چلے جائیں۔

کشور۔ (خوش ہوکر) تم نے اجازت دیدی!

لاجونتی۔ کہتی تو ہوں جائیے..... اس میں میری اجازت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ کو کام پر جانا ہے، کہیں عیش کرنے تھوڑی جانا ہے..... تو چاء کے ساتھ انڈوں کا حلوہ بنادوں۔ تھوڑے سے بسکٹ بھی ہیں۔ جانے وہاں آپ کو کب کھانا ملے، اس لئے اچھا ہوگا کہ یہاں ہی سے کچھ کھاکے جائیے!

کشور۔ نہیں نہیں، اسکی کوئی ضرورت نہیں، میں خالی چاء پیونگا۔

لاجونتی۔ (نرائن سے) اور آپ؟

نرائن۔ (چونک کر) میں؟ میں سہ پہر کو کچھ نہیں کھایا کرتا۔

لاجونتی۔ تو خالی چاء رہے.... ہوں؟

کشور۔ چاء سے زیادہ ضروری میرا ڈنر سوٹ ہے، اُسکو پریس کرنا ہے۔

لاجونتی۔ ڈنر سوٹ؟

نرائن۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہاں کوٹھی پر دوسرے افسر بھی آئینگے اور انہیں بھی انکے ساتھ ڈنر کھانا ہوگا۔ ڈنر سوٹ میں جائیں گے تو اچھا رہیگا۔ ان لوگوں پر اچھا اثر پڑیگا۔

کشور۔ تم میرا مُنہ کیا دیکھ رہی ہو؟

لاجونتی۔ ڈنر سوٹ؟ آپ کا مطلب اُسی سوٹ سے ہے نا جو کالی سرج کا بنا ہوا ہے۔ دم کٹا سا؟

کشور۔ ہاں، ہاں، اُسی کو ڈنر سوٹ کہتے ہیں۔ اُسے نکال کر پریس کردو۔

لاجونتی۔ وہی سُوٹ جو آپ نے تین برس پہلے بنوایا تھا، وہی وہی جسکے استر میں ایک بار آپنے مجھ سے رفو کرایا تھا۔

کشور۔ ہاں، ہاں، وہی۔ وہی۔ کیوں؟

لاجونتی۔ جسکے ساتھ تم سفید رنگ کی بُو باندھا کرتے ہو۔

کشور۔ وہی، وہی۔ اُسے ٹرنک میں سے نکالو اور پریس کردو۔

لاجونتی۔ آپ نے مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہا۔ اب وقت کے وقت آپکو یاد آیا۔ وہی مثل ہوئی....

کشور۔ پہلے کیوں نہیں کہا۔ پہلے کیا نہیں کہا؟

لاجونتی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا وہ آپ کے کام کا ہے؟

کشور۔ کیوں.... کیوں، اُسے کیا ہوا؟ وہ کام کا نہیں تھا۔

لاجونتی۔ میں نے آج صبح ٹرنک کھولا تو آپکے سوٹ میں کیڑا لگ رہا تھا، سو میں نے اُٹھا کر درزی کو دے دیا کہ اُس میں سے مُنے کے دو کوٹ اور دو نیکر بنا دے۔

کشور۔ مُنے کے دو کوٹ اور دو نیکر بنا دے۔ میرے ڈنر سوٹ میں سے..... تم یہ کیا کہہ رہی ہو لاجونتی؟ میری اجازت کے بغیر تم میرا

سوٹ سُمنے کے دو کوٹ اور دو نیکر بنانے کے لئے درزی کو کیسے دے سکتی ہو۔

لاجونتی:۔ واہ، یہ بھی ایک ہی کہی، جناب جب ہر دوسرے تیسرے مہینے میری کسی نہ کسی ساڑھی سے اپنی دھوتی بنالیا کرتے ہیں تو کیا میں بھی اسی طرح چلایا کرتی ہوں ۔۔ اور جب آپ شیروانی کے نیچے اکثر میرا کُرتہ پہن لیتے ہیں، تو میں تو کچھ نہیں بولتی۔ چُپ رہتی ہوں۔

کشور:۔ تمہاری ساڑھی اور کُرتہ گئے بھاڑ میں.... ان سے میرے سُوٹ کا مقابلہ کرتی ہو ـــــ لاجونتی، تمہاری یہ حرکت ناقابلِ برداشت ہے، میں نے اس سوٹ پر پُورے ڈیڑھ سو روپے خرچ کئے تھے۔

لاجونتی:۔ اور جس ساڑھی سے میں نے آپکے کمرے کی کھڑکیوں کے پردے بنا دئے تھے، وہ بھی ڈیڑھ سو روپے کی تیاری کی تھی ـــــ اُس کی زردوزی اگر نوچ کر بیچی جاتی جب بھی تیس چالیس روپے کہیں نہیں گئے تھے۔

کشور:۔ وہ ساڑھی دو برس کی پُرانی تھی۔

لاجونتی:۔ اور آپکا سُوٹ، تین اور تین اور تین تو برس کا پُرانا۔

کشور:۔ میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتا، سمجھیں، تم بہت ہٹ دھرم ہوگئی ہو ـــ تم کو ڈھیل دیکر میں نے سخت غلطی کی۔ جھک مارا ـــ آج تم نے میرے ڈنر سوٹ سے مُنے کے لئے دو کوٹ اور دو نیکر بنوانے کا آرڈر دیا ہے، کل تم میری موٹر سے اُس کے لئے جھولا بنوانے کا حکم دے دوگی، پرسوں یہ گھر کسی کے حوالے کر دوگی۔ اترسوں مجھے نیلام پر چڑھا دوگی۔ میں خُوب مُفت کا تمہارے ہاتھ لگ گیا ہوں۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے، تم جھوٹ بول رہی ہو، میرا سُوٹ ویسے کا ویسا موجود ہے۔ جلدی سے نکال کر پریس کر دو۔ مجھے وہاں سات بجے پہونچ جانا چاہیئے۔

نرائن:۔ سات نہیں ـــ ساڑھے سات!

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوتی ہے)

کشور:۔ لو، یہ فون بھی آگیا....!

لاجونتی:۔ یہ آپ کا فون نہیں، میری کسی سہیلی کا ہے (ٹیلیفون کا چونگا اُٹھانے کی آواز) ہلو ـــ ہلو.... ہاں، ہاں.... ۴۵۸۹۶.... جی.... جی.... میں خیریت سے ہوں.... مگر انکا مزاج آج کچھ بگاڑ پر ہے چڑچڑے ہو رہے ہیں.... جی ہاں....

کشور:۔ کون ہے؟

لاجونتی:۔ میں نے غلطی سے اُن کا ڈنر سوٹ بیکار سمجھکر آج درزی کو دے دیا کہ وہ اس سے مُنے کے دو کوٹ اور دو نیکر بنادے اس لئے وہ آج شام کو باہر نہیں نکل سکتے... کیا کہا... نہیں نہیں، اگر فرمایئے تو اُنکے بدلے میں حاضر ہو جاؤں... بس... تو ادھر سے بھی تسلیم۔

(کھٹ سے چونگا رکھنے کی آواز)

نرائن:۔ (ایکا ایکی) ارے، سوا پانچ ہوگئے۔ مجھے تو ایک ضروری کام سے جانا تھا... بھئی میں چلا... اچھا بھابی... پھر کبھی حاضر ہونگا... میں چلا...

لاجونتی:۔ اجی ٹھیریئے تو... ٹھیریئے تو...

کشور:۔ جانے دو اُسے، تم بتاؤ یہ فون پر کون تھا؟... آخر مجھ سے کہتی کیوں نہیں، چُھپاتی کیوں ہو، کہو بھی کون تھا۔

لاجونتی:۔ آپ کو کیا... کوئی بھی ہو... جایئے میں نہیں بتاتی... اور کہیئے تو بتا دوں پر آپ.....

کشور:۔ بگڑنا تو نہ جایئے گا؟ تو اگر میں بگڑ ہی گیا تو آپ کا کیا بنا لونگا.... اچھا کہو بھی کون تھا؟

لاجونتی:۔ لو کہے دیتی ہوں.... پر دیکھئے، ہتّے سے اکھڑ نہ جایئے گا، دھن دیجئے۔

کشور:۔ اب کہو بھی کون تھا؟

لاجونتی:۔ میری سہیلی، اُرملا دیوی... ناراض ہوگئی ہی مجھ سے، ڈنر سوٹ کے بجائے اسمیں ہی کپڑے پڑتے، پر آپ بڑے صاحب کی کوٹھی تو چلے جاتے... یُوں چور کیسے پکڑا... یہ اُرملا دیوی...

کشور:۔ جائے بھاڑ میں اور میں جاؤں چولھے میں۔

نوکر:۔ سرکار میں لے آیا ہوں۔

کشور:۔ (چونک کر) کیا لاتے ہو تم؟

نوکر:۔ میم صاحب نے آپ کا ڈنر سوٹ استری کرانے کے لئے دیا تھا وہ لانڈری سے لایا ہوں۔

کشور:۔ جاؤ، دین محمد ٹیلر ماسٹر کو دے آؤ کہ وہ اس میں سے مُنے کے دو کوٹ اور دو نیکر بنا دے۔

(یہ ڈرامہ بمبے اور لاہور سے نشر ہو چکا ہے)

سعادت حسن منٹو

دو دوست

اِدھر امین نے اسکول میں قدم دھرا اُدھر راحت سے دو دو چونچیں ہوگئیں۔

"بے تو نے میرے جوتے پہ پاؤں کیوں رکھدیا؟ اندھا ہے؟"

"اندھا تیرا باپ" امین نے جوتا اتارتے ہوئے کہا۔

"بے اندھے کے بچے"

"چُپ رہ نہیں چٹنی کر ڈالوں گا"

"بڑا آیا گاماں پہلوان وہاں سے ..."

"پہلوان کا بچہ"

تڑاخ سے مٹی کی دوات امین کے کلّے پر آن گری، بلبلا اُٹھا۔ تختی اُٹھا کر جمائی جو راحت کے سر پر تو راحت چت جا پڑا اور لگا پاؤں کی چرخی چلانے، سب لڑکے اکٹھے ہوگئے "ارے پانی لانا ذرا سا، اے تیری جیب میں لڈو ہونگے موہن، دیجو ذرا سا، بے ہوش ہو رہا ہے۔ راحت، اے راحت دوست، لے بھئی سب کھڑے ٹکٹکی لگائے گھور رہے ہیں۔ لو لو۔ لنجو کوئی پانی کا ایک چلو تو لے آتے" ــــ اور خبر ہے یہ الفاظ کس منہ سے نکلے؟ ــــ امین کے منہ سے!

اور یہ تو معمولی جھڑپ تھی۔ ایک بار امین نے راحت کے پیٹ میں ایک انچ چاقو گھسیڑ دیا۔ اور جب اُسے اٹھا کر ہسپتال لے گئے تو اتنا رویا کہ آنکھیں سُوج گئیں اور گال پھول کر ڈبل روٹی بن گئے!

امین ذرا جلد باز تھا اور راحت قدرے بُردبار، لیکن لڑ کر من جانے کے معاملے میں دونوں ایک تھے۔ اپنی سات آٹھ سال کی مختصر عمر میں اُنہیں کوئی ایسا واقعہ یاد نہ تھا جب وہ پندرہ منٹ سے زیادہ ایک دوسرے سے رنجیدہ رہے ہوں، لڑتے تو جیسے چبا ڈالیں گے ایک دوسرے کو، الگ ہوتے تو جیسے دونوں پچھتا رہے ہیں۔ اور جیسے ایک منتظر ہے کہ دوسرا کب لپک کر پیار سے اس کی چھاتی سے چمٹ جائے!

جماعت میں لڑ رہے ہیں کھیل کے میدان میں ایک دوسرے کا منہ چڑا رہے ہیں۔ چھٹی پر ایک دوسرے پہ پھبتیاں اُڑائی جا رہی ہیں۔ ایک حد سے بڑھا دوسرے نے ڈھیلا کھینچ مارا۔ اِدھر سے گالی، اُدھر گالی کا جواب۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے، تڑ تڑ اور پھٹ پھٹ سے کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی۔ بچے سہمے ہوئے دُور کھڑے آنکھیں جھپکاتے رہتے اور جب یہ دونوں لہو لُہان ہو جاتے تو تیز تیز سانس لیتے، بستے سر پر رکھتے الگ الگ کھڑے ہو جاتے اور باتوں پر آجاتے۔

"مزا چکھ لیا نا؟" امین کہتا۔

"کیوں گُدّی میں جو گھُونسا پڑا تھا، اُس کی سُناؤ؟ کیا کہا تھا اُس نے؟"

"میں نے سمجھا کوئی پتنگا آن بیٹھا ہے گردن پر"

بچے تالیاں بجانے لگتے، راحت جھینپ جاتا پر ہمت نہ ہارتا۔ کہتا "اور تم نے جو میری چھاتی پر اپنی طرف سے مُکا دیا تھا، میں نے سمجھا کوئی مکوڑا آن گرا ہے"

"مکوڑا پتنگے سے بھاری ہوتا ہے" امین منطق چھانٹتے ہوئے کہتا۔

راحت مُسکراتے ہوئے جواب دیتا "کیا دکان پر سودا ہو رہا ہے! پتنگا ہلکا ہوتا ہے، مکوڑا بھاری ہوتا ہے! توبہ!"

امین راحت کے نزدیک جا کر کہتا "مگر سچ کہنا قصور کس کا تھا؟"

دونوں مُسکرا دیتے۔ بچے کچھ حیران ضرور ہوتے مگر اتنے نہیں، وہ جانتے تھے یہ اُن کا روز کا معمول ہے۔ بس پھر دونوں اپنی ننھی ننھی چھنگلیاں ایک دوسرے میں اٹکا کر زور سے کھینچتے اور کہتے "لے آج سے ہم تم پکے دوست!"

مگر قدرت اُن کی فطرت کو ایک زبردست حادثے کیلئے تیار کر رہی تھی۔ اور یہ حادثہ پندرہ سال بعد پیش آیا۔ جب دونوں بائیس سال کے نوجوان تھے۔ گٹھا ہوا جسم، اُبھری ہوئی مچھلیاں، لال رنگ، چکّی کے پاٹوں ایسے چوڑے چکلے فولادی سینے۔ زمین پر قدم رکھتے تھے تو جیسے اس کا سینہ پھاڑ کر دھر دیں گے، جدھر سے گذرتے لوگ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ ہیں اللہ کے حقیقی خلیفہ۔ یہ آن بان، یہ سج دھج جیسے سکندر اور پورس جا رہے ہیں!

سکندر اور پورس! ــــ فاتح اور مفتوح! ــــ اور پھر دوست!

کیا تاریخ واقعی اپنے آپ کو دُہراتی ہے!

بات یوں ہوئی کہ شہر کے سب سے بڑے رئیس کی لڑکی جمیلہ کو

دونوں نے ایک روز باغ میں ٹہلتا دیکھ لیا اور دونوں کے دِل دھک سے رہ گئے! آمین نے راحت کی طرف دیکھا اور راحت نے آمین کی طرف!

"بڑی خوبصورت ہے یار؟"

"بڑی خوبصورت ہے!" راحت نے تعجب سے گردن کو ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا: "بڑی خوبصورت ہے!"

شاید جمیلہ نے یہ الفاظ سُن لئے، بھاگی جو وہاں سے سر پر پاؤں رکھکر اور اُلجھی جو ایک بیل سے تو مُنہ کے بل چنبیلی کی جھاڑی میں جا گری، وہاں شاید بھڑوں کا چھتہ تھا۔ ایک ساتھ دس بارہ آتشیں ڈنک جمیلہ کے صاف روشن چہرے پر چُبھے اور پھر جمیلہ کی چیخیں تھیں اور باغ کی معطر فضا!

دونوں نوجوان کچھ جھجکے، مگر پھر آگے بڑھے، رومالوں سے بھڑوں کو گراتے گئے اور پاؤں سے کچلتے گئے، جمیلہ کو ایک نے ایک بازو سے پکڑ لیا دوسرے نے دوسرے بازو سے۔ اُٹھا کر گھاس کے وسیع قطعہ میں لے آئے، دونوں نے پوچھا: "کہاں ہے آپ کا گھر؟ ہم آپکو وہاں پہونچادیں؟"

سسکیاں لیتے ہوئے بولی: "میری موٹر باہر کھڑی ہے مجھے وہاں تک پہونچا دیجئے۔ میں تو دیکھ بھی نہیں سکتی۔ ہائے میں اندھی ہوگئی!"

دونوں کے دلوں نے ایک بار پھر قلابازی کھائی "اندھی ہوگئی!" سر مُنڈاتے ہی اولے پڑے۔

اُسے موٹر تک پہونچا کر واپس لوٹے کہ راحت نے پوچھا، "کس کی موٹر تھی؟"

"چودھری بلند اقبال کی"

"ہاں میں نے بھی یہی سمجھا تھا"

جمیلہ کی امداد میں دونوں نے برابر کا حصّہ لیا تھا، اس لئے اَن بَن نہ ہوئی۔

بات آئی گئی ہوگئی بس یونہی راتوں کو باغ کی یاد آجاتی تو ذرا دل دھڑک اُٹھتے اور آنکھوں میں ذرا نمی سی تیرنے لگتی بس۔ اور کچھ نہ ہوا۔ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا۔

اتفاقاً بیس بائیس دنوں کے بعد دونوں اُسی باغ میں اُسی جگہ سے گزر رہے تھے کہ جمیلہ کو آتے دیکھا گھبرا سے گئے۔ اِدھر اُدھر جھانکنے لگے، جیسے چھپنے کیلئے کوئی کُنج تلاش کر رہے ہیں۔ جمیلہ نے انہیں پہچان لیا۔ ٹھٹک کر پریشان اور ہراساں نظروں سے چنبیلی کی جھاڑی کو دیکھنے لگی۔ آمین ذرا طرار تھا۔ بولا: "جی ہاں اسی جھاڑی میں بھڑوں کا چھتہ ہے"

جمیلہ مُسکرا دی۔ راحت پچتانے لگا کہ میں نے پہلے کیوں بات نہ کی۔

ہفتہ عشرہ کے بعد راحت کو معلوم ہوا کہ آمین چودھری بلند اقبال کے گھر آنے جانے لگا ہے اور گھنٹوں جمیلہ سے باتوں میں مصروف رہتا ہے، سر سے پاؤں تک جل اُٹھا اور لگا منصوبے باندھنے!

ہفتہ عشرہ کے بعد آمین کو جمیلہ کی زبانی معلوم ہوا کہ آج دن کو راحت آیا تھا۔ اور بہت دیر تک چودھری صاحب سے سیاسیات پر باتیں کرتا رہا۔ اور پھر جب وہ ایک دوست سے ملنے بیٹھک میں گئے تو وہ جمیلہ سے موجودہ دَور کی رومانی شاعری پر اور پھر انگریزی شاعر کیٹس کے خطوط پر خیال آرائیاں کرتا رہا!

آمین پر جیسے بجلی گری۔

اُسی شام راحت رستے میں ملا۔ پوچھا: "آج صبح کہاں رہے؟ میں تمہارے گھر گیا تھا۔ بندو نے کہا جانے کدھر نکل گئے نئے کپڑے پہن کر!"

راحت کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ بولا: "تم کہاں سے آرہے ہو؟"

"میں جہاں سے بھی آرہا ہوں۔ پر تم صبح صبح کدھر گئے تھے؟"

"کہاں جاتا میں"

"پھر بھی ....."

"تمہارے ہاں گیا تھا، تم میرے ہاں چلے آئے۔ رستے میں مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ یونہیں ٹانگیں مارتے پھرا"

آمین کا ماتھا ٹھنکا۔ راحت میرا اتنا اچھا دوست ہوتے ہوئے بھی مجھ سے حقیقت چھپا رہا ہے! نوجوان تھا یہ خیال نہ آیا کہ وہ خود راحت کا اتنا اچھا دوست ہوتے ہوئے اصلی بات کو چھپاتے پھرتا ہے!

بس یوں سمجھئے کہ دونوں دِلوں میں محبت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ دونوں دِلوں میں رقابت کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ دونوں دِلوں میں سترہ اٹھارہ سال کی بے لوث اور بے غرض دوستی کی خوشبو لہریں لے رہی تھی! عجیب معمّہ تھا کہ حل ہونے میں ہی نہ آتا تھا! وہ محسوس کرنے لگے جیسے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہاتھ پیر ہلا نہیں سکتے بس عذاب جھیلتے جا رہے ہیں اور سانس لئے جا رہے ہیں۔

اور جمیلہ کی سُنئے۔ آمین آیا تو پیارے آمین۔ راحت آیا تو پیارے راحت۔ ایک دل کی ٹھنڈک تو دوسرا آنکھوں کا نُور۔ آمین

کو زلفوں میں پھول سجانے کی اجازت ہے تو راحت کو انگلیوں میں انگوٹھیاں پہنانے کی آزادی! اِدھر بھی پھونک ماردی اور شعلہ بھڑکا دیا۔ اُدھر بھی پھونک ماردی اور شعلہ بھڑکا دیا۔ یہ نہ سمجھی کہ آخر ایک طرف جھکنا پڑے گا۔ امین ذرا زیادہ چرب زبان تھا ——— آخر فتح پائی۔ سکندر ——— اور بیچارہ پورس! راحت کو سب کچھ معلوم ہوگیا!

ایک دن شہر سے باہر دونوں اکٹھے جارہے تھے کہ اُلجھ پڑے!

راحت بولا "تم اتنے بڑے ہوگئے پر تمہاری فطرت نہ بدلی"

"کیوں؟ کیا کیا میں نے؟"

"پوچھنے کی ضرورت ہی تمہیں؟"

"میں نہیں سمجھا"

"انجان بنتے ہو"

"آخر کچھ بتاؤ بھی"

"جب تمہیں معلوم ہے پھر کیا بتاؤں"

"تمہاری فطرت بھی نہ بدلی۔ کنواری لڑکیوں کی طرح جو بات ہوئی دل میں چھپا کر رکھ لی"

"اور تم نے چھپا کر نہیں رکھی؟"

"بالکل نہیں"

راحت پھٹ پڑا "کیا تم جمیلہ سے محبت نہیں کرتے؟"

امین بکھر پڑا "کیا تم نے بھی اس کے قدموں میں بیٹھکر گھنٹوں اُسکی خوشامدیں نہیں کیں؟"

"مُنہ سنبھال کر بات کرو۔ تم نے اس کے پاؤں چاٹے ہیں کہ مَیں نے؟ —"

"اور وہ سونے کی انگشتری جس میں ایک سو روپے کا فیروزہ جڑا تھا؟"

"اور وہ سونے کا کلپ جس میں زمرد کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے — ؟"

"آج تک تم سے اتنا نہ ہوسکا کہ مجھے بتا دیتے۔ مَیں کیا کھا جاتا تمہیں؟"

"بڑا آیا راکشش کہیں کا۔ تم سے بھی تو اتنا نہ بن پڑا کہ جمیلہ کی محبت کا اقرار کرلیتے۔ میں تو نہ بھٹکا پھرتا"

"پہلے اپنی حیثیت تو دیکھ لی ہوتی"

راحت مچھلی کی طرح تڑپ گیا "حیثیت؟"

"ہاں۔ پہلے اپنی چال ڈھال اپنی شکل وصورت کو تو آئینہ میں دیکھا ہوتا"

"اور تم اپنے آپ کو یوسفِ ثانی سمجھتے ہو گے۔ بڑے آئے وہاں سے سرکاری بھینسے......"

"ابے چپ رہ"

"ابے کس کو کہتا ہے؟ لات لگاؤں گا کمر میں اور ٹوٹ کر بکھر جائے گا"

"تب دولتیاں کہیں اور جھاڑا کر۔ میں امین ہوں امین......"

"اور مَیں راحت ہوں راحت!"

تو تو مَیں مَیں ہوئی۔ ہاتھا پائی تک نوبت نہ آئی۔ مگر شہر واپس لوٹے تو دونوں پریشان۔ یہ کیا ہوگیا! اتنے اچھے دوست تھے۔ ایک دوسرے کی تکلیف بن آنسو بہائے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور آج کیا بھوت سوار ہوا سر پر کہ ہر ایک نے کہا "میں تیرے چھری بھونک دونگا" اور دوسرا بولا "اس سے پہلے میں کلہاڑی سے تیرا سر دو کرکے رکھدونگا"

یا وحشت! انہیں ساری کائنات کروٹیں بدلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ جی اُلٹنے لگا! اپنے اپنے گھروں میں آئے اور دھم سے پلنگ پر لیٹ گئے کھانے کا ہوش کہاں! دردِ سر کا بہانہ کرکے ٹالدیا۔ سترہ اٹھارہ سال اکٹھے رہے، اکٹھے کھیلے، اکٹھے ہنسے کودے، اور آج ایک چھوکری کی پیچھے جس نے دونوں سے یکساں طور پر اظہارِ محبت کر رکھا تھا، ایک دوسرے کو قتل کی دھمکیاں دے بیٹھے۔ اب کیا مُنہ دکھائیں گے ایک دوسرے کو! آمنے سامنے کیسے ہونگے! قیامت نہ آجائے گی! آسمان نہ پھٹ پڑیگا!

بستر سے اُٹھکر ٹہلنے لگے، چہرے پر پانی ڈالتے رہے۔ لمبی لمبی سانسیں لیں۔ دل دھڑکے جارہا تھا۔ دماغ گونجے جارہا تھا جمیلہ کو جیسے کبھی دیکھا تک نہیں! جیسے سب کچھ راحت ہے اور سب کچھ امین ہے! اور جیسے عمر بھر کی کمائی ایک آن میں تودہ خاک ہوکر رہ گئی ہے!

مُنہ اندھیرے ہی امین شہر سے باہر چل کھڑا ہوا کہ ہوا خوری کر آئے۔ شاید طبیعت بہل جائے۔ اُدھر سے راحت بھی اسی خیال سے باہر نکلا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ محبت اور حقارت کے ملے جلے جذبات نے نظریں جھکا دیں۔ دونوں کے دل بیتاب کہ ایک دوسرے کو بلا کر گلے لگالیں اور دونوں کا جذبۂ غیرت محوِ فغاں کہ یوں نہیں! آن پر دھبہ آجائے گا!

سکندر اور پورس۔ فاتح اور مفتوح کی چپقلش کی وجہ ایک قطعہ زمین تھی اور یہاں حوا کی ایک حسین وجمیل بیٹی جو ایک وقت میں دو دلوں سے کھیلنا پسند کرتی تھی۔ اعتراف مشکل تھے۔ شرما گئے۔ ایک سطر نکل گیا دوسرا اس طرف!

انجن والے نے سیٹی پر سیٹی دی۔ بریکیں کھینچیں۔ چیخا، پکارا۔ ایک ایک کھڑکی سے پانچ پانچ خوف زدہ سر باہر لٹک پڑے۔ "کیا ہوا کیا ہوا؟"

ایک نوجوان نے خودکشی کرلی۔

فائرمین دور آک کے پیڑوں سے ایک سر اٹھا لایا۔ خاک اور خون میں لت پت۔ آنکھیں نیم وا، منہ ذرا کھلا ہوا، ملائم بالوں میں تیل پڑا ہوا۔ زرد اور خوبصورت! کون ہے؟ کون تھا؟

مسافروں میں سے ایک شخص پکارا۔ "اوہ! امین علی!"

"امین علی!" کئی جاننے والے تڑپ اٹھے۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال لائی گئی۔ شہر کا شہر اکٹھا ہوگیا۔ چھاتیاں دھان کی طرح کوٹی جانے لگیں۔

یک بیک سارے مجمع پر موت کا سا سکوت طاری ہوگیا۔

سامنے بڑے دروازے سے راحت علی کی لاش بھی پوسٹ مارٹم کے لئے لائی جارہی تھی!

احمد ندیم قاسمی!

غیر معروف کوچہ

غیر معروف ایک کوچہ ہے خراب آباد میں
ضوفشاں ہے جلوۂ جاناں کا جس میں آفتاب
رات ہے تاروں بھری جس کی زمیں
ہر قدم پر خم ہے جس میں اک جبیں
چھا رہا ہے جیسے ذرے ذرے پر کیفِ شباب
بچھ رہے ہیں دل کے ٹکڑے جس کی ہر بنیاد میں
بہہ رہی ہیں جس میں خونیں آنسوؤں کی نالیاں
چل رہی ہیں سرد آہوں کی فضا میں آندھیاں
کوندتی ہیں جس کی دیواروں پہ مضطر بجلیاں
اس جنوں آثار کوچے کے مریضِ غم مکیں
غم کے مارے ہیں مگر اظہارِ غم کرتے نہیں
اس گلی کے بے سرو ساماں فقیر
ٹھوکروں سے ملک تاج و تخت ہیں روندے ہوئے
اس گلی کے صاحبِ حشمت امیر
پھر رہے ہیں مکھے سے چیتھڑے باندھے ہوئے

قسمتیں اس میں بگڑتی ہیں سنور جاتی بھی ہیں
صورتیں اس میں نکھرتی بھی ہیں مرجھاتی بھی ہیں
اس کی دیواریں بڑی سنگین ہیں
پتھروں کا فرش ہے جس پر قدم جمتا نہیں
ایک بار اس پر پھسل کر پھر کبھی تھمتا نہیں
بند دروازے بڑے رنگین ہیں
جن کے تالے کھولنا دشوار ہے
کھول کر پھر بند کردینا جنہیں آساں نہیں
راہگیروں پر گلی کا راستہ عریاں نہیں
کوچہ کیا ہے وادیٔ پرخار ہے
جو کبھی کوچے سے نکلتا ہے، نکلتا ہے اداس
اس کی بارِ رنج وغم سے ٹوٹ جاتی ہے کمر
دیکھتا ہے وہ مگر کچھ بھی نہیں آتا نظر
اسکو چلدیتی ہے تنہا چھوڑ کر ٹوٹی سی آس

عشق کا کوچہ ہے یہ اور آگ سے دہکا ہوا
ہر قدم پر کوئی یہ کہتا ہے "واپس لوٹ جا"

مخمور جالندھری!

ننھی الیفون[1]

گذر گئی اور پھر بھی زندہ ہے۔ اس کے پُرسکون چہرے سے دردو کرب کے وہ آثار چھٹ چکے ہیں جو اکثر بیماری کے دوران میں طاری ہوجاتے ہیں۔ اس کو دیکھکر گمان ہوتا ہے کہ وہ سو رہی ہے ــــــ بہت ہی میٹھی نیند۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دھوکا ہوتا ہے کہ سانس کی آواز ــــــ اُس کے دھڑکتے ہوئے سینے کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ــــــ پیہم کانوں میں آرہی ہے۔

مَوت کی زردی؟ عالمِ نزع کی تکلیفیں اور مُصیبتیں؟ اور اُس کے بعد پیشانی پر بل کھاتی ہوئی شکنیں؟ ــــــ وہ شکنیں جو انتہائی کرب کے بعد پڑجایا کرتی ہیں۔ یا نیلی دھاریاں جو پلکوں کے اردگرد نمایاں ہوجاتی ہیں؟ کہاں ہیں یہ آثار؟ شاید اس کی موت نے ان نشانات کو بھی معدوم کردیا تھا یا اُس کے خاموش حُسن اور پُرسکون جمال نے اس کے چہرے پر یہ توازن قائم کردیا ہوگا........ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اُس کی تخلیق ہوئی ہے اور اُس کے جسم میں عنقریب رُوح پھونکی جانے والی ہے۔

کچھ ہی دن پہلے وہ حسبِ معمول اپنی سُندر اور چاند سی صورت لئے آتشدان کے نزدیک بیٹھی ہوئی مُسکراتی ہوتی اور اپنی مانوس بلی سے اٹھکھیلیاں کرتی یا اپنے ارغوانی ہونٹوں سے انتہائی زندہ دلی کے ساتھ کوئی مترنم لیکن پُرسکون گیت الاپتی یا اپنے چمکدار اور کافوری ہاتھوں سے موسمی پھولوں کو چُن کر اپنے بُڈھے باپ کی خدمت میں پیش کرتی.... لیکن آج؟ ــــــ آہ ــــــ اس کی زندگی کی شمع بجھ چکی تھی اور یہ تمام باتیں موہوم تھیں۔

"میں دُنیا کو خیرباد کہہ رہی ہوں۔ میری پیاری چڑیا کو میرے پاس لاؤ کہ میں اس پر الوداعی نظر ڈال لوں" یہ تھا آخری جملہ جو موت سے پہلے اُس کی زبان سے ادا ہوا۔

چڑیا کا پنجرہ اُس کے پاس لایا گیا اور اُس کی مسہری کے کنارے لٹکا دیا گیا۔ الیفون کا چہرہ دمک اُٹھا۔ اُس نے اپنی بے زبان سہیلی پر مُسکراتے ہوئے ایک نظر ڈالی۔ چڑیا پھدک پھدک کر چہچہا رہی تھی۔ شاید وہ کوئی المناک گیت سُنانے کی کوشش کررہی تھی ــــــ لیکن ــــــ وہ اپنی پیاری مالکہ کے نزدیک ہونیکے باوجود اس سے بیخبر تھی کہ اس کا یہ گیت موت کا خوفناک پیغام ہے۔

قریب ہی بُڈھا ــــــ مغموم و محزون بُڈھا ــــــ پلنگ کے ایک گوشے میں سرنگوں بیٹھا تھا۔ اس کا دل قابو میں نہ تھا۔ عقل گم تھی۔ وہ اُن کمزور اور نحیف ہاتھوں کی طرف جھکا ہوا تھا ــــــ وہ ہاتھ جو کل تک بُڈھے کے لئے عصائے پیری اور زندگی کا سہارا بنے ہوئے تھے۔

بڈھے نے اُس کے دونوں ہاتھ لیکر اپنے سینے پر رکھ لئے گویا وہ اپنی باقیماندہ لیکن مختصر زندگی کو ــــــ جو اس کے دھڑکتے ہوئے قلب میں محسوس کی جاسکتی تھی ــــــ اپنی ننھی الیفون کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ شاید اس طرح معصومہ دُنیا میں کچھ عرصے اور ــــــ خواہ چند ہی لمحے کیوں نہ ہوں ــــــ زندگی کا لُطف حاصل کرسکے۔ اور بُڈھے کو اس کی موت کا وہ وحشتناک منظر نہ دیکھنا پڑے جسکے لئے اب اُس میں بالکل یوتا نہ تھا۔

بڈھا کچھ دیر تک اسی انداز میں بیٹھا رہا۔ پھر یکبارگی اپنے دوستوں سے مخاطب ہوکر بولا: "دیکھو! یہ حرارت دھیرے دھیرے اُس کے جسم سے منتقل ہورہی ہے"۔ حاضرین نے انتہائی حزن و ملال کے ساتھ بڈھے کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ بیچین ہوگئے۔ اُن کی نظریں کبھی کبھی بے چینی میں اُٹھ جاتیں اور انتہائی حسرت و یاس کے ساتھ پھر

---

[1] یہ ایک کمسن لڑکی تھی جس کا بچپن فرانس کے ایک پادری کے گھر بسر ہوا تھا۔ پادری گاؤں کے ایک اسکول کا نگراں تھا۔ وہ بہت بڈھا ہوچکا تھا۔ اُسکے تمام لڑکے اور پوتے ایک ایک کرکے ختم ہوچکے تھے اور وہ تنِ تنہا باقی ماندہ زندگی ــــــ جو اجیرن ہوچکی تھی ــــــ بسر کررہا تھا۔ اس وقت اسکو یہ لڑکی ہاتھ لگی۔ پادری کو اس سے قلبی اُنسیت تھی۔ وہ اس کے نسبی حالات سے بالکل نابلد تھا۔ اس نے اسکی تعلیم و تربیت میں بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا۔ یہانتک کہ الیفون نے ساتویں منزل میں قدم رکھا اور اسی نامساعد منزل میں اسکو ایک سخت بیماری بلکہ مرض الموت کا سامنا کرنا پڑا جس نے چند دنوں سے زیادہ مہلت نہ دی اور وہ اپنے پروردگار سے جاملی۔

نیچے جُھک جاتیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور قطرہ قطرہ کر کے نیچے ڈھلکنے لگے۔ بڈھا لوگوں کی بیقرار نگاہوں پر ایک نظر ڈالتا، پھر ــــ مایوس ہو کر ــــ کسی دوسری جانب دیکھنے لگتا۔ گویا وہ لوگوں سے ــــ اُس ٹوٹ جانے کے باوجود ــــ امداد کا خواہاں تھا۔

چند مختصر لمحوں کی دیر تھی ــــ جس کے بعد؟ . . . . . .

بڈھے نے محسوس کیا کہ مریضہ کے ہاتھ اُس کو اپنی جانب کھینچ رہے ہیں۔ وہ تڑپ اُٹھا۔ مریضہ نے بڈھے کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں اور اپنی جانب بھینچنا شروع کیا ــــ انتہائی [illegible] کے ساتھ ــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں، انتہائی نقاہت کے باوجود، برقی بلکہ رُوحانی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ننھی ایفون گذر گئی ــــ وہ پیاری اور خاموش بچی گذر گئی، وہ متین سنجیدہ اور صبر کرنے والی لڑکی گذر گئی ــــ اللہ کی خوشنودی میں ــــ جو زندگی کے مطلع پر ایک ستارہ بنکر چند لمحوں کیلئے چمکی اور پھر جھلملا کر بُجھ گئی، جو تقدیر کے باغ میں کلی بنکر نمودار ہوئی اور فوراً ہی مُرجھا گئی، جو بلّور کا ایک ایسا رنگین پیالہ تھی جو اب تک پہونچنے بھی نہ پایا تھا کہ چکنا چور ہو گیا یا موتیوں کا ہار تھی جو گندھنے سے پہلے ہی بکھر گیا ہو۔

یہی وہ کمرہ ہے جس میں اس کی موہ لینے والی مُسکراہٹ نے اکثر جلوہ آرائیاں کیں ہیں لیکن ــــ اُف ــــ اب اسی میں اس کے تمام خاموش تبسمات گُم ہو کر رہ گئے ہیں، یہی وہ باغ ہے جہاں وہ روزانہ ــــ دن ہو یا رات ــــ جایا کرتی تھی، جہاں وہ اپنی خوشرنگ چڑیوں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی، پھول توڑتی اور اپنے لگائے ہوئے پودوں کی دیکھ بھال کرتی یا اکثر کیاریوں پر، جن میں سُرخ مہین کنکر بچھے ہوئے تھے، چہل قدمی کرتی لیکن ــــ آہ ــــ اب یہ سب اس سے محروم ہیں اور آج کے بعد کسی کو اسکی زیارت کا موقع نصیب نہ ہوگا۔

پیاری ایفون خوش خلق تھی، نیک نفس تھی، اس کا ضمیر سُتھرا تھا، وہ دُنیا کے تمام جانداروں کو ــــ ناطق ہوں یا صامت ــــ محبوب رکھتی تھی۔ اس کو اپنی پیاری بلّی سے اپنے ضعیف اور بڈھے باپ کے مقابلہ میں کسی طرح کم محبت نہ تھی۔ اور نہ وہ اپنے باپ کے کھوسٹ دوستوں اور ہم نشینوں کو اس نووارد شخص کے مقابلے میں کسی طرح زیادہ چاہتی تھی جو اپنی عمر میں پہلی بار اسکے قصبہ میں داخل ہوا ہو۔

آج تک کسی نے نہیں سُنا کہ ہم مکتب لڑکوں اور لڑکیوں کی اس کی کبھی آن بن رہی ہو۔ نیک بخت طلبا اس کی عنایت اور شائستگی کے ہمیشہ مدّاح رہے اور بدطینت طلبا اُس کی عفو گزاری اور چشم پوشی کے معترف تھے۔

اگر کوئی شخص اُس کی آنکھوں کا مطالعہ کرتا، جن میں عاجزی، انکساری اور وہ چمک پائی جاتی تھی جو صرف قطرہ ہائے اشک سے پیدا ہو جاتی ہے ــــ تو اس کو معاً احساس ہوتا کہ اس پر وہ راز منکشف اور وہ رمز آشکارا ہے جس کو پوشیدہ رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی تھی ــــ وہ جانتی تھی کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اُس کے برخلاف وہ اپنے باپ کے گھر میں نہیں ہے۔ البتہ ایک بزرگ اور قابل قدر مُحسن کے گھر میں ــــ وہ مُحسن جو اُس کی پیدائش اور تاریخ ولادت سے بھی واقف نہیں۔

اُس کے لبوں پر ہمیشہ ایک ہلکی لیکن شیریں مُسکراہٹ موجود رہتی۔ وہ بہت بھولی تھی اور اپنے شیریں تبسم سے غمگین دلوں کی کدورت دُور کر دیا کرتی، اس کے بعد ــــ جو کچھ چاہتی منوا لیتی ــــ لیکن اُسکی مُسکراہٹ، اُن لڑکیوں کے برخلاف ــــ جو اپنی ماں سے اکثر جھوٹی مُسکراہٹ کے ساتھ پیش آتی ہیں ــــ تصنّع اور بناوٹ سے مبرّا ہوتی اور محبت و اخلاص، تلطّف و مہربانی کے جذبات سے لبریز۔

یہی وجہ تھی کہ آسمان کے رہنے والے یہ برداشت نہ کر سکے کہ وہ زیادہ عرصے زمین پر رہے۔

اس کا جنازہ اُٹھانے کیلئے گرجا گھر کے گھنٹے بجنے لگے لیکن ــــ افسوس ــــ اس کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ اگر اس میں قوتِ سماعت ہوتی تو یقیناً وہ ــــ جیسا کہ زندگی میں اس کا دستور تھا ــــ انتہائی بیتابی اور تاسف کے ساتھ ان گھنٹوں کی دردناک اور مُہیب آواز سنتی۔

تدفین کا وقت آیا۔ لوگوں نے اپنے ہاتھوں پر اس کو اُٹھا لیا اور گرجا میں لے جا کر ایک کونے میں رکھدیا۔ لوگ انتہائی حسرت و یاس کے ساتھ الوداعی نظر ڈالنے کے لئے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ کھوسٹ بڈھوں نے جو اس سے انتہائی محبت کرتے تھے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کیا اور مدرسہ کے تمام لڑکوں لڑکیوں اور ان عورتوں نے بھی جو اس کو اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ آہ و بکا وہ مسکین پیرمرد کر رہا تھا جس کے لئے ایفون سب کچھ تھی اور جس سے وہ چند لمحوں میں جُدا ہو گئی۔

ایک شخص کہتا ہے میں نے ایک بار اس کو اسی جگہ دیکھا تھا